

علی پور کا ایلی



ممتاز مفتی

پسندیدہ مسائل و ڈائجسٹ کراہد پر حاصل کردین
نویسندہ فروغت کے لیے تشریف لائیں

محمد ران ڈائجسٹیری
مجدد پیر روڈ محلہ عید گاہ روڈ ٹوبہ

فہرست

۲۱	علی پور کا اہلی ،
۳۷	بچپن ،
۷۹	بیداریاں
۱۴۰	شہزاد
۱۸۱	سانوری
۲۲۰	تیم اور نیم
۲۷۹	سفینہ اور نور
۳۲۷	شہزاد
۳۷۶	دیوانگی
۴۲۳	فرار
۴۷۸	تیاگ
۵۵۲	گوریاں

دیباچہ برائے بازپنجم

۱۹۹۵ء

۶۵۰

۷۶۲

۸۶۶

۹۵۲

۱۰۲۷

۱۱۱۶

۱۱۵۳

۱۲۲۹

سادہ

چھ لڑکیاں

بن باسی

تجدید

بھگوڑے

انجام

پاکستان

علی پور کالہیلی (ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

میں نے کبھی سوچا ہی نہ تھا کہ اس کتاب کی اتنی ایڈیشن شائع ہوں گی اور اس کی مانگ اس قدر بڑھ جائے گی۔ میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ مشاعرہ اردو ادب اس کتاب کو تسلیم کر لیں گے اور اردو ادب میں اسے ایک مقام بخش دیں گے۔ میں اردو ادب کے وسعت قلب کا مرہون منت ہوں، چونکہ یہ میری کوششوں یا جدوجہد کی وجہ سے نہیں ہوا۔

مجھ میں کبھی خواہش پیدا نہیں ہوئی تھی کہ ادب بنوں۔ کس برتے پر ہوتی نہ تو میں اردو زبان سے واقف تھا نہ ہی میں نے کبھی اردو ادب کا مطالعہ کیا تھا۔

میں اس زمانے کی پیداوار ہوں جب اردو زبان پنجاب میں در نہیں آئی تھی۔ ہم لوگ گھروں میں محلوں میں مدرسوں میں کالجوں میں دفاتروں میں ہر جگہ بے تکلف پنجابی بولتے تھے۔ مدرسوں میں صرف آٹھویں جماعت تک اردو پڑھائی جاتی تھی۔ کالجوں میں اردو کا وجود نہ تھا۔ اور نیشنل یونکوائج کے لئے الگ کالج بنائے گئے تھے۔ ان کی حیثیت ایسی تھی جیسے براہمنوں کے آشرم کے قریب ہر بچن کنیا بنی ہو۔ اور نیشنل کالج کے طلباء کو اجازت تھی کہ تحصیل علم کے بعد صرف انگریزی کا پرچہ دے کر وہ گریجویٹ ڈگری کے حقدار ہو سکتے تھے۔ ایسے گریجویٹ کو عرف عام میں تحقیر سے دایا، ٹھنڈا کہا جاتا تھا۔

ان دنوں میں یکسر مغرب زدہ نوجوان تھا ان حالات میں میں اردو ادب بننے کی خواہش کیسے کر سکتا تھا۔

اس زمانے میں میں کیوں اردو میں لکھتا رہا بظاہر اس کی صرف ایک وجہ تھی، ضد۔ میرا موقف یہ تھا کہ صرف ادیب ہی کو لکھنے کا حق نہیں ہے غیر ادیب بھی لکھ سکتا ہے آپ اسے ادیب نہ ماننے کا لیکن لکھنے کا حق تو دیکھتے تھے۔

در اصل یہ سارا گورکھ دھندا تقدیر کا چلایا ہوا تھا۔ اپنا راستہ ہموار کرنے کے لئے تقدیر کو کیا کیا گمن گمیریاں چلائی پڑتی ہیں۔

علی پور کا ایلی میں نے اردو ادب کے خلاف احتجاج کے طور پر لکھی تھی۔ اردو ادب کی ایک پہلوؤں میں بڑا اجلا تھا بڑا مذہب تھا بڑا اخلاق زدہ تھا، اس حد تک کہ حقیقت پسندی سے بے گانہ ہو جاتا تھا۔ اردو ادب کی خود نوشتیں بڑی دھلی دھلائی، کلف زدہ اور استری کی ہوئی تھیں۔ میں نے سوچا ایک سچی خود نوشت پیش کروں۔ اخلاق اور مذہب سے بے نیاز۔

در اصل یہ کتب میں نے اردو ادب پر طنز کی حیثیت سے لکھی تھی اور میرا خیال تھا کہ یہ کتب چھینٹے اڑائے گی شورشوری پیدا کرے گی اور پھر ٹائیس ٹائیس فٹ ہو کر رہ جائے گی۔ لیکن یہ کتب تو جل نکل۔ اپنی سچائی اور اردو ادب کی وسعت قلب کی وجہ سے۔ تقدیر کے بھید کس نے پائے ہیں۔

ممتاز مفتی
جون ۱۹۹۵ء

پیش لفظ

(تیسرا ایڈیشن)

یہ کتب میری آپ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔ پہلے مجھ میں اتنی جرات نہ تھی کہ اپنی خامیوں، یکپوں اور بے راہ رویوں کو اپناؤں۔ اس لئے میں نے اسے روئیدلو کا نام دے دیا۔

یہ آپ بیتی ۱۹۰۵ء سے ۱۹۴۷ء تک مشتمل ہے۔ اس آپ بیتی میں ہر واقعہ، ہر کردار حقیقت پر مبنی ہے۔ افسانہ نگاری اسلوب میں ہو تو ہو واقعات میں حقیقت گوئی سے ہم لیا گیا ہے۔ یہی اس کتب کی امتیازی خصوصیت ہے۔

ارلہ تھا کہ سوانح کا دوسرا حصہ "ایلی اور الکھ نمکری" کے عنوان سے پیش کروں گا، لیکن الکھ نمکری والوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ ان کا کہنا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو پردہ دری بند نہیں۔ لہذا معذور ہوں۔

ممتاز مفتی

درخ ۲۶ نومبر ۱۹۸۳ء

دوسرا ایڈیشن

اس کتب کا پہلا ایڈیشن ۱۹۶۱ء میں چھپا تھا جو دو سو پچاس جلدوں پر مشتمل تھا۔ یہ ایڈیشن انقزی میں چھپا۔ یہ انقزی آدم جی انعام سے متعلق تھی۔ "اب یہ کتب اس لئے مشہور کہ اس پر آدم جی انعام نہ ملا۔" (ابن انشا)

صرف دو سو پچاس جلدیں چھپنے کے باوجود اس کتاب کو اتنے افراد نے پڑھا ہے کہ جان کر حیرت ہوتی ہے۔ اب سعادت، فرزانه اور چودھری بشیر احمد کی تحریک پر اس کا دوسرا ایڈیشن پیش کیا جا رہا ہے۔

بیشتر لوگ جنہوں نے اس کتاب کا مطالعہ کیا ہے اس بات پر مصر ہیں کہ یہ ناول ہے۔ محمود ایلا کہتے ہیں کہ ”یہ تلاش ذات کا ناول ہے۔“ ابن انشا کا کہنا ہے کہ ”یہ ناولوں کا گرنتھ صاحب ہے۔“ سعادت اور فرزانه کا خیال ہے کہ ”اس ناول میں ایسے نکلے بھی ہیں جنہیں پڑھ کر پھر سے جینے کی آرزو پیدا ہوتی ہے۔“ ایسے قاری بھی ہیں جو کہتے ہیں کاش یہ ناول ہوتا اور رومان کے نقطہ عروج کے بعد ختم ہو جاتا۔ ایسے قاری بھی ہیں جن کا خیال ہے کہ اسے ایسا ہی ہونا چاہئے تھا جیسے کہ ہے۔

خوشی اور تعجب کی بات ہے کہ اس طویل کتاب کو کئی ایک اعلیٰ افسروں نے بھی پڑھا ہے جن کی ہدیم الفرستی کا یہ عالم ہے کہ بیگم کے پاس بیٹھ کر پڑوسیوں کی بدخویاں کرنے کی عشرت سے بھی محروم ہیں اور ان کی رائے اس کتاب کے متعلق خاصی مختلف ہے۔

اپنی دانست میں میں نے ناول نہیں بلکہ ایلی کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلی کی شخصیت کا ارتقا پیش کروں۔ اسی لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلی ایسا کردار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر بھاڑ کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید ہم سب پنچھی ہوں اور کنارے لگنے کے بعد پر بھاڑ کر جوں کے توں خشک ہو جاتے ہوں۔

بہر حال اردو لوہ میں کوئی کہانی ایسی نہ ملے گی، جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چٹاؤ کئے بغیر ایک جگہ دھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ جیتی ہے۔

ایلی کا کہنا ہے کہ یہ کتاب ہی نہیں بلکہ ایک خط ہے جو اس نے سادی اور عالی کے نام لکھا ہے۔ بری الذمہ ہونے کے لئے نہیں بلکہ اعتراف جرم کے لئے۔

مجھے یقین ہے کہ اس کتاب کے دوسرے حصے ”ایلی اور الکھ عمری“ کی تکمیل کے بعد یہ کتاب ارتقا کی ایک اہم کڑی کی حیثیت اختیار کر لے گی اور اس کے دھواں دار اندھیرے، آنے

والی کرن کو، مزید چمک بخشیں گے۔ اور دوں حصے مل کر تلاش ذات کا ناول بن جائے گا۔ لیکن بارہ سال الکھ عمری کی دہلیز پر بیٹھنے کے بعد مجھے شک پڑنے لگا ہے کہ شاید الکھ عمری ایک دہلیز کے سوا کچھ بھی نہ ہو جسے پار کر کے آپ مڑ کر اپنے ہی دل میں داخل ہو جاتے ہیں۔ جہاں ایک عظیم نزاکات سرسبز ہے۔

راولپنڈی۔ جنوری ۱۹۶۹ء

مستار مفتی

(پہلا ایڈیشن)

۱۹۳۶ء میں میں نے اپنا پہلا افسانہ ”جھکی جھکی آنکھیں“ پیش کیا تھا، آج میں اپنی پہلی مسلسل کتاب ”علی پور کا ایلی“ پیش کر رہا ہوں۔ یہ روئیداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں، لیکن محبت نہ کر سکا، جس نے محبت کی پھلجڑیاں اپنی انا کی تسکین کے لئے چلائیں، لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالہ پیدا نہ کر سکا۔ جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول، عیالوں میں کھویا رہا، حتیٰ کہ بلا آخر نہ جانے کہاں سے ایک کرن چمکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور افسانہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے۔ ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا افسانوی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

اس کتاب کا مقصد صرف ایلی کی داستان حیات پیش کرنا ہے۔ کسی متعلقہ یا ضمنی کردار کی دل آزاری، تضحیک یا تذلیل نہیں۔ اگر اس کتاب کے کسی حصے سے ایسا پہلو نکلتا ہے۔ تو وہ

میری تحریر کے خام ہونے اور وسعت نگاہ کی کمی کی وجہ سے ہے۔

شاید آپ علی پور کے ایلی کی رویداد پسند کریں۔ تو شاید میں بھی کبھی دوسری کتاب میں اس ”نہ جانے کہاں سے چپکنے والی کرن“ اور ”نہ جانے کدھر کو لے جانے والے راستے“ تذکرہ کروں، جس کے اشارے پر اس کتاب کا اختتام ہوتا ہے اور جس پر گامزن ہونے کے ایلی پر قول رہا ہے۔

ممتاز مفت

راولپنڈی ۵ مارچ ۱۹۸۱ء

بانو قدسیہ

اگر آپ کو غزل الغزلات پڑھنے کا شوق ہے اور آپ عورتوں سے باتیں کر کے مسرت حاصل کرتے ہیں تو ”علی پور کا ایلی“ ضرور پڑھئے۔

اگر آپ جانتے ہیں کہ مرد بطح کی مانند ہے، ہمیشہ اوپر سے پانیوں میں تیرتا ہے اور پھلجھلج کی طرح نچلے پانیوں میں نہیں جاسکتا تو بھی ”علی پور کا ایلی“ آپ کے لئے مسرت کا باعث ہوگی۔

اگر آپ میں تجسس کا مادہ ہے اور آپ بچپن میں بھول بھلیاں اور پھیلیاں بوجھتے رہے ہیں تو آپ کے لئے ”علی پور کا ایلی“ وہ سنہری پوشین ہے جو ہزار منزلوں کے بعد شہزادہ کی ملی تھی۔

اگر آپ لوگوں سے ملنا چاہتے ہیں اور مکمل طور پر مردم بیزار نہیں ہوئے تو ”علی پور کا ایلی“ ضرور پڑھئے، اس میں اک بنان آبلہ ہے۔ لیکن۔۔۔ اگر آپ بچپن میں پوری کہانی کو چار سطروں میں بیان کرنے کا فن سیکھ چکے ہیں، جوانی میں آپ نے صرف وہ کتابیں پڑھی ہیں جن کے آخر میں سری درج ہوتی ہے اور اگر ”بھا“ آپ کم گو، درست بات کرنے والے اور لکھیوں پر گن گن کر غصہ کرنے کے علوی رہے ہیں تو یہ کتاب آپ کے لئے بے کار ہے۔ اس سے بہتر ہو گا کہ آپ اس کی سری کسی ایسے دوست سے سن لیں جس نے اسے غور سے پڑھا ہو اور اس سے لطیف اندوز نہ ہو سکا ہو۔

اور ادر ادر ”چلی“ سے جمع نہیں کی گئی، خود مصنف کے خون جگر سے صورت پذیر ہوئی ہے۔

کرنل محمد خان

جب ممتاز مفتی کی کتاب — ”علی پور کا ایل“ — کو آدم جی انعام نہ مل سکا تو معا نہیں احساس ہوا کہ یہ ضرور کام کی کتاب ہوگی، اسے پڑھنا چاہئے اور پڑھی تو ہمارا وہی حال ہوا جو ”ان“ کی تقریر سن کر غالب کا ہوا تھا، یعنی:

میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

کسی ادب پارے کی عظمت پر کھنے کے لئے اس سے بہتر کوئی کسوٹی نہیں — ظاہر ہے کہ ممتاز مفتی کے منکروں کے بھی دل تو مومن ہوں گے، صرف دماغ کافر ہیں۔

قدرت اللہ شہاب

مفتی اگر ادیب نہ ہوتا تو جرائم پیشہ ہوتا۔ چونکہ لاشعور اس کی تحریروں کا موضوع ہے اور انسانی لاشعور میں نہ جانے کتنے عمر خاں اور بھوبت ڈاکو چھپے بیٹھے ہیں۔

مفتی عقیدے کا روگ نہیں پالتا، ہاں عقیدت کا شکار ضرور ہوتا ہے جب وہ عقیدت طاری کرے تو اس شخص کی زندگی حرام ہو جاتی ہے جس سے مفتی کو عقیدت ہو۔ اس وجہ سے مفتی کی دوستی ایک ایسے پھوڑے کی طرح ہے جس کی ٹیسوں میں لذت ہے — ”علی پور کا ایل“ میں مفتی بدرجہ محبت سے عقیدت کی جانب بڑھ رہا ہے۔ شہزاد، مفتی کی محبت کے پھوڑے کی ٹیسوں اور لذت کی دو دھاری چھری تلے تڑپ رہی ہے۔

مفتی کی زندگی پر صوفی کی گہری چھاپ ہے۔ اس کی تحریروں شعور اور لاشعور کے تصادم کو سلجھاتے ہوئے تصوف اور سلوک پر ختم ہوتی ہیں۔ ”علی پور کے ایل“ میں مفتی نے افسانوں میں لاشعور کے تجرباتی نظام کو تصوف کی ابتدا کے پہلے موڑ پر پہنچا دیا ہے۔

اگر مفتی ”علی پور کا ایل“ کا دوسرا حصہ لکھنے میں کامیاب ہو گیا تو اندازہ ہے کہ محبت اور عقیدت کا دوا آتش ہو کر یہ کتاب ایک خصوصی اہمیت حاصل کر لے گی۔

اشفاق احمد

جب ”علی پور کا ایل“ شائع ہوا تو میں اسے اردو زبان کا ایک عظیم ناول تصور کیا کرتا تھا۔ انہی دنوں ناشر نے اسے آدم جی پرائز کے لئے گلڈ کے دفتر میں گزارا۔ جنوں نے اسے ”پڑھو اور اس پر ”غور“ کیا۔ پھر فیصلہ دیا کہ ”علی پور کا ایل“ اس قابل نہیں کہ اسے آدم جی انعام سے نوازا جائے۔ چونکہ یہ ملک کے پانچ بیروں کا فیصلہ تھا اس لئے مجھے بھی اپنی رائے میں تبدیلی کرنی پڑی۔ اس وقت سے لے کر اب تک میری رائے ویسی ہی چلی آ رہی ہے کہ پچھلے دنوں ان ناول کو پھر سے دیکھنے کا موقع ملا۔ چونکہ بزرگوں کی عزت کرنے کا حکم مجھے بچپن سے ملا ہے، اس لئے میں ان کے فیصلے پر قائم رہنے پر مجبور ہوں۔

ویسے میرا دل پکار پکار کر کہتا ہے کہ ”فسانہ آزاد“ اور ”علی پور کا ایل“ اردو کے دو عظیم ناول ہیں۔ خدا کا شکر ہے کہ میرے دل کی آواز مجھ ہی تک محدود ہے۔ ورنہ بڑا ہنگامہ مچا جاتا۔

آپ اس ناول کو پڑھئے لیکن اپنی رائے قائم کرنے کے بجائے فاضل جنوں کے فیصلے کو پابند رہئے کیونکہ یہ اردو ادب کی تاریخ کا اہم فیصلہ ہے اور اس کو بنیاد بنا کر مستقبل کے ادب کے بارے میں اقوال فیعل دیئے جانے چاہئیں۔

ضمیر جعفری

ممتاز مفتی اردو ادب میں اسلوب دیگر کے الگ داستان کے خالق ہیں۔ ان کے فن اور فکر میں ایک ایسے جوان رعنا سے تشبیہ دوں گا جو دیکھنے میں بہت البرکمر سوچنے میں نہایت ہے۔ آپ اس سے پیار بھی کر سکتے ہیں اور بےیت بھی حاصل کر سکتے ہیں۔ مفتی کا ادب ہی نہیں ہمیشہ جوان بھی رہے گا۔ سوچتا ہوں اگر ممتاز مفتی پیدا نہ ہوتا تو زندگی کئی رعنائیوں اور دلچسپیوں سے محروم رہ جاتی۔

”علی پور کے ایل“ کو میں اس دور کا ایک اہم ادبی کارنامہ سمجھتا ہوں اور زندگی کے قدر و سبب نماز پر یہ کارنامہ شاید ممتاز مفتی ہی سرانجام دے سکتا تھا۔ کتاب کی ”فراہم

آدم جی ادبی انعام کی ایک مجلس منصفین ہوتی ہے۔ میں پہلے سال سے اس کا معتد اعزازی ہوں، میرا کام انتظامی ہے اور ضابطے کی رو سے میں کتابوں کے بارے میں حق رائے دی نہیں رکھتا۔

جب اس کتاب (علی پور کالہ) پر غور ہوا، اس مجلس کے صدر تھے ڈاکٹر اختر حسین رائے پوری اور اراکین تھے پروفیسر ممتاز حسن، پروفیسر وقار عظیم اور دیگر مشاہیر جن کے نام شائع ہو چکے ہیں۔ انہوں نے اس کتاب (علی پور کالہ) کو بہترین نہ سمجھا، بلکہ جمیلہ ہاشمی کی ”تلاش ہماراں“ کو انعام کا مستحق قرار دیا۔ منصفین نے اپنی رائے وے دی جس کا احترام کیا گیا اور انتظامی پابندی بھی کی گئی۔ مجلس منصفین کی کارروائی خفیہ رکھی جاتی ہے صرف متفقہ یا اکثریتی رائے کی تشہیر کی جاتی ہے۔ اس لئے میں اس کارروائی کا حال نہیں بتا سکتا۔ لیکن ایک قاری کی حیثیت سے مجھے ہمیشہ یہ کہنے کا حق ہے کہ یہ فیصلہ اردو ادب کے ساتھ کم از کم ایک ناانصافی کے مترادف تھا۔

ابن انشا

”علی پور کالہ“ ممتاز مفتی کا بڑا بھاری کارنامہ ہے۔ حجم اور وزن کے اعتبار سے ہی نہیں مضمون، پلاٹ اور اسلوب کے لحاظ سے بھی، کچھ لوگ اسے اردو ناولوں کا گرو گرنتھ صاحب بھی کہتے ہیں، کیونکہ یہ ہاتھ میں اٹھا کر مطالعہ کرنے کی چیز نہیں بلکہ اسے چوکی پر رکھ کر مورچل ہلاتے ہوئے پڑھنا پڑتا ہے۔ اسے نئے ادب کی طلسم ہو شرما بھی کہہ سکتے ہیں۔ کہ قدم قدم پر ہفتیوں آتے ہیں جن سے گزرتے ہوئے ہیرو کے اور قاری کے ہوش گم ہوتے ہیں۔ کردار کردار چڑھا ہوا ہے، طلسم میں طلسم گرفتار ہے، اور افسانہ از افسانہ می خیزد۔ اس کا سائل بھی افسانے سے زیادہ داستان کا ہے۔ کڑی سے کڑی ملتی جاتی ہے۔ زبان و مکان کی زقندیں نہیں ہیں، جن سے پائے نگاہ میں موج آنے کا اندیشہ ہو، یہ ناول قلم سے کم کیرے سے زیادہ کر رہا ہے اور اس کا فوکس ایلی پر رہتا ہے۔ اس ناول کے دو نمایاں پہلو ہیں، راست بازی کردار تراشی۔ راست بازی روسو کی سی نہیں کہ غلو کی وجہ سے ریا بن جائے، بلکہ سادہ غیر جفا اور سلوہارن قسم کی۔ کردار بنانے میں مفتی جلدی نہیں کرتے، سچ کچے سو بیٹھا ہو۔ ایک

کی تشکیل میں پچاسوں صفحے اور دسیوں برس صرف ہو جاتے ہیں لیکن پھر وہ ایسا ہوتا ہے کہ ٹن ٹن بچتا ہے۔ پتھر پر نقش ہو جاتا ہے۔ مجھے یہ ناول پڑھے بہت دن ہوئے، لیکن آج بھی علی احمد ہو یا شہزاد، ساوی ہو یا انصار، منصر، تسلیم ہو کہ ارچند، ذہن میں اپنی اپنی جگہ قطب نما بنے کھڑے ہیں۔ ہر ایک کی ج ج دھج الگ، خمیر جدا، دو لہا اس بارات کا ایلی سہی، لیکن آگے چل کر شہزاد اسے بچاڑ کر کھڑی ہو جاتی ہے۔ وہ پاپن جویوں جلی نہ کوئلہ بنی نہ راکھ، اردو ادب کے لازوال کردار کے طور پر زندہ رہے گی۔ پھر ساوی ہے جس نے اس قصے میں شوخی اور رومان کا رنگ بھرا ہے ایک تتلی جو ہاتھ نہیں آتی، ایک غزال جو وحشت کرتا ہے۔ ایلی پر تو اس ناول میں ناحق کو خود مختاری کی تمت ہے وہ تو ان تین جشیوں — علی احمد (باپ)، شہزاد اور ساوی کے درمیان کوڑے کھاتا پاجوللاں چلا جا رہا ہے، چلا جا رہا ہے — بارہ سو صفحے کے اس ناول کو شروع کر کے ختم کئے بغیر رکھنا مشکل ہے، جس نے پڑھا ایسے پڑھا کہ کام سے یا دفتر سے چار دن کی چھٹی لی، اتنے دن کی رسد اور پانی کی ایک مٹکی پاس رکھ لی۔ بیٹوں اور تاجروں اور ان لوگوں کے پڑھنے کی یہ چیز نہیں جن کا لمحہ لمحہ بڑا قیمتی ہوتا ہے اور جو صرف منڈیوں کے بھاؤ اور سینما کے اشتہار پڑھنے کے لئے پیدا ہوئے ہیں، غالباً انہیں طباقوں کا مفاد نظر تھا کہ آدم جی انعام کے فاضل جنوں نے انعام نہ دے کر قوم کو اس ناول سے بچانے کی کوشش کی لیکن تقدیر پر کس کا بس چلتا ہے۔ سنا ہے اب یہ دوبارہ شائع ہو رہا ہے۔

علی پور کا ایلی

ایلی

اس کا نام الیاں تھا۔ لیکن گھر میں سبھی اسے ایلی کہا کرتے تھے۔ ”ایلی —“ اس کے ابا آواز دیتے۔ ابا کی آواز سن کر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ”ایلی۔ حقہ بھر دو۔“ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھتا۔ ابا کے کمرے کا دروازہ بند دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہچکچاتا، محسوس کرتا کہ اس بند کمرے میں داخل ہونا ٹھیک نہیں۔ دبی آواز میں کھانسنے کی کوشش کرتا تاکہ کمرے کے لوگ اس کی آمد سے مطلع ہو جائیں۔ لیکن اس کی آواز حلق میں سوکھ جاتی۔ پھر وہ بڑی کوشش سے چلتا۔ ”آیا جی“ اور جرائت کر کے دروازہ کھولتا لیکن دروازہ کھولنے سے پہلے اپنی نگاہیں جھکا لیتا اور ایسا انداز اختیار کر لیتا۔ جس سے ظاہر ہو کہ حقہ کے علاوہ اسے کمرے کی کسی چیز سے دلچسپی نہیں۔ کمرے میں ابا کو اکیلے دیکھ کر اس کے دل سے بوجھ اتر جاتا پھر وہ بے فکری سے حقہ کی طرف بڑھتا۔

اس کے ابا عام طور پر چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ قنصل اتار کر بیٹھا کرتے تھے۔ ان کی دھوٹی میلی ہونے کے علاوہ پٹی ہوئی تھی اور اس کے پلوں کو ادھر ادھر سر کے رہنے کی بری عادت تھی جو ایلی پر بے حد گراں گزرتی۔ ”ہوں — کیا ہے۔“ ابا گھور کر اس کی طرف یوں دیکھتے جیسے وہ خواہ مخواہ کمرے میں آگھسا ہو۔ ”جی۔ جی۔ چلم“ ایلی ان کی دھوٹی کی طرف نہ دیکھنے کی شدید کوشش کرتے ہوئے جواب دیتا اور پھر چلم اٹھا کر دروازے کی طرف بھاگتا۔

کہا ہو۔

میں داس ہوا۔ ہابزہ برن مابے اماوند کے یا کو پیے میں

اماں کے قرب کی وجہ سے وہ فرحت سے جلتا تھا اور اپنے آپ کو فرحت سے بہتر سمجھتا تھا۔ فرحت کی اس گھر میں حیثیت ہی کیا تھی نہ تو ابائے اسے کبھی بلایا تھا۔ نہ اسے چلم بھرنے کے لئے کہا تھا اور ایللی کو تو وہ اکثر بلاتے تھے۔ وہ جب کھانا کھانے لگتے تو ”ایلی“ کو آواز دیتے ایللی اور جب ایللی جاتا تو دو انگلیوں سے بوٹی اٹھا کر اس کی طرف بڑھا دیتے ”ایلی بوٹی۔“ اور ایللی اسے ہاتھ میں اٹھائے یوں اپنے کمرے میں داخل ہوتا جیسے کوئی تہنہ ہو۔ وہ فخریہ انداز سے فرحت کی طرف دیکھتا۔ لیکن فرحت یوں ناک چڑھا کر منہ پھیر لیتی جیسے ایللی کے ہاتھ میں گوشت کی بوٹی نہیں بلکہ مرا ہوا چوہا ہو۔ ہونہ ایللی غصے سے پھنکارتا ”بڑی آئی ہے۔ جیسے بوٹیاں کھا کھا کر آتا چکی ہو۔“

پھر جب صفیہ پھلوں کی ٹوکری نکال کر انہیں چھانفتی اور گلے سڑے پھل الگ کرتی تو ابا ایللی کو آواز دیتے اور جب وہ ان میں سے کم گلا سڑا کیلا یا سیب ایللی کی طرف بڑھاتے تو صفیہ بول اٹھتی۔

”لو یہ تو ابھی اچھا بھلا ہے۔“ یہ کہہ کر وہ عجیب سی مسکراہٹ، مسکراتی اس مسکراہٹ سے سارا کرا بھر جاتا اور ایللی خود محسوس کرتا جیسے واقعی وہ پھل ابھی اچھا بھلا ہو اور اس قابل نہ ہو کہ کسی کو دیا جائے۔ علی احمد حیرت سے صفیہ کی طرف دیکھتے اور پھر کھیاں ہنسی ہنس کر دوسرے گلے سڑے پھلوں سے چٹاؤ کرنے میں مصروف ہو جاتے۔

اگر کبھی ابا کوئی پھل فرحت کو دیتے تو وہ اسے یوں ایک طرف رکھ دیتی، جیسے وہ کھانے کی چیز ہی نہ ہو۔

بڑا بچی تھی فرحت اور اماں اس کی ان حرکتوں پر خفا ہونے کی بجائے فخر اور مسرت سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی۔ اماں کی اس مسکراہٹ پر ایللی محسوس کرتا جیسے فرحت اور اماں نے چوری چوری آپس میں سمجھوتا کر رکھا ہو۔ اسے غصہ آتا کہ اماں اس سے سمجھوتہ کیوں نہ کرتی تھی۔ اول تو ایللی اپنے حصے کا پھل رکھ دینے کا قائل ہی نہ تھا اور کبھی رکھ دیتا تو اماں بچے جھڑک کر اس کے پیچھے پڑ جاتی۔

”اے اب کھا بھی لے ایسے پڑا رہے گا خراب ہو جائے گا۔“ اماں یہ بات فرحت سے کیوں نہیں کہتی وہ سوچتا۔ وہ ہم سے ایک سا بڑا کیوں نہیں کرتی۔

فرحت کی بات چھوڑے خود صفیہ سے اماں کا برتاؤ عجیب سا تھا۔ صفیہ گردن اٹھا، چھاتی

ابھار ہاجرہ کے سر پر آکھڑی ہوتی۔ ”ہاجرہ یہ کرو وہ کرو اور یہ تو تم نے ابھی تک کیا ہی نہیں اور وہ کام جو میں نے کل تمہیں دیا تھا وہ۔“ صفیہ کی باتیں سنتے ہوئے اماں کی عجیب حالت ہوتی۔ اس کی نگاہیں صفیہ کے چہرے پر لگی ہوتیں۔ جسم میں گویا جان نہ ہوتی۔ نس نس حاضر ہوتی۔ ایللی کو تو شک پڑتا تھا کہ اماں اس پر قریبان ہوئی جا رہی ہے اور اس کے منہ سے نکلے ہوئے ہر لفظ کو یوں اٹھاتی جیسے قرآن شریف کا ورق ہو۔

آصفی محلے والیاں سب یک زبان ہو کر کہا کرتی تھیں۔ ہے ہاجرہ بیچاری تو مظلوم ہے۔ جیسے سوکن کی خدمت کرنی پڑتی ہے۔ لیکن بہن سچ پوچھو تو ہمارے لئے تو گھر والی وہی ہے اور یہ کالے منہ والیاں جو گھر میں آ جاتی ہیں۔ ہمیں ان سے کیا۔

محلے والیاں بکتی تھیں صفیہ کا منہ کالا کہیں تھا۔ الٹا وہ تو سرخ اور سفید تھا نہ صفیہ سوکن تھی۔ نہ اماں مظلوم۔ پھر وہ کیا تھیں اس ابھن کو بھولنے کے لئے ایللی نیچے محلے کے لٹلے میں اتر جاتا۔ اس کا اپنا گھر ایک معمہ تھا۔ وہ مندی والے ہاتھوں ملل کے ابھاروں والی صفیہ۔ سوکن کو محبت بھری نظروں سے دیکھنے والی ہاجرہ۔ سنی بھری بولتی گوگلی فرحت اور بند کمرے میں بیٹھنے کے شوقین علی احمد۔

آصفی محلے کے چوگان میں پہنچ کر وہ اپنے گھر کو بھول جاتا حتیٰ کہ چوگان میں کھیلتے ہوئے اسے ابا کی آواز سنائی دیتی ایللی۔ ایللی۔ ابا کا حقہ بھرنے کے بعد وہ ان کاموں سے بچنے کے لئے احاطہ چھوڑ کر علی پور کے بازاروں یا کھیتوں میں چلا جاتا اور کھیل کھیل کر تھک جاتا تو کسی درخت کے تلے بیٹھ کر سوچنے لگتا۔ ان کا گھر ایسا کیوں ہے۔ ابا ایسے کیوں ہیں۔ صفیہ کون ہے۔ کہاں سے آئی ہے۔

علی پور

علی پور چھوٹا اور بے حد پرانا قصبہ تھا۔ اس کی وضع قطع وہاں رہنے والوں کی نفسیات کی آئینہ دار تھی۔ قصبہ کے ارد گرد چاروں طرف ٹانگ چندری اینٹوں کی فصیل بنی ہوئی تھی۔ جو اب جگہ جگہ سے گری جا رہی تھی۔ جس میں جگہ جگہ بڑے بڑے شکاف پڑ چکے تھے۔ فصیل میں آٹھ دروازے اور دو موریائیں تھیں۔ اس چار دیواری کے باہر گول سڑک بنی ہوئی تھی جو قصبہ کے گرد گھومتی تھی۔ جس کے پرے سرسبز کھیتوں میں یہاں وہاں قدیم باغات

کے شکستہ مکرواضح آثار پھیلے ہوئے تھے۔ کچی پگڑیاں قرب و جوار کے گاؤں کی طرف نکل گئی تھیں۔ جہاں سے علی پور کا شریوں دکھائی دیتا تھا، جیسے قدیم عمارتوں کا ایک ڈھیر ہو۔

شہر کے اندر ٹانگ چندی اینٹوں کی بنی ہوئی سڑکیں گلیاں اور عمارتیں تھیں۔ بازاروں میں تنگ سڑکوں کے ارد گرد دکانوں میں تھیلیاں لٹکتی تھیں۔ مٹی کی ہنڈیاں نیچے اوپر رکھی تھیں۔ حکیم کی دکان میں سیاہ رنگ کی بوتلوں پر رنگ آلود ٹین کے ڈھکنے چڑھے تھے۔ جن پر کھیاں بجنھتا تھیں۔ بازاروں سے تنگ گلیاں گھومتی ہوئی نکل جاتیں۔ جن کے دونوں طرف چھوٹی اینٹوں کی دیواریں استادہ تھیں۔ ان بوسیدہ ریختی دیواروں میں کہیں کہیں اکا دکا کھڑکی کھلتی۔ تنگ و تاریک کھڑکی۔ ان اونچے ترچھے ٹانگ چندی مکانات کو دیکھ کر دل پر ایک بوجھ سا پڑ جاتا۔ دیواروں پر بدرنگ ٹانگ چندی اینٹوں کو دیکھ کر سر میں درد ہونے لگتا۔ طبیعت پر ان جلدی اواسی چھا جاتی۔ یہاں وہاں اندھیری ڈیوڑھیوں سے دیرانی جھانکتی۔ منڈیروں اور چھتوں پر سائے سے حرکت کرتے۔ جیسے بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔ گلیاں گھومتے گھومتے دفعتاً آگے سے بند ہو جاتیں یا گلی کے اختتام پر محلے کا احاطہ شروع ہو جاتا۔ جہاں بچے فرش پر ریختے۔ عورتیں چرخہ کاتنے یا ازار بند بننے میں مصروف نظر آتیں یا کھڑکیوں سے سر نکال کر ایک دوسری سے لڑتیں ہاتھ چلا کر کوسنے دیتیں۔

قدیم شہروں کی طرح علی پور بھی ایک ٹیلے پر آباد تھا۔ جس کے عین وسط میں ٹیلے کی بوٹی تھی۔ جس پر اک مسار شدہ قلعے کے آثار تھے جو شاید کسی زمانے میں شہر کی حفاظت کے لئے بنایا گیا تھا اس اونچے مقام کو جبہ کہتے تھے۔ بٹے کے پاس ہی قصبے کی عالی شان جامع مسجد تھی۔ جس کے قریب بڑا بازار تھا۔ جس میں کپڑے اور غباری کی دکانیں تھیں۔ بڑے ازار کے چاروں طرف گمری تاریک گلیوں کا جال بچھا ہوا تھا اور ان سے پرے شہر کی فصیل دور دروازے اور اس سے پرے گول سرسبز کھیت اور پرانے باغات کے مسار شدہ آثار۔

علی پور کے بازاروں میں لوگ دکانوں پر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے دنیاوی اور مذہبی مسائل پر تبادلہ خیالات کرتے۔ کوئی اس اہم بات پر روشنی ڈالتا کہ شیخ عظمت بیگ کے گھر اولاد کیوں نہیں ہوتی۔ کوئی یہ نقطہ سمجھاتا کہ آصف علی کی بیگم دراصل کس خاندان سے ہے۔ ایک اس امر کی وضاحت کرتا کہ نورے حجام کے پاس وہ کونسا بے نظیر نسخہ ہے جو جنکوں کے سبب سے استعمال کیا جاتا ہے۔ ایک یہ راز فاش کرتا کہ بابو سمیع کے لڑکے اعظم بیگ کی

بیوی کی آنکھیں اتنی شکلم کیوں ہیں۔

نھو تمباکو فروش کی دکان پر چوٹ کا کھیل چلتا۔ بولے حکیم کی دکان پر شریعت سے متعلق مسائل پر گرم گرم بحث ہوتی۔ معراج لنگڑے کی دکان پر ترپ کی بازی کھیلی جاتی اور چاند حلوائی کے تخت پوش پر آنے والے سیاسی دور کا تذکرہ رہتا۔

ہر دکان پر ایک نہ ایک خصوصی قسم کا مجمع لگا رہتا۔ یہ لوگ ہر آنے جانے والے کو غور سے دیکھتے۔ کہاں سے آیا ہے کہاں جا رہا ہے کیوں آیا ہے کس لئے جا رہا ہے اور اس کے گذر جانے کے بعد دیر تک ان تفصیل پر اپنی رائے کا اظہار کرتے رہتے۔ اجنبی کی آمد پر پہلے تو ان کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں اور اس کا احاطہ کر لیتیں پھر اس کا تعاقب کرتیں۔ ایک گروپ کی نگاہوں کی زد سے نکلنے کے بعد وہ دوسرے گروہ کی نگاہوں پر چڑھ جاتا۔ اس کے خدوخال، لباس، انداز، چال، گفتگو اور سرسری حرکات کا مفصل جائزہ لیا جاتا پھر ان جملہ تفصیلات پر اظہار خیال کیا جاتا اور پھر تنقید و تبصرہ کے بعد اس کی شخصیت اور طور اطوار پر آخری فیصلہ سنا دیا جاتا جس کے خلاف اپیل کرنے کی گنجائش نہ ہوتی اور جس کو بدلنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا۔

آصفی محلہ

علی پور کے جنوب مغرب میں ہاتھی دروازے کے قریب بڑی ڈیوڑھی کے عقب میں آصفی محلہ تھا جس میں ایلی کے عزیز و اقربا رہتے تھے۔ بڑی ڈیوڑھی کے پٹ رنگ آلود ہو چکے تھے اور چولیس بے کار۔ ڈیوڑھی کی پیشانی پر دھندلے حروف میں کچھ لکھا ہوا تھا۔ اندر ڈیوڑھی کے پہلو میں آصفیہ مسجد تھی جس کے قریب شاہ ولی کا مزار تھا۔ مزار سے آگے آصفی محلہ تھا۔ چاروں طرف چار منزلہ مکانات استادہ تھے جن کے درمیان ایک وسیع احاطہ تھا۔ جس میں کمیٹی کی ایک خیمہ لال ٹین لگی ہوئی تھی۔ احاطے کے ایک طرف رنگ محل تھا جس کی چونے لگی دیواروں پر رنگ کے نقش و نگار کی بجائے میل جما ہوا تھا۔ دوسری طرف شیش محل تھا جس میں نہ تو کوئی شیشہ لگا ہوا تھا اور نہ بلور دونوں کی وضع قطعی طور پر محل کی سی نہ تھی۔ اس کے باوجود محلے والے انہیں رنگ محل اور شیش محل کہتے تھے۔ شیش محل کے نیچے ایک فراخ نہ خانہ تھا جس میں ایک مسجد اور ایک کنواں تھا۔

اس تہ خانے کے متعلق مختلف قسم کی روایات مشہور تھیں۔ کہا جاتا تھا کہ یہ تہ خانہ بندے کے حملوں سے بچنے کے لئے تعمیر کیا گیا تھا۔ جب سکھ لیرے شہر پر ہلا بولتے تو آصفی محلہ کے مرد عورتیں اور بچے تہ خانے میں پناہ لیتے۔ مسجد میں نماز پڑھتے اپنی سلامتی کی دعائیں مانگتے اور کنوئیں کا ٹھنڈا پانی پی پی کر اللہ کا شکر بجالاتے۔

محلے میں کئی ایک ڈبوڑھیاں اور کمرے ایسے تھے جن میں سورج کی روشنی کبھی داخل نہ ہوئی تھی۔ دوپہر کے وقت بھی محلے والے ہاتھوں سے ٹٹول کر یا دیاسلائی جلا کر ان ڈبوڑھیوں اور کمروں سے گزرا کرتے تھے۔ ان پرانے محلات میں چوٹے کچے کمرے تھے۔ جن کی کھڑکیاں اک زمانے سے بند پڑی تھیں چھبے خیدہ ہو چکے تھے۔ کمروں میں جالے تے ہوئے تھے۔ چھتوں میں چمگادڑیں رہتی تھیں اور خمیدہ دیواروں میں شکاف پڑ چکے تھے۔ ان مکانات میں نت نئے اکشافات ہوتے رہتے تھے۔ کسی اندھیرے کمرے میں کسی بوسیدہ صندوق سے کوئی قلمی مسودہ برآمد ہو جاتا۔ کسی چوٹے گچی دیوار پر کسی پرانے کتبے کا ازسرنو اکشاف ہوتا یا کسی طاق کے اندر ایک مزید چھپے ہوئے طاق کا پتہ چلتا۔ شاید اسی وجہ سے ہر آصفی کے دل میں ایک پرائیویٹ خیال جاگزیں رہتا کہ محلے کے کسی نہ کسی کوٹے میں کیس نہ کیس دبا ہوا خزانہ موجود ہے۔ لیکن ہر آصفی نے اس امید افزا خیال کو دل میں چھپا رکھا تھا۔ وہاں کسی دبے ہوئے خزانے کا ہونا بعید از قیاس نہ تھا کیونکہ سبھی جانتے تھے کہ شہنشاہوں کے زمانے میں جب آصفی برسر اقتدار تھے تو ان کی تنخواہ سرکاری خزانے سے گدھوں پر لد کر آتی تھی۔

پرانے زمانے میں آصفیوں کی عظمت مسلم تھی لیکن اب وہ باتیں محض قصے تھے۔ خوش کن تھے۔ اب آصفی اور ان کے رنگ محل اور شیش محل کے ارد گرد بسنے والے خدنگار اور کمین سب خلط ملط ہو چکے تھے۔ سارے محلے میں صرف چند افراد ایسے تھے جو مکتب سے تحصیل یافتہ تھے۔ اس لئے زیادہ تر آصفیوں کا شغل دوکانداری، مزدوری اور بے کاری پر مشتمل تھا۔ یہ آصفیوں کے انحطاط کا زمانہ تھا، اس لئے وہ اپنی عظمت کا احساس پدرم سلطان بود سے اخذ کرتے تھے۔ گذشتہ جاہ و حشمت کی کہانیاں ان کے نزدیک حال کی تاریخ البالی سے کہیں زیادہ وقعت رکھتی تھیں، جنہیں سنانے میں آصفی محلے کی بوڑھیاں بچل سے کام نہ لیتی تھیں۔

علی احمد

ایلی کے والد علی احمد کا گھر محلے بھر میں بڑے گھرانوں میں گنا جاتا تھا اس کی سب سے بڑی وجہ یہ تھی کہ محلے بھر میں احمد واحد شخص تھے، جنہوں نے چودہ جماعتوں تک تعلیم پائی تھی۔ اگرچہ وہ بی اے کی ڈگری حاصل نہ کر سکے تھے، لیکن اس زمانے میں بی اے فیل ہونا بڑی بات تھی۔ بی۔ اے میں فیل ہونے کے بعد علی احمد کو ایک مقتول اسماعیلی مل گئی تھی اور اس آسامی کی وجہ سے محلے بھر میں ان کی عزت تھی۔

اپنے والد کی طرح علی احمد کی طبیعت میں بھی عاشقانہ چمک کا عنصر تھا۔ لیکن ان کی طبعی رنگین مزاجی اور جرأت مندانہ عاشقانہ عنصر پر حاوی رہتی، جو انہیں آپس بھرنے اور فراق میں تڑپنے کی بجائے جینے کی طرف مائل رکھتی۔ دراصل علی احمد کو افراد کی بجائے زندگی سے عشق تھا۔

علی احمد کا قد درمیانہ تھا بدن چھریا، رنگ سانولا ان کی پیشانی فراخ تھی۔ خدوخال میں کوئی خصوصی جاذبیت نہ تھی مگر اس کے باوجود نہ جانے اس فراخ پیشانی میں ان سادہ سیاہ آنکھوں میں یا جانے کہاں وہ بے نام اثر تھا، جسے محسوس کر کے راہ چلتی عورت اپنے راستے سے ہٹک جاتی۔ اس کے پاؤں آپ ہی آپ ٹھٹھکتے لگتے۔ پلو سر سے سرک کر شانوں پر جا گرتا۔ پھر برقعہ کے پٹ کھلنے اور درز سے ایک بڑی سی چمکیلی آنکھ ظہور ہو جاتی۔

علی احمد کی چال میں ایک خصوصی جاذبیت تھی ان کے شانے کبھی خم سے آشنا نہ ہوئے تھے۔ ان کی چھاتی تتی رہتی نگاہیں ہمیشہ اوپر کو انہی رہتیں۔ وہ دیکھ کر راہ چلنے کے عادی نہ تھے بلکہ انہیں راہ چلنے ہوئے دیکھنے میں دلچسپی تھی۔ علی احمد کے انداز میں ایک وقار تھا۔ ان کی طبیعت میں منساری کے علاوہ ایک رنگینی تھی۔ گفتار میں شوخی اور شرارت تھی اور ان کی نگاہوں میں نصرت اور کامیابی کا پیغام جھلکتا تھا۔

بیویوں کے متعلق علی احمد کے خیالات نہ تو محدود تھے اور نہ رسمی۔ انہیں بیویوں سے یہ گلہ تھا کہ انہیں جلدی ہی عام ہو جانے کی عادت ہوتی ہے۔ چاہے کتنے چاؤ چوٹلوں سے بیاہ کر لاؤ۔ کتنے ہی رکھ رکھاؤ سے رکھو لیکن جلد ہی وہ پلورچی خانے میں بیٹھی آلو چھیل رہی ہو گی یا راکھ بھرے چولے میں پھونکیں مار رہی ہو گی۔ اس طرح چند ہی روز میں وہ

بیوی سے بلورچن بن کر رہ جائے گی۔ بیوی کی اس بری عادت کے خلاف انہیں بہت شکایت تھی۔

والدین نے چھوٹی عمر ہی میں علی احمد کو باجرہ سے بیاہ دیا تھا وہ ابھی جوان ہی تھے کہ ان کے گھر دو بچے بھی ہو گئے۔ بڑی لڑکی فرحت اور چھوٹا ایل۔ ایل کی پیدائش کے کچھ عرصہ بعد علی احمد کے سر سے ان کے دادا اولاد علی کا سایہ اٹھ گیا۔ اس وقت علی احمد نوجوان تھے برسرِ اقتدار تھے اور اپنی پیشانی اور رنگین نگاہوں کے بے نام سحر سے بخوبی واقف تھے۔ ان کے گرد پیش ایک حسین و دلکش دنیا پھیلی ہوئی تھی اور دل میں تسخیر کا بے پناہ جذبہ موجیں مار رہا تھا۔

علی احمد کو باجرہ سے چنداں دلچسپی نہ تھی، اس کی کئی ایک وجوہات تھیں اول تو باجرہ کے نام میں اتنی تقدیس تھی۔ ایسے مقدس نام کی لڑکی سے کوئی شوخ یا رنگین قسم کی حرکت کرنا ممکن ہی نہیں تھا۔ دوسرے اعمال کے لحاظ سے بھی وہ باجرہ ہی تھی۔ اس لئے باجرہ کا نام ہی علی احمد کے رنگین مزاج پر بار تھا۔ جسمانی طور پر بھی وہ چنداں قابل قبول نہ تھی قد چھوٹا بناوٹ میں نزاکت کا عنصر قطعی طور پر مفقود۔

باجرہ ان بیویوں میں سے تھی جو خاوند کی آمد پر تسلیم و رضا کی شدت سے بے جان ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کے برعکس علی احمد کو عمل تسخیر سے عشق تھا اور تسخیر جہی ممکن ہے جب سرکشی کا عنصر غالب دکھائی دے۔ چاہے وہ فریب نظر ہی کیوں نہ ہو جو تسخیر کے جذبے کو ابھارے تسخیر کرنے والے کو مائل بہ عمل کرے اور پھر مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی اہستہ چال، ابھری ہوئی چھائی، فراخ پیشانی اور رنگین تبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر ننھیلے میں ڈان کو ہٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کا رزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلاوے۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ بچہ ٹین کا سپاہی۔ جنگجو سورما۔

جنسی پہلو کے علاوہ علی احمد میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں موجود تھیں۔ ان کی گفتگو میں طنز اور مزاح کی شیرینی تھی۔ لطائف اور روایات کے علاوہ انہیں شجرہ نسب اور دیگر تاریخی واقعات کو بیان کرنے میں بے حد مہارت تھی۔ محفل میں وہ اپنے تاریخی علم کا

اظہار کچھ اس انداز سے کرتے کہ ذرا کوفت نہ ہوتی۔ اس کے علاوہ لکھنے سے تو انہیں عشق تھا عشق۔ اپنا بیشتر وقت وہ لکھنے میں صرف کرتے تھے۔ شاید یہ آمنیوں کی بد قسمتی تھی یا شاید خوش قسمتی ہو کہ ان کی توجہ تصنیف و تالیف کی طرف مائل نہ ہوئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کی یہ قابلیت گھر کا حساب اور پیدائش و موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود ہو کر رہ گئی۔ لیکن نظر انصاف سے دیکھا جائے تو یہ کام بھی ایک بہت بڑی مصروفیت تھا۔ علی احمد کے ڈیک پر بڑے بڑے ضخیم رجسٹر پڑے رہتے تھے۔ جن کے ساتھ المونیم کی تھالی میں ایک دوات اور دو موٹی نبوں کے قلم رکھے رہتے۔ اپنی مخصوص میلی اور پھٹی ہوئی دھوتی پہن کر قبض اتار کر کیمبل یا چٹائی پر اکڑوں بیٹھ کر وہ فرصت کے اوقات میں ان بھاری بھر کم رجسٹروں میں مختلف نوعیت کے اندراج کرنے میں شدت سے مصروف رہا کرتے تھے۔

علی احمد کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔ وہ پیسوں کو احتیاط سے رکھتے تھے اور ہر قسم کے خرچ کو فصول خرچ کے مترادف سمجھتے تھے حتیٰ کہ عورت پر بھی روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے۔ ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں۔ روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ملوی چیز سے کوئی تعلق نہیں۔

نوجوانی ہی میں علی احمد عظیم الشان کامیابیوں سے ہمکنار ہو چکے تھے۔ ابتدائی دور میں چانناں کے التفات نے ان میں خود اعتمادی کی بنا ڈالی تھی۔ پھر صفیہ کی ڈرالمائی شکست نے تو انہیں ہیرو بنا دیا تھا۔

صفیہ

صفیہ شام کوٹ کی ایک بیار تھی۔ اس کے سرخ و سپید چہرے پر عجب وقار تھا۔ اس کا لانا قد کشادہ پیشانی اور اہستہ چال دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے قدرت نے شام کوٹ میں ایک قلوپترہ پیدا کر دی ہو۔ صفیہ کو دیکھ کر علاقہ کا پولیس الیکٹر شاپ الدین اپنے اوسان کھو بیٹھا تھا۔ لیکن پولیس کا افسر اعلیٰ ہونے کے باوجود وہ شام کوٹ کی اس بیار حسینہ کو اپنی جانب متوجہ نہ کر سکا، جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ شاب الدین کے دل میں صفیہ کی آرزو نے

میں اہلی تھا وہ ایک نحیف و زار پہ تھا۔ اکثر بیمار رہتا۔ ہاجرہ کے لئے یہ بھی بہت تھا کہ اس کے پاس فرحت اور اہلی تھے جن کے سارے وہ زندگی بسر کر سکتی۔ اس لئے اس کی تمام تر توجہ اہلی کے علاج معالجے کی طرف مبذول ہو گئی۔ اہلی زندہ رہے۔ اہلی صحت مند ہو جائے، چاہے گھر میں بیسیوں صفائیں آجائیں۔ پڑی اس۔ اپنے نصیب میں بہن۔ مقدر کے خلاف کیا شکوہ۔ ہاجرہ کے آنسو خشک ہو گئے۔ اس کے بالوں اور دھپے سے عطر کی خوشبو آنے کی بجائے ہسپتال کی آویڑیں اور پنساری کے کسر آئل کی بو آنے لگی۔ اس کے خیالات میں اپنے گھر کی بجائے اہلی کا گھر بس گیا۔ جب اہلی جوان ہو گا۔ جب اہلی کی بیوی آئے گی۔ جب اجڑا ہوا گھر پھر سے آباد ہو گا۔ جب لٹا ہوا سماگ لوٹ آئے گا۔ ہاجرہ نے بستر پر پڑے ہوئے بیمار اہلی کی طرف دیکھا اور فرط محبت سے اس کے قریب تر ہو گئی۔ ننھی فرحت حیران کھوئی کھوئی نگاہوں سے ماں کی طرف دیکھنے لگی۔ ہاجرہ فرحت اور اہلی یہ ان کی دنیا تھی۔ ہاجرہ اہلی کی طرف دیکھتی رہی فرحت ہاجرہ کا سارا ڈھونڈتی رہی اور اہلی بے بس نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھا کیا اور ساتھ والے کمرے میں روغنی کجری اور ٹین کا سپاہی محبت کا میدان جنگ گمرانے میں مصروف رہے اور علی احمد کی بوڑھی ماں جائے نماز پر یوں بیٹھی رہی جیسے کچھ نہ سن رہی ہو، کچھ نہ دیکھ رہی ہو۔

انوکھا انتقام

اہلی جے گیا بچپن کی لمبی پہاری کے چنگل میں پڑا وہ آخری سانس لیتا رہا۔ مگر لیتا رہا، اس کی لاغری اور ناتوانی کی وجہ سے بیماری اسے ہلاک نہ کر سکی اور بالآخر چھوڑ گئی۔ وہ رو بہ صحت ہونے لگا۔

ہاجرہ نے اسے رو بہ صحت ہوتے دیکھا تو اس کے دل سے ایک بوجھ اتر گیا۔ اہلی زندہ رہے گا۔ اہلی کی طرف سے مطمئن ہونے کے بعد ایک بار پھر ہاجرہ کی توجہ اپنے لئے ہوئے سماگ کی طرف مبذول ہو گئی۔ خاوند کے لئے جو دلی چھپی محبت اس کے دل میں تھی وہ پھر سے ابھر آئی لیکن اظہار کو کون روک سکتا ہے۔ اصلی روپ میں نہ سہی، کسی سروپ میں نہ سہی۔ ہاجرہ کے دل میں بھڑکتی ہوئی پیار کی آگ نے نفرت کا روپ دھار لیا تاکہ اظہار تو ہو سکے۔ لیکن نفرت جتانے کا بھی کوئی ذریعہ نہ تھا وہ تو خود علی احمد کی محتاج تھی۔ اس کی نفرت

عشق کا رنگ اختیار کر لیا اور عالم مجبوری میں وہ صغیر کو اغوا کرنے پر مجبور ہو گیا۔ چونکہ شباب الدین کے ذرائع وسیع تھے اس لئے وہ صغیر کو لے کر امرتسر پہنچ گیا اور اسے اپنے موروثی مکان کے دیوان خانے میں بٹھا کر خود والدین کی رضا مندی حاصل کرنے کے لئے اندر گیا تاکہ صغیر کے لئے اپنے مکان میں دائمی جگہ پیدا کر سکے۔

علی احمد اسی وقت اتفاق سے اپنے دوست شباب الدین سے ملنے اس کے مکان پر جا پہنچے۔ صغیر کو دیکھ کر وہ جھوسنے لگے۔ صغیر کی بے پروا اور بھرپور جوانی نے ان کی قوت تسخیر کو لٹکایا۔ نہ جانے اس مختصر سے وقفہ میں شباب الدین کے دیوان خانے میں ٹین کے سپاہی نے اس سرخ و سپید ثیار کو کیا جوہر دکھائے کہ شباب الدین کی آمد سے پہلے ہی صغیر علی احمد کی ہو کر رہ گئی اور ایک بچے کی طرح علی احمد کی انگلی پکڑے دیوان خانے سے باہر نکل آئی۔

آصفی محلے میں صغیر کو چھپائے رکھنا مشکل کام نہ تھا اس لئے پولیس کی صغیر کو ڈھونڈ نکالنے کی کوششیں اکارت گئیں اور صغیر چپکے سے علی احمد کی بیوی بن گئی۔

صغیر کے آنے پر محلے میں کافی ہلچل پیدا ہوئی مگر بیچارے محلے والے معمولی احتجاج کرنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتے تھے۔ ہاجرہ اس نئی آمد پر شگفتہ۔ رد کی پٹی لیکن ہاجرہ کی سنتا ہی کون تھا۔ اس کے علاوہ وہ خوب جانتی تھی کہ علی احمد کے گھر میں اس کی حیثیت نوکرانی سے زیادہ نہیں۔ چاہے صغیر آئی یا نہ آئی۔ اس لئے جلد ہی وہ خاموش ہو گئی۔ علی احمد کی والدہ جانتی تھی کہ بیٹا اپنے باپ کی طرح جذباتی واقع ہوا ہے۔ خاوند کے جذبہ محبت کی وجہ سے اس نے عمر بھر رٹا پے میں بسر کی تھی۔ وہ ڈرتی تھی کہ کہیں بیٹا بھی اسی جذبہ کے تحت اسے داغ مفارقت نہ دے جائے، اس لئے وہ بھی چپ چاپ ہو رہی کہ چلو بیٹے کے صدمے کی نسبت دوسری ہو گا گھر میں آنا برا نہیں۔ محلے والے بھی خاموش ہو رہے کیونکہ صدائے احتجاج بلند کرنا تو آسان ہے مگر اسے قائم رکھنا محنت طلب بات ہے۔ انہیں صرف یہ گلہ تھا کہ صغیر شام کوٹ کی ترکھانی تھی۔ ایک ترکھانی کا آئینوں میں آئینا ہونا تکلیف دہ امر تھا مگر اس کا کیا کیا جاتا کہ شریعت اس بات کی اجازت دیتی تھی اور کھلے بندوں شریعت کے خلاف آواز اٹھانا مناسب نہ تھا۔

صغیر کے آنے پر ہاجرہ کی حیثیت محض ایک نوکرانی کی رہ گئی۔ اس وقت ہاجرہ کی گود

بھوکے سو جاتے۔ پھولدار پلنگ پر بیٹھے بیٹھے صفیہ انتظار سے آگاہ کر چلائی۔ ”ہاجرہ جب تک وہ نہ آئیں، تم باورچی خانے سے نہیں جانا سونا نہیں۔“ اور ہاجرہ چوکی پر بیٹھی انتظار کرتی کہ کب علی احمد آئیں اور وہ انہیں کھانا کھلانے سے فارغ ہو کر اپنا چولہا جلائے۔ ایللی اور فرحت کے لئے چاول پکائے۔

علی احمد واپس آتے تو چپکے سے دبے پاؤں اپنے کمرے میں داخل ہو جاتے تاکہ صفیہ کو معلوم نہ ہو کہ وہ اتنی دیر سے لوٹے ہیں۔ لیکن ان کی آہٹ پا کر صفیہ جاگ اٹھتی۔ وہ علی احمد سے بگڑتی۔ علی احمد اسے مناتے لیکن وہ بگڑے چلی جاتی۔ پھر کمرے سے دھینگا مشتی کی آوازیں آنے لگتیں چونکہ معاملے کی نزاکت دیکھ کر ڈان کو بٹے میدان میں آ نکلتا۔ ٹین کا سپاہی اپنے واؤ دکھاتا بلاخر شام کوٹ کا وہ مضبوط مگر حسین قلعہ سر ہو جاتا اور صفیہ کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل جاتی۔ علی احمد خوب جانتے تھے کہ ٹین کا سپاہی اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ لا سکتا ہے اور ہونٹوں پر مسکراہٹ آ جائے تو ٹھیک ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد ہاجرہ کو آواز دی جاتی۔ ہاجرہ کھانا کھلاؤ۔ کھانا کھانے کے بعد ٹین کا سپاہی تازہ دم ہو کر پھر سے میدان کارزار میں شام کوٹ کے قلعے کو لٹکارتا اور ہاجرہ چپکے سے اپنا چولہا جلا کر سوئے ہوئے بچوں کے لئے کھانے پینے کا سامان تیار کرنا شروع کر دیتی۔

پھر صفیہ کو ایک نئی بات سوچھی ایک نیا امتحان۔ ”ہاجرہ“ صفیہ بولی! ”دیکھو تو میری بانہوں میں سونے کے کڑے ہوں تو کیسا رہے۔“ وہ آنکھ پچا کر مسکرائی۔ اسی دن ہاجرہ کی زندگی میں ایک نئی بات پیدا ہو گئی روپیہ بچانا۔ صفیہ کے کڑوں کے لئے روپیہ بچانا۔ صفیہ کے لئے ر۔ تھیں کپڑے میا کرنا۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود ہاجرہ صفیہ کو اپنا نہ سکی۔ صفیہ فرحت اور ایللی کو دیکھ کر خوش نہ ہوتی تھی لہذا اس کی تیوری چڑھ جاتی۔ نگاہیں خشمگین ہو جاتیں کیونکہ اس کے اپنے یہاں کوئی بچہ نہ تھا۔

علی احمد کبھی کبھار حیرانی سے ان دو بچوں کی طرف دیکھتے جیسے ان کے وجود سے پہلی مرتبہ واقف ہو رہے ہوں۔ انہیں یاد آتے کہ وہ ان کے اپنے بچے ہیں اور پھر وہ بچے خواہ مخواہ ان کو اچھے لگتے اور وہ کھانا کھاتے ہوئے آواز دیتے۔ ”ایللی۔ یہاں۔ یہاں آؤ ایللی۔ یہ لوبوٹی۔“ جسے ہاتھ میں پکڑ کر ایللی وہ بے حد مسرور ہوتا اور یوں فخر سے اٹھائے پھرتا جیسے وہ ترفہ ہو۔

یا محبت کو کون خاطر میں لاتا تھا۔ وہ بیچاری کر ہی کیا سکتی تھی اور اظہار تو جیسی اظہار ہوتا ہے جب دوسرے اسے محسوس کریں۔ ہاجرہ نے اسی اظہار محبت یا نفرت کا ایک انوکھا طریقہ ایجاد کر لیا۔ ایسا انوکھا طریقہ جو صرف عورت ہی کو سوجھ سکتا ہے جسے عمل میں لانے کی جرأت صرف عورت ہی کر سکتی ہے۔ اس نے اپنی سوکن صفیہ سے عشق لگا لیا۔ اس لئے کہ اس طرح وہ علی احمد کی حریف بن سکتی تھی اسے رقابت کی آگ میں جلا سکتی تھی۔

نتیجہ یہ ہوا کہ علی احمد کے گھر کی نوکرانی ہاجرہ اب علی احمد کی نوکرانی نہیں تھی بلکہ اس کی حریف تھی۔ وہ صفیہ کی نوکرانی بھی نہ تھی۔ عشاق نوکر نہیں ہوتے۔ اگر صفیہ کے دل میں ہم جنسی کا ذرا سا بھی پہلو ہوتا تو ہاجرہ کی کامیابی یقینی ہو جاتی اور علی احمد ہاجرہ کے وجود کو ماننے پر مجبور ہو جاتے لیکن ایسا ہونا تھا نہ ہوا۔ صفیہ اپنے فطری مردانہ جاہ و جلال کے باوجود اپنی سرشت میں ہم جنسی کا پہلو نہ رکھتی تھی۔ اس لئے ہاجرہ کے اس انوکھے تسلیم و رضا کے جذبے کو دیکھ کر حیران رہ گئی۔ اس کے ہونٹوں پر طنز بھری مسکراہٹ جھلکنے لگی۔ اچھا تو میں آزما دیکھوں۔ اس نے سوچا اور وہ ہاجرہ کو آزمانے کے دلچسپ مشغلے میں کھو گئی۔ ہاجرہ قدم آگے اٹھا چکی تھی اب وہ پیچھے نہ ہٹ سکتی تھی۔ صفیہ کیا کہے گی کہ وہ

اظہار محبت محض ایک دکھلاوا تھا۔ اس خیال سے ہاجرہ کے احساس خودداری پر ٹھیس لگتی تھی اس لئے وہ اندھا دھند اس راہ پر آگے بڑھنے لگی۔ ایک قدم اور شاید اب صفیہ کو یقین آ جائے ایک قدم اور شاید اب صفیہ قائل ہو جائے۔ وہ آگے بڑھتی گئی۔ صفیہ کی جانب قدم اٹھاتی گئی اور فرحت اور ایللی پیچھے رہتے گئے۔ پیچھے رہتے گئے۔ ”صفیہ صفیہ۔“ ہاجرہ کی آواز میں وہ لٹاکر تھی جو صرف احساس شکست ہی پیدا کر سکتا ہے۔ ”صفیہ۔ آزما دیکھو۔ صفیہ۔“ دور ایللی پڑا چارپائی پر رو رہا تھا۔ فرحت گریا کھیلتے کھیلتے آگاہ تھی۔ گھر کے اس چھوٹے سے دیران کمرے میں جو ہاجرہ کے لئے مخصوص تھا۔ فرحت اور ایللی تنہا رہ گئے۔

نرالا امتحان

باورچی خانے میں ہاجرہ صبح و شام صفیہ کی خوشنودی کے لئے مصروف کار رہتی۔ صفیہ پھولدار پلنگ پوش پر بظاہر بے نیاز بیٹھی علی احمد کا انتظار کرتی اور علی احمد گھر سے باہر اپنی قوت تسخیر کے امتحان میں، مصروف رہتے۔ ہاجرہ کے کمرے میں ایللی اور فرحت رو رو کر

بچپن

مندی رنگے ہاتھ

ایلی برا ہوتا جا رہا تھا۔ گرد و پیش کے حالات کو سمجھے بغیر ان سے متاثر ہو رہا تھا۔ پٹنگ پر بیٹھی ہوئی صفیہ اس کی توجہ کا مرکز بنی جا رہی تھی۔ وہ صفیہ جس کے مندی رپے ہاتھ ہر وقت حرکت میں رہتے تھے۔ جس کے ہاتھوں کی میلی زرد انگوٹھیاں گھومتی تھیں۔ جس کی مہین لمبل کی فیض ہر وقت ابھری رہتی تھی۔ وہ صفیہ..... جس کے حکم کو بجالانے کے لئے اس کی ماں ہر وقت کمر بستہ رہتی تھی۔ جس نے ماں کو بچوں سے چھین لیا تھا جس نے اس کے باپ کو اپنے جادو کے زور سے ٹین کے سپاہی میں تبدیل کر رکھا تھا۔ وہ صفیہ، وہ اس صفیہ سے ڈرتا تھا اس کے خونیں ہاتھوں سے ڈرتا تھا۔ اس کے بالوں کے جوڑے سے ڈرتا تھا۔ اس کی مہین فیض سے ڈرتا تھا۔ چوری چوری اس کی طرف دیکھتا اس کی بے نام طاقت کو محسوس کرتا۔ جسم کے بل کھڑے ہو جاتے۔ کانوں کی لویں گرم ہو جاتیں۔ تنفس تیز ہو جاتا پھر اس کی روح کی گمراہیوں سے ایک طوفان اٹھتا۔ صفیہ کے خون سے بھیگے ہوئے ہاتھ اس کی طرف لپکتے۔ زرد میلی انگوٹھیاں گھومتیں۔ اس کا سر چکرانے لگتا طبیعت ہاش کرنے لگتی اور وہ دیوانہ وار بھاگتا۔ دور صفیہ کے کمرے سے دور، ان تمام چیزوں سے جنہیں صفیہ کے خون آلود ہاتھوں نے چھوا ہو۔

صفیہ کو معلوم تھا کہ ایلی مندی والے ہاتھوں سے چڑتا ہے اور انگوٹھیوں سے گھن کھاتا ہے۔ اس لئے وہ جان بوجھ کر ہر کھانے کی چیز کو ہاتھ لگا دیتی تھی اور اسے آواز دیتی: ”ایلی یہ لو

ہاجرہ اس بات کا خاص خیال رکھتی تھی کہ بچے یہ محسوس نہ کریں کہ جو چیزیں علی احمد اور صفیہ کو میسر تھیں، وہ انہیں نصیب نہیں۔ اس لئے وہ انہیں ہر قسم کی تھوڑی تھوڑی چیز منگوا دیا کرتی تھی۔ اگر علی احمد کے لئے پلاؤ تیار ہوتا تو وہ انہیں نمکین چاول پکا دیا کرتی اور کہتی ”لو یہ بہترین قسم کا پلاؤ ہے اور ایلی اور فرحت خوشی خوشی وہ بہترین قسم کا پلاؤ کھاتے۔ لیکن اس کے باوجود جب وہ دیکھتے کہ ان کی ماں گھر میں برتن مانگنے اور صفیہ کا کھانا پکانے میں صبح و شام مصروف رہتی ہے اور صفیہ کو پٹنگ پر بیٹھ کر حکم چلانے کے سوا اور کوئی کام نہیں تو وہ محسوس کرتے کہ ان کی ماں محض نوکرائی ہے اور علی احمد ان کے آقا ہیں۔ لہذا نہیں۔

صفیہ کے آنے پر علی احمد کو وہ آزادی نہ رہی تھی۔ تسخیر کا شوق تو ان کے دل میں جوں کا توں قائم تھا۔ لیکن اس کے مواقع کم ہو چکے تھے۔ دو ایک مرتبہ انہوں نے عورتوں کو گھر بلانے کی کوشش کی تھی لیکن صفیہ اس بات کو برداشت کرنے کے لئے تیار نہ تھی۔ علی احمد کو مجبوراً اپنی اس دلچسپی کو گھر سے باہر تک ہی محدود رکھنا پڑا۔ اب وہ راتیں باہر گزارنے لگے اور آدمی آدمی رات گئے گھر آنے لگے تھے۔ صفیہ نے اس پر صدائے احتجاج بلند کی۔ لیکن علی احمد صدائے احتجاج سے نہ ڈرتے تھے کیونکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ صفیہ کی بڑی سے بڑی صدائے احتجاج کو ٹین کا سپاہی مسکراہٹ میں بدل سکتا ہے۔

مٹھائی۔۔۔ اور پھر مٹھائی کو اپنے ہاتھوں سے اچھی طرح مل کر اسے دیتی۔ اہلی اسے یوں پکڑتا جیسے وہ مٹھائی نہیں بلکہ چوہا ہو اور پھر اپنے کمرے میں آکر غصہ سے کھولتا۔ ”بڑا بد دلغ ہو گیا ہے تو“ صفیہ اسے ڈانٹتی۔ کیا ہے ”مندری رنگے ہاتھ کو۔ یہ دیکھ ایسے اچھے لگتے ہیں۔ مندی لگے ہاتھ۔ دیکھ تو“ وہ اس کے منہ پر ہاتھ مل دیتی اور اہلی آؤ آؤ کرتا بھاگتا اس کی ناک میں مندی کی بو بس جاتی۔ مٹھی مٹھی ننگے پنڈے کی بو، اس کی آنکھوں میں خون اتر آتا گرد و پیش میں انجالی پچکاریاں چلتیں۔ برہنہ صورتیں چاروں طرف سے یورش کرتیں۔ آخ تھو۔ آخ تھو۔

صفیہ نے ایک دن اہلی کو ستانے کا فیصلہ کر لیا۔ جب وہ سو رہا تھا تو اس کے ایک ہاتھ پر مندی مل کر اسے باندھ دیا۔ باہرہ نے فٹیں کیں۔ ”نہ صفیہ اسے کچھ نہ کہہ۔“ صفیہ بولی۔ ”مندری ملنے سے کیا ہوتا ہے۔ خواہ مخواہ کا پا کھنڈ چا رکھا ہے اس لڑکے نے۔ دیکھوں کیا کرے گا۔ اپنا ہاتھ کٹ کر پھینک دے گا کیا۔“ یہ سن کر باہرہ خاموش ہو گئی۔ وہ بیچاری خود مجبور تھی۔ جب اگلے روز اہلی جاگا اپنا مندی رنگا ہاتھ دیکھ کر اس نے سر پیٹ لیا۔ جسم کے بند بند سے مٹھی مٹھی بو آرہی تھی۔ نگاہ میں ہر چیز سرخ دکھائی دے رہی تھی۔ اس روز اسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ ننگا ہو۔ جیسے اس کا جسم غلاط سے لٹھڑا ہوا۔ باہر صحن میں سفید ململ کی باریک کرتی پہنے صفیہ کھڑی بل بناتے ہوئے مسکرا رہی تھی۔ نہ جانے اہلی کو کیا ہوا۔ اس کی نظر میں وہ سفید کرتی سرخ دکھائی دینے لگی۔ سرخ، خونیں سرخ۔ جیسے وہ فیض مندی سے رنگی ہو۔ وہ بھاگا۔ لپکا اور آن کی آن میں صفیہ کی کرتی پر بل پڑا۔ اس کے ناخون سفید ململ میں دھنس گئے۔ فیض کی دھجیاں صحن میں اڑنے لگیں۔ ”مجھے برا ہو لینے دے۔ مجھے دسویں پاس کر لینے دے پھر۔ پھر“ وہ دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ نہ جانے بڑے ہو جانے کو اس ننگے پنڈے کی بو اور مہین فیض سے کیا تعلق تھا نہ جانے دسویں پاس کر لینے کو اس سرخ رنگ سے کیا تعلق تھا۔ مگر وہ اپنی دھن میں سوچے سمجھے بغیر چننا چلاتا رہا ململ کی دھجیوں کو بکھیرتا رہا۔ اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھیں گویا اہل کر باہر نکل آئی تھیں۔ جسم کانپ رہا تھا۔ ”ہاں۔“ وہ چلایا۔ ”بڑا ہو جاؤں پھر۔“ اس کے حلق میں آواز سوکھ گئی۔

صفیہ حیران کھڑی تھی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے۔ پھر اہلی بھاگ گیا۔ گھر سے باہر۔ دیوان خانے سے باہر۔ سکول میں جا کر چھپ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ جرم کا مرتکب ہو

چکا ہو۔ جیسے وہ اپنے اس فعل کی وجہ سے ننگا ہو گیا ہو۔

”ہوں۔ تم یہاں ہو۔“ سارے دن کی تلاش کے بعد علی احمد نے اسے ڈھونڈ نکالا۔ ”چلو گھر چلو۔ چلو“ اور وہ گھر کی طرف چل پڑے۔ گھر پہنچ کر علی احمد نے اس کے کپڑے اتروا دیے۔ فیض پانچامہ جوتے اور اسے گھر سے باہر نکل کر اندر سے دروازے کی کنڈی چڑھا دی۔

گلی ویران پڑی تھی لیکن اہلی محسوس کر رہا تھا جیسے لوگ کھڑکیوں کے پیچھے سے چھپ کر اسے دیکھ رہے تھے۔ منڈیروں کے پیچھے کھڑے ہنس رہے تھے۔ منڈیر پر بیٹھا ہوا کوا شور مچا رہا تھا۔ قہقہے لگا رہا تھا۔ پھر دفعتاً گلی کے ناک چندی اینٹوں کے فرش پر پاؤں کی چاپ گونجی۔ کوئی آ رہا تھا اسے یوں لگا۔ جیسے کسی نے اس کے سر پر ہتھوڑا دے مارا ہو۔ ہتھوڑے کی ضربیں قریب تر ہوئی جا رہی تھیں۔ اہلی دیوار میں منہ دے کر کھڑا ہو گیا۔ چھپانے کے لئے اس نے اپنے منہ پر ہاتھ رکھ لیا۔ مندی کی بو کا رپلا آیا۔ تڑپ کر وہ ٹالی میں گر پڑا، جیسے ناگ نے ڈس لیا ہو۔ بے بسی میں اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

نہ جانے کتنا عرصہ اہلی نے اپنا بایاں ہاتھ بغل میں چھپائے رکھا۔ وہ ایک ہاتھ سے روٹی کھاتا تھا۔ ایک ہاتھ سے منہ دھوتا اور سارے کام اسی ایک ہاتھ سے کرتا تھا۔ جب کبھی مجبوری کی وجہ سے وہ مندی رنگا ہاتھ بغل سے نکالتا تو اسے محسوس ہوتا جیسے ابانے کپڑے اترا کر اسے گلی میں نکل رکھا ہو۔ جہاں وہ ٹالی میں منہ دے کر رو رہا ہو۔

انو کھا باب

اس زمانے میں وہ رہنگ میں رہتے تھے جہاں اس کے ابلا لازم تھے۔ روٹنگ ایک چھوٹا سا شہر تھا۔ گلیاں ویران تھیں۔ دکانوں میں سرخ گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے لٹکے رہتے تھے اور مضبوط ہانہوں والے پست قد قصائی کھانڑیوں سے ان ٹکڑوں کو کاٹنے میں مصروف رہتے۔ موٹی موٹی عورتیں یوں کچر کچر باتیں کرتیں جیسے چارہ کاٹنے کی مشینیں چل رہی ہوں۔ پھر علی احمد سیر کے لئے دلی گئے تو اہلی کو بھی ساتھ لے گئے۔ دلی کو دیکھ کر اہلی دنگ رہ گیا۔ اتنا بڑا شہر دیکھنے کا اسے پہلے کبھی اتفاق نہ ہوا تھا بازاروں کی بھیڑ، دوکانوں کی قطاریں۔ خواہنے والوں کا شور اور تانگوں اور گاڑیوں کا تسلسل دیکھ کر اس کے دل میں نئی بیداریوں نے کروٹ لی۔ دلی میں ماموں شمش علی کا گھر جہاں وہ ٹھہرے تھے، بذات خود اہلی کے لئے اجنبی کی چیز تھی۔ وہاں کی ہر بات

اجمل کے بل

نرالی تھی۔ ہر طریقہ انوکھا تھا۔ اس سے پہلے کسی کے گھر رہنے کا ایلی کو اتفاق نہ ہوا تھا۔ اس لئے اپنے گھر کے علاوہ وہ کسی گھریلو ماحول سے پورے طور پر واقف نہ تھا۔ جشمت علی ابا ہونے کے باوجود ہمیشہ سر جھکا کر چلتے تھے۔ دفتر سے واپسی پر علیحدہ کمرے میں ٹین کے سپاہی کا کھیل کی بجائے اپنے بچوں کے درمیان بیٹھ جاتے۔ ایلی کے لئے یہ ایک اجنبی کی بات تھی۔ اچھا باپ تھا وہ باپ نہ ہوا سنا تھی ہو گیا۔ ایلی سمجھتا تھا کہ باپ وہ ہوتا ہے جو بچوں کے لئے ہمیشہ دور رہے۔ جس کی تیوری چڑھی رہے۔ جس کے انداز میں ایک شمن برتری ہو بے نیازی ہو۔ جو دو انگلیوں میں گوشت کا کلزرا اٹھا کر بیٹے کو آواز دے۔ ”ایلی“

حشمت علی کے چھوٹے بیٹے جمیل کو دیکھ کر ایللی کو اس کی جرأت پر حیرانی ہوتی تھی۔ باپ سے ذرا بھی نہ ڈرتا تھا۔ بات بات پر ماں سے لپٹ جاتا تھا۔ اس کے باوجود اس کے ابا اس کے کپڑے اتروا کر اسے گلی میں نہیں نکالتے تھے۔ جمیل کتنا نڈر اور آزاد تھا۔ وہ دلی کے بازاروں میں اکیلا گھومتا پھرتا تھا۔ ہجوم کو چیرتا ہوا نکل جاتا۔

[illegible]

جہل سے مل کر اسے کئی ایک باتوں کا پتہ چلا۔ عجیب و غریب باتوں کا مثلاً یہ کہ اس کے بڑے بھائی صفدر کو تھپڑ کی ایک پارسی لڑکی سے عشق تھا۔ پارسی لڑکی۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ تھپڑ میں جا کر دیکھے کہ پارسی لڑکی کیسی ہوتی ہے اور اس سے عشق کیسے لگتا ہے، لیکن جلد ہی وہ مہایوں کے مقربے اور قطب صاحب کی لاٹ پر جا پہنچے اور وہ ان عالیشان عمارتوں میں کھو گیا۔ پھر رہنگ میں واپس آنے کے بعد اسے پارسی لڑکی کا خیال آیا اور وہ چوری چوری خواہش کرنے لگا کہ کبھی وہ بھی پارسی لڑکی کو دیکھے لیکن رہنگ میں تو ہر طرف پورنی عورتیں تھیں جو پتھر کوٹنے

میری نظروں سے دور ہو جاؤ۔“

پھر ایک رات کٹ پٹیوں کا تماشا شدت اختیار کر گیا۔ شام کوٹ کے قلعے سے طبل جنگ بجنے لگا اور نین کے سپاہی نے گھبرا کر ہتھیار ڈال دیئے اور بند کمرے پر موت کی سی خاموشی طاری ہو گئی۔ اگلی صبح جو نئی علی احمد بیدار ہوئے تو گھر پر ایک مصیبت ٹوٹ پڑی۔ ”یہ چیز یہاں کیوں رکھی ہے؟ وہ وہاں کیوں گیا ہے؟“ ایلی حیران تھا کہ اس بند کمرے کے سپاہی کو کیا ہوا کہ اپنی سر زمین چھوڑ کر گھر کے ویرانے میں گھومنا شروع کر دیا۔ لیکن جلد حیرت مصیبت میں بدل گئی۔ جب علی احمد نے لکار کر کہا ”تم پڑھتے کیوں نہیں ہر وقت کھیلتا ہے۔ لنڈور۔ ادھر آؤ۔“ اور آخر کار تن اجمل پر آٹوٹی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حجام بلوا کر اجمل اور ایلی دونوں کے بل کٹوا دیئے گئے اور علی احمد فاتحانہ تقہم لگا کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئے۔ اس رات ایلی رضائی میں منہ ڈھانپ کر روتا رہا کہ ابا ہائے اجمل کے بل ہائے اجمل کے بل۔

اس کے بعد علی احمد نے اجمل کے باہر جانے اور شامیں باہر بسر کرنے پر نکتہ چینی شروع کر دی۔ حتیٰ کہ ایک روز اجمل دیر سے گھر آیا تو انہوں نے اجمل کے منہ پر تھپڑ جمادیا ”بڑا بننا ہے تو“ اور اجمل رونے لگا۔ اندر صغیہ مسکرا رہی تھی۔ مسکرائے جا رہی تھی۔ وہ ہاتھ کی انگوٹھیاں گھما رہی تھی اور رضائی میں منہ ڈال کر ایلی نہ جانے کیوں اپنے آپ سے کہہ رہا تھا ”میں بڑا ہوں۔ میں دسویں پاس کر لوں۔“

اگلے روز اجمل مدرسے سے واپس نہ آیا شام کے وقت ایک آدمی ایک رقعہ لایا۔ لکھا تھا ”میں گھر جا رہا ہوں۔ میرا انتظار نہ کریں۔ اجمل کے جانے کے بعد ایلی اکیلا رہ گیا۔ اگر انہی دنوں ابا کا جالہ دورا ہے نہ ہو جاتا تو ایلی کے لئے وقت کاٹنا مشکل ہو جاتا۔ بہر حال وہ رہنگ چھوڑ کر دورا ہے چلے گئے۔“

اس نئے شہر میں ان کے مکان کے سامنے ایک گندہ ٹالہ بتاتا تھا جس کے ارد گرد بچے کھیلا کرتے تھے۔ ایلی کے لئے یہ ٹالہ ایک بہت بڑی نعمت تھی جہاں کھیل کر وہ ابا کی بے بسی اور صغیہ کے غلیظ ہاتھوں کو بھول سکتا تھا۔

خانم

ایک روز جب وہ گندے ٹالے کے قریب کھیل رہا تھا تو اس کے ابا باہر نکلے۔ ایلی انہیں

دیکھ کر سہم گیا۔ علی احمد رک گئے چاروں طرف دیکھا اور پھر ایلی کو اشارہ کر کے بلایا۔ وہ ڈر گیا نہ جانے ابا اسے کیوں بلا رہے تھے۔ اس سے پہلے تو انہوں نے اسے یوں کبھی بلایا نہ تھا یا تو وہ خاموشی سے پاس سے گزر جایا کرتے تھے اور یا اسے دیکھ کر کہتے ”تو یہاں کھیل رہا ہے۔ دوڑ گھر جانا لائق سارا سارا دن کھیلتا رہتا ہے۔“ اور ایلی چپکے سے دوڑ کر گھر میں جا چھپتا۔ اس روز ان کے بلانے پر ایلی ڈرتا ہوا پاس آیا۔ اس کا خیال تھا کہ پاس بلا کر ابا گھوڑیں گے اور اسے گھر جانے کو کہیں گے۔ لیکن ایلی قریب آیا تو وہ بولے ”ادھر آ۔ ادھر آ۔“ اسے اپنی آنکھوں اور کانوں پر اعتبار نہ آتا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ضرور کوئی غلطی ہو گئی ہے شاید اس نے ان کا اشارہ غلط سمجھا ہو لیکن پھر وہ چپ چاپ آگے آگے کیوں چل پڑے تھے۔ پھر اسے خیال آیا شاید وہ اسے گھر کے لئے کوئی چیز خرید کر دینے کے لئے ساتھ لے جا رہے تھے۔ بہر حال ساری بات عجیب سی تھی۔ ایلی ان کے پیچھے خاموشی سے چلنے لگا بازار آیا اور ختم بھی ہو گیا لیکن خاموش چلتے گئے۔

بازار کے اختتام پر علی احمد ایک گلی میں گھوم گئے اور دیر تک پر بیچ گلیوں میں چلتے رہے۔ حتیٰ کہ گلیاں بھی ختم ہو گئیں اور وہ شہر کے باہر کالی سڑک پر جا پہنچے۔ سڑک کے دوسرے سرے پر وہ اس مختصر سی آبادی میں جا داخل ہوئے جو ریل کے پل کے پار تھی اور از سر نو گلیوں میں جا گھسے جہاں چھوٹے چھوٹے گھروندے بنے ہوئے تھے۔ بالا خروہ ایک دروازے پر رے جہاں علی احمد نے دروازے پر دستک دی کچھ دیر کے بعد دروازے کی درز میں ایک موٹی سی اتنی بڑی کالی آنکھ دکھائی دی ”خانم“ علی احمد نے آہستہ سے کہا۔ اندر سے گویا چاندی کی گھنٹیاں بجنے کی آواز سنائی دی۔ دروازہ کھلا اور ایک سرخ و سفید چہرہ ظہور ہو کر چاروں طرف چھا گیا۔

خانم کو دیکھ کر ایلی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔ چوڑے گورے چٹے چہرے پر دو موٹی موٹی کالی آنکھیں مسکرا رہی تھیں ”آؤ بیٹو۔“ اس نے چارپائی کھینچ کر کہا ”بیٹھ جاؤ۔“ علی احمد نے ایلی کو حکم دیا اور وہ خود بے تکلف چارپائی پر لیٹ گئے ”حقہ بھرتا ذرا خانم“ علی احمد نے یوں کہا جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو۔ خانم نے جلدی سے چلم میں دو کوئلے ڈالے اور پھر علی احمد کے پاس بیٹھ کر ان سے بے تکلف باتیں کرنے لگی۔ جلد ہی وہ دونوں ایلی کے وجود سے بے خبر ہو کر ایک دوسرے میں کھو گئے۔ ایلی حیران تھا کہ خانم کون ہے اور اس کا منہ اتنا چوڑا اور سرخ و سفید کیوں ہے اور اس کی آنکھیں اتنی شوخ کیوں ہیں اور زعب بھرے چہرے کے باوجود اس قدر مسکراتی کیوں ہے

خانم کے گھر کی طرف اڑ لیتا اور پھر خانم کا چٹا سفید ہاتھ پیار سے اس کے منہ کو چھکتا اور اس کے ہونٹ سلاتا وہ مٹی کا گھروند اس کی آنکھوں تلے کانپتا اور اس کے دل میں کچھ کچھ ہوتا نہ جانے کیا ہوتا۔

پھر ایک روز خانم ان کے اپنے گھر آگئی۔ ایللی نے اسے دیکھا اور حیران رہ گیا۔ خانم نے راز دارانہ نگاہ ایللی پر ڈالی۔ اندر سے ابا بھاگے بھاگے باہر آئے۔ ”صفیہ یہ استانی ہیں۔ اسلامیہ سکول کی بڑی استانی تم سے ملنے آئی ہیں۔ بیٹھ جاؤ۔ استانی صاحبہ۔ ایللی ان کے لئے کچھ لاؤنا بھی۔ اتنی دور سے آئی ہیں۔ کتنی دور ہے آپ کا سکول، ہاں آٹھ کوس مجھے یاد آگیا اور نام کیا ہے۔ سلاں والی نہیں نہیں۔ سیل آبلو ٹھیک“ اور علی احمد کو دیکھ کر خانم نے اتنا بڑا گھونٹ نکال لیا اور ان کی طرف پینہ کر کے بیٹھ گئی۔ پھر وہ ایللی کی طرف دیکھ کر راز دارانہ انداز سے مسکرانے لگی۔ لیکن وہ ابا سے پردہ کیوں کر رہی تھی؟ اس نے گھونٹ کیوں نکال رکھا تھا کیا وہ استانی تھی؟ لیکن وہ تو وہیں رہتی تھی۔ شرمیں، پھر ابا کیوں کہہ رہے تھے کہ وہ سیل آباد سے آئی ہے ایللی کی سمجھ میں خاک بھی نہ آیا۔ مگر وہ محسوس کر رہا تھا کہ خانم عجیب سی نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جیسے اسے بلا رہی ہو جیسے ہاتھ کی بجائے نگاہوں سے اسے تھپک رہی ہو۔

”نہیں۔ نہیں۔“ علی احمد کہہ رہے تھے ”اگر آپ کو میرا یہاں آنا ناگوار ہے تو میں باہر چلا جاتا ہوں۔ ہاں ہاں اچھا تو آپ کے سکول میں کتنی لڑکیاں تعلیم پاتی ہیں؟ آپ کے سکول کا بڑا چرچا ہے۔“ خانم مسکرائے جارہی تھی۔ مسکرائے جارہی تھی۔ صفیہ گھور گھور کر اس کی طرف دیکھ رہی تھی اور باہر اندر سبز رنگ کی میٹھی بوتلیں کھولنے میں مصروف تھی تاکہ سیل آباد کی استانی کی تواضع کی جاسکے۔

تین بچے

اس روز ایللی کو ایک عجیب سا احساس ہو رہا تھا۔ جیسے وہ تین بچے عجیب و غریب کھیل کھیل رہے ہوں۔ علی احمد، خانم اور ایللی۔ ابا تو یوں سنجیدگی سے باتیں کئے جارہے تھے۔ جیسے وہ علی احمد ہی نہ ہوں۔ مگر ان کی آنکھوں کی چمک ان کے سروپ کی چٹکی کھا رہی تھی اور خانم یوں لپٹی ہوئی بیٹھی تھی، جیسے واقعی ہی علی احمد اس کے لئے ایک بیگانہ شخص ہوں۔ لیکن وہ ہر بار ایللی

اور اس کی طرف دیکھنے کو جی کیوں چاہتا ہے۔ وہ اس بات پر بھی حیران تھا کہ ابا وہاں یوں لیٹ کر حقہ پی رہے ہیں۔ جیسے وہ ان کا اپنا گھر ہو اور خانم یوں ان کے پاس بیٹھی تھی جیسے صفیہ گھر میں ان کے پاس بیٹھا کرتی تھی۔ صفیہ اور خانم کا کوئی مقابلہ بھی تو نہ تھا اگرچہ صفیہ کا رنگ بھی کافی سفید تھا۔ اس کے چہرے سے بھی رعب برستا تھا۔ لیکن صفیہ کے ہاتھ پر تو ہر وقت شکن پڑی رہتی تھی۔ اس کے برعکس خانم مسکرائے جارہی تھی۔ وہ ایللی کو دیکھ کر ویسے ہی مسکراتی تھی۔ جیسے علی احمد کو دیکھ کر جیسے ان دونوں میں کوئی فرق ہی نہ ہو۔ صفیہ تو صرف علی احمد کی طرف دیکھ کر مسکرایا کرتی تھی۔ سب سے بڑی بات یہ تھی کہ خانم کے ہاتھ مندی رنگے نہ تھے۔ کتنے صاف ستھرے ہاتھ تھے اور انگلیوں میں انگوٹھیاں بھی تو نہ تھیں۔

وہ باتیں کرنے میں مشغول تھے کہ اندر کوئی بچہ رونے لگا۔ بچے کے رونے کی آواز سن کر ایللی گھبرا گیا نہ جانے کہاں سے ایک شخص میلی سی چادر میں لپٹا ہوا آمو جوہ ہوا ”دیکھ تو سراب رو رہا ہے۔“ خانم بولی اور پھر علی احمد سے باتوں میں مشغول ہو گئی اور وہ چادر میں لپٹا ہوا عورت نما شخص اندر جا کر بچے کو تھپکنے لگا۔ نہ جانے وہ شخص کون تھا۔ نوکر تو نہیں معلوم ہوتا تھا وہ خانم کا خاوند بھی نہیں ہو سکتا تھا۔ پھر کون تھا وہ۔ ایللی کے لئے وہ مکان ایک راز محسوس ہونے لگا وہ بے تکلف مسکرانے والی عورت۔ وہ عورت نما مرد اور وہ روتا بچہ۔

”اچھا تو یہ لڑکا ہے۔“ خانم نے اپنے ہاتھ سے ایللی کے منہ کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اس کی اس تھپک میں کتنا پیار تھا۔ ایللی کے جسم میں ایک جھرجھری سی ناچنے لگی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ خانم کا ہاتھ اسے تھپکتا رہے اور وہ بڑی بڑی کالی آنکھیں دیے ہی مسکاتی رہیں اور اس کے سامنے وہ بڑا سا سرخ و سپید چرو پونہی معلق رہے اور وہ ابا کے ساتھ ہمیشہ وہیں اس مٹی کے گھروندے میں رہے اور اور۔

اس کے بعد گندے نالے کے پاس کھیلتے ہوئے وہ چوری چوری دعائیں مانگتا کہ ابا گھر سے نکل کر اسے اشارہ کریں۔ ایللی اور آؤ ہمارے ساتھ چلو وہ اسی طرح خانم کے گھر جائے اور اس دروازے۔ خانم کی سیاہ آنکھ انہیں دیکھے اور بلا سخر اس کا ہاتھ اسے تھپکے۔ کبھی کبھی اس کی خواہش پوری ہو جاتی۔ ابا باہر نکل کر انگلی کے اشارے سے بلاتے اور پھر کہتے ”اس مکان میں جہاں تم اس روز گئے تھے۔ تمہیں یاد ہے نا وہاں جاؤ اور خانم کو یہ دے آؤ۔“ اور وہ چپکے سے ایک گٹھڑی سی اس کی بغل میں تھما دیتے۔ ”کسی سے کتنا نہیں سمجھے۔“ وہ زیر لب کہتے اور ایللی

کی طرف دیکھ کر یوں آنکھ چمکاتی کہ اسے اس انوکھے کھیل کا لطف آجاتا اور اس کا جی چاہتا کہ وہ کھیل ہمیشہ کے لئے جاری رہے۔ اور خانم اس کی طرف دیکھ مسکاتی رہے ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ قہقہہ مار کر ہنس دے۔

پھر جلد ہی چند ایک ماہ کے اندر اس استانی کا راز کھل گیا جو سیل آباد کے سکول میں پڑھاتی تھی اور علی احمد سے گھونٹ نکالنے میں احتیاط سے کام لیتی تھی اور صفیہ کا منہ غصے سے لال ہو گیا اور اس کی آواز سارے محلے میں گونجنے لگی۔ حالات بگڑتے دیکھ کر علی احمد تو گھر سے باہر چلے گئے اور جان بوجھ کر دیر سے آئے۔ حقیقت یہ تھی کہ روز بروز علی احمد کی طبیعت صفیہ سے ہٹی جا رہی تھی اور صفیہ کو خود اس کا احساس ہوتا جا رہا تھا کہ اس کا اثر ختم ہو چکا ہے۔ اپنے اثر کو قائم رکھنے کے لئے اس نے از سرنو ہاتھوں پر مندی لگائی۔ باریک ریشمیں قیص پھنی، سیاہ کناری والے دوپٹے اوڑھے لیکن ان کو ششوں کے باوجود اس کا رنگ زرد پڑتا گیا اس کی آواز مرجھا گئی۔ یہ محسوس کر کے صفیہ نے نئے پہلو سے اپنی اہمیت کا احساس اخذ کرنے کی کوششیں کیں۔ علی احمد نہیں تو نہ سہی باہرہ جو ہے جس پر وہ حکومت کر سکتی تھی۔

علی احمد مزاج کے بہت شکستہ واقع ہوئے تھے۔ وہ صفیہ کے غصے کو دیکھ کر چوری چوری مسکراتے اور پھر سنجیدگی سے ان بگڑے ہوئے حالات پر بات کرنے کی بجائے جھٹ ٹین کا سپاہی بن جاتے۔ اس پر صفیہ چڑ جاتی اور بے بسی اور غصہ میں ہاتھ چلاتی لیکن ٹین کا سپاہی ہنسے جاتا لڑے جاتا حتیٰ کہ صفیہ کا غصہ ختم ہو جاتا اور وہ مسکرانے لگتی اور ٹین کا سپاہی فاتحانہ طور پر قہقہہ لگاتا اور سب ٹھیک ہو جاتا۔ لیکن اس کے باوجود اب سب ٹھیک نہ ہوتا تھا۔ صفیہ کے دل کی پھانس نہ نکلتی تھی اور اس کا رنگ روز بروز زرد ہوتا جا رہا تھا۔ خانم روز آمو جود ہوتی تھی اس کی موجودگی سے صفیہ کا رنگ اور بھی پیکا پڑ جاتا اور گھر میں خانم کے قہقہے گونجتے اور اس کی کالی آنکھیں مسکاتیں اور علی احمد دبی دبی خوشی سے بے تاب ہو کر جھومتے اور چلاتے ”ایللی اب تم ذرا سراب کو کھلاؤ باہر جا کر کھلاؤ اسے۔ اسے باجناؤ۔“ اور ایللی بڑی مسرت سے سراب کو اٹھا لیتا اور خانم کے چیمیز دینے والے ہاتھ ایللی کے منہ کو تھپکتے اور اس کا جسم جھنجھنے کی طرح بچتا اور رگ دپے پر پیر ہوٹیاں سی چلتیں اور خوشی سے اس کے پاؤں زمین پر نہ نکلتے اور وہ محسوس کرتا جیسے ہوا میں اڑا جا رہا ہو۔ خانم کی نگاہیں علی احمد کو جھنجھناتیں اور علی احمد فرط اس سے یا نہ جانے کیوں صحن میں ادھر ادھر گھومنے نکلتے اور صفیہ ہزار ہو کر پٹنگ پر جا بیٹھتی اور منہ دیوار

کی طرف موڑ لیتی۔

خانم کے آنے سے صفیہ ایللی سے اور بھی چڑنے لگی ”ہوں تو تو ابا کے پیغام لے کر جاتا ہے شرم نہیں آتی۔“ اور شرم آنے کی بجائے ایللی کی ایڑیاں اونچی ہو جاتیں اور اس کی چھاتی تن جاتی اور وہ ابا سے گہرے تعلقات رکھنے کے خیال سے فخر محسوس کرتا۔

ابا اب تقریباً ہر روز کھانا کھاتے ہوئے اسے آواز دیتے ”ایللی“ اور پھر دو انگلیوں میں لٹکتا ہوا گوشت کا ٹکڑا اس کے ہاتھ میں تھما دیتے۔ اب وہ اسے مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پکڑتا تھا بلکہ یوں لٹکائے چلا جاتا جیسے وہ کوئی تمنہ ہو اور پھر روٹی پر رکھ کر اسے یوں کھاتا کہ فرحت دیکھ لے تو جل کر راکھ ہو جائے۔

صفیہ اب عام طور پر چپ چاپ ایللی پڑی رہتی اور تمنائی میں کھانستی رہتی تھی۔ ادھر علی احمد کے کمرے میں خانم کے قہقہے گونجتے۔ سراب کو ہلانے کے لئے ایللی گراموفون پر پرانے ریکارڈ لگاتا اور خانم کی سریلی آواز کے ساتھ ساتھ موسیقی کا ساز چھڑ جاتا ادھر باورچی خانے میں باجرہ خانم کے لئے چائے بنانے میں مصروف رہتی۔ پھر دفعتاً علی احمد چلاتے ”ایللی سراب کو باہر لے جاؤ۔ وہاں بمل جائے گا۔“ سراب کو اٹھا کر ایللی باہر نکل آتا اندر خانم کی سریلی سروں پر ٹین کا سپاہی رزمیہ انداز سے رقص کرتا اور ایللی کا جی چاہتا کہ وہ چھپ چھپ کر اس رقص کو دیکھے۔ بیچاری صفیہ کا بیشتر وقت اب تمنائی میں گزرتا تھا۔ اکیلے بیٹھے بیٹھے خاموشی سے آکٹا کر یا تو وہ باجرہ کو کوستی رہتی یا کھانستی رہتی۔

باجرہ نے کئی ایک بار ایللی کو بتایا تھا کہ صفیہ بیمار ہے اسے سل کا عارضہ ہو گیا ہے مگر ایللی کو اعتبار نہ آتا تھا۔ صفیہ بیماری یا کسی اور درد سے عاجز آجائے ایللی اس کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھا۔ یہ کیسے ممکن ہو سکتا ہے کہ صفیہ کو کوئی عارضہ ہو جائے۔ اونہوں۔ یہ تو محض تمنائی کی وجہ سے تھا ابا جو باہر رہتے تھے اور پھر خانم جو آجاتی تھی وہاں

خانم آتی تو گھر میں ایک شور مچ جاتا۔ خانم کتنا شور مچاتی تھی۔ اس کا ایللی کو مسکا کر دیکھنا نگاہ سے ایللی کا منہ سلانا اور اس کے منہ کو ”جھنجھنے کی طرح بجانا۔ اب ایللی کو معلوم ہو چکا تھا کہ خانم استانی نہ تھیں یہ جان کر اسے بہت دکھ ہوا تھا اگر وہ استانی ہوتی تو خوب رہتا۔ وہ دل ہی دل میں سوچتا تھا نہ جانے استانی کیسی ہوتی ہو گی وہ تو فر فر انگریزی بولتی ہو گی اور پھر اونچی ایڑی کی جوتی پہن کر ٹپ ٹپ ہو گی بالکل جیسے بازاروں میں میسین چلتی ہیں۔

استانی

پھر ایک روز علی احمد دورے پر جانے لگے تو انہوں نے ایللی کو پاس بلایا ”چلو ایللی“ وہ بولے۔ ”تمہیں ساتھ لئے چلتے ہیں۔“ ایللی گھبرا گیا نہ جانے علی احمد اسے کہاں لے جائیں گے۔ ہاجرہ نے یہ بات تعجب سے سنی اور صفیہ نے ناک چڑھائی۔ ”نہیں نہیں گھبرانے کی کیا بات ہے۔“ علی احمد بولے ”وہاں سکول کی استانی ایللی کا خیال رکھے گی۔“ استانی ایللی اٹھ کر بیٹھ گیا۔

جب وہ ابا کے ساتھ نانکہ میں بیٹھا تو خانم کا ہاتھ لگے بغیر ہی اس کے گل جھنجھنے کی طرح بج رہے تھے اور دل دھک دھک کر رہا تھا۔ استانی۔ استانی اس محلے کی چکی خوشی سے جج رہی تھی۔ نانکہ میں بیٹھے ہوئے وہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ لیکن اسے کچھ دکھائی نہ دے رہا تھا وہ کھیت وہ سڑک وہ پیرسب دھندلائے ہوئے تھے دور افت پر۔ ٹیلوں کے پیچھے سے ایک حسینہ جھانک رہی تھی۔ جب وہ منزل پر پہنچے تو انہیں ایک صاف ستھرے کمرے میں بٹھا دیا گیا اور پھر انکی تواضع کے لئے دودھ کی ایک بھری ہوئی گاگر آگئی۔ اتنا سارا دودھ اور سکول میں اس کے اپنے مدرسے میں تو دودھ دیکھنے میں نہیں آیا تھا کبھی البتہ خوانچے والے مدرسے کے باہر پڑ اور پکوڑے بیچا کرتے تھے دودھ تو نہیں بیچتے تھے وہ شاید زنانہ مدرسوں میں دودھ بکتا ہو۔ ہر صورت وہ حیران تھا وہ اونچے لمبے گلاس رکھ کر نوکر چلا گیا۔ پلنگ پر علی احمد تکیہ لگائے حقہ پی رہے تھے۔ جیسے وہ خانم کے گھریا کرتے تھے۔ ایللی نے ان کی طرف دیکھا اور اسے محسوس ہوا کہ کچھ ہونے والا ہے۔

”سلام و علیکم“ عورت کی آواز سن کر ایللی چونکا۔ اس نے مڑ کر دیکھا پیچھے لٹکے ہوئے پردے سے ایک حنائی ہاتھ نکل آیا ”بچے کو اندر بھیج دیجئے۔ کیسے اچھے تو ہیں آپ؟“ شکر ہے۔ ”ایللی“ علی احمد بولے۔ اندر جاؤ استانی جی بلا رہی ہیں تمہیں۔“ ایللی ہچکچاتا رہا لیکن علی احمد کی نگاہ میں سنجیدگی کی جھلک تھی ”آؤ تاہنا۔“ اندر سے آواز آئی اور ایللی جھجکا ہچکچاتا ہوا اندر چلا گیا۔ ارے استانی کی طرف دیکھ کر وہ بھونچا رہ گیا۔ اس کا رنگ کالا تھا۔ جسم بھدا اور منہ پر ہنزاری چھائی ہوئی تھی۔

ایللی کے تخیل میں تو استانی نہ جانے کیا تھی۔ وہ سمجھتا تھا کہ استانی خانم سے کہیں زیادہ

خوبصورت اور رنگین ہوگی اس کی آنکھوں میں شہرت چمک رہی ہوگی اور مڑگیاں اشاروں سے لدی ہوں گی اور اس کے ہاتھ خانم کے ہاتھوں سے زیادہ بے تکلف ہوں گے جو اسے جھنجھٹائیں گے۔ اس استانی کے چہرہ پر تو نحوست چھائی ہوئی تھی۔ اس کی حرکات بے حد بھدی تھیں اور پھر شلوار کی جگہ چادر باندھ رکھی تھی۔ عورت اور چادر۔ لاجول ولا قوت۔ ایللی کے دل میں نفرت کھولنے لگی۔ یہ کیسی استانی کے ہاں لے آئے تھے۔ ابا شاید وہ غلطی سے وہاں آ گئے ہوں۔ لیکن اس معاملے میں ابا غلطی نہیں کر سکتے تھے اور اب بھی وہ چارپائی پر مطمئن اور متوقع انداز سے لیٹے ہوئے تھے۔ ایللی حیران تھا۔

استانی کی نگاہیں علی احمد پر پکی ہوئی تھیں۔ جیسے انہیں جانچ رہی ہوں تول رہی ہوں۔ تو یہ تھیں استانی، ہیڈ معلم ”یہ لو مٹھائی۔“ اس نے ایللی کے سامنے مٹھائی کی تھالی رکھ دی اور خود پھر سے پردے کے پیچھے آکھڑی ہوئی وہ پھر سے علی احمد سے باتیں کرنے لگی ”ثمیم تو ان دنوں کشمیر میں ہے وہ وہیں رہتی ہے کیوں نہ رہے لڑکی کے کھانے پینے کے دن ہیں اور پھر وہ تو کشمیر کے میوؤں پر پلی ہوئی ہے۔ یہ سرخ چہرہ اللہ جھوٹ نہ بلائے کوئی جوانی آئی ہے لڑکی پر! آنکھیں پھنپتی ہیں دیکھ کر اور پھر اوپر سے دسویں پاس۔“

”اچھا دسویں بھی کر لی ہے؟“ علی احمد نے قہقہہ مار کر پوچھا۔

”پچھلے سال جو کی تھی میں نے بتایا تو تھا۔“

”اچھا“ علی احمد بولے ”لیکن تم بھی تو آج تک باتیں ہی کرتی رہی ہو کبھی ملایا تو نہیں ثمیم سے۔“

”ہے بچی ہے ابھی۔“ استانی نے ذرا تنک کر جواب دیا ”عمر ہی کیا ہے اس کی افسروں کے سامنے کہاں آتی ہے۔“

”بیگم ادر دیکھو۔“ علی احمد بولے ”ہم کیا غیر ہیں؟“

”نہیں غیر تو نہیں۔“ وہ بولی ”پھر بھی جب تک بات طے نہ ہو جائے“ ”بھئی واہ۔“ وہ ہنسنے لگے ”کیا کوئی کسریاتی ہے۔ بات طے ہی سمجھو۔“ نہ جانے وہ کس کی باتیں کر رہے تھے۔ ثمیم کون تھی وہ کشمیر میں کیوں پل رہی تھی۔ اس کی طرف دیکھ کر آنکھیں کیوں پھنپتی تھیں اور وہ بات کیا تھی جسے طے سمجھا جا رہا تھا۔ ایللی ان کی باتوں سے اکتا گیا اور مٹھائی کی طرف متوجہ ہو گیا۔ استانی سے تو مٹھائی ہی کیس اچھی تھی۔

دور سے واپسی پر علی احمد نے گھر میں داخل ہونے سے پہلے کہا ”دیکھو ایللی گھر میں کوئی بات کرنے کی ضرورت نہیں۔“ اس نے باپ کی طرف دیکھا اور بات سمجھے بغیر ہی اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر وہ سوچتا رہا کہ نہ کرنے کی بات ہی کوئی تھی۔ کوئی بھی تو نہیں وہ تو وہاں دودھ پینے کے علاوہ مٹھائی کھاتا رہا تھا اور وہ شیم کی باتیں کرتے رہے تھے اور پردہ ہوا سے اڑتا رہا تھا۔ ہائیں! دفتنا! اسے خیال آیا۔ استانی نے تو شلوار کی جگہ چادر باندھی ہوئی تھی۔ جیسے جات باندھتے ہیں رنگدار چادر، ساڑھی نہیں، رنگدار چادر اور قمیص، آخر استانی نے چادر کیوں باندھی ہوئی تھی۔ شاید ابا کا بات نہ کرنے سے یہی مطلب ہو گا کہ گھر والوں کو پتہ نہ چلے کہ استانیاں شلوار پہننے کی بجائے چادر باندھتی ہیں۔ لیکن وہ شیم کون تھی۔ جو کشمیر کے پھلوں پر ہل رہی تھی اور جس پر جوانی ٹوٹ کر آ رہی تھی۔ شاید علی احمد شیم کی بات کو چھپانا چاہتے تھے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ بہر حال اس پر استانی کی حقیقت تو کھل چکی تھی۔ استانی سے مایوس ہو کر وہ ایک دفعہ پھر خانم کی طرف متوجہ ہو گیا لیکن جلد ہی خانم کا قرب بھی اس سے چھین لیا گیا اور علی احمد نے کسی وجہ سے انہیں علی پور بھیجنے کا فیصلہ کر لیا۔ اور ہاجرہ فرحت اوم ایللی علی پور آگئے۔

چوگان اور پیڑے

پہلی مرتبہ محلہ میں آکر اس نے واضح طور پر محسوس کیا کہ محلے والے اسے علی احمد کا وارث سمجھتے ہیں اور اس کی ماں کو گھر کا نوکر نہیں سمجھتے اور پٹنگ پر بیٹھنے والی صفیہ کو گھر کی مالک نہیں مانتے ”تم آگئے بیٹا۔“ چچی جان نے اسے دیکھ کر پیار سے سر پر ہاتھ پھیرا ”اچھا ہوا تم آگئے۔ تمہیں کیا ضرورت ہے کہ جگہ جگہ علی احمد کے ساتھ جوتے چٹکاو۔ تم اپنے گھر میں رہو۔ یہ گھر تمہارا ہی ہے۔ جو تم ہو وہ کوئی دوسرا نہیں ہو سکتا اور وہ صفیہ کالے منہ والی چڑیل اسے کون جانتا ہے اچھا کھیلو بیٹا کھیلو۔“

بوڑھی جانیں چلائی ”خدا کا شکر ہے۔ میرا بیٹا ایللی گھر آیا۔ جانے دو علی احمد کو درد کی خاک چھانٹتے تم کیا اس کے نوکر ہو جو اس کی چاکری کرتے پھرتے ہو۔ تم اللہ کے فضل سے اس گھر کا چاند ہو۔“

”آگئی تو ہاجرہ۔“ برکتے بولی۔ ”سوار آؤ تمہارا اپنا گھر ہے بیٹی۔ علی احمد کا کیا ہے اس کے

سر پر تو عورتوں کا بھوت سوار ہے۔ بس عورتیں ہوں۔ اللہ ماری رنگ رنگیلی۔ ان کے نخرے نسے اور چھڑ چھاڑ ہو اور میاں پریوں کے درمیان میں اندر بن کے بیٹھے رہیں دفع کر علی احمد کو۔“ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو ڈبڈبا آئے۔ ”نہ بیٹی تو اپنا آپ کیوں ہلکان کرتی ہے۔ تیری بلا سے جو تو ہے وہ اور کون ہو سکتی ہے۔ محلہ والوں کی نگاہ میں۔ آپ جھک مار مار کر تھک جائے گا۔ اللہ کرے یہ تیرا ایللی جئے زندگی دراز ہو۔“

کئی ایک روز تو محلہ والیوں کا تاتا بندھا جا رہا اور ہاجرہ بات بات پر آنسو بہاتی رہی اور محلے والیاں اسے دلا سے دیتی رہیں ایللی حیران تھا کہ اہل بات بات پر رو کیوں دیتی ہے۔ رونے کی تو کوئی بات نہ تھی نہ جانے پھر وہ کیوں روئے جا رہی تھی۔ شاید اس لئے کہ وہ صفیہ سے جدا ہو گئی تھی۔ مگر محلے میں پہنچ کر تو اس کا انداز ہی بدل گیا تھا۔ جیسے وہ صفیہ سے بیزار ہو۔ جیسے وہ خوشی سے اس کے خدمت نہ کرتی ہو مگر باہر جا کر تو وہ صفیہ صفیہ کرتے تھکتی نہ تھی۔ ایللی کو کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔

نیچے احاطے میں محلے کی بوڑھیاں چرنے رکھے باتوں میں مشغول تھیں۔ سب انہیں کی باتیں کر رہی تھیں۔ علی احمد کے قصے۔ ہاجرہ کی مظلومیت۔ چاروں طرف لوگ ہاجرہ فرحت اور ایللی سے ہمدردی جتا رہے تھے اور ہاجرہ کی نیکی اور خدمت گزاری کا تذکرہ کر رہے تھے اور ہاجرہ ڈھلکتے آنسوؤں کے باوجود پھولے نہ سار رہی تھی۔ آنسوؤں کے علاوہ اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک تھی۔ ایللی نے اس چمک کو پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں نہ دیکھا تھا۔

گھر میں صرف دادی اہل خاموش تھی وہ ایللی کی طرف دیکھتی مسکراتی اور پھر تلخ انداز سے کہتی ”ایللی اب تو سارا دن آوارہ گردی ہی کرتا رہے گا کیلا۔“ اور ایللی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اسے گھورنے کی بجائے پیار کر رہی ہو۔ ”اوہر آ۔“ وہ چلاتی اور ایللی دیکھنے کی بجائے اس کے کندھوں پر جا سوار ہوتا اور پھر بڑھیا ہنستی۔ ”تو تو میرے کندھے توڑ دے گا۔ ہٹ اب مجھے نماز پڑھنی ہے۔ دفع ہو۔“ اور ایللی اس کے کندھوں سے اور بھی چمٹ جاتا۔

ہاجرہ کو روتے دیکھ کر دادی اہل ہاتھ چلا کر کہتی ”تو تو پاگل ہے لڑکی خواہ مخواہ جان کھپا رہی ہے۔ علی احمد کا کیا ہے۔ ہو جائے گا ٹھیک آپ ہی مرد ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

کئی ایک دن تو یونی روئے دھونے کا سلسلہ جاری رہا پھر ایللی آتا کر باہر نکل گیا اور چوگان میں کھیلنے لگا۔ آہستہ آہستہ وہ محلے کے لڑکوں سے واقف ہوتا گیا اور دھیرے دھیرے اس کی

کر پڑا۔
چار ایک دن تو اس کے لئے گھر سے باہر نکلتا مشکل ہو گیا۔ لیکن چھپے رہتا بھی تو ممکن نہ تھا۔ اس لئے اسے باہر نکلتا ہی پڑا اور اسے معلوم ہوا کہ رضا، ضیا، بالا اور ارجمند بھی جمیل سے پیڑے کھاتے ہیں اور جمیل روز چوکی سرکا کر روپے نکال لاتا ہے۔ اور وہ سب اس راز سے واقف ہیں یہ جان کر اس کے دل سے وہ بوجھ اتر گیا اور وہ لڑکوں میں شامل ہو کر کھیلنے لگا۔

انکرا اینڈی ماباؤں

پھر اسے مدرسے میں داخل کر دیا گیا۔ مگر اس کا سکول محلے کے باقی لڑکوں کے سکول سے بہت دور تھا۔ محلے کے قریبی سکول والوں نے ایللی کو داخل کرنے سے انکار کر دیا تھا ایک تو وہ پڑھائی میں کمزور تھا دوسرے اس مدرسے میں جگہ نہ تھی۔ لیکن داخل ہونے کے بعد اسے اطمینان سا ہو گیا کیونکہ جلد ہی اسے معلوم ہوا کہ اس اسکول میں بھی محلے کے چند ایک لڑکے تعلیم پا رہے تھے ان لڑکوں میں ارجمند سب سے زیادہ تیز تھا۔ ارجمند ڈاکٹر ڈاکر کا بیٹا تھا وہ سب مل کر پانچ بھائی تھے۔ سب اونچے لمبے پتلے دہلے بچپن کا زیادہ تر زمانہ پانی پت میں بسر کر کے وہ پہلی مرتبہ علی پور آئے تھے۔ ان کے والد اب بھی پانی پت میں ڈاکٹر تھے۔ جہاں ڈھپنری میں انہوں نے اپنی عمر کا زیادہ تر حصہ بسر کیا تھا۔

ارجمند بے حد لمبا تھا حالانکہ وہ ایللی کے ساتھ نویں جماعت کا طالب علم تھا۔ اس کے قد و قامت اور برتاؤ سے ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے عرصہ دراز سے فارغ التحصیل ہو چکا ہو۔ پانی پت میں رہنے کی وجہ سے ارجمند فر فر اردو بولتا تھا۔ جہاں کوئی اجنبی آیا اس نے چار ایک خوبصورت فقرے چلا دیے۔

”آئیے تشریف لائیے۔ فرمائیے۔ خاکسار کیا خدمت کر سکتا ہے۔“ اور ادھر وہ گیا ادھر انپ شاپ بولنا شروع کر دیا۔ ویسے تو ارجمند کو سینکڑوں چیزیں یاد تھیں۔ ایسکے اینڈی ماباؤں۔ کیلے ریو، ریو پیتے ریو پریم سندیس، پریم ٹونا اور نہ جانے کیا کیا لیکن ایللی کو اس کی انکرا اینڈی ماباؤں بہت پسند تھی ”دیکھو ایللی“ ارجمند چلاتا ”انکرا اینڈی ماباؤں کے لئے ریو ریو پیٹے ریو ریو“ کیا سمجھے۔“ اور ایللی حیران ہو کر اس کی طرف دیکھتا۔ ہم سمجھاتے ہیں۔ ہم سمجھاتے ہیں مطلب ہے لڑکی پھنسا کر کیا مشکل ہے کچھ مشکل نہیں۔ مصیبت یہ ہے کہ یہاں محلے داری ہے۔ اگر ڈھپنری

جھک کم ہوتی تھی۔ جمیل سے مل کر وہ بے حد خوش ہوا اسے دلی کی یاد آگئی جہاں وہ پارسی لڑکی رہتی تھی اور اٹھنی دیئے بغیر انہوں نے حلوہ خریدا تھا۔ جمیل نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”آؤ ایللی چلو پیڑے کھائیں۔“ ”پیڑے“ ایللی کے منہ میں پانی بھر آیا۔ ”لیکن کیسے۔ تمہارے پاس اٹھنی ہے کیا؟“ ”نہیں“ جمیل بولا۔ ”روپے۔ بہت سے روپے آؤ دکھاؤں تمہیں۔“ جمیل نے لکڑی کی چوکی اٹھائی اور اس کے پاؤں تلے دو روپے پڑے تھے۔ ایللی حیران رہ گیا ان کے گھر میں تو ایسی کوئی چوکی نہیں تھی جس کے پاؤں تلے روپے ملتے ہوں۔ چوکی تلے روپے، اس نے حیرانی سے جمیل کی طرف دیکھا۔ ”ہاں۔“ جمیل نے لا پرواہی سے کہا۔

”اماں کے ہیں۔ میں نے اٹھا کر چوکی تلے چھپا دیئے تھے۔“

اتنے پیڑے ایللی نے کبھی زندگی بھر نہ دیکھے تھے۔ اس نے چار ایک تو بڑے شوق سے کھائے۔ پھر وہ آگیا اس کا دل بیٹھنے لگا۔ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس نے کلمہ کیا ہے جرم کیا ہے۔ اتنے پیڑے خریدا تا جرم نہیں تو اور کیا ہے۔ اس نے شدت سے محسوس کیا کہ چاند حلوائی کو معلوم تھا کہ وہ روپے اس نے چوکی تلے سے نکالے ہیں۔ وہ مسکرا رہا تھا خاموش مگر چالاک مسکراہٹ اور ایللی جھینپ رہا تھا۔ نہیں۔ نہیں میں نہیں۔ میرے پاس تو ایک پیسہ بھی نہیں ہے۔

پیڑے کھانے کے بعد ایللی پر بھرنا خاموشی طاری ہو گئی اور وہ واپس چلے آئے۔ ٹھک ٹھک ٹھک، ایللی نے گھبرا کر پیچھے دیکھا۔ ہاتیں وہ گھبرا گیا۔ رضا لکڑی ٹیکتا اور لکڑی ٹانگ سمھاتا ہوا آ رہا تھا۔ اس نے انہیں لٹکارا۔ ”اماں سے آئے ہو تم۔“ بک نہیں بے جمیل ہنسنے لگا۔ ایللی کا دل دھک دھک کر رہا تھا ضرور اس لکڑے کو جمیل کی ماں نے بھیجا ہو گا۔ ”بے۔“ رضا چلایا۔ ”اکیلے اکیلے پیڑے کھاتا ہے تو اور اسے کھلاتا ہے۔ ہوں۔ یہ پیڑے اکیلے ہضم نہیں ہوئے۔ بتا دوں میں۔“

جب وہ دونوں بڑی ڈیوڑھی کے پاس پہنچے تو جمیل کو دیکھ کر سب چلانے لگے ”کیوں بھی پیڑے۔“ ایللی کا رنگ فاق ہو گیا اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور وہ سب شور مچائے جا رہے تھے۔ ”رضاء، بالا اور پھر کلن پر ہاتھ رکھ کر چلایا۔“ بازار بکیندی برنی۔ ”آبا بھائی واہ وا۔ رضا نے لکڑی ٹانگ کھا کر داؤدینی شروع کی اور ان سب کی توجہ پیڑوں سے ہٹ کر بالے کے گھنے کی طرف مبذول ہو گئی اور ایللی چپکے سے وہاں سے سرک آیا اور داوی اماں کی رضائی میں چھپ

جھا لیتی تھیں۔ دور سے دیکھ دیکھ کر مسکراتی تھیں خواہ مخواہ ہنس جاتی تھیں۔ بے کار بے مصرف۔ اگر ارجمند کو لڑکیاں اچھی لگتی تھیں تو ٹھیک تھا۔ لیکن وہ سب گورکھ دھند۔ انگریزی ماہوں کیا تھا۔ فضول ہونہ ہو۔ ارجمند جانتا ہی کیا تھا۔ نہ تو اس نے خانم کو دیکھا تھا اور نہ کسی کو بانی پت کے ہسپتال میں مریضوں کے ساتھ رہنے سے کیا ہوتا ہے۔

ہکوری ڈکوری

ایک روز ارجمند دوڑا دوڑا ایللی کے گھر آیا۔ اسے ادھر ادھر آؤ بھاگ کے آؤ بھاگ کے آؤ۔ آؤ۔ آؤ۔ ورنہ پچھتاؤ گے۔ ساری عمر پچھتاؤ گے۔ وہ ایللی کو اپنے گھر کی طرف گھینے لگا۔ تم بھی کیا یاد کرو گے کہ دوست نے ہکوری ڈکوری بھی نہیں دکھایا۔ چلے آؤ آج گھر میں کوئی نہیں ہے۔ وہ سب پیر جی کے میل گئے ہیں۔ آؤ اب و نیاز کے لئے اور ہم رہ گئے ہیں یہاں انداز و ناز کے لئے۔“

گھر پہنچ کر اس نے ایللی کو بند کھڑی میں دھکیل کر کہا۔ ”اب یہاں بیٹھ جاؤ۔ چپ شور نہ مچانا کھڑکی کی ان درزوں سے دیکھو ہکوری ڈکوری۔“ اور وہ دونوں بیٹھ کر بند کھڑکیوں کی درزوں میں سے دیکھنے لگے۔ ایللی کو کچھ بھی نظر نہ آتا تھا۔ مگر ارجمند چلائے جا رہا تھا۔ ”وہ سامنے بالکونی دکھائی دیتی ہے نا۔ بس اس میں کھیل ہوتا ہے ہکوری ڈکوری کا۔“ آہ نظر

سامنے سبز رنگ کا جنگل صاف دکھائی دے رہا تھا۔ اس کے اندر دو دروازے ایک کمرے میں کھلتے تھے۔ جنگل سے نیچے محلے کا بازار تھا۔ سامنے دوکان پر عمو حلوائی دودھ کی کڑاہی صاف کر رہا تھا۔ ساتھ ہی حکیم صاحب مریضوں کے انتظار میں بیٹھے داڑھی کو سلا رہے تھے ”آہا“ ارجمند نے چٹکی بجائی ”وہ رہا“ ایللی نے شوق سے جنگل کی طرف دیکھا۔ جنگل کے پچھلے کمرے میں ایک دھندلی سی شکل دکھائی دی۔ ”ابھی ادھر آئیں گے۔ کچے دھاگے سے کھینچی آئے گی سرکار مرے۔“

زن سے ایللی کے جسم میں بجلی سی دوڑ گئی۔ اس کے سر میں بہن بہن سا ہونے لگا جیسے دفعتاً سر کھینوں کے چھتے میں بدل گیا ہو۔ دل گھڑی کی طرح بجنے لگا۔ جنگل کے پچھلے دروازے میں ایک عورت کھڑی تھی۔ اس نے جسم پر ایک تولیہ لپیٹ رکھا تھا۔ ایک طرف گلابی جسم پر

ہو تو یوں پھنسی ہے یوں جیسے چٹکی بجتی ہے اور پھر ڈھنری پانی پت میں ہو تو تو کیا بات ہے۔ آئی پھنسی، آئی پھنسی۔ خیر کچھ پروا نہیں۔ یہ دیکھو یہ ر۔ شمس رومال کا ہوتا ہے حد ضروری ہے۔ اسے کہتے ہیں۔ کیلے ریوریو۔ سمجھ کیا سمجھ۔ صرف ہوتا ہی نہیں طریقہ استعمال بھی جانتا چاہئے۔ ”ہاں“ اور وہ رومال ہلا کر کتا ”لنڈا ہم بتائیں گے“ دیکھو۔ اسے تھانے کی مشق کرو پہلے یوں نہیں بلکہ یوں ہاتھ میں مرے ہوئے چوہے کی طرح نہ پڑا رہے بلکہ ہر چند منٹ کے بعد جنبش میں آئے۔ اب منہ پونچھو گرد جھاڑو۔ ذرا احتیاط سے جنبش کی خوبصورتی ہی میں سارا جاو ہے۔ کیا سمجھ۔ لیکن ٹھہرو یہ کیلے ریوریو ہی کافی نہیں۔ اس پر سینٹ یعنی خوشبو کا چمڑکنا لازمی ہے۔ یہ دیکھو شیشی چار آنے کی یہ شیشی بیسیوں لڑکیوں کو پھنسانے کے لئے کافی ہے ہاں تو اس رومال سے گالوں کو سلاؤ۔ بالوں کو جھاڑو گردن پر لگا لو۔ ہاتھ میں رکھو۔ لڑکی دور کھڑی ہو تو منہ پر جھکا دے کر یعنی سلام عرض کرتا ہوں اور یوں ہلا یا تو مطلب ہے اب آؤ بھی تاجان من اور یوں چھاتی پر پھینک لیا تو مطلب ہے ظالم سینے سے لگا جا اس کے استعمال کے کئی انداز ہیں۔ لیکن فی الحال یہی کافی ہے۔ اس کے بعد یہ دیکھو۔ اس نے جیب سے ایک بانسری نکالی اور نچلا ہونٹ لٹکا کر اس میں پھونکیں مارنے لگا ”یہ ہے پریم سندیس کہیں اندر بند کمرے میں بیٹھی ہے تو یہ چیز اسے منڈیر پر لے آئے گی اور آخری چیز یہ ہے پریم ٹونا۔ دیکھا۔“ اس نے ایک چھوٹی سی کتاب جیب سے نکالی۔ ”اس میں سب کچھ لکھا ہے محبت کے خطوط، غزلیں، گیت ہر موقع کے لئے۔“ مثلاً یہ دیکھو ”اور وہ گانے لگا“ جب سے تم پر ہوا ہوں شیدا ناٹ سلیڈنگ چھوڑ دیا۔“ بڑی لا جواب چیز ہے۔ سنتے ہی لڑکی ہنسی اور ہنسی تو سمجھو پھنسی اور یہ سب کچھ کیا ہے انگریزی ماہوں۔“

ایللی اس کی باتیں غور سے سن رہا تھا اور بے حد کتر محسوس کر رہا تھا اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ لڑکی پھنسانے کا مقصد کیا ہے۔ آخر اتنے بڑے انگریزی ماہوں کا کچھ تو مقصد ہو گا لڑکیاں نہیں۔ اسے تو ثمار عورتیں اچھی لگتی تھیں۔ لڑکیاں خاصی لگتی تھیں۔ لیکن کوئی خاص اچھی نہ لگتی تھیں اور اچھی لگتی بھی تو بھی انہیں پھنسانے کا مطلب۔ اچھی لگتی تھیں۔ نہیں اچھی لگتی تھیں تو نہیں اچھی لگتی تھیں۔ لیکن وہ ر۔ شمس رومال اور بانسری اور پریم ٹونا پریم سندیس وہ سب کس لئے تھے۔ خانم کی بات تو اور تھی نا۔ وہ تو بہت ہی اچھی تھی اور اس کا ہاتھ سے ایللی کو تھپکنا۔ منہ سلا نا۔ کتنا اچھا لگتا تھا۔ لیکن چھوٹی چھوٹی لڑکیاں۔ وہ تو شرم سے آنکھیں

سیاہ بال لنگ رہے تھے جنہیں بنانے میں وہ مصروف تھی۔ دو بازو بھرے بھرے سفید بازو۔ ایلے نے محسوس کیا جیسے اس کے ہاتھ بال بنانے کے بہانے اس کا منہ سہلا رہے ہوں۔ چھن چھن چھن جھنجھٹا بجتے لگا ارجمند جانے کیا کیا کئے جا رہا تھا۔

دفعاً ہالوں کو جنبش ہوئی اور۔ اور۔ ایک بڑا سا چہرہ دکھائی دینے لگا۔ چوڑا۔ چٹا سفید۔ دو مخروطی بانیں لٹکنے لگیں۔ ”انہوں“ ارجمند چلایا۔ ”یہ تو دو سرائیڈیشن ہے یہ نہیں بڑا والا ایڈیشن نہیں بالکل نہیں ہمیں تو چھوٹا والا چاہیے چھوٹا والا چلو ایلے یہ سب غلط ہے۔ یہ بکوری ڈکوری نہیں۔ یہ تو کورا ڈکورا ہے۔ چلو۔“

ایلے کا جی نہ چاہتا تھا کہ وہاں سے ہٹے مگر ارجمند نے اس کا بازو کھینچ لیا اور اسے باہر لے گیا۔ سب غسل فرماتی ہیں۔ سب چھوٹا بڑا سائز پھر غسل فرمانے کے بعد اس کمرے میں ضرور آتی ہیں۔ تولیہ لپیٹے، کپے دھاگے کا معجزہ ہے۔ بڑی چیز ہے کچا دھاگا ”لیکن یہ گھر کس کا ہے؟“ ایلے نے پوچھا کیونکہ وہ گھر محلے سے باہر تھا اور ایلے کو معلوم نہ تھا کہ وہاں کون رہتا ہے ”کسی کا بھی ہو۔“ ارجمند نے کہا ”ہمیں تو آم سے مطلب ہے پیڑ سے نہیں اور آم بھی وہ جو آم ہوں حلوہ کدو نہیں۔ سمجھ ہمارے پاس آیا کرو گے تو یونی عیش کرائیں گے۔“

ہم جولی ٹولی

محلے میں ہر عمر کے لڑکے تھے اور عمر کے مطابق وہ ایک دوسرے سے ملتے جلتے تھے مثلاً ایک تو جلیل یوسف اور رفیق کی ٹولی تھی جو عمر میں اس سے بڑے تھے۔ جلیل اس کی خالہ زاد بہن کا بیٹا تھا۔ رفیق اس کا ماموں زاد اور لطیف خالہ زاد بھائی۔ والدہ کی طرف سے اس کا قریبی رشتہ دار کوئی نہ تھا اور ہوتا بھی تو کیا تھا۔ علی احمد پرانے رشتہ داروں کو خوش رکھنے کی نسبت نئے رشتے پیدا کرنے کو ترجیح دیتے تھے۔

رفیق جلیل کا بڑا بھائی تھا۔ لیکن وہ جلیل سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ نہ تو اسے چوکی تلے روپے رکھنے کا شوق تھا نہ حلوائی سے پیڑے کھانے کا اور نہ ہی بھیڑ والی دوکان سے اٹھنی کا سودا خریدنے کا جلیل کی طرح نہ تو وہ شوخ تھا نہ دلا پتلا۔ اس کے انداز میں ایک خاص قسم کا رکھ رکھاؤ تھا۔ جسم فریبی پر مائل تھا۔ طبیعت میں خاموشی اور محاسن نمایاں تھے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ بے حد منسلک تھا۔ ہمیشہ کوشش کرتا تھا کہ لوگوں کے کلام آئے۔ رفیق مزاج کا رہتا تھا۔

تھا۔ لیکن یہ رنگ ہلکا ہلکا تھا، مدھم مدھم سا، کبھی شوخی سے نہ چکا تھا۔ نہ ہی اس کی طبیعت میں جرأت تھی کہ آگے بڑھ کر کچھ کہہ سکے اس کے برعکس وہ ذہنی طور پر محسوس کئے جاتا اور اظہار کرنے کے وقت پیچھے ہٹ کر جھجک جاتا اس کے باوجود اس کے پاس ہر وقت انگریزی باباؤں کا سب سامان میا رہتا تھا۔ جب میں ایک آنے والی غزلوں کی کتاب ہاتھ میں خوشبو دار ریٹھی روہل اور آنکھوں میں چوری چوری دیکھنے اور جھجکنے والی نگاہیں۔

جلیل اس کے برعکس شن قلندری کا قائل تھا۔ آنکھوں میں رندانہ جھٹک تھی۔ انداز میں والہانہ پن تھا اور یوسف پیپارہ تو ان معاملات سے قطعی ناواقف تھا۔ سپاہیوں کے سکول ماسٹر کا بیٹا ہونے کی حیثیت سے وہ کئی ایک سال فوجی پلٹنوں میں رہا تھا اور نتیجتاً ”بھانٹا، دوڑنا، کودنا، ہاٹ اور کوئٹ مارچ کے کھیلوں کو دنیا کی سب سے بڑی لذت سمجھتا تھا۔ اس کی طبیعت ڈر سے خالی تھی اور وہ کسی عظیم الشان کارنامے کا متلاشی تھا۔ رفیق کی طبیعت میں بھی کسی کارنامے کی خواہش کی جھٹک تھی۔ لیکن اس خواہش سے ریٹھی ملبوسات عطریات اور حنائی ہاتھوں کی بو آتی تھی۔ یہ تینوں لڑکے ایلے کے قریبی رشتہ دار تھے اور ایلے کا زیادہ وقت انہی کے پاس گزرتا تھا۔ لیکن وہ تینوں عمر میں ایلے سے بڑے تھے اور ایلے سے چھپ چھپ باتیں کرتے تھے۔ رفیق اور جلیل آپس میں راز دارانہ طور پر کچھ طے کرتے یوسف ان کی ایسی باتوں سے اکتا کر دیوار پر چڑھنے میں مصروف ہو جاتا اور ایلے ایک طرف کھڑا شدت سے محسوس کرتا کہ کاش وہ بھی ان کی باتوں میں شامل ہوتا۔

ارجمند کے گھر سے فارغ ہو کر ایلے رفیق اور جلیل کے یہاں چلا جاتا جہاں رفیق کے دوست اکٹھے ہوا کرتے تھے۔ جلیل کا گھر محلے میں نہ تھا۔ یہ بہت خوبی تھی۔ کیونکہ وہاں وہ محلے والیوں کی نگاہوں سے دور جو جی چاہے کر سکتے تھے گھر میں جلیل کو ایک علیحدہ کمرہ ملا ہوا تھا۔ اس کمرے کی کھڑکی ایک گلی میں کھلتی تھی جس میں بوڑھی عورتیں چوکیوں پر بیٹھی رہتی تھیں۔ جب وہ وہاں سے سرکتیں تو جلیل اور رفیق چوری چوری باہر جھانکنے لگتے اور ان کا ریٹھی روہل کھڑکی سے باہر لہرائے لگتا۔ جسے دیکھ کر ایک ایک لڑکی جھاڑو دینے کے بہانے باہر گلی میں نکل آتی اور با آواز بلند کسی چچی یا خالہ سے باتیں کرتے ہوئے خواہ مخواہ مسکرائے جاتی اور پھر دہلیز پر جھاڑو دیتے دیتے وہ آدمی سے زیادہ گلی صاف کر دیتی۔ اس وقت جلیل کھڑکی میں بیٹھ کر عجیب سی آنکھوں سے مسکراتا اور رفیق بے تابانہ اٹھ بیٹھتا اور عالم اضطراب میں غزلوں کی کتاب سے

کچھ گنگنائے لگتا۔

نہ جانے وہ لڑکی گلی میں جھاڑو کیوں دیا کرتی تھی اور یا آواز بلند باتیں کیوں کیا کرتی تھی۔ اس کی آواز میں لوج کیوں پیدا ہو جاتا تھا۔ اس کے انداز میں اس قدر شوخی کیوں تھی اور جلیل اس وقت ایسی آنکھیں کیوں بنا لیا کرتا تھا۔ جس میں بیک وقت مسکراہٹ بھی ہوتی اور وحشت بھی اور اس وقت رفتی کی آنکھوں میں بوند باندی سی کیوں ہو ا کرتی تھی؟

یہ تو ظاہر تھا کہ وہ سب کھیل اس لڑکی سے متعلق تھا مگر اس کا مقصد کیا تھا یہ باتیں ایلی کیلئے حیران کن ہونے کے باوجود بے حد دلچسپ تھیں۔ رفتی اور جلیل میں یہ عیب تھا کہ وہ ایلی کو بات سمجھانے کی بجائے اس سے بات چھپانے کی کوشش کرتے۔ اسی لئے ایلی ان کے ہاں بیٹھا بیٹھا آتا جاتا اور ان کو چھوڑ کر ارجمند کی طرف بھاگتا۔

ارجمند اسے دیکھ کر چلاتا ”ایلی ایلی۔ چلو ایلی۔ بڑی ڈیوڑھی میں چلیں۔“ اور وہ اپنا تمام تر انگریزی ملباؤں اٹھا کر ڈیوڑھی میں چلے جاتے جہاں چورستہ بنا تھا لوگ آتے جاتے رہتے۔ ارجمند وہاں کھڑے ہو کر بانسری بجاتا اور آتی جاتی لڑکی کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ مذاق کرتا اور وہ جھینب کر مسکرا کر چلی جاتی۔ ”لا جواب چیز ہے ایلی۔ مگر ابھی نہیں کچھ سال کے بعد دیکھنا۔ وہ دیکھو ٹاٹ کے پیچھے۔ ارے تم تو اندھوں کی طرح کھڑے رہتے ہو۔“ اور ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگتا اگر کسی نے دیکھ لیا تو محلے کا بڑا بوڑھا اور ہر سے گزرتا تو ایلی یوں کسی اڑتی ہوئی چڑیا کو دیکھنے لگ جاتا جیسے وہاں کھڑے ہونے سے اس کا مقصد صرف چڑیا دیکھنا ہو۔ ارجمند آنکھیں بند کر کے بانسری بجانے لگتا۔ محلے کے سب لوگ انہیں گھورتے ”ارے لڑکی یہاں کیا کر رہے ہو۔ خواہ مخواہ رستہ نہ روکو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ یہ سن کر ایلی کو پسینہ آ جاتا اور ارجمند چپکے سے جواب دیتا۔ ”اچھا صاحب ابھی چلے جاتے ہیں۔ ذرا انتظار کر رہے ہیں بھائی صاحب کا۔“ ارجمند کو بات ٹالنے میں کمال حاصل تھا۔

جلیل اور رفتی کے علاوہ محلے میں ایک اور ٹولی تھی۔ اجمل، صفدر، اکرم، دین محمد اور غلام بخش کی۔ یہ ٹولی محلے کے جوانوں کی تھی۔ وہ جلیل اور رفتی سے بھی الگ تھلک رہتے تھے۔ جوانوں کی اس ٹولی کے مشاغل تنہائی میں ترتیب دیئے جاتے تھے۔ وہ منظر عام پر کوئی ایسی حرکت سرزد نہ کرتے تھے جس پر محلے والیوں کو ان پر نکتہ چینی کرنے کا موقع ملے چونکہ محلے والیوں کو جوانوں سے چڑ تھی۔ وہ چھوٹے بچوں سے پیار کرتیں لیکن جوں

جوں وہ بڑا ہوتا جاتا توں توں وہ ان کی نظروں میں کھٹکتا۔ حتیٰ کہ جوان ہو کر وہ محکوک ہو جاتا اور اس کے ہر فعل پر حملہ والیاں چونک کر دیکھتیں اور چہ میگوئیاں کرتیں۔ اس ٹولی کا کوئی فرد جب باہر چوگان میں نکلتا تو محلے والیوں کی نگاہیں اس پر مرکوز ہو جاتیں جیسے وہ کوئی خطرناک ارادہ رکھتا ہو۔ محلے میں جوان ہونا جرم سمجھا جاتا تھا اور جوانوں کو اس بات کا پورا احساس تھا۔ لیکن وہ مجبور تھے ان کا احتجاج دبا دیا رہتا اور ان کی بیشتر قوتیں بزرگوں کے خلاف احتجاج اور سازش کرنے میں صرف ہو جاتیں۔

اجمل دسویں جماعت پاس کر کے اب کالج میں پڑھتا تھا اور کبھی کبھی چھٹی پر محلے میں آ جاتا تھا۔ اکرم، ارجمند کا بڑا بھائی تھا اور وہ اتنا لمبا تھا کہ بڑی ڈیوڑھی کے علاوہ کسی دروازے سے جھکے بغیر گزر نہ سکتا تھا۔ وہ شیلے میں نوکر تھا اور کبھی کبھار چھٹی لے کر محلے میں آیا کرتا تھا۔ دین محمد کی علی پور میں دکان تھی اور وہ پتلا دیلا ہونے کے باوجود بڑا معزز بنا پھرتا۔

صفدر کو دیکھ کر تو ایلی بڑا مایوس ہوا تھا کیا یہ وہی صفدر تھا جو دلی میں پارسی لڑکی سے محبت کیا کرتا تھا اور صبح شام پارسی تھیٹر میں رہا کرتا تھا۔ وہ تو بالکل ایک سیدھا سادا نوجوان تھا۔ جس میں ذرا بھی پارسی تھلک نہ تھی۔ بہر حال اس میں ایک خوبی ضروری تھی۔ جب وہ کوئی تھیٹر کی دھن گنگنائے تو اس کی آنکھوں میں عجیب بوند باندی سی ہوتی گلابی گلابی بوندیوں کی پھور پڑتی۔ اس کی چوڑی کلائی پر نیلے رنگ کی سیاہی میں نہ جانے کیا کھدا تھا جسے وہ اکثر دیکھتا اور پھر کسی خیال میں کھو جاتا۔ اس کی طبیعت بہت رنگین تھی۔ رفتی کی طرح دلی دلی رنگینی نہیں بلکہ چھلکتی ہوئی رنگینی ابلتا ہوا جوش لیکن جسمانی طور پر اس پر ہمد طاری رہتا تھا۔ جیسے وہ تھک ہار کر بیٹھ گیا ہو۔ غلام بخش کی آنکھیں اکثر چھتوں تلے کچھ ڈھونڈنے میں مصروف رہتیں اور اس کی چھاتی تتی رہتی۔

کبھی کبھار محلے کی ان تینوں ٹولیوں کا میل بھی ہو جایا کرتا۔ سب سے بڑی ٹولی یعنی محلے کے جوان محلے کے نوجوانوں کو بلاتے چلو بھی آج کرکٹ کا کھیل رہے گا۔ محلے کے نوجوان محلے کے لڑکوں کو مطلع کر دیتے۔ کھیل کی خبر سن کر لڑکوں کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ گیند بلا اور وکٹیں اٹھا کر قصبے سے باہر تالاب والے میدان کو چل پڑتے۔ پھر جب وہ میدان میں وکٹیں گاڑ کر سنترنپ کرتا رہتے تو محلے کے جوان آہنچتے ان کے آتے ہی نوجوانوں کی حکومت کا دور ختم ہو جاتا۔ رفتی اپنا خوشبودار ریٹھی رومال چپکے سے گردن سے ہٹا کر جیب میں ڈال لیتا اور

ارجند اپنا شوخ انداز ترک کر کے مودبانہ کھڑا ہو جاتا۔ صفر اور اکرام آکر ایک نظر میدان پر ڈالتے۔ صفر ہاتھ میں گیند اٹھاتا اور قبض کی آستینیں چڑھاتے ہوئے ایک بار بازو پر کھدے ہوئے حرف کی طرف دیکھ کر سر جھٹکتا اور تھپڑ کی دھن گنگنائے لگتا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایللی کی آنکھوں سے وہ میدان او جھل ہو جاتا اور تھپڑ کے منظر پر ایک پارسی لڑکی آکھڑی ہوتی۔ ”اے دلربا میں ہوں ندا۔“ صفر کے مضبوط بازو اس کی جانب بڑھتے اور وہ جھینپتی۔

”ایللی تم ادھر جاؤ شاپ کے پاس۔“ ایللی چونک پڑتا۔ ”سنا تم نے“ اکرم گردن جھکائے چلاتا اور غلام بخش خاموش ہنسی ہنسنے لگتا۔ ایللی کو اس وقت معلوم ہوتا کہ وہ میدان میں کھڑا ہے۔ تھپڑ میں نہیں اور کھیل شروع ہونے والا ہے۔

آصفی لڑکے کرکٹ کھیلنے کے بہت شوقین تھے لڑکے تو مکے ہی میں گیند اور تختی سے کرکٹ کھیل لیا کرتے تھے۔ مگر جوان اور نوجوان صرف میدان میں گیند بیٹ سے کھیلتے تھے۔ صفر گیند پھینکنے کا بے حد شوقین تھا اکرم لمبا ہونے کی وجہ سے بہت زور سے ہٹ لگاتا تھا اور غلام بخش صرف گیند روکنے کا مشاق تھا۔ اکثر میچ بھی ہو جاتے تھے۔ جس میں ایللی کا کام صرف کھلاڑیوں کی چیزوں کی رکھوالی کرنا ہوتا تھا۔ بہر حال اسے میچ میں شامل ہونے سے بڑی دلچسپی تھی۔

بالا

ان دلچسپیوں کے علاوہ مکے میں ایک اور دلچسپی تھی اور وہ بالا تھا جو بذات خود ایک ٹولی تھا اپنے آپ میں اس قدر مگن رہتا تھا کہ اسے کسی کے ساتھ مل بیٹھنے کی خواہش ہی محسوس نہ ہوتی تھی۔ بالا ایللی کا ہم عمر تھا اور اس مکان میں رہتا تھا جو ایللی کے مکان کے عین سامنے واقع تھا۔ صبح سویرے ہی بالا اٹھ کر اپنے بہت بڑے تخت پوش پر چڑھ جاتا اور شروع کر دیتا۔ یہ گرامو فون ہے یہ ریکارڈ ہیں۔ یہ منہ سے بجانے والا ہارمونیم ہے اور یہ تاش کی گڈیاں ایک دو تین۔ تخت پوش پر چڑھ جاتے کے بعد وہ ان کے درمیان بیٹھ جاتا اور پھر چیزوں کو بتانے سنوارنے اور ادھر سے ادھر اور ادھر سے ادھر رکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ ”یہ نیلم ہیں اور یہ زمرہ“ وہ اس ڈبیا میں ہونے چاہیں۔ ”وہ آپ ہی اپ گنگنا رہتا۔“ ”یہ۔ ہائیں۔“ آج اس کا رنگ مدھم کیوں پڑ گیا۔ ہاں آج بدھ ہے نا، بدھ، تہ تہ بدھ کو پکھراج کا رنگ زرد پڑ جاتا ہے

اور لعل کا نکھرتا ہے۔ لعل کہاں ہے۔ آؤ بھائی ایللی ہے۔ آجاؤ بھائی ایللی میرے سر آنکھوں پر۔ ہی ہی میں دیکھ رہا تھا کہ لعل کہاں ہے۔ پکھراج یوں چمک رہا ہو گا یوں جیسے پالش کر رکھا ہو۔ یہ جیتی پتھر حساب کے مطابق چمکتے اور پھیکے پڑتے ہیں۔ ہاں تو بل کہاں ہے۔ ہی ہی ہی اٹھا کے لے جاتے ہیں۔ بڑا تنگ کرتے ہیں۔ پیچارے بڑے اچھے ہیں۔ ہی ہی ہی ابھی مجھے ڈیوڑھی میں ملا تھا ایک کسے لگا۔ نیچے کنوئیں کے پاس ایک دیگ نیلم اور پکھراج کی بھری ہے۔ وہ تو ہمیں پتہ ہے سبھی جانتے ہیں اور وہ روزانہ دیگوں کو ادھر ادھر کرتے رہتے ہیں۔ رات بھر آوازیں آتی رہتی ہیں وہ انہیں ادھر ادھر کرنے میں ساری رات، ساری رات چھن چھن ہوتا رہتا ہے۔ قہقہے مارتے ہیں روتے ہیں چیخنے ہیں اچھا تاش کھیلو گے آؤ بھلا تمہیں جاگی پائی کا ریکارڈ سنائیں۔ بیاں موری مروڑی، ہی ہی بڑا اچھا ہے۔ ہائیں یہ گردا، گرد پڑ جائے تو ریکارڈ خراب ہو جاتے ہیں۔ تہ تہ تہ ہی ہی لوسنو۔“

ایللی بالے کو دیکھ کر حیران ہوتا تھا۔ اسے یہ چیزیں کون دیتا تھا۔ وہ کون تھے جو اس کے گھر میں رہا کرتے تھے اور اسے تنگ کرتے تھے اور اسے بالکل تنگ نہ کرتے تھے اور کنوئیں والے کمرے کے نیچے کیا دیا ہوا تھا اور وہ دیکھیں کس کی تھیں۔

سارے مکے میں مشہور تھا کہ بالے کا گھر آسیب زدہ ہے اس لئے کہ مائی عمدہ نے وہاں چلہ کانا تھا۔ اور جب وہ آخری رات اکیلی وہاں بیٹھی ہوئی تھی تو دو کئے ہوئے بازو اس کے سامنے اُگرے تھے اور پھر سارے کا سارا دھڑدھم سے اُگرا اور سر کھڑا ہو گیا اور پھر وہ بھاگی۔ ڈر کر بھاگی اور لوگوں کے دروازے کھٹکھٹانے لگی۔ اس کے پیچھے قہقہوں کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ لوگوں نے ڈر کے مارے دروازے بند کر لئے۔ پھر عمدہ کی چیخیں سنائی دیں اور پھر خاموشی چھا گئی اور صبح عمدہ بے ہوش پڑی ملی اور اس کے گرد گندگی کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔

آصفی مکے میں کئی ایک مکانات اور مقامات کے متعلق ایسی ہی باتیں مشہور تھیں۔ چچی عظمت کے چوبارے کی کھڑکی آپ ہی آپ کھل جاتی تھی اور اس میں سے بے موسم کے میوے گرتے تھے۔ شیخ کی حویلی کی سب سے اوپر والی منزل سے رات بھر آوازیں آتی تھیں۔ حسن دین کی ڈیوڑھی میں کوئی بزرگ رہتا تھا وہاں ہر جمعرات کو دیا جلایا جاتا تھا۔ ایللی کے گھر کا چوبارہ بھی آسیب زدہ تھا اور رحمت بی بی کے کونے پر تو لوگوں نے آگ جلتی دیکھی تھی۔ مکے میں عمدہ کے علاوہ کئی اور لوگوں نے بھی وظائف پڑھے تھے اور وہ چلہ پورا کرنے میں کامیاب نہ ہوئے

تھے۔

محلہ والیاں

اس کے باوجود بچے آزادانہ ہر جگہ کھیلتے تھے اور محلے کی بوڑھی عورتیں انہیں گھورتی تھیں۔ ”کھیل کود کا وقت ہونا چاہئے۔ ہر وقت اللہ مارا گیند بلا اور پھر ہر وقت چیخ پکار اور اس پلید گیند کے چھینے ان لڑکوں کو تو اللہ ہی سمجھے۔ دیکھو تو کیا حال بنا رکھا ہے۔“ دوسری کھڑکی سے جھانکتی ”ٹھیک ہے بہن کیا زمانہ آیا ہے۔ بڑے بات کریں تو یہ منہ چڑاتے ہیں۔“ تیسری بولتی ”اب تو زمانہ ہی بدل گیا نہ بڑے کا خوف نہ بوڑھے کا لحاظ۔“ بچے انہیں دیکھ کر بھاگ جاتے اور وہ وہیں کھڑی گھنٹوں نئے زمانے پر لیکچر دیتی رہتیں اور چپے ہوئے لڑکے ان کا منہ چڑاتے، ”ہوں بڑی آئی ہیں!“

محلے کی بوڑھیاں محلے کے نوجوانوں، بچوں اور بوڑھوں پر آکاش نیل کی طرح چھائی ہوئی تھیں حتیٰ کہ محلے کے تمام مرد بھی ان سے دبتے تھے۔

بوڑھی چڑیل

لڑکے سب سے زیادہ ایللی کی دادی سے ڈرتے تھے کیونکہ وہ ہر بات پر انہیں ڈانٹتی تھی۔ ایک بار بات شروع کرتی تو پھر مسلسل لیکچر دینے لگتی۔ حتیٰ کہ اس کے منہ سے کف جاری ہو جاتے۔ اس کی آواز سن کر سب بھاگ لیتے تھے اور پھر کسی تنگ گلی میں چھپ کر اس کا منہ چڑاتے۔ نوجوان اسے چڑیل سمجھتے تھے۔ جوانوں میں صفدر کو تو اس کے نام سے وحشت ہوتی تھی۔ ”مجھ سے تو میرے اس بڑھیا کو خواہ خواہ ہر بات میں میرا نام گھسیٹ لیتی ہے۔“ ایللی کی دادی کو محلے کے لڑکوں سے سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ وہ اس کی دیوار کے ساتھ گیند کھیلتے تھے۔ جس سے دیوار کمزور ہوئی جا رہی تھی۔ اس پر صفدر کو اتنا غصہ آتا تھا کہ وہ گھر بیٹھ کر بڑے اہتمام اور محنت سے پوناش کا ایک اتا بڑا پٹاخہ تیار کرتا تاکہ تنوار کے دن دادی ایللی کی دیوار پر مارے۔ پٹاخہ چھوٹتے ہی زنانے کی آواز آتی اور دادی ایللی کھڑکی میں جا کھڑی ہوتی۔ ”اے ہے جوانوں کے سر پر تو بھوت سوار ہے۔ خون چڑھا ہوا ہے۔ یہ تو محلے کو تباہ کر کے رہیں گے۔“

دادی ایللی کو چنچنے سن کر صفدر کو عجیب سی روحانی مسرت حاصل ہوتی وہ اطمینان سے جھنے لگتا۔ ”اے دلربا میں ہوں جدا۔“ ان تمام باتوں کے باوجود ایللی کو یقین نہ آیا کہ دادی ایللی سخت مزاج ہیں حالانکہ جب بھی وہ گھر جاتا تو دادی دور سے اسے دیکھ کر برس پڑتی ”بس تو بھی اب کہیں کا نہ رہا۔ ان محلے کے لڑکوں میں کھیل کر تو بھی بگڑ گیا۔“ لیکن ایللی اس کی جھڑکیوں کی پروا نہ کرتا اور اس کے کندھوں پر سوار ہو جاتا اور وہ تنگ آکر کہتی: ”کتنی دیر سے بیٹھی انتظار کر رہی ہوں کہ تو آئے تو مچلی کھاؤ۔ صبح سے تیرے لئے پکا کر بیٹھی راہ تک رہی ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ کڑائی کلا کھٹا اٹھاتی۔ کڑائی چھوٹی چھوٹی مچھلیوں سے بھری ہوتی۔ ایللی کو چھوٹی مچھلیاں کھانے کا بہت شوق تھا۔ وہ کڑائی اٹھا کر بھاگ جاتا اور دادی پھر سے اسے کونے لگتی اور چوری چوری منہ پر پلہ لے کر مسکاتی، بڑا شیطان ہو گیا ہے نکما کہیں کا۔

دادی ایللی کے ساتھ ایللی کی چھوٹی زاد بہن سیدہ رہا کرتی تھی، جو ہر وقت دادی کے پاس بیٹھی رہتی اور دادی ایللی کے کام کیا کرتی تھی۔ سیدہ کو دیکھ کر ایللی حیران ہوتا کہ وہ نوجوان ہونے کے باوجود دادی ایللی کی طرح سر لٹکائے بیٹھی رہتی ہے۔ شادی ہو جانے کے باوجود اپنے میاں کے پاس کیوں نہیں رہتی اور اس کی شکل اتنی غم آلود کیوں ہے اور اس کے میاں کہاں رہتے ہیں اور وہ وہیں آتے کیوں نہیں؟

سیدہ کو دیکھ کر ایللی سوچ میں پڑ جاتا۔ لیکن اسے سیدہ سے یہ باتیں پوچھنے کی کبھی جرات نہ ہوتی تھی۔ اوہر اونچے چوہارے میں سیدہ کی بہن نیاز اپنے تینوں بچوں کے ساتھ رہتی۔ اس کی حالت سیدہ سے بھی بدتر تھی۔ یا تو وہ چپ چاپ پڑی رہتی اور یا اٹھتی تو نماز پڑھنے کھڑی ہو جاتی۔ محلے کی بہت سی عورتیں اسی طرح رہتی تھیں جیسے پیپ سے بھرے پھوڑے ہوں جیسے ان کے دل دکھتے دکھتے پھوڑے بن چکے ہوں۔ اس کی اپنی ماں تو ان سب سے مختلف تھی۔ وہ دن بھر بیسیوں کام کیا کرتی تھی۔ کبھی کپڑے سیتی کبھی گونا گاتی۔ کبھی بچوں کے لئے گڑیا بنانے لگتی۔ کبھی کسی دولہا کے لئے عروسی گڑی تیار کرتی اور ایللی کو چنگ اڑا کر بھی تو وہی دیتی تھی۔ ایللی کو چنگ اڑانا نہیں آتا تھا۔ باہر اسے خود چنگ بنا کر دیا کرتی تھی۔ اس کی کتابوں پر خود ہی جلد چڑھایا کرتی تھی۔ باہر کو دنیا بھر کے سب کام کرنے آتے تھے نہ جانے اس نے اتنے سارے کام کہاں سے سیکھ رکھے تھے۔

ہوئی اسے کوٹھے پر لے جاتی تاکہ کھلی ہوا میں سو سکے۔ ایک رات جب وہ سب کوٹھے پر سو رہے تھے تو آندھی چلنے لگی۔ بوند باندی ہونے لگی۔ باجرہ کا خیال تھا کہ جلد ہی آندھی ختم جائے گی، اس لئے وہ صوفیہ کو اٹھا کر برساتی میں لے گئی تاکہ اسے نیچے گرمی میں تکلیف نہ ہو۔ یہ آندھی ایک عام آندھی تھی۔ آندھیاں اکثر آیا کرتی تھیں۔ چند ایک منٹ کے لئے تیز ہوا چلتی بادل مگر جتنے جھینے پڑتے اور پھر مطلع صاف ہو جاتا۔ علی احمد سیدہ اور داوی اماں کے نیچے چلے جانے کے بعد وہ آندھی طوفانی صورت اختیار کر گئی۔ باجرہ گھبرا گئی۔ باجرہ کے لئے دو چھوٹے چھوٹے بچوں کی مدد سے صوفیہ کو نیچے لے جانا مشکل تھا۔ طوفان اور بھی تیز ہوتا گیا۔ ہوا مکانون اور دکانوں سے ٹکرا کر اکیڑوں پر چبھنے لگی، جیسے جنگل میں شیر دھاڑتا ہے۔ آسمان پر سیاہ رنگ کی گھٹا چھا گئی۔ بجلی کی کڑک سے کان پھٹے جا رہے تھے۔ ایللی اور فرحت جاگ پڑے۔ وہ دونوں ڈر کر رونے لگے۔ ”اماں، اماں، اماں۔“ ادھر مریضہ کراہ رہی تھی۔ برساتی میں دو کھلے عراب تھے، جن پر پٹ نہیں لگے ہوئے تھے۔ ان عرابوں میں ہوا چٹکھاڑ رہی تھی۔ باجرہ نے چلا چلا کر علی احمد، داوی اماں اور سیدہ کو آوازیں دیں، لیکن طوفان کی شدت کی وجہ سے اس کی آواز بھلی منزل تک نہ پہنچ سکی۔ طوفان کی شدت کے ساتھ مریضہ کی حالت بگڑتی جا رہی تھی۔ باجرہ گھبراہٹ میں ادھر ادھر دیکھتی رہی۔ مریضہ کراہ رہی تھی۔ بچے رو رہے تھے۔ ہوا سے محفوظ رکھنے کے لئے اس نے چارپائیاں مریضہ کی گرد کھڑی کر دیں اور ایللی اور فرحت سے کہا کہ انہیں تھامے رکھیں مگر ہوا کے جھونکوں نے چارپائیوں کو اٹھا کر پھینک دیا۔ دونوں بچے چارپائیوں کے ساتھ دیوار سے ٹکرائے۔ بچے ڈر کر جھپٹیں مارنے لگے۔ پھر دھننا۔ ان کی نگاہ مریضہ پر جا پڑی۔ مریضہ دیواروں کی طرح سر چلا رہی تھی۔ اس کا سر اور آنکھیں گھڑی کے پنڈولم کی طرح ہل رہی تھیں۔ آنکھیں پتھرائی جا رہی تھیں۔ دم اکڑ رہا تھا۔ باجرہ گھبرا گئی۔ روتے ہوئے بچے سم گئے۔ بلدیاراں کے اس طوفان کی نسبت وہ طوفان جو مریضہ کے سینے اور آنکھوں میں چلتا ہوا محسوس ہوتا تھا، کہیں زیادہ بھیانک تھا۔ ان کی توجہ بیرونی طوفان سے ہٹ کر صوفیہ کی طرف مبذول ہو گئی۔ ”میں جاتی ہوں۔ میں کسی کو بلاتی ہوں۔“ باجرہ گھبرا کر چلائی۔ صوفیہ کا سر انکار میں اور بھی شدت سے ہلنے لگا۔ پھر ایک ساعت کے لئے صوفیہ کا سر تھم گیا۔ اس کی آنکھوں کی وہ بھیانک مرنی کم ہو گئی۔ اس نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔ صوفیہ نے باجرہ کا ہاتھ تھام لیا۔ میں نے تیری قدر نہ کی۔ اس کی نگاہ میں بے بسی کی ایک عجیب جھلک تھی۔ چند ساعت کے لئے اس نے

طوفان

ابھی وہ محلے کی زندگی سے پورے طور پر محفوظ نہ ہونے پایا تھا کہ ایک روز علی احمد اور صوفیہ آگئے۔ داوی اماں انہیں دیکھ کر چلائی ”علی احمد تو۔“ ”ہاں“ انہوں نے لاپرواہی سے کہا۔ ”یہ بیمار ہے۔“ باجرہ نے دونوں ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ”اللہ بخیر کرے۔ کون بیمار ہے کہیں صوفیہ تو۔“

صوفیہ کے آنے پر سارا محلہ ان کے گھر جمع ہو گیا۔

”اے کیا ہوا صوفیہ کو؟“

”لو خواہ خواہ۔ اچھی بھلی تو ہے صوفیہ۔“

”کیوں صوفیہ کیا بات ہے۔ کون سی تکلیف ہو گئی تھی؟“

صوفیہ کا رنگ زرد ہو چکا تھا اور وہ پلنگ پر پڑی کھانسی رہتی تھی۔

”آرام آجائے گا۔ تو خواہ خواہ فکر کرتی ہے۔“

ایللی نے صوفیہ کو دیکھا۔ اس کے ہاتھ کی مہندی بالکل اڑ چکی تھی۔ انگوٹھیاں اور بھی میلی ہو گئی تھیں۔ مگر اس کا جسم ویسے کا ویسا ہی تھا۔ ماتھے پر شکن اسی طرح پڑی تھی۔ ایللی کو یقین نہ آتا تھا کہ وہ بیمار ہے۔ وہ اس کے قریب جاتے ہوئے ڈرتا تھا کہ کہیں ایک دم سے اس پر جھپٹ نہ پڑے۔ اگر وہ بیمار تھی تو اسکی تیوری کیوں چڑھی۔ بیمار تو گھورا نہیں کرتے۔ نہیں نہیں صوفیہ بیمار نہیں اس نے اپنے دل میں فیصلہ کر لیا۔

اس کے باوجود صوفیہ بیمار تھی اور لوگ روزانہ اس کی عیادت کے لئے ان کے گھر آیا کرتے تھے۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر پڑی رہتی اور نہت کی طرف دیکھتی رہتی۔ ”اے ہے تو کس فکر میں پڑی ہے۔ لڑکی۔“ محلہ والیاں اسے پیار سے گھورتیں۔ ”انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ذرا پرہیز کا خیال رکھ اور بس۔!“

لیکن ان باتوں کے باوجود صوفیہ کا چھت کو گھورتا نہ گیا۔ سارا دن وہ چھت کو گھورتی رہتی اور باجرہ اس کی چارپائی کے گرد یوں گھومتی رہتی۔ جیسے باجرہ شہنشاہ بار ہو اور صوفیہ اس کا بیمار بیٹا ہاویں۔

پھر شام کے وقت جب گرمی بڑھ جاتی تو باجرہ صوفیہ کو سارا دیتی اور وہ آہستہ آہستہ چلتی

اپنی نگاہیں ہاجرہ پر جمائے رکھیں پھر اس کی آنکھ سے ایک موٹا سا آنسو ڈھلک آیا اور مکمل ہر پھسل کر بالوں میں کھو گیا۔ پھر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی اور بازو گر کر ٹکٹنے لگا اور سر ہمیشہ کے لئے ساکت ہو گیا۔ ”اماں“ ایلی نے چیخ ماری۔ ہاجرہ نے سر پیٹ لیا ”صفیہ“ صفیہ۔“

ایک فقیر

طوفان تھم چکا تھا۔ نیچے بڑے کمرے میں پلنگ پر صفیہ کی لاش پڑی تھی اور اس کے گرد محلہ والیاں بیٹھی باتوں میں مشغول تھیں۔ صفیہ کا جسم چادر سے ڈھکا ہوا تھا۔ لیکن اس کا ہاتھ صاف دکھائی دے رہا تھا۔ ایلی نے دو ایک بار صفیہ کی طرف دیکھا، اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ موت کا بہانہ کر کے پڑی ہو۔ جیسے ابھی جاگ اٹھے گی۔ کہے گی ”ایلی بازار سے دو روہا دو۔ ہاجرہ تو میری بیماری کا بہانہ کر کے آرام سے بیٹھی ہے۔ چل اٹھ برتن صاف کر چل اٹھ۔ لاش میں جنبش ہوئی۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ صفیہ کا جو ہڈا کھل کر ٹکٹنے لگا۔ محلہ والیوں نے با آواز بلند کلمہ پڑھنا شروع کر دیا۔ ایلی چیخ مار کر بھاگا ”داوی اماں“ ”داوی اماں“ ”داوی نے اسے قہ لیا۔“ ”تو کیوں بیٹھا ہے۔ یہاں ادھر آ میں تجھے سلا دوں۔“ ”داوی اماں نے اسے بازو سے کچے ہوئے کہا۔

صفیہ کی وفات پر ہاجرہ کئی دن تک روتی رہی۔ رہ رہ کر صفیہ کا وہ فقرہ یاد آتا تھا۔ ”میر نے تمہاری قدر نہ کی۔“ اس وقت اس کی آنکھوں میں فخر بھری چمک لہراتی اور گالوں پر آنر بنے گلتے۔ برسوں کی خدمت گزاری اور عشق کے بدلے اسے ایک فقرہ ملا تھا۔ ”میں تمہاری قدر نہ کی۔“ ہاجرہ اس فقرے کو تھنے کی طرح سینے پر لگائے پھرتی تھی۔ اس ایک فقرہ کی وجہ سے برتری میں بدل گیا تھا۔ وہ اس ایک فقرے کی خاطر ایک بار پھر عمر بھر کسی خدمت گزاری میں بسر کر سکتی تھی۔

صفیہ کی موت سے علی احمد کے گھر کے روز مرہ میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ ایلی اسی طرح ار حند سے انگریزی مایاؤں کی تفصیلات سمجھتا رہا اگرچہ عملی طور پر ان تفصیلات کا کوئی نتیجہ نہ ہوا۔ کبھی کبھار کھڑکی کی درز سے وہ بکوری ڈکوری کے مختلف ساز دیکھتا رہا۔ محلے کے جوان کے ساتھ کرکٹ کے میدان میں جاتا رہا جلیل اور رفیق کے ساتھ قاضی دروازے کے پاس تنگ گلی میں بھاڑ دینے والی کی شوخیوں کو بخور دیکھتا اور داوی اماں کے ساتھ لپٹ کر سوتا رہا۔

ہاجرہ اسی طرح سارا دن باورچی خانے میں برتن ماٹھتی۔ کھانا پکاتی اور علی احمد کی چلیں بھرتی رہی اور فرحت حسب معمول گھر کے کام کرنے کے علاوہ سیلیوں کے گھروں کے پتھر لگاتی رہتی اور داوی اماں اسی طرح گھٹنوں میں سر دینے چولے کے پاس بیٹھی رہی اور اس کے پاس سیدہ خاموشی سے نیکیوں سے زمین کریدتی رہی اور علی احمد وہی پھٹی ہوئی میلی دھوتی باندھے ڈیسک کے رجسٹر میں لکھتے رہے اور محلہ کی چمکادڑیں رات کو احاطے پر چیخ چیخ کر منڈلاتی رہیں۔ بچے کھیلتے رہے۔ بوڑھیاں انہیں گھورتی رہیں اور محلے کے بوڑھے نماز ادا کرنے کے بعد کھانسی ہوئے سر لٹکائے گھروں کے دروازے کھٹکھٹاتے رہے اور صندل داوی اماں کی دیوار پر پھینکنے کے لئے منجھل پوناش کے پٹائے تیار کرتے ہوئے گنگھٹاتا رہا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔ اے دلربا ہوں میں خدا۔“

سارہ صبورہ

پھر ایک دن علی احمد کے یہاں مہمان آئے۔
”ہاں یہی مکان تو ہے۔“

”تم آگے چلی جاؤ۔ گھبرانے کی کیا بات ہے۔ اے ہے تمہارا اپنا محلہ ہے۔“ چاچی حاجیاں کی آواز آئی۔

”کون آیا ہے۔ چاچی؟“ ماں جیواں بولی۔

”اپنے علی احمد کے مہمان آئے ہیں۔“

”کون مہمان آئے ہیں۔ چاچی کن کے گھر آئے ہیں؟“

”مہمان آئے ہیں۔“ ”داوی اماں نے سر اٹھا کر دیکھا۔“ ”دیکھ تو لڑکی کون مہمان آئے ہیں۔“

شام کوٹ سے تو نہیں آئے۔“

”کون آیا ہے؟“ علی احمد قلم ڈیسک پر رکھتے ہوئے بولے اور پھر حسب عادت جلدی سے فیض پینے لگے۔ ہاجرہ باورچی خانے سے نکل کر چپ چاپ دروازے میں آکھڑی ہوئی اس کی آنکھیں ابھی سے پر غم ہو رہی تھیں کہ شاید مہمانوں کے آتے ہی صفیہ کی موت پر اظہار افسوس کرنا پڑے۔ شاید وہ آئے ہی اسی غرض سے ہوں۔ ایلی سہم کر کھڑا ہو گیا۔ فرحت اپنا دوپٹہ سنبھالنے لگی۔ سب میڑھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔ میڑھیوں سے ہلکے ہلکے قہقہوں کی

ہاجرہ مسکرا رہی تھی۔ مگر اس کی مسکراہٹ میں بلا کا اضطراب تھا اور فرحت کے ماتھے پر تل پڑ رہے تھے۔ علی احمد کی مسلسل ہی ہی کی آواز آرہی تھی۔ داری کا ہاتھ کانپے چلا جا رہا تھا اور سیدہ کا کلن بالکل رنگا ہو چکا تھا۔

دیر تک محلے میں وہ لہرس ناچتی رہیں پھر سکون طاری ہو گیا۔ لیکن علی احمد کے گھر میں ایک دبا دبا طوفان ابھر رہا تھا۔ ادھر بڑے کمرے میں باہرہ، فرحت، سارہ، صبورہ بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔ کمرے سے ہلکے لطیف قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ایسے رنگین قہقہے جو محلے کے کسی گھر سے کبھی سنائی نہ دیتے تھے۔ باہر دادی اہل چولے پر گھنٹوں میں سر دیئے بیٹھی تھی اور اس کے پاس سیدہ سر ہاتھوں میں تھامے تیل سے بھری کڑائی کو حسرت ناک نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔ اندر علی احمد قہقہے پہنے بار بار چورنگاہوں سے جھانکتے اور پھر حقے کے کش لیتا شروع کر دیتے اور کھانتے۔ پھر وہ ایک دم اضطراب سے آواز دیتے ”ایلی کی ماں حقہ بھر دو۔“ پھر قلم اٹھا کر لکھنے کی کوشش کرتے اور پھر کھانے لگتے۔ ”ایلی کی ماں کون آئی ہیں؟ لڑکیاں ہیں۔ اچھا تو دور رہا ہے۔ آئی ہیں۔ دور رہا ہے میں یہ لوگ رہتے کہاں ہیں؟ چھانک والے محلے میں۔ اچھا وہ جو سبز کھڑکیوں

تو میں اُمید خیر خیر! اس کی آنکھوں میں گلابی چھینے اڑ رہے تھے۔

ہائے اللہ

ہی ہی ہی۔ اندر علی احمد ہنس رہے تھے۔ ”وہ بات بتانا تو میں بھول ہی گیا جب۔“ کہتے ہوئے وہ چلم اٹھائے چلے آئے اور چولے کے قریب جانے کی بجائے سیدھے ڈالان میں گھس گئے۔ ”ہی ہی ہی جب ہم سب قاضی صاحب کے مکان پر گئے تھے۔ ہی ہی ہی اوھر آؤ نا سارہ صبورہ ہمیں بات سنائیں۔ اس کمرے میں آؤ نا۔ تم شرابی کیوں ہو۔ یہ تمہارا اپنا ہی گھر ہے۔ ہی ہی ہی۔ قاضی صاحب کے گھر کو تو ہم اپنا ہی گھر سمجھا کرتے تھے۔ تم کیوں شرابی ہو۔ آجاؤ آجاؤ۔“

وہ کھڑے ہنسنے جا رہے تھے وادی اماں کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ سیدہ کا ڈوپٹہ کان سے گرنا جا رہا تھا۔

”بھئی فرحت یہ تمہارے کہنے کے بغیر نہیں آئیں گی۔ ٹھیک تو ہے۔ بھئی یہ آداب طور طریقہ کیسے چھوڑیں۔ جب تک میزبان خود نہ کہے کیسے آئیں اور بھی فرحت تو ان کی میزبان ٹھہری۔ کیوں فرحت یہی بات ہے نا ہی ہی ہی۔ آخر بڑے گھرانے کی لڑکیاں ہیں۔ بہت بڑا گھرانہ ہے ان کا، کون نہیں جانتا ان کے گھرانے کو دورا ہے میں۔ اچھا تو فرحت تم انہیں ساتھ لے آؤ۔ اوھر ہی ہی۔“ وہ اپنے کمرے کی طرف چل دیئے۔

رات پڑ چکی تھی۔ لیکن ہاجرہ ابھی باورچی خانے میں بیٹھی انتظار کر رہی تھی کہ علی احمد کھانا کھالیں تو وہ فارغ ہو۔ صبورہ فرحت کے ساتھ گئیں مارنے میں مشغول تھی۔ وادی اماں جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ سیدہ بستر میں لیٹی ہوئی تھی۔ امیلی وادی اماں کی چارپائی پر اونڈھا پڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔ علی احمد اپنے کمرے میں سارہ کو وہ قصہ سنا رہے تھے، جب وہ قاضی صاحب سے پہلی مرتبہ ملے تھے۔

”ہی ہی ہی اور قاضی صاحب نے سمجھا۔ یہاں قریب ہو کر سنا نا۔ انہوں نے سمجھا کہ ہی ہی ہی اندر میرے میں نہ جانے کون ہے۔ ہی ہی ہی۔ ہاتھ چلانے شروع کر دیئے یوں۔ یوں ہی ہی ہی۔“ ہلکی سی باریک ہنسی کی آواز سنائی دی۔ ”ہی ہی ہی۔“ علی احمد بے تماشائے چلے جا رہے تھے۔ ان کے کمرے میں نہ جانے کیا گڈمڈ ہو رہا تھا۔ جیسے واقعی قاضی صاحب پکڑ دھکڑ کر

شام کو ارجمند نے آواز دی۔ ”آیا“ امیلی چلائی۔ لیکن نہ جانے کیوں ارجمند امیلی کا انتظار کرنے کے بجائے چپ چاپ اوپر آگیا۔ حالانکہ وہ عام طور پر امیلی کے گھر آئے سے گریز کیا کرتا تھا ”وادی اماں سلام امیلی گھر ہے کیا؟“ اس نے چوری چوری ڈالان کی طرف دیکھا جہاں سارہ اور صبورہ بیٹھی تھیں اور پھر دروازے سے باہر اس مقام پر کھڑا ہو گیا، جہاں ڈالان میں بیٹھی ہوئی لڑکیاں اسے اچھی طرح دیکھ سکتی تھیں۔ اس نے جیب سے ریشمیں روپے نکالا اور اسے گروں پر پھیرنے لگا پھر وہ ایک انداز سے کھڑا ہو گیا۔ ”بیٹھ جا۔“ وادی اماں بولی ”نہیں وادی اماں میں ٹھیک ہوں۔“ ارجمند نے چوری چوری کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا اور پھر آواز نکالے بغیر کوئی شہر گنگنانے لگا۔ امیلی سامنے حیران کھڑا تھا۔ کیونکہ ارجمند جان بوجھ کر اس کی طرف دیکھنے سے گریز کر رہا تھا۔ کچھ دیر تو امیلی دیکھتا رہا پھر چپکے سے اس کے قریب آکھڑا ہوا اسے یوں قریب دیکھ کر ارجمند بولا ”امیلی وہ کتاب تمہارے پاس ہے نا؟“

”کوئی کیسی کتاب؟“ امیلی نے پوچھا۔

”بھئی وہی۔“ وہ با آواز بلند بولا۔ ”جو ماسٹر صاحب کل پڑھا رہے تھے کیا نام ہے اس کا۔“ وہ پھر دبلی دبی آواز میں امیلی سے کہنے لگا۔ واہ وا کیا چیزیں ہیں۔ کیا بکوری ڈکوری ہیں۔ ہاں بھئی تو وہ کتاب ہے جس میں سے آج سوال کرنے ہیں۔“ وہ پھر وادی اماں کو سنانے کے لئے چلایا۔ ”بڑا والا نہیں چھوٹا والا ایڈیشن وہ گلابی گلابی سی۔“ اس نے اندر ڈالان کی طرف اشارہ کیا۔ ”کیا چیز ہے واہ۔“ امیلی کی کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ وادی اماں ارجمند کو گھور رہی تھی۔ اس کے ریشمیں رومال کو گھور رہی تھی۔ دھنستا اس نے وادی اماں کی کڑی نگاہوں کو محسوس کیا۔ ”اچھا۔“ وہ بولا ”زرا ہمارے گھر آؤ نا امیلی۔ وہ چھوٹی گلابی گلابی۔ چھوٹا والا ایڈیشن۔ آؤ گے نا۔“ اس نے اندر ڈالان کی طرف دیکھا۔ ”میں انتظار کروں گا۔ ہائے کیا چیز ہے۔“ اور وہ چلا گیا۔

ارجمند کے جانے کے بعد رفیق آگیا اس کی نگاہیں یوں مطمئن تھیں، جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو۔ ”پھوپھی کہاں ہے؟“ اس نے زیر لب کہا ”شاید اوھر ہو۔“ وہ اپنے آپ ہی بولا اور ڈالان میں داخل ہو گیا۔ پھر وہ ہٹھکا ”اوہ۔ مجھے تو پتہ ہی نہ تھا۔“ اس نے گویا دیوار سے مخاطب ہو کر معذرت کی اور واپس جانے لگا۔ ”رفیق ہے۔“ ہاجرہ نے آواز دی۔ وہ رک گیا۔ ایک سرسری مگر بھیگی نظر سارہ اور صبورہ پر ڈالی ایک ہلکی سی آہ بھری۔ ”وہ کہا تھا نا پھوپھی جی نے سودا لانا“

چاپ گھنٹوں میں سردیے بیٹھی تھی۔

اس نے پہلی مرتبہ داوی اماں پر غصہ محسوس کیا۔ کیا وہ گھنٹوں میں سردیے اور سجدے کرنے کے علاوہ اور کچھ نہ کر سکتی تھی۔ ویسے محلے کے لڑکوں کے خلاف تو اس کی زبان قینچی کی طرح چلتی تھی۔ جب صفر اس کے مکان کی دیوار پر پٹاخہ چلاتا تو اس وقت وہ کیوں جینتی تھی۔ اے ہے مکان کی دیواریں بل گئی ہیں۔“ اب کیا مکان کی دیواریں نہیں بل رہی تھیں۔ پھر وہ یوں چپ کیوں بیٹھی تھی اور فرحت کے پاس بیٹھی ہوئی وہ بھیگی بلی سارہ جھکی جھکی نگاہوں سے گھر والوں کو مٹول رہی تھی۔ اور صبورہ یوں چپ چاپ بیٹھی تھی جیسے کچھ کھو گیا ہو۔ ایللی نے پہلی مرتبہ سارہ کی طرف نگاہ بھر کر دیکھا۔ بھیگی بلی کیسی چور نگاہوں سے دیکھتی تھی۔ اسے واضح طور پر معلوم نہ تھا کہ وہ اسے بری کیوں لگ رہی ہے۔ لیکن وہ اسے بری لگ رہی تھی۔

ادھر سے ابا کے حقے کی گڑ گڑاہٹ سن کر اس نے منہ بنایا۔ بڑے علی احمد بنے پھرتے ہیں۔ ہی ہی ہی۔ فضول دانت نکالتے رہنا۔ باہر داوی اماں بیٹھی بار بار دالان کی طرف دیکھ کر آہیں بھر رہی تھی۔ اور سیدہ چپ چاپ بیٹھی آلو چھیل رہی تھی۔ باہرہ تو خیر برتن دھونے کے سوا کچھ کر ہی نہ سکتی تھی۔ ایللی دل ہی دل میں مل کھاتا رہا اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں مل کھا رہا ہے۔

پھر گھر میں یہ دستور ہو گیا علی احمد سارا دن اپنے کمرے میں بیٹھے رہتے۔ اگرچہ دن میں چار ایک مرتبہ خود حقہ کی چلم اٹھا کر دالان کی طرف چلے آتے حالانکہ انہوں نے کبھی خود چلم نہ بھری تھی اور پھر باہرہ کے کمرے میں جھانکتے۔ ”ہی ہی ہی کیا ہو رہا ہے۔ بھئی۔“

سارہ صبورہ ”گپیں چل رہی ہیں۔ خوب خوب۔ صبورہ کو گپیں بڑی پسند ہیں۔“
دن میں دو ایک بار ارحند آجاتا۔ ”ایللی، ایللی بھی وہ سوال چھٹی مشق کا پندرہواں سوال وہ کیسے ہو گا۔ اپن سے تو نہیں ہوتا۔ بھئی واہ آج تو صندلی پیرا ان، زیب تن ہے۔ یہ آج معلوم ہوا کہ چاہ غب غب صندلی پیرا ان پر کیا ہمار دیتا ہے۔“

رفیق آکر پوچھتا ”چھو بھی آج مچھلی بہت کستی بک رہی ہے، کیا خریدو گی؟“ اور چھپ چھپ کر اندر جھانکتا آہیں بھرتا۔

رات پڑتی کو علی احمد آتے۔ ”ہی ہی ہی صبورہ سو گئی کیا ابھی نہیں سوئی یہی عمر تو ہے گپیں ہانکنے کی ہی ہی ہی اور سارہ۔ سارہ تو دیر تک

رہے ہوں۔ ہنسی کی ہلکی آواز آئی پھر بند ہو گئی۔ ”ہی ہی ہی۔“ بھاری آواز بھی بند ہو گئی۔ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر دفعتاً ”ہائے اللہ کی آواز آئی اور پھر علی احمد کے کمرے پر موت سی خاموشی چھا گئی۔

جائے نماز پر بیٹھے ہوئے دعا مانگتے مانگتے داوی اماں کے ہاتھ لرزے جیسے دفعتاً ”اسے تم کا عارضہ ہو گیا ہو پھر وہ دھپ سے سجدے میں گر گئی۔ سیدہ نے آہ بھر کر رضائی منہ پر لے لی۔ مشین پر کپڑا سینے سے باہرہ کا ہاتھ کلپا اور دستہ مشین کی چرخی سے باہر نکل آیا اور باہرہ کی پھٹی نگاہوں سے صبورہ اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔ فرحت نے ماں کی طرف دیکھا اس رنگ زرد پڑ گیا۔ لیکن صبورہ اسی طرح خوشی سے چلاتی رہی ہنسی رہی پھر دفعتاً ”اس نے عمر کیا۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو اور وہ خاموش ہو گئی۔

ایللی نے سر اٹھایا۔ چاروں طرف گھبرا کر دیکھا۔ نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ جیسے بہت کچھ ہو تھا۔ اس کے دل پر ایک بوجھ سا پڑ گیا۔

کچھ بھی تو نہیں

چواؤں۔ ٹھک علی احمد کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔ تمام گھر پر بھیانک سکوت طاری تھا۔ موت کا سکوت، موت! ایللی کانپ گیا۔ اس کی نگاہوں کے سامنے صفیہ آگئی۔ جیسے وہ اس روز چارپائی پر پڑی دم توڑ رہی تھی۔ ایللی نے محسوس کیا کہ علی احمد کے ساتھ سارہ کمرے میں اسی طرح سر پٹک رہی تھی۔ ادھر سے ادھر۔ ادھر سے ادھر۔ آنکھیں پھڑپھڑا رہی تھیں۔ اس کی وجہ سے اس کی چیخ نکل گئی۔ داوی اماں اچک کر اس کے پاس آگئی۔ ”کیا ہے داوی اماں۔ وہ زیر لب گنگناتا۔ ”کچھ نہیں ایللی۔“ داوی اماں نے کہا ”کچھ بھی تو نہیں۔ سو جا تو۔“ اور اسے کانپتے ہوئے ہاتھ سے تھپکنے لگی۔

اگلے روز جب ایللی بیدار ہوا تو اس نے محسوس کیا کہ گھر پر وہی بھیانک خاموشی چھا ہوئی ہے۔ اس صبح وہ تمام دنیا کے خلاف غصہ محسوس کر رہا تھا وہ کمرہ غلاطت سے بھرا تھا۔ وہ وہ محلہ وہ شہر سب گندگی سے بھرے تھے۔ اس نے محسوس کیا کہ محلے والے بھی اندھے اندھے اور لالچ۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ گھر وہ محلہ وہ شہر چھوڑ کر کہیں چلا جائے جہاں غلاطت ہو جہاں گندگی نہ ہو جہاں بھیانک خاموشی نہ چھائی ہو۔ اس کی نگاہ داوی اماں پر جا پڑی جو

جانگے کی عادی ہے۔ کیوں سارا۔ اچھا بھئی۔

یہ کہہ کر وہ باہر نکل آتے۔ اور پھر دالان سے آواز دیتے ”فرحت کی ماں صبورہ سو جائے تو مجھے آج کا حساب لکھوا دیتا۔ اور۔ اور۔“ اور وہ عجیب انداز سے ہنسنے لگتے۔

اس پر باجرہ کہتی ”ہائے لڑکیو اتنی دیر ہو گئی ہے اب سو جاؤ۔“ اور فرحت فوراً لیٹ کر کہتی۔ ”بھئی ہم تو اب سو تے ہیں۔ نیند آگئی۔ آؤ صبورہ تم بھی جاؤ۔“ اور وہ زبردستی صبورہ کو لٹا لیتی اور پھر آنکھیں بند کر کے یوں پڑ جاتی جیسے نہ جانے کب کی سوئی ہوئی ہو۔

سارہ چپ چاپ اپنی چارپائی پر چلی جاتی مگر وہ لیٹی نہ تھی۔ ایک طرف چپ چاپ بیٹھ رہتی۔ اس پر باجرہ محسوس کرتی۔ جیسے کمرے میں گھنٹن پھیل رہی ہو اور وہ کھسیانی ہنسی ہنس کر کوئی بات چھڑنے کی کوشش کرتی مگر سارہ چپ چاپ بیٹھی رہتی۔

پھر جب صبورہ سو جاتی تو علی احمد کی آواز آتی ”فرحت کی ماں۔ فرحت کی ماں آج کا حساب تو لکھوا دو آکر۔ صبورہ سو گئی ہے نا۔“

علی احمد کی آواز سن کر دادی اماں کا سر ہلنے لگتا اور وہ رکوع کے بغیر ہی سجدے میں گر جاتی۔ ادھر سارہ آنکھوں سے باجرہ کی طرف دیکھتی۔ باجرہ اٹھ بیٹھتی اور سارہ چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑتی۔ جب وہ صحن سے گزرتی تو سیدہ اپنا منہ رضائی میں لپیٹ لیتی۔ اہلی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا لیکن دادی اماں نماز پڑھتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر اسے تھکنے لگتی۔ پھر کچھ دیر کے بعد باجرہ ان کے کمرے میں جھانکتی۔ ”سو گیا؟“ اہلی کو جائے دیکھ کر گھبرا کر بات بدل لیتی اور باجرہ کے جانے کے بعد گھر پر ہنگامہ خیز سکوت چھا جاتا۔

پھر ایک رات جب صبورہ اور فرحت حسب معمول باتیں کرتے کرتے لیٹ گئی تھیں اور سارہ دوپٹہ اوڑھے یوں صبورہ کی چارپائی کے کونے پر بیٹھی تھی۔ جیسے اسے ابھی اٹھ کر کہیں جانا ہو اور باجرہ منظر کھڑی تھی کہ کب آواز پڑے اور وہ سارہ کو راستہ دکھا کر اپنے فرض سے فارغ ہو جائے کہ دفعتاً علی احمد کی آواز سنائی دی۔ جیسے وہ بالکل ہی بدلی ہوئی ہو۔ ”صبورہ جاگ رہی ہے۔“ انہوں نے سر تال میں کہا۔

صبورہ! باجرہ کے ہونٹ ہلے۔ اس نے حیرت سے چھوٹی سی بچی کی طرف دیکھا۔ جس نے ابھی غنواں شباب میں قدم رکھا ہی تھا۔

صبورہ! سیدہ کی آنکھیں یوں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ جیسے دفعتاً بینائی سے محروم ہو گئی

ہوں۔

دادی اماں نے صبورہ کا نام سنا تو اس نے پہلی ہی رکعت میں سلام پھیر دیا۔

”کس نے بلایا ہے مجھے؟“ صبورہ اٹھ بیٹھی ”مجھے بلایا ہے مجھے؟ چچا نے بلایا ہے۔“ اس کی آنکھوں میں عجیب سی چمک لہرائی ”مجھے بلایا ہے۔ مجھے۔“ اور وہ شور مچاتی چلاتی ہوئی بولتی ”آ تو رہی ہوں میں۔“ اور پھر آپ ہی آپ علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑی۔ یہ دیکھ کر سارہ بیٹھی بیٹھی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ جیسے کوئی گھنڈی گر کر اوندھی ہو گئی ہو اور فرحت نے منہ موڑ کر اوپر کبل لے لیا اور باجرہ بیٹھی بیٹھی آنکھوں سے دیکھتی رہی۔

چراؤں ٹھک دروازہ بند ہو گیا۔ گھر پر سناٹا چھا گیا۔ اہلی نے دانت پیس کر رضائی پر گھونٹ مارا۔ اس روز دادی اماں اسے تھکنا بھول گئی۔ اس نے یہ بھی نہ کہا ”سو جا اہلی۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

لولیٹر

اگلے روز اہلی ارجمند کے گھر بیٹھا تھا اور ارجمند اسے سمجھا رہا تھا ”بڑی والی کو نہیں چھوٹی والی کو۔ وہ جو گلابی گلابی سی ہے۔“ ”اچھا“ اہلی نے سمجھے بغیر کچھ کہنے کی غرض سے کہا۔ ارجمند نے زیر لب کہا ”سب بڑی والیاں بے کار ہوتی ہیں۔ ان سے عشق نہیں ہو سکتا۔ اور اس لئے انہیں لولیٹر نہیں لکھا جا سکتا اور اگر لکھو بھی تو بیکار ہے، پوچھو کیوں؟ اس لئے کہ ان کا دل دھک دھک نہیں کر سکتا اور دل دھک دھک نہ کرے تو پھر عشق کیونکر ہو سکتا ہے۔ سمجھے کیا سمجھے۔ تو جان من لولیٹر چھوٹی والی کو لکھا جائے بکوری ڈکوری کو۔“

”لولیٹر۔“ اہلی نے ہونٹوں پر زبان پھیری۔

”ہاں۔“ ارجمند چلایا۔ ”بالکل موزوں ہے عمر اس کی لولیٹر کے لئے اور اگر ہم نے لولیٹر نہ لکھا تو وہ خفا ہو جائے گی کہ لولیٹر بھی نہ لکھا مجھے بڑے عاشق بنے پھرتے تھے اور اس کا دل دکھے گا۔ سمجھے۔“

لیکن اہلی گھبرا رہا تھا۔ ”اگر اس نے علی احمد سے کہہ دیا تو۔“ ”انہوں“ ارجمند بولا ”تم انہیں نہیں جانتے۔“ ارجمند اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر اینڈی باباؤں لولیٹر کے سہارے جیتی ہیں جب تک لولیٹر نہ پڑھ لیس طبیعت کو چین نہیں پڑتا تازہ موصول نہ ہو تو پرانے پڑھ کر وقت

کاٹتی ہیں۔ ان کے ٹریک لویٹروں سے بھرے ہوتے ہیں اور چاہے کوئی لکھ دے انہیں۔ پڑھتی ضرور ہیں اور پھر کیا مجال جو کسی کو بتائیں۔ انہوں بالکل نہیں جانتیں۔“

”بالکل نہیں۔“

”انہیں کیا ضرورت ہے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر کیا۔ پھر پھر، اڑ اور ایک لویٹر۔“ ارجمند بولا۔

”اچھا۔“ ایلی نے تھوک نکلنے کی بے کار کوشش کی۔ ”کس چیز سے لکھیں۔ میں بتاؤں

آنسوؤں سے لکھیں۔“

”مگر آنسو آئیں گے کہاں سے۔ ہم تو بھی بننے کے قائل ہیں۔ رونے کے نہیں۔ البتہ

خون سے لکھنا آسان رہے گا۔“

”وہ کیسے؟“

”پن جھبولیں گے کیا؟“

”تکلیف نہ ہوگی کیا؟“

”واہ اس میں کیا ہے۔ لیکن سوال یہ ہے لڑکیاں خون پسند نہیں کرتیں۔ اس لئے سیاہی

سے لکھ دو۔“

”اچھا لیکن لکھیں کیا؟“ ایلی نے پوچھا ”یہ مسئلہ تو چنگی بجانے میں حل ہو جائے گا ہاں۔“

ارجمند نے کہا ”یہ اتنے پریم شاستر پڑے ہیں۔ ان میں سے جن لو۔“ ارجمند نے کشمیری بازار کی چھپی ہوئی چار ورتی کتابوں کا ایلی کے سامنے ڈھیر لگا دیا۔

سارا دن وہ خط کا مضمون چھانٹتے رہے۔ آخر شام کے چار بجے کے قریب خط مکمل ہو

گیا۔ اس میں زیادہ تر شعر لکھے ہوئے تھے۔ ”مائی ڈیرٹی لکھوں، میری جان لکھوں یا دلہا

لکھوں۔ اے جان من میں تم کو القاب کیا لکھوں۔“ یہ شعر تو القاب کی حیثیت رکھتا تھا۔ نفس

مضمون کا شعر یہ تھا ”اس حسن ترے کی بیوی نے مرے جینٹل ہارٹ کو توڑ دیا۔ جب سے تم

پر ہوا ہوں شیدا ناٹ سلیٹنگ چھوڑ دیا۔“ اس شعر کے چناؤ میں بڑی لے دے ہوئی تھی مگر

ارجمند نے صاف اعلان کر دیا تھا کہ اگر یہ شعر نہ لکھا گیا تو لیٹر ادھورا رہ جائے گا۔ کیونکہ سکول

کی لڑکیاں صرف انہی شعروں کو پسند کرتی ہیں۔ جن میں انگریزی کی چاشنی ہو ورنہ وہ اپنا لویٹر

مسی سہیلی کو بھی نہیں دکھا سکتیں کہ وہ یہ نہ سمجھ لے کہ اسے کسی گنوار نے لویٹر لکھا ہے۔

ارجمند کی بات معقول تھی اور نہ بھی ہوتی تو بھی ایلی لکھنے پر مجبور تھا کیونکہ اسے تو لویٹر

کے متعلق علم ہی نہ تھا۔ وہ یہ نہ جانتا تھا کہ لویٹر لکھنے سے ہو گا کیا۔ شام تک لویٹر تو مکمل ہو

گیا لیکن اسے صبرہ تک پہنچانا بڑا مشکل مرحلہ تھا۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ اس کی فیض کی وہ

جیب جلتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔ جس میں اس نے لویٹر اس کی جیب میں ڈال دینا اور جیب

میں نہ ڈال سکو تو اسے دور سے دکھانا۔ دیکھ کر وہ بے قرار ہو جائے گی اور خود ہی منت کر کے

بانگ لے گی۔

دوسری تجویز تو ایلی کے لئے قطعی طور پر ناقابل قبول تھی دکھانا بڑی جرأت کا کام تھا۔

البتہ چوری چوری اس کی جیب میں رکھنا شاید ممکن ہو۔ لیکن دقت یہ تھی کہ اس کی فیض میں

جب نہ تھی۔ عجیب فیض پہنتی تھی۔ وہ اس نے پہلی مرتبہ دیکھا کہ اس کی فیض شروع سے

لے کر آخر تک انوکھی تھی۔ جا بجا ہنسی پڑی ہوئی تھیں کہیں کھلی کہیں تنگ کہیں کچھ کہیں کچھ

ایسی فیض تو محلہ بھر میں کسی کی نہ تھی۔

پھر جب دونوں ہمیش بیٹھی باتیں کر رہی تھیں تو دفعتاً اسے لویٹر کا خیال آیا اور پسند

آگیا۔ دل دھڑکنے لگا لیکن ہمت کر کے اس نے وہ دفعہ اس کے جوتے میں ڈال دیا۔ جلدی میں

اسے یہ بھی معلوم نہ ہو سکا کہ وہ جوتا کس کا تھا۔ سارہ کا یا صبرہ کا۔

اگلے دن وہ علی احمد کے روبرو سر لٹکائے کھڑا تھا۔ ”بول“ وہ کہہ رہے تھے ”سچ بچ بتا

دے۔“ اور سارہ ان کے قریب کھڑی مسکرا رہی تھی ”بتا“ وہ گرج رہے تھے ”ہوں تو تمہیں

نے شرارت کی ہے شرم نہیں آتی۔“

”شرم نہیں آتی شرم نہیں آتی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ غصے بھری

آوازیں، اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ دیوانہ وار چلانے لگے۔ شرم نہیں آتی اور علی احمد کے سامنے

تن کر کھڑا ہو جائے شرم نہیں آتی۔ ہی ہی ہی اور باہر نکل جائے اس مکان سے دور۔ اس شر

سے دور۔

”دفع ہو جاؤ ہماری نظروں سے دوڑو جاؤ۔“ علی احمد گرجے اور ایلی چپ چاپ آکر چارپائی

پر پڑ گیا۔

تمام گھر میں چاروں طرف شور مچا ہوا تھا۔

بیداریاں

بام آباد

چھٹی ختم ہونے پر علی احمد کا تبادلہ بام آباد ہو گیا، لیکن علی احمد تن تنہا بام آباد جانے کے لئے تیار نہ تھے۔

علی احمد تنہائی سے ڈرتے تھے شاید وہ اپنے آپ سے خائف تھے وہ کمرے میں اکیلے سونے لگتے تھے۔ اگر سوتے میں ان کے کمرے سے لوگ چپ چاپ نکل آتے تو جو نبی آخری آدمی باہر نکلتا، وہ گھبرا کر جاگ اٹھتے۔ اسی وجہ سے ان کا کسی کمرے یا مکان میں اکیلے رہنا ممکن نہ تھا۔ تنہائی کے علاوہ خاموشی بھی ان پر گراں گزرتی تھی۔ رات کے وقت اگر ان کی آنکھ کھل جاتی تو وہ اسی چھائی ہوئی خاموشی سے ڈر کر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتے تاکہ اپنی آواز کا سہارا لیں یا وہ اپنی بیوی کو پکارتے اور یا حقہ بھر کر اس کی گڑگڑ سے تسکین حاصل کرنے کی کوشش کرتے۔ لہذا بام آباد تنہا جانا کیسے ممکن تھا۔ ایسا کی ماں ان کے ساتھ جانے کی خواہشمند نہ تھی وہ جانتی تھی کہ اسے ساتھ لے جانے سے علی احمد کا مقصد صرف یہی تھا کہ اپنا کمرہ آباد رکھنے کے لئے گھر میں ایک عورت کی موجودگی کا بہانہ قائم ہے۔

اس روز علی احمد دادی اماں کے پاس چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دادی اماں کہہ رہی تھیں ”اے ہے۔ لڑکی اگر تو ساتھ چلی جائے تو کم از کم علی احمد کو روٹی کی تکلیف تو نہ ہوگی۔“ اور دروازے سے گئی ہوئی باجرہ رو رہی تھی۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ گر رہے تھے۔

”اللہ رکھے تیرے بال بچے ہیں تو ہی تو اس گھر کی مالکہ ہے تو ساتھ جائے گی تو ہی گھر بے کانا۔“

ہی ہی ہی ہی۔ شرم نہیں آتی۔
قاضی صاحب تو سمجھ لو ہمارے بھائی تھے۔ ذرا قریب ہو جاؤ نا۔ شرم نہیں آتی۔
شرم نہیں آتی۔ شرم نہیں آتی۔ محلے کے کوئے چلا رہے تھے۔
چراؤں، ٹھک، علی احمد کا دروازہ بند ہوتے ہوئے کراہ رہا تھا شرم نہیں آتی۔
غصے میں بھنا کر ایلی نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سوجھا ہوا تھا۔
کنپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ ”شرم نہیں آتی۔“ وہ بہ آواز بلند چلایا لیکن گھیس گھیس کے علاوہ
اس کے منہ سے کچھ نہ نکل سکا۔ بے بسی اور لا چاری کی وجہ سے اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”نہ میں نہیں بنتی مالکہ اس گھر کی“۔ ہاجرہ نے ہنسی لے کر کہا۔ ”بہت چاکری کر دیکھی ہے۔“

داوی بولی۔ ”آخر تو نہ جائے گی تو مگر زاہد کیسے ہو گا۔“ ”ہاجرہ نے کہا۔ میرے بغیر انہیں کسی چیز کی کمی ہے کیا۔“

”چل چھوڑا اب۔“ داوی اماں بولی۔

پھر نہ جانے کیسے چند ہی منٹوں میں محلہ والیاں آپہنچیں جیسے انہوں نے پہلے ہی سے پروگرام بنا رکھا ہو۔

”اے ہے کیوں نہ جائے گی تو“ چاچی حاجاں ہاتھ چلا کر بولی ”اللہ رکھے تو اس گھر کی مالک ہے۔“

”لو یہ سنو۔“ ماں جیواں نے ہاجرہ کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا ”اللہ عمر دراز کرے تیرے بچوں کی تو نہ جائے گی اپنے گھر تو ہو گا کیا۔“

”تو ان آنے جانے والیوں کی کیا پروا کرتی ہے آتی ہیں تو آجائیں۔ آئیں گی اور چلی جائیں گی۔ ان کل مونیوں کا کیا ہے جی۔ گھر تو تیرا ہی ہے نا۔ اپنے لئے نہیں تو ان بچوں کے لئے تجھے ضرور جانا چاہئے۔“

محلے کی بوڑھیاں ہاجرہ کے گرد چیلوں کی طرح منڈلانے لگیں۔ ان کی چیخیں سن کر امیلی نے محسوس کیا کہ بام پور کا طوفان آیا ہی چاہتا ہے۔ پہلے تو ہاجرہ نے جلی کئی شانے کی کوشش کی پھر اس نے بچکیوں سے احتجاج کیا اور بالاخر خاموش ہو گئی اور اس کی خاموشی پر ایک ہنگامہ بپا ہو گیا۔

”ہاجرہ جائے گی، ہاجرہ جائے گی۔“

”اے ہے کیوں نہ جائے اپنے گھر۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد ہنسنے لگے ”تو سامان باندھ دو نا اس کا۔“ اور سامان باندھا جانے لگا

اور دو روز میں وہ سب بام آباد پہنچے۔

بام آباد ایک نیا شہر تھا۔ لیکن جب امیلی نے اسے دیکھا تو اس میں کوئی ایسا نیا پن دکھائی نہ دیا۔ امیلی کا خیال تھا کہ نیا شہر بھی ویسا ہی ہو گا جیسے نیا گھر ہوتا ہے لیکن اسے پہلی بار معلوم ہوا کہ نیا شہر نے گھر سے قطعی طور پر مختلف ہوتا ہے۔

بام آباد ایک ویرانہ تھا، وسیع ویرانہ۔ اس کی سڑکیں بے تحاشہ چوڑی تھیں کہ سڑک پار کرنا مشکل ہو جاتا۔ پختہ سڑکیں تو درحقیقت بہت چھوٹی تھیں مگر ان کے ارد گرد بہت ساری زمین خالی پڑی ہوئی تھی۔ بازاروں کے دونوں طرف دکانوں کی جگہ جھونپڑیاں بنی تھیں۔ جن میں عجیب سی دکانیں لگی ہوئی تھیں۔ سڑک کے درمیان دو چوک آتے تھے۔ وہ چوک اتنے وسیع تھے کہ ایک طرف سے دوسری طرف چلتے چلتے اپلی تھک جایا کرتا۔ علی پور کا آصفی محلہ اس ایک چوک میں سا سکتا تھا۔ سڑک ختم ہوتے ہی ویرانہ شروع ہو جاتا پھر ہسپتال کی عمارت آتی جس پر ہر وقت موت کا ماسکوت طاری رہتا۔ دائیں طرف ہائی سکول کی عمارت تھی۔ ایک بہت بڑی پختہ اور خوبصورت عمارت شکل و صورت میں وہ انگریزی کے حرف ای (E) سے ملتی تھی۔ بڑی عمارت سے ہٹ کر کچے کمروں کی ایک لمبی قطار تھی اور اس سے مغرب کی طرف ایک مربع بلڈنگ تھی جس کے سامنے بہت بڑا چھانگ لگا ہوا تھا۔ یہ سکول کا بورڈنگ ہاؤس تھا۔ سکول کے ارد گرد وسیع میدان تھے۔ جن میں ریت اڑتی تھی۔ ریت میں کہیں کہیں جھانپا لگی ہوئی تھیں۔ سکول سے پرے یہاں کھجور کے درخت لگے ہوتے تھے اور سڑک پر اونٹنوں کے قافلے آتے جاتے رہتے تھے۔

سکول سے بہت دور شہر کے دوسرے سرے پر علی احمد کا مکان ایک گلی میں واقع تھا۔ اس مکان میں چار کمرے تھے۔ ایک بہت بڑا صحن جس میں ایک کونے پر خاردار درخت لگا تھا۔ مکان کے ایک طرف کئی ایک غریب کنبے آباد تھے۔ وہیں ایک کوٹھڑی میں مالی رہتا تھا اور اس کا بیٹا گھل رہتے تھے۔ دوسری طرف ایک گھوڑا ڈاکٹر رہتے تھے، جن کا رنگ بے حد کالا تھا مگر جن کی پیشانی عراب دار تھی۔ ڈاکٹر کا بیٹا فرید بھر پور جوان تھا۔ اس کا منہ کتنا چوڑا تھا اور اس کا جسم کس قدر پھیلا پھیلا سا تھا۔ ڈاکٹر کے گھر میں دو جوان لڑکیاں تھیں۔ زاہدہ اور عابدہ، جو ہر وقت نمازیں پڑھنے میں لگی رہتی تھیں۔ ان کی آنکھیں موٹی موٹی تھیں۔ لیکن وہ اس قدر کالی کیوں تھیں۔ ان کی آوازیں یوں سنائی دیتی تھیں جیسے گھنٹیں بج رہی ہوں۔ وہ دونوں فرحت کی سیلیں بن گئیں۔ اس بات پر امیلی کو بڑا غصہ آیا۔ اسے فرحت کی سیلیوں سے بے حد چڑھو مٹی تھی۔ فرحت کی سیلیوں کا خیال آتے ہی اس کی نگاہوں تلے سارہ اور صبورہ آجائیں اور پھر آواز آتی، ”سارہ سو گئی ہے کیا۔“ اور پھر چراؤں، ٹھک دروازہ بند ہو جاتا۔ ”ہونہ، سیلیں۔!“ امیلی کے دل میں غصے کی ایک لہر اٹھتی اور وہ ہوا میں ایک گھونٹہ چلا دیتا۔

زاہدہ اور عابدہ نے صحن کی درمیانی دیوار سے ایک اینٹ نکال رکھی تھی تاکہ آپس میں باتیں کر سکیں اور علی احمد آتے جاتے دزدیدہ اور حسرت بھری نگاہوں سے اس سوراخ کی طرف دیکھا کرتے اور ہاجرہ علی احمد کی نگاہوں کو دیکھ کر اپنا سینہ تھام لیا کرتی ہائے اللہ اب کیا ہو گا اور اہلی محسوس کرتا کہ اب وہ سوراخ بڑا ہو جائے گا۔ بڑھتے بڑھتے دروازہ بن جائے اور پھر ایک دروازہ آواز آئے گی۔ زاہدہ سو گئی کیا اور عابدہ چپکے سے دروازے سے نکل کر گھر میں آجائے گی اور پھر علی احمد کے کمرے میں کھس جائے گی۔ پھر دروازہ بند ہو جائے گا اور پھر۔ پھر۔ لیکن غصے سے اس کا منہ اس قدر سرخ ہو جاتا کہ ”پھر“ کے متعلق اسے کوئی دلچسپی نہ رہتی۔

ر فیتقال

ہام آباد میں سب سے پہلی عورت جو ان کے گھر آئی ر فیتقال تھی۔ ”بی بی کوئی کم ہووے تیں ڈسوتا“ اس کے انداز میں بے بسی کی جھلک نمایاں تھی۔ لیکن نہ جانے کیوں اہلی نے محسوس کیا کہ اس کی جھکی جھکی آنکھیں نہ دیکھنے والی نظر آنے کے باوجود دیکھتی تھیں۔ ہاجرہ پہلے ہی روز ر فیتقال کی دکھ بھری کہانی سن رہی تھی اور اس کا پلو بھیگا ہوا تھا۔ اہلی نے ایک نظر دونوں کو دیکھا اور پھر غصے سے بے تاب ہو کر باہر چلا گیا۔ ر فیتقال روزانہ کے یہاں آنے لگی۔ اس کے ساتھ اس کا چھوٹا بیٹا گلاں بھی ہوتا تھا۔ اگر گھر کے کام کاج میں ہاجرہ کا ہاتھ بٹاتی اور اس دوران میں علی احمد خلاف معمول خود ہم اشائے باورچی خانے میں آجایا کرتے۔

”اوہ۔ ر فیتقال ہے۔ کیا حال ہے ر فیتقال۔ اچھی تو ہے تو۔ بڑی دیر کے بعد دیکھا۔“ اور ر فیتقال مسکراہٹ بھینپنے کی کوشش کرتی اور نظریں جھکا لیتی اور علی احمد اپنے آپ باتیں کرتے کرتے تھک جاتے اور پھر اپنے کمرے میں چلے جاتے اور وہاں پہنچ کر آواز دینے ر فیتقال ذرا آتا تو۔“ اس پر ہاجرہ کی تیوری چڑھ جاتی اور ر فیتقال مسکرا کر سر جھکا لیتی جیسے سب سمجھتی ہو اور چپ چاپ بیٹھی کام کئے جاتی۔

لیکن اہلی کو محسوس ہوتا جیسے اس کی خاموشی میں ہاں کی جھلک ہو جیسے اس کا جی چاہتا کہ اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں چلی جائے اور پوچھے آپ نے بلایا ہے جی لیکن وہ بیٹھے رہے پر مجبور تھی۔ بی بی کیا کہے گی اور بی بی بات بات پر کچھ نہ کچھ کہا کرتی تھی آواز پڑنے پر وہ نہ

ب کہتی ”اونہوں۔ ان تلوں میں تیل نہیں ر فیتقال ایسی نہیں۔ سب عورتیں ایک سی نہیں ہوتیں کہ بلاوے کی خطر بلاوے کی خطر ہوں۔“ یہ سن کر ر فیتقال مسکرائے جاتی اور اہلی مبسم طور پر محسوس کرتا۔ جیسے ر فیتقال کا جی کچھ اور چاہتا ہے اور وہ کچھ اور کر رہی اور اہلی کی نگاہ میں ر فیتقال کی مسکراہٹ دودھاری چھری کی طرح محسوس ہوتی تھی اور وہ ر فیتقال سے نفرت کرتا اور یہ نفرت روز بروز شدید تر ہوتی جاتی تھی۔

لیکن ہاجرہ ر فیتقال کے گمن گاتی تھی۔ بات بات پر ر فیتقال کی تعریف، ر فیتقال کی شرافت اور نیکی کی گھر میں دھوم مچی ہوئی تھی۔ شاید اسی دھوم کی وجہ سے ر فیتقال قطعی طور پر مجبور ہو گئی تھی کہ علی احمد کی آواز سننے کے باوجود اور ان کی متبسم آنکھوں کے اشارے کے باوجود چپ چاپ بیٹھی رہے۔ اس کے باوجود جب وہ علی احمد کے کمرے کے دروازے کے قریب سے گزرتی تو اس کی گردن تن جاتی۔ گنگھڑایوں کھٹا اور بند ہوتا کہ عجیب سے دائرے بنتے چلے جاتے اور اہلی محسوس کرتا جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ رک جائے اور چوری چوری مسکرانے کی بجائے قہقہہ مار کر ہنس دے۔ کیوں بلایا ہے مجھے۔ کس نے بلایا ہے مجھے، مگر وہ چلے جاتی چلے جاتی۔ اہلی سمجھتا تھا کہ ہاجرہ کی توقعات نے اس کا دہاں رکنا ناممکن کر دیا اور ہاجرہ کے ان محبت بھرے جذبات سے جو اس نے ر فیتقال سے وابستہ کر رکھے تھے۔ صفیہ کی بو آتی تھی اور اہلی کو محسوس ہوتا تھا جیسے ر فیتقال صفیہ کی جانشین ہو۔ اہلی کو اس بات پر اور بھی غصہ آتا تھا۔

علی احمد کا گھر ایک عجیب گھر تھا۔ اس میں دو طاقتیں برسرِ پیکار تھیں۔ علی احمد اور ہاجرہ ہر نوواردہ کو دیکھ کر دونوں طاقتیں اسے اپنی طرف کھینچیں۔ علی احمد کے کمرے کا کھلا دروازہ اسے اپنی طرف بلاتا اور باورچی خانے کی محراب اسے اپنی طرف کھینچتی۔ علی احمد کے دروازے سے قہقروں کی آواز سنائی دیتی اور باورچی خانے سے دبی دبی آہوں کی۔ وہ کمرہ اور باورچی خانہ دونوں ہی مظلوم تھے۔ کمرہ ہی ہی کرنے پر مجبور تھا اور باورچی خانہ آہیں بھرنے پر۔ فطرت ان دونوں کی مجبوریوں پر مسکراتی تھی۔ جیسے وہ ان دونوں کے راز سے واقف ہو اور ان دونوں کی شکایت سے دور اہلی اور فرحت ایک دیوانے میں اکیلے زندگی کے دن کاٹ رہے تھے۔ تن تنہا۔

ہر نوواردہ کے پاؤں کے آہٹ سن کر دونوں بھائی بہنوں کے کان کھڑے ہو جاتے۔ اب کیا ہو گا۔ وہ اشتیاق بھری نگاہوں سے اسے دیکھنے لگتے۔ نوواردہ کمرے اور باورچی خانے کے

گھگھرے کو ہاتھوں پر لپیٹتی ہوئی چل پڑی۔ اب آسائے سے آگے تھا پیچھے اس کی ماں اور سب سے پیچھے کور تھی۔

انہیں جاتے دیکھ کر ایللی باہر نکلا۔ مضطربانہ گھر میں گھومنے لگا۔ باورچی خانے میں داخل ہوا تو دفعتاً سرگوشیوں کی آوازیں بند ہو گئیں۔ باہر چولہے کے پاس بیٹھی تھی۔ اس سے ذرا پرے ریفٹاں گھگھرے پر بوٹیاں بنا رہی تھیں۔

ظاہر تھا کہ وہ دونوں کور کے متعلق باتیں کر رہی تھیں۔ لیکن کیوں ایللی کے آنے پر وہ دفعتاً چپ کیوں ہو جایا کرتی تھیں۔ یوں سر سے سر جوڑ کر دبی دبی آواز میں یہاں سے وہاں کرتے رہتا اور ریفٹاں کے ہونٹوں پر وہ دبی دبی مسکراہٹ جیسے وہ اپنے آپ کو دھوکا دے رہی ہو جیسے وہ باہر کو فریب دے رہی ہو۔ اماں اسے اس قدر اچھا کیوں سمجھتی تھیں اور وہ چلتے وقت جان بوجھ کر اس طرح قدم کیوں اٹھاتی تھی کہ اس کے گھگھرے میں دائرے پڑیں اور علی احمد کے کمرے کے پاس سے گذرتے ہوئے اس کی گردن مورنی کی طرح تن کیوں جاتی تھی۔ ایللی کو ان سب باتوں کی وجہ سے ریفٹاں سے نفرت تھی۔

شدید نفرت ایسی نفرت جو اسے کور سے بھی نہ تھی۔

نوکرانی کے ہاں بچہ

چند ہی دنوں بعد ان کے یہاں ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز وہ گلی میں کھیلنے کے بعد جب گھر میں داخل ہوا اور اپنے کمرے کی طرف بڑھا تو فرحت نے اسے روک دیا۔

”اونہوں اندر نہ جانا۔“

وہ اس بات پر حیران رہ گیا ”کیوں اندر کیا ہے“

”اماں بیمار ہیں۔“ فرحت نے کہا۔

”تو کیا ہوا۔“ ایللی نے کہا۔ وہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ علی احمد کا کمرہ تو نہ تھا جس میں جانے سے ہمیشہ گھبرایا کرتا تھا اور داخل ہونے سے پہلے ان جانے میں کھانتا اور پھر نگاہیں جھکا کر داخل ہوتا جیسے کوئی جرم یا گناہ ہو مگر یہ تو ان کا اپنا کمرہ تھا۔ پھر فرحت کا اسے روکنے سے کیا مطلب تھا۔ اگر اماں بیمار تھیں تو کیا تھا۔ بیماری کی وجہ سے کمرے میں جانے کی ممانعت تو نہیں ہو سکتی۔ اماں دفعتاً ”میں تو نہیں بن گئی تھیں کہ بیماری میں لوگوں سے ملنا چھوڑ دیا تھا یہ سب فرحت اپنی

اس کا جسم لٹا ہوا تھا۔ نگاہ حرم آلود تھی۔ اسے دیکھ کر انتہائی غلاطت کا احساس ہوتا تھا۔ کور سیاہ فام گوشت تھا۔ کور سیاہ فام گوشت کا ایک گول منول لو تھڑا تھی۔ جس پر بھڑکیلے کپڑے لٹے ہوئے تھے۔ جو اس لو تھڑے کو اور بھی بد نما بنا رہے تھے۔ اس کا قد ٹھٹھکا تھا۔ سر چھوٹا اور گول جس میں چھوٹی چھوٹی آنکھیں ریختیں اور سفید دانت رضا مندی کی چمک سے روشن تھے۔ آسا ایک اونچا لمبا لڑکا تھا۔ اس کا چہرہ ذہنی چمک سے کورا تھا۔ اس کی آنکھوں میں حلقہ کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی اور اس کے انداز سے صاف ظاہر ہوتا تھا کہ وہ کور کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہے۔

یہ قافلہ چمکے سے مکان میں داخل ہوا اور علی احمد کے متعلق ابتدائی معلومات حاصل کرنے کے بعد باہر صحن میں اسی مقام پر خیمہ زن ہو گیا۔ جہاں سے اندر کام میں منہمک علی احمد پورے طور پر دکھائی دیتے تھے۔ علی احمد نے باہر دیکھا۔ کور کے دانت چمکے۔ انہوں نے جلد ہی سر جھکا کر لکھنا شروع کر دیا۔ کور اپنے گھگھرے اور چولی کو ٹھیک کر کے علی احمد کی طرف منہ موڑ کر بیٹھ گئی۔ بڑھیا نے اس کی طرف پیٹھ کر لی۔ آسا آسمان کی طرف اڑتی ہوئی جیلوں کا بھور معائنہ کرنے لگا۔ کور کے دانت پھر چمکے اس نے ایک بھر پور انگڑائی لی۔ علی احمد کے ہاتھ سے قلم چھوٹ کر رجرش پر جا گرا۔ ”کون ہے؟“ وہ بولے۔ جواب میں دانت چمکے اور بغیر کسی تمہید کے کور اٹھ کر علی احمد کے کمرے میں جا داخل ہوئی۔ اس پر بڑھیا اس خاردار درخت کو دیکھنے میں مصروف ہو گئی۔ جو صحن میں پھیلا ہوا تھا اور آساتھ سے زمین پر تیل بوٹے بنائے لگا۔

اس روز علی احمد کے کمرے سے ٹین کے سپاہی کی ہی ہی سنائی دینے کی بجائے ربوکی گزیا کی چپیں چپیں سنائی دے رہی تھیں۔ اور ایللی حیران تھا اور فرحت یوں خلا میں گھور رہی تھی جیسے کچھ بھی نہ ہو۔

دفعتاً دروازہ کھلا اور کور ہنسی ہوئی نکل۔ ”ماں۔ ماں آسائیل تو نہیں۔ آسا تو پاس ہے۔ نہ جانے کس نے اس سے کہہ دیا ہے کہ تو فیل ہے خواہ مخواہ وہ تو پاس ہے۔ میں نے خود نیچہ دیکھا ہے۔ تو نے کہا نہیں تھا۔“ اس نے آسا کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ تو پاگل ہے۔“ آسا کی ماں بولی۔

آسا پاگلوں کی طرح ہنسا اور پھر خاموش ہو گیا کور کے دانت چمکے علی احمد سر کھانے لگے۔ ”آؤں گی۔ ضرور آؤں گی۔ بابو جی۔“ وہ بولی ”چل ماں“ اور مڑ مڑ کر دانت چمکاتی ہوئی

طرف سے کہہ رہی تھی۔ ایللی نے سوچ کر سینہ تن لیا۔ ”نہیں نہیں میں جاؤں گا۔“ وہ بولا۔
 عین اس وقت ریفٹاں دوڑتی ہوئی باہر نکلی ”تمہیں مبارک ہو۔ تمہارے ہاں ایک نوا
 بھائی ہوا ہے۔“ بھائی ہوا ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آیا۔ بھائی کیسے ہو سکتا تھا۔ ریفٹاں کا مطلب
 کیا تھا۔ اہل کے یہاں بیٹا لیکن یہ کیسے ممکن تھا۔ اہل تو اس گھر کی نوکرانی تھی۔ نوکرانی کے کمر
 بیٹا۔ اہل تو علی احمد کے کمرے میں کبھی نہ گئی تھی۔ اہل کو تو کبھی آواز پڑتی تھی۔ ہاجرہ سو گئی
 کیا۔ اہل تو ایسی نہ تھی۔ پھر اہل کے ہاں بیٹا نہیں نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ یہ گناہ تھا بے عزتی
 تھی۔ نوکرانی کی بے عزتی۔ اہل نے تو کسی کلرک کو بھرتی نہ کرانا تھا۔ پھر یقیناً ریفٹاں کئی
 تھی۔ وہ دوڑ کر اندر گیا اور ننھے ننھے بچے کو دیکھ کر شرم سے زمین میں گڑ کے رہ گیا۔ پھر وہ باہر
 آبیٹھا اور محسوس کرنے لگا۔ جیسے وہ آسا ہو۔ جیسے علی احمد نے اس کی ماں کو بھی کھلونا بنایا ہو اس
 خیال پر اس کے دل کو ایک دھچکا سا لگا۔

وہ صحن میں خاردار درخت کے نیچے بیٹھ گیا۔ چاروں طرف ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ دور
 تک کچی اینٹوں کی منڈیروں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور اس سے پرے ریت کے ٹیلے اور اس کھڑے
 تھے۔ آسا۔ آسا درخت پر بیٹھا ہوا کوا چلایا۔ اس نے غصہ میں ایک پتھر اٹھا کر اس کی طرف
 پھینک دیا۔

ہاجرہ کے کمرے میں شور مچا ہوا تھا۔ محلے والیاں اونچی آواز میں چلا رہی تھیں۔ ”ہن
 تمہیں مبارک ہو۔“

وہ ہاجرہ کو مبارک باد کیوں دے رہی تھیں۔ لوگ کیوں ہاجرہ کے کمرے میں جمع ہوتے جا
 رہے تھے۔ کیوں لوگوں کو تو چاہئے تھا کہ اس سے نفرت کریں جو نوکرانی ہونے کے باوجود گود میں
 بچہ لئے پڑی تھی۔ لیکن اہل کو بھی احساس نہ تھا۔ کس بے شرمی سے مسکرا رہی تھی۔ اسے
 شرم نہ آتی تھی۔ مگر اہل تو ایسی نہ تھی۔

ایللی شرم سے پانی پانی ہوا جا رہا تھا۔ اب وہ لوگوں کو کیسے منہ دکھائے گا اب وہ اپنی ماں کے
 سامنے کیسے جائے گا اور فرحت۔۔۔۔۔۔ فرحت کو اس بات پر کتنا دکھ ہو گا۔ مگر
 فرحت تو خوشی سے پھولے نہ سہا رہی تھی۔ کیا فرحت کو یہ بات گوارا تھی۔ کیا اس حادثہ پر اسے
 دکھ نہ ہوا تھا۔ ادھر ابا اپنے کمرے میں آقاؤں کی طرح اطمینان سے بیٹھے لکھ رہے تھے۔ جیسے
 انہیں نوکرانی اور اس کے نواز سیدہ بچے کی خبر ہی نہ ہو۔

بچے کی مبارکباد دینے کے لئے مختلف قسم کی لوگ آتے تھے۔ کچھ تو ہاجرہ کی کوٹھڑی میں
 جا کر کھس جاتے اور کچھ علی احمد کے کمرے سے آگے نہ جاسکتے۔ کور ان لوگوں میں پیش پیش
 تھی۔ ”باوجی مبارک ہو۔“ وہ دور سے چلاتی ہوئی آئی اور پھر علی احمد کے کمرے میں داخل ہو کر
 یوں مطمئن ہو گئی۔ جیسے علی احمد ہی زچہ اور بچہ ہوں۔

علی احمد کا کمرہ کور کے لئے مخصوص ہوا جا رہا تھا۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ دانت چمکاتی
 کھکھرا جھلاتی آمو جو ہوتی۔ ”کو باوجی کیا حال چال ہے ننھا کیسا ہے۔ اس کے سفید دانت سیاہ
 رنگ میں چمکتے۔“ ”آگئی تو“ علی احمد اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔

”اچھا تو ابھی یقین نہیں آیا۔“ وہ بچکے کی رسی ہاتھ میں پکڑ کر چابک کی طرح جھلاتے
 ہوئے چلاتی۔

یہ دیکھ کر نین کا سپاہی جوش میں آجاتا ”اچھا یہ جرأت۔“
 پھر کمرے میں اودھم مچ جاتا اور ایللی غصے میں مٹھیاں بھیجتا ہے ”کتنی کمروہ آواز ہے کور
 کی، انداز کس قدر ننگا ہے۔ ننگا اور غلیظ“ اسے کور سے نفرت تھی اور وہ آسا کو دیکھ کر غصے میں
 کھولنے لگتا تھا۔ کیونکہ وہ محسوس کرتا جیسے خود آسا ہو اور کلرک کا امتحان پاس کرنے کے لئے
 ہاجرہ کو لے کر آیا ہو۔

ایللی بڑی محنت سے اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش کرتا مگر ان کی
 آوازیں اس کے کانوں پر ہتھوڑوں کی طرح پڑتیں۔ پھر دفعتاً علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلتا
 اور علی احمد کی آواز سنائی دیتی ”ایللی، ایللی۔“

دھرم بھر شٹ

اس وقت ایللی کا علی احمد کے کمرے میں جانا کس قدر دشوار اور پر ازیت ہوا کرتا اور وہ
 دروازے پر جا کر رک جاتا۔ اندر جانے کی ہمت نہ پڑتی۔ پھر وہ انتظار کرتا کہ ایک بار پھر آواز
 پڑے تو اندر جائے۔ باہر چلپاتی دھوپ میں اسے کافی دیر تک کھڑا رہنا پڑتا۔ اندر ریز کی گزریا نہ
 جانے کیا کیا تماشے کرتی۔ ان تماشاؤں میں وہ دونوں بھول جاتے کہ انہوں نے ایللی کو آواز دی
 تھی۔

”ایللی“ دوسری مرتبہ آواز پڑنے پر وہ ڈرتا ڈرتا اندر داخل ہوتا اکثر دونوں ایک دوسرے

الہ کو بتانا ہے کار تھا۔ اماں تو نصیحتیں کرنے کے سوا کچھ جانتی ہی نہ تھی ایلی کوئی بات بھی کرتا۔ وہ جواب میں نصیحت فرما دیتی کہا کرتی تھی کوئی برا کرتا ہے تو کرنے دو لیکن تم اس کے ساتھ برائی نہ کرو۔ اس پر ایلی محسوس کرتا۔ جیسے اماں عیسائی ہو جو ایک گال پر تھپڑ کھا کر دوسرا پیش کرنے کی تلقین کرتے ہیں۔ ہونہ اماں تو خواہ مخواہ بنتی تھیں۔ اس کے علاوہ جب سے

علی احمد رسی کا سٹنل دیکھتے ہی ٹمین کے سپاہی میں بدل کر ربڑ کی گڑیا پروار کرنا شروع کیا۔

اس کی پھٹی پھٹی آواز سن کر ایللی محسوس کرتا۔ جیسے اس پر پٹانزم کر دیا گیا ہو۔ وہ کیفیت کس قدر پر لذت محسوس ہوتی تھی۔

روز شام کے وقت ایللی اس طرف نکل جاتا۔ جس طرف گھنٹام کا گھر تھا اور گھنٹوں گلیوں اور بازاروں میں اس امید پر آوارہ پھرنا کہ شاید گھنٹام کسی کام کے لئے باہر نکلے اور پھر۔ پھر اسے دیکھ کر رک جائے۔ کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا ہو جائے اسی طرح جس طرح سکول کے برآمدے میں کھڑا رہتا تھا۔ ایک ٹانگ سیدھی اور دوسری میں خم، پھر وہ دونوں پاؤں ملا لیتا اور پنچوں کے بل کھڑا ہو کر ایڑیاں اٹھا لیتا اور پھر پنچوں پر جھولنے لگتا۔ ایللی کو یوں لگتا جیسے کوئی ننھا سا فرشتہ فضا میں تیر رہا ہو۔ اس کے ہونٹ کلی سے بنے رہتے تھے۔ نہ جانے ہونٹ کیوں کلی سے بن جاتے تھے۔ جیسے اس نے کوئی بڑی شگفتہ بات سنی ہو یا کہنے والا ہو۔

بٹھے بٹھائے ایللی کے دل میں اضطراب سا پیدا ہو جاتا اس کا جی چاہتا کہ وہ ایٹور لال کی باتیں سنے یا گھنٹام کے سامنے کھڑا ہو اور فضا میں کوئی پیارا فرشتہ جھول رہا ہو یا پرکاش کا گول چہرہ اس کی نگاہوں میں سا جاتا اور وہ بے تاب ہو کر اٹھ بیٹھتا اور باہر گلی میں جا کر ٹھٹھٹھ لگتا۔ لیکن گلی میں ٹھٹھٹھ بھی تو مشکل ہوا جا رہا تھا۔ وہاں ٹھٹھٹھ تو پڑوس والے گھر سے زائدہ، عابدہ کی آوازیں کن میں پڑتیں کس قدر سریلی آوازیں تھیں۔ دل میں تیرکی طرح چھ جاتی تھیں اور پھر اندر جا کر ڈولنے لگتیں جیسے دل میں کوئی فرشتہ پنچوں کے بل کھڑا جھول رہا ہو۔ آوازوں میں کیسا جادو تھا۔ کیوں۔ شکلیں تو بالکل سیدھی سادھی تھیں۔ رنگ بھی کالا اور ان میں کچھ بھی تو جاذب نظر نہ تھا۔ لیکن آوازیں ایللی کو بیتاب کر دیتی تھیں۔ تنکھی سریلی اور لودھار آوازیں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آتا کہ قریب ہی وہ چنی سفید نرس میز کے مقابل کھڑی آپ ہی آپ شرارہی ہوگی۔ جیسے اس کی عادت تھی۔ مسکراتے ہوئے اس کے گالوں میں گڑھے پڑ جاتے تھے۔ لیکن وہ مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرائے کی کوئی وجہ بھی تو معلوم نہ ہوتی تھی۔ زرد رنگ کے مزہبوں کے مرتبوں اور کڑوی دوائیوں کی بوتلوں کے درمیان کھڑے ہو کر مسکرائے۔ ایللی کے لئے یہ عقدہ ناقابل حل تھا۔ پھر اس کی چال۔ کس پھمن سے چلتی تھی۔ مسکراتی تو جیسے چراغ روشن ہو جایا کرتے۔ مگر وہ ایللی کو دیکھ کر قطعاً نہ مسکراتی تھی۔

ہاں اس روز جس روز ماں نے اسے بلایا تھا۔ جب ان کے گھر ننھا ہوا تھا اس روز۔

اس کے یہاں بچہ ہوا تھا۔ ایللی کی اس کے متعلق رائے بدل چکی تھی۔ اس لئے وہ خاموش رہا۔ اس نے بوتل کے پانی کا راز کسی کو نہ بتایا البتہ اس روز کے بعد اسے بوتل بھرنے کی کوفت سے نجات مل گئی۔

اس سے پہلے وہ کور کی آمد کی خبر سن کر گھبرا جایا کرتا تھا۔ اب اسے بوتل بھرنے کے لئے جانا پڑے گا۔ چلچلاتی دھوپ میں کنوئیں کا بھاری چکر دھکیلنا پڑے گا لیکن اب جو نئی وہ گھر میں داخل ہوتی ایللی کا جی چاہتا کہ وہ جلدی پانی مانگے اور ایللی بوتل میں نفرت کا زہر بھر کر لادے۔ اب اسے کنوئیں چکر چلانے اور بوتل بھرنے میں کوفت کی بجائے مسرت ہوتی اور پھر جب چوٹھن میں بیٹھ کر وہ منہ میں تھوک اکٹھا کرتا تو اس کا چہرہ خوشی سے لال ہو جاتا پھر ڈیوڑھی کی طرف بھاگتا اور بالآخر بوتل اٹھائے خوشی خوشی علی احمد کے کمرے کی طرف چل پڑتا۔ اس خوشی میں یہ قطعی طور پر بھول جاتا کہ علی احمد کے کمرے میں کھانسی کر داخل ہونا چاہئے اور وہاں جانے سے پہلے سرجھکا لیتا چاہئے۔

انوکھے جذبات

اس زمانے میں وہ محبت کے اولین جذبات سے واقف ہو رہا تھا۔ اس کے دل میں نئے انوکھے جذبات ابھر رہے تھے۔ اسے بلاوجہ سکول کے دو ایک لڑکے اچھے لگنے لگے تھے۔ حالانکہ اچھا لگنے کی کوئی وجہ معلوم نہ ہوتی۔ پھر بھی وہ اسے اچھے لگتے تھے۔ مثلاً اس کے ہم جماعتوں میں ایٹور لال، پرکاش اور گھنٹام تھے۔ مثلاً اسے گھنٹام کا چپ چاپ کھڑا ہونا۔ وہ ایک عجیب انداز سے کھڑا ہوتا تھا۔ اس کی ایک ٹانگ سیدھی ہوتی۔ دوسری یوں خیدہ رہتی جیسے ازلی طور پر اس میں سیدھا ہونے کی صلاحیت ہی نہ ہو۔ ہونٹ یوں آپس میں چٹکی سی بنائے رہتے جیسے ابھی کوئی بات کرنے والے ہوں، مگر ہونٹوں پر آتی ہوئی وہ بات ہونٹوں میں دبی رہتی۔

پھر وہ پرکاش تھا۔ پرکاش کا پھولا پھولا چہرہ اور اس کے رخسار پر وہ سیاہ تل اسے بڑا اچھا معلوم ہوتا تھا اور ایٹور لال کا وہ تقسمہ۔ اس کا بے تکلف انداز۔ اس کا لبہا سامنہ اور میلے دانت اسے بڑے اچھے لگتے تھے۔ ایللی صبح شام ایٹور لال کے ساتھ رہتا تھا اور شوق سے اس کی باتیں سنتا رہتا۔ حالانکہ ایٹور لال کے دانت بڑے بھدے اور زرد تھے اور اس کے منہ سے بو آتی تھی مگر وہ بو کتنی اچھی لگتی تھی اسے ایٹور لال کا بولے جانا بولے جانا۔ اونچی آواز میں شور مچانا۔

اہل تو اب ننھے میں کھوپکی تھیں۔ صبح و شام، دن رات وہ ننھے کی دیکھ بھال میں وقت بسر کرتی اور باقی تمامہ وقت بلورچی خانے میں گزارتی۔ فرحت بھی ہر وقت ننھے کو کھلانے میں لگی رہتی تھی۔ رفیقان اسے کھلاتی تو نہ تھی۔ مگر بڑے شوق سے دیکھتی۔ آتے ہی سیدھی ننھے کی طرف جا کر اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہتی ”یہ ننھا بال ہے۔ یہ مینڈھا سا میں ہے۔“ اور پھر بلورچی خانے میں بیٹھ کر گھگھرے پردھاگے سے بوتیاں بنانے میں مصروف ہو جاتی۔

علی احمد اب بھی سارا دن حساب کتاب لکھنے میں وقت صرف کرتے تھے اور کور بھی مینے میں صرف چار ایک مرتبہ آتی تھی۔ اب تو ایلی کو کور میں چنداں دلچسپی نہیں رہی تھی وہ اس کی بوتل میں تمونے سے بھی اکتا چکا تھا۔ جب کبھی علی احمد اس سے پانی لانے کو کہتے تو وہ چپکے سے بوتل اٹھا کر باہر نکل آتا اور پھر گھر سے پانی بھر لیتا۔ پھر کچھ دیر گلی میں کھیلنے کے بعد بوتل اٹھا کر نپا کے کمرے کی طرف چل پڑتا اور کور سمجھتی کہ وہ پانی کنوئیں کا ہے۔ کور کو پانی کے بارے میں سوچنے کی فرصت ہی کہاں تھی وہ تو بند کمرے میں ربو کی گڑیا کی طرح چپیں چپیں کرتی اور جاتے وقت دو روپوں کے لئے علی احمد سے جھگڑا کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ علی احمد کا بھی کور سے دل بھر چکا تھا کیونکہ اب وہ اس کے آنے پر بھی کام میں لگے رہتے تھے اور اس کے جانے سے پہلے ہی پھر سے لکھنے میں مصروف ہو جاتے۔ نہ جانے ان دنوں وہ کسے چٹھیاں لکھ رہے تھے۔ ہر دوسرے تیسرے دن وہ ایک چھٹی لکھ کر ایلی کو دیتے ”لو ابھی اسے لیٹر بکس میں ڈال آؤ۔“

پہلی مرتبہ جب ایلی نے لفافے کا پتہ پڑھا تو وہ حیران رہ گیا۔ استانی کے نام چٹھی اور وہ بھی شاکوٹ والی کیا وہی جس نے شلوار کی جگہ چورلیٹ رکھی تھی؟ وہ تو شاید اس بات کو اہمیت نہ دیتا لیکن گلی میں فرید نے اسے پکڑ لیا ”ہوں استانی کو خط جا رہا ہے۔ کون ہے یہ استانی۔ دال میں کچھ کالا ہے دوست!“ اس وقت ایلی نے بھی محسوس کیا کہ دال میں کچھ کالا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ دال کون تھی اور کالا کون تھا۔ استانی تو دال نہیں ہو سکتی تھی۔ پھر فرید نے اس کا ہاتھ تھام لیا اور عجیب سی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔ ”ایلی“ اس نے معنی خیز نگاہوں سے اسے دیکھا ایلی کے جسم میں جھنجھٹ سی دوڑ گئی۔ ”ایلی“ فرید نے اس پر بھرپور نگاہ ڈالی۔ ایلی کی اینٹیاں ہوا میں معلق ہو گئیں اور وہ فضا میں جھولنے لگا جیسے وہ کوئی ننھا فرشتہ ہو۔ وہ محسوس کرنے لگا جیسے وہ خود گھنٹام ہو اور کوئی ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہو۔ اس کے جسم میں چوٹیاں

علی احمد بار بار نرس سے باتیں کرتے رہے تھے۔ نرس مسکراتی تھی اور منہ موڑ لیتی تھی پھر منہ موڑ کر مسکراتی تھی اور علی احمد گھوم کر پھر اس کے سامنے آکھڑے ہوتے تھے۔

زاہدہ اور عابدہ کے خیال سے بچنے کی کوشش میں ایلی نرس کے خیال میں کھو جاتا مگر ڈسپنری کی کھڑکی تک جانے کی اس میں ہمت نہ پڑتی۔ پھر اس کے خیالات کا رخ زاہدہ کے بھائی فرید کی طرف منعطف ہو جاتا کتنا شوق تھا اسے نرس کو دیکھنے کا۔ فرید بھرپور جوان تھا۔ اس کا جسم کتنا بڑا تھا۔ موٹے موٹے ہاتھ۔ پھولی پھولی پنڈلیاں اور بھرے بھرے بازو۔ وہ نرس کے لئے ہر وقت مضطرب رہتا تھا۔ ”ایلی“ وہ اسے گلی میں دیکھ کر رک جاتا۔ ”ایلی ذرا جانا تو ہسپتال کی کھڑکی سے جھانکنا ہے یا چلی گئی۔ خدا کے لئے ابھی جاؤ۔ یار ہم تو مر گئے۔ تباہ ہو گئے۔ اس کے لئے اور پھر وہ مضطرب گلی میں گھومنے لگتا۔ بار بار جسم کھاتا اور ڈسپنری کی کھڑکی سے نرس اس کی طرف دیکھ کر مسکرا کر منہ موڑ لیتی اور اپنے کام میں لگ جاتی جیسے کچھ خبر ہی نہ ہو کہ باہر کون کھڑا ہے۔

نرس مسکراتی کیوں تھی۔ مسکرانے کے بعد منہ کیوں موڑ لیتی تھی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا۔ پھر وہ ہسپتال کی طرف جاتا۔ کھڑکی میں سے دھڑکتے دل سے جھانکتا۔ کتنی سفید تھی وہ چٹنی سفید ایلی کو گورا رنگ بے حد پسند تھا۔ لیکن نرس اس کی طرف دیکھتی بھی نہ تھی۔ مسکراتی بھی تو اسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ مسکراہٹ بالکل روکھی پھسکی ہو۔ نہ جانے ایلی کے دروہو نرس وہ مسکراہٹ کیوں نہ مسکراتی تھی جو وہ فرید کے سامنے مسکرایا کرتی تھی اور ایلی کو دیکھ کر وہ منہ بھی تو نہ موڑتی تھی۔ اس پر ایلی کو بے حد دکھ ہوتا اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی کو نے میں جا کر رو دے چٹین مار مار کر روئے۔ مگر رو نہ بھی تو نہ آتا تھا اسے۔

اس روکھی مسکراہٹ والی نرس سے مایوس ہو کر وہ از سر نو گھنٹام کے خیال کی طرف متوجہ ہو جاتا اور ہسپتال کی کھڑکی کو چھوڑ کر بازار کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنٹام کیس بازار میں کھڑا ہو۔ شاید ایٹور گلی میں کھیل رہا ہو۔ یا شاید پر کاشت۔

ایلی کے دل میں انوکھی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ جوں جوں اس کے دل میں نئی آرزوئیں تشکیل پائے جاتیں توں توں اس کے دل میں علی احمد کے کمرے سے نفرت بڑھتی جاتی اور اس کمرے میں جانے والیوں کے خلاف بغض شدید تر ہوتا جاتا اور اہل اور رفیقان کے متعلق شبہات تقویت پکڑتے جاتے۔

ی دوڑنے لگیں۔

اس روز ایللی دیر تک آئینے کے سامنے کھڑا رہا۔ لیکن وہاں ایک بھدے کالے اور بھونڈے لڑکے کے سوا کچھ نہ تھا پھر اس نے باہر جا کر صابن سے منہ دھویا شاید وہ پہلا دن تھا۔ جب اس نے اس شدت سے محسوس کیا تھا کہ وہ بد صورت ہے۔

اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا کہ فرید اسے ایسی نگاہوں سے کیوں دیکھتا تھا۔ نہ جانے وہ ایسی آنکھیں کیونکر بنا لیا کرتا تھا اور پھر اس کا ”ایلی“ کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ جیسے اس کی آواز حلق میں خشک ہو گئی ہو۔ لیکن اس کے اپنے جسم پر چیونٹیاں سی کیوں ریگنے لگتی تھیں۔ وہ چیونٹیاں گدگدی کیوں کرتی تھیں۔ جس سے دل میں کچھ کچھ ہوتا تھا۔ عجیب سا احساس تھا وہ ان جانے میں ایللی کو فرید سے ڈر لگنا شروع ہو گیا اور اس نے فرید کے گھر کی طرف جانا چھوڑ دیا۔ لیکن کیوں۔ وہ یہ نہ جان سکا۔ اس کے باوجود جب کبھی وہ کپڑے بدلتا یا جوتا پہنتا۔

تو اسے کوئی نہ کوئی ضروری کام پڑ جاتا اور مجبوراً اسے گلی میں اس سمت کو جانا پڑتا۔ جہاں فرید کا گھر تھا۔ جاتے ہوئے اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ہر آہٹ پر اس کے دل پر عجیب سا دباؤ محسوس ہوتا۔ جیسے کسی نے اسے پکڑ لیا ہو۔ ”ایلی“ اسے خواہ مخواہ آوازیں سنائی دیتیں اور پھر جسم پر چیونٹیاں ریگنے لگتیں۔ گلی میں فرید نہ ملتا تو وہ اطمینان کا سانس لیتا لیکن دل میں دبی دبی سی نخل کاٹنے کی طرح لگی رہتی اور بالاخر مایوس ہو کر گھنٹام کے گھر کی طرف چل پڑتا۔ شاید گھنٹام بازار میں کھڑا ہو۔ اس کی نگاہ تلے گھنٹام آکھڑا ہوتا۔ جس کے پاس ہی فرید کھڑا ہنس رہا ہوتا فرید اور گھنٹام۔ اب اس کے ذہن میں لازم و ملزوم ہوئے جا رہے تھے۔ روز بروز بے تاب ہوا جا رہا تھا۔ بات بات پر اس کا دل دھڑکتا ایک اضطراب چاروں طرف سے اس پر یورش کر رہا اور اس اضطراب کے تعاقب میں وہ آوارہ پھرتا۔ گلی میں میدان میں بازاروں میں اور گھر میں بھی وہ مختصر سا گھر دفعتاً اس قدر وسیع کیوں ہو گیا تھا اور علی احمد کا کمرہ روز بروز سکڑ کر چھوٹا کیوں ہوتا چلا جا رہا تھا۔ خود علی احمد بھی تو اب اس کی نگاہوں میں اتنے عظیم نہ رہے تھے۔ اب انہیں اور ان کے کمرے کو آسانی ہے نظر انداز کر سکتا تھا۔

کشمیر کا سیب

ان دنوں علی احمد مضطرب رہنے لگے تھے۔ لکھتے لکھتے وہ قلم رکھ کر باہر آ جاتے اور کسی ٹٹلی

ہوئی چارپائی پر ہاتھوں میں سر تھام کر لیٹ جاتے۔ دیر تک چپ چاپ لیٹے حقہ پیتے رہتے پھر دفعتاً ”جوش میں اٹھ بیٹھے اور کسی نہ کسی بہانے کشمیر کی بات شروع کر دیتے۔ ”ایلی کیا بات ہے کشمیر کی۔ اللہ تعالیٰ نے زمین پر جنت کا نمونہ اتار رکھا ہے۔ رہنے کا مزمہ ہے تو کشمیر میں۔“ وہ کسی کو مخاطب کئے بغیر کہتے ”سرو قد درخت ٹھنڈی نہریں پھل بے اندازہ۔ پھل کھاؤ، چشموں کا ٹھنڈا پانی پیو“ ایلی وہاں کے رہنے والے حسین نہیں ہوں گے تو کون ہو گا۔“ یہ محسوس کر کے کہ ان کی بات کوئی نہیں سن رہا علی احمد کبھی نہ گھبراتے تھے۔ ”جنہوں نے صبح شام سیب کھائے ہوں ان کی شکل سیب سی نہ ہوگی تو پھر کیسی ہوگی۔ سیدھی بات ہے کیوں ریفٹاں جو سیب کھا کر پلے گا وہ بڑا ہو کر سیب بن جائے گا۔ ہی ہی ہی۔ کیا کہتی ہے۔“ اندر باورچی خانے میں ریفٹاں چپ چاپ بیٹھی مسکراتی رہتی۔ ”کیا بات ہے کشمیر کی۔ واہ وا کسی شاعر نے کہا ہے۔

اگر فردوس بر روئے زمین است

ہمیں است وہیں است وہیں است

ایلی یہاں آؤ۔ ادھر تمہیں اس شعر کا مطلب آتا ہے کیا؟“ وہ شعر پھر سے دہراتے اور ایللی کی خاموشی پر کہتے ”آؤ تمہیں اس کا مطلب سمجھائیں لیکن پہلے یہ بتاؤ کہ کشمیر ہے کہاں۔ وہ تو ٹھیک ہے یہ بتاؤ کہ وہاں گرمی کیوں نہیں پڑتی اور وہاں چشمے کیوں پھوٹتے ہیں۔ شاباش ٹھیک پہاڑ تو ہے لیکن پہاڑ پر رہنے والے۔ ریفٹاں تم جانتی ہر پہاڑ پر رہنے والوں کے چہرے سیب کی طرح کیوں ہوتے ہیں۔ ایللی کی ماں تم نے دیکھا ہے کسی کو جو برسوں کشمیر میں رہا ہو۔ سبحان اللہ کیا رنگ روپ ہوتا ہے۔ میسین بیچاری کیا مقابلہ کریں گی۔ انگریز تو بد صورت ہوتے ہیں۔ ان کے منہ پر تو نحوست برستی ہے۔ لیکن کشمیر والے۔ واہ واسبحان اللہ“

گھر میں کسی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد بام آباد کے ویرانے میں بیٹھے بیٹھے دفعتاً ”کشمیر کیسے جا چنچے۔ ہاجرہ نے یہ عالم دیکھا تو ایک دن چپکے سے ریفٹاں کے کان میں بولی ”کوئی بات ہے ضرور کوئی بات ہے میں جھوٹ نہیں کہتی۔ میری بات یاد رکھو۔ اگر بات نہ نکلی تو میرا زہد اور بات ٹکسنے میں دیر بھی نہیں لگے گی ہاں۔ میں تو تیرا پچاچتی ہوں ان کے۔“

ریفٹاں ہونٹ پر انگلی رکھ کر حیرانی سے ہاجرہ کی طرف دیکھتی ”اچھا۔ لو میں بیچاری کیا جانوں۔“

بڑی بیچاری تو دیکھو۔ ایللی گھورتا۔

پھر دفعتاً ”نخا بیمار پڑ گیا اور سب کی توجہ ننھے کی طرف مبذول ہو گئی۔ ہاجرہ ر فیقل اور فرحت ہاجرہ کے پاس بیٹھی رہیں۔ ایللی کو دن میں دو تین بار ڈسپنری جانا پڑتا۔ وہ نرس تک پہنچ تو جاتا لیکن اس سے براہ راست بات کرنا اس کے لئے مشکل ہو جاتا۔ کئی بار وہ بات کرنے کے لئے فرید کو ساتھ لے جاتا اور نرس فرید کی طرف دیکھے بغیر جھپٹتی۔

نرس کی آمد پر علی احمد قیص پن لیتے اور ننھے کی چارپائی کے قریب آکھڑے ہوتے۔ ”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ نرس سے اپنی بات شروع کر دیتے۔ نرس کے جانے کے بعد علی احمد ان سب کو تسلی دیتے۔

”گھبراؤ نہیں ٹھیک ہو جائے گا۔ بالکل ٹھیک ہو جائے گا سب کھلاؤ اسے سبب — لیکن سبب کشمیر کا ہو۔ کلو کا نہ ہو۔ ایللی بھاگ کر ایک سبب لے آؤ۔ وہ دو آنے جیب سے نکل کر کہتے۔ بس سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ایللی کی ماں گھبرانے کی ضرورت نہیں۔ مگر ایللی کلو کا نہ لانا تھوڑا سارس نکال کر بچے کو دو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ وہ کہتے ہیں نا انگریز۔ این اپیل اے ڈے۔ کیپس دی ڈاکٹر اے، کیا سمجھ ایللی۔ اچھا تم آؤ گے تو تمہیں سمجھا دیں گے۔“

ر فیقل آتی تو علی احمد اسے روک لیتے ”ر فیقل ٹھہر تو سہی۔ تو تو بام آباد کا سکندر اعظم معلوم ہوتی ہے۔ آندھی کی طرح آتی ہے، گبولے کی طرح چلی جاتی ہے۔ اس طرح بھاگنے دوڑنے سے فائدہ اور پھر بام آباد میں یہ کوئی جگہ ہے کیا بالکل فضول بے کار یہاں تو اچھا خاصا آدمی بیمار پڑ جاتا ہے۔ اب دیکھو اندر نخا بیمار پڑا ہے۔ میری اپنی صحت تباہ ہو چکی ہے۔ تم بھی تو زرد پڑ رہی ہوں۔ کیوں“ ر فیقل آنکھیں جھکائے مسکرائے جاتی۔ اچھا تو سکندر اعظم اب کی گرمیوں میں ہم تمہیں کشمیر لے چلیں گے۔ تم بھی اور نخا بھی وہاں جا کر یوں سرخ ہو جاؤ گے۔ جیسے جیسے —

کور کی آمد پر وہ قہقہہ مار کر صحن سے اٹھ بیٹھتے ”آئیے ماراج لو بھی یہ راجپوتانے کے شہدہ سا نہی بھی آگئے۔ تم چاہے جا کر ساری عمر کشمیر رہو کچھ فرق نہیں پڑے گا۔“ اور کور بات سن کر ہنسنے کی رسی کی چابک بالیتی اور اسے گھمانے لگتی۔ علی احمد ہنسنے لگتے۔

اوسر کور اور علی احمد کے درمیان ہنگامہ شروع ہوتا اوسر ساتھ والے کمرے میں ننھے کی حالت بد سے بدتر ہوئی جاتی۔ ننھے پر ہاجرہ کا سر جھکا ہوتا۔ گالوں پر آنسو رواں ہوتے اور چارپائی کے پاس ر فیقل چپ چاپ کھڑی ہوتی۔ اس پر ایللی نرس کو بلانے کے لئے بھاگتا۔

نرس کو گھر آنا دیکھ کر مین کا سپاہی چونکتا اور اپنی رزم گاہ کو چھوڑ کر نکل آتا پھر دفعتاً ”یہ محسوس کر کے کہ اس نے قیص نہیں پسنی ہوئی علی احمد لپک کر اندر داخل ہوتے اور قیص پن کر نرس کے روبرو آکھڑے ہوتے۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ وہ کہتے ”خیریت تو ہے کیا بچے کی طبیعت کچھ خراب ہو گئی ہے کہ آپ تشریف لائی ہیں۔ آپ کے آنے پر ہر شخص کا دل دھک سے رہ جاتا ہے۔ نرس۔“ وہ مسکراتے۔

دفعتاً ”انہیں خیال آتا۔ کہتے“ اگر آپ برا نہ مائیں نرس تو پوچھوں کیا آپ کشمیر کی رہنے والی ہیں۔ معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“

ان کی باتیں سن کر ہاجرہ اندر ننھے کو گود میں لئے بیٹھی آنسو بہائے جاتی اور ر فیقل اسے سمجھاتی تسلی دیتی۔ ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ہاجرہ روتی کیوں تھی۔ وہ کیوں توقع کرتی تھی کہ علی احمد اس کے بچے میں دلچسپی لیں۔

دلچسپی تو وہ لیتے تھے۔ اکثر آکر دیکھتے بھی ”گھبراؤ نہیں۔“ مسکرا کر کہتے ”ٹھیک ہو جائے گا۔ گرمیوں میں اسے کشمیر لے چلیں گے۔“ لیکن ہاجرہ چاہتی تھی کہ نوکرانی کے بچے کی بیماری کی وجہ سے آقا اپنی زندگی حرام کر لیں۔ نرس سے باتیں نہ کریں۔ کور سے کشتی نہ لڑیں۔ یہ سوچ کر ایللی کو آقا پر نہیں بلکہ نوکرانی پر غصہ آتا تھا۔

پھر ایک روز علی احمد کو ایک ضروری خط موصول ہوا۔ خط پڑھتے ہی وہ اٹھ بیٹھے اور جلدی سے تیاری کرنے لگے۔ پھر وہ ہاجرہ کے کمرے کے دروازہ پر آکھڑے ہوئے۔ ہاجرہ اور سب عورتیں بچے کے اوپر جھکی ہوئی تھیں۔

”کیا حال ہے؟“ وہ بولے۔ ”واہ تم تو ویسے ہی گھبرا جاتی ہو فضول۔ آخر بیماری جاتے جاتے ہی جائے گی۔ گھبرانے کی کوئی بات نہیں بچے بیمار ہوا ہی کرتے ہیں۔ یہ کوئی نئی بات نہیں۔ اچھا تو میں دو دن کے لئے سرکاری کام پر جا رہا ہوں۔ گھبراتا نہیں دو روز کے بعد آجاؤں گا ہاں ہاں — ایللی، ایللی یہ لو۔“ انہوں نے چند پیسے اس کے ہاتھ میں تھما دیئے ”خرچ کر لینا۔ اچھا بھائی میں جاتا ہوں۔“

ننھے کی حالت خراب ہوتی چلی جا رہی تھی۔ سانس آکھڑا رہا تھا۔ منہ سوچ رہا تھا۔ ہاجرہ کی آنکھوں سے آنسو گر رہے تھے۔ ر فیقل کے ہونٹوں پر وہی مبسم سی شرارت آسیر نہی تھی۔

فرحت چپ چاپ بیٹھی ابا کو جاتے ہوئے حیرانی سے دیکھ رہی تھی اور علی احمد بڑے اطمینان سے انہیں الوداع کہتے ہوئے تسلی دے رہے تھے ”کوئی بات نہیں میں جلد آجاؤں گا سب ٹھیک ہو جائے گا۔“

آٹھ دن کے بعد علی احمد لوٹے۔ گھر میں داخل ہوتے ہی چلانے لگے۔ ”ایلی کی ماں تمہیں مبارک ہو۔ اب تم تھانہ رہو گی۔ تمہارا ایک ساتھی گھر میں آجائے گا۔“

”ہائیں تم اس قدر خاموش کیوں ہو۔“ انہوں نے گھر پر چھائی ہوئی خاموشی کو محسوس کر کے کہا اور پھر جیسے یک دم کچھ یاد آجائے پر بولے۔

”ہاں ننھے کا کیا حال ہے؟“

ہاجرہ کے منہ سے ایک دہی ہوئی چیخ سن کر وہ گھبرا گئے۔

”اوہ۔ تم نے مجھے بتایا ہی نہیں مجھے تار دے دیا ہوتا کوئی آدمی بھیج دیا ہوتا۔ ت ت ت۔“

ت۔ کتنا پیارا بچہ تھا۔ بے حد افسوس ہے۔“ انہوں نے آہ بھری۔ ”مگر اللہ کے کاموں میں کس کو دخل ہو سکتا ہے۔ صبر کے سوا چارہ نہیں اس طرح رونے سے کیا ہوتا ہے۔ رونا دکھونا بے کار ہے۔ بالکل بیکار قسمت میں یونہی لکھا تھا۔“ قسمت! ہاجرہ نے ماتھے پر زور سے ہاتھ مارا اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

اس شام علی احمد صحن میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے ”وہ اپنی استثنیٰ شام کوٹ کی ہے نہ تم جانتی ہوتا۔ نہیں جانتی۔ ہاں ایلی جانتا ہے، کیوں ایلی جب تم میرے ساتھ دورے پر گئے تھے اور اس نے تمہیں مٹھائی کھلائی تھی یاد ہے نہ۔ اس کی لڑکی ہے۔ سولہ سال کی عمر ہو گی۔ کشمیر میں پرورش پائی ہے۔ رنگ اتار سا ہے۔ آخر کیوں نہ ہو۔ جس نے اناج کی جگہ پھلوں پر پرورش پائی ہو۔ اس کا رنگ اتار سا کیوں نہ ہو گا۔ ساری بات طے ہو گئی ہے تاریخ مقرر ہو چکی ہے۔ میں نے سوچا تھا۔ ایلی کی ماں اتنے بڑے گھر میں اکیلی رہتی ہے۔ کوئی تو ساتھی ہونا چاہئے۔ لوہاں اب تیار ہو جاؤ۔ ایلی کی ماں۔ ہم سب علی پور جا رہے ہیں۔ ایلی کی دادی نے بلایا ہے۔ سارا انتظام تمہیں کو کرنا ہو گا ایلی کی ماں۔ تمہارے سوا گھر میں اور کون ہے۔ ہی ہی ہی“ وہ ہنسنے لگے۔

ہاجرہ کی آنکھیں بالکل ہی پتھرا گئیں۔ رقیق مسکراتے لگی اور ایلی علی پور جانے کی خوشی میں تپنے لگا۔ ایلی کو بھائی کی موت پر چنداں غم نہ ہوا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ اچھائی ہوا کہ نوکرانی

کے منہ کا نشان مٹ گیا۔ اب اسے کوئی یاد دلانے والا نہ تھا کہ وہ آسا ہے۔

علی پور جانے کی خبر سن کر ایلی کی توجہ اپنے ساتھیوں کی طرف مبذول ہو گئی اور وہ یوں ہل گیا جیسے کوئی بچہ کھلونا ملنے پر ہل جاتا ہے۔ نویں جماعت کا امتحان ختم ہو چکا تھا۔ اس لئے علی پور جانے کی خبر اس کے لئے بے حد خوش کن تھی۔

شہ بالا

علی پور پہنچتے ہی محلے والوں نے ایلی پر سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی۔

”کیوں ایلی کیا باپ کی شادی پر آئے ہو۔ کیا کہتا ہے۔“

”ایلی شہ بالا بنے گا اپنے ابا کا ہے نا۔“ ”کیوں میاں تمہاری نظر میں بھی کوئی کشمیر کا

سیب ہے۔ ابھی سے چٹاؤ کر لو میاں پھر بچھتاؤ گے۔“

”اے ہے ایلی بیٹے سے مذاق کیوں کرتے ہو۔ وہ کیوں بنے شہ بالا کسی کا۔ اس کے تو دو لہما

بننے کے دن آرہے ہیں۔ بھئی اسے دق نہ کرو۔“

”کیوں بھئی اہل کو ڈولی میں بٹھا کر کب لائے گا۔ ایلی۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ ویسے وہ کوشش تو کرتا تھا کہ کوئی چٹکیلی بات کرے لیکن نہ جانے کیوں اسے اس بات پر شرم محسوس ہونے لگتی اور اس کی آواز گلے میں خشک ہو کر رہ جاتی۔ اس پر عورتیں اسے چھیڑتی۔

”لے لڑکے کی آنکھوں میں آنسو چھلکنے لگے۔“

”اے ہے اس کے گلے میں تو آواز خشک ہو گئی۔“

”نہ بیٹے ایلی برا نہ من۔ اس کا کیا ہے علی احمد تو ہے ہی ایسا۔“

”عورتوں کے بغیر اس کا وقت کتنا مشکل ہے۔ مگر بیٹا چاہے کوئی آئے کوئی جائے گھر کا مالک تو ہی ہے اور گھر کی مالک تیری ماں ہاجرہ۔“

”ان آنے جانے والیوں کو کون پوچھتا ہے ماں۔“

ادھر علی احمد کے گرد لوگوں نے حلقہ باندھ رکھا تھا۔ ”کیوں علی احمد نہ رہ سکا تو بنی شادی کے بغیر شرم نہیں آتی علی احمد۔ یہ کیا تیرے دو لہما بننے کا وقت ہے۔ گھر بیٹی جوان ہو چکی ہے۔ لڑکا دسویں پاس کر چکا ہے۔“ ”علی احمد کوئی کشمیر کا سیب ہمیں بھی لا دو۔“

لیکن علی احمد کے حلق میں آواز خشک نہ ہوتی تھی نہ ان کا چہرہ زور پڑتا اور نہ ہی ان کی زبان لڑکھاتی اور وہ سب کو کوئی نہ کوئی جواب دے کر خاموش کر دیتے۔ داروغہ سے کتے بھلا داروغہ کشمیر کے سبب لانے کی چیزیں نہیں۔ یعنی وہ تو ڈال سے توڑ کر کھانے کی چیز ہے۔ اسے ہے تو ہاتھ بڑھاؤ۔“

جانوں مائی سے کہتے ”لومائی اللہ نہ کرے میں کیوں رہوں شادی کے بغیر مرد ہوں میں اور وہ بھی تیرا بیٹا۔“

پھر جیواں آکر چلائی۔ ”علی احمد تیرے تو بال بھی سفید ہو گئے۔“
 ”ہاں مائی۔“ وہ جواب دیتے ”دل سفید نہیں ہوا۔ ابھی ایمان کی روشنی سے منور ہے اور اللہ رسول کی سنت کا لحاظ ہے۔“

”اے ہے۔ علی احمد۔“ جیواں ہنس کر دو تہتر مارتی ”تو تو بھانڈ ہی رہے گا۔ ساری عمر۔“ اور علی احمد ہنسنے اور جیواں چلائی اور ان کا گھر قہقروں سے گونجنے لگتا۔ اس وقت ایللی کو علی احمد سے عقیدت سی محسوس ہونے لگتی۔ ان کی باتیں سن کر وہ ان کے تمام قصور بخش دیتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ بھی علی احمد کی طرح باتیں کر سکے لیکن بات کرتے وقت اس کی زبان انک جاتی تھی۔ گلہ بیٹھ جاتا۔ دل کو کچھ کچھ ہونے لگتا تھا اور اس کا جی چاہتا تھا کہ بھاگ جائے دور جہاں کوئی نہ ہو۔ کوئی نہ ہو۔

علی پور پہنچ کر پہلے تو ہاجرہ بہت روئی تھی رو رو کر اس نے برا حال کر لیا۔ وہ ننھے کی ہانڈ کرتے ہوئے آنسو بہاتی رہتی۔ ”اور پھر ایسا سمجھدار اور متحمل مزاج۔ رونا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ہائے اتنی تکلیف وہ بیماری لگی اسے کہ توبہ ہے۔ زہریا کوئی معمولی بیماری نہیں بہن۔ لیکن اس بچہ نے آف تک نہ کی۔ رویا ہی نہیں۔ بس حیران نگاہوں سے چاروں طرف دیکھتا رہا کہ کمال آیا جہاں میری کسی کو قدر نہیں۔ جہاں کسی کو میرے دکھ کی خبر نہیں۔“

ہاجرہ کے آنسو از سر نو ٹپکنے لگتے اور وہ کچھ دیر کے لئے خاموش ہو جاتی۔ ”بیماری میں اس کا مسکراتا نہ گیا۔ یوں مسکراتا۔ جیسے سیانے لوگ مسکراتے ہیں۔ میں روئی تھی اور وہ مسکراتا۔ بیماری نے اسے ذرا بھی ہمت نہ دی۔“ ہاجرہ وہ رو رو کر بچے کی باتیں کرتی رہتی اور اسے آنسو پونچھتی رہتی۔

ہاجرہ بار بار علی احمد کے بے حسی کا قصہ بیان کرتی رہی۔ ”انہیں اپنے شغل سے کام۔“

مرے یا بچے ان کی بلا ہے۔ انہیں تو کشمیری سبب کا عشق لگا تھا۔ کہتے تھے۔ کشمیری پھلوں پر پلے ہے۔ دسویں پاس ہے۔ انگریزی فر فر بوتی ہے۔ اچھا ہے بہن ہم بھی اس سے اٹھنا بیٹھنا۔ چلنا پھرنا بات کرنا سیکھیں گے۔ مجھے تو خوشی ہے بہن کہ گھر میں میم آئے گی۔ سچ کہتی ہوں۔ میرا خدا شاہد ہے۔ بہن مجھے گلے کی قسم مجھے کوئی دکھ نہیں۔ بس یہی دکھ ہے کہ ننھا تڑپ تڑپ کر مر رہا تھا اور میاں کو کشمیری سبب کی دھن لگی تھی۔ دو پیسے کی دوا تک نہ منگوائی۔ زس دیکھنے آتی تھی تو اس سے ٹھنڈے کئے جاتے تھے توبہ ہے۔ گھر میں کوئی دم توڑ رہا ہو اور لوگ اپنی حرص و ہوس میں کھوئے ہوئے ہوں۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ مجھے سو کن کا دکھ تو نہیں۔ اس ننھے پھول سے بچے کا دکھ ہے۔“ اور وہ از سر نو رونے لگتی۔ اس وقت ایللی کو محسوس ہوتا کہ ہاجرہ بچے کا نام لے کر نہ جانے کس دکھ کی وجہ سے رو رہی ہے۔ سو کن کا دکھ نہ تھا تو وہ اتنی قسمیں کیوں کھاتی تھی۔ کلمہ کیوں پڑھتی تھی۔

پہلے تو ہاجرہ ننھے کے لئے روتی رہی اور علی احمد کی بے وفائی کا گلہ کر کے آنسو بہاتی رہی پھر دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ لوگ یہ نہ سمجھ رہے ہوں کہ وہ سو کن کی آمد کی وجہ سے رو رہی ہے اور بیٹے کے بہانے اپنے لئے ہوئے سہاگ پر آنسو بہا رہی ہے۔ ہاجرہ سب کچھ برداشت کر سکتی تھی۔

یہ نہیں کہ لوگ اس کی قوت برداشت کا مذاق اڑائیں۔ اس پر خاوند پسندی کا جرم عائد کریں۔ اس لئے وہ خاموش ہو گئی اور اٹھ کر علی احمد کے بیاہ کی تیاری میں لگ گئی اور یوں شوق سے انتظامات کرنے لگی، جیسے خاوند کی بجائے اس کے بیٹے کی شادی ہو رہی تھی۔ انتظامات پر وہ بات بات پر اعتراض کرتی ”نہیں نہیں یہ تو کچھ بھی نہیں۔ میں دولہن کو یہ پہننے نہ دوں گی۔ دولہن کیا کہے گی۔ سسرال والے کیا سمجھیں گے۔ اور یہ زیور تو اب پرانا ہو گیا ہے۔ دولہن کے لئے نئی طرز کی چیز ہونی چاہئے۔“

اہل کے اس اٹھنا اور شوق کو دیکھ کر ایللی حیران ہوتا تھا۔ لوگ حیران ہوتے تھے اور حیرانی کا اظہار بھی کرتے تھے۔ ”ہاجرہ تم کیوں جان مار رہی ہو۔ لو خواہ مخواہ۔ چھوڑو کرنے دو آپ ہی اسے۔ تمہیں کیا پڑی ہے۔ ایسا بھی نہیں ہونا چاہئے انسان کو۔“

یہ سن کر ہاجرہ کی آنکھ میں چمک سی لہرائی۔ ”اے ہے بہن اس میں کیا ہے۔ سو کن آئی ہے توبہ شک آئے۔ اپنے اپنے نصیب ہیں۔ جو اللہ نے نصیب میں لکھ دیا ہم اللہ۔“

اس پر لوگ اس کی طرف عجیب نگاہوں سے دیکھتے۔ حیرانی شکوک میں بدل جاتی اور وہ سوچتے ضرور اس میں کوئی بھید ہے۔ ایلی بھی ان شکوک کو شدت سے محسوس کرتا اور اسے دل پر غصہ آتا لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ غصہ کیوں محسوس کر رہا ہے اور اس کے اپنے دل میں شکوک کیوں پیدا ہوتے ہیں۔ اس گھر کی تمام تر باتیں ہی عجیب تھیں۔ صرف ایک داوی الماں تھیں جو گھر کی الجھنوں سے دور بیٹھ کر مسکراتی رہتی تھیں۔

ایلی کو صرف داوی الماں پر بھروسہ تھا جو کسی بات میں دخل نہ دیتی تھی اور کھری کھری بنا دیتی تھی۔ ”علی احمد رسی جل گئی پر بل نہ گیا۔“ اس نے علی احمد کی شادی کے متعلق صرف یہی ایک جملہ کہا تھا اور پھر خاموش ہو کر جائے نماز پر جا بیٹھی۔

گھر کے باقی تمام لوگ عجیب تھے۔ ابا اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ الماں یوں نکلے کی حاجن بنی ہوئی تھیں۔ جیسے وہ انسان نہیں بلکہ فرشتہ ہو۔ صرف دو پردوں کی کسر تھی اور سیدہ کیسی چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔ مسکراتی بھی تو ہونٹوں کے کونوں سے کہ کسی کو پتہ نہ چلے۔

گھر کی ان الجھنوں سے آٹا کر ایلی باہر نکل جاتا اور محلے کے لڑکوں کو بلا کر سب کچھ بھول جاتا یا تو وہ ارجمند کے چوہارے میں جا کر کھڑکی کی درز سے کوراڑو دیکھتا رہتا یا محلے کے کونوں کے پاس کھڑے ہو کر انگریزی لہجوں کو آزماتا یا جمیل کے ساتھ جا کر تنگ گلی میں بیڑے کھاتا یا رضا کی دوکان پر بیٹھ کر اس کی اناپے شنبابتوں پر ہنستا یا بلا کے ہاں جا کر گراموفون سنتا اور یا محلے کے سب لڑکوں کو اکٹھا کر کے میدان میں گیند بیٹ کھیلنے میں مصروف ہو جاتا۔ ان مصروفیتوں میں دن بیت جاتا اور شام پڑ جاتی اور پھر داوی الماں کی آواز محلے میں گونجتی۔ ”ایلی اب تو آئے گا کہ نہیں سارا دن لنڈوروں کی طرح پھرتا ہے۔ آج رات ہو گئی۔ ایلی۔“ پھر وہ چپکے سے دبے پاؤں بیڑھیاں چڑھتا اور داوی الماں اسے دیکھ کر غصے سے چیختی اور وہ بے خوف آگے بڑھ کر اس کے کندھوں پر چڑھ جاتا اور وہ ہنس پڑتی اور پھر وہ دونوں ایک چارپائی پر سو جاتے اور داوی الماں اسے تھپکتی۔ ”سو جا اب لنڈور کہیں گا۔“ اس وقت ابا لیپ کی روشنی میں مہاجنوں کی طرح حساب ملانے میں مصروف ہوتے۔ دو اور تین پانچ، آٹھ۔ تیرہ یہ ہوئے دو سو تیرہ اور ہاجرہ چیزیں دیکھتے ہوئے بڑ بڑاتی ”لو یہ قیص کا کپڑا تو بالکل بے کار ہے۔ دولہن کیا کہے گی۔“ اور علی احمد چلاتے ”تو تو پاگل ہو گئی ہے۔ اٹھارہ روپے گز کا ہے۔ اس سے بہتر کیا ہو سکتا ہے۔ دو سو تیرہ

اور چھ سو چھپیس یہ ہوئے کل۔“

دولہن

دولہن کی آمد پر محلے میں ایک شور مچ گیا۔ چاروں طرف سے عورتوں نے علی احمد کے گھر کی طرف یورش کر دی۔

”آؤ بہن دولہن کو دیکھ آئیں۔“

”دولہن آگئی کیا؟“

”ابھی آئی ہے ابھی۔“

”ہائے میرا دل نہ کھل ہے؟“

”کتے ہیں کشمیر میں بلی ہے۔“

”سنا ہے وہ تو انگریزی فر فر بولتی ہے۔“ اور وہ دوپٹے سنبھل کر علی احمد کے گھر کی طرف چل پڑتیں۔

دولہن کی آمد کی خبر سن کر ایلی نے جھرجھری لی۔ اس کے بدن میں بجلی سی دوڑ گئی اور وہ چپ چاپ کمرے کا کھڑا رہ گیا نہ جانے کیوں وہ گھر جانے سے ڈرتا تھا۔

”اے ہے تو یہاں کھڑا ہے۔ ایلی۔“ وہ اسے سہا ہوا کھڑا دیکھ کر بولیں ”اور تمہارے گھر میں اللہ کے فضل سے نئی دولہن آئی ہے۔“

دوسری بولی بہن اللہ کے فضل سے کیوں کہو۔ یوں کہو کہ علی احمد کے شوق کی وجہ سے۔“ پہلی بولی: ”اب جو آگئی ہے تو اس پر اللہ کا فضل ہو۔ خوشیاں دیکھے۔“

ایلی حیرانی سے ان کی باتیں سنتا تھا۔ عجیب باتیں تھیں ان کی۔ وہ علی احمد پر غصے سے بل کھاتیں اور ساتھ ہی ان کی رنگیں مزاحی کی وجہ سے ان کی جانب کھینچی جاتیں۔ ہاجرہ سے بھر دی کا اظہار کرتیں اور ساتھ ہی اسے مورد الزام بھی سمجھتیں۔ کتنی عجیب بات تھی۔

دولہن کو دیکھتے سارا محلہ علی احمد کے گھر اکٹھا ہو رہا تھا مگر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے اسے گھر میں جانا چاہئے۔ اس میں گھر جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی، لیکن آخر اسے گھر جانا ہی پڑا اور وہ چپکے سے ایک کونے میں جا کھڑا ہوا۔ بڑے کمرے میں عورتوں کے جھوم کے درمیان پٹنگ پر ایک سرخ رنگ کی ٹنڈی سی لپٹی پڑی تھی دو تالیفیدہ ہاتھ لٹک رہے تھے۔ کتنی رنگدار مندی تھی

”مسکرا کر کہتی ”علی احمد پہلے تو ہمیشہ مٹی پر گر کر اترتا تھا۔ اب کی بار توجیت گیا ہے۔“
”ہند ہے تمہیں چاچی؟“

”اچھی ہے۔ اپنی لڑکیوں کی طرح ہی ہے۔ بیچاری، ناک نقشہ برا نہیں رنگ سفید ہے۔
آنکھیں کالی تو ہیں پر ذرا کھلی کھلی ہیں۔ ہر حال ناک نقشہ برا نہیں۔“
”تیرے ناک نقشے کی طرح ہے کیا۔“ علی احمد نے مسکرا کر پوچھا۔
”چل دفعہ ہو منہ کالا۔“

”کیوں چاچی میں کیا بات کہتا ہوں۔“ چاچی ہنسے جا رہی تھی۔

کھانے سے فارغ ہو کر اہلی پھر دولہن کے کمرے میں جا داخل ہوا اور چوری چوری اسے دیکھنے لگا۔ سفید جسم سے چارپائی بھری ہوئی تھی۔ اسے سفید رنگ بہت پیارا لگتا تھا اور ان جانے میں وہ بھرے جسم کو دیکھ کر بہت خوش ہوا کرتا تھا۔ عورتیں ایک ایک کر کے چلی گئیں۔ پھر وہ دولہن کے پاس جا بیٹھا۔ دفعتاً دوپٹے میں حرکت ہوئی اور ایک بڑا سا سفید منہ نکلا ہو گیا اور وہ چوری چوری اس کی طرف دیکھنے لگا۔

”ہائیں۔“ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے کسی نے اس کی امیدوں کے عالی شان محل کو پاؤں کی ٹھوکر سے چور چور کر دیا ہو۔ دولہن کی آنکھوں میں فرق تھا اور اس کا چہرہ خالی ورق کی طرح سرا سر کور تھا۔ اہلی نے محسوس کیا جیسے اسے دھوکا دیا گیا ہو۔ جیسے اس کی توقعات کو ٹھکرایا گیا ہو اسے جان بوجھ کر غلط فہمی میں مبتلا رکھنے سے علی احمد کا کوئی خاص مقصد ہو گا۔ غصے سے اس کی کنپٹیاں جتنے لگتیں اور وہ بھاگا۔ دور دور دولہن سے دور اس جیتے دھوکے سے دور باہر صحن میں پہنچ کر اس کی آنکھوں سے آنسو نکل آئے۔ کئی دن تو اس صدمہ کی وجہ سے وہ سخت اواں رہا پھر اس نے اپنے آپ کو محلے کی زندگی میں کھو دیا تاکہ گھر کے واقعات کو دل سے بھلا کر اپنی خوشی کو محفوظ کر سکے۔

نماز کیلٹی

اس زمانے میں علی پور میں خلافت تحریک کے تحت نماز کیلٹیوں کا دور دورہ تھا۔ مسلمانوں میں اسلام کے متعلق بڑا جوش تھا ہر محلے میں نماز کیلٹیاں قائم ہو رہی تھیں۔ نوجوان لڑکے علی الصبح منہ اندھیرے جاگ پڑتے اور سردی میں ٹھہرتے ہوئے ایک دوسرے کو جگاتے۔ پھر

نہ جانے مونگیا فیض کی وجہ سے وہ اور بھی سرخ دکھائی دے رہی تھی یا شاید اس لئے کہ بہت سفید تھے۔ اہلی نے نفرت بھری جھرجھری محسوس کی اور منہ موڑ لیا۔

لوہر عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا ”ایلی یہاں آ۔ اپنی امی کو سلام کر آکر۔“
”سلام جی۔“ اس نے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر کہا اور پھر سر جھکا کر کھڑا ہو گیا۔
”بھگے ہے لڑکا سلام کہتا ہے۔ اسے پیار تو کر لے دولہن۔“
”اللہ رکھے تیرا بیٹا ہے۔“

”پلا پلایا بیٹا مل گیا تجھے یہ بھی کسی کسی کے نصیب میں ہوتا ہے۔“
مونگیا چادر تلے سے حنائی ہاتھ اہلی کی طرف بڑھا۔ اس نے سر جھکا دیا اور منہ مڑا۔ سانس بند کر کے کھڑا ہو گیا تاکہ اسے حنا کا رنگ دکھائی نہ دے۔ یوں نہ آئے۔ سر تھپکنے کے وہ حنائی ہاتھ اس کے منہ پر آنکا۔ مندی کی بو کا ایک طوفان اٹھ آیا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو دورے دوڑ گئے۔ نہ جانے اس بو میں کیا تھا۔ اہلی کے جسم کا بند بوند ٹوٹنے لگتا تھا۔ تار تار لگتے گھبرا کر اس نے اپنا آپ چھڑا لیا اور صحن کی طرف بھاگا۔
”شرماتا ہے۔“ مٹی جیواں چلائی۔ ”بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔“

دوسری بولی ”ایسا اچھا بیٹا ملا ہے تجھے۔“
اہلی دادی اہل کے تخت تک پہنچ چکا تھا۔ اس کا دل مالتا رہا تھا۔ سر گھوم رہا تھا اور سب ہنس رہی تھیں۔

”دیکھ آیا اہل کو۔“ دادی اہل نے کہا ”بیٹھ جا۔“ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔
”میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ وہاں مٹی کی ہڈیاں ہیں۔“ دادی اہل اس کے پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔

دوسرے کمرے میں علی احمد مضطربانہ طور پر ٹہل رہے تھے۔ بار بار وہ باہر نکلتے ”مائی چہ

تجھ پر تو پھر سے جوانی آرہی ہے۔ ہلدی کا برتن کھاتی ہے کیا؟“
”شرم کر علی احمد۔“ مائی جیواں ہنستی۔ ”شرم کر“ لیکن اس کے انداز سے ظاہر ہوتا ہے

اس کی بے شرمی پر بے حد مسرور ہو۔
چاچی حاجاں چلائی ”لے آ گیا تیرا کشمیر کا سب۔“ تجھے مبارک ہو علی احمد۔“
”کیوں چاچی؟“ وہ جواب میں پوچھتے ”خسارے کا سودا تو نہیں کیا ہم نے۔“

جلوس کی شکل میں شرکاک چکر لگاتے۔ محلے محلے پھرتے اور گاگا کر لوگوں کو جگاتے۔ نماز پڑھنے پر تلقین کرتے۔ لڑکوں کو نماز پڑھنے سے اس قدر دلچسپی نہ تھی۔ البتہ اکٹھے ہو کر گاتے ہوئے بڑے جگہ جانا۔ مجاہدانہ انداز سے گھومنا اور مجاہدانہ شن سے لکار لکار کر گانا یا غازی مصطفیٰ پاشا کمال شن میں قصیدے پڑھنا اور امان اللہ خان کے گن گانا اور علی برادران کو سراہنا۔ اہلی اور خنل بے حد پسند آیا۔ کیوں نہ پسند آتا محلے کے جوان اس بات میں شان امتیاز سمجھتے تھے۔ جو وہ باہر نکلتے تو ان کا انداز عجیب ہوتا جیسے ہیرو ہوں۔ جیسے مصطفیٰ پاشا کا گیت گانے والے نو مصطفیٰ کمال ہوں۔ جنہوں نے زمانے کی نگاہوں سے بچنے کے لیے بھیجیں بدل رکھا ہو۔ اگر خنل میں بھی شریک ہوتے تھے۔ رفتی، اعظم، غلام علی، ضیاء اور صفدر لیکن صفدر اور غلام کی حیثیت صرف منتظمین کی سی تھی۔ وہ صبح جاگتے لال دینوں کا انتظام کرتے۔ انہیں جلانے پھر نعروں کی کاپیاں نکال کر گیتوں کی دھنیں قائم کرتے اور بالا خرچھوٹے لڑکوں کو گلے کا سوپ کر خود سگریٹ سگاکر جلوس کے ساتھ چل پڑتے۔

بڑے لڑکوں میں صرف اعظم تھا جو انتظامات کرنے کے علاوہ گلے میں بھی پیش پیش ہوا تھا۔ اہلی اعظم کو دیکھ کر فخر سے پھولے نہ سہا۔ اس کالے، گلے کا انداز، گردن اٹھا کر چلنے کا عادت اور گاتے ہوئے ادھر ادھر دیکھنے کا انداز اہلی کو بے حد جاذب معلوم ہوتے تھے۔ اس گلے میں یا کندھوں پر ایک شان بے نیازی سے رومال پڑا ہوتا تھا۔ جس پر کبیل بڑی شان سے نکلتا اور پھر گاتے ہوئے اس کی گردن کا زاویہ کس قدر خوبصورت معلوم ہوتا تھا۔ اہلی کا بھی کہ وہ بھی اعظم کی طرح بے نیازی سے چلے اور شان استغنیٰ سے گلے اور اس کا کبیل دیتے ہی لٹکے۔ لیکن سردی کی وجہ سے وہ کبیل میں ٹھسرتا ہوا چلتا اور گاتے ہوئے اس کی گردن پھول جاتی اور آواز چیختی اور کنپٹیاں درد کرنے لگتیں۔ اہلی کی آواز تو بہت بلند تھی لیکن اس گلے میں بیٹھاس نہ تھی۔ عام طور پر وہ آواز بہت اونچی نکالتا اور ابتدا ہی میں ایسی سر قائم کر کے جسے بھٹانا مشکل ہو جاتا۔ پھر وہ سب اصرار کر کے اسے گلے والوں کے گروپ کا سردار بنا دیتے یہ بہت بڑا امتیاز تھا۔ اسی امتیاز کی وجہ سے وہ بہت سویرے جاگ اٹھتا اور باہر نکل جاتا کہ کمیٹی کے لئے لیٹ نہ ہو جائے۔

علی پور میں جب وہ جلوس کی صورت میں چلتے تو بند کھڑکیاں کھل جاتیں۔ چھتوں سے آلود چہرے جھانکتے، منڈیروں سے انگڑائی لیتے ہوئے بازو دکھائی دیتے، بڑے لڑکے سگریٹ

سٹل لے لے کر کھڑکیوں منڈیروں اور چھتوں کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے اور ساتھ ہی ٹولی کو ہدایات دیتے رہتے۔ درپچوں سے ہمیں آوازیں سنائی دیتیں۔ ”اگر دیکھو تو نماز کمیٹی والے ہیں۔ دیکھ تو۔“

مسجد کے زیر سایہ

دوپہر کے وقت وہ ارجمند کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں ”انگریزی مایاؤں“ کے تمام سامان سے لیس ہو کر کنوئیں کے قریب جا کھڑے ہوتے اور ہر آتی جاتی لڑکی پر انگریزی چلائے۔ ارجمند ریشمیں رومال لہراتا۔ اس کے ہونٹ بانسری پر رکھے ہوتے لیکن بانسری بجانے کی بجائے وہ کچھ اور ہی ظاہر کرتے اور وہ دبی زبان سے کہتا ”اف! غضب ہے۔ قیامت ہے۔ اب لڑکچن چھوڑ دے ظالم شہاب آنے کو ہے۔“

ان دنوں کو وہاں کھڑا دیکھ کر کنوئیں کے پاس والے مکان سے برتن بجنے کی آوازیں آنا شروع ہو جاتیں پھر کوئی قہقہہ مار کر ہنستی اور با آواز بلند کسی کو پکارتی ”عائش! آئے گی بھی یا نہیں۔ ہی ہی ہی ہی۔“ اس کے قہقہے سن کر اہلی کو علی احمد کا کمرہ یاد آ جاتا اور وہ سوچنے لگتا ”کیا ہر مکان میں علی احمد کا کمرہ ہوتا ہے، کیا ہر بند دروازے کے پیچھے ٹین کے سپاہی چھپے ہوتے ہیں۔“

پھر دفعتاً ”ٹاٹ کا پردہ ہلتا اور ایک بھرے جسم کی لڑکی سامنے آکھڑی ہوتی۔ ارجمند کا رومال ہلتا بانسری فٹیں کرتی۔ آنکھیں چمک چمک کر دیکھتیں۔ بازو بغل گیر ہونے کے اشارے کرتے۔ اس وقت اہلی کے ماتھے پر پسینہ آ جاتا۔ آنکھیں جھک جاتیں۔ دل دھک دھک کرنے لگتا۔ کوئی آنکھلا تو وہ اس انداز سے ادھر ادھر دیکھنے لگتا۔ جیسے کسی اور کام میں مصروف ہو۔ جیسے ارجمند سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے وہ راہ چلتے چلتے ٹوک گیا ہو۔ اور ٹاٹ کے پردے سے مسکراتی ہوئی نوجوان لڑکی کی موجودگی کا اسے قطعی علم نہ ہو جیسے وہ انگریزی مایاؤں کے عمل سے قطعی عواقف ہو۔

ادھر ارجمند کا ریشمیں رومال اس کی گردن پر آگرتا بانسری کا زاویہ بدل اور وہ یوں آسمان کی طرف دیکھنے لگتا۔ جیسے اللہ سے لو لگا کر اس کی حمد و ثناء میں کوئی دھن بجا رہا ہو۔ اس کے باوجود آتے جاتے شکوک بھری نگاہوں سے انہیں دیکھتے اور پھر مسکرا کر آگے نکل

جاتے۔ ان کے جانے کے بعد ٹاٹ کے پردے کی اوٹ سے چھپی ہوئی لڑکی کا بازو یا آنکھ پھرے باہر نکل آتی اور ارجمند کا رومال پھر سے لہرانے لگتا۔ ایللی کا دل پھر سے دھڑکنے لگتا اور اس کی پیشانی پھر سے پسینے سے بھجک جاتی۔ اس خطرناک کھیل میں وہ زیادہ دیر مشغول نہ رہ سکتے تھے اس لئے کہ آتے جاتے لوگ انہیں وہاں اس طور کھڑے دیکھ کر گھورتے تھے۔ شاید خطرناک ہونے ہی کی وجہ سے یہ کھیل ان کے لئے بے حد دلچسپ تھا۔ حالانکہ ایللی کو کبھی اتنی مہلت ملی تھی کہ وہ ٹاٹ سے جھانکتے ہوئے چہرے کو نظر بھر کر دیکھ سکے وہ صرف یہی جانتا تھا کہ وہ بڑا سا چہرہ سفید سفید ہے اور وہ بانہیں غمخیز گوشت سے لبالب بھری ہیں اور وہ آنکھیں بے ہوشی اور شوخ ہیں۔

پھر وہ دونوں کنوئیں کو چھوڑ کر پرانی حویلی کے میدان میں آکھڑے ہوتے۔ اس میدان میں کسی زمانے میں ایک حویلی تھی، جو اب مندم ہو چکی تھی۔ مشرق کی طرف چند ایک پختہ مکانات تھے۔ شمال کی سمت میں ایک گلی نکل گئی تھی، جس میں دور تک کچے مکانات بنے ہوئے تھے۔ گلی آصفی محلے سے تعلق نہ رکھتی تھی۔ کہا جاتا تھا کہ پرانے زمانے میں آصفیوں کا کام کار کرنے والے کس، یہ گلی انہیں کی تھی اگرچہ اب ان کی مجلسی حیثیت آصفیوں سے کم صورت کم نہ تھی۔

پرانی حویلی کے میدان کے پرے مشرق میں شیخوں کے چند ایک مکانات تھے۔ کنوئیں کے پاس ایک مکان میں سید آکر آباد ہو گئے تھے اور اس کے قریب چند کشمیری آئے تھے۔ اب آصفی محلہ صرف مغربی حصہ تک محدود تھا۔ وہ پختہ وسیع میدان جسے منڈی کہتے تھے اس مرکزی حصہ تھا۔ آصفی لڑکے عام طور پر اس مرکزی حصے میں کھیلنے سے گھبرایا کرتے تھے۔ کیونکہ وہاں کھیلنے سے انہیں محلے کی عورتوں کی نگاہوں تلے رہنا پڑتا تھا اور وہ بات بات پر اعتراض کرتیں ”اے مائی کا گند اچھالتے ہوئے تمہیں شرم نہیں آتی۔ سارا دن ٹپاک چھینے اڑا رہتے ہو۔ چھوڑو اس گندے کھیل کو۔“ گلی میں کھیلنے پر وہ چلاتیں۔ ”کسی کا سر پھوڑ کر اٹھایا کا سانس لو گے تم یہ کیا شریفوں کا کھیل ہے۔“ منڈی میں انگریزی مایاؤں کا کھیل تو بالکل بایا تھا۔ وہاں تو ریشمی رومال تک لہرایا نہ جاسکتا تھا۔ بانسری بجانا تو الگ چیز تھی۔ اگر وہاں ریشمی رومال لہرایا بھی جاسکتا تو بھی اس کا کوئی فائدہ نہ ہوتا کیونکہ منڈی کے گرد رہنے والی لڑکیاں کھڑکیوں میں نہیں آسکتی تھیں۔ یا تو ان میں اس قدر جرات نہ تھی اور یا شاید حس ہی نہ

دبے پاؤں چلتیں جیسے پاؤں کی آہٹ ان کی دشمن ہو۔ بچی نگاہوں سے دیکھتیں۔ بند ہونٹوں سے مسکراتیں اور یوں آہستہ بولتیں جیسے وہ لڑکیاں نہیں بلکہ چلتے پھرتے سائے ہوں اور پھر منڈی میں ہر آہٹ پر بوڑھیوں کے کلن کھڑے ہو جاتے۔

”کون ہے۔ اے ہے شریفوں کے بیٹے بھی اب بانسریاں بجانے لگے۔ میرائی بن گئے۔ کیا تو ہے کیا زمانہ آیا ہے۔“

”ریشمی رومال لہراتے ہوئے شرم نہیں آتی کیا۔“ چاروں طرف سے بوڑھیاں کھڑکیوں میں آجھ ہوتیں۔ ”یہ ذرا دیکھنا مل برکتے۔ چاچی حاجیل ذرا آؤ تو۔“

سارے محلے میں انگریزی مایاؤں کے لئے صرف دو مناسب مقامات تھے ایک تو کنوئیں کے پاس مسجد کے قریب جہاں بڑی ڈیوڑھی تھی اور دوسرے پرانی حویلی کے میدان میں بڑی لائٹین کے نیچے۔

کپ اور کیپ

جب وہ دونوں لائٹین کے نیچے کھڑے ہوتے اور ارجمند بانسری کی سروں کو چھینتا تو دفعتاً عصمت اللہ کے مکان کی کھڑکی کی جتن کو حرکت ہوتی جسے دیکھ کر ارجمند زیر لب کہتا ”وہ مارا دیکھا۔ جلد وہ جو سر چڑھ کر بولے۔“ پھر وہ جتن کی طرف دیکھ کر آنکھیں چمکاتا اور ایللی سے مخاطب ہو کر کہتا ”دیکھا ادھر بین بچا ادھر سانپ ناچنے لگا۔ اسے کہتے ہیں انگریزی مایاؤں۔“

ارجمند کی باتیں سن کر ایللی فخر محسوس کرتا کیونکہ ارجمند کی فتح اس کی اپنی فتح تھی۔ لیکن اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ سانپ کون ہے۔ کہاں ہے اور اس کے ناچنے کا مطلب کیا ہے۔ جتن کی طرف تو وہ بھی دیکھتا تھا۔ مگر اتنی دور سے جتن کے پیچھے اسے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا پھر وہ دوسری جانب دیکھنے لگتا شاید سانپ ادھر ناچ رہا ہو۔

اسے یوں کھوئے ہوئے دیکھ کر ارجمند چلاتا ”نہیں یار۔ کیپ کیپ سمجھ کیپ کھڑکی میں آ بیٹھی ہے وہ مٹی جتن، وہ اب دیکھا۔ اف یار کس غضب کی چیز ہے بس سمجھ لو بالکل تیار ہے۔ ذرا سی کسر ہے ایک آنچ کی اگر ہماری ڈپنری یہاں علی پور میں ہوتی اور کیپ کسی روز دوا لینے آگئی تو سب ٹھیک ہو جاتا۔ معاملہ صاف ہو جاتا۔ لیکن اب یہاں ڈپنری جو نہیں کیا کیا جائے۔“

ایلی محسوس کرتا کہ انگریزی مایاؤں میں ایک ڈپنری کا ہونا اشد ضروری ہوتا ہے۔ سوچنے پر اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ڈپنری اس سلسلے میں کیا مدد کر سکتی ہے۔ ڈپنریاں تو مل میں بھی تھیں۔ جہاں لمبی میزیں بھی ہوئی تھیں۔ میزوں پر روٹی کے چھاپے پڑے ہوئے کپاونڈر فینچی لئے کھڑا رہتا۔ پھر بڑی بڑی بوتلیں اور وہ عجیب سی بوتلیں سوکھنے سے انسان بخواہ محسوس کرنے لگتا ہے کہ وہ بیمار ہے اور وہ ڈاکٹر جس کے ماتھے پر شکنیں پڑی رہتیں۔ ہاتھ میں بڑی ٹوٹیاں لگتیں۔ جو نہایت خشک آواز میں باتیں کرتا تھا۔ اور مریضوں کی بات یوں پروائی سے سنتا تھا۔ جیسے سن ہی نہ رہا ہو۔ ایسی جگہ کے ہونے سے بھلا کیا فائدہ ہو سکتا تھا فائدے سے ارجمند کا مطلب کیا تھا۔

”کیپ کیپ۔“ ارجمند کی آواز سن کر ایلی پھر چونکا اور کھڑکی کی طرف دیکھتا کھڑکی میں زرد رو لڑکی کا چہرہ دیکھ کر اس کا دل دھڑکنے لگتا اور وہ نگاہیں پھیر لیتا پھر ارجمند کا رومل ہلتا اس کے بالوں اور گالوں سے مس کرتا ہوا چھاتی پر آگرتا اور ارجمند اسے یوں گلے لگا لیتا جیسے جاندار چیز ہو۔ یہ دیکھ کر کیپ مسکراتی اور لودھار آواز سے پڑوسن کو بلاتی۔ ”سیکنہ، سیکنہ۔“ وہ دونوں اسے کیپ کہا کرتے تھے۔ یہ نام ارجمند نے تجویز کیا تھا تاکہ سننے والوں کو مل نہ ہو کہ وہ کس کے متعلق باتیں کر رہے ہیں۔ ایلی جب چوگن میں لڑکوں کے ساتھ کھڑا ہو ارجمند اس کے پاس آکر بہانے سے اپنے سر پر ہاتھ رکھ لیتا۔ جس سے ایلی کو معلوم ہو جاتا کیپ کے متعلق کوئی بات ہے یا کیپ کھڑکی میں کھڑی ہے یا وہ چوگن کی طرف آ رہی ہے یا کے سکول سے آنے کا وقت ہو چکا ہے۔

اگر کسی خاص مصروفیت کی وجہ سے ایلی ارجمند کا اشارہ نہ سمجھتا تو ارجمند ٹوپی کے منہ کوئی بات کر دیتا۔ ایلی ہم نے ایک کیپ خریدی ہے آؤ دکھائیں۔ غضب کی چیز ہے۔ خوبصورت رنگ ہے کہ ہمیں کیا بتائیں۔ واہ واہ دیکھو اور پھرک جاؤ۔“

اس پر ایلی کی سمجھ میں آ جاتا کہ کوئی بات ہے اور پھر ایلی کسی بہانے کھیل چھوڑ کر اس کے ساتھ چل پڑتا اور وہ دونوں پرانی حویلی کے میدان میں جا کھڑے ہوتے اور کیپ کھڑکی آکر سیکنہ کو آوازیں دیتی اور با آواز بلند ہنستی یا انگریزی پڑھتی یا ویسے ہی کھڑکی میں کھڑی ہو سیکنہ سے باتیں کرنے لگتی۔

”کل چھٹی ہے۔ پندرہ پر سوں سے سکول کا وقت بدل جائے گا۔ پرسوں سے نو بجے ہے۔“

سکول — اور ڈھائی بجے ختم ہو گا۔“

اس پر ارجمند چلاتا ”نوٹڈ، نوٹڈ“ اور پھر زیر لب گنگنا تا ”ڈارلنگ ما بدولت تین بجے ڈیو ڈمی پر ڈیوٹی دیا کریں گے تاکہ حضور کا باقاعدہ استقبال کیا جائے جو حضور کے شایان شان ہو۔“ اتنے میں کیپ کے گھر سے ایک چھوٹی سی لڑکی مسکراتی ہوئی نکل آتی۔

ارجمند چلاتا ”کیپ کیپ، مدھ بھری پیالی۔“

وہ خواہ مخواہ شرماتی اور مسکاتی اور ان کے پاس سے گزر جاتی۔

”مدھ بھری پیالی۔“ ارجمند با آواز بلند کہتا ”چند سال کے بعد کیا غضب ہو گا۔ کیا قیامت ٹوٹے گی۔ کیا فتنہ بیدار ہو گا۔ اف پیالی پیالہ بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی۔ پتی پھول بن جائے گی کلی کھل کر چمن ہو جائے گی کیا سمجھے ایلی۔“

ایلی حیرت سے ارجمند کی طرف دیکھتا۔ ارجمند کی باتیں کس قدر دلفریب تھیں۔ اسے کیسے اچھے فقرے یاد تھے اور وہ اردو کس بے تکلفی سے بولتا تھا۔ ”کاش“ ایلی سوچتا ”میں بھی پانی پت جاتا اور دہلی سے خوبصورت زبان سیکھ آتا اور پھر میں بھی ایسے جملے بول سکتا۔“ لیکن ایلی تو سیدھی سلامی بات کرتے ہوئے بھی جھینپ جاتا تھا پاگوں کی طرح وہ کیپ کی طرف دیکھ تو سکتا تھا لیکن بات نہ کر سکتا تھا اور وہ پیالی تھی بھی تو بے حد خوبصورت۔ کس قدر سفید رنگ تھا اور اس پر سرنی جھلکتی تھی۔ ایلی اسے دیکھ کر دم بخود رہ جاتا تھا مگر وہ پیالی بہت ہی چھوٹی تھی اور اس کی سیاہ اور شفاف آنکھیں خوبصورت ہونے کے باوجود ان نگاہوں سے خالی تھیں جو بڑی لڑکیوں کی آنکھوں سے جھلکتی تھیں نہ جانے ان میں کس چیز کی کمی تھی کیپ میں مدھ تو بھری تھی اور وہ جھلکتی بھی تھی مگر وہ مدھ اس مدھ سے کس قدر مختلف تھی جو کیپ سے چھلکا کرتی تھی۔ حالانکہ کیپ رعنائی اور حسن میں کیپ کے مقابلے میں بیچ تھی۔

جب کیپ لپاتی ہوئی ان کے پاس سے گزرتی تو ارجمند ہنس کے کہتا ”جان من کیا دو سال کے بعد بھی ہمیں یاد رکھو گی بھلا نہ دینا خاکسار کو۔“

کیپ کھلکھلا کر ہنس پڑتی اور ایلی کا دل گویا کھل کر پھول بن جاتا۔

ارجمند کہتا ”چلو بھی اب کوری ڈکوری کی باری ہے۔ دعا کو ساز بڑا نہ ہو۔“ پھر وہ ارجمند کے گھر بند کھڑکیوں کی درزوں سے جھانکتے رہتے۔ لیکن عام طور پر ان کا شوق پورا نہ ہوتا اور سائے کا والان دیران رہتا۔ اگر کبھی کوئی عورت غسل کرنے آتی بھی تو ایلی کی آنکھیں آپ ہی

آپ بند ہو جائیں اور وہ محسوس کرتا۔ جیسے وہ جرم کر رہا ہو لیکن اس وقت اس کا دل وہ نہیں تھرتھرتا اور سانس مشکل سے آتا۔ یہ کیفیت تکلیف دہ ہونے کے ساتھ ساتھ پرلذت تھی ایلی کی تمام تر دلچسپی اس کیفیت سے وابستہ تھی۔ اس منظر سے نہیں وہ منظر صرف اس ضروری تھا کہ اس کی موجودگی سے ایلی کو یہ کیفیت حاصل ہوتی تھی۔

نسا نذیراں

مکبوری ڈکوری سے فارغ ہو کر ایلی جمیل کے یہاں چلا جاتا اور وہ دونوں مل کر روپے جو جمیل نے ماں کی صندوقچی سے چرائے ہوتے ایک دو تین چار — پھر وہ مل کر منہ بناتے۔ منصوبے بناتے وقت سامنے چوبارے میں ایک لڑکی آجاتی انہیں دیکھ کر لڑکی کو نہ کیا ہو جاتا۔ وہ اٹھ بیٹھی چار ایک قدم چلتی پھر لوٹ آتی پھر کھڑکی میں کھڑی ہو کر انگڑائیاں پھر سر ہانڈ اٹھا کر اسے سینے سے لگاتی۔ گود میں بٹھاتی پھر وہ ناچنا شروع کر دیتی۔ ناچ ختم ہوتا وہ پھر سے انگڑائیاں لیتا شروع کر دیتی۔ از سر نو کھڑکی میں آجاتی۔ دوپٹہ اتار کر پھینک دیتا ہالوں کو لپیٹ لیتی پھر انہیں کھول دیتی۔ پھر دوپٹہ اوڑھ لیتی اور از سر نو ناچنے لگتی۔ ایلی نے مرتبہ اسے دیکھا تھا۔ لیکن اس نے جمیل سے بات نہ کی تھی۔ نہ ہی اسے خیال آیا تھا کہ انگریزی مائڈ کا کھیل کھیلا جاسکتا ہے۔ کیونکہ اس کے نزدیک وہ کھیل تو ارجنڈ کی موجود محتاج تھا۔ جمیل کو ایسی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ فی الحال وہ تو ماں کی گٹھڑی میں سے چرانے اور دوستوں کو پیڑے کھلانے کے دلچسپ مشغلے میں کھویا ہوا تھا۔

لیکن ایک روز جمیل نے اس سیماب صفت لڑکی کو دیکھ لیا اور دیر تک اسے دیکھا رہا۔ کھیل اسے بہت پسند آیا اور وہ دونوں شدت سے اس جوان لڑکی کی طرف دیکھنے لگے جو وہ چوبارے میں نہ جانے کیا کھیل کھیل رہی تھی۔ کیسا ناچ ناچ رہی تھی۔ پھر ان کا یہ معمول اور ایلی کے لئے جمیل کے چوبارے میں انگریزی مائڈ کا ایک نیا باب کھل گیا۔ انگریزی اس باب میں ایک عجیب و غریب خصوصیت تھی نہ تو اس میں ریٹھی رومال ہلانا پڑتا تھا بانسری بجانے کی ضرورت تھی۔ نہ پریم پتروں کی کتاب کھولنی پڑتی تھی۔ بس وہ صرف کھول کر اس میں بیٹھ جاتے باقی سب کچھ وہ لڑکی خود کیا کرتی تھی۔ جب ایلی آتا جاتا تو وہ آتا

جب وہ گھر کی میزھیوں کے قریب پہنچتا تو نذیراں اسے دیکھ کر کسی بہانے اپنا کام چھوڑ کر ان کی ڈیوڑھی میں آجاتی ”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کے قریب آکر مسکراتے ہوئے پوچھتی اور اس قدر قریب آجاتی کہ اس کے جسم کی بو ایلی کی ناک پر یورش کر دیتی اور نذیراں کا سانس اس کے منہ سے نکراتا ہوا محسوس ہوتا اور نذیراں ٹٹنگی باندھ کر اس کی طرف دیکھتی اور اس کی بانہیں ایلی کی طرف بڑھتی اور گھبرا کر ایلی پیچھے ہٹ جاتا۔

”کہاں سے آئے ہو؟“ وہ اس کی طرف بڑھنے لگتی۔

”ہیں۔ ہیں۔ ذرا باہر گیا تھا۔“ وہ کئی کترا کر میزھیوں کی طرف بڑھتا اور پھر بھاگ کر اوپر چڑھ جاتا۔ اسے یوں اوپر چڑھتے ہوئے دیکھ کر داوی ماں پوچھتی۔

”کیا ہے تمہیں ایلی۔ یوں بھاگ کر کیوں چڑھتے ہو میڑھیاں جیسے کوئی پچھا کر رہا ہو۔“

ایلی ڈر کر پیچھے دیکھتا کہیں وہ پیچھے تو نہیں آ رہی؟

”کیا ہے ان میڑھیوں میں؟“ وہ پھر پوچھتی۔

”کچھ نہیں داوی ماں کچھ نہیں۔“

نذیراں کو دیکھ کر اسے کبھی خیال نہ آیا تھا کہ وہ اس کے ساتھ انگریزی مائڈ کا کھیل کھیل سکتا ہے اور ڈسپنری کے بغیر ہی کامیابی حاصل کر سکتا ہے نہ اسے ریٹھی رومال کی ضرورت ہے اور نہ شعروں کی کتاب کی۔ لیکن اس کے ذہن میں کامیابی کی نہ تو آرزو تھی اور نہ یہ شعور تھا کہ کامیابی کا مطلب کیا ہے۔ اسے وہ لڑکیاں بے حد پیاری لگتی تھیں جو دور کسی کھڑکی سے جھانکتیں اور مسکراہٹ بھری نگاہ چمکا کر کھڑکی بند کر لیتیں۔ اسے وہ لڑکیاں پسند تھیں۔ جن کے چروں پر اواسی چھائی ہوتی۔ ایسی لڑکیاں جن کی صورت روٹی روٹی ہوتی جو ہائے اللہ کہہ کر بھاگ جاتیں وہ نہیں جو آگے بڑھ کر اسے گھیر لیتیں اور پوچھتی کہیں سے آئے ہو۔

مکمل وا

ایک دن جب وہ حسب معمول نذیراں سے خوف زدہ ہو کر میڑھیاں چڑھ رہا تھا تو ابا نے اسے آواز دی۔ ”ایلی“ وہ گھبرا گیا نہ جانے ابا نے کیوں بلایا تھا کہیں وہ میڑھیوں کی بات سے واقف تو نہ تھے۔

ایلی ڈرتے ڈرتے قریب گیا ”آج تم ٹیم کے ساتھ شام کوٹ جا رہے ہو سمجھتے جاؤ تیاری

کر لو۔“ علی احمد نے کہا۔ خوشی سے ایلچی کی باجھیں کھل گئیں۔ وہ ایک نئی جگہ جائے گا۔
شام کوٹ۔

شام کوٹ کے نام سے وہ اچھی طرح واقف تھا۔ چونکہ صفیہ شام کوٹ کی رہنے والی اگرچہ اسے وہاں جانے کا کبھی موقع نہ ملا تھا۔ اسی روز وہ شام کوٹ کو روانہ ہو گیا۔ شام کوٹ نے محلے میں اپنی نئی ماں کا گھر دیکھ کر اسے بے حد ہلایا۔ وہاں ایک ڈیوڑھی کے پیچھے ایک چم سانگ و تاریک صحن تھا جس کے پیچھے دو کوٹھڑیاں تھیں۔ ڈیوڑھی میں ایک بوڑھی عورت ہاتھ باندھے بیٹھی تھی۔ چادر میں وہ کس قدر بھدی لگ رہی تھی۔ اس کا بیٹھنے کا انداز بھی تو بچہ تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو بلکہ کوئی بے حس گنوار مرد بیٹھا ہو۔

ایلچی کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ ”خیر سے بسم اللہ“ اور وہ اس کے منہ پر ہاتھ پھیرنے لگی۔ ”بیٹھ جا۔ سنا علی احمد کا کیا حال ہے۔ آپ کیوں نہیں آیا وہ۔ بہت بننے لگا ہے اب پہلے تو یہ یاد نہ تھی۔ دو سال میری منتیں کرتا رہا۔ میری دہلیز پر بیٹھا رہا۔ میری بیٹی کشمیر میں چلی ہے ہاں ہاں نازک ہے وہ۔ اسے کوئی دکھ نہ ہو۔ ورنہ وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔ میں نے بھی ساری سرکاری نوکری کی ہے۔ عمر بھر استانی کا کام کیا ہے۔ تم آئے ہی تھے نا۔ ہمارے سکول میں یاد۔ نا تمہیں۔“

دھنکا۔ ایلچی کو یاد آیا۔ ہوں! یہ تو وہی استانی تھی۔ جو اس روز پردے کے پیچھے کھڑی احمد سے باتیں کر رہی تھی۔ ایلچی نے گھن سی محسوس کی۔ کیا سبھی استائیاں اسی قسم کی ہوتی ہیں کیا ان میں ذرا بھی جھجک نہیں ہوتی۔ کیا وہ مردوں کی طرح چادریں باندھتی ہیں۔

”لوگ ذرا احتیاط تو بھرتا۔“ استانی نے کسی کو آواز دی اور پھر اپنی تقریر جاری کر دی۔ ”میں نے پورے پندرہ سال ملازمت کی ہے اللہ نہ کرے کوئی ضرورت نہ تھی۔ نوکری کرنے کا ہر شوق تھا پڑھانے کا شوق۔“

اس کے لہجے سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے اس نے محکمہ تعلیم کی بجائے پولیس کی نوکری ہو۔ علی احمد کی بات کرتے ہوئے اس کے انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ اس سے کما حقہ واقف ہو۔ جیسے علی احمد کے متعلق بات کرتے ہوئے اسے تکلفات کی ضرورت نہ ہو۔ اس کے باوجود یا شاید اسی لئے اس کی گفتگو میں نفرت کی جھلک تھی۔ بات بات پر وہ اپنے گھرانے کی عظمت کا ذکر چھیڑ دیتی اپنی بڑائی جاتی اور بالا خراہی بیٹی کی نزاکت طبع کی طرف اشارہ کر کے

کو متنبہ کرتی کہ اس کی بیٹی کو احتیاط سے گھر میں رکھیں۔ پھر اس نے اپنے بیٹے کو آواز دی۔ ”قاسم“ اور ایک جوان لڑکا باہر آ گیا۔ ”یہ تیرا ماموں ہے۔“ وہ بولی۔ ایلچی نے ماموں کو سلام کیا لیکن وہ حیران تھا کہ جس قدر استانی کا چہرہ اور انداز انسانیت سے خالی تھا، اس قدر قاسم کا مردانہ پن سے محروم تھا۔

دونگا

اس گھر میں سب سے زیادہ قابل قبول شخصیت اس کی نئی امی شمیم کی ہی تھی۔ شمیم میں نہ تو استانی کی سی بیداری تھی اور نہ قاسم کی سی مجبوری۔ البتہ ایلچی کو ایک تکلیف ضرور تھی۔ جب بھی شمیم اس کے پاس آتی تو اس کی چادر سے دو حنا ملیدہ ہاتھ نکل آتے۔ جن کی سفیدی کی وجہ سے حنائی سرنی اور بھی شوخ دکھائی دیتی اور حنا کی سرنی کی وجہ سے ہاتھوں کی سفیدی اور بھی دوہی۔ ان ہاتھوں کو دیکھ کر ان جانے میں وہ محسوس کرتا جیسے کوئی جرم ہو، گناہ کر رہا ہو۔ شمیم محبت جتانے کے لئے اپنے حنا ملیدہ ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی اور ایلچی انہیں اپنی جانب بڑھاتا ہوا دیکھ کر گھبرا کر سسم جاتا اور دور ہٹنے کی شدید کوشش کرتا مگر بالآخر وہ دو حنائی ناگ اسے اپنی لپیٹ میں لے لیتے۔ حنا کی بو سے اس کے ذہن میں ایک طوفان سا اٹھتا۔ گرد و پیش دھندلا جاتے اور پھر — شرم سے اس کا سر جھک جاتا وہ اپنی نگاہ میں ننگا ہو جاتا۔ ننگا اور شرمسار۔

اس طرح اس کی زندگی گھٹنوں میں ہاتھوں کی اہمیت بڑھتی گئی۔ ماں کی اہمیت بڑھتی گئی اور اس کے ذہن میں حنائی رنگ کا جنسی زندگی سے تعلق استوار ہوتا گیا۔ ان کے گھر میں جو عورت آتی تھی۔ اسے براہ راست یا باپ سے تعلق ہوتا تھا اگر وہ ان کے بند کمرے میں جا پہنچتی تو بھی اور اگر وہ اس کی زد سے بچنے کی کوشش کرتی تو بھی۔ ہر صورت ہر عورت جو اس مکان میں آتی تھی اسے علی احمد سے تعلق ہوتا تھا یا حنفی تعلق۔

لیکن اس زمانے میں اسے اثبات نفی کا شعور نہ تھا۔ اس کے دل میں یہ جذبہ پیدا ہو جاتا کہ بند کمرے کے طلسم کو توڑ کر ٹین کے سپاہی کے چنگل میں پھنسی ہوئی عورت کو نجات دلائے لیکن اس خیال کے ساتھ ہی خواہ مخواہ چند ایک خیالی تصاویر اس کے ذہن میں اتر آئیں اور وہ لاعلم پڑھنے سے غلصہ نہ ہوتی۔ پھر وہ اس خیال کو بھولنے کی کوشش میں لگ جاتا۔ لیکن ٹین کے سپاہی سے غلصہ پانے والی حسین ماں جسے چھوڑ کر وہ بھاگ رہا ہوتا اپنی گود سے حنائی ہاتھ

نکال کر اشارے کرتی۔ ”ایلی۔ ایلی ٹھہرو مجھے ساتھ لے جاؤ۔ ایلی“ — اور حنائی ہاتھ اس طرف بڑھتے چلے آتے۔

بشیم کے حنائی ہاتھوں سے ڈر کر وہ قاسم کے پاس جا بیٹھتا مگرچہ اسے قاسم قطعی طور پر نہ تھا۔ پھر بھی اسے وہاں سکون و اطمینان تو میسر ہو جاتا تھا نہ جانے قاسم میں کیا تھا۔ اس کے پر بل نہ تھے اور یہ بات ایلی کو ناگوار تھی۔ اس کا صاف سنرا جسم دیکھنے سے وہ کتراتا تھا۔ قاسم فیض پنے بغیر بیٹھا رہتا۔ اب وہ قاسم کو فیض پہننے پر کیسے مجبور کر سکتا تھا پھر اس کی استائی بھی تو بدن کو ڈھانپنے کے متعلق محتاط نہ تھی اس کی فیض کے بن اکثر کھلے رہتے تھے جس میں لٹا ہوا پانچ لہجہ کی غمازی کرتا تھا۔

بڑھیا کے جسم کی طرف دیکھ کر اسے کراہیت محسوس ہوتی۔ اس کے حنا مالیدہ ہاتھوں دیکھ اسے غصہ آتا۔ اسے حنا سے ہاتھ رنگنے کا کیا حق تھا۔ اسے ان بوتلوں کو لٹکانے کا کیا حق تھا۔ شدید نفرت سے گھبرا کر وہ اندر کمرے میں جا گھستا جہاں وہ لڑکی شاد چپ چاپ بیٹھی کام پر مشغول ہوتی۔ شاد عجیب نام تھا اس کا لیکن اس کا رنگ زرد کیوں رہتا تھا۔ حالانکہ چلنے پھرنے اور کام کرنے میں وہ بے انتہا تیز تھی۔ کس پھرتی سے کام کرتی تھی وہ — سارے گھر پر صرف شاد ہی ایسی لڑکی تھی۔ نئے دیکھ کر اسے گھبراہٹ نہ ہوتی تھی۔ اس کی کئی ایک وجوہ تھیں۔ ایک تو وہ پتلے دبلے جسم کی لڑکی تھی۔ دوسرے اس کا رنگ سفید نہ تھا اور تیسرے اس کے ہاتھ حنا مالیدہ نہ تھے۔ حنا مالیدہ ہاتھ اس کے لئے صرف اس صورت میں پریشان کن کرتے تھے جب ان کا رنگ گورا ہو اور دیکھنے میں وہ گدگدے محسوس ہوں۔

چند دن شام کوٹ رہنے کے بعد وہ مکلادالے کر واپس علی پور پہنچ گیا اور چند ہی دنوں کے بعد علی احمد اپنے حنائی ناگ لے کر واپس نوکری پر چلے گئے اور ایلی علی پور میں اکیلا رہ گیا۔ اس بات پر اسے بے حد مسرت ہوئی۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ اسے علی نے بند کمرے، ٹین کے سپاہی اور حنائی ناگوں سے نجات مل گئی ہے اور وہ مجرم نہیں ہے۔ نے کوئی گناہ نہیں کیا۔

لیکن اس کے باوجود محلے میں کوئی نہ کوئی واقعہ ضرور ہو جاتا جس سے اس کے دل میں ہاتھوں کی یاد تازہ ہو جاتی۔ اس کے دل میں پھر لذت اور گناہ کا احساس ابھرتا۔

چوزے اور گدھ

حنائی ہاتھوں کے سحر سے بچنے کے لئے وہ گھر سے باہر نکلتا اور گھومتا پھرتا۔ ارجمند، جہاں

سعیدہ کے گھر پہنچ جاتا۔ سعیدہ ایلی کی خالہ زاد بہن تھی۔ حسن دین کی بیوی ہونے کے باوجود وہ حسن دین سے کس قدر مختلف تھی۔ حسن دین محکمہ ڈاک میں ملازم تھے اور اکثر علی پور سے باہر رہا کرتے تھے۔ لیکن اگر علی پور میں ہوتے تو بھی ایسے محسوس ہوتا۔ جیسے وہ باہر ہوں۔ ان کی موجودگی اور غیر موجودگی میں چنداں فرق نہ تھا۔ اول تو وہ بات کرنے کے قائل ہی نہ تھے اور کرنے کی کوشش بھی کرتے تو وہ مکمل نہ ہو سکتی بلکہ ادھوری رہ جاتی۔

گھر میں داخل ہوتے ہی وہ ایک نظر سعیدہ کی طرف ڈالتے اور پھر مسکرا دیتے۔ یہی ان کی سب سے بڑی بات ہوتی جسے صرف سعیدہ سمجھتی تھی۔ اس مسکراہٹ میں ان کا احساس کمتری ادھوری کوشش اور سعیدہ سے قلبی تعلق بھی کچھ واضح ہو جاتا پھر وہ اپنی حاضری کے باوجود گویا مکان سے ناہید ہو جاتے اور سعیدہ اس مسکراہٹ سے اخذ شدہ احساس برتری میں پھولے نہ سکتی۔

سعیدہ کے مکان میں ہر وقت بھیڑ لگی رہتی تھی۔ اسے بھیڑ رکھنے سے بے حد دلچسپی تھی۔ وہ اپنی کھڑکی سے آتے جاتے کو آواز دیتی۔ ”رشتہ کہاں جا رہا ہے تو۔“ ”فرحت تو آج آئی نہیں اور“ ”زیدہ لو تم کہاں جا رہی ہو — بازی نہیں لگے گی کیا“ ”آؤ نا ایلی آج تو پارٹی کا بندوبست ہونا چاہئے۔“

سعیدہ، زیدہ اور آصفہ تینوں سنگی بہنیں تھیں۔ زیدہ رحم علی سے بیباکی جانتی تھی اور آصفہ مولانا عبداللہ سے ویسے تو تینوں بہنیں مزاج کی رنگین واقع ہوئی تھیں۔ مگر سعیدہ میں بہت زیادہ مجلسی عنصر تھا۔ اس کا گھر بھی محلے کے مرکزی مقام پر تھا۔ وہ ادھر ادھر سے لوگوں کو بلا کر اپنے گھر میں اکٹھا کر لیا کرتی اور پھر وہاں تاش کی بازی شروع ہو جاتی۔ چور سپاہی یا بھانجی دیور کا کھیل چلے۔ چور سے باقاعدہ ایک اکتی بطور جرمانہ وصول کی جاتی اور پھر یہ اکتیاں اکٹھی کر کے کچھ منگایا جاتا یا پکایا جاتا اور بالاخر سب لوگ مل کر کھاتے پیتے۔ اس شغل کے دوران سعیدہ کا گھر تقصوں سے گونجتا۔ ایک دوسرے سے مذاق کئے جاتے۔ فقرے کئے جاتے۔

ویسے سعیدہ کے گھر میں تو روز ہی ہنگامہ رہتا تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ خصوصی طور پر مولود شریف کا اہتمام کیا کرتی تھی۔ فرش پر سفید چادریں بچھائی جاتیں۔ گلاب چھڑکا جاتا۔ کھانے کو لالچیاں اور پان میا کئے جاتے۔ شام کو عورتیں اکٹھی ہو کر نعیتیں پڑھتیں اور مرد دور کسی جگہ

اچھا لڑکا ہے۔ لیکن اب محلے کے لڑکوں کے ساتھ مل کر تو بھی بگڑتا جا رہا ہے۔ اچھا جاکیل چاہے۔
 ارجمند ایللی کو دیکھ کر ریشمیں رومال لہراتا ”ارے یار بس تم تو سوئے ہی رہتے ہو۔ ابھی
 ابھی کپ اور کپ سکول جا رہی تھیں۔ کیا بتاؤں آج کیا ٹھاٹھ تھے۔ غضب ہو گیا۔ سرخ قمیص
 جیسے خون سے رنگی ہو۔“ دفعتاً پاؤں کی آہٹ سن کر وہ چونکتا۔ ”آخا“ وہ بات کٹ کر کہتا
 ”ارے وہ دیکھو تو میاں پہلوان بھی آگئے وہ دیکھو کنوئیں کے پاس۔“

”وہ دیکھا سلام کا جواب دیا جا رہا ہے۔ کیا سمجھتے یہ ماتھے سے مکھی نہیں اڑاتی جا رہی۔ اس
 وقت کبھی کہیں۔ کیوں ایللی ہے نا اور ذرا اکھراؤ کورا تو دیکھو جب تک اس کلاک پر ماؤس نہیں
 چڑھے گا۔ یہ ٹن ٹن ہی کرتی رہے گی۔“ اور پھر وہ ننھے چوڑوں کی طرح سر جوڑ کر کپ کپ کی
 باتیں کرنے میں دیر تک مصروف رہتے۔

ارجمند سے ملنے کے بعد وہ رفتی اور جلیل کے یہاں چلا جاتا۔ رفتی تو زیادہ وقت سودا
 خریدنے میں مصروف رہتا تھا۔ اس کا معمول تھا کہ صبح سویرے اٹھ کر چچی پھوپھا اور خالہ کے گھر
 جا کر پوچھتا۔ ”خالہ جی کوئی چیز منگوانی ہو تو بتا دیجئے۔“ ”چچی بازار سے کچھ منگواتا ہے کیا۔“
 پھوپھا جی میں بازار جا رہا ہوں۔ دیر تک وہ بازار جانے کا ڈھنڈورہ پیٹتا رہتا ساتھ ہی اس کی
 آنکھوں سے گلابی پھوار اڑتی رہتی اور نگاہیں چوری چوری گرد و بیش کا جائزہ لیتی رہتیں پھر وہ
 سوڑے اکٹھے کر کے اپنا ریشمی رومال جیب میں ڈال اور غزلوں کی کاپی تمام کر بازار چلا جاتا جب
 سودا سلف سے فارغ ہوتا تو وہ جلیل کی طرف جا پچھتا اور پھر وہ تنگ گلی کی لڑکی اپنے گھر کی دہلیز
 اور گلی میں جھاڑو دیتی اور چلا چلا کر باتیں کرتی اور رفتی کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی اور
 جلیل وحشت بھری نظروں سے اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتا اور لڑکی مسکرائے جاتی اور ایللی
 محسوس کرتا جیسے وہ کوئی دلچسپ سازش کر رہے ہوں۔

پھر یوسف آکٹھا یوسف کے آنے پر نقشہ ہی بدل جاتا کیونکہ یوسف لڑکیوں کے وجود سے
 بے نیاز تھا وہ ان مسکاتے ہوئے جھانکتے ہوئے جلاتے ہوئے چٹے سفید چروں کی طرف آنکھ اٹھا کر
 بھی نہ دیکھتا تھا۔ اس کے آتے ہی تسخارنہ حرکات کا طوفان اڑ آتا۔ جلیل اور رفتی اسے بناتے
 اور وہ جان بوجھ کر بنتا۔ جیسے کسی کارٹون میں جان پڑ گئی ہو۔ ایللی محسوس کرتا۔ جیسے یوسف کو
 بنانے سے جلیل کا مقصد صرف اس لڑکی کو محظوظ کرنا ہوتا تھا جو نہ جانے کیوں گلی کے ایک
 سرے سے دوسرے سرے تک جھاڑو دینے پر تلی رہتی تھی۔

بیٹھ کر سنتے یا قریب ہی کسی مقام پر چھپ کر دیکھتے۔ گلے کے علاوہ سیدہ کو ناچنے کا بھی شوق
 شوق تھا۔ اکثر وہ چند ایک قریبی بہنوں اور بھائیوں کو بلا کر گلے کی محفل جمالیتی اور پھر
 نچلے دار ٹوپی پہن کر ڈھولک کے ساتھ ناچتی اور اپنے حنائی ہاتھوں کو عجیب انداز سے لہرائی
 ایللی محسوس کرتا جیسے وہ کوئی جادو گرینی ہو اور حنائی ہاتھ کوئی جیتا جاگتا طلسم ہوں اس وقت اس
 نگاہ میں گرد و پیش دھندلانے لگتے اور وہ چپکے سے وہاں اٹھ کر اپنے گھر داوی ایللی کے پاس
 لینے کے لئے آجاتا۔

داوی ایللی اسے تھپک کر سلاتی ”کچھ بھی تو نہیں ایللی۔ کچھ بھی نہیں سو جا اب“ لیکن
 ایللی کی تسلیوں کے باوجود یا شاید ان تسلیوں کی وجہ سے وہ محسوس کرتا کہ کچھ ہے۔ نہ جلا
 کہاں کچھ نہ کچھ ہے ضرور ہے جو اسے پریشان کر رہا ہے۔ اس کے دل کے نچلے پردوں میں
 لے رہا ہے۔ طوفان بپا کر رہا ہے۔ لیکن داوی اسے تھپکے جاتی۔ ”سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“
 جا۔“ اور بالا خروہ سو جاتا اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ اس کے سامنے حنائی ناگ لپکتے اور ایک بازار
 بھر کم جسم ناچتا ناچتا اس کی طرف بڑھتا اور پھر دھڑام سے اس کی چھاتی پر آگرتا اور اس کا دم رگڑ
 جاتا اور وہ چیخ مار کر جاگ اٹھتا۔ داوی ایللی اٹھ بیٹھتیں۔ ”کیا ہے تجھے ایللی۔ ڈر گیا ہے کیلا۔“
 جانے سارا دن کہاں کہاں کھیلتا ہے۔ کس کس مقام پر بیٹھتا ہے تو۔ تجھے جو کہا ہے میں نے
 سخت مقام پر نہ جایا کر۔ رات کو تو ڈرنا ہی ہوا اس وجہ سے ”اب سو جا۔“ داوی ایللی کو کیا
 تھا کہ وہ عمر کے کیسے سخت مقام پر آ پہنچا ہے۔

صبح سویرے ایللی پھر باہر نکل جاتا اور محلے کی زندگی کی گھما گھمی میں کھو جاتا بوڑھی عورت
 اس کی طرف اپنے جھلی دار پنچے بڑھاتیں۔ ”ایللی ہے جیتا رہ بیٹے۔ خدا عمر دواز کرے۔ تیری
 کا کلیجہ ٹھنڈہ رہے میں کہتی ہوں۔“ وہ راز دارانہ طور پر ایللی پر جھک جاتیں۔ ”اللہ رکھے جانے
 کا وارث تو ہی ہے۔ تو ہی گھر کا مالک ہے اور یہ جو آتی جاتی ہیں۔ کلمو نہیں یہ سب چڑیل
 ہیں۔ سب دفعان ہو جائیں گی۔ انشاء اللہ تو ہی گھر کا مالک بنے گا۔ کھیلنے جا رہا ہے۔ تو جانے
 دو گھڑی کھیلنا اچھا ہی ہوتا ہے۔“ عورتوں سے بچ کر وہ محلے کے کسی بوڑھے کے جے چڑھ جاتا
 ”میاں ایللی کہاں ہیں وہ تیرے ابا آج کل۔“ نیا بیاہ کرنے کی تو نہیں سوچ رہا۔ وہ دماغ
 ہے اس کا لیکن بھی ایک خوبی ضرور ہے۔ اس میں محلے میں کبھی ایسی بات نہیں کی۔ خیر
 اعمال کا ہر کوئی خود ذمہ دار ہوتا ہے۔ لیکن یاد رکھ۔ اپنے ابا کے نقش قدم پر نہ چلنا۔ سمجھ

گوڑھنے اور سر کا پلو سنبھالنے میں شدت سے مصروف رہتیں۔ اس تاریک اور گھٹی گھٹی فضا کی وجہ سے ان کے رنگ زرد تھے۔ چہروں پر مردنی چھائی ہوئی تھی اور انداز سے بے حسی بیٹھتی تھیں۔ اگر کبھی کبھار ان کے چہرے پر جوانی کی چمک لہراتی بھی تو وہ کوہنے کی طرف منہ موڑ کر اپنا آپ سنبھال لیتیں اور پھر آٹا گوندھنے میں یا برتن مانجنے میں مصروف ہو جاتیں۔

آصفی۔ محلے میں صرف چند ایک مخصوص قسم کی آوازیں گونجا کرتی تھیں۔ محلے کی بوڑھیوں کی آوازیں ان کے چرخوں کی گھم گھم، تاریک دالانوں میں برتنوں کی کھنک، چوگان میں بچوں کا دبا دبا شور محلے کی مسجد سے بکسیریں مردوں کی کھنکھاریں اور دبے پاؤں چلنے کی آوازیں۔ بند ہوتے ہوئے ٹانگ چندی دروازوں کی چراؤں ٹھک چمکاوڑوں کی جھینجھیں جو شام کو چوگان پر منڈلایا کرتیں اور پھر ضعیفوں کے خراٹے۔

ان جملہ آوازوں میں صرف ایک آواز ایسی تھی جو محلے کی نصیبت سے مختلف تھی۔ وہ بالا کا گرامو فون تھا۔ جو کبھی کبھار بالا کے آسیب زدہ کمرے میں گانے کی کوشش کیا کرتا تھا اگرچہ اس ماحول میں اس کی آواز گھٹ کر رہ جاتا تھا۔

جب پہلی مرتبہ بالا کے گرامو فون پر جاگی بائی الہ آبادی کے گیت کی آواز محلے میں سنائی دی تو محلے کی گدھیں جھپٹ کر کھڑکیوں میں آگئیں۔

”میں پوچھتی ہوں یہ کون چلا رہا ہے۔“

”نہ جانے کہاں سے آواز آرہی ہے۔“

”اے ہے یہ تو عورت ہے کوئی۔“

”لو چاہی وہ تو بلانے لگایا ہے کوئی رکٹ۔ اے ہے محلے میں باجے بجاتا۔“

”تو ہے ماں آج تک تو یہ بات سننے میں آئی نہیں تھی۔“

”میں کتنی ہوں اس لڑکے کا دل غ چل گیا ہے۔“

”لڑکے کا کیوں بس۔ قصور تو داڑھی والے کا ہے۔ جس نے اسے باجا خرید کے دیا۔“

اس روز محلے کی گدھیں دیر تک سر اٹھا کر پر پھڑپھڑاتی رہیں۔ لیکن بالا سے کچھ کہنا ممکن بھی ہوتا؟ بڑی سے بڑی جھاڑ جھپٹ کر نہ پالا ہنس دینے کا عادی تھا۔

”ہی ہی ہی ہی۔“ چاچی سنا تم نے یہ توؤں والا باجا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ اچھا ہے نا۔ پورے دو سو میں لیا ہے اور یہ ریکارڈ جاگی بائی الہ آباد والی کا ہے۔ بڑا اچھا گاتی ہے۔ ماں جی ہی ہی ہی۔

دوپہر کے وقت جلیل اور ایللی محلے میں لوٹ آتے۔ اس وقت محلے کی بوڑھی عورتیں چوگان میں بیٹھ کر کوئی نہ کوئی کام کیا کرتی تھیں۔ کوئی ازار بند بنتی۔ کوئی تانگے کے گولے بناتی۔ چوگان سے گزرتے ہوئے رفتی کی گردن جھک جاتی۔ اس کی آنکھوں کی بوند باندی ختم ہو جاتی۔ اس کے ہونٹوں کا گیت ختم ہو جاتا اور اس کے چہرے پاس جا بیٹھتا صفدر کی گردن تو ہمیشہ اگڑی رہتی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ہر وقت عجیب سی سرخی پھیلی رہتی اس کے بازو عجیب انداز سے لٹکتے رہتے اور ہونٹوں پر تبسم گیت کا سہل طاری رہتا۔ وہ مضطربانہ طور پر ادھر ادھر ٹھٹھا ادھر ادھر دیکھتا اور پھر تھپڑ کے گیت کا کوئی بول ان جانے میں اس کے منہ سے نکل جاتا ”حافظ خدا تمہارا۔“ اس وقت ایسا محسوس ہوتا جیسے وہ کسی سے رخصت ہو رہا ہو۔ اس پر ایللی کی نگاہوں تلے ایک پارسی حسینہ آکھڑی ہوتی اور اس کا دل دھک دھک کرنے لگتا۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ وہ صفدر سے پوچھے کہ وہ پارسی لڑکی کیا ہوئی اور وہ گیت کیا پارسی لڑکی گایا کرتی تھی اور صفدر کی آنکھیں سرخ کیوں رہا کرتی تھیں اور اس کے بازو لہرایا کیوں کرتے تھے مگر ایللی کو صفدر سے بات کرنے کی جرأت نہ ہوا کرتی تھی۔ کیونکہ صفدر محلے کے بڑے لڑکوں میں سے تھا اور چھوٹے لڑکے بڑے لڑکوں سے ایسی باتیں نہیں کیا کرتے تھے۔ اگرچہ صفدر کے انداز میں وہ معزز پن نہ تھا جو عام طور پر بڑے لڑکوں میں پایا جاتا تھا۔ بلکہ اس کے برعکس صفدر میں بے باکی تھی۔ خلوص تھا پھر بھی ایللی کو یہ باتیں پوچھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی۔

صفدر کی اسی بے باکی کی وجہ سے محلہ والیاں اسے بہت برا سمجھتی تھیں اور دادی الہ تو صفدر کا نام سننے ہی غصے سے چلانے لگتی۔ ”بد معاش کہیں کا شرابی۔ دفع کر اسے۔ نام نہ لے۔“ مردود کہیں کا۔“ اور صفدر بھی دادی الہ کے نام سے چڑتا تھا۔ ”مردود بڑھیا۔ کھڑکی میں گدھ کا طرح بیٹھی رہتی ہے مرقی بھی نہیں۔“ اور منجھل پوناٹھ کا پٹا نہ بتاتے وقت اس کی آنکھوں میں یوں مسرت لہراتی جیسے بڑھیا کو وہ اس پٹانے تلے تڑپتے ہوئے دیکھ رہا ہو اور دیوار پر پٹا نہ یوں مارنا کہ ایللی محسوس کرتا۔ جیسے دیوار کی بجائے بڑھیا کے سینے پر پھینک رہا ہو۔

آصفی محلے کی زندگی محلے کی تنگ و تاریک گلیوں، کوٹھڑیوں اور ٹانگ چندی اینٹوں کی ریختی ہوئی اونچی دیواروں سے گھرے ہوئے احاطے میں مخصوص انداز سے دھڑکتی تھی۔

محلے کی بوڑھیاں صبح سویرے ہی بیدار ہو جاتیں اور کھڑکیوں میں چوکیوں پر گدھوں کی طرح آ بیٹھتیں۔ جوان لڑکیاں کوٹھڑیوں کی گھٹی گھٹی فضا میں تاریک دالانوں میں برتن مانجنے کا

سنو تو ابھی اپنا نام بولے گی میں ہوں جاگتی، بانی الہ آباد والی۔ ہاں۔“

بلا کی بات پر بوڑھیوں کے ہونٹوں پر ہنسی آجاتی۔ ”اے چھوڑو چاچی۔ اس لڑکے پر تو آسیب کا سایہ ہے ساری رات جنوں کی محفل لگی رہتی ہے اس کے تخت پر۔“

”ہاں میں اس کے بس کی بات بھی ہو۔ انگلیاں تو سونگھو اس کی پلاؤ کی خوشبو آتی ہے۔“

بلا کی جگہ اگر اور گراموفون خریدتا تو شاید اسے بجانے کی کبھی اجازت نہ ملتی۔ لیکن بلا کون روکتا۔ آسیب زدہ بلا کو محلے میں خصوصی درجہ حاصل تھا۔

بیابا

بلا کے گراموفون کے علاوہ کبھی کبھار بیابا شادی کے موقعوں پر محلے کی فضا میں تبدیلی دانتی ہوتی، لیکن اس میں بھی آوازوں کی نوعیت نہ بدلتی تھی۔ ڈھولک تو بجتی تھی اور ڈھولک کی ضرب میں جوان لڑکی کی مضطرب انگلیوں کی تڑپ بھی گونجتی لیکن گانے زیادہ تر بوڑھیاں ہی گاتیں اور ان کی دھنیں اس قسم کی ہوتیں۔ وہ گانے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ انہیں سن کر محسوس ہوتا جیسے بہت سی چنگاڑیں بھیاٹک آواز میں چیخ رہی ہوں۔ جیسے کسی کی موت پر کوئی بین کر رہا ہو۔ دھیمی آواز میں لمبے سرگونجے اور محلے کی فضا کو اور بھی تاریک کر دیتے۔

اگر کوئی نوجوان لڑکی کوئی گیت گانے کی کوشش کرتی تو اس کی آواز اس قدر بیگانگی سنائی دیتی تھی کہ وہ جلد ہی شرما کر یا گھبرا کر اس ناکام کوشش کو چھوڑ دیتی اور بوڑھیاں اپنی عظمت کو از سر نو محسوس کر کے پھر سے لمبی اداس سروں میں روئے لگتیں۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود شادی کے موقع پر کچھ نہ کچھ تبدیلی ضرور وقوع پذیر ہوتی۔ ٹانگ چند دیواروں کی سیاہی کھل کر صاف ہو جاتی۔ کھڑکیوں میں سرخ دوپٹے لہراتے اور علی پور کا بینڈ بجا چکی حویلی میں نغمے بجا لگتے۔ اس روز محلے کے لڑکے بوڑھی گدھوں کے منھوں سے اپنے سروں پر محسوس نہ کرتے۔ گیس کی روشنی میں لڑکوں کے ریشمیں رومال لہراتے۔ سیاہ بودے چمکتے۔ جیبوں سے پم سندیس۔ کتابیں باہر نکل آتیں لڑکوں کی نگاہیں کھڑکیوں کے ارد گرد ناکام منزلتیں لیکن یہ سب باتیں بیکار تھیں۔ کیونکہ محلے کی لڑکیوں کی مجال نہ تھی کہ وہ کھڑکیوں یا دروازوں میں آگیاں

ہوں۔

لڑکے کچھ دینے کچھ لینے کچھ کہنے کے بہانے بیابا والے گھر میں جا داخل ہوتے۔ تاریک ڈیوڑھیوں میں چھپ کر انتظار کرتے بھیڑ میں راستے بنانے کے بہانے اندھیرے میں چٹکیاں بھرنے کی کوشش کرتے۔ اس افزائش میں چوڑیاں کھنکیتیں۔ مندی والے ہاتھ کپڑوں میں لپٹ جاتے۔ جسم سینے ”ہائے میں مرگئی۔“ کی نحیف آوازیں سنائی دیتیں ”لیکن ان معمولی مگر دلچسپ باتوں کے سوا کچھ بھی نہ ہوتا۔“

بیابا شادی کے موقع پر ایلی کے لئے گھر جانا مشکل ہو جاتا تھا۔ جب وہ اپنی اندھیری ڈیوڑھی میں پہنچتا تو ایک دھندلی سی شکل ڈیوڑھی کے کسی کونے سے نکل آتی۔ گھبرا کر وہ رک جاتا اور دھندلی شکل گھوم کر اس کا راستہ روک لیتی۔

”کون ہے؟“ وہ چلاتا۔

بھدی سی ہنسی سنائی دیتی۔ ”ڈر گئے۔“ نذیراں کی آواز آتی اور وہ مڑ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل جاتا اور ارجمند کو ڈھونڈھ نکالتا۔

”ہیلو ایلی ہے۔“ ارجمند چلاتا ”سراسر بے معنی ہے۔ ایلی۔ برات والے گھر جانا بے معنی ہے۔ بیکار ہے بالکل بیکار میں نے چٹکی بھری تو ظالم کہنے لگی۔ کون چاچی سے۔ ہاتھ جوڑ کر جان چھڑائی پھر مسکرانے سے بھی باز نہیں آتیں۔ اگر واقعی کے سے حج کر کے آئی ہیں یہ لڑکیاں تو پھر دیکھ کر مسکراتی کیوں ہیں اور مسکراہٹ بھی خالص ڈپنسری والی اور چٹکی بھرو تو چاچی سے کہہ دوں گی۔ لا حول ولا قوۃ۔ چلوپ اور کیپ کی طرف چلیں۔ محلے سے بات بنتی ہے۔ آج بانسری پر ایک دھن سیکھ کر آیا ہوں۔ واہ کیا دھن ہے۔ بس سمجھ لو کچا دھاگا ہے جس سے سرکار بندھی آئے گی۔ آؤ سنائیں تمہیں۔“

نہ جانے کیوں ایلی نے نذیراں کی بات کبھی ارجمند سے نہ کی تھی۔ بلکہ وہ ڈرتا تھا کہ ارجمند کو نذیراں کی بات کا پتہ نہ چل جائے۔ تاکہ وہ رنگین انگریزی مایاؤں کا کھیل حقیقت کا روپ نہ دھارے ایلی کو کہتی ہوئی چٹوں سے دلچسپی تھی۔ مسکراتی ہوئی آنکھوں سے دلچسپی تھی۔ معنی خیز انداز سے حرکت کرتے ہاتھوں کو دیکھنے کا شوق تھا۔ لیکن عورت یا لڑکیوں کا قرب اس کے لئے سولہاں روح تھا۔ اسے ڈرتا تھا کہ نذیراں کی بات سن کر ارجمند کی توجہ اس طرف منعطف ہو گئی تو وہ رنگین ختم ہو جائے گی۔ اور نہ جانے کیا شروع ہو جائے۔ اس کے ذہن میں قرب کا مفہوم تاریکی تھا۔ پر اسرار خوفناک تاریکی۔

اور دوسری طرف انتظامات میں مشغول تھی۔ جیسے بہت دلچسپی لے رہی ہو۔ فرحت کے کپڑے سبھی دولہا کی چیزیں بھی تیار کرتی جاتی۔ علی احمد کے احکامات بھی دوڑ دوڑ کر سنتی اور ساتھ ساتھ آنسو بھی چھلائے جاتی۔ عجیب عادت تھی اماں کی پھر ہر آتی جاتی سے شکایت بھی کرتی جاتی کہ فرحت کا بیاہ زبردستی کیا جا رہا ہے۔

اوسر فرحت کو بھی احساس نہ تھا کہ اس کی شادی ہو رہی ہے۔ فرحت کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی اس نے آٹھویں جماعت تک مدرسے میں تعلیم پائی تھی پھر علی احمد نے دفعتاً اعلان کر دیا تھا کہ اسے سکول جانے کی اجازت نہیں بیچیوں کے لئے اتنی ہی تعلیم کافی ہے۔ اس پر فرحت پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی اور ہاجرہ نے اس کے ساتھ مل کر آنسو بہائے تھے۔

مگر علی احمد کا حکم اٹل تھا ان دونوں کے آنسو کام نہ آئے اور فرحت کی تعلیم کا سلسلہ ٹوٹ گیا۔ آٹھ سال سکول میں پڑھنے کے باوجود فرحت ابھی بچی ہی تو تھی وہ اکثر محلے کے چوگان میں جا کر کھلی کلبیسر دی ناچتی رہتی۔ ساتھ ساتھ کچھ گنگنائی اور محلے کے بزرگ اس کی طرف دیکھ کر مسکراتے۔ ”فرحتو گھومنی۔“ اور بوڑھیاں مسکرا کر کہتیں ”فرحت تو فرحت ہی رہی۔“ ایللی نے کبھی محسوس نہ کیا تھا کہ فرحت بڑی ہو گئی ہے اسے بھی وہ فرحت ہی دکھائی دیتی تھی۔ اس میں عورت کا نام و نشان تک نہ تھا۔

اپنے بیاہ کی بات سن کر فرحت نے چوگان میں جانا بند کر دیا۔ اب وہ خالہ کے گھر بھی نہ جاتی تھی۔ لیکن اس تبدیلی کے باوجود اس میں وہ بات پیدا نہ ہوئی تھی جو جوان لڑکیوں میں ہوتی ہے۔

پھر وہ دن آپہنچا جب ان کے گھر کے امانے بابے بجنے لگے اور گھر میں مہمان آجے ہوئے اور ہاجرہ کام کاج میں اس قدر مصروف ہو گئی کہ آنسو بہاتا بھی بھول گئی اور محلے کے لڑکوں نے بہانے بہانے ان کے گھر آنا شروع کر دیا اور برتن بجنے لگے۔ حنائی ہاتھ ریٹھی وہ بنوں میں سے باہر نکلے اور چھپنے لگے اور گھر میں ایک ہنگامہ برپا ہو گیا اور بالاخر فرحت کو ڈولی میں بٹھادیا گیا اور ایللی اور ہاجرہ دونوں ڈولی کے ساتھ ایک نئے گھر میں چلے گئے۔ یہ نیا گھر اجمل کا گھر تھا۔ چونکہ اجمل کی ماں مدت سے فوت ہو چکی تھی۔ اور بہنیں سب اپنے اپنے گھر اور بچوں والی تھیں اس لئے فرحت کی خدمت کرنے کے لئے خود ہاجرہ کو اجمل کے ہاں جانا پڑا۔

اجمل کا گھر ایللی کے گھر کے پاس ہی تھا۔ چوگان کے شمال کی طرف ایک چھتی مٹی، جسے

ایللی کے گھر میں تیاریاں ہونے لگیں۔ نہ جانے کیا ہونے والا تھا۔ بات سمجھ میں نہ آئی تھی۔ لیکن کچھ ہونے والا ضرور تھا۔ اسی لئے تو علی احمد چھٹی لے کر علی پور آگئے تھے۔ اور دادی اماں کو پاس بٹھا کر اس سے پوچھ پوچھ کر نہ جانے رجسٹر میں کیا لکھ رہے تھے اور ہاجرہ کو ٹھڑی میں کھڑی رو رہی تھی۔ نہ جانے اسے کیا ہوا تھا۔ وہ یوں رونے کی عادی نہ تھی۔

علی احمد نے تو کبھی دادی اماں سے بات نہ کی تھی۔ ماں بیٹے اس مکان میں اجنبیوں کی طرح زندگی بسر کیا کرتے تھے۔ دادی اماں سارا دن سیدہ کے قریب اکڑوں بیٹھی رہا کرتی تھی اور علی احمد اندر بیٹھ کر حقہ پیا کرتے تھے اور رجسٹروں میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ دونوں کی آنکھ میں کبھی بات نہ ہوتی تھی۔ ایللی اکثر حیران ہوا کرتا کہ یہ کیسے ماں بیٹے ہیں ایک دوسرے سے بات بھی نہیں کرتے۔ اگر کوئی دادی اماں سے علی احمد کی شکایت کرتا تو وہ اطمینان سے جواب دیتیں۔ ”علی احمد کی تو عادت ہی ایسی ہے۔“ اور پھر مسکرا دیتیں جیسے اظہار ناراضگی کے باوجود انہیں علی احمد کی وہ بات پسند ہو اور علی احمد کبھی دادی اماں کو بلاتے بھی تو پوچھتے۔ ”بھئی وہ ظالم کام کرنا ہے کیا کیا رسمیں ادا کرنی ہوں گی۔“ اس کے سوا انہوں نے کبھی دادی اماں کو نہ بلایا تھا۔ اندر دادی اماں کپڑوں اور زیور کی بات کر رہی تھی نہ جانے کس کے کپڑوں اور زیور کی بات ہو رہی تھی۔ لیکن اماں ان کی بات سن سن کر روکیوں رہی تھی۔ کپڑے اور زیور کی بات رونے کا کیا مطلب۔ پھر اتفاق سے سعیدہ آگئی اور اماں پھوٹ پڑیں۔

”لو لڑکی کی قسمت ہی پھوٹ گئی میں تو جانتی ہی تھی وہ اپنے رشتہ داروں کے گھر میری پھینک دے گا۔ سو وہی ہوا۔ میری بچی کو فیروز کے بیٹے اجمل کے پلے باندھ رہے ہیں۔ ایللی میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“

اجمل ایللی کی پھوپھی کا لڑکا تھا وہی اجمل جو روہنگ میں چند ایک ماہ کے لئے ان کے ہاں ٹھہرا تھا۔ جسے علی احمد نے ہاں بنانے اور بن ٹھن کر رہنے پر مار کر نکال دیا تھا۔ ایللی کو جیسی۔ اجمل سے ہمدردی تھی۔ اس کی شکل و صورت بھی ایللی کو بہت بھاتی تھی اور پھر اس کا لڑکا سے میل جول اور باہمی ربط بھی ایللی کو بے حد پسند تھا اور اب تو وہ بہت بڑا ہو چکا تھا اور وہ آٹھ سال ایران میں نوکری کرنے کے بعد لوٹا تھا۔ نہ جانے اماں کو اجمل کیوں ناپسند تھا نہ جانے لڑکیوں کیوں تھیں۔ آخر اجمل میں کیا برائی تھی۔ اماں کا مسلسل روئے جانا ایللی کے لئے ہاجرہ حیرانی تھا! اماں بھی تو عجیب باتیں کیا کرتی تھیں۔ ایک طرف تو اس بات پر اس قدر ناخوش

گلیارہ کہتے تھے سے گزر کر ایک اندھیری ڈیوڑھی کو پار کر کے اس نے گھر کی سیڑھیاں آتی تھیں لیکن اس اندھیری ڈیوڑھی کو پار کرنا آسان نہ تھا۔ کیوں کہ دوپہر کی کڑکتی دھوپ میں بھی اس ڈیوڑھی میں گھٹا ٹوپ اندھیرا چھایا رہتا تھا۔ اس گھر کے ایک طرف ایللی کے ماموں شمس علی رہتے تھے اور دوسری طرف اس کی خالہ کا کنبہ آباد تھا۔ یہ تینوں گھر دراصل ایک ہی بڑی حویلی کے حصے تھے جسے کسی زمانے میں آصفی بزرگوں نے تعمیر کیا تھا۔ اگر چوبارے سے دیکھا جائے تو پتہ چلتا کہ نیا گھر علی احمد کے مکان سے ملحق تھا۔ درمیان میں صرف ایک چھت پڑتی تھی۔ اس لئے ایللی عام طور پر ملحقہ کوٹھے سے گزر کر دیوار پھاند کر نئے گھر چلا گیا کرتا تھا تاکہ اسے اندھیری ڈیوڑھی سے گزرنا نہ پڑے۔

اجمل کے والد کسی زمانے میں اکرم ٹیکس کے دفتر میں افسر تھے اب بھی ان کے بڑے اور انداز سے تھکسانہ جاہ و جلال کے آثار ہویداتھے ان کے چہرے پر حکومت اور صحت کی سرنگی جھلکتی تھی۔ اگرچہ انہیں عمدہ چھوڑے کئی سال گزر چکے تھے۔ کہا جاتا تھا کہ انہیں ایک طوائف جاگی سے محبت تھی۔ جس کے عشق میں انہوں نے سبھی کچھ کھو دیا تھا اور نوکری سے فارغ ہو کر جاگی کے یہاں جا متیم ہوئے تھے۔ اجمل کی والدہ بھی عرصہ دراز سے لقمہ اجل ہو چکی تھیں۔ اجمل کی تین بہنیں بقید حیات تھیں۔ سیدہ، رابعہ اور انور، سیدہ نہ جانے کس سے بیاہی ہوئی تھی۔ مگر دادی کے پاس رہتی تھی۔ رابعہ ایللی کے خالہ زاد بھائی پرویز کی بیوی تھی اور انور کی شادی ہمدانی سے ہو چکی تھی جو کسی دور دراز مقام پر کسی مدرسے میں تالیق تھے۔ ان حالات میں اجمل کا گھرویران پڑا تھا۔ اس کے بیاہ پر اس کے والد آئے۔ بہنیں بھی اکٹھی ہو گئیں لیکن جلد ہی وہ سب اپنے اپنے گھر لوٹ گئے اور اجمل کے گھر میں صرف فرحت ہاجرہ اور ایللی رہ گئے تھے۔ اسی لئے ایللی نے محسوس نہ کیا کہ وہ گھر بیگانہ ہے۔ اکثر وہ والدہ کے ساتھ وہیں رہتا رابعہ سے باتیں کرتا رہتا یا پڑوس میں رفیق کے گھر بیٹھا جاتا اور یا دوسری طرف پرویز کے والد محسن علی کے پاس جا بیٹھتا۔

”آؤ ایللی آؤ۔“ محسن اسے دیکھ کر چلاتے۔ ”کو علی احمد کیسے ہیں۔ کوئی نئی شادی کرنے تو نہیں سوچ رہے۔“ اور وہ ہنسنے لگتے۔

ایللی کو محسن علی بے حد پسند تھے ان کی باتوں سے سچائی اور خلوص ٹپکتا تھا۔ بزرگ ہونے کے باوجود ان میں تقصع نام کو نہ تھا۔ محسن علی کے مکان سے ملحق دالان میں پہلی مرتبہ اس

ملاقات شریف سے ہوئی تھی۔

شریف

شریف ایک پتا دلا کمزور اور اداس شخص تھا۔ وہ چپ چاپ چارپائی پر بیٹھ کر حقہ پینے کا عادی تھا۔ دیوار سے سر لگائے کبیل اوڑھے وہ حقہ پینے میں مصروف رہتا۔ اس کی آنکھیں نہ جانے کہاں لگی رہتی تھیں جیسے کہیں لگی ہوں اور وہ خلا کو حسرت بھیر نگاہوں سے گھورتا رہتا۔ کچھ دیر کے بعد ایک مہووم سی آہ بھر کر ایک نگاہ غلط انداز سے گرد و پیش کی طرف دیکھتا اور پھر اپنی دنیائے خیال میں لوٹ جاتا۔ اس کا سردیوار پر ٹک جاتا اور نگاہیں اسی طرح خلا کو گھورنے لگتیں۔

”آؤ ایللی۔“ شریف نے اسے سرسری طور پر بلایا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ ایک نظر اس نے ایللی کی طرف دیکھا اس کی نگاہ میں عجیب سی چمک تھی جو آن کی آن میں لہرا کر غائب ہو جاتی تھی۔ اس ایک ہی چمک میں سب کچھ تھا۔ خلوص، محبت، سادگی، ناکافی، وہ چمک کبھی عیاں ہوتی تھی جیسے ابر آوردات کو کبھی کبھار چاند ایک ساعت کے لئے مسکرا کر منہ چھپا لیتا ہے۔

وہ ایک چمک نہ جانے ایللی سے کیا کہ گئی۔ جیسے ہمیشہ کے لئے محبت کا پیمان کر گئی۔ ایللی بیٹھ گیا۔ شریف بیگانہ ہونے کے باوجود بیگانہ محسوس نہ ہوتا تھا۔ ایسے محسوس ہو رہا تھا اسے جیسے وہ شریف سے مدتوں سے واقف ہو۔ جیسے وہ دونوں پرانے دوست ہوں۔

”ایللی۔“ شریف نے آہ بھری ”کیا وہ ڈائن ابھی تک جیتی ہے بتا۔“ اس کے ہونٹوں پر زہر خند تھا۔

”ڈائن“ ایللی نے حیرانی سے دہرایا ”ہاں وہ بڑھیا۔ تمہاری دادی۔“ شریف نے کہا۔ ایللی کو یہ بات سخت ناگوار گزری۔

”کیا وہ ڈائن کبھی نہ مرے گی۔ کیا وہ اسی طرح دوسروں کی زندگی تباہ کرتی رہے گی۔“ شریف کے چہرے سے حسرت و بریلوی ٹپکتی تھی۔ ایللی کے دل میں شریف کے لئے جذبہ ہمدردی ابھر آیا۔ اس نے ان جانے میں محسوس کیا کہ شریف مظلوم تھا۔ اس پر ظلم توڑے گئے تھے۔

نہ جانے لوگ دادی اماں کو ڈائن کیوں کہا کرتے تھے نہ جانے صفر اس کے سینے میں

پناے کیوں پھینکا کرتا تھا اور محلے کے تمام لڑکے اس سے خائف کیوں تھے۔ یہ تو ایک عجیبہ تھی کہ وہ بچوں کا شور سن کر کھڑکی میں آتی تھی اور انہیں جھاڑ بھپاڑ کیا کرتی تھی۔ لیکن مرزا اس بات پر اسے ڈانٹتا کہتا تو روانہ تھا وہ اس کے کردار کے دوسرے پہلو سے کیوں واقف تھے۔ انہیں اس کی بناوٹی تیوری کے نیچے دبی دبی مسکراہٹ کیوں نہ دکھائی دیتی تھی۔ ایلی نے لئے وہ بوڑھی ڈانٹ گھر کے پھیلے ہوئے صحرا میں واحد نخلستان تھی۔ محبت کا چھوٹا سا ڈھکچہ چشمہ جو شور مچا کر اپنے وجود کے اعلان کرنے کا عادی نہ تھا بلکہ چپ چاپ بے آواز بیٹھا جاتا تھا۔ ”نہیں۔ نہیں۔ وہ نہیں مرے گی۔“ شریف نے یاس بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ ”بھی ایہ نہ جانے کن کن کے درمیان دیوار بنتا ہے۔“ شریف کی باتوں سے ظاہر تھا جیسے شریف کی زندگی تباہ کرنے میں صرف داوی اماں کا ہاتھ ہو مگر اس کی سمجھ میں نہ آیا کہ شریف کی زندگی کس انداز سے برباد ہو چکی تھی اس نے صرف یہ محسوس کیا کہ شریف اس چینی کی پیالی کی مانند تھا، جو میں بال آچکا ہو۔

پہلی ہی نشست میں ایلی شریف کا دوست بن گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ وہ شریف کا دان ہے اگرچہ اسے شریف کے راز کے متعلق کچھ معلوم نہ تھا۔ شریف سعیدہ کا دیور تھا اور جب کبھی علی پور آتا تو وہ سعیدہ کے یہاں ٹھہرتا کھیل و تفریح کی اس محفل میں جو اکثر سعیدہ کے یہاں لگتی تھی۔ شریف کی موجودگی عجیب سی لگتی جیسے طرہ راگ میں بے برجست سر لگا ہو۔ ایک بات بہر طور واضح تھی کہ شریف عشق کا مارا ہوا تھا۔ اب کو عشق کے منہموم سے پورے طور پر واقفیت نہ تھی۔

عشق بھی عجیب چیز ہے۔ ایلی سوچتا جو شریف کی آنکھوں سے حزن و ملال بن کر جھڑ ہے۔ صدف کی آنکھوں سے رنگ کے چھینٹے بن کر اڑتا ہے۔ اور ارمند کی آنکھوں میں شرارت بن کر کوندتا ہے۔ آخر یہ چیز کیا ہے؟

پھر احاطے کی بند کھڑکی سے داوی اماں کی آواز گونجتی۔ ”اے ہے آج تم نے یہ کیا محفل رکھی ہے۔“ اور شریف سرد آہ بھر کر کہتا ”وہ گدھ بولی۔ چلا رہی ہے۔ اسے زندگی بھرا آوازیں اچھی نہیں لگتیں اسے دیرانہ پسند ہے۔“ اس پر باہرہ خود کھڑکی کھول کر کہتی ”مجھے نے آج مولود شریف کرا لیا ہے۔“ یہ سن کر داوی اماں بڑبڑاتی ہوئی چلی جاتی۔ پھر سب اصرار پر سعیدہ ٹوپی پہن لیتی اور لگنے لگتی۔ مدینے میں مورے سیاں بالا ہے رے۔ نہ جانے

نے یہ بول کہاں سے سن رکھے تھے۔ ایلی کو اس کا گانا بہت اچھا لگتا تھا۔ وہ چپ چاپ بیٹھ کر بغور سننے میں مشغول رہتا مگر بار بار اس کی توجہ شریف کی طرف منعطف ہو جاتی جو چارپائی پر بیٹھا حقہ تھا۔ بار بار آپس بھرتا کروٹیں بدلتا اور محروم نگاہوں سے چھت کی طرف دیکھے جاتا۔

بکھری ہوئی کہانی

نئے گھر میں آنے سے ایلی کا دائرہ ملاقات وسیع ہو گیا تھا اس لحاظ سے وہ نیا گھر اس کے لئے بائٹ فرحت ثابت ہوا تھا۔ وہاں اسے بہت سے لوگوں سے ملنے کے مواقع میسر آتے رہتے تھے۔ سعیدہ اور شریف سے تو وہ روز ہی ملتا تھا۔ اسے شریف کے متعلق عجیب و غریب تفصیلات کا علم ہوتا جا رہا تھا۔ اکھڑے اکھڑے واقعات بکھری بکھری تفصیلات۔ محلے کی عورتیں بھی تو شریف کے متعلق دبی دبی آواز میں باتیں کیا کرتی تھیں۔ اگرچہ شریف میں وہ خصوصی دلچسپی نہیں لیتی تھیں۔ پھر بھی کبھی کبھار کوئی نہ کوئی بات منہ سے نکل ہی جاتی۔ سانپ تو گزر چکا تھا لیکن لکیر ابھی باقی تھی اور محلہ والیوں کو سانپ کی نسبت لکیر سے زیادہ دلچسپی تھی۔ جب ایلی کسی کے منہ سے شریف کے متعلق کوئی بات سنتا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے اور وہ اس بات کو احتیاط سے اپنے ذہن میں محفوظ کر لیا کرتا اور پھر جب وہ رات کے وقت بستر پر لیٹتا تو سنی ہوئی باتوں کے ٹکڑے جوڑنے میں مصروف ہو جاتا۔

سعیدہ آہ بھر کر بولی ”شریف نے تو جان بوجھ کر اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ جوانی کو روگ لگا رکھا ہے۔ ایسا بھی کیا کہ کوئی اپنا آپ تباہ کرے۔“ لو خالہ بھلا اس بڑھیا سے توقع کی جاسکتی تھی کہ وہ ہماری تکلیف کا احساس کرے وہ تو بلکہ ہماری بربادی میں خوش ہے۔ اسے تو موقع ہاتھ آیا تھا اور اب کان پھڑوا کر میاں رانجھایا بیٹھا ہے۔ ہر وقت اپنی ہیر کے خیال میں غرق رہتا ہے اور کھڑے ہیر کو کب سے لے بھی گئے بات ختم ہو چکی۔ لیکن اس نے اپنی زندگی تباہ کر رکھی ہے۔ اسے کون سمجھائے۔“

راجہ بولی ”ویسے نام کا شریف ہے لیکن کر توت دیکھو۔ خواہ مخواہ اس بھولی بھالی لڑکی کو بھرا لیا۔ اس بچاری معصوم کو کیا پتہ تھا کہ یہ چال صرف اسے بدنام کرنے کے لئے چلی جا رہی ہے۔ بچاری کو کیا پتہ تھا کہ اس کے ماتھے پر ٹکٹ کا ٹیکہ لگانے کے لئے یہ کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ تو بہ ہے ہم تو کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔ وہ تو داوی اماں نے بچا لیا ورنہ جانے کیا ہوتا۔“

چچی کہنے لگی۔ ”ہن آہستہ بات کر۔ یہاں تو عشق لگا ہوا ہے۔ اس شریف نے کو دیکھا ہے نے یہ تو پاگل ہو رہا ہے اس کے عشق میں۔ اس لڑکی نے پاگل کر دیا ہے سامنے کھڑی ہو کے۔ دیوانی ہو رہی تھی وہ تو نہ کسی کی شرم نہ لحاظ اور اب یہ لڑکا کسی کو گھر بسائے گا اونٹوں تو بہ ہے ہن دیکھ لو اپنی بیوی کو رلا رلا کے مار دیا۔ بیچاری کی خبر تک نہ پوچھی۔ اب لڑکوں دے گا اپنی لڑکی۔ اسے تو انوری کی دھن لگی ہے۔ سارا دن آپس بھرتا رہتا ہے اور آنکھیں موند کر پڑا رہتا ہے اسے تو انوری کھا گئی اسے ہے۔ کیسا جوان نکلا تھا۔ پر اب تو دیکھا ہی ہے۔“

داوی اماں نے ایللی کو پاس بٹھالیا ”اے ہے ایللی اب تو ادھر آتا ہی نہیں ایسا ہی جی لگا ہے تیرا اس گھر میں۔ اللہ رکھے یہ تیرا اپنا گھر ہے۔ لوگ اپنے ہی گھر میں رہتے ہی کتنے ہیں ایللی تو ادھر نہ جایا کر۔ شریف کی بری صحبت میں نہ بیٹھا کر سنا تو نے۔ چھوڑ اس کلمو ہے کو۔ ہم بھی نہیں۔ وہ تو ہمارا دشمن ہے۔ دشمن نے ہماری عزت کو تباہ کر کے رکھ دیا۔“

شریف نے آہ بھر کر کہا ”لاہور جاؤ گے ایللی۔“ اس نے چھت کی طرف دیکھ کر ایک لمبی بھری۔ ”اس شرم میں رہو گے تم۔ جہاں وہ رہتی ہے۔ آہ۔ اس کے قریب رہو گے۔ اس نے ملنے جایا کرو گے کتنے خوش نصیب ہو تم۔ انہوں نے اسے زبردستی ہمدانی سے بیاہ دیا۔ زہرا اسے ڈولی میں ڈال دیا۔ روتی چیختی چلائی ہوئی کو ڈولی میں ڈال دیا۔ ایللی ان ڈانٹوں نے اسے جی مار دیا۔ لیکن پھر بھی وہ میری ہے اس کی منور روشنی میرے لئے ہی مخصوص ہے۔ کتنی ہے اس میں کتنی پاکیزگی ہے۔ تم وہاں رہو گے جہاں وہ رہتی ہے۔ کتنے خوش نصیب ہو تم اس نے لمبی آہ بھری اور آنکھیں موند لیں۔

محلے میں شریف کی داستان کے ٹکڑے جا بجا بکھرے تھے اور ایللی انہیں جوڑنے نہ مصروف تھا۔ نہ جانے انوری کون تھی۔ جس سے شریف کو عشق تھا نہ جانے وہ حسینہ کون تھی جس نے خاندان کے ننگ و ناموس کو تباہ کر دیا تھا۔ ہر حال اسے شریف سے ہمدردی تھی۔ چاہتا تھا کہ شریف اسے اپنا قصہ سنائے مگر شریف کے سامنے اس خواہش کا اظہار کرنے کی بات نہ پڑتی تھی۔ ہر حال شریف کی آنکھوں کی چمک اور اس کا دکھی انداز اسے بے حد بیان معلوم ہوتے تھے۔

ظاہر تھا کہ شریف اپنے گزشتہ ناکام عشق کی محرومی میں ابھی تک ڈوبا ہوا تھا اس نے

بھی کی تھی مگر اس کی بیوی شریف کے گھر کے دیرانے میں رہ کر تپ دق کا شکار ہو کر مر گئی تھی یہ کوائف تو ایللی کو معلوم تھے۔ مگر ان جزئیات سے کیا ہوتا ہے اسے توکل سے دلچسپی تھی۔

ہر وقت حقے کی ٹلی منہ میں دبائے شریف دیوار سے ٹیک لگائے چھت کو گھورتا رہتا اور ساتھ ساتھ مودوم آپس بھرتا اس کی آنکھیں ایک عجیب و غریب خمار سے چمکتیں اور اس کے منہ سے رال گرتی رہتی۔ ”آؤ ایللی آؤ بیٹھ جاؤ۔“ وہ ایللی کی طرف دیکھ کر اسی محروم انداز سے کہتا اور پھر ایللی کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر اسی طرح دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کی طرف ٹنگی باندھ کر دیکھنے میں کھو جاتا۔ ایللی بیٹھے بیٹھے کسی نامعلوم جذبہ کی شدت سے بھیگ جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے وہ کمرہ شریف کے خلوص سے بھرا ہوا ہو۔ جیسے کمرے کی دیواریں احساس احترام سے کھڑی ہو گئی ہوں۔ جیسے کھڑکیاں منہ کھولے حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی ہوں۔ شریف کی آمد سے ایللی کو انگریزی لمباؤں سے خاص دلچسپی نہ رہی تھی وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ زندگی کی سب سے بڑی عظمت عشق ہے۔ پاکیزہ عشق۔ محروم عشق اور چلتی لڑکیوں کو دیکھنا تو بچوں کا کھیل ہے۔ اگرچہ اسے معلوم نہ تھا کہ عشق کا مطلب کیا ہے۔ مرد عورت سے کیوں محبت کرتا ہے مگر نہ جانے کیسے اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عشق سے بڑھ کر اور کوئی چیز قاتل حصول نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس سے عشق کرے۔ کیسے عشق کرے لیکن ان دنوں اس کی سب سے بڑی تمنا یہی تھی کہ وہ کسی سے عشق شروع کر دے اور پھر ناکام ہو کر شریف کی سی جاویدت پیدا کر لے اور دیوار سے ٹیک لگا کر چھت کو گھورنے میں زندگی صرف کر دے۔ اسے شریف کی زندگی کا یہ پہلو بے حد پیارا لگتا تھا لیکن اس سے ہٹ کر شریف کی باقی ماندہ شخصیت سے اسے گھن آتی تھی۔ مثلاً شریف کا ڈھیلا ڈھیلا پن۔ اس کی چال ڈھال اسے قطعی پسند نہ تھے اور اس کے منہ سے رال سی ٹپکتی دیکھ کر تو وہ کراہت سے منہ موڑ لیتا تھا۔ اس کے لئے شریف کی تین خصوصیات بے حد پیاری تھیں۔ شریف کی محبت بھری نگاہیں، غمناک نگاہیں جن میں ایک مٹھاس اور محرومیت بھرا نشہ رواں دواں رہتا تھا۔ شریف کا بے پناہ خلوص اور شریف کی دوست نوازی۔

حاجی شریف کی رخصت ختم ہو گئی اور وہ واپس اپنی نوکری پر چلا گیا۔ شریف کے جانے کے بعد ایللی کوئی ایک دن اکھڑا کھڑا رہا۔ ارجمند کے اصرار کے باوجود کپ اور کپ کی طرف متوجہ نہ ہوا نہ ہی اس نے انگریزی لمباؤں کے کھیل میں حصہ لیا۔ اسے صرف ایک دھن لگی تھی کہ وہ

یا بھی مہربان ہوتے تو دونوں انگلیوں میں گوشت کا ٹکڑا یا کوئی اور کھانے کی چیز پکڑ کر چلاتے ”ایلی یہ لے۔ ایلی۔“ اس کے علاوہ کبھی ایلی کی طلبی نہ ہوئی تھی اور نہ ہی انہوں نے محسوس کیا تھا کہ وہاں ان کے قریب چند ایک گز کے فاصلے پر ایک لڑکا ایلی بھی رہتا تھا۔

غیم کے آنے کے بعد چند ایک دن کے لئے تو علی احمد کے کمرے میں غیم غیم کی آوازیں گونجتی رہیں اور غیم کی آواز مدھم سرگوشیاں کرتی رہی۔ پھر وہ سرگوشیاں معدوم ہوتی گئیں اور بالاخر ایلی کو اس کمرے سے سسکیں سنائی دینے لگیں اور غیم کا انداز محرومیت کا غماز ہو گیا۔ اس کی آنکھوں کی چمک ماند پڑتی گئی اور علی احمد کی کھنکھار میں درشتی کا انداز واضح ہوتا گیا۔ جلد ہی کور پھر سے آمو جوہ ہوئی اور بند کمرے کے پیچھے اس کے دانت چمکنے لگے۔ ”بابو جی کے مزاج ٹھیک ہونے والے ہیں۔“ وہ پچھلے کی رسی گھما کر کتہی اور غیم باورچی خانے میں حیران نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھتی جیسے کہیں کھو گئی ہو۔ جیسے اس کی سمجھ میں نہ آ رہا ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔ اس پر دوسرے کمرے میں ہاجرہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی رفیقہ مسکراتی اور اپنا بدن سیلا کر ہاجرہ سے کہتی ”ہائے اب کیا ہو گا۔“ اور ایلی غصے سے کھولتا اور اس کا جی چاہتا کہ چلا چلا کر کہے ”اب میں دسویں جماعت میں ہوں۔ اب میں بڑا ہو گیا ہوں۔ اب میں دیکھوں گا کہ یہاں کون آتی ہے۔“

”ایلی کور کے لئے پانی لاؤ۔ ایلی“ علی احمد کی کھنکھار سن کر اس پر سکتے کا عالم چھا جاتا۔ جسم پر سویاں سی جلنے لگتیں اور وہ اٹھ کر کھڑا ہو جاتا۔ ”آیا جی۔“ اس وقت وہ یہ حقیقت بھول جاتا کہ وہ دسویں میں ہے اور گھر میں عورتوں کا آنا جانا برداشت نہیں کر سکتا اور وہ بوتل اٹھا کر باہر نکل جاتا۔

کنوئیں کے پاس پہنچ کر اس کے حواس درست ہوتے۔ دھند لکا دور ہو جاتا اور غیم کے حنا ملیدہ ہاتھ فضا میں لٹکتے دکھائی دیتے اور اس کی آنکھوں کا فرق اس قدر نمایاں ہو جاتا کہ وہ چونک پڑتا اور محسوس کرتا۔ جیسے وہ ایلی کی مدد مانگ رہی ہو۔ جیسے وہ ایلی کی پناہ لے رہی ہو۔ اس خیال پر وہ کنوئیں پر بوتل رکھ کر سیدھا کھڑا ہو جاتا۔ ”میں دسویں جماعت میں ہوں۔ میں اب بچہ نہیں میں دیکھوں گا اس گھر کو کون تپاک کرتا ہے۔“ پاؤں کی ٹھوک سے وہ بوتل کو گرا دیتا جو کنوئیں کی منڈیر پر لڑھک لڑھک کر نیچے جا گرتی ”مجھے دسویں پاس کرنا ہے۔ مجھے ضرور دسویں پاس کرنا چاہئے۔ ورنہ یہ گھر کبھی پاک صاف نہ ہو سکے گا۔ مجھے دسویں پاس کرنا ہی ہو گا۔“

کسی سے باقاعدہ عشق کرے کسی سے عہد و بیان کرے اور پھر اسے نبھانے کے لئے زندگی وقف کر دے۔ لیکن کوئی بھی تو نہ تھی جو اس سے عہد و بیان کرنے پر مائل نظر آتی ہو کوئی اسے غلام میں نہ لاتی تھی۔ بڑی عورتیں اسے قابل التفات نہ سمجھتی تھیں اور چھوٹی لڑکیوں میں اسے فحاش کوئی دلچسپی نہ تھی۔

بہر حال کچھ دیر کے بعد ہی شریف کا وہ اثر معدوم ہو گیا اور ایلی پھر سے ارجمند کے راجہ کھیل میں حصہ لینے لگا۔ لیکن یہ شمولیت محض ایک قریب تھا ایک دکھاوا تھا دراصل ایلی کی حشر کرنے کی خواہش سمٹ کر اس کے دل کی گہرائیوں میں بیٹھ گئی تھی۔

میٹرکولیشن

پھر دسویں کے امتحانات قریب آ گئے اور ایلی کی توجہ اس طرف مبذول ہو گئی اور وہ پھر آباد کیلئے عازم سفر ہو گئے۔ بام آباد پہنچ کر آہستہ آہستہ شریف اس کے ذہن سے خارج ہو گیا۔ بام آباد میں اب وہ اکیلے نہ تھے۔ ان کے ساتھ غیم تھی۔ اس کے حنا ملیدہ ہاتھ۔ فیروز کی چادر اور چٹے سفید چوڑے چرے سے سارا گھر بھرا ہوا تھا کبھی کبھار اس کے حنا ملیدہ ہاتھوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے صفیہ پھر سے جی اٹھی ہو۔ اس خیال پر وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔ غیم نے خوابیدہ چہرے کو دیکھ کر۔ اس کی نیم مردہ آنکھوں کو دیکھ کر جن میں عجیب سی بے ربطی تھی، ایلی مایوس ہو جاتا ”نہیں یہ صفیہ تو نہیں۔ اس میں وہ بات ہی نہیں۔“ اس احساس کو شدت سے محسوس کر کے ایلی کی نگاہ میں غیم کے ہاتھوں کا رنگ اڑ جاتا اور اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہاتھ سفید نہیں بلکہ پیپلے ہیں اور وہ پیلا پن رنگ کی وجہ سے نہیں بلکہ بے جان ہونے کی وجہ سے ہے۔ اس کے بعد اس کے لئے گھر میں رہنا مشکل ہو جاتا اور وہ باہر گھنٹام اور ایشر لال کی طرف نکل جاتا اور پڑھنے کے بہانے ان دونوں کو دیکھ دیکھ کر آہیں بھرتا رہتا اور یہ محسوس کرتا کی کوشش کرتا کہ اسے ان سے عشق ہے، عشق پیارا۔ دن وہ ایشر لال یا گھنٹام کے پاس گزرتا اور پھر شام کو کتابیں اٹھا کر گھر کی طرف چل پڑتا۔

گھر کے قریب پہنچتے ہی وہ رک جاتا۔ کہیں علی احمد نہ دیکھ لیں کہیں وہ نہ پوچھ لیں کہ ”آج کیا پڑھا، علی احمد کا ڈر اس کے دل پر بوجھ بن جاتا حالانکہ گھر میں علی احمد نے اسے کچھ نہ کہا تھا۔ کبھی چلم بھرنے کے لئے اسے بلاتے یا بازار سے سودا لاتا ہو تو اسے آواز دیتے“

اور اس کی بومحسوس کر کے اس کی طبیعت ماش کرنے لگتی تھی اور جسم کا بند بند لرز جاتا تھا۔ پھر بھی نہ جانے کیوں اس کے ذہن میں حنائی ہاتھ لگتے تھے۔ اس کی جانب بڑھتے۔ وہ گھبرا کر سمٹتا اور پھر ایک جھرجھری اسے جھنجھوڑتی ایک ہوائی سی چل جاتی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ایسا کیوں ہوتا ہے کیوں۔ اس کا دل چوری چوری خواہش کرتا کہ وہ ہاتھ اسے تھپک تھپک تھپک کر سلا دیں اور ایک بھرا ہوا جسم اس پر جھک جائے۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ کیپ کی بجائے کوئی بڑے سے جسم اور گدے جیسے گول گول رنگین ہاتھوں والی اس جتن کے پیچھے کھڑی ہو اور وہ محسوس کرے کہ ایلی اس کی طرف دیکھ رہا ہے لیکن بھرے جسم والیاں تو اسے خاطر ہی میں نہ لاتی تھیں نہ جانے کیا سوچتی رہتی تھیں وہ ایلی۔ چوری چوری ان کی طرف دیکھتا اور پھر گھبرا کر ان کے ہاتھوں کی طرف دیکھتا اور بلاخر ان کے پاؤں کو گھورتا لیکن انہیں احساس ہی نہ ہوتا کہ کوئی دیکھ رہا ہے کن نظروں سے دیکھ رہا ہے انہیں کام کاج سے اتنی فرصت ہی نہ ہوتی کہ ایلی کی نگاہوں یا اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی موجودگی کو محسوس کریں۔ ایلی چاہتا تھا کہ وہ اس کی نگاہوں کو محسوس کر کے لے جائیں۔ اپنا آپ سمیٹیں۔

ہاکی سٹک

اسے چپ دیکھ کر داوی اماں چلائی۔ ”ایلی کیا ہے تجھے یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے تو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تجھے یا تو سارا دن اللہ مارے لڑکوں کے ساتھ لگا رہتا ہے یا گھر میں آکر یوں گم سم بیٹھ رہتا ہے۔“ ایلی یہ سن کر داوی اماں سے لپٹ جاتا۔ انہیں دیکھ کر سر گھٹنوں میں دے کر مسکراتی اور داوی اماں چیختی۔ ”اے ہے اب تجھ سے لڑائی کون لڑے تو یہ — کتنا بڑا ہو گیا ہے تو — ابھی کل اتنا سا تھا اور آج دیکھو — شرم تو نہیں آتی۔ تجھے بوڑھی جان کی ہڈیاں توڑتے ہوئے۔ جا — کھیل جا کے اس سے تو کھیلنا ہی اچھا۔“

داوی اماں کو چھوڑ کر وہ سیدھا رضا کی دوکان پر جا پہنچا۔ اب رضا اس کا دوست بن چکا تھا۔ رضا کی دوکان محلے کے اونچے بازار میں تھی میلے سے دروازوں کے پاس دھندلی دیواروں کے درمیان کئی ایک گتے کے ڈبے رکھے ہوئے تھے، جن میں مختلف اشیاء پڑی تھیں۔ ایک میں ربو کے گیند تھے، ایک میں بچوں کے چوڑے کی مٹائی۔ ایک میں لڑکیوں کے بالوں کے لئے پینیں اور

اگر ایلی کو گھر کی ہلاکی کا خیال نہ ہوتا اگر شمیم کے حنا ملید ہاتھ اس کے سامنے فضا میں محرومیت سے نہ لگتے اگر کور کے سفید دانتوں سے اسے شدید نفرت نہ ہوتی تو شاید ایلی کب دسویں پاس کرنے میں کامیاب نہ ہوتا۔ سکول میں وہ ایک تالائق لڑکا تھا نہ تو اسے پڑھنے کا شوق تھا نہ وہ ذہن تھا جماعت کے لڑکے اس کی باتوں پر ہنسا کرتے تھے اور استاد اس کی تالائق پر فخر لگایا کرتے تھے۔

جوں جوں امتحان قریب آتا گیا، شمیم کی نگاہیں اور بھی محروم ہوتی گئیں۔ کور کے دانت بھی چپکیلے ہوتے گئے۔ علی احمد کی کھسکار میں اور بھی درشتی پیدا ہوتی مٹی اور ایلی کا عزم اور کثرت حاصل کر گیا۔ اب وہ رات کو چپکے سے کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور چوری چوری اسے کرتا رہتا۔ علی احمد کی الماری میں بہت سی کتابیں تھیں۔ گرائمر، یو سی، پریپوزیشنز، ہر چیز پر طبع کتاب تھی اور وہ باری باری انہیں الماری میں سے نکالتا اور چوری چوری پڑھتا۔

اس کے باوجود وہ امتحان کا نتیجہ سن کر حیران رہ گیا اسے یقین نہ آتا تھا کہ وہ پاس ہو ہے۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا۔ اس نے پرچے بھی تو اچھے نہ کئے تھے لیکن زیادہ تعجب کن بات یہ تھی کہ دسویں جماعت پاس کرنے کے باوجود وہ وہی ایلی تھا۔ جیسے پہلے تھا۔ اس میں ذرا بھی توفیق آیا تھا کوئی تبدیلی نہ ہوئی تھی۔ علی احمد کی کھسکار سن کر اس کا حلق ویسے ہی سوکھ جاتا تھا۔ جسم پر ویسے ہی چوٹیاں ریگنے لگتی تھیں اور جی ہاں کہہ کر وہ اسی طرح بوتل اٹھا کر کنوئیں طرف چل پڑتا تھا۔ اس کی آنکھوں تلے شمیم کے حنا ملید ہاتھ اسی طرح بے بسی سے لگتے تھے اس کے سوا وہ کیا کر سکتا تھا کہ کور کی بوتل کو ٹھوکر مار کر گرا دے اور کور کی بوتل میں تھو

وے۔

دسویں پاس کرنے کے بعد وہ علی پور آگیا اور پھر داوی اماں کے پاس رہنے لگا۔ داوی اماں کے پاس رہنے میں کس قدر آرام تھا۔ اسے نماز پڑھتے اور تسبیح کے دانے پھیرتے دیکھ کر اس کے دل میں خوشی کی لہر دوڑ جاتی۔ داوی اماں کا گھر کس قدر پاکیزہ تھا۔

داوی اماں کے گھر کی پاکیزگی پر مسرور ہونے کے باوجود وہ ارجحند سے انکراینڈی مایاں مصروف ہو جاتا اور جب وہ کنوئین کے پاس جا کر ریشی ردال ہلاتے اور بانسری بجاتے تو کب کھڑکی کی جتن میں ہلکی سی لرزش پیدا ہو جاتی۔ ایک آنکھ ابھرتی مگر ایلی کو نہ جانے کیوں سے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ اس کے ذہن میں تو حنائی ہاتھ رقصاں تھے۔ اگرچہ حنا کا رنگ دیکھ

مٹائی فڈ کا نام سن کر جمیل غصے سے گھونہ گھاتا۔ ”لنگڑے دوسری ٹانگ کی جانے۔ اے چاہئے۔“ جمیل اندر داخل ہوتا۔

پھر وہ تاش کی بازی شروع کر دیتے اور دیر تک تاش کھیلتے رہتے۔ حتیٰ کہ کوئی آکر ایلی خروار کر دیتا کہ دادی اماں کھڑکی میں بیٹھی ہر آتے جاتے سے اس کے متعلق پوچھ رہی ہے اور محلے کے تمام لڑکوں کو گالیاں دے رہی ہے۔ پھر ایلی چپ چاپ اٹھ کر گھر کی طرف چل پڑتا۔ راستے میں کنوئیں کے قریب یا لالٹین کے پاس ارچند اسے دیکھ کر چلاتا۔

”ارے یار غضب ہو گیا۔ ایلی آج تو وہ ہمارے گھر آگئی۔ ظالم نے نیلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ نیلا سوٹ اور سفید رنگ۔ توبہ ہے۔“

”میں ذرا گھر جا رہا ہوں۔“ ایلی جواب دیتا۔

”پاکل ہو۔“ ارچند چلاتا ”آج — اور گھر وہی بات ہوئی آج ہی گھر میں بوریا نہ ہوا۔ بھی آج خاص دن ہے۔ آج نہیں جا سکتے تم تمہیں پتہ نہیں اس کی سہیلی آئی ہوئی ہے۔ وہ دیکھو وہ — سبحان اللہ کیا سہیلی ہے۔ کبخت۔ اندر کا اکھاڑا بنا ہوا ہے۔ یہ گھر آج آہا۔ وہ دیکھو۔ چاند سا کھڑا نکل آیا۔ ذرا حق اٹھا کر میری جان۔ منہ دھوئے بغیر کیا پھین ہے۔“ بلم کریں توری اکھیاں۔“

نہ جانے کیوں ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ ارچند محض گزریوں کا کھیل کھیل رہا ہے۔ بے جان گزریاں جو لپائیں جھینپتیں، ظاہر ہوتیں اور چھپ جاتیں اور پھر کھلکھلا کر ہنستیں اور چلا چلا کر باتیں کرتیں۔ اس وقت ایلی کی نگاہوں تلے دو بھرے بھرے بازو لٹکتے۔ مخروطی بانسوں کی جلازیت نضا پر چھا جاتی۔ اور بھرے بھرے جسم میں خاموش بجلیاں سی رواں دواں ہوتیں۔ یوں محلے میں صبح سے شام ہو جاتی اور رات کو بستر پر پڑے وہ سوچتا۔ کس سے عشق کدوں۔ کس سے۔

کلب تھے۔ دو ایک گتوں پر چمکدار بیٹن لگے ہوئے تھے۔ ایک گتے پر لوہے کی چوٹیاں چٹنی ہوئی تھیں۔ ایک کونے میں مٹی اور ربڑ کے چند کھلونے رکھے ہوئے تھے۔ ان ڈبوں کے پاس رونا بوریے پر بیٹھا رہتا تھا۔ جس کے قریب ہی اس کا پلڑا کر چلنے والا سونا پڑا ہوتا تھا اور سونے کے پاس اس کا مضحکہ خیز جوتا۔ اس جوتے کو دیکھ کر خواہ مخواہ ہنسی آجاتی کیونکہ اس کا ایک پاؤں تو عام جوتے کے سائز کا تھا اور دوسرا میٹر بچکا نہ۔ رضا کی ٹانگوں کو دیکھ کر ایک ساعت کے لئے ہر نوار دچوکتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اپنی ٹانگ کے پاس اس نے لنگڑی کی ایک مڑی ہوئی کھوٹی ڈال رکھی ہو۔ لوگوں کو اپنی ٹانگ کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ چلاتا۔ ”میری طرف دیکھو باہو۔ میری طرف۔ یہ کھوٹی بکاؤ نہیں۔“ اور پھر منہ پکا کر لیتا یا ہنس کر کہتا ”پسند ہے یہ؟ ایک تم کو بھی دلا دوں۔“ رضا اپنی لنگڑی ٹانگ پر شرمندگی محسوس کرنے کے بجائے فخر محسوس کرتا تھا ”یار“ وہ دوستوں کے درمیان کھونٹے کے سارے کھڑا ہو کر لنگڑی ٹانگ کو گھما کر کہتا ”اللہ میاں نے مجھے تو ایک ہاکی دے رکھی ہے کیا سمجھا ہے تم نے اسے کسی سے لڑتے وقت رضا کو اپنے حریف کو پچھاڑتے ہوئے دیکھ کر ایلی محسوس کرتا جیسے لنگڑا ہونا خصوصی نعمت ہو۔ رضا یوں حریف سے چٹ جاتا۔ جیسے جزیرے کا بڈھا پیر تمہ پا ہو اور پھر اس مڑی ہوئی کھوٹی سے واقعی یوں کام لیتا گویا وہ ہاکی سنگ ہو۔

لیکن رضا بعداً ”لڑنے سے گریز کرتا تھا ہر بات کو مذاق میں اڑا دینے کی قابلیت گویا اس نے ورٹے میں پائی تھی اور پھر اس کی باتیں سن سن کر محلے کے لڑکے ہنس ہنس کر پاکل ہو جایا کرتے تھے۔

ایلی رضا کے پاس جاتا تو وہ اٹھ بیٹھتا ”آؤ ایلی آؤ۔ میاں بیٹھو“ وہ دکان کے اندر ایک بورا بچھا دیتا۔ ”تاش کھیلیں۔ سیر کرو گے تو چلتے ہیں دکان بند کر کے چلتے ہیں۔ چلو۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ ایلی چلاتا ”میں تو ویسے ہی آیا تھا بیٹھنے کے لئے۔“

”اچھا تو ٹھیک ہے۔“ اور وہ دونوں بیٹھ جاتے انہیں پاس بیٹھ کر باتیں کرنے کی بھی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ چپ چاپ دونوں بیٹھے رہتے اور رضا حسب معمول ساتھ دلا حکیم تمباکو فروش اور بیڑی فروش پر بچتیاں کستارہتا اور ایلی ہنستا رہتا۔ پھر جمیل اوھر نکلتا۔

”اے بھائی جمیل۔ جمیل۔ کہاں جا رہے ہو۔“ رضا چلاتا۔ ”کچھ مٹائی فڈ ہے نا آج ہم بھی چلتے ہیں۔ ایلی بھی بیٹھا ہے۔ میاں اندر دکان میں ہے۔“

”داوی اماں پوچھ رہی تھیں۔“ لڑکے میٹھی روٹیاں پکا دوں تجھے۔ ساتھ لے جانا۔ اے ہے گاڑی میں بھوک لگے گی تو کیا کرے گا۔“

چند ایک گھنٹوں میں ایلی کی تیاری مکمل ہو چکی تھی۔ اس کے پاس تھا ہی کیا کہ سنبھالنے میں دیر لگتی۔ دو قیص چار ایک پا جائے ایک پرانا کوٹ اور ایک گھسا ہوا جوتا۔ لاہور پہنچ کر علی احمد نے اسے تانگے پر بٹھایا وہ تانگہ انہیں گندے اور بھیڑ سے بھرے بازاروں میں سے گھماتا ہوا بھائی دروازے لے گیا۔ یہ کیسا لاہور تھا۔ کیا یہ وہی لاہور تھا۔ جہاں موتی نے اسے سیر کرائی تھی۔ یہ لاہور اس لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا پھر بھی اسے تسلی تھی کہ وہ لاہور آگیا ہے اب اسے گھر میں دیک کر رہنے کی کوفت سے نجات مل جائے گی۔ اب اس سے کوئی نہ کہے گا ”ایلی حقہ بھر دو۔“ اب اسے کنوئیں سے بوتل میں پانی بھرنا نہیں پڑے گا اور علی احمد کا کمرہ دور ہو گا۔ بہت دور۔ اب کوئی آسا صحن میں بیٹھ کر تنکے سے زمین پر لکھنے میں مصروف دکھائی نہ دے گا اور نیم وا دروازے سے رضامندی بھرے سفید دانت نہ چمکیں گے۔ اب اسے ہر چیز خریدنے کے لئے علی احمد کے سامنے ہاتھ پھیلانے نہ پڑیں گے۔ جب وہ علی احمد سے پیسے مانگتا تھا تو — تو یہ ہے وہ ایک جملہ کتنا دو بھر ہو جاتا تھا اور — اور جب وہ کچھ کہہ چکتا تو علی احمد کے جواب دینے سے پہلے دنیا پر سناٹا چھایا رہتا۔ زندگی گویا جم کو برف کی سل بن جاتی اور پھر جب علی احمد اچھا کہتے تو گویا ”کن“ کی آواز آتی اور وہ ابجد اور قحط ختم ہو جاتا اور چاروں طرف زندگی از سر نو بیدار ہو جاتی۔ لیکن علی احمد اچھا کہاں کہتے تھے۔ اب اس کی اپنی جیب میں پیسے ہوں گے اور وہ مونگ پھلی خرید سکے گا اور گڑ کی ریوٹیاں — کتنی کڑا کے دار ہوتی ہیں گڑ کی ریوٹیاں۔ عیش خالص عیش۔ اتنی آزادی۔ اتنی آزادی اسے مل جائے گی کیا۔ وہ حیران تھا۔

گلیاں ہی گلیاں

رات علی احمد اور ایلی نے ایک عزیز کے یہاں بسر کی اور صبح سویرے ایلی کو ساتھ لے کر علی احمد کالج کی طرف چل پڑے — ”ہائیں یہ ابا کہہ رہا ہے تھے۔“ ایلی سوچنے لگا۔ یہ تو گلیاں ہیں۔ تنگ و تاریک گلیاں — کیا کالج گلیوں میں ہوتے ہیں اور گلیاں فضول گھومے جا رہی تھیں۔ لیکن وہاں کالج تو نہ تھا کوئی۔ وہاں تو عورتیں ہی عورتیں تھیں۔ کھڑکیوں سے لٹکتی

شہزاد

لاہور

ایلی کو علی پور میں رہتے ہوئے ابھی کچھ زیادہ عرصہ نہیں گزرا تھا کہ علی احمد آگئے اور انہی بولے ”ایلی کالج میں داخل ہونے کے لئے تیار ہو جاؤ کل ہم جا رہے ہیں۔“ ایلی کے جہ میں ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ لاہور وہ لاہور جہاں وہ اپنے ماموں قیوم کے ساتھ گیا تھا وہاں یہ اخبار محلے میں جہاں قیوم رہتا تھا۔

شام کے وقت جب قیوم اسے تانگے میں بٹھا کر سیر کو لے گیا تھا۔ سفید گھوڑی والا تانگہ جس کا کوچوان بوڑھا ہونے کے باوجود اس قدر زندہ دل تھا ”موتی بیٹی۔ آج بابو جی کو سیل کر رہے ہیں۔“ چل بیٹی دولہن کی چال چلیو۔ چل۔“ اور موتی یوں چلنے لگی تھی جیسے اس کی تانگہ تلے چھوٹے چھوٹے پیسے لگے ہوئے ہوں۔ گردن کے بال لہرا رہے تھے۔ نیچے سڑک پانی کی دھارے کی طرح بہہ رہی تھی اور یہ دھارا چوڑا ہوتا جا رہا تھا اور چوڑا۔ اور چوڑا۔ سڑک دوونوں کناروں پر سرسبز درخت اور اونچی عمارتیں ناچ رہی تھیں۔

پھر مکانات اور عمارتیں کم ہوتے گئے۔ ان کی جگہ دونوں طرف گھاس کے سبز قطعے بن گئے جن میں سے رنگ رنگ کے پھول سر اٹھا اٹھا کر دیکھنے لگے۔ سرسبز درخت جھوم جھوم تھے۔ خاکستری نیلے لڑھک رہے تھے۔ سڑک بھورے فیتے کی طرح چل رہی تھی۔ سبز چمن گھبوں پر بتیاں یوں ٹٹمنا رہی تھیں جیسے جگنو چمک رہے ہوں۔ وہ لاہور! لاہور کا نام سنتے ہی وہ اٹھ بھاگا۔ ”داوی اماں میری قیص کہاں ہے داوی اماں میری“

”جی۔ جی۔ جی۔“ ایللی گھبرا گیا۔
 ”جی جی کیا۔ سیدھی بات کرو۔“

وہ چلا گیا تو ایللی اٹھ بیٹھا۔ اس کے ارد گرد دیواریں گھوم رہی تھیں۔ ہوٹل میں ہر طرف اونچے لمبے جاٹ قسم کے لڑکے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ”ٹھہراؤ لوٹو۔“ کہاں جا رہا ہے تو مار رہے تھے۔ منہ پڑا رہے تھے۔ ”ایللی بھاگے لگا۔ ایک بھدی سی آواز پیچھے سے چلا رہی تھی۔“ ٹھہراؤ لوٹو۔“

ارے یہ لڑکیاں کہاں سے آگئیں۔ ”ایک لڑکا ایللی کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا۔ اس نے زبردستی ایللی کی ٹھوڑی پکڑ لی اور اس کے منہ کو چاروں طرف گھما کر بولا ”یہ دیکھو ماں کالا۔ ابھی ماں کا دودھ پینا نہیں چھوڑا اور آئے ہیں یہاں کالج میں داخل ہونے کے لئے۔ ماں کے پیٹ ہی سے دسویں کر کے آتے ہیں۔“

خوف سے ایللی کی حرکت قلب بند ہوئی جا رہی تھی۔ اس کی کپٹیاں تھرک رہی تھیں ”جا اپنی ماں کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ اس نے دھمکی دے کر کہا ”دوڑا می کی گود میں جا کر بیٹھ۔“ پھر ایللی کو کچھ معلوم نہیں۔ وہ بھاگ رہا تھا۔ سڑکوں پر بھاگ رہا تھا۔ بھیڑ کو چرتا ہوا جا رہا تھا۔ لوگ اس کی طرف منہ اٹھا ٹھا کر دیکھ رہے تھے وہ زیر لب ایک دوسرے سے کچھ کہہ رہے تھے۔ ”ماں کی پیٹ سے دسویں پاس کر کے آتے ہیں۔“ ”یہ دیکھو ماں کالا۔ باہا ہا۔“

سارا لاہور اس کے راز سے واقف تھا۔ سبھی اس پر ہنس رہے تھے ”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ پھر بھاگ اٹھا۔ لڑکیاں نفرت سے اس کی طرف دیکھ کر مسکراتیں۔ عورتیں ہاتھ چلا کر باتیں کرتیں۔ تانگے والے اس کا مضحکہ اڑا رہے تھے۔ ”ہٹ بابو۔“

اس کا جی چاہ رہا تھا کہ بھاگ کر دادی امں کے پاس جا پہنچے اور وہ اسے تھپک تھپک کر سلا دے۔ ”کیا ہے تجھے ایللی۔ سو جا۔ کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ اور پھر مطمئن ہو کر وہ رضا کی دکان میں جا بیٹھے۔ ”آؤ بابو ایللی۔ بیٹھ جاؤ۔“ اور وہ پر وقار انداز سے بیٹھ جائے یا ارجند کے پاس جا کھڑا ہو۔ ”ایللی وہ دیکھو بین جی اور ناگ مست ہوا ہے نا۔“ وہاں اس کی اہمیت تھی۔ وہاں لوگ اسے ماں کالا نہیں سمجھتے تھے وہاں اس کی باتیں ایک حیثیت رکھتی تھیں۔

بازار میں جگہ جگہ چھابڑی والے مونگ پھلی، ریوڑیاں اور پنے بچ رہے تھے لیکن اسے کچھ بھی تو دکھائی نہ دے رہا تھا۔ چاروں طرف بھیانک دھند لگا چھایا ہوا تھا اونچے اونچے کھجے سروں پر

ہوئی عورتیں۔ منڈیروں سے جھانکتی ہوئی عورتیں۔ چوکیوں پر بیٹھی ہوئی عورتیں۔ بل بلاتی ہوئی۔ دانتوں پر دنداسہ لیتی ہوئی دوپٹے سنبھالتی ہوئی۔ لجاتی ہوئی۔ گھورتی ہوئی۔ چپ ہوئی۔ چلاتی ہوئی عورتیں۔ اور وہ گلیاں ختم ہونے میں نہ آتی تھیں ایک ختم ہوئی اور دوسری شروع ہو جاتی۔ ایک مڑ جاتی تو دوسری کھل جاتی۔ گلیاں ہی گلیاں۔ تنگ کھلی۔ پورا گلیاں۔ جہاں علی احمد کے سوامر گردن جھکائے گزرتے تھے اور غباریں سینہ ابھار کر چل رہی تھیں۔ وہ تھک گیا مگر گلیاں چلے جا رہی تھیں اور ان میں علی احمد سر اٹھائے منڈیروں کی طرف دیکھتے ہوئے شانہ انداز سے یوں چل رہے تھے جیسے بارغ میں ٹہل رہے۔ دفعتاً ”گپ ختم ہو گئیں۔ چوڑی سڑک آگئی۔“ ”وہ تمہارا کالج ہے۔ ایللی“ علی احمد نے سامنے والی سڑک کی طرف اشارہ کیا ”اور دیکھا یہ۔“ وہ گلیوں کی طرف اشارہ کر کے بولے ”یہ لاہور ہے لاہور۔“ ”وہ ہنسنے لگے۔“

ماں کالا

علی احمد دو دن وہاں ٹھہرے۔ ایللی دعائیں مانگتا رہا کہ وہ جلد رخصت ہوں اور اسے آزاد حاصل ہو لیکن جب سب کام مکمل ہو گیا۔ فیس ادا کر دی گئیں۔ کتابیں میا کر دی گئیں۔ بورڈنگ میں 17 نمبر کے کمرے میں اس کی چارپائی رکھوا دی گئی اور علی احمد رخصت ہونے لگا تو نہ جانے کیوں وہ گھبرا گیا۔

بورڈنگ میں لڑکے ہی لڑکے بھرے پڑے تھے۔ بڑے بڑے لڑکے۔ اونچے لمبے بھرے جسم کے مرد نما لڑکے عجیب سے چروں والے لڑکے بڑی رعوت سے گھورنے کے لیے بھاگتے۔ جو ڈانٹ کریوں بات کرتے جیسے تھانے دار ہوں۔ ”اے لڑکا۔ ادھر آؤ۔“ اور ”اے کون ہو۔ کون ہو تم۔“ وہ ہر وقت مونچھیں مروڑتے۔ اپنے تہ بند جھاڑتے رہتے۔ کیا پاجاموں کی جگہ انہوں نے بڑی بڑی چادریں لپیٹ رکھی تھیں۔ جن کے تلے طلائی جوتے غ جن کی نوکیں نکلی رہتی تھیں۔ ان لڑکوں کے ساتھ عمر رسیدہ نوکر تھے جو انہیں حقہ پلاتے۔ علاوہ مٹھی چانی میں مصروف رہتے۔ ایللی انہیں دیکھ کر ڈر گیا اور پھر سہم کر سترہ نمبر کے کمرے میں دیک کر بیٹھ گیا۔

”اے تو کون ہے؟“ ایک لبا ترنگ لڑکا کمرے میں آگھا ”کون ہے تو؟“

ٹٹماتی ہوئی بٹیاں اٹھائے ناچ رہے تھے۔

نہ جانے کب تک وہ بازاروں میں آوارہ گھومتا رہا لیکن آخر کار اسے واپس ہوٹل میں ہی پڑا۔ واپس آنے کو اس کا جی تو نہ چاہتا تھا۔ اس گنوار خانے کی نسبت شیش کے پلیٹ فارم بیٹھ کر وقت کاٹنا کہیں بہتر تھا۔ لیکن شیش بھی تو ایک اجنبی مقام تھا جہاں پولیس کے سپاہی بیٹھے اور لیٹے ہوئے مسافر کو شک کی نظروں سے دیکھتے تھے۔ اسے کسی عزیز کے گھر کا راستہ بچہ معلوم نہ تھا۔

ڈرتے ڈرتے وہ بورڈنگ میں جا داخل ہوا وہاں برآمدوں میں گراؤنڈ میں جگہ جگہ چارپائو بچھی ہوئی تھیں۔ حقے گڑا گڑا رہے تھے۔ سفید چادریں جھاڑی جاری تھیں۔ ”او نڈرے۔“ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔

چپ چاپ وہ کمرہ نمبر سترہ میں جا پہنچا۔ ہائیں وہاں تو کچھ بھی نہ تھا۔ نہ اس کا ٹرنک۔ نہ سوٹ کیس۔ نہ بستر نہ چارپائی کمرے کے دروازے کے قریب برآمدے میں ایک جاٹ کو بڑ دیکھ کر وہ اس کی جانب بڑھا۔

”جی۔ جی۔“ اس کا دل دھڑک رہا تھا ”یہاں اس کمرے میں یعنی کمرہ نمبر سترہ میں یہ میرا سامان بستر۔“

جاٹ نے بے پروائی سے اس کی طرف دیکھا اور کھانسنے لگا ”معلوم نہیں۔“ وہ مونچھوں والے جوان سامنے کوٹھے پر چارپائیوں پر پڑے تھے۔ وہ ان کے قریب چلا آیا لیکن ان سے بات کرنا کچھ آسان نہ تھا۔

”کیوں بھی۔ کیا دیکھتا ہے۔“ ایک نے چلا کر کہا۔

”کچھ نہیں جی۔ کچھ نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”ہوں۔ کون ہے۔ یہاں کیوں گھوم رہا ہے۔“

”جی میں سترہ نمبر میں فرسٹ ایئر میں۔ میں۔ میں۔“ اس کی گھبراہٹ بڑھتی جا رہی تھی۔

”جی میرا بستر چارپائی۔ ٹرنک۔ سب غائب ہیں۔“

”ہائیں۔ کیا مطلب کیا ہم چور ہیں۔“ ایک نے مونچھ مروڑتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔ جی۔ نہیں۔“ ایللی نے جھٹ انہیں یقین دلانے کی کوشش کی ”یہ تو اپنے ہوٹل

نہیں ہے۔“ ایک نے اسے گھسٹکار کر کہا ”اوھر آجے۔“ ”چوری کرنے آیا ہے تو۔“

”جی جی نہیں۔ میں تو۔“

”بھاگ جا یہاں سے ورنہ پولیس کو بلائیں گے۔ دوڑ۔“

ایللی پھر بھاگ رہا تھا۔ نہ جانے کہاں کس طرف۔ لوگ اسے مشتبه نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ پولیس مین کے سامنے پہنچ کر وہ گھبرا جاتا اور آنکھ پجاکر نکل جانے کی کوشش کرتا۔ نہ جانے کیوں وہ اپنے آپ کو چور سمجھنے لگا تھا۔ آوارہ۔ چور پلیٹ فارم پر وہ ایک بچہ پر پڑ گیا۔ اسے مسافر خانے کے بچہ پر پڑے دیکھ کر پولیس والا آدھمکا۔

”ہے۔ کون ہے۔ تو۔ کہاں جائے گا؟“

”جی جی۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔

”کہیں بھی نہیں۔“ وہ بولا

”تو یہاں کیوں پڑا ہے؟“

”میں۔ میں۔“ وہ گھبرا گیا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔ نہ جانے اسے کیا کرنا چاہیے تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

”بھاگ یہاں سے۔“ حوالدار نے مونچھوں کو تآؤ دیتے ہوئے کہا۔

ایک بار پھر وہ دیران لاہور کی سڑکوں پر گھوم رہا تھا۔ جہاں خوفناک شکلوں والے کتے بھونک رہے تھے۔ ہر قدم پر وہ محسوس کرتا تھا۔ رک جاتا۔ نہ جانے کہاں سے کوئی آنکھ لگا۔ کتا بھونکے گا یا کوئی حوالدار مونچھ مروڑ کر اسے گھورے گا۔ تو بہ کس قدر دیران شہر تھا وہ کتنی چوڑی سڑکیں تھیں وہاں اور وہ کھبوں پر ٹنگی ہوئی بٹیاں یوں ٹٹماتی تھیں۔ جیسے کسی ڈانن کی آنکھوں کی پتلیاں ہوں۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا آخر وہ پولیس والا یہی پوچھتا تھا تاکہ کہاں جائے گا۔ ٹکٹ کہاں ہے تیرا۔ اس خیال پر وہ پھر شیش کی طرف مڑ گیا۔ بنگ آفس سے اس نے ٹکٹ خریدا اور ونگ روم کی طرف چل پڑا۔

پھر جو اسے ہوش آیا تو وہ گاڑی میں بیٹھا تھا اور گاڑی علی پور کی طرف فرارے بھرتی ہوئی جا رہی تھی۔

پناہ گاہ

علی پور پہنچ کر وہ اپنی تمام گزشتہ تکلیف کو بھول گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے ویرانی ختم ہو

گئی ہو اور وہ پھر سے ایک حیثیت سے مالک ہو گیا ہو۔

”ایلی۔ ایلی۔ ایلی۔“ چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔

”ایلی۔“ داوی اہل چلا رہی تھی۔ ”تیرا دل لگ گیا تھا وہاں لاہور میں۔ تو بہ اتنی دور تھی نہ جانا۔ نہ بھی میں تو نہیں چاہتی تو وہاں اکیلا جائے۔“

”ایلی۔“ ارچند چلا رہا تھا۔ ”تم آگئے۔ اچھا ہوا تم آگئے۔ تم چلے جاتے ہو تو سب گڑبڑ جاتا ہے۔ اسٹنٹ نہ ہو تو پیچھا ہینڈ کیا کرے۔ بڑی چیز ہوتی ہے اسٹنٹ۔ ہاں تم نہیں جانتے دفاتروں میں اس کی کیا حیثیت ہوتی ہے اور پھر یہاں انکرائیڈی آفس ہے۔“

”آگے بابو۔“ رضائے اپنی لنگڑی ٹانگ کو گھماتے ہوئے کہا ”آؤ بیٹھو۔ اب تو کالج والا بن گئے۔ بابو بن گئے تم۔“

”ایلی۔“ جیل اسے دیکھ کر مسکرانے لگا۔ ”آؤ اوپنی گلی میں آؤ وہاں آج لالہ نے لکھاب جاسن بنائے ہیں۔ آؤ۔“

”تو آگیا ایلی۔“ سعیدہ نے اپنا خوشبودار دوپٹہ سر پر لیتے ہوئے کہا ”آجا“ آج رات کو مپاہی کی بازی لگے گی۔ آئے گا نا تو۔“

”ہاں۔ ہاں۔“ ایلی نے کہا ”ضرور آؤں گا۔“

”ایلی۔“ اب تو کالج کے ٹھاٹھ ہیں نا۔“ حکیم صاحب اسے دیکھ کر طنزاً ”مسکرائے چودھری یہ سن کر بولا ”کیا فرق ہے حکیم صاحب۔ یہ تو جیسے پہلے تھا ویسے ہی اب ہے۔“

”وہی رضا کی دوکان۔ وہی تاش کی گڈی۔“ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لٹریچر چچا عظمت رک گئے ”کیا کہا چودھری۔ تاش کی گڈی۔ تاش کھیلنے کے علاوہ ان لٹریچر

آتا ہی کیا ہے۔ اللہ آپ کا بھلا کرے۔“ رضا ہنسا ”یہی میں کہہ رہا تھا۔ چچا عظمت۔“

عظمت نے رضا کی طرف انگلی سے یوں شست باندھی جیسے اسے گولی کا نشانہ بنا رہے ہوں نے تو لچ پنے کا لڑہا بنا رکھا ہے۔ یہ دکان تو محض ایک بہانہ ہے۔“

”ہاں۔“ رضا ہنسا ”چچا جی یہی بتا رہا تھا میں انہیں۔ لیکن ان احمقوں کی سمجھ میں آئے بات بالکل بھس بھس ہیں یہ سب اور یہ ایلی۔“

علی پور آجانے سے ایلی کی ایک حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ اگرچہ محلے کے بزرگ

بوڑھیاں اکثر پنچے جھاڑ کر پیچھے پڑے رہتے پھر بھی علی پور تھا اور لاہور۔ لاجل ولا قوت وہ تو ایک دیرانہ تھا۔ کھوے سے کھوا چھلنے کے باوجود دیرانہ۔

لاہور کا خیال آتے ہی ایلی گھبرا جاتا۔ اس کی پیشانی پر پسینہ چھوٹ جاتا۔ لیکن وہ دل ہی دل میں جانتا تھا کہ اسے لاہور جانا ہی ہو گا۔ علی پور میں رہنا ممکن نہ تھا۔ پھر بھی جتنے دن وہ علی پور رہ سکتا تھا۔ غنیمت تھا۔

”اے ہے تیری چھٹی ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔“ داوی اہل اسے چوتھے ہی روز گھورنے لگی۔ ”اب تو واپس بھی جائے گا یا بیس آوارہ گردی کرتا رہے گا۔ میں تیرے ابا کو کیا جواب دوں گی۔“

”لیکن میں وہاں بورڈنگ میں جا کر بھوکوں مروں۔“ ایلی کو سوچھی ”لو وہاں تو بلکہ کھانے کو میوے ملتے ہیں تیرے ابا کہہ رہے تھے اس روز تو بھی پاس ہی تھا۔“ داوی اہل نے جواب دیا۔

”ہونہ میوے۔ وہاں تو روٹی بھی نہیں ملتی۔ بڑے لڑکے سب کچھ کھا جاتے ہیں۔ فرسٹ انٹر والوں کو کون پوچھتا ہے۔“

پہلے تو داوی اہل نے ایلی کی بات کا اعتبار نہ کیا لیکن جب اس نے دیکھا کہ لاہور کے نام پر ایلی کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر جاتی ہیں تو اسے یقین آ گیا۔

”نہ بھی میں تو ایلی کو بورڈنگ میں نہ بھیجوں گی۔ اے ہے اپنا فیروز جو رہتا ہے۔ وہاں لاہور میں پھر لڑکا بورڈنگ میں بھوکوں کیوں مرے۔ نہیں بھی میرا ایلی وہاں نہ رہے گا کبھی بھی۔ اپنا گھر نہ ہو تو بھلا مجبوری ہوئی۔ لیکن فیروز کے ہوتے ہوئے لڑکے کو بھوکوں مارنا۔“

تقہ اور نعرہ

فیروز کی جوانی دیر سے ڈھل چکی تھی۔ لیکن اس کے رخساروں پر سرخی کی جھلک ابھی تک نمایاں تھی۔ جسم بھرا ہوا تھا۔ چہرہ پروقار ہونے کے باوجود نہ جانے کیوں بے جان سا محسوس ہوتا تھا۔ شانے چوڑے تھے چال ایستادہ تھی اور جسم تھومند اور مضبوط تھا۔ لیکن اس کے باوجود فیروز کو دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے اس کی عظمت ماضی سے تعلق رکھتی ہو۔ جیسے وہ گزشتہ جاہ و شہت اور عیش و عشرت کی ایک داستان ہو۔ اس کی آنکھوں میں چمک اور وقار دونوں خصوصیات بہ یک وقت موجود تھیں۔ لیکن ان میں ایک بے نام سی بے حسی کی جھلک تھی۔

بہم سی آکٹھٹ اور محرومی۔

فیروز کی زندگی اس دیرانی اور محرومی کے باوجود متوازن تھی۔ جسے پابندی اوقات سے خصوصی تعلق تھا۔ وہ صبح سویرے جاگ اٹھتا۔ ٹھنڈے پانی سے غسل کرنے کے بعد کپڑے پہن کر چل قدمی کے لئے باہر نکل جاتا۔ واپسی پر چائے پینے کے بعد تھوڑا سا مطالعہ کرتا اور پھر کچھ کھا کر کپڑے اتار کر آرام کرتا حتیٰ کہ چائے کا وقت ہو جاتا اور چائے پینے کے بعد وہ پھر کپڑے پہن کر باہر سر کو چلا جاتا اور واپسی پر کھانا کھا کے لیٹ جاتا۔

فیروز کو باتیں کرنے سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی خاموشی کسی دلخراش المیہ کی شہرہ تھی۔ فیروز کے کمرے کے قریب ہی ایک کوٹھڑی میں اس کی ہمیشہ صابرہ رہتی تھی۔ وہ ہر وقت چارپائی پر بیٹھی تسبیح پڑھتی رہتی تھی۔ اس کے سر پر ایک خاکستری رنگ کی چادر پڑی رہتی۔ جس میں اس کا سرخ و سپید چہرہ یوں دکھتا۔ جیسے کسی نے اندھیری کوٹھڑی میں کوئلے دہکا رکھے ہوں۔ اس کے سیاہ لمبے بال عام طور پر کھلے لٹکے رہتے۔ ”بیٹھ جاؤ۔“ وہ نووارد کی طرف مسکرا کر دیکھتی اور بڑے اخلاق سے اس سے باتیں کرتی اور پھر دفعتاً ”اس کا قہقہہ گو بھتا ایک بے پروا بے نیاز پروقار قہقہہ۔ وہ ہر تکلیف اور پریشانی پر قہقہہ مار کر ہنسی اور نووارد محسوس کرتا جیسے وہ دیوانی نظرات پر خندہ زن ہو۔ صابرہ کا چہرہ بڑا پر وقار اور بارعب تھا۔ اس کا انداز بے حد پر اثر تھا۔ اس کوٹھڑی کے ارد گرد کئی ایک کوٹھڑیوں میں صابرہ کی بیٹیاں رہتی تھیں۔ سب سے چھوٹی لڑکی فیضہ کی شادی کسی سید سے ہونے والی تھی جو کسی گاؤں میں زمیندار تھا۔ سرور کا خلد ایک معمولی دوکاندار تھا جس کی دوکان لوہے کے کباڑ خانے پر مشتمل تھی وہ روز حسرت زدہ انداز سے خاوند کا انتظار کرتی کہ کب دوکان سے چار پیسے کما کر لائے اور وہ ہانڈی روٹی کا انتظام کرے سرور دن بھر کپڑے دھوتی بچوں کو بیٹھتی اور خاوند کو زیر لب برا بھلا کہتی رہتی۔ بچے چپ چاپ حیران نگاہوں سے کبھی ماں اور کبھی بیٹیوں کی طرف دیکھتے۔

ایک کوٹھڑی میں خاوند اچلے کپڑے پہنے کوئی کتاب پڑھتی رہتی یا سرور کے بچوں کی طرف دیکھ کر ناک بھوں چڑھاتی۔ فیضہ کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اس گھر کی فروغ ہو۔ اس کے انداز میں نہ تو باپوسی تھی اور نہ بے نیازی اس دیرانے میں فیضہ ایک سرسبز خطے کی طرح تھی۔ اس کے ہاتھ حنا کے رنگ سے چمکتے تھے۔ اس کے ہونٹ مسکراہٹ سے کھلے رہتے۔ لہجوں پر کسی ناکسی ڈھولک گیت کی دھن نہ تھی۔ جب وہ ڈھولک کے ساتھ گاتی تو ایسا معلوم

جیسے بہار آگئی ہو۔

اوپر والی منزل میں انور اور اس کی بیٹی مینا رہتے تھے۔ ایک چھوٹے سے کمرے میں انور چولے کے سامنے بیٹھی دیوار کی طرف نکلتی رہتی۔ جیسے دیوار کے پار دور — بہت دور نہ جانے کیا دیکھ رہی ہو۔ اس کی لٹ جھٹک کر منہ پر آگرتی آنکھوں میں ان بے آنسو تھلکتے اور وہ بار بار آہ بھرتی اور ننھی مینا گڑیا تھا جسے کبھی ماں کی طرف دیکھتی اور کبھی دیوار کی طرف۔ یہ وہ مکان تھا جہاں لاہور میں اہلی کو قیام کرنا تھا۔

فیروز اہلی کا چھوٹا بھائی تھا۔ چھوٹے بھائی کی زندگی بسر کر رہا تھا۔ ابتدائی زندگی میں وہ محکمہ پولیس میں اچھے عہدے پر فائز تھا پھر شاید وہ مسلسل حکومت سے آگیا اور اس کے دل میں حکومت کی آرزو چٹکیاں لینے لگی یا شاید یہ سب راگ رنگ اور رقص کا اعجاز ہو۔ مسلسل عیش و طرب انسان کے دل میں نسائی آرزوئیں پیدا کر دیتا ہے۔ بہر حال اسے ایک رقامہ سے محبت ہو گئی اور ایک روز شراب کے نشے میں خود کشی کی عملی مگر ناکام کوشش کی وجہ سے وہ ملازمت سے برطرف کر دیا گیا اور بالآخر ظہور اس رقامہ کے چوبارے پر جا بیٹھا۔ بالی نے کئی ایک سال اس کی خدمت کی۔ پھر بالی کی اچانک موت پر وہ اپنی ہمیشہ کے گھر آنے پر مجبور ہو گیا تھا اور اب وہ سب اکٹھے ایک مکان میں رہتے تھے۔ فیروز خاموشی سے میز پر بیٹھا رہتا چارپائی پر لیٹ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔ لمحہ کمرے میں صابرہ بیٹھی تسبیح کے دانے کتنی رہتی اور کبھی کبھار ایک بے نیاز اور بے جلال قہقہہ لگاتی۔ ساتھ ایک نعرہ بھی ”داتا۔“ اس قہقہے میں بے نیازی اور زندگی تھی اس نعرے میں جذبہ اور جوش تھا۔ وقار سے بھرپور زندگی احترام سے بھرپور جذبہ۔

اوپر والی منزل میں انور ڈیڈبائی ہوئی آنکھوں سے دیوار کی طرف دیکھتی اور پھر آہ بھر کر کہتی ”اہلی تم نہیں جانتے ساس اور مندوں نے مینا کے ابا کو ہاتھ میں لے رکھا ہے اور میاں آپ بھی تو جانے کس منی کے بنے ہیں کہ انہیں کسی بات کا ہوش ہی نہیں راجہ اندر بنے بیٹھے ہیں۔ ہائے اہلی ماں باپ نے مجھے کہاں جھونک دیا۔ میری تو قسمت ہی پھوٹ گئی۔“ اس کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرتے اور وہ انہیں پلو سے پونچھ کر پھر دیوار کی طرف ٹٹکتی باندھ کر دیکھنے لگتی۔ اس پر ننھی مینا اور بھی سہم جاتی اور اُسے گڑیا کا کھیل بھول جاتا اور اہلی سوچنے لگتا یا اللہ یہ سب کیا ہے؟ یہ روٹی روٹی خوبصورت عورت، وہ سننے دیکھنے والا سرخ و سپید بزرگ، اور ایک

دوسرے سے بے خبر بے نیاز، ہمیش اور ان کے جلتے ہوئے بچے — وہ حیران ہوتا اور پھر سوچ میں کھو جاتا۔ پھر دفعتاً صابرہ کا قہقہہ گونجتا اور داتا کا نعرہ بلند ہوتا جیسے وہ غربت اور ان مصائب کا جو اس گھر پر مسلط و محیط تھے۔ تسخیر اڑا رہی ہو۔

فیروز کے مکان کے متصل بھتیجی رہتے تھے۔ جن کی لڑکیاں گایا کرتی تھیں۔ ان کے یہاں روز ایک نہ ایک قریب رہتی۔ نہ جانے کیوں۔ ہفتے میں دو چار مرتبہ ڈھولک بھتیجی اور عورتیں دیر تک گاتیں۔ جسے سن کر فیروز چپ چاپ پتھر کی طرح چارپائی پر پڑا رہتا اور صابرہ کی تسبیح اور بھی تیزی سے چلتی اور انور کے دوپٹے کا پلو بالکل ہی تر ہو جاتا اور خاور ناک سیکڑ کر کستی ”تہہ ہے کس قدر چینی ہیں یہ بھینٹیں۔ کیسا دواہیات حملہ ہے یہ۔“ اور فیض شوق سے شاہ نشین پر ہا بیٹھی اور ان کے گیت سننے میں محو ہو جاتی یا مسرور ہو کر چلانے لگتی ”ہائے آپا کیسی اچھی ڈھولک بجاتی ہیں یہ ہائے میں کیا کروں۔“

دھند کا

صبح سویرے ایللی منہ ہاتھ دھو کر کالج کی طرف چل پڑتا۔ لیکن نہ جانے کیا تھا اسے جلا جوں وہ کالج کے قریب پہنچتا اس کے دل میں ہول اٹھنے لگتے۔ دہلی دہلی گھبراہٹ ابھرتی اور اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ کالج کی طرف چلتے ہوئے ہر قدم پر اس کی حیثیت کم تر ہو جاتی۔ غم کہ کالج میں پہنچ کر وہ ایک ٹھنکنے میں بدل جاتا اور پھر چاروں طرف بڑے بڑے گلیور اس کے گرد گھومتے اسے گھورتے اور اس کا تسخیر اڑاتے۔ ایللی کی نگاہیں جھک جاتیں اس کا جی چاہتا کہ کہہ بھاگ جائے دور — بہت دور جہاں کوئی نہ ہو۔ جہاں کوئی اس کا تسخیر نہ اڑائے۔ کوئی نہ دھمکی نہ دے جہاں لوگ اس قدر اونچے لمبے اور بہت ناک نہ ہوں پھر نہ جانے کیا ہوتا اس کے گرد و پیش لایک دھند کا سا چھا جاتا اور وہ دھند کا ان گلیوروں کو ایللی کی نظروں سے چھپا دیتا۔ ان کے تسخیر بھرے قہقہے مدھم پڑ جاتے۔ پھر وہ دیکھتا کہ وہ بازاروں میں گھوم رہا ہے۔ ان جلا بازاروں میں۔ نئی نئی سڑکوں پر یہ دیکھ کر اس کے دل کو اطمینان سا ہو جاتا۔ جیسے اس نے اپنا اور اپنی زندگی محفوظ کر لی ہو۔ جیسے وہ کسی بہت بڑے خطرے سے نکل آیا ہو۔

اس کے باوجود اس کے دل میں ٹھنک سی لگی رہتی کہ وہ کالج میں حاضری نہیں دے گا۔ کلاسز انڈ نہیں کر رہا۔ بلکہ آوارہ گردی کر رہا ہے۔ گناہ کا ارتکاب کر رہا ہے۔ گناہ کا خیال

ہی اس کی نگاہوں میں دو حنائی ہاتھ لٹکنے لگتے اور وہ از سر نو مضطرب ہو جاتا۔ اس اضطراب سے مخلصی پانے کے لئے اس نے کئی ایک طریقے ایجاد کر رکھے تھے۔ وہ مونگ پھلی اور ریوڑیاں کمانے میں مصروف ہو جاتا لیکن مونگ پھلی اور ریوڑیاں ایسی چیزیں صرف وقتی مصروفیت بہم پہنچا سکتی تھیں۔ اس نے اس سلسلے میں سگریٹ کو بھی آزمایا تھا۔ مگر سگریٹ بھی مفید ثابت نہ ہوئے تھے الٹا وہ تو گلے میں کھرکھری سی پیدا کرتے تھے۔ جس سے اس کا اضطراب اور بھی بڑھ جاتا تھا ان سب باتوں سے اکتا کر سڑکوں پر بھٹکتے پھرنے سے تھک کر وہ کسی سینما ہل میں چلا جاتا اور چار آنے کا ٹکٹ خرید کر دو ڈھائی گھنٹے تک اسلمو اور پیڈرو بھلور کے کارنامے دیکھنے میں کھو جاتا۔ سینما ہل کا اندھیرا اسے لوگوں کی ٹولتی ہوئی جا بھتی ہوئی پریشانی کن نگاہوں سے محفوظ کر لیتا اور پھر اطمینان سے پیڈرو بھلور کا روپ دھار کر وہ بد معاشی کو پینتا اور بالا خر حنائی ہاتھوں والی حینہ کو گھوڑی پر چڑھا کر ہوا ہو جاتا۔

لیکن سینما سے فارغ ہو کر جب وہ گھر پہنچتا تو وہ حنائی ہاتھ شہ نشین کو تھامے ہوتے۔ جھکی جھکی نگاہوں سے وہ انہیں دیکھتا اور پھر چپ چاپ نگاہ اٹھائے بغیر چوبارے میں جا پہنچتا جہاں انور چارپائی پر بیٹھی فضا کو گھور رہی ہوتی۔

اسے قریب بیٹھے دیکھ کر وہ چونکتی۔ ”ہائے ایللی میری قسمت ہی پھوٹ گئی۔ کیا تھا اور کیا ہو گیا۔ ایللی — انہوں نے اس قدر ظلم کیوں کیا مجھ پر۔ میں نے ان کا کیا بگاڑا تھا۔“ اور وہ ٹپ ٹپ رونے لگتی۔

پھر صابرہ کے قہقہے کی آواز سنائی دیتی اور وہی نعرہ ”— داتا“ اور پھر متصل کوٹھڑیوں سے بھنگوں کی ڈھولک اور گیت کی آوازیں بلند ہوتیں۔ ”آگ ببل کے دھوئیں دے چ روواں لکواں دکھ جہاں دا۔ ہائے جہاں دا۔“

لاہور کی زندگی عجیب زندگی تھی۔ ایللی محسوس کرتا جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو۔ یہ عالم خواب چند روزہ ہو۔

وہ دھند کا جو اس نے اپنے گرد و پیش بکھیر رکھا تھا۔ اس کے لئے کس قدر اطمینان بخش تھا۔ کیونکہ اس دھند کے وجہ سے وہ دلخراش حقائق سے بیگانہ رہ سکتا تھا۔ لوگوں کی نگاہوں سے بچ سکتا تھا۔ لوگوں کو تو ہر آتے جاتے کو نگاہوں سے کریدنے کی بری عادت تھی۔ ایللی کے لئے سب سے بڑی مشکل لوگوں کی نگاہیں تھیں۔ بازار میں چلتے ہوئے اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ

دھندلی دھندلی تصاویر اسے اپنی آغوش میں پناہ دے دیتیں۔

پیڈرو بہادر

دیے تو اس زمانے کے لاہور میں بھی خوبصورت عمارات اور سڑکیں تھیں خوشنما دکانیں اور ہوٹل بھی تھے۔ اگرچہ تعداد میں بہت کم تھے۔ لیکن جس لاہور میں ایللی رہتا تھا وہ لاہور عظیم الشان عمارتوں پر بڑے بڑے ہوٹلوں اور دوکانوں سے سجے ہوئے بلقات اور خوبصورت سڑکوں سے قطعی طور پر خالی تھا۔ فیشن اہل علاقے میں جانے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس نے کئی ایک مرتبہ بڑی دوکان میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ مگر اس کا دل دھک دھک کرنے لگا اور پیشانی پینے سے بھیگ گئی تھی اور وہ چپ چاپ سر جھکائے وہاں سے چلا آیا تھا۔ مل روڈ پر جانا اس کے لئے قطعی طور پر ناممکن تھا۔ وہاں لوگ اکڑ کر چلتے تھے اور انہیں دیکھ کر ایللی محسوس کرتا جیسے اس کی ڈولتی ہوئی ناؤ کسی عظیم الشان جہاز سے ٹکرانے لگی ہو۔ وہ سہم جاتا۔ پنسری پر چڑھ جاتا اور پنسری سے اتر کر سڑک کے کونے پر سمٹ کر کھڑا ہو جاتا۔ سینما دیکھنے کے لئے وہ اس ہال میں جاتا جو عام سا ہو اور جہاں عام سے لوگ جاتے ہوں۔ جس کی عمارت عظیم الشان نہ ہو جس میں داخل ہوتے ہوئے وہ گھبراہٹ محسوس نہ کرے۔

اس زمانے میں لاہور میں صرف چار ایک سینما ہال تھے ایک بھائی دروازے کے باہر ایک ہیرا منڈی میں اور ایک شاہ عالی کے باہر اور یہ تینوں ہال معمولی اور گھٹیا قسم کے تھے جہاں وہ آسانی سے جاسکتا تھا۔

میکلوڈ روڈ اس زمانے میں ایک ویران سڑک تھی۔ جس پر ایک بیٹھی سی عمارت میں لیمرن سینما تھا۔ یہ عمارت اگرچہ چنداں عظیم الشان نہ تھی مگر وہاں جانے والے تماشائی قطعی طور پر مختلف تھے اور سینما کے ماحول سے انگریزیت اور فیشن کی بو آتی تھی۔ وہاں جانا ایللی کے بس کی بات نہ تھی۔ گیا تو وہ کئی ایک بار تھا۔ ایک روپے کا ٹکٹ خریدنے کے لئے ٹکٹ گھر تک پہنچ بھی تھا۔ مگر پھر وہی دھندلا چھا گیا تھا اور پھر جب وہ دھندلا چھٹا تھا تو وہ شاہ عالی گیٹ سینما کے ٹین ہال میں بیٹھا مسٹر آف مارہ دیکھتے ہوئے مونگ پھلی کھا رہا تھا۔ ان دنوں فلم خاموش ہوا کرتے تھے۔ ایک فلم مہینوں چلا کرتا تھا۔ کیونکہ اس زمانے میں سیریل فلم دکھائے جاتے تھے۔ ممکن ہے برٹ انشی چیوٹ اور ایپار ہال میں ایسے فلم بھی دکھائے جاتے ہوں جو

وہ اپنی لگتی ہوئی ہانہوں کو کیسے سنبھالے اور اکھڑی اکھڑی گردن کو کیسے قائم رکھے کہ لوگ اسے تسخیر نہ نہیں۔

چار ایک لوگوں کے قریب سے گزرتا یا ان کے پاس کھڑا ہوتا یا ان سے باتیں کرتا یا ایللی بے حد مشکل تھا۔ بازار کے لوگ تو خیر اکثر بے پروائی اور بے توجہی سے اس کے پاس گزر جاتے لیکن کالج کا ہر لڑکا اس کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگتا اور لڑکوں کے گرد اس کا گھیراؤ اڑاتے۔

اس زمانے میں کالج کے لڑکے بھی تو عجیب سے تھے۔ لڑکے معلوم ہی نہ ہوتے تھے۔ لگتا جیسے بڑے بڑے زمیندار اور رئیس ہوں۔ جو پنچائت کے اجلاس پر آئے ہوں۔

جب وہ گاؤں سے لاہور آتے اور پھر سٹیشن سے بورڈنگ تک تانگے میں پہنچتے تو عجیب منظر نظر آتا۔ تانگے کے پائیدان پر ان کا نوکر غلام علی۔ قلیا کریم بیٹھا ہوتا جو ایک ہاتھ تمباکو کا تھیلا دوسرے میں کھی کا پتہا تھامے ہوتا۔ چودھری سیٹ پر یوں اکڑنوں بیٹھا ہوتا جیسے رئیس بانگہ ہو۔ ایک ہاتھ سے مونچھ مروٹا دوسرے سے سر کھچاتا۔ سیٹ پر ایک طرف ہر کامرتیان ہوتا اور دوسری طرف فرشی حقہ جس کی نے بے حد لمبی اور چمکدار ہوتی تھی۔ ان کے قد اونچے لمبے ہوتے تھے۔ انہوں نے کالے اپکن اور بھاری بھر کم شلواریں پہنی ہوتی تھیں اور ان کے سر کی گچڑی کا طرہ گویا تانگے کی چھت کو اٹھائے ہوتا۔

اس کے برعکس ایللی کا چھوٹا اور پرانا کوٹ جو علی احمد کو الٹا کر بنایا گیا تھا۔ اس کی سسٹن مختصر سی پتلون اور معمولی سا جوتا۔ یہ تمام چیزیں صاف مانگے کی معلوم ہوتی تھیں اور ایللی کا قد اور پندرہ سال کی عمر۔ شاید انہیں باتوں پر کالج کے لڑکے اسے دیکھ کر ہنستے تھے۔ وہ نہ بھی ہنستے تو بھی ایللی کے لئے کالج جانا مشکل ہوتا کیونکہ اس کے دل پر کتنی کا احساس اور محیط رہتا تھا۔ جو اس نے اپنی والدہ سے ورثے میں پایا تھا اور جسے علی احمد کے گھر کے اندر نے پالا پوسا تھا اگرچہ یہ احساس کسی وقت دب بھی جاتا۔ لیکن مناسب وقت پر دفعتاً دل کوٹوں سے نکل کر اس پر زور کر دیتا اس وقت اس کی انبا کی ناؤ ڈولنے لگتی اور پھر وہ گما ہستی سے معدوم ہو جاتا۔ عین اس وقت اس کے گرد وہی دھندلا چھا جاتا جو اسے لوگوں کی رحم نگاہوں سے محفوظ کر لیتا تھا اور اس دھندلے میں گھومتا گھومتا وہ سینما ہال میں جا پہنچتا

صرف دس بارہ ریلوں میں ختم ہو جاتے ہوں۔ لیکن اس تفصیل کے متعلق ایلی کو کچھ معلوم تھا۔ بہر حال شہر کے سینما گھر میں بارہ پندرہ ایسی سوڈ دکھائے جاتے تھے۔ جن کے اختتام پر ہر کسی بہت بڑی مشکل میں پھنس جاتا تھا اور بد معاشوں کے زرنے میں ہیروئن اپنی عزت اور ہار بچانے کی خاطر ہیرو کی امداد کے لئے دعائیں مانگ مانگ کر اس کا انتظار کرتے کرتے بار کر مایوس ہو جاتی تھی۔

خاموش فلم دیکھنے میں ایک خوبی ضرور تھی۔ ہر چند ایک منٹ کے بعد چادر پر انگریزی پر مکالمے یا بیانیہ عبارت آجاتی تھی اور ہال کے پچھلے حصے سے سنگٹاٹ سی بلند ہوتی یہ مکالمے اور عبارتیں ایلی کے لئے واحد ذریعہ تعلیم تھیں۔ کیونکہ کلج میں لیکچر میں حاضر ہونا یا سبق حاصل کرنا اس کے لئے ممکن نہ رہا تھا نہ ہی اسے یہ معلوم تھا کہ جماعتیں کہاں بیٹھتی ہیں اور کون پروفیسر انہیں پڑھاتے ہیں۔

پہلے دو سال کے دوران میں ایلی کا نام کئی ایک مرتبہ کلج سے خارج ہوا لیکن ہر بار کسی کسی طرح علی احمد کو خبر مل جاتی اور وہ علی پور کے کسی عزیز کو اطلاع دے دیتے اور جلد ہی کلج کا کوئی بزرگ علی پور سے آپہنچتا اور دو ایک دن لمبے چوڑے لیکچر پلا کر اور ایلی کی فیس ادا کر کے واپس چلا جاتا اور ایلی کا نام ایک بار پھر کلج کے رجسٹر میں درج ہو جاتا۔ ایک مرتبہ تو خود علی احمد اسے داخل کرانے کے لئے آگئے اور انہوں نے ایلی کو لیکچر پلانے کی جگہ ایک اور طریقہ اختیار کیا۔ وہ باری باری ایلی کے تمام پروفیسروں اور کلرکوں سے ملے اور ایلی کو ان سب سے متعارف کرایا۔ پروفیسر حیران تھے کہ یہ کون لڑکا ہے کیونکہ انہوں نے ایلی کو جماعت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

اس واقعہ سے اتنا فائدہ ضرور ہوا کہ ایلی کی جھجک کسی حد تک دور ہو گئی۔ وہ دھندلا کلاب صرف کلج کے برآمدوں بیڑھیوں اور میدان تک محدود رہ گیا اور کلاس روم کا مطلع کھل گیا اب وہ بھاگ کر برآمدے سے گزرتا اور کلاس روم کی آخری بچ پر بیٹھ جاتا اور پھر جب جماعت ایک لیکچر سے فارغ ہو کر دوسرے کمرے کی طرف جاتی تو وہ پہلے ہی بھاگ کر کسی کونے میں جا کر ٹھہرتا تاکہ لڑکوں کی نگاہیں اس پر نہ پڑیں۔ لیکن اس کے باوجود حاضری کے رجسٹر سے اس کا نام کتنا بند نہ ہوا۔

طالب خیریت

خط لکھنے میں علی احمد کو کمال حاصل تھا انہیں ہر اس بات پر دلچسپی تھی جو لکھنے سے متعلق

ہو مثلاً گھر میں ان کے لکھنے کے سامان کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ علی احمد میز پر بیٹھ کر نہیں لکھ سکتے تھے۔ لکھنے کے لئے انہیں فرش پر بیٹھنے کی ضرورت پڑتی۔ ان کی دوات ہمیشہ تھالی میں رکھی ہوتی۔ قلم کی نیپیں گھس گھس کر اس قدر موٹی ہو جاتیں کہ دیکھنے والا شناخت نہ کر سکتا تھا کہ تحریر کلک سے لکھی گئی ہے۔ یا ریلیف کے نب سے لیکن علی احمد کو گھسی ہوئی نب سے لکھنے کا شوق تھا وہ ہر نئی نب کو گھس کر یا جانے کیسے موٹا کر لیا کرتے اور پھر اطمینان سے فرش پر بیٹھ کر لکھا کرتے اور اس شغل میں اس قدر کھو جاتے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہ رہتا۔ یہ تو محض اتفاق کی بات تھی کہ لکھنے کے سلسلے میں ان کی توجہ حساب کتاب اور تاریخ پیدائش و وفات اور شادی بیاہ تک محدود رہ گئی تھی۔ ورنہ اگر وہ تصنیف و تالیف کی طرف توجہ دیتے تو نہ جانے کیا نتائج ظہور میں آتے۔

خط لکھنے کے معاملے میں ان کی قابلیت کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ ایک تو خط میں وہ مناسب القابات اور معقول انداز تحریر کے شدت سے قائل تھے۔ ہر بات کو مناسب جزئیات اور حصوں میں تقسیم کرتے اور پھر باقاعدہ طور پر انہیں نمبر وار تحریر کرتے۔ ایلی اپنے خط میں چلاتا ”جناب والا! آپ نے ابھی تک خرچ نہیں بھیجا میں سخت تکلیف میں ہوں۔ کلج کی فیس ادا کرنا ہے۔ جسم پر کپڑا نہیں۔ جیب میں پائی نہیں۔ ازراہ کرم واپسی ڈاک خرچ بھیجئے تاکہ مزید ہے میں سخت تکلیف میں ہوں۔“

بواپسی ڈاک ان کا گرامی نامہ ایک کارڈ پر موصول ہوتا کیونکہ وہ لفافہ لکھنے کے قائل نہ تھے ”برخوردار الیاس تمہارا خط ملا۔ حالات سے آگاہی ہوئی یہ جان کر بے حد خوشی ہوئی کہ تم خیریت سے ہو اور خوش و خرم ہو۔ یہاں سب خیریت سے ہیں اور ہم سب تمہاری خیریت کی خبر کے طالب ہیں۔ علی احمد۔“

علی احمد کا خط پڑھ کر ایلی کے تن بدن میں آگ لگ جاتی۔ غصے میں وہ پھر سے ایک لمبا چوڑا خط لکھتا ”یہاں بالکل خیریت نہیں، حالات بالکل ناسامد ہیں۔ میں مرا جا رہا ہوں۔ میری خبر لیجئے اگر آپ نے خرچ نہ بھیجا تو نہ جانے کیا ہو جائے گا۔ بواپسی ڈاک خرچ روانہ کیجئے۔“

بواپسی ڈاک علی احمد کی طرف سے کارڈ موصول ہوتا۔ برخوردار تمہارا خیریت نامہ ملا۔ اسی طرح ہر دوسرے دن اپنی خیریت کی خبر بھیجتے رہا کرو تاکہ باعث فکر نہ ہو۔

اس زمانے میں ایللی کو علی احمد کی فنکاری کا احساس نہ تھا۔ ان خطوط سے محفوظ ہونے بجائے چڑ جاتا۔ اس کی وجہ غالباً یہ تھی کہ ایللی کو مضحکہ خیز باتوں پر ہنسا نہیں آتا تھا۔ وہ ایللی پر اپنا توازن کھو بیٹھتا تھا اس کی شخصیت میں توازن اور وضع داری سرے سے مفقود تھی۔

علی احمد ایللی کو خرچ ضرور بھیجا کرتے تھے اس کی ضروریات سے زیادہ بھیجتے مگر ایللی پر انہیں تنگ بخشی کی علت تھی وہ خرچ اقساط میں بھیجتے جس کا نتیجہ یہ ہوتا کہ وہ چلنے کی جیب میں اس امید پر اٹھائے پھر تاکہ دوسری قسط آنے پر فیس ادا کر دے گا۔ لیکن جب دوسری قسط موصول ہوتی تو پہلی خرچ ہو چکی ہوتی اور اسے تیسری قسط کا انتظار کرنا پڑتا۔ اس کے علی احمد کے خطوط سے جو دھند لکا پیدا ہو جاتا اسے صاف کرنے کے لئے بھی تو کافی خرچ ہوتا تھا۔ ان تمام باتوں کا نتیجہ یہ ہوتا کہ اس کے مالی حالات ہمیشہ بگڑے رہتے اور اس کا سینہ گندیریاں چوسنا مونگ پھلی اور ریوڑیاں کھانا اور بھی ضروری ہو جاتا۔

ان مسائل سے آگاہ ہو کر وہ انور کے پاس جا بیٹھتا۔ انور ہال کھولے آنکھیں بنائے دیکھ کر طرف گھورتے ہوئے کہتی ”ہائے ایللی کیا ہو گیا۔“ ایللی کا دل چاہتا کہ وہ بھی کسی سے عشق کی کر بیٹھ جائے اور علی احمد کے خطوط اور کالج کے دھندلکے سے نجات حاصل کر لے لیکن سمجھ میں نہ آتا کہ عشق میں انور کی یہ کیفیت دیکھ کر کیسے عشق لگائے اتنی کوششوں کے باوجود کسی سے عشق نہ لگا سکا تھا۔ کسی کے سامنے جا کر تو اس کی نگاہیں جھک جاتی تھیں۔ دل دھک کرنے لگتا تھا اور زبان بند ہو جاتی تھی۔ پھر عشق کیسے لگتا اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کرے۔

پھر اسے خیال آتا کیوں نہ نذیراں سے عشق لگا لوں۔ وہ نذیراں جو علی پور کی اس لڑکی ڈیورہ میں اس کا انتظار کیا کرتی تھی اور جب وہ داخل ہوتا تو کھلکھلا کر ہنس پڑتی ”توڑ میں ہوں۔ ایللی میں ہوں۔“ اور پھر ایک خوشبودار جسم اس کی طرف بڑھتا دوسرا آنکھ موٹے ہونٹ اور بھدا چہرہ اور وہ گھبرا کر بھاگتا۔

نہ جانے اسے نذیراں سے عشق کیوں نہ ہوتا تھا۔ نذیراں واحد لڑکی تھی جو اسے اس کی طرف ہاتھ بڑھایا کرتی تھی۔ باقی لڑکیاں تو اس کے وجود ہی سے منکر تھیں۔ اسے بھی کرتیں تو صرف ایک نگاہ غلط انداز ڈال کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتیں۔ مصیبت کہ ایللی کو ان لڑکیوں سے ڈر لگتا تھا جو اسے دیکھ کر آگے بڑھتی تھیں اور وہ تمام لڑکیاں

پاری لگتی تھیں جو اسے دیکھ کر فوراً منہ موڑ لیا کرتی تھیں۔ عجیب مصیبت تھی۔ اس مسئلہ میں اسے مشورہ دینے والا بھی تو کوئی نہ تھا۔ صرف ایک ارجند تھا۔ لیکن وہ تو اس معاملہ میں ایللی کی ہانک مدد کر سکتا تھا۔ وہ تو انگریزی مایاؤں کو ایک کھیل سمجھتا تھا اور لڑکیوں سے یوں کھیلتا تھا۔ جیسے وہ کھلونے ہوں انہیں لہاتا۔ چھیڑتا ان کا مذاق اڑاتا۔

اس کے برعکس ایللی ان کی عزت کرتا تھا۔ انہیں پاکیزہ سمجھتا تھا اور خاموشی سے ان کی پرستش کرنا چاہتا تھا۔ وہ عشق کو ایک بلند و بالا چیز سمجھتا تھا ایک ایسا تعلق جسے جسم سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ لیکن وہ تعلق کیسے قائم کیا جائے اس کے بارے میں اس کی سمجھ میں کچھ نہ آتا۔

دو سال کالج میں گزارنے کے بعد اسے معلوم ہوا کہ حاضر یوں کی کمی کی وجہ سے اسے امتحان میں نہیں بھیجا جاسکتا۔ یہ خبر سن کر گھبراہٹ تو ضرور ہوئی لیکن صرف اس خیال پر کہ علی احمد کو کیا جواب دے گا، ویسے دل ہی دل میں اس نے خوشی محسوس کی کہ امتحان کی مصیبت سے چھٹکارہ ہوا اور وہ فوراً گاڑی میں سوار ہو کر علی پور روانہ ہو گیا۔ امتحان کے لئے نام نہیں جاسکتا تو پھر لاہور میں رہنے کا فائدہ؟

والیسی

ایللی کے احاطے میں قدم رکھتے ہی محلے والیوں نے شور مچا دیا — ”کون آیا ہے؟“

”اے ہے ایللی ہے ہاں جی اپنی ہاجرہ کا بیٹا۔“

”اچھا ہاجرہ کا بیٹا آیا ہے اللہ زندگی دراز کرے۔“

”اب تو بمن باو صاحب بن گیا ہے۔“

”بڑا لائق لڑکا ہے یہ ہاں میں تو پہلے سے ہی جانتی تھی۔ اے ہے اوھر تو آڑکے شرما تو اس سے ہے۔ تیری خلائیں اور پھو پھیاں بیٹھی ہیں کوئی غیر تو نہیں۔“

”چلانی بڑا شرمیلا لڑکا ہے۔ بڑا اچھا ہے اور یہ محلے کے چھو کرے۔ توبہ طوفان مچا رکھا ہے۔ انہوں نے۔“

”ابھی پیدا ہو ہی نہیں پاتے اور شرارتیں پہلے ہی شروع کر دیتے ہیں۔“

”لیکن ایللی ان لڑکوں سانہیں۔“ ”اے ہے ہن“ ”چلانی بولی۔“ ”ہاں کے گھر کا چراغ اور وہ علی احمد وہ تو بمن اپنی ہی دھن میں لگا ہے۔ بس ہر سال نئی نویلی طے پرانی تو باسی ہو جاتی ہے

نہ جانے محلے میں جب بھی ایلی کی بات شروع ہوتی تو جلد ہی علی احمد اور اس کے تذکرہ کیوں چھڑ جاتا اور پھر لوگ مسلسل طور پر علی احمد کی باتیں کرتے رہتے جیسے ایلی کا محض علی احمد کی بات چھیڑنے کیلئے ایک بہانہ ہو یا محض ایک تمہید۔ محلے کی عورتیں جب بھی علی احمد کی بات چھڑتیں تو ایلی ان کی بات اور انداز میں عجیب تضاد محسوس کرتا۔ کہنے کو تو وہ علی احمد کے خلاف شکایات کرتیں اور ان کی بری عادت پر ہاتھ دھرتیں مگر ان کے انداز سے معلوم ہوتا جیسے وہ علی احمد کو سراہ رہی ہوں جیسے ان کی وہ خصوصیت بے حد پیاری ہو اور علی احمد کا شروع کرنے کے بعد وہ اسے جاری رکھنے پر مجبور ہوں۔ اسے برا بھلا کہتے ہوئے ان کی آنکھوں میں چمک لہراتی ہونٹ مسکراہٹ کی وجہ سے کھل جاتے اور ہلکی سی سرخی نہ جانے کہاں سے آ کر رخساروں پر جھلکتی۔ ایلی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ یہ کیسی نکتہ چینی تھی۔ کبھی کبھ اور کڑے کچھ اور سمجھاتی کچھ تھیں۔ اثر کچھ اور لیتی تھیں۔

ہاجرہ سے جب وہ ہمدردی جتائیں تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ وہ ہمدردی کے پردے پر درحقیقت اس پر ترس کھا رہی ہیں ”ہائے بچاری ہاجرہ۔“ اہل کبھی ”لیکن اس کو کیا پرول احمد جو چاہے کرے۔ اس کی بلا سے لگاتا پھرے عشق جہاں اس کا جی چاہے۔“

”وہ تو رنگیلا راجہ ہے۔“ دوسری مسکراتی۔

اس پر ایلی محسوس کرتا کہ جیسے وہ درپردہ ہاجرہ پر نفیس رہی ہوں اور علی احمد کی اس خاص خصوصیت پر پھولے نہ ساتی ہوں۔ اس مرتبہ ایلی نے پہلی دفعہ محلے والیوں کی اس دورانی شدت سے محسوس کیا۔ ایلی کے احساسات میں عجیب قسم کی گہرائی پیدا ہو رہی تھی۔ روز بروز زود حس ہوتا جا رہا تھا۔ ایسی باتیں اسے چھینے لگی تھیں۔

پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ محلے والیوں نے ان کا مذاق بنا رکھا ہے۔ انکا ہاجرہ۔ سستی ہمدردی جتنا درحقیقت اپنی عفت کا اظہار کرنے کا ایک ذریعہ تھا وہ ہاجرہ کے لئے کچھ کر سکتی تھیں نہ ہی وہ علی احمد سے شکایت کر سکتیں۔ شکایت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اہل انان کی یہ عادت پسند تھی۔ علی احمد کی شخصیت پسند تھی اور اخلاق کے متعلق تو وہ صرف فرمانا جانتی تھیں۔ یہ سوچ کر اس نے محلے والیوں کی باتوں سے اپنی توجہ ہٹالی۔

شریف کی وہ

اتفاق سے انہیں دنوں رخصت لے کر شریف علی پور آگیا اور وہ پھر سے شریف

مید شریف نے ایلی کی طرف دیکھا اور اپنی نیم وا آنکھیں ایلی کے چہرے پر گاڑ دیں۔ ایلی نے جیرانی سے شریف کی طرف دیکھا۔ اس سے بات کرنے کی کوشش کی مگر وہ دیے ہی چپ چاپ اس کے منہ کی طرف نکلتا رہا۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرنے لگا۔ جیسے اس کی نگاہیں چوٹیوں کی طرح اس کے جسم میں دھنسی جا رہی ہیں۔ اس کی نس نس میں ریگ رہی ہیں۔

شریف کے ہونٹوں پر تبسم چھلکا ”گھبرا گئے۔“ وہ بولا ”ابھی سے گھبرا گئے۔“ اور وہ پھر اس طرح ٹٹکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھنے لگا اس کی نگاہوں میں عجیب سی مستی تھی۔

”مجھے جانا ہے۔“ ایلی نے گھبرا کر ایک مرتبہ پھر اٹھنے کی کوشش کی۔

”تم نہیں جاسکتے ایلی۔“ شریف مسکرایا ”تم میری نگاہوں سے اوچھل نہیں ہو سکتے۔“

بیٹے رہتا ہو گا۔ میرے رویہ میری نگاہوں کے سامنے اور میں تمہیں دیکھتا رہوں گا۔ حتیٰ کہ میری آنکھیں پانی ہو کر بہ جائیں۔ تم نے اس کو دیکھا ہے؟ تم اس کے پاس رہے ہو۔ یوں ہی تم اس کے رویہ بیٹھا کرتے ہو گے اور وہ تمہیں دیکھا کرتی ہو گی۔ تم نے اس مکان میں دو سال بسر کئے جس میں وہ رہتی ہے۔ تم اس فضا میں سانس لیا کرتے تھے۔ کتنا خوش قسمت ہوں میں جو تمہیں دیکھ رہا ہوں۔“ شریف کی آنکھوں سے پانی بہ رہا تھا۔ مگر اس کی آنکھیں اسی طرح ایلی کو گھورے جا رہی تھیں۔ اس کے منہ سے حسب معمول رال بہ رہی تھی۔ چہرے پر حسرت دیاس کی دبیز تہ چڑھی ہوئی تھی اور وہ اپنی روئیداد کو جا رہا تھا۔

”کیا وہاں تن تنہا رہتی ہے۔ اتنی بھڑ میں تن تنہا رہتی ہے خالوں نے اسے وہاں قید کر رکھا ہے۔ انہوں نے اس کے بازو کٹ دیے اور وہ تڑپ تڑپ کر وقت گزار رہی ہے۔ اس نے تم سے کچھ کہا تھا میرے بارے میں۔“ ایلی رک گیا۔

ایلی کو نفی میں سر ہلاتے ہوئے دیکھ کر شریف نے لمبی آہ بھری ”وہ کسی سے بات نہیں کرے گی۔ انہوں نے اسے اس قدر ڈرا دیا ہے کہ وہ گھٹ کر مرجائے گی مگر کسی سے دل کی بات نہ کہے گی اور۔۔۔۔۔۔“ وہ جوش میں اٹھ بیٹھا ”یہ سب اس ڈائن کی شرارت ہے۔ جیسے تم داوی اہل کہتے ہو۔ اس خبیث بڑھیا کی۔ وہ ہم دونوں کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو گئی۔ اس نے وہ کھڑکیاں کیوں سے بند کر دیں جو اس طرف کھلتی تھیں۔ وہ روزانہ انٹوں سے بھر دے دیتے تھے۔ جن سے اس کی آواز مجھ تک پہنچ سکتی تھی۔“ شریف بولے جا رہا

رہا تھا۔ نہ جانے وہ اس سے کیا کئے والی تھیں۔

”ایلی۔“ وہ بولی۔ ”میری عزت تیرے ہاتھ میں ہے اگر تو میری بات مان لے تو میں سرخرو ہو جاؤں گی اور اگر تو نے انکار کر دیا تو بس سمجھ لے کہ آئندہ سے تو ماں کا نہیں باپ کا بیٹا ہو جائیگی۔“

ایلی حیران تھا اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ ماں کی عزت کیسے بچا سکتا تھا۔ آخر وہ کوئی بات تھی۔ جس پر ماں کی عزت کا دار و مدار تھا اور اس کی عزت ہی کیا تھی گھر میں۔ اس کی حیثیت تو نوکروں کی سی تھی۔ پھر عزت کی بات کرنا اور عزت بچانے کا سوال، ایلی کی سمجھ میں کچھ نہ آرہا تھا۔

ہاجرہ نے اس کے سامنے ہاتھ جوڑ دیئے۔ ”پھر تم جو چاہے کر لیتا ایلی اپنی بات پر قائم رہنا یا بدل جانا لیکن اس وقت ہاں کر دو اگر تم نے ہاں نہ کی تو تمہارے ابا تمہیں اپنے رشتہ واروں کی جھولی میں ڈال دیں گے اور تم مجھ سے دور ہو جاؤ گے۔“

”لیکن ماں یہ سب کیا ہے؟“ ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔ ”کچھ بتاؤ تو مجھے پتہ چلے۔“

”تمہارے بھلے کی کستی ہوں بیٹا۔“ وہ بولی ”اگر میں نے ابھی ابھی کچھ نہ کیا تو وہ نہ جانے کیا کر دیں گے۔ تو تو انہیں جانتا ہی ہے۔ وہ اچھے لوگ نہیں تو تو جانتا ہی ہے بیٹا۔“ یہ کہہ کر وہ رونے لگی۔

”لیکن بات کیا ہے ماں۔“ وہ گھبرا گیا۔

”تو وعدہ کرے گا تو میں بتاؤں گی۔“ ماں نے جواب دیا۔ ”بس سمجھ لے کہ تیری بہتری ہی کی بات ہے۔“

بھلا میں کوئی ایسی بات کر سکتی ہوں جو تیرے لئے اچھی نہ ہو۔ بس تو ایک بار ہاں کہہ دے۔“

”اچھا ماں جو آپ کی مرضی۔“ اس نے بات سمجھ بغیر ہی نکلتی سے نجات حاصل کرنے کے لئے کہہ دیا جو اس پر مسلط ہوئی جارہی تھی۔

”اللہ عمر دراز کرے۔ خوشی نصیب کرے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”میں جانتی تھی تو میری بات رد نہ کرے گا۔ میں جانتی تھی تو مجھے چھوڑ کر ابا کی طرف نہ جائے گا۔ تو دیکھ لہجہ تیرے لئے ایسی اچھی دوا سن چکی ہے میں نے جو لاکھوں میں ایک ہے۔ لاکھوں میں۔“

تھا اور ایلی حیران اس کے سامنے بیٹھا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ کیا کرے کس طرح اپنی ہمدردی کا اظہار کرے۔

دفعہ ”سعیدہ داخل ہوئی۔“ شرم نہیں آتی تھی۔ ”اس نے حنا ملیدہ ہاتھ لراتے ہوئے کہا۔“ اس بچے کو سامنے بٹھا کر روتے ہوئے شرم نہیں آتی۔ اس بیچارے کو کیا سنا رہا ہے تو قصہ۔ اسے کیا معلوم کیا ہوتی ہیں یہ باتیں۔ خواہ مخواہ کا پاکھنڈ بچا رکھا ہے۔ تو تو عورتوں سے ہو گیا۔ اے ہے مرد ہزاروں جگہ آنکھیں لڑاتے ہیں اور پھر اپنے اپنے دھندے میں لگ جاتے ہیں۔ مگر یہ میاں ہیں کہ مجنوں بنے ہوئے ہیں۔ چاہے دوسرے کو ذرا احساس نہ ہو۔ یہ اپنا ہلکان کئے جائے گا۔ جا ایلی تو اپنے گھر۔“ اس نے حنا ملیدہ ہاتھ سے اس کا منہ سلاتے ہوئے ”یہ میاں تو مجنوں بننے کی قسم کھائے ہوئے ہیں۔“

اس وقت ایلی کو سعیدہ کے ہاتھ کا لمس ناگوار گزرا۔ اسے شریف کے پاس سے چلے آئے سے دکھ بھی ہوا۔ لیکن اس دکھ میں خوشی کا دبا دبا عنصر بھی تھا۔ کیونکہ شریف کی باتیں سن کر اس کے دل میں جذبات کا ایک طوفان اٹھا ہو چکا تھا۔ جو اسے مضطرب کئے جا رہا تھا۔ وہ چاہتا کہ کہیں اکیلے میں جا کر رو دے۔ شریف کے دکھ پر نہیں بلکہ اپنے دکھ پر اپنی بد قسمتی پر کہ کسی سے محبت نہ کر سکا۔

ماں کا آنسو

اگلے روز جب وہ شریف کی طرف جانے کو تیار ہوا تو ماں نے اس کا بازو تھام لیا ”ایلی تم جا مجھے تجھ سے کچھ کہنا ہے۔“ ایلی گھبرا گیا۔ کیا ماں بھی شریف کے خلاف ہیں۔ کیا وہ بھی نیند چاہتیں۔ کہ میں اس سے ملوں۔

”ذرا ٹھہر جا۔“ ماں بولی۔ ”بیٹھ یہاں ابھی میں بھی چلتی ہوں تیرے ساتھ۔“ وہاں پہنچا سوچتا رہا نہ جانے ماں نے اسے وہاں کیوں بٹھایا تھا نہ جانے وہ اس سے کیا کہنا چاہتی تھیں۔ وہ تو ہمیشہ بات کہہ دیا کرتی تھیں۔ یوں تو انہوں نے کبھی نہ کہا تھا۔ ایلی ٹھہر جا مجھے تجھ سے کہنا ہے۔

کچھ دیر کے بعد ماں نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اسے نیچے لے گئی۔ چلی منزل میں اس ایک کمرے میں جا کر اندر سے کنڈی لٹکی پھر وہ ایلی کی طرف بڑھی۔ ایلی کا دل دھک دھک

اس پر رضائے ہنستے ہوئے چھپے ہوئے ایلی کی طرف دیکھا اور بظاہر بڑی سادگی سے با آواز بلند کہا ”اور چچا جی لڑکا بھی تو گدڑی میں لعل ہے۔“

”لیکن وہ چھپا کہاں ہے آج دکھائی نہیں دیتا۔“ چچا مسکرائے۔ ”تمہاری دوکان کی گدڑی میں تو نہیں چھپا ہوا۔“ چچا نے یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا کر پردہ اٹھا دیا اور ایلی کو چھپا دیکھ کر ہنسنے لگا۔ ”بہن! واہ ایلی تم یہاں چھپے ہو اور محلے میں تمہاری منگنی کے چرچے ہیں۔ واہ بھی واہ عجیب معاملہ ہے باپ شادی کا شوقین ہے اور بیٹا منگنی پر شرم کے مارے چھپا ہوا ہے۔“

ایلی کا دل دھک دھک کرنے لگا اور وہ سٹ کر پرانے ڈبوں کے انبار کے پچھے سرک گیا اور چچا ہنستے ہوئے چل پڑے۔

پھر رضائے شور مچا دیا۔ ”سن لیا گدڑی کے لعل اب چھپے ہی رہو گے کیا۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ رضا کو گالیاں دے لیکن گالی دینا اس کے نزدیک جائز نہ تھا۔ وہ گالی دینے کی جرات نہ رکھتا تھا ”بہت برے ہو تم۔ بہت برے جو راز کھول دیتے ہو۔“ وہ غصے میں چلا یا۔

رضائے قہقہہ مار کر ہنسنے لگا ”شریلو میاں راز تو ہوتے ہیں اس لئے کہ انہیں کھولا جائے اور لڑکیاں ہوتی ہیں اس لئے کہ انہیں پھانسا جائے آج تو تمہیں مونچھوں پر تاؤ دے کر چلنا چاہئے آج تم — لیکن تمہارے منہ پر مونچھ بھی ہو۔“

پھر کوئی محلے والی آنکلی ادھر ”ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے۔“ اس نے رضا سے کہا ”یہاں بیٹھا ہے تو اور تیرے دوست کی منگنی ہو رہی ہے آج تو تیری پانچوں سہیلیوں میں ہونی چاہیں ”نی الحال تو سری کڑھائی میں ہے۔ اہل۔“ رضائے سنجیدگی سے جواب دیا ”اے ہے۔“ اہل مسکراتے ہوئے بولی۔ ”بات کرنے سے نہ چو کے گا تو۔ ایک رگ زیادہ ہے نا۔ سچ کہا ہے کسی نے لنگڑے کی ایک رگ زیادہ ہوتی ہے۔“

”ایک نہیں اہل میں تو کئی زیادہ ہیں۔“ رضائے جواب دیا اور بڑھیا ہاتھ چلاتی آنکھوں سے گھورتی اور ہونٹوں سے مسکراتی چلی گئی۔

پھر ارجمند آکر چلانے لگا ”ارے لنگڑے کہاں چھپایا ہے اس گدڑی کے لعل کو۔ نہیں تائے گامالے تو دوسری بھی لنگڑی کر دوں گا۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔ لپٹنے کے لئے لنگڑی لاجواب ہے۔“ رضائے جواب دیا۔

”یہ لپٹن دپٹن سب نکال دوں گا بتا کہاں ہے۔“

میں اس سے بہتر لڑکی نہیں مل سکتی۔ کل تیری منگنی ہو جائے گی اور پھر تیرے ابا کے لئے ہاں ہو جائے گا کہ وہ تجھے اپنے رشتہ داروں کے باندھ دیں۔“

ایلی حیرانی سے اہل کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر اہل اس بات کو اتنی اہمیت کیوں دے رہی تھیں۔ اتنی سی بات کو اس قدر اہم کیوں سمجھ رہی تھیں۔ اس ذہن میں تو ان دنوں اس معاملے کی اہمیت نہ تھی۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق تھا جس پر اور ازدواجی زندگی کا کوئی مبہم نقش بھی مرقوم نہ تھا۔

”لیکن اہل۔“ اس نے بھد مشکل کہا ”میں مندی نہیں لگاؤں گا۔ میں انگوٹھی نہ پہنوں گا۔“ اس کے ذہن میں منگنی اور شادی کے متعلق سب سے بڑی مشکل مندی اور انگوٹھی تھی۔

”تو کچھ بھی نہ کیجیو۔ جیسے تیرا دل چاہے۔ میں کوئی رسم بھی نہ ہونے دوں گی۔ مجھے تو صرف تجھے نامزد کرنا ہے۔ تیرے ابا کے رشتہ داروں سے پچانا ہے اور میرا کوئی منہ نہیں۔“

چند دنوں کے بعد محلے کے چوگان میں علی پور کا بہترین بینڈ بج رہا تھا۔ ایلی اور کلثوم گھروں کے درمیان آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ عورتیں مرصع اور ریشمیں پہنے اپنے ادھر سے ادھر منک رہی تھیں۔ لڑکیاں لڑکوں کو دیکھ کر ”اوئی اللہ“ کہہ کر گھونکتی چھپ جاتیں۔ بوڑھیوں نے شاید تبسم کو چھپانے کے لئے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں محلے کی چودھرائیاں مٹھائی کے تھال اٹھائے گھر گھر لڈو بانٹ رہی تھیں۔ محلے میں منگنی بڑا مرتبہ بتاشوں کی بجائے موتی چور کے لڈو بانٹے جا رہے تھے اور ایلی اس ہنگامے سے دور رہنے دوکان کے پچھلے حصے میں چھپ کر بیٹھا ہوا تھا۔ اسے لوگوں کے رد و رد جاتے ہوئے شرم تھی۔ اس کے باوجود آتے جاتے لوگ رضا کی دوکان پر رک جاتے اور ایلی کی منگنی کی بات دیتے۔

منگنی

”بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے کیوں نہ ہو بھی اکلوتا بیٹا ہے اہل کی کوئی خواہش آج تک پوری نہیں ہوئی تو اسی ہمارے سہی۔ مطلب تو خوشی دیکھنا ہے نا بھئی۔“

”ہمیں کہیں ہو گا شرم سے منہ چھپائے ہوئے۔“ رضائے اشارہ کیا۔

”یہ پلٹن و پٹن سب نکال دوں گا جتا کہاں ہے۔“

”ابے تو یہاں ہے۔“ ارجمند اندر آکر بولا ”بس ٹاس کر دیا تو نے یہ لیبل لگا کے ستیا باں
میں۔ اینٹ الجھر کی قسم تمہاری اس حرکت نے سارا انکرائیڈی ختم کر کے رکھ دیا۔ اب نہ پریم
کام آئے گا نہ پریم سندیس اور نہ پریم پتر سب بدک کر بھاگ جائیں گی خیرے اس لیبل کو
کر۔ دوست تو ہمیں بھی لے ڈوبا آئے کے ساتھ گھن بھی پس گیا۔ چل میاں چھپ کے
بیٹھا ہے۔ چل وہ کپ کیپ اور کوری ڈوری جمع ہیں۔ بھی واہ کیا بچھن ہے چل اب پھس
تو پھر کن کیا۔ جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“

عین اس وقت جمیل آگیا ”چلو بھائی۔“ وہ چلایا ”کیا یاد کرو گے کہ دوست کی مفتی پر
کھلایا۔ آج جو جی چاہے کھاؤ۔ چلو تنگ گلی کے حلوائی نے تازہ پیڑے بنائے ہیں۔“
”ارجمند کو تو کپ کپ کی گئی ہے۔ چلو ہم تینوں چلتے ہیں۔“ رضائے شرارت سے
ٹانگ کی ہاکی جھلا کر کہا۔

”اچھا بھی اگر۔“ بچوں کی یہی مرضی ہے تو آج کے دن ہم بھی پیڑے کھا کر گزارہ کر
گے کیا کیا جائے۔“ ارجمند بولا۔

مجبوراً ایلی ان کے ساتھ چل پڑا مگر اسے رہ رہ کے خیال آتا کہ اگر کسی نے اسے
کھاتے ہوئے دیکھ لیا تو کیا کہیں گے لوگ کہ اپنی مفتی کی خوشی منا رہا ہے۔ بلکہ بنا کر اس
جست لگائی تاکہ رستے میں وہ اس کا مذاق نہ اڑائیں۔

ارجمند ہنسا ”بڑی بے صبری ہے بھی آج۔“ پیارے کو کیا معلوم کہ ابھی تو
سیٹ ریڑرو ہوئی ہے۔ ر۔ شمس گھڑی تو نصیب سے ملے گی۔“

رضا۔ ارجمند اور جمیل سے کئی کلاٹ کر وہ چھپتا چھپتا سیدھا شریف کے پاس
تاکہ وہاں اطمینان سے بیٹھ سکے۔ شریف اسی طرح منہ میں حقے کی لئے چھت کی طرف
رہا تھا۔ گھر کے سب افراد کلثوم کے یہاں تقریب منانے کے لئے جا چکے تھے۔ اس لئے
سنان پڑا تھا۔

”آگئے تم۔“ شریف مسکرایا ”مجھے معلوم تھا۔ تم آؤ گے۔ ان ظالموں نے تمہیں

دیا۔ تمہاری قسمت پر بھی مرثیت کر دی۔“ اس نے لمبی آہ بھری ”ان کی خوشی اسی میں ہے کہ
لوگوں کی تقدیروں سے کھیلیں۔“ ایلی کی سمجھ میں نہ آیا کہ وہ کیا کہہ رہا ہے۔ مفتی کرنے میں
تقدیر سے کھیلنے کی کیا بات تھی۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ دہی آواز سے بولا ”اماں نے تو مجھے صرف نامزد کیا ہے تاکہ ابا اپنے
رشتہ داروں کی بھولی میں نہ ڈال دیں۔“

”وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ ایلی وہ یونہی کہا کرتے ہیں۔ وہ یونہی بھولے نوجوانوں کو دام میں
پھنسا کرتے ہیں اور تم ان کے دام میں پھنس گئے ہو۔“

”نہیں۔ نہیں۔“ ایلی چلایا۔ اسے یہ جان کر صدمہ ہوا کہ شریف اسے بچہ سمجھتا ہے۔ ایلی
کی خواہش تھی کہ شریف اسے دوست سمجھے اور کھل کر اس سے باتیں کرے۔ اپنی زندگی کے
راز بتائے۔ یوں مشورے دے جیسے کہ دوستوں کو دیئے جاتے ہیں۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ بولا ”اماں نے میرے سامنے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کی آنکھوں میں
آنسو تھے۔“

شریف قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ حقے کی نے اس کے منہ سے نکل کر نیچے گر پڑی۔
”ماں کے آنسو۔“ وہ ہنسا قصائی کی چھری تو مفت میں بدنام ہے۔ وہ ذبح کرتی ہے ایلی مگر اس نے
کبھی روپ نہیں بدلا۔ اپنے آپ کو کسی اور شکل میں پیش نہیں کیا۔ لیکن ماؤں کے آنسو۔“
اس نے دانت بھیج کر کہا ”وہ اسی طرح ہاتھ جوڑتی ہیں۔ آنسو بہاتی ہیں اور پھر جب شکار پھنس
جاتا ہے تو اس پر سواری کرتی ہیں۔ ماں کے آنسو۔“ شریف نے ایک بھیانک قہقہہ لگایا۔

عین اس وقت سعیدہ آگئی۔ ”ہائیں تو یہاں بیٹھا ہے ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”خدا کے واسطے۔“
اس نے شریف کے آگے ہاتھ جوڑے۔ ”خدا کے لئے اب ایلی کی زندگی کو تباہ نہ کر۔ اپنی تو برباد
کر لی۔ اب اس پر رحم کر۔ تجھے نہیں معلوم خالہ کی تمام امیدیں اور امتگیں ایلی سے وابستہ
ہیں۔“ سعیدہ کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”میری طرف دیکھ۔“ شریف نے ایک دیوانہ وار
قہقہہ لگایا۔ کہنے لگا ”ماں کی آرزوئیں پوری ہوں۔ بہنوں کی امتگیں پوری ہوں مگر۔“ بات ختم
کے بغیر وہ خاموش ہو گیا اور چھت کی طرف گھورنے لگا۔

”تم نے اس کی ماں کے آنسو نہیں دیکھے۔“ سعیدہ غصے میں چلائی۔
”تمہارے بھی دیکھ رہا ہوں۔“ شریف نے مسکرا کر کہا ”کیا فرق پڑتا ہے۔“

بہاں کر چھپ جایا کرتے تھے۔ مگر ایللی کے لئے گویا وہ تیوری محض دکھاوے کی ہوتی تھی۔ تیوری ہونے کے باوجود وہ تیوری سختی کی حامل نہ ہوتی تھی اور ایللی اسے دیکھ کر ہنس دیا کرتا تھا لیکن اس روز داوی ایللی تیوری چڑھانے کے بغیر ہی گھور رہی تھی۔ جیسے اپنے آپ کو گھور رہی ہو۔ اپنی بے بسی پر تملارہی ہو۔

باہر بیٹنچ رہا تھا۔ دور کلثوم کے گھر میں لڑکیاں ڈھولک پر گیت گارہی تھیں۔
”نی متھار اچند در گاودی کنڈلاں والی او۔“

ایللی کی منسوبہ ثمرہ اس کی خالہ زاد بہن کلثوم کی لڑکی تھی۔ کلثوم کے گھر وہ اکثر جایا کرتا تھا اور دیر تک وہاں بیٹھ کر باتیں کیا کرتا تھا۔ اس دوران کئی بار ثمرہ بھی وہاں آتی یا ادھر ادھر کلام میں مصروف رہتی۔ اس کے باوجود اسے ثمرہ کی شکل و صورت کے متعلق کچھ اندازہ نہ تھا۔ منگنی کے روز ایللی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ اس نے ثمرہ کو کبھی دیکھا ہی نہیں۔ اس کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ ثمرہ کو غور سے دیکھے۔ کیسی ہے۔ لیکن کسی کے گھر جا کر لڑکی کو غور سے دیکھنا ایللی کے لئے ممکن نہ تھا۔ اسے نگاہ اٹھا کر دیکھنے کی جرأت نہ ہوتی تھی اور لڑکیاں بھی تو عجیب ہوتی ہیں پاس جا کر دیکھو تو یوں جزی سنبھال کر بیٹھ جاتی ہیں جیسے بے جان گڑیاں ہوں۔ دور سے کمری میں کھڑے ہو کر دیکھو تو مورتیوں کی طرح دم پھیلا پھیلا کر ٹانہتی ہیں۔ چڑیوں کی طرح پھدکتی ہیں۔ دور سے دیکھنے میں کس قدر لطف آتا تھا۔ لیکن قریب سے اب تو ثمرہ کو قریب سے دیکھنا بالکل ہی ممکن نہ رہا تھا۔ اب تو اس گھر میں پاؤں دھونا بھی مشکل تھا۔

ایللی کی نظر میں کلثوم کے گھر کے مناظر یوں چلنے لگے جیسے فلم چلتی ہے۔ دم پھیلا کر ٹانہتی ہوئی ثمرہ سرخی اور پاؤں سے تھپے ہوئے چہرے والی کلثوم جس کے گلے میں پھولوں کے ہار لٹکا کرتے تھے اور مرجھائے ہوئے چہرے والا رحم علی جو کلثوم کا خالوند تھا۔ جسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ مظلوم ہو۔ جیسے وہ کلثوم کا میاں نہیں بلکہ نوکر ہو۔ دفعتاً ایللی کی نگاہوں تلے روغنی چہرے والی ثمرہ گلے میں ہار ڈالے آکر چوکی پر بیٹھ گئی۔ اس کے اپنے چہرے میں تبدیلی رونما ہوئی۔ گل پچک گئے منہ پر جھریاں پڑ گئیں اور صورت رحم علی کی سی ہو گئی اور وہ ثمرہ کی چوکی کے قریب یوں جا کھڑا ہوا جیسے رحم علی ہو۔ ایک مظلوم فرد، نوکر، ایللی چونکا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”کیا ہے بچھے۔“ داوی ایللی چلائی ”انتا بے قرار کیوں ہے تو۔ لیٹ جا آرام سے۔ لیٹ جا“

”ادھر آ ایللی۔“ سعیدہ نے ایللی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچ لیا ”جا گھر جا۔ میں تیرا انتظار کر رہی ہے۔ یہاں بیٹھ کر کیا حاصل ہو گا بچھے۔ جا گھر جا۔“

ایللی چپ چاپ گھر کی طرف روانہ ہو گیا۔ اندھیری ڈیوڑھی میں وہ رکا باہر عورتیں باتیں رہی تھیں۔

”اچھا ہی کیا چاہی باجرہ نے جو بیٹے کو ابھی سے جکڑ لیا ورنہ بڑے ہو کر یہ قابو میں آسکتا۔“

”توبہ کر لڑکی کوئی زمانہ آیا ہے۔“

”پر میں کہتی ہوں چچی بات بگڑتی ہو تو بگڑ کر ہی رہتی ہے۔ چاہے جو کر لو آخر اس کے بیاہ بھی تو جھپٹپٹن میں ہی ہوا تھا۔ باجرہ سے۔ اب دیکھ لو اس نے کیا کر دکھایا۔“
”ٹھیک کہتی ہے تو غیب کی بات کون جانے پر میں کہتی ہوں آخر ہے اسی کا بیٹا۔ یہ کیا گل کھلائے گا۔“

ایللی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کونسی بات سچی تھی۔ ایللی کے آنسو یا شریف کا تفتہ۔ ڈیوڑھی سے نکل کر وہ چپکے سے داوی ایللی کے پاس چلا گیا۔ داوی نے اسے دیکھ کر تیرا چڑھالی۔

”اے ہے کہاں بھٹکتا پھرتا ہے تو۔ ادھر تیری ماں اپنا چاؤ پورا کر رہی ہے۔ آخر وہ تمہارا باپ ہے۔ اس کی رضامندی تو ہی ہوتی تیری ماں نے۔ رضامندی نہ سہی اس سے بات کیا ہوتی آخر گھر کے مرد سے بات کرنی ہی چاہیے تھی۔ باجرہ کی یہ سینہ زوری توبہ کیا زمانہ آیا ہے یہ دیکھ لو علی احمد کی چٹھی۔ میرے خط کے جواب میں کیا لکھا ہے۔ اس نے۔“ داوی ایللی۔
تحت سے چٹھی اٹھا کر اسے دی۔ بولی ”وہ تو لکھتا ہے ہمیں معلوم نہیں کہ ایللی کی منگنی ہو رہی ہے۔ کہاں ہو رہی ہے۔ ایللی کی ماں ہی جانتی ہوگی۔“ وہ اپنی مرضی کر رہا ہے یہ اپنی مرضی رہی ہے اور تو میرے لال تو خواہ مخواہ ان چکی کے پاؤں میں پسا جا رہا ہے۔ آ بیٹھ یہاں پاس۔ دیکھ تو میں نے تیرے لئے کیا منگوا لیا ہے۔ غضب خدا کا ادھر علی احمد آنکھیں دکھا رہا۔ ادھر یہ بی بی آنسو چھلکا رہی ہے۔ ابھی باب۔“

یہ پہلا دن تھا جب اس نے محسوس کیا کہ داوی ایللی پریشان ہے۔ اس کے ماتھے پر ہاتھ چڑھی ہوئی تھی۔ ویسے وہ گھورتی تو وہ روز ہی تھی۔ جب محلے کے لڑکوں، رگر جتی تھی تو وہ

”شادی“۔ وہ ہنسنے لگا۔ عجیب سی ہنسی تھی وہ اس میں مسرت کی بجائے دھمکی تھی خوفناک دھمکی جیسے وہ شادی کی بجائے انتقام لے رہا ہو۔ اس کے قہقہے میں ایک تسلسل پیدا ہوتا گیا خوفناک تسلسل اور آواز بتدریج بلند ہوتی گئی۔ اس قدر بلند ہو گئی کہ گھر کے سب لوگ بھاگ کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ”کیا ہوا کیا ہوا کیا بات ہے۔“ مگر شریف کسی کو جواب دیے بغیر اسی طرح قہقہہ مار کر ہنسے بارہا تھا۔ اس کی آنکھوں سے پانی بننے لگا تھا۔ منہ سے رال کے تار نکل رہے تھے۔ چرا سرخ ہو رہا تھا۔

”اب کیا محلے والوں کو تماشا دکھانا ہے۔“ سعیدہ چلائی۔ ”یا کوئی نیا کھیل ہے۔“
 ”اللہ رکھے اگلے ہفتہ برات لے کے جانا ہے۔ بہن شادی کی خوشی ہے ہنس لینے دو۔“
 رابعہ نے بات ٹالنے کے لئے کہا اور پھر ایللی کا ہاتھ پکڑ کر بولی ”آجھے دکھاؤں کیسے اچھے کپڑے بنوائے ہیں اس کی دولہن کے لئے۔“ وہ تھسٹ کر ایللی کو دوسرے کمرے میں لے گئی۔
 ”لیکن خالہ۔“ اس نے رابعہ اور سعیدہ سے پوچھا ”کہاں ہو رہی ہے شریف کی شادی؟“
 ”بہت دور“ رابعہ نے کہا ”بہت دور جہاں وہ نوکر ہے وہاں نہ جانے کیا نام ہے اس جگہ“

”مگر بہن۔“ سعیدہ نے کہا ”ہیں تو وہ خرم آباد کے رہنے والے نوکری نور پور میں کرتے ہیں ٹالڑکی کے ابا بہت بڑے افسر ہیں۔ غلام علی نام ہے۔“ دوسرے کمرے میں شریف کا قہقہہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ کھانسی رہا تھا جیسے تھک کر ہار گیا ہو۔

”دیکھا۔“ رابعہ نے زیر لب مسکرا کر کہا ”اکیلے میں سب ٹھیک ہو گیا۔ اب وہ کھانسی رہا ہے تم تو بہن اس کی دیوانگی کو اور بھی ہوا دیتی ہو۔“

”لو مجھے کیا معلوم کہ ایسی ہوتی ہیں یہ باتیں۔“ سعیدہ بولی ”میں ذرا جا کر دیکھوں۔“ ایللی نے دلی زبان سے کہا اور پھر چپکے سے شریف کے پاس جا بیٹھا۔ شریف آنکھیں موندے ٹیک لگائے چپ چاپ بیٹھا تھا۔

بمجرد رفتن اس کی نگاہ ایللی پر پڑی۔ ہونٹوں پر تبسم لہرایا ”شادی“ وہ مدھم آواز میں بولا ”اب شادی کیا ہوگی۔ جب شادی کی آرزو تھی۔ تب تو یہ سب میرے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے تھے۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ انور اور شریف کی شادی ہو سکتی نہیں ہو سکتی۔ خالوں نے مجھے قید کر لیا اور اسے شر سے دور نہ جانے کہا لے گئے۔ اب کیا ہے۔“ اس نے لمبی آہ

پھر ایللی کی نگاہوں تلے چچا ہنسنے لگے ”بڑی دھوم سے منگنی کی ہے ہاجرہ نے۔“
 ”ستیا ناس کر دیا۔ سوا ستیا ناس۔“ ارجمند چلایا۔ ”لیل لگا کے کیوں مری مٹی خراب ساری انگریزی ملیا میٹ ہو گئی۔“
 پھر ہاجرہ اس کے روبرو آکھڑی ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میری عزت ہاتھ ہے۔“

اچھا کیا پھٹپھٹن میں ہی جکڑ لیا۔ ”ایک عورت بولی۔“
 ماں کے آنسو۔ ہا ہا ہا۔ شریف کا قہقہہ سنائی دیا۔ ماں کے آنسو وہ تڑپ کر اٹھ بیٹھا۔
 ”کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ دادی اماں نے گویا شریف کی ہاں میں ہاں ملائی ہے تجھے۔“ وہ بولی۔
 دور لڑکیاں گارہی تھیں۔ ”بیٹھی بنجواں دے ہار پرواں۔“

تھیلی میں مینڈک

اگلے روز ہاجرہ ایللی کو اکیلے میں لے گئی۔ کہنے لگی ”شریف کی باتوں میں نہ وہ تو خواہ مخواہ تجھے گمراہ کر رہا ہے۔ لو کوئی بات ہے بڑا اپدیشک دیکھ لو۔ شادی کے خلاف کرتا ہے۔ بھلا خود کیوں اپنی شادی کروا رہا ہے۔ سعیدہ سے منتیں کیوں کرتا ہے۔ کیوں سامنے ہاتھ جوڑتا ہے۔“

”ہاتھ جوڑتا ہے؟“ ایللی نے حیرانی سے پوچھا ”وہ کس لئے؟“
 ”کہتا ہے میرا بیاہ کرادو۔ میں اپنا گھر بساؤں گا۔ دیکھ لو۔ خود تو اتنا چاؤ ہے دوسرا پالا اور تمہیں منگنی کے خلاف اکسار رہا ہے۔ توبہ کوئی حد ہوتی ہے زمانہ سازی کی۔“
 زمانہ سازی اور شریف۔ ایللی کو یقین نہیں آ رہا تھا ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔“ وہ اٹھ بیٹھا ”نہیں اماں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ چلایا ”پوچھ دیکھ تو اس سے چمک کر بولی۔“ میں کیا غلط کہہ رہی ہوں۔“

ہاجرہ کے جانے کے بعد وہ سیدھا شریف کے گھر پہنچا اور جاتے ہی بات چیت شروع کر دی۔
 شادی ہو رہی ہے کیا؟ اس نے شریف سے پوچھا۔
 شریف کے ہونٹوں پر زہر خند پھیل گیا جھست کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے

لوکے چوہن میں کھڑے ہو کر ریشمیں روہل ہلاتے ہلاتے اور بال ٹھیک کرنے کے بہانے سلام کرتے کرتے تھک جاتے مگر وہ یوں بے حس و حرکت کھڑی رہتیں۔ جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہوں چند ایک جن پر محلے کا اثر زیادہ نہ تھا لڑکوں کو دیکھ کر دوڑتیں بھاگتیں۔ ایک دوسری کو پکڑتیں۔ پلو جھکتیں۔ اسے سنبھالتیں سبھی کچھ کرتیں مگر اظہار محبت کرنا تو کیا انہیں پینالٹ محبت کو مناسب طور پر وصول کرنے تک کا شعور نہ تھا۔

جس دن سے شریف نے ایللی کو اپنا راز بتایا تھا اسی دن سے بیٹھے بٹھائے ایللی کی نگاہوں تلے ایک شوخ متبسم حینہ آکھڑی ہوتی۔ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتی اور ایللی کا جی چاہتا کہ وہ دلہیز سے باہر نکل آئے اور پھر تھیلی میں سلا ہوا مینڈک دھپ سے اس کے سینے پر آگرے اور وہ گہرا کر اٹھ بیٹھے اور فضا میں ایک مدھم مگر رنگین قلعہ یوں گونجے جیسے گھنٹیاں بج رہی ہوں۔

اس روز برات کے ساتھ نور پور جاتے ہوئے وہ غیر معمول طور پر خاموش تھا۔ کھڑکی سے باہر ٹیلے ٹیلے دوڑ رہے تھے۔ کبھی کوئی گہرا کھڈ منہ پھاڑے آٹھٹا جس کے تلے دور پانی کی ندی بہتی۔ پھر وہی ٹیلے اور ان پر یہاں وہاں خشک ٹنڈ منڈ درخت۔ ایللی کی نگاہیں اس گلابی افق میں کھوئی ہوئی تھیں جو اس کے اندازے کے مطابق ان کی منزل تھا اور وہاں گلابی متبسم چہرہ اسے دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

ڈبے میں بیٹھے ہوئے براتی اپنی باتوں میں گمن تھے۔ ہر چند منٹ کے بعد ایک قلعہ گونجتا۔ کسی پر آوازہ کسا جاتا اور ایللی چونک کر اودھ دیکھتا۔

ایک طرف محلے کے بزرگ تھے دوسری طرف جوان اور تیسری طرف اس کے اپنے ساتھی۔ ارجمند، رضا اور رفیق۔ ہر گروہ اپنے اپنے مشاغل میں منہمک تھا۔ صرف دو فرد اکیلے چپ چاپ بیٹھے تھے۔ ایک کونے میں شریف تھا جو مسلسل گاڑی کی چھت کو گھورے جا رہا تھا۔ دوسری طرف ایللی تھا۔ جو کھڑکی سے باہر کسی رنگین افق کو دیکھنے میں کھویا ہوا تھا۔ ممکن ہے۔ ریل کی چھت میں شریف بھی وہی رنگین افق دیکھ رہا ہو۔ ان دونوں کو منزل کا خیال لگا ہوا تھا۔ دونوں کے سینوں میں مینڈک کو در رہے تھے دونوں کی نگاہوں میں رنگین تبسم جھلما رہے تھے۔

ہر چند منٹ کے بعد غالباً اپنے تخیل اور محسوسات کی نوعیت سمجھ کر ایللی احساس ندامت سے گہرا جاکہ اس خیال پر ندامت محسوس کرنا کہ اپنے دوست کی بیوی کو ناک رہا ہے۔ محسوس کرنا کہ وہ مجرم ہے پھر گہرا کر لاجول پڑھتا اور کسی اور بات کی طرف متوجہ ہونے کی ناکام کوشش

بھری۔ ”یہ سمجھتے ہیں میں شادی کر رہا ہوں۔ ان کو کیا معلوم ایللی۔ ان میں احساس نہیں سمجھیں گے۔“ پھر وہ ایللی کے قریب تر ہو گیا اور راز دارانہ انداز میں بولا ”انہیں نہیں معلوم ایللی کہ میں صرف اس لئے شادی کر رہا ہوں کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی بچاؤ جیسے میری زندگی تباہ ہوئی تھی اور وہ کتنی معصوم ہے تم دیکھو گے تو اندازہ ہو گا تمہیں اس کو کیا معلوم کہ محبت کسے کہتے ہیں۔“ شریف نے جھرجھری لی۔ ”نہ جانے اسے کیا نظر آیا مجھ میں۔ نہ جانے اسے کیا خوش فہمی ہے۔ کاش وہ کسی جیتے جاگتے نوجوان کو چنتی۔ مجھ ایسے شخص میں اب کیا رہ گیا ہے۔ جو تھا وہ لوگوں کے ظلم کی بھینٹ چڑھ گیا۔ اب کیا دھرا ہے؟ اسے کون سمجھائے۔ جو ابھی دلہیز پر کھڑی مسکرا رہی ہو اسے کیا معلوم کہ زندگی کیا چیز ہے جانے محبت نے اس پر کیا جالو کر دیا ہے۔ واقعی ہی وہ شہزادی ہے۔ اسم با مسمیٰ ہے۔ چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلہیز سے باہر آگئی۔ میرے روبرو اور اس ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔“

”مینڈک کے ذریعے محبت۔“ ایللی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”اسے مینڈک کو ایک تھیلی ہی رکھا تھا جب میں سو رہا تھا تو اس نے وہ تھیلی مجھ پر پھینک دی۔ میں ڈر کر اٹھ بیٹھا وہ لگی۔“ شریف نے ہنسنے ہوئے کہا ”محبت بھی اظہار کے انوکھے طریقے پیدا کرتی ہے۔ انوکھے وہ رک گیا اور طویل خاموشی کے بعد بولا ”مجھے اس کی محبت کا احترام ہے اسے تو شاید میں دیتا۔ مگر محبت کو کیسے ٹھکرا سکتا ہوں۔ میں نے خود محبت کی ہے۔ میں جانتا ہوں کہ محبت کیا ہے۔ عجیب چیز ہے محبت۔ عجیب، تم محبت کرو ایللی۔ کسی سے کرو مگر محبت کرو۔“ اس نے ایللی کی طرف طویل آہ بھری اور خاموش ہو گیا۔

آٹھ روز کے بعد وہ سب برات لے کر نور پور جا رہے تھے۔ اس انوکھی لڑکی کو وہاں کے لانے کیلئے جس میں اتنی جرأت تھی کہ گھر کی دلہیز سے باہر نکل کر شریف پر مینڈک پھینک سکتی تھی۔ وہ لڑکی جسے ایسا انوکھا اظہار محبت سوجھ سکتا تھا۔

محلے میں تو ایک بھی لڑکی ایسی نہ تھی جس میں مذاق کرنے کی صلاحیت ہو یا جس کی جرأت ہو۔ انہیں تو دبے پاؤں چلنے۔ چھپ چھپ کر جھانکنے اور منہ پر پولے کر مسکرانے۔ سوا کچھ نہ آتا تھا۔

چوڑائی اور لمبائی عام پلیٹ فارموں سے کئی گنا زیادہ تھی۔ سٹیشن کے احاطے کے چاروں طرف قد آدم فسیل تھی۔ جس میں ایک پھانک لگا تھا۔ جس سے ریل اندر داخل ہوتی ایک طرف سرخ رنگ کا ایک اونچا قلعہ بنا ہوا تھا جس کی دیواروں میں ہندو کی تالیوں کے لئے سوراخ چھوڑے ہوئے تھے۔ دوسری جانب سٹیشن کے شاف کے رہائشی کوارٹر تھے۔ بیٹھے بیٹھے سے معمولی کوارٹر اور قلعہ کے پیچھے اونچے سیاہ پہاڑا۔ ستادہ تھے۔

ایلی نے تعجب سے چاروں طرف دیکھا۔ پھر اس کی نگاہیں ان کوارٹروں کی طرف مرکوز ہو گئیں۔ اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا جیسے کھڑکیوں اور دروازوں کے پیچھے مینڈکوں سے بھری ہوئی تھیلیاں رکھی ہوں۔

باہر سٹیشن کے احاطے میں کوئی ایسی جگہ نہ تھی جہاں سے مینڈک دستیاب ہو سکتے ہوں۔ مینڈک کیا وہاں تو تلاب یا چھپر کا نام و نشان تک نہ تھا۔

پھر وہ ایک بہت بڑے کمرے میں کھانا کھا رہے تھے۔ بھنے اور تلے ہوئے مرغ مسلم رکابیوں میں پڑے تھے۔ قسم قسم کے چاول اور گوشت۔ وہ حیرانی سے ان بھرے قابوں کی طرف دیکھ رہا تھا جو گوشت سے لدے ہوئے تھے۔ علی احمد قلعہ مار کر ہنس رہے تھے۔ محلے والوں کی باجیس کھلی ہوئی تھیں اور شہزاد کے والد کی آنکھوں میں گویا پھلجھڑیاں چل رہی تھیں۔

”کیا جوڑی ہے۔“ پچھا چلانے لگے۔ ”بھائی غلام علی اور علی احمد کی واہ وا۔“

”وہ کہتے ہیں نا“ کسی نے آواز دے کر ”ساجن سے ساجن ملے کر کر لے باتھ۔“

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر بھائی غلام علی۔“ علی احمد ہنسے اور پھر مسلم مرغ پر چل پڑے۔

پھر ایک نوکرانی آکر چلانے لگی ”ایلی کو اندر بلایا ہے۔“ اندر بلا رہے ہیں ایلی کو۔ ایلی کو اندر بلایا ہے۔ چاروں طرف سے آوازیں سنائی دینے لگیں۔ ایک بھیانک دف بجتے لگی۔ ایلی کی رگوں میں کوئی دھمکی بجانے لگا تھا ہوں میں ارد گرد کی چیزیں دھندلا گئیں۔

اندر جاتے ہی نہ جانے اسے کیا ہوا اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ حلق آواز سے خالی ہو گیا۔ بازو لٹکتے لگے۔ چاروں طرف سے جھنجھٹا ہٹ سی سنائی دے رہی تھی مگر وہ گردن نہ اٹھا سکتا تھا۔ ”لے علی احمد کا ایلی ہے“ محلے والی کی مکروہ آواز سنائی دی۔

”اچھا بس بیٹا رہے۔“ دو بڑے بڑے ہاتھوں نے اس کے سر کو گرفت میں لے لیا اور پھر

کرتا۔ پھر دفعتاً اس کے تخیل میں شہزادی پیچھے ہٹ جاتی اور اس کی چھوٹی بسن آگے بڑھتا۔ شاید اس میں بھی دہلیز پار کرنے کی جرات ہو۔ شاید اسے بھی مینڈک پھینکنے سے دلچسپی ہو۔ خیال پر وہ اطمینان کا سانس لیتا اور پھر سے اپنے رنگین خواب میں کھو جاتا۔

ایلی کے ذہن میں ایک نئی امید کروٹ لے رہی تھی۔ ایک نئی دنیا ابھر رہی تھی۔ سامنے ٹیلے کی اوٹ میں مینڈکوں کی جھیل کے کنارے ایک دو شیزہ اسے دیکھ کر مسکرائی۔ اشارے کرتی ایلی کے جسم پر چوٹیاں رینگتیں سینے میں مینڈک پھدکتے اور دل میں نہ جلا کیا ہوتا۔

شریف بھی بار بار چونکتا جیسے وہ بھی خود کو مجرم سمجھ رہا ہو۔ جب وہ اس رنگین منظر خیال میں کھویا ہوا ہوتا تو ایک سوگوار چہرہ اس کے روبرو اکھڑا ہوتا۔ ستا ہوا منہ کھلے پیر ہونٹوں پر زہر خند۔ اسے دیکھ کر شریف کو احساس ہوتا کہ وہ انور سے بے وفائی کر رہا ہے۔ کی زندگی تباہ کر کے خود رنگین افق آہو کر رہا ہے۔ اس خیال پر وہ گھبرا جاتا۔ پھر اس کی آنکھ میں حزن و ملال کی گھٹائیں ابھرنے لگتیں دل سے آواز بلند ہوتی۔ نہیں نہیں میرا کیا ہے۔ سب تو اس لئے ہے کہ اس کا دل نہ ٹوٹے۔ اس کی زندگی تباہ نہ ہو۔

براقی دولہا میاں کی حالت کو دیکھ کر مسکراتے۔

”دیکھ لو بھئی یہ دولہا میاں ہیں یوں اپنی برات لئے جا رہے ہیں۔ جیسے کوئی دار پر چڑھا ہو۔“

علی احمد قلعہ لگاتے ”میاں دار ہی تو ہے۔ اس حقیقت کو کوئی کوئی سمجھتا ہے۔“

جوان قلعہ لگاتے ”جیسی تو علی احمد دار پر چڑھتے چڑھتے نہیں جھکتے۔“

نوجوان چھپ چھپ کر مسکراتے سرگوشیاں کرتے اور پھر ارجمند با آواز بلند کہتا ”میل“

تم تو یوں بیٹھے ہو جیسے کوئی دار پر چڑھنے والا ہو۔“

”کیوں میاں اسے شوق نہیں کیا۔ بیٹا کس کا ہے۔“

اور سب علی احمد کی طرف دیکھ کر ہنسنے اور گاڑی چیختی چلاتی ہوئی دوڑے جاتی۔

بالآخر ایک وسیع و عریض پلیٹ فارم پر گاڑی رک گئی۔ ”لو بھئی نور پور آگیا۔“

ایلی کا دل اچھل کر حلق میں آ پھنسا۔

وہ ایک عجیب سا سٹیشن تھا۔ جیسے ایک وسیع و عریض ریس کورس ہو۔ پلیٹ فارم

نہ جانے ایسا کیوں ہوتا تھا۔ کیوں جب وہ منزل پر پہنچتا تو اس کے پاؤں میں چلنے کی سُر رہتی۔ اس کے بازو شل ہو جاتے۔ نگاہیں احساسِ ندامت سے دھندلا جاتیں۔ ایسا کیوں قلم جب وہ تنہیلے میں اپنے تخیل کی دنیا میں واپس پہنچتا تو اندھے کی طرح منزل سے چٹ ہا اس کی گرفت میں دیوانگی کا عنصر پیدا ہو جاتا تھا۔

مونگیا گٹھڑی

— پھر وہ نور پور سے واپس آرہے تھے اور ایللی احساسِ ناکامی کی وجہ سے خاموشی اس کے تخیل کے پر گویا کٹ چکے تھے۔ بازوؤں میں طاقت پرواز نہ رہی تھی۔ اس کے ملے کوئی افق نہ تھا۔ مٹا لے ٹیلے۔ ٹنڈ منڈ درخت اور پھیلی ہوئی ویرانی۔

پھر ارجمند اسے جھنجھوڑ رہا۔ ”ابے او مردے۔“ وہ چلایا۔ ”تو پہلے ہی فوت ہو گیا بدادہ ہوا۔ ورنہ آج ہماری طرح حرام موت مرتا بیچ گیا یار۔ تو ہمیشہ ہی بیچ جاتا ہے۔“

ارجمند کی بات سن کر ایللی حیران ہوا۔ ارجمند نے تو کبھی ایسی بات نہ کی تھی۔ اس کے اندر میں کبھی مایوسی نہ دیکھی تھی۔ پھر اسے کیا ہوا۔ وہ یوں سر کو ہاتھ سے تھامے بیٹھا تھا۔ جیسے قلم طور پر تباہ ہو چکا ہو۔

”بیٹا ہمارا تو کلیان ہو گیا۔“ وہ دلی آواز میں بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بات۔“ ارجمند ہنسا۔ ”دیکھ لو رفیق کی آنکھوں میں۔ دیکھ لو وہ بات۔ دیکھ لو کیا بتی ہم یار ہم اس لائق تو نہ تھے۔“ ایللی نے رفیق کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں گویا ہیر ہیر ریگ رہی تھیں۔

”ہے ہے۔“ ارجمند بولا ”بس سمجھ لو وہ منظر جو کپ نے چھ سال کے بعد جھلک کر دکھا آج دیکھ لیا ہے میں کیا کروں۔“ اس نے لمبی آہ بھری۔ ”اب تو یہی ہے کہ چوہے کی طرح نکلوے کو کترتے رہیں۔“ یہ کہہ کر اس نے جیب سے سوکھے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا نکالا اسے کترنے لگا۔ پھر ایللی کی طرف دیکھ کر کہنے لگا ”ہے ہے دے تو دوں تجھے بیٹا مگر جو ڈال توڑ کر کھائے میں بات ہے وہ کہاں اور پھر اپن کے یہ ہاتھ بھی دیکھ لے جیسے کوہڑی کے ہوں!

وہ ہاتھ جن سے اس بھکاری کو یہ ٹکڑا ملا ہے۔ ہے ہے۔ اچھا چل تو بھی کرے دیوی کے درشن۔ کیا چڑ ہے خدا کی قسم۔ آتو بھی کیا یاد کرے گا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر ڈبے سے باہر لے گیا اور پھر لمحہ زندہ ڈبے میں اسے زبردستی ٹھونس کر چلائے لگا ”یہ آیا ہے ایللی خالہ سعیدہ کستا ہے میں خالہ سے ملوں گا۔“

”آئی ایللی“ خالہ بڑے تپاک سے بولی ”میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔ یہ ایللی ہے۔ میری خالہ باجرہ کا بیٹا۔“ اس نے مونگیا گٹھڑی سے کہا جو پاس ہی سیٹ پر دھری تھی۔

مونگیا گٹھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیکے ہوئے ہاتھ ایللی کی طرف لپکے۔ تازہ خون کی بو کا ایک ریلا آیا۔ ایللی بھاگنے کی سوچ رہا تھا کہ گٹھڑی کے پٹ کھل گئے۔ دو گلابی جھیلیں چھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ سارے منہ پر چٹکی ہیر ہوئیاں ریگ رہی تھیں۔ پھر ایک چھلکا ہوا تبسم۔ ایللی کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ گرد و پیش جھلکا کر معدوم ہو گیا۔

سعیدہ نہ جانے ہاتھ ہلا ہلا کر کیا کہہ رہی تھی۔ باہر پلیٹ فارم پر ارجمند آنکھ بچا کر چھاتی پیٹ رہا تھا۔ رفیق رشمیں رومال ہلا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں میں بوند باندی ہو رہی تھی۔ پرے علی احمد حسب دستور کولہوں پر ہاتھ رکھے ڈبے پر نگاہیں گاڑے کھڑے تھے جیسے کوئی چیل پر تول رہی ہو۔ ان کے قریب ہی صفدر انگلیوں میں سگریٹ تھامے چٹکی بجا بجا کر گنگنا رہا تھا۔ ”اے دلربا میں ہوں فدا۔“ ایللی خاموش کھڑا تھا۔ نہ جانے کب تک ویسے ہی کھڑا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ کب مونگیا گٹھڑی کے پٹ بند ہوئے۔

پھر اسے کچھ پتہ نہ تھا کہ کھڑکی کے باہر ٹیلے بھاگ رہے تھے۔ یا سرسبز میدان پھیلے ہوئے تھے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ لوگ باتیں کر رہے ہیں یا نہیں رہے ہیں۔ دل میں ایک شور برپا تھا۔ رگوں میں لہرس اٹھ رہی تھیں۔ سینے میں دھکیلی بیج رہی تھی۔ سامنے ایک لق و دق ویرانہ پھیلا ہوا تھا اور اس ویرانے میں ایک مونگیا گٹھڑی پڑی تھی۔ اور دو خون آلود ہاتھ — اور گاڑی ہوکتی ہوئی جا رہی تھی۔

شہزاد

محلے میں شہزاد کی آمد یوں اثر انداز ہوئی جیسے جوہڑ میں پتھر گرنا ہے۔ محلے کے بند پانی میں دھاروں طرف چھیننے اڑے جیسے سوڈے میں کسی نے نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔ پھر لہرس جوہڑ کے

طول و عرض تک دوڑ گئیں۔

عورتوں نے اسے دیکھا اور ہونٹوں پر انگلیاں رکھ کر خاموش ہو گئیں۔ بوڑھوں نے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا۔ مردوں کی آنکھیں پٹی رہ گئیں۔ بوڑھے اسے دیکھ کر چپ چاپ مسجد کی طرف چل پڑے اور وہاں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے لگے۔

محلے کے بڑوں میں صرف دو رنگیلے آدمی تھے جو عمر میں بڑے ہونے کے باوجود خیر مزاج تھے اور زندگی میں لہریں پیدا کرنے کے قائل تھے۔ علی احمد اور محمد اعظم، انہیں لڑا پڑھنے۔ گردن جھکانے کھانے یا مسجد میں جا کر سبحان اللہ کا ورد کرنے سے قطعاً دلچسپی نہ تھی منہ سے گنگنائے کی بجائے سبحان اللہ، ان کی آنکھوں میں منعکس ہو جاتا۔ جھجک کر پیچھے ہٹ جانے کی بجائے وہ آگے بڑھ کر کوئی بات چھیڑ دیتے۔

”لڑکی تو اداس تو نہیں ہو گئی یہاں آکر۔“ محمد اعظم مسکراتے۔ ”گھبرا نہیں دل لگ جا گا۔“ اور پھر ان کی نگاہوں سے ظاہر ہوتا کہ دل لگ کر سب ٹھیک ہو گیا ہے۔

صبح سویرے ہی محمد اعظم آہنچتے۔ ”کیوں شزاؤ کچھ پکانے کھانے کا بھی فکر ہے یا نہیں۔“ خولی شزاؤ کی نہیں چلے گی یہاں، بول کیا منگوانا ہے بازار سے۔ ہائیں بیٹنگن کھائے گی۔ آج بیٹنگن اونٹوں بیٹنگن نہیں کھایا کرتے گرمی ہو جاتی ہے۔ اچھا شریف کو کھلائے گی بیٹنگن۔ اس طرح کب تک گزارا ہو گا۔“ اور وہ قہقہہ مار کر ہنستے۔ ”اچھا چائے کا پیالہ تو پلا ایک کیکشن ادا کرنے کے بغیر نہیں لایا جاتا سمجھی، ہائیں تو بروک بانڈ پیتی ہے۔ اونٹوں لڑکی چاہی۔“ اور ان کی متبسم نگاہیں کسی رنگین پیالی سے لپٹ جاتیں اور انداز سے معلوم ہوتا جیسے بیٹنگن کھا کے آئے ہوں۔

محمد اعظم کا طریق کار گھریلو انداز کا حاصل تھا۔ ان کی باتوں میں اپنا لینے کا پہلو واضح ہوتا تھا۔ کر کے پہلو بدلتے۔ پہلو بدل کر پھر بات کرتے اور اس دوران میں نگاہوں سے جانچتے۔ اسلئے علی احمد چل کر جانے کے قائل نہ تھے نہ انہیں سودا لا کر دینے کی بات پسند تھی اور نہ ہی چائے کا پیالہ مانگنے کے قائل تھے۔ ان کی باتوں میں اشارت کا پہلو ہوتا تھا۔ وہ دور کھڑے چل چیل کی طرح منزل لاتے پھر آواز دیتے۔ باتوں سے رجھاتے اور تمام تر بات زبان کی مدد سے نگاہوں ہی میں طے کر لیتے اور بالا خرہ برسمیل تذکرہ آواز دیتے۔ ”میں نے کہا چاچی۔ آجائیں گے بچا۔ مسجد ہی میں گئے ہیں تو کیوں پریشان ہو رہی ہے۔“ اور جب چاچی ہنس کر

جھپٹ کرتی تو کہتے میں نے کہا۔ یہ شریف کے گھر کی کھڑکی میں کون کھڑی ہے۔ کوئی اندھی سہی معلوم ہوتی ہے نہ سلام نہ دعا نہ بات نہ چیت — اچھا تو تو ہے شزاؤ میں سمجھا شاید اندر ہمیں جلا رکھا ہے۔ تو آئی نہیں کبھی۔ دکھائی ہی نہیں دیتی۔ نہ جانے کن مشاغل میں کھوئی رہتی ہے۔“

علی احمد شزاؤ کی آواز سنتے تو غصہ کے چوبارے سے لمحہ جھنگے میں نکل آتے اور غصہ کو یوں آواز دیتے جیسے غصہ سے بے حد ضروری کام پڑ گیا ہو۔ جب سے شزاؤ نے محلے میں قدم رکھا تھا علی احمد کو بار بار غصہ سے کام پڑ رہا تھا۔ گھر کے تمام لوگ ان کے اس ضروری کام کی نوعیت سے واقف تھے۔ ایسے وقت سیدہ گھٹنوں میں منہ دے کر ہنسی۔ داوی اماں مسکرا کر کہتی۔ ”تو بے اس لڑکے کو تو اپنی سُدھ بڈھ نہیں رہتی۔“ غصہ چوبارے میں ان کی آوازیں سنتی اور تیوری چڑھا کر اپنے آپ سے کہتی۔ ”میں جانتی ہوں ان کے ضروری کام کو اچھی طرح معلوم ہے مجھے۔ کون نہیں جانتا۔“ شزاؤ جھنگے کے سامنے کھڑی ہوتی تو فوراً اسے آواز دیتے۔ ”شزاؤ ہے۔“ وہ جھنگے سے چلاتے۔ ”سنا کیا حال ہے۔ نور پور تو نہیں یاد آتا۔ کھلے میدانوں میں کلیں کرنے والیاں جب گھر میں قید ہو جاتی ہیں تو جی گھبراتا ہے ٹہ ٹہ ہی ہی۔“ اور وہ اپنی بات پر ہنسنے لگتے اور دیر تک ہنسے جاتے۔

شزاؤ کو دیکھ کر صفدر اپنے کھدے ہوئے بازو کو بھول جاتا۔ اسے بل جھٹک کر سر ملانا بھی یاد نہ رہتا اور اپنا محبوب گیت حافظ خدا تمہارا جو وہ پارسی لڑکی کے ساتھ سٹیج پر گایا کرتا تھا قطعی طور پر بھول جاتا اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھنے میں کھو جاتا۔

محلے کے جوان تو شزاؤ کو دیکھ کر حیران رہ گئے تھے۔ اس کی ہر بات زالی معلوم ہوتی تھی۔ اس کا انداز بے حد انوکھا تھا۔ جتنی کی آڑ میں کھڑی ہونے کی بجائے وہ جتنی کو لپیٹ دیتی اور چمپ کر دیکھنے کی بجائے اطمینان سے کھڑکی کے زیریں سارے پر پاؤں رکھ کے بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتی۔ وہ محلے والیوں کی طرح میلے اور سادہ کپڑے پہنتا پسند نہ کرتی تھی۔ اس کا دوشہ لٹلانیے شالوں پر گرا رہتا۔ جیسے وہ سر کی جگہ شالوں سے متعلقہ لباس ہو۔ اس کے بل نیم کھلے رتے اور آنکھوں کے کونوں میں دور کشیشوں تک سرے کی دھار صاف دکھائی دیتی۔

رفش اسے دیکھ کر گھبرا جیلا کرتا۔ اس کی گردن جھک جاتی۔ اس کی نگاہیں اماطے کے فرش پر آواز ہو جاتیں اگرچہ ان میں ہوائیاں سی چلتی رہتیں۔ اور اس کے ہونٹ نہ جانے کیا

طرف آنکھ اٹھا کر دیکھنا جرم ہو۔ اس لئے گھر کے کسی کو نے میں بیٹھ کر مسکراتی ہوئی شہزادی کی طرف حسرت ناک نگاہوں سے دیکھا اور اس کے قریب تر جانے کی آرزو کو دل میں باک سمجھنوں طرف اس کے قدموں میں بیٹھ رہتا۔ اسے یہ بھی تو معلوم نہ تھا کہ آرزو کرنے کا مقصد کیا ہوتا ہے۔ اسے تو بس شہزاد کے قرب کی آرزو تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ اس سے قریب تر ہو جائے اور اسے دیکھ کر شہزادی آنکھوں میں ایسی پھلجھریاں چلیں جیسے شریف کو دیکھتے ہوئے چلا کرتی تھیں۔ مگر یہ ناممکن تھا اور ممکن ہوتا بھی تو لیکن کیسے ممکن ہو سکتا تھا کہ وہ اپنے دوست کی بیوی کی آرزو کرے۔ کتنی بری بات تھی۔ کتنی ناجائز۔ اس بات کو بھلانے کے لئے اس نے اپنی توجہ دوسری باتوں کی طرف مبذول کرنے کی کوشش کی۔

چند ایک دنوں کے بعد ارجمند نے بھی محلے کے چوگان میں کھڑا ہونا موقوف کر دیا۔ ”نہ ہجی۔“ وہ چلانے لگا۔ ”اپنے بس کی بات نہیں۔ اپنے تو پر جلتے ہیں اور بھی ایللی بات یہ ہے کہ پکا پکایا کھانا اپنے نصیب میں نہیں۔ اپنے نصیب میں تو انتظار کرنا لکھا ہے۔ بس چھ سال کی بات ہے۔ صرف چھ سال۔ بھر کپ کو بھلکے دیکھا۔ اف غضب ہو جائے گا اور دوست رام تو ہم پہلے ہی کر لیں گے۔ اگر مناسب وقت پر رام نہ کر لیا جائے بھائی تو یہ بلا قابو میں نہیں آئیں۔ بس جہاں کی کٹوریوں میں گلاب آیا تو سمجھ لو کہ دنیا ہی بدل گئی۔ یوں آنکھیں پھیر لیتی ہیں جیسے جانتی ہی نہ ہوں اور وہ شہزاد۔ ارے وہ تو ظالم بے عزتی کر دیتی ہے بالکل بے عزتی۔ اس روز مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”کس داؤ پر کھڑا ہے تو۔“ کچھ کامیابی کی بھی امید ہے یا ایسے ہی ظالم نے مجھے کٹ کر رکھ دیا اللہ بے اعتنائی کا یہ عالم ہے کہ ہم کسی گنتی میں شمار نہیں اور پھر یوں کٹ کے رکھ دیں۔ بھئی واہ۔ نہ بھئی اپنے بس کی بات نہیں۔ لیکن تم آزادی سے آجاسکتے ہو۔ دوست تم مزے میں ہو۔“

ارجمند اور ایللی دونوں اپنے آپ کو دھوکا دینے کے لئے کپ اور کپ میں دلچسپی کا اظہار کرتے لگتے۔ ایللی کہتا ”چلو وہاں چلیں تمہارے گھر میں کھوری ڈکوری دیکھیں گے۔“ ارجمند مسکرا کر چلا ”کیوں دوست ابھی سے چوہا گھڑی پر چڑھنے لگا۔“ اور وہ دونوں کھڑکی کی دوزلوں سے منزل کے گھر میں جھانکتے۔ سبز جھیلے کا دروازہ کھلتا اور ایللی محسوس کرتا جیسے کسی مونگیا گھڑی کے پت کھل گئے ہوں۔ اس کے شانوں پر بوجھ پڑ جاتا۔ بند بند میں دھکی سی بجتے لگتی اور وہ گہرا کر کھڑکی سے ہٹ جاتا۔

منگتا تے۔ پھر وہ چپکے سے شہزادی کی سیڑھیاں چڑھ جاتا۔ ”چچی کوئی سودا تو نہیں منگوانا“ اور اس آنکھوں سے گلابی شرارے پھونکتے اور ہونٹوں سے اف اف کی آواز پیدا ہوتی۔ جیسے اسے ہر کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہو اور شہزاد بے نیازی سے اس کی طرف دیکھتی اور ”نہیں“ کہہ کر بے پروائی سے کسی کلام میں لگ جاتی جیسے پتہ ہی نہ ہو کہ رفیق کو اتنا کچھ برداشت کرنا پڑ رہا ہے۔ ارجمند انگریزی کا تمام تر سلاسل لے کر چوگان میں کھڑا ہو جاتا اور ہلنے ہلانے شروع کر دیتی کی طرف دیکھتا۔ شمس ردیل ہاتھوں میں اچھالتا۔ احتیاط سے ہلنے ہوئے ہالوں اور شمس ردیل سے سنبھالتا اور پھر بانسری ہونٹوں تلے رکھ کر سر اٹھا کر یوں اوپر کی طرف دیکھتا جیسے سپرے کے ٹوکے سے سانپ نکلنے والا ہو۔

لیکن نہ جانے شہزاد کس مٹی کی بنی ہوئی تھی کہ اس نے ارجمند کی حرکات کو کبھی درخ اشتنا نہ سمجھا تھا۔ وہ کھڑکی میں آتی ہر راہ چلتی ہوئی محلے والی سے کوئی بات چھیڑ لیتی۔ ہر گز جاتے سے ہنس کر بات کرتی مگر اس نے کبھی ارجمند کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا۔ ارجمند کی ساری کی ساری انگریزی دھری کی دھری رہ گئی تھی۔ پھر وہ آتا کر کچی حویلی کی طرف متوجہ ہو گیا تھا۔ جہاں کپ اسے دیکھ کر چھلکتی اور کپ یوں چھدکتی جیسے پارے کو آگ لگلا گئی ہو۔ کچی حویلی میں پہنچ کر اس کے انگریزی میں از سر نو تاثر ہو جاتا تھا اور چہرے پر دا آجاتی۔

احاطے میں ایللی کے کھڑے ہونے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اول تو اس میں اتنی جرات تھی کہ ارجمند سے سیکھے ہوئے داؤ کو آزما سکے۔ لیکن کبھی ارجمند کے ساتھ کھڑا بھی ہوتا تو حویلی یا باہر کوئیں کے قریب محلے کے احاطے میں کھڑے ہونا ایللی کے لئے ناممکن تھا اور پھر شہزاد کے لئے کھڑے ہو۔

جب سے ایللی نے ریل گاڑی میں اس مونگیا گھڑی کے پت کھول کر اس کی طرف جھانکا تھا اس پر شہزاد کا اس قدر رعب پڑ گیا تھا کہ اس کی آواز سن کر نگاہیں جھک جاتیں اور وہ اسے بھاگ لیتا۔ شہزاد کے رو بہ جانا تو الگ بات تھی۔

شہزاد کے سامنے ایللی کے شانوں پر منوں بوجھ پڑ جاتا۔ نسون میں گویا خون جم جاتا۔ دھک دھک کرتا۔ جی چاہتا کہ دوڑ کر کسی کو نے میں جا بیٹھے اور اپنے آپ کو محفوظ کرے۔ تو یوں دکھائی دیتی تھی جیسے کسی اور دنیا کی مخلوق ہو۔ جیسے وہ ایک ایسی پاکیزہ ہستی ہو جس

”ارے کیا ہے تجھے۔“ ارجمند اسے یوں بے توجہی برتتے ہوئے دیکھ کر کہتا ”میاں بھو
موقع پر میدان چھوڑنا مردوں کا کلمہ نہیں۔“

اس پر ایلی لا جواب ہو کر بھاگ آتا اور اپنے چوہارے کے کونے میں بیٹھ کر اپنی کٹی
شدت سے محسوس کرتا۔ اس کی نگاہوں میں فرار کی رنگین راہیں کھلتیں اور وہ ان میں کھو جاتا



سانوری

دولت پور

کچھ روز کے بعد دولت پور سے علی احمد کا خط موصول ہوا۔ جس میں ایلی کو ہدایت کی گئی
تھی کہ خط کو دیکھتے ہی وہ فوراً دولت پور آ جائے۔ خط پڑھ کر ایلی چونکا اسے ڈر تھا کہیں ابا اسے
دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ اس کی خواہش تھی کہ اسے پھر سے لاہور
کے کسی کالج میں داخل کیا جائے۔ کیونکہ لاہور میں وہ آزادانہ زندگی بسر کر سکتا تھا۔ لیکن جب
سے علی احمد کا تبادلہ دولت پور نہیں ہوا تھا ایلی کو یہ فکر دامن گیر ہو گیا تھا کہ کہیں علی احمد اسے
دولت پور کے کالج میں داخل ہونے پر مجبور نہ کریں۔ علی احمد کے مکان سے ایک مرتبہ چھٹکارہ
حاصل کرنے کے بعد وہ از سر نو وہاں مقید نہیں ہونا چاہتا تھا۔ وہ علی احمد کے کمرے سے ڈرتا
تھا۔ اسے کشمیر کے سیبوں پر پللی ہوئی ماں کی حنا مالیدہ ہاتھوں سے وحشت ہوتی تھی۔ سب سے
بڑھ کر اسے علی احمد کے کمرے سے نفرت تھی۔ جہاں کوئی نہ کوئی کوریا خانم موجود رہتی تھی۔
لیکن علی پور میں رہ کر اپنی زندگی تباہ کرنا بھی تو اسے گراں ہو رہا تھا۔ ایک ان جانی کشمکش
اسے جگی کے پاؤں کی طرح پیس رہی تھی۔ اس لئے اس نے دولت پور جانا منظور کر لیا۔ کیونکہ
علی پور سے مخلصی پانے کا یہی ایک واحد طریقہ تھا اور وہ مانگے کے سوٹ کیس میں اپنی چند ایک
لودھیانے کی قمیض ڈال کر دولت پور کی طرف چل پڑا۔
دولت پور میں علی احمد کے مکان کو دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔ وہ ایک پختہ چوہارہ تھا جو ایک جنگل

دو کروں اور ایک کمرہ نما صحن پر مشتمل تھا۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ مکان گھر نہیں تھا بلکہ تری علی احمد کا کمرہ تھا۔ گھر تو بام آباد میں تھا۔ جہاں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس کے پہلو میں چار کمرے تھے۔ ایک دوسرے سے الگ۔ ایک دوسرے سے دور جہاں علی احمد کے رہتے ہوئے بھی ان سے دور رہنا ممکن تھا۔ جہاں ایلی ٹین کے سپاہی کے میدان جنگ کی بات سے دور رہ سکتا تھا۔ جہاں وہ اپنی انفرادیت کو بحال رکھ سکتا تھا اور پانی کی بوتل بھرنے کے اپنے ذہن کو اس کمرے کے تاثرات سے محفوظ رکھ سکتا تھا۔ لیکن دولت پور کا گھر تو سب ایک کمرہ تھا۔ جسے بہت سے حصوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا۔ جیسے کبوتروں کے رہنے کے لئے ڈربے بنے ہوتے ہیں۔ اگرچہ دیواروں کے پردے کھڑے تھے۔ اس کے باوجود کسی کمرہ کی انفرادی حیثیت نہ تھی۔

دولت پور کا چوبارہ دیکھ کر وہ لرز گیا۔ اسے ٹین کے سپاہی اور ربڑ کی چیخنے والی گولیاں ساتھ رہنا پڑے۔ گلہ نہیں نہیں وہ دولت پور کے کالج میں میں تعلیم نہیں پائے۔ گلہ کبھی نہیں۔ صحن میں چولے کے سامنے شیم بیٹھی تھی۔ کشمیر کا وہ سیب جو چکنے سے پہلے ہی سڑا ہوا تھا۔ وہ شیم۔ اس کے گرد کباڑی کی دو کاڑی کی مانند کھانے پینے کی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔ کی مضی پچی کی ناک بہہ رہی تھی۔ قریب ہی بڑی لڑکی حواج سے فارغ ہونے میں مشغول تھی۔ شیم روٹیاں پکاتے ہوئے مضی کی ناک پوٹھتی۔ بڑی لڑکی کے جسم کو کپڑے سے صاف کرتا تھا۔ پھر انہیں ہاتھوں میں آنے کا بیڑا اٹھا کر روٹی پکانے میں مصروف ہو جاتی۔ ساتھ والے کمرے میں علی احمد میلی سی دھوئی باندھے ایک بڑے سے رجسٹر میں آلو اور پیاز کا حساب لکھنے میں مصروف تھے۔ بنگلی کمرے میں چیزیں گڈمڈ پڑی تھیں۔

ایلی پر ایک گھبراہٹ طاری ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس مکان سے نکلے۔ اس لئے وہ عقی کھڑکی میں کھڑا ہو کر پچھواڑے کے مکانات کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔ سامنے کوٹھے پر کوئی شخص خنجر نگاہوں سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہوں میں ایلی کی کرن واضح تھی۔ اس کے انداز سے بے مبری عیاں تھی۔ چند لمحات کے لئے وہ کوٹھے پر رہا۔ پردے کے قریب آکر کھڑا ہو جاتا۔ نگاہیں اس کھڑکی پر مرکوز ہو جاتیں جس میں ایلی کھڑا تھا۔ چند منٹ ایلی وہاں کھڑا رہا پھر گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا اور شیم کی طرف متوجہ ہو گیا۔ شیم کے رہنے بسنے کا انداز دیکھ کر اسے غصہ آنے لگا کیا میٹرکولیٹ ایسی ہوتی ہیں۔

شیم میں پٹی ہوئی عورتوں کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ ایلی کی نظروں میں شیم کی آنکھوں کا فرق زیادہ نمایاں ہوتا جا رہا تھا۔ شیم کے چہرے پر حزن و ملال کے آثار واضح تھے۔ رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ”سپاری۔“ وہ سوچنے لگا ”اس کی زندگی عام بیویوں سے کس قدر مختلف ہے اسے کیا کیا برداشت کرنا پڑا ہے۔ جب چینی کی گڑیا آکر چیختی ہوگی اور ٹین کا سپاہی میدان کار زلہ گرم کرتا ہوگا تو شیم اس بنگلی کمرے کی چار پائی پر بیٹھ کر کیا سوچتی ہوگی۔“ اس کے دل میں پہلی مرتبہ شیم کے لئے ہمدردی پیدا ہوئی لیکن اس جذبہ ہمدردی میں ترس کا عنصر نمایاں تھا۔

سارا دن ایلی پریشان رہتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ صحن میں شیم کو روٹی پکاتے ہوئے دیکھ کر اس کی طبیعت مائل کرنے لگتی اور وہ دیوار کی طرف منہ موڑ لیتا۔ کھڑکی سے کور جھانکتی۔ ”بابو جی کہاں ہیں۔“ دروازے سے استانی تہہ بند جھاڑتی ہوئی داخل ہوتی۔ ادھر سے خانم مسکراتی۔ وہ زیادہ دیر وہاں نہیں بیٹھ سکتا تھا۔ بلاخرہ بنگلی کمرے کی کھڑکی سے اس بے قرار نوجوان کو دیکھنے میں کھو جاتا جو نہ جانے کس کے لئے دن بھر چھت پر بلادیہ پینائی کرنے میں مصروف رہتا تھا۔ پھر وہ گھبرا کر گھر سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کے بازاروں میں بے مصرف گھومتا۔

دولت پور دوسرے شہروں سے کس قدر مختلف تھا۔ بام آباد کی تو اور بات تھی وہ تو شہر تھا ہی نہیں بلکہ محض ایک نو آبادی تھی۔ جہاں غریب لوگ رہتے تھے۔ لیکن دولت پور تو پرانا شہر تھا پھر اس کے بازاروں میں اس قدر ویرانی کیوں تھی۔ اس کی دوکانوں میں وہ بھڑک نہ تھی جو بڑے شہروں کی دوکانوں میں ہوتی ہے۔

بازاروں میں آتے جاتے لوگ ساوہ طبیعت کے تھے۔ ان کے لباس میں دکھلوے کا عنصر نہ تھا۔ ان کی گفتگو میں ایک عجیب قسم کی معصومیت تھی۔ وہ اپنی غرور کا اظہار کرنے سے گھبراتے نہ تھے۔ ایک پیسے کا سودا لینے کو عار نہ سمجھتے تھے۔ دولت پور لاہور سے کس قدر مختلف تھا۔

سلفر اور پٹاخہ

دولت پور کی زندگی کا مرکز پنواڑی کی دوکان تھی جو عوام کے جذبات کی عکاسی کرتی تھی۔ ہر دوکان پر چار ایک نوجوان جمع رہتے جو پان کھاتے۔ ایک دوسرے پر فقرے کہتے اور پھر سیٹھ گرد عاری لال یا مدن لال بھابھڑہ کے تازہ ترین معاشرے پر ہنس کر باتیں کرتے۔ ایلی دور

”ہوں۔“ علی احمد بولے ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“

”ہوں۔“ انہوں نے ایلچی کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تم یہاں داخل ہونے سے انکار کرتے ہو۔“ یہ کہتے ہوئے انہوں نے بید کی چھڑی اٹھائی جو پاس دیوار کے سہارے کھڑی تھی۔

”ارے۔“ وہ گھبرا گیا۔ اسے اس سلوک کی توقع نہ تھی۔

”دیکھئے آپ مجھے مجبور نہ کریں۔“ وہ بولا۔

زن سے ایک اور ضرب مڑی۔ نہ جانے اس وقت ایللی کو کیا ہوا وہ یہ بھول گیا کہ وہ ایللی ہے اور علی احمد اس کے والد ہیں۔ اس نے ایک جست لگائی اور اس میز پر چڑھ گیا جو باپ اور بیٹے کے درمیان بچھی ہوئی تھی۔ جھپٹ کر علی احمد کے ہاتھ کی سوئی کو پکڑ لیا۔ ایک کھولتی ہوئی نگاہ باپ پر ڈالی۔

دو ایک گھنٹے نہ جانے وہ کہاں گھومتا رہا۔ بھاگ جانے کے خوفناک منصوبے بناتا رہا۔ سوچتا رہا کہ کس طرح وہ سمندری جہاز میں داخل ہو کر چھپ جائے گا اور جب جہاز گہرے سمندر میں

اسے یہ معلوم نہ تھا کہ سیٹھ گردھاری لال کون ہے اور ساجو کس کا نام ہے اور وہ منٹے چلم کیوں ہے۔ وہ تو صرف یہ جانتا تھا کہ ساجو کوئی ہے۔ ہوگی کوئی اور سیٹھ گردھاری لال اے چوس رہے تھے۔ لیکن اسے اس بات سے کیا تعلق۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ دولت پور میں ایک نیا قلعہ بیدار ہوا ہے۔ جس کی شکل پانچ سیڑ
اور جو مست ہاتھی کی طرح چلتی ہے اور شوقین راستے میں کھڑے ہو کر گھنٹوں اس کا انتظار
کرتے ہیں۔

اس سلفے کی چلم اور اس نئے فتنے کے باوجود اہلی کو دولت پور میں رہنے سے کوئی دلچسپی نہ ہوئی اور بالآخر مجبور ہو کر علی احمد سے کہنے لگا "میں یہاں داخل نہیں ہوں گا۔ میں تو لاہور میں پڑھوں گا۔" علی احمد نے ایک ساعت کے لئے اس کی طرف غور سے دیکھا اور پھر بولے "اس وقت اس موضوع پر بات کرنا بیکار ہے اس لئے کہ ہمیں فرصت نہیں ہے کل دفتر آجائے وہاں یہ مسئلہ طے کر لیں گے۔"

واخله

دفتر میں علی احمد کی حیثیت انفر کی تھی۔ ان کے لئے ایک علیحدہ کمرہ مخصوص تھا۔ جس کا

تھی۔ ”سلام کتا ہوں جی۔“ بلا شمیم سے مخاطب ہو کر بولا ”اپنے پھوپھا جان کہاں گئے ہیں۔“
 ”ہوں گے! ہوں گے! باہر سیر کو۔“ ہائیں ایللی بھائی بھی یہاں ہیں۔ مزاج تو بخیر ہے نا۔ شکر اللہ کا میں
 تو بالکل خیریت سے ہوں۔ علی پور میں سبھی خیریت سے ہیں ہاں۔“ اس نے یوں کہا جیسے یہ ایک
 انیسویں ہاک امر ہو۔ ”بھئی یاد کرتے ہیں آپ کو۔“ وہ اپنے آپ سے باتیں کئے جا رہا تھا جیسا
 کہ اس کی عادت تھی۔ خود ہی سوال کرتا۔ پھر خود ہی اس کا جواب دینے لگتا۔ اس کی نگاہیں نہ
 جانے کس طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی تھیں۔ جیسے دیواروں کے پار کچھ دیکھ رہا ہو۔ اس کی چچی
 بلا کی طرف دیکھنے میں کھوئی رہتی جیسے ڈرتی ہو کہ کہیں بلا اس کی نگاہ سے اوجھل ہوئے دیا گیا تو
 وہ پر اسرار طریقے سے گم ہو جائے گا۔

جلد ہی شمیم اور ایللی کو معلوم ہو گیا کہ بلا اور اس کی چچی وہاں دو ایک مہینے ٹھہرنے کے لئے
 آئے تھے۔ کیونکہ ان کا خیال تھا کہ شاید علی احمد کے زیر اثر رہنے سے بلا میں دسویں پاس کرنے
 کی صلاحیت پیدا ہو جائے۔ اگرچہ علی احمد نے ان کی آمد پر خوشی کا اظہار کیا تھا مگر ان کے انداز
 سے ظاہر تھا کہ انہیں قطعی طور پر خوشی نہیں ہوئی بلکہ ان کے آنے سے کوفت محسوس ہو رہی
 تھی۔

بلا اپنے جواہرات کے ڈبے کھول کر بیٹھ جاتا۔ ”یہ دیکھو ایللی۔“ وہ اسے آکھاتا۔ ”یہ
 نلیم جو ہے یہ کوہ سفید کے سوا اور کسی جگہ سے نہیں ملتا ہاں۔ کیونکہ وہی ایک پہاڑ ہے جہاں
 پریوں کی آمد و رفت رہتی ہے۔ پریوں کو نلیم سے محبت ہوتی ہے۔ ہاں۔ پھر جب چودھویں
 رات کا چاند چمکتا ہے نا تو اس کا رنگ اور بھی گہرا ہو جاتا ہے اور۔۔۔“

ایللی کو اب بلا کے قیمتی پتھروں سے وہ دلچسپی نہ تھی جو کسی زمانے میں ہوا کرتی تھی۔ ایللی
 اس کی باتیں سن کر مسکراتا اور پھر سوچتا کہ کس طرح بلا کے طلسمی پتھروں سے مخلصی پائے لیکن
 اعلانیہ بلا کی بات کٹ کر چلے جاتا یہ اس کے لئے ممکن نہ تھا۔ بہر حال وہ بلا کی باتیں سنتا جتا یا
 لیتا اور نہ سننے کی آرزو کرتا۔

پھر مدد فضا“ بلا اٹھ بیٹھتا اور آپ ہی آپ بڑبڑانے لگتا۔ جیسے کوئی اسے بلا رہا ہو۔ ”ابھی آتا
 ہوں۔ بھئی۔ ابھی آیا میں۔ وہ بلا رہے ہیں نا مجھے۔“ اس کے اشاروں میں راز و دار نہ اور پر
 اسرار انداز جھلکتا۔ اس کی مسکراہٹ میں احساس برتری کی جھلک ہوتی۔ جیسے وہ حالات کو بہتر

پہنچ جائے گا تو وہ باہر نکلے گا۔ اور جہاز والے بلا خراسے رکابیاں دھونے پر ملازم رکھ لیں گے
 کہ جہاز بصرہ کی بندرگاہ میں ننگر انداز ہو جائے گا۔ پھر چپکے سے جہاز سے باہر نکل جائے گا۔
 اس کے ایک عزیز نے کیا تھا۔

لیکن یہ دلچسپ تفصیلات سوچنے کے بعد وہ گھر لوٹ آیا۔ اس میں بھاگ جانے کی جرات
 تھی۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہ تھا کہ وہ بھاگ جانے کی تفصیلات بھی نہ سوچے۔ جب وہ
 واپس پہنچا تو علی احمد اس کا انتظار کر رہے تھے۔ ”غلام محمد“ انہوں نے نوکر کو آواز دی۔ ”اے
 ڈاکٹر رام داس کے پاس لے جاؤ۔“

ڈاکٹر سے دو الگوانے کے بعد وہ چارپائی پر لیٹ کر فیصلہ کرتا رہا کہ دولت پور کے کلینک
 داخل نہیں ہو گا چاہے کچھ ہو جائے لیکن تیسرے روز جب علی احمد نے اپنے ہیڈ کلرک کے
 ساتھ اسے دولت پور کینٹ کلج میں داخل ہونے کے لئے بھیجا تو وہ یوں چپکے سے اس کے راز
 چل پڑا۔ جیسے دولت پور کلج میں داخل نہ ہونے کا اس نے فیصلہ ہی نہ کیا ہو۔

چند ایک دن تو ایللی جو بارے کے ان دونوں کمروں میں پریشان حال گھومتا رہا پھر قلعہ
 اطمینان سے بیٹھ گیا۔ جب شام کے وقت شمیم کھانا پکانے لگتی اور نانہہ حواج میں مصروف
 جاتی اور انجم کی ناک بہتی تو وہ چپکے سے باہر نکل جاتا اور دولت پور کی گلیوں میں گھومتے ہوئے
 سوچتا کہ یہ مکان سیٹھ گردھاری لال کا تو نہیں اور یہ عورت جو کھڑکی میں کھڑی ہے۔ دولت
 کا نیا فتنہ ہے یا سلنے کی چلم۔

وہ یونہی گھومتا رہتا تاکہ وہ شمیم کو کھانا پکاتے ہوئے نہ دیکھے۔ کھانا کھاتے ہوئے وہ سوچے
 لگتا کہ کس طرح وہ جہاز میں چھپنے میں کامیاب ہو سکے گا۔ اور پھر کس طرح جہاز کا کپتان
 رکابیاں دھونے پر نوکر رکھنا منظور کر لے گا اور پھر بصرہ کی بندرگاہ میں کس طرح سے چور
 چوری جہاز سے اترے گا۔ وہ مسلسل طور پر کچھ نہ کچھ سوچتا رہتا تاکہ کھانے کے دوران یہ خیال
 نہ آئے کہ یہ وہی کھانا ہے جسے شمیم نے پکایا ہے۔

جمعہ شہ

پھر ایک روز علی احمد کے یہاں بلا اور اس کی چچی آگئے۔ آگے آگے بلا تھا۔ اس کے ہاتھ
 میں سوٹ کیس تھا اور اس کے پیچھے اس کی چچی دیواروں کا سہارا لیتی ہوئی سیڑھیاں چڑھ رہی

یوں بکرجائیں۔ جیسے معاملے سے بنے ہوئے بلوے کا اندرونی ٹاکا لوٹ گیا ہو۔

اس پر دفعتاً کپڑوں کی گٹھڑی میں حرکت پیدا ہوتی اور چچی اٹھ کر بلا کے بکھرے ہوئے اعضا کو سمیٹتی اور بعد مشکل اس لاش کو گھسیٹ کر چارپائی پر ڈال دیتی۔ اس وقت ایلی سوچتا کیا یہ وہی بلا ہے جو فطرت کے تمام رازوں سے کما حقہ واقف ہے۔ کیا یہ بے ہوشی بھی کوئی راز ہے۔ یہ سوچتے سوچتے ایلی اونگھنے لگتا اور پھر چپکے سے اٹھ کر بستر پر لیٹ جاتا اور علی احمد کے قلم کی چراؤں چراؤں کو غور سے سننے میں مصروف ہو جاتا جو ملحقہ کمرے میں حسابات کے رجسٹر پر کرنے میں مصروف رہے۔ ایلی کو خوف دامن گیر رہتا تھا کہ کہیں علی احمد یہ نہ پوچھ لیں۔ "ایلی تم ابھی سے سو گئے کیا سارا دن آوارہ پھرتے ہو اور سرشام ہی پڑ کر سو جاتے ہو کیا وجہ ہے۔" لیکن علی احمد کو حساب کتب لکھنے میں اس قدر دلچسپی تھی کہ وہ رجسٹر سامنے رکھ کر دنیا و مافیہا سے بے خبر ہو جاتے تھے۔

آتشیں میزائل

رات کو خواب میں عجیب و غریب اشکال ایلی کے پیچھے دوڑتیں اور وہ ڈر کر بھاگتا۔ خوف سے اس کے روتھکنے کھڑے ہو جاتے۔ دل دھڑکتا۔ مگر وہ دوڑے جاتا۔ پھر بلا نہ جانے کہاں سے اس کے سامنے آکھڑا ہوتا اور مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ کو دیکھ کر عجیب قسم کی ہمدردی سی محسوس ہوتی تھی۔ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔ "بلا مسکرا کر کتا ٹھیک ہو جائے گا۔ بلا کا چٹا سفید ہاتھ ایلی کی طرف بڑھتا اور اسے تھپکنے لگتا۔ ایلی جاگ اٹھتا اور اپنے آپ کو کمرے میں دیکھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔ پھر آہستہ آہستہ از سر نو اس پر خوف مسلط ہونا شروع ہو جاتا۔ اندھیرے میں اس کا دم گھٹنے لگتا اور وہ آنکھیں بند کر کے پڑ جاتا۔" دفعتاً اسے محسوس ہوتا کہ کوئی چیز اس کے جسم سے چھو رہی ہے۔ آہستہ آہستہ حرکت کر رہی ہے۔

پہلی مرتبہ جب اس نے یہ محسوس کیا تھا تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا تھا۔ وہاں کچھ بھی نہ تھا۔ صرف بلا کا بازو چارپائی تلے یوں لٹک رہا تھا۔ جیسے قصائی کی دوکان پر بکھرے لٹکا کرتے ہیں۔ یہ بات تعجب خیز نہ تھی۔ کیونکہ اکثر بلا کے اعضا چارپائی سے لٹکا کرتے تھے۔ اس نے کئی مرتبہ اس کا بازو اور ٹانگ چارپائی تلے دیکھے تھے اور بلا کی چچی تو اکثر رات کے وقت چلایا کرتی۔ "بلا تیری دوسری ٹانگ کہاں ہے۔ بلا کہاں ہے۔ تیری دوسری ٹانگ۔ پھر وہ اٹھ کر بلا کی دوسری ٹانگ

طور پر سمجھتا ہو جیسے وہ فطرت کے راز سے کما حقہ واقف ہو۔" ذرا انتظار کرو میں ہو آؤں۔ ایلی سے کتا اور پھر چپ چاپ کوٹھے کی میز پر چڑھنے لگتا۔ اس کے جانے کے بعد کوٹھے پر زیر لب باتیں کرنے کی آوازیں سنائی دیتیں۔ پھر وہ لوٹ آتا لیکن میز پر اترتے وقت دفعتاً رکنا جیسے کسی نے اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کتا۔ "نہیں نہیں یار نہیں۔ جیسے میں نے کہا اسے پھر بلایا ہو اور نہ جانے کس سے مخاطب ہو کر کتا۔" نہیں نہیں یوں نہیں۔ جیسے میں نے کہا تھا دیے۔" اور پھر مسکراتا ہوا نیچے اتر آتا۔ ٹھیس اور ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے رہتے۔ اسے آتا دیکھ کر ٹھیس گھبرا کر اٹھ بیٹھتی اور انجم کو کیلجے سے لگا کر ٹانگہ کے سر پر ہاتھ رکھ کر گویا انہیں محفوظ کر لیتی۔

پھر وہ گھبرا کر پوچھتی۔ "بلا تم کس سے باتیں کیا کرتے ہو۔"

بلا مسکراتا ہے۔ "آپ نہیں جانتی پھوپھی۔ آپ انہیں نہیں جانتیں۔ اپنی ہی ہیں وہ بڑے اچھے ہیں بیچارے۔"

بلا جواب دیتا۔ "کہاں نہیں ہیں۔ ان کے لئے کوئی حد مقرر نہیں وہ ہر جگہ موجود ہیں۔ مکان میں جنگل میں میدان میں۔ لیکن بڑے اچھے ہیں وہ بیچارے بار بار مجھے بلا لیتے ہیں۔ بی بی۔" وہ ہنستا۔

"اس وقت تو اپنے جمعہ شاہ کو نہیں جاننے بڑے زبردست ہیں وہ جو چاہیں کر دیں۔ چاہیں جسے چاہیں بلا لیں تو یہ بھی کس میں ہمت ہے کہ ان کی بات رد کرے۔ لیکن میں ہی نا ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگتا "میری اور بات ہے۔ میرا ہم زاد بڑا زبردست ہے نا۔ اس لئے۔ لیکن تمہیں کیا معلوم پھوپھی میں نے کئی بار کہا ہے انہیں کہ۔"

اور بلا اسی طرح ایک قصہ چھیڑ دیتا۔ جس کے دوران میں وہ بار بار مسکراتا اور انہیں بلا سمجھانے کی کوشش کرتا جیسے دونوں بچے ہوں پھر جب رات پڑ جاتی تو وہ کتاب سامنے رکھ کر دیوار کے پار دیکھنے میں مصروف ہو جاتا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب قسم کی دیوانگی جھلکتی۔

ایلی کو بلا کی طرف دیکھ کر ڈر لگتا تھا۔ اس لئے وہ کوشش کیا کرتا کہ اس کی طرف نہ دیکھے۔ دوسری جانب بلا کی چچی یوں بیٹھی رہتی جیسے کپڑوں کی گٹھڑی پر کسی ڈائن کا سر کان رکھ دیا گیا ہو۔ اس کی نگاہیں بلا پر مرکوز رہتیں اور وہ مسلسل طور پر پیار بھری سیاہ ڈارنگھٹا سے اسے گھورتی رہتی۔ حتیٰ کہ بلا کی آنکھیں بند ہو جاتیں اور سر کتاب پر جھک جاتا اور ٹانگ

نہیں۔ ستارے ٹوٹ رہے تھے۔ پھر گھٹا ٹوٹ اندھا چھا گیا اور ایلہ نے محسوس کیا جیسے وہ ایک طویل و عریض سمندر پر ایک ٹوٹی ہوئی کشتی میں بنے جا رہا ہو اور چاروں طرف تھکی ہادی لہریں رینگ رہی ہوں۔

اس روز پہلی مرتبہ اسے اس تلاطم کا تجربہ ہوا تھا۔ پہلی مرتبہ اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی اپنی شخصیت میں رتین طوفان نہیں ہیں۔ اگلے روز وہ بلا کے ہاتھ کو بڑے غور سے دیکھ رہا تھا۔ کتنا شگاف ہاتھ تھا وہ کس قدر نمکیں۔ اسے دیکھ کر ایلہ کو بیک وقت نفرت اور دلچسپی محسوس ہو رہی تھی۔ نفرت کا احساس غالب تھا۔ مگر اس نفرت کے باوجود رات کی تاریکی میں اس چھائی ہوئی خاموشی کے پس منظر پر وہ محفل لمس رواں دواں ہو جاتا تو اسے محسوس ہوتا گیا کسی مربوط کے تار لرز رہے ہوں۔ اس وقت وہ پہلو بدل کر اپنے آپ کو محفوظ کر لیتا۔ لیکن جلد ہی ان جانے میں وہ بھر کوٹ بدلتا۔ اور پھر نمکی لہریں بڑھ کر طوفان کی شکل اختیار کر لیتیں افاق پر خمیں جھینے اڑتے ایک میزائل شوں سے آسمان کی طرف پلٹک۔ پھر دیر تک طوفان زدہ سمندر کی دیرانی میں وہ لکڑی کے ٹوٹے ہوئے تختوں پر پڑا ڈبکیں کھاتا اور کسی ان جانے احساس سے شربور ہو جاتا۔ دن بھر وہ کلچ سے متعلقہ مشاغل میں مصروف رہتا۔ شدت سے مصروف رہتا تاکہ اس کے ذہن میں بلا کا خیال نہ آجائے۔ بلا کے رو برو جانے سے بھی اسے سخت تکلیف ہوتی تھی۔ روحانی تکلیف۔ بلا اس کے ذہن میں ایک رستے نامور کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ لیکن —

پیش میموریل

دولت پور کا کلچ ایک وسیع احاطے میں طویل نما عمارت میں واقع تھا۔ احاطے کے چاروں طرف ایک منزلہ کمرے بنے ہوئے تھے۔ جن کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ چلا گیا تھا اور درمیان میں ایک وسیع و عریض صحن تھا۔ جس میں دو ایک پلاٹ دو ایک ٹینس اور بیڈ منٹن کے کورٹ تھے اور درمیان میں کنکر بچے ہوئے راستے بنے ہوئے تھے۔

احاطے کا شرقی پہلو تعلیم و تدریس کے لئے مخصوص تھا اور باقی تین پہلوؤں میں بورڈنگ طلباء کے رہائشی کمرے تھے جو زیادہ تر خالی پڑے رہتے۔

اس کلچ کی حیثیت محض ایک سکول کی سی تھی۔ احاطے کے دونوں پھاٹوں میں سٹولوں پر

سینیتی اور رستمی بن کر بلا کی پابندی کی طرف پڑ جاتی اور بلا اسی طرح سویا رہتا یا زیر لب مگر کر آنکھیں یوں بند کر لیتا جیسے نیند میں ہو۔

بلا کے جسم کے متعلق ایلہ کے لئے دو تین باتیں عجیب تھیں۔ ایک تو اس کا جسم سفید ملائم تھا۔ جیسے عورتوں کا ہوتا ہے۔ دوسرے وہ بالوں سے خالی تھا۔ اس کے ہاتھ اس قدر خوب تھے کہ ایلہ کو حیرت ہوتی تھی۔ انگلیاں مخروطی تھیں اور جلد پریوں گلابی جھل سی چمکتی تھی پھر ناکوں کی باریک جھلی چڑھا رکھی ہو۔

اس روز بلا کا ہاتھ چارپائی سے لٹکتے دیکھ کر ایلہ کو تعجب نہ ہوا تھا۔ بلکہ اس نے آنکھیں نہ کر کے سو جانے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اسے نیند نہ آتی تھی۔ نہ جانے نیند کو کیا ہو گیا تھا کمرے کے اندر میرے سے نجات پانے کے لئے اس نے سینہ گردھاری لال کے متعلق شروع کر دیا تھا۔ نہ جانے سینہ گردھاری لال کیسا ہو گا۔ اس کے سنے کی چلم سا جو اور دو ہاتھ نہ جانے کون تھی۔ وہ — جو دولت پور میں پانچ سبھی جاتی تھی۔ کوئی ہو گی۔ پڑی ہو کرے۔ ایلہ نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ دفعتاً اس نے پھر وہی لمس محسوس کیا۔ وہی چیز جیسے کوئی محفل بیر ہوئی چل رہی ہو۔ وہ پھر چونکا۔ بیر ہوئی رک گئی۔ لیکن کچھ دیر کے بعد پھر چلنے لگی۔ اگرچہ وہ جنبش چونکا دیتی تھی۔ لیکن اس قدر مدہم تھی۔ وہ لمس اس قدر محفل تھا ایلہ میں عجیب سی لذت بیدار ہو رہی تھی۔ جیسے رنگین جھولنے چپکے سے اس کی رضائی میں کھس گئے ہوں۔ بیر ہوئی کی ہر جنبش پر وہ بدکتا اور اس کے بدکتے ہی وہ جھولارک جاتا۔ دم جلد ہو کر رہ جاتا لیکن اس گھبراہٹ کے باوجود ایلہ کا جی چاہتا کہ وہ جنبش پھر رواں ہو جائے۔ بیر ہوئی پھر چلنے لگے۔ اس لمس کی وجہ جاننے کے لئے اس نے رضائی سے باہر دیکھنے کی خواہش محسوس کی تاکہ اسے معلوم ہو کہ بلا کا بازو کیا وہیں لٹک رہا ہے۔ لیکن جہن اس وقت وہ پھر رواں ہو چکی تھی۔ ایلہ نے رضائی سے منہ نکال کر باہر دیکھنے کی خواہش کو دبا لیا کہ اپنے وجہ سے وہ بیر ہوئی رک نہ جائے۔

بیر ہوئی سرک رہی تھی۔ سرک رہی تھی۔ اس کے جسم کے ایک ان جانے مرکز چاروں طرف لہریں اٹھ رہی تھیں۔ وقت گویا ختم چکا تھا۔

پھر دفعتاً ایک گرواب اٹھا۔ وہ ہلکی ہلکی لہریں ایک عجیب سے طوفان میں بدل گئیں۔ آتشیں میزائل فضا میں بلند ہوا اور پھر انہم بم کی طرح پھٹ گیا۔ چاروں طرف چنگاریاں اڑا

بیٹھے چوکیدار اونگھتے۔ کالج دنگ کے برآمدے میں ڈھیلے ڈھالے چڑاسی ہاتھوں میں کھڑے تھے۔ ننگے پاؤں یوں گھومتے پھرتے جیسے ہنکشتو چل رہے ہوں۔ دفتر میں لالہ رام لال بیڈ کلرک کے چمک کی چونچ پر رکھے بڑے بڑے رجسٹروں میں اندراج کرنے میں مصروف دکھائی دیتے۔ اور ارد گرد کم سن کلرک حساب کتاب کے کھاتے کھولے بیٹھے رہتے۔

جماعتوں میں پروفیسر تکنیکی آواز سے پڑھاتے اور لڑکے بچوں پر بیٹھ کر اونگھتے۔ پورائے کے دیران کمروں میں الیکٹریزنوں پر دھوئیاں لٹکائیاں اور پرانے سوکھتے۔ رسوئی میں دل کڑاہیں بجتیں۔ چولے سے پھلے اڑتے اور باہر بھیجی ہوئی ڈائینگ ٹیبل پر لڑکوں کے مبرے ہاتھ انہیں کچھ کرنے کے لئے بڑھتے۔

دولت پور کالج کا نام پس میوریل کالج تھا جو کسی بڑے سینٹھ نے لوک رکشا کے لئے چلا دیا تھا۔ شاید اسی لئے کالج میں پس صلح اور شانتی کے سوا کچھ نہ تھا۔ لڑکے شانتی سے بوجھ چڑاسی آواز پیدا کئے بغیر آمدوں سے چلتے پھرتے۔ دفتر میں بیڈ کلرک کے قلم کے چمک چڑاؤں کے سوا کوئی آواز پیدا نہ ہوتی۔

اس پس میوریل کالج میں صرف ایک گروپ ایسا تھا جو اس چھائی ہوئی خاموشی کو ڈر کی کوشش کرتا۔ لیکن بسا اوقات ان کی یہ کوشش بری طرح سے ناکام ہو جاتی۔ یہ گروپ پور کے شہر کے مسلمان لڑکوں کا تھا۔

شہر کے لڑکے صبح سویرے اپنے بائیکل سنبھالتے اور چھائی کی طرف چل پڑتے جہاں واقع تھا۔ شہر سے نکلتے تو تعداد کے لحاظ سے ایسا معلوم ہوتا جیسے سائیکلوں کا ایک جلوس لگا سائیکلوں کی ریس ہو رہی ہو۔ یہ جلوس گہیں اڑاتا۔ شور مچاتا۔ شاخوں پر ہاتھ رکھ کر چلا چھوڑے قطار در قطار چلے جاتا۔ ان کے اس طور پر چلنے سے چھائی اور شہر کے درمیان سڑک کا ٹریفک رک جاتا۔ تانگے والے چیخے رہے۔ باؤ۔ بیج کے پلو۔ بیل گاڑی والے چلنے ٹریفک کے سپاہی میٹھیاں بجاتے۔ دیران کو ٹھیوں میں سے صاحبوں کے کتے نکل کر بھٹکتے لیکن وہ جلوس بے نیازی اور بے پروائی سے چلے جاتا۔

ان کی زبانیں قہقہوں کی طرح چلتی تھیں۔ نگاہیں گوند کی طرح چمک جاتیں۔ چروا شوقیان جھلکتیں بھوڑوں میں مستیاں لہراتیں۔ ہونٹوں پر مسکراہٹیں ابھرتیں۔ ایک دوسرے کو ہانپنے کی کوشش کرتے۔ دوسرا دل چھینک عاشق کا روپ دھار لیتا۔ ایک شریف کی سی

ہانک دوسرا علی احمد کی طرح میدان میں آکھوتا۔

ایک کہتا "کیوں میری جان دیکھو گے یا مار ہی ڈالو گے۔"

دوسرا کہتا۔ "کیوں بے سارے ہماری ہی ملی اور ہمیں سے میاؤں۔"

"کیوں سارے۔ ہم سے تو چھپتا ہے اور دوسروں سے آنکھیں لڑاتا ہے۔"

"بھی ہم تو سرکار کے نوکر ٹھہرے۔"

"تو مشق ناز کر بے خون دو عالم ہماری گردن پر۔"

"ہم بھی منہ میں زبان رکھتے ہیں۔ جان من۔"

ہر کسی کو شوق تھا کہ وہ عاشق کا رول ادا کرے اور دوسرے کو معشوق بنا کر رکھ دے۔

دولت پور کے لڑکوں کا صرف یہی ایک مذاق تھا۔ ان کے پاس بات کرنے کے لئے صرف یہی ایک موضوع تھا۔ جسے بات کرنی آتی تھی۔ جو چوٹ کر سکتا تھا۔ فی البدیہہ جست جواب دے

سکتا تھا وہ ہیرو بن جاتا اور جو لڑکے ازلی طور پر کنگے تھے وہ گلوبن کر رہ جاتے۔

ایلی ازلی طور پر ایک گونگا لڑکا تھا۔ اسی وجہ سے اس کے لئے ان کی باتیں بے حد پریشان

کن ہوتی تھیں۔ اور وہ جلوس خاصہ اذیت دہ۔ اس لئے وہ اکثر کوشش کرتا کہ ایسے وقت کالج

چلے جب لڑکوں کے جلوس میں شامل ہونے کا ڈر نہ ہو۔

یہ جلوس جب کالج کے دروازے پر پہنچتا تو اور بھی شور مچاتا۔ لیکن ان کا وہ شور بے جان

ہو کر رہ جاتا کوشش کے باوجود اس میں تسلسل پیدا نہ ہو سکتا۔ اس راہب خانہ نما احاطے میں عجیب خصوصیت تھی۔

اس احاطے میں بڑی سے بڑی شوخ بات بے جان ہو کر رہ جاتی۔ بڑی سے بڑی پھبتی فلیٹ

ہو جاتی جیسے صحرائیں جھاڑیوں کی سبزی خشک ہو کر اڑ جاتی ہے۔

یہ جلوس احاطے میں داخل ہوتے ہی بے جان ہو جاتا۔ لڑکوں کے ہونٹ خشک ہو جاتے۔

ان کے قلم کی آوازیں جم جاتیں اور وہ چپ چاپ کلاس روم میں بیٹھ کر اونگھنے لگتے اور چھٹی کا

انتظار کرتے تاکہ ایک بار پھر حرکت کر سکیں۔

پس میوریل کے پروفیسر بھی عجب تھے۔ ان میں شوخی یا بانگن نام کو نہ تھا ان کے لباس

بڑے کیسے نہیں بلکہ بد رنگ تھے۔ ان کی حرکات اس حد تک مدہم تھیں جیسے سلومونٹ پر قلم

چل رہا ہو۔ ان کی آوازیں احاطے کی خاموشی کو تقویت دیتی تھیں۔ ان کے بیکچروں میں بھی علمی

نمائش مفقود تھی۔ لیکچر دیتے تو یوں محسوس ہوتا جیسے معلومات کا پرچار کرنے کے بجائے وہ علم کے عجز کا اظہار کر رہے ہوں۔ لڑکے ان کے اس انداز پر تمسخر سے ہنستے تھے۔ اگرچہ چار چوہی ہنستے تھے۔ لیکن پروفیسروں کے برتاؤ کو محسوس کر کے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے کالج کی جگہ ایک بودھی راہب خانہ ہو جہاں لوگ علم کی بجائے شانتی کا پدیش سیکھ رہے ہوں۔

ایلی کے لئے وہ کالج خوش کن نہ تھا۔ ہاں اتنا ضرور تھا کہ وہاں احساس کمتری کی وجہ سے بھاگنے کی ضرورت محسوس نہ ہوتی تھی۔ اس لئے وہ کالج میں باقاعدہ جاتا۔ اگرچہ اس نے کبھی پروفیسر کے لیکچر کی طرف دھیان نہ دیا تھا۔ جماعت میں وہ اونگھتا۔ ریس میں لڑکوں کی باتیں سنتا اور خلی پیڑ میں انہیں کسی دیران کمرے میں تاش کھیلنے ہوئے دیکھتا رہتا یا کالج سے نکل کر چھاؤنی کے بازاروں میں گھومتا۔

کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچتا اس دل بیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہوگی۔ نہ جانے ٹیم کی بچیاں صحن میں بگ کیا کر رہی ہوں گی۔ سارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں وہ الگ تہائی میں بیٹھ سکا ہو۔

کالج کے بند ہونے کے بعد وہ سیدھا گھر آتا۔ لیکن جوں جوں وہ گھر کے قریب پہنچتا اس دل بیٹھنے لگتا نہ جانے علی احمد کے کمرے میں کون ہوگی۔ نہ جانے ٹیم کی بچیاں صحن میں بگ کیا کر رہی ہوں گی۔ سارے گھر میں کوئی کونہ بھی تو ایسا نہ تھا جہاں وہ الگ تہائی میں بیٹھ سکا ہو۔

کچی گری

پھر دولت پور میں پچھلے کے میلے کا دن آگیا۔ شر کے پواڑیوں کی دوکانوں پر بھیڑ لگ گئی۔ لوگ پان کھاتے پیکیں تھوکتے ایک دوسرے پر فقرے کتے۔ مذاق اڑاتے اور بلاخر شر۔ سیٹھوں اور پناخوں کے متعلق بات شروع کر دیتے۔

”کیوں بھی غلام محمد کون کون آرہی ہے اب کے پچھلے کے میلے میں۔“

”اپنی زہرہ ہے دلی والی۔ علی جان ہے اور پٹیلے کی زالی بانو ہے۔“

”بڑی اچھی اچھی آئیں گی۔ اب کی بار بڑا ٹھانڈا رہے گا۔ تو دیکھو تو۔“

”کیوں رے بڑا تھن سین آیا ہے تو سمجھنے والا راگ دیا کا۔“

”اچھا خاصہ تو گاتی ہے وہ اور جب ہاتھ اٹھا کر کولے منکاتی ہے تو دیکھ لیجو تیرے چہرے

کے دل کو نہ ہوا کچھ کچھ تو کہتا۔“

”ارے یار تو بھی بس لفٹاؤ ہی رہا۔ یہاں گانے میں اپنی زہرہ کا جواب نہیں اور پھر دیکھو۔“

بھی تو چمن چھری ہے نری۔“

”ہونہ دیکھنے میں تو وہ ہے جو آج کل شرکی آنکھ کا تارہ بنی ہوئی اے اور بھی ہے بھی

یوں سمجھ لو کچی گری۔ رضائی میں پڑ کر چباتے رہو۔ ہاں۔“

پھر وہ سب اس کچی گری کو چبے اور اپنی تخیل میں کھو کر پان کی پیک نگل جاتے اور پھر کھاتے اور چلاتے۔

”کیوں بھی غلام محمد بڑا چچ ہے۔ تیرا تمباخو کہاں سے منگولیا ہے اب کی مرتبہ۔“

غلام محمد ایک شان بے نیازی سے چلاتا ”اے کیا سمجھا ہے تو نے اپنی دوکان پر چچ وہ آتی ہے۔ جو اول درزے کی ہو۔ ہاں۔“

میلے کے دن شر میں گھومتے ہوئے راج چوک میں مرزا کی دوکان کے قریب ایلی ان کی بات سن کر ٹھسکا۔

”اے وہ سامنے تو ہے وہ شیخ کی دوکان کے اوپر جھرمٹ لگا ہے نا اس میں تو غور سے تو دیکھ۔ آنکھیں ہیں تیری یا بن جو کہ دیکھنے کی چچ رکھتی ہی نہیں۔“

”وہ تو اپنی بالیاں والی ہے۔ پناخ کہاں رکھتا خود کو نہیں الٹا ہمیں جھٹلاتے ہے۔“

”ہاں ہاں بالیاں والی کے ساتھ ہی تو ہے۔ بائیں ہاتھ کو اے کیا ابھی سے آنکھوں پر چتا لیا۔ کما جو ہے تجھ سے بیسیوں بار چھوڑ دے یہ جیادیتاں۔ اندھا ہو کر راج چوک میں لاشی نہ ملے تو نے تو اپنا نام مرجا نہیں۔“

ایلی غور سے دوکان کی چھت پر بیٹھی ہوئی عورتوں کو دیکھ رہا تھا۔ جہاں بھڑکیلے سے کپڑے پنے چند ساتویں عورتیں بیٹھی تھیں۔ جن کے انداز میں نمائش کے علاوہ عریانی کی جھلک تھی۔ ان نے محسوس کیا۔ جیسے وہ سب بکاؤ ہوں۔ جنہیں سے داموں خریداجا سکتا ہو۔ تو کیا یہی تھی دولت پور کی پناخ جو ہوائی بن کر چھوٹی ہوئی تھی شر میں۔

”دیکھ لیا۔“ مرزا قہقہہ مار کر ہنسا ”بڑے جوڑوں میں ہے آج کل یہ لٹلیا۔ اپنی لطیفن کی لٹلیا ہے۔ اے دی لطیفن جو منڈی میں دانے چھاتی ہے۔ اپنے سیٹھ مجید الرحیم کی دوکان پر بیٹھیں ہیں۔ بڑی نے سیٹھ گردھاری لال کو سنبھال رکھا ہے اور۔“

”اور کیا بے سلفی کی لٹ کو کون نہیں جانتا۔ جانتا ہوں اسے اچھی طرح یوں۔“

”پیارے اس جاہل پناخ نے پکر دیا ہے سارے شر کو۔“

کوٹھے پر چڑھا کرتی تھی اور پردوں کے پیچھے چھپ چھپ کر بیٹھا کرتی تھی اس کا رنگ کتنا سفید تھا۔ اس کے انداز میں نمائش کا نشان تک نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب ایللی نے اسے دیکھا تھا تو وہ حیران رہ گیا تھا۔ پردے کی جالیوں کے پیچھے دو بلوری پاؤں گویا بڑی نفاست سے چار پائی پر رکھے ہوئے تھے اور ان کے رو برو دو مخروطی ٹانگیں جو میلے لٹھے کے پاجامے میں لمبوس تھیں۔ ایللی نے پہلی مرتبہ پاجامے کے حسن کو محسوس کیا تھا۔ چوڑی دار پائجامہ تو اس نے اکثر دیکھا تھا مگر اسے دیکھ کر نفرت محسوس ہوئی تھی۔ جیسے وہ پتلے پتلے بانسوں پر چڑھا ہو۔

دولت پور کی عورتوں کا انداز اتنا بھدا تھا۔ ان کی حرکات اس قدر بے ڈھب تھیں۔ ان کی نگاہیں حجاب سے اس قدر بے برہ تھیں کہ ایللی نے ان کے لباس کی خوبی پر کبھی غور ہی نہ کیا تھا۔ اسی لئے اس روز اس لڑکی کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا تھا۔ کتنی متناسب ٹانگیں تھیں اور پھر بلوری پاؤں پھر دفعتاً ایک سریلی دبی دبی آواز میں گونجتی۔ ”آتی ہوں۔“ اور وہ جھک کر چھپتے چھپتے پردوں کی اوٹ لیتی ہوئی غائب ہو گئی تھی۔

ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ اس اندھیری گلی میں ان آتے جاتے جامنی سایوں کو دیکھنے سے علی احمد کا ہتھکڑ کیا تھا۔ وہ وہاں کس لئے کھڑے ہر آتے جاتے کو تاکنے کی بے معنی کوشش میں مشغول تھے۔

میلہ

”تم ہو بلا جی۔“ ”قرب ہی سے آواز آئی۔ ایللی چونکا۔“
اندھیرے میں علی احمد کے دانت چمکے۔ ”تم آگئیں۔ ہی ہی ہی۔“ ٹین کا سپاہی اپنے مخصوص انداز میں ہنسا۔

”پھر تم نے جو اشارہ کیا تھا۔“ ریڑ کی گڑیا کی آنکھوں کی سفیدیاں چمکیں۔

”ہی ہی ہی۔“ تو تو نے دیکھ لیا۔“ وہ بولے۔ ”میں تو سمجھا تھا شاید۔ ہی ہی۔“

”کیسے نہ دیکھتی۔“ وہ چمک کر بولی۔

اس کا دھیان تو تھماری طرف ہی لگا رہتا ہے۔ قریب ہی چادر میں لپٹا ہوا ایک مرد گنگناہا۔

اس کی آواز سے سیڑ میں شب کی بو آتی تھی۔

ایللی حیرانی سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ لوگ کس دم سے انہیں پرکھتے تھے۔ نہ جانے کس نقطہ نظر سے انہیں عورتیں حسین نظر آتی تھیں۔ دور پور کے پنواڑیوں کی بات تو خیر الگ تھی۔ اپنے علی احمد کے خیالات بھی اس سلسلے میں جڑ تھے۔ ایللی کی سمجھ میں کچھ نہ آتا تھا۔ وہ چھپ چھپ کر ان عورتوں کو گھور رہا تھا جو شیشے کی پر بیٹھی پنکھوں کے جلوس کا انتظار کر رہی تھیں۔

”تو یہاں کیا دیکھ رہا ہے؟“ علی احمد کی آواز سن کر وہ چونکا۔

”جی۔ جی۔ یونہی دیکھ رہا تھا۔“

”اس طرح پاگلوں کی طرح ادھر ادھر نہیں دیکھا کرتے۔“ علی احمد نے کوہلوں پر ہاتھ راکھ کر دوکان پر بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف بڑے اٹھاک سے دیکھتے ہوئے کہا۔
”اچھا تو ابھی جلوس یہاں نہیں پہنچا ہوں۔“ انہوں نے ایللی کی طرف دیکھے بغیر کہا۔
ویر میں پہنچے گا یہاں ہوں۔“

پھر وہ اسی طرح کوہلوں پر ہاتھ رکھے وہاں ٹہلنے لگے۔ علی احمد نے نہ جانے کیا کیا کچھ دوکان پر بیٹھی عورتوں میں سے ایک نے بامعنی انداز سے دوسری کو کہنی ماری اور پھر سکران بیٹھی۔ اسے اٹھتے دیکھ کر علی احمد بولے۔ ”آؤ ایللی ذرا ادھر سے ہو آئیں۔ اس طرف۔“ ایللی کو لے کر چوک کے عقب کی اندھیری گلیوں میں گھس گئے اور ایک جگہ رک کر گھبراہٹ انتظار کرنے لگے۔

ان گلیوں میں عورتوں کے گروہ ادھر ادھر آ جا رہے تھے۔ نہ جانے کیوں ایللی دور پور کی عورتوں سے گھن آتی تھی۔ ان کا انداز چال ڈھال، طور طریقہ گھٹیا قسم کا تھا۔ کپڑے پستی تھیں۔ سستے اور بھڑکیلے ان کی حرکات میں کوئی حسن نہ تھا۔ ان کا انداز تو بالکل ہی گنوار پن کا مظہر ہوتا۔ سب سے بڑھ کر یہ کہ ان کا رنگ عموماً کالا تھا اور کلا سے ایللی کو قطعی دلچسپی نہ تھی۔

بلوری پاؤں

دولت پور میں کہیں کہیں سفید رنگ کے لوگ بھی نظر آتے تھے مگر ان کی تعداد بہت کم تھی مثلاً علی احمد کے چوبارے کے سامنے جو بیٹھا بیٹھا سا کچا گھر تھا۔ اس میں وہ لڑکی جو ہمیشہ

اور کا نام سن کر شیم تڑپ اٹھی۔ اس کی ناک پر حقارت آمیز جنبش ہوئی اور وہ گویا انتقام بچھاڑے کی کھڑکی میں جا کھڑی ہوئی۔ جس کے عقب میں کونٹے پر وہ نوجوان کھڑا انتظار کیا کرتا تھا۔ اس نے اپنا دوپٹہ جھنجھوڑ کر پھینک دیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک بامعنی مسکراہٹ پھیل گئی۔ باہر میاں کھائیں رہے تھے۔ کھڑکی میں بیگم مسکرا رہی تھی۔ پلنگ پر پڑی ہوئی بچی میں کی طرف دیکھ کر رو رہی تھی اور منہی فاطمہ چاروں طرف غور سے دیکھ رہی تھی۔ جیسے گرد و پیش کے حالات سے آشنا ہونے کی کوشش کر رہی ہو اور ایلی اچھلتے ہوئے دل سے میڑھیاں اتر رہا تھا۔

جو نکلیں اور جسم

بازاروں اور گلیوں کا ایک لمبا چکر کاٹ کر ایلی کار ہر ایک معمولی سے مکان میں داخل ہوا۔ صحن میں ایک سیاہ فام بڑھیا جھاڑو دے رہی تھی۔ اس کے کپڑے پھٹے ہوئے تھے۔ چہرہ ابلے ہوئے انڈے کی طرح جامد و ساکت تھا۔ پیشانی پر شکن تھے۔ انہیں داخل ہوتے دیکھ کر وہ رک گئی اور بے باکانہ طور پر انہیں گھورنے لگی۔ پھر کولوں پر ہاتھ رکھ کر یوں کھڑی ہو گئی جیسے ہاتھ کی جھاڑو سے تواضع کرنے کیلئے تیار ہو۔

”آگے تم۔“ بڑھیا غرائی۔

”کون ہے میں“ اندر سے آواز آئی۔ میں۔ ایلی گھبرا گیا کیا یہ اس کی ماں تھی۔ میں۔

”تیرے ہی کچھ ہوں گے مجھے کیا مالوم۔“ وہ غرائی۔

”اے گرمی کیوں کھا رہی ہے تو میں۔“

”گرمی تو تیری ٹھنڈی ہونے میں نہیں آتی۔“

”تو تجھے کیا تنگی بھٹ ہے تو کئے کی حاجت بن کر بیٹھ رہ آرام سے۔“

”لو لگا ہے تجھے لو، اندھی ہو رہی ہے ہر آتے جاتے سے، غرلائی ہے۔“ بڑھیا چیخنے لگی۔

”وہ غلام محمد تو ہے۔ آجا۔ اندر آجا۔“ کمرے سے کسی نے جھانک کر کہا۔

”بس لگاتی جا تو سینے سے۔“ بڑھیا غرائی۔ ”اور تیرا کام ہی کیا ہے مجھے کیا معلوم تھا کہ گود میں کیسیں پال رہی ہوں۔ کتیا یہ سب اس حرای سا جو کا کام ہے اس شکارن نے سب کے منہ لو لگا دیا۔ لو چو جی ہیں۔ لیکن کب تک۔“ اس کے منہ سے کف جاری تھا۔

”تو خواہ مخواہ۔۔۔۔۔“ وہ لاڈ سے غرائی۔ ”تو نہ بول بچ میں۔“

علی احمد یوں ہنسنے جا رہے تھے۔ جیسے ان کی شان میں قصیدہ پڑھا جا رہا ہو۔ ”اچھا تو۔۔۔۔۔“ وہ بولے ”چلے گی اب۔“

”اب۔۔۔۔۔“ وہ چونکی۔ ”نہ بھی ہم تو پنکھا دیکھ کر جاویں گے۔“

”بڑی متوالی ہے پنکھے کی۔“ سیز مین ہنسا۔

”متوالی ہی تو ہے۔“ مین کے سپاہی نے گویا پھر وار کیا۔

”میلہ دیکھ کر پنچوں گی۔ ہاں۔ سچی بات کوں گی۔“

”میلہ تو تم خود ہو۔“ علی احمد قہقہہ مار کر ہنسے۔ ”دنیا دیکھ رہی ہے۔“

”اوں۔ جھوٹ۔“ اس نے لاڈ سے گویا شکایت ”کما“ کوئی بھی تو نہیں دیکھتا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”وہ تو انگلیاں اٹھا رہے تھے۔ تمہاری طرف۔“

”پڑے اٹھائیں۔ اپنی بلا سے۔۔۔۔۔ اور وہ میری ججج لائے ہو۔“

مین کے سپاہی کا قہقہہ یک قلم موقف ہو گیا۔ ”اود مجھے یاد نہیں رہا۔“ وہ سنجیدہ۔

بولے۔

”وہ کیوں یاد رہنے لگا۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”بھیج دیں گے۔ بگڑتی کیوں ہو۔“

”کیوں نہ بگڑوں بس ایک ہی بات یاد رہتی ہے تمہیں۔“

”ایلی کے ہاتھ بھیج دوں گا۔ یہ ایلی ہے میرا لڑکا۔“

”اچھا تو یہ ہے ایلی۔“ وہ لاڈ سے چلائی۔ ”پڑھتا اے تو۔“

”صبح مل لینا اس سے اپنی چیز بھی لے لینا۔“ علی احمد بولے۔ ”چلو ایلی۔“

اس کے جانے کے بعد وہ بولے ”چلو تمہیں میلہ دکھادیں۔ دیکھو گے نا۔“

اگلے روز صبح سویرے ہی علی احمد نے ایلی کو آواز دی اور اس کے ہاتھ میں ایک دا

نوٹ دے کر ایک ٹھنڈی سی تھادی۔ ”یہ اودھ لے جا۔“ وہ بولے۔ ”غلام محمد چہرہ اسی ہا

ہے وہ تمہیں ساتھ لے جائے گا۔ نوٹ جیب میں ڈال لو مگر نہ جائے اود یہ ٹھنڈی اسے د

غلام محمد کو وہ اٹھا لے گا۔ سمجھ۔ غلام محمد۔“ انہوں نے چہرہ اسی کو آواز دی۔ ”ایلی کو لو

جاؤ۔“

”بڑی گرم ہے بڑھیا آج راجو۔“ غلام محمد نے آنکھیں جھپک کر کہا۔

”اس کا کیا ہے۔ یونہی بولتی بکتی رہتی ہے۔“ راجو نے خڑے سے جواب دیا۔ غلام محمد سے قریب تر ہو گیا۔ اس کی نگاہوں میں عجیب سی چمک تھی۔ ایسی چمک جو کسی چہرہ کی آنکھوں میں نہیں ہوتی۔

”ساجو کو کوسی ہے۔“ وہ ہنسا ”تجھے نہیں۔“

راجو نے ایک انداز سے زبان ہونٹوں میں لے لی اور دوسرے کونے میں بیٹھی ہوئی عورت کی طرف دیکھا۔

دوسرے کونے میں ایک پست قد فریہ سیاہ فام عورت چارپائی پر بیٹھی پان لگا رہی تھی۔ اس کی انگلیاں انگوٹھیوں سے لدی ہوئی تھیں۔ ابھرے ابھرے گالوں میں یوں رینگ رہی تھیں جیسے ڈبل روٹی میں سیاہ دراڑیں پڑی ہوں۔

”ابھی ساجو کا کیا دیکھا ہے اس بڑھیا نے۔“ وہ بولی ”ابھی تو دیکھے گی۔ غضب خدا کا۔“

”تھی کی روٹی ہضم نہیں ہوتی۔ سوکھے ٹکڑوں کے بغیر جی نہیں سکتی یہ۔“

ساجو کے ابھرے ہوئے گالوں اور موٹی انگلیوں پر گویا جلی حروف میں حرص و ہوس کو تھا۔ اس کے ہونٹوں کو دیکھ کر ایلی محسوس کر رہا تھا۔ جیسے جو نکلیں ہوں۔ نہ جانے کیوں ایلی لگ رہا تھا۔ جیسے ساجو سرخ گوشت کا ایک لوتھڑا ہو۔

اس کے قریب ہی سب سے چھوٹی بہن آجو بیٹھی تھی۔ جیسے کسی سوکھے درخت سے لٹکی ہوئی شاخ ہو۔ اس کے چہرے پر اداسی برس رہی تھی۔ خدو خال سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی لٹکا ہو۔ ہاتھ ٹنڈ سے تھے۔ جیسے انگلیاں ٹوٹی ہوں۔ عمر بہت چھوٹی تھی لیکن چہرہ معصومیت سے تھا۔

ان تینوں میں سے صرف راجو ہی کو برداشت کیا جاسکتا تھا۔ لیکن پھر بھی جوانی کے سوا

میں کیا تھا اور جوانی بھی وہ جو نسائیت اور معصومیت سے یکسر خالی تھی۔ ایلی نے وہ نوٹ جیب نکال کر راجو کے سامنے رکھ دیا۔ ساجو نے نوٹ دیکھ کر سر اٹھایا اور پھر منہ بنا کر بیٹھ گئی۔

غلام محمد نوٹ دیکھ کر مسکرایا بولا ”میرا حصہ ری۔“

”تیرا حصہ۔“ راجو نے پیار بھری نظر اس کی طرف ڈالی اور پھر اپنی طرف یوں دیکھا

اس کا حصہ سمجھا رہی ہو۔

”اور ہمارا نام ہی نہیں لیتا کوئی۔“ زمین پر بیٹھے ہوئے سبز مین نے اپنی چادر اتار کر مسکرا

کر کہا۔

”بڑا سیٹھ مارا ہے نا اس لئے۔“ ساجو نے ہاتھ چلا کر نفرت بھرے انداز میں کہا۔

دلفشا ایلی کو یاد آیا ساجو۔ سلفے کی لٹ ساجو۔ سیٹھ گردھاری لال کی ساجو۔ اور اس

نے پھر سے غور سے ساجو کی طرف دیکھا۔ کیا سیٹھ اس طرح کی داشتہ رکھتے ہیں۔ جو عام لوگوں کے سامنے نکلی بیٹھنے سے نہیں گھبراتی۔ پھر اس نے راجو کی طرف دیکھا۔ دولت پور کی پٹانہ راجو اس کی دانست میں تو وہ چلا ہوا پٹانہ تھی اور اس کی حرکات و سکنات اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ لے اور صحن میں جا کر اس بڑھیا کے ساتھ مل کر چلائے۔

وہ اٹھ بیٹھا ”میں اب جاتا ہوں۔“

”لے پان تو کھا جا۔“ ساجو نے بازاری انداز میں لٹکارا۔

آجو سم کر کونے میں لگ گئی اور راجو مسکراتی ہوئی آگے بڑھی۔ ”یہاں آیا کرنا تیرا اپنا گھر ہے یہ۔“

باہر بڑھیا چیخ رہی تھی۔ ”حرام کاری کی لت پڑی ہے۔ انہیں خون چوسنے کا مزہ پڑ گیا ہے۔ جو نکلیں ہیں جو نکلیں۔“

نہ جانے بڑھیا کی بات نے ایلی پر کیا اثر کر دیا کہ گھر لوٹتے ہوئے تمام منظر ہی اس کی نگاہوں میں بدلا ہوا تھا۔ دوکانوں پر بیٹھے ہوئے لالے یوں دکھائی دے رہے تھے جیسے کڑے شکار کی ٹانگ میں بیٹھے ہوں۔ سودا بیچتے ہوئے بھابڑے چادر میں لپٹے ہوئے سبز مین کی طرح مسکرا رہے تھے۔ تماش بینوں نے اپنی نگاہوں کے جال بچھا رکھے تھے۔

ہواؤں کی دوکان پر مسکراتے ہوئے کھاتے ہوئے انسان پلپلے کینڑوں کی طرح ایک دوسرے کو اپنے لعاب وہن میں پھنسا رہے تھے۔ گھر میں علی احمد حساب کے رجسٹروں کا خون چوس رہے تھے اور کھڑکی میں کھڑی خیم یوں حسرت سے ان دیران کوٹھوں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ جو چوہارے کے عقب میں صحرا کی طرح پھیلے ہوئے تھے۔ جیسے وہ اسی بات کی متنی ہو کہ کوئی جو تک اپنے ہونٹ اس پر گاڑ دے۔ اس کے سر پر آسمان نیلے بازو پھیلائے ایک عظیم گدھ کی طرح چھایا ہوا تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود ایک جو تک ہو جسے خون چوسنے کے لئے کسی جسم کی تلاش ہو۔

گھونٹے پھرنے کے بعد جب وہ بڑے ڈاک خانے کی طرف سے مڑے تو وہ سوچنے لگا کہ
لوہر جانے کا مطلب۔ وہ تو گھونٹے پھرنے کی جگہ نہ تھی۔ وہاں تو وہ بازار تھا۔ جہاں لوگ دیکھے
جانا پسند نہیں کرتے۔

وہ ایک دودھ کی دوکان پر رک گئے۔ ”دودھ پو کے ایلے۔“ رفیق نے پوچھا۔
”نہیں۔“ ایلے نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”اچھا بھئی۔“ رفیق بولا ”بیویا نہ پو گھر جا کر بتانا نہیں۔“

”اور بتا بھی دو گے تو کیا ہے۔“ یوسف اپنے سپاہیانہ انداز میں چلایا۔ ”میرا تو بھوک کے
مارے دم نکلا جا رہا ہے۔ ڈالنا میاں آدھ سیر دودھ میں دو بن۔“ اور وہ دونوں اپنے اپنے پیالے
لے کر بیٹھ گئے۔ کچھ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر رفیق نے یوسف کو اشارہ کیا۔

”توبہ ہے۔“ یوسف چلایا ”شمیم کے ہاتھ کی پکی ہوئی روٹی کیسے کھا لیتے ہو تم ایلے۔“

”اسی ہاتھ سے بچوں کو پونچھتی ہے اور اسی ہاتھ سے آٹے کا بیڑا اٹھا لیتی ہے۔“ رفیق نے
آہ بھری۔

”اب کیا دودھ بھی حرام کرو گے تم۔“ یوسف چلایا۔

اس کے بعد ایلے کے لئے بھی شمیم کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا مشکل ہو گیا اور وہ تینوں جھوٹ
موٹ گھونٹے پھرنے کا بہانہ کر کے رات کے اندھیرے میں پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ بن
کھاتے اس وقت ایلے کے کلن ملحق بازار پر لگے رہتے۔ جہاں سے سارنگی کے سرگونجے اور طبلے
کی قلاب کے ساتھ ساتھ ایلے کا دل دھک دھک کرتا اور وہ حسرت سے ان چوہاروں کی طرف
دیکھتا جہاں جانا اس کے لئے ممنوع تھا اور جہاں جانے کی تمنا روز بہ روز اس کے دل میں بڑھتی جا
رہی تھی۔

سکڑ سارہ

رفیق اور یوسف کی ٹریننگ کلاس میں چار ایک عیسائی لڑکے بھی تھے جن سے ان کی راہ و
رم تھی۔ خصوصاً دکنز اور جان سے تو ان کی دوستی کی زیادہ تر وجہ یہ تھی کہ وہ دولت پور کی
عیسائی لڑکیوں کی باتیں کیا کرتے تھے اور رفیق لڑکیوں کی باتوں میں دلچسپی لیتا تھا۔ شاید اسی وجہ
سے وہ انہیں اکثر دودھ پلانے کے لئے مہلا لے کر نکالتا تھا۔

جب ایلے گھر پہنچا تو بلا قیستی پتھروں کا ڈبا کھولے بیٹھا تھا۔ ”ہاں بھائی صاحب یہ لعل ہے
چاندنی میں یہ پکھراج بدل جاتا ہے اور پھر بندر اس کی چمک کو دیکھ کر اسے اٹھلاتے ہیں۔ ہم
کے سفید مخملیں ہاتھ لعل کو یوں تھک رہے تھے۔ جیسے اس کی سرخی چوس رہے ہوں اور
کے قریب وہ بوڑھی جو تک اس کی چچی بلا پر نگاہیں گاڑے بیٹھی تھی۔ کتنی عجیب تھی
جو نکلیں جو نکلیں اور اجسام اور ارد گرد پھیلا ہوا اچھایا ہوا دیرانہ۔

پھر ایلے کی زندگی کے بھیا تک جمود میں ایک حرکت پیدا ہوئی۔ اس کے ماموں زاد بھائی
اور یوسف تار کا کام سیکھنے کے لئے دو ماہ کے لئے دولت پور آگئے۔ ان کے آنے سے ایلے
لئے اس صحرا میں ایک چھوٹا سا نخلستان بن گیا۔

کچھ اور بھی

سیٹھ جمنواس کے یتیم خانے میں ایلے دن گزارتا۔ جس کا نام کالج رکھ دیا گیا تھا۔
شام کے وقت کالج سے سائیکل پر پاؤں مارتا ہوا گھر پہنچتا پھر رفیق اور یوسف کے مہرلوہ بازار
کے چکر کاٹتا اور رات کو گھر آکر پڑا رہتا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ دنیا صرف جو تک اور
کے اجتماع کا نام نہ تھا وہاں جو تکوں اور جسموں کے علاوہ اور بھی کچھ تھا۔ بے نام سا کچھ جس
پاکیزگی کی جھلک تھی۔ مثلاً رفیق اور یوسف مثلاً سامنے چوہارے میں دو بلوریں پاؤں چست پا
یا وہ سیاہ آنکھ جو کبھی کبھار ان جنگلوں میں سے ظلوع ہوتی تھی۔ جس کا مقصد نہ دیکھنا تھا نہ
جسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ حسین ہے کیف آور ہے اور جھلکتی ہے۔ ایلے اسے دیکھتا تھا
جتائے بغیر دیکھنا چاہتا تھا کہ وہ اسے دیکھ رہا ہے اسے اپنے طرف مائل کرنے کی کوشش کے
اسے دیکھتا تھا۔ اور پھر اس اضطراب سے بچنے کے لئے جو اسے دیکھنے سے ایلے پر طاری ہو جاتا
وہ رفیق اور یوسف کو دیوانہ وار تلاش کرتا تھا۔

رفیق اور یوسف کے آنے سے اسے ایک نقصان بھی ہوا۔ انہوں نے ان جانے میں ایلے
علی احمد کے گھر سے رہا سا تعلق بھی توڑ دیا۔

شام کو کھانے کے بعد وہ چپکے سے ایلے سے کہتے ایلے چلو ذرا گھوم آئیں۔ پہلی مرتبہ
انہوں نے ایلے کو گھونٹنے کی دعوت دی تھی تو اس کا جی چاہتا تھا کہ انکار کر دے لیکن ایلے
کے خلاف وہ ان کے ساتھ چل پڑا تھا۔

بہر حال اہلی ان کی باتیں سنا کرتا۔ کیتھی کو دیکھنے کا شوق رفیق کے دل میں اس قدر بڑھ

آنکھوں سے دو آنسو گالوں پر ڈھلک آئے۔ پھر اس نے سر جھکا لیا۔ سسٹرنے آکر اسے قہر لیا۔

اندھا کنواں

پھر گرمی کی تعطیلات کی وجہ سے کالج بند ہو گیا۔ یوسف اور رفیق کی ٹرننگ بھی ختم ہو چکی تھی۔ علی احمد سے اجازت لے کر اہلی رفیق اور یوسف کے ساتھ علی پور آیا۔ گرمی کی چھٹیوں میں محلے کی زندگی میں ایک عجیب و غریب گہما گہمی پیدا ہو جاتی تھی۔ ملے کے ملازم پیشہ لوگ انہی دنوں چھٹی لے کر آیا کرتے تھے تاکہ محلے والوں سے میل ملاپ قائم رہے۔ اگر وہ خود چھٹی پر نہ آسکتے تو وہ ایک ماہ کے لئے بچوں کو ضرور علی پور بھیج دیتے۔ اتنی دیر باہر رہنے کے بعد عورتیں زرا لیج دھج کے ساتھ علی پور میں داخل ہوتیں اور اپنے بے حاصل کردہ فیشن اور خیالات کو اک شان سے محلے کے عوام کے سامنے پیش کرتیں۔ اپنی عظمت کا رعب ڈالنے کی کوشش کرتیں۔

”نہ بہن بچے کو ڈرایا نہیں کرتے اس طرح بچے کے دل میں ڈر بیٹھ جاتا ہے۔ ہاں میں تو پیٹ لیتی ہوں۔ اپنے سیدی کو لیکن ڈرانا۔۔۔ انہوں!“

دوسری بولتی نہ بہن یہ چند رسائٹل نہ چلے گی اس شلوار کے ساتھ۔ اب تو بہن چمکدار چیز کوئی بھی پسند نہیں کرتا۔ میں نے جیسی بوسکی کی قمیضیں سلوائی ہیں۔

جوان لڑکیاں کھڑکیوں میں کھڑی ہو کر محلے کی کھڑکیوں کے سامنے اپنے لباس کی نمائش کرتیں۔ لڑکے اپنے دوستوں سے مل کر نئی سیکھی ہوئی باتوں کا ریکارڈ چلاتے۔

محلے کے بوڑھے ان کی باتیں سن کر مسکراتے جیسے پاگل خانے سے چھوٹ کر آئے ہوں پھر وہ کھنکارتے اور زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے مسیحا کا رخ کرتے۔

بوڑھیاں آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر ارد گرد دیکھتیں اور پھر ”توبہ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔“ کہتی ہوئیں اپنے اپنے کام میں لگ جاتیں۔

محلے کی جوان لڑکیاں حسرت بھری نگاہوں سے ان نوداروں کی طرف دیکھتیں۔ کاجی چاہتا کہ باتیں کرتی رہیں اور وہ سنتی رہیں۔ ان کی آنکھوں میں گویا شوق کے دیئے روشن جاتے۔

اس لحاظ سے محلہ ہر سال موسم گرما میں کیٹیجی بولا کرتا تھا۔ جس طرح خزاں میں درخت پرانے پتے گرا دیتے ہیں اور نیا سبز جامہ اوڑھ لیتے ہیں۔ اس کے بلوجود آصفی محلے کی زندگی بنیادی طور پر ویسے ہی اپنے صدیوں پرانے محور پر گھومتی رہتی محلے میں تبدیلی آتی تو نمی۔ لیکن کچوا چال سے کسی کیڑے کے رینگنے کے مترادف تھی۔ درحقیقت اپنی مخصوص کہنہ کج رفتاری کی وجہ سے وہ محلہ لوگوں کو پیارا تھا۔ چونکہ وہاں جا کر وہ اپنے عظمت جتا سکتے تھے۔ نئے حاصل شدہ خیالات سے محلے والوں کو مستفید کرنے کے عمل میں یہ خوش فہمی دل میں رچا سکتے تھے کہ وہ نئے خیالات سے کماحقہ واقف ہیں۔ درحقیقت آصفی محلہ وہ اندھا کنواں تھا۔ جہاں کوئی سمندری مینڈک داخل نہ ہوا تھا۔ جہاں جوہڑ کے مینڈک پھدکتے تھے اور وہ کبھی اس قدر نہ پھولے تھے کہ اپنے آپ میں سانہ سکیں۔

شیش کے قریب انہیں رضائل گیا۔ ”بھئی واہ۔“ وہ چلایا۔ ”آگے جناب۔ بھئی کیوں نہ آئے۔ اب بھی نہ آتے تو کب آتے سلون آیا اور مینڈک نہ ٹرائیں۔“

یہ کہہ کر وہ اہلی سے بات کئے بغیر لاشی گھماتا ہوا کچری کی طرف چل پڑا۔ ابھی آتا ہوں ذرا کچری جاتا ہے۔ ”وہ کھٹ کھٹ چلتے ہوئے چلایا۔ ”ہوگی ملاقات دوکان پر۔“

برساتی نالے کے پل پر انہیں چچا عمو ملے ”ہوں۔“ انہوں نے آنکھیں پچکاتے ہوئے کہا ”آگئی یہ بھجن منڈلی۔ چلو یہ بھی اچھا ہی ہوا۔ کب سے مندر میں گھنٹیاں بج رہی تھیں۔“ یہ کہہ کر زیر لب لاحول پڑھتے ہوئے وہ شیش کی طرف چل دیئے۔

”اس اللہ لوگ کو مندر کی گھنٹیوں کی آبا سو جی۔“ اہلی نے رفیق سے کہا۔

”بس جو منہ میں آیا چلا دیا۔“ یوسف نے بے پروائی سے کہا۔

”کوئی بات ضرور ہے۔“ رفیق اپنے بھیکے بھیکے انداز میں بولا۔

چوراہے کے قریب چچی اہل کو دیکھ کر اہلی نے جھک کر سلام کیا۔ ”جیتے رہو۔“ وہ بولی چمچی پر آئے ہوئے اچھا ہے۔ اچھا کیا۔ دیکھ لو تم بھی رونق چار دن کے لئے دن ہیں ملا۔“

کھانگی اہل کی بات سن کر ان کا ماتھا ٹٹکا ضرور کوئی بات ہے۔ نہ جانے کیا ہے۔ مگر ہے اور جی تو وہ سب اشارتا ”انہیں سمجھا رہے تھے کچھ رفیق بھی گھبرا گیا۔ لیکن یوسف قہقہے مار رہا تھا۔“ اسے یار خواخواہ ڈرتے ہوئے۔

واسطہ ہے غلاموں کی بات سمجھنا لائن سے پوچھو۔ ”فیا حسب معمول آنکھوں میں مسکرانے لگا۔
 ”ہن کی پانچوں سہمی میں ہیں آج کل۔“ ارجمند بولا ”اور ہمارا سرگزشتی میں ہے۔“
 ”کیوں بھی یہ ٹھیک کہتا ہے ارجمند۔“ ایللی نے بات سمجھے بغیر فیا سے پوچھا۔
 ”کیا ہے۔“ فیا ہنسا ”وہ تو میرا بھائی بن گیا ہے۔ ایمان سے۔“ اور پھر چوگان کی طرف چل

پڑا۔
 ”ہے۔“ ارجمند نے چھاتی پر ہاتھ مارا۔ ”وہ ہماری بہن ہی بن جاتی۔“ وہ فیا کی طرف دیکھ
 کر چلایا۔ پھر ایللی سے مخاطب ہو کر بولا ”اچھا بیٹا تو جاؤ دادی امں کے چرن چھو آؤ۔ خاکسار کچی
 حویلی کی لائین کے نیچے ڈیوٹی دے رہا ہو گا۔ دادی امں کے بنے ہوئے لذو کھانے نہ بیٹھ جانا
 ورنہ خاکسار کی آہ پڑے گی تم پر۔“

ایللی کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آخر وہ کون تھی اور وہ کون تھا اور محلے والوں کے اوسان
 کیوں خطا ہو رہے تھے ارجمند اور فیا کی تو اور بات تھی مگر چچی امں اور بچا عملو ظاہر تھا کہ بچا عملو
 بھی متاثر ہوئے بغیر نہ رہ سکے تھے۔ ایسا کون تھا وہ۔

چوگان میں پہنچ کر اس نے ڈرتے ہوئے چاروں طرف دیکھا مگر محلے والیوں کے سوا وہاں
 کوئی نہ تھا اور محلے والیاں حسب دستور اسے دعائیں دے رہی تھیں۔

”اللہ بڑا مرجہ نصیب کرے۔“

”کون آیا ہے چاچی۔“

”اے ہے اپنا ایللی آیا ہے۔“

”جیتا رہے بی بی امں کے کلیجے کی ٹھنڈک ہے۔“

ڈیوڑھی میں جا کر وہ ڈر گیا اس کے سامنے نذیراں کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”تم آ گئے۔ اب
 پلے نہ جانا۔“

”ہائے کون ہے؟“ دادی امں چلائی۔ ”دیکھ تو سیر میوں میں لڑکی جیسے کسی کی پٹائی ہو رہی
 ہو۔ ہائیں ایللی تو ہے۔ تو نے تو مجھے ڈرا ہی دیا۔ کیا ایسے چڑھا کرتے ہیں سیر میاں۔ کب آیا تو۔
 راضی تو رہا۔ علی احمد کیسا ہے۔ بچے کیسے ہیں۔ وہ خود نہیں آیا چھٹیاں کب ہوں گی اسے؟“

سعیدہ اسی طرح گھٹنوں میں سر دیئے دادی امں کے پاس بیٹھی تھی۔ ”امں سے ملا تو دادی
 امں نے کلمہ۔“ وہ اوسہری رہتی ہے۔ فرحت کے پاس۔ اچھا مل لیجو جا کر ذرا بیٹھ تو۔ اب تو اتنا

ڈیوڑھی میں ارجمند نے اسے پکڑ لیا ”ارے تم ہو ایللی تم۔ ارے پٹ گئے۔ پتہ ہو
 بریلو ہو گئے۔“ پھر اس نے رفیق اور یوسف کو دیکھا اور دفعتاً ”پلو بدلا۔ پلو بدلنے میں اور
 مکمل حاصل تھا۔

”السلام علیکم بھائی صاحب مزاج اچھے ہیں صاحب اپنا حال تو بتا رہا ہے اس ایللی کے
 کم بخت منہ موڑتا ہے تو پھر ادھر دیکھنے کا نام ہی نہیں لیتا اور فرمائیے آپ تو خیریت سے
 ہیں۔“
 رفیق مسکرا کر آگے کو چل دیا۔ تو ارجمند نے ایللی کو رکنے کا اشارہ کیا ”ابے ٹھہر
 سے ملے بغیر دادی امں کی جھولی میں کیسے جاسکے گا تو۔“

وہ اور وہ

رفیق اور یوسف کے جانے کے بعد ارجمند نے اپنے سینے پر دو ہتھ مارنے شروع کر دیے۔
 ”بتائی بریلوی۔ بتائی بریلوی۔ ارے یار وہ سارا اینٹ البحر کا دفتر بے معنی ہو کر رہ گیا وہ انکار
 خاک میں مل گیا اور یہ پریم ٹوٹا اور پریم پھرا۔ اس نے اپنی بانسری اور ر۔ شمس روہل کی
 اشارہ کر کے کہا ”سب قیل“ وہ تو نگاہ اٹھا کر نہیں دیکھتی نہ جانے وہ ناگ کس بین پر مت
 ارے ارے کوئی ناگ سا ناگ ہے۔ اف، اف، اف کی بھین ہے۔ کیا دم خم ہے۔ کیا
 ہے۔ ایک نگاہ دیکھ لے تو دن بھر سرور نہیں جاتا۔ اور سانوہا رنگ جیسی گوگل کا کتیا ہو۔
 بولو وہاں اس خاکسار کی بانسری کیا کر سکتی ہے۔ بیچاری“ ”آخر بات بھی کرو گے۔“ ایللی نے
 کر پوچھا۔

”لو بھی۔“ ارجمند نے سر پیٹ لیا ”اور یہ کیا بکواس کر رہا ہوں۔ میاں دیکھو گے وہ
 اڑ جائیں گے وہ چیز ہے جو دیکھے بنا تصور میں نہیں لائی جاسکتی۔ اللہ اللہ کیا چیز ہے۔ خدا
 اس مسجد پر ایک۔۔۔ بھر پور نگاہ ڈال دے تو ایک آن میں سلی آپ ہی بت بن جائے
 لو جو کرتا ہے۔ ہے۔ ہے۔“

فیا کو آتے ہوئے دیکھ کر ارجمند ایک ساعت کے لئے خاموش ہو گیا۔ ”لو بھی۔“
 لب بولا۔ ”آگئی، ٹھنڈا لائن لہذا اپنی گاڑی رک گئی۔“

اپن کی تو مین لائن ہے بھائی۔ سیدھے روٹ پر چلنا جانتے ہیں ہم۔ ہمیں تو حوصلہ

بڑا ہو گیا ہے تو منہ پر داڑھی نکل رہی ہے۔“ دادی امل نے حیرانی سے اس کا جائزہ لیا مگر کھائے گاہ تیرے لئے بہت کچھ رکھا ہوا ہے۔ میں نے ہاں۔ اے حمیدہ رشیدہ لڑکیو تم کچھ رہی ہو۔ جاؤ اپنا کام کرو۔“ وہ ان دو لڑکیوں سے مخاطب ہو کر کہنے لگی جو دروازے میں کھڑی غور سے ایللی کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

رشیدہ اور حمیدہ سیدہ کی بہن نیاز کی بیٹیاں تھیں۔ ان کی والدہ فوت ہو چکی تھی اور اب دونوں دادی امل کے پاس آگئی تھیں ”جارشیدہ جا کر وہ کمرہ صاف کر دے۔ حمیدہ تجھے توہمرا ہے ابھی برتن مانجنے ہیں۔“

”اچھا ایللی۔“ دادی امل بولی ”علی احمد نے میرا خرچ نہ بھیجا۔ کیا اسے خود خیال نہیں آئے ہے میں کیوں یاد کراؤں۔ خدا نہ کرے۔ مجھے کوئی بے اعتباری ہے۔“ ایللی نے بڑھ کر دادی امل کو گود میں لے لیا۔ ”اے ہے چھوڑ۔“ وہ چلائی۔ ”جیسے کوئی دس سال کی بچی ہو تو توہمرا ہڈیاں توڑ دے گا۔ توبہ ہے۔ دیکھتے دیکھتے کتنے بڑے ہو جاتے ہیں یہ ہاتھوں کے چنے۔ اچھا اور بات سننا۔ وہاں کیسے رہتا ہے تو۔“ وہ بولے جارہی تھی اور ایللی سوچ رہا تھا کتنی پیاری ہے دادی امل۔ اس کے پاس آکر یوں لگتا ہے کہ جیسے بچہ گھونسلے میں آگیا ہو۔ دادی امل کے پاس کروہ بھول جاتا کہ ارجمند کچی حویلی میں اس کا انتظار کر رہا ہے اور وہ کون تھا جسے خیالے ہمارا لیا ہے۔ وہ سانوری کون ہے جو کسی بین پر مست نہیں ہوتی۔

بیگم

نہ جانے وہ کب تک دادی امل کی ہڈیوں سے چٹ کر بیٹھا رہا حتیٰ کہ ہاجرہ آگئی۔ ”ایللی آیا ہے۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھلی ہوئی تھیں ”ایللی آفرحت تیرا انتظار کر رہی ہے۔“ ”جابل آ۔“ دادی امل بولی۔ اور وہ اٹھ کر امل کے ساتھ فرحت کی طرف چل پڑا۔ ابھی وہ فرحت سے بات کرنے ہی لگا تھا کہ اوپر کی سیڑھیوں میں شور ہوا۔ ”سننا ہے ایللی ہے۔“ شہزاد کی آواز دور سے گونجی۔ شہزاد کی آواز کی سرتل ہی زلزلہ تھی۔ اس کا ہر اندازہ والیوں سے مختلف تھا۔ ایللی نے شوق سے سیڑھیوں کی طرف دیکھا۔ سامنے شہزاد کھڑی مسکرا تھی۔ موتیا گھڑی کے پٹ پورے طور پر کھل چکے تھے۔

شہزاد کی ہر بات میں عورت اور لڑکی کی عجیب و غریب آمیزش تھی۔ ایسی آمیزش جو

کی کسی عورت یا لڑکی میں نہ تھی۔ شہزاد میں بچپن کی ایک ایسی جھلک تھی جو دوسروں کو کھینچنے پر آسانی تھی۔

ایللی نے شہزاد کو دیکھ کر سر جھکا لیا۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ شہزاد کے رو برو اس کے جسم و روح کا رواں رواں جی ہاں کہہ کر سر جھکا لیا کرتا تھا۔ ”وہ بلا تے ہیں تم کو چائے پر۔“ شہزاد مسکرائی۔ ”چلو میرے ساتھ۔“ اور ایللی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔

”تم آگئے“ شریف اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس کی آنکھیں اسی طرح چھت پر لگی ہوئی تھیں۔ البتہ ہونٹوں پر ہلکا سا تبسم تھا۔ ایللی کی نگاہ میں شریف کس قدر خوش نصیب تھا جسے شہزاد نے اپنا تھا۔ جس کی زندگی شہزاد کی روشنی سے منور تھی۔ لیکن بظاہر شریف پر اس کا کوئی اثر نہ تھا۔ وہ اب بھی انور کے خیال میں ویسے ہی مست رہتا تھا۔ کتنا وفا شعار سچا عاشق ہے۔ اس کی محبت کو کوئی چیز متزلزل نہیں کر سکتی۔ جس کی زندگی میں شہزاد سی موتیا گھڑی کھل کر بھی کوئی تبدیلی پیدا نہیں کر سکی۔

”ہوں تم کیسے ہو ایللی۔“ ایک بلو قار حسین عورت اس کے رو برو آکھڑی ہوئی۔

ایللی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”سلام کتا ہوں۔“ وہ کھڑا ہو گیا۔

”یہ ایللی ہے امل۔“ شہزاد نے اس عورت سے کہا۔

”مجھے یاد ہے۔“ وہ بولی۔ ”برات کے دن اندر آیا تھا۔ وہی تو ہے۔“ ایللی نے اس کی طرف ڈرتے ہوئے دیکھا۔ اونچا لمبا قد۔ فریہ جسم اور پر وقار چہرہ۔ اس کے خدو خال میں حسن و وقار کی عجیب آمیزش تھی۔ آنکھوں میں حکومت کی چمک تھی۔ آواز میں دبدبہ تھا۔ اس کی انگلیوں میں عجیب قسم کی انگوٹھیاں تھیں۔ جن میں تک کلی کی طرح ابھرے ہوئے تھے۔

”بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گویا ایللی کو ڈانٹنا۔ تیرے باپ کا کیا حال ہے۔ اب تو کشمیر کے سیب سے بھر گیا ہو گا اس کا دل کوئی نئی نویلی چیز میں ہے نگاہ میں۔“

”جی جی۔“ ایللی بن سوچے سمجھے کہے جا رہا تھا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا وہ اس کے رو برو بیٹھا رہے اور تنکھیں سے اس کی طرف دیکھتا رہے۔ اس وقت وہ شہزاد کو بھی بھول چکا تھا۔ اور شریف تو بالکل ہی ذہن سے اتر چکا تھا۔

پھر لمحہ کمرے سے کسی نے آواز دی اور بیگم بولی ”پھر بیٹھوں گی کسی وقت تیرے پاس۔“

یہ کہہ کر وہ چلی گئی اور طلسم ٹوٹ گیا۔

لمحہ کرے سے شہزاد کی سی کئی ایک آوازیں سنائی دے رہی تھیں اور وہ محسوس کر تھا۔ جیسے جن میں ہمار آگئی ہو۔ لیکن وہ جن اہلی کے لئے ممنوع تھا۔ ممنوع نہ بھی ہوتا تو اس کی جرات نہ ہوتی کہ وہاں جا کر دیکھتا کہ وہ آوازیں کن کی تھیں۔ جرات ہوتی بھی کیے اس میں کوئی بھی خوبی نہ تھی۔ چہرہ کارٹون سا تھا۔ جسم ہڈیوں کا ڈھانچہ دکھائی دیتا تھا۔ رنگ تھا۔ کوئی بھی تو ایسی خصوصیت نہ تھی جس کے بل بوتے پر وہ اپنے آپ کو درخور اعتنا سمجھ امید رکھتا اور جرات کو کلام میں لاتا۔

سانے شریف لیٹا ہوا نہ جانے کیا کہہ رہا تھا۔ وہ اپنے ہی دنیا میں کھویا ہوا تھا۔ نگاہیں اہم کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ اہلی دنیا میں کھویا ہوا ہے۔ اور اس کی بات نہیں سن رہا۔ اسے اس سے غرض نہ تھی کہ کوئی اس کی بات سنے۔ اسے تو کہنے سے غرض نہ اور بات کہنے کے لئے اس نے اہلی کو جن لیا تھا اور اہلی سننے کا انداز قائم کئے کچھ سوچ رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیا سوچ رہا ہے کیا محسوس کر رہا ہے۔ اپنے محسوسات کو اپنا لے شاید اسے ندامت ہوتی اس لئے اس نے اپنے محسوسات کو واضح طور پر کبھی نہ اپنایا تھا اور قہر ہی کسی جن میں رنگین چیزیاں چمک رہی تھیں دور کچی حویلی کی لائٹیں کے نیچے انگریزی کی شیدائی پریم سندس تھامے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

کار اور خاکسار

اگلے روز صبح سویرے ہی ارجمند آگیا۔ ”اوزید کے چیلے۔“ وہ آتے ہی چلایا ”کل سارا دن مجھے کچی حویلی کے صحرا میں پیسا مارا اور خود کو کل کے بن میں سانوری سے سانوری سے رنگ پکڑی کھیلنے میں مصروف رہا۔ تف ہے تیری دوستی پر۔“

جب اہلی نے سانوری کے متعلق اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تو ارجمند قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”ہمیں بتانا ہے یا رہمیں جنہوں نے پریم دو یا پر باہن ہی میں عبور حاصل کر لیا تھا۔ اپن ہا ہا جنہوں نے پانی پت کی ڈسپنری کی میزوں پر پریکٹیکل ٹریننگ حاصل کی ہوئی ہے۔ کو تو سند دیا دیں۔ سند یافتہ لوگوں کو چٹکیوں میں اڑانا آسان نہیں۔ اچھا تو بیٹا کل کی رپورٹ دو۔ کونے مراحل طے کر لئے اور کون کونے باقی ہیں۔ لیکن یا رکھ گیا ہے کیا انداز پایا ہے۔ اور پھر

اللہ حساس اور سمجھدار۔ ہلکی سی جنبش بھی نوٹ کئے بغیر نہیں رہتی۔ رومل کی ہلکی سی جنبش کی یوں۔ مطلب خاکسار ابھی حاضر ہوا۔ فوراً بات پالی لیکن کیا عجل کہ چوتن سے ظاہر ہو۔ صرف ایک لطف مسکراہٹ اور پھر فوراً جتا بھی دیا۔ ہم سمجھ گئے۔ خاکسار ہو آئے اجازت ہے جب تک ہمیں چوگن سے کوئی دلچسپی نہیں ”اور پھر چوگن سے کوئی دلچسپی نہیں“ اور پھر چوگن سے منہ موڑ کر کھڑے ہو گئے اور جب تک خاکسار واپس نہ آیا ویسے ہی کھڑے رہے۔ واہ واہ کیا ذہانت ہے۔ جتنی بڑی بے پروا ہے۔ اتنی ہی چھوٹی حساس ہے۔ واہ واہ اپنا انگریزی وہ چلا ہے کہ بس کیا بتاؤں۔“ وہ رک گیا۔

”لیکن سب بیکار ہے۔“ اس نے پینتزا بدلا ”سب بیکار انگریزی کا ہوش بھی رہا ہو۔ کس کافر کو ہوش رہے گا۔ میاں کب تک مچھلی کانٹے پر لگی تڑپتی رہے اب تو وقت ہے کہ سرکار ڈوری کھینچیں۔ لیکن سرکار بھی کیا کریں اہلی وہ تو خود مہمان کی حیثیت سے آئے ہوئے ہیں وہ کیسے کھینچیں اور خاکسار کے لئے یہ رنگ محل ممنوع ہوا۔ وہاں جائے تو کس بہانے جائے اسی فکر میں تھا خاکسار کہ اللہ نے رحمت کافر شہر بھیج دیا یعنی تم آگئے اور تم یہاں پہنچتے ہی یزید بن کر رہ گئے۔ بٹے بٹے۔“

سانورے کنہیا

”ہا ہا ہا“ دقتاً ارجمند چیخ کر بولا۔ ”ہم اپنی رام کہانی میں لگے ہیں اور وہ دیکھو وہ۔ اس کمر کی میں ارے اندھے وہ والی جو اندھیری ڈیوڑھی کے اوپر کھلتی ہے۔ نہ جانے سانورے کنہیا کب سے اپنی گویوں کے انتظار میں کھڑے ہیں۔ اے ٹھہرتو۔ اتنا بے صبر کیوں ہوا جا رہا ہے۔ مجھے پرہم تو کر لینے دے۔“ اور وہ درشن کے بن ترس گئی اکیاں گنگناؤں اور رومل ہلانے لگا۔ کمر کی میں ایک اونچی لمبی لمبی لمبی پلکوں سے سیاہ خوابیدہ آنکھوں کو ڈھانچے کھڑی تھی۔ اس کے نقوش ستواں تھے۔ چہرے پر انوکھی سی ر۔ شمس ملاحظت کا شفاف سا نقاب پڑا تھا۔ جیسے کوئی سنڈلا ہاتھ میں شیشے کا سپر لئے حیران کھڑی ہو۔ ”لیکن یہ ہے کون؟“ اہلی چلایا۔

”کیا واقعی۔“ ارجمند نے حیرانی سے اہلی کی طرف دیکھا۔ ”ہم تو سمجھ رہے تھے کہ بتا رہا ہے ہمیں۔ ارے بھائی یہ سب تمہاری اس موٹگیا گٹھڑی سے نکلے ہوئے فتنے ہیں۔ جب سے وہ پنڈورا میل آئی ہے رنگین مصیبتوں کا ایک صندوق کھل گیا ہے۔ اب کر لو جو کرنا ہے اور ابھی

دوران میں اہلی اس آئینے کی طرف دیکھتا رہتا جو جیل نے ایسے زاویے پر لگا رکھا تھا کہ نیچے سے آتا ہوا ہر شخص پہلے ہی نظر آجائے۔

جیل شوکت سے باتوں میں مشغول رہتا۔ شوکت نہایت معصومیت سے جیل کی طرف دیکھتا اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ روز اسے اتنی مٹھائی کیوں کھلاتا ہے اور اہلی اس آئینہ پر کیوں جکارتا ہے۔

دوپہر کے وقت شہزاد کی والدہ آجاتی جسے سب بیگم کہتے تھے اور وہ تھی بھی تو بیگم۔ اہلی اکثر محسوس کرتا تھا کہ اس کے سر پر چھوٹا سا تاج بھی ہونا چاہئے تھا جیسے بیگمات پہنتی ہیں۔ اس کے اندر میں بلا کارعب تھا اور اس کی نگاہوں میں ایک عجیب شان بے نیازی تھی۔

بیگم کو آصفی محلہ بالکل ناپسند تھا ”یہ کیا ہیں تمہارے محلے کے مکانات۔“ وہ اہلی سے کہتی ”اندھیرے کوئے اجڑے ہوئے چوہارے جیسے گلی سڑی پیاز کے چھلکے ہوں ایک دوسرے کے اوپر۔ دوسرا تیرنے کے اوپر توبہ ہے ہمارے یہاں تو صاف سترے کمرے ہوتے ہیں اور شہزاد کے اہل تو ایک دن بھی نہ ٹھہریں یہاں بڑے صفائی پسند ہیں وہ اور یہ جو تمہاری محلہ والیاں پکاتی ہیں۔ جسے تم لوگ کھانا کہتے ہو۔ ان کے سامنے رکھا جائے تو طوفان اٹھا دیں۔ تمہارے محلے کے مرد تو بد جو نہیں بد جو۔ مردوں کی سی بات نہیں ان میں۔ کبھی ہمارے یہاں آؤ تو تمہیں دکھاؤں میں۔“

اہلی مسرور ہو کر بیگم کی باتیں سنتا۔ اس وقت اسکی نگاہوں میں نور پور کا وسیع میدان پھیل جاتا اور قلعے کے برج ابھرتے اور وسیع فراخ کمرے کھلتے اور بالاخر ایک زرد مینڈک اور دو حنائی انگلیاں اس کی طرف بڑھتی۔

پھر شام کے وقت جب سورج غروب ہونے کے لئے مغرب میں اترتا تو اہلی کوٹھے پر چڑھ جاتا اور کتب ہاتھ میں لے کر وہاں ٹھٹھا جیسے سبق یاد کر رہا ہوتا کہ متصل کوٹھے پر سانوری کو دیکھ سکے اور متصل کوٹھے پر ہلکے رنگوں میں لمبوس سانوری یوں شلتی جیسے اسے اہلی کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہو۔

اس کی بڑی بڑی آنکھیں دور کسی افق پر مرکوز ہو جاتیں۔ اس کا دوپٹہ یوں لٹکتا جیسے تاج پوشی کی تصاویر میں شہزادیوں کے پیچھے رہنے والی شہزادیاں ہوتی ہیں۔ تک تک تک۔ اس کی اونچی ایڑی والی گرگجی بلیمت لے میں تل دیتی اور پھر نہ جانے کیا ہوتا۔ گرد پیش کے دھندلے

دیکھا گیا ہے ابھی تو وہ گلاب کا پھول اور رس گھا بھی ہیں۔ اف! وہ گلاب کی کلی جب کلی کا دنیا پر رنگ کی وہ قیامت ٹوٹے گی کہ آنکھیں پھٹ جائیں گی۔ چھ سال کی عمر میں یہ کیفیت کہ مسکراتی ہے تو فضا میں قدیلیں روشن ہو جاتی ہیں اور وہ ان کا بھائی شوکت جیسے موم ہو۔ فیا تو اسے دیکھ کر ہمیشہ کے لئے بد معاشی سے توبہ کر چکا ہے اور جیل بیڑے کھلے بغیر شغل کو بھول چکا ہے خیر اپنے کو تو بھٹنڈا لائن سے کوئی دلچسپی نہیں۔ اپن کو تو بار بار یہ سنا ہے کہ تکیا لے ڈوبے اور حضور گاتے بھی ہیں واہ وا کیا گاتے ہیں۔ چار ایک دن ہوئے بھجن منڈی براجمن ہوئے تھے۔ وہ رنگ بنایا کہ بس کیا پوچھتے ہو۔ محلے کے لڑکوں کے دل کالوں میں خم ہو گئے اور نفسوں نے وہ تل دی کہ بس اسے ہے۔“ وہ چھاتی پر دو ہنر مارنے لگا۔

عین اس وقت میڑھیوں سے پاؤں کی چاپ سنائی دی جیسے کوئی نیزے پر تلچ رہا ہو اور پھر جم سے شہزاد داخل ہوئی۔ اس کا سانس چڑھا ہوا تھا۔ دوپٹہ کندھوں پر اڑ رہا تھا۔ منہ پر راز جھللا رہی تھی۔ ”اہلی اہلی۔“ وہ بولی ”کب سے تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔ چائے سامنے رکھو۔ جلدی آؤ۔“ یہ کہہ کر وہ واپس دوڑ گئی۔

ارجمند از سر نو سرپٹنے لگا ”ہائے اللہ کیا کریں ہم کدھر جائیں ہمیں کوئی نہیں بلاتا چائے کوئی پوچھتا ہی نہیں کہ میاں کون ہو۔ سیر ہو یا پاؤ ہو۔ اچھا بھئی جاؤ۔ مزے اڑاؤ۔ اپن کا ہے۔ جیسے تیسے وقت بتالیں گے بس یہی فرق ہے تاکہ تم سنگ ساتھی ہو اور ہم پردیسی رہا رکھو دوست۔ سنگ ساتھی کو کبھی وہ رتبہ نہیں ملا جو پردیسی کو ملتا ہے۔ آخر میں بازی پر دیکھا کہ ہاتھ میں رہتی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک حریفانہ سلوٹ مارا اور چلا گیا۔

اس کے بعد یہ معمول ہو گیا۔ روز صبح سویرے چائے کیلئے شریف کی طرف سے بلا آئے پہلے فضا میں ٹھٹھکو رنجتے پھر جم سے شہزاد اتر آئی۔ دوپٹہ اس کے شانوں پر یوں لٹکتا جیسے کہ ہوئی ڈاک کا اشتہار ہو۔ بائیں فضا میں لہرائیں جیسے رفتار ظاہر کرنے کے لئے مصور نے گلاب خطوط لگا دیئے ہوں۔ ”وہ تمہارا انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ ہنستی — گھینٹیں بجاتیں۔

چائے پر شریف اسی طرح چھت پر نگاہیں گاڑے رہتا اور ہر دو منٹ کے بعد ایک لہجہ بھرتا اور پھر جوش میں دبی آواز سے کہتا ”کسی سے محبت کرو اہلی۔ چاہے وہ کوئی بھی ہو بس محبت کرو۔“

دوپہر کو جیل شوکت کو بلا لاتا ہے۔ وہ تینوں برساتی میں بیٹھ کر کہیں اڑاتے۔ جس کا

مکانات سبز پیراہن پہن لیتے اور چوبارے یوں دکھائی دیتے جیسے تنکوں سے بنے ہوئے جھونپڑے ہوں اور پھر دور سے بانسری کی سرس بلند ہوتی اور کرشن کنیا گوکل کے ہنسنے اور ان کے چہرے کے ریشمیں سانولے پن میں اشیر بلو کی مدھم روشنی چمکتی اور چوگن میں کوئی راکشش ارجمند کے روپ میں چلائے۔ ”مند گاؤں والے انبے او گوکل کے ہنسنے کو بھی یہ حضرت ہاتھ سے گئے۔ نہ جانے کیا زمانہ آیا ہے۔ چھوٹوں کو بڑوں کا لحاظ نہیں رہا۔ بتاؤ۔ اقربا میرے کریں خون کا دعوے کس پر۔“

گل حکمت کا متوالا

چھپر۔ پیٹھے رفت کو سو بھی۔ رفت کو ہمیشہ ہی سو جھا کرتی تھیں اگرچہ بظاہر وہ خاموش لڑکا تھا۔ رفت کی تمام تر قوت اس کی آنکھوں اور گالوں میں سمٹ کر آگئی تھی۔ تک زبان کا تعلق تھا وہ گونگا تھا۔ اس کے ساتھ کوئی بات بھی کرو تو وہ مسکراتا اس کی مسکراہٹ میں تنہی نہیں ہوتی تھی۔ ایسی بات کرو جو اسے ناپسند ہو تو اس کے ہونٹ ہلکے سے کل باہر اور اس کی آنکھوں میں بوندا باندی شروع ہو جاتی۔ ایسی بات چھیڑ دو جو اس کے لئے تھکد ہو تو وہ گھبرا جاتا۔ اس کے ہونٹوں سے ”آف آف“ کی آواز نکلتی جیسے اس نے کوئی گرم چیز دھال لی ہو اور اس کی حرکت اضطرابی رنگ اختیار کر لیتیں۔

بے زبان ہونے کے باوجود رفت بے حد حساس تھا۔ اس کی طبیعت میں دلی ہلچل تھی۔ صبح سویرے ہی وہ شریف کے یہاں جا پہنچتا ”چچی کوئی چیز تو نہیں منگنی۔“ اور پھر جب رتکین اشتہار کی طرح اس کے سامنے آتی تو وہ گھبرا کے پیچھے ہٹ جاتا اس کی آنکھیں جلتی جاتیں اور کوئی رتکین سرگلے میں پھنس جاتا شدت تاثر سے وہ ”آف آف“ ہی ہی کرتا آنکھوں بوندا باندی اور تیز ہو جاتی۔ رفت دلی دلی آج کو پسند کرتا تھا۔ وہ گل حکمت کا متوالا تھا۔ بھرک کر جلتے سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ اس کے کردار میں دو پہلو نمایاں تھے رتکین اور بھگ

آن ملا تھا

اس کے باوجود رفت کو اکثر سو جھتی تھیں۔ اب کی بار اسے لا جواب بات سو جی اور کے لڑکے بات سن کر متفقہ طور پر جھومنے لگے۔

”میں کتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”اگر ہم ایک ڈرامہ کھیلیں تو۔“

”ڈرامہ۔“ ایلی کے دل میں گویا ایک رتکین ہوائی چل گئی۔

”ڈرامہ آپ کیا بات ہے۔“ ارجمند چلایا۔ کرشن کنیا ٹھیک رہے گا۔ آہلہ اور گائیاں اور

گوپیاں اور بیچ۔ میں بند رابن کا گوکل۔“

”ڈرامہ۔“ صفدر نے ایک لمبی آہ بھری اور سگریٹ کی راکھ جھاڑ کر شانے پھیلا کر گنگناٹے لگا۔ ”حافظ خدا تمہارا۔“

یوسف۔ پاپیانہ ہنسی ہنسا۔ ”یہ بھی کر دیکھو۔“ وہ بولا

رشا نے اپنی ننگری ٹانگ جھلا کر کہا ”میاں کوئی بلاشلہ کا پارٹ ہو تو ہمیں دے دیتا۔ باقی سب خیریت ہے۔“

صفدر کے دالان میں پردوں کی جگہ کھیں اور چادریں لٹکائی گئیں۔ کیونکہ اس کے سامنے صحن کے اوپر کی چھت گیلری کا کام دے سکتی تھی۔ جہاں سے محلے کی عورتیں ڈرامہ دیکھ سکتی تھیں۔ آٹا حشر کے کھیل ”خوبصورت بلا“ کا ایک رتکین نکلا کھیلنے کے لئے چٹا گیا۔ رفت نے گنگنیں رو کا پارٹ سنبھال لیا۔ ارجمند کو زینک کا کام ملا اور اسی طرح سب ہی پارٹ محلے کے بڑے لڑکوں نے سنبھال لئے اور وہ سب شدت سے سیرسل میں مصروف ہو گئے۔

اس رات صحن کھپا کھچ لڑکوں سے بھرا تھا اوپر گیلری میں بیس بیس عورتیں بیٹھی تھیں۔ بستر کے لگے ہوئے کھیسوں اور چادروں کے پیچھے گنگنیں رو کی آنکھوں میں گلابی رنگ کی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ارجمند زینک کے بھیس میں پریم پتر اور پریم ٹوٹا سنبھالے کھڑا تھا۔ صفدر ہدایت کار کی حیثیت سے شانے پھیلائے۔ ”اے دلربا میں ہوں فدا۔“ گنگنا رہا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ ایکٹروں منہ اٹھا کر باتیں کر رہے تھے جیسے اللہ تعالیٰ سے ہم کلام ہوں۔ گنگنیں رو کہہ رہی تھی کہ ”کوئی طرح سینے کو دھرا کئے کھڑا تھا۔ زینک چھت سے باتیں کر رہا تھا۔ پرامت کرتے والوں کے لئے کتاب پر نظریں جمائے رکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ پٹاخہ بجایا دیتے تو پردہ کھینچنے والے کو معلوم ہی نہ ہوتا کہ اسے پردہ کھینچنا چاہیے۔

لوہر زینک سامنے منظر کی وجہ سے اس حد تک مست ہو گیا تھا کہ ان جانے میں اس نے ڈنڈے کو یوں تھام لیا تھا جیسے وہ ایک بانسری ہو۔ صرف ایلی کی نگاہیں جھکی جھکی تھیں۔ اسے زینک پارٹ کرنے میں شرم محسوس ہو رہی تھی۔

تماشاخان بار بار تالیاں بجا رہے تھے۔ گیلری کے دھندلے میں سفید سفید دانت چمک رہے تھے۔ ہلکی ہلکی رو پہلی گھنٹیں بج رہی تھیں جنہیں سن کر اداکار اور بھی چپکتے اور ان کے اپنے پارٹ پر محدود رہ جانا مشکل ہو جاتا اور وہ اپنی طرف سے بڑھا چڑھا کر مکالمے بولتے۔ آخری گانے پر زبردست تالیاں پٹنی گئیں۔ گیلری سے دبا دباواہ وا کا شور بلند ہوا۔ اس پر گانے والے اور بھی چپکے اور وہ جوش میں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے لگے اور وہ اپنے بازو جھلاتے ہوئے چلایا۔ ”آؤ ملا تھا۔ اک پردیسی پیاری بھول نہ جانا۔“ جیسے گیلری میں کسی سے مخاطب ہو۔ اس پر تالیاں طوفان اور بھی تیز ہو گئیں۔ گیلری سے با آواز بلند نعرے سنائی دیے اور آخری ڈراپ گراوا گیا۔

کون خوش نصیب

اگلے روز جب ایللی چائے پینے کے لئے شریف کے گھر بیٹھا تھا اور شریف دو ایک منٹ کے لئے اے اکیلا چھوڑ کر خود کو ٹھے پر گیا ہوا تھا تو دفعتاً ”قربیب ہی سے اک سریلی آواز اس کے کان میں پڑی اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ کوئی گارہی تھی۔“

”آن ملا تھا اک پردیسی پیارے بھول نہ جانا جی۔“ اس نے لپک کر ملحقہ کمرے میں جھانک کر دیکھا۔ سانوری کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی آنکھیں جھکی ہوئی تھیں۔ جن پر لمبی لمبی پلکریاں سایہ کئے ہوئے تھیں۔ اس کے سانورے رنگ میں مٹلی چمک تھی اور کھڑے ہونے کے لمحے میں واضح پردگی ایللی کا دل اچھل کر اس کے گلے آٹکا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے اسے دیکھا تھا وہ مسکرائے جا رہی تھی۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ اس سے بات کرے اس سے پوچھے۔

سانوری ہو۔ کیا واقعی۔ ”مگر اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

شام کو ایللی جب دولت پور جانے کی تیاری میں مصروف تھا تو دفعتاً ”وہ چونکا۔“ اس نے وہ چلایا۔ ”اس نے تو کہا تھا۔ پیارے بھول نہ جانا جی۔ پیارے ہاں ہاں یقیناً اس نے پیارے کہا تھا۔ لیکن گیت میں تو پیاری تھا۔ ہاں ہاں۔ پیاری بھول نہ جانا جی۔ پھر سانوری نے پیارے کہا۔ کہا تھا۔ پیارے سے اس کا مطلب کیا تھا۔ کس سے مخاطب تھی وہ۔ اس وقت کمرے میں ڈکا بھی نہ تھا اور وہ کھڑکی میں تو نہ تھی۔ کھڑکی سے دور اس دروازے کے قریب جو گھر میں تھا۔“ ایک ساعت کے لئے اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی ”شاید“ اس کے ذہن میں ایک خیال آیا ”نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ مجھ میں ہے ہی کیا لا حول ولا قوۃ مجھ“

یہ جملہ کیسے کہا جاسکتا ہے۔ پھر سانوری کہے۔“

”لیکن پھر وہ کون تھا۔ کون تھا وہ۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”نہ جانے کون تھا۔ کوئی خوش نصیب ہو گا۔“

اس کی چشیاں کیسے نازک وقت پر ختم ہوئی تھیں۔ اگر وہاں کچھ دیر اور رہتا کاش —

کم از کم اسے یہی معلوم ہو جاتا کہ وہ خوش نصیب کون ہے۔

پھر جب وہ شریف کو خدا حافظ کہنے کے لئے شہزاد کے گھر گیا تو اس نے دیکھا کہ سانوری کھڑکی میں کھڑی تھی۔ خاموش اداس، ایک ساعت کے لئے اس کی پلکیں اٹھیں اس نے ایک ساعت کے لئے نگاہ بھر کر ایللی کی طرف دیکھا۔ ایک واضح آہ بھری پھر اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ سانورے رنگ کی لبوتری انگلی نے یوں رخسار کو چھوا جیسے آنسو پونچھ رہی ہو پھر اس نے منہ موڑ لیا۔

”تم جا رہے ہو ایللی۔“ شریف مسکرایا ”جاؤ چلے جاؤ۔ اس اندھے کنوئیں سے بھاگ جاؤ۔ جاؤ وہاں جہاں لوگ محبت کرنے کو گناہ نہیں سمجھتے جاؤ محبت کرو ایللی جاؤ۔“

ڈیوڑھی میں رفتی سر جھکائے کھڑا تھا۔ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔ سی سی کی مدھم آواز سنائی دی۔ ”میں بھی جا رہا ہوں ایللی ”وہ بولا ”نو کری مل گئی ہے۔ مجھے اب جانا ہی ہو گا۔“ وہ یوں آہیں بھر رہا تھا جیسے نوکری کا دل جانا بد قسمتی ہو۔

لاٹین کے قریب ارجمند کھڑا اس کی راہ دیکھ رہا تھا۔ ”یہ تم نہیں جا رہے ایللی۔“ وہ بولا ”تمہیں کون خاطر میں لاتا ہے۔“ وہ رک گیا۔

”لیکن کیا۔“ ایللی نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”چپکاری سے رنگ جا رہا ہے۔ بانسری سے نغمہ جا رہا ہے“ ارجمند نے آہ بھر کر کہا۔

”پاگل ہو گئے ہو۔“ ایللی نے اسے گھورا۔

”ہاں۔“ اس نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی ”سچ کہتا ہوں۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”سانوری کنیا نے پاگل کر دیا ہے کیا۔“ ایللی نے پوچھا۔

گوپیوں کے بغیر کنیا کیا ہے۔ کچھ بھی نہیں اتنا بھی نہیں جانتے تم۔ ارجمند نے پینتر بدلا ”چلے جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔ جاؤ ہم حکم دیتے ہیں جاؤ۔ مابدولت کا فرماں بجالاؤ۔ جاؤ۔“

دل کی کمرائیوں میں بیٹھ چکا تھا جب وہ ابھر کر اہلی کے شعوری ذہن کی طرف پورش کرتا تو اہلی اسے پھر دہانتا اور اس طرح اپنی دنیا کو محفوظ کر لیا کرتا مگر وہ دبایا ہوا خیال اندر ہی اندر دل کو متھن کیے جا رہا تھا۔

جنیاتی محور

اہلی کی تمام تر جنیاتی زندگی علی احمد کے محور کے گرد کھو گئی تھی جب کوئی جو تک ان کے مگر آکر علی احمد کا خون چوسنے کے شغل میں مصروف کار ہو جاتی تو وہ غصے سے بھوت بن جاتا۔ علی احمد کو ایسی زندگی بسر کرنے کا حق نہیں۔ اسے نین کے سپاہی کا کردار ادا کرنے کا کوئی حق نہیں۔ اسے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہوں میں ذلیل کرنے کا کیا حق ہے۔ کیا اسے ایسی سستی قسم کی عورتوں کے علاوہ کوئی باعزت عورت نہیں ملتی — وہ اس بات پر بیچ و تب کھاتا۔ اور اگر سارہ صبورہ سی باعزت لڑکیاں علی احمد کے رنگین جال میں پھنس جاتیں تو بھی اسے غصہ آتا کیا اسے اپنی عمر کی عورتیں نہیں ملتیں۔ کیا اسے اس قسم کی سستی عورتیں نہیں مل سکتیں جو روپے کے عوض خریدی جاسکتی ہوں۔ ہر صورت میں اسے علی احمد پر غصہ آتا اور غصے کے بلنے اس کے جنسی پہلو میں اہل آجاتا اور پھر وہ چوری چوری سوچتا کہ عورت سے قرب حاصل کرنے کا ایک طریقہ ہے ایک واحد امید اور پھر ایک عمر رسیدہ عورت بالوں سے جھانکتی اور اس کی طرف دیکھ کر مسکراتی۔ اسے اپنی طرف بلائی اور اس کا جی چاہتا کہ اس کی گود میں سر رکھ کر لادے۔ روتا رہے حتیٰ کہ جسم کا درد دور ہو جائے۔ ہڈیوں میں جو چوٹیوں سی چلتی تھیں ہچکچا لیتی تھیں ان سے نجات حاصل ہونے میں جو تناؤ سا اسے پریشان رکھتا تھا وہ ختم ہو جائے لیکن دفعتاً وہ گود میں پڑے ہوئے محسوس کرتا کہ وہ اس بھرپور عورت کو جانتا ہے اس کی شکل و صورت مانوس سی دکھائی دیتی اس کے منہ سے ایک چیخ نکل جاتی۔ اور وہ اپنی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر معدوم ہونے کی کوشش میں کھو جاتا۔

ہائے اہلی!

اب کی بار جب وہ دولت پور میں آیا تو اس کے خیالات کی دنیا میں نئی تفصیلات کا اضافہ ہو گیا تھا بیٹھے بیٹھے اسی رنگین سی آواز اس کے کان میں پڑتی پیارے بھول نہ جانا جی۔ ایک

تیم اور نیم

قرب کی آرزو

اب کی بار دولت پور میں پہنچ کر اہلی کے خیالات اور حیل تبدیل رہے تھے۔ اس احساسات میں نئی بیداریاں پیدا ہو رہی تھیں۔ خیالات میں تبدیلیاں ہو رہی تھیں۔ جسم میں تقاضے ابھر رہے تھے۔ اس کے دل میں عورت کے قرب کا شوق پیدا ہوتا جا رہا تھا۔ اس چاہتا تھا کہ عورت کے قریب جائے۔ اسے قریب سے دیکھے اسے پیار کرے مگر یہ کیسے ممکن تھا۔ آصفی سراج میں کسی عورت کے قریب جانے کا امکان نہ تھا۔ اور اگر ہوتا بھی تو اپنی جرأت کہاں؟ ہر حال اس کی خواہش تھی کہ کسی کی ہانہ پکڑ لے اور پھر رو دے۔ اس کو بچے کا خیال آتا جس سے سارنگی کی سرس گونجا کرتی تھیں۔ لیکن — اگر بزرگ وہاں چلا بھی جاتا تو ان عورتوں کو دیکھ کر عجیب سی کراہت محسوس ہوتی جو لائین جلائے بیٹھی مردوں کا انتظار کیا کرتی تھیں۔ درحقیقت وہ انہیں عورتیں ہی نہیں سمجھتا تھا۔ اس کو بچے میں پہنچے بغیر کسی عورت سے قرب ممکن نہ تھا کسی کو بلوریں پاؤں ہوئے دیکھتا یا کسی کو کھڑکی سے جھانکتے ہوئے ایک نظر دیکھ لیتا تو اسے اور بھی مضطرب کرتا۔ پھر عورت سے قرب کی آرزو کیسے پوری ہو سکتی تھی۔

پھر دفعتاً اسے ایک خیال آیا۔ ایک مکروہ بھیاںک خیال — اور وہ رزمیا مگر تھا اس کا مسلسل طور پر اس خیال پر لا حول پڑھنا بیکار تھا کیونکہ ابتداء سے ہی یہ خیال

اجل کے دولت پر آجانے سے ایلی کو ایک سہارا مل گیا کیونکہ اجل نے وہاں پہنچنے ہی اپنے اثر و رسوخ سے علی احمد کے گھر سے ملحقہ چھو کا چوبارہ کرائے پر لے لیا اور ایلی کے لیے اجل کا گھر ایک نعمت غیر مترقبہ ہو گیا۔

ایک فائدہ یہ بھی ہو کہ اجل کے آجانے سے ایلی نے عیش کے ہاتھ کا پکا ہوا کھانا کھانے سے نجات پالی اب اسے پہلوان کی دوکان پر جا کر دودھ اور بن کھانے کی بھی ضرورت نہ پڑتی تھی۔

اگرچہ علی احمد نے ایک بار پھر — پرانے انداز کو اعلانِ اپنا لیا تھا شاید اس لیے کہ کشمیر کا سب اپنی تمام تر رعین کو چکا تھا۔ اب علی احمد کو ان بل کھاتی ہوئی گلیوں سے گزر کر اتنی دور راجو کے گھر جانا نہیں پڑتا تھا بلکہ راجو خود ان کے یہاں آزادی سے آتی جاتی تھی اور علی احمد کا کمرہ ایک مرتبہ پھر وہی بام آبلو کا کمرہ بن گیا تھا جس راجو کی گزیا جینتی۔ اور نین کا بکتر بند سپاہی جنگ کے نعرے لگاتا اور پھر رنگین ہنسی کی آواز سنائی دیتی جسے سن کر عیش غصے سے بل کھاتی اور پھر انتقامی عیبی کھڑی میں جا کھڑی ہوتی اور آنسو پونچھ کر مسکرانے کی کوشش کرتی۔

اگرچہ اب بھی ایلی علی احمد سے ڈرتا تھا گھبراتا تھا لیکن اب وہ علی احمد کے کمرے سے غافل نہ تھا اب نہ تو اسے بوتل اٹھا کر کنوئیں پر جانا پڑتا تھا اور نہ ہی چینی ہوئی راجو کی گزیا یا نین کے سپاہی کی آوازیں سننا پڑتی تھیں اس لیے کہ جب علی احمد کے کمرے میں میدان کارزار گرم ہوتا تو ایلی چپکے سے اجل کے چوبارے میں جا بیٹھتا اور وہاں پہنچ کر گرمی سوچ میں کھو جاتا۔

نہ جانے کیوں

نہ جانے کیوں عورتیں راجو کی گزریوں کی طرح کیوں چھیں چھیں کرتی ہیں اور مرد نین کے سپاہی کیوں بن جاتے ہیں۔ کیا سبھی مرد نین کے سپاہی بن جاتے ہیں کیا سبھی عورتیں راجو کی گزریوں کی طرح چھیں چھیں کرتی ہیں۔ ان کے منہ سے بچوں کی طرح لاڈ بھری توہلی باتیں کیوں نکلتی ہیں۔ ویسے عام بات کریں تو ان کا لہجہ بالکل صاف ہوتا ہے۔ ذرا تو تلاپن نہیں ہوتا آواز میں لہجہ نہیں ہوتا۔ ان امور کے علاوہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ علی احمد کس معیار کے مطابق عورتوں کو چھتے تھے۔ مثلاً وہ کور تھی۔ یہ راجو تھی۔ ان میں کوئی کشش بھی تو نہ تھی۔ کوئی بات بھی تو نہ تھی جسے قابل ستائش یا دلکش سمجھا جاسکے۔ کیا حسن و خوبصورتی کی

طبع تصویر اس کی آنکھوں کے سامنے جھلساتی۔ پھر ایک بامعنی ہنسی۔ واضح اور رنگین اور ہلکا۔ مڑمڑ کے دو گھٹنے جھتر جھک جاتے اور ایک لمبی سی مخروطی پر ہم انگلی فضا میں ابھرتی۔ ہمدردی جھم سے کوئی آجاتا اور منظر یوں بدل جاتا جیسے پتھر گرنے سے جھیل کے ساکت پانی میں رام کے ایوانوں کے دھندلے مگر حسین نقوش دفعتاً "پاش پاش" ہو جاتے ہیں اور چاروں طرف لہر اٹھنے لگتیں۔ پھر فضا میں چاروں طرف مرکزی دیوتا کے ٹخنوں پر لگے ہوئے ننھے بازو پھڑپھڑا بلوریں پاؤں رقص کرتے اور بل دہشہ اور مڑمڑ ایک زنانے سے اس کے قریب سے آ جاتے اور دور — دور ایک مدہم حسین آواز گنگناتی ہوئی سنائی دیتی "ہائے ایلی وہ جانے انتظار کر رہے ہیں۔" اس وقت ایلی چونکا اور شرم سے سر جھکا لیتا۔ ایک مبہم سا احساس جرم کے دل و دماغ پر چھا جاتا۔ دور ایک ننھی سی حسین عورت سفید آنچل پھیلانے اڑے جاتی۔ اس کا جی چاہتا کہ کہیں سر رکھ کر رووے اتنا روئے کہ کوئی ہاتھ لپک کر اسے تھپکنے پر مجبور جائے۔ قریب ہی سے شریف کا مدہم قہقہہ گونجتا۔ ایلی محبت کرو۔ محبت کرو چاہئے کہ؟ سے کرو محبت کرو۔ محبت کیے بغیر تم کچھ بھی نہیں؟ وہ اپنا سر خلاف میں گاڑ دیتا آنکھیں پٹا لیتا۔ نہیں نہیں میں مجرم نہیں ہوں میں جرم نہیں کروں گا۔ اور پھر نہ جانے کہاں سے بلوریں ہاتھ اس کی طرف بڑھتے اور ہمدردی بھرے لمس سے اسے تھپکنے لگتے اور وہ یوں نہ روئے سو جاتا جیسی کوئی بچہ کسی کھلونے کو حاصل نہ کرنے پر روتے روتے تھک کر سو جاتا ہے۔

چھو کا چوبارہ

خوش قسمتی سے انہیں دونوں ایلی کا بہنوئی اجل دولت پرور میں آگیا۔ اسے دولت پرور پھری میں ایک نوکری مل گئی تھی۔

ایلی کو اجل سے بہت ہمدردی تھی۔ کیونکہ کئی ایک پہلوؤں سے اس کی اپنی زندگی سے ملتی جلتی تھی اس کے علاوہ اجل نے اوائل عمر میں ہی بصرہ اور کابل سے دور دراز کے سفر کیے تھے جن کی وجہ سے اس کے دل میں اجل کی عزت پیدا ہو گئی تھی۔

اجل اونچے لمبے قد کا لڑکا تھا جس کی قابلیت پر ایلی فخر محسوس کیا کرتا تھا اور سب سے کراے اجل کی رنگین طبیعت بہت پسند تھی۔ ہاجرہ کی کتہ چینی کے باوجود یا شاید اس لیے اسے اجل بہت پسند تھا اور وہ محسوس کرتا تھا کہ اجل اس کا دوست ہے۔

خصوصیات کے وسیلے کے بغیر عورت بذات خود قابل حصول ہوتی ہے لیکن یہ کیسے ممکن ہے کچھ عورتوں کو دیکھ کر تو ایلی کو گھن آتی تھی۔

ایلی محسوس کرتا جیسے عورت ایک معصومہ ہو ایک ایسا معصومہ جو بند کمرے کے بغیر حل نہ ہو سکتا ہو اس خیال پر اسے شدید خواہش محسوس ہوتی کہ ایک بار اسے بھی کسی عورت کے بند کمرے میں بند ہونے کا اتفاق ہو اور اس کے رویہ بھی وہ اسرار کھل جائیں صرف ایک بار ایک بار۔

وہ راجو یہ راجو

ایک روز رات گئے جب ایلی گھر پہنچا تو علی احمد کے کمرے کے قریب پہنچ کر وہ محسوس کرے سے ٹین کے سپاہی کے نعروں اور ریڈیو گریا کی چیں چیں کی بجائے عجیب سی آوازیں رہی تھیں کوئی کراہ رہی تھی کوئی مدہم آواز میں ہمدردی جتا رہا تھا۔

ابھی وہ اپنے کمرے میں داخل نہ ہوا تھا کہ دفعتاً علی احمد کے کمرے کا دروازہ کھلا اور اسے ہنسی کھیلتی راجو کی جگہ نحیف و زوال راجو برآمد ہوئی۔ اس نے اپنا ہاتھ علی احمد کے کندے پر رکھا ہوا تھا اور بصد مشکل سہارے کر چل رہی تھی۔

”ایلی“ انہوں نے باہر نکلتے ہی ایلی کو آواز دی۔ ”ادھر آؤ ذرا۔ ہمارے ساتھ چلو۔“

”اس وقت اتنی رات گئے۔“ شمیم زیر لب بولی۔

”مزدوری کلام ہے ابھی لوٹ آئیں گے۔“ انہوں نے بے رخی سے جواب دیا ”چلو ایلی“

”اس پچارے کو کیوں ساتھ خراب کرتے ہو۔“ شمیم نے کہا۔

”چلو ایلی“ علی احمد نے شمیم کی بات نہ سنی قائلہ چل پڑا۔ برقعے میں لپٹی ہوئی راجو علی احمد کے ساتھ گھٹ گھٹ کر چل رہی تھی۔ اور علی احمد نے اسے یوں سہارا دے رکھا تھا جیسے بیمار ہو پیچھے پیچھے ایلی سوچتا ہوا چلا جا رہا تھا نہ جانے کیا بات ہے۔ نہ جانے کمرے سے یہ کیا راجو نکل ہے۔ راجو ایسی تو نہ تھی۔ وہ تو کتر کتر باتیں کیا کرتی۔ آنکھیں مشکاتی خمرے کرتی۔ راجو تو روئی روئی سی تھی۔ نہ جانے وہ کدھر جا رہے تھے۔ کیوں جا رہے تھے اور چلے جا رہے تھے۔ راجو گھٹ گھٹ کیوں رہی تھی راجو اپنے گھر پہنچ کر دھڑام سے چارپائی پر گر پڑی اور علی احمد دوسری چارپائی کے قریب کھڑے ہو کر چلانے لگے۔ ”رحمن دوڑو دوڑو۔ دیکھو راجو کو کیا

”کیا ہے۔ کیا ہے۔ چاروں طرف سے عورتیں راجو کی طرف لپکیں اور ایک آن میں بھیڑ لگ گئی۔“

صرف وہ بڑھیا دور کھڑی چلاتی رہی۔ ”کیا پا کھنڈ چار کھا ہے تم دونوں نے۔ میں مرتا ہوں۔ میں مرتی ہوں اور مرتا کوئی بھی نہیں خمرے دکھانے شروع کر رکھے ہیں۔ میں کتنی ہوں یہ شخص کیوں آتا ہے اس گھر میں اور یہ مرنے جوگی اس سے کیوں ملتی ہے اس سے تو یہی بہتر ہے کہ مر جائے خس کم جہاں پاک۔“

”پاکل ہو گئی ہو مل“ راجو چلائی ”لوکی بے ہوش ہے ہاتھ سے جا رہی ہے اور تو کھڑی وعظ کر رہی ہے جیسے ککے سے آئی ہو۔“

”تو مجھے مل نہ کہا کر ڈائن“ رحمن چیخی۔

راجو جیرانی سے کھڑی دیکھ رہی تھی۔ اس کے ٹوٹے ہوئے ہاتھ چھاتی پر پڑے تھے منہ خوف سے اور بھی بد نما ہو گیا تھا۔

راجو کے رخسار پھول رہے تھے جیسے باسی ڈبل روٹی میں اہل آگیا ہو۔

سیلز مین نے پوچھ کر راجو کو اٹھا کر بیٹھادیا۔ سا جو نے اس کی مدد کی علی احمد نے سرسری طور پر سہارا دیا لیکن بیٹھنے کی بجائے وہ ڈھیر ہو کر گر پڑی۔

یہ دیکھ کر علی احمد گھبرا گئے ”کانڈ کہاں ہے دوات دوات۔“ وہ چلانے لگے کچھ دیر تلاش کرنے کے بعد انہوں نے کانڈ اور دوات علی احمد کو دے دی۔ علی احمد نے کانڈ پر کچھ لکھا اور چادر میں لپٹا ہوا سیلز مین اسے لے کر بھاگا۔

چھوٹے کمرے میں رحمن کھڑی چلا رہی تھی قریب ہی سا جو غصے سے گھور رہی تھی۔ باہر دالان کے ایک کونے میں آجو سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ اس سے پرے ٹوٹی ہوئی کھات پر ایلی بیٹھا سوچ رہا تھا نہ جانے کیا ڈرامہ کھیلا جا رہا ہے۔ راجو کیوں چارپائی پر ڈھیر ہوئی پڑی ہے اس کی ماں بیٹی سے ہمدردی کرنے کی بجائے ان سب کو صلواتیں کیوں سنا رہی ہے اور علی احمد اس قدر گھبرائے کیوں ہیں۔

پھر دروازہ کھلا اور چادر میں لپٹے ہوئے سیلز مین کی آواز سنائی دی ”ڈاکٹر صاحب آگئے۔“

”ڈاکٹر“ ایلی نے دیوار کی طرف منہ پھیر لیا۔ کیس ڈاکٹر پہچان نہ لے۔ اس مکان میں دیکھ نہ

لے لیکن علی احمد علی احمد بھی تو اسی گھر میں تھے اور علی احمد کا کیا ہو گا۔ اگر علی احمد کو وہاں پہچان لیا تو۔

علی احمد کھسانی ہنسی ہنس رہے تھے ”ہی ہی ہی ڈاکٹر صاحب مریضہ بے ہوش ہے کہ سے یونہی پڑی ہے۔“ ”اسے اندر لے چلو۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ اور وہ سب راجو کو اٹھانے کے دوڑے۔

بوکا ریلوا

اس دوران میں ساہو آگئی اور ایللی کے قریب بیٹھ کر پان لگانے لگی اندھیرے میں اس سفید دانت چمک رہے تھے۔

”گڈی گڈے کا کھیل بنا رکھا ہے انہوں نے۔“ اس نے کسی کو مخاطب کیے بغیر کہا اپنا ہی ہوش ہے دوسرے جائیں جنم میں اب تم ہی بتاؤ انہیں ایسا کرنا چاہئے تھا کیا۔ گئی۔ پھر آپ ہی آپ بولی۔ ”راجو کے ختم کو پتہ چلا تو کیا ہو گا۔ اسی بات کا خیال ہونا چاہیے انہیں دولت پور میں وہ کونسا چوک ہے جہاں ان کی باتیں نہیں ہو رہی ہیں۔ کیوں نہ ہوں ڈھنک سے بات کریں تو ہے۔ ناوہ ایک رات بھی اس کے بغیر نہیں رہتی اور اگر وہ بھی یہ بڑھا بچوں کی طرح بلکنے لگتا ہے۔ اور رہی سہی بات اس بڑھیا نے ڈبو رکھی ہے کولوں پر رکھ کر جینتی ہے جو کسی نے نہیں سنی بات تو یہ اللہ کی بندی اسے بنا کر رہے گی۔ پان لگے۔“ وہ ایللی کے قریب سرک آئی۔

قریب بہت ہی قریب ساہو کے میلے دانت چمکے بوکا ایک ریلوا آیا۔ ایللی نے محسوس کیا اسے کسی گندے نالے میں دھکیل دیا گیا ہو۔ جہاں گلے سرے گوشت کا ڈھیر لگا ہو۔ لالہ اٹھ بیٹھا۔ ”پان تو کھالے“ ایک سیاہ بازو اس کی طرف لپکا۔

”نہیں نہیں۔“ ایللی نے کچھ کہنے کی کوشش۔

”کافتا ہے کیا۔“ وہ عجیب انداز سے بولی ”اچھا بیٹھ تو جا۔“ اور وہ اس سے دور ہوتے چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گیا۔

نیا عقدہ

چھوٹے کمرے کا دروازہ کھلا ڈاکٹر باہر نکلتے ہوئے بولا ”اسے اکیلے پرارہنے دو۔“

ہو جائے۔ کل صبح مجھے اطلاع دینا۔“ یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔ ایک بار پھر سب نے چھوٹے کمرے کی طرف پورش کر دی اور وہاں لڑنے جھگڑنے لگے نہ جانے کیا بات تھی جس پر وہ جھگڑ رہے تھے۔ بڑھیا چلا چلا کر رو رہی تھی۔ جیسے غصے سے بھررا ہوا بلڈر پھٹ گیا ہو۔ ساہو طعنے دے رہی تھی۔ سیلزمین شاید اپنے ذریعہ تجارت کو تباہ ہوتے دیکھ کر بوکھلا گیا تھا۔ اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی اور علی احمد اسٹراب میں ٹہل رہے تھے جیسے وہ کمرہ ایک صحرا ہو۔ ہاتھ کولوں پر رکھے ہوئے تھے ٹوپی ماتھے پر الٹی ہوئی تھی۔

آہستہ آہستہ شور کم ہوتا گیا۔ بڑھیا کی ہچکیاں مدہم پڑ گئیں ساہو کے طعنے نفرت بھری نگاہ تک محدود ہو گئے۔ آج دروازے کے باہر چوکھٹ کے قریب سہمی ہوئی کھڑی تھی اس کے منہ سے بات نہ نکلتی تھی۔

دیر تک خاموشی طاری رہی۔ رحیمین راجو کی کونٹھری میں جا کر لیٹ گئی۔ آج باہر کھاٹ پر ڈھیر ہو گئی ساہو پاندان سامنے رکھے بکری کی طرح جھگی کرتی رہی علی احمد ویسے ہی گھبراہٹ بھرے انداز میں ٹھٹھلے رہے پھر راجو کراہنے لگی علی احمد اور ساہو دوڑ کر اندر چلے گئے کچھ دیر کے بعد وہ دونوں باہر نکلے۔ ساہو کو لمبے منکاتی ہوئی باہر نکلی۔ پھولے ہوئے جسم میں سفید سفید دانت اور آنکھیں چمکیں۔ پیچھے پیچھے علی احمد تھے ایللی کو دیکھ کر وہ چونکے۔

”تم۔ تم یہاں تم۔“ جیسے وہ ایللی کو ساتھ لانے کی تفصیل بھول چکے ہوں ”اچھا اچھا خیر۔“ دھنکا ”وہ گھبرا کر رک گئے۔“ اب اس وقت تو گھرجانا ٹھیک نہیں۔“ انہوں نے ایللی سے کہا ”رات بہت گزر چکی ہے۔ یہیں لیٹ کر سو رہو۔ صبح سویرے چلے جائیں گے۔“

زہر

علی احمد کے انداز میں غیر معمولی ملائمت پیدا ہو گئی تھی نہ جانے کیوں؟ ”اور دیکھتا“ علی احمد اس کے قریب بیٹھ کر رازدارانہ انداز میں کہنے لگے ”گھر جا کر یہ نہ کہتا کہ راجو بیمار تھی۔ کہ راجو نے زہر کھالیا تھا۔“

زہر۔ ایللی سکتے میں رہ گیا۔ کیا واقعی راجو نے زہر کھالیا تھا۔ مگر کیوں کیا اسے علی احمد سے محبت تھی؟ کیا راجو بھی محبت کی اہل تھی لیکن۔ وہ سیلزمین اور وہ دس کانٹ جو اس روز وہ راجو کے لیے لایا تھا۔ اس کی وہ نگاہیں جو اس نے غلام محمد پر ڈالی تھیں۔ نہیں اسے محبت نہیں

ہو سکتی۔ پھر اس نے زہر کیوں کھایا تھا۔ ایللی کے لیے یہ ایک نیا عقدہ تھا۔

”ساجو“ علی احمد نے منت سے کہا ”بھئی ایللی کا کچھ انتظام کر دو۔ دن چڑھنے میں اب ایک گھنٹے ہی ہوں گے پڑ رہے گا کیس۔“ یہ کہہ کر وہ راجو کے کمرے میں داخل ہو گئے اور اس سے دروازہ بند کر لیا۔

محبت ————— نہ جانے محبت کیا ہوتی ہے۔ مگر نہیں محبت تو ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ سوچنے لگا۔ نہ جانے لوگ عورت کے پیچھے اس قدر اندھے کیوں ہو جاتے ہیں۔ عورت میں کوئی کشش ہے۔ راجو جیسی سیدھی سادھی گنوار لڑکی نے علی احمد کو دیوانہ بنا رکھا ہے۔ اس کے دل میں شدید خواہش پیدا ہوئی کہ وہ عورت کو قریب سے دیکھے اسے عورت کا قرب حاصل ہو۔ مگر کیسے حاصل ہو۔ کوئی صورت بھی ہو اس نے چوری چوری اپنے گرد نگاہ دوڑائی۔ ایک طرف ٹوٹی ہوئی کھنڈی پر وہ پتلی دہلی لڑکی آجو پڑی تھی جس کی آنکھوں میں زرد زرد میل لگا رہا تھا اور جس کے ہاتھ ٹوٹے ہوئے تھے۔ اس نے جھرجھری محسوس کی۔ آجو میں کوئی بھی بات نہ تھی کہ اسے عورت سمجھا جاسکے۔

بدلاؤ

”آؤ ایللی۔“ ————— ساجو چارپائی بچھاتے ہوئے بولی ”یہاں آجاؤ۔“ ایللی اٹھ کر اس چارپائی پر جا پڑا ایللی نے ساجو کی طرف دیکھا۔ نہیں نہیں وہ عورت نہیں۔ ایللی کے لیے تو عورت ایک لطیف اور پاکیزہ چیز کا نام تھا۔ وہ سوچنے لگا نہیں نہیں یہ عورتیں نہیں یہ تو جو نکلیں ہیں اور چپ چاپ پڑ گیا۔

ساجو نے ایک عجیب سی دھن گنگنائی شروع کر دی۔ عجیب سی دھن تھی وہ جیسے کوئی گدی دیرانے میں تھما بیٹھی کسی کا انتظار کر رہی ہو۔ اس دھن سے جسم کی بو آتی تھی۔ وہ دھن جو لاشیں جلا کر بیٹھنے والی عورتیں ہی گنگنا سکتی ہیں۔

نفرت سے ایللی نے منہ موڑ لیا آنکھیں بند کر لیں۔ لیکن وہ گنگناہٹ لحظہ بہ لحظہ علی گئی جیسے کوئی آہستہ ایک ایک کر کے کپڑے اتار رہا ہو۔ پھر چارپائی کھینچنے کی آواز سنائی دی۔ وہ اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اسے کسی ربڑ کی گڑیا کی جیسں چیں سنائی دے رہی تھی۔ اس کی نگاہوں تلے ٹین کا سپاہی ابھر رہا تھا ————— بڑھ رہا تھا۔

”پوچی۔“ کور کی مکر وہ آواز سنائی دی۔ سفید دانت اندھیرے میں چمکے وہ سہم گیا۔ لیکن میں اس دقت خانم کے ہاتھ نے بڑھ کر کور کو پرے دھکیل دیا اور پھر وہ حسین بازو ایللی کی طرف بڑھل اس لس کی وجہ سے اندھیرے میں ایک الاؤ روشن ہو گیا سرخ سرخ جھینے اڑے۔ چاروں طرف چوٹیاں رینگ رہی تھیں۔ اس نے گھبرا کر پہلو بدلا۔ بو کا رپا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا ساجو کی چارپائی اس کے ساتھ ملی ہوئی تھی اور ایک حریف تھوٹی اس کی طرف بڑھ رہی تھی ٹبراکر پیچھے ہٹنے کی بجائے اس نے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا اور گرم غلیظ جسم کے ایک پکے نے اسے آغوش میں لے لیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ چیخ مار کر اٹھ بیٹھے اور اس ٹائٹ میئر سے اپنے آپ کو محفوظ کر لے لیکن اس کے برعکس نہ جانے کیوں اس دیوانگی کے تحت جو اس پر مسلط ہو چکی تھی اس نے اس غلاطت بھرے جوہر میں چھلانگ لگا دی۔ ایک لس۔ ایک ڈبکی۔ آتش فشاں ہے لاوے کا ایک ریلا نکلا جس نے ایللی کو تنکے کی طرح بہا کر نہ جانے کہاں پھینک دیا۔

قریب ہی سے تمسخر بھری مدہم آواز سنائی دی بس ————— اور ایللی نے محسوس کیا جیسے اس پر گھڑوں پانی پڑ گیا ہو۔ وہ ایک کیرے کی طرح رینگ رہا تھا۔ رینگ رہا تھا پھر سیاہ ہمدردانہ اندھیرے نے اپنا دامن پھیلا کر اسے چھپا لیا۔

ٹائٹ میئر

”ایللی۔ ایللی۔“ آواز سن کر ایللی نے آنکھیں کھول دیں ارے میں کہاں ہوں۔ پھر علی احمد کو دیکھ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ اس نے حیرانی سے چاروں طرف دیکھا اور اس غیر مانوس جگہ کو دیکھ کر وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ساتھ والی چارپائی پر ایک مبہم سی حرکت ہوئی اس نے اوپر دیکھا ساجو ————— دھن اس نے محسوس کیا کہ وہ نگاہ ہے اور کوئی ڈانٹ اس کا پیچھا کر رہی ہے اس کا منہ کھٹکا اڑا رہی ہے۔ اور وہ بھاگ رہا ہے۔

سامنے افق پر لمبی مڑگلیں سے ڈھکی ہوئی دو پر غم آنکھیں تھیں۔ سانولی انگلی گرا ہوا آنسو ہونچ رہی تھی۔ نہیں ایللی۔ شریف مسکرا رہا تھا نہیں نہیں۔ محبت کرو چاہے کس سے کرو۔ کوئی بھی ہو لیکن محبت کرو۔ ————— اور ایللی کا جی چاہتا تھا کہ شریف کے گلے سے لگ کر روئے۔ ایللی کے لیے وہ رات بھیانک خواب یا ٹائٹ میئر کی حیثیت رکھتی تھی جس کی یاد سے وہ لرز

جاتا تھا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے اس نے بہت بڑا جرم کیا ہو جیسے اس نے ہمیشہ کے لیے آپ کو قعرِ زلت میں دھکیل دیا ہو اور وہ تسخّر اور تحقیر سے بھرا ہوا قعر۔ کیا یہی عورت کا قرب تھا کیا علی احمد کو اسی قرب کا شوق تھا۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا؟ عورت کے قرب کا مطلب غلامی کے جوہر میں ڈبکیں کھانا نہیں ہو سکتا۔ نہیں نہیں۔

کئی ایک دن وہ اس نائٹ میئر کے تاثرات میں کھویا رہا اس کے دل میں صرف ایک خیال تھا کہ وہ عورت کے قرب کے قابل نہیں اس میں وہ اہلیت ہی نہیں درنہ وہ تسخّر و تحقیر جس کی وجہ سے وہ ایک کیڑے کی طرح ریٹکنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

نہیں نہیں۔ شریف کی آواز سنائی دیتی۔ یہ نہیں محبت کرو مجھ کو وہ دوانہ دار آدمی۔ گھومتا کس سے محبت کروں۔ کیسے محبت کروں اور اس کے دل میں جستجو کی ایک لہر دوں۔ جاتی۔

بے زاری

دولت پور میں اب ایلچی کی زندگی نے ایک مخصوص رنگ اختیار کر لیا تھا۔ اس کے صبح و شام ایک مخصوص ڈگر پر چلنے لگے تھے کالج اس کے لیے دلچسپی سے خالی تھا۔ اگرچہ اب وہ کالج جانے سے بالکل نہ گھبراتا۔ لیکن اس کی توجہ تعلیم کی طرف مبذول نہ ہوئی تھی۔ اسے یہ احساس نہیں ہوا تھا کہ تحصیل علم کرنا اس کے لئے ضروری ہے۔ ایلچی کے لئے کالج محض ایک تفریح گاہ تھی۔

کالج سے واپس آتے ہی وہ کتابیں گھر میں پھینک کر اجہل کی طرف چلا جاتا اور وہاں کسی نہ کسی مشغل میں مصروف ہو جاتا۔ گھر میں تو کوئی ایسی بات نہ ہوتی تھی جو اس کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔

علی احمد حساب کار جس پر کرنے میں مصروف رہتے یا کسی نہ کسی بات پر غم سے جھگڑا شروع کر دیتے۔ غم دو ایک منٹ جینتی چلاتی ہاتھ چلاتی اور پھر تھک کر روتا شروع کر دیتی۔ اسے دوتا دیکھ کر اس کی دونوں بچیاں پیچھے لگتیں اور گھر میں کمرام مچ جاتا۔

راجو آجائی تو علی احمد کی حساب کتاب سے دلچسپی ختم ہو جاتی۔ رجسٹر بند کر کے وہ راجو کی طرف متوجہ ہو جاتے۔ بات بات پر ہنسنے چمھاتے۔ نہ جانے کیوں راجو کے آنے پر وہ ہلانے ہلانے غم کو ہلاتے اس سے کچھ پوچھتے یا اس کی تعریف کرتے۔ شاید غم کو تنگ کرنے میں مزا



علی احمد اے چٹکیوں میں اڑا کے لیٹ جاتے۔

”ٹھیک ہے“ وہ کہتے ”تو لڑنا چاہتی ہے تو میں ضرور تیری خواہش پوری کروں گا لیکن حق کی چلم بے بغیر لڑنا نہ بھی یہ مشکل ہے تو ذرا چلم بھر دے پھر لڑیں گے کیوں نہیں لڑیں گے تو چاہے اور ہم نہ لڑیں۔ بھی واہ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ اس پر شمیم روتے ہوئے چلم بھرنے لگتی اور علی احمد کپڑے بدلتے ہوئے گنگنانے لگتے۔

گزشتہ خفت

جب بھی علی احمد باہر جانے لگتے تو ایلی گھبرا جاتا کہ کیس علی احمد کو اسے ساتھ لے جانے کا خیال نہ آجائے۔ ان کے ساتھ باہر جانے سے وہ ڈرتا تھا۔ اس مکان سے ڈرتا تھا جہاں اس نے وہ رات بسر کی تھی۔ اس سیاہ فام عورت سے ڈرتا تھا جس کا تحقیر بھرا قہقہہ اب تک اس کے کانوں میں گونجتا تھا۔ وہ اس قرب سے ڈرتا تھا جس کا وہ ایک بار سزاوار ہو چکا تھا۔

علی احمد باہر جانے لگتے تو وہ گھبرا جاتا۔ راجو ان کے گھر آتی تو وہ چپ چاپ دبے پاؤں باہر نکل جاتا۔ راجو کی زیر لب مسکراہٹ سے اسے ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ ایلی کی گزشتہ خفت سے کماحقہ واقف ہو جیسے وہ جانتی ہو جانے بغیر سمجھتی ہو جیسے ساجو نے اسے اس تمسخر بھرے قہقہے سمیت ساری بات بتا دی ہو۔ اس کی مسکراہٹ ایلی کے سینے میں دھار بن کر اتر جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ کہہ رہی ہو۔

”اچھا تو جناب بھی اس میں قدم رکھتے ہیں۔ واہ واہ بڑی خوشی ہوئی یہ جان کر۔“ اس پر وہ گزشتہ خفت از سر نو اس پر طاری ہو جاتی۔

کبھی تو راجو کو دیکھ کر ایلی کے دل میں ایک عجیب سی وحشت بیدار ہو جاتی اور اس کا دل ہلکتا کہ بڑھ کر اس کی فیض تار تار کر دے اور پھر چلا چلا کر کہے ”میں تمہیں جانتا ہوں تم جو تک ہو جو تک۔“ پھر وہ لاحول پڑھ کر اپنے آپ کو محفوظ کرنے کی کوشش میں کھو جاتا اور بالاخر چپکے سے گھر سے باہر نکل جاتا۔ بیڑھیاں اترتے ہوئے اسے شریف کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی ”نہیں نہیں ایلی محبت کرو محبت۔“

تین راتیں

ایک روز راجو کے آنے پر جب وہ دبے پاؤں بیڑھیاں اتر رہا تھا تو علی احمد نے آواز زد

آتا ہو یا شاید اس کی وجہ ان کی ازلی تماش بینی ہو۔ راجو کو دیکھ کر غصے کی وجہ سے علم آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں ہو جاتا اور اس کی شکل و صورت بالکل ہی مضحکہ خیز ہو جاتی۔ بلاآخر ٹین کا سپاہی قلعہ بند ہو جاتا اور کشمیر کا سیب انتقام ”لمحہ کمرے کی عقبی کوئی“ نلک جاتا۔ بند کمرے میں ریڑ کی گزیا چیخیں اور مٹی کا پہلوان گرتا اور پھرا۔ ستودہ ہو جاتا پھر گزیا۔ ستودہ ہو جاتا۔ گزیا تالیاں پیٹتی قہقہے لگاتی۔ نیچے سڑک سے گزرتے ہوئے لوگ ان کی قسموں کو سن کر رک جاتے پھر پڑاؤ کی دوکان پر بات چل نکلتی۔

”ہاں میاں روج آوے ہے اس چو بارے والے پاؤ کے پاس۔“

”ٹھیک کہے ہے یہ میں آپ دیکھے ہوں روج یہاں سے گجرتے دے۔ یہاں آکر آگے جھکالے ہے میں نے کبھی نہیں جتایا۔“

”کیا کیا یہاں اس چو بارے ماں۔“ ارے نہیں بھائی عقل کی بات کرو۔“

”ارے ماں کھوب جانوں یہ چو بارے والا پاؤ بڑا گھاگ ہے یہ پاؤ۔ چار روج ماں نماں اس نے اب وہ چلاوا پناہ ہے۔ چلاو۔“

شام پڑتی تو راجو رخصت ہو جاتی اور علی احمد پھر سے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتا۔ جب رات کے آٹھ بجتے تو وہ آپ ہی آپ گنگنانے لگتے۔ ”افو مجھے تو آج انسپکٹر صاحب بلایا تھا۔ یاد ہی نہیں رہا۔ حافظہ کس قدر کمزور ہو گیا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ باہر جانے کے کپڑے پہننے لگتے۔

چار ایک منٹ بل کھانے کے بعد شمیم گویا اپنے آپ سے کہتی ”جیسے میں جانتی تھی ان کے انسپکٹر صاحب کو۔“

علی احمد ہنس پڑتے ”تو تو بالکل بگلی ہے راجو کی طرف جانا ہوتا تو چھپانے کی کیا ضرورت تھی۔“

”توبہ اتنا بڑبڑ بھی نہ ہو کوئی چوری اور پھر سینہ زوری شرم نہیں آتی۔“ شمیم جواب دیتی ”بے وقوف شرم تو عورتوں کے لیے ہے۔“ وہ ہنسنے لگتے۔ ”مردوں کے لیے نہیں۔“ اس پر شمیم خاموش ہو جاتی اور چھوٹے کمرے سے سکیوں کی آواز آنے لگتی ”نہیں ابھی آیا۔“ کہہ کر علی احمد باہر نکل جاتے اور پھر آدھی رات تک راجو کے یہاں پڑے رہ جاتے۔ واپسی پر گھڑی دو گھڑی تو میاں بیوی کی لڑائی ہوتی۔ شمیم بات بڑھانے کی کوشش کرتا۔

دولت پور کا پانہ میں بنی ہوں کیا سمجھا ہے تم نے جہاں میرا جی چاہے جاؤ گی جس کے ساتھ جی چاہے رہوں گی کر لو میرا جو کرتا ہے۔“ اور دور پیچھے ایللی یوں چلا آتا جیسے بازار سے کوئی سودا خریدانے کے لیے جا رہا ہو اور اسے اس میلے برقعے میں لمبوس ٹھک ٹھک کرتی ہوئی عورت اور چہرہ نگاہوں والے مرد سے کوئی تعلق نہ ہو۔

اس روز ان کے پیچھے چلتے ہوئے وہ دعائیں مانگ رہا تھا یا اللہ کہیں وہ اس گھر میں نہ جا رہے ہوں جہاں میلے پنڈے کی بو کے ریلے آتے ہیں اور وہ سیاہ گوشت میں میلے دانت۔ وہ اس کے رو برو کیے جانے کا نہیں نہیں۔

موز پر جا کر علی احمد رک گئے۔ ”اچھا راجو تو چل گھر۔ لیکن جلد اس جگہ پہنچ جائیو۔ سبھی ہم انتظار کریں گے۔“

اچھا کہہ کر راجو چلی گئی اور علی احمد اور ایللی مرکز دوسری سڑک کو ہو لیے۔ کئی ایک راستوں سے ہوتے ہوئے بالاخروہ ٹاؤن ہال میں داخل ہوئے جہاں لوگوں کا ہجوم تھا۔

بے بی شو

”آؤ ایللی آؤ یہاں آج بے بی شو ہے۔“ علی احمد نے ایللی کی طرف دیکھا ”ارے بے بی شو نہیں جانتے اور کہنے کو کالج میں پڑھتے ہو۔“ وہ سننے لگے ”واہ یہ بھی لا جواب بات ہے۔ دیکھو بے بی کا مطلب ہے بچہ یعنی دودھ پیتا بچہ یعنی وہ بچہ جو ماں کا دودھ پیتا ہے آج یہاں ان بچوں کا شو ہو گا میو ہل ہال میں جو بچہ سب سے زیادہ سندرست ہو گا اسے انعام ملے گا۔ یعنی یعنی۔“ وہ لوہر اوہر آتے ہوئے کہنے لگے۔ ”یہ بچوں کی نمائش ہے سمجھو اور سرکار یہ نمائش اس لیے موز کر رہی ہے تاکہ لوگوں کی توجہ بچوں کی صحت کی طرف مبذول ہو۔ ہی ہی ہی۔“ وہ نہ جانے کس کی طرف دیکھ کر رہے۔ اور پھر اپنا لیکچر شروع کر دیا۔

”ہل تو کیا کہہ رہا تھا میں۔ ہال بے بی شو۔ شو کا مطلب ہے۔ مظاہرہ مطلب ہے دکھانا۔ سی یعنی ایس ڈئل ای۔ مطلب دیکھنا اور سی سے شو۔ یہ ٹاؤن ہے۔ سمجھو۔“ پھر خاموش ہو گئے۔

”ہل تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“ وہ پھر کسی طرف دیکھنے لگے۔

حفظان صحت اور زچہ و بچہ کا لیکچر تو محض جملہ معترضہ تھا۔ مطلب تو یہ تھا کہ اس احاطے

”ایللی۔ جانا نہیں۔“

وہ رک گیا اس کا دل دھک دھک کرنے لگا ”نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ میں لاپس نہیں جاؤں گا۔“

”ایللی اوہر آؤ۔“ علی احمد نے پھر آواز دی۔

راجو اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی ”اب تو نظری نہیں آتا ایللی۔“ اس نے لاڈ بھرے لہجے سے کہا ”جی نہیں چاہتا تیرا ملنے کو۔“ ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ بات طنز کی گئی ہو۔

”ایللی ذرا ہمارے ساتھ چلنا ہے تمہیں۔ ابھی چلتے ہیں ذرا ٹھہرو“ علی احمد بولے۔

”میں نہیں جاؤں گا۔“ ایللی نے با آواز بلند کہنے کی ناکام کوشش کی۔ اور پھر اپنی بے بسی بل کھا کر خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد علی احمد تیار ہو گئے ”چلو ایللی“ وہ بولے اور پھر علی احمد راجو اور ایللی سڑکیاں اترنے لگے۔

علی احمد اور راجو کے ساتھ دولت پور کے بازار سے گزرنا ایللی کے لیے بہت بڑی ٹٹل تھی۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے لوگ ان کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکراتے تھے۔ ان کے متعلق زیر لب باتیں کرتے تھے۔ اس وقت ایللی کی حیثیت سلیزمن کی سی ہو رہی تھی۔ اسے یہ بات بے حد ناگوار گزرتی لیکن وہ کبھی کیا سکتا تھا۔ وہ تینوں راہ گیر عجیب انداز سے چلے جا رہے تھے۔

علی احمد کو تو لوگوں کی موجودگی کا احساس ہی نہ ہوتا تھا راہ چلتے ہوئے انہوں نے کبھی رہکیروں یا پنواڑیوں کی طرف نگاہ اٹھا کر نہ دیکھا تھا۔ انہیں اوہر دیکھنے کی فرصت ہی نہ ہوتی وہ تو گردن اٹھا کر چلنے کے عادی تھے اور ان کی گردن کا زاویہ ایسا ہوتا تھا کہ سڑک کا اوچھل رہتی بلکہ مکانات کی مٹلی منزل کی طرف دیکھنا۔

ان کے لیے ممکن نہ رہتا اور دو رویہ بنے ہوئے چوباروں یا کونٹوں کو منڈیروں کی طرح دیکھتے ہوئے وہ آگے بڑھے جاتے۔ ان کے عقب میں راجو برقعہ پہنے ہوئے گرگلی جالوں میں چلتی جیسے وہ دولت پور کی راجو نہیں بلکہ کوئی اور ہی ہو جیسے اسے کوئی جانتا ہی نہ ہو۔ اس کے باوجود کبھی کبھی اس کا سینہ تن جاتا قدموں میں شوخی لہراتی اور جالی کے پیچھے سے لپکتی جیسے اس کا جی چاہتا ہو کہ ان آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھنے والے لوگوں سے کہے ”میں ہی“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا ”ہاں ہاں استغنے دینے ہی کو تو کہتے تھے۔“

”اور۔ اور تم نہیں ہوا بھی۔“

”ہم بھی جا رہے ہیں۔“ وہ بولی۔

”اوہ تو تم بھی جا رہی ہو۔ اس سلسلے میں میری مدد کی ضرورت ہو تو بلا روک ٹوک کہو۔“

اتنا صاحب اور مجھ میں کوئی فرق نہیں ہمارے پرانے دوست ہیں اور پھر خاندانی تعلقات ہیں ہی ہی۔“

جھوٹ جھوٹ۔ ایلی کا دل دھڑک رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی مکڑا اپنے پنجے پھیلا رہا ہو ہی ہی کے تار سے جال بن رہا ہوں اور کبھی قریب ہوئی جا رہی ہو اور قریب۔

ایلی کو اس بات پر غصہ آ رہا تھا کہ علی احمد چھوٹی سی لڑکی سے بھی ہی ہی کیے بغیر نہ رہے۔ کتنی چھوٹی عمر تھی اس کی جب کہ وہاں علی احمد کے برابر کی عورتیں موجود تھیں پھر۔

شاید وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ لڑکی کسی نوجوان کی توجہ کے لائق تھی۔ پھر دفعتاً اسے سارہ اور عبور یاد آ گئیں اور اسے غلی احمد کی آواز سنائی دی۔ سارہ سو گئی کیل۔ ہی ہی۔

”شراب نہیں تسلیم“ علی احمد اسے بھرمار رہے تھے ”ہاں ہاں برقعہ اٹھا لو کیا حرج ہے۔ ڈرو نہیں۔ ہم جو تمہارے ساتھ ہیں۔“

دفعتاً سفید رنگ کا ایک دمبہ ایلی کی آنکھوں تلے ابھرا اور گھٹکھریالے بالوں کی ایک لٹ لرائی اور اس نے گھبرا کر نگاہیں نیچی کر لیں۔

علی احمد کو تسلیم کی کلائی پر گھڑی باندھتے ہوئے دیکھ کر نہ جانے کیوں اسے شدید صدمہ محسوس ہوا جیسے کوئی اس کا دل مسل رہا ہو۔ ایلی کی نگاہوں میں وہ نمائش دھندلی پڑ گئی۔ بے بس فیسے اس نے علی احمد کی طرف دیکھا اور پھر مٹھیاں بھیج کر چل پڑا جیسے اس کے دل میں ایک نرم قائم ہو چکا ہو۔ جیسے اس نے ایک فیصلہ کر لیا ہو۔

”نہیں نہیں میں اسے سارہ نہیں بننے دوں گا۔ اس کی زندگی تباہ نہیں ہوگی۔ اسے اپنی عمر راہب خانے میں بسر نہیں کرنی پڑے گی نہیں نہیں“ وہ چلا رہا تھا۔ اس کے گرد لوگ شور مچا رہے تھے ٹانگے والے چلا رہے تھے۔ عورتیں سینے سے بچے چٹائے بھاگی جا رہی تھیں لیکن اس کے ذہن میں صرف ایک خیال تھا۔ ایک ارادہ تھا۔ سامنے شریف مسکرا رہا تھا ہاں۔ ایلی

میں کھڑے ہو کر باتیں کرنے کے بجائے ارد گرد کے مجمع میں کسی کو ٹاکا جائے۔ ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے بچوں کے ہمانے وہ عورتوں کی نمائش ہو اور پھر دولت پور کی عورتیں بھی تو ایسی اچھی تھیں ان میں وہ امر تر اور لاہور والی بات ہی نہ تھی۔ سیاہ رنگ کی دہلی پٹکی عورتیں جن کی ہاں نما ٹانگوں پر میلے تنگ پاجاموں کے غلاف چڑھے تھے اور جن کی گودوں میں انسانی دھلے پڑے رہے تھے۔

ہر جملے کے بعد علی احمد چاروں طرف دیکھتے اور ہر برقعہ پوش کو نگاہوں سے ٹٹولتے پھر اسے قول رہے ہوں اور پھر ہنسنے لگتے۔

”ہی ہی ہی۔ تم انفیٹ مارٹیلٹی کو بھی نہیں جانتے تمہیں کالج میں پڑھانے کیا ہیں وہ۔ دیکھو ہم تمہیں سمجھاتے ہیں۔“ ”آئیے خان صاحب آئیے۔ کسے مزاج کیسے ہیں۔“ وہ ایک اجنبی سے کہنے لگے۔ ”ہاں ہاں میں ایلی کو سمجھا رہا تھا کہ انفیٹ مارٹیلٹی کے کئے ہیں بچے کو باتیں سمجھانے کا بہترین طریقہ یہی ہے کہ اسے ایسے تہوار دکھائے جائیں۔ ہی ہی اور خان صاحب کے جانے کے بعد وہ مسکراتے ہوئے چاروں طرف دیکھنے لگے۔ ہاں تو کیا کہہ رہا تھا۔ میں یعنی مطلب ہے۔“

ایلی کو اچھی طرح معلوم تھا کہ مطلب کیا ہے اور وہ چاہتا تھا کہ چلا چلا کر لوگوں پر واضح کر دے کہ مطلب کیا ہے بلکہ خود انہیں بتا دے کہ وہ اچھی طرح سمجھتا ہے کہ مطلب کیا ہے۔

سفید دھبہ، بھوری لٹ

”ہائیں تم ہو تسلیم۔ تم۔“ علی احمد ایک اچلے برقعے کی طرف بڑھے تم یہاں۔“ برقعہ پٹا گھبرا کر رک گئی۔ ”تم نے مجھے پہچانا نہیں۔ ہی ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگے ”بھئی میں علی احمد ہوں علی احمد اپنے آغا صاحب اور میں دونوں ایک ہی دفتر میں تو تھے۔ آج کل کہاں ہیں صاحب۔“

”امر تر گئے ہوئے ہیں۔“ ایک باریک سی سسی سی آواز سنائی دی ”ہاں ہاں امر تر ہی ہوں گے انہوں نے خود مجھ سے کہا تھا ہی ہی ہی۔“

”پرانے دفتر سے چھٹی لی ہے کیا۔“

”استغنے دے دیا ہے۔“

کچھ نہیں سے..... بہت کچھ

اس جلائے کے بعد اہلی کا دولت پور میں رہنا قطعی طور پر ناممکن ہو گیا اس نے وہ آخری مہینہ بڑی مشکل سے گزرا۔ اب اس کی نگاہ میں علی احمد کی حیثیت ایک راکش کی رہ گئی تھی جس کا کام صرف یہ تھا کہ سیٹاؤں کو اپنی لٹا کی بھینٹ چڑھلوے اور راجو سا جو تو غلط ڈھیروں کے سوا کچھ نہ تھیں۔ ان سے بات کرتے ہوئے اہلی کو گھن آنے لگی تھی۔

البتہ اب جب غم عقی کھڑی کا سارا لیتی تو اہلی کو غصہ نہ آتا بلکہ اس کے دل میں ہمدردی کی ایک لہر دوڑ جاتی پجاری جو اس خوفناک لٹا میں بیکار بے مصرف مقید تھی۔ جو جھوٹے ساروں پر اپنی زندگی کے دن کاٹ رہی تھی جس کے لیے زندگی صبح و شام کے توازن کے سوا کچھ نہ تھی۔

ایک ماہ کے لیے کالج میں امتحان کی تیاری کے لیے چشیاں ہو چکی تھیں اہلی کتابیں لے کر اجمل کے پنگ پر پڑ جاتا۔ ایک گھنٹہ ریالی لٹ اس کی آنکھوں تلے لٹتی۔ ایک سفید سادہ چاند کی طرح چمکتا اور وہ چھت کی طرف ٹھنکی پاندھ کر بیٹھ جاتا اور نگاہوں کو مست بنانے کی شدید کوشش کرتا چھت سے شریف کی تجسم آواز آتی۔ تم محبت کے بغیر کچھ بھی نہیں اہلی۔ کچھ بھی نہیں۔ اور وہ محسوس کرتا کہ وہ بہت کچھ ہے بہت کچھ۔ پھر اسے امتحان دینے کیلئے اجلا ریاست میں جانا پڑا۔

ریاست اجلا

اجلا ایک ویران شہر تھا۔ جس میں یہاں وہاں آبادی کے ٹکڑے تھے۔ اور کہیں کہیں خوبصورت محل اور بنائے تھے۔ اجلے کا بڑا بازار کا ایک وسیع اور غلط کوچہ تھا جس میں سیاہ فام چمٹ و چھالاک قسم کے لوگ ادھر ادھر گھومتے پھرے تھے۔ جن کی زبان کچر کچر چلتی اور جن کی آواز میں نہ تو دلی کی سی رعینگی تھی اور نہ لاہور کی سی مٹھاس۔ باتوں میں عجیب سی کرختگی تھی۔ انداز میں عمویت سی تھی جن کی باتیں گویا بنگلی تھیں۔ بھونڈی اور بنگلی۔

اس بازار کے اوھر ادھر پرانی وضع کی بڑی بڑی عمارتیں تھیں۔ جن پر دیرانی اور اواسی

ہاں۔ محبت کرو۔ چاہے کسی سے کرو لیکن محبت کرو۔

اچھا تو

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چار بائی پر گر پڑا غصے اور بے بسی سے اس کی آنکھوں میں آنسو گئے۔ ان آنسوؤں کے دھندلکے میں شریف تحسین بھری نگاہوں سے اسے دیکھ رہا تھا۔ "کچھ بھی نہیں۔" کے بغیر تم کچھ بھی نہیں اہلی۔ اہلی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے اجمل دفتر سے آیا تو اہلی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔ "اہلی تم رو رہے ہو۔ علی احمد سے ہو گئی کیا۔"

"نہیں تو۔" وہ بولا۔

"تو کیا غم نے کچھ کہا ہے۔"

"نہیں تو" اہلی کی بچی نکل گئی۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ کیوں رو رہا ہے۔ اس بچکیاں کیوں نکل رہی ہیں۔ اس کی کوئی وجہ بھی تو نہ تھی مگر اس کے باوجود وہ چاہتا تھا کہ اس کے کندھے پر سر رکھ کر رو دے اس کا دل چاہتا تھا کہ راز دارانہ انداز میں اجمل کو ایک لے جائے اور اس سے کہے "مجھے محبت ہو گئی ہے۔ اب میں کیا کروں۔"

اہلی بار بار کوشش کرتا کہ اپنی محبوبہ کے تصور میں کھو جائے لیکن ایک سفید سادہ بھورے بالوں کی گھنٹہ ریالی لٹ کے سوا کوئی اور تفصیل اس کے تصور میں نہ آتی بلکہ پتہ بھی دھندلی پڑتی جا رہی تھیں۔ کتنا پیارا نام تھا اس کا تسلیم۔ اور آواز۔ کتنی میٹھی کتنی رنکلی۔ اہلی کی باتیں سن کر اجمل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی "ہوں" اس نے ایک آواز

کہا۔ "اچھا تو اہلی کو محبت ہو گئی ہے۔" اتنا کہنے کے بعد وہ کسی خیال میں کھو گیا اور آٹھ گھنٹوں تلے نجو کا بلوریں جسم منور ہو گیا۔ نجو البڑر قاصد جو اس کے باپ کے واسطے جاگتا تھا تھی اور جسے اس نے کئی ایک سال آنکھوں کا تار بنائے رکھا تھا۔ وہ نجو جس کو بھلانے کے لیے اس نے بھرے کی خاک چھانی تھی اور کابل کی پہاڑیوں میں پناہ لی تھی اور جسے بھولنے کی کوشش میں وہ اب تک ملحقہ چوباروں میں نہ جانے کس کی تلاش کیا کرتا تھا۔

چھائی رہتی تھی اور جن کی اندھیری لمبی ڈیوڑھیوں میں اونچے لمبے سپاہی بندوقیں اٹھائے پہنا کر تھے۔ کہا جاتا تھا کہ ان پرانے محلوں میں مہاراج کی وہ رانیاں مقیم تھیں جو مہاراج کا ختم ہو جانے پر ان محلات میں منتقل کر دی گئی تھیں اور زندگی کے باقی دن نوکروں اور اہل کاٹھ کی نگاہ التفات کے سہارے بسر کر رہی تھیں۔

ایلی محلات کے نوکروں کو مسرت کی نظر سے دیکھتا۔ دفعتاً اسے مہاراج پر غصہ آئے اور پھر علی احمد کی آواز سنائی دی۔ ”شرائے کی کیا بات ہے تسلیم۔ ہم کوئی بیگانے تو نہیں۔“ ایلی ان نگاہوں تلے ایک سفید دھبہ جھللاتا ایک بھوری لٹ لراتی اور وہ آہ بھر کر آسمان کی طرف دیکھ لگتا اور محسوس کرتا جیسے وہ سبھی کچھ ہو۔

مہاراج

مہاراج کا موتی محل دیکھ کر ایلی سہم گیا۔ کتنے حسین کمرے تھے۔ کتنا خوبصورت ماسلمان تھا ایلی کے لیے اتنی خوبصورتی اور فراوانی قابل حصول نہ تھی۔ زیادہ عالی شان چیزوں دیکھ کر اس کے دل میں ڈر سا پیدا ہو جاتا تھا ایک بوجھ سا پڑ جاتا تھا۔

شہابی حمام کو دیکھ کر وہ دنگ رہ گیا۔ یہاں رانیاں اور مہاراج نہاتے تھے تلاب میں نہاؤں دار پانی بھردیا جاتا تھا پھر غلام گردش پر وہ ایک دوسرے کو پکڑتے تھے۔ پھر جب اسے معلوم ہوا کہ سیڑھیاں چڑھتے وقت مہاراج سارا لیتے ہیں تو اس کے دل میں مہاراجوں کے خلاف پیدا ہو گیا اور اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ دنیا غریبوں کی شرافت اور محبت کی وجہ سے ختم تھی۔

واپسی پر سندھ محل کے دروازے کے قریب وہ رک گئے ان کی ہمت نہ پڑتی تھی دروازے پر سنتری سے بات کریں۔

ظالم یا مظلوم

”کیوں بھی یہاں کیوں کھڑے ہو۔“ سنتری نے لٹکارا۔

”جی جی۔“ ایلی بولا ”یہ محل دیکھنا چاہتے ہیں ہم۔“

”یہ محل نہیں دیکھا جا سکتا۔“ وہ بولا۔ مہاراج آرہے ہیں۔ یہاں اب بھاگ دو۔

مجید جوان سب میں شوخ طبیعت کا لڑکا تھا چلا کر کہنے لگا ”وہ جو بوڑھا اور نوجوان لڑکی وہاں بٹار کے ہیں۔“

”اس نے اندر باغیچے کی طرف اشارہ کیا۔“ وہ کیوں بیٹھے ہیں جی۔“

باغیچے کے اندر ایک کونے میں ایک بوڑھا اور اس کی نوجوان بیٹی چپ چاپ گھاس پر بیٹھے تھے۔

سنتری مسکرایا ”تم کون ہو بھی۔“ وہ بولا ”ہندو ہوا یا مسلمان“ ”الحمد للہ“ مجید نے شوخی سے کہا۔

سنتری قریب آگیا ”تم نہیں جان سکتے یہ بات۔“ اس نے مسکرا کر راز دارانہ انداز سے کہا ”یہ کام نہ تم کر سکتے ہو نہ جان سکتے ہو۔ یہ بڑھا بڑی امید لے کر مہاراج کے دربار میں آیا ہے۔“

”تو کیا یہ جو اس کے ساتھ لڑیا ہے اس کی امیدیں ہیں۔ الطاف نے اس گوری نوجوان لڑکی کی طرف دیکھ کر کہا جس کی نگاہ خمار آلود تھی۔

”ہاں۔“ سپاہی ہنسا ”اس لڑکی کو اس نے ۱۲ سال تک گائے کا دودھ پلا پلا کر جوان کیا ہے۔ کتا ہے میں نے لڑکی کے پنڈے پر حلوہ باندھ باندھ کر اسے پالا ہے اس امید پر کہ مہاراج یہ نذرانہ منظور کر لیں۔“

”لوہ۔“ — مجید ہنسا ”تو یہ نذر نیاز کا معاملہ ہے۔“ ایلی نے غور سے اس لڑکی کی طرف دیکھا جو نو عمر ہونے کے باوجود جوانی سے بھرپور تھی۔ ایلی سوچنے لگا کیا ہر مرد ایسا ہی ہوتا ہے۔ کیا عورت کے معاملہ میں ہر مرد ہی مہاراج ہوتا ہے۔ وہ وہ کور تھی۔ وہ بھی تو بھائی کو بلازمت دلوئے کیلئے آئی تھی اور پھر وہ خاتم تھی جسے وہ بلاؤموں کی گتھڑیاں دینے جایا کرتا تھا اور بلاؤنراجو۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ مہاراج ظالم تھا یا وہ بوڑھا باپ۔

دیر لہ

اتحمن سے فارغ ہو کر وہ پھر علی پور آگیا اس کا خیال تھا کہ علی پور وہی علی پور ہو گا جس سے وہ چند لمحوں پہلے گیا تھا جس بند ران کی رہنمائی چھائی رہتی۔ کرشن کنھیہا بانسری بجاتے اور مٹوری کوٹھے پر شعلتی تھی جس کپ چھلکتے تھے کیپ بوے طعراق سے اپنی نمائش کرتی تھی اور

کچی حویلی کی کبڑی لالین کے نیچے علی پور کا جادوگر اپنا سلمان لے کر اینکرایسنی کا پرہتا تھا مگر اب کی دفعہ وہ علی پور پہنچا تو وہ ایک ویرانہ تھا۔ لٹ و لٹ ویرانہ۔

رنگ محل کی عمارت ویران پڑی تھی شریف اور بیگم اپنے کنبے سمیت واپس نور پور تھے رنگ محل کے جنوبی حصے میں صرف رابعہ اور اس کا ننھا بیٹا سائر مقیم تھے۔ مغربی طرف فرحت اور باجرہ رہتی تھیں شمال میں اس کے ماموں حشمت علی اور ان کا بڑا بیٹا منظور تھے۔ حشمت علی پانچ وقت کی نماز پڑھنے اور قرآن کریم کی تلاوت کرنے میں مشغول رہتے۔ ان کا بیٹا پرانی یادوں کو بار بار دل میں دہرانے اور ”حافظ خدا تمہارا“ کی دھن لاپنے میں مگن رہتا اور کبھی کبھی اپنے نانا سے روپے تھپتھپا کر چوری چوری شراب پینے کے شغل میں رنڈ کرتا تھا۔

پرویز

رابعہ۔ سیدہ اور انور اجمل کی بہنیں تھیں۔ رابعہ کی شادی نو عمری میں اس کے چاچا بھائی پرویز سے ہو چکی تھی جو میڈیکل کالج میں تعلیم حاصل کرنے کے بعد فوج میں بھرتی تھا اور جس نے دوران تعلیم ہی میں حلقہ اسلام کو چھوڑ کر عیسائیت اختیار کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ مذہب کی اس تبدیلی کا سبب کسی نوجوان لڑکی کا حسن و جمال تھا لیکن اس کے متعلق وہاں سے کوئی بھی نہ جانتا تھا۔ کیونکہ پرویز کی زندگی ایک پر اسرار معمہ بن کر رہ گئی تھی۔ والد کا بے حد لاڈلا تھا اسی وجہ سے باپ نے اسے اعلیٰ تعلیم دلوائی تھی حالانکہ وہ صاحب شخص نہ تھے۔ پھر بھی انہوں نے بیٹے کی ہر بات پوری کی تھی جس کا نتیجہ یہ ہوا تھا کہ متوسط درجے کے والدین کا بیٹا ہونے کے باوجود فیشن ایبل حلقوں میں رہنے کا عادی ہو گیا۔ ہمیشہ کے لیے اپنے عزیزوں کی سی علمیانہ زندگی بسر کرنے سے نجات حاصل کرنے کی غرض اس نے عیسائیت اختیار کر لی تھی۔

پرویز کی تبدیلی مذہب گھروالوں کے لیے ایک گہرا صدمہ تھی اس کی والدہ نے اس کا اور یوں خاموش ہو گئی جیسے کسی اتھاہ سمندر میں ڈوب گئی ہو۔ والد نے سنا تو وہ انگریز ادھر ادھر ٹھٹھنے لگے۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ چلائے ”ایسا نہیں ہو سکتا۔ نہیں پرویز ایسا نہ کرے گا۔“

اور پھر جب انہیں یقین ہو گیا کہ خبر درست ہے تو انہوں نے پہلو بدلا ”عیسائی ہو گیا تو کیا ہوا۔“ انہوں نے ہنسنے کی ناکام کوشش کی۔ ”اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔ بہر حال وہ پرویز ہے وہ ہمارا بیٹا ہے۔ نہیں نہیں اس کا کیا ہے۔ اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ مگر ان کے انداز سے واضح تھا کہ فرق پڑتا ہے۔ ایسا فرق جو ان کے لیے قابل برداشت نہیں۔

پرویز کے متعلق یہ خبر اس کی بیوی رابعہ نے سنی تو اس نے لپک کر ننھے ساحر کو اپنی گود میں اٹھالیا اور چرائی سے چاروں طرف دیکھنے لگی جیسے کھو گئی ہو۔ رابعہ نوجوان تھی حسین تھی اور زندگی کی راہ میں ابھی نو آموز تھی۔

رابعہ کو دیکھ کر ایللی کو پرویز پر غصہ آنا شروع ہو جاتا اور وہ سوچنے لگتا کہ ضرور پرویز کے ساتھ کوئی ایسا واقعہ پیش آیا ہو گا جیسا سارہ کے ساتھ آیا تھا ورنہ عیسائیت کا سہارا کیوں لیتا۔

کیا ہے تجھے

سارہ کا خیال آتے ہی اسے علی احمد یاد آ جاتے اور پھر بے بی شو کا وہ میدان دکھائی دیتا اور ایک ابلے پر قہقہہ والی لڑکی اس کے روبرو آکھڑی ہوتی۔ ایک سفید وجہ ایک گھنٹھریالی لٹ۔ پھر وہ چپ چاپ گھر جا کر بیٹھ جاتا اور دادی ایللی پوچھتی ایللی کیا ہے تجھے کیا ہو گیا ہے۔ کیا بات ہے۔ ایللی۔ ایللی کو خود بھی معلوم نہ تھا کہ اسے کیا ہو گیا تھا۔

محلے کا احاطہ ویران پڑا تھا اس لیے کہ ارجند نہ جانے کہاں کس نوکری پر چلا گیا تھا اور انگریزی کا کھیل ہمیشہ کے لیے ختم ہو گیا تھا۔ کبھی کبھی ایللی گھبرا کے ارجند کے گھر چلا جاتا جہاں تخت پر ارجند کی بانسری پڑی دیکھ کر اس کا دل بھر آتا۔ یا کسی وقت جب وہ نگاہ بچا کر مقابلے کے مکھن کی طرف دیکھتا اور وہاں بکوری ڈکوری کا کوئی ایڈیشن نظر آتا تو دل پر ٹھیس لگتی۔ پھر وہ کچی حویلی کی کبڑی خدیہ لالین تلے چلا جاتا لیکن وہاں کھڑا ہونا تو بالکل بیکار تھا۔ اگرچہ کیپ فوراً کھڑکی میں آکھڑی ہوتی اور مسکرا مسکرا کر کسی نہ کسی سے با آواز بلند باتیں کرنے لگتی لیکن ایللی کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کرے کس طرح ہاتھ ہلائے، رومال لہرائے۔ وہاں بت کی طرح بے حس و حرکت کھڑے رہتا بھی تو بے معنی بات تھی اور پھر لوگ — پھر وہ رضا کی دوکان پر جا بیٹھتا اور رضا اسے دلچسپ باتیں سنا تا اور ہر آتے جاتے کو چھیڑتا اور بالآخر ایللی پر فقرے کسے

میں کوٹھ ہوتی تھی اور وہ ہر ممکن موقع پر رضا کے پاس جا بیٹھتا اور رضا اسے اواس دیکھ کر کہتا "آؤ ہمیں گھملا لیں۔ کیا یاد کرو گے بابو۔"

وہ اپنی لاشی سنبھال کے ساتھ ہو لیتا اور جب وہ علی پور کی فسیل کے باہر پھر لگا لگا کر تھک جاتے تو وہ اسے پہلوان اور طفیل کے پاس لے جاتا۔ پہلوان اور طفیل آصفی محلے کے پڑوس میں رہتے تھے پہلوان ایللی کو دیکھ کر مسکراتا۔ "آئیے بابو جی۔" اور پھر اپنی تمام تر معصومیت کو لیے ہوئے بیٹھا مسکراتا رہتا۔ طفیل ایک دیلا پتلا لڑکا تھا جس کی طبیعت میں رعینہ اور تیزی دونوں غصہ موجود تھے۔ وہ دونوں ایللی کے ساتھ بڑی محبت اور عزت سے پیش آتے تھے اور ایللی محسوس کرتا تھا جیسے وہ ایک بلند و برتر ہستی ہو۔ پھر وہ شیخ ہدم کی طرف جا بیٹھتے جو چڑے کا سوداگر تھا۔

شیخ ہدم

پہلی دفعہ شیخ ہدم کو دیکھ کر ایللی بہت متاثر ہوا تھا۔ شکل و صورت سے معزز دکھائی دینے کے باوجود اس کے خیالات نوجوانوں کے سے تھے اور طبیعت میں بلا کی چمک تھی۔ شیخ ہدم پہلا شخص تھا جو عمر اور مرتبے میں بڑا ہونے کے باوجود ایللی سے دوستانہ حیثیت سے ملتا تھا۔ "آئیے الیاس صاحب۔" وہ اسے دیکھ کر مسکراتا "تشریف رکھیے یہاں گھبرانے کی کوئی بات نہیں بس چار ایک منٹ میں سودا طے ہو جائے گا اور پھر بیٹھ کر گپ اڑائیں گے۔" ہاں جی چودھری جی۔" وہ اپنے گرد بیٹھتے ہوئے بیوپاریوں سے کہتا "بس جو کہہ دیا ہے نا میں نے وہ عین مناسب ہے۔ آپ بھی کیا یاد رکھیں گے چودھری صاحب۔ سو کے پیچھے ایک آنہ اور سسی۔ بس چودھری صاحب اب تو مطمئن ہو جانا چاہئے آپ کو۔ ٹھیک ہے ٹھیک ہے اچھا تو سلام علیکم ہاں جی الیاس صاحب۔ تو رہے گی شطرنج کی بازی۔ مگر ابھی تو آپ ناچتے ہیں اس فن میں بہر حال چلئے۔ ہو ہی جائے ایک بازی۔ ہاں کیا پیسے گے آپ نہیں چاہئے تو واہیات ہے۔ او لڑکے دودھ والے۔ آدھ کیر دودھ میں چار بیڑے بلو کر لانا۔ ذرا بالائی زیادہ ڈالنا۔ الیاس صاحب بھی کیا یاد کریں گے کہ کسی شیخ سے پالا پڑا تھا۔ بابو الیاس صاحب دودھ پیجئے۔ بالائی کھائیے اور ورزش کیجئے ورزش۔ یہی میٹھ ہے آپ کی قسم۔ ہاں تو کئے کیسی گزرتی ہے آج کل۔"

شیخ ہدم میں زندگی تھی۔ جوانی تھی اور اس کے علاوہ وہ معزز شہری سمجھے جاتے تھے اور یہ سب باتیں علی پور میں ایللی کو نصیب نہ تھیں گھر اور محلے والے اسے کھانڈرہ لڑکا سمجھتے تھے اور

شروع کر دیتا۔ "ہوں تو ایللی بابو کو محبت ہو گئی ہے۔ بڑا خطرناک مرض ہے یہ۔ اللہ ہی پہلے وہ ہے ورنہ ایسے مریض پیچتے نہیں۔" اور ایللی کو اس کی باتوں کے علاوہ اپنی حماقت پر غصہ آتا کہ اس نے اپنی محبت کی بات رضا کو کیوں بتا دی تھی مگر رضا کو بتائے بغیر چارہ بھی تو نہ تھا علی پور میں اور کون تھا جس سے وہ راز دل کہہ سکتا تھا۔ صرف ایک رضا تھا۔ رفت بھی تو نوکری کے سلسلے میں کہیں جا چکا تھا۔

حمیدہ رشیدہ

محلے میں اس کے لیے دلچسپی کی کوئی صورت نہ تھی گھر میں بوڑھی داوی کے سوا کوئی نہ تھا۔ سیدہ تو بالکل ہی خاموش رہا کرتی تھی۔ وہ ہر وقت داوی امں کے ساتھ چپ چاپ بیٹھی رہتی تھی۔ جوان ہونے کے باوجود وہ ازلی طور پر بوڑھی تھی۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ اس کا ظہور اس کی پروانہ کرتا تھا۔ کبھی کبھار سال دو سال کے بعد رات کے اندھیرے میں وہ چپ چاپ آجاتا پھر انگلی صبح جب ایللی بیدار ہوتا تو اسے خبر ملتی کہ فاضل صاحب آئے ہوئے ہیں وہ دور سے ہی اسے دیکھتا۔ سیاہ فام بھاری بھر کم سامرو جس کے بال کالے ہونے کے باوجود سفید دکھائی دیتے تھے اور جس کی جھگی ہوئی کمر سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ شانوں پر صدیوں کا بوجھ اٹھائے ہوئے ہو۔ وہ دھیمی آواز میں باتیں کرنے کا عادی تھا یہاں تک کہ گھروالوں کو اس کو کھسپ پھر سے انداز نہ ہو سکتا تھا کہ وہ آپس میں محبت بھری باتیں کر رہے ہیں یا ایک دوسرے سے لڑ رہے ہیں بلند جب کبھی ایللی اس کے پاس جاتا تو وہ ایک نہ ایک دلچسپ بات شروع کر دیتا اور ایللی کو یقین نہ آتا کہ اس شکل و صورت کا شخص ایسی چمکیلی اور دلچسپ بات بھی کر سکتا ہے۔

ایللی کے گھر میں سیدہ کے علاوہ سیدہ کی مرحوم بہن نیاز کی بیٹیاں حمیدہ اور رشیدہ بھی رہتی تھیں مگر وہ تو بالکل بچیاں تھیں۔ حمیدہ اور رشیدہ کا ایک بھائی بھی تھا جس کا نام نقی تھا اور جانا کے چہرے پر بہت بڑا داغ تھا۔

حمیدہ اور رشیدہ کے آنے سے ایللی کو چند ایک سہولیات ضرور حاصل ہو گئی تھیں مگر اسے دو چھوٹی بہنیں میسر ہو گئی تھیں جو اس کے چھوٹے موٹے کاموں میں مصروف رہتی تھیں اور اس کا کام کرنے میں حقیقی مسرت محسوس کرتی تھیں مگر ان باتوں کے باوجود اسے گھر و

بڑی تھی اس لیے انہوں نے اسے چنداں اہمیت نہ دی تھی۔ لیکن ایللی کے لیے اب بے بی شوکا
وہ دن ایک تاریخی دن تھا ایک ایسا دن جسے وہ کبھی فراموش نہ کر سکتا تھا۔

پرنسپل

روشن لال خوش شکل اور جوان قسم کے آدمی تھی ان کے بشرے سے ذہانت اور بے تکلفی
پتہ تھی۔

”ہوں۔۔۔“ وہ بولے ”تو تم علی احمد کے لڑکے ہو۔ جانتے ہو علی احمد میرے
دوست ہیں لنگوٹھیہ دوست۔ مگر تم گھبرائے ہوئے کیوں ہو۔ علی احمد کے بیٹے کو گھبرانا زیب
نہیں دیتا۔ بیٹہ جاؤ چائے پیو گے نا۔ اوہ تو تمہیں مجھ سے زیادہ ان سنہری مچھلیوں سے دلچسپی
ہے۔“ ایللی کو بلور کے مرتبان میں تیرتی ہوں مچھلیوں کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر وہ ہنسنے
لگے۔

”چھا تو الیاس یہ بتاؤ کہ جب مرتبان کا پانی گندہ ہو جائے اور مچھلیوں کو تازہ پانی بہم پہنچانا ہو
یعنی مرتبان کا پانی بدلنا ہو تو کیا کریں گے۔“
ایللی سوچنے لگا ”ہاں ہاں سوچ لو۔“ وہ مسکرا کر بولے۔ ”مگر کوئی ایسی بات بھی نہیں۔
مانٹس پڑھی تھی نا تم نے دسویں میں۔“

ایللی ان کی بے تکلف باتیں حیرانی سے سن رہا تھا اس کا تو خیال تھا کہ روشن لال اسے کوئی
ضروری پیغام دیں گے اور بزرگانہ انداز میں کچھ فرمانے کے بعد یہ ملاقات ختم ہو جائے گی مگر وہ تو
اس سے یوں باتیں کر رہے تھے جیسے وہ علی احمد کی لہجائے خود ایللی کے دوست ہوں۔
”چھا تو الیاس تمہارے مشاغل کیا ہیں؟“ وہ پوچھنے لگے۔ ”سنا ہے فی الحال فیل ہونا تمہارا
مشغلہ ہے جب میں تمہاری عمر میں تھا تو میرا بھی یہی مشغلہ تھا۔ کئی ایک سال میں کامیابی سے
فل ہوتا رہا۔“

ایللی حیران تھا کہ انہیں کیا جواب دے وہ بڑے شوق سے ان کی باتیں سن رہا تھا اور مسکرا
رہا تھا ”چھا بھئی“ بلا خردہ بولے ”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم تمہیں اپنے کالج میں داخل کر
سکتے۔ خوب مگر رے کی جو مل بیٹھیں گے دیوانے دو۔ کیوں۔“
”آپ کا کالج۔“ ایللی نے خوشی سے پوچھا۔

بس وہ اس قابل نہ تھا کہ اسے کوئی اہمیت دی جائے۔ اس میں ذہنی چمک تو تھی مگر وہ اُردو
خوف کے دبیز پردوں میں دم توڑ رہی تھی۔ اور سب سے بڑھ کر یہ کہ وہ خود کفیل نہ تھا پیر
شیخ ہدم تھے۔ جب شیخ ہدم اسے الیاس صاحب کہتے تو وہ خوشی سے پھولانہ ساتا اور اسے غم
ہوتا کہ وہ بھی ایک حیثیت کا مالک ہے باعزت فرد ہے ایک ایسا شخص جو بالغ العقل ہے۔
ان باتوں کے باوجود ایللی زیادہ دیر تک شیخ ہدم کے پاس نہیں بیٹھ سکتا تھا کیونکہ جلد ہی
پر احساس کمتری چھا جاتا اور وہ وہاں سے چلے آنے کا کوئی نہ کوئی جواز پیدا کر لیتا۔ مگر اگر
چارپائی پر لیٹ جاتا اور شریف کی سی آنکھیں بنا کر چھت کو گھورنے لگتا چھت پر ایک سفید
دھبہ چمکتا اور ایک بھوری لٹ لٹکتی دوسیاہ آنکھیں ڈولتیں۔ بار بار آپہں بھرتا اور پہلو بدلتا
محسوس کرتا کہ زندگی ایک مسلسل کوفت ہے ایک دکھ بھری کیفیت۔

نتیجہ

ایللی کا نتیجہ نکلا تو وہ فیل تھا۔ اس خبر کو سن کر اسے بہت صدمہ ہوا لیکن اس نے اپنی تعلیم
کا ناکامی کو ایسی چابکدستی سے ناکامی محبت کی طرف مبذول کر دیا کہ اسے فیل ہونے کا
صدمہ نہ رہا۔ وہ ابھی ہوئی لٹ اور پر پیچ ہو گئی اور اس سفید دھبے میں دل کے خون کی لگی
سرخ شامل ہو گئی۔

نتیجہ کے اعلان کے بعد علی احمد کا ایک خط موصول ہوا جس میں ایللی کو مختصر طور پر
کی گئی تھی کہ وہ امرتسر جاکر ایڈورڈ روڈ پر روشن لال سے ملے خط میں علی احمد نے یہ نہ لکھا
کہ یہ روشن لال کون تھے اور ان سے ایللی کو ملانے کا مقصد کیا تھا۔ ایللی صرف اس حد تک
سکا تھا کہ روشن لال علی احمد کے دوست تھے اور انہوں نے کسی نجی کام کے لیے اس سے
لال سے ملنے کو کہا تھا۔

ایللی کو معلوم نہ تھا کہ روشن لال امرتسر آریہ کالج کے پرنسپل تھے اور علی احمد کا مقصد
ملاقات سے صرف یہ تھا کہ روشن لال ایللی کو امرتسر آریہ کالج میں داخل ہونے پر رضامند کرے
اور وہ لاہور میں آوارگی کرنے سے محفوظ ہو جائے انہیں معلوم نہیں تھا کہ ایللی کی سب
بڑی خواہش یہی تھی کہ وہ امرتسر جائے وہاں ایک سال رہتا تو بہت بڑی خوش نصیبی
شاید انہیں بے بی شوکا وہ معمولی واقعہ یاد ہی نہیں رہا تھا ان کی زندگی ایسے واقعات سے

”ہاں ہاں۔“ وہ بولے ”ایک چھوٹا سا کالج ہے اور اسے چلانا میرے ذمہ ہے تم اگر میرے کالج میں داخل ہو جائیں تو بڑا اچھا ہو۔“

”جی ہاں۔“ ایللی خوشی سے جھوم گیا۔ ایک تو امرتسر اور پھر روشن لال صاحب اس صورت اور کیا ہو سکتی تھی اور وہ داخل ہونے کا وعدہ کر کے چلا آیا۔

ہال دروازے میں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال آیا کہ وہ یہاں رہتی ہے اس شہر میں میں بیٹھتی ہو گی اس نے بازار میں چلتے ہوئے ٹانگوں کی طرف دیکھ کر سوچا۔ ان بزرگوں پھرتی ہو گی کتنی خوش نصیب ہیں یہ سڑکیں یہ راستے یہ ٹانگے یہ ہوا۔ ایک سفید مادہ نگاہوں تلے چپکنے لگا اور تھکھریالی لٹ لہرا لہرا کر اسے بلائے گی۔ اللہ کرے اب روشن لال ہاں لیں اور میں امرتسر کالج میں داخل ہو جاؤں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ تجویز تو خود ہی تھی جسے روشن لال نے اپنی جانب سے پیش کیا تھا تاکہ ایللی کو یہ احساس نہ ہو کہ اسے میں داخل ہونے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور وہ لاہور میں داخل ہونے کا مطالبہ نہ کرے۔

دس دن کے اندر اندر علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں اسے امرتسر میں داخلہ اجازت دے دی گئی اور وہ اپنا مختصر سا سامان اٹھا کر امرتسر آ پہنچا اور آریہ کالج میں داخل اور پرنسپل روشن لال نے اسے بورڈنگ میں داخل ہونے کی خصوصی اجازت حاصل کیونکہ وہاں مسلمان لڑکوں کو رہنے کی اجازت نہ تھی۔

آم اور سانپ

بورڈنگ شہر سے بہت دور نہر کے کنارے آموں کو کوٹھی میں واقع تھی۔ آموں کا ایک ویران جگہ تھی زرد رنگ کی یہ پرانی عمارت چاروں طرف سے آم کے درختوں سے گھری ہوئی تھی جہاں رات بھر زمین پر سانپ ریختے اور دن بھر الو بولتا۔ مغرب کی جانب سڑک تھی جس کے پرے آموں کا ایک باغ تھا جنوب کی طرف نہر بہتی تھی اور باغ کی طرف ویران زمین تھی۔

کوٹھی سے ایک پختہ سڑک شہر کی طرف نکل گئی تھی۔ سڑک کا یہ ویران علاقہ تھا جس کے دونوں طرف اونچے لمبے درخت لگے تھے اور وہ اتنے گھنے تھے اور تنہا زیادہ تھے کہ اچھی خاصی جنگل کی شکل بن گئی تھی۔ سڑک کے اس ویران علاقے

سہنی باغ اور ٹھنڈی کھوئی تھی۔
اڑتے پھلکے

بورڈنگ میں تقریباً بارہ تیرہ کمرے تھے جن سے ہٹ کر دو کمرے تھے جو باورچی خانے کے لیے مخصوص تھے جن میں چار ایک غلیظ باورچی اور نوکر ہر وقت کام کالج میں مصروف رہتے تھے۔ کوٹھی کے مشرق میں دو بڑے کمرے بنگالی پروفیسر سیز جی کے لیے مخصوص تھے جو بورڈنگ کے پرنسپل تھے اور اکثر چوری گھر میں مچھلی پکا کر کھایا کرتے تھے کیونکہ بورڈنگ میں گوشت مچھلی اور انڈا پکانا قانونی طور پر منع تھا۔ بورڈنگ کے باورچی خانے میں آلو ساگ بھنے ہوئے ٹنڈے بیگن کا بھرتہ اور دالیں پکتی تھیں۔ سوئی کے باہر ایک لمبی میز بڑی تھی یہ میز لڑکوں کا ڈائننگ ہال تھی۔ بندو باورچی چھوٹے چھوٹے پکا کر انہیں باورچی خانے سے پر اسرار رکابیوں کی طرح ہوا میں پھینکتا اور باہر منیر بیٹھے ہوئے لڑکے انہیں دبوچتے۔

”بندو پھلکا“ رام لال چلاتا اور بندو ایک زرد زرد سا پھلکا فقہا میں چھوڑتا جو رام لال کے ہاتھوں میں آگرتا۔ ایللی بندو کی چستی اور نشانی پر حیران رہ گیا۔ وہ منظر عجیب تھا۔ باورچی خانے کے باہر سفید زمین پر ایک لمبی غلیظ میز پر دس بارہ لڑکے کٹوریاں سامنے رکھے بیٹھے تھے اور بندو کے پھلکے کپوتروں کی طرح ہوا میں اڑ رہے تھے۔

”بندو پھلکا“ اور ایک ساعت میں ایک پھلکا پکارنے والے کے ہاتھ میں آگرتا۔
”بندو وال۔“ ایک لڑکا چیخا اور ہنستا ایک کٹوری لے کر بھاگتا۔

ایللی کے لیے کھانے کی میز کا یہ منظر بالکل نیا تھا۔ نیا اور انوکھا۔ لیکن اسے اجازت نہ تھی کہ وہ اس میز پر بیٹھے کیونکہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان کے لیے جزل نیبل پر بیٹھنا منع تھا اس کے لیے کچن کے برتنوں کو استعمال کرنا ممنوع تھا۔ خوش قسمتی سے اس سال بورڈنگ میں دو اور مسلمان لڑکے داخل ہو گئے تھے جنہیں خصوصی وجہ کی بناء پر وہاں رہنے کی اجازت مل گئی تھی اور ان تینوں کا فرض تھا کہ یا تو وہ سب سے پہلے کھانا کھالیں اور یا سب کے بعد اور یا کمرے میں بیٹھ کر جب جی چاہے کھائیں بشرطیکہ اس وقت کوئی نوکر فارغ ہو جو ان کے لیے کھانا لائے۔

کٹوریاں

نوکران زرد کٹوریوں میں کھانا لے آتا اور پھر کٹوریوں میں انگلیاں ڈال کر بڑی بے تکلفی

سے دال یا سبزی ان کے ذاتی برتنوں میں اتار دیتا۔ اس عمل کے دوران میں وہ احتیاط رکھتا کہ اس کے جسم کا کوئی حصہ ان کے برتنوں سے چھو کر بھڑکتا نہ ہو جائے اور پھر وہ تینوں باری باری چلاتے۔ ”بندو پھلکا“ اور پھلکے ہوا میں اڑتے اور برتن بجتے اور وہ تینوں ایلی شفیع اور ملا داو شور چاتے۔

ہفتے کو سر شام ہی سے بچن سے باہر دودھ کی بڑی بڑی گاگریں قطار میں پڑی دکھائی دیتی۔ نہ جانے وہ گاگریں کہاں سے آتی تھیں۔ شام کو ہر آدھ گھنٹے بعد کوئی مرا سر پر گاگر اٹھائے تینوں سے نیم چٹا نیم بھانگتا ہوا آتا دکھائی دیتا۔ اس کا جسم میل سے بھرا ہوتا۔ ہاتھوں کی انگلیاں گاگر میں ڈوبی ہوئی ہوتیں اور کہنیوں تک بازو دودھ میں تر ہوتے دودھ کی چھلکتی ہوئی گاگر لیے۔ بھاگا آتا اور پھر بسنتے یارامو کی مدد سے گاگر اتار لی جاتی۔

ہفتے کی رات بندو بڑے بڑے کڑا ہے چولہوں پر رکھ کر آگ جلا دیتا اور پھر رات بھر ان کڑاہوں میں چمچ چلانے کی آوازیں آتیں اور بندو باری باری بسنتے اور رامو کو ڈانٹتا۔ اگلے روز بڑی بڑی زرد تھالیوں میں کھیر ڈال دی جاتی اس پر لڑکے خوشی سے پھولے نہ ساتے اور پھر میز پر بیٹھ کر کھیر بھری انگلیاں چاٹتے۔ اس روز بندو کے پھلکے ہوا میں نہ اڑتے اور کٹوریال باورچی خانے کے ایک کونے میں ڈھیر کر دی جاتیں۔

معزز آدمی

شفیع۔ مولا داو اور ایلی بورڈنگ کے ایک علیحدہ کمرے میں رہتے تھے۔ شفیع پتلا دلاور لڑکا لڑکا تھا جس کے خدو خال سے چستی اور ذہانت نکلتی تھی۔ اس کے والدین امرتسر کے قریب کا کسی گاؤں کے زمیندار تھے۔ مولا داو کو تاہ قد اور جسم تھا۔ خدو خال سے وہ کالج کا لڑکا معلوم تھا نہ ہوتا تھا اور گفتگو سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کسی گاؤں کا جاٹ بھول کر شہر میں آ نکلا ہو۔ اس کا لباس بھی عجیب تھا۔ کم از کم ایلی کے لیے تو وہ لباس بہت ہی انوکھا تھا اس کے لباس کو دیکھ کر پہلے ہی روز پر نہیں نے اسے دفتر میں بلا لیا اور کہنے لگے۔

”مولا داو یہ کیا حلیہ بتایا ہے تم نے۔“

”حلیہ“ مولا داو نے حیرانی سے دیکھا اور پھر ٹھوڑی پر ہاتھ پھیر کر بولا پر نہیں صاحب میں اپنے گاؤں کا ایک معزز آدمی ہوں اور جناب حلیہ تو مجرموں کا ہوتا ہے۔“ مولا داو کی آواز

انداز میں ایک خاص قسم کی سنجیدگی اور معصومیت تھی۔
”نہیں۔ نہیں یہ نہ بند کالج میں نہیں چلے گا۔ کوئی شلوار نہیں ہے تمہارے پاس پہننے کے لیے۔“

”مل جائے تو پہن لوں گا۔“ وہ بولا۔

اس پر نہیں نے کسی فنڈ سے اسے دو شلواریں سلوا دی تھیں۔ اس کے بعد بورڈنگ سے چلے وقت مولا داو ایک شلوار اخبار کے کانڈ میں لپیٹ کر لے جاتا۔ جب کالج کی کھٹی بجتی تو وہ تہہ بند اتار کر جھٹ شلوار میں داخل ہو جاتا اور جماعت میں جا بیٹھتا جہاں خالی پیریز آتا وہ شلوار کانڈ میں لپیٹ لیتا اور تہہ بند باندھ کر اطمینان کا سانس لیتا۔

”بھئی اب کرو بات۔“ وہ چلاتا۔ ”یار اس شلوار میں تو دم گھٹتا ہے۔“

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مولا داو کہاں کا رہنے والا تھا اور کہاں سے آیا تھا اس نے کبھی اپنے گاؤں اور والدین کا ذکر ہی نہ کیا تھا البتہ اسے جیب خرچ بہت کم ملتا تھا اور اس کے زیادہ تر اخراجات کالج والے خود ادا کیا کرتے تھے کیونکہ وہ کرکٹ کا ایک نہایت عمدہ کھلاڑی تھا اور بائیں ہاتھ سے کھلے گیند پھینکنے کی وجہ سے کالج والے اس کی عزت کیا کرتے تھے۔

شفیع یا تو سانپ مارنے کے شوق میں ادھر ادھر گھومتا پھرتا اور یا ہاکی کھیلنے کے متعلق چہیں غانا رہتا۔ مولا داو تہہ بند جھاڑتا اور عجیب و غریب منصوبے بناتا رہتا۔ پہلے ہفتے میں اس نے لنگوٹا باندھ کر جڑے پر رومال باندھ کر ہاتھ میں لٹھ لے لیا اور رات کے وقت سڑک پر دو رویہ درختوں میں جا چھپا۔ جب بھی کوئی بورڈنگ سے متعلق لڑکا سڑک پر آتا دکھائی دیتا تو وہ لٹھ لے کر درختوں سے باہر نکل آتا۔

رکھ دے میل جو بھی تیرے پاس ہے وہ ڈاکو بن کر انہیں ڈانٹتا۔ اس طرح پہلی رات اس نے کئی فیلپس۔ چاقو۔ گھڑیاں اور سات روپے بارہ آنے نقد جمع کر لیے تھے اور بورڈنگ کے لڑکوں کے دل میں سڑک کے اس دیران حصے کا ڈر پیدا ہو گیا تھا۔

میں ہوں!

سویرے وہ تینوں تیار ہو کر کالج کی طرف چل پڑتے اور دو گھنٹے کی پیدل مسافت طے کرنے کے بعد کالج پہنچتے کیونکہ ان کے پاس بائیکل نہ تھے اور تاکے پر جانے کی توفیق نہ تھی۔ راستے میں

مولاداد بار بار تہ بند بھاڑتا جاؤں کی طرح چکھاڑتا اور عجیب و غریب حرکات کرتا۔

شفیع یا تو مست انداز میں کوئی دھن گنگنا رہتا یا ہاکی کے میچوں کے متعلق قصے سناتا۔ چپ چاپ اپنے خیالات میں کھویا چلا جاتا۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی ہے۔ نہ جانے اسے معلوم ہے یا نہیں۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس طرح اس کا پتہ لگائے اسے صرف یہی معلوم تھا کہ اس کے بھائی پہلے کسی دفتر میں ملازم تھے اور اب ان کا ارادہ تھا کہ ملازمت چھوڑ کر شروع کر دیں اور ان کا نام آغا صاحب تھا۔ آغا غلام بخش۔

وہ امرتسر میں آوارہ پھرتے ہوئے بڑے غور سے لوگوں کے بوڑھو پڑھتا رہتا کہ شاید کبیر غلام بخش کا بوڑھنگ ہو مگر کئی روز تک وہ بے کار گھومتا رہا اور اسے وہ بوڑھو نظر نہ آیا۔

ایلی کے دل میں تسلیم کے متعلق نفقوش دھندلے پڑتے جا رہے تھے اور جوں جوں دھندلے پڑتے ڈوبنے کے مانند وہ ان نکتوں سے شدت سے چپے جاتا جس قدر وہ دھندلے تھے اسی قدر اس کا جذبہ محبت بڑھتا جا رہا تھا وہ ڈرتا تھا کہ کیسے وہ شکل اس کے دل میں محو نہ ہو جائے اور اسے محبوبہ کی از سرنو جستجو کرنی پڑے کیسے ایک مرتبہ ”سب کچھ“ ہو کے بعد وہ پھر سے ”کچھ بھی نہ“ نہ رہ جائے۔

برقعہ میں لپٹی ہوئی ہر عورت کو وہ امید بھری نگاہ سے یوں دیکھتا جیسے اسے توقع ہو کہ وہ اس کے پاس چلی آئے گی اور قریب آکر برقعہ اٹھا کر راز دارانہ انداز سے جھانکے گی اور پھر بے لہجے میں کہے گی۔ ”تسلیم میں ہوں۔“

ہر برقعہ پوش لڑکی جب اس کے قریب سے چپ چاپ گزر جاتی تو اسے دکھ سا محسوس ہوتا لیکن جلد ہی دور سے آتی ہوئی کوئی اور برقعہ پوش اس کی امید کا مرکز بن جاتی اور وہ اپنے سے اسے ٹوٹتا شاید وہ نورانی وجہ اور گھنگھریالی لٹ اس برقعے میں ملفوف ہو۔ اکثر مرتبہ ہوتا کہ کمپنی باغ میں شلٹے ہوئے اسے لڑکیوں کے گردہ دکھائی دیتے جنہوں نے برقعہ ہوتے اور اسے کئی ایک سفید وجہ اور گھنگھریالی بھوری ٹیٹیں دکھائی دیتیں اور اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ ان میں سے کون سی تسلیم ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا کہ وہ کس کی طرف دیکھے۔ کبھی گوری چٹی لڑکیاں حسین معلوم ہوتی تھیں لیکن ان میں سے کوئی بھی اس کے قریب نہ آتا اور راز دارانہ انداز میں نہ کہتی۔ ”تسلیم۔ میں ہوں۔“ یہ صورت حال بے حد تکلیف اور سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ امرتسر میں وہ کسی سے دل کی بات نہ کہہ سکتا تھا۔

شفیع توج و شام سانپ مارنے۔ اچھلنے کودنے۔ گنگناٹے اور بالاخر ہاکی کی دلچسپی میں کھویا رہتا تھا اور مولاداد کی شکل و صورت ہی ایسی تھی کہ اس سے کوئی رنگین بات بیان ہی نہ کی جا سکتی تھی۔ کالج میں بیسیوں لڑکے تھے مگر وہ ان سے اچھی طرح واقف نہ تھی مثلاً مدھوک تھا۔ نوچا لہجہ پیرا سا ساتھی۔ جس کے انداز سے بے پناہ ہمدردی ٹپکتی تھی اور جس کی آنکھوں پر مہمی اور لمبی بھوئیں عجیب پرتانگ اثر رکھتی تھیں۔ مگر ان سب باتوں کے باوجود ایلی کے لیے مدھوک سے ایسی بات کرنا ممکن نہ تھا۔ پھر وہ پست قد بشیر تھا مگر وہ تو سرا سر معزہ تھا اس سے کوئی سنجیدہ بات نہ ہو سکتی تھی۔ البتہ آصف تھا۔

آصف

آصف ایک خوبصورت اور دراز قد لڑکا تھا جو بات بات پر شرما جانے کا عادی تھا اور جس کے جذبات ہر لمحہ اس کے چہرے پر گلابی رنگ کی صورت میں ناپتے رہتے تھے۔ معمولی سی بات پر اس کے رخساروں پر ایک گلابی لہر دوڑ جاتی۔ نگاہیں جھک جاتیں آنکھوں میں پھلجھریاں سی چلتیں اور جسم بید کی طرح جھولتا۔

آصف زیادہ باتیں کرنے کا شوقین نہ تھا اور نہ ہی محفل میں جانے کا دلدادہ جب بھی لڑکے غلط چیرید میں کالج کے گراؤنڈ میں کھڑے ہو کر خوش گپیاں کرتے وہ مسکراتا ہوا آنکھٹا اور چپکے سے ایلی کو اشارہ کرتا اور وہ دونوں چپکے سے وہاں سے کھسک جاتے اور یا تو پہلوان کی دوکان پر بیٹھ کر پوری کچوری کھاتے یا رامو پان والے سے پان سگریٹ خریدتے۔ بازاروں میں گھومتے پھرتے ہوئے جب بھی کوئی عورت قریب یا دور سے گزرتی جس کے سینے پر سلوٹ پڑے ہوتے آصف ایلی کو کہنی مار کر چپکے سے کہتا۔ ”وہ دیکھو۔ اوھر۔ وہ اوھر۔“

آصف کو پکڑنے کی سلوٹوں اور متناسب جسم کے دائروں سے بے پناہ دلچسپی تھی جسے اس نے عام لڑکوں کے سامنے کبھی ظاہر نہ کیا تھا۔ اس کے احساسات بے حد پاکیزہ اور لطیف تھے اور نہایت میں شاعرانہ رنگ کوٹ کر بھرا ہوا تھا لیکن عورت کے جمال کے علاوہ اسے اس سے دل اور دلچسپی نہ تھی بلکہ عورت کے قرب کا ڈر اس کے دل میں خطرناک قسم کی شدت اختیار رہ چکا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ وہ عورت کے جمال کو دیکھے۔ اس کے جسم کے خم و چوڑے جانچے چوری دلی حسن سے محفوظ ہو مگر دیکھے جانے والی کو احساس نہ ہو جائے کہ اسے دیکھا جا رہا ہے۔

نگاہیں چار نہ ہو جائیں اگر کوئی شوخ راہ گیر نگاہ بھر کر اسے دیکھ لیتی تو آصف کو ہلیر آہ آ نکھیں پلکوں تلے غروب ہو جائیں اور رخساروں پر یوں ہوائیاں سی چلتیں جیسے غروب آفتاب کے وقت بادلوں میں گلابی نقوش بننے لگتے ہیں۔

آصف کی طبیعت ایسی تھی کہ دیر تک اس سے دل کا راز نہ کہنا ممکن نہ تھا۔ اس نے ایک روز ٹلتے ٹلتے اس سے اس وجہ اور گھنگھریالی لٹ کا راز کہہ دیا۔ اہلی کا قہر آصف نے ہتھیلی پر رخسار رکھ کر ترچھی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا اور پھر اس کی آنکھوں گلابی بوندیوں کی پھولوار پڑنے لگی ”تم تو چھپے رستم ہو۔“ وہ مسکرانے لگا۔

آصف سے درد دل کہنے کا اہلی کو کوئی فائدہ نہ ہوا۔ نہ کسی لڑکی نے نقاب بلند ”تسلیم میں ہوں۔“ اور نہ ہی کسی بورڈ پر آغا غلام بخش لکھا نظر آتا۔ البتہ اتنا ضرور ہوا کہ اہلی لڑکوں میں کھڑا ہوتا تو آصف چپکے سے آکر کہتا ”تسلیم“ اور ہاتھ اٹھا کر سر جھکاؤ مسکرائے جاتا جیسے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے کچھ سمجھا رہا ہو جتا رہا ہو۔

گلابی جھینپ

ایک روز حسب معمول آصف اور اہلی دونوں کالج گراؤنڈ کے درمیان کھڑے مہر کا دیکھ رہے تھے جو کالج کا حسین ترین نو عمر لڑکا تھا۔ مہر بھاگتا ہوا آ رہا تھا دھنستا اسے ٹھوکر اس کی ٹوپی دور جا پڑی۔ گھنگھریالے بال بکھر گئے۔ اس پر آصف مدہم آواز میں منگلیا ”کچھ تو نہیں تمہاری تسلیم“ اور اہلی نے ایک نظر مہر کی طرف دیکھا پھر محسوس کرنے لگا جیسے ہم شکل ہو۔

اس کے بعد کی تمام تر بکھری بکھری توجہ مہر پر مرکوز ہو گئی اس کے ذہن میں تسلیم روپ دھار لیا۔

علی الصبح اہلی بڑے شق سے کالج آتا اور پھر آتے ہی اس دروازے پر کھڑا ہوا جانا مہر داخل ہوا کرتا تھا اور وہاں کھڑا مہر کا انتظار کرتا رہتا۔ مہر آ جاتا تو اہلی کے جسم میں کلا کرٹ سی دوڑ جاتی اور پھر وہ سارا دن یہ سوچتا رہتا کہ کس مقام پر کھڑا ہو۔ اور کس دیکھے تاکہ مہر کا مسکراتا ہوا چہرہ پورے طور پر اسے نظر آتا رہے۔ دوسرے وقت جب ہوتی تو آصف اور اہلی کالج کے دروازے کی طرف بھاگتے جس سے گزر کر مہر گھبرا جاتا۔

مزن جاتا تو دونوں پہلوان کی دوکلن پر پوریاں کھاتے نسائی خم و بیج دیکھتے۔ مہر کی واپسی کا انتظار کرتے۔ اگرچہ مہر کی حیثیت محض نعم البدل کی تھی لیکن اس سفید دھبے اور بھوری لٹ کی نسبت جسے ڈھونڈ نکالنے میں وہ ناکام ہو چکے تھے۔ یہ نعم البدل ایک مثبت اور ٹھوس حقیقت تھی۔ اور حقیقت بھی ایسی جس پر ایک خواب کا سا عالم طاری رہتا تھا۔ چونکہ مہر نہ تو گردن اٹھانے کا عادی تھی۔ نہ قریب آکر بات کرنے کا۔ اس کے برعکس وہ ایک دور کا موبہوم تبسم اور گلابی جھینپ کی آمیزش تھا۔ لہذا چاہے وہ لڑکا تھا یا لڑکی اہلی کے لیے چنداں فرق نہیں پڑتا تھا۔ کالج کے بعد اہلی اور آصف امرتسر کے بازاروں اور باغات میں گھومتے رہتے یا آصف کے گھر جا بیٹھے۔ آصف گھومنے کا بہت شوقین تھا مگر اسے اپنے والدین کی عزت اور اپنی نیک نامی کا بہت خیال رہتا تھا۔ بازاروں میں چلتے ہوئے وہ ہمیشہ سر جھکا کر چلتا تاکہ اس کے رویے سے آوارہ پن ظاہر نہ ہو نہ ہی وہ ایسے علاقوں میں جانے کے لیے تیار ہوتا جہاں پائے جانے پر بدنامی کا خدشہ ہو مثلاً وہ کٹڑہ رنگین میں کبھی داخل نہ ہوتا حالانکہ یہ کٹڑہ ان کے مکان کے قریب ہی تھا۔

کٹڑہ رنگین

کٹڑہ رنگین میں رقاصائیں رہتی تھیں اور وہاں سے ہر وقت دلکش آوازیں آیا کرتیں۔ کبھی دور سے سارنگی بین کرتی ہوئی سائی دیتی کبھی ستار رقص کرتی اور کبھی طبلہ کی تھاپ سن کر اہلی کے دل میں کچھ کچھ ہونے لگتا۔ اس وقت اہلی کا دل چاہتا کہ ایک بار کٹڑہ رنگین میں سے گزرے اور ان آوازوں کو قریب سے سنے۔ آصف بھی ان آوازوں کو سن کر مسکراتا اور اس کی آنکھوں میں گلابی بوندیوں کی پھوار پڑتی لیکن وہ ایک لمبی آہ بھر کر کسی اور طرف مڑ جاتا۔ اہلی آصف کی وجہ سے مجبور تھا اس لیے وہ بھی کبھی اس کٹڑے میں داخل نہ ہوا تھا۔ وہاں اکیلے جانا بھی تو مشکل تھا اس نے کئی بار ادھر کا رخ کیا تھا مگر موڑ پر جا کر وہ گھبرا جاتا اور اس کا دل دھڑکنے لگتا۔

کئی ایک مرتبہ شیخ ہدم کے ساتھ بھی اسے امرتسر کے بازاروں میں گھومنے کا اتفاق ہوا۔ ہدم تجارت کے سلسلے میں امرتسر آتے رہتے تھے اور ہمیشہ آنے سے پہلے خط کے ذریعہ اہلی کو اطلاع دے دیتے ”الیاس صاحب میں آ رہا ہوں شام کو تین بجے مجھے کمپنی باغ کے مرکزی پلاٹ

قدر لطف انداز اختیار کر سکتی ہیں خصوصاً وہ چوبارے جو اس کے متصل اور ملحق تھے ان کی کمین
و بے حد جاذب نظر تھیں۔ بازار میں دورویہ خوبصورت دوکانیں تھیں جن میں پواڑیوں کی
سزت تھی۔

پواڑیوں کی دوکانوں پر آتے جاتے پان کھانے کے بہانے کھڑے ہو جاتے اور پھر عاشقانہ
نظروں سے چوباروں کی طرف دیکھتے۔ ان کے متعلق فقرے چست کرتے یا عریاں اشارے
کرتے جس پر چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصائیں لطیف تبسم سے منہ پھیر لیتیں۔
شام کے وقت اس کوچے میں گویا ہمارا آجاتی تھی۔ چوبارے والیاں شام سے پہلے ہی ہمارا
کرنا جوڑا بدلتیں سنگار کرنے کے بعد وہ تیار ہو کر جنگلے میں آ بیٹھتیں۔

رات پڑتے ہی محفل ہائے نشاط آراستہ ہو جاتیں۔ کٹرہ موسیقی کی آوازوں سے
گوں جتنا سارنگیاں چمڑ جاتیں کھٹکھٹو بجاتے لے بلپٹ سے شروع ہو کر درت ہوتی جاتی اور
جوں جوں رات بھیکتی گیت کے بولوں کی ادائیگی میں عریانی کا عنصر بڑھتا جاتا۔
نیچے بازار میں محروم مگر شوقین مزدوروں کی پکیوں سی سڑک اور دیواریں رنگی جاتیں اور ان
کے نعرے بلند ہوتے جاتے۔

”میری جان۔“

”ایک نظر ادھر بھی۔“

”محول کھنا دل پرد۔ سیل داراجی رکھنا۔“

بالاخر ان کی محرومی اضطراب میں بدل جاتی اور کسی معمولی سے بہانے پر یہ اضطراب شدت
اختیار کر لیتا اور پھر آپس میں گلی گلوچ تک نوبت پہنچ جاتی اور کٹرہ میں لڑائی شروع ہو جاتی
کی کا سر پھٹ جاتا کسی کا پیٹ چاک کر دیا جاتا پھر پولیس میدان عمل میں آ پہنچتی۔ اب جگر تھام
کے نیمو میری باری آئی۔ کی سی نگاہیں ڈالتے ہوئے چوباروں میں بیٹھے ہوئے سیٹھ اس ہنگامے
سے گھبرا کر میراثیوں کو درخواست کر دیتے اور رقاصہ کا قرب حاصل کر کے خود کو ایک شدید
ترنگامے کے حوالے کر دیتے تاکہ کٹرہ کے ہنگامے سے نجات حاصل کر سکیں۔

مجسم شعری

ایلی یا سمین سینا کی فراخ ڈیوڑھی میں کھڑا حیرانی سے کٹرہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ سینا

میں ملیے۔ وہاں سے ہم سینما جائیں گے۔

ہم ایلی سے ملتے ہی مخصوص انداز میں چلانا شروع کر دیتے ”ایلی صاحب یہ کیا مصیبت
ہے آپ ایسے دکھائی دے رہے ہیں جیسے قیامت ٹوٹی ہوئی ہو، عشق تو نہیں ہو گیا کیس۔ عین
سے بچنے کا بہترین طریقہ ہم بتائیں گے۔ آئیے آئیے نا صاحب۔“ اور وہ اسے دودھ کی دوکان پر
لے جاتے۔ ہاں پہلوان ذرا آدھ سیر دودھ میں چار پیڑے بلوٹا۔ بس الیاں صاحب صبح و شام کھا
پیو انشاء اللہ عشق قریب نہیں پھٹکے گا۔ اس مرض کے لیے دودھ ہی تریاق ہے اور سگریٹ اور
چائے سے پرہیز لازم ہے۔ آئیے اب سینما چلیں۔ سینما دیکھنا صحت کے لیے بے حد مفید ہوتا
ہے آئیے رام بلغم میں مسٹر آف نورا کی فلم لگی ہے۔ اور وہ دونوں سینما چلے جاتے وہاں
سگریٹ پیتے پوریاں کھاتے اور پھر شیخ ہمد رات کی گاڑی سے واپس علی پور چلے جاتے اور ایلی
آموں والی کو خسی کا رخ کر لیتا۔ ایلی کے دل میں ایک دبی دبی امید تھی کہ شاید کسی روز شیخ ہمد
یا سمین سینما ہاؤس جانے کا ارادہ کر لیں جو کٹرہ رنگین میں واقع تھی لیکن ہمد نے کبھی اس بل
میں جانے کی بات نہ کی تھی۔

پھر ایک روز امرتسر میں دو مشہور شاعر تشریف لائے۔ جن سے آصف کے گہرے تعلقات
تھے ان کی آمد پر آصف کو امرتسر میں ایک عظیم مشاعرے کا انتظام کرنا پڑا اور حسن اتفاق سے
مشاعرہ یا سمین سینما ہال میں ہونا قرار پایا۔ جو اس ممنوع کٹرہ میں واقع تھا آصف نے پہلے تو بہن
کوشش کی کہ مشاعرے کا انتظام کسی اور جگہ ہو جائے لیکن وہ کامیاب نہ ہوا بہر حال اگر
اسے کٹرہ میں جانا ہی پڑا۔

کٹرہ رنگین امرتسر کے خوب صورت ترین بازاروں میں سے تھا اس کی لمبائی ایک فرلانگ
سے زیادہ نہ تھی ویسے کافی فراخ تھا۔ سڑک کے دوروب۔ خوبصورت چوبارے بنے ہوئے تھے
کے جھجے بڑھے ہوئے تھے جن پر رنگ روغن کیا ہوا تھا۔ ان جھجوں کے پیچھے فراخ چوباروں
چاند نیاں بچھی ہوئی تھیں۔ گاؤں کی لگے ہوئے تھے اور چھتوں سے جھاڑ فانوس لٹکتے دکھائی
تھے۔ جنگلوں میں خوب صورت رقاصائیں دیدہ زیب ملبوسات پہنے بڑے طعمران سے بیٹھی
غلط انداز سے نیچے بازار کی طرف دیکھتی رہتیں۔ ان کی حرکات جمیل تھیں آوازیں اچھا
تھیں۔

ایلی انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ وہ کبھی تصور نہ کر سکتا تھا کہ ناچنے گانے والی عورتیں

کے مقابل کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی رقصہ کس قدر حسین و جمیل تھی۔ اس کی حرکات قدر متوازن اور دلربا تھیں۔ اس کا وہ بے پروائی اور بے نیازی بھرا انداز اسے اور بھی صورت بنا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے رقصہ نہیں ہو سکتی تھی۔ اس کی حرکت سے سناپن۔ عربی یا نمائش کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔

آصف سینما ہل کے اندر چمپا ہوا تھا تاکہ کوئی اسے وہاں دیکھ نہ پائے۔ ایلی ڈیوڑھی کھڑا چوری چوری چوباروں کی طرف دیکھ رہا تھا اس کے دائیں بائیں کھڑے بھی لوگ تنگلی سے طوائفوں کی طرف دیکھ رہے تھے پھر بھی نہ جانے کیوں ادھر دیکھتے ہوئے اس پر دھڑکنے لگا ایک لڑکا جانا سا خوف طاری ہو جاتا حالانکہ وہ سب ادھر دیکھنے میں اس قدر مصروف تھے کہ انہیں ایلی کی طرف دیکھنے کی فرصت ہی نہ تھی اور اگر فرصت ہوتی بھی تو اس کے اس فعل کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے۔

دلفینا ایک اور گروہ ڈیوڑھی میں داخل ہوا جس کے پیش پیش ایک نوجوان تھا جسے بال بکھرے ہوئے تھے آنکھوں میں مستی جھلک رہی تھی اور چہرے سے تنگلی اور ذہانت تھی۔

”اٹھا۔“ وہ سامنے کے چوبارے میں بیٹھی ہوئی حسینہ کی طرف دیکھ کر بے غم سے چلایا ”سبحان اللہ۔ حضور تو مجسم شعر ہیں۔ واہ واہ۔ واہ واہ۔“ وہ تنگلی باندھ کر دلفینا رقصہ کی طرف دیکھنے لگا اس کے ساتھی مسکرانے لگے۔

”واہ واہ کیا انداز دلبری ہے حسن بذات خود انگشت بدلتا ہے۔“ رقصہ نے شور مچایا۔ ایک بھر پور نگاہ اس نوجوان پر ڈالی۔

نوجوان عالم مستی میں سینما کے دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ کر رقصہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ”اللہ کی قسم۔ ہمیں است و ہمیں است و ہمیں است۔“ آصف بھاگتا ہوا ہلکا باہر نکلا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور وہ کانپ رہا تھا۔ وہ شاعر سے مخاطب ہو کر چلایا ”یہ کیا کر رہے ہیں آپ لوگ کیا کہیں گے۔“

آٹا

”بھئی واہ۔“ بے خود حیرانی سے چلایا۔ ”اس میں کہنے کی بات کیا ہے۔ کیوں بیٹھی

سجے ہو کد۔“ اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے پوچھا۔ اور طوائف کی طرف تنگلی باندھ کر با آواز بلند یہ شعر پڑھنے لگا۔
نظر کو ہے عادت تماشا!
جہاں ہو جیسا ہو جس طرح ہو

کوئی یہ حُسن ازل سے کہہ دے
کہ جلوہ آرا ہو جس طرح ہو
شعرن کر سب لوگ جھومنے لگے اور آصف گھبرا کر ایلی کی طرف بڑھلا۔
”ہائیں۔ آصف ایلی کے پاس کھڑے ایک شخص کو دیکھ کر بولا آپ ہیں آٹا صاحب آپ ہلے۔“

آٹا صاحب۔ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا وہ درمیانے قد کا شخص تھا چہرے پر متنت کے آثار تھے اور انداز سے خلوص ٹپکتا تھا۔
”یہ ہیں الیاس میرے ہم جماعت اور دوست۔“ آصف نے آٹا سے کہا۔

”بڑی خوشی ہوئی آپ سے مل کر۔“ آٹا صاحب نے ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا ”آپ امرتسر کے رہنے والے ہیں۔“

”ہاں ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں تو علی پور کا ہوں۔“ ”علی پور“ آٹا صاحب نے دہرایا ”وہاں میرا ایک عزیز دوست علی احمد رہتے ہیں۔ بڑے رنگین مزاج ہیں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یہ انہیں کے بیٹے ہیں۔“ آصف مسکرا کر بولا۔

”علی احمد کے بیٹے۔“ آٹا صاحب نے پھر ایلی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”کتنی خوشی ہوئی آپ سے مل کر خاکسار کو آٹا غلام بخش کتے ہیں۔ آپ کے والد صاحب میرے گھرے دوست ہیں اور مہربان بھی۔“

آٹا غلام بخش۔ ایلی کی نگاہ میں گرد و پیش دھندلا گئے۔ نہ جانے وہ جوان شاعر سیڑھیوں پر بیٹھا کیا کر رہا تھا۔ نہ جانے چوبارے میں بیٹھی ہوئی گلابی کرپ میں لمبوس رقصہ کیسے مسکرا رہی تھی۔ ایلی کی نگاہوں تلے اس شور بھرے دھندلے میں آٹا صاحب کے علاوہ بھی معدوم ہو چکے تھے اور آٹا صاحب کے عقب میں ایک تھنڈی لٹ لٹ رہی تھی اور ایک رنگین وجہ

مسکرا رہا تھا۔

”تسلیم“ آصف نے مسکرا کر ایللی کی طرف بامعنی انداز سے کہا ”تسلیم“ تھا صاحب
عقب میں کسی تبسم چہرے نے کھٹکھٹائی لٹ جھٹک کر کہا۔

ایللی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ وہ خوشی سے ناچنے لگے اور چیخ چیخ کر کے ”تسلیم“
اچھے ہیں۔“

”تسلیم آپ آغا صاحب ہیں۔“ تسلیم مجھے آپ سے مل کر بے حد خوشی ہوئی۔“

آغا صاحب کامکان یا سمین سینما کے قریب ہی کٹرہ رنگین میں واقع تھا مکان کے بار
سنار کی دوکان تھی جس کے پیچھے ایک والان تھا جس میں مک کھلتا تھا جسے ملاقاتی کرے کے
استعمال کیا جاتا تھا اور جس کے ایک پہلو میں ایک زینہ اوپر کو چلا گیا تھا۔ آغا کے کمرے
اوپر چوبارے میں رہتے تھے اور یہ چوبارہ کٹرہ کے باقی چوباروں کی طرح تھا۔ فرق مرز
قدر تھا کہ اس کے آگے بالکونی نہ تھی اور چوبارے کی تین کھڑکیوں پر چھین پڑی ہوئی غم
ان کھڑکیوں سی کبھی کسی نے باہر نہ جھانکا تھا۔

ایللی اس بات پر حیران نہ ہوا کہ وہ اس چوبارے میں کیوں رہتے تھے اور اگر رہتے
کٹرہ کے رسم کے مطابق وہ کھڑکیوں چتوں سے خالی کیوں نہ تھیں یہ باتیں غیر اہم
اس لیے یہ تفصیلات اس کی توجہ کو جذب نہ کر سکیں اور وہ اپنی امیدوں کے اس گوار
دیکھنے میں کھو گیا۔

تیم نیم

آغا کے ساتھ ملاقاتی کرے میں بیٹھے ہوئے اس کے احساسات عجیب سے تھے وہ اس
پر سرت محسوس کر رہا تھا کہ وہ اسی مکان میں بیٹھا ہے جہاں وہ رہتی ہے اسی چھت تلے ہے
جس کے اوپر نہ جانے وہ کس کام میں مصروف ہے آغا سے باتیں کرنے کے بلوچوں اس کے
ان آوازوں پر لگے ہوئے تھے جو اوپر سے آ رہی تھیں۔ ”ہائے میں کیا کروں۔ لو میں کیا
یوں ہوتا ہے۔“ ان آوازوں میں لے تھے راگ تھا۔ شوخی تھی۔ ان قدموں کی آواز
ترنم تھا۔ اوپر سے بہت سی آوازیں آ رہی تھیں لیکن ان سب کا ایک ہی سا انداز تھا۔

میں ایللی ہوں۔ نہ جانے اس کی آواز کون سی تھی۔

جب والان کے اوپر چٹکے سے کوئی پلو لہراتا ہوا نکل جاتا تو ایللی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ ان
پلوں کی اڑان کتنی حسین تھی۔ بظاہر وہ آغا سے باتیں کر رہا تھا مگر اس کا دل کسی اور ہی لے پر
بیٹھ رہا تھا اور آغا میں بھی کتنی مٹھاس تھی اس کے چہرے پر اطمینان کی ایک دبیز تہ چڑھی ہوئی
تھی۔ سکون اور اطمینان۔ گویا وہ یوں اپنے آپ میں گمن تھا جیسے کوئی ناؤ کسی ساکن جھیل میں
چوڑوں کی مدد کے بغیر آپ ہی آپ رواں ہو۔

”اچھا بھی میں ذرا نہالوں۔“ آغا صاحب اٹھ بیٹھے۔ ”ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوا۔“ وہ
زیر ہی غسل خانے میں داخل ہو گئے۔

ایللی موقع غنیمت جان کر بلا حلف اوپر دیکھنے لگا جہاں سفید سفید انجل لہرا رہے تھے ”بھائی
جان۔“ ایک سرلی آواز سنائی دی۔ معصوم گلابی چہرہ جھکا۔ ایک تبسم جھلکا۔ ”بھائی جان۔“ پھر
آواز آئی۔

چند ساعت کے بعد نو دس سال کی ایک حسین چھنی کی گڑیاں نیچے اتر آئی۔ اس نے ایللی کی
طرف دیکھا اور پھر ایک تبسم مسکراہٹ سے شرابا کر منہ موڑ لیا وہ صابون اور تولیہ غسل خانے
کے دروازے پر رکھ کر بھاگ گئی اور پھر دروازے کی درز سے مسکرا مسکرا کر جھانکنے لگی۔

”رکھ دیا نیم۔“ آغا نے پوچھا۔

”جی دروازے میں ہے۔“ وہ بولی اور پھر بامعنی انداز سے مسکرا کر بھاگ گئی۔
”آہستہ آہستہ ایللی اور نیم دوست بن گئے۔ جب ایللی زینے میں کھڑے ہو کر آواز دیتا ”آغا
صاحب“ تو بھائی منزل کے دروازے میں رنگین سرگوشیاں ہوتیں۔ پھر نیم مسکراتی ہوئی نیچے اتر
آئی۔

”وہ کمال ہے نیم۔“ ایللی اس سے دلی آواز میں پوچھتا۔
”ہے“ وہ کتنی ”دہل دروازے کی اوٹ میں۔“ وہ زیادہ تراشاروں میں جواب دیتی تھی۔
اس کے اشارات میں عجیب شان بے نیازی تھی۔
”اس سے کوسانے آئے۔“ ایللی کہتا۔
”ہونہ۔ وہ نہیں آتی ہم کیا کریں۔“
”تم نے کہا بھی تھا۔“

طور پر مختلف تھی۔ جسمانی طور پر بھی ان دونوں میں کوئی مشابہت نہ تھی۔ حتیٰ کا جسم پتلا دھلا تھا اس کے چہرے پر شوخی اور اضطراب چھائے رہتے تھے۔ اس کے علاوہ حتیٰ کے خدو خلل بے حد جذبات نظر آتے۔ ایللی نے جب پہلی مرتبہ اسے دیکھا تو وہ چونک پڑا۔ اس وقت وہ گرم چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ سبز چادر میں خوب صورت خدو خلل کو دیکھ کر ایللی نے سمجھا جیسے کوئی خاتون غلطی سے مردانے میں آگئی ہو۔

حتیٰ بہت جلد ایللی سے مانوس ہو گیا۔ اس کی باتیں عجیب تھیں ”ایللی“ وہ چلاتا آؤ ایللی ہمیں میٹ کر لائیں۔ آؤ ہمیں تمہاری ہم نام کے پاس لے چلوں۔ اتنی رسیلی آنکھ ہے کہ اگر اس کی ایک نگاہ پڑ گئی تم پر تو طبیعت صاف ہو جائے گی اور کیا جسم ہے۔ شعلے نکلنے شعلے۔ چلو ملا لاؤں ہمیں۔ اپنے پر تو مرتی ہے لیکن بڑی اچھی ہے چلو۔“

ایللی حیرانی سے اس کی باتیں سنتا اور پھر گھبرا کر کہتا ”پھر سہی کبھی۔“ اور حتیٰ منہ بنا کر کہتا ”چھا بھئی تو پھر میں تو چلا۔“ اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر ایللی اوپر گم کی طرف دیکھتا اور نیم کو اشارے کرتا اور نیم تسلیم کا بازو پکڑ کر اسے بیڑھیوں کی طرف کھینچتی اور تسلیم ہنسنے جاتی حتیٰ کہ بوڑھی دادی شور مچانا شروع کر دیتی ”لڑکیو یہ کیا غل غپاڑہ ہے۔ آرام سے بیٹھو۔“ اور لڑکیاں خاموش ہو جاتیں اور ایللی چپ چاپ محروم اور مایوس انداز سے باہر نکل کر بورڈنگ کی طرف چل پڑتا۔

گھما گھمی

بورڈنگ کی اس دیران کو غمی میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ کیا یہ محبت ہے کیا یہی وہ محبت ہے جس کے متعلق شریف اسے خبردار کیا کرتا تھا۔ لیکن دل ہی دل میں اسے احساس تشنگی ہوتا۔ بات کسی لحاظ سے بھی تو مکمل نہ تھی۔ نہ تو تسلیم نے کبھی تھیلی میں سلا ہوا امینڈک اس پر پھینکا تھا اور نہ کسی اور طریقے سے ایللی کی محبت کی سنجیدگی کو محسوس کیا تھا۔ بلکہ تسلیم کے رویے کو دیکھ کر ایللی سوچتا تھا کہ وہ تو بچوں کا کھیل کھیل رہے تھے محبت نہیں کر رہے تھے۔ کیا محبت بچوں کا کھیل ہوتی ہے۔ نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا۔ اتنی عظیم چیز بچوں کا کھیل کیسے ہو سکتی ہے۔ اسے یوں خاموش بیٹھے دیکھ کر مولا داو چلاتا۔ ”یہ کیا صورت بنا رکھی ہے ایللی۔ کیا ہماری زندگی بھی حرام کو کے چلو باغ سے امروہ چرا کر کھائیں۔ کیوں شفیق“

”کہہ رہی ہوں کہا تھا کہا تھا اور کیا کرتی۔“

”پھر کیا کہتی ہے وہ۔“

”بس ہنسے جاتی ہے۔ چھوڑو اسے۔“ وہ ہونٹ نکال کر جواب دیتی ”مجھے سناؤ۔“

”کراؤ نہ کراؤ گے۔“ وہ زبردستی اپنی بات جھینڈ دیتی۔

”لے چلوں گا۔ لے چلوں گا۔ پہلے یہ بتاؤ کیا وہ باہر نہیں نکلتی۔ کیسے جاتی نہیں۔ پر یاویے۔“

”ہونہ وہ کیا جائے گی۔“ وہ تحقیر سے ہونٹ نکالتی۔ ”چھوڑو اسے۔“

ہوتا ہے، ہوتا ہے

”پہلے جا کر اس سے کوکو کے دروازے سے جھانکے۔ بڑی پیاری ہے نیم۔ جاؤ۔“ مشکل سے اوپر جانے کیلئے تیار ہوئی۔ پھر آہستہ آہستہ بیڑھیاں چڑھتی پھر اوپر کے دروازے رکتیں سرگوشیاں ہوتیں۔ ہلکے ہلکے تھپتھپنے سنائی دیتے اور بالآخر دروازے سے ایک سفید ہاتھ کر لہراتا اور انگلیاں یوں ناچتیں جیسے کتھا کلی کے کسی مندر کی مشق کر رہی ہوں۔ پھر لٹ اڑتی۔

لو اس سے کیا ہوتا ہے۔ کوئی ہنس کر کہتی۔

بالآخر نیم نیچے از آتی۔ ”وہ نہیں آتی سامنے کہتی ہے ہم کسی کے سامنے ٹپ کرتے۔“ وہ منہ بنا کر کہتی۔

ایللی روز جان بوجھ کر ایسے وقت آنا کے یہاں جایا کرتا تھا جب وہ گھر پر نہ ہوں اور ڈرتے ڈرتے دیر تک بیڑھیوں میں کھڑا رہتا۔ پھر وہ شام کے وقت دوبارہ وہاں جاتا۔ صاحب کے پاس بیٹھا رہتا اور اوپر سے عجیب و غریب باطنی آوازیں سنائی دیتیں۔ بلکہ کبھی کبھی موقعہ پا کر لوہے کی سلاخوں سے سفید بازو جھولتے اور کوئی کہتی ”لو اس سے!“ ہے۔ ”اور کوئی جواب دیتی۔“ ”ہوتا ہے ہوتا ہے۔“ اور ایللی محسوس کرتا جیسے اس آواز سے پھر وہ سوچنے لگتا کہ آخر کس بات سے کچھ ہوتا ہے اور وہ دیر تک سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ آواز نہا کر باہر نکل آتے اور کپڑے پہننے لگتے اور پھر وہ دونوں باہر گھومنے کے لیے چلے جاتے شام کے وقت حتیٰ آجاتا۔ حتیٰ آنا کا چھوٹا بھائی تھا مگر اس کی طبیعت آنا صاحب

شفیع ہنس کر جواب دیتا ”دیکھو تو اپنی صورت۔ دیکھنے میں تو ڈا کو نظر آتے ہو لو کہ چوریاں اور وہ بھی امردوں کی۔“

پھر وہ دونوں ایللی کی طرف متوجہ ہو جاتے۔

”اے کیا ہے۔“

”کیا ہے بے تجھے۔“

”عشق کا روگ لگا ہے کیا۔“

”وہ مہر لڑکا ہے ناکالچ میں اس پر مرتا ہے تو۔“

”لو اس میں کیا ہے۔“ مولا داو پیار سے کہتا۔ ”کہو تو اٹھا لاؤں اسے یہاں اس کی

میں۔“

”پاکل ہوئے ہو۔“ ایللی چلاتا۔

ایللی نے تسلیم کے متعلق مولا داو اور شفیع سے کبھی بات نہ کی تھی یہ راز صرف ان تک محدود تھا۔ جب کبھی وہ آصف سے ملتا اس کا جی چاہتا کہ وہ سنجیدگی سے اس سے پوچھ آصف محبت کیا ہوتی ہے۔ کس طرح کی جاتی ہے۔ اس نے کئی ایک بار آصف سے پوچھا تھا مگر مسکرائے کے سوا آصف نے کبھی جواب نہیں دیا تھا۔

ہنگامہ

پھر خبر آئی کہ شریف چھٹی پر علی پور آیا ہوا ہے اور ایللی کی آنکھوں میں خوشی کے ثمنانے لگے۔ ”میں جاؤں گا۔“ اس نے آصف سے کہا۔

”تم نہیں جاسکتے۔“ آصف مسکرایا ”تم اسے چھوڑ کر کیسے جاسکتے ہو۔“

لیکن آصف کے اعتراض کے باوجود وہ گرمی کی چھٹیوں سے دس روز پہلے علی پور کی بار علی پور ویران نہ تھا وہاں شریف تھا۔ شہزاد تھی رفتی اور ارجمند تھے۔ علی پور پہنچ کر خوشی سے اس کی باچیس کھل گئیں۔ محلے میں پہنچنے سے پہلے علی پور گیا جو ایللی کو دیکھ کر چلانے لگا۔

”کیوں بھی فرہاد۔ وہ نہر کھودنے کا کام ختم ہو گیا۔“

”کیا بلکا ہے تو۔“ ایللی نے اسے گھورا۔

”ہمارے محلے والے کہہ رہے ہیں۔“

”کیا کہہ رہے ہیں۔“ ایللی نے گہرا کر پوچھا۔

”کہتے ہیں کہ امرتسر میں عشق کا کھیل کھیلا جا رہا ہے۔ کالج تو محض بھانہ ہے۔ اس قدر قریب رہتے ہوئے بھی اب علی پور آنے کی فرصت نہیں ملتی۔“

رضا سے مل کر جب وہ محلے میں پہنچا تو اس نے محسوس کیا جیسے سبھی لوگ اس کی طرف دیکھ دیکھ کر ہنسنے لگے ہنس رہے ہوں۔

”ہائیں“ ”چچا امداد چلائے“ ”کیوں بھی ایللی آگیا تجھے بھی ہوش پڑ گیا اسی چاؤ کے چکر میں آخر بیٹا کس کا ہے شاباش“ غصے سے ایللی کے کان سرخ ہو گئے۔

”اے۔ ہے یہ تو ایللی ہے اپنا“ محلے کی عورتوں نے اسے دیکھ کر شور مچایا۔

”اللہ عمر دراز کرے۔ جیتا رہے۔ مل کا کچھ ٹھنڈا رہے۔“

”ہائے ایللی تو اب عید کا چاند ہو گیا۔“ ”جوان ہو گیا ہے نا“ دوسری مسکرا کر بولی۔

”ہمارے لیے تو وہی ایللی ہے۔“ ایک مسکرائی۔

”کیوں ایللی کیا امرتسر میں لگ گیا تیرا۔ اب تو علی پور کی طرف رخ ہی نہیں کرتا۔“

”پڑھائی ہے فرصت بھی ہو۔“ ایک نے طنز کیا۔

”تو آیا ہے ایللی۔“ ہاجرہ شور سن کر بھاگی بھاگی آئی ”آ میں تو کب سے تیرا انتظار کر رہی تھی۔“

”اب اس کا انتظار کیا کرے گی تو۔“ چچی نے مسکرا کر کہا ”اللہ رکھے اب جوان ہو گیا ہے۔“

داوی ملل اسے دیکھ کر کھڑکی سے چلائیں ”کب آیا تو۔“

”جاداوی ملل سے مل لے۔ اس کا جی اچھا نہیں۔“ ہاجرہ نے کہا۔

داوی ملل کو دیکھ کر وہ بھاگا اور بھاگ کر اس سے بغل گیر ہو گیا۔

”کیا کرتا ہے تو۔“ وہ چلائی ”وہی جاٹ کا جاٹ ہی رہا تو۔“ اور وہ کھانسنے لگی۔

”کیوں داوی ملل۔ بیمار ہو گیا؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولی ”اچھی بھلی ہوں۔“

”تسے کا دورہ پڑتا ہے۔“ سیدہ نے کہا۔

”کیوں دادی اہل۔“ اس نے دادی سے پوچھا۔

”اب بھی نہ پڑے گا دے گا دورہ تو کب پڑے گا۔“ وہ ہنسی۔

یعنی اس وقت تیزی سے کسی کے بیڑھیوں سے اترنے کی آواز آئی اور صبح سے شہر کے سامنے آکھڑی ہوئی۔ ”سنا ہے ایللی آیا ہے۔“

ایک ساعت کے لیے ایللی شہزاد کو دیکھ کر بھونچکا رہ گیا جالی کے سیاہ دوپٹے پر سفید چمک رہے تھے اور وہ اس کے شانوں پر یوں اڑ رہا تھا۔ جیسے پر پھڑپھڑا رہے ہوں۔ اس پر ہونٹوں پر عجیب سا تبسم تھا۔ ایسا تبسم جو اس سے پہلے ایللی نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نگاہوں میں عام معمولی چمک تھی اور گالوں پر سرخی جھلک رہی تھی جیسے لجا رہی ہو۔ وہ تو کبھی لہلائی نہ تھی اور کے انداز میں تو ہمیشہ بے نیازی کی جھلک ہوتی تھی۔ ایللی نے محسوس کیا جیسے دفعتاً شہزاد کی پینگی بدل لی ہو۔

”ایللی آؤ نا۔“ وہ بولی ”تمہیں بلا رہے ہیں وہ جلدی آؤ۔“ وہ مسکرائی۔

ایللی کے جسم پر چھوٹیاں چلنے لگیں۔

”اے ہے۔“ دادی اہل بولی ”تو سن ہو کر کیوں رہ گیا۔ دیکھو تو یوں کھڑا ہے جیسے ہوا

میں نہ ہو۔ جانا ہے ادھر تو جاہو آ۔ میری طرف کیا دیکھتا ہے۔“

”تمہیں مبارک ہو ایللی۔“ شریف اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا ”تم پہلے امتحان میں ہاں

گئے۔“

”کونسا امتحان“ ایللی نے پوچھا۔

شریف نے ایک بھر پور نگاہ ایللی پر ڈالی ”پہلے امتحان میں تم پاس ہو گئے اور اگلا

دوسرے امتحان میں بھی تم پاس ہو جاؤ گے۔“

”میں تو ایف اے میں فیل ہو گیا ہوں۔“ ایللی نے گھبرا کر کہا۔ شریف قہقہہ مار کر ہنسا

اور پاس کھڑی شہزاد کی طرف دیکھنے لگا۔ سیاہ دوپٹے کے سفید پھولوں کے درمیان ایک گلاب

ہوا تھا۔ ”سنٹی ہو۔“ وہ بولا ”ایللی کی باتیں سن رہی ہو۔“

”سن رہی ہوں۔“ وہ بولی ”اب تو میں بھی ایللی کی باتیں بڑے غور سے سننے لگی ہوں۔“

”وہ کیسے۔“ شریف مسکرایا۔

”اب اس کی نگاہیں تو دیکھو ذرا۔“ وہ بولی۔

”اس کی نگاہ“ شریف تلی بجا کر اٹھ بیٹھا ”اس کی نگاہ سے تم کیسے دیکھ سکتی ہو۔ ہر کسی کی نگاہ الگ ہوتی ہے۔ ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے اور۔ اور۔“ اس نے ایک لمبی آہ بھری۔

”دوسرے دیکھتے ہیں مگر دیکھتے نہیں۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ شہزاد منہ بنا کر خاموش ہو گئی۔

ایللی سوچنے لگا نہ جانے کیا باتیں کر رہے تھے وہ دونوں۔ دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے وہ شہزاد کو اپنی آنکھ سے دیکھ رہا ہو۔ ایسی نگاہ سے جس سے شاید شریف نے اسے کبھی نہ دیکھا ہو۔ لیکن شہزاد نہ جانے اسے کسی کی نگاہ سے دیکھ رہی تھی۔ وہ گھبرا گیا۔

”لیکن آپ تو امتحان کی بات کر رہے تھے۔“ اس نے شریف سے کہا۔

”دیادی امتحانات کی بات نہیں۔“ شریف شہزاد کی طرف دیکھ کر مسکرایا۔ ”میں تو اس

امتحان کی بات کر رہا ہوں۔“ ”اچھا تو پھر کون ہے وہ۔ کیسی ہے۔ سنا ہے بڑی خوب صورت

ہے۔“ شہزاد نے ایللی کو عجیب نگاہوں سے دیکھا۔ ”خوب صورت۔“ شریف ہنسا۔ ”خوب

صورت تو وہ ہے ایللی جسے کوئی دیکھنے والا مل جائے۔“

شہزاد نے چوتن چڑھا کر کہا ”آپ نے تو اپنی آنکھوں سے دیکھی ہے خوبصورتی۔“

”پاکل نہ بنو۔“ وہ آہ بھر کر بولا ”زخموں کو طفرے نہیں کریدا کرتے۔“ ایک ساعت کے

لیے شہزاد کی آنکھیں گویا کسی نامعلوم جمیل پر تیرنے لگیں پھر دفعتاً ”وہ مڑی اور کمرے سے باہر

نکل گئی اور وہ دونوں تنہا رہ گئے۔“

”اب تو تم بڑے آدمی بن گئے ہو۔“ شریف نے کہا ”اب تو لوگ تمہیں دیکھنے لگے ہیں

بس وہی باتیں ہیں صرف وہ۔ باقی سب بیچ ہے۔ سب بیچ! یا تو تم میں خود دیکھنے کی اہلیت ہو یا

دوسروں کی توجہ جذب کرنے کی۔ اور تم نے ثابت کر دیا ہے کہ تم دونوں خصوصیات رکھتے

ہو۔“

ایللی گھبرا گیا۔ ”نہ جانے کیا کہہ رہے ہیں آپ۔“ میں نہیں سمجھا۔“

”سب سمجھ میں آجائے گا۔“ شریف ہنسنے لگا۔ ”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ آج تم سے مل کر بڑی

راحت ہو رہی ہے مجھے۔ تمہاری قسم بڑی راحت۔“

شریف سے ملنے کے بعد جب وہ احاطے میں پہنچا تو اسے ارجمند مل گیا اسے دیکھتے ہی ارجمند

چلایا ”اے ایللی۔ تم دی تلی کے تلی رہے نا ہمارا سارا اینکرائسڈی تم نے تباہ کر دیا بھی۔ واہ

دیکھ کر اپنے دل میں فخر محسوس کرتی مگر دفعتاً نہ جانے اسے کیا خیال آیا کہ وہ مسرت بھری نگاہ حسرت میں بدل جاتی۔ اس کی آنکھیں بھر آئیں اور وہ منہ موڑ کر آنسو پونچھتی۔ اس پر ارجمند فتنہ مار کر ہنستا اور کہتا۔ ”اماں رو رہی ہو تم۔ واہ اماں رونے کی اس میں کوئی بات ہے۔ مابدولت اب بڑے ہو گئے ہیں۔ اب گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ سمجھو اب سکھ چین کا زمانہ آ گیا۔ چٹنی کی جگہ مابدولت کے حکم سے چاہیل اور کوفتے ہوں گے اور سوکھی روٹی کی جگہ پراٹھے۔“ وہ جھک کر اماں کو آغوش میں لے لیتا۔ ”اب تو کوئی رونے کی بات نہیں اماں۔“ وہ ہنستا۔ ”نہیں اماں ہم مریں گے نہیں۔ اللہ میاں نے جو تیسویں پارے میں صاف لکھا ہے کہ ارجمند نہیں مرے گا جب تک اس کے یہاں بارہ لڑکے اور چھ لڑکیاں پیدا نہ ہو جائیں گی اور اس کی داڑھی دو فٹ گیارہ انچ تک نہ بڑھ جائے گی۔ واہ تم ویسے ہی روتی ہو اماں۔“

ان کی جواں مری کے متعلق تمام محلے میں چرچا تھا۔ لوگ محسوس کرتے تھے کہ ان کی جوانی پیغام اجل لاتی ہے حالانکہ اب تک صرف ایک بھائی ہی فوت ہوا تھا اور پانچ بھائی بچپن کے مختلف مدارج طے کر رہے تھے۔

سچا عاشق

نوکر ہونے کے بعد ارجمند نے اعلانیہ طور پر احاطے میں کھڑے ہو کر انگریزی کے شغل میں مصروف رہنے کی عادت چھوڑ دی تھی۔ وہ احاطے میں کھڑا ہوتا تو تھا مگر اس کے انداز میں ایک وقار سا پیدا ہو گیا تھا اگرچہ اس کے جذبات وہی پرانے تھے اور اس کا طریق کار بھی نہ بدلا تھا۔

لیکن امیلی کے لیے اب اس شغل میں حصہ لینا ممکن نہ رہا تھا۔ وہ کیسے احاطے میں کھڑا ہو سکتا تھا اسے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ محبت لگانے کے بعد اس کا لڑکیوں کو دیکھنا مناسب نہیں۔ لوگ سمجھیں گے کہ اس کا عشق محض ایک ڈھونگ ہے۔ جسمانی لذت کے حصول کا ذریعہ۔ اور پھر وہ ہنس کر کہیں گے کیوں نہ ہو آخر بیٹا کس کا ہے۔

امیلی کو جس قدر نفرت اس ایک جملے سے تھی کسی اور چیز سے نہ تھی۔ اسے خود علی احمد کے طریقہ کار سے نفرت تھی شاید اس لیے کہ ان کی اس خصوصیت کی وجہ سے اسے بہت دکھ پہنچا تھا۔ اس کی ماں کی زندگی تباہ ہوئی تھی۔ ان کا گھر برباد رہا تھا پھر وہ اس انداز کو کیسے اچھا

عجیب آدمی ہو۔ اتنا ترین کیا تھا تمہیں۔ سب اکثرت گیا۔ سنا ہے محبت لگا بیٹھے ہو۔ ارجمند توقف محبت لگانا مردوں کا کام نہیں۔ مردوں کا کام تو پھول پھول پر بیٹھ کر لطف اندوز ہونا ہے۔ ہم لوگوں کی دوستی ملاحظہ ہو یار جب سے شاہ کاکو کی فیکٹری میں ملازم ہوا ہوں ہر سہ ماہ خیال رہا ہے کہ گاؤں کی گوریاں جن جن کے پھنسا رکھوں۔ اپنے لیے نہیں۔ تمہاری قسم اس خیال سے کہ یار لوگوں کو بلا کر کبھی عیش کرا دوں۔ وہ محفل جملوں کہ سالے عمر بھر رکھیں۔ مگر یار ساری امیدوں پر پانی پھیر دیا تم نے یہ عشق کی بیماری لگا کر۔ آخر تلی ہی ہے کتے ہیں ناکہ کتے کی دم کو بیس سال لوہے کی تلی میں رکھو پر نکالو گے جب تو سلی ٹیڑھی ہی کی۔“

چھ بھائی

ارجمند کو شاہ کاکو کی فیکٹری میں نوکری کرتے صرف چھ ماہ کا عرصہ ہوا تھا اس عرصے میں وہ بہت بدل چکا تھا۔ اول تو اس کا قد بہت لمبا ہو چکا تھا۔ ارجمند کے تمام بھائی دراز تھے۔ محلے میں کوئی بھی ایسا نہ تھا جو قد میں ان کی برابری کر سکتا ہو۔ ان بھائیوں میں تین بڑے خصوصیات تھیں ایک تو وہ سب غیر معمولی طور پر دراز قد تھے۔ دوسرے تمام کے تمام بھائی دراز مزاج تھے اور سنجیدہ سے سنجیدہ بات کو مذاق میں ٹال دیا کرتے تھے اور بڑی سے بڑی معین ہنس کے برداشت کرنے کے عادی تھے۔

ان کے والد ڈاکٹر تھے۔ والد کے زیر سایہ انہوں نے بڑی ناز و نعمت سے بچپن گزارا تھا۔ والد کی وفات کے بعد مالی مشکلات کا دور آیا۔ وہ گھر میں چھپ کر چٹنی سے روٹی کھاتے اور باہر نکل کر یوں مونچھیں سنوارا کرتے جیسے کوفتے کھا کر آئے ہوں۔ لیکن ان کی خصوصیت بہت الم انگیز تھی۔ بچپن گزر جانے پر وہ دفعتاً اپنے لیے جوان بن جانے یہاں تک کہ عام دروازوں سے گزرتا بھی ان کے لیے مشکل ہو جاتا لیکن جوانی اپنے ساتھ پیغام اجل لے آتی جوان ہوتے ہی وہ نیا توئی بی کا شکار ہو جاتے یا کسی اور وجہ سے آہٹا جاتے۔ باپ کی وفات کے بعد ارجمند کا بڑا بھائی بھرپور جوانی میں فوت ہو چکا تھا۔ اس کی وفات ان کے گھرانے کی حالت اور بھی نازک ہو گئی تھی۔ اب ارجمند جوان ہو رہا تھا۔ ارجمند کی بوڑھی ماں جو مصائب کی وجہ سے جیتے جی گویا پاگل ہو چکی تھی ارجمند

سمجھ سکتا تھا اس لیے اس نے اس طریق کار سے پہلو بچانے کے لیے دل میں یہ ایمان پیدا کر لیا تھا کہ محبت کو جسم سے کوئی تعلق نہیں بلکہ محبت اور جسم دو متضاد باتیں ہیں۔ وقت کئی کے لیے لڑکیوں کی طرف دیکھنا اس کی نظر میں جرم تھا۔ دل گئی کے لیے انگریزی کا کھیل کھیلنا اسے گوارا نہ تھا اور اب جب محلے بھر میں اس کے عشق کے چرچے ہو رہے تھے۔ اب تو اس نے لیے احاطے میں کھڑے ہونا ممکن ہی نہ رہا تھا۔ سچے عاشق کا کام یہ نہیں کہ جو گان میں کھڑے ہو کر نوجوان لڑکیوں سے آنکھیں لڑائے۔ اس کے برعکس سچے عاشق کو تو چاہیے کہ چارپائی پر بار کر مست نگاہوں سے چھت کی طرف گھورتا رہے اور جب تھک جائے تو ٹھنڈی آہ بھر کر ہا بدل لے۔

طوفان بد تمیزی

اس رات بستر پر لیٹے ہوئے جب وہ نیم کی سرگوشیوں کے متعلق سوچ رہا تھا تو اس پاؤں کی ہلکی سی آہٹ سنی جیسے نیم سیڑھیاں اتر کر تھی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ تصور میں کتنی تڑپ تھی کیسی وضاحت سے آواز آ رہی تھی پھر آہستہ سے دروازہ کھلا جیسے نیم کھولا کرتی تھی۔ "بائیکل کی سیر کرا دو۔"

ایک اونچی لمبی نیم کو سامنے دیکھ کر وہ گھبرا گیا۔

شہزاد ہنس پڑی "ڈر گئے۔"

"اوہ آپ ہیں خالہ جی۔" ایللی اسے خالہ کہا کرتا تھا۔

"ابھی سے سو گئے۔" وہ پھولدار پروں کو سمیٹتے ہوئے بولی۔

بیٹھ جاؤ خالہ جی۔ کہہ کر وہ گھبرا گیا۔ اسے بٹھائے کہاں۔ کمرے میں ایک چارپائی کے بیٹھنے کی کوئی جگہ نہ تھی۔

"کہاں بٹھاؤ گے۔" شہزاد ہنسی

ایللی محطّمہ کا شہزاد دل کی بات کس طرح بھانپ لیتی تھی کیا وہ اس کے دل کی سب بات سمجھتی تھی۔ اس خیال پر وہ لرز گیا کیونکہ اپنے دل کی سب باتوں کو اپنانے یا ان پر سوچنے سے کبھی جرات نہ ہوئی تھی۔ کئی بار اپنی کسی پوشیدہ خواہش کی ہلکی سی جھلک دیکھ کر وہ حیران کرتا تھا اور پھر دوسرے امور پر غور کرنے کی کوشش کرتا۔ اس وقت بھی اسے

متعلق نہ جانے کیا خیال آیا تھا۔ اس کے دل میں اکثر شہزاد کو دیکھ کر طوفان سا پیدا ہو جاتا تھا۔ ایک عجیب سا طوفان بد تمیزی۔

ایک طرف مونگیا گٹھڑی کے پٹ کھل جاتے۔ دوسری طرف نیلی جھیل میں کنول سا ابھرتا۔ مینڈک لہار گانے لگتا اور دو سفید سے بازو لہراتے اور دو رنگین خوں ہاتھ اس کی طرف پلکتے اور کہیں سے شریف کی متبسم آواز سنائی دیتی۔ "ہر کوئی اپنی نگاہ سے دیکھتا ہے ہلکی۔" اور پھر وہ اس طوفان بد تمیزی کو سمیٹنے کی شدید کوشش کرتا۔

اس طوفان بد تمیزی پر اسے شدید غصہ آتا تھا اپنے آپ پر غصہ آتا۔ وہ محسوس کرتا تھا جیسے علی احمد بنا جا رہا ہو۔ پھر اس کا جی چاہتا کہ بھاگ کر روپوش ہو جائے "کہاں بٹھاؤ گے۔" اسے خاموش دیکھ کر شہزاد نے اپنی بات دہرائی۔ "اسے نہ بٹھا سکے تو مجھے کیسے بٹھاؤ گے۔" وہ پھر ہنس۔ اس کی ہنسی شرارت آمیز تھی۔

نہ جانے شہزاد کس قسم کی لڑکی تھی۔ ایک انوکھی عجیب سی لڑکی۔ جس کی ہر بات نزالی تھی۔ جس کی ہر حرکت گویا منہموم سے بھری ہوئی تھی۔ نہ جانے شہزاد کی ہر بات چھیڑکیوں دیتی تھی۔ اس کی ہر نگاہ دل میں کھب کیوں جاتی تھی۔ اور یہی نہیں اس کا طرز عمل دودھاری تھا۔ وہ ایک نگاہ سے یوں چھیڑتی جیسے اسے چھیڑ دینے سے دلچسپی ہو اور دوسری نگاہ سے یوں الگ تھلک ہو جاتی جیسے ان باتوں سے بلند تر ہو۔ جیسے اسے فانی مخلوق سے قطعی طور پر کوئی دلچسپی نہ ہو۔ ایک ساعت میں وہ اس قدر قریب آ جاتی تھی جیسے پوچھ رہی ہو۔ "میں کہاں بیٹھوں۔" اور دوسری ساعت میں اس قدر دور ہو جاتی۔ دور — اس افق سے بھی دور جہاں گلابی جھیلوں میں نیلے مینڈک پھد کتے تھے۔ ایک وقت اس کا تبسم گویا دل کو کاٹ کر رکھ دیتا اور پھر دوسری ساعت میں اس کے ہونٹوں میں ایک ہلکی سی سلوٹ پیدا ہو جاتی اور محسوس ہوتا جیسے وہ مذاق اڑا رہی ہو۔ تنقید کر رہی ہو۔ رنگینی کے بلوغد اس میں بے نیازی کا عنصر بہت واضح تھا۔ ایللی اسے بلند دہلا ہستی سمجھتا تھا جس کے متعلق ایسی ویسی بات نہیں سوچی جاسکتی تھی۔ لیکن یہ کیا معیت تھی کہ ایسی ویسی بات نہ جانے کہاں سے اس کے دل میں آگھبتی اور وہ شرمندہ ہو کر کئی اور بات کے متعلق سوچنے کی شدید کوشش کرتا۔

طوطا اور مینا

لیکن اس روز تو شہزاد کا انداز قطعی طور پر مختلف تھا اور اس کا رات کے وقت وہاں اکیلے

آنا۔ اور پھر پوچھنا۔ ”کہاں بٹھاؤ گے۔“

وہ چارپائی کے ایک کونے پر بیٹھ گئی۔ ”ایلی۔“ وہ بولی ”میں پوچھنے آئی ہوں کہ کیا تمہیں محبت ہو گئی ہے۔“

ایلی گھبرا گیا۔ وہ اسے کیا جواب دے۔

”اس خبر کی تو محلے میں دھوم مچی ہے آج کل پھر تم مجھ سے کیوں چھپاتے ہو۔“

”چھپاتا تو نہیں۔“ ایلی نے بمشکل کہا۔

”تو بتاؤ نا۔ یہ سچ ہے کیا۔“

ایلی نے اثبات میں سر ہلا دیا اور چپ رہا۔

”کتنے بد نصیب ہو تم ایلی۔“ شنزاد کی آواز میں سنجیدگی تھی۔ ”بہت بد نصیب ہو تم۔“

”اگر تم کچھ دیر صبر کرتے اگر تم جلد بازی نہ کرتے تو کتنا اچھا ہوتا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے آہستہ سے کہا۔

وہ مسکرا دی۔ ”اب سمجھنے کا کیا فائدہ۔ اب تو نہ ہی سمجھو تو اچھا ہے۔ جب میں بچا تھا۔“

یہاں محلے میں آئی اور تمہیں دیکھا تو میں سمجھی کہ ایلی ایک عام سالن کا ہے۔ مجھے یہ خیال نہ

پیدا ہوا تھا کہ تمہیں دیکھ کر کسی کے دل میں اتنا گہرا اثر پیدا ہو سکتا ہے وہ تو آپے سے

رہی۔ لیکن اب کیا فائدہ۔ بے کار ہے اب۔ بچاری۔“ وہ آہ بھر کر خاموش ہو گئی۔

ایلی حیران تھا کہ وہ کیا کہہ رہی ہے۔

”خالہ“ ایلی بولا۔ ”یہ کیا طوطا مینا کی کہانی سنا رہی ہیں آپ۔“

”ہاں۔“ وہ مسکرائی ”میں سمجھتی تھی۔“ وہ بولی ”یہ طوطا معمولی طوطا ہے جیسے ہوتے

طوطے۔ مجھے معلوم نہ تھا کہ یہ طوطا بولتا بھی ہے۔ اب تو ہمیں طوطے سے ڈر آنے لگا۔“

پھر ہنسی۔

”جبھی یہاں آگئی ہو اس وقت اکیلی۔“ ایلی نے پہلی مرتبہ شنزاد سے مذاق کرنے لگا۔

کی۔

”اونہوں“ وہ سنجیدگی سے بولی ”میری بات چھوڑو۔ یہ تو مینا کا خیال تھا جو مجھے ہلانا

ہے۔“

”مینا کون ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ بھی تھی بچاری۔“ نہ جانے اسے کیا ہو گیا۔ اس کی سُدھ بدھ جاتی رہی۔ اس نے کہا تھا

طوطے کو مینا کی کہانی سنا دینا ایک بار۔ شاید اس کہانی کو سن کر سمجھ جائے مگر یکا رہے مجھے معلوم نہ

تھا کہ طوطا مینا بولے باتیں کرتا ہے اور اس کا اثر اس حد تک ہو سکتا ہے تو یہ ہے۔“ شنزاد نے

جمر بھری لی۔ ”اچھا۔“ وہ کھڑی ہو گئی۔ ”میں جلتی ہوں ناحق تمہیں بے آرام کیا۔ صبح آؤ گے

نا۔“

”لیکن ذرا ٹھہرو تو۔“ ایلی نے کہا۔

”نہ بھئی۔“ وہ ہنسی ”اب تو تم سے ڈر آنے لگا ہے۔“ اور ہنستی ہوئی چلی گئی۔

ایلی دیر تک بستر پر پڑا کروٹیں بدلتا رہا۔ طوطا کون تھا۔ مینا کون تھی اور بے پروا بے نیاز

شنزاد کو اب ڈر کیوں آنے لگا تھا۔ ایلی کے دل میں جذبات کی ایک بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

ایلی کو یہ معلوم بھی کیسے ہوتا کہ شنزاد گوگل کے بن کی سانوری کے متعلق بات کر رہی

ہے۔ وہ سانوری جسے وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھا کرتا تھا اور سمجھتا تھا کہ وہ ایک سمانا خواب ہے

ایک دلکش تصویر۔ وہ خواب بھلا حقیقت کیسے ہو سکتا تھا۔ حقیقت تو محلے کی لڑکیاں تھیں جو

جوتوں کے پیچھے چھپ چھپ کر مسکراتی تھیں۔ اور پھر اپنے آپ سے ڈر کر پیچھے ہٹ جاتیں۔

لیکن سانوری تو یوں بے نیازی سے کوٹھے پر شلا کرتی تھی جیسے گرد و پیش ایک ناقابل توجہ منظر

نوش کر رہا ہو۔ وہ ایک ساعت کے لیے بھی یہ نہ سوچ سکتا تھا کہ طوطا مینا کی کہانی کی مینا سانوری

تھی جس نے کبھی آنکھ اٹھا کر اس کی طرف نہ دیکھا تھا جو اسے قابل التفات ہی نہ سمجھتی تھی۔

اس زمانے میں ایلی نسائی دورخی سے واقف نہ تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ عورت بھی اسی طرح

ہوتی ہے جیسے لڑکے ہوتے ہیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان کی بظاہر بے نیازی محض ایک پردہ ہوا

کرتی ہے۔ اس لیے وہ طوطا مینا کی کہانی کے مفہوم کو نہ سمجھ سکا اگر اسے معلوم ہو جاتا کہ

سانوری نے اسے ایسا مرتبہ بخشا ہے تو وہ خوشی سے ناپنے لگتا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ ایک بار

ڈنکے کی جوت سے تسلیم کے عشق کا اعلان کر چکا تھا۔

عشق تو ایک بار محبت لگا کے پھر نہیں بدلتے۔ سچی محبت کی سب سے بڑی خصوصیت اس

کے نزدیک وفا تھی۔ سرد مری کے باوجود وفا۔ بے پروائی کے باوجود وفا۔ اگر اسے طوطا مینا کی کہانی

کا مفہوم معلوم ہو جاتا تو الٹا وہ کٹکٹش میں گرفتار ہو جاتا کہ کس طرح تسلیم کو چھوڑ کر سانوری

سے عشق لگائے۔

ایک اور

اگلے روز صبح ہی علی احمد کی آمد کا شور مچ گیا۔ چچا امداد جو کسی کام سے شیٹن کے گھر تھے واپسی پر احاطے میں آکر چلانے لگے ”بہن نواب۔ بہن نواب۔“

دادی اہل ان کی آواز سن کر بولیں ”اے ہے لڑکیو سنو تو امداد کی آواز آ رہی ہے ان کانوں میں تیل ڈال کر بیٹھ رہتی ہو۔“

”بہن نواب سے کہہ دو۔“ چچا امداد چلائے ”علی احمد آرہے ہیں میں نے انہیں بلانے دیکھا ہے کھانا دانا تیار رکھے اور سیدہ بیٹی“ وہ ہنس کر بولے: ”کتنا ساتھ شمیم بھی ہے بچہ بگڑا ایک اور بھی۔“ وہ ہنسنے لگے۔

”اے ہے چچا“ ایک بولی۔ ”یہ ایک اور کون ہے۔“

چچا نے۔ ”ہر بار ہوتی ہے ساتھ ایک اور نئی بات ہے کیا۔“

”کیوں نہ ہو ایک اور ساتھ۔“ دوسری بولی ”علی احمد کے ساتھ ایک اور نہ تو کوئی جانے کہ علی احمد ہیں۔“

”مگر چچی اب کی بار کون ہے؟“

”ہو گی کوئی ترکھانی یا ننھی۔“

”اے ہے یہ نہ کہو سنا ہے شریف زادیاں بھی آتی ہیں۔“

”نہ بھی میں تو نہیں مانتی۔ وہ شریف زادی ہی کیا ہوئی جو آگئی۔ اور بہن یوں پچنے اور اطمینان سے انگلی پکڑے آتا ہے یہ علی احمد۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے میلے سے لٹا گوجری خرید کر لا رہا ہو۔ ذرا نہیں شرماتا ذرا نہیں سوچتا کہ محلے میں جا رہا ہوں محلے والے کہیں گے۔“

”ہونہ۔ محلے والے۔ محلے والوں کی بہن وہ پروا کرتا ہے کیا جو ج پوچھو تو شرافت فدا ہی میں رہ گئی ہے علی احمد کے پاس اللہ کے فضل سے چار پیسے ہیں۔ اچھے عمدے پر لگا۔ اسے محلے والوں کی کیا پروا۔“

علی احمد کا قافلہ احاطے میں داخل ہوا تو محلے کے مکانوں کی تمام کھڑکیاں بھری ہوئی تھیں

بڑھیاں چوہن میں کھڑی تھیں لڑکیاں، چتوں کے پیچھے دکی ہوئی تھیں، جیسے علی احمد کی آمد ایک عظیم واقعہ ہو۔

”علی احمد“ ایک بولی۔ ”سنا ہے پھر ایک اور ساتھ لے آیا ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے۔ ”چچی وہ تو شمیم کی سہیلی ہے۔“

”ہیشہ سہیلی ہی بن کر آتی ہے پہلے پہل۔“ ایک چلائی۔

”اے ہے علی احمد تیرے بہانے نہ گئے کیسے کیسے بہانے تراشتا ہے تو“ دوسری نے کہا۔

”ہی ہی ہی۔“ وہ نے ”تو اور کیا صاف صاف کہوں تمہارا لحاظ بھی نہ کروں چاچی۔“

”اے ہے۔ یہ اچھا لحاظ ہے علی احمد“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔

علی احمد ہی ہی کرتے ہوئے ڈیوڑھی میں داخل ہو گئے اور محلے والیوں کی نگاہیں ان کے پیچھے چلنے ہوئے قافلے پر مرکوز ہو گئیں۔

”چچی ہے تو اونچی لمبی۔“ ایک بولی۔

”ہو گی تو ویسی ہی کالی کلفتی۔ ایسی ہی لایا کرتا ہے۔ یہ علی احمد“ دوسری نے کہا۔

نہ جلنے کیا چاؤ ہے اس کو۔ گلی سڑی اٹھا لاتا ہے۔“ تیسری نے منہ ہٹا کر کہا۔

”ہاے ری۔“ ایک چلائی ”میں مرگئی یہ تو ننھی معلوم ہوتی ہے۔“

”ننھی ہے تو اور بھی اچھا ہے اپنے علی احمد کو ناچ بچائے گی۔“

”اے یہی تو وہ چاہتا ہے۔“ چچی نے جواب دیا۔

”اتنی عمر بیت گئی پر ابھی یہ جنون اس کے سر سے نہ گیا۔“

”وہ جنون ہی کیا ہوا اہل جو چلا جائے۔“

دادی اہل نے اپنے کمرے سے آنکھ بچا کر دیکھا پھر دھڑم سے تخت پر گر پڑی۔ جیسے اسے دھچکا لگا ہو۔ پھر بات کیے بغیر تخت پوش پر گڈٹ ہو کر پڑی رہی جیسے سجدے میں پڑی ہو۔

شمیم نے گھر میں داخل ہوتے ہی برقعہ اتار کر پھینک دیا اور تیزی سے بھاگ کر اپنے کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کا منہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا آنکھیں رو رو کر ابلی ہوئی تھیں۔ اس کی دونوں لڑکیاں سہمی ہوئی تھیں۔

معذرت

علی احمد اور نوداد وہ چپ چاپ اطمینان سے الگ ایک کمرے میں جا بیٹھے جیسے کوئی بات

ہی نہ ہو یا ہر محلے والیوں کا ہتھکٹا لگ گیا۔

”ایلی“۔ علی احمد نے آواز دی۔ ”ایلی بھی یہ راجو تم سے ملنے آئی ہے۔ ہی ہی ہی تھی کہ علی پور دیکھوں گی۔ اب یہ کام تمہارا ہے ایلی کو اسے گھماؤ پھراؤ۔ ایلی تو علی پور کے چپے سے واقف ہوا۔ ہی ہی ہی۔ کیوں ایلی۔ اچھا تو باجرہ کہاں ہے اسے راجو سے ملائیں۔“

”سیدہ۔ کیا کر رہی ہے۔ تو۔ اوھر آنا اوھر دیکھ یہ راجو تجھ سے ملنے آئی ہے اور توہاں چولے کے پاس بیٹھی ہے۔ یہ دولت پور کے رہنے والے ہیں۔ راجپوت ہیں۔ اپنی دوکانیں زمینیں ہیں سبھی جانتے ہیں انہیں وہاں دولت پور میں مشہور خاندان کے ہیں۔ راجپوت ہر عزت والے سمجھے جاتے ہیں۔ آجاؤ۔ آجاؤ بیٹھ جاؤ۔ سیدہ راجو یہ سیدہ ہے میری بہن کی بیٹی میری بیٹی ہی سمجھو۔ اپنے یہاں ہی رہتی ہے۔ اور کو سیدہ کیا حال چال ہے۔ باجرہ نہیں آئی۔ شیم کیا ہوئی۔ سفر کی وجہ سے تھک کر جا پڑی ہو گی اپنے کمرے میں ہی ہی ہی۔ اچھا ہلکے ذرا چلم میں دو کوئلے تو رکھ دینا۔ واقعی سفر میں انسان تھک جاتا ہے۔“

وہ مسلسل بولتے گئے جیسے خاموشی سے ڈرتے ہوں جیسی آواز کے تھکے کا سارا لڑو بننے سے بچتا چاہتے ہوں اور پھر ہر بات پر ان کا قہقہہ گونجتا رہا کھوکھلا کھسیانہ قہقہہ جیسے راجو کو لانے پر معذرت کر رہے ہوں۔

”اماں۔“ وہ بھاگے بھاگے اپنی والدہ کی طرف آئے۔ ”اماں تمہارا کیا حال ہے؟“

بھلی ہوں علی احمد ”برھیانے جواب دیا ”ذرا دم کی تکلیف ہے۔ رک جاتا ہے۔“

”پھر تو بہت تکلیف ہوئی۔“

”اب یہی کچھ ہوتا ہے۔ کچھ وقت بیت گیا کچھ بیت جائے گا مگر علی احمد یہ تو کیا ہے؟“

”ہے۔“ داوی اماں نے آہستہ سے کہا۔

”اوہو اماں۔“ وہ ہنسے ”بہت دہلی ہو گئی ہو۔ کوئی دوا دارو کر رہی ہو۔“ علی احمد کو یوں بات بدلتے دیکھ کر وہ مسکرا کر بولی ”علی احمد تیری عادت نہ بدلی اور دوا کا کیا پوچھتے ہو۔ اب تو نا کرو۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولے ”میں ڈاکٹر کو بلاؤں گا اس سے پوچھوں گا۔“ اور پھر راجو کے یوں جا بیٹھے جیسے وہ خود مریض ہوں اور ڈاکٹر ان کی طرف دیکھ کر مسکرانے لگی اور پھر علی احمد

کے کمرے کا دروازہ بند ہو گیا۔

گورو دیو مہاراج

راجو کے آنے پر چار ایک دن محلے میں یہی شغل رہا ایک مسکرا کر پوچھتی ”علی احمد یہ تو کیا لے آیا ہے۔“

علی احمد مسکرا کر جواب دیتے ”چچی یہی تو مجھے تم سے پوچھنا ہے یہ میں کیا لایا ہوں۔ خسارہ کا سودا تو نہیں۔“

”دوسری پوچھتی ”علی احمد یہ کیا لے آیا تو دیکھنے میں تو کچھ بھی نہیں۔“

علی احمد ہنس کر کہتے ”ہاں بہن دیکھنے میں کچھ نہیں۔“

پھر کوئی محلے والا چلاتا۔ ”علی احمد اب تمہارے دن نہیں رہے۔“

”ہاں بھی صاحب۔“ وہ ہنستے ”جیسی تو راتیں منا رہا ہوں۔“

ایلی بھی راجو کو دیکھ کر حیران تھا اس میں وہ بات ہی نہ تھی۔ کوئی بھی تو بات نہ تھی اس میں۔ بالکل چلا ہوا پٹاخہ نہ جانے کیا ہو گیا تھا اسے۔ جیسے کچھ ہو گیا ہو۔

اگلے روز جب ایلی نے ارجمند سے بات کی تو وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”بھئی واہ ایلی تم تیلی کے تیلی ہی رہے صرف علی احمد ہی سیانے آوی ہیں باقی تو سب الو کے پٹھے رہتے ہیں۔ یہاں وہ باغی کے دانت نہیں پالتے جو کھانے کے نہیں بلکہ دکھانے کے ہوں سمجھے میاں۔ پیٹ کی بھوک آنکھیں سیراب کرنے سے نہیں مٹتی۔ سمجھے مگر تم کیا سمجھو گے۔ تم تو ہوئے تیلی کے تیلی۔ مطلب یہ ہے بیٹا وہ کہا ہے سیانوں نے کہ عورت دیکھنے کے لیے نہیں لائی جاتی گھر میں۔

پھر صورت پر کیا جانا۔ تمہارے ابا تو گورو دیو مہاراج ہیں۔ دھن ہیں گورو دیو مہاراج وہ انگریزی سیکھ رکھا ہے کہ واہ وا۔ یوں اڑی چلی آتی ہیں جیسے شمع پر پردانہ آتا ہے۔ آبا کیا گریکھ رکھا ہے تمہارے ابا نے بیٹا اپنے ابا کی قدر و منزلت اس خاکسار سے پوچھو۔ اپنے خادم سے پوچھو۔

خاکسار پرانا کھلاڑی ہے۔ خاکسار نے یہ کھیل ڈپنری کی میزوں پر سیکھا تھا اور آج اتنے سال کے بعد جب خاکسار شاہ کا کو گیا اور جناب یوں سمجھ لو کہ ایک طرف شاہ گاؤں ہے اور دوسری طرف کاکو گاؤں آتی ہیں اور اوھر سے کاکو کی کراریاں۔ خاکسار ایک نظر اوھر رکھتا ہے۔ دوسری شلو کی شزلوایاں آتی ہیں اور اوھر سے کاکو کی کراریاں۔ خاکسار ایک نظر اوھر رکھتا ہے۔ دوسری

ادھر۔ اس قدر چاق و چوبند رہنے کے باوجود نتیجہ کیا ہے۔ بالکل ٹیل۔ چھ ماہ میں صرف وہ تھیں اور وہ بھی سمجھ لو مجبوری ہے۔ لیکن تمہارے ابا۔ سبحان اللہ گرو دیو جی مہاراجا انگریزی چلاتا ہے بڑھا کہ دولت پور سے علی پور چلی آتی ہیں۔ واہ وا۔ بیٹا بڑے ہو کر پورے اس بڑھے کے کارناموں پر۔ مگر یار اس بے وہ نسخہ تولے لوجو وہ استعمال کرتا ہے۔ یہ کلام کرو گے تو سدا سکھی رہو گے۔“

اب تو محلے کے سبھی لوگ اس بارے میں ایلی سے کچھ نہ کچھ کہنے کے لیے بہانہ رہے تھے۔

ایک کہتا ”میاں ایلی مبارک ہو۔“

دوسرا کہتا ”کہوئی مل پسند آئی۔“

تیسرا کہتا ”کیوں ایلی تم کب تک دیکھتے رہو گے میاں اب تو تمہارے دن آگئے۔“

کوئی کہتی ”ایلی تیرے ابا کا چتاؤ کیا ہے۔“

ایک بولتی۔ ”ایلی تو نہ اس راہ پر چلیو چھوڑ اس کو۔ اس نے تو اپنی زندگی جلا کر لی۔“

پھر اتفاق سے محلے میں دو ایک شادیوں کا اہتمام شروع ہو گیا اور لوگوں کی توجہ علی راجو سے ہٹ کر شادیوں کی طرف مبذول ہو گئی۔



میراثین

انہی دنوں علی پور میں میراثنوں کا ایک نیا ٹولہ آیا تھا۔ ان میں ایک میراثن زہرہ فطیمہ کی بیٹی تھی۔ جب وہ نکاتی اس کا حلیہ ہی بدل جاتا۔ اس پر ایک عجیب کیفیت چھا جاتی تھی کہ دیکھنے والے مسکرت ہو کر رہ جاتے۔

محلے کے جوان بیچارے انتظار میں رہتے تھے کہ کوئی ایسا ہاتھ آئے تو وہ میراثنوں کو بلائیں اور چھت پر چاندنی بیٹھ کر زہرہ کو گاتے دیکھیں۔

کوٹھے پر ایک طرف عورتیں بیٹھ جاتیں۔ درمیان میں میراثنوں کے لئے جگہ مقرر کر دی جاتی۔ دوسری طرف محلے کے جوان بیٹھ کر زہرہ کی طرف متنبہ نگاہوں سے دیکھتے۔ جب وہ عورتوں کی طرف دیکھتی تو اس کے چہرے پر مروتی چھائی ہوتی۔ لیکن جب وہ جوانوں کی طرف آنکھ اٹھاتی تو دفعتاً ”گویا سوکھا ہوا پھول از سر نو تازہ ہو جاتا اس پر جوانوں کے ہاتھ چپ چاپ میموں میں کچھ ٹٹولنے لگتے۔ زہرہ کے ساتھیوں کے چہروں پر مسرت کی لہر دوڑ جاتی اور ان کی تنوں میں جوش پیدا ہو جاتا۔

محلے کی عورتیں میراثنوں کو پسند نہ کرتی تھیں اگرچہ وہ اس بات کو تسلیم کرنے پر مجبور تھیں کہ ان کے آنے سے محلے میں رونق کی لہر دوڑ جاتی ہے اور تقریب میں چل پھل پیدا ہو جاتی ہے۔ مگر جوانوں کا مسکرا مسکرا کر زہرہ کی طرف دیکھنا اور روپے پر روپے دیتے جانا انہیں

سفینہ اور نور

کروا آتے ہی ہوں گے۔ بچا۔“ اور پشتراس کے کہ چاچی جواب دیتی وہ اس کے پاس سے نکل جاتی اور کسی اور سے جا کر بات کرنے لگتی۔

”بہا عمرو ہیں۔ سلام کہتی ہوں بابا۔ نماز پڑھ کر آئے ہو۔ یہ کس وقت کی نماز ہوئی۔ دن میں نو نمازیں پڑھتے ہو کیا۔“ اور پشتراس کے کہ بابا کچھ کہیں وہ کسی بچے سے بات شروع کر دیتی۔

شزاو کی ملائیں انوکھی تھیں جو محلے والیوں کی نگاہوں میں کھنکھتیں مگر اس کی ہنس کھ طبیعت کی وجہ سے۔

رفیق اور سیکینہ

محلہ والیاں خاموش رہتی تھیں۔ پھر بھی دبی دبی رہنے کے باوجود بات نہ دبی اور محلہ والیوں کی سرگوشیاں جاری رہیں۔ ”ہرنی ہے ہرنی۔“ وہ اسے دیکھ کر کہیں ”کلیلیں بھرتی ہے۔“ شاید اس لئے کہ اکیلی شزاو کے متعلق سرگوشیاں کرنا آسان نہ تھا۔ جب تک دو نام منسلک نہ ہوں سرگوشیوں میں لذت پیدا نہیں ہوتی۔

اس لئے آہستہ آہستہ ان سرگوشیوں میں شزاو کے ساتھ رفیق کا نام شامل کر لیا گیا اور محلے والیاں رفیق کی طرف مشکوک نگاہوں سے دیکھنے لگیں۔ شاید رفیق کی طرف انگلیاں نہ اٹھتیں مگر مشکل یہ تھی کہ رفیق کی شادی سوچنی تھی اور وہ بچپن ہی میں سیکینہ کا خوندین چکا تھا جو اس کی ہر حرکت پر کڑی نگاہ رکھتی تھی اور اس کی ہر جنبش میں مقصد ڈھونڈتی تھی۔ رفیق کی آنکھوں میں بوندا باندی ہوتی دیکھ کر اس کے کپڑوں میں عطر کی خوشبو محسوس کر کے وہ ایک گہری سوچ میں پڑ جاتی۔

رفیق اور سیکینہ ایک قدامت پسند گھرانے کے افراد تھے۔ خاوند بیوی ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے آزادانہ طور پر مل نہیں سکتے تھے۔ ایک دوسرے سے بات کرنے کے لئے بھی انہیں بہانوں کا سہارا لینا پڑتا تھا اور پھر موقعہ اور محل کو دیکھنا پڑتا۔ رفیق کو رومل دھلوانا ہوتا تو وہ رومل پکڑ کر چھت کی طرف گھومتے ہوئے یوں گنگناتا جیسے کوئی منتر پڑھ رہا ہو۔ ”میں کہتا ہوں اسے دھو ڈالنا آج۔“ یہ کہتے ہوئے وہ سیکینہ کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھتا اور چولہے کے قریب بیٹھی ہوئی سیکینہ ہنڈلا میں جھانکتے ہوئے گنگناتی ”رکھ دیجئے۔“ پھر رفیق رومل کو جھاڑ کر یوں گرا

بے حد ناپسند تھا۔

محلے میں صرف چند ایک لڑکیاں ایسی تھیں جو محلے کی عام عورتوں کے برعکس ایسے ہلکے خوش دکھائی دیا کرتی تھیں ان میں شزاو پیش پیش تھی۔ ڈھولک کی آواز سن کر اس کی آنکھوں میں گلابی جھینے اڑنے لگتے شانوں پر پریشمیں دوپٹے کا سنبھالنا مشکل ہو جاتا۔ بازوؤں بات بہا لہراتے جیسے کتھا سکی کے مندر ادا کر رہی ہو۔ اس کی تو آواز بھی بدل جاتی تھی۔ سنے کے چڑھ جاتے اور بات میں تھا۔ لوج پیدا ہو جاتا۔

ہرنی ہے ہرنی

شزاو کی اس بات پر محلہ والیوں میں چہ میگوئیاں ہوتی۔ دبی دبی آوازیں سنائی دیتی۔ ”آخر خاندان کا اثر نہیں جاتا بن۔“ ”خود بھی تو کاتی ہے۔ سنا تھا۔ جب دولسن بن کر آئی تھی خود اپنے بیاہ پر گلے لگی تو بہ ذرا نہ جھجھی۔“

”میں کہتی ہوں چاچی یہ چیزیں خون میں ہوتی ہیں ہاں کہے دیتی ہوں۔“ ”چ کہتی ہو بیٹی۔ زمانے کو دیکھ کر حیرت ہوتی ہے۔“ ”ابھی تو دیکھتی جاؤ چاچی۔ ابھی دیکھا کیا ہے۔“ ”نہ اللہ نہ کرے۔ اب تو خدا اٹھا ہی لے تو اچھا ہے بن۔“ ”ہے اور وہ میرا شن تو بہ یوں دیکھتی ہے۔ جیسے آنکھوں کی جگہ میغیں ہوں۔ ہاں ہے نگاہیں۔“

”آج کل کے نوجوانوں کو تو یہی پسند ہے بن۔“ ”تو بہ وہ تو ان میٹوں پر بچھے جاتے ہیں۔“ جب سے شزاو محلے میں آئی تھی۔ محلہ والیاں اسے حیرانی سے دیکھتی تھیں اور انگلی ڈال کر کھڑی کی کھڑی رہ جاتیں۔ مگر شزاو نے کبھی اس تفصیل کو اہمیت نہ دی تھی محسوس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اس کی طرف حیرانی سے دیکھتی ہیں اور اس کی حرکت کا بخور ہیں۔ وہ چلتے چلتے چاچی کی طرف دیکھ کر شور مچا دیتی۔ ”سنا چاچی کس کا انتظار کر رہی ہے۔“

دیتا جیسے مداری تماشا دکھا رہا ہو۔ پھر وہ باہر نکل جاتا اور سیکنہ لمبا گھونٹ سنبھالے آتی اور گردن روہل اٹھا لیتی اور اس سمت قطعی طور پر نہ دیکھتی۔ جس سمت کو رفتی گیا ہو۔ ان حالات میں سیکنہ اپنے شوہر کو بچی نظروں سے دیکھنے کے سوا اور کر ہی کیا سکتی تھی۔ اس کے برعکس شہزاد سے سراٹھا کر ملتا تھا۔ اگرچہ بات عزت سے کرتا تھا۔ لیکن اس کا ہلنے بھلنے شہزاد سے ”چچی کچھ منگوانا تو نہیں۔ میں بازار جا رہا ہوں۔ چچی ایسے اچھے چاول آتے ہیں۔ بنواری لال دوکلن پر منگوانے ہیں کیا۔ چچی چائے سستی ہو گئی ہے۔ چچی بڑا اچھا کپڑا منڈی میں آیا ہے۔“ دن میں رفتی دوبار شہزاد کی طرف جاتا اور پھر دیر تک آہستہ آہستہ اس سے باتیں کرتا اور باتوں کے دوران میں سی سی کرنے کے علاوہ جھجکتا اور گھبرا گھبرا کر ادھر ادھر دیکھتا اس وقت اس کی آنکھوں سے پھلجھریاں چلتیں اور کانوں پر سرخ چوٹیاں رہتی تھیں۔ رفتی کی پیوی سیکنہ اسے شہزاد کی طرف آتے دیکھ کر اپنے لیے گھونٹ سمیت کوٹھم چڑھ آتی اور ان کی طرف کھڑکی چھت یا طاق سے چوری چوری جھانکتی۔ انہیں قریب قریب کھڑے دیکھ کر رفتی کے متعلق نہ جانے کیا کیا اندازے لگاتی۔ پھر اکیلے میں بیٹھ کر آنسو بہا اور محلے والیاں اسے او اس دیکھ کرچہ میگوئیاں کرتیں اور ان کی سرگوشیوں میں رفتی اور شہزاد کے نام سنائی دیتے۔

ایلی نے بھی کئی ایک بار انہیں یوں قریب کھڑے باتیں کرتے ہوئے دیکھا تھا اور خود اس کے دل میں بھی جلن پیدا ہوئی تھی۔ پھر تنہائی میں بیٹھ کر سوچتا رہا تھا ”رفتی اثر پدا کر رہے تو کیا ہے۔“ اس نے لا حول پڑھ کر اس خیال کو دل سے نکال دیا تھا۔ لیکن یہ تو اس دنیا کی بات تھی جب اسے تسلیم سے محبت نہ ہوئی تھی۔ اب تو جب بھی وہ شہزاد کی طرف دیکھتا اس کی نگاہوں میں شہزاد کے خدو خال دھندلے پڑ جاتے اور اس رنگین دھندلے میں سفید چمکتے اور تھنکھریالے بالوں کی لٹ لہرائی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ شہزاد نہیں بلکہ تسلیم ہو چکے ہیں نے ہمیں بدل رکھا ہو۔

ڈبل اینٹ

علی پور کے ان مشاغل میں ایلی کی چھٹیاں گویا چشم زدن میں ختم ہو گئیں۔ اور وہ علی سے امر تر چلا آیا کالج جانے سے پہلے وہ آصف کے گھر گیا اور دیر تک اسے آوازیں دیتا رہا۔

ان کا نوکر نیچے آیا۔ ”آصف صاحب ہیں۔“ اس نے پوچھا۔ ”جی میں دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا ”آپ کا نام کیا ہے؟“ آصف نے تو کبھی ایسا نہ کیا تھا۔ جب بھی ایلی اس تنگ گلی میں کھڑا ہو کر آواز دیتا تو کھڑکی سے آصف جھانکتا اور مسکرا کر کہتا ”آیا ابھی۔“ اس سے پہلے نوکر نے کبھی نیچے آکر نہ کہا تھا ”جی میں دیکھتا ہوں۔“ آپ کا نام کیا ہے۔“

نوکر دوسری بار آیا ”جی آئیے۔“ وہ بولا۔ وہ اسے بیشک میں لے گیا۔ ”بیٹے وہ ابھی آتے ہیں۔“ وہ بیشک بہت ہی مختصر سا کمرہ تھا جس کے ایک کونے میں پٹنگ پڑا تھا اور دوسری جانب ایک میز اور دو کرسیاں رکھی ہوئی تھیں، دو بڑی کھڑکیاں اور روشندان گلی میں کھلتے تھے۔ ایلی نے آصف کی بیشک کو دیکھ کر محسوس کیا جیسی وہ بدل بدل سی ہو۔ پہلے تو اس میں اتنا اندھیرا نہ ہوتا تھا نہ ہی وہ اس قدر دیران تھی۔ پہلے روشندانوں میں شیشے لگے ہوئے تھے لیکن اب ان پر ٹاٹ لگا کر بند کر دیا گیا تھا۔

کچھ دیر کے بعد آصف داخل ہوا اس کا چہرہ زرد تھا آنکھیں روئی روئی نظر آتی تھیں اور انداز میں جھجکتی۔ ایلی کی طرف دیکھ کر اس نے مسکراتے کی کوشش کی لیکن اس کی مسکراہٹ بے حد اوس تھی۔

”تم آگئے۔“ وہ بولا ”میں محسوس کر رہا تھا کہ تم کبھی نہیں آؤ گے اور کالج ہمیشہ بند پڑا رہے گا اور۔۔۔ اور۔۔۔“ اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔ ہاں بیماری سمجھ لو۔“ وہ بولا۔

”کیا تکلیف ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تکلیف۔“ آصف مسکرایا ”تکلیف نہیں روگ لگا ہے۔“ وہ ایلی کے قریب تر ہو کر زیر لب باتیں کر رہا تھا۔ جیسے اپنی آواز سے ڈر رہا ہو۔

”آخر بات بھی تو بتاؤ؟“ ایلی نے چیخ کر کہا۔

آصف گھبرا گیا۔ ”خدا کے لئے آہستہ بولو۔ کوئی سن نہ لے۔“

”کون سن رہا ہے تمہاری بات۔“ ایلی نے پوچھا۔

”سن رہا ہے۔ سن رہا ہے۔“ اس نے روشن دانوں کی طرف اشارہ کیا۔

”عین اس وقت گلی میں کسی نے قہقہہ لگایا۔ ایلی چونکا: ”یہ کون ہنس رہی ہے؟“

چلو یہاں سے چلیں۔ وہ گھبرا کر بولا: ”لیکن ایسے نہیں تم پہلے جاؤ میں آ جاؤں گا۔ بازار
ملوں گا۔ جلدی کرو جلدی۔“

اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد ہو رہا تھا۔ ”کھڑکی کھول دو۔“ قریب ہی سے پھر وہ
غریب آواز آئی۔

”یہ ہے کون؟“ ایللی نے پوچھا۔ آصف کا چہرہ اور بھی زرد پڑ گیا۔ ہونٹ کانپنے لگے
کے لیے بازار میں میرا انتظار کرتا۔ شاید مجھے دیر ہو جائے۔“

عین اس وقت ایک ڈبل اینٹ روشندان کے ٹاٹ سے ٹکرا کر دھڑام سے گلی میں گر
باہر نکلتے ہوئے ایللی نے چوری چوری ایک نظر مقابل کے چوہارے پر ڈالی۔ کھڑکی میں

کھڑا تھا۔ اس کے سیاہ لمبے بال کھلے ہوئے تھے اور چہرہ سرخ ہو رہا تھا۔
”اس سے کہو باہر نکلے۔“ وہ چلائی۔

ایللی ڈر کر بھاگا کہ کوئی اینٹ اس کے سر پر نہ گر جائے۔

کوئی نہیں کسی سے نہیں

بازار میں وہ دیر تک ٹھٹھا رہا مگر آصف نہ آیا اس کا جی چاہتا تھا کہ پھر سے گلی میں دام
جائے اور جا کر اسے آواز دے مگر جرات نہ پڑتی تھی۔ نہ جانے وہ اینٹ کس نے ماری تھی

جانے وہ اسے ڈانٹ کیوں رہی تھی۔ نہ جانے وہ کون تھی اور حالات کیا تھے۔ دیر تک
سوچتا رہا اور پھر ان جانے میں اس نے اپنا رخ آٹا کے گھر کی طرف موڑ لیا اور پھر جوں

اٹھا کر دیکھا تو وہ تسلیم کی سی دھیوں میں کھڑا تھا۔ غیر از معمول اس نے دروازہ کھٹکٹایا۔ لیکن
گویا ویران پڑا تھا کوئی آواز نہیں آرہی تھی ڈیوڑھی زینہ اور بیٹھک سب ویران پڑے

اس نے پھر دروازہ کھٹکٹایا۔ دور سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ اس کا دل دھڑکنے لگا۔
”کون ہے؟“ تسلیم کی آواز سن کر اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ دروازے میں تسلیم

دوپٹہ لہرایا اور پھر ایک گھنگھریالی لٹ جھلکی۔
”تسلیم۔“ ایللی نے زیر لب کہا۔

”اوئی اللہ۔“ وہ چلا کر پیچھے ہٹ گئی اور پھر ہنسنے لگی۔
”گھر کوئی نہیں۔“ وہ ہنستی ہوئے بولی۔ اس کی ہنسی میں واضح اشارہ تھا۔

”مجھے کوئی نہیں سے ملتا ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”کوئی نہیں۔ کسی سے نہیں ملتے۔“ وہ پھر ہنسی۔

”ہاں ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”میں کسی سے نہیں ہوں۔“

”بڑے ہو۔“ وہ تنک کر بولی۔ ”ہم کیا کریں۔“

”ہی تو نہیں بتانے آیا ہوں۔“ ”وہ بولا۔ کہ تم کیا کرو۔“

”نہ جی۔“ وہ کہنے لگی۔ ”ہمیں نہ بتائیے کچھ۔ ہم نہیں سنتے ایسی دسی بات۔ کو کام کیا
ہے؟“

”ہم وہ آن پڑا ہے۔“ ایللی گنگٹانے لگا ”خدا کے لئے ذرا دروازے میں تو آؤ۔“

”نہ میں نہیں آتی۔“

”ضروری بات ہے۔“ وہ ہنسنے کرنے لگا۔

”پڑی ہو۔“ وہ بولی۔

ایللی نے دروازہ کھول دیا۔ ”اچھا تو میں آتا ہوں۔“ ”خدا کے لئے۔ خدا کے لئے۔“ وہ
چلائی۔ ”وہ آنے ہی والے ہیں۔“

”تو پھر وعدہ کرو کہ تم مجھ سے ملو گی۔“ ایک فاتح کی طرح اس کی باچھیں کھل گئیں۔
”لے لے مطلب!“ وہ بولی۔

”تمہیں دیکھنا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”دیکھنا ہے۔“ وہ تکتہ مار کر ہنسی ”دیکھ کر کیا لیں گے۔“

”کیا لینے دینے کے بغیر دیکھا نہیں جاسکتا۔“

”بس جی بس۔“ وہ چڑ کر بولی۔ ”اب جانے دو ورنہ۔“

”ورنہ۔“ وہ چلایا۔ ”میں اندر آ رہا ہوں۔“

”نہیں نہیں۔“ اس نے منت کی۔

”تو پھر ملنے کا وعدہ کرو جلدی۔“

”ملوں گی۔ ملوں گی۔“

”کب؟“

”کہہ جو ملا ملوں گی۔ جاؤ نا اب۔ جاؤ بھی۔“ وہ چڑ کر بولی۔

ایلی میزبیاں اترتے ہوئے سوچنے لگا۔ اگر وہ اوپر سے ایک ڈبل اینٹ مارے یا پتھر پھینکے تو زندگی کتنی دلفریب ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ کچھ ہو جائے کوئی شرارت۔ کوئی شرارت! حرکت۔ جس سے زندگی زندگی بن جائے چاہے جو کچھ بھی ہو یہ سوچتا ہوا وہ چپ چاپ گھر کو خُشی کی طرف چل پڑا۔

پھوٹ

جونہی وہ یورڈنگ میں پہنچا۔ اللہ داد نے لپک کر اسے پکڑ لیا اور اسے شانوں پر اٹھا کر ایللی نے شور مچایا۔ ٹانگیں چلائیں۔ لیکن بے کار۔ اللہ داد نے اسے اٹھائے رکھا۔ شیخ اب بن گئی بات۔ اب تو وہ باؤنڈری لگائیں گے کہ یہ مہاشے یاد کریں گے۔ ”شیخاؤ کرنے کے بعد وہ دونوں ویسے ہی ایللی کو اٹھائے ہوئے جلوس کی صورت میں ہر گزے گھومنے لگے۔

”لو بھئی ہو جاؤ تیار ہر نام سیاں اور گوہند رام ذرا آجاؤ میدان میں ہمارا پٹو بھی لگاؤ وہ باؤنڈری لگے گی کہ یاد رکھو گے۔“

ہر نام سنگھ نے انہیں دیکھ کر مونچھ مروڑی ”واہ کرو۔“ وہ دھاڑنے لگا۔ ”وہ اتور کا کہ یاد کرو گے۔۔۔۔۔۔“

اللہ داد نے طنز بھرا تقہہ لگایا ”تو آجاء میدان میں میرے یار۔“
پھر وہ رام گوپال کے کمرے میں جا گئے ”نکل آجے رامو۔“ اللہ داد چلایا ”وہیں“
تیرے ہاتھ ابے مسلوں کے سامنے کیا ٹھہرو گے تم۔ آدم خور ہوتے ہیں ہاں۔
رام گوپال نے ایک نعرو لگایا جسے کالی ماتا جسے بجرنگ ملی اور چھلانگ مار کر باہر نکل گیا۔
یونی جی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعروں کو
لڑکوں کو نکال کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی سپرنٹنڈنٹ کے کمرے میں
”علی — مولا علی“ اللہ داد نے نعرو لگایا۔ بنگالی بابو گھبر کر باہر نکل آیا اور
جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔

تیرے ہاتھ ابے مسلوں کے سامنے کیا گھمرو کے کم۔ اوم حور ہوئے ہیں ہنس
رام گوپال نے ایک نعرو لگایا جسے کالی مانتا جسے۔ برجنگ ملی اور چھلانگ مار کر باہر نکل پڑا
یونہی جلوس بڑھتا گیا۔ وہ ہر کمرے میں داخل ہوتے اور پھر باہر نکل کر نعرے لگاتا
لڑکوں کو نکل کر آگے چل پڑتے۔ سب سے آخر میں وہ بنگالی سپرینٹنڈنٹ کے کمرے میں
”علی — مولانا علی“ اللہ داد نے نعرو لگایا۔ بنگالی بابو گھبرا کر باہر نکل آیا اور
جلوس کو دیکھ کر اس کی گھبراہٹ نے مضحکہ خیز صورت اختیار کر لی۔
”ارے یہ کیا گڑبڑ ہے، بھئی۔“ بنگالی بولا۔
”باہر نکلتے صاحب۔“ لڑکے ایک زبان ہو کر چلائے وقت ہو چکا ہے وہ مقابلہ

”اے بدھو آج مسلمانوں کے احتجاج کا دن ہے۔ آج انہیں کفار کو نچا دکھانا ہے۔ بیٹا آج

تمہیں ہماری لاج رکھنی ہے۔ اگر مسلمانوں کے ہوتے ہوئے ”پیڑ“ کا خطاب کسی اور کو مل بھی کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہیں گے۔“ اللہ داد بولا۔

”اتنا کھاؤ آج۔ اتنا کھاؤ کہ اس اسلامی پیٹ کے صحرا میں بندو کے پھلکے رست کے لئے بن جائیں۔“ شفیع نے اپنا ادبی انداز دکھایا۔

”ارے چھوڑو یہ صحرا و ہرا۔“ اللہ داد بولا ”یوں کہہ کہ اتنا کھاؤ اتنا کھاؤ کہ میزے اللہ کے لئے چار آدمی بلانے پڑیں۔ یہ بنگالی بابو کیا یاد کرے گا سلا کہ مسئلے کبھی اگر ٹھہرے بورڈنگ میں۔“

کالج کے بورڈنگ کی رسم کے مطابق ہر سال ایک مرتبہ کھانے کا مقابلہ ہوا کرتا تھا کہ کھانے پر باہر میزیں لگا دی جاتیں۔ تمام امیدوار اپنی اپنی جگہ بیٹھ جاتے۔ درمیان سپرنٹنڈنٹ کی کرسی رکھ دی جاتی تاکہ وہ فیور اور فاول کا فیصلہ کر سکے۔

کچن میں اس روز دو چار اچھے اچھے سالن پکائے جاتے۔ اتنی مقدار میں پکائے جانے امیدواروں کے لئے کافی ہوں کیونکہ مقابلے کے روز ہر امیدوار کوئی سا سالن طلب کر سکتا جب مقابلہ شروع ہو جاتا تو ہر امیدوار کے پاس دو ریفری کھڑے ہو جاتے جو پھلکوں کی تعداد جاتے اور ہرنے پھلکے پر آواز دیتے ”رام گوپال بارہواں۔“ ”لیتا سیاں پندرہواں۔“ درمیان میں بیٹھے ہوئے فشی ہر امیدوار کے نام کے سامنے تعداد لکھتے جاتے۔ ان ریفریوں کے ساتھ مختلف پارٹیوں کے لڑکے کھڑے رہتے تاکہ تعداد لکھنے والے شرارت نہ کریں اور ضابطی پر سپرنٹنڈنٹ کو پکارا جاتا۔ ”پوائنٹ آف شکایت لالہ جی۔“ جو لڑکا اس مقابلے میں سے زیادہ پھلکے کھاتا اسے ”پیڑ“ کا خطاب دیا جاتا اور گلے میں ہار ڈال کر اس کا جلوس نکالا جس کی ساتھ مناسب قسم کے نعرے لگائے جاتے۔

مقابلے کے دن کے لئے باورچی بندو پہلے ہی پھلکے پکا رکھتا تاکہ پھلکوں کی کمی نہ بیچ میں غلغلہ نہ پڑ جائے پھر مقابلے کے وقت بندو۔ رامو، ہرنامہ اور کرشار سوئی میں بیٹھ ہوئے پھلکے سینکے میں مصروف ہو جاتے اور رامو۔ کھمیا اور بڑھا چوکیدار باہر میزوں پر بیچ کرنے کے لئے تیار رہتے۔

مقابلہ شروع ہوا۔ سوئی کی کھڑکیوں اور دروازے سے پھلکوں کی بو چھاؤ شروع ہوئی۔ اہلی کو یوں محسوس ہونے لگا جیسے سوئی اور میزوں کے درمیان سفید کپڑے اوڑھے ہوئے

پھلکا ہر نام سنگھ چنچ ”آٹھ“ اس کے سر پر کھڑا ریفری جلاتا اور پھر اوہر سے رام گوپال شور چا بند ”بندو اوہر پندرہ“ بندو ”پھلکی“ اللہ داد چنچ ساتھ ہی شفیع اور اہلی چیخنے لگتے۔ ”پھلکاری نہ پھلکاری۔“ ستاسٹھ۔ ستاسٹھ۔“ کی آواز سن کر رام گوپال چونک جاتا۔ ارے پھر دفعتاً اسے یاد آتا کہ اللہ داد شفیع اور اہلی کے پھلکوں کا حساب اکٹھا ہو رہا ہے اور ستاسٹھ کا مطلب تھا ستاسٹھ بنا تین یعنی بائیس فی کس۔ اسی قسم کی چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ چاروں طرف سے شہلش رام گوپال اکٹھے اوڑھے ہرنامے۔ علی حیدر کے نعرے گونج رہے تھے اور ہر لحظہ سکور بڑھتا جا رہا تھا۔ مقابلے میں صرف سات امیدوار تھے۔ رام گوپال، ہرنام سنگھ امرت لال، گوچرن سنگھ، ان کے علاوہ مسلمانوں کا ایک گروپ تھا۔ جس میں اللہ داد شفیع اور اہلی تھے۔ مچن میں پانچ چھ میزیں لگی ہوئی تھیں۔ ہر میز پر امیدواروں کے سروں پر ریفری اور لڑکے کھڑے کتنی میں مشغول تھے۔ درمیان میں چھ لڑکے کی حیثیت سے حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جن کے پاس ہی آرام کرسی پر بنگالی بابو سپرنٹنڈنٹ جج کی حیثیت سے بیٹھے تھے۔

تین پیڑ

”ایک سو ستون۔“ مسلمانوں کے گروپ کے ریفری نے آواز دی۔

”علی حیدر۔“ اللہ داد چلایا۔ ”بندو چنچی۔“

”پوائنٹ آف آرڈر۔“ رام گوپال کھڑا ہو گیا۔ ”سپرنٹنڈنٹ صاحب اللہ داد صرف چنچی کھا رہا ہے۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داد دھاڑنے لگا۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

”ٹھہرو، ٹھہرو۔“ بیڑ جی بولے۔ ”چنچی پر کوئی پابندی نہیں۔“

”علی حیدر۔“ اللہ داد غرایا اور رام گوپال میز سے اٹھ کر اندر چلا گیا۔ اس کے جانے کے بعد شفیع اور اللہ داد دیر تک چٹکھاتے رہے پھر آہستہ آہستہ گوچرن نے بھی ہاتھ روک لیا اور سب سے آخر میں ہرنام سنگھ کی طبیعت ہلش کرنے لگی ”علی حیدر۔“ تینوں مسلمان ہیرو ایک سو ستون پر اٹھ بیٹھے اور بورڈنگ والوں پر گویا اوس پڑ گئی۔

”اٹکی یہ فاول ہے یہ مسئلے چنچی سے روٹی کھاتے رہے ہیں یہ اصول کے خلاف ہے“ لیکن ان کی ہریت پر اللہ داد ”علی حیدر“ کا نعرہ لگا کر ان کا منہ چراتا اور بیڑ جی مسکرا کر کہتے ”چنچی کھاتا

اصولوں کے خلاف نہیں۔“ اور اللہ داد پھر سے تازہ دم ہو کر چنگھاڑا۔ ”علی حیدر“

پیڑ کا لقب تو انہوں نے حاصل کر لیا۔ لیکن رات بھر ان تینوں کی بری حالت رہا چارپائیوں پر پڑے وہ دیر تک کروٹیں بدلتے رہے اور پھر اللہ داد اٹھ بیٹھا اور کلن پر ہاتھ رکھ لگانے لگا اور پھر دو گھنٹہ چلا کر بولا۔

”ارے یارو۔ کیوں اپنے آپ کو دھوکا دے رہے ہو۔ نیند تو آج تمہارے باپ کو بھی نہ آئے گی۔ بیکار پڑے ہو۔ آؤ چلو امرودوں کے بلوغ سے امرود توڑ کر لائیں۔ بڑے ہانم ہمارے ہیں۔ تمہاری قسم۔“

صبح سویرے اللہ داد نے پر نیل کے نام ایک درخواست لکھی کہ حضور چھٹی لینے کو آؤ ہمارا ارادہ ہے۔ اور نہ چھٹی نہیں کوئی دلچسپی ہے ازراہ کرم چار آدمی بھیج دیجئے جو ہمیں انکار کالج لے آئیں۔

دوسرے وقت پر نیل اپنی لینڈو میں آیا اس کے ساتھ آصف تھا ”ہیلو“ پر نیل بولا مبارک ہو تمہیں۔ پیڑ بولو کیا حال چال ہے تمہارا۔“ اللہ داد نے اٹھ کر ہاتھ جوڑے ”صبر“ آپ کا دیا سب کچھ ہے صرف اتنی ارج ہے کہ چار دن کے لئے چار آدمی مقرر کر دیئے جائیں ہمیں اٹھا کر گھما پھرا لایا کریں۔“ پر نیل نے ایک قلم لکھ لایا اور پھر ”شائش ویل ڈن“ لکھا رخصت ہو گیا۔

اداس شام

پر نیل کے جانے کے بعد آصف نے ایللی کو اشارہ کیا۔ ذرا یہاں تک چلنا میرے مانو اس وقت اللہ داد اور شفیع اپنی ہی دھن میں لگے ہوئے تھے۔ اس لئے ایللی چپکے سے آصف کے ساتھ چل پڑا۔ آصف کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تو تھی مگر مسکراہٹ میں تازگی نہ تھی۔ اسے ملتے ہی ایللی نے ایک سانس میں کئی ایک سوال کر ڈالے۔

”کل تم کیوں نہ آئے وہ کون تھی جس نے ڈیل اینٹ ماری تھی۔ وہ تمہیں گھور لگا تھی۔ تم سے ہوئے کیوں ہو۔ کیا ہے تمہیں آصف بولو بھی نا۔“

لیکن آصف چپ چاپ کھڑا تھا اس کے ہونٹوں پر کھسیانی مسکراہٹ تھی اور دمک رہا تھا۔

پہر ایللی بھی خاموش ہو گیا اور دیر تک وہ دونوں درخت تلے خاموش بیٹھے رہے۔ ہر چند منٹ کے بعد آصف ایللی کی طرف دیکھ کر بے بسی بھرے انداز سے مسکرا دیا۔

آخر وہ بولا۔ ”سننے لگا“ ایللی اگر میں زہر کھالوں تو تم برا تو نہ مانو گے۔“

”زہر۔“ ایللی نے پوچھا ”آخر کیوں؟“

”یہ نہ پوچھو۔“ آصف نے کہا ”اب زندگی بیکار ہے۔ بے عزتی کی زندگی سے مر جانا بہتر ہے۔“

”اگر میں کھالوں تو کیا کھالوں کے تم۔“ ایللی نے شرارت سے پوچھا ”ہاں۔“ وہ بولا ”کھالوں گا۔“

ایللی سوچ میں پڑ گیا۔ آصف چپ چاپ نہر کے پانی کو گھورنے لگا۔ دور کوئی رہٹ رو رہا تھا۔ سامنے ندی کا پانی گویا چلتے چلتے رک گیا تھا۔ ارد گرد پھیلے ہوئے کھیتوں میں پودے سر جگائے کھڑے تھے اور وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔

وہ یونہی خاموش بیٹھے رہے۔ حتیٰ کہ سورج مغرب میں جا ڈوبا اور آسمان پر سرخ دریاں بہل گئیں اور رہٹ رو رو کر چپ ہو گیا۔ کتنی اواس شام تھی وہ۔

ایللی اٹھ بیٹھا ”نہیں“ وہ بولا ”ابھی تم زہر نہ کھاؤ۔“

”کیوں۔“ آصف نے پوچھا ”کیوں نہ کھاؤں۔“

”بس ابھی نہیں کہہ جو دیا ہے میں نے۔“

”اچھا۔“ آصف نے آہ بھری۔ ”پھر میں کیا کروں۔“

”انتظار کرو۔“ ایللی بولا۔

اچھا کہہ کر آصف خاموش ہو گیا اور پھر بورڈنگ میں جانے کی بجائے شہر کو چل پڑا ”میں لب چتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ایللی بولا ”کل پھر ملیں گے۔“

ساری رات ایللی سوچتا رہا کہ آصف زہر کھانے پر کیوں آمادہ تھا وہ کوئی بات تھی جس کی وجہ سے دھکی تھا وہ لڑکی کون تھی وہ چلا کیوں رہی تھی اس روز کیا آصف کو اس سے محبت تھی۔ پھر اس نے آصف کی بیٹھک پر اینٹ کیوں پھینکی تھی اور چلا کیوں کھا تھا۔ سامنے بلاؤ لے کر انہیں محبت تھی تو۔ لیکن محبت ایسے تو نہیں کی جاتی محبت تھی تو پھر زہر کھانے کی کیا

ضرورت تھی۔ انہیں خیالات میں کھویا ہوا وہ سوچتے سوچتے سو گیا۔

آصف

آصف ایک خاموش اور شرمیلا نوجوان تھا۔ نہ جانے اس کی بے پناہ جلالت کا کیا راز تھا شاید اس کی وجہ اسکی خاموشی اور شرمیلانہ پن ہو یا شاید اس کا سفید رنگ جھکی جھکی آنکھیں رخساروں پر جھلکتی ہوئی سرخی کو اس سے کوئی تعلق ہو بہر صورت یہ امر مسلمہ ہے کہ لڑکیوں اس کے لئے بے قرار رہتی تھیں۔ قرب و جوار میں رہنے والیاں بار بار کوٹھے پر آ کر کہ شاید ایک نظر آصف کو دیکھنا نصیب ہو جائے۔ کئی ایک تو گھنٹوں کوٹھے پر شعلی رہتی۔ کالج جانے یا وہاں سے لوٹنے کا وقت ہوتا تو وہ گلی کی کھڑکیوں میں آکھڑی ہوتیں۔ کئی ایک چھپ کر دیکھتیں۔ کئی ایک ایسی بھی تھیں جو بے پروائی کے پردے میں اپنی نمائش کرنے ایک نظر آصف انہیں دیکھ لے اور چند ایک تو دیوانہ وار چتیں اٹھالیتیں یا کھڑکیوں سے شعلی لڑکیوں نے کئی بار اعلانیہ طور پر اسے سلام بھی کئے تھے۔ اس کے علاوہ اعلانیہ بات نہ تھی۔ مگر گلی میں چلتے ہوئے آصف نے کبھی گردن نہ اٹھائی تھی۔ وہ چپ چاپ زمین پر گناؤں جلدی جلدی گلی میں سے گزر جانے کی کوشش کرتا تھا۔

کوٹھے پر اس کا رویہ مختلف ہوتا تھا وہ اوپر چڑھتے ہی نیچی نظروں سے چھتوں کا جائزہ لیتا اور بزرگ صورت مرد یا عورت قرب و جوار میں نہ ہوتے تو وہ لڑکی پر بھرپور نظر ڈالتا اور ہنس سے سامنے سے ہٹ جاتا غالباً اس کی یہ بھرپور نظروں کی تمام تر مشکلات کی وجہ تھی۔ اسے لڑکیوں سے دلچسپی ضرور تھی۔ لیکن اسے ہر وقت یہ ڈر لگا رہتا کہ لوگ کیا کہیں والدین کیا سمجھیں گے نہ جانے والدین کو خوش کرنے کے لئے یا اپنے زہد و تقویٰ کا راز جانے کے لئے۔ یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ وہ اپنی برتری کا عملی طور پر اظہار کرنا چاہے اس کی وجہ کچھ بھی ہو وہ اکثر کوٹھے سے اتر کر گلی کی طرف جاتا اور کسی نہ کسی شکایت کرتا "دیکھ لو اماں آج اس نے مجھے سلام کیا ہے۔" اور اس کی اماں نہ جانے کس طرح یا محنت کی وجہ سے جھٹ ٹوکر کو بھیج کر لڑکی کے والدین تک شکایت پہنچا دیتی۔ ایسی شکایت محلے کی کئی ایک لڑکیوں کے والدین تک پہنچ چکی تھی اور وہ سب اس عادت سے تلائ تھیں۔ والدین تو پہلے ہی اپنی بچیوں کی معصومیت پر یقین رکھتے

خواہند ہوتے ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ان کی اپنی اولاد بے حد معصوم اور پاکباز ہے البتہ دوسروں کے بچے انہیں گمراہی کی طرف راغب کرنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہیں۔ آصف کی ان شکایات کا نتیجہ یہ ہوا کہ لڑکیوں نے آنسو بہا بہا کر والدین کو یقین دلا دیا کہ ان کا کوئی قصور نہیں اور محلے والوں کے دلوں میں آصف کے خلاف بغض پیدا ہو گیا۔

اگلے روز جب وہ کالج میں ملے تو آصف کے چہرے پر حقیقی انہماک کی جھلک تھی اور اس کے جسم میں کفنگی تھی۔ ایلی کو دیکھ کر وہ حسب معمول اس کی طرف بڑھا اور ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھ کر بولا "تسلیم۔" ایک ہی نظر میں ایلی کو محسوس ہو گیا کہ یہ آصف کل والا آصف نہیں تھا وہ آصف جو تین گھنٹے یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے پتھر کا بنا ہو۔

"زہر تو نہیں کھایا تم نے۔" ایلی نے سنجیدگی سے پوچھا۔

"نہیں۔" وہ بولا "تم نے جو کہا تھا انتظار کرو۔"

"تو انتظار کر رہے ہو۔" ایلی نے اسے چھیڑا۔

"نہیں۔" وہ بولا "اب اس کی ضرورت نہیں۔ آؤ اور تھائی میں گھومیں یہاں لڑکے آ جاتے ہیں۔ اکیلے میں بتاؤں گا تمہیں۔" اور وہ دونوں میدان کی طرف نکل گئے۔

سفینہ

آصف نے بات شروع کی۔ "اس لڑکی نے مجھے بہت تنگ کیا ہے ایلی۔" آصف نے مکرانے ہوئے کہا "دہی جو اس روز مقابل کے چوہارے میں کھڑی تھی۔ جس روز تم آئے تھے۔ جس نے روشن دان پر اینٹ پھینکی تھی۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہو گیا ہے۔ ایلی کچھ سمجھ میں نہیں آتا کہ وہ عام لڑکیوں کی طرح کوٹھے پر چڑھ کر ہمارے گھر کی طرف جھانکا کرتی تھی۔ میں نے وہ ایک مرتبہ اماں کی معرفت شکایت بھی بھجوائی۔ لیکن اس سے کوئی فائدہ نہ ہوا۔ اماں نے گھنٹوں اعلانیہ کوٹھے پر ٹھہرنا شروع کر دیا۔ سارا دن کوٹھی پر دھوپ میں کھڑی رہتی۔ خیر وہ دن بھی گزر گئے پھر گرمیاں آئیں تو ہم کوٹھے پر سونے لگے۔ ان کے کوٹھے پر ہماری طرح پردے بہت چھوٹے چھوٹے ہیں۔ صبح سویرے وہ اٹھ بیٹھتی اور آنکھوں پر ہاتھ رکھے ہمارے کوٹھے کی طرف منہ کر کے بیٹھ رہتی۔ جب تک میں نہ جاگتا وہ اسی طرح بیٹھی رہتی پھر جب میں بیدار ہو جاتا تو وہ منہ سے ہاتھ ہٹاتی اور مجھے سلام کر کے مسکراتی۔ ایسے معلوم ہوتا

جیسے اس نے صبح سویرے مجھے دیکھنے اور سلام کرنے کی قسم کھا رکھی تھی۔ مجھے دیکھنے سے پہلے منہ سے ہاتھ نہ ہٹاتی تاکہ کوئی اس کے رویو نہ آئے۔ گھر والوں نے اس بات پر اسے لہجہ مگر اپنی ہٹ سے باز نہ آئی۔ آخر گھر والے ہار گئے۔

اس کی یہ کیفیت دیکھ کر میرے تو اوسان خطا ہو جاتے تھے۔ محلے والے کیا کہیں گے۔ سوچتا رہتا۔ محلے کے لوگوں کو دیکھ کر سر جھکا لیتا۔ مجھے شرم محسوس ہوتی۔ ایسے محسوس ہوتا ہے کہ مجھ پر ہنس رہے ہوں۔ میرا مذاق اڑا رہے ہوں۔ لیکن اب۔ اب نہ جانے اسے کیا ہوا ہے۔ گویا وہ اپنے بس میں نہیں رہی اب اسے ہسٹریا کا دورہ پڑتا ہے یا وہ پاگل ہو چکی ہے۔ ایک دن سے اس کی آنکھیں سرخ ہیں۔ منہ سوجا ہوا ہے اور اسے قطعی پروا نہیں کہ وہ کیا رہی ہے اسے کسی بڑے بھوٹے کی پروا نہیں۔ وہ کوشے پر چڑھ کر با آواز بلند میرا نام لے کر پکارتی ہے۔ آوازیں دیتی ہے۔ آصف آصف جی۔ لوگ سن کر ہنستے ہیں۔ میرا مذاق اڑاتا ہے۔ پھر وہ مقابل کے چوہارے میں آجاتی ہے اور کھڑکی میں کھڑے ہو کر با آواز بلند باتیں کرتی ہے۔ اگر میں سامنے نہ جاؤں تو پتھر پھینکتی ہے۔ ”آصف نے آہ بھری اس کی آنکھیں ڈبڈبائی اور وہ خاموش ہو گیا۔ ایلی یہ رویہ اوسن کر خوشی کی ایک لہر محسوس کر رہا تھا۔ کتنا خوش فہم ہے اُف۔ وہ سوچ رہا تھا۔ جسے کسی کی محبت حاصل ہے۔ جسے دیکھنے کے لئے کوئی منہ پر ہاتھ رکھے بیٹھی رہتی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ آصف اس بات پر آبدیدہ کیوں ہو رہا ہے اس بات پر زہر کھانے کا مطلب۔

”اور۔۔۔ اور۔“ آصف نے پھر بات شروع کی۔ ”اس نے اپنا نام بھی بدل لیا۔ اب وہ سفینہ کی بجائے اپنے آپ کو آصفہ کہتی ہے۔ آصفہ توبہ کتنی جرات ہے۔ لیکن اب چلی گئی ہے۔“ آصف نے کہا ”اس کے والدین زبردستی اسے لے گئے ہیں۔ نہ جانے کدہ تاکہ بدنامی نہ ہو۔ اللہ کرے وہ کبھی واپس نہ آئے۔

”کیا واقعی اسے تم سے محبت ہے۔“ ایلی نے حسرت ناک انداز سے پوچھا۔ آصف ہنسنے لگا ”مجھے کیا معلوم۔“ وہ بولا کہ محبت کیا ہوتی ہے اگر یہی محبت ہے تو بچائے توبہ کتنی بدنامی ہوئی ہے۔ کتنی رسوائی۔ ”کیا تمہیں بھی اس کا خیال ہے؟“ ایلی پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ وہ متبسم نگاہوں سے ایلی کو دیکھنے لگا۔ اس کی نگاہ میں تعجب کی

تھی۔

”کیا وہ خوبصورت ہے آصف؟“ ایلی نے پوچھا۔

”خوبصورت“ آصف سوچنے لگا اور پھر ہنس کر بولا ”یہ کبھی خوبصورت دکھائی دیتی ہیں۔“

اس روز ایلی آصف کی باتوں کے متعلق سوچتا رہا۔ کس قدر عجیب باتیں تھیں آصف کی۔ شرف سے کس قدر مختلف۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر محبت کے متعلق ہر ایک کا نظریہ مختلف کیوں تھا اور محبت کی حقیقت کیا تھا۔ وہ تو اس بات پر فخر کیا کرتا تھا کہ اسے تسلیم سے محبت ہے اور محلے والوں کے سامنے اسے تسلیم کرنے میں ذرا نہ ہچکچاتا تھا۔ لیکن آصف۔

دن بھر ایلی بورڈنگ میں بیٹھے ہوئے سوچتا رہا۔ اس کے سر پر آموں کے درختوں کی ٹہنیاں ہوا میں جمی ہوئی رہیں۔ کھیت گویا بال پھیلانے سوگ مناتے رہے اور دور رہٹ کر ہاتھ رہا۔ یونہی دوسرے شام ہو گئی اور مغرب میں بادل کسی ان جانے غم سے سلگنے لگے۔ آگ کے شعلے لپکنے لگے۔ ایک اضطراب۔ دکھ بھری بے قراری۔ خاموش غم فضا سے چھنتا رہا۔

بادلوں کے ان ٹکڑوں میں تسلیم اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کی ٹیس ابھی ہوئی تھیں۔ پھر دفعتاً ایک حرکت سی ہوئی اور تسلیم نے گول مثول صورت اختیار کر لی۔ جیسے ٹھنڈی ہو۔ پھر سبز ٹھنڈی کے پٹ کھل گئے اور چہم سے کسی نے جھانکا۔ ”مجھے تم سے ڈر آتا ہے ایلی۔“ ایک متبسم آواز سنائی دی اور پٹ پھر سے بند ہو گئے۔ وہ چونک پڑا۔ توبہ ہے۔ وہ زیر بولا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرتے لگا۔ لیکن جلد ہی ایک بدلی نے کرن کنیا کا روپ دھار لیا۔ ٹک ٹک ٹک قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔ دو بڑی بڑی سیاہ کتیاں ڈول رہی تھیں۔ دور کوئی بانسری بجا رہا تھا۔ کتنی اواس تھی۔ وہ شام۔ اواس اور خاموشی۔

پگلی بہن

اگلے روز تسلیم کے گھر جاتے ہوئے وہ سوچ رہا تھا اگر تسلیم کو بھی کچھ ہو جائے جیسے آصف کو ہوا تھا اور وہ کھڑکی سے جتن اٹھا کر سامنے آکھڑی ہو جیسے اس روز آصفہ کھڑی تھی اور پھر اسی طرح کے ”تم سامنے کیوں نہیں آتے تو کیا زندگی بن جائے۔ یا جب وہ وہاں پہنچے تو تسلیم آنکھوں پر ہاتھ رکھے بیٹھی ہو اور اسے دیکھ کر ہاتھ اٹھا کر مسکرائے ”سلام“ اور پھر ہنس کر اندر

جلنے اس قدر خاموشی کیوں چھائی ہوئی تھی۔
 ”حی کی بات سنی تم نے؟“ آٹا نے بات شروع کی ”حد ہو گئی اس کا نام الماس ہے۔ نئی نئی

آئی ہے۔ یہاں اچھی خاصی ہے۔ نو جوان ہے۔ نہ جانے حی نے کیا کر دیا ہے۔ بچاری نے
 دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ اس کے جواری میراثی بھوکے مر رہے ہیں اور حی کے خون کے پیاسے ہو
 رہے ہیں۔ لیکن یہ کسی سے ڈرے۔ توبہ کر۔ ڈر تو اس کی گھٹی ہی میں نہیں۔ سارا دن وہاں جا
 کر بیٹھ رہتا ہے۔ وہ اس کی جراثیں دھوتی ہے پتلونیں استری کرتی ہے۔ چائے بنا کر پلاتی
 ہے۔ عجیب جذبہ ہے محبت کا۔“ آٹا ہنسنے لگا۔ دھندہ کرنے والیوں کو بھی نہیں چھوڑا۔ کوئی
 معصوم نہیں ہے وہ اناڑی نہیں۔ سب کچھ سمجھتی ہے۔ جانتی ہے کہ ان نکوں میں تیل نہیں۔
 حی محض وقت کٹی کر رہا ہے۔ پھر بھی وہ فریب کھائے جاتی ہے۔ عجیب بات ہے۔“ آٹا ہنسنے
 لگا۔ ”آؤ آج ہمیں سیر کرالائیں“ آؤ۔“

جب وہ چلنے لگے تو دفعتاً اوپر سے نیم کی آواز آئی ”بھائی جان میں آ رہی ہوں۔“
 ”تو پھر میں کیا کروں۔“ آٹا نے ہنس کر کہا۔

”میں آج رہی ہوں۔“ وہ بیڑھیاں اترتے ہوئے بولی۔

”خواہ مخواہ مجھ سے کلام ہے کیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ دروازے میں کھڑی ہو گئی۔

”تو پھر میں کیا کروں۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تو پھر چلا کیوں رہی تھی تو۔“

”بس چلا رہی تھی۔ یونہی۔“

”اچھا شور نہ مچا ہم جا رہے ہیں۔ آؤ ایللی۔“

آٹا بات کر رہا تھا تو چھوٹی نیم اس کی پشت کے پیچھے سے یوں ہونٹ ہلا رہی تھی جیسے کچھ
 کہہ رہی ہو جیسے کوئی پیغام دے رہی ہو۔ لیکن ایللی کی سمجھ میں کچھ نہ آیا۔

جب آٹا چلنے لگا تو وہ پھر چلائی۔ ”کتنی ہوں کوٹھے پر بلا رہے ہیں آپ کو۔“

”بلا رہے ہیں کیوں۔“

”کیا معلوم۔“ وہ پھر ہونٹ ہلا کر ایللی کو اشارہ کرنے لگی۔

بھاگ جائے۔ صرف ایک مرتبہ صرف ایک بار۔ روز نہ سہی صرف ایک بار۔ صرف ایک بار۔
 صرف ایک بار کا ورد کرتا ہوا وہ ان کے گھر پہنچ گیا اور وہاں پہنچ کر دفعتاً اسے خیال ہوا کہ
 منزل پر پہنچ چکا ہے۔ مگر منزل ویران پڑی تھی۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ بیڑھیاں غالی تھیں۔
 تک وہ وہاں کھڑا مایوس و محروم نگاہوں سے دیکھتا رہا۔ پھر اس کا جی چاہا کہ چپکے سے لوٹ لے۔
 نہروالی کوٹھی میں آموں کے درختوں تلے بیٹھ کر بیٹھ کر روئے۔ روتا رہے حتیٰ کہ اس کا
 جسم کے بند بند میں وہ چلچلاتا ہوا درد ختم ہو جائے جو ان دنوں وہ محسوس کرنے لگا تھا۔

”ہائیں۔ تم ہو ایللی۔“ حی اسے دیکھ کر چلایا ”یہ کیا صورت بنا رکھی ہے۔ جیسے پندے
 آئے ہو۔ آؤ۔ آؤ۔ تمہارا دل بے ملاؤں۔ اس کے پاس جا کر سب دکھ بھول جاتے ہیں۔ تم
 نہیں گھبراؤ نہیں۔ اس کے یہاں کوئی نہیں آتا جاتا۔ اس نے دھندہ چھوڑ رکھا ہے۔ کیسے کہ
 دھندہ۔ ہمارے عشق میں مری جا رہی ہے اور ایللی ایمان سے وہ تو اونی طور پر گھریلو عورت ہے
 خالص پدمنی۔ اس کے پاس بیٹھ کر ایسے محسوس کرتا ہوں۔ جیسے ماں کی گود میں بیٹا ہوں۔
 آرام و سکون ملتا ہے وہاں۔ آؤ۔ آؤ۔ آؤ لے چلوں تمہیں۔“

”آہ ایللی۔“ آٹا بابل بھاتا ہوا باہر نکلا۔ ”بھئی اب تو آتے ہی نہیں تم اس طرف۔ کنے
 نئے مشاغل پیدا کر لئے ہیں اور وہاں۔“

”کیوں ایللی چلو گئے؟“ حی نے آٹا کی بات کو کاٹ کر کہا۔

”نہ۔ نہ بھئی۔“ آٹا نے حی سے کہا ”اس پر تو کرم ہی کر۔“ اس پر حی منہ بنا کر چلا
 اور ایللی آٹا کے ساتھ اکیلا رہ گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ حی اسے وہاں لے جائے جہاں
 کی آغوش کا سا سکون میسر ہوتا ہے۔ جہاں وہ ہو جو محبت کے لئے دھندہ چھوڑنے کی جان
 رکھتی ہے۔ جو روپوں کی جھٹکار کو محبت پر قربان کر سکتی ہے۔

”کس سوچ میں کھوئے ہوئے ہو آج؟“ آٹا بولا ”بہت اواس ہو۔“

جواب میں ایللی ہنس دیا ”نہیں تو اواس تو نہیں۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”تو کوئی بات سناؤ۔“ آٹا نے کہا۔

”کوئی بات ہو بھی۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ آٹا مسکرا دیا اور پھر دانت صاف کرنے لگا۔

ایللی نے چوری چوری اوپر کی طرف نظر دوڑائی مگر وہاں کوئی پلو دکھائی نہ دے

دینے لگی تھی جیسے ایک ویرانہ ہو۔ طویل و عریض ویرانہ۔ بے مقصد پھیلاؤ۔ ایک اذیت وہ ٹھراؤ چاروں طرف بٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ اس صحرا میں وہ خود ایک ناؤ تھا۔ جس کے گرد ریت کی لہریں بھٹنوں کی طرح ٹانچ رہی تھیں۔

جب بھی ایللی کی توجہ اپنی جانب مبذول ہوتی تو وہ اس ٹھراؤ کو شدت سے محسوس کرتا۔ لیکن جب اس کی توجہ ریت کی لہروں کی طرف منعطف ہوتی تو اسے حرکت کا احساس ہوتا۔ جب وہ بسز پر لینا تو اس کا خیال نیم کے پیغام پر مرکوز ہو گیا۔ نہ جانے نیم کا مطلب کیا تھا۔ مطلب تھا بھی یا محض تفریح یا کچھ اور پھر بائیسکل رکھنے سے کیا مقصد ہو سکتا ہے اور اسے واپس لانے کی سکیم سے کیا فائدہ پہنچ سکتا ہے۔ دیر تک وہ اس پنگی لڑکی کی باتوں پر غور کرتا رہا۔ لیکن کتنی نہ کلی۔ وہ سوچ سوچ کر ہار گیا۔ حتیٰ کہ اس کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز کئی دفعہ اسے خیال آیا کہ سائیکل وقت مقررہ پر لانے کی آخر کیا ضرورت ہے۔ کسی وقت بھی لے آؤں گا۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ پھر اس کے ذہن میں امید کی ایک کرن روشن ہو جاتی۔ شاید فرق پڑ جائے پھر جلد ہی وہ کرن بجھ جاتی اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ لیکن اس نکلش کے باوجود وہ مقررہ وقت پر آٹا صاحب کے گھر جا پہنچا۔ وہاں پہنچ کر اس نے چوبارے کی کھڑکیوں پر نگاہ دوڑائی۔ میزھیوں کی طرف دیکھا مکان گویا ویران پڑا تھا۔ بے دلی سے اس نے دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے؟“ بڑھیا نے آواز دی۔

”میں ہوں ایللی۔“ وہ چلایا۔

”کوئی گھر نہیں ہے نہ آٹا ہے نہ جی۔“ بڑھیا نے رونے کے انداز میں کہا۔

”اپنا سائیکل لینے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”سائیکل؟“ بڑھیا خاموش ہو گئی۔ پھر مدھم سی سرگوشی سنائی دی۔ ”سائیکل ساتھ والے گھر میں کھڑا ہے۔ یہ جو ادھر ہے۔ پنواڑی کے پیچھے والا سمجھ گیا نا۔ لے لے جا کر ادھر سے۔“

یہ انتہائی اتنی بے رخی تو اجنبی کے ساتھ بھی نہیں برتی جاتی۔ خیر بڑھیا کی عادت ہی ایسی تھی۔ لیکن وہ نیم کیا ہوئی۔ کم از کم اسے تو موجود رہنا چاہئے تھا، کچھ دیر تو وہ ڈیوڑھی میں کھڑا سوچتا رہا۔ اس امید پر کہ شاید ابھی دروازہ کھل جائے اور نیم بھاگے۔ لیکن دروازہ بند ہی رہا۔ پھر مدھم مدھم ہو گیا۔ اور سوچنے لگا۔ اب کون پتہ لگائے کہ وہ مکان کونسا ہے۔ جس میں

”اس وقت نہیں۔ ہم جا رہے ہیں۔“ آٹا نے گھور کر کہا۔

”اچھا تو اچھے بھائی جان ہمیں ایک پان لے دو۔“

”اوہ۔۔۔ تو یہ بات ہے۔“ آٹا ہنسنے لگا۔ ”خود لے لیتا یہ لو پیسے۔“

”ہم تو پان لیں گے پیسے نہیں۔“ وہ لاڈ سے بولی۔

”پاکل ہو گئی ہے کیا۔“ آٹا ہنسا۔

”ہاں۔“ نیم نے سنجیدگی سے کہا ”پاکل ہو گئی ہوں۔“

آٹا قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”یہ بہنیں بھی بہت مہنگی پڑتی ہیں۔ اچھا میں لاتا ہوں پان۔“ بھاگ نہ جاتی۔

”نہیں بھاگتی۔“ وہ مسکرائی۔

آٹا باہر نکلا تو وہ ایللی کے قریب تر ہو کر بولی ”اپنا بائیسکل نہ لے جانا بیس چھوڑ چلاؤ۔“ شام کو تین بجے آکر کتا بائیسکل دو۔“ اس نے ایللی کی طرف یوں دیکھا۔ جیسے وہ ایک بچہ ہو۔ روز پہلے دن ایللی نے محسوس کیا کہ وہ منہ سی معصوم بچی ایک مکمل عورت تھی جس کے پاس کئی آغوش لاور چھپی ہوئی تھیں۔ یہ کہہ کر وہ اوپر کی طرف بھاگی۔

”ہائیں۔“ ایللی چلایا ”اور وہ پان۔“

”پان۔“ وہ ہنسی۔ ”میں نہیں کھاتی پان وان۔ نہ بھی۔“

عین اس وقت آٹا داخل ہوا۔ ”ہائیں چلی گئی اور یہ پان۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا۔

ہی۔ یہ بہنیں بالکل ہی پنگی ہوتی ہیں۔“ اور وہ پان منہ میں ڈال کر ہنسنے لگا۔

”سائیکل لے لو چلیں۔“ آٹا نے ایللی سے کہا۔

”نہیں۔“ ایللی نے ڈرتے ہوئے جواب دیا۔ ”میں ہی پڑا رہے گا کل لے لوں۔“

وقت۔۔۔۔۔ ”اچھا یوں ہی سی۔“ آٹا نے بے پرواہی سے کہا اور وہ دونوں چل پڑے۔

اتنی ساری

اس روز جب ایللی بورڈنگ میں پہنچا تو وہ بے حد تھکا ہوا تھا۔ کئی ایک دنوں سے لگاتار نام سلور اس کے بند بند میں چوبیسوں کی طرح رینگ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ وجود ایک تکلیف دہ چیز ہو۔ اس کے گرد نیلا آسمان روز بروز پھیکا پڑتا جاتا تھا اور دنیا بالکل

شعلوں کی طرح اسے چاٹنے لگے۔ اس کے اوسان خطا ہو گئے۔ آنکھوں تلے دھند چھا گئی۔
 گورے بچے مجسم چرے۔ سیاہ ڈولتی آنکھیں۔ لہراتی ہوئی چوٹیاں اس سے ٹکرائیں۔ پھر دفعتاً
 نیم نیم کا شور بلند ہوا اور وہ سب بھاگیں اور ایک مقام پر یوں گڈمڈ ہو گئیں۔ جیسے جمناسٹک
 گروپ دفعتاً ایک نئی ترتیب میں تشکیل ہو جاتا ہے۔ ”نیم نیم“ وہ کسی پر جھکی ہوئی چلا رہی
 تھیں۔ پھر وہ کسی کو تھمتی ہوئی ایلی کی طرف بڑھیں اور ایلی رنگین آنچلوں، گوری گوری
 ہانپوں، ریشمی چوڑیوں اڑتی ہوئی خوشبو دار لٹوں اور دلنواز قہقروں کے انبار میں دب گیا۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو اسے۔“ وہ ایلی کو لٹکار رہی تھیں ”سنہیلو اپنی پیاری کو اب پکڑ بھی لو۔“
 کئی ایک گوری ہانپیں اس کی طرف لپکیں اور بلاخرد و بازو اس کے ہاتھوں میں تھما دیئے گئے۔
 ایک قہقروں کا گونجا اور پھر وہ سب ہنستی ہوئی اس زینے کی طرف بھاگیں جو صحن کے ایک کونے سے
 کونے کی طرف چلا گیا تھا۔ زینے پر رنگین آنچل لہرائے قہقروں کی آوازیں گونجیں اور پھر
 خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے دیکھا کہ وہ سفید سفید بازو تھمتے تن تھما کھڑا ہے اور فرش پر رنگین
 کپڑوں کی ایک گٹھڑی پڑی ہے۔ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ ان سفید بازوؤں کو کیا کرے اور
 اس گٹھڑی کو کس طرح کھولے ”نیم نیم“ اس نے بازوؤں کو جھنجھوڑا۔ ”نیم اوھر دیکھو۔“ اس
 نے گٹھڑی کو کھولنے کی کوشش کی مگر گٹھڑی اور بھی سٹ گئی۔ وہ اس بند گٹھڑی سے گویا کشتی
 لڑنے میں مصروف ہو گیا۔ مگر اس کی کوشش کا نتیجہ صرف یہ ہوا کہ گٹھڑی کے پلو اور بھی لپٹ
 گئے۔ حتیٰ کہ وہ بازو بھی کیس گم ہو گیا اور وہ گٹھڑی اس کے قدموں میں کپڑوں کا ایک ڈھیر سا بن
 کر رہ گئی۔ ”نیم نیم“ وہ چلایا مگر کوئی جواب نہ ملا ”نیم۔۔۔“ اوپر سے بڑھیا کی آواز سنائی
 دی۔ اس نے گھبرا کر اوپر کی طرف دیکھا۔ تڑپ کر وہ گیند اس کے ہاتھوں سے پھسل کر نکل گئی۔
 ایک ساعت کے لئے زینے میں رنگین پلو لہرایا پھر کونٹے سے ایک سرخ چرے نے اس کی طرف
 مڑ کر دیکھا جیسے وہ بتا کا بنا ہوا ہو پھر اس مکان پر موت کا سکوت چھا گیا۔ والانوں کے خاموش
 کونے گویا ہر نکل آئے اور اس پر ہنسنے لگے۔ اس کا تسخیر اڑانے لگے۔ ”تم تم“ اور کونٹے کے
 پودے جھک جھک کر اس کی طرف دیکھنے لگے ”بیچارہ۔ بیچارہ۔“

دفعتاً اس نے محسوس کیا کہ اس کا راز کھل چکا ہے۔ وہ سب جان گئی ہیں کہ وہ کچھ بھی
 نہیں۔ ایک گٹھڑی تک کو نہیں کھول سکتا۔ دو بازوؤں کو نہیں سنہیل سکتا۔ بیچارہ اس نے
 محسوس کیا کہ وہ سب والانوں کی دیواروں کے پیچھے کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں اور اوپر کونٹے پر نیم

بائیکل پڑا ہے۔ چھوڑو بائیکل لیکن اس نے محسوس کیا کہ وہ تھکا ہوا ہے اور اتنی دور نہیں
 کوٹھی تک واپس پیدل جاتا۔ اس خیال پر وہ پنواڑی کی دوکلن پر جا کھڑا ہوا۔ ”کیوں صاحب
 بولا“ آپ کے پچھلے مکان کی طرف کونسا راستہ جاتا ہے۔“
 ”یہ ہے۔“ پنواڑی نے قریب ہی ایک ڈیوڑھی کی طرف اشارہ کیا۔

”انہوں نے کہا ہے۔ میرا بائیکل وہاں رکھا ہے۔ اس مکان میں کون رہتا ہے؟“ اس نے
 پنواڑی سے ملتی جلتی انداز سے پوچھا پنواڑی نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا پھر بولا ”مگر ایلی
 رہتا خلی پڑا ہے۔“

جھجکتے ہوئے اس نے ڈیوڑھی سے اندر جھانکا۔ اندر کوئی دکھائی نہ دیا۔ آواز تک
 آ رہی تھی۔ پھر جرات کر کے وہ اندر داخل ہو گیا۔ صحن کے عین درمیان میں سائیکل کھڑا
 اور مکان ویران پڑا تھا۔

مکان کے درمیان ایک وسیع صحن تھا۔ جس کے ارد گرد چاروں طرف والان بنے ہوئے
 تھے۔ جن میں بہت سے دروازے اور فراخ کھڑکیاں تھیں۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے سائیکل
 طرف بڑھا اور اسے شینڈ سے اتارنے لگا۔ جب وہ اسے کھینٹنے لگا تو دفعتاً چاروں طرف والانوں
 سے کئی ایک جوان لڑکیاں جھانکنے لگیں۔ وہ سب ہنس رہی تھیں۔ مسکرا رہی تھیں۔ پھر وہ
 والانوں سے نکل کر باہر صحن میں آگئیں اور ان کی آن میں اس صحن میں رنگین آنچل لہرائے
 لگیں۔

بیچارہ

”لے جاؤ بائیکل“ ایک پتلی لمبی لڑکی آگے بڑھ کر بولی۔
 ”کھڑے کیا دیکھ رہے ہو؟“ دوسری نے کولہوں پر ہاتھ رکھ کر اسے ڈانٹا اور پھر ہنس پڑی۔
 ”یہ ہے کون؟“ ایک اور چمک کر بولی۔

”پوچھو نیم سے۔“ عقب سے ایک شوخ آواز آئی اور وہ کھلکھلا کر ہنسی۔
 چاروں طرف سے ان لڑکیوں نے گویا ایلی پر یورش کر دی۔ خوشبو کا ایک ریلو لیا گیا
 اڑتے ہوئے آنچل۔ اس کی طرف لپکے جیسے کالے ناگ زبانیں نکالے جھپٹ رہے ہیں۔
 سے ہالی کا سر جسم سے الگ ہو کر فضا میں اڑا جیسے بارود کا بنا ہوا ہو۔ رنگین خوشبو کا

مایوس و محروم کھڑی ہے۔ اور اس کا چہرہ جذبہ تحقیر سے سرخ ہو رہا ہے۔ صحن میں پلاٹا سائیکل سرک کر پرے ہٹ ہٹ گیا۔ جیسے وہ اپنا آپ اس کے حوالے کرنے کے لئے تیار ہو۔ ایلی کی پیشانی پر پینہ آگیا اور وہ سائیکل اٹھا کر بھاگا۔ بورڈنگ کی طرف جاتے ہوئے اسے اپنی بزدلی اور حماقت کا احساس ہوتا اور محسوس کرتا کہ وہ کچھ بھی نہیں۔ اتنا اچھا موقع کے باوجود وہ کچھ نہ کر سکا۔ وہیں اتنی لڑکیاں تھیں۔ مگر وہ کسی کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھا تھا حتیٰ کہ وہ نیم کی شکل بھی نہ دیکھ سکا۔ اس کے دل میں اس واقعے کی یاد کانٹا بن کر چبھ رہی تھی۔ اس طرح وہ واقعہ اس کے لئے ایک تلخ اور خوشگوار واقعہ بن گیا۔ ”بیچارہ۔ بیچارہ۔ بیچارہ۔ سائیکل کا فری ویل چلا رہا تھا اور سڑک پر دھندلی اشکال اس کا منہ چڑا رہی تھیں۔ اس واقعہ کے بعد مدت تک ایلی کے آغا کی گھر جانے کی جرات نہ ہوئی۔ جب بھی آغا مکان کے متعلق اسے خیال آتا تو وہ محسوس کرتا کہ اس کا راز فاش ہو چکا ہے، اس کو پچھنے کی بات نہ ہو۔ نوجوان لڑکیاں چوباروں میں کھڑی اس پر ہنس رہی ہیں۔ اس پر انگلیاں اٹھا رہی ہیں ”وہی ہے وہی۔“ اس خیال کے آتے ہی اسے پینہ آ جاتا۔

کھلاڑی

پھر اتفاق سے کالج میں ایک نئی تحریک شروع ہو گئی، جس نے ایلی کی توجہ کو جذب کر لیا۔ یہ تحریک ایک ڈرامہ کھیلنے کی تحریک تھی۔ مگر اس تحریک کی ابتدا انوکھی تھی اور اس کی تمام ذمہ داری اللہ داو پر عائد ہوتی ہے۔

اللہ داو فطری طور پر ایک مسخرو واقع ہوا تھا اور اس کا مذاق اس قدر سنجیدگی کا پہلو لے رہا تھا کہ انسان کو بے اختیار ہنسی آ جاتی مثال کے طور پر کالج میں اس کا داخلہ بھی انوکھے انداز سے ہوا تھا۔ ایک روز چادر باندھے ایک تھیلا سی قیص پینے اور شانے پر ایک بڑا سا روئل ڈالے گا۔ لڑکیاں کی کپاؤنڈ میں کھڑا حسرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا کہ اتفاق سے پر نپل اس طرف سے گزرا پر نپل اسے کھڑا دیکھ کر سمجھا کہ کوئی جاٹ کالج کی حدود میں آکھسا ہے۔ پر نپل اس کے قریب آکھڑا ہوا۔ اس پر وہ جبکہ محسوس کئے بغیر وہیں کھڑا رہا۔

”اے چودھری۔“ پر نپل نے کہا ”میں کیا کر رہا ہے تو؟“

”میں۔“ وہ چونکا۔ ”دیکھتا نہیں کہ کھڑا ہوں۔ کچھ بھی تو نہیں کر رہا۔“ یہ کہہ کر وہ

لڑکوں کو دیکھنے لگا جو کپاؤنڈ میں کرکٹ کھیل رہے تھے۔

”کسی سے ملے گا کیا؟“ پر نپل نے پوچھا۔

”نہیں۔“ دیکھ رہے ہیں۔ کرکٹ کا یہ کھیل۔“

کرکٹ کا لفظ سن کر پر نپل چونکا۔ ”پڑھے لکھے ہو کیا؟“

”پور تو کیا دیسے ہی کھڑے ہیں۔“ وہ بولا

”میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔“ پر نپل بولا ”یہ کالج گراؤنڈ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولا ”اجازت نہیں تو پتلے جاتے ہیں۔“ یہ کہہ کر وہ پھلانگ کر کالج کی چار دیواری پر چڑھ گیا اور دیوار پر بیٹھ کر کرکٹ دیکھنے لگا۔

اس پر پر نپل کو بے حد طیش آیا اور اس نے قریب جا کر کہا ”اب دیوار پر بیٹھ گئے۔“

”تم نے جو کہا تھا کہ گراؤنڈ میں کھڑے ہونے کی اجازت نہیں۔ اب کیا یہاں بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں۔“ وہ تنک کر بولا۔

پر نپل کو اس کی وقفانیت پر ہنسی آگئی۔ بولا ”تم اس کھیل کو سمجھتے ہو کیا۔“

”سمجھتے۔“ اس نے پر نپل کی طرف دیکھا۔ ”ہم نے تو اس کھیل کو کھیل کھیل کر چھوڑ دیا ہے۔ اب کسی زمانے میں کھیلا کرتے تھے۔“

”کھیل کھیلا کرتے تھے؟“ پر نپل نے پوچھا۔

”مدرسے میں اور کہیں۔“

”اچھا تو مدرسے میں پڑھتے رہے ہو۔“

”ہاں۔“ وہ بولا ”دس پاس کی ہیں۔“

”اور اب کیا کرتے ہو۔“

”کچھ بھی نہیں۔“

”کرکٹ کھیلو گے آؤ تمہیں کھلائیں۔“

اللہ داو نے سمجھا کہ وہ مذاق کر رہا ہے۔ کہنے لگا ”واہ کھڑا ہونے تو دیتے نہیں اور کہتے ہو کہ کرکٹ کھلائیں گے۔“

پر نپل قہقہہ لگا کر ہنسنے لگا اور پھر اسے پکڑ کر ٹیم میں لے گیا۔ ”لو بھی ایک نیا پلیئر لائے ہیں ہم۔“ وہ بولا۔ اللہ داو نے گیند اٹھا لیا اور بائیں ہاتھ سے بال کرنا شروع کر دیا ایک ہی دور

اسے پانچ روپے جرمانہ کر دیا۔ اللہ داو نے تو جرمانہ ادا نہ کیا۔ ہر حال دفتر نے جرمانے کی ادائیگی کے لئے تقاضہ جاری رکھا۔ حتیٰ کہ اللہ داو کو احساس ہو گیا کہ اسے یہ جرمانہ ادا کرنا ہی ہو گا۔ ایک روز وہ شفیع سے کہنے لگا ”یار شفیع اب تو اس جرمانے کا کچھ کرنا ہی ہو گا۔“

”کرنا کیا ہے؟“ شفیع بولا ”پانچ روپے دے دو اور کیا۔“

”اچھا بھئی۔“ اللہ داو نے کہا۔ ”تو مجھے دس روپے قرض کے طور پر دے دے یار۔“

”ہاں یار دس ہی دے دو۔“ اس نے کہا۔ ”یا تو یہ زائد پانچ اصل کو بھی واپس لے آئے

اور نہیں تو دسوں ہی گئے۔ یہ جو اکھیل ہی دیکھوں۔“

اگلے روز اکاؤنٹنٹ نے پرنسپل سے جا کر شکایت کی کہ اللہ داو پانچ کی بجائے دس روپے جرمانہ ادا کرنے پر مصر ہے یہ ایک عجیب و غریب شکایت تھی۔

اللہ داو کو طلب کیا گیا۔ ”یہ کیا حماقت ہے؟“ پرنسپل نے پوچھا۔ ”جرمانہ تو تمہیں پانچ روپے ہوا ہے اور تم دس ادا کر رہے ہو یہ کیا حماقت ہے۔“

اللہ داو نے سر جھکا لیا۔ ”نہیں حماقت نہیں جی۔“ وہ بولا۔ ”تو پھر کیا ہے؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”صاحب پانچ روپے تو جرمانہ دیا ہے اور پانچ روپے جمع کرا دیئے ہیں۔“

”کیا مطلب؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”جی کسی وقت پانچ روپے ہوتے ہیں۔ کسی وقت نہیں ہوتے اور ان پر خورداروں کا کیا اعتبار نہ جانے کب اگر الجھ جائیں۔“

اللہ داو نے یہ بات کچھ ایسی سنجیدگی اور معصومیت سے کہی کہ پرنسپل قہقہہ مار کر ہنس پڑے۔ ”تو مطلب یہ ہے کہ پانچ ایڈوائس کے طور پر دے رہے ہو۔ ہا ہا ہا۔“ وہ ہنسے۔ ”حد ہو گئی۔ اللہ داو تمہیں تو تحفہ کا مسخرہ ہونا چاہئے خواہ مخواہ کالج میں پڑھ کر وقت گنوار ہے ہو تم۔ ہی ہی۔“

”حضور میرا کیا ہے۔ آپ نے کالج میں داخل کر لیا تو کالج میں داخل ہو گیا۔ تحفہ میں داخل کر دیئے تو تحفہ میں داخل ہو جاتا۔ میرا کیا ہے۔“

”اچھا تو تمہیں تحفہ میں داخل کر دیں گے۔“ پرنسپل ہنستا ہوا چلا گیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک تو اللہ داو کا جرمانہ معاف کر دیا گیا اور دوسرے کالج کی مجلس تمثیل کا

میں اس نے کالج کے دو بہترین کھلاڑیوں کی وکٹیں اڑا دیں تو پرنسپل نے واہ وا کا شور مچا دیا۔ پرنسپل اسے اپنی لینڈ میں بٹھا کر گھر لے گیا اور اگلے ہی روز اسے کالج میں داخل کر لیا گیا۔ کی تمام فیس معاف کر دی گئیں بلکہ پورے فنڈ میں سے اس کے لئے کتابیں خریدی گئیں اور جوڑا کپڑوں کا بنا کر دیا گیا تاکہ وہ مناسب کپڑے پہن کر کالج آ سکے۔

مسخرہ

ایک روز اللہ داو برآمدے کے کونے پر کھڑا نہ جانے کیا سلج رہا تھا کہ گیارہویں مارچ چھوٹا سال لڑکا بھاگتا ہوا ادھر آ نکلا اور اللہ داو سے ٹکرا کر گر پڑا۔ اللہ داو نے لپک کر اسے ”نہ بیٹا۔“ وہ بزرگانہ انداز میں بولا ”اندھا دھند بھاگا نہیں کرتے۔“ اللہ داو نے اس کے کپڑے جھاڑے اور پھر اس کا منہ چوم کر کہا: ”نہ بر خودار ایسے نہیں کیا کرتے۔“ اس پر ارد گردی سب لڑکوں نے تالیاں پیٹ دیں اور بہت ہنگامہ مچا دیا۔ اس شور اور ہنگامے کی وجہ سے لڑکے نے جا کر پرنسپل سے رپورٹ کر دی۔ اس رپورٹ پر پرنسپل غصے میں آ گیا اور اسے لڑکے کو فوراً دفتر میں طلب کیا۔ ”اللہ داو تمہارے خلاف شکایت پہنچی ہے ہمیں۔“ انہوں نے اسے بتایا۔

میں کہا: ”جی کیسی شکایت؟“ اللہ داو نے معصومیت سے پوچھا۔

”کیا یہ درست ہے کہ تم نے گویند کا منہ چوما ہے؟“ وہ طیش میں بولے۔ ”جی ہاں۔“

داو نے سر جھکا لیا۔

”ہوں۔“ پرنسپل غرایا۔ ”تو تمہیں اس کی سزا ملنی چاہیے۔“

”غلطی ہو گئی مجھ سے جناب۔“ اللہ داو بولا۔

ممکن ہے اللہ داو کا یہ قصور بھی معاف کر دیا جاتا اور اسے آئندہ کے لئے سزا مل جاتی۔ لڑکوں کا خیال تھا کہ ایسا ہی ہو گا کیونکہ ہر بات میں پرنسپل اللہ داو کی رعایت کرتے تھے۔ بلکہ ایک روز اللہ داو کی شرارت پر تو پرنسپل صاحب نے اعلانیہ قہقہہ مار کر کہا: ”اللہ داو کو معاف نہ کروں تو اور کیا کروں اگر جرمانہ کر دوں تو وہ جرمانہ بھی کالج کے کسی لڑکے ہی ادا کرنا پڑے گا۔“

بھئی اس کے پاس کچھ ہو بھی۔“ پرنسپل کی یہ بات سنی تھی۔ اللہ داو کچھ بھی تو نہ تھا۔

لیکن اس روز پرنسپل بے حد غصے میں تھے۔ اس لئے انہوں نے اس کی اس

اجرا ہو گیا۔ اور چند ہی دنوں میں کالج میں شکنتلا کے کھیل کی سیرسل شروع ہو گئی۔

شبہ لگن

ایلی کو موسیقی سے بے حد دلچسپی تھی۔ گانے کی آواز سن کر اس کے دل میں چڑے دوڑنے لگتے۔ دل بیٹھ جاتا ایک رنگین اداسی اسے چاروں طرف سے گھیر لیتی۔ جب شکنتلا کی سیرسل شروع ہوئی تھی، اس کے لئے بورڈنگ میں جانا مشکل ہو گیا تھا۔ نصیبت یہ تھی کہ عام لڑکوں کو سیرسل دیکھنے کی اجازت نہ تھی اور سیرسل کے وقت ان لڑکوں کا داخلہ ممنوع تھا، جن کو ڈرامہ کھیلنے کے لئے نہیں چنا گیا تھا۔ اس لئے جب سیرسل شروع ہوتی تو وہ ہال سے باہر دروازے کے شیشے سے لگ کر دیکھتا رہتا اور جب سائڈل دھن بجاتے تو اس پر عجیب کیفیت طاری ہو جاتی۔ چند ہی یوم میں ایلی کو تین چار مرتبہ سنتے پکڑ لیا گیا اور آخر کار ڈرامے کا انچارج اسے پرنسپل کے پاس لے گیا۔ پرنسپل نے اسے ڈانٹا ڈپٹا۔ پھر دفعتاً نہ جانے اسے کیا سوچھی بولا۔ ”ہوں اگر تمہیں ڈرامے سے لپٹے تو عملی طور پر ہماری مدد کیوں نہیں کرتے۔“

”عملی مدد“ ایلی سوچنے لگا۔

”تم کا سکتے ہو؟“ پرنسپل نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ناج سکتے ہو؟“

”جی نہیں۔“

”یہ اچھی دلچسپی ہے۔“ وہ ہنسنے لگے ”گا نہیں سکتے۔ ناج نہیں سکتے مگر ڈرامے سے۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو پروفیسر انچارج کے حوالے کر دیا گیا کہ جو مناسب کام کر سکے

سے لیا جائے اور ایلی کو سیرسل کے دوران ہال میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

جب ”حمہ“ کی مشق شروع ہوتی اور میراثی طبلے پر ہاتھ چلاتا تو ایلی کا دل ڈب ڈب

کے جسم پر ہیر ہونیاں رینگنے لگتیں۔ خاص طور پر جب ربایوں کا وہ چھوٹا سا لڑکا

بیٹھی سی آواز میں ”تو جگ کا ہے۔“ کہتا تو اس کا دل دھک سے رہ جاتا وہ سب

ہم تلخ یادیں محو ہو جاتیں یہاں تک کہ وہ بائیکل والا واقعہ بھی بھول جاتا جب وہ کپڑوں کی عنبرنی کے بل کھولنے سے قاصر رہا تھا۔ اس وقت اسے شہزاد کا جھم سے آنا بھی بھول جاتا۔

پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ موسیقی اسے تلخ یادوں سے آزاد کر سکتی ہے۔ خصوصاً جب نور کی شبہ لگن سے بہار آئی گاتا تو ایلی یہ بھی بھول جاتا کہ وہ ایلی ہے کہ وہ علی احمد کا بیٹا ہے اور علی احمد کو نین کا سپاہی بننے سے دلچسپی ہے اسے سبھی کچھ بھول جاتا اور وہ حیرانی سے اس سانورے سے چھوٹے سے نور کی طرف ٹنگی باندھ کر دیکھتا۔ دیکھتے چلا جاتا۔ اس وقت نور کے چہرے کے گرد ایک ہلا سا نمودار ہوتا آنکھوں میں چمک لہراتی۔ بازو رقص کرنے لگتے۔ اس وقت اسکی آنکھیں باتیں کرتیں اس کے چتون انظار سے چھلکتے۔ ان کا پیغام کس قدر حسین ہوتا۔

نور کو دیکھ کر پہلی مرتبہ ایلی کو نزہت کی عظمت کا احساس ہوا۔ اس کا گیت سن کر اس نے محسوس کیا جیسے واقعی بہار آگئی ہو اور وہ شبہ لگن جس کی وجہ سے بہار آئی تھی۔ نور بذات خود ہو۔

اس کے بعد ایلی کئی ایک دن شبہ لگن اور بہار میں کھویا رہا۔ انتظار کرتے کرتے وہ تھک جاتا۔ لیکن کالج کا وقت ختم ہونے میں نہ آتا۔ خدا خدا کر کے سیرسل کا وقت ہوتا اور نور ٹھمکتا ہوا ہال میں داخل ہوتا اور ایلی کے لئے بہار آتی۔

معصوم فلاحشہ

لیکن چند ہی دن کے بعد ایلی پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اس پتلے دبلے سانورے لڑکے میں دو شخصیتیں کام کر رہی ہیں۔ دو مختلف متضاد شخصیتیں۔ ایک وہ نور جو گاتے وقت اس میں بیوار ہوتا۔ وہ نور جس کی حرکات میں حسن کی جھلک دکھائی دیتی۔ جس کے گلے میں سے گویا پھلکی ہوئی ہانڈی کا ایک فوارہ چھوٹا۔ لیکن جو نئی وہ گانا ختم کر دیتا تو اس کی آنکھوں میں عریانی بھرا پیغام جھلکتا اور اس کی حرکات سے سستے پن کا مظاہرہ ہوتا۔

نور کی چال تو بالکل ان عورتوں کی طرح تھی۔ جو کنزوار رنگین میں دوسرے درجے کے بچوں میں بیٹھتی تھیں۔ نور کی ان باتوں کو دیکھ کر ایلی کو دکھ سا محسوس ہوتا اور وہ جلد ہی کسی اور بات کی طرف توجہ منعطف کر لیتا تاکہ خیال بٹ جائے۔ مگر اس کے باوجود اس کے دل میں

نہیں دیکھا تھا۔

نور چند ایک روز کے لئے تو ان کا منہ سکتا رہا پھر جب اسے یقین ہو گیا کہ اس کا یہ نیا تعلق اپنی نوعیت کا بالکل انوکھا تعلق ہے تو وہ حیران رہ گیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں نہ آتی تھی۔ سمجھ میں آتی تو بھی اسے یقین نہیں پڑتا تھا۔ پھر نہ جانے اسے کیا ہوا ایک روز وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

”خدا کے لئے مجھے بچالو۔ مجھے اپنے ساتھ لے چلو۔ میں یہ زندگی بسر کرنا نہیں چاہتا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔ پتلے پتلے ہونٹ لرز رہے تھے اور وہ امید بھری نگاہوں سے ایللی اور آصف کی طرف دیکھ رہا تھا۔ ندی کے کنارے پر سوکھے ہوئے درخت جو شبہ لگن سے ہرے ہو چکے تھے۔ پھر سے سوکھ گئے۔ ندی کے پانی کی روانی تھم گئی۔ جیسے وہ ایک جوہر بن گئی ہو اور ان کے ارد گرد ایک وسیع دیراندہ پھیلا ہوا تھا۔

بیگانے دوست

ایک روز آصف بھاگا بھاگا ایللی کے پاس آیا اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔

”ایلی“ وہ بولا۔ ”وہ“ وہ سفینہ پھر یہاں آ رہی ہے۔ اگر وہ آگئی تو پھر میں کیا کروں گا۔ چلو ہم امرتسر سے بھاگ چلیں ایللی۔“

”لیکن جائیں کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”کہیں بھی۔“ اس نے آہ بھر کر کہا۔

”نہیں آصف۔“ ایللی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔ ”اگر وہاں بھی لڑکیوں نے تمہیں سلام کرنے شروع کر دیئے تو۔“

”تو تو۔۔۔۔۔ آصف سوچنے لگا۔ ”تو میں کیا کروں۔“ اس نے بے بسی سے ہاتھ پلایا۔

”تم ان کی شکایت کرنا چھوڑ دو۔“ ایللی نے سوچ کر کہا ”شکایتوں کی وجہ سے وہ چڑ جاتی ہیں۔ ضد پیدا ہوتی ہے۔ تم خود انہیں سلام کرنا شروع کر دو تاکہ وہ خود تمہاری شکایتیں کریں۔“

”میری شکایتیں۔“ آصف گھبرا کر بولا۔ ”نہیں نہیں یہ میں برداشت نہیں کر سکتا۔“

کالسا سا چھرا رہتا۔ پھر وہ شدید کوشش سے تصور کے زور پر اس نور کو گانے والے نور میں بدل دیتا اور یوں وہ عریاں منظر شبہ لگن میں تبدیلی ہو جاتا اور بہار آجاتی۔

جب آصف کو ایللی کی اس نئی دلچسپی کا علم ہوا تو وہ بہت ہنسا کہنے لگا ”اچھا ابھی آج دیکھیں گے تمہارا نور۔“ اس شام کو آصف گل ہتھیلی پر رکھے بیٹھا نور کا گانا سنتا رہا حتیٰ کہ اس کی آنکھیں شفاف پانی کی مچھلیوں میں بدل گئیں اس کے ہونٹوں کی وہ تسخیر آمیز سلوٹ دور ہو گئی اور پاؤں انجانے میں تل دینے لگے۔

اس کے بعد آصف اور ایللی فارغ وقت میں نور کو لے کر آمروں والی کوٹھی کے قریب نہر کے کنارے چلے جاتے۔ ایللی کسی پیڑ تلے بیٹھ جاتا۔ آصف ندی میں پاؤں لٹکا لیتا اور نور کا گانا اس شبہ لگن میں ایللی کی نگاہوں تلے ہتھکھالی لٹ لراتی اور آصف کی آنکھیں جھیلیں میں تیرتیں اور سوکھے ہوئے درختوں پر ہریا دل یورش کرتی اور ندی کا پانی ناچتا اور آسمان پر ہندسے رقص کرتے۔

گانے کے اختتام پر نور کی آنکھ میں وہ نورانی چمک بچھ جاتی اور ایک ریڑی کپڑے انداز میں ہو کر ان کے روبرو اکھڑی ہوتی اور نمائش کرنے میں مصروف ہو جاتی۔ ہونٹ جو کون کی لہا ان کی طرف بڑھتے اور وہ دونوں گھبرا کر وہاں سے چل دیتے اور سوچتے کہ کس طرح اس سے بچا چھڑائیں۔ اس وقت انہیں یہ فکر دامن گیر ہو جاتا کہ کوئی انہیں نور کے ساتھ دیکھ نہ پائے لیکن جو نئی وہ نور سے جدا ہوتے تو وہ اس کے خیال میں کھو جاتے۔ شبہ لگن پھر کب لگتا گا۔

اتفاق سے ایک روز شیخ ہدم بھی آگئے اور ان تینوں نے مل کر شبہ لگن منائی لیکن شیخ خاموش ہو گئے اور پھر اپنے مخصوص انداز میں کہنے لگے: ”یہ سب ٹھیک ہے۔ الیاس صاحب لیکن امرتسر کے رہا یہ لڑکے سے نہر کے کنارے پر گانا سنتا اور پھر ماشاء اللہ گانے والے جب صاحب ہوں بات ذرا خطرناک ہے۔“

”خطرناک ہے۔“ ایللی کی سمجھ میں نہ آیا کہ آخر بات خطرناک کیوں تھی۔ اس میں خطر کی کیا بات تھی۔ نور ان کے ساتھ بے حد مانوس ہو چکا تھا اور اب تو اس پر واضح ہو چکا تھا کہ وہ کا مقصد موسیقی کے سوا کچھ نہیں اور اس کا پاؤں ٹھمکانا، آنکھیں مٹکانا اور ہونٹ ٹکانا ایللی پر بے کار تھا۔ ایللی نے اب سے پہلے کبھی اتنے چھوٹے بچے کو ایسی عریاں حرکات کرتے

میں جاتا تو یہ احساس اس کی رگ و پے میں بس جاتا۔ وہیں پہنچ کر وہ محسوس کرنے لگتا جیسے زندگی ایک گرداب ہو جس میں افراد کی چھوٹی چھوٹی قدیلیں اپنی اپنی دھن میں سلگ رہی ہوں اور گرداب کے بہاو کے ساتھ ساتھ دیوانہ وار گھوم رہی ہوں۔

جب بھی شام کے وقت ایللی آتا سے ملنے ان کے یہاں جاتا تو آتا ایللی کو لے کر ڈیوڑھی کے باہر کمرے ہو جاتے تاکہ کمرے میں چلتے پھرتے لوگوں کا تماشا کر سکیں۔ کمرے میں لوگ پان کھاتے، سگریٹ کے کش لیتے اور نگاہوں کی انگلیوں سے چوباروں میں بیٹھی ہوئی رقاصوں کو جھیرتے۔ اشارے کرتے۔ تماشین تانگوں پر بیٹھ کر چوباروں کی طرف گرم نگاہیں ڈالتے ہوئے مزر جاتے۔ مزدوروں کے گروہ کوچے میں شلتے۔ تاجر نگاہیں جھکائے قدم اٹھاتے ہوئے نکل جاتے۔ شوقین مزاج دوکانداروں کی نگاہیں گاہکوں اور رقاصوں کے درمیان یوں گھومتی جیسے گڑی کا پنڈولم چلتا ہے۔

ہر چند گھنٹوں کے بعد کمرے میں کوئی ایسا شخص بھی آنکھتا جسے دیکھ کر لوگوں کی نگاہیں چوباروں سے ہٹ کر اس کی طرف منعطف ہو جاتیں۔ بازار میں ایک مدھم سی سرگوشی ابھرتی۔

”کون ہے۔“

”ہائیں یہ ہے وہ۔“

”کیسے دیکھ رہا ہے۔“

”یارانہ ہے اس سے کیا؟“

اور وہ سرگوشی برف کی گیند کی طرح لڑھکتی۔ لڑھکتے جاتی۔ حتیٰ کہ سارا کھنڈ اس کی لپیٹ میں آجاتا۔ رقاصائیں بھی اپنے بے نیازانہ انداز کو چھوڑ کر بچوں کی طرح بازار کی طرف دیکھنے لگتیں اور چند ساعت کیلئے انہیں یاد نہ رہتا کہ وہ دیکھنے کے لئے نہیں بلکہ اپنا آپ دکھانے کے لئے وہاں بیٹھی ہیں۔ اس وقت رقاصوں میں نسائیت کی جھلک نمودار ہو جاتی اور محسوس ہونے لگتا کہ وہ گزریاں نہیں بلکہ جیتی جاگتی عورتیں ہیں۔

لکھنؤ، الہ آباد یا مدراس کا کوئی مشہور سا زندہ آجاتا یا کوئی پیرا نوکھا لباس پہنے اپنے ساتھیوں کے ساتھ کمرے میں داخل ہوتا۔ وہاں مشہور ڈاکو اور لٹیرے آیا کرتے تھے۔ کروڑ پتی اور کسیدہ تو اکثر آتے۔ لیکن کمرے میں سب سے زیادہ دھوم انکسٹر رووف کی تھی۔

انکسٹر رووف

اگر انکسٹر رووف آجاتا تو فوراً بازار پر سناٹا چھا جاتا۔ پناہی سسم کر بیچھے ہٹ جاتے۔

”اگر تم انہیں سلام کرنا شروع کر دو گے تو ان کا برتاؤ محبوب کا سا ہو جائے گا۔“ ایللیا نے کہا۔ ”اور وہ تم سے دور بھاگنے لگیں گی۔ انہیں دور بھاگانے کی یہی ایک ترکیب ہے۔“

”اچھا۔“ آصف نے تلی بجائی۔ ”کیا یہ چلے گی۔ پھر تو بہت اچھا ہے۔“

آصف سمجھ رہا تھا کہ ایللی اسے مشورہ دے رہا تھا۔ حالانکہ درحقیقت مشورے کے پہلو میں وہ اپنی مشکل بیان کر رہا تھا وہ محسوس کر رہا تھا کہ کوئی لڑکی ایسی نہ تھی جو صبح سویرے ایللی سے سلام کرتی ہو۔ کوئی بھی تو نہ تھی جو اس کے لئے بیقرار ہو۔ بلکہ قریب اگر بھی وہ کسی کی طرح سٹ جاتی تھیں اور کوشش کے باوجود بھی کھل نہ سکتی تھیں۔

”لیکن آصف۔“ ایللی نے کہا ”ایسا کیوں ہوتا ہے اگر تم ان کی تلاش میں سرگرداں ہو جاؤ تو وہ دور بھاگتی ہیں اور اگر تم ان سے دور بھاگو تو وہ تمہارا پیچھا کرتی ہیں۔“

”ہاں۔“ آصف مگھلتا، ”مگر میں ان کی تلاش میں کیسے کھو جاؤں۔“

اس کے برعکس ایللی سوچ رہا تھا کہ وہ انہیں اپنی تلاش میں کیسے سرگرداں کرے گی طرح انہیں تلاش پر مائل کرے۔

وہ دونوں بہترین دوست تھے لیکن ایک دوسرے سے اس قدر قریب ہونے کے باوجود ایک دوسرے سے کس قدر دور تھے۔ کس قدر بیگانہ۔ ان کی مشکلات ایک دوسرے سے کس قدر مختلف اور متضاد تھیں۔

”اچھا۔“ آصف نے کہا۔ ”تو مجھے بتاؤ کہ میں کس طرح ان پر ظاہر کروں کہ میں ان کی تلاشی ہوں۔“

”تم صبح اٹھ کر ان کو سلام کرنا شروع کر دو۔“ ایللی نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”اور کبھی دوپہر یا شام کو کوشش کر کے کوٹھے یا کھڑکی سے اسے دیکھ لیا کرو۔“

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔“ آصف بولا۔

اور ایللی نے دل میں سوچا اچھا میں کوشش کروں گا کہ کسی کو اپنے لئے سرگرداں بنا کر مائل جتو کروں۔

وہ کوچہ

ایللی اب محسوس کرنے لگا تھا جیسے وہ سمندر میں بہتا ہوا تنکا ہو۔ خصوصاً جب وہ اس

کوئین ہبلہ سر پٹیا۔ پھر کچھ دیر بعد چوہارے سے انسپکٹر رؤف کے دھاڑنے کی آوازیں آئیں جو مارے کٹرے میں گونجیں۔ وہ نشے میں چیتا چلاتا دھمکیاں دیتا۔ غلیظ گالیاں دیتا اور پھر ایسے لگتا جیسے چوہارے میں دنگا فساد ہو رہا ہو۔ وہ بالا خربتیاں بگھ جاتیں اور سکوت چھا جاتا اور کٹرے والے محسوس کرتے جیسے اس گہری خاموشی سے کراہوں کی آواز آرہی ہو۔

انسپکٹر رؤف کے علاوہ کوئی دوسری شخصیت جو کٹرے پر اثر انداز ہوتی تھی، پیر سبز پوش کی تھی۔ جب بھی وہ کٹرے میں داخل ہوتے تو ایک تعجب اور خاموشی بھری سرگوشی بلند ہوتی۔ پنواڑی پان لگانا چھوڑ دیتے۔ تماش بینوں کی نگاہیں چوہاروں سے ہٹ کر پیر صاحب کے چہرے اور لباس پر مرکوز ہو جاتیں۔ سلازمین دوکان کے اندرونی حصے سے دوڑ کر باہر آکھڑے ہوتے اور رقاصائیں جنگلوں پر کھڑی ہو کر نیچے دیکھنے لگ جاتیں۔

پیر صاحب کے سبز ریشم پیراہن پر ان کی لابی سیاہ زلفیں لگتیں ان کے سر پر ریشمیں ہزاروں عربی انداز سے بندھا ہوتا اور ان کا حسین نسائی چہرہ چمکتا اور ریشمی سیاہ آنکھیں جھکی رہتیں۔ ان کے خدو خال ستواں تھے۔ ان کی آنکھیں دیکھنے والی نہیں بلکہ دیکھنے والی تھیں اور انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے کوئی حسین عورت جوگی لباس پہنے چوہارے سے اتر کر تقریباً کٹرے کے بازار میں گھوم کر اپنی نمائش کر رہی ہو۔

آنچل اور گٹھڑیاں

اس کوپے کو دیکھ کر نہ جانے ایللی کو کیا ہو جاتا۔ اس کے جسم پر چوونیاں ریگنے لگتیں اور پھر ایک عجیب سی کیفیت طاری ہو جاتی اور اس کا جی چاہتا کہ وہ وہیں کھڑا دیکھتا رہے۔ دیکھتا رہے۔

اب اس کے لئے آغا کے ملاقاتی کمرے میں بیٹھنا ناممکن ہو چکا تھا۔ جب بھی وہ وہاں بیٹھتا تو اسے محسوس ہوتا کہ کوئی اس پر ہنس رہا ہے۔ اس کا مذاق اڑا رہا ہے۔ ایک رنگین آنچل لہراتا دکھائی دیتا اور پھر بہت سے کپڑے لپٹ لپٹ کر گٹھڑی کی شکل اختیار کر لیتے اور وہ گٹھڑی لڑھکتی ہوئی کوئی ہنسا جیسے مذاق اڑاتا۔ ایللی گھبرا کر اٹھتا اور زینے کی طرف بھاگتا زینے میں کھڑی نیم کے ہونٹوں پر اسرار تبسم ہوتا ”آگئے، آگئے۔“ وہ آنکھیں میٹکا کر کہتی۔ ایللی کو اس کی آوازیں بلا کاٹھڑ محسوس ہوتا پھر وہ باہر نکل جاتا اور بازار کے کسی کونے میں کھڑا ہو کر لوگوں کی طرف دیکھنے

دوکاندار چوہاروں کی طرف دیکھنا موقوف کر دیتے۔ راہ گیر نگاہیں جھکا لیتے۔ اوھر چوہاروں کی سرفی بھرے چہرے زرد پڑ جاتے۔ نگاہوں میں شوخی کی جگہ گھبراہٹ دوڑ جاتی۔ رقصائیں چلیں۔ چپ چاپ گردن جھکائے بیٹھ جاتیں جیسے طبیعت ناماز ہو۔

اس زمانے میں کٹرے پر رؤف کی حکومت تھی۔ وہ کٹرہ اس کی ریاست تھی۔ جب کہ وقت وردی پر سٹی پیٹی لگائے۔ سر پر طرے دار پگڑی باندھے اپنے باڈی گارڈ کے ساتھ کٹرے میں نکلتا تو ایک سرگوشی ابھرتی اور تیزی سے میاں سے وہاں تک دوڑ جاتی اور ایک عقب میں بھیانک خاموشی چھوڑ جاتی۔

پنواڑی چوہاروں کی طرف تاڑنے کا شغل چھوڑ کر شدت سے پان بنانے میں مصروف جاتے۔ دوکان پر کھڑے شوقین نظرس لوانے کا خیال موقوف کر دیتے۔ جزل مرچنٹ کے سلازمین حساب کتاب کے رجسٹر کھول کر مصروف ہو جاتے۔

انسپکٹر رؤف کی آمد کی خبر سن کر چوہاروں میں سازندوں کے ہاتھ لرز کر ممنوع سرول پڑتے دکھ بھری سرول پر قیام لے ہو جاتے۔ سارنگیاں ناچنا چھوڑ کر رونا شروع کر دیتیں اور مسکراتی ہوئی رقاصائیں گھبرا کر گانا چھوڑ دیتیں اور کھوئے ہوئے انداز میں پان لگانے بیٹھ جاتیں۔ انسپکٹر رؤف تمہید کے طور پر کٹرے کے دو تین چکر لگاتے۔ پھر کسی چوہارے کے دروازے پر اپنے سپاہی کو متعین کر دیتے اور خود سیڑھیاں چڑھ کر اوپر جا پہنچتے۔ ان کے پیڑھ چڑھتے ہی وہ طلسم گویا ٹوٹ جاتا۔ اس وقت کوئی پنواڑی نعرہ لگاتا ”علی“ اس کا وہ نعرہ سن کر کٹرے میں گونجتا اور کٹرے میں رکی ہوئی زندگی پھر سے حرکت میں آجاتی۔ تماش بینوں کی نگاہیں بے باکی سے کھڑکیوں پر منزلانا شروع کر دیتیں۔ پنواڑیوں کی دوکانوں پر کھڑے شوق سے رقاصوں کو تاڑنے لگتے۔ رقاصوں کے ہونٹوں پر ایک بار پھر تبسم لہراتا اور ان کے لبوں سے بوجھ اتر جاتا۔

البتہ جس چوہارے پر انسپکٹر رؤف چڑھ جاتے تھے وہاں لوگوں کی حالت بد سے بدتر جاتی۔ محفل درخواست ہو جاتی۔ سینٹھ اور تاجر چپکے سے نیچے اتر آتے۔ میرانی ہاتھ دھر کر جاتے۔

پھر اگر رؤف کے حکم کے مطابق وہاں راگ رنگ ہوتا بھی تو سارنگیاں گلے کی چلیں

”اچھا“ آصف نے آہ بھری۔ ”لیکن میں کمال جاؤں۔“
”کیوں۔ تم تو یہاں خوش ہو۔“

”یہاں خوش ہوں۔ برا خوش ہوں لیکن۔“ آصف نے آہ بھری ”لیکن کیا۔“ ایلی نے کہا۔
”معلوم نہیں۔“ آصف نے سر جھکا لیا ایسے معلوم ہوتا ہے جیسے اب یہ شر دیران ہو گیا ہے۔
”جیسے کچھ بچی نہیں رہا جیسے کچھ کھو گیا ہے۔“

”اب تو وہ یہاں نہیں۔ اب تو تمہیں کوئی تنگ نہیں کرتی۔“ ایلی نے طنزاً کہا۔ ”ہاں۔“
آصف نے آہ بھری۔ ”اب مجھے کوئی تنگ نہیں کرتی۔“
”پھر بھی تم اس کو۔ عجیب بات ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ آصف نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”عجیب بات ہے۔ اچھا تم ہو آؤ علی پور
ہے۔“ اس نے آہ بھری۔ ”کاش کہ میرا بھی کوئی علی پور ہوتا۔“

اس روز وہ دونوں دیر تک اندھیرے میں سر کے کنارے بیٹھے رہے حتیٰ کہ اللہ واو لکڑی
اٹھائے ان کی تلاش میں آپہنچا۔

”ارے یہاں بیٹھے ہو تم دونوں۔“ وہ چلایا۔ ”اور میں سمجھا شاید سر میں ڈوب گئے جو ابھی
تک نہیں آئے۔“ ”ہاں۔“ وہ انہیں خاموش دیکھ کر چلایا ”کیا کر رہے ہو میاں۔ یوں چپ چاپ
بیٹھے سے مطلب چلو ایلی چلو۔“

رات کے وقت لیٹے ہوئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شہ گن گزر گئی ہو اور بہار
کے بعد چاروں طرف خزاں کی دیرانی چھا گئی ہو۔ چاروں طرف ایک لٹی ہوئی دنیا تھی۔ دورندی
کا دھارا اس آواز میں گنگنا رہا تھا۔ لہریں ہچکیاں لے رہی تھیں۔ درخت شاخیں شاخیں بھر
رہے تھے۔ رسوئی میں رامو بھدی آواز میں کچھ گنگنا رہا تھا اور چاروں طرف گھپ اندھیرا لہریں
لہرا رہا تھا۔

اس کا خیال نیم کی طرف منعطف ہو گیا۔ ایک گٹھڑی سی لپٹ گئی۔ ایک تہقہ بلند ہوا اور
زرد و اس چرے ستونوں کی اوٹ سے نکل کر بھاٹکنے لگے۔ بڑی بڑی سیاہ آنکھیں تسنخر سے
اس کی طرف دیکھ رہی تھیں۔

گھبرا کر اس نے باورچی خانے کے تل کو گھورتا شروع کر دیا۔ کتنا غلیظ تل ہے۔ اس
نے جھرجھری لی۔ نہ جانے رامو کہاں ہے کس کام میں لگا ہے۔ شاید برتن صاف کر رہا ہو۔ شاید

میں کھو جاتا۔

کالج میں جب آصف مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہتا ”ایلی تسلیم۔“ تو ایک رات
گٹھڑی دھم سے ان کے درمیان آگرتی اور اس کا راز کھول دیتی۔ وہ محسوس کرنا کہ آصف
کے راز سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ ایلی ایک ریشمیں گٹھڑی کھولنے کی ہمت بھی
رکھتا۔

پھر شام کو وہ دونوں آموں کی کوٹھی کے قریب سر کے کنارے نور سے ملنے اور نور
کے نیچے بیٹھ کر گاتا اور شہ گن سے بہار آجاتی۔ لیکن سب سے بڑی مشکل یہ تھی کہ نور
لئے سر سے اتنی دور چل کر آموں کی کوٹھی تک پہنچنا مشکل تھا اور نور کو اس کے گھر سے
ممكن نہ تھا۔ کیونکہ نور محلے کے لڑکوں سے اس قدر خوف زدہ تھا کہ اسے یہ گوارا نہ تھا کہ کلاں
کر گھر سے اسے بلائے۔ نور سے ایک جگہ مقرر کر لی جاتی اور ایلی مقرر وقت پر وہاں جا کر نور
اپنے بائیکل پر بٹھا کر بورڈنگ میں لے آتا۔ ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ نور کو یوں بائیکل پر
خطرے سے خالی نہیں۔ اسے معلوم نہ تھا کہ نور کو یوں بائیکل پر لانا خطرے سے خالی نہیں
معلوم نہ تھا کہ کسی لڑکے سے دوستی کی وجہ سے عداوت بھی پیدا ہو سکتی ہے۔

ایک روز جب ایلی سفید چوک میں کھڑا نور کا انتظار کر رہا تھا تو ایک پہلوان قسم کا شخص
اور بڑی بے تکلفی سے بولا۔ ”دیکھ بابو تو نور کا چچھا کرنا چھوڑ دے ورنہ خون بہہ جائے گا۔
تیری کھلڑی اتر جائے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے غصے میں تل پر ایک گھونہ مارا۔ پانی کا ایک ٹپا
چھوٹا اور ایلی کے کپڑے بھیگ گئے۔

اس روز آصف اور ایلی تن تنہا سر کے کنارے خاموش بیٹھے رہے حتیٰ کہ سورج کی نما
دھاریاں دھندلی پڑ گئیں۔ اور دور شہ کی بتیاں روشن ہو کر ناچنے لگیں۔ مگر شہ گن سے ہلا
آئی۔ دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

پھر ایلی نے کہا۔ ”آصف میرا یہاں جی نہیں لگتا۔“

”اچھا۔“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔ ”تو پھر کیا کیا جائے۔“

”تو پھر میں علی پور سے ہو آؤں کیا۔“ ایلی نے کہا۔

”اس سے کیا ہو گا۔“

”پتہ نہیں۔“ ایلی بولا ”شاید۔“

رسوئی میں بیٹھا ہو۔ اس کی نگاہ پھر تل پر رک گئی۔ اگر اس کے گرد اینٹوں کا چھوڑا ہوا دھڑا
اس کی نگاہ میں تل کے گرد ایک صاف ستھرا چہرہ بن گیا۔ ”اور بابو۔“ ایک بدستور
طرف لپکا ”کھڑی اتر جائے گی تیری۔ ہاں۔“ ایلی نے گھبرا کر آنکھیں بند کر لیں۔ اسے
ہونے لگا کہ تل سے چھینٹے اڑ رہے ہیں اور وہ شرابور ہو چکا ہے۔

رینگتی دیواریں

اگلے روز ایلی گاڑی میں علی پور جا رہا تھا۔

بخار کی وجہ سے اس کی کپٹیاں تھرک رہی تھیں۔ دل میں دھکی بج رہی تھی۔
ہرے بھرے کھیتوں میں جا رہی تھی۔ یہاں وہاں بزرگھڑیاں بندھی پڑی تھیں۔
ایک گھڑی قریب آتی۔ ”دھننا“ اس میں سے دو حنا مالیدہ ہاتھ ایلی کی طرف لپکے۔
شیم کی ہنسی کی آواز سنائی دیتی۔ ”ہی ہی ہی“ علی احمد ققمہ مارتے۔ ”کشمیر کے سیپوں
ہے ہاں۔“

دوسری گھڑی کے پٹ کھٹل جاتے۔ بھوؤں کے عین درمیان ایک تارہ چمکے۔
روشن بندی ہو۔ پھر سیاہ جھیلوں میں دو دیئے روشن ہو جاتے۔
”رے رے رے۔“ ارجمند چھاتی پینٹا۔ ”جب سے اس پنڈورا کی گھڑی
کھلے ہیں اک قیامت ٹوٹ پڑی ہے محلے پر۔“
لوہکتی ہوئی ایک اور گھڑی قریب آجاتی اور کھٹنے کی بجائے مزید لپکے جاتی۔ پٹ اور
ہو جاتے۔ پھر چاروں طرف سے حسین چہرے جھانکتے۔ ایک ققمہ ابھرتا۔ ”بے ہوا
چارہ۔“

ایلی چونک جاتا۔ وہ اپنے آپ کو جھنجھوڑتا۔ لیکن گزشتہ سخت کا احساس اس کے لطافت
ہو جاتا۔ پھر بزرگھڑی قریب آکر سکتی۔

”اسے بھول جاؤ ایلی۔ بھول جاؤ۔ میری طرف دیکھو۔ میری طرف۔“
گھبرا کر وہ لالچل پڑھنے لگتا۔ ”یہ میں کیا سوچ رہا ہوں! یہ کیسے ہو سکتا ہے؟“
اس کی طرف دیکھ کر مسکراتا۔ ”تم امتحان میں پاس ہو گئے ہو ایلی۔ تم میں جرات ہے۔“
”ہاں ہاں“ شنوار کہتی۔ ”اب تو ایلی سے ڈر آنے لگا ہے۔“ اور وہ گھبرا کر

دھننا“ ایلی دیکھتا کہ وہ اس پر جھک گئی ہے اور سیاہ جھیلوں پر کنٹرول سے دیئے روشن ہو گئے ہیں۔
جب وہ محلے میں پہنچا تو شام پڑ چکی تھی۔ بڑی ڈیوڑھی ویران پڑی تھی چوگان میں کوئی نہ
غذا چپکے سے وہ گھر کی بیڑھیاں چڑھنے لگا۔

گھر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ صرف دادی اماں کے کمرے میں مٹی کا دیا جل رہا تھا۔ وہ
چپکے سے دروازے میں جا کھڑا ہوا۔ دادی اماں کا تخت جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی، خالی پڑا تھا۔
دادی اماں چارپائی پر بے حس و حرکت پڑی تھی اور سیدہ اس کے اوپر جھکی ہوئی تھی۔ حمیدہ اور
رشدہ چپ چاپ ایک کونے میں سہمی ہوئی بیٹھی تھیں۔

دیر تک وہ چپ چاپ کھڑا رہا۔ پھر اس نے آہستہ سے آواز دی۔ ”دادی اماں“ سیدہ نے
مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور پھر ہونٹوں پر انگلی رکھ کر چپ رہنے کا اشارہ کیا دادی اماں میں
دکھ پیدا ہوئی۔ اس نے نحیف و زار آواز میں کہا۔ ”ایلی ہے اچھا اچھا۔“ اور پھر خاموش ہو
گئیں۔

اس پر ایلی سیدہ سے چٹ گیا۔ ”تم اس طرح سے کیوں بیٹھی ہو۔ دادی اماں کو کیا ہے وہ
لپٹی ہوئی کیوں ہیں۔ بولتی کیوں نہیں۔ بولو۔ بولو۔ تم سب خاموش کیوں ہو۔“ ”سیدہ نے ایلی
کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔ اور اشارے سے بولی۔ ”چل اس کمرے میں یہاں نہیں۔“
جب وہ اس کمرے میں پہنچا تو وہاں ماں کو دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔
”ایلی آیا ہے۔“ ہاجرہ چلائی۔ ”کب آیا تو۔“
”دادی اماں کو کیا ہوا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔
”اس کی حالت اچھی نہیں۔“
”تیار ہے؟“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ تو جا ادھر فرحت کی طرف۔ ادھر سو جا کے۔ یہاں ہم
نویں۔“

”لیکن مجھے دادی اماں۔“
”اسے اپنا ہوش نہیں۔ بہت تکلیف میں ہے جا شلباش۔“ ہاجرہ نے منت کی۔ ”سیدہ“ وہ
اس کے داخل ہونے پر چلا کر بولا۔ جواب میں سیدہ نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر اشارہ کیا۔
”خود نہ پچا ہوش آتا ہے تو وہ پھلی کی طرح تڑپتی ہے۔ تین دن ہو چکے ہیں۔ بڑے عذاب میں

گھال پچکاری

ہائیں۔ وہ گھبرا کر رک گیا اس کے روبرو چوہارے میں شزاو بیٹھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ تخت پر بیٹنے کی مشین پڑی تھی۔ جس کے ایک جانب دو بلوریں پاؤں قرینے سے رکھے تھے۔ سیاہ جالی کے دوپٹے سے دو سفید بازو نکل کر مشین کو تھامے ہوئے تھے۔ ر۔ شمس لبوس کے اوپر ایک متبسم چہرہ دو نوکیلی آنکھیں اور ان پریشانی کا سیاہ تل۔ گھبرا کر ایلی نے نگاہ جھکا۔

شزاو کے سرخ حنا بالیدہ ہاتھوں نے جیسے اس کے منہ پر ایک طمانچہ مار دیا۔ سرخ بوندیاں بپٹے لگیں۔ ایلی لوکھڑا گیا۔

”تو ایلیا ایلی؟“ شزاو نے مسکرا کر پوچھا۔ داوی کی بیماری کی خبر سن کر آیا ہے؟“

”نہ۔ نہ نہیں تو۔“ ایلی نے اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کی۔ ”آپ یہاں ہیں۔“
دفعہ اس غیر محرک تصویر میں جنبش ہوئی۔ ایک چمک لرائی بھجھکتی ہوئی چمک ”ہاں۔“
شزاو مشین چلاتے ہوئے بولی۔ ”اب کی بار میں ان کے ساتھ نہیں گئی۔ میں نے کہا کچھ دیر یہاں رہ لوں بیٹھ جاتو۔“

”کھڑکیوں ہے تو؟“

ایلی بیٹھ گیا اور شزاو کی طرف دیکھ کر سوچنے لگا۔ شزاو سر اٹھا کر دیکھتی تو اس کے ہونٹوں پر ایک مسکراہٹ چمکتی عجیب سی مسکراہٹ ایسے محسوس ہوتا کہ گھال بھری پچکاری چل گئی ہو جیسے شزاو بہت قریب آگئی ہو بہت قریب۔ اتنی قریب کہ قرب کی وجہ سے ایلی کے بند بند میں بتیاں کی روشن ہو گئی ہوں جیسے اس نے نہ جا۔ نہ کیا پایا ہو لیکن جب شزاو آنکھیں جھکا لیتی تو ایلی محسوس کرتا جیسے گھانا ٹوپ اندھیرا چھا گیا ہو چاروں طرف دیرانی اور اواسی چھا جاتی اس وقت ایلی کو شزاو کے حنا بالیدہ ہاتھوں سے گھن آنے لگتی اس وقت وہ محسوس کرتا جیسے وہ نگاہ ہو۔ جیسے اس کا وجود باعث تنگ ہو۔ احساس ندامت سے اس کا سر جھک جاتا اور وہ دل ہی دل میں لالچول بڑھنے لگتا لیکن اس کے باوجود اس کے دل میں شدت سے آرزو پیدا ہوتی کہ شزاو ایک بار پھر ٹھہرنا کر دیکھے۔ اس منور پریشانی سے بجلی چمکے چھوٹی چھوٹی بتیاں یوں روشن ہو جاتیں جیسے گھال بھری پچکاری چل گئی ہو اور شزاو کے حنا بالیدہ ہاتھوں کی پچکاری سے گھال کی پھوار پڑے۔ شزاو

جھٹکا ہے۔ اللہ اس کی مشکل آسان کرے۔“ سیدہ نے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

”آؤ ایلی۔۔۔۔۔“ ہاجرہ بولی۔ ”آؤ اوھر چلیں۔“ اور وہ دونوں چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑے۔

”تیری داوی کی حالت اچھی نہیں۔ کیا معلوم کب آنکھیں بند کر لے۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔
”لیکن۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کیا بیماری ہے؟“

”بیماری؟ اب میں اس کا جواب دوں۔“ ہاجرہ مسکرائی۔ ”عمر کا تقاضہ ہے آخر ایک دن جانا ہی ہے سب کو۔“

ایلی خاموش ہو گیا۔ وہ جانتا تھا کہ داوی امان بہت ضعیف ہے لیکن اس کے مرنے متعلق اسے کبھی خیال نہ آیا تھا اور اب اس کے دل پر چوٹ سی لگی تھی۔

”سب انتظامات کر چکی ہے اب ہاتھوں سے وہ۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”کپڑا لٹا کر بائٹ پکی ہے۔ قل کے لئے پنے منگوا کر رکھ لئے ہیں۔ کل خود ہی ختم دیا۔ کفن کا کپڑا بھی کر رکھا ہوا ہے۔ بس اب تو گھڑی پل کی بات ہے۔ جیسی تو میں رات کو اوھر ہی رہی لیکن ایلی تو اوھر فرحت ہی کی طرف سو سو۔ میں تمہیں وہاں چھوڑ کر واپس آ جاؤں گی۔“
”ہوں۔“ ایلی خاموش ہو گیا۔

”تو داوی کے پاس سو کر کیا کرے گا۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”اسے تو اپنا ہوش نہیں اس کا بگڑتا ہے۔ تو بڑی تکلیف ہوتی ہے اسے۔ تو کیا خدمت کرے گا اس کی۔ اس نے تو کئی سے خدمت نہیں کرائی آج تک۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ علی پور نہیں بلکہ امرتسری میں ہو۔ چاروں طرف لالچول ہوئی تھی۔ محلے کے اونچے لمبے مکانات خاموش کھڑے تھے۔ ٹانک چندی اینٹوں کی دیواریں ریگ رہی تھیں۔ دیواروں پر چمکڑا رنگین منڈا رہی تھیں وہ یوں جچ رہی تھیں جیسے اس کی پر قہقہے لگا رہی ہوں۔ کھڑکیاں دیران پڑی تھیں۔ جن پر سیاہ تیلیوں کے پردے بھول دیے دور کچی حویلی میں کڑی لال ٹین سرجھکائے سوچ رہی تھی۔

فرحت کی طرف جاتے ہوئے ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے علی پور ایک دیرانہ ہو اس نے ایک دھندلی اور لٹی ہوئی دنیا تھی۔ جس میں کوئی بات بھی جاذب نظر نہ تھی وہ محسوس کرتا جیسے جینے کے لئے کوئی جواز باقی نہ رہا ہو۔ جیسے زندگی اپنی تمام رنگینی اور دلچسپی کھو چکی ہو۔

پکڑی چلائی جاتی ہے اور وہ شرابور ہوا ہی چاہتا ہے۔ لیکن دفعتاً نہ جانے کیا ہو جاتا۔ بات مگر جالی، گال کی جگہ دو ایک پھول پتیاں برستیں اور پھر مطلع غبار آلود ہو جاتا۔ پھول پتیوں کا کیا تھا وہ تو ہر تبسم پر اڑا کرتی تھیں۔
 کچھ دیر ایلی شہزاد کے سامنے بیٹھا رہا۔ پھر اس کے لئے وہاں بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا۔ شہزاد نہ جانے کہاں تھی۔ اس کے چہرے پر ایک وقار تھا۔ بے حسی تھی۔
 ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”اچھا اب میں جاتا ہوں فرحت انتظار کر رہی ہو گی۔“
 ”اچھا تو مل آئے۔“ اس نے سر اٹھائے بغیر کہا۔ ”لیکن جائے یہاں پتیا نیچے جانو بنا رہی ہے۔“
 ”اچھا تو میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ فرحت کی طرف چل پڑا۔

احساس عظمت

نیچے صندر اندھیری کوٹھری کے ساتھ والا کمرہ صاف کر رہا تھا۔
 ”ہائیں ایلی ہے۔“ صندر اسے دیکھ کر چونکا ”چھٹی لے کر آئے ہو؟“
 ”دوای الہ۔“ صندر نے دانت پیسے۔ ”وہ نہیں مرے گی وہ کبھی نہیں مرے گی وہ مرے تو میں پانڈی دوں گا۔ ضرور دوں گا ایمان سے مذاق نہیں۔“
 ایلی کو صندر کی بات اچھی نہ لگی۔
 ”آؤ۔ آؤ۔ بیٹھ جاؤ ایلی۔“ صندر نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ ”بیٹھ جاؤ۔“
 ایلی بہت خوش تھا کہ محلے کا ایک بڑا لڑکا اسے اتنی اہمیت دے رہا تھا اور پھر وہ لڑکا جسے تھپڑ کی پاری لڑکی سے عشق تھا۔
 ”تم مجھ سے کبھی نہیں ملے ایلی۔ میرے پاس بھی آکر بیٹھا کرو۔ اوروں کے پاس بیٹھے ہو تو ہمارے پاس بیٹھنے میں کیا حرج ہے۔“
 ایلی کو صندر کی باتیں سمجھ میں نہ آرہی تھیں نہ جانے کیا کہہ رہا تھا وہ اس کے بازو عجیب انداز سے پھیلے ہوئے تھے۔ دائیں بازو پر نیلے حروف میں کچھ کھدا ہوا تھا۔ شاید اس پار سن کا نام ہو ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ ان نیلے حروف کے متعلق صندر سے پوچھے لیکن اس میں ہمت نہ پڑی۔

کا انداز عجیب سا تھا۔ جب وہ مسکراتی تو فضا میں اثبات کی پھلجھڑیاں چل جاتیں۔ لیکن جسے سنجیدہ ہو جاتی تو بے نیازی کا دبیز پردہ پڑ جاتا اور پھر وہ گویا ایلی کی موجودگی اور گویا وجود سے بے تعلق ہو جاتی۔ نہ جانے یہ کیا سحر تھا یوں لمحہ بھر میں اس قدر قریب آ جاتا اور پھر دور لمحے میں جیسے کوئی کوسوں دور ہو۔
 ایلی اکثر سوچتا تھا کہ وہ خصوصی مسکراہٹ کیا تھی جو قرب کا احساس دیتی تھی۔ نہ جانے اس کی مسکراہٹ میں کیا جادو تھا۔ جیسے کوئی ان جالی شہ گن آگئی ہو۔ اس نے کئی بار رفت کی بات کے ہونٹوں پر وہ مسکراہٹ دیکھی تھی مگر رفت پر اس کا ذرا بھی اثر نہ ہوتا تھا۔ گال کی ہر پکڑی تلے کھڑے ہو کر بھی وہ ویسے ہی خشک رہتا اور پھر تیوری چڑھا کر خشک آواز میں لے ڈانٹا ”دوپٹہ سنبھالو۔ سرنگا ہوا جا رہا ہے۔“ اور پھر باہر نکل جاتا۔
 کئی بار شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اس نے محسوس کیا تھا کہ شہزاد کی آنکھوں میں وہی نم کی لہر چمک رہی ہے اور اس نے محسوس کیا تھا جیسے شہزاد واضح الفاظ میں اپنے خلود سے بکڑ رہی ہو۔ جیسے دور کھڑے رہنے کے باوجود اس کے قریب آگئی ہو۔ اس کی گود میں بیٹھ لگی ہو۔
 شریف اس کے جواب میں گھورتا تو نہیں تھا۔ لیکن اس کی آنکھوں میں مسرت کی جگہ لڑائی جھلکتی حسرت اور اداسی اور پھر شہزاد اس کی حسرت بھری اداسی کو محسوس کر کے چونکتی۔ وہ بچھ جاتی، اور گھٹا ٹوپ اندھیرا چھا جاتا۔ ایسی چمک اس نے مردوں کی آنکھوں میں کبھی نہ دیکھی تھی۔ ہاں عورتوں کی آنکھوں میں کئی بار دیکھی تھی، لیکن عورتوں کی آنکھوں میں نہ جانے کیا ہوتا تھا۔ نہ جانے وہ نگاہ کیا تھی، مسکراتی تو وہ ویسے بھی تھیں لیکن ہر مسکراہٹ میں وہ بات چا

شہزاد اکثر مسکرا مسکرا کر ایلی سے باتیں کیا کرتی تھی۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ مسکراہٹ محض سطحی ہو لیکن شریف کی طرف دیکھ کر مسکراتی تو ایلی تڑپ اٹھتا۔ مسکراہٹ عام مسکراہٹ سے کس قدر مختلف ہوتی تھی۔ ایلی کا جی چاہتا کہ کوئی اس کی طرف ہی وہی مسکراہٹ لہرائے۔ ویسی ہی مسکراہٹ سے دیکھے۔ ان دونوں ایلی کی سب سے بڑی آرزو حسرت وہ مسکراہٹ تھی۔
 ایلی کے جسم کا بند بند اس نگاہ کا بھوکا تھا اور پھر شہزاد سے ”میرے ایسے نصیب کہاں ہے۔ سوچتا کہ شہزاد میری طرف وہ نگاہ ڈالے۔ پھر بھی کبھی کبھار وہ محسوس کرتا کہ وہ گال بھلا

راہ قلہ اسے اپنی عظمت کا احساس ہوا جا رہا تھا اگرچہ اس کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ احساس عفت کس وجہ سے ہے اور وہ سب اس سے مایوس کیوں تھے اور ان کا انداز حسرت زدہ کیوں تھا یہ سوچتا ہوا وہ شہزاد کی طرف چل پڑا۔

بے نیاز درزن

جب وہ داخل ہوا تو شہزاد اسی طرح بیٹھی مٹھین چلا رہی تھی اور اس کی نگاہ ریشمیں کپڑے پر جمی ہوئی تھی۔
”آگے تم۔“ اس نے نگاہ اٹھائے بغیر کہا۔ ”دیکھو تو کب سے چائے پڑی ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“

میز پر چائے کے برتن رکھے ہوئے تھے۔ چند ایک ساعت تو ایلی منتظر رہا کہ ابھی شہزاد آنکھ اٹھا کر اس کی طرف دیکھے گی لیکن وہ جوں کی توں کام کرتی رہی۔ آخر وہ سوچنے لگا کہ آنکھ اٹھا کر دیکھنا نہ سہی لیکن اٹھ کر چائے تو بنائے گی مگر جلد ہی اس کی غلط فہمی دور ہو گئی۔
”اب پی بھی لو نا چائے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے بھی ایک پیالہ بنا دو۔“ ایلی کے تمام سامنے خیال صلیں کے بلبلوں کی طرح پھوٹ گئے۔

اس نے محسوس کیا جیسے گرد و پیش دھندلا رہے ہوں۔ جیسے وہ گرا جا رہا ہو۔ بلندیوں سے نیچے کی طرف لڑھک رہا ہو وہ احساس برتری کا فور ہو چکا تھا۔ وہ سوچنے لگا ”میں چائے کا بھکاری تو نہیں جو میز پر رکھی ہے۔“ اس کا جی چاہا کہ اٹھ کر بھاگ جائے اور اپنے آپ کو اس برتر اور بے نیاز درزن سے محفوظ کر لے، لیکن اٹھ کر بھاگنے کی بھی ہمت نہ تھی۔ پھر دھنسا ”اسے یاد آیا کہ اس نے کہا تھا کہ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ“ ڈوبتے کو تنکے کا سارا مل گیا۔ میرے لئے بھی بنا دو ایک پیالہ۔ اس ایک فقرے میں جادو تھا کتنی اچھی ہے شہزاد۔ وہ محسوس کرنے لگا اور بھر چائے بنانے میں مصروف ہو گیا۔

اگلے روز صبح سویرے ہی شہزاد چہم سے آ نمودار ہوئی۔ ”چلو ایلی۔“ وہ بولی۔ ”میں کب سے انتظار کر رہی ہوں۔ چائے ٹھنڈی ہو رہی ہے۔“
”یہاں جو بنی ہوئی ہے۔“ فرحت بولی۔ ”دونوں بیٹھ کر پیس کیوں نہیں پی لیتے۔“ فرحت کے انداز میں طعنے تھے۔

اگرچہ صدر اس وقت کمرے کی صفائی کرنے میں مشغول تھا۔ لیکن کبھی کبھار وہ رگ اور اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔ سرخ بوندیاں اڑتیں۔ لیکن جلد ہی وہ چمک ماند پڑ جاتی۔ محرومیت کے بادل چھا جاتے وہ ایک آہ بھرتا۔ اس کے ہونٹوں میں وہی جنبش ہوتی۔ ”میں تمہارا۔“ کی جنبش، پھر وہ تڑپ کر مڑتا اور ایلی سے کہتا ”ایلی تم شریف کے پاس بیٹھا کرے۔ لیکن میرے پاس تم کبھی نہیں آئے۔ کبھی نہیں۔ حالانکہ ہم دونوں کا رشتہ زیادہ قریبی ہے اچھا۔ اچھا آج چائے اکٹھے پیئیں گے۔“

یعنی اس وقت چوبارے سے شہزاد کی آواز آئی۔ ”ایلی۔“ شہزاد کی آواز سن کر صدر چونک پڑا اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کا بندھن رگڑ کر رہا ہو۔

”ایلی چائے تیار ہے آؤ بھی نا۔“ شہزاد کی آواز گونجی۔
شہزاد کی آواز سن کر بھی چونک جاتے تھے۔ نہ جانے اس کی آواز میں کیا اثر تھا۔ آواز مکملے والیوں کی آواز سے قطعی طور پر مختلف تھی جسے سن کر یوں محسوس ہوتا جیسے وہ میں کوئی اڑتا ہوا پتھری تن اڑا گیا ہو، یا جیسے گھور گھٹا میں سورج کی کوئی کرن چمک گئی ہو۔ کی آواز سن کر مکملے کے بزرگ بھی چونک پڑتے تھے اور پھر کسی سے پوچھتے۔ ”یہ شہزاد ہے؟“ صدر نے ایلی کی طرف محروم نگاہ سے دیکھا۔ ”ہاں بھئی۔“ وہ بولا ”اب میں کیا کہوں۔ کچھ بھی نہیں۔ کون کچھ کہہ سکتا ہے۔“ اس نے ایلی سے یا اپنے آپ سے کہا ”اچھا وہ بولا“ کبھی تو ہم دونوں اکٹھے چائے پیئیں گے۔“

ایلی صدر کے کمرے سے باہر نکلا تو فرحت کھڑی تھی۔ ”ایلی تو کب آیا؟ مجھے تو پتا نہیں تھا کہ تو آیا ہے۔“ وہ حسرت بھری مسکراہٹ سے بولی۔ ”مگر میں شہزاد کی آواز نہ سنی مجھے معلوم ہی نہ ہوتا کہ تو آیا ہے چلو شکر ہے کہ ہم تیرا نام تو سن لیتے ہیں شہزاد کی زبان مان سہی۔ چائے تو ہمارے یہاں بھی تیار ہے۔“

”مگر۔۔۔“ اس نے شہزاد کے چوبارے کی طرف حسرت بھری نگاہ سے دیکھ کر کہا۔ فرحت مل جائے تو آئیو آئے گا۔ ضرور آئے۔“ فرحت کی آنکھوں میں نمی نمی سی دیکھ کر ایلی لرز گیا۔ وہ حیران تھا کہ وہ سب ایلی کی طرف سے اس قدر مایوس کیوں تھے۔ وہ سوچ رہا تھا۔ ان کی ان کسی شکایات کا کیا جواب دے مگر ان جانے میں ایلی میں ایک احساس برتری لہرائی

”میں نہیں۔“ شنزاد تن کر بولی۔ ”چائے کا مزا اکیلے میں آتا ہے۔“
 ”تو جیسی ایللی کو بلانے آئی ہو۔“ فرحت نے پھر وار کیا۔
 ”ہاں۔“ شنزاد نے قہقہہ لگایا۔

”مجھے بھی ساتھ لے چلو۔“ فرحت بولی۔
 ”نہ بھائی۔“ شنزاد نے جواب دیا۔

”معلوم ہوتا ہے شریف جاتے ہوئے ایللی کو ہمیں سوئپ گیا ہے۔“

”ہاں۔“ شنزاد مسکرائی۔ ”وہ کہہ گئے ہیں ایللی کو چائے پر ضرور بلایا کریں۔“

”اوہ“ فرحت شنزاد کی دلیری پر گھبرا گئی اور ایللی چپ چاپ شنزاد کے پیچھے چلی پڑی۔

جب وہ شنزاد کے چوہارے میں پہنچے تو شنزاد حسب معمول مشین کے سامنے بیٹھ کر لگا۔
 ”ایک پیالہ مجھے بھی بنا دو۔“ اور خود کام میں مصروف ہو گئی۔

دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھا چائے پیتا رہا اور شنزاد کپڑے سینے میں منہمک رہی۔ چائے پلا۔
 جب وہ نیچے اترا تو اندھیری کو ٹھنڈی میں صفدر کھڑا حسرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے
 ہونٹ ہنسنے ہوئے تھے جیسے ”حافظ خدا تمہارا گنگناٹا بھول چکے ہوں۔ ایللی کو دیکھ کر اس نے
 ایک ٹھنڈی آہ بھری۔ ہونٹوں پر ایک حسرت بھری مسکراہٹ آگئی۔ نہ جانے وہ کیوں اس کی
 طرف حسرت سے دیکھتے تھے۔ اس کا جی چاہا کہ چلا کر کہے۔ ”نہیں نہیں۔ میں نے خود اپنے ہاتھ
 سے چائے بنا کر پی ہے۔ میرے ساتھ میز پر کسی نے چائے نہیں پی۔“ لیکن اس میں اتنی جرات
 نہ تھی۔ چوگان میں عورتوں نے اس کی طرف معنی خیز نگاہوں سے دیکھا۔

”اے ہے۔“ ایک بولی۔ ”ایللی آیا ہے۔“

”میں کہہ رہی ہوں۔ یہ کیا گورکھ دھندہ ہے۔“ چاچی بولی۔ ”داوی تیری اس طرف پلا
 پڑی ہے۔ بن تیری ادھر ہے تو اس ڈیوڑھی سے باہر نکل رہا ہے۔“

”ہائے چاچی۔“ دوسری نے کہا۔ ”آج کل کے لڑکے گھر پر کھل بیٹھتے ہیں۔“

”نہ لڑکی۔“ چاچی نے پینتڑا بدلا۔ ”ہمارا ایللی ایسا نہیں۔ ہو گا کوئی کام آخر پڑ جاتا ہے۔“
 ”اس نے کان سے منہ لگا کر کچھ کہا اور پھر ہنسنے لگی۔

”دیکھ لو زمانے کے رنگ ہیں چاچی۔“

”یہی تو دیکھ رہی ہوں۔ تو بہ کیا زمانہ آیا ہے مگر ہمارا ایللی ایسا نہیں۔“

کیا کروں

پھر رضا اُٹھیا۔ ”ٹھیک ہے بابو اب کیوں ہمارے پاس آنے لگے تم۔ اب تو بس
 چہاروں میں بیٹھ کر چائے اڑتی ہے۔ لوگ بلا بلا کر پلاتے ہیں۔ مگر بابو جب اونچے چوہاروں سے
 کوئی کرے تو ہڈی پھلی ایک ہو جاتی ہے ہاں۔“ اس نے اپنی ننگری ٹانگ دکھاتے ہوئے کہا۔
 ”یقین نہ آئے تو یہ دیکھ لو۔“

”بکواس بند کرو۔“ ایللی نے بات مذاق میں ٹالنے کی غرض سے کہا۔

”کیسے کروں بند۔“ رضا ہنسنے لگا۔ ”اپنا تو کام ہی بکنا ہے۔ سنا امر تسروالوں کا کیا حال ہے۔ اب
 توڑے ہیں نا۔“

رضا اسے چھیڑنے لگا۔

”بیٹھ جا۔“ وہ بولا ”بیٹھ جا میاں۔“

”کوئی نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کیوں؟“

”بیٹھے کو بھی نہیں چاہتا چل کہیں گھومیں پھریں۔ واہ دل خوش کر دیا رضا نے لاشمی پکڑی اور
 چل پڑا۔ دیر تک وہ دونوں فاصل سے باہر گھومتے رہے پھر ایک درخت تلے بیٹھ گئے۔

”رضا۔“ ایللی بولا؟ ”میرا جی نہیں لگتا۔“

”جی لگ جائے بابو تو پھر بھی نہیں لگتا۔“

”کیا مطلب؟“ ایللی نے پوچھا۔

”سارے محلے میں تیری تسلیم کی باتیں ہو رہی ہیں۔“

”لیکن رضا تسلیم تو میرے سامنے نہیں آتی کئی جتن کر دیکھے“

”تسلیمیں سامنے نہیں آیا کرتیں ایللی۔ سامنے آکھڑی ہوں تو پھر بات ہی کیا ہے۔“

رضا نے کہا۔ یہ تو ہوتا ہی ہے۔ ”پھر ایللی امر تسر کی باتیں سنا تا رہا اور رضا قہقہے مار کر ہنستا رہا۔

میر کر کے جب وہ واپس آئے تو رضا سے رخصت ہو کر ایللی داوی اماں کی طرف گیا
 دلازے میں باجرہ کھڑی تھی۔ ”تو یہاں کیا کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”جا فرحت کی طرف دوڑ جا
 ملے۔“ ”کیوں؟“ ایللی نے پوچھا۔

شہزاد

”کما جو ہے تم سے۔“ وہ بولی۔ ”وہ اسی طرح بے ہوش پڑی ہے۔ آنکھیں کھلے سکت نہیں رہی۔ اس کے پاس بیٹھ کر اپنا دل برا کرے گا تو۔ جا فرحت تیرا انتظار کر رہی ہوگی وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چل پڑا۔

شام کو جب وہ شہزاد کے چوہارے میں پہنچا تو چوہارے سے ملحقہ چھت پر پانچ چھ چھلپائی ہوئی تھیں اور فرحت اور شہزاد چارپائی پر بیٹھی باتیں کر رہی تھیں۔

”تو آگیا ایل۔“ فرحت اس کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔ ”اچھا کیا تو نے کہ چلا آیا۔“

ایں کی حالت اچھی نہیں۔ نہ جانے کب۔“

— وہ رک گئی۔ ”ایں تو کئی راتوں سے ادھر ہی رہتی ہیں، آج کی رات — مجھے بھی جانا پڑے اسی لئے میں نے یہاں چارپائیاں بچھوا دی ہیں تاکہ بچے اکیلے نہ رہیں۔“

ہے ناشہزاد — ”وہ ہے تیری چارپائی ایل۔ وہ کونے والی۔“

رہنمائی اور سپیرا

رات کو شہزاد کی طرف دیکھے بغیر ایل اپنی چارپائی پر چپ چاپ لیٹ گیا اور سوچ میں غرق ہو گیا۔ محن میں چاندی۔ چٹکی ہوئی تھی رو پہلی چاندنی میں شہزاد کے دو بلوریں پاؤں کہیں رکھے ہوئے تھے اور سیاہ جالی دار دوپٹے میں اس کی دودھیا پیشانی پر ایک سیاہ بیرہوٹی چھٹی ہوئی تھی۔

دو نوکیلی آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ گھبرا کر ایل نے دیوار کی طرف منہ موڑ لیا اور کسی اور بات کے متعلق سوچنے کی کوشش کرنے لگا۔

کچھ دیر کے بعد دادی ایں کی طرف سے ہاجرہ نے فرحت کو آواز دی۔ ”ادھر آنا۔ جلدی۔“

”خدا خیر کرے۔“ فرحت نے گھبرا کر کہا اور ملحقہ کوٹھا پھلانگ کر دادی کی طرف چلی گئی۔

فرحت کے جانے کے بعد دیر تک خاموشی چھائی رہی۔ نہ جانے شہزاد بیٹھی کیا کر رہی تھی۔

ایل نے شہزاد کی طرف نہ دیکھنے کا عزم کر رکھا تھا مگر اس کے باوجود اس کی نگاہوں تلے سیاہ جالی دار دوپٹے کا پلوڑ رہا تھا۔ شفاف پیشانی پر سیاہ بیرہوٹی رینگ رہی تھی۔ ہر پانچ منٹ کے بعد اسے احساس ہوتا کہ وہ شہزاد کے متعلق سوچ رہا ہے پھر وہ گھبرا کر اپنی توجہ کسی اور طرف مبذول کرنے کی کوشش میں لگ جاتا۔

”سو گئے ایل۔“ قریب ہی شہزاد کی آواز سن کر وہ چونک پڑا اور گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”نہیں تو“



جاگ رہا ہوں۔

”اوه—— میں سمجھی سو گیا ہے۔ لیکن یوں چپ کیوں پڑا ہے تو“ وہ بولی ”گور کیا ہو“
ناچوں۔“ ایلی نے جل کر کہا۔

وہ بچوں کی طرح ہنسنے لگی ”ناچ تجھے کون منع کرتا ہے۔“

”اکیلے میں تو ناچا بھی نہیں جاتا۔“ وہ بولا۔

”تو کیا اکیلا ہے۔“ شہزاد نے اشارتاً اسے امرتریاد دلانے کی کوشش کی۔

”اکیلا ہی تو ہوں۔“ ایلی نے لمبی آہ بھری۔

وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ”اوه میں سمجھی امرتریاد آ رہا ہے تجھے۔“

”امر تر؟“ وہ گھبرا گیا۔

”تسلیم۔“ شہزاد نے جھک کر اسے آداب کیا اور پھر ہنسنے لگی۔

ایلی کا منہ فق ہو گیا۔ نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد امرتسر اور تسلیم کے متعلق کیا نہیں جانتی۔

”کبھی تسلیم سے ملاقات بھی ہوئی ہے؟“ شہزاد نے اس کے قریب آکر پوچھا اور پھر اس چارپائی پر بیٹھ گئی۔

ایلی کے جسم پر چوٹیاں رینگنے لگیں اسے محسوس ہونے لگا جیسے گرمی کی ایک لہر اس

طرف بڑھ رہی ہے۔ ان جانا اضطراب اس پر چھائے جا رہا تھا۔ ایک سرخ دھندلکا اس کی کپٹیا

میں تھرک رہا تھا۔ صحن میں زرد چاندنی اور گدرے سایوں کی عجیب سی دھاریاں پڑی ہوئی

تھیں۔ پاس ہی چوبارے میں اندھیرا رنگ رہا تھا۔ مسجد کے گنبد کے اوپر چمکندیں چاند

تھیں۔

”یاد آتی ہے تمہیں۔“ شہزاد نے ایلی کی طرف دیکھ کر پوچھا ”جسبی یوں چپ چاپ ہونا

ہے تو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔

شہزاد اپنے حنا لیدہ ہاتھوں سے کھیل رہی تھی۔ سفید ہاتھوں پر حنائی رنگ اسے ملے

دکھائی دے رہا تھا۔

”نہیں۔ نہیں۔“ وہ بولا

”اچھا۔“ وہ ہنسی ”اگر وہ یاد بھی نہیں آتی تو پھر فائدہ ہی کیا ہوا؟“

”فائدہ۔“ اس نے شہزاد کی اڑتی ہوئی لٹ کی طرف دیکھا۔

”اچھی محبت ہے یہ۔“ وہ بولی۔

”ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر بھاگ جائے وہ قرب نہ جانے کیا کر رہا تھا جیسے اسے چھیڑ رہا

ہو۔ اس کی قوت عمل دھندلائی جا رہی تھی نہ جانے قرب کی وجہ سے یا کسی ان کے ڈر سے جو

اس کی نگوں میں دھنکی کی طرح بج رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر اس نے بات کرنے کی

کوشش کی تو اس کی آواز کی لرزش راز فاش کر دے گی۔

”میں پانی پی لوں۔“ ایلی نے گھبرا کر کہا۔

”میں پلائی ہوں تمہیں پانی۔“ شہزاد اٹھ کھڑی ہوئی۔

ایلی کا بھاگ جانے کا یہ بمانہ بھی بے کار ہو کر رہ گیا۔ اس نے چاروں طرف دیکھا گھڑے

کے پاس شہزاد گلاس میں پانی ڈال رہی تھی۔ اس کے گرد چاندنی اور اندھیرے کی بساط بچھی ہوئی

تھی اور اس بساط پر ملکہ بیٹھی تھی۔ اس کے سر پر اڑتے ہوئے بالوں کا تاج تھا۔ ”یہ لو۔“ شہزاد

کا تالیفہ ہاتھ اس کی طرف بڑھا۔ ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایلی جھجک کر پیچھے ہٹا۔

”لو بھی“ ہاتھ اور قریب آگیا ایلی کا جی چاہتا تھا پانی کے گلاس کی بجائے اس کا ہاتھ پکڑے

اور پھر پھر۔ مگر پھر کے متعلق اسے کچھ معلوم نہ تھا۔ ایک سرخ دھندلکا

چمک چمک۔ ایک چمک چمک۔ اس کی طرف لپکی۔ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹا۔ شہزاد

نے گلاس چھوڑ دیا ایلی شرابور ہو گیا۔ شہزاد کی سریلی ہنسی سے فضا کو بچنے لگی۔

”بالکل ہی جنون بن گئے۔“ وہ چلائی۔ ”لاؤ میں پونچھ دوں۔“ وہ ہنستی ہوئی آگے بڑھی۔

سرخ ناگ بچن پھلائے پھر اس کی طرف لپکا بکا ایک رٹلا آیا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔ سرخ دیوانگی

اس پر مسلط ہو گئی۔ اس نے لپک کر اس رنگین سانپ کو ہاتھوں میں پکڑ لیا۔ جسے وہ سپیرا ہو۔

اسے اپنی طرف کھینچا۔ نہ جانے محض جنون کی وجہ سے۔ محبت سے۔ نفرت سے یا اس خوف کی

وجہ سے جو اس پر مسلط و محیط تھا۔ اس کی دیوانگی اور بھی شدید ہو گئی۔ اس نے ایک تازہ جھنکا

دے کر دیوانہ وار اسے اپنی طرف کھینچا۔ یوں بے دردی سے کھینچا۔ جیسے شہزاد محض ایک رنگین

گڑیا ہو۔ شاید وہ اسے دانٹوں سے کانٹا چاہتا تھا تاکہ کانٹے جانے سے پہلے اس کی گردن چبالے

اور اپنے آپ کو محفوظ کرے لیکن اس کے گرم لمس سے ایلی کے ہونٹ جلنے لگے اور ان جانے

لیکن شاید شہزاد کسی کو نہ بتائے۔ شاید وہ اس راز کو چھپالے۔ ابھی تک تو اس نے فرحت سے اس بارے میں بات نہ کی تھی۔ شاید وہ موقع کی تلاش میں تھی کہ کب اہلی کہیں جائے اور وہ اہلی کی حماقت کا قصہ بیان کرے۔ فرحت اور ہاجرہ سن کر کیا کہیں گی۔ کہیں گی۔ آخر بیٹا کس کا ہے۔ اس خیال پر اس کے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔

لیکن شہزاد کا رویہ بے نیازی اور بے پروائی کا مظہر تھا۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ اس کے اس رویے کی وجہ سے اہلی کے دل میں امید کی کرن روشن ہو گئی۔ شاید وہ کسی کو نہ بتائے۔ لیکن پھر اسے خیال آتا اگر نہ بھی بتائے تو بھی وہ اپنے دل میں اسے ذلیل سمجھے گی۔ اس کی اس مذموم حرکت پر رنجیدہ ہو گی۔ ممکن ہے اب کبھی اس کے قریب نہ آئے اور آئے بھی تو نفرت سے ہانک بیٹھ لے۔ کیا وہ ہمیشہ کے لئے شہزاد کی جھم سے محروم ہو جائے گا۔ کیا وہ اسے دیکھ کر کبھی نہ سکرائے گی۔ اس کی آنکھوں میں نصیحتیاں روشن نہ ہوں گی اور وہ گلال بھری پچکاری نہیں نہیں۔ اس سے تو یہی بہتر ہے کہ شہزاد فرحت سے شکایت کر دے۔ ہاجرہ سے کہے۔ شریف سے کہہ دے۔ جس سے جی چاہے کہہ دے مگر اپنا انداز نہ بدلے ہاں ہاں۔ میں اس سے معافی مانگ لوں گا۔ ہاتھ جوڑ دوں گا اور جب وہ معاف کر دے گی تو منت کر کے کہوں گا۔ ”میری ایک بات مان لو خدا کے لئے۔ صرف ایک بات۔ اپنے ہاتھوں پر مندی نہ لگایا کرو اور اگر اس کے بغیر چارہ نہ ہو تو اپنا ہاتھ میرے اس قدر قریب نہ لایا کرو۔“

چارپائی پر پڑے پڑے وہ سوچ رہا تھا۔ اس کے سر پر اندھیرے کا ایک بہت بڑا ٹکڑا منڈلا رہا تھا اور شیش محل کی سب سے اونچی منزل فیالی چاندنی میں اپنی بے نور کھڑکیوں سے اس کی طرف گھور رہی تھی۔ قریب ہی شہزاد فرحت سے باتیں کرتے ہوئے ہنس رہی تھی۔

شہزاد کی ہنسی سن کر وہ چونک پڑا۔ وہ ہنس کیوں رہی تھی۔ وہ باتیں کیوں کر رہی تھی۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ شاید وہ اس کی اس حرکت کو درخور اعتناء نہ سمجھتی ہو۔ اس خیال پر وہ پر کانپ میں کونٹیں بدلنے لگا۔

”گویہ اور دیکھو۔“ شہزاد ہنسی۔ ”ویسے سویا ہوا ہے لیکن کونٹیں لئے جا رہا ہے۔“ فرحت نے عجیبگی سے کہا۔ ”معلوم ہوتا ہے کہ تم نے کبھی خیال نہیں کیا سوتے میں ہمیشہ کونٹیں لیتا ہے۔“

میں اس نے اسے دیوانہ وار چومنا شروع کر دیا۔ شہزاد چارپائی پر یوں گر چکی تھی جیسے ایک ہارلم موٹکیا گٹھڑی میں تبدیل ہو گئی ہو۔

”اہلی تم —؟“ وہ ہونک رہی تھی۔

اہلی کی نگاہ میں وہ زرد چاندنی سرخ ہوئی جا رہی تھی۔ جیسے فضا میں گلال کی پچکاریاں ہل رہی ہوں۔

عین اس وقت لمحہ کوٹھے سے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔ فرحت چلاتی ہوئی آ رہی تھی۔ ”تم سو گئے کیا؟“

فرحت کی آواز سن کر وہ خونیں طلسم ٹوٹ گیا۔ اہلی کی گرفت ڈھیلی پڑ گئی۔ گٹھڑی ہلک کر کھڑی ہو گئی اور اہلی لیٹ کر یوں چپ چاپ پڑ گیا۔ جیسے عرصہ دراز سے سو رہا ہو۔

”تم ابھی گئی۔“ شہزاد نے کہا۔

”اماں نے بھیج دیا۔“ فرحت بولی۔

”کیا حال ہے اب۔“

”اچھا نہیں۔ شاید آج کی رات —“

”بیچاری کی جان چھٹے۔“

”میں سمجھی تم سوچکے ہو گے۔“ فرحت نے کہا۔

”نہیں تو۔“ شہزاد بولی۔ ”ابھی تو جاگ رہے ہیں۔“

”اور اہلی تو غالباً سوچکا ہے۔“ فرحت نے اہلی کی طرف دیکھ کر کہا۔

”ابھی تو باتیں کر رہا تھا۔ مجھ سے۔“ شہزاد کی آواز میں کسی قسم کی لرزش نہ تھی۔ وہ ہل

کوٹھے پر ادھر ادھر گھوم رہی تھی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

اگر۔ لیکن

اہلی پسینے میں شرابور تھا۔ اسے اپنے کئے پر پشیمانی ہو رہی تھی۔ میں نے کیا کر دیا۔ کیا کیا۔ اگر شہزاد نے فرحت سے کہہ دیا تو۔ اگر اس نے شریف کو بتا دیا تو وہ کیا کہے گا۔ مجھ سے نفرت کرنے لگے گا۔ دونوں مل کر تسخیر سے نہیں گے۔ اس تسخیر کو محسوس کر کے اٹھنا سانس رک گیا۔

”اچھا۔“ شنزاد کی آواز میں طنز تھی۔ سوتے میں جاگنے کی سی حرکتیں کرتا ہے اور جاگنے میں سوتے کی سی۔ عجیب بات ہے۔“

فرحت شنزاد کی بات سمجھ نہ کسی۔ البتہ ایلی کی پیشانی پر چند قطرے نمودار ہوئے وہ سوچ لگا کہ شنزاد کی آواز میں کتنی طنز تھی۔ ضرور اس نے اس کی اس حرکت کا برا مانا تھا۔ ضرور برا ہو گا۔ اب کیا ہو گا۔ کیا وہ اس گھر میں آنے سے محروم کر دیا جائے گا۔ ساتھ ہی اسے خیال آیا کہ شکر ہے اس نے کچھ تو مانا اسے اچھا نہ سہی برا سہی درخور اعتنا تو سمجھا۔ اگر وہ کچھ بھی سمجھتی تو اس خیال پر اسے خوشی تو ہوتی، مگر پھر وہی فکر سوہان روح ہو جاتا نہ جلنے لہ وہ کیا کرے گی۔

آہستہ آہستہ فرحت اور شنزاد کی آوازیں مدھم پڑتی گئیں اور ان کی باتوں میں وقفے پڑ گئے۔ حتیٰ کہ چاروں طرف سناٹا چھا گیا۔

وہ چونک کر جاگ پڑا۔ اس نے مڑ کر چوری چوری فرحت اور شنزاد کی چارپائیوں کی طرف دیکھا انہیں چپ چاپ پڑے دیکھ کر وہ پانی پینے کے بہانے اٹھ بیٹھا۔ فرحت چارپائی کے ایک پاؤ پر سٹی ہوئی پڑی تھی۔ اس سے پرے شنزاد چارپائی پر یوں جھجھی ہوئی تھی جیسے پلنگ پوش ہوتا ہے اس کے ہونٹوں پر بمبم سی مسکراہٹ تھی۔ ایک ہاتھ ساتھ والی چارپائی پر اپنی ٹانگیں صیبہ پر پڑا تھا۔ جیسے تھکتے تھکتے سو گئی تھی۔ ایلی بنے شدت سے محسوس کیا کہ کاش وہ صیبہ اور شنزاد کا ہاتھ اسے تھکتا۔

دھنسا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ہاتھ اسے تھپک رہا ہو اس کے بدن میں چونٹیل پڑ گئیں۔ سرخ ناگ پھن اٹھا کر اس کی طرف لپکا۔ ایلی کسی شدید جذبہ سے متاثر ہو کر شنزاد کی طرف بڑھا۔ اس کا جی چاہتا کہ اس رنگین پھن سے لپٹ جائے اور پھر ڈسے جانے کے بعد خوابیدہ حسینہ پر گر کر ڈھیر ہو جائے۔ لیکن عین اس وقت فرحت نے کروٹ لی اور وہ گھبرا کر اٹھ گیا اور پھر چپ چاپ اپنی چارپائی پر جا لیٹا۔

ندامت یا ڈر

اگلے روز ایلی سارا دن اس کوشش میں لگا رہا کہ شنزاد کے روبرو نہ جائے۔ وہ شنزاد ڈرتا تھا۔ صبح سویرے ہی اٹھ کر وہ باہر نکل گیا اور کوٹلی جا کر قبرستان اور تالاب کے گرد

معرف مہوتا رہا۔ واپس آکر چپکے سے اندھیری ڈیوڑھی سے گزر کر سیدھا فرحت کے گھر آچکا جلا تک عام طور پر وہ ہمیشہ شنزاد کے مکان سے گزر کر فرحت کی طرف آیا کرتا تھا۔ پھر جب دوسرا کوہ گھر بیٹھا فرحت سے باتیں کرنے میں منہمک تھا تو میزبانیوں سے طلبہ کی تھاپ سنائی دی۔ وہ پائوش ہو گیا۔ اسے بھول گیا کہ وہ کہہ رہا تھا۔ کیا کہتا چاہتا تھا۔ فرحت اور ہاجرہ حیرانی سے اس کی طرف دیکھنے لگیں۔ وہ اٹھ بیٹھا ”اچھا میں ہو آؤں۔“ جیم سے شنزاد اس کے قریب آرکی۔ ایلی نے نگاہیں جھکالیں۔

”ایلی ہے۔“ شنزاد نے لا پرواہی سے کہا ”نظر ہی نہیں آیا آج کہاں رہا۔“ وہ ہنسی اور فرحت کی طرف دیکھنے لگی۔

ایلی چپکے سے وہاں سے سرک گیا۔

چوگان دیران پڑا تھا۔ چھوٹے چھوٹے بچے جو چوگان میں کھیل رہے تھے، مٹی کے پتلے معلوم ہو رہے تھے۔ پرانی حویلی کی خمیدہ لال ٹین کمر پر دونوں ہاتھ رکھے اسے گھور رہی تھی۔ کپ کی کمز کی جتن لٹی لٹی دکھائی دے رہی تھی۔ کنوئیں کے پاس رہنے والی کشمیرن یوں بیٹھی تھی جیسے کسی نے چوکی پر زرد رنگ کے گوشت کا ڈھیر لگا رکھا ہو۔

بھر وہ دای امل کے پاس جا بیٹھا۔ مگر وہ خاموش چارپائی پر پڑی تھی۔ ”تو آگیا۔“ سیدہ نے اس کی طرف دیکھا۔ ”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”جا۔ جا کر کھیل۔ یہاں نہ بیٹھ بیار کے پاس نہیں بیٹھا کرتے۔“ کچھ دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا پھر گھبرا کر باہر نکل آیا۔ چاروں طرف دیرانی بھٹی ہوئی تھی۔

شام کو جب وہ فرحت کے ساتھ شنزاد کے کونے پر سونے کے لئے گیا تو اس نے جھکی جھکی آنکھوں سے محسوس کیا کہ شنزاد مسکرا رہی ہے۔ اس کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔ نفرت بھری مسکراہٹ۔

”تو ابھی بیس ہے ایلی؟“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی چلا گیا ہے واپس امر تر۔“

”نہیں تو۔“ شنزاد کی طرف دیکھے بغیر اس نے جواب دیا۔

”کیا ہوا ہے تجھے؟“ وہ بولی۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ایلی نے اس کی طرف دیکھے بغیر جواب دیا اور چپکے سے چارپائی پر لیٹ گیا۔

پاؤں پر مگر معافی مانگ لے لیکن پاؤں پر گرنا بھی تو مشکل تھا۔ اس نے شنراؤ کے پاؤں کے طرف دیکھا کتنے خوبصورت تھے۔ جیسے سنگ مرمر کے بنے ہوئے ہوں۔

شنراؤ نے کوٹ سی لی اور اس کا ایک بازو کرسی سے نیچے لٹکے لگ۔ ”مجھے تم سے ایسی توقع نہ تھی۔“ اس نے اپنی بات دہرائی۔ اس رنگین ناگ نے پھن اٹھایا۔ ایللی کی نگاہیں اوپر اٹھ گئیں۔ اس کے چہرے کی زردی سرخی میں بدل گئی۔ وہ اٹھ کر شنراؤ کی طرف لپکا اور اس کے لٹکے بازو سے یوں لپٹ گیا۔ جیسے کوئی نیولا سانپ سے لڑ رہا ہو۔

اس نے شنراؤ کو چپ کرانے کے لئے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا پھر نہ جانے کیا محسوس کر کے وہ شنراؤ کے بلوریں پاؤں سے لپٹ کر اپنے ہونٹ ان پر ملنے لگا ”شنراؤ۔ شنراؤ۔“ وہ گنگنایا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے۔“

لیکن ایللی دیوانہ وار اس کے پاؤں سے لپٹا رہا۔ آہستہ آہستہ شنراؤ کی آواز مدھم پڑتی گئی۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شنراؤ۔ مجھے تم سے محبت ہے شنراؤ۔ مجھے تم سے —“

ایللی کی آواز بلند ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ ایللی نے بڑھ کر شنراؤ کے لبوں پر مر سکوت لگا دی۔ اس ٹھنڈی کے پٹ از سر نو بند ہو گئے۔ اس کی آنکھیں جھک گئیں۔ مڑھان نے ان سیاہ شراروں کو ڈھانپ لیا اور اس کے بازو فضا میں معلق ہو کر رہ گئے۔

ممکن ہے۔ شاید

ایللی نے جواب میں یہ بات صرف اس لئے کہی تھی کہ اس کے علاوہ اور کوئی جواب دینا ممکن نہ تھا۔ معافی مانگ لینے کا امکان تو تھا۔ مگر اس میں اس کی بے عزتی تھی اگر وہ معافی مانگ لیتا تو اس کا یہ مطلب ہوتا کہ وہ حرکت اس نے کسی مذموم خیال سے کی تھی۔ سستی عیش و عشرت کے خیال سے یا رنگین وقت کٹی کے لئے۔ اس کے علاوہ اس نے محسوس کیا تھا کہ اگر معافی مانگ لی تو وہ شنراؤ سے ہمیشہ کے لئے دور ہو جائے گا۔ کس منہ سے اس کے رو برو جلیا کرے گا بے شک اسے شنراؤ سے بے پناہ دلچسپی تھی۔ شنراؤ کو دیکھ کر وہ مضطرب ہو جلیا کرتا تھا مگر یہ اضطراب بے نام اور بے مقصد تھا۔ اس نے کبھی شعوری طور پر شنراؤ سے محبت کرنے کی آرزو محسوس نہ کی تھی۔ نہ ہی اس نے کبھی سوچا تھا کہ شنراؤ سے وہ اس قسم کا تعلق پیدا کر سکا ہے۔ لہذا وہ تو اسے اس قدر بلند اور عظیم ہستی سمجھتا تھا کہ اس کے قرب کی آرزو دل میں

مر سکوت

اگلے روز وہ بہت دیر سے بیدار ہوا۔ اس نے کونٹھے پر چاروں طرف دیکھا۔ فرحت پاؤں تھی۔ شنراؤ کی چارپائی خالی پڑی تھی۔ صرف صبیحہ پڑی سو رہی تھی۔ موقعہ کو غنیمت جان کر ایللی جلدی سے اٹھا تاکہ شنراؤ کے آنے سے پہلے ہی فرحت کی طرف چلا جائے۔ جب وہ دروازہ میں داخل ہوا تو کسی نے زور سے اس کی قبض پکڑ لی۔ ”کہاں جاتا ہے تو؟“ — اور چائے پی کے جانا۔ ”شنراؤ کو دیکھ کر اسے ہیونہ آگیا۔ ”نہیں نہیں۔“ اس نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ادھر آکر بات کرنا۔“ وہ اسے گھسیٹ کر اپنے کمرے میں لے گئی اور کرسی پر بٹھا کر بے نیازی سے میز پر چائے کے برتن رکھنے میں یوں مصروف ہو گئی جیسے ایللی سے کوئی واسطہ نہ ہو جیسے وہ اسے پکڑ کر لائی نہ ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھا رہا۔ پھر وہ اس کے سامنے آ بیٹھی۔ ”پلی چائے۔“ وہ یوں گھور کر بولی جیسے بچے کو دوا پلا رہی ہو۔ ”پلی سانپ سوگھ با تجھے کیا۔“

”ہاں۔“ وہ بولا ”سانپ سوگھ گیا ہے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسی۔ ”پھر تو تو بڑا ڈھیٹ ہے کہ اب تک اچھا بھلا چلتا پھرتا ہے۔“

”لوگ نہ جینے دیتے ہیں نہ مرنے۔“ وہ بولا۔

”اتنی پروا کرتا ہے تو لوگوں کی۔“

وہ لا جواب ہو گیا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”ایللی۔“ وہ بولی۔ ”وہ کیا حماقت تھی۔ مجھے تجھ سے ایسی توقع نہ تھی۔“

ایللی۔ ”اس نے آہستہ سے کہا ”تجھے شرم نہ آئی۔“

ایللی کی ناگ پر ہیونہ آگیا اس کی آنکھیں اور بھی جھک گئیں سمجھ میں نہیں آتا تھا۔

جواب دے۔ ”اور پھر تو ایسی بات کرے۔ تو ایللی۔“ وہ بولی ”کوئی اور کرتا تو مجھے لگتا

ہوتا۔“

ایللی کے دل میں آیا کہ اٹھ کر بھاگ جائے مگر اس میں ہمت نہ تھی پھر اس نے

رہانے کے خیال ہی سے گویا اس کی جان نکلتی تھی۔

اگر اس ٹیلی چاندنی میں وہ تنہائی میں اس کے قریب نہ بیٹھتی یا اس کے ہاتھوں پر چڑھ کر نہ ہوتا یا حنا میں وہ بونہ ہوتی جو ایل کو مشتعل کر دیا کرتی تھی یا وہ ہاتھ ازراہ اتفاق ہاتھ کی طرح پھن نہ اٹھاتا اور ایل کو یہ محسوس نہ ہوتا کہ اسے اپنی حفاظت کرنی ہے تو وہ کبھی شہزادہ اپنی گرفت میں نہ لیتا۔

اگر شہزاد بار بار اسے نہ بلاتی تو اس کی گردن جھکی ہی رہتی اور آہستہ آہستہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اسے اپنی حماقت کا احساس ہو جاتا یا اگر شہزاد تنہائی میں اس سے اس کے اندر رویہ کے متعلق استفسار کر کے اسے لا جواب نہ کر دیتی تو وہ اپنی گزشتہ حماقت کا اعلان نہ کرتا۔ اس کی زندگی میں شہزاد کا رنگین بھنور پیدا ہی نہ ہوتا اور اس کی داستان حیات سراسر غم ہوتی۔

ان چھوٹی چھوٹی تفصیلات نے مل کر ایل کی زندگی کے دھارے کا رخ پھیر دیا۔ دیکھ کر طرح ایل کے لئے وہ رنگین ہاتھ تنکا بن گئے اور وہ ان رنگین ناگوں سے دیوانہ وار چٹکایا۔ ہاتھوں سے چمپنے کے لئے صرف ایک جواز ہو سکتا تھا۔ صرف ایک ”مجھے تم سے محبت ہے“ مجھے تم سے محبت ہے۔“ اپنی لغزش پر پردہ ڈالنے کے لئے وہ اس جملے کو دہرائیا کرتی کہ وہ وہ مکان اس کے اس جملے سے گونجنے لگے۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔“ نہ جانے ان الفاظ نے یا اس بڑھتی ہوئی شدت نے جس سے وہ ادا کئے جاتے تھے یا ان کی ادائیگی کے تازہ شہزاد کی عقل و خرد کو مغلوب کر دیا یا ممکن ہے کہ اس میں قوت دماغ باقی نہ رہی ہو۔ ممکن ہے شہزاد ان الفاظ کی بھوک ہو اور شریف نے ہمیشہ اسے اس جملے سے محروم رکھا ہو۔ اس لئے شہزاد نے انجانے میں ایل کو وہ الفاظ کہنے پر مجبور کر دیا ہو۔ شاید شہزاد اپنے خاندان کے رویے سے متاثر ہو چکی ہو جو ہر وقت ممکنگی لگائے چھت کی طرف دیکھتا رہتا تھا۔ جو کوہوتر کی آنکھیں بنا کر لڑتا تھا جو ہر بات پر آہ بھرتا تھا اور انور کی محبت کے خود ساختہ قریب میں ڈبکیاں لینے میں مشغول محسوس کرتا تھا اور شہزاد اس کے قریب اس بات کی تمنا میں کھلتی رہتی تھی کہ وہ ایک نظر ان طرف دیکھے۔ ایک بار ماضی کے دھندلے سے نکل کر حال کی طرف متوجہ ہو۔ ممکن ہے کہ شہزاد شریف کی سچی محبت کے آکا دینے والے تسلسل سے بیزار ہو گئی ہو اور اس کے دل میں انجانے میں بیدار ہو چکی ہو کہ وہ بھی کسی کی انور بن جائے۔ ہر صورت اس کی کئی باتیں

ہو نیچے یہ ہوا کہ شہزاد کو قریب دینے کے بعد ایل نے ان جانے میں اپنے آپ کو قریب دینا شروع کر دیا اس نے حقائق کو اپنے خود ساختہ جذبات کے ایندھن میں جلا جلا کر سرخ کر لیا اور اسے عین ہو گیا کہ اسے شہزاد سے محبت ہے۔

گودی کا گیند

اس روز وہ سارا دن شہزاد کے قدموں میں بیٹھا روتا رہا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد۔ مجھے تم سے عشق ہے۔ میں نے بار بار چاہا کہ انظار محبت نہ کروں۔ تمہیں ناراض نہ کروں۔ مجھے ڈر تھا کہ تم ناراض ہو جاؤ گی اور تم ناراض ہو جاؤ تو پھر زندگی میں باقی کیا رہ جاتا ہے۔ شہزاد تم ناراض تو نہیں۔ شہزاد۔ بولو تم خاموش کیوں ہو۔ میں تمہارے قابل نہیں شہزاد میں تمہارے قریب آجاؤں تو تم مٹی ہو جاتی ہو۔ تم چاند ہو شہزاد اور میں بے وقوف پتھر۔ میں تمہارے قابل نکلیں۔ مجھے برداشت کرو گی شہزاد۔ بولو شہزاد۔“

شہزاد حیرانی سے اس کی باتیں سنتی رہی۔ ابتدا میں تو اس کی حیرانی میں بیگانگی کا عنصر غالب تھا مگر آہستہ آہستہ وہ بے تکلی باتیں وہ احمقانہ شدت۔ وہ بے مصرف پگلا پن جو ایل کی باتوں اور چہرے سے ہوتا تھا اس کے دل پر نہ جانے کیا اثر پیدا کر گیا۔ ایل کی بے تکلی باتیں اس کے گلوں سے داخل ہو کر چہرے پر ریگنے لگیں گالوں پر سرخی بن کر جھلکنے لگیں آنکھوں سے پر نم مٹی بن کر جھانکنے لگیں۔

”تم میری حماقت کسی کو بتاؤ گی تو نہیں شہزاد۔ میری دیوانگی اپنے تک محدود رکھو گی نا۔ وعدہ کرو شہزاد، اگر تم نے کسی سے کہہ دیا تو میرا کیا ہو گا۔ پھر میں اس گھر میں کیسے آسکوں گا اور تم سے دور رہ کر زندگی کیسے کئے گی۔ شہزاد غصہ نہ کرنا۔ میں مجبور ہوں شہزاد۔“

شہزاد کے چہرے پر حیا کی سرخی جھلکنے لگی۔ اس کی آنکھیں جھپکنے لگیں۔ اس کی ناک پر ہلیر آنے لگا اور پھر اس کے بازو بے جان ہو کر ٹکنے لگے جیسے سپردگی کے شدید جذبے سے شل ہو چکے ہوں۔

مگر ایل کو یہ احساس نہ تھا کہ اس کے منہ پر حیا کیوں جھلک رہی ہے۔ اس کی ناک پر پسینہ کھل سوتیوں کی طرح ابھرتا رہا ہے اور اس کے بازو لٹک کیوں رہے ہیں۔ وہ ابھی تک زینے کی پہلی میز می پر ہی قدم جمائے کی جدوجہد میں دیوانہ وار مصروف تھا۔

”تم بتاؤ گی تو نہیں شنراو — تم مجھے معاف کر سکو گی۔ میں تمہیں دور سے دیکھا گا۔ دور سے بس۔ اتنا تو تم برداشت کر لو گی۔ نا۔“

ایلی عورت سے واقف نہ تھا اسے معلوم نہ تھا کہ اس کی بے نیکی باتوں نے شنراو کو کیا کر دیا ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ تمام کا تمام زینہ گر کر اس کے قدموں میں ڈھیر ہو چکا ہے پہلی سیڑھی پر قدم جمانے کی کوشش میں کھوئے رہتا بیکار ہے۔ اسے احساس نہ تھا کہ وہ رینگن ناگ اس کی الیز گرفت کے لئے خطر تھے۔ بے تاب تھے اور وہ ڈولتی ہوئی شریقی آنکھیں اس انتظار میں کھلی ہوئی تھیں کہ کوئی لمس انہیں بند کر کے راحت فراہم بخش دے اور وہ رینگن گھٹری جو ہر لمحہ بند ہوئی جا رہی تھی اس بات کی خواہشمند تھی کہ اسے اٹھا کر گودی کا گیند بنالے۔

اسے ان باتوں کا احساس بھی کیسے ہو سکتا تھا۔ وہ بیچارہ عورت اور محبت کی دنیا کی رہا بھی واقف نہ تھا۔ اس کا مقصد تو صرف اس قدر تھا کہ کسی نہ کسی طرح اپنے آپ کو پناہ حفاظت کو نشتر نہ ہونے دے اپنے خود ساختہ راز کو محفوظ کرے۔

عین اس وقت اگر باجرہ نہ آجاتی تو نہ جانے وہ دونوں کب تک یوں ہی بیٹھے رہنے کے پاؤں کی چاپ سن کر اس خطر موم گیا گھڑی کا طلسم ٹوٹ گیا۔ وہ اچھل کر اٹھ کر بیٹھنے لگی۔

”اچھا تو چائے۔ بتاؤں تیرے لئے۔“ وہ بولی۔

”چائے۔“ وہ گہرا گیا۔ چائے کی توبت ہی نہیں ہو رہی تھی۔

”نہیں نہیں۔“ شنراو بولی۔ ”اب تو چائے پی کر ہی جانا۔“

باجرہ کے آنے پر شنراو کا انداز ہی بدل گیا وہ یوں ہنس ہنس کر اس سے باتیں کرنے لگی بچی انتہائے معصومیت میں اظہار مسرت کرتی ہے۔ ایلی چپکے سے اٹھ بیٹھا اور کچا چوری سے باہر نکل گیا تاکہ کوئی اسے روک نہ لے۔ جوں جوں وہ شنراو کے چہرے سے ہوتا گیا تو اس کے دل میں اس سرنویہ ڈر پیدا ہوتا گیا کہ شنراو اہل کو وہ بات نہ شکایت نہ کر دے۔ اگر اس نے شریف سے کہہ دیا تو نہ جانے اس نے اسے معاف کیا کہ نہیں۔

فرار

باہر جا کر اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ واپس امرتسر چلا جائے گا تاکہ پھر شنراو کے ساتھ

خدا نہ رہے۔

گھر پہنچ کر اس نے اپنی تمام چیزیں اکٹھی کیں اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر نکلا۔ صحن میں فرحت ہنسیا پکا رہی تھی۔ ”میں جا رہا ہوں فرحت۔“ وہ بولا۔

”جا رہا ہے تو کیا واقعی جا رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”کہاں جا رہا ہے تو؟“ — ہائیں۔ اتنی جلدی۔ ”وہ حیران رہ گئی۔“ ”تمہیں تو ابھی چار دن اور رہنا تھا۔“

”نہیں۔ میں جا رہا ہوں۔ ابھی۔“ ایلی بولا۔

”آخر بات کیا ہے؟“ فرحت نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کسی بات سے ناراض ہو گیا ہے کیا؟“

”لو نموں۔“

”نہ جانے تو ہم سے کیوں ناراض رہتا ہے۔ ایلی۔ ہمارا کیا قصور ہے؟“

”نہیں تو۔“ وہ گہرا کر بولا۔

”تو کیا شنراو نے کہا ہے کچھ؟“

”میں کہتا ہوں۔“ وہ چڑ کر بولا۔ ”کچھ بھی نہیں۔ کسی نے کچھ نہیں کہا مجھ سے۔“

”تو میں شنراو کو بلاؤں۔ وہی تمہیں روک سکتی ہے۔“ فرحت نے غلصانہ طور پر کہا۔

”نہیں نہیں۔“ شنراو کا نام سن کر وہ ڈر گیا۔ ”مجھے امرتسر سے خط آیا ہے۔“

”خط آیا؟“

”ہاں میرا دست تیار ہے۔“

”لو۔“ اس نے اطمینان کا سانس لیا۔ ”تو پہلے کہا ہوتا مجھ سے۔“

”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“

”لیکن اہل سے تو مل کر جا اور تیری داوی اہل۔ وہ بھی تو تیار ہے اس کی حالت۔“

”یہ کہہ کر وہ چپکے سے سیڑھیاں اترنے لگا۔ اسے ڈر تھا کہ راستے میں اس کا کوئی دوست نہ

مل جائے۔ اگر رضال بھی گیا تو غضب ہو جائے گا۔ وہ اسے تنگ کرے گا۔ لیکن خوش قسمتی سے

ہنگن میں بچوں کے سوا کوئی نہ تھا اور رضا سے بچنے کے لئے وہ ایک اور راستہ اختیار کر سکتا تھا۔

بے تاب رہتا ہے۔ اس لئے بار بار گھر کو بھاگتا ہے۔" یہ کہہ کر وہ کچھ دیر تک خاموش بیٹھا رہا۔
 پھر اچھی آپ بولا "لیکن آخر وہ بھی تو گود ہے۔ دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں ہوتا۔" اللہ
 دلوں نے بی آہ بھری۔ "وہ بھاگتا بھری تھی اپنی۔ اللہ جانتا ہے اس کی گود میں پڑ کر مجھے بے بے
 بول جاتی تھی۔" ایللی یہ سن کر بھونچکا رہ گیا اس کم بخت کو کیسے معلوم ہو گیا کہ — اسے
 فہم آئے لگے۔ لیکن وہ کر ہی کیا سکتا تھا اور اللہ داؤ کی معصوم مسکراہٹ کے جواب میں غصہ کرنا
 بالکل ہی بے معنی معلوم ہوتا تھا۔ وہ چپ چاپ اٹھ بیٹھا اور ٹھٹھا ٹھٹھا نر کے کنارے پر جا پہنچا
 دراصل اس کا جی چاہتا تھا کہ اچانک نور سے ملاقات ہو جائے اور پھر شہ لگن آجائے۔ اس کے
 دل کے نچلے پردوں میں ایک شہ لگن جھٹک رہی تھی اور وہ چاہتا تھا کہ دل کی گمراہیوں سے نکل
 کر وہ اس پر مسلط و محیط ہو جائے اور پھر وہ پودوں کی اوٹ میں بیٹھ کر چپکے چپکے رووے۔ آنسو
 اس کے گلاں پر ڈھلکیں اور نور پوچھے۔ "کیا ہے جی۔" جیسے اس کی عادت تھی اور وہ جواب
 دے۔ "کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔"

"ہائیں۔" نر کے کنارے آصف کو بیٹھے دیکھ کر وہ حیران رہ گیا اس کی آنکھوں میں وہی
 پھوار پڑ رہی تھی لیکن یہ ظاہر نہ ہوتا تھا کہ آیا وہ خوشی سے سرخ ہو رہی ہیں یا غم کی وجہ سے۔
 "آگے تم —" اس نے دبی دبی او اس مسکراہٹ سے کہا۔

"ہاں۔" ایللی نے آہ بھری۔ "تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ نور کا انتظار کر رہے ہو کیا؟"
 "ہو نہیں۔" آصف نے نفی میں سر ہلایا۔

"تو پھر ایللی نے پوچھا۔ "سیر کرنے آئے تھے۔"

"سیر —" آصف نے زہر خند سے کہا۔ "میں کہاں جاؤں ایللی۔"

"کیوں۔" ایللی نے گھبرا کر پوچھا۔

"کوئی جگہ بھی تو نہیں رہی۔"

"کیوں۔" ایللی چلایا۔

دیس نکلا

"وہ — وہ — وہ —" آصف نے آہ بھر کر کہا۔
 "واپس آگئی ہے۔"

— ریل میں بیٹھے ہوئے وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے چاروں طرف دیکھ رہا تھا اس
 دنیا ہی بدل ہوئی دکھائی دے رہی تھی۔ سبزہ گویا نئے انداز سے لہرا رہا تھا۔ بوٹے عجیب شان
 کھڑے تھے۔ پھول بہت ہی شوخ تھے۔ جیسے رنگین دیئے ٹٹا رہے ہوں۔ کھیتوں میں ہلکے
 ہوئے کسان انوکھی رویمان بھری فضا میں ڈوبے ہوئے تھے۔ گاڑیوں چلی جاری تھی جیسے
 چھاتی پھلا کر پرواز کر رہا ہو۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ مناظر کے حسن پر رووے۔

امر تر پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے وہ کسی نئے شہر میں آپہنچا ہو جسے اس نے پہلے
 دیکھا ہو۔ سٹیشن کے گنبد الف لیلے کے کسی پر اسرار منظر کی یاد دلا رہے تھے۔ سڑکیں خوشی
 ادھر ادھر دوڑ رہی تھیں لوگ آ رہے تھے۔ جیسے کسی تقریب پر اکٹھے ہو رہے ہوں۔

لیکن بورڈنگ میں وہی دیرانی چھاتی ہوئی تھی۔ رامو بیٹھا برتن صاف کر رہا تھا۔ ہڈوٹا
 کی بورڈوں میں سرویئے بیٹھا تھا۔ ہر نام سنگھ، گورچن سنگھ اور جیون ایک درخت کے نیچے
 اپنے کیس سکھا رہے تھے۔ کمرے میں اللہ داؤ کرسی پر اپنی قبض پھیلائے خود فرش پر بیٹھا
 آم کی خشک سٹھلی رگڑ رہا تھا۔

"ارے۔" اللہ داؤ اسے دیکھ کر چلایا۔ "تو آگیا۔ بیٹا چار روز پہلے ہی ماں کی گود چھوڑ آیا۔"
 اونٹوں یہاں تیرا جی نہیں لگے گا۔"

"بک نہیں۔" ایللی نے بتاؤنی غصے سے کہا۔

"اچھا بھئی۔" اللہ داؤ چلایا۔ "ایک تم ہو کہ ماں کی گود نہیں چھوڑتے ایک وہ شفا ہے۔"
 سارا سارا دن یوں سانپ مارنے میں لگا رہتا ہے۔ جیسے کالج میں سانپ مارنا سیکھنے کے لئے
 ہو۔ بس ایک میں رہ گیا ہوں۔ محنت کرنے کے لئے۔" یہ کہہ کر اس نے مظلومانہ انداز سے
 پر آم کی سٹھلی رگڑنی شروع کر دی جیسے امتحان پاس کرنے کے لئے سر پر آم کی سٹھلی رگڑنا
 ہو۔

ایللی دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اسے اللہ داؤ کی باتوں سے کوئی دلچسپی نہ تھی نہ جانے
 تھا اسے، نہ نعتاً اسے اس بورڈنگ کالج اور شہر سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ وہ کمرہ چھوڑ
 ہو رہا تھا اور اللہ داؤ یوں لگ رہا تھا جیسے اجنبی ہو۔

دیر تک کمرے میں خاموشی چھاتی رہی۔ سٹھلی رگڑتے رگڑتے اللہ داؤ نے ایک نظر
 طرف ڈالی اور پھر چپکے سے بولا۔ "ارے بھائی پہلے تو ہم سمجھتے تھے کہ ایللی باپوں کی گود سے

”ہاں۔“ — وہ بولا۔ ”جیسے انتقام لینے آئی ہو۔“

”انتقام۔“ ایلی نے دہرایا۔

”اب وہ کسی کا لحاظ نہیں کرتی اور ایلی اب تو وہ اعلانیہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے گھر والے بیچارے ہار گئے ہیں۔ محلے میں کرام مچا ہوا ہے اور میں گھر سے بھاگا پھرتا ہوں۔ اب ہو ایلی۔ کیا کروں میں۔“

— ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اس میں مشکل کوئی تھی۔ یہ تو بلکہ اس کی فز نصیبی تھی۔ عجیب آدمی تھا آصف بھی۔

”دیوانوں کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتی رہتی ہے۔“

”دیکھتی ہے تو دیکھنے دو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اتنی رسوائی اتنی بدنامی ہو رہی ہے کہ۔“ آصف نے جھرجھری لی۔ ”میرا تمنا بنا رہا تھا کہ

اس کے گھر والے کہتے ہیں ہم کیا کریں۔ لڑکی ہوش و حواس کھو چکی ہے اور اگر اس پر۔“

وہ خاموش ہو گیا اور پھر حسرت و یاس بھری نگاہ سے اُس نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”میری طرف محلے والے یوں دیکھتے ہیں جیسے کوئی مجرم ہو۔ جیسے اس کی دیوانگی میلاد سے ہو۔ وہ تو پاگل ہو کر آزاد ہو گئی ایلی مجھ سے تو وہی اچھی ہے۔ لیکن میں کیا کروں میرا

گھر میں آنا جانا بند ہو چکا ہے۔ مجھے تو دیس نکال لایا گیا ہے۔“

”اچھا۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”اگر تم کو تو میں تمہارے بورڈنگ میں آ رہوں۔“ آصف نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“

”تو میں کل آ جاؤں۔“ آصف کے منہ پر مسکراہٹ پھیل گئی جیسے وہ ایلی کا سہارا بنا کر

ہو گیا ہو۔

”آ جاؤ۔“ ایلی خوشی سے چلایا۔ ”کتنا اچھا رہے گا۔ ہم صبح و شام اکٹھے رہیں گے۔“

آصف نے اس کا ہاتھ دیا اور نہ جانے کب تک وہ اسی طرح ہاتھ میں ہاتھ پکڑے ہوئے

کنارے بیٹھے رہے۔ آصف اپنے خیالات میں مگن تھا مگر ایلی کے روبرو کچھ اور ہی تھا ایک

گور بازو اس کی طرف بوہتا اور حنا مالیدہ ہاتھ اسے اپنی گرفت میں لے لیتا۔ ”ایلی تم لوگوں

پر داکرتے ہو؟“ — دو گلابی آنکھیں اس کی طرف دیکھتیں، گلاب بھری پچکاری چلتی اور

شرابور کر جاتی۔ وہ ایک نگاہ کس قدر مدہوش کن تھی۔ ایک نگاہ — اس نگاہ کو حاصل کرنے کے لیے ایلی دنیا کی بڑی سے بڑی مشکل کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کے خلاف

جھل کرنے پر آمادہ تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ آصف سے وہ راز کھدے کسی سے کھدے اور اپنے

آپ کو محفوظ کر لے مگر وہ شہزاد کا راز تھا وہ اسے کس طرح افشا کر سکتا تھا اور پھر آصف سے وہ

راز کہتا جو اس غم میں تسخّل رہا تھا کہ ایک حسینہ اس کے لئے پاگل ہو رہی ہے۔ بھلا شہزاد کی

مت کن نگاہ کو آصف کیسے سمجھ سکے گا۔ ایلی بات کہتے کہتے رک جاتا اور پھر آسمان پر پھیلی ہوئی

مرغی کو دیکھنے میں کھو جاتا اسے ایسا محسوس ہوتا جیسے شہزاد کے گالوں سے اتر کر وہ مرغی آسمان پر

پھیل گئی ہو اور اس کا ہر چھوٹے سے چھوٹا وجہ کہہ رہا ہو۔ ”تم لوگوں کی پروا کرتے ہو۔ تم

ایلی۔“ اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں پر نپل کے گھر چلے گئے اور اس سے درخواست کی کہ وہ

آصف کو ایک ماہ کے لئے بورڈنگ میں رہنے کی اجازت دے دے۔

پر نپل نے ان کی بات سن کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”آصف کیا بات ہے۔“ وہ مسکرایا۔

”بات تو کوئی نہیں پر نپل صاحب —“ آصف کے چہرے پر گھبراہٹ کا طوفان آ گیا جو

اس کی بات کو اعلانیہ جھٹل رہا تھا۔ پر نپل مسکرانے لگا۔ ”بھئی ایک بات کرو۔ زبان سے کہہ

رہے ہو کہ کچھ نہیں اور نگاہیں کہہ رہی ہیں بہت کچھ ہے۔“ ایلی نے گھبرا کر سچی بات کہہ دینے

کی غرض سے منہ کھولا۔ ”جی بات یہ ہے۔“ وہ بولا۔ آصف نے بھرپور نگاہ ایلی پر ڈالی اس نگاہ

میں ایک طوفان تھا۔ غصہ تھا۔ بے بسی تھی۔ منت تھی۔ دھمکی تھی۔ ایلی سسم کر خاموش ہو گیا۔

پر نپل نے ان دونوں کی طرف تعجب سے دیکھا اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ہنس کر بولا ”پڑھائی کا بہانہ نہ کرنا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرنے کا کیا فائدہ ہے تو

بہتر ہے کہ صاف کہہ دیا جاتا کہ اس کی وجہ بتانے سے ہم قاصر ہیں۔ ہر صورت مجھے یقین ہے

کہ تم شرارت کے درپے نہیں ہو اور کوئی ایسی بات سرزد نہ ہوگی جو کالج کے لئے باعث بدنامی

ہو۔“

”جی نہیں ایسی کوئی بات نہ ہوگی۔“ آصف بولا۔

”اچھا تو اجازت ہے۔“ پر نپل نے کہا۔ ”اب تم جاؤ اور آرام کرو مجھے صورت حال اچھی

نہیں دکھتی اگر تم مجھے دوست سمجھ کر بتا دیتے تو شاید میں مدد کر سکتا۔ لیکن خیر۔“

جب وہ بورڈنگ میں پہنچا تو لڑکوں نے اسے دیکھ کر شور مچا دیا۔ ”ایلی، ایلی، ایلی، ایلی، ایلی“

داوی اماں

تار — ایلی کا دل ڈوب گیا۔ تار آیا ہے۔ اسے زندگی بھر کبھی تار نہ آیا تھا۔ راز کھل گیا۔ نہ جانے اب کیا ہو گا۔ شہزاد نے وہ بات بتادی۔ اس روز کبھی جو قہقہہ ایلی سے ایسی توقع نہ تھی۔ تم نے یہ کیا کیا ایلی۔ ہائے تم نے یہ کیا کیا — ایلی کے پاؤں نے زمین نکل گئی۔ اب کیا ہو گا اور وہ برآمدے میں کھڑا ہو کر سوچنے لگا۔

”ارے جا کر پتہ بھی لگائے گا کہ نہیں۔“ شفیع چلانے لگا۔

اللہ داویولا ”بھئی تار والا اور ہی تو گیا ہے تمہیں دیکھنے کے لئے۔“

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چپکے سے بھاگ جائے۔ جہاں تار والا اسے تلاش نہ کر سکے گا۔ غفٹ سے بچ جائے مگر اسے تار والے کی تلاش کرنا ہی پڑی۔ اللہ داویا کے گم لڑکا سمجھیں گے اس کے باوجود وہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ تار والا جا چکا ہو۔

تار والے کو دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا۔ پیشانی پر پسینے کے قطرے ابھر آئے۔ بات بنے دیکھ کر اللہ داوی نے تار اس کے ہاتھ سے چھین لیا اور تار کھولتے ہوئے بولا۔ ”اللہ لاڈلے کی فرقت میں اداس ہو گئی ہو گی۔“ دفتنا ”اللہ داوی خاموش ہو گیا۔ اس کی اضطراب سے تار کو پھر تمہ کرنے میں مصروف ہو گئیں۔ ”ابے“ شفیع نے اس سے پوچھ لئے کچھ کہنا چاہا مگر اللہ داوی کا چہرہ دیکھ کر اس میں ہمت نہ پڑی دیر تک برآمدے میں غامض رہی۔ پھر آصف آہستہ سے بولا۔ ”ایلی تمہاری داوی اماں —“

”داوی اماں۔“ ایلی نے حیرانی سے دہرایا۔

”ہاں۔ تمہاری داوی اماں چلی گئیں۔“ آصف نے کہا۔

”چلی گئیں؟ —“ ایلی نے گھبرا کر تار کی طرف دیکھا اس کے منہ سے ایک جگہ

اور پھر دور سے آواز آئی۔ ”نہیں ایلی۔ کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“

جب وہ محلے کے چوگان میں پہنچا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ چوگان کے عین درمیان میں پڑا تھا۔ چاروں طرف محلے والے کھڑے تھے۔ محلے والیاں بچے چلاتے ہوئے کھڑے تھیں۔

رہے تھیں۔ محلے والے جنازے کے متعلق یوں تفصیلات طے کر رہے تھے۔ جیسے کوئی عام سی تقریب ہو۔ جس میں غم یا دکھ کا کوئی عنصر نہ ہو۔

ایلی کو دیکھ کر کوئی چلائی ”اے ہے لڑکے کو تو آئیے دو اپنی داوی کے قریب۔“

”ہائیں آگیا تو ایلی۔ شکر ہے آگیا تو۔“

”ہائے بہن اس کے بغیر تو دم نکلتا تھا اس کی داوی اماں کا۔“

”اس کے سوا اور تھا ہی کون اس کا۔ علی احمد نے تو کبھی پوچھا ہی نہیں۔“

”آخری دم تک یاد کرتی رہی تھی۔ لے دیکھ لے اس کا منہ۔“

ایلی داوی اماں کی طرف دیکھنے سے ڈر رہا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ مری ہوئی داوی کی طرف دیکھے۔ نہیں نہیں وہ جیتی ہے مری نہیں۔ اس کے تخیل میں وہ ابھی تک جیتی تھی۔ وہ نہیں مر سکتی۔ وہ کبھی نہیں مر سکتی ایلی نے نگاہ پھیر لی اور داوی اماں کی طرف دیکھے بغیر ہی وہاں کھڑا رہا۔

جنازہ

چاروں طرف لوگوں کا ہنگامہ لگا ہوا تھا ہر کوئی دوسرے سے بات کر رہا تھا — ان کی باتوں پر ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔ کیا انہیں داوی اماں کی موت کا غم نہیں۔ کیا انہیں اس کی موت پر دکھ نہیں ہوا یوں شوخی سے ایک دوسرے سے باتیں کیوں کر رہے تھے۔ ناگاہ ایلی کی نگاہ علی احمد پڑی۔ وہ چپ چاپ بت بنے کھڑے تھے۔

ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا جیسے وہ دکھ محسوس کر رہے ہوں۔ پہلی مرتبہ ایلی کو خیال آیا کہ ان کے دل میں بھی جذبات ہیں۔ انہیں بھی کسی کے مرنے پر دکھ ہوتا ہے۔ انہیں بھی عزیزوں کے دکھ سکھ کا احساس ہے۔ یہ احساس ایلی کے لئے بالکل نیا تھا اور اتنا عجیب تھا کہ اس نے جلد ہی اس سے مخلص پانے کی کوشش کی۔ پھر چار بزرگوں نے بڑھ کر جنازے کو اٹھایا اور وہ سب ان کے پیچھے پیچھے قبرستان کی طرف چل پڑے۔

علی پور کے بازار میں جنازے کو دیکھ کر راہ چلتے چلتے لوگ رک جاتے تھے۔ دوکاندار سودا مند تو ناچھوڑ کر ایک طرف ادب سے کھڑے ہو جاتے گاہک بازار سے ہٹ کر کسی بند دوکان کے تختے پر بٹھ جاتے۔ کھیلتے ہوئے بچے سہم کر رک جاتے اور منہ میں انگلیاں ڈال کر حیرانی سے اس جلوں کی طرف دیکھتے۔

نماز پڑھی تھی اور جہاں پاس ہی چادر سے ڈھکی ہوئی چارپائی پر داوی اماں پڑی تھیں۔ وہاں بیٹھے ہوئے اس نے اللہ سے بڑی عجز بھری دعائیں مانگی تھیں۔ ”یا اللہ یہ کیا ہو گیا اللہ داوی اماں اب مجھ سے کبھی نہ ملیں گی۔ یا اللہ۔“ اس نے بن سوچے سمجھے یہ سب دعائیں مانگی تھیں۔ اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ وہ دعائیں مانگ رہا ہے یا وہ دعائیں نہ تھیں بلکہ سوالات تھے۔ عجیب سوالات تھے۔ ایسے سوالات جن کا کوئی جواب نہ تھا۔ دعائیں مانگ کر وہ وہیں بیٹھ کر زمین کریدتا رہا تھا حتیٰ کہ اسے اس مقام سے وحشت ہونے لگی۔ دور لوگ قبر کھودنے میں مصروف تھے۔ قبرستان میں یہاں وہاں محلے والے ٹولیوں میں بیٹھے ہوئے دبی دبی آوازوں میں باتیں کر رہے تھے۔ جوان دور پختہ تالاب کی طرف نکل گئے تھے اور نوجوان نہ جانے کہاں تھے۔

وہ اٹھ بیٹھا اور پھرتا پھرتا ان کچی قبروں میں جا پہنچا جہاں محلے کے عام آدمی دفنائے جاتے تھے۔ وہ گھبرا کر رک گیا۔ سامنے صفر ایک پیڑ کے نیچے چپ چاپ بیٹھا تھا۔ نہ جانے وہ اپنی ہی دمن میں بیٹھا کیا سوچ رہا تھا۔ اس وقت اس کی آنکھوں میں چمک نہ تھی۔ بازو لٹک رہے تھے اور ہونٹوں پر کوئی بول نہ تھا۔

”تم ایل!“ — وہ اسے دیکھ کر گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ”آؤ آؤ۔ تالاب کی طرف چلیں۔ آؤ۔ اہی قبر میں اتارنے میں دیر ہے۔ آؤ۔“ اس کی آواز روٹی تھی۔

وہ دونوں چپ چاپ تالاب کی طرف چل پڑے۔ ”تم آگئے۔“ وہ بولا تم تو چلے گئے تھے اچھا کیا آگئے۔“ وہ بولا۔ ”بہت اچھا کیا۔ میں بھی جا رہا تھا مگر نہ گیا۔ محض اتفاق ہے ورنہ چلا جاتا۔“ اس کا گلا خشک ہو گیا۔

دیر تک صفر خاموش رہا۔ پھر زیر لب بولا۔ ”مرگئی۔“ اور چپ ہو گیا جیسے گلا آواز سے خالی ہو۔ پھر دفعتاً اس کے ہونٹ ہلے اور اس نے مٹی کا ایک ڈھیلا اٹھا کر دور پھینک دیا۔ ایل نے محسوس کیا جیسے وہ کہہ رہا ہو حافظ خدا تمہارا جیسے داوی اماں پارسی لڑکی ہو اور اس کے چلے جانے پر صفر کا گلا آواز سے خالی رہ گیا ہو۔

”تم کہتے تھے وہ مرنے بھی نہیں۔“ ایل نے گلو کیر آواز میں کہا۔

”ہاں۔“ صفر بولا۔ ”کہتا تھا۔ مگر وہ مر گئی۔ مر گئی۔“

ایسا معلوم ہوتا تھا۔ جیسے صفر کا وہ ایک لفظ داستان کو چھپائے ہوئے ہو۔

بازار سے نکل کر وہ کھیتوں میں جا پہنچے۔ کھیتوں پر کام کرنے والے کسان انہیں دیکھ کر اچھوڑ کر ان کے ساتھ چل پڑے۔

”کیوں بھائی کس کا جنازہ ہے۔“

”مائی کس کی والدہ تھی۔“

”اچھا وہ جو دفتر کے باپ ہیں۔“

”آیا کرتے ہیں کبھی اس طرف۔“

”کیا تکلیف تھی۔“

”جی ہاں۔“ وہ تو ہمانے ہوتے ہیں۔ اصل میں تو تقدیر کا لکھا ہوتا ہے جو ہو کر رہتا ہے۔

جنازے کے آگے محلے کے بوڑھے آخ تھو آخ تھو کرتے کھانٹے چلے جا رہے تھے۔

کبھار کوئی کھانٹے کے علاوہ مدھم آواز میں چلاتے ”یارب العزت یا اللہ۔“ — ”قادر مہم۔“

— ان کے پیچھے پیچھے محلے کے جوان تھے اور سب سے آخر میں محلے کے نوجوان دوڑ

ہوئے ایک دوسرے کو کہنیاں مارتے تھے، چٹکیاں بھرتے تھے، پھریوں سنجیدگی اختیار کر لیتے تھے

جیسے وہ ایسی حرکت کے اہل ہی نہ ہوں۔ کبھی کبھار نوجوانوں کی قطاروں سے دبے دبے فٹے

ہوتے جس پر محلے کے بوڑھے آخ کہہ کر رک جاتے اور تھو کرنے کی بجائے غصہ

نگاہوں سے پیچھے کی طرف دیکھتے۔

لیکن اس روز ایل سب سے پہلی قطار میں چل رہا تھا اسے احساس نہ تھا کہ بوڑھے

خیز انداز میں آخ تھو آخ تھو کر رہے ہیں یا جوان دزدیدہ نظروں سے کھیتوں میں جے

گھروندوں سے جھانکتی ہوئی سیاہ قام مگر نوجوان لڑکیوں کی طرف دیکھ رہے ہیں یا نوجوان

مار مار کر ایک دوسرے کو کسی قابل توجہ منظر کی طرف دیکھنے کا اشارہ کر رہے ہیں۔ اس روز

ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اس پر ایک پریشان کن قہقہہ مسلط اور

گھبراہٹ تھی نہ پریشانی نہ خوشی تھی نہ غم۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے۔

داوی اماں کی موت کا مفہوم کیا ہے۔ اس کے نتائج کیا ہوں گے۔ اس کی سمجھ میں نہ آ رہا

چلے جا رہا تھا خاموش بے حس!

وہ مر گئی

جنازے کی نماز کے بعد قبرستان میں دیر تک وہ اس جگہ بیٹھا رہا جہاں کھڑے ہو کر

”ہاں مرغی۔“

صفر کے کہنے کا انداز ایسا تھا کہ ایللی کی آنکھوں میں پھر سے آنسو آگئے مگر صفر ایللی میں گنگنائے چلا جا رہا تھا اور ہر دس قدم کے بعد چپکے سے کہتا ”مرغی۔“

بھیانک اداسی

داوی ایللی کو دفنانے سے فارغ ہو کر وہ محلے میں واپس پہنچے چوگان میں چاروں طرف کھڑکیوں اور منڈیروں پر غورتیں کھڑی تھیں اسے علم نہ تھا کہ شہزاد بھی وہیں کھڑی ہے۔ اس کے سیاہ دوپٹے میں ستارے چمک رہے ہیں بازو دوپٹے سے اٹکھے ہوئے ہیں۔ لمبی ترجمی آنکھوں پر مڑھاں ڈھلکی ہوئی ہیں۔ اسے شہزاد کے وجہ کا ہی احساس نہ تھا۔ وہ اسے بھول چکا تھا۔ یاد ہی نہ تھا کہ شہزاد نے اس کے ہاتھ تھام کر اس سے کہا تھا۔

”ایللی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو! — تم ایللی؟“

چوگان سے وہ ان جانے میں گھر کی طرف چل پڑا۔ لیکن سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ نے محسوس کیا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے۔ گھر میں اب کیا دھڑا تھا۔ کچھ بھی نہ تھا۔ تخت ویران پڑا ہو گا۔ چولیس کے پاس گھٹنوں میں سر دیئے کوئی بیٹھا نہ ہو گا۔ کوئی اس سے کہے گا۔

”تو آگیا۔ میں نے تیرے لئے کچھ رکھا ہوا ہے۔ ہنڈیا میں۔“

کوئی نہیں جتنے گا ”ہے تو نے تو میری ہڈیاں توڑ دیں۔“

کسی کا جھروں بھرا ہاتھ اسے تھپکے گا نہیں۔ ”کچھ بھی تو نہیں ایللی۔“ وہ روک رہا تھا۔

”داوی ایللی۔ داوی ایللی۔“ وہ قبر پر بیٹھا رو رہا تھا۔ ”داوی ایللی یہ کیا ہو گیا۔ کیا ہو گیا۔“

یہ۔ ”ایک بوڑھا چہرہ اس کی طرف دیکھ کر مسکرایا دو جھلی وار بازو اس کی طرف بڑھے۔

نہیں ایللی۔ کچھ بھی تو نہیں۔“ چاروں طرف بھیانک اداسی چھائی ہوئی تھی۔ قریب ہی کھڑا کراہ رہا تھا۔ دور چلی ہو تک رہی تھی۔ مغرب میں سورج غروب ہو رہا تھا۔

قبرستان سے اٹھ کر ابھی اس نے چند ایک قدم اٹھائے تھے کہ رضا ایللی۔ ”تم“

رضا کی طرف تعجب سے دیکھا۔

”چل۔“ رضا بولا ”تیرے ابا بلا رہے ہیں۔“ وہ خاموشی سے ایللی کے ساتھ ساتھ چلنے لگا۔ ایللی کا منہ نہیں چاہتا کہ گھر جائے لیکن وہ چپ چاپ رضا کے ساتھ چل پڑا۔

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد نے اسے اپنے پاس بٹھالیا۔ ”بیٹھ جاؤ ایللی۔ تم کہاں آوارہ گھوم رہے ہو۔“ فضول۔ ایللی کی ماں۔ ”انہوں نے ہاجرہ کو بلایا“ اس کا بستر بچھا دو یہاں۔ آج یہ یہیں رہے گا ہمارے پاس۔“

ایللی تم۔ تم ایللی

اگلے روز صبح سویرے ایللی چپکے سے علی پور سے امرتسر چلا آیا۔ نہ جانے اس کے لئے علی پور میں رہنا کیوں ناممکن ہو چکا تھا۔ اس کا منہ چاہتا تھا کہ علی پور سے چلا جائے اس مکان سے دور بھاگ جائے اس کے لئے اس تخت کی طرف دیکھنا ناممکن ہو چکا تھا جہاں داوی ایللی بیٹھ کر نماز پڑھا کرتی تھی۔

وہ رات علی پور میں اس نے یوں کائی جیسی کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ داوی ایللی فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے کانٹوں پر پڑا ہو۔ اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ داوی ایللی فوت ہو چکی ہے۔ ایسے محسوس ہوتا تھا جیسے وہ اپنے تخت پر بیٹھی نماز پڑھ رہی ہو اور ابھی وہ نماز سے فارغ ہو کر چارپائی پر اس کے سر ہانے آ بیٹھے گی اور اپنے جھلی دار ہاتھوں سے اسے تھپکنے لگے گی۔ ”سو جا ایللی سو جا۔ کچھ بھی تو نہیں۔“

اس خیال پر ایللی کو خوف سا محسوس ہوتا کہ داوی مر چکی ہے اور اب وہ کبھی آکر اس تخت پر نہ آئے گی۔ اسی بے نام ڈر کی وجہ سے اب کی بار علی پور میں رہنا اس کے لئے ناممکن ہو گیا تھا۔ علی الصبح وہ اٹھ بیٹھا۔ سیدہ کھڑکی کے پاس بیٹھی قرآن کریم پڑھ رہی تھی۔

”خالد۔“ اس نے سیدہ کی طرف دیکھے بغیر کہا۔ ”میں جا رہا ہوں۔“

”کہاں جا رہا ہے تو۔“ سیدہ نے سرسری طور پر پوچھا ”جا رہا ہوں۔“ اس نے سر کی جنبش سے ظاہر کرنے کو شش کی۔ ”میں پوچھ رہی ہوں کہاں جائے گا تو اس وقت“ سیدہ چڑ گئی۔

”امرتسر؟“ وہ یوں بولا جیسے امرتسر اس مکان کے کسی کمرے کا نام ہو۔

”ہاں۔“ ایللی نے کہا ”مجھے جانا ہی چاہئے۔“

”ابا سے تو پوچھ لے۔“ وہ جھنجھلا کر بولی۔

”نہیں۔“ وہ بولا ”پوچھنے کی کیا بات ہے اس میں۔“

”نہیں نہیں یہ مناسب نہیں۔“ وہ بولی۔ ”بڑوں سے بات کرنا اچھا ہوتا ہے۔“

ایلی نے گویا سیدہ کی بات سنی ہی نہیں۔ وہ سیڑھیوں کی طرف چل پڑا۔

سیدہ نے شور مچایا۔ ”ایلی امر تر جا رہا ہے میں کستی ہوں شا آپ نے ایلی جا رہا ہے۔“ اور اسے آوازیں دیتی رہ گئی۔

علی احمد کی آوازیں سن کر وہ رک گیا اور اسے ان کے روبرو حاضر ہونا پڑا۔

”مجھے امتحان کے لئے تیاری کرنی ہے۔“ اس نے کہا ”مجھے جانا ہی چاہئے۔“

یہ بات سن کر علی احمد خاموش ہو گئے۔

”یہ تو بلکہ اچھا ہی ہے“ سیدہ بولی۔ ”پڑھائی میں لگ جائے گا۔“

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے دل کا بوجھ اتر گیا ہو۔ وہ خلاص اور مسلط اور محیط تھا اب ختم ہوا جا رہا تھا۔ لیکن اب غم بوند بوند اس کے بند بند میں سرایت کرتا تھا۔

ایلی کی نفسیات کی یہ عجیب خصوصیت تھی کہ کسی تکلیف وہ واقعہ پر اس کے دل کو دھچکا نہیں لگتا تھا بلکہ ایسے واقعہ کی خبر سن کر اس کے ذہن میں ایک خلا پیدا ہو جاتا جو اسے تخیل اور احساسات کو شل کر دیتا۔ دیر تک اس پر یہ کیفیت طاری رہتی۔ جیسے وہ عالم غلبہ گھوم پھر رہا ہو۔ پھر بوند بوند غم اس کے دل میں سرایت کرتا۔ اواسی چاروں طرف سے آ کر کرتی۔

گاڑی میں بیٹھتے ہی ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے ساری دنیا ایک بے معنی پھیلا ہو۔ اس طرف سے اواسی امڈی آ رہی تھی۔ دور درختوں کے جھنڈ میں داوی امل اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔ اس کا ہاتھ ایلی کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ”اے ہے کیا ہے تمہیں۔“ کچھ بھی نہ ہوا۔ کچھ بھی تو نہیں۔ ”لیکن اس کے باوجود ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے کچھ ہو گیا ہو۔ کچھ نہ ہو۔ ایلی نے آہ بھری۔ ”اب مجھے کون تھک کر سلائے گا۔“

دلفت اس کی نگاہ تلے گھاس کی سبز ٹھٹھری میں حرکت ہوئی۔ شتراو کا جسم چوم رہا تھا۔ پھولدار دوپٹے سے گورا چٹا بازو برآمد ہوا۔ ”میں جو ہوں۔“ وہ مسکرائی۔ ”میں جو ہوں۔“

بول گئے کیا۔“

شتراو کو دیکھ کر وہ ششدر رہ گیا۔ ”ہائیں“ گھبرا کر اس نے شتراو کی طرف دیکھا شتراو تو

بالکل اس کے ذہن سے مفقود ہو چکی تھی۔ اسے اس کے وجود کا احساس ہی نہ تھا۔ پورے

چہرے تھکے علی پور میں رہنے کے باوجود اس کے ذہن میں شتراو کا خیال نہ آیا تھا اس نے محسوس

کیا گویا وہ بہت بڑے کنارہ کا مرتکب ہوا ہو۔ علی پور ایک دن رہنے کے باوجود اسے شتراو کا خیال

بھی نہ آیا تھا۔ جیسے شتراو اس کے لئے ایک دم معدوم ہو گئی ہو۔ شتراو کے گھر کی دیواروں کی

طرف دیکھنے کے باوجود اس کی کھڑکی کے سامنے کھڑے ہونے کے باوجود اس کا احساس ہی نہ ہوا

تھا۔ اپنی اس دیوانگی پر وہ بوکھلا گیا۔ نہ جانے وہ دل میں کیا کہتی ہوگی ہو سمجھتی ہوگی کہ اس روز

اس کے بازو پکڑ کر جو کچھ ایلی نے کہا تھا وہ سب جھوٹ تھا۔ فریب تھا محض وقتی دل بسلاوا تھا۔

اس پر اس کے سینے پر سانپ لوٹ گیا۔ شتراو دل میں کیا کہتی ہوگی۔ اف ایلی نے دونوں ہاتھوں

سے سر تھام لیا۔

پھر اس کے دل میں شبہات پیدا ہونے لگے۔ شاید شتراو کو اس کی آمد کا احساس ہی نہ ہوا

ہو۔ شاید اس نے ایلی کو قاتل تو جہ ہی نہ سمجھا ہو۔ شاید اس کی وہ مسکراہٹ وہ جملہ۔ ”تم لوگوں

کی پروا کرتے ہو؟ ایلی تم؟“ محض ایک مذاق ہو ایک ادا ہو۔ پھر اسے اس تمام واقعہ کی حقیقت پر

شک پڑنے لگا۔ شاید یہ سب کچھ میرے دماغ کی اختراع ہو۔ ورنہ شتراو میری پروا کرے؟ نہیں

نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ شتراو سی رنگین حسینہ مجھے دنیا کے روبرو کھڑے ہونے کی شہہ دے۔

نہیں نہیں یہ سب خوش فہمی ہے۔ محض خوش فہمی!

یہ سوچ کر ایلی گھبرا گیا۔ اس کی گرد و پیش سرسبز کھیت ویران ہونے لگے سروسوں کے پھول

خزاں زندہ پتے دکھائی دینے لگے۔ پھر دور در ایک ٹیلے پر کھڑی ہو کر کوئی مسکرانے لگی۔ اس

کے بازو ایلی کی طرف بڑھنے لگے۔ حنا مالیدہ ہاتھوں کی مٹھیاں کھلیں۔ ”ایلی تم؟“ وہ مسکرا کر

بولی۔ ”تم ایلی؟“ وہ آواز گاڑی کے پیروں میں گونجنے لگی۔ ایلی تم، تم، تم ایلی۔ ”گاڑی کی رفتار

تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ساری کائنات پھولدار آئینے میں لپٹی جا رہی تھی۔

اکاٹھٹ

پورڈنگ کی سڑک پر نہر کے قریب اسے مراد نور ملے وہ دونوں پورڈنگ سے واپس آ

نے سر اٹھایا اور تہہ بند جھاڑ کر کہنے لگا: ”یہ تو جاتا آتا ہی رہتا ہے۔“
 شفیع نے اللہ داد کو ڈانٹا ”بک نہیں۔ داوی اماں کی موت کو تو کیا جانے۔“
 ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ اللہ داد نے زیر لب کہا ”نہ اپنی کوئی داوی اور نہ اماں۔ وہ جو کمرے
 میں رہتی ہے ناخوشید بانی اس کے پاس گیا تھا۔ بہتری منتیں کیس کہ مجھے بیٹا بنا لو لیکن سالی نے
 بات سنی ہی نہیں الٹا میرا شیوں سے کہہ کر مجھے باہر نکلوا دیا۔ لو بولو۔ اب میں کروں تو کیا
 کروں۔“

شفیع ہنسنے لگا۔ ”میں بتاؤں۔“ وہ بولا۔ ”بس چپ چاپ بیٹھا رہ تو۔“
 اللہ داد آہ بھر کر خاموش ہو گیا۔

رات کو کھانا کھانے کے بعد آصف اور اپلی چل قدمی کے لئے باہر نکل گئے۔ فضا بے حد
 لاس تھی۔ چاروں طرف خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ اندھیرے میں وحدتی سڑک ڈراؤنا منظر پیش
 کر رہی تھی۔ چپ چاپ وہ دونوں کہنی باغ کی طرف چلے جا رہے تھے۔ دفعتاً ”آصف گویا اس
 خاموشی سے آتا کر بولا ”ایلی۔“

”جی۔“ ایلی نے اپنے خیالات میں ڈوبے ہوئے کہا۔

”میرا کیا ہو گا ایلی۔“

”کیوں؟“

”میرا انجام کچھ اچھا معلوم نہیں ہوتا۔“ وہ بولا

”خواہ مخواہ۔“

”خواہ مخواہ نہیں۔“ آصف نے کہا۔ ”میں محسوس کرتا ہوں۔“

”کیا محسوس کرتے ہو۔“

”جیسے جیسے نہ جانے کیا ہونے والا ہے۔“

”آخر بات تو اتنی ہے ناکہ وہ آگئی ہے۔“

”نہیں یہ نہیں۔“ آصف نے آہ بھری۔
 ”پھر؟“

”اس کی بات نہیں۔“

”تو پھر کس کی بات کر رہے ہو؟“

رہے تھے۔

وہ دونوں ایلی کے قریب سے گزر گئے۔ چار ایک قدم چلنے کے بعد وہ رک گئے مگر کراہ
 گیا اور نور ایلی کی طرف بڑھا۔ اس کے ہونٹوں پر وہی غم تھا۔ آنکھوں میں وہی نگاہ تھی۔
 دیکھ کر ایلی ندامت سے زمین میں گڑ گیا مگر کیا کہے گا۔ وہ ایلی کے متعلق کس قدر غلط فہمی
 لگائے گا۔

”آگئے۔“ نور نے ترچھی نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“

”بک آئے۔“ نور کی نگاہوں نے ایلی کے چہرے پر بچے گاڑ دیے۔

”ابھی۔“

”وہ مجھے ادھر آنے نہیں دیتے۔“ اس نے شکایت کی۔

”کون؟“

”وہی۔“ وہ مسکرایا ”محلے والے۔“

”کیوں؟“

”پتہ نہیں۔“ نور نے ہونٹ بٹھ سے بتائے۔

”اچھا۔“ ایلی چل پڑا۔

”وہ شک کرتے ہیں۔“ اس نے ایلی کا راستہ روک لیا۔

”ہوں۔“ ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

”پھر؟“ نور نے یوں اس کی طرف دیکھا جیسے کہہ رہا ہو تم ان کے شکوک کو پورا کیوں نہیں
 کرتے۔

”پھر کچھ نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا اور بورڈنگ کی طرف چل پڑا جیسے وہ نور کی بات سمجھ

تی نہ ہو۔ چاروں طرف آکٹاٹ پھیلی ہوئی تھی۔

آموں کی کوٹھی کے میدان میں بت سے لڑکے بیٹھے کھانا کھا رہے تھے۔ رسولی

پھلکوں کی بارش ہو رہی تھی۔

”آگئے بابو جی۔“ رامو اسے دیکھ کر مسکرایا۔ اس نے غلیظ دانت چپکے۔

”کمرے میں آصف ہاتھوں میں سر دیئے بیٹھا تھا۔“ تم آگئے۔“ وہ ایلی کو دیکھ کر بولا۔

”میں کستا ہوں۔ یہ لڑکیاں مجھے تنگ کیوں کرتی ہیں؟“ اس نے آہ بھر کر پوچھا۔
”تنگ تم خود ہوتے ہو آصف۔“ ایلی نے کہا ”وہ نہیں کرتیں۔“

”تمہیں نہیں معلوم۔“ آصف نے جواب دیا ”اب دیکھو تا کتنی بدنامی ہو رہی ہے مجھے
جانے اس نے وہاں گھر میں کیا طوفان پا کر رکھا ہے۔ اماں کیا کہتی ہوں گی اور پھر محلے والے
پہلے ہی کہتے تھے۔ تالی ایک ہاتھ سے نہیں بچتی۔“

”تو انہیں کہنے دو تمہارا کیا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔
”نہیں نہیں۔“ آصف چلایا ”تم ایسا نہ کہا کرو۔“
”تو بتاؤ کیا کہوں میں۔“

”یہ بتاؤ کہ میرا کیا ہو گا؟“ آصف نے پھر آہ بھری۔
”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی چڑ گیا۔

”نہ جانے کیا ہو گا؟“ آصف نے ہاتھ مل کر کہا۔ کچھ دیر کے لئے وہ دونوں خاموش
چلتے رہے پھر آصف نے بات بدل۔

”ایلی۔“ وہ بولا ”تم نیم سے نہیں ملے؟“

”نیم۔“ ایلی چونک پڑا۔ وہ نیم کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔
”مجھ سے چھپاتے ہو۔“ آصف ہنسا۔

”نہیں تو۔“ ایلی نے کہا۔ ایک ساعت کے لئے اس کے دل میں آئی کہ آصف سے
کی بات کہہ دے لیکن اس میں جرات نہ ہوئی۔ آصف سے بات کرنا ممکن نہ تھا ایلی محسوس
تھا۔ جیسے طبعی رہنمائی کے باوجود آصف ایک ملا تھا۔ جس سے دل کی بات نہ کہی جاسکتی تھی۔
اگلے روز کالج سے فارغ ہو کر ایلی آغا کی طرف چل پڑا۔ اسے اس کوچے سے جا
دلچسپی تھی، ان چروں سے تو اسے ڈر لگتا تھا جو کھڑکیوں اور جنگلوں میں بنے سنورے دکھائی
تھے۔ لیکن کھڑے والیوں کی لودھار آوازیں سن کر ایلی کے دل پر سانپ لوٹ جاتا۔
محسوس ہوتا جیسے کوئی کلیجہ مسل رہا ہو۔ اس میٹھی جلن میں کس قدر لذت تھی۔ پھر جب
کسی ایک چوبارے میں بین کرتی اور طلبہ سر پٹتا تو ایلی پر کیفیت طاری ہو جاتی۔
ابھی وہ چوک میں ہی تھا کہ حسی نہ جانے کہاں سے آدھمکا۔ ”ارے تم ایلی؟“ وہ پوچھا
تو جیسے کھو گئے۔ کیا ہوا تمہیں۔“

”واہی اماں فوت ہو گئیں تھیں۔“ ایلی نے رونی آواز میں کہا۔

”اوہ۔“ ایک ساعت کے لئے حسی خاموش ہو گیا۔ پھر وہ مخصوص انداز سے مسکرانے لگا۔

”واہی باتیں ایسا ہی کیا کرتی ہیں۔ ان کی تو عادت ہی ایسی ہے اب چھوڑو بھی۔ تم نے تو ایسا حال
پارکھا ہے۔ جیسے دنیا تیگ دو گے۔ آؤ تمہیں اپنی عاشق کے پاس لے چلوں۔ اسے دیکھ کر سب
کچھ بھول جاؤ گے۔ شرط لگا لو۔ نہ بھولو۔ تو اپنا ذمہ۔ میں اپنے دکھ وہاں اٹھا کر لے جاتا ہوں اور
وہ ایسی اچھی ہے کہ ایک نظر دیکھ لے تو سب بھول جاتا ہے آؤ۔“ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ حسی اسے
زبردستی ساتھ لے جائے لیکن اس کے باوجود اس کے دل کے کسی کونے میں ڈر چھپا ہوا تھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ہجک کر پیچھے ہٹا۔ ساتھ ہی وہ ڈر رہا تھا کہ کہیں حسی اس کے احتجاج کو
تسلیم نہ کر لے۔ اسے اکیلا چھوڑ کر چلا نہ جائے۔ لیکن حسی اسے کھینچتا ہوا چوبارے پر چڑھنے
لگا۔

”بالی۔ اور“ ہے نا۔“

پھر زینے میں حسی نے آواز دی۔ ”ہے نا۔ ادھر آؤ بھاگ کر میں ایک شخص کو پکڑ لایا
ہوں۔ بھاگ نہ جانے دوڑ کر آؤ نا۔“ وہ چلا آ گیا۔

”ہے نا۔“ کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہ رقصہ کی طرح بنی سنوری
ہوئی عورت ہو گی، اس کے کپڑوں میں وہی بھڑک ہو گی۔ اس کے بال ویسے ہی بنے ہوں گے۔
ان سے خوشبو کی پٹیں آتی ہوں گی۔ لیکن وہ تو گویا باورچی خانے سے دال بھگارتی ہوئی اٹھ کر
آئی تھی۔ کپڑے عام سے تھے۔ جن میں اجلا پن نام کو نہ تھا۔ بال اچھے ہوئے تھے۔
آستینیں یوں اوپر چڑھی ہوئی تھیں۔ جیسے روز کپڑے دھوتی ہو اور چہرے پر جوانی کی شکستگی
کے سوانگر کا کوئی عنصر نہ تھا۔ وہ بھاگی بھاگی آئی اور سوچے سمجھے بغیر ایلی کا بازو پکڑ کر اسے کھینچنے
لگی۔ ایلی نے اس کی طرف حیرانی سے دیکھا۔ وہ یوں مسکرا رہی تھی جیسے صدیوں سے اسے
جانتی ہو اور اس کا جسم یوں بے تسکلفی ایلی سے چھو رہا تھا۔ جیسے وہ عورت ہی نہ ہو۔

پھر چند ہی منٹوں میں معاملی کے پاس ایک ہی چارپائی پر بیٹھی ہوئی بلا تکلف باتیں کر رہی
تھی ”حسی نے مجھے کئی بار تمہارے متعلق بتایا ہے۔ حسی کہتا ہے تم اس کے دوست ہو۔ مجھے
حسی کے بھی دوست پیارے ہیں۔“ وہ مسکراتی اور پھر ہم۔ ہم نام بھی تو ہیں۔ تم الیاس ہو اور

میں الماس کچھ زیادہ فرق تو نہیں۔ ہے نا تو حسی مجھے پیار سے کہتا ہے میرا اصلی ہمراز ہے۔“

”جکتی ہے یہ۔“ حسی چلایا۔ ”الماس ولماس کوئی نہیں یہ۔ وہ تو نمائشی چیز ہوتی ہے۔“
 نا۔ تو خالص گھر کی رانی ہے۔ کیوں ایلچی؟“

”ہاں۔“ ایللی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کیوں ایللی۔“ حسنی نے یوچھا۔ ”ہے نا الماس بائی ہو سکتی ہے کیا؟“

”ہے نا۔“ کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ وہ مسکرائی۔ ”گھر کی رانی کو سہم، بکھر

ایک گھر نہیں۔ اور نہ ہو گا۔" اس کے گالوں پر آنسو ڈھلکنے لگے۔

”پاکل پاکل۔“ مٹی غصے سے چیخنے لگا۔ ”بھروہی حماقت۔“

”مجھے معلوم ہے۔ ہے نا، آسو پتے ہوئے کہا۔“ میرا دل گواہی دیتا ہے کہ گمر نیا۔

ہو گا تم چاہے لاکھ کرو۔“

”میں کہتا ہی کیا ہوں۔“ حتیٰ ہنس۔

”چاہے کو بھی۔ لیکن جو لکھا ہے ہو کر رہتا ہے یہ چند دن تو میں گھر بنا کر رہ لوں گا۔“

چاہے کچھ ہو جائے۔ یہ چند روز۔" اس کی آواز بھر آئی۔ "املی تم بھی یہاں میرے پاس رہو۔"

رہو گے؟ چند روز تو ہیں۔ صرف چند روز پھر ایک دن الماس بائی کو چوبارہ میں جانا ہی پڑے گا۔

ہے نانے کھسائی نہیں ہستے ہوئے کہا۔ ”وہ وہیں جا بیٹھے گی جہاں سے آئی ہے۔“ ہے نانے

کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی بت بنا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”یا گل۔“ حنی چلایا۔

”کیوں اہلی رہو گے میرے ساتھ؟ جب حی چلا جاتا ہے تو یہ گھر ویران ہو جاتا ہے“

اکلی بیٹھی گھبرا جاتی ہوں۔ تم آجاؤ تو ہم اکٹھے رہا کر س گے تمہیں بہت سی باتیں سنانا کہنا۔

میں — ست سی آؤ گے نا؟“

”میں میں۔“ اہلی گھبرا گیا۔ لیکن اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمیشہ کے لئے ہے تاکہ اس

وقت چارپائی پر اس کے پاس بیٹھ کر اس سے باتیں کرتا رہے لیکن مصیبت یہ

تیں سن کر اہلی کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب اور قریب۔

سمجھتی ہوں ایسوں کو۔ وہ ڈانٹا میں نے کہ پھر کبھی میرے گھر کا رخ نہیں کیا۔
 ”لیکن اسے قید کیوں کر لیا گیا ہے؟“ ایللی نے پوچھا۔

”کچھ کر دیا ہو گا نشتے میں۔“ وہ بولی۔ ”کسی کو قتل نہ کر دیا ہو۔“

اسی وقت ایک ساعت کے لئے ”ہے نا“ کی جگہ بائی کھڑکی میں آکھڑی ہوئی اس ہاتھ اپنے کولوں پر رکھ لئے۔ ہونٹ بڑھ سے بن گئے اور آنکھ میں چمک لرائی۔

”سمجھتا تھا۔“ وہ بولی۔ ”کہ اسے بھی دھمکی دے کر گرا لوں گا۔“ بڑا نفا تھا۔

ایللی الماس کو دیکھ کر گھبرا گیا۔ ”ہے نا۔“ وہ بولا۔ ”پانی پلاؤ گی۔“

”پانی۔“ وہ چونک پڑی اور دفعتاً ”بائی کی جگہ ہے نا مسکرا نے لگی۔“ تم بھی مجھے کرنے لگے ہو۔“ وہ چلائی اور اندر جا داخل ہوئی۔

”ایللی یہاں آؤ۔ یہاں نیچے بازار میں۔“ جی چلانے لگا۔ اس کی آواز سن کر ایللی نے اپنے مرتبہ محسوس کیا کہ وہ الماس کے چوبارے میں تھا۔ اسے شرم آنے لگی۔ گھبرا کر کھڑکی سے بیٹھ بیٹھ گیا اور پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ جی کو خاموش کرنے کے لئے اسے نیچے جانا پڑا۔ جب وہ بیڑھیوں کے پاس پہنچا تو ہے نا بھاگی بھاگی آگئی۔

”یہ لو اپنا پانی۔“ وہ بولی اور اپنے آپ کو یوں سنبھالنے لگی۔ جیسے گاؤں کی لڑکیاں ہا کے بعد تھک کر آفچل اور اپنا آپ سنبھالتی ہیں۔

”میں جا رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا اور زینہ اترنے لگا۔

”پھر آؤ گے نا۔“ وہ بولی۔ ”ضرور آنا۔ میں یہاں اکیلے بیٹھے بیٹھے تھک جاتی ہوں۔“ آنا۔ ضرور۔“ اس کی آواز گونج رہی تھی اور ایللی بازار میں پہنچ چکا تھا۔

انوکھی تحقیق

کنڑے میں بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ لوگ جگہ جگہ گرد ہوں میں کھڑے باتیں کر رہے تھے۔ پنڈائیوں کی دوکانوں پر لوگ جمع تھے۔ پان کی پیک تھوک کر یا سگریٹ کا لباس لگا کر وہ سبز جنگل والے چوبارے کی طرف دیکھتے اور پھر چہ میگوئیاں کرنے لگتے۔

چوباروں میں رقاصائیں منہ میں انگلیاں ڈالے کھڑی تھیں اس وقت انہیں ہوش نہ تھا۔ انہیں معلوم نہ تھا کہ ان کے بال پریشان ہو رہے ہیں۔ چروں پر جھلکیں

پڑی ہیں۔ گل پاؤڈر اور روغن سے خالی ہیں یا پاؤں ننگے ہیں۔ غالباً اس وقت انہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ رقاصائیں ہیں۔ اس وقت تمام بایاں ہے نا ہوئی تھیں۔ جیسے دفعتاً باورچی خانے سے پلم کرتے کرتے بھاگ کر جنگلے میں آکھڑی ہوں۔ وہ سب حیرانی سے سبز جنگلوں کے مکان کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ سبز جنگلہ دیران پڑا تھا۔ بازار میں لوگ حیرانی سے چلا رہے تھے:

”بھئی مد ہو گئی۔ وہی سیٹی پٹی والا راجہ۔“ مد ہو گئی۔“ ایک بولا۔

”سالہ خدمت کرتا تھا ہاں کنڑے پر۔“

”حکومت سی حکومت سنا ہے سیٹھ جمناداس نے ہاتھ جوڑے تھے۔ اس کے رو برو۔“ بھئی کیوں نہ جوڑتا۔ دل کا معاملہ تھا۔“

”سیٹی پٹی والا چاہتا تو سالہ چار موٹر کاریں مانگ لیتا۔ سیٹھ سے۔“

”موٹر کیا ہے جو چاہتا سو لیتا ہاں۔“

”پر اسے تو میاں ”شادی“ کے سوا کچھ سوچتا ہی نہ تھا۔ وہ اس کے سر پر سوار تھی۔“ وہ ہنسی مٹاتی ہے بھئی تو بند بوتل چڑھ جاتی ہے ایک دم۔“

”پر اب تو بابو کھل گئی وہ بند بوتل۔ کیوں بھئی۔“

”پر بالم کیسے ہوا پہلوان کو کہ سالہ ویسے ہی راجہ بنا ہوا ہے جھوٹ موٹ کا۔“

”نہیں ہو گیا۔ کانٹھ کی ہنڈیا کب تک چڑھتی ہے۔ ہاں۔“

”بھئی ہنڈیا تو آٹھ مینے چڑھی رہی۔ میرے بھائی۔“

”اور میں کہتا ہوں یہ تو چڑھی ہی رہتی اگر اپنے بابو کی بیٹی کو نہ چھیڑتا وہ۔“ ”کون بیٹی؟“

”اسے یہی سبز جنگل والی۔“

”وہ جو ہنڈی سلونی سی ہے؟“

”ہاں ہاں بڑی مرچیلی ہے وہ۔ بابو اس کے ہاں آتا جاتا ہے نا۔“ ”کون بابو؟“

”بابو کو نہیں جانتے۔ بھئی وہ گورا چنڈا۔ یہیں کنڑے میں رہتا ہے۔ سرداراں کے چوبارے کے بچہ ہوا اسے کی لگی میں کھینچ پھینچ میں ہے وہ بابو اپنا۔“

”لیکن کیسے معلوم ہوا کہ سیٹی پٹی والا بتاؤں افسرین کر تحقیق کر رہا ہے۔“

”بس جی بابو نے پہلے تو اس بروپیے کی فٹیں کیں۔ تم جانتے ہو ایک مجھے کے ٹوٹی ہوئے
دوسرے سے بات کر لیتے ہیں اپنے بابو نے کہا بھی جس پر جی چاہے ہاتھ رکھ ڈالو اپنے کا
تعلخ نہیں پر ”ننی“ پر ہاتھ نہ ڈالنا۔“
”پھر کیا ہوا؟“

”بات تو کھری کسی بابو نے پیارے۔“

”ہاں بھی صاف بات اچھی ہوتی ہے۔“

”پر وہ تو گویا نفلوں کا بھوکا تھا۔ اسی شام کو وہ ”بتی“ کے چوبارے پر چڑھ گیا اور پھر
کے گھونٹ پی کر رہ گیا۔ پھر بابو نے جا کر دفتر سے مالومات لیں۔ اس سے پوچھا اس سے پوچھا
پوری تیخ کی اور مالوم ہوا کہ سرکار نے تفتیش کے لئے کوئی حکم جاری نہیں کیا اور
صاحب آج بابو میاں دوخان پر آیا اور بولا استاد آج کہیں سرکنا نہیں وہ تماشہ دکھاؤں گا کیا
گے ایسا تماشہ کنڑے والوں نے کبھی نہ دیکھا ہو گا اور اس وقت وہ اوپر ”ننی“ کے چوبارے
ہے اور ساتھ پس ہے تاکہ سیٹی پٹی والے کو ہتھکڑی لگا لے۔“

”ہوں تو یہ بات ہے۔“

”بھی شابیشے بابو کا۔“

”بڑا بچے کا آدمی ہے وہ اگرچہ ہے کھفہ پس کا پڑ اپنا یار ہے۔“

عین اس وقت آٹا آگیا۔ اس کے چہرے پر وہی بے نیازی برس رہی تھی۔

”تم ہو ایللی؟“ آٹا اس کی طرف دیکھنے لگے۔

وہ سرسری انداز سے بولا۔ ”آگئے تم۔ اب کی مرتبہ تو دیر کر دی تم نے یہ تماشہ دکھا
ہو گئی۔ کس کو معلوم تھا کہ یہ انگوڑی محض ڈھونگ ہے اور وہ سی آئی ڈی کا انسپکٹر دراصل ایک
موقوف شدہ پلیہ ہے۔ پٹھے نے آٹھ مہینے کنڑے میں عیش کئے ہیں۔ دعوتیں اڑائی ہیں
بجرے دیکھے ہیں۔ گانے سنے ہیں اور جس کی بیج پر چالایا ہے۔ خدا کی قسم ایسا قسم طرف
چوٹی کی بایوں سے چلیں بھڑاتا رہا۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”لیکن۔“ ایللی نے پوچھا ”پوری بات میری سمجھ میں نہیں آئی۔“

”ہاں۔“ آٹا ہنسنا۔ ”میں سمجھا شاید تم جانتے ہو اس معاملے کو کنڑے کا تو بچہ پڑھا۔“

”جہ۔“ آٹا ہنسنے لگے۔ ”کیا واقعی۔“ ایللی نے کہا۔

”یہ سیٹی پٹی والا انسپکٹر پہلے پولیس میں تھا۔ پھر نہ جانے کس وجہ سے درخواست ہو گیا۔
اس کے بعد اس شخص نے ایک جعلی حکمنامہ بنایا۔ جس میں لکھا تھا کہ فلاں شخص نے حکومت
کا ایک لاکھ روپیہ غبن کیا ہے اور بیان کیا جاتا ہے کہ اس نے زیادہ تر روپیہ امرتسر کنڑہ رنگین
میں اپنی محبوبہ بنام سردار دیا بہارو پر صرف کیا ہے۔ انسپکٹر رؤف کو حکم دیا جاتا ہے کہ وہ موقع پر
جا کر اس امر کی تحقیق کرے اور اپنی رپورٹ پیش کرے۔“ آٹا صاحب ہنسنے لگے۔

”کہنت کو کیا بات سوچیں اور پھر اس نے رقصاؤں کے جو دو نام لکھے اس خط میں وہ بہت
سوچ کر لکھے۔ چونکہ کنڑے میں ان ناموں والی بہت سی رقصائیں ہیں اور وہ سب اوپر کے
درجے کی ہیں۔ بس تو اس نے وہ خط یہاں کے ایس پی کو دکھایا۔ انہیں بھلا کیا اعتراض ہو سکتا تھا
اس کے بعد اس نے تفتیش کے پردے میں وہ کیا جس کا جواب نہیں۔“
”آٹا آٹا ہیں۔“ ایک نوواردان کی طرف بڑھا اور وہ دونوں باتیں کرتے ہوئے سبز جھنگے
والے چوبارے کی طرف چل دیئے۔

ایللی نے آٹا کی ڈیوڑھی کی طرف دیکھا وہاں نیم کھڑی مسکرا رہی تھی۔ نیم کو اپنے مخصوص
انداز میں مسکراتے ہوئے دیکھ کر ایللی کا دل ڈوب گیا۔ ”معا“ اسے خیال آیا شاید نیم بھی وہیں کہیں
موجود ہوگی۔ وہ تڑپ کر مڑا مگر آٹا کے چوبارے کی کھڑکیوں جوں کی توں بند تھیں۔ چٹیس بے
جلان انداز سے لٹک رہی تھیں اور حرکت سے قطعی طور پر بے گانہ تھیں۔ اوپر کوٹھے کی منڈیر پر
سوا بازو کا کوئی حصہ بھی دکھائی نہ دے رہا تھا۔ ایک بار پھر اس پر مایوسی چھا گئی۔ اس نے نیم کی
طرف دیکھا جو ویسے ہی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے کوئی
نوشہخیز اس کے ہونٹوں میں دبلی ہوئی ہو۔

بالرب بالماظہ ہو شیر

ایللی نے آٹا کی طرف دیکھا وہ دور جا چکا تھا۔ حتیٰ پان کی دکان پر کھڑا باتوں میں مصروف تھا۔
اس نے لا ایک مرتبہ اوھر اوھر دیکھا اور پھر حالات کو سازگار سمجھ کر نیم کی طرف بڑھا۔ اسے
آٹا دیکھ کر نیم کے ماتھے پر پیارا شکن پڑ گیا۔ بھویں کمانوں کی طرح ہوتی گئیں۔

”کہاں ہے ہر ویسہ؟“

”پکڑ لیا گیا۔“

”اسے لار ہے ہیں۔“

”پہلوان ذرا دیکھنا دوکان کو میں آیا۔“

سب لوگ دیوانہ وار سبز جنگل والے چوہارے کی طرف لپکے۔ حتیٰ نے دو ایک کو گرایا دو ایک کو بچھاڑا اور وہ دھاڑتا ہوا ایلی سمیت سبز جنگل والے چوہارے کی میڑھیوں کے سامنے جا پہنچا۔ چند ایک سپاہی میڑھیوں سے نیچے اتر رہے تھے۔ ہجوم کو دیکھ کر انہوں نے اپنے چابک چلانے شروع کر دیے۔ ”ہٹ جاؤ ہٹ جاؤ۔“ لوگوں نے بڑی مشکل سے راستہ دیا۔ حتیٰ یہ دیکھ کر اس دوکان کی طرف لپکا جو ان میڑھیوں سے ملحقہ تھی اور اس نے ایلی کو جھجے پر تھمھٹ لیا۔ سپاہیوں کے پیچھے سینی پینی والا روف ہنکڑی پنے بڑے وقار سے آ رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے وہ رکا۔ اس نے بڑے غیور انداز میں چاروں طرف دیکھا اور پھر یارعب انداز سے بولا۔ جیسے اپنی رہنمائی کو حکم دے رہا ہو۔

”اے ہمارے لئے موڑ بھی نہیں لائے تم۔ ہم موڑ کے بغیر کیسے جائیں گے۔“

یو نے ایک ترہ خند مسکراہٹ سے اس کی طرف دیکھا۔ سپاہی مسکرائے۔

”اور دیکھو۔“ طرم نے تھکمانہ لہجے میں کہا۔ ہمیں سگریٹ چائیس پہلوان ”وہ چلایا۔“

سگرت کا ایک ٹین۔“

”سگرت کا نہیں۔“ پہلوان پنواڑی چلایا۔ ”اب تو بیٹے ویسے ہی ٹین پاٹ ہو گا۔“

”سلا موڑ لگتا ہے۔“ ہجوم سے آواز آتی چل تو سہی تھانے میں تیرا ایک سیڈیر دبائیں گے تو ہوش آجائے گا۔“

”ارے اوسکی دالی پٹی۔“

”خاموش“ طرم نے انہیں ڈانٹا۔ ”ہمیں نہیں جانتے تم۔“

یو نے لگا ”اب سالہ دیوانہ بنتا ہے۔“

”بیکار خلیش ہشیار ہے۔“

”جلوس آہستہ آہستہ کنڑے میں چلنے لگا۔ ہجوم نعرے لگا رہا تھا۔ لوگ بیڑیوں کے ٹکڑے اس معمول شدہ راجہ پر پھینک رہے تھے۔ اوپر رقصائیں جنگلوں سے نیچے لگی ہوئی تھیں کئی

”ہم نہیں بولتے تم سے۔“ وہ ایک انداز سے زیر لب بولی۔

”کیوں؟“ ایلی نے نگاہیں چمکاتے ہوئے کہا۔

”بس تم نے کھو دیا۔“ اس نے ناک چڑھا کر کہا۔

”کیا کھو دیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”سب کچھ۔“ وہ بولی ”تم تو بس کھو ہی دیتے ہو۔ میں بتاتی ہوں بات اور تم بگاڑ دیتے ہو۔“

”آخر بتاؤ بھی نا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر تم آتے کیوں نہیں ہمارے میاں۔“ وہ بولی۔

”تمہاری آپا جو چھپی رہتی ہے۔“ اس نے پینترہ بدلا۔ ”دیکھ لو آج بھی چھپی بیٹھی ہے۔“

”اوں۔“ وہ بولی۔ ”وہ تو نہیں چھپتی پر داوی اسے باہر آنے بھی دے۔“

”کیوں داوی کیا پکڑے رکھتی ہے اسے۔“

”سائے کی طرح سوار رہتی ہے۔“ آپا کہتی تھی۔ ”وہ رک گئی۔“

”میرے متعلق کچھ کہتی تھی۔“ بتاؤ۔“ ایلی نے منت کی۔

”نہیں بتاتی۔“ اس نے بسور کر کہا۔ ”مجھ سے ملنے جو نہیں تو بتاؤں کیوں۔“

”تم بڑی پیاری ہو۔“ وہ اس کے قریب تر ہو گیا۔

”جھوٹ۔“ نیم نے اپنا آپ اس کے حوالے کرتے ہوئے کہا ”چھوڑو ہمیں۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ چھوٹی سی لڑکی درحقیقت ایک بالغ عورت ہو۔ ایک عورت

لہجانے کے انداز سے پورے طور پر واقف ہو۔ اس نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا نا۔

اس حواگی کے باوجود اپنا منہ نہ ڈر رکھا تھا۔

عین اس وقت ایک شور اٹھا اور کنڑے میں کھڑے تمام لوگ سبز جنگل والے جنگل

طرف بھاگے۔

”ادھر آؤ۔ ادھر آؤ۔“ حتیٰ نے بڑھ کر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ اسے نیچے لار رہا تھا۔“

حتیٰ ایلی کو دیوانہ وار تھمھنے لگا۔

وہاں ایک کمرام بچ گیا۔

”جوتے مارو جوتے۔“

والوں نے اس پر بھی مچھلی کھانے کے خلاف پابندی لگا رکھی تھی۔

جب وہ سب امتحان سے فارغ ہوئے تو اللہ داوے سکھوں کے ساتھ مل کر بورڈنگ میں ایک جلوس نکالا۔ وہ جلوس تین لڑکوں پر مشتمل تھا ایک ہندو ایک مسلمان اور ایک سکھ، اللہ داو خود اس جلوس کا لیڈر تھا۔ وہ ہر کمرے میں جا کر نعرہ لگاتے۔

”جے ہندو دھرم کی جے۔“

”اے بندوؤ۔“ اللہ داو چلاتا۔ ”خدا تمہارا کلیان کرے۔ تم نے سال بھر ہمیں والیس کھلا کھا کر اندر باہر سے خوشبو دار بنا دیا ہے۔“ اس پر بانی لڑکے چلاتے۔ ”جے ہندو دھرم کی جے۔“

اللہ داو کے نعرے سن کر رسوئی کے تمام نوکر مسرت سے سر ہلا رہے تھے۔ وہ سمجھتے تھے کہ واقعی اندر باہر سے خوشبودار ہونا ایک قابل تعریف امر ہے۔ ہندو جذبات کے اثر سے بھیگی ہوئی قمیضیں بھری نگاہوں سے اللہ داو کو دیکھ رہا تھا۔ دور بنگالی بلو زیر لب مسکراتے ہوئے نکل رہے تھے۔ اوہر آصف اپنی ہی دھن میں کھویا ہوا ایللی کے کلن میں کہہ رہا تھا ”اب کیا ہو گا اب میں مگر کیسے جاؤں گا ایللی؟“

عین اس وقت پر نپل اپنی لینڈو میں آموں والی کوٹھی میں آدھمک۔ چند ایک ساعت کے لئے پودوں کے پیچھے چھپ کر وہ لڑکوں کی باتیں سنتا رہا پھر معاملہ کی نوعیت کو بھانپ کر مسکرایا اور وہیں سے چلانے لگا۔ ”او اللہ داو یہ کیسا شور ہے؟“ جلوس پر نپل کو دیکھ کر ختم کیا۔ سکھ دغتا ”اپنے کلمے بالوں میں کنگھی کرنے میں مشغول ہو گئے۔ رامو اور لالو بھاگ کر رسوئی میں بدلتن صف کرنے لگے۔ اللہ داو ایک ساعت کے لئے چپ چاپ کھڑا رہا اور پھر اسے سو جھی۔ اس نے جیب سے آم کی خشک گٹھلی نکالی اور اسے اپنے سر پر رگڑنے لگا۔

”کیا کر رہے ہو اللہ داو۔“ پر نپل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

”مسلم پر نپل جی۔ سر سے خشکی نکال رہا ہوں۔“

”ہوں۔ لیکن تمہاری سر کی خشکی کبھی نہ جائے گی۔ خشکی آم کی گٹھلی سے نہیں جاتی عقل سے جاتی ہے۔“ اس پر سب لڑکے ہنس پڑے۔

”مضور۔“ اللہ داو نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔ ”اسی عقل کے کھوج میں اس کلج میں آیا تھا پر کلج میں نہیں ملی۔“

ایک ہاتھ مل رہی تھیں۔ کئی ایک شرمندگی محسوس کر رہی تھیں کہ انہیں دھوکہ دے کر لوٹا گیا اور وہ سیٹی پٹی کا متوالا تحکمانہ انداز سے احکامات جاری کرتا ہوا چلا جا رہا تھا۔

”ہٹ جاؤ یہ ہمارا جلوس ہے باادب با ملاحظہ ہوشیار۔“

اس روز شام کو جب ایللی واپس اپنے بورڈنگ ہاؤس کو جا رہا تھا تو وہ محسوس کر رہا تھا کہ خود سیٹی پٹی کا بہروپے ہو اور ایک روز اسے بھی یونہی جلوس میں چلتے ہوئے پکارنا ہو گا ”باادب با ملاحظہ ہوشیار۔“

الوداع

پھر وہ سب امتحانات کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ شفیع صبح سویرے ہی اپنی ہاکی لگ کر کتابیں اٹھا کر قریب کے باغ میں جا بیٹھتا اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور وہاں دن بھر پڑھنے اور سانپ مارنے کے مشاغل میں وقت کاٹتا۔ آصف اور ایللی نسر کے کنارے جا بیٹھتے۔ جہاں آصف پڑھنے کے علاوہ ٹھنڈی آبیں بھرتا اور بار بار ”اے سے پوچھتا“ ”ایللی اب کیا ہو گا“ اور ایللی یہ سن کر سونے لگتا اس وقت اس کے روہو شہزادہ آگیا ہوتی اس کے حنا مالیدہ ہاتھ ایللی کی طرف بڑھتے اور پھر ایک رنگین آواز سنائی دیتی۔ ”ایللی مجھے تم سے یہ توقع نہ تھی۔“

”ایللی اب کیا ہو گا۔“ آصف کی آواز سنائی دیتی اور پھر ایللی کے سامنے وہ سیٹی پٹی کا لڑکا آمو جوہو ہوتا اور تحکمانہ انداز سے چلاتا ”باادب با ملاحظہ ہوشیار۔“

اللہ داو سارا دن کمرے میں بیٹھا رہتا اور پڑھنے کے علاوہ سر پر آم کی گٹھلی رگڑتا رہتا۔ پھر یہ آواز بلند بنگالی بلو کو گالیاں دیتا جس کی وجہ سے وہ گوشت کھانے سے محروم کر دیا گیا تھا۔ ”ان ہندوؤں کو اللہ غارت کرے یا مہاتما بدھ ان پر اپنا قہر نازل فرما کہ انہوں نے ایک مومن پر گوشت کھانا حرام کر رکھا ہے۔“

رام ان کو بن باس دے کہ انہوں نے مجھے دال کھلا کھلا کر تباہ کر دیا ہے میرا معذہ برداشت لا حول پڑھتا ہے۔“

اللہ داو کا شور سن کر ہر نام اور لیتا سیاں آجاتے اور وہ سب مل کر شور مچاتے۔ ہوش بنگالی سپرنٹنڈنٹ اللہ داو کی بددعائیں سنتا اور چوری چوری مسکراتا کیونکہ وہ خود مقلوم تھا۔

منسوبہ بندھتا۔ اگر وہ اسے خطوط لکھنے اور وہاں تک پہنچانے کی ترکیبیں سوچنے کے فکر میں تھا اور ایلی سے ان امور میں مدد چاہتا۔ تو شاید ایلی کو اس رومان میں دلچسپی محسوس ہوتی۔ سفینہ سے بچنے کی ترکیبیں سوچنے میں ایلی کو کوئی دلچسپی نہ تھی۔ لیکن آصف سے انکار کرنا بھی تو ممکن نہ تھا اور ویسے بھی شتراو کی کشش کے باوجود ان حنائی ناگوں کے سحر کے باوجود وہ علی پور جانے سے ڈرتا تھا۔ وہ شتراو کے قرب سے ڈرتا تھا وہ ان لٹکتی ہوئی گوری بانسوں سے ڈرتا تھا۔ جن میں ایلی کی زبردست آرزو اس کے سینے میں سگ رہی تھی۔

در حقیقت اس وقت وہ دونوں آصف اور ایلی ”بھگوڑے“ تھے اور ان کا وہ انوکھا فرار ان انہوں کا حال تھا جو بندھنوں کی پید اواری ہوتی ہیں۔ وہ دونوں زندگی سے دور بھاگ رہے تھے۔ انسان کی بنیادی خواہشات سے منکر تھے اور زندگی کے دھارے سے ہٹ کر کنارے کے بند اور متعفن پائوں کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہے تھے۔ وہ بھگوڑے دراصل مریض تھے۔ جنہیں یہ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہے ہیں جنہیں شعور نہ تھا کہ وہ اپنے ہاتھوں سے اپنی زندگی کا گلا گھونٹ رہے ہیں اور مستقبل کو تباہ کر رہے ہیں۔ زندگی کے ہاتھی کو ٹٹولنے والے دو اندھے۔

وہ چوبارہ جو انہیں رہنے کے لئے کرائے پر ملا۔ ایک چھوٹی سی گلی میں واقع تھا جو ہال بازار سے نکل کر رام باغ کے بازار میں جا ملتی تھی۔ اس گلی کی چلی منزل میں تمام تر دوکانیں تھیں جو مرثام ہی بند ہو جاتی تھیں۔ اوپر کی منزل میں زیادہ تر گودام تھے جو دن رات بند رہتے اس وجہ سے گلی دیران اور سندان رہتی۔ لیکن ان کے چوبارے کے جنگلے کی کھڑکیوں کے عین مقابل میں ایک نوجوان رقاصہ کی بیٹھک کا پچھلا حصہ تھا۔ بیٹھک کی کھڑکیاں رام باغ کے بازار میں کھلتی تھیں۔ صدر دروازہ بھی اسی بازار میں تھا مگر — پچھلے حصے کی کھڑکیاں اس چوبارے کے مقابل کھلتی تھیں۔

اس چوبارے میں وہ دونوں بے سرو سامان حالت میں جا بیٹھے۔ ان کی پاس ایک ٹوٹے ہوئے ٹنک اور دو بستروں کے سوا کچھ نہ تھا۔ کھڑکیوں کے پاس انہوں نے زمین پر بستر بچھائے اور ہوم تیل کا بیکٹ دیا سلائی سگریٹ سرہانے رکھ کر وہ دونوں بیٹھ گئے۔ چند ایک منٹ کے لئے وہ اس اجنبی ماحول کے متعلق باتیں کرتے رہے پھر خاموش ہو گئے۔ خاموشی گہری ہوتی گئی کہ رات کے اندھیرے نے اسے اور بھی بھیانک بنا دیا۔

”اچھا لڑکو۔“ پرنسپل نے بات کا رخ بدلا۔ ”مجھے تم سے کچھ کہنا ہے۔“ اس پر اس طرف سے لڑکے بھاگے بھاگے آئے اور پرنسپل کے گرد جمع ہو گئے۔

”آج تم امتحان سے فارغ ہو کر اپنے اپنے گھر جا رہے ہو۔ تم میں سے کئی لڑکے ہیں اس کالج میں نہیں آئیں گے اسی لئے تم سب سے الوداع کہنے آیا ہوں۔“

اس پر سب لڑکوں نے تالیاں بجائیں اور پھر پرنسپل سے مصافحہ کرنے کے لئے قہار ہو کھڑے ہو گئے۔ اس اثناء میں بنگالی سپرنٹنڈنٹ بھی آگیا اور وہ دونوں باری باری لڑکوں سے ہاتھ ملانے لگے۔

دو بھگوڑے

پرنسپل کے جانے کے بعد بنگالی بابو کے کہنے کے مطابق وہ سب اپنا بستر باریا بندھنے لگے۔ پھر باری باری ناگوں میں بیٹھ کر رخصت ہونے لگے۔ ایلی کو بستر بندھتے دیکھ کر آصف نے اس سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”ایلی۔“ اس کی آواز میں منت تھی۔ ”تم چلے گئے تو میں کیا کروں گا۔ ایلی۔“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”اب تو مجھے جانا ہی ہو گا۔“ وہ بولا۔

”کیوں یہاں رہنے میں کیا ہرج ہے۔ تمہاری تسلیم بھی تو یہیں ہے۔“

”میری تسلیم۔“ ایلی چونکا لیکن جلد ہی سنبھل کر بولا ”ہاں وہ۔“

”تو پھر تم کیوں علی پور جاتے ہو فضول۔ یہیں رہو ایلی میرے ساتھ۔ یہاں تو بڑے

لگن ہے مہر ہے سہی تو یہاں ہیں۔ یہیں رہو میری خاطر۔ ایلی۔“

”لیکن یہاں رہیں گے کہاں۔ تمہارے گھر میں؟“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”گھر میں میں کیسے جا سکتا ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہم یہاں کوئی مکان کرائے پر لے لیں گے۔“ آصف نے جواب دیا۔

ایلی امر تسمیں رہنا نہ چاہتا تھا۔ اسے آصف اور سفینہ کہ کہانی میں قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اگر آصف لڑکی میں اثباتی دلچسپی محسوس کرتا۔ اگر وہ لڑکی

”ایلی۔“ آصف نے لمبی آہ بھری۔

”ہاں۔“

”اب کیا ہو گا؟“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اب میں کیا کروں گا؟ کیسے گھر جاؤں گا؟“

”تم تو خواہ مخواہ ڈرتے ہو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو کیا گھر چلا جاؤں۔“ آصف نے پوچھا۔

”تمہارا اپنا گھر ہے۔“ ایلی بولا۔

”لیکن محلے والے کیا کہیں گے۔“

”پڑے کہیں تم نے کوئی جرم کیا ہے کیا۔“ ایلی نے چمک کر کہا۔

”لیکن میں اس سے نجات کیسے پاؤں گا؟“

”نجات پانے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ دیکھتی ہے تو پڑی دیکھے۔ تمہارا کیا لیتی ہے۔ تمہارا“

بگڑتا ہے۔“

”ج“ آصف اٹھ کر بیٹھ گیا۔

”اور کیا“ ایلی نے تن کر کہا۔

”اور اگر وہ آوازے کسے تو؟“

”تو کیا کہنے دو؟“

”مگر اس کا انجام کیا ہو گا؟“

”انجام اچھا چاہتے ہو تو اس پر یہ ظاہر کرو کہ تمہیں اس سے محبت ہے۔“

”لیکن کیسے ظاہر کروں۔“

”تم اس کی طرف دیکھو۔“

”بس اتنی سی بات ہے۔“ آصف نے مسکرا کر پوچھا۔

”اور کیا وہ مطمئن ہو جائے گی اور تمہیں تنگ نہ کرے گی۔“ ایلی نے دھوکے سے کہا۔

”ج۔ میں نے کبھی نہیں سوچا تھا۔“

”اس کے بعد آصف خاموش ہو جاتا اور کسی گھرے خیال میں کھو جاتا اور دیر تک“

پپ پپ لیتے رہتے۔ پھر دفعتاً ”آصف چونکتا۔“

”مگر ایلی“ آصف مدھم مدھم آواز میں کہتا جیسے اپنے آپ سے کہہ رہا ہو۔ ”اس طرح تو بات

بڑھ جائے گی۔“

”ہاں بات تو بڑھ جائے گی۔“

”تو پھر کیا ہو گا؟“

”تو پھر۔۔۔۔۔ ایلی سوچ میں پڑ جاتا۔“

”اگلے روز صبح سویرے ہی آصف نے ایلی کو جگایا۔“

”ایلی ایلی۔“ اس نے اسے جھنجھوڑا۔ ایلی کے بیدار ہونے پر وہ مسکرانے لگا اس کی

آنکھوں میں عجیب سی پھوار پڑ رہی تھی۔ ”ایلی۔“ وہ چلایا۔ ”چلو میں تمہیں دکھاؤں۔ چلو اوپر

کوٹھے پر۔“

”اوپر“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ”وہ کوٹھے پر کھڑی ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔؟ یہاں اس کوٹھے پر۔“

”اپنے گھر کے کوٹھے پر یہاں سے صاف نظر آتا ہے۔ آؤ میں تمہیں دکھاؤں۔“

”لیکن وہ کن۔“ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”بھئی وہی۔ آؤ۔“

”وہی تمہارے والی سیفینہ۔“

”ہاں ہاں وہی۔ کوٹھے سے صاف دکھائی دیتی ہے۔ اپنے گھر کی چھت پر کھڑی ہے۔“

لیکن تمہارا محلہ تو دور ہے یہاں سے۔“

”نہیں تو اس چوبارے کے عین پچھواڑے میں ہے۔ یہ ہاں بازار کے پیچھے اس کنڑے کے

بائیں ہاتھ۔“

”لیکن۔۔۔۔۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا۔“

”راستہ گھوم پھر کر جاتا ہے ویسے یہاں سے قریب ہے چلو۔ پیچاری کھڑی میری راہ دیکھ

رہی ہو گی ابھی تک بہت نہیں ہماری حالانکہ مجھے گھر سے نکلے اتنی دیر ہو چکی ہے۔ حد کر دی

میں نے یہ تو میری جان لے کر ہی چھوڑے گی۔“

کونٹے سے ایللی نے اس طرف نگاہ دوڑائی جدھر آصف اشارہ کر رہا تھا۔ چاندل طرز منڈیروں کو ٹھوں اور چھتوں کا ایک طوفان پھیلا ہوا تھا اور وہ منڈیریں اور چھتیں ایک دوسرے سے شانے جوڑ کر کھڑی تھیں۔ جیسے ایک دوسرے کا سارا لے رہی ہوں ایسے معلوم ہوتا جیسے مکانات مسار ہونے کے بعد بلے کے ڈھیر بن گئے ہوں اور ان ڈھیروں میں چتر پائے پھر رہے ہوں۔

”وہ دیکھو وہ“ آصف شرماتے ہوئے بولا۔ ”وہ جو نیلی برساتی کے پاس زرد رنگ کی منڈیروں والی چھت ہے اور اس کے قریب میلے سے کونٹے پر وہ جس کے پیچھے بڑے بڑے سوراخ ہیں دیوار میں ان پردوں کے پاس وہ سفید کپڑوں میں لمبوس لڑکی ہے نا آئی نظر میں آ رہی ہے۔ دیکھا۔“

غور سے دیکھنے کے باوجود ایللی کو چھتوں کے انبار کے سوائے کچھ دکھائی نہ دیا۔ لیکن اندر کے اصرار سے بچنے کے لئے اسے کچھ دیر کے بعد ”ہاں ہاں۔۔۔“ کہنا ہی پڑا۔
 ”اب دیکھ لو۔“ آصف بولا۔ ”یوں کھڑی رہتی ہے جیسے پتھر کا بت کھڑا ہو۔“
 ”ہاں۔“ ایللی بولا۔ ”تم نے تو اسے پتھر کا بتا دیا۔“
 ”ج“ آصف نے مسکراتے ہوئے ایللی کی طرف دیکھا۔ ”وہ بھی یہی کہتی ہے۔“
 ”جج کہتی ہے وہ۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”تم بھی یہی سمجھتے ہو کیا۔“ آصف نے آہ بھر کر پوچھا۔
 ”تم اسے خواہ مخواہ تباہ و برباد کر رہے ہو آصف۔“ ایللی غصے میں بولا۔
 ”میں؟“ آصف نے مظلوم نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔
 ”ہاں تم۔“ ایللی چلایا۔

”نہیں نہیں ایسا نہ کہو۔“ آصف نے منت کی۔
 ”اسے تم سے محبت ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”اسی لئے تم اسے ذلیل کر رہے ہو۔“
 ”کیا واقعی محبت ہے اسے؟“ آصف نے پوچھا۔
 ”ظاہر ہے اور کیا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”میں تو سمجھتا ہوں کہ اس کا مقصد صرف مجھے بدنام کرنا ہے۔“
 ”تم پاگل ہو آصف۔“

”کیوں؟“ وہ چلایا۔

”کیا اس طرح وہ خود بدنام نہیں ہوتی؟“

”اسے بدنامی کی پروا نہیں۔“

”لڑکی ہو کر بدنامی کی پروا نہیں؟ کتنی عجیب بات کرتے ہو تم۔“

”ہاں عجیب سی ہی معلوم ہوتی ہے۔“ آصف سوچ پر پڑ گیا۔

اس قسم کی بے دھنگی باتیں کرتے کرتے دفعتاً وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔ آصف نہ بننے کس سوچ میں پڑ جاتا اور ایللی کا جی چاہتا کہ اس کا بھی کوئی انتظار کرے اس کے لئے بھی کوئی پھت پر کھڑی رہے حتیٰ کہ صبح سے شام ہو جائے۔ اس کے لئے وہ ساری دنیا کا مقابلہ کرنے کو تیار تھا۔ ساری دنیا کو ٹھکرانے کے لئے بے تاب تھا۔

پھر دفعتاً ایک دھندلی سی شکل ایللی کی نگاہوں تلے واضح ہونے لگتی۔ دو سفید بانٹیں لٹکتی۔ دو شگونی ہاتھ جوڑتے اور ماتھے کے عین درمیان میں ایک سیاہ تل ابھر آتا۔ شہزاد مسکراتی اور کہتی ”ایللی تم کیا تم دنیا والوں کی پروا کرتے ہو؟“ اس وقت ایللی خاموش ہو جاتا اور آصف کی آواز سن کر چونک پڑتا اور اس کا وہ حسین خواب ٹوٹ جاتا۔

اس طرح ایک دوسرے سے دور ایک دوسرے سے بیگانہ وہ دونوں قریب قریب بیٹھ رہتے اور دیوالوں کی طرح اس اجڑے ہوئے منڈیروں کے ڈھیر کی طرف دیکھتے رہتے۔

نرالی تجویز

ایک روز آصف بولا۔ ”ایللی کوئی ایسا طریقہ نہیں کیا کہ وہ جھوٹی ثابت ہو جائے اور میں اسے طعنہ دے سکوں۔“

ایللی کو بت سمجھ میں نہ آئی۔ ”میں نہیں سمجھا۔“ وہ بولا۔

”مطلب یہ ہے کہ میں اسے کوئی ایسی فرمائش کروں جو وہ پوری نہ کر سکے اور پھر میں اس سے کہوں بس دیکھ لی تمہاری محبت۔“

”یہ تو سیدھی سادھی بات ہے۔“ ایللی چلایا۔ ”اسے کہہ کہ یوں اعلانیہ تم سے اظہار محبت نہ کرے۔“

”لوں توں“ آصف نے نفی میں سر ہلایا۔ ”یہ وہ نہیں مانتی۔ کوئی اور بات ہو۔“

”کوئی اور بات“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے پھر وہ بولیں۔
چٹکی بجائی۔ بن گئی بات۔

”کیا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے بہتر تجویز نہیں ہو سکتی۔“ ایلی نے خوشی سے اچھل کر کہا۔

”کیا تجویز ہے؟“ آصف شوق سے ایلی کے قریب تر ہو گیا۔

”لیکن اس پر عمل کرنے کے لئے تمہیں گھر جانا پڑے گا۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ آصف بولا۔ ”میں چلا جاؤں گا۔ بتاؤ تو۔“

”جب تم گھر جاؤ تو کوٹھے پر چلے جانا۔“ ایلی نے گرجوٹی سے کہا۔

”گھر جاتا ہوں تو کوٹھے پر تو ضرور جایا کرتا ہوں اگرچہ لوٹا لے کر جاتا ہوں۔ دیکھو۔“

دکھانے کو۔“ آصف بولا۔

”اور وہ کوٹھے پر آجائے گی۔ آجائے گی نا۔“

”ہاں۔ وہ تو اکثر کوٹھے پر ہی رہتی ہے اور مجھے دیکھتے ہی اطلاع دے کر ہی جاتی ہے۔“

بڑے ادب سے۔“ آصف ہنسنے لگا۔

”اب کی مرتبہ وہ سامنے آئے تو اسے اشارہ کر کے اپنی قمیض کے نچلے کونے کو پکڑ کر

اٹھاتا۔ یہاں تک کہ بازو سر کے اوپر اٹھرائی کی صورت معلوم ہو جائیں۔“

”اس سے کیا ہو گا؟“ آصف نے پوچھا۔

”اس سے قمیض کا اگلا حصہ اوپر اٹھ جائے گا۔“

”پھر؟“ آصف اس کے قریب تر ہو گیا۔

”پھر تمہارا سارا جسم نکلا ہو جائے گا۔“

”لیکن اس کا فائدہ۔“

”پھر اس اشارہ کرنا کہ وہ بھی ایسا ہی کرے۔ اشارے سے کتنا میری خاطر۔“

”یوں کرنے سے تو اس کا جسم بھی نکلا ہو جائے گا۔“ آصف گھبرا کر بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے بڑے فخر سے کہا۔

”لیکن وہاں کوٹھے پر اسے نکال کر دیتا۔“ آصف ہچکچا کر بولا۔ ”نہیں نہیں۔“

”یہی تو بات ہے“ ایلی نے کہا۔ ”وہ عورت ہے۔ حیا مانع ہو گی۔ وہ مجبور ہو گی اور نہ

فرمائش پوری نہ کر سکے گی۔“

”ہوں۔“ آصف بولا۔ ”لیکن اگر اس نے قمیض اٹھا دی تو۔۔۔“

”ہوں۔“ آصف بولا۔ ”لیکن اگر اس نے اس امکان پر غور ہی نہ

کیا تھا پھر وہ بولا۔ ”نہیں نہیں یہ ایسا نہیں کر سکتی خصوصاً کوٹھے پر کھڑی ہو کر ایسا نہ کر سکے گی

بہرہ تمہارے ہنس دینا بس یہی ہے تمہاری محبت۔“

”لیکن تمہارے کس طرح ہنسوں گا میں۔“ آصف نے پوچھا۔

”جیسے تمہارے ہنسنے ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

پھر وہ دونوں تسخیر سے ہنسنے کی کوشش کرنے لگے۔

سنگ مرمر کا مجسمہ

اگلے روز صبح سویرے ایلی نے بصد مشکل آصف کو گھر جانے پر مجبور کر دیا تاکہ وہ گھر جا کر

اس کی نئی تجویز پر عمل کر سکے۔ نئی تجویز پر عمل کرنے کے لئے آصف گھر جا چکا تھا اور ایلی رو

ٹل کی تفصیلات جاننے کے لئے اس کا انتظار کر رہا تھا۔

اس کے ذہن کی عجیب کیفیت تھی۔ اس کا دل گواہی دے رہا تھا کہ وہ لڑکی آصف کے کہنے

پر اپنی قمیض نہیں اٹھائے گی۔ وہ اپنے آپ کو دنیا کے سامنے عریاں نہ کرے گی۔ مگر وہ نشتا اس

کا سلسلہ خیال ٹوٹ جاتا اور دل میں یہ خواہش ابھرتی کہ وہ قمیض اٹھالے تاکہ آصف واپس گھر

جانے پر مجبور ہو جائے اور اس دیران چوبارے میں رہنے سے نجات مل جائے۔ پھر وہ لا حول

پڑنے لگتا اور اسے احساس ہو تاکہ وہ کہیں ہے جو اپنے فائدہ کے لئے آصف کو گھر جانے پر اکسا

رہا ہے۔ پھر وہ چلا اٹھتا۔ ”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو سکتا ایسا نہیں ہو گا۔“

اس نے اپنے پیچھے آہٹ سنی۔ ”آصف“ وہ چلایا۔ ”تم آگے۔“ آصف ایک بت کی طرح

اس کے عقب میں کھڑا تھا۔ چہرے پر مردنی چھائی ہوئی تھی۔ ہونٹ لرز رہے تھے۔ بازو لٹک

رہے تھے۔

”آصف“ ایلی اس کی طرح مڑا۔ ”کیا ہوا آصف؟“

آصف نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اس کی آنکھیں آنسوؤں سے چھلک رہی تھیں۔

”لیکن وہ۔ وہ ہمہ رک گیا۔“ وہ لڑکی۔“

آصف نے اثبات میں سرملانے کی کوشش کی۔
 ”اس نے کیا کیا بولو۔“ ایلی اضطراب سے دیوانہ ہو رہا تھا۔

آصف نے پھر اثبات میں سرملادیا اور اس کا سر ایلی کی چھاتی پر لٹک گیا۔
 ”خدا کے لئے بولو۔“ ایلی چلایا۔
 ”ہاں اس نے قمیض اٹھا دی۔“ آصف زیر لب بولا اور اس کے گالوں پر دھڑکنے لگی۔
 ”آسو ڈھلک آئے۔“



”بالکل ہی اٹھا دی؟“ ایلی نے دیوانہ وار پوچھا۔
 ”ہاں۔ بالکل۔“

”پھر؟“ ایلی کا سر بھڑکے ڈنک کی طرح بھن بھن کر رہا تھا۔
 ”ڈر سے مرے ہاتھ پاؤں پھول گئے۔“ آصف نے جواب دیا ”اور میں بھاگا کہ کھانا
 وہاں دیکھ نہ لے۔“

”اور وہ۔“ ایلی نے پوچھا۔
 ”وہ ویسے ہی کھڑی تھی جیسے سنگ مرمر کا کوئی مجسمہ ہو۔ سر کٹا مجسمہ۔“
 وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ ایلی تنکے سے زمین کریدنے لگا اور آصف دیوار سے سہارا لگا کر کھڑا
 گیا اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔
 ”ایلی۔“ دیر کے بعد آصف گنگنایا۔
 ”ہاں۔“ ایلی چونکا۔

”اس کا جسم اتنا خوبصورت۔۔۔۔۔۔ شدت جذبات سے آصف کی آواز رک گئی۔
 ”آصف۔“ دھتکا ”ایلی اٹھ بیٹھا۔“ تم اب جاؤ۔ یہاں رہنے کا کوئی فائدہ نہیں
 ”نہیں۔“

”ایلی۔“ آصف چلایا۔

”اب تمہیں جانا ہی ہو گا۔ میں شام کی گاڑی سے علی پور جا رہا ہوں۔“
 ”ایلی۔ ایسا نہ کرو۔“ آصف نے منت سے کہا۔ ”میں تباہ ہو جاؤں گا۔“
 ”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”اب تمہیں اسے اپنانا ہی ہو گا۔“ اور وہ نیچے اتر کر سلان باغ
 ”ایلی۔۔۔۔۔۔ آصف نے آخری بار اسے پکارا۔ لیکن وہ زمین میں پہنچ چکا تھا۔

دیوانگی

زندگی کا موڑ

اس روز آصفی محلے کی طرف جاتے ہوئے ایلی پہلی مرتبہ لوگوں کی نظریں ہچا کر کٹے کوشش کر رہا تھا۔ اسے خود بھی معلوم نہ تھا کہ کیوں ایسا کر رہا ہے۔ اگرچہ طبعی طور پر وہ گھبراہٹ سے گھبراتا تھا لیکن محلے کی اور بات تھی۔ محلے میں وہ اہمیت محسوس کیا کرتا تھا۔ جس محلے کے کسی لڑکے کی آواز سنتا!

”آگئے باوجی۔“

توخوشی کی ایک لہر دوڑ جاتی۔

محلے کے بازار میں سب سے پہلے حکیم بوٹا کی دوکان تھی۔ بوٹے کے انداز میں سبکیں ہی سی ترشی تھی۔ وہ ہمیشہ طنز بھری بات کرتا۔ لیکن ایلی کو بری نہیں لگتی تھی۔ بوٹے کے بعد ہڈی طوائی کی دوکان تھی ایلی کو دیکھتے ہی اس کے زرد دانت باہر نکل آتے۔

”آگئے باوجی۔ نمستے مہاراج۔“ وہ دونوں ہاتھ جوڑ کر ماتھے پر رکھ لیتا۔

اس روز نہ جانے ایلی کو کیا ہوا تھا۔ ان جانے میں وہ چھپ چھپ کر گھر جا رہا تھا۔ حکیم نہ دیکھ پائے۔ چاند دکان پر موجود نہ ہو۔ چاند اور حکیم کے دیکھنے کا تو سوال ہی پیدا نہ تھا کیونکہ رات پڑ چکی تھی۔ لوگ دکانیں بڑھا چکے تھے۔ بہر صورت تھو تھو تھو فروش کی دکانیں حسب معمول جھگڑا تھا اور وہ سب اندر بیٹھے ہوئے چوٹ کھیل رہے تھے۔ انہیں دیکھ کر آصفی کے لئے وہ رکا۔ پھر منہ دوسری طرف موڑ کر چپکے سے آگے نکل گیا۔ تنہا کی دکان پر کوئی بھی نہ تھا۔ بچہ خالی پڑا تھا جس پر محلے کے لوگ اکثر دیر تک بیٹھ کر دیکھ دیکھ کر ہانکا کرتے تھے۔ سردار خود بازار کی طرف پیٹھ کئے دودھ کی کڑا ہی صاف کر رہا تھا۔

مہر کے قریب پہنچ کر ایلی شاہ ولی کی خانقاہ کی چار دیواری کے سائے میں چلنے لگا تاکہ مسجد سے آتا ہوا کوئی بزرگ اسے نہ دیکھے۔ چوگان دیران پڑا تھا جس کے اوپر محلے کی کھڑکیاں یوں ٹھنڈا رہی تھیں جیسے قبرستان میں یہاں وہاں دیئے جل رہے ہوں۔ ایک ساعت کے لئے وہ وہاں رکا اور پھر ایک ہی جھٹ میں چوگان کو پار کر کے چھٹی گلی میں جا گھسا۔ اتنی رات گئے فرحت کے گھر کی اندھیری دیوار سے گزرتا تو ممکن نہ تھا کیونکہ وہ دروازہ تو گھر والے سر شام ہی بند کر لیا کرتے تھے۔ شزاو کی طرف سے جاتے ہوئے وہ گھبراتا تھا کیونکہ شزاو کے چوبارے کی ٹہلی منزلیں میں سیدہ رہتی تھی اور سیدہ کے سامنے اوپر جانا، یہ اسے گوارا نہ تھا۔ سیدہ کیا کہے گی۔ منہ سے نہ بھی کہے تو دل میں کہے گی۔ اللہ کرے سیدہ کا دروازہ کھلا ہو تاکہ اسے کھٹکھٹانا نہ پڑے۔ دروازہ کھلا دیکھ کر اس نے اطمینان کا سانس لیا اور پھر چند ایک ساعت کے لئے ٹہلی منزل کا جائزہ لینے کے بعد وہ سائے کی طرح لپک کر اوپر کے زینے میں جا پہنچا۔ آہستہ آہستہ اس نے وہ بیڑیاں نہ جانے کتنی دیر میں طے کیں تاکہ سیدہ یا شزاو کو پاؤں کو چاپ سٹائی نہ دے۔

بیڑیوں میں چھپ کر اس نے ایک نگاہ شزاو کے چوبارے پر ڈالی۔ چوبارے کے دروازے کے عین درمیان میں ایک چوکی پر سلائی مشین رکھے وہ کچھ سینے میں مصروف تھی۔ شانے جھکے ہوئے تھے۔ سیاہ تاروں والا دوپٹہ ایک شان بے نیازی سے اس کے کندھوں پر لٹک رہا تھا۔ سیاہ دوپٹے میں اس کا سفید چہرہ کسی انجمنی مسرت سے چمک رہا تھا۔ سیاہ سرگئیں آنکھیں دو آڑی ترچھی قدیلوں کی طرح چمک رہی تھیں۔ اور ماتھے کے عین درمیان میں سیاہ تلک آویزاں تھا۔ آدمی آستینوں والے بھرے بھرے بازو مشین پر لٹک رہے تھے۔

شزاو کو دیکھ کر اس کا دل خوشی سے دھک سے رہ گیا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ سنگ مرمر کا مجسمہ ہو۔ جیتا جاگتا مجسمہ۔ وہ ایک پستانا تھی۔ سندر پستانا۔ ایسا پستانا جس کی تعبیر کے متعلق اسے خود بھی علم نہ تھا۔

آہستہ آہستہ وہ شزاو کی طرف بڑھا اور چپکے سے آنکھ پھا کر اس کے پہلو میں جا بیٹھا اور پھر اس کے ہلکتے ہوئے بازو کو گرفت میں لے کر دیوانہ وار چومنے لگا۔ شزاو اسے دیکھ کر ڈر گئی۔

”ہائے تم ہو۔“ وہ چلائی۔ ”تم نے تو مجھے ڈرا دیا۔“ ایلی نے اپنا منہ اس کے گورے ہاتھوں میں گاڑ دیا۔

”یہ کیا حالت ہے۔“ وہ اسے گھورنے لگی لیکن اس کی شیریں آواز میں مسکراہٹ واضح جھلک تھی۔ جیسے تیوری محض دکھلاوا ہو۔

”یہ کیا پگلا پن ہے۔“ شہزاد نے اسے گھورا۔

”ہے پھر۔“ وہ بولا۔ ”کرلو جو کرنا ہے۔“

وہ ہنس پڑی۔ ”اب پاگلوں سے کون لڑے۔“

”لو کرو دیکھ لو۔ اگر ہمت ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔

”اونسو۔“ شہزاد نے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر کہا: ”چپ وہ۔“

”کون ہے۔“ ایلی گھبرا اٹھا۔ ”کون ہے؟“

”جانو۔“ وہ زیر لب بولی اور اس نے صحن کے پرلے کونے کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ ایلی“

جائے گی میں نے اسے گھر کا کام کرنے کے لئے پاس رکھ لیا ہے۔“

ایلی کی تمام تر مسرت مفقود ہو گئی اور وہ چپ چاپ یوں بیٹھ گیا جیسے اسے شہزاد کی آنکھوں

ترجمی آنکھوں اس کے سیاہ دوپٹے اور گورے بازوؤں سے کوئی تعلق نہ ہو۔

”آخر آہی گئے تم۔“ شہزاد زیر لب بولی۔

”آٹا ہی پڑا۔“ ایلی نے کہا۔

”اور جو اتنی دیر وہاں ٹھہرے رہے۔ امتحان کے بعد وہ۔“ شہزاد مسکرائی۔

— جواب دو۔“

”تم نے جو کہا تھا۔ میں شکایت کر دوں گی۔ یاد ہے کہا تھا ناں۔“ ایلی ہنسنا

شہزاد نے مسکرا کر سر اثبات میں ہلا دیا۔

”جھوٹ کہا تھا کیا۔“ وہ آنکھیں چمکا کر بولی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے ردو دو شمعیں روشن ہو گئی ہوں۔

وہ نگاہ اس کے لئے ایک نئی چیز تھی جس میں چمک کے علاوہ عجیب سی گرمی تھی جسے

زیر اثر اس کے خون میں حدت پیدا ہو جاتی تھی۔ کنپٹیاں تھرکنے لگتیں۔ آنکھوں میں غبار

آتا اور پلکیں بوجھل ہو کر جھک جاتیں۔ اس ایک نگاہ سے ایلی نے محسوس کیا جیسے گرد و پیش

ایک سنہرے دھندلکے نے لپیٹ میں لے لیا ہو۔ جیسے تمام کائنات منور ہو گئی ہو۔ جیسے زندگی

ایک نیا روپ دھار لیا ہو۔ وہ اس ایک بے پایاں نگاہ کے نئے میں سرشار نہ جانے کب تک

رہا۔ حتیٰ کہ جانو ہاتھ میں لوٹا لئے باہر نکلی اور اسے دیکھ کر چلائی۔

”ایلی ہے۔ کب آیا ہے۔ کیا سکول چھوڑ دیا یا دیسے ہی چھٹی پر آیا ہے۔ اے ہے بوتا

نہیں۔“ وہ بچے بھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”بوتا تو ہوں۔ کیا کہتی ہے تو۔“ ایلی نے کہا۔

”کہیں بوتا ہے تو جیسے مدھک پٹی رکھی ہو۔ آنکھیں تو دیکھ اپنی۔“ جانو نے ہنس کر کہا۔

ایلی کو بات ٹالنے کی ترکیب نہ سوجھی، بولا: ”تجھے دیکھ کر نہ جانے کیا ہو گیا ہے آنکھوں

کو۔“

کسی کی جرأت ہے کہ میری طرف دیکھے۔“ وہ غرائی۔ ”دیدے نہ پھوڑ دوں۔ آج تک تو

جرأت نہ ہوئی کسی کو میری طرف دیکھنے کی۔“

شہزاد کی آنکھوں میں پھوار پڑنے لگی۔ وہ ہنستے ہوئے بولی: ”یہ تو دیکھ رہا ہے روک لے۔

اسے ورنہ سر چڑھ جائے گا۔ بات بڑھ جائے گی۔“

”ہوں۔“ وہ نفرت سے بولی۔ ”یہ کیا سر چڑھے گا۔“

”ناک نہ چڑھا جانو۔“ ایلی قہقہہ مار کر بولا: ”پہلے ہی تیری ناک تلوار کی طرح تیز ہے۔“

”لے کر لے بات۔“ شہزاد نے پھر وہی نگاہ ایلی پر ڈالی۔

”دفع کر ان آجکل کے جھو کروں کو۔ جو منہ میں آتا ہے بک دیتے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ

کمرے کے پرلے کونے کی طرف چل پڑی اور بڑبڑاتی ہوئی کلام میں مصروف ہو گئی۔

شہزاد نے پھر وہ نگاہ ایلی پر ڈالی۔ اس کی آنکھیں چمکیں۔ ہونٹوں میں نہ جانے کیسی

مناطیسی جذبش پیدا ہوئی اور پیشانی کا تنک و نعتا ”منور ہو گیا۔ ایلی کے دل میں نہ جانے کیا ہونے

لگا۔ اس کے جسم سے پھلپھری کی طرح انگارے نکلنے لگے۔

ایلی کا سر شانوں پر بھن بھن کر رہا تھا۔ شہزاد یوں اٹھاک سے سوئی میں آگا پروری تھی

جیسے احساس ہی نہ ہو کہ پاس کون بیٹھا ہے۔ ایلی کی نگاہوں تلے شہزاد کے سر کے گرد ایک سنہری

ہلہلک رہا تھا۔ دور جانو نہ جانے کیا بڑا بداری تھی۔

اس روز ایلی کو اپنی گزشتہ زندگی ایک دھندلا خواب محسوس ہونے لگی۔ اسے محسوس ہو رہا

تھا جیسے وہ از سر نو پیدا ہوا ہو۔ شہزاد کے بطن سے پیدا ہوا ہو اور ایک نئی زندگی سے نوازا گیا ہو۔

جیسے اس نے زندگی کا پہلا موڑ طے کر لیا ہو اور اس کے طے کرتے ہی زندگی کی شکل کلیتہً بدل

”نہ مجھے نہیں اچھا لگتا یہ مذاق۔“ جانو بولی۔
 ”تجھ سے نہ کرے تو کس سے کرے مذاق۔“ شزاو نے کہا۔
 ”کیوں۔ کیا میں بن سے کرے گا مذاق۔ سچ ہے آخر بیٹا کس کا ہے۔ علی احمد کا ہی ہے نا“
 ”کیوں۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”علی احمد نے کیا کیا تھا مذاق۔“
 جانو کلیاں دینے لگی۔

”شرم نہیں آتی جو منہ میں آیا بک دیا۔“
 ”تو پلادے اسے چائے تو خاموش ہو جائے گا۔“ شزاو نے ویسے ہی بے پرواہی سے کہا۔
 اور جانو چائے بنانے لگی۔

جانو عرصہ دراز سے آصفی محلے میں مقیم تھی۔ وہ آصفی نہ تھی بلکہ ان لوگوں میں سے تھی جو باہر سے آکر محلے میں رہنے لگے تھے۔ جانو کا خاوند عرصہ دراز سے فوت ہو چکا تھا۔ اور اب دونوں بیٹی کا گزارہ محلے والوں کے کام کاج میں ہاتھ بٹانے پر تھا کیونکہ اس کے علاوہ ان کا کوئی ذریعہ آمدنی نہ تھا۔ کام کاج نہ بھی ہوتا تو بھی محلے والے جانو کو کچھ نہ کچھ دیتے رہتے۔

جانو کا رنگ کھلا کھلا تھا۔ نقوش ستواں تھے۔ اسے دیکھ کر خیال آتا تھا کہ جوانی کے دنوں میں بے حد حسین ہو گی۔ اگرچہ اب اس کے حسین نقوش پر ضبط کی کرختگی کی مر لگی ہوئی تھی۔ محلے والے جانو کی بے حد عزت کرتے تھے کیونکہ نوجوانی میں بیوہ ہو جانے کے باوجود اس نے اپنی تمام زندگی پاکبازی میں گزاری تھی۔ محلے میں کسی شخص نے کبھی اس پر انگلی نہ اٹھائی تھی۔ محلے والے اس کی شرافت کا تذکرہ اکثر کیا کرتے تھے اور جانو اپنی اہمیت کا احساس اس پاک دامن سے انداز کرتی تھی اور اسی وجہ سے ہر کسی سے پاک دامن کا مطالبہ کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی آواز میں کرختگی پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے مزاج میں درشتی اور لاپرواہی تھی۔ محلے کے لوگ اس کی سخت مزاجی پر نکتہ چینی کرنے لگے تھے۔ حالانکہ یہ خصوصیات انہوں نے بذات خود اس میں پیدا کی تھیں۔ بلکہ یوں کہیں کہ انہوں نے اپنے خیالات کے اظہار سے جانو پر عائد تہمت پر قائم کی جا چکی تھی۔ بہر حال جانو کو یہ احساس نہ تھا کہ لوگوں نے اس کے متعلق ایک رائے قائم کر کے دراصل اسے زندگی کے ایشیائی پہلوؤں سے محروم کر دیا ہے۔

ہونکہ جانو کی تہمت اہمیت ”دامن ترکن ہشیار باش“ پر مبنی تھی اس لئے وہ سمجھنے لگی تھی

گئی ہو۔ اتنی سی بات نے اس کی زندگی بدل دی تھی۔ صرف اتنی سی بات کہ اس نے دلوں ہوئے بازوؤں کو تھام لیا تھا اور نفرت سے بچنے کے لئے محبت کا ڈھونگ رکھ لیا تھا۔ زندگی پر قدر عجیب تھی اور وہ زندگی کا موڑ کس قدر حسین تھا۔

جانو

نہ جانے شزاو کو کیا ہے۔ ایللی سوچنے لگا۔ نگاہ اٹھا کر دیکھتی ہے تو اس قدر قریب آجاتی ہے کہ نگوں میں تھرکتی محسوس ہوتی ہے۔ پہلو میں دھڑکتی ہوئی سنائی دیتی ہے۔ گرمی کی طرح بند بند میں ریختی ہے اور کبھی یوں دیکھتی ہے جیسے کوسوں دور ہو۔ جیسے اسے ایللی کے کاد بھی شعور نہ ہو۔ احساس ہی نہ ہو کہ ان دونوں میں کوئی بندھن ہے۔

صرف نگاہ ہی نہیں اس کی خاموشی بھی ایسے ہی اثرات کی حامل تھی۔ کبھی وہ آنکھیں نہ کر کام میں لگ جاتی تو کبھی ایللی کو محسوس ہوتا جیسے وہ اس پر بھگی ہوئی ہو جیسے اس کے جسم گرمی اسے پکھلا رہی ہو۔ جیسے اس کا نرم و گداز جسم اس سے مس ہو رہا ہو۔ مگر کبھی جب آنکھیں جھکائے کام میں مصروف ہوتی تو گویا وہ برف کا ایک تودہ بن جاتی۔ اس کے انگ انگ سے بیگا نکیت کی لہریں نکلتیں اور ایللی کو منجھ کر دیتیں۔ اور وہ اضطراب اور گھبراہٹ سے ہل بدلنے لگتا۔ نہ جانے یہ خصوصیت صرف شزاو میں ہے یا سبھی عورتوں میں ہوتی ہے۔ بیٹھے بیٹھے وہ سوچنے لگا کیا سبھی عورتوں کے کئی ایک روپ ہوتے ہیں۔ کیا وہ سب آن میں رہ بن جاتی ہیں۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ جب شزاو سے قرب کا احساس حاصل ہوتا تو اس کے لئے سانس لینا بھی پر لذت ہو جاتا لیکن جب وہ بیگا نکیت کا روپ دھارتی تو ایللی کے دل میں از سر نو احساس کتری جاگ اٹھتا اور وہ دیوانہ وار اپنے آپ کو کوستا۔

”اب تو چائے پئے بغیر نہ جائے گا کیا؟“ جانو نے اس کے قریب آکر کہا۔
 وہ چونکا۔

”تو ابھی تک یہیں ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔
 دونوں ہاتھ کمر پر رکھ کر جانو سر ہلانے لگی۔
 ”تو کیا چلی جاؤں۔ اچھی نہیں لگتی تجھے۔“

”نہیں نہیں۔ اچھی لگتی ہے تو۔“ ایللی نے پینسٹرا بدلا۔ ”بہت اچھی لگتی ہے۔“

نے اور عرصہ دراز سے عملی طور پر شہزاد کے سامنے بھی سر جھکا چکے تھے۔

ان ملاقاتوں میں شہزاد کو اپنی ذات سے ہٹ کر سوچنے یا سمجھنے کی ضرورت نہ تھی۔ اس لئے ہفتی محلے میں آجانے کے بلوچوں وہ محلے کے تقاضوں سے بے نیاز رہی۔ محلے والوں کو دیکھ کر اس نے کبھی دلیہ یا نگاہیں سنبھالنے کی کوشش نہ کی۔ بات کرنے سے پہلے کبھی نہ سوچا کہ سن کر وہ کیا کہیں گے اور غالباً اسی وجہ سے وہ محلے بھر کی محبوبہ بن چکی تھی۔

نوجوان حیرانی سے اس کی طرف دیکھتے اور سردھٹتے۔ وہ محسوس کرتے کہ شہزاد میں وہ زندگی کو صحیح شکل میں دیکھ رہے ہیں۔ دکھلاوے اور رسم سے آزاد بے پروا بلند و بے نیاز۔

محلے کی لڑکیاں حیرت سے اس کی طرف دیکھتیں اور منہ میں انگلی ڈال کر رہ جاتیں۔ ابتدا میں تو محلے کی بوڑھیاں بھی اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ انہیں احساس ہونے لگا کہ جوانی کے قائم کردہ اصولوں پر نہ چلے وہ اچھی کیسے کھلائی جاسکتی ہے۔ اس کے بلوچوں شہزاد کی معصومیت اس کے اخلاق اور اس کی طبعی فیاضی کی وجہ سے انہیں شہزاد سے مل کر ان اصولوں کے بلوچوں خوشی محسوس ہوتی تھی۔ پھر جب وہ چلی جاتی تو ان کو غصہ آنا شروع ہو جاتا۔ — توبہ کتنی بے پروا لڑکی ہے — وہ محسوس کرتیں جیسے انہیں دھوکا دیا گیا ہو اور فریب سے خوش کر لیا گیا ہو۔ پھر ان کی زبانیں حرکت میں آ جاتیں اور دیر تک باتیں کرتی رہتیں۔ کسی نہ کسی بہانے شہزاد کی بے پروائی اور جرات پر نکتہ چینی کرتیں۔

”توبہ۔ کیا زمانہ آیا ہے۔ اب تو کل کی چھوکیاں ہرنوں کی طرح قلائعیں بھرنے لگی ہیں۔ انکی ریل تھی اور یہ لوب اوپر چوہارے سے بول رہی ہے جیسے پاؤں تلے پیسے لگے ہوئے ہوں۔“

”اور بس اللہ ماری یہ سیڑھیاں جو ہیں۔ انہیں گھٹنوں پر ہاتھ رکھے بغیر چڑھنا بھی تو ممکن نہیں۔“

”میں تو چڑھ جاتی ہے جیسے پانی کا گلاس پی لیا۔“

”توبہ مل یہ تو بھلا سیڑھیاں ہیں۔ وہ تو نگاہوں پر چڑھی بیٹھی ہے۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرتی ہے۔ ذرا نہیں سمجھتی۔“

”مگر زمانہ آیا ہے مل۔ پر شکر ہے اپنے محلے کو ہوا نہیں گئی۔“

”اللہ بچائے لڑکی۔ یہاں پھر بھی اللہ کا فضل ہے بس یہ باہر سے آنے والیاں ہی جل کو گندا

کہ وہ ”دامن تر کمن ہشیار باش“ کی تلقین کرنے کے لئے دنیا میں بھیجی گئی ہے۔ اپنی زندگی کو سنوارنے کے بعد اب وہ دوسروں کی زندگی کو سنوارنا اپنا فرض سمجھتی تھی اور اس کے لئے ہر جوان لڑکی یا غیار حسینہ کو بات بات پر ہدایت کرنے کی عادی ہو چکی تھی۔ اس کی طبیعت وجہ سے محلے کی بوڑھیاں اسے بہت اچھا سمجھتی تھیں اور محلے کی جوان عورتیں اس کی ہر بات پر محتاط ہو جاتی تھیں۔ اور ایسا برتاؤ اختیار کر لیتیں کہ وہ زیادہ دیر ان کے پاس نہ ٹھہرے۔ واضح اشارات کا جانو پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ کیسے ہو سکتا تھا کہ وہ ان خصوصیات کو رکھ کر جن پر اس کی اہمیت کا تمام تر دارو مدار تھا۔

مطمعون محبوبہ

شہزاد محلے کی فضا میں پل کر جوان نہ ہوئی تھی اس لئے وہ محلے کی رسومات اور آئینہ کی تفصیلات سے نہ تو واقف تھی اور نہ انہیں اہمیت دیتی تھی۔ وہ طبعاً ان تفصیلات سے بے نیاز تھی اور اپنی طبیعت کے مطابق زندگی بسر کرنے کی قائل تھی۔ شہزاد کو کبھی نہ سوچا کہ ماحول کا تقاضا کیا ہے۔ اس نے کبھی نہ سوچا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے۔ کیا اندازہ لگائیں گے۔ لوگوں کی اہمیت کا شعور ہی نہ رکھتی تھی۔ رکھتی بھی کیسے اس کے اپنے میاں برائے ہم نام بلکہ طبعاً شریف واقع ہوئے تھے اور شریف خاندان سے کہتے ہیں جو بیوی کی ہر بات پر سر تسلیم خم کر دے۔

شہزاد نے سر تسلیم خم کرنے کا ایک انوکھا بہانہ ایجاد کر رکھا تھا۔ وہ ظاہر کرتا تھا کہ حقیقی میں ڈوب کر اسے کسی بات میں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اتنی فرصت ہی نہ تھی کہ لڑکی باتوں پر غور کر سکے۔ اگرچہ شہزاد کا حسن دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہراتی تھی اور ہنسنے لگتا تھا لیکن وہ تو قطعی طور پر اور بات تھی۔ دلچسپی کے اس فقدان کے علاوہ شہزاد شخصیت میں کوئی ایسی بات نہ تھی جو شہزاد کے دل میں اس کی عظمت کا احساس پیدا کرے۔ شہزاد کی خوشنودی کے لئے ذاتی محسوسات کے چکر سے نکلنے پر مجبور کرتی یا شہزاد کو ابھارتی۔ وہ تو شہزاد کی آمد سے پہلے جیتے جا چکے تھے اور اس حد تک جیتے جا چکے تھے کہ سر نو جیتنے کی کوشش سراسر بے معنی ہو کر رہ گئی تھی۔ اگرچہ بظاہر وہ یہ ظاہر کیا کرتے تھے کہ عادی ہو چکے ہیں مگر وہ محض ایک دل بسلاوہ تھا۔ درحقیقت وہ طبعاً سر جھکا دینے والا

”ہے نہ اچھی لگتی ہیں نہ۔ وہ بھی کیا کہ آستینیں جو ہاتھوں پر لگتی رہیں۔ اچھا اب چائے بنا جا کر۔“

شنراؤ کے اس انداز کو پہلے پہل تو جانو سمجھ نہ سکی۔ شنراؤ کی باتیں سن کر اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ جواب میں کیا کہے۔ پھر آہستہ آہستہ وہ شنراؤ کے انداز سے مانوس ہوتی گئی اور اب ہی آپ بڑوانے میں وقت بسر کرنے لگی۔

ایلی حیران تھا کہ شنراؤ کی باتوں پر سبک پاکیوں نہیں ہوتی۔ اسے غصہ کیوں نہیں آتا۔ وہ بات بن کر کیوں ٹل دیتی ہے۔ پیشانی پر شکن تک نہیں آتا بلکہ بسا اوقات وہ اس کی بات سنتی ہی نہیں جیسے جانو جبک مار رہی ہو۔

دکھایا مینا

چائے بنانے کے بعد جانو اپنا کھانا برتن میں ڈال کر گھر چلی گئی اور وہ دونوں اس دالان میں اکیلے رہ گئے۔ شنراؤ کے ساتھ اپنے آپ کو اکیلے پا کر ایلی کا دل دھڑکنے لگا لیکن اس کے باوجود شنراؤ خاموشی سے اپنے کام میں یوں لگی رہی جیسے اسے ایلی کے وجود کا علم ہی نہ ہو۔

”شنراؤ۔“ ہردومٹ بعد ایلی زیر لب اسے آواز دیتا۔ ”شنراؤ۔“

”ہوں۔“ وہ جھکی جھکی آنکھوں سے جواب دیتی۔ ”کہو۔ کیا کہتا ہے۔“ اس کی آواز میں

عجب کی بیگانگی ہوتی جیسے وہ شنراؤ ہی نہ ہو جس نے اس پر وہ نگاہ ڈالی تھی۔

”اوجھر دیکھو ناں۔“ وہ منت سے کہتا۔

”کیا دیکھوں؟“ وہ بے نیازی سے جواب دیتی۔ ”کیا ہے دیکھنے کو یہاں؟“

”اچھو۔ ایلی چلاتا۔“ اتنی بے پرواہی۔

”کیا ہے؟“ کچھ دیر کے بعد شنراؤ نے سر اٹھایا اور اس کی طرف یوں دیکھا جیسے وہ زمین میں گرا ہوا ایک پتھر ہو۔

”مناؤ ناکیا کہتا ہے۔“

ایلی نے جھٹ کر اس کا بایاں بازو تھام لیا۔

”بس مکی کام تھا۔“ وہ خشک آواز سے بولی اور بائیں بازو کو اس کے حوالے کر کے یوں کام میں منہمک ہو گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ حتیٰ کہ وہ محسوس کرنے لگا کہ اس کے ہاتھ میں کاٹھ کا

کرتی ہیں ہاں میں تو ج کھوں گی۔“

نہ جانے شنراؤ کو ان باتوں کا علم تھا یا نہیں لیکن اس کے برتاؤ سے کبھی ظاہر نہ ہوا تھا کہ عورتوں کو دیکھ کر وہ یوں کھل جاتی جیسے نو خیز کلی ہو۔ ان کی ہر ضرورت کو فراموش کر دیتی لیکن اس کے علاوہ اسے ان سے کوئی تعلق نہ تھا۔ صرف دو چار گھرانوں سے اس کا باہر جوں تھا اور وہ بھی محض سرسری۔ چوبارے کی کھڑکی میں کھڑی ہو کر وہ کوئل کی طرح چپ چاپ رہتی۔

”کیوں چچی۔ آج تو بہت مصروف نظر آتی ہو۔ کیا چچا امر ترسے آگئے۔“

چچی منہ میں انگلی ڈال لیتی:

”ہائے اللہ۔ اس لڑکی نے کیا کہہ دیا۔ کوئی نے گا تو کیا کہے گا۔“ اس کے باوجود اس کا ہاتھ حقیقت کا اظہار سن کر چچی کے چہرے پر مسرت کی ایک روداد جاتی۔

محلے والیوں کے لئے شنراؤ کی باتیں انوکھی ہونے کی وجہ سے بے حد جاذب تھیں اور جاذبیت کی وجہ سے وہ اس پر نکتہ چینی کرتی تھیں۔

جانو کے شنراؤ کے گھر میں آنے کو ایلی نے بہت برا مانا۔ جانو کی موجودگی کی وجہ سے اسے شنراؤ کے پاس بیٹھنا مشکل ہو گیا۔ جانو کیا کہے گی۔ یہ یہاں کیوں بیٹھ رہتا ہے۔ اپنے گھر پر نہیں جاتا۔ اور پھر جانو تو منہ پر کہہ دینے سے بھی دریغ نہیں کرتی تھی۔ وہ تو براہ راست اس سے کہہ دے گی۔ اسے نہ لگایا کہ منہ در نہ لوگ کیا کہیں گے۔ اللہ رکھے اتنا بڑا ہو گیا ہے۔ کیا بچہ ہے جو ہر وقت تجھ سے چپکا رہتا ہے، لیکن شنراؤ کو یہ بات سو جھی تک نہ تھی۔ شنراؤ کی بات کو اہمیت ہی نہ دیتی تھی جب وہ ایسے مسائل چھیڑ لیتی تو شنراؤ چپکے سے کسی کام میں مشغول ہو جاتی۔ غالباً اس نے کبھی جانو کی بات کو سنا ہی نہ تھا اگرچہ اس وقت وہ بے توجہ ہاں ہاں کرتی رہتی۔

اوجھر جانو جب سے شنراؤ کے پاس آئی تھی اس کی یوں رکھوالی کرنے لگی تھی جیسے پتھر کی ایجنٹ ہو اور شنراؤ کو نظریہ سے بچانے کے لئے متعین کی گئی ہو۔ وہ شنراؤ کی آدمی اپنے کو دیکھ کر ناک منہ چڑھاتی:

”اے ہے۔ یہ کیا تنگی باہیں لئے پھرتی ہو تم خواہ خواہ اپنا گورا رنگ چمکے گا۔“

آستینیں تو پوری ہونی چاہئیں جو باعزت عورتوں کو جتی ہیں۔“

اس پر شنراؤ مسکرا کر کہتی:

بازو ہو۔ بے کار۔ بے جان

”یہ کیا حماقت ہے۔“ وہ بولی۔

”کیا حماقت؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اور کیا حماقت نہیں تو۔“ شنزاد نے بازو کھینچ لیا۔ ”بیٹھ کر باتیں کرو۔“

”کیا بات کروں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کوئی بھی ہو۔“ شنزاد بولی۔

”اچھا۔“ ایلی کو سوچھی۔ ”تم اتنی پیاری کیوں ہو شنزاد؟“

”ہوں پھر۔ کر لو جو میرا کرنا ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”کاش۔۔۔ میں کچھ کر سکتا۔“ ایلی نے آہ بھری۔

”کچھ کر بھی نہیں سکتے۔ بس!“ وہ ہنسنے لگی۔

”مجھے اکسا رہی ہو۔“ ایلی غصے میں بولا۔

”پیاریوں سے لڑا بھی کرتے ہو تم؟“ شنزاد نے پوچھا۔

”لڑائی مجھے بڑی اچھی لگتی ہے۔ تمہیں نہیں لگتی کیا؟“

”کس سے لڑوں۔ کوئی ہو بھی لڑنے کے لئے۔“

”مجھ سے لڑو۔“

”تم سے کیا لڑنا۔“ شنزاد مسکرائی۔

”اس سے لڑتی ہو کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس کی ہنسی میں تحقیر کی دھار تھی۔ ”اے آپیں بھرنے۔“

فرصت بھی ہو۔ وہ کیا لڑنے لگا۔ اور آجکل تو وہ ابا جان کے پاس گیا ہوا ہے۔“

”کیوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اب تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ بولی۔ ”بکرے کی جان گئی پر کھانے والی کو مزہ نہ آیا۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ وہ منت سے بولا۔

”وہ مسکرائے گی: ”تم کیا سمجھو گے؟“

”آخر بات کیا ہے۔ خدا کے لئے مجھے بتاؤ۔“ ایلی نے محسوس کیا جیسے بات اس کی دلالت

متعلق ہو۔

”میں کیا بتاؤں۔ انہیں سے پوچھ لیتا کبھی۔“

”کس سے؟“

”ان سے یا سانوری سے۔“ شنزاد نے ایک خصوصی انداز سے کہا۔

”سانوری سے؟“

”ہاں ہاں اسی سے۔ اب کیا بھول گئے اسے۔ ان دنوں جب وہ اس کوٹھے پر ٹھلا کرتی تھی

اور تم لوہر چھت پر منہ پر کتاب رکھے پڑھنے کے بہانے بیٹھے رہا کرتے تھے۔ مجھے کیا معلوم

نہیں۔“

”شنزاد۔“ ایلی ندامت سے چلایا۔

”اس بے چاری کو کیا پتہ تھا۔ وہ تو تمہارے تھپڑ پر ہی مر مٹی۔“ شنزاد ہنسنے لگی۔ ”تمہاری

دھمیں گاگا کر رو دیا کرتی تھی۔“

”رو دیا کرتی تھی؟“ ایلی حیران ہو رہا تھا۔

”اپنی طرف سے تو وہ محبت لگا بیٹھی تھی تم سے۔ اسے کیا معلوم تھا کیسے لگائی جاتی ہے محبت

نہ جانے کوئی بات پسند آگئی تھی اسے تمہاری۔ جب گھر والوں کو معلوم ہوا تو وہ سب اسے

بھینٹنے لگے۔ اس وجہ سے وہ اور بھی ضد میں آگئی اور اس نے اماں سے صاف کہہ دیا میں ایلی

سے شادی کروں گی۔“ شنزاد ہنسنے لگی۔ ”ان دنوں مجھے کیا خبر تھی کہ ایلی۔“ وہ با معنی انداز سے

رک گئی۔ پھر اس نے با معنی نگاہ اس پر ڈالی۔ ”کیا پتہ تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

ایلی نے شرم سے سر جھکا لیا۔ شنزاد ہنسنے لگی۔

”بے چاری نے بڑے بڑے طعنے سنے تمہارے لئے۔ سارے گھر والوں کی نگو بن کر رہ

گئی۔ اماں تو اسے آنکھیں دکھاتی تھی۔ تمہارا نام سن کر اماں کی آنکھوں میں خون اتر آتا تھا۔ نہ

جانے کیوں جیسے تم سے کوئی بیر ہو۔“

”کیوں۔ میں نے تمہاری اماں کا بکاڑا تھا۔“ ایلی نے کہا۔

”جب تو نہیں بکاڑا تھا مگر اب تو۔۔۔۔۔۔“ اس نے ایک بار ایلی کو پھر اسی نگاہ سے

دیکھا۔ لا روشن دیکھے اس کی طرف لپکے۔

”شنزاد۔“ اس کے بازو کا سہارا لینے کے لئے ایلی آگے بڑھا۔

”پھر بات اب تک پہنچ گئی۔“ شنزاد نے دلفراہ انداز بدلا۔ ”اور انہوں نے فوراً مشورہ کر کے

”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”میرا مطلب ہے۔“ اور پھر رک گئی۔
 ”میں سمجھتا ہوں تمہارا مطلب۔“ وہ اٹھ بیٹھا اور فرحت کی طرف چل پڑا۔
 ”ایلی۔“ شزاو نے اسے آواز دے کر روکنا چاہا۔
 مگر ایلی کے لئے واپس جانا ناممکن ہو چکا تھا۔

اتنے قریب اتنے دور

اس رات وہ دیر تک کروٹیں بدلتا رہا۔ اس کے دل میں عجیب و غریب قسم کے شکوک اور
 تاہم بجزوں کے چپتے کی طرح جھنجھٹا رہے تھے۔ سینہ سلگ رہا تھا۔ کلیجہ کوئی مسل رہا تھا۔ چاروں
 طرف سے لہریں سی اٹھ رہی تھیں جو ہر ساعت مزید شدت اختیار کرتی جا رہی تھیں۔ کیا یہی
 محبت ہے جس کے لئے وہ اس قدر بیتاب تھا۔ کیا یہی وہ محبت ہے جس کی شریف اسے تلقین کیا
 کرتا تھا۔

”محبت کرو ایلی محبت۔“ وہ اس کے روبرو کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”محبت کرو ایلی چاہے کسی سے
 کرو۔“

لیکن شریف کی اپنی کیفیت تو ایسی نہ تھی۔ وہ تو اس طرح کروٹیں نہیں بدلتا تھا۔ وہ تو بڑے
 الطمین سے منہ میں حقے کی نیلے لینا چھت کو تکتا رہتا تھا اور اس کے ہونٹوں پر مبہم
 مسکراہٹ کھلا کرتی تھی۔ اور اس کی آنکھیں گویا ہر وقت نشے میں رہتی تھیں۔ — نہیں
 نہیں یہ محبت نہیں۔ نہ جانے کیا ہے محبت۔ نہیں محبت تو ایک خمار ہوتی ہے۔ ایک نشہ، ایک
 کیفیت!

دراصل اسے شزاو کے برتاؤ کے متعلق کچھ سمجھ میں نہ آتا تھا۔ کسی وقت تو وہ ایلی سے
 اس قدر قریب آ جاتی کہ وہ محسوس کرتا جیسے دونوں ایک جان دو قالب ہوں۔ اس وقت اس کے
 دل میں ایک سنسنی سی دوڑ جاتی اور وہ محسوس کرتا جیسے وہ فاتح ہو۔ جیسے اس نے دنیا کی بہترین
 نعمت، بہترین لذت کو پایا ہو۔

لیکن جلد ہی منظر بدل جاتا اور دوسری ساعت میں شزاو اس سے کوسوں دور چلی جاتی۔ جیسے
 اس کے وجود سے ہی بے خبر ہو۔ جیسے جانتی ہی نہ ہو اور وہ دونوں ایک دوسرے سے قطعی طور
 پر بیگنہ ہوں۔ اس بیگانگی کو وہ روح کی گمراہیوں میں شدت سے محسوس کرتا اور اس کا جی

سانوری کا رشتہ کر دیا۔ زبردستی۔“

”کس کے ساتھ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہ جانے کون ہیں۔ کہتے ہیں کوئی ایس ڈی او کا لڑکا ہے مگر مجھے تو نہیں دکھاتا ایس ڈی او
 تمہارے شریف صاحب نے بھی ابا کی ہاں میں ہاں ملا دی۔ اب وہ بے چاری اپنی قسمت
 رہی ہے وہاں۔“

”میں تم سے کیا مذاق کروں گی۔“ وہ بولی۔ ”مذاق تو اس بے چاری کا اڑ گیا جو تم سے مل
 کی بات بھی نہ کہہ سکی۔ بے چاری نے کئی ایک بار خط بھی لکھا تھا مگر تمہارا پتہ معلوم نہ ہوا
 وہ ڈرتی تھی کہ کسی اور کے ہتھے نہ چڑھ جائے۔ پھر جب اس نے سنا کہ تم اس امر تروال لڑکا
 کے لئے پاگل ہو رہے ہو تو دل ٹوٹ گیا۔ میرے پاس رویا کرتی تھی۔“

”شزاو“ ایلی نے اپنا سر اس کے بازوؤں پر رکھ دیا۔
 ”اور آج تم میرے بازو سے لپٹے ہو۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ ایلی نے محسوس کیا ہے
 قہقہہ اسے چھری کی طرح چیرتا جا رہا ہو۔

”مجھے تم سے محبت ہے شزاو۔“ وہ گڑ گڑا کر بولا۔

”تو پھر میں کیا کروں؟“ وہ فحشا، شزاو کا انداز بدل گیا۔

”تمہیں میرا کوئی خیال نہیں کیا۔“ اس نے پوچھا۔

”مجھے کسی کا بھی خیال نہیں۔“ وہ بولی۔

”تمہیں شریف کا خیال ہے ناں۔ میں جانتا ہوں۔“ ایلی کی آنکھیں سرخ ہوتی جا رہا

تھیں۔ کپٹیاں تھکر رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے کوئی اس کا کلیجہ چاٹ رہا ہو۔

”تمہیں شریف سے محبت ہے نا؟“

”یونہی سمجھ لو۔“ ایلی چلایا۔ ”میں بے وقوف ہوں بے وقوف۔“

”سیانے بھی ہوتے تو کیا فرق پڑ جاتا۔“ شزاو بولی۔

”سیانا ہوتا تو تمہارے لئے یوں پاگل نہ ہوتا۔“ ایلی نے کہا۔

”سچ ایلی۔ ایک بات پوچھوں۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”تمہیں مجھ سے محبت جتنی ہے؟“

سو جی؟

”تمہارا مطلب ہے میں فریب کر رہا ہوں۔“ ایلی نے بناوٹی غصے سے کہا۔

چاہتا کہ کسی کے گلے لگ کر رو دے۔ چنچیں مار مار کر رو دے اور پھر کوئی آتا نہ پکڑ کر ڈال دے۔
کوئے کوئے میں بے وفائی کے گیت گاتا پھرے۔

اسے خیال آتا کہ شہزاد کا محبت کا روپ محض ایک دکھلاوا ہے۔ ٹھیک تو ہے۔ لہذا آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ ایک بد صورت بے ڈھنگے چھو کرے سے محبت کرے۔ کوئی غلطی لڑکی ہوتی تو بھی بات قابل قبول ہوتی۔ لیکن شہزاد — وہ تو جس کو چاہتی اپنے روبرو ہوتی تھی۔ شاید اس کا مقصد صرف لوگوں کے سر جھکانے کے علاوہ کچھ نہ ہو۔ لوگوں کو خیر کر کے علاوہ کوئی مقصد نہ ہو۔ اس خیال پر ایللی کے تصور میں شہزاد کرشن بنگلوان کی طرح ملا تھا ایک انداز سے کھڑی ہو جاتی اور اس کے گرد سینکڑوں سر جھکے دکھائی دیتے۔ اور پھر ایللی دیکھے سروں کو پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہو جاتا۔ یہ خوش نصیب کون ہے۔ وہ کون۔ اس کے دل میں وہم اٹھتے اور وہ سوچنے لگتا شاید رفتی وہ خوش نصیب ہو۔ جیسی تو شہزاد دیکھ کر مسکرایا کرتی ہے اور گھنٹوں کسی کوئے میں، سیڑھیوں پر، منڈریا جھنگے پر اس کے ملنے کھڑی رہا کرتی ہے۔ مگر کسی وجہ سے اسے یقین نہ پڑتا کہ رفتی شہزاد کے لئے جاذب توجہ ہو ہے۔ اس کی جب کے ر — شمس رومال، پریم شاستر اور سینٹ کی شیشی اور اس کی آنگھول پڑتی ہوئی بنگشی پھوار کے باوجود جاذب توجہ ہو سکتا ہے۔ رفتی میں تھا ہی کیا — نہیں تھا۔ تو پھر؟ — ایک سوالیہ نشان اس کے روبرو آکھڑا ہوتا۔ پھر وہ نشان شریف کی شان اختیار کر لیتا۔ ضرور اسے شریف سے محبت ہے جیسی تو اس پر مینڈک پھینکا گیا تھا۔ جیسی تو اس آمد پر شہزاد کی چال تک بدل جاتی ہے اور وہ سیڑھیاں اتر کر چھم سے رک جاتی ہے:

”ایللی وہ بیٹھے چائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

اس پر ایللی احساس رقابت سے لوٹنے لگتا اور اس کے سینے میں ایک جلن سی ہونے لگتی۔ رات بھر وہ اسی طرح دیوانہ وار کروٹیں بدلتا رہا اور پھر صبح کے قریب تھک کر سو گیا۔ جب وہ چائے پی رہا ہوتا تو سیڑھیوں میں — چھم کی آواز سنائی دیتی اور شہزاد قہقہے مچاتی ہوئی اس کے روبرو آکھڑی ہوتی اور مسکرا کر کہتی:

”وہاں کب سے چائے بنی ہوئی ہے اور ایللی تم یہاں بیٹھے ہو۔ آؤ۔“
یہ کہہ کر وہ مسکرا کر وہی نگاہ اس پر ڈالتی اور وہ اپنے تمام وہم اور عزم بھول کر پلوٹنے کی طرح اس کے پیچھے چل پڑتا۔

اس پر فرحت چلائی:

”لے تو ایللی کو انگلی سے پکڑ کر لے چلی تا۔“ اس کی بات میں دھار ہوتی تھی۔ مگر شہزاد گویا ہنسی بن جاتی تھی جیسے سنا ہی نہ ہو۔ ”اپنی خیر منا۔“ وہ چلائی۔ ”کسی روز تجھے انگلی سے پکڑ کر لے جاؤں۔“

”بیٹھے کون انگلی پکڑ کر لے جاتا ہے جی۔“ فرحت زیر لب کہتی۔

”تم تو آنکھیں دکھاتی ہو ورنہ لے ہی چلوں کبھی۔“ شہزاد ہنستی۔

اور بات ہنسی میں ٹل جاتی۔

پھر باجہ مظلوم انداز میں شہزاد کے چوہارے کی چوکھٹ پر آکھڑی ہوتی:

”کب آئے گا تو ایللی؟“

”نہیں دیے پوچھ رہی تھی۔ جلدی آ جانا ایللی۔ فرحت کھانے پر انتظار کرتی رہتی ہے۔“

”ٹھیک تو ہے۔“ شہزاد ہنس کر کہتی۔ ”میل قحط پڑا ہوا ہے۔ کھانے کو تو صرف دیں ملتا ہے فرحت کے ہاں۔“

اور وہ دونوں دو بچوں کی طرح بیٹھ کر گپیں مارتے اور ہنس ہنس کر لوٹ پوٹ ہو جاتے۔

اور جانو انیس دیکھ کر باورچی خانے کے برتنوں کو گھورتی اور آخر زیر لب کہتی۔ ”لو بیٹھو

مے بھی چھو منو۔ یوں بھاگے دوڑے پھرتے ہیں جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ میں کہتی ہوں

لوگ دیکھ کر کیا کہتے ہوتے۔“

”جو ان کے جی چاہے وہ کہیں۔ جو ہمارا جی چاہے گا ہم کریں گے۔“ شہزاد ایللی کی طرف

دیکھ ڈالتی اور ایللی محسوس کرتا جیسے اس ایک نگاہ کے سہارے وہ ساری دنیا کے خلاف یدھ

کرنے کے لئے تیار تھا۔ جانے اس نگاہ میں کیا تھا۔ اسے دیکھ کر ایللی کو سبھی کچھ بھول جاتا تھا۔

اسے رات بھر کی گریہ و زاری بالکل ہی بھول جاتی۔ اس کے ذہن میں کوئی سوالیہ نشان نہ رہتا

اور وہ بھٹکا کہ زندگی واقعی قابل زہمت ہے۔

جانو شہزاد کا جواب سن کر بظاہر چپ ہو جاتی مگر وہ شکایت دن بھر اس کے انداز میں گویا بوند

نمذرتی رہتی۔ اس کی چال سے، اس کے سر ہلانے کے انداز سے، اس کے ہونٹوں کے خم

سے اس کی ہر بات سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ ایسی باتوں کو اچھا نہیں جانتی مگر وہ دونوں جانو کے

اس اظہار سے بے نیاز بیٹھ کر چائے پیتے اور گپیں ہانکتے اور بہانے بہانے ایک دوسرے کو دق

شعوری طور پر کوئی آرزو نہ تھی۔

ایلی کو کسی مخصوص جسمانی قرب کا خیال نہ تھا بلکہ اسے اس قرب سے ڈر لگتا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ اس قابل نہیں کہ شنراؤ کے ساتھ وہ قرب حاصل کر سکے۔ اسے اپنے آپ پر بھروسہ نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ اگر اس قربت کی نوبت آگئی تو وہ بری طرح سے ناکام رہے گا۔ اور پھر شنراؤ کیا کہے گی۔ اس کے علاوہ ویسے بھی اسے ایسے قرب سے نفرت تھی۔ اس کے خیال میں ایسا قرب محبت کے جذبہ کے لئے باعث ننگ تھا۔ محبت کی توہین تھا۔ پھر شنراؤ سی پاکیزہ دیوی ہے۔ نہیں نہیں۔ یہ کبھی نہیں ہو سکتا۔ اس خیال پر ہی اسے وحشت ہوتی تھی۔

صبح چائے پی کر وہ دیر تک شنراؤ کے پاس بیٹھا رہتا حتیٰ کہ مظلوم صورت بنائے ہوئے ہاجرہ نمودار ہوتی:

”اے ہے فرحت کب سے انتظار کر رہی ہے کہ کھانا کھا لو۔“

”میں ابھی آیا۔“ کہہ کر وہ ماں کو ٹال دیتا۔

اس پر جانو بڑبڑانے لگتی:

”توبہ کیا زمانہ آیا ہے اولاد کے دل میں ماں کا لحاظ نہیں رہا۔“

آج ایک گھنٹے کے بعد ہاجرہ پھر آ جاتی۔ حتیٰ کہ وہ مجبور ہو کے اٹھ بیٹھتا اور بادل غواشتہ ماں کے پیچھے پیچھے چل پڑتا۔

جب ایلی کھانا کھا رہا ہوتا تو بیڑھیوں میں وہی دھما چوکڑی کی آواز سنائی دیتی اور پھر چیم سے شنراؤ ہاتھ میں سالن کی پلیٹ لئے مسکراتی ہوئی آ موجود ہوتی۔

”وہ کرلیے پکائے ہیں آج کہ کچھ لو تو طبیعت سنور جائے۔“ وہ چلائی۔

”کیوں نہ ہو جی ان ہاتھوں میں جادو ہے۔“ فرحت طعنہ دیتی۔

”لوگوں کی تو ویسے ہی طبیعت سنور جاتی ہے۔“ ہاجرہ فرحت کی ہاں میں ہاں ملائی۔

”کیوں نہ سنورے جی۔“ شنراؤ یوں قہقہہ مار کر ہنستی جیسے اسے طنز کا احساس ہی نہ ہو پھر شنراؤ یدمی ایلی کے پاس پہنچتی اور پھر چوری چوری وہی مسکراہٹ چھلکا کر زیر لب کہتی۔

”مہمگ کیوں آیا ہے تو۔۔۔۔۔۔“ پھر یا آواز بلند چلائی: ”لے کھا کر دیکھ اپنی انگلیاں نہ چاٹ لیں۔“

اس وقت چپکے سے شنراؤ کا جتنی ہاتھ ایلی کے پیلو سے نکل کر اس کا کھل سلاتا اور ایلی کی

کرتے۔ پھر جو نئی جانو کسی کام کے لئے چوبارے سے نیچے اتر جاتی تو دفعتاً ”ان کی لادہ“ باتیں ختم ہو جاتیں۔ ایلی شنراؤ کی طرف یوں دیکھنے لگتا جیسے بچہ ہو۔ اور اس کے سامنے مٹھائی کی ایک تھالی۔ اس کی بدلتی ہوئی نگاہ دیکھ کر شنراؤ دفعتاً ”سجیدہ ہو جاتی اور پھر کی پھر مصروف ہو جاتی اور یوں ایلی کے وجود سے بے نیاز ہو جاتی جیسے اس سے کوئی واسطہ نہ ہو۔ دیکھ کر ایلی کے دل میں غصے کا ایک طوفان کھولتا اور وہ پاگلوں کی طرح شنراؤ کی طرف ہرگز نہ

”خدا کے واسطے۔“ وہ زیر لب سنجیدگی سے کہتی۔ ”جانو آ جائے گی۔“

”نہیں نہیں۔“ ایلی چلاتا۔ ”وہ تو ابھی گئی ہے۔“

”کوئی اور آ جائے گا۔ ہوش کرو۔“ شنراؤ اسے گھورتی۔

”اور تم تو کہتی تھیں۔ ایلی کیا لوگوں سے ڈرتے ہو۔ یاد ہے؟“ ایلی کہتا۔

”تم سمجھتے تو ہو نہیں۔“ شنراؤ کی آواز میں درشتی پیدا ہو جاتی۔

اس پر ایلی کے سینے پر سانپ لوٹ جاتا۔ وہ گہرے فکر میں پڑ جاتا اور ایک سوالیہ نشان اس کے سامنے ابھرنے لگتا۔

اس طرح تھکنے میں وہ دونوں بیگانہ وار ایک دوسرے کے روہرو بیٹھے رہتے۔ شنراؤ

جانے کونسے افق میں کھوئی رہتی اور ایلی اس کی طرف پاگلوں کی طرح ٹٹکی باندھ کر دیکھتا رہتا۔

اس کا بازو تھام لیتا اور وہ اسے یوں اس کے حوالے کر دیتی جیسے بچے کو بھلانے کے لئے بلے

کھلوتا ہو اور خود بے نیاز ہو جاتی جیسے وہ بازو اس کا اپنا نہ ہو۔ کچھ دیر تک تو وہ اس بے جان

سے کھیلتا رہتا۔ پھر اسے احساس ہونے لگتا کہ اس بازو سے شنراؤ کا دور کا واسطہ نہیں۔ بچل

ایک اضطراب گھیر لیتا اور وہ شنراؤ کے قریب بیٹھ کر محروم محسوس کرتا اور محرومیت کی وجہ سے

قرب کی بنا پر کروٹیں بدلتا اور کڑھ کڑھ کر اپنی جان ہلکان کر لیتا حتیٰ کہ کوئی آ جاتا اور شنراؤ

کی چاپ سنتے ہی اس سے اپنا بازو چھڑا کر دور ہو بیٹھتی اور پھر ہنس ہنس کر باتیں کرتی۔ اس کی

طرف خاص انداز سے دیکھتی۔ وہی انداز۔ اس طرح وہ تھائی میں قرب کے باوجود ایک دوسرے

سے دور رہتے اور محفل میں دور ہونے کے باوجود ایک دوسرے کے قریب ہو جاتے۔

ایلی کی صرف ایک خواہش تھی کہ وہ شنراؤ کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب۔

شنراؤ اس کی طرف دیکھ کر مسکرائے۔ وہی مسکراہٹ۔ باہمی سازش کی مسکراہٹ۔ اور تھائی

بھی وہ اس کے اس قدر قریب ہو جاتی کہ دونوں میں ذرا فرق نہ رہے۔ اس کے علاوہ

علی پور تو ایسی جگہ تھی جہاں سیاہ ناک شہابی اینٹیں آنکھیں موند کر سب کچھ دیکھتی رہتیں۔ اور بھرات کے پردے میں بڑھا چڑھا کر ایک دوسری سے سب کچھ کہہ دیتیں۔ انیوں کی بات دروازے چاؤں چاؤں کر کے دہراتے جنہیں سن کر آوارہ کتے قہقہے لگاتے اور چنگاڑیں خوشی سے رقص کرتیں اور اندھیرے کوئے باہر نکل نکل کر چنگاڑوں کی کٹھاکلی دیکھتے۔ مسکرا کر پھر سے چپ جاتے۔ پھر جب سورج کی پہلی کرن محلے کے مکانات کو روشن کرنے کی ناکام کوشش میں معصوف ہوتی تو محلے والے وہی بات چھیڑ دیتے۔ دہلی دہلی زبان سے بات پھسل نکلتی۔ انگلیاں ڈولائی انداز سے ابھر کر ہونٹوں پر ٹپک جاتیں۔

”ہائے اللہ۔ یہ بات ہے؟“

”توبہ کیا زمانہ آیا ہے۔“

”وہ تو میں پہلے ہی کہتی تھی ناں۔ کہتے ہیں ہونمار بروا کے چکنے چکنے پات۔“

”پرسن لو تم بہن یہ کاٹھ کی ہنڈیا چار دن چڑھے گی بس۔“

”پرسن کہتی ہوں اسے شرم نہ آئی۔“

اگر ایلی اس راز کو اتنی اہمیت نہ دیتا تو شاید بات نہ بگڑتی۔ اور اگر بگڑتی بھی تو اس میں تعفن پیدا نہ ہوتا۔ اگر ایلی اس سلسلے میں محض ایک تفریح جانتا اور دیوی کی بجائے شہزاد کو محض ایک رنگین تلی سمجھتا یا خوب صورت کھلونا سمجھ کر اس سے کھیلتا تو بات یوں گل حکمت ہو کر خطرناک ہو لے پیدانہ کرتی لیکن ایلی کو پیدائشی طور پر یہ تعلیم دی گئی تھی کہ ایسے تفریحی تعلقات گناہ کے مترادف ہوتے ہیں۔ علی احمد کے کمرے کے خلاف اس نے جو بغض پال رکھا تھا اس کے اس خیال کو اور بھی معکم کرنا تھا اس کا خیال تھا کہ ایسے تعلقات یا ایسی خواہشات کو جائز بنانے کے لئے انہیں حقیقی عمل عشق و مروت ضروری ہوتا ہے اور حقیقی عشق میں لازم ہے کہ انسان اپنی شخصیت کو تباہ کر دے۔

زندگی کو ایک روگ بنالے۔ وصال کے تمام راستے اپنے ہاتھوں سے مسدود کر دے اور پھر عمر بھر داس و دھن کا سمارا لئے ایک لپاچ بنا رہے، اسی وجہ سے ایلی نے اس تفریحی تعلق کو جو اس کو اس شہم کو اس معمولی غرض کی وجہ سے عمل میں آیا تھا۔ ماحول سے اخذ کئے ہوئے اعتباروں کی وجہ سے ایک لامتناہی اور تباہ کن الجھن میں بدل دیا۔ اور شہزاد کو دیوی بنا کر خود اسکے روبرو پیسوی بن کر بیٹھ گیا۔ اگر وہ شہزاد کو دیوی کی بجائے ایک جیتی جاگتی حسین عورت سمجھتا۔ مرد کی حیثیت سے اس کی آواز کرتا تو شاید شہزاد میں بھی دورخی پیدا نہ ہوتی اور اس کا قرب قرب ہوتا اور بعد، بعد مگر اب ان

آنکھوں تلے تارے ناچنے لگتے۔ وہ قہقہہ مار کر ہنستی: ”دیکھ لے فرحت ایک ہی لئے میں آنکھیں اٹل آئی ہیں ایلی کی۔“

فرحت زیر لب کہتی: ”نہ جانے کیا لقمہ دیا ہے تم نے۔“

”یہی تو ایک راز ہے۔“ شہزاد نظر بچا کر ایلی کے منہ پر ہلکا سا تھپڑ مار کر کہتی۔ ”یہ کیسے پہچانے گا اچھا میں چلی۔“ اور وہ بھاگ کر بیڑھیوں میں غائب ہو جاتی۔

ایلی بے وقوفوں کی طرح منہ اٹھا کر دیکھتا رہتا۔ پھر نہ جانے کہاں سے ایک چھوٹا سا گڑا کر اس کے منہ پر لگتا اور ایلی کی باچھیں کھل جاتیں اور وہ محسوس کرتا کہ زندگی کس قدر عجیب ہے۔ اس وقت اس کی نگاہ تلے سوالیہ کی بجائے استفہامیہ نشانات رقص کرتے۔

شہزاد کا وہ التفات بھرا لمس اس کے گال میں جذب ہو کر خون میں جلتا اور اس کی رگوں میں یوں لہرس لینے لگتا جیسے کسی ٹھہری ہوئی جھیل میں کسی نے پتھر پھینک دیا۔ ایلی کے لئے یہ لقمہ ٹکنا مشکل ہو جاتا اور جلد ہی وہ کوئی بسانہ بنا کر شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ جب وہ بیڑھیاں چڑھنے لگتا تو فرحت کوئی طنز بھری بات کہہ دیتی یا باجرہ مظلومیت بھرے اور اس میں اسے ٹوکتی جس پر وہ غصے سے بھوت بن جاتا اور اس کی آنکھیں سرخ ہو جاتیں۔

جونہی ایلی شہزاد کے چوبارے میں پہنچتا تو اس کی توقع کے خلاف وہاں کوئی اور ہی شہزاد ہوتی جیسے اس شہزاد سے دور کا کوئی واسطہ نہ ہو جو جھم سے زینے سے اتری تھی۔ اس وقت اس کے ہاتھ حنا مالیدہ ہونے کے باوجود بے جان ہوتے۔ اس کی آنکھیں دور نہ جانے کس ماحول کی کھوئی ہوتیں۔ وہ پتھر کے بھگوان کی طرح بیٹھی رہتی جیسے اسے ایلی کی آمد کا احساس تک نہ ہو۔ ایلی اس پتھر کے بھگوان کے روبرو بیٹھ کر نہ جانے کہاں کھو جاتا یا اس بے جان کھلونے سے کچھ جو شہزاد کے شانوں سے لٹکا کرتا تھا۔

دورخی

ان دنوں ایلی سارا سارا دن گھر میں چھپا رہتا اور گھر میں بھی وہ کھڑکی میں کھڑے ہوتا۔ احتراز کرتا کہ کوئی دیکھ نہ لے۔ نہ جانے کیوں و غصا، اس کی زندگی میں پردہ واری کا عنصر پیدا گیا تھا۔ اس کی خواہش تھی کہ کسی کو خبر نہ ہو کہ وہ علی پور آیا ہوا ہے۔ کوئی اس کا راز نہ لے لیکن علی پور میں کسی بات کو چھپے رہنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔

ابھی حالات میں شہزاد بھی الجھ کر رہ گئی تھی جس کی وجہ سے ایللی ان سوالیہ نشانات سے واقفہ اور اس کی زندگی بے پناہ مسرت اور بے پایاں الم کے چکر میں پس کر رہ گئی۔

وہ راز

ایللی نے اس راز کو اس قدر متبرک بنا دیا کہ محلے کی ٹانگ شامی اینٹیں جلتے جلتے کی گئیں دروازے آہ و زاری کرنے لگے کتے کسی آنے والی مصیبت کے مبہم احساس سے مضطرب چنچیں مارنے لگتے اور محلے والیوں کے کان کھڑے ہو گئے:

محلے والیاں ایللی کو دیکھ کر منہ میں انگلیاں ڈال لیتیں:

”ہائے ایللی تو کیا یہاں ہے۔ لو۔۔۔ اور میں سمجھ رہی تھی کہ لڑکا سکول میں پڑھتا ہے۔“

”لو ہمیں کیا معلوم کبھی دیکھا بھی ہو یا ہر چوگن میں۔ پہلے تو اللہ مارے ارجمند کے ساتھ لائین تے کھڑا رہتا تھا اور اب گویا کسی نہ خانے میں چھپا رہتا ہے۔ کیا ہو گیا تری عقل کو۔“

کوئی کہتی:

”اے ہے لڑکے تو تواب شکل دکھانے سے بھی رہا۔ ایسا بھی کیا۔ نہ لڑکے انہوں سے لے رہتا ہی اچھا ہوتا ہے۔“

کوئی مسکرا کر کہتی:

”انہوں سے تو ملتا رہتا ہے لال۔ اپنے دی ہوتے ہیں ناں جسے کوئی سمجھے۔ ہم بوجھوں کیسے سمجھے۔ ماشاء اللہ اب جوان ہے۔ اب تو اس کی ماں کو چاہئے کہ شادی کر دے اس کی۔“

”نہ جانے باپ کی طرح کتنی عورتیں گھرائے گا۔“

”نہ بسن دعا کرو۔ اللہ ہدایت دے۔“

محلے والیاں تو پھر بھی بات اشارہ کرتی تھیں لیکن محلے کے لڑکے تو کھلے بندوں اس سے کہتے تھے:

”کیوں بھی۔ کیا پھر سے ماں کی گود میں پڑ گئے۔ اب تو دکھائی ہی نہیں دیتے۔ کوئی بڑا پھنسے ہو۔ اب تو اونچی ہواؤں میں اڑنے لگے ہوں۔“

وہ خود بھی انہیں ملنے سے کتراتا تھا۔ باہر تو وہ نکلتا ہی نہ تھا اس لئے اس کے بچوں کو

کہا کہ وہ رسی ہو جانو۔ مجھ سے کہہ رہی ہو کیا؟“ ایللی اسے ستانے کے لئے معصوم انداز میں کہتی تھی۔

”کولب اے بھی اکیلا ہوش۔ کب سے چلا رہی تھی کہ رضانیچے بلارہا ہے۔ سنتے ہی نہیں۔ اور

پہلے تو اس کے دل میں شہزاد کے کہنے پر "ایلی تم لوگوں کی پروا کرتے ہو؟" بڑی بڑی

ایسی باتیں - سی باتیں

لیکن آصفی محلے کی سیاہ اینٹیں ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر مسکراہٹ بھینچ کر کہتی ہیں اور آصفی مکانات کے دروازے زیر لب چوں چوں کر کے مسکراتے ہوئے کہتی ہیں کہ اندھیرے میں محلے کے کتے روتے، چمگاڈیں جھینٹیں اور ان تہہ خانہ نما مکانات والیاں سر جوڑ کر باتیں کرتیں اور پھر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لیتیں۔

ایلی کے شب و روز میں اس کی علاوہ صرف ایک بات تھی۔ ہر روز یا ہر دو روز

بربادی اور تباہی کے اعلان کم ہوتے گئے۔ شاعری کا عنصر نہ رہا جس سے اس کے پہلے خط لبرز ہوتے تھے۔ آہستہ آہستہ اس کے خطوط میں صبر اور ضبط کی جھلک واضح ہو گئی اور نفس مضمون میں اختصار پیدا ہوتا گیا اور آخرش ایلی کو آصف کا وہ خط موصول ہوا جس میں صرف ایک جملہ لکھا تھا۔

”میں تادم تحریر زندہ ہوں۔“

ایلی نے وہ خط دیکھا۔ اسے بار بار پڑھا لیکن اسے کچھ سمجھ نہ آیا۔ آخر تادم تحریر زندہ ہوں سے اس کا مقصد کیا تھا۔ یہ بات تو ایک حقیقت تھی۔ ایک ایسی حقیقت جسے کوئی جھٹلا نہیں سکتا تھا۔ انسان اپنے مستقبل کے متعلق کیسے جان سکتا ہے۔ وہ صرف حال کے متعلق ہی جانتا ہے اور حال کیا ہے۔ ایک ساعت، ایک مختصر ترین ساعت۔ ایلی نے لاشعوری طور پر ان باتوں کا جائزہ لیا۔

اس وقت شام کا وقت تھا۔ ایک اداس شام شہزاد کی موجودگی کے باوجود اداس، اس کی سیاہ آنکھوں میں چمکتی ہوئی شرارت کے باوجود اداس۔ وہ چپ چاپ شہزاد کے پاس جا بیٹھا۔

”شہزاد“ وہ بولا۔ ”یہ دیکھو تو؟“

”کیا ہے؟“ وہ بولی۔ ”کیا دیکھو تو؟“

”یہ خط میرے دوست کا ہے۔“ ایلی نے اسے خط دیتے ہوئے کہا۔

”عجب خط ہے۔“ وہ بولی۔ ”اس سے تو بہتر تھا اپنی تصویر ہی بھیج دیتا“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم نہیں جانتیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”اسے ایک لڑکی سے محبت ہے۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی۔ ”محبت ہے — پھر؟“

”کس کوئی گزبوند ہو جائے۔“ ایلی نے کہا۔ ”کس وہ مرنے جائے۔“

”محبت میں مرجائے۔“ اس نے پوچھا۔ ”کیا لڑکی کو اس کی پروا نہیں۔“

”وہ جان دیتی ہے اس پر۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو پھر اسے کیا پڑی ہے کہ جان دے۔“ شہزاد مسکراتے ہوئے بولی۔

”شاید۔“ ایلی سوچ رہا تھا۔

”واہ۔“ وہ ہنسی۔ ”محبت کرنے والے کبھی نہیں مرتے۔ وہ تو امر ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا امر ہو جاتے ہیں کیا۔ تو مجھے بھی امر کر دو شہزاد۔“

امیدیں پیدا ہو گئی تھیں لیکن پھر جلدی ہی وہ سب گارے کی دیواروں کی طرح دھڑام سے گر گئیں۔ اب بھی جب شہزاد اس پر وہ نگاہ ڈالتی یا جب وہ فرحت کی طرف آکر فرحت یا ہمت کسی طعنے کے جواب میں ظاہر کرتی جیسے لوگوں سے قطعی طور پر بے نیاز ہو۔ جب وہ لوگوں کی موجودگی کے باوجود آنکھ بچا کر ایلی کا گل سلا جاتی یا چلتے چلتے چپکے سے اسے چپکی بھر سکتا تھا۔ ہی باتوں میں آنکھ بچا کر اسے گھورتی یا زبان نکال کر اس کا منہ چراتی اس وقت ایلی کا سینہ جڑاؤ جاتا اور شانے ابھر آتے۔ وہ محسوس کرتا کہ وہ خوش قسمت شخص ہے جسے شہزاد کی سامتی ہر ہے مگر جو نہی وہ تنہائی میں شہزاد سے ملتا تو اس کی تمام امیدیں اور سرسبز خاک میں مل جاتیں۔ ایلی نے آصف کے دو ایک خطوں کے جواب بھیجے تھے بار بار مطالبہ کیا تھا کہ تفصیلات کر کر بھیجے۔ لیکن آصف میں اتنی ہمت کہاں تھی کہ کاغذ پر دل کا راز لکھ بھیجتا۔ اس نے تو اپنی شخصیت کو یوں چھپا رکھا تھا کہ خود اسے جاننے سے محروم ہو چکا تھا۔ تفصیلات کی بجائے وہ اپنی اور بربادی کے راگ الاپتا رہا اور بار بار ایلی کو امر تر بلاتا رہا۔ ”خدا کے لئے ایک بار آکر لے بربادی سے بچالو۔“ مگر ایلی کو اتنی فرصت کہاں تھی کہ وہ آصف سے ملے جاتا۔ وہ ڈنڈے میں اپنا آپ کھو چکا تھا۔ وہ تو چاہتا تھا کہ شہزاد اس کے سامنے بیٹھی مشین چلاتی رہے اور وہ اس کی ڈولتی آنکھوں اور لٹکتے ہوئے بھرے اور گورے بازوؤں کو دیکھتا رہے۔ اس کے حجاب ہاتھوں کا شہر رہے۔ شہزاد چھم سے زینے سے اترے اور کہے:

”ایک۔“

”ایک لقمہ کھاؤ تو زندگی سنور جائے۔“

اس بات کا متنی تھا کہ شہزاد زبان نکال کر ایلی کا منہ چڑائے اور پھر سنجیدگی سے باؤں کے:

”جانو۔ تم آج بات ہی نہیں کرتیں۔ ناراض ہو کیا؟“

اگر ایلی کو احساس ہو جاتا کہ آصف شہر چھوڑ کر جانے کے علاوہ کچھ اور کرنے کی بھی طاقت رکھتا ہے تو حالات یہ رخ اختیار نہ کرتے لیکن ایلی کو تو یقین تھا کہ آصف خطرے میں کوئی نہ سکتا چونکہ اس میں آگے قدم رکھنے کی جرأت نہیں۔ ایلی کو کبھی خیال نہیں آیا تھا کہ وہ اپنے پیچھے ہٹا سکتا ہے جو خطرناک نتائج پیدا کر سکتا ہے۔ اگر اسے اس بات کا ذرا بھی احساس ہو جاتا شاید وہ آصف کو ملنے کے لئے امر تر چلا جاتا مگر ایسا نہ ہوا۔

کے بعد آصف کا وہ خط بے معنی ہو کر رہ گیا۔ ایللی کے لئے تمام کائنات شہزاد سے بھر گئی۔ ان بلنے میں ایللی کا سر جھکا اور بازو کی بجائے شہزاد کے بلوری پاؤں پر ٹک گیا اور شہزاد نہ جانے کس لمحے پر کھو کر رہ گئی۔

بلنا

اگلے روز ایللی جب چوبارے میں بیٹھا ہوا حسب معمولی شہزاد کے پاؤں کا جائزہ لے رہا تھا تو دفعتاً چوگان سے شور مٹا دیا۔

”کون ہے تو؟“

”دیر کے ملے گا تو؟“ کوئی محفلہ والی بولی۔

”کون آیا ہے۔ ہن؟“ دوسری چلائی۔

”میں کتنی ہوں کوئی آیا ہے کیا؟“

”ہاں ہاں۔ کوئی امر ترسے آیا ہے۔“

”کس کے ہاں آیا ہے؟“

”اپنے علی احمد کے ہاں۔“

”اچھا! اللہ۔ سو بار آئے۔ کوئی مہمان ہو گا لیکن علی احمد تو آج کل نوکری پر ہیں۔“

”کہتا ہے ایللی سے ملنا ہے۔“

”ایللی سے ملنا ہے؟“

ایللی گھبرا گیا۔ وہ چپکے سے اٹھا اور کھڑکی کی درز سے دیکھنے لگا۔ چوگان کے عین درمیان میں ایک اونچا لمبا جوان کھڑا دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ نہ جانے کون ہے؟ اس کے چہرے کو غور سے دیکھنے کے باوجود وہ اسے پہچان نہ سکا۔

”بیٹے! کیا نام ہے تیرا؟“ مائی حاجاں پٹکھا چلاتے ہوئی چلا کر بولی۔

”کیا کا شفیع۔“ اللہ تیرا بھلا کرے۔ ابھی آ جاتا ہے ایللی بیس ہو گا۔“

”اے ہاجرہ۔ اے لڑکی فرحت میں کتنی ہوں لڑکی کیا نام ہے تیرا؟“ ”ہے مجھے تو اللہ ملاہم علی بھول جاتا ہے۔ ہاں اپنی جانوں۔۔۔۔۔ اے جانوں۔۔۔۔۔ ذرا ہاجرہ کو آواز تو دینا۔۔۔۔۔ کتنا کوئی ایللی سے ملنے آیا ہے۔“

”امر ہوتے ہیں۔“ وہ بولی۔ ”کئے نہیں جاتے۔“

”تو کیا میں امر ہو گیا ہوں؟“ ایللی نے پوچھا۔

وہ سوچ میں پڑ گئی۔ پھر دفعتاً ”سراٹھا کر بولی۔

”ایللی؟“

”جی۔“ ایللی نے امید افزا نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”ایللی کیا تم واقعی۔۔۔۔۔ پھر دفعتاً وہ رک گئی۔

”بولو۔“ ایللی نے شہزاد کا بازو جھنجھوڑا۔ ”کیا کہہ رہی تھیں تم؟“

”کچھ نہیں۔“ شہزاد کی آنکھوں میں آنسو تیرنے لگے۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ضد کرنے لگا۔ ”ضرور بتاؤ مجھے۔“

”کچھ ہو تو بتاؤں میں۔۔۔۔۔ وہ مسکرائی۔ اس کی مسکراہٹ غمناک تھی۔

”اچھا تو کچھ بھی نہیں کیا۔“ ایللی نے بات کا رخ بدلا اور سر جھکا کر بیٹھ گیا۔ پھر دفعتاً اس نے سراٹھایا۔

”شہزاد۔“ وہ بولا۔ ”تمہارا کچھ بھی نہیں میرے لئے دنیا بھر کے بسے کچھ سے زیادہ ہے۔“

شہزاد نے تڑپ کر ایللی کی طرف دیکھا اور پھر ایللی کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

”ایسی باتیں نہ کیا کرو ایللی۔“ وہ بولی۔

”کیسی باتیں؟“ ایللی نے پوچھا۔ شہزاد خاموش رہی۔

”کیوں نہ کیا کروں؟“ ایللی نے پھر پوچھا۔

”بس نہ کیا کرو ایللی۔۔۔۔۔ میری خاطر۔“ شہزاد نے منت سے کہا۔

”تمہاری خاطر میں بس کچھ کر سکتا ہوں شہزاد مگر یہ مطالبہ نہ کرو کہ تمہاری خاطر میں نہ کہوں۔“

”اچھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”میری خاطر تم کیا کیا کر رہے ہو؟“

”جو میں اپنی خاطر نہیں کر سکتا تمہاری خاطر کر سکتا ہوں صرف تمہاری خاطر۔“

”چپ۔“ وہ چلائی۔ اور اس کی حنائی انگلی ایللی کے ہونٹوں پر ٹک گئی۔

وہ پہلا دن تھا جب تیجے میں شہزاد نے ایللی سے اظہار التفات کیا تھا۔ اس اظہار التفات

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ کسی سے کہلوایے کہ ایلی گھر پر نہیں اور اس اجنبی سے ملنا کوفت سے جان بچالے لیکن اس وقت تک محلے میں چاروں طرف شور مچ چکا تھا۔ ملکا را اجنبی کے متعلق سن کر گدھوں کی طرح کھڑکیوں اور منڈیروں پر آکھڑی ہوئی تھیں۔ ہاتھ پتھیاں چل رہی تھیں ہاتھ چل رہے تھے۔ زبانیں قینچی کی طرح چل رہی تھیں۔ لب لہجہ سے بچنا ممکن نہ تھا۔ اس لئے وہ بادل خواستہ نیچے اتر گیا اور ڈرتے ڈرتے چوگان میں پہنچا۔

”کون ہے؟“ اس نے پوچھا۔

چاروں طرف سے محلے والیوں نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔

”ہائیں تم شفیع۔“ شفیع کو دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ شفیع اس جماعت تھا۔ وہ اس کی شکل و صورت سے پوری طرح واقف تھا۔ حیرانی اس بات پر غمی کر کے شفیع کا پہچانا کیوں نہ تھا اور فرض کیجئے دوری کی وجہ سے پہچان نہ سکا تھا تو بھی اس کے لئے جانے پر وہ اسے کیوں نہ پہچان سکا؟

”آؤ آؤ۔“ وہ گرجوٹی سے بولا۔ ”اوپر چلو۔“

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”مجھے جلدی ہے۔“

”جلدی ہے تو کیا بیٹھو گے نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کیسے آئے ہو؟“

”تمہیں لینے آیا ہوں۔“ شفیع نے جواب دیا۔

”مجھے لینے آئے ہو؟“

”ہاں۔“ وہ رک کر بولا: ”میری ساتھ امرتسر چلنا ہے تمہیں۔“

”کیوں؟“ ایلی کے منہ سے یوں نکل گیا جیسے اسے شفیع کی بات بری لگی ہو۔

ایک ساعت کے لئے شفیع گھبراہٹ مٹا کر بولا: ”آصف نے بلایا ہے تمہیں۔“

مٹھراہٹ حسرت آلودہ تھی۔

”آصف نے بلایا ہے۔“ ایلی نے دہرایا۔

”ہاں۔ وہ کہتا تھا اسے ساتھ لے کر آنا۔“

”تم کسی اپنے کام سے آئے ہو گے میں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔ صرف تمہارے لئے۔“

”صرف مجھے لے جانے کے لئے خیریت تو ہے؟“ ایلی گھبرا گیا۔

”آصف کی حالت اچھی نہیں۔“ شفیع نے آنکھیں جھکا کر کہا۔

”حالت اچھی نہیں۔ کیا مطلب؟“

”اس نے کہا تھا میری طرف سے کہہ دینا حالات اچھے نہیں اور ساتھ لے کر آنا۔“ شفیع نے بعد مشکل جملہ ختم کیا۔

”ہوں۔ تو حالات اچھے نہیں۔ یہ کہو نا۔ اس کے حالات تو کبھی اچھے نہ ہوں گے۔“ ایلی

جھک کر بولا۔

”چلو اب راستے میں باتیں کریں گے۔“ شفیع بولا۔

”اگر میں دوسری گاڑی میں آ جاؤں تو؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”ابھی چلنا ہو گا۔ ضروری ہے۔“

”اچھا تو میں تیار ہو آؤں۔“ ایلی نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”دیر نہ لگانا۔“ شفیع نے اسے تاکید کی۔

بے معنی کھرام

ایلی تیار ہو کر آیا تو وہ شیش کی طرف چل پڑے۔ محلے سے باہر نکلتے ہی ایلی نے سوالات کی بھرمار کر دی:

”آصف تمہیں کیسے مل گیا؟ کیا تم چٹھیوں میں باہر نہیں گئے تھے کہیں؟ خود کیوں نہ آیا

آصف؟ تمہیں گھر کا پتہ کیسے مل گیا؟ مجھے اس نے کیوں بلایا ہے؟ آخر بات کیا ہے؟“

شفیع ایلی کے سوالات سے گھبرا گیا۔ لیکن اس نے ان میں سے کسی کا جواب نہ دیا بلکہ

جواب دینے کی بجائے اس نے اپنا قصہ چھیڑ دیا کہنے لگا۔

”بات یہ ہے کہ آصف کو ایک لڑکی سے محبت تھی۔“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”ہاں اسے محبت ہو گئی تھی۔“ شفیع نے کہا۔

”لیکن اس نے مجھ سے تو کبھی بات نہیں کی تھی۔ اس کے متعلق۔“ ایلی نے منہ پکا کر

”کسی سے بات کرنا اس کی عادت میں داخل نہیں تھا۔“ شفیع نے آہ بھری۔

”پھر اس نے تم سے بات کیسے کی۔ تمہیں یہ راز کیسے بتا دیا آصف نے؟“

”ج ایل۔“ شفیع نے سر جھکا لیا۔

شفیع کے انداز کی سنجیدگی کی وجہ سے ایللی خاموش ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ شفیع کی بات کی سمجھی ازاں سے مگر بہت نہ پڑی۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کی طاقت گویائی ختم ہوتی جا رہی ہو۔ جیسے اس کی رگوں میں خون جم گیا ہو۔ وہ خاموش ہو گیا۔ اور وہ دونوں نہ جانے کب تک خاموش بیٹھے رہے۔ ایللی گاڑی کی کھڑکی کے باہر دوڑتے ہوئے دیہات کے منظر کی طرف کھوئے کھوئے دیکھتا رہا اور شفیع کی دکھتی آنکھ سے قطرے گرتے رہے۔

دھننا گاڑی کو دھچکا لگا اور وہ رک گئی۔ امرتسر کے پلیٹ فارم کو دیکھ کر ایللی حیران رہ گیا۔ اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ وہ امرتسر جا رہا ہے۔ اسے یہ بھی خیال نہ رہا تھا کہ شہزاد اس وقت بیٹھی ٹین میں چلا رہی ہو گی۔ اسی طرح سر جھکائے بازو لٹکائے۔ اس وقت ایللی کے ذہن میں ایک وسیع غلط پھیلا ہوا تھا۔

ٹین میں سے وہ دونوں تانگے میں سوار ہو گئے۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے تھے جیسے انہیں ایک دوسرے سے کچھ نہ کہتا ہو۔

جب وہ آصف کے گھر کے قریب پہنچے تو شفیع نے مہر سکوت توڑا۔

”ایللی۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ ایللی چونکا۔

شفیع رک گیا جیسے اسے یاد نہ رہا ہو کہ کیا کہنا چاہتا ہے۔ ”آصف کی حالت بہت خراب تھی۔ بہت خراب۔ اس حد تک کہ شاید.....“

”سب ٹھیک کر لوں گا میں۔“ ایللی چمک کر بولا۔

”شاید وہ.....“ شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”شاید کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔“ ایللی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔

گلی کا موڑ مڑتے ہی ایللی حیران رہ گیا۔ وہ تنگ گلی لوگوں سے بھری ہوئی تھی۔ کھڑکیوں میں ٹنڈروں پر عورتوں کا جھوم تھا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہاں غدر ہو گیا ہو۔ لوگ چلا رہے تھے۔ جھج رہے تھے۔

”یہ کیا ہے؟“ اس نے ہٹ کر شفیع سے پوچھا۔

شفیع نے ایللی کی بات کا کوئی جواب نہ دیا بلکہ اس کا ہاتھ پکڑ کر مجمع کر چیرتا ہوا آگے نکل

”بے چارہ مجبور ہو گیا ہو گا۔ پھر بھی اس نے مجھ سے پوری بات نہیں کی۔“ شفیع نے لگا ”کیا بات کی تھی تم سے آصف نے؟“ ایللی اپنی لاعلمی کا اظہار کرنے کی کوشش کرنے لگا ”مجھ سے۔“ شفیع خاموش ہو گیا۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک آیا۔

”شفیع۔“ ایللی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”تم رو رہے ہو؟“

”نہیں۔“ شفیع نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”دراصل میری آنکھیں دکھتی ہیں۔ پلٹا کر ہے۔ آصف نے مجھے گھر بلا بھیجا تھا کہنے لگا۔ شفیع کیا تم ایللی کو بلا سکتے ہو۔ اگر ایللی نہ آیا تو۔۔۔۔۔“ وہ خاموش ہو گیا۔ جس طرح وہ بات کرتا ہے تم جانتے ہی ہو۔“ شفیع نے پھر بد شروع کی۔

”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”اچھی طرح معلوم ہے۔“

”پھر اس نے میری منتیں کیں۔“ شفیع کہنے لگا۔ ”لیکن میں نہ مانا۔ میں نے کہا جب تک بلانے کی وجہ نہ بتاؤ گے میں نہ جاؤں گا۔ پھر اس نے بتایا مجھے کہنے لگا میں عجیب مصیبت میں گرفتار ہوں۔ اگر ایللی نہ آیا تو سمجھ لو میری زندگی ختم ہو جائے گی۔“

”بے وقوف۔“ ایللی چلایا۔ ”محبت لڑکی سے ہے لیکن ایللی نہ آیا تو سمجھ لو زندگی ختم ہو جائے گی..... عجیب بے ٹکی سے بات ہے۔“

”نہیں ایللی۔“ شفیع نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”وہ واقعی تکلیف میں ہے۔ اس کی حالت اچھی نہیں۔“

”حالت اچھی نہیں۔“ ایللی چلایا۔ ”اچھا خاصا ہے۔ کھانا پیتا ہے۔ حالت اچھی کیوں نہیں۔“

”نہیں۔“ شفیع رک رک کر کہنے لگا۔ ”اب تو بے چارہ ختم ہو گیا۔ منہ زرد ہو گیا۔“ آنکھیں نکل آئی ہیں۔ پہچانا تک نہیں جاتا۔“ شفیع نے کہا۔

”کیا واقعی؟“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔

”ہاں۔۔۔۔۔ اب شاید وہ بچ نہ سکے۔“ شفیع نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔

”بچ نہ سکے۔ تم بھی حد کرتے ہو۔۔۔۔۔“ ایللی بولا۔

پھر وہ نماز پڑھ رہے تھے اور وہ امامت کر رہی تھی۔ وہ لاش کو دفن رہے تھے اور وہ قہقہے لگا

رہی تھی۔ "شفیع نے اسے آواز دی۔" چلو گھر چلیں۔"

ایلی نے ننی میں سر ہلا دیا۔

"تو کیا تم علی پور جاؤ گے؟" شفیع نے پوچھا۔ "اس وقت؟"

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا۔ "میں جا رہا ہوں۔"

"اچھا تو میں تمہیں شیٹن پر چھوڑ آؤں گا۔" وہ بولا۔

دفعتاً ایلی نے شفیع کی طرف دیکھا:

"شفیع۔" وہ بولا۔ کیا واقعی آصف مر گیا؟"

شفیع نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

"لیکن لیکن — تم تو کہتے تھے —" ایلی رک گیا۔

"میں میں۔" شفیع نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔ "میں تمہیں بتانا چاہتا تھا لیکن....."

"تمہیں معلوم تھا کہ؟" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" اس کی دھمکی آنکھ سے پانی جاری ہو گیا۔ "آصف نے مرتے وقت وصیت کی تھی

کہ تمہارے آنے سے پہلے اس کا جنازہ نہ اٹھایا جائے۔"

ایلی تڑپ کر مڑا۔ وہ پھیلا ہوا دھند لگا دفعتاً ختم ہو گیا۔ اس کی گرد اونچے لمبے لوگ بھاگ رہے تھے۔ ڈراؤنے مکانات سر اٹھائے کھڑے تھے۔

"وصیت۔" ایلی گنگنایا۔

"ہاں۔" شفیع بولا۔ "آصف نے کل رات زہر کھالیا تھا۔"

"زہر؟" ایلی کے ہونٹ ہلے۔

"رات کے دو بجے وہ مر گیا اور مرنے سے پہلے اس نے گھر والوں سے کہہ دیا کہ جب تک تم نہ آؤ جنازہ نہ اٹھایا جائے۔ صبح اس کے گھر والوں نے مجھے بلا کر علی پور بھیج دیا تاکہ تمہیں ملے آؤں۔"

"زہر کھالیا؟" ایلی اپنے آپ ہی بڑبڑا رہا تھا۔

"کتنے ہیں۔" شفیع نے کہا۔ "اس لڑکی نے آصف کو خط لکھا تھا۔ آؤ ہم آکٹھے زہر کھالیں۔"

میا۔ آصف کے مکان کے نیچے وہ رک جہاں لوگوں کی بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

"ایلی آگیا ہے۔" وہ چیخ کر بولا۔

"ایلی آگیا ہے۔" اوپر سے زنانہ آوازیں آئیں اور پھر دفعتاً "لوگوں کی دلدوز چیخیں سنائی دیں۔ ایک قیامت ٹوٹ پڑی۔ چاروں طرف سے چیخوں کی آوازیں آنے لگیں۔

"وہ آگیا ہے۔ وہ آگیا ہے۔"

"ایلی آگیا ہے مگر تو چلا گیا ہے۔ لے بیٹے آگیا ہے تیرا دوست۔ اب اس سے توبہ کر

آصف تیرا دوست تجھ سے ملنے آیا ہے۔ ہم سے تو تو نے کبھی بات نہ کی کیا اس سے کبھی بات

کرے گا۔ ایلی بیٹے! تیرا آصف چپ ہو گیا ہے۔ اب وہ نہیں بولتا۔ اب وہ کبھی نہ بولے گا۔"

پھر وہی چیخیں سنائی دینے لگیں جنہیں سن کر ایلی سن ہو کر رہ گیا۔ جیسے وہ ایک بے ہوش

ہو۔ اس کے گرد چاروں طرف چیخوں سے بھرا ہوا ایک دیرانہ پھیلا ہوا تھا۔ اسے نیلے رنگ

سے دکھائی دے رہے تھے۔ دور کوئی بین کر رہا تھا اور سینکڑوں مدھم مدھم آوازیں گونجنے

تھیں۔

نگلی رقصہ

پھر دفعتاً "کوئی چلایا: "ہٹ جاؤ جنازہ آ رہا ہے۔"

اور وہ دھبے ہوا میں تیرنے لگے۔ چاروں طرف سے عجیب عجیب آوازیں بلند ہوئیں۔

معنی آوازیں پھر وہ سب ایک کھلے میدان میں کھڑے تھے جہاں ایک خوف ناک سناٹا چھایا ہوا تھا۔

آسیب زدہ مکان میں بھوت پریت چل پھر رہے تھے۔ میدان میں قبروں کے درمیان کلمے

والی ایک خوبصورت ڈائن کھڑی تھی۔ اس نے اپنی چھاتیوں پر سے قمیض اٹھا رکھی تھی۔

کے گھٹنگھریالے بال چہرے کے گرد پھیلے ہوئے تھے۔ اس کی آنکھوں سے شرارے پھوٹ رہے

تھے اور وہ رقص کر رہی تھی۔ مسرت بھرا رقص..... وحشت بھرا رقص۔ لوگ اس کے

سے بے خبر سفید کپڑے میں لپٹی ہوئی لاش کندھے پر اٹھائے ہوئے تھے۔

پھر دفعتاً "ایک شور برپا ہوا۔ وہ دلدوز چیخیں وہ ہچکیاں کراہیں بند ہو گئیں۔ وہ نہ

کدھر کو چل پڑے۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ان کے آگے آگے وہی نگلی رقصہ ہاتھی مارنے

تھی۔

فلاں دن فلاں دقت اور دونوں مرجائیں۔“
”اور وہ بھی مر گئی کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

انتقام ---- انتقام

”نہیں۔“ شفیع بولا۔ ”وہ نہیں مری۔ کوئی کہتا ہے اسے کھانے کو زہر نہیں ملا۔ کوئی کہتا ہے وہ دراصل آصف سے انتقام لینا چاہتی تھی اس لئے اس نے اسے دھوکا دیا۔ اس لڑکی کا یہ حد بدنامی ہوئی تھی تاہم اور اس کے بھائیوں نے اسے باندھ کر پٹیا تھا۔ پھر وہ اس محلے سے لے گئے تھے۔ دور کسی اور محلے میں سفید کنڑے کے قریب لیکن سچی بات کے متعلق کسی کو نہیں معلوم۔“ شفیع نے کہا۔ ”میرا خیال تھا شاید تمہیں معلوم ہو گا۔“

”مجھے۔۔۔“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔ ”سب بیکار ہے بالکل بے کار۔ کوئی فائدہ نہیں۔“ ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ خود آصف کی موت کا ذمہ دار ہو جیسے اسی نے آصف کو مارا ہو۔ ان لوگوں کے عمارتوں کے اوپر ایک حسین لڑکی مسکرا رہی تھی۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنی قمیض کے دامن کو نیچے کونوں سے پکڑ لیا اور پھر بازو اوپر اٹھائے۔ اوپر اور اوپر۔ حتیٰ کہ وہ تنگی ہو گئی اور آصف اسے دیکھ کر چلانے لگا۔ ”نہیں نہیں نہیں نہیں۔“ پھر اس کا رنگ ہلدی کی طرح زرد پڑ گیا اور وہ بھوت بن گیا اور لوگوں نے اسے سفید لٹکھے میں لپیٹ دیا۔ کسی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ ”ہٹ جاؤ۔ جتاؤ آ رہا ہے۔“

”میں سمجھتا ہوں۔“ شفیع بولا۔ ”اس لڑکی نے واقعی آصف سے انتقام لیا ہے کیونکہ آصف نے اس کی طرف التفات نہ کیا تھا۔ کچھ لوگ کہتے ہیں وہ دونوں چار ایک بار چوری چوری لے بھی تھے۔ کچھ کہتے ہیں نہیں لڑکی کی شوق ملاقات سے ترقی رہی لیکن آصف نے اپنی بے وفائی سے اسے بھسم کر دیا اس لئے وہ انتقام پر تل گئی۔ کہتے ہیں اگر لڑکی کے پیار کو ٹھکرا دے تو وہ انتقام لیتی ہے۔ میرا مطلب ہے اگر اس کی آرزو نہیں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہے۔“ شفیع نے وضاحت کی۔

”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔“

گاڑی کا انجن چلاتا ہوا جا رہا تھا۔

کھیتوں میں ایک برہنہ عورت ناچ رہی تھی۔ اس کے بال کھلے تھے۔ چھاتیاں ابھری ہوئی تھیں۔

نہیں۔ ہاں برہنہ ہوئے تھے۔

”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔“ انجن گویا ایللی کو دھمکیاں دے رہا تھا۔ ”انتقام لیتی ہے۔ انتقام لیتی ہے۔“

دھن۔ برہنہ عورت کے چہرے میں تبدیلی واقع ہوئی۔ ایللی نے اسے پہچان کر چیخ سی ماری:

”شزاو۔“ اس کا جسم پسینے سے شرابور ہو گیا۔

”کیا ہے تمہیں بابو۔“ اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر نے اس کی طرف دیکھ کر پوچھا۔

”بیار ہو بھائی؟“ دوسرے نے پوچھا۔

ایللی گھبرا گیا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

لیٹ جاؤ۔ لیٹ جاؤ۔“ انہوں نے زبردستی اسے لٹا دیا۔

وہ برہنہ عورت تیرتی ہوئی کھیتوں سے گاڑی میں آکھسی اور اس کی چھاتی پر بیٹھ گئی۔

”انتقام۔ انتقام۔“ گاڑی چلائے جا رہی تھی۔ تڑپ کر وہ اٹھ بیٹھا۔ ”انتقام۔ انتقام۔“ شفیع دور سے مسکرا کر بولا۔ ”اگر اس کی خواہشات پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔“

برہنہ شزاو کے کھلے بال ایللی کے چہرے سے مس کر رہے تھے۔ ”انتقام۔ انتقام۔“ انجن اسے خبردار کر رہا تھا۔ ڈبے کے سبھی مسافر حیرانی سے اسے دیکھ رہے تھے۔

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”نہیں نہیں۔“

”کیا ہے تمہیں؟“ کسی نے قریب آکر پوچھا اور اس کے جسم کو ہاتھ لگا کر بولا۔ ”اسے تو غلہ ہو رہا ہے۔“ ”نہیں نہیں۔“ ایللی چلایا۔ ”بخار نہیں بخار نہیں۔“

پھر اسے ہوش آیا تو وہ چارپائی پر لیٹا ہوا تھا۔ اس کے گرد کئی ایک دھندلائے ہوئے چہرے تھے۔ دھن۔ ایک چہرہ اس کے قریب تر ہو گیا کھلے بالوں میں گھرا ہوا۔ گھبرا ہوا۔

”شزاو۔“ اس کے ہونٹ کھلے۔ اسے دیکھ کر وہ جوش میں آ گیا۔ ”تم مجھ سے انتقام لو کہ۔“ اس نے اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کی۔

شزاو ہنسنے لگی۔ ”کیا کہہ رہے ہو تم؟“

”نہ جانے بیوشی میں کیا بول رہا ہے۔“ ہاجرہ بولی۔ ”دیکھو تو بخار سے بدن تپ رہا ہے۔“

ہر بات پر مسکراتا ہے اور جب بھی اس کی طرف دیکھتا ہے تو اس کے ہونٹوں سے لعاب کا تار نکل آتا ہے جیسے شہزادہ مصطفیٰ کی ٹوکری ہو۔ ایسے خلود کو چھوڑ کر ایللی سے محبت کرنے میں اسے کیا فائدہ ہے۔ ایللی کا ناک نقشہ حسین نہ تھا۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ رنگ سیاہ تھا جس میں چوڑے چوڑے زرد دانت نہایت بد نما لگتے تھے۔

ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ اس دور میں ایللی کے خیالات روایتی رنگ لئے ہوئے تھے۔ بہت سے روایتی اعتبار اس کے دل میں جاگزیں تھے جن کی صحت کے متعلق اسے کبھی شک نہیں پڑا تھا۔ شک بھی کیسے پڑتا؟ یہ دور اس عمر کا وہ دور تھا جب کہ اس کے والدین، اس کے بزرگ اور محلے کے بوڑھے اسے ایک بچے سے زیادہ حیثیت دینے کے لئے تیار نہ تھے۔

یہ وہ زمانہ تھا جب تجربہ سب سے بڑی خصوصیت سمجھا جاتا تھا۔ جب علم اور فکر کی کوئی حیثیت نہ تھی اور انفرادیت دیوانگی کے مترادف سمجھی جاتی تھی۔ اس زمانے میں شادی ہو جانے کے بعد دفعتاً لوگ معزز بن جاتے تھے اور انہیں یہ حق حاصل ہو جاتا کہ وہ جملہ حقائق پر تمبرہ کریں اور کنواہوں کو صراطِ مستقیم کے متعلق سمجھائیں۔

اس کے والد علی احمد جب بھی ایللی کے متعلق اظہارِ رائے فرمایا کرتے تو ان کے انداز سے تحقیر کا عنصر واضح ہوتا۔ ان حالات میں وہ بھلا زندگی کے مسائل کے متعلق خود سوچنے کی جرات کیسے کر سکتا تھا۔ اسے کیسے یقین آ سکتا تھا کہ کوئی عورت اس سے محبت کر سکتی ہے۔ ایسی صورت میں اس کے نزدیک شہزاد کے قرب کی آرزو کرنا بھی جائز نہ تھا۔ اس خیال پر ہی وہ چونک جاتا اور ندامت محسوس کرتا۔ چونکہ اسے یقین تھا کہ اگر اس نے شہزاد کو چھوا تو وہ مہلی ہو جائے گی۔ ہٹاک ہو جائے گی۔ اسی وجہ سے ایللی کی خواہش تھی کہ وہ شہزاد کو دور سے پیار کرے ایللی کے سجدے، شہزاد کے لٹکنے والے بازوؤں، اس کے رنگین گدے سے ہاتھوں اور اس کے بلوری پاؤں تک محدود رہے مگر اب اس کی محبت کی راہ میں ایک نئی مشکل حائل ہو گئی تھی۔ ایک ایسی مشکل جس نے اسے ابھن میں ڈال دیا تھا۔

جلتا بجھتا سائن بورڈ

جب وہ شہزاد کے پاؤں پر سر جھکاتا تو چپکے سے شفیع کا مسکراتا ہوا چہرہ اس کے قریب آ جاتا۔

”کیا ہے تمہیں ایللی؟“ شہزاد نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔ کچھ بھی نہیں۔“ ایللی خاموش ہو گیا۔

پھر جب سب لوگ چلے گئے تو اس نے شہزاد کو آواز دی۔ وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھی۔

”کیا ہے ایللی؟“ وہ قریب آ کر بولی۔

”تم مجھ سے انتقام تو نہ لو گی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”انتقام۔ کیا کہہ رہے ہو تم؟“ شہزاد گھبرا گئی۔

ایللی نے شہزاد کا بلوری پاؤں پکڑ لیا۔ بے ساختہ اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔

”ہائیں۔“ شہزاد چلائی۔ ”تم رو رہے ہو؟“

”وعدہ کرو شہزاد۔ وعدہ کرو۔“ وہ منت کرنے لگا۔ ”تم مجھ سے انتقام نہ لو گی۔ وعدہ کرو۔“

”پاکل نہ بنو۔“ وہ بولی۔

”نہیں نہیں۔ وعدہ کرو۔“ ایللی نے منت کی۔

”نہیں۔ میں تم سے انتقام نہ لوں گی۔“ شہزاد بولی۔ ”اب نہ روؤ۔“ وہ اسے تھپکے لگا۔

وہ اس کے بلوری پاؤں پر سر رکھے روتا روتا سو گیا۔

نئی ابھن

شہزاد کے اس وعدے کے باوجود ایللی کے دل میں انتقام کا خوف جوں کا توں قائم رہا۔ اگرچہ شفیع نے اس روز وہ بات سرسری طور پر کی تھی مگر ایللی کے دل میں وہ بات گرا گئی۔ اور پھر نہ جانے آصف کی موت کی وجہ سے یا امرتسر کے لوگوں کی سرگوشیوں کی وجہ سے وہ بات ایللی کے دل کی گہرائیوں میں اتر گئی۔

جب بھی ایللی شہزاد کے پاس جاتا تو شفیع نہ جانے کدھر سے آنکھٹا اور مسکرا کر کہتا۔ ”اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں۔۔۔۔۔۔“ دفعتاً اس کی مسکراہٹ ڈنک سنجیدگی میں بدل جاتی اور ساری دنیا پر سکوت طاری ہو جاتا۔ خوف ناک سکوت۔ اور ناک سہیلے اور شہزاد کو سوس دور ہو جاتی اور وہ بڑبڑاتی جانو منظر سے خارج ہو جاتی۔ اکثر اکیلے میں بیٹھے ہوئے وہ سوچتا۔ آخر شہزاد کو کیا پڑی ہے کہ مجھے اچھا سمجھتا ہے۔ اور ہے۔ وہ شادی شدہ ہے۔ اس کا خاوند ہے، جو چھت ر آنکھیں گاڑنے کے پوچھتا ہے۔

سٹش میں ڈبکیں کھاتا رہا۔ اندھیرے میں اپنا راستہ ٹٹوتا رہا لیکن دوسری ساعت میں سورج کی مندر کرئیں اس کی آنکھوں کو چکا چوند کر دیتیں اور وہ پھر سے اندھا ہو جاتا۔ اس کی کیفیت اس بجلی کے ساٹن بورڈ کی سی تھی جو ایک ساعت میں روشن ہو جاتا ہے اور دوسری ساعت میں بجھ جاتا ہے۔

غرم

نقارہ خدا کے شور کے باوجود شاید ایلی کبھی اس راہ پر گامزن نہ ہوتا مگر اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد آکر اسے اپنے ہاتھ سے پھینک نہ دے۔ وہ کبھی کچھ برداشت کر سکتا تھا مگر شہزاد سے قطع تعلقی اسے گوارا نہ تھی۔ اگر شہزاد کی آرزوؤں کو قرب سے تعلق نہیں تو قرب کی کوشش سے وہ زیادہ سے زیادہ ناراض ہوگی تا مایوس تو نہ ہوگی۔ اس کے دل میں ایک خاموش عزم پیدا ہو گیا۔ گویا ایک نئے زخمی سپاہی نے حملہ کرنے کی ٹھان لی۔

کئی ایک روز وہ سوچتا رہا۔ اس کا یوں سوچتے رہتا شہزاد کے لئے خاصا پریشان کن تھا۔ وہ بار بار پوچھتی "ایلی کیا ہے تجھے؟" "کچھ نہیں۔" ایلی جواب دیتا۔

"نہ۔" شہزاد اشارہ کرتی۔ "یوں سوچ پچار میں نہیں پڑا کرتے۔ جب سے امر تر سے آئے ہو نہ جانے کیا ہو گیا ہے تمہیں۔"

شہزاد کو آصف کی موت کا پتہ تھا اور اسے لئے وہ ایلی کے متعلق فکر مند تھی۔ وہ دن میں کئی ایک بار فرحت کے ہاں آتی تاکہ ایلی کا پتہ لڑے۔ ہر بار وہاں آنے کے لئے وہ نئے سے نیا ہمانہ تلاش کرتی۔ اور ہر بار فرحت طنزاً بات کرتی جسے سن کر شہزادی ہنس دیتی۔ پھر وہ ایلی کے قریب آجاتی۔

"کوئی۔ کیا ابھی تک جنون نہیں گیا؟" وہ ہنس کر پوچھتی۔

ایلی مسکراتا۔ "جنون بھی کبھی جاتا ہے؟"

"اتنے امر تر مجھے تم۔ اب چارپائی چھوڑنے کا نام ہی نہیں لیتے۔" وہ ہنسی۔

"سے۔" ہاجرہ کہتی۔ "وہ تو اس حالت میں بھی تمہاری طرف جانے کے لئے بے تاب رہتا ہے۔"

اگر عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اس کے ساتھ ہی سفید کمرے میں لپٹا ہوا آصف منہ سے پلو اٹھا کر یوں بے بسی سے مسکراتا جیسے شفع کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ چونک کر اٹھ بیٹھتا اور پھر شہزاد کی طرف دیکھ کر اس کی بے نیازی اور بے پرواہی کو محسوس کر کے یہ سمجھنے لگتا کہ شہزاد کی آرزوئیں پوری نہیں ہو رہیں۔ پھر وہ گہری سوچ میں پڑ جاتا۔ جیسی وہ تخیل میں اس سے دور ہو جاتی ہے اور دوری میں اسے آکسانی ہے جیسی وہ تھلائی میں اس سے بے پروا ہو جاتی ہے جیسے ایلی کے وجود کا اسے احساس ہی نہ ہو۔ اور فرحت، ہاجرہ اور جلالہ سامنے بھانے بھانے اس کا دامن کھینچتی ہے۔ چوری چوری اس کا گل سسلا جاتی ہے یا پلٹ پلٹ چٹکی بھر لیتی ہے۔ ظاہر ہے وہ سوچتا کہ تخیل میں ایلی کو چرن تپسیہ کرتے دیکھ کر وہ یوں ہل جاتی ہے اور لوگوں کی موجودگی میں پھر سے امید کا دھبہ جلا لیتی ہے۔

ان دنوں ایلی یہ نہ جانتا تھا کہ عورت کے لئے محبت محض ایک ماحول ہے۔ چن بڑ بھری نگاہوں اور رومان بھرے خوابوں سے بنا ہوا ماحول۔ اسے یہ معلوم نہ تھا کہ عورت مردانہ جسم کی خواہش مٹتی ہوئی ہے۔ اس کے نزدیک محبت ایک ذہنی تاثر ہے۔ جسم کو وہ مرہ اس لئے برداشت کرتی ہے کہ وہ ظلم نہ ٹوٹے۔ وہ تپسیہ بھری نگاہیں کم نہ ہو جائیں لیکن ایلی شہزاد کی بے نیازی کو مایوسی سمجھتا تھا۔ حالانکہ وہ بے نیازی احساس تسخیر و مسرت کا بے پلا اظہار تھی۔

ایلی ان باتوں کو سمجھتا بھی کیسے؟ اسے تو یہ بتایا گیا تھا کہ زبان خلق نقارہ خدا ہوتی ہے۔ خدا کا نقارہ کبھی دروغ بیانی کر سکتا ہے بھلا۔ اس نے اپنے دوستوں کے علاوہ کئی بار ہاں چھپ کر بزرگوں کی باتیں بھی سنی تھیں۔ ان سب کا خیال تھا کہ عورت کی آرزوئیں پوری نہ کی جائیں تو وہ انتقام لیتی ہے۔ اور ان آرزوؤں کے متعلق کئی بار علی احمد ہنس کر کہا کرتے تھے "ان عورتوں کی کیا پوچھتے ہو میاں۔ یہ تو تب تک تمہاری ہیں جب تک تمہاری گرت میں ہیں۔ ہاتھ سے نکل گئیں تو پھر تم کون ہم کون؟"

اس نقارہ خدا کے باوجود ایلی کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ اسے حقیقت تسلیم کر لے۔ کیا عورت کی آرزو یہی ہوتی ہے؟ کیا شہزاد یہی چاہتی ہے؟ نہیں نہیں۔ وہ جھلا اٹھتا شہزاد لگتا نہیں۔ وہ عام عورت نہیں وہ کبھی ایسی بات کی آرزو نہیں کر سکتی۔

اس کے باوجود دل ہی دل میں ایلی لوگوں کی باتوں کو تسلیم کرنے پر مجبور تھا۔ وہ اس

مسلل سوچ بچار کے بعد ایلی کے ذہن میں ایک خیال آیا۔ خوشی سے وہ اچھل پڑا۔ اور پھر اطمینان سے تفصیلات پر غور کرنے لگا۔
”وہ لوہو کیا تجویز ہے۔“

وہ حیران تھا کہ یہ خیال اسے پہلے کیوں نہ آیا۔

پھر اڑسرو اس کے دل میں غدشات پیدا ہونے لگے۔

”اگر شہزاد نے برانہ مانا تو ——— اگر وہ ناراض ہو گئی تو ——— اگر کسی نے دیکھ لیا تو ——— اگر بات شریف تک پہنچ گئی تو!۔“

شہزاد تیسری منزل پر چوہارے میں رہتی تھی لیکن سب سے ٹپلی منزل میں ڈیوڑھی سے لہذا ایک بیٹھک بنی ہوئی تھی جو شریف کے قبضے میں تھی اور جہاں انہوں نے گھر کا سامان بند کر رکھا تھا۔ بیٹھک عرصہ دراز سے بند پڑی تھی۔۔۔۔۔ کبھی کبھار شہزاد وہاں کوئی چیز رکھنے یا لانے کے لئے جایا کرتی تھی۔ ایلی نے بیٹھک میں کپڑے کی آرام کرسیاں رکھی ہوئی دیکھی تھیں۔

دھیر کو جب شہزاد آئی تو ایلی نے چپکے سے اس کی چابیاں اڑالیں۔ جب وہ چلی گئی تو وہ چپکے سے اٹھ کر شہزاد کی بیٹھک کا قفل کھلا اور کمرے میں داخل ہو کر اس نے ایک کھڑکی کی اندر سے چکی کھول دی۔ لیکن پٹ جوں کے توں بند رہنے دیئے۔ پھر بیٹھک کے دروازے پر تالہ لگا کر وہاں آ گیا۔

اگلی روز جب شہزاد آئی اور حسب معمول قریب آ کر زیر لب بولی:
”اوجھرنہ آؤ گے کیا؟۔“

”آؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”بشرطیکہ۔“

”اوہ۔ اب شرمیں لگنے لگے۔“ شہزاد نے آنکھیں چپکا کر کہا۔

”ہاں۔“ وہ مسکرایا۔ ”شرمیں ہی لگائیں گے۔“

”اچھا۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”کیا شرط ہے؟۔“

”وہاں میں کپڑے کی ایک آرام کرسی میں بیٹھوں گا۔“ ایلی نے معصوم انداز سے کہا۔

”نہیں۔ اتنی سی بات ہے۔ میں ابھی جانو کو بھیجتی ہوں نیچے سنور میں وہاں رکھی ہیں دو کرسیاں۔ ابھی لے آئے گی۔ یہ کون سی بڑی بات ہے۔“

”پتہ نہیں۔“ فرحت مسکراتے لگتی۔ ”شہزاد نے کیا جادو کر رکھا ہے ہم سب پر۔“
”جادو تو ہو گا۔“ شہزاد آنکھیں چپکا کر کہتی۔

”مجھے بھی سکھا دو۔“ فرحت بات بدلنے کی کوشش کرتی۔

”اونٹوں۔ یہ منہ اور مسور کی دال۔ تم سے اتنا تو ہو نہیں سکتا کہ خلود کو کلے۔“

”سچ کہتی ہو۔“ فرحت جل کر کہتی۔ ”یہ منہ اور مسور کی دال۔“

”اونٹ۔“ شہزاد آنکھیں چپکاتی۔ ”خالی منہ سے کیا ہوتا ہے۔ بڑی بڑی مثل دو والیاں اپنا سامنہ لے کر رہ جاتی ہیں۔“ پھر وہ بات بدلتی۔ ”یہ ایلی پڑے پڑے لباس پہنے ہے؟۔“ ”تمہارے متعلق ہی سوچتا ہو گا۔“ فرحت پھر وار کرتی۔

”کیوں ایلی میرے متعلق سوچتے ہو؟۔“ شہزاد ایلی پر وہی نگاہ ڈالتی۔ ”جواب دو۔“
”ہاں تمہارے متعلق۔“ ایلی ہنستا۔

”اب کی بار آلیں وہ۔ ان سے شکایت کروں گی۔“ پھر مکر نہ جاتا۔ ”شہزاد سنجیدگی سے کہہ رہا ہے۔“
”ان کو تو تم نے جان بوجھ کر باہر بھیج رکھا ہے۔“ فرحت چپچتی۔

”ہے نا۔“ شہزاد ہنستی۔ ”اب تو مجھے مانو گی نا۔“

”اب تو بہت دیر ہو گئی۔ کب آئے گا شریف؟“ ہاجرہ بات بدلنے کی خاطر پوچھتی۔
”کیا معلوم کب آئیں گے۔“ شہزاد مسکراتی۔

شریف کا نام سن کر ایلی کا احساس گناہ جاگ اٹھا۔ اس کے سینے پر ایک ٹھیس لگتی تھی۔
مزید سوچ میں پڑ جاتا۔

سوچ بچار

امر تیسرے واپسی کے بعد چار ایک دن ایلی نے چار پائی پر گزار دیئے۔ ویسے تو وہ جاکر سکتا تھا اور شہزاد کی طرف جا سکتا تھا مگر اس نے جان بوجھ کر ادھر جانے سے انکار کر دیا۔
جانے میں رکھا ہی کیا تھا۔ وہاں شہزاد کے قریب پہنچ کر تو وہ بالکل ہی معدوم ہو جاتا تھا۔
جانے سے فائدہ ——— اس سے تو یہی بہتر تھا کہ وہ اوجھرنہ جاتا تو شہزاد بار بار فرحت کی آغوش میں آتا۔ اس کی نگاہ کی اس اذیت دے بغیر التفاتی سے نجات ملی ہوتی تھی۔

ایلی نے نفی میں سر ہلایا:

”جانو کو نہ بھیجتا۔ وہ باتیں بنائے گی۔ خواہ مخواہ طعنے دے گی۔“

”اچھا تو۔“ شنزار بولی۔ ”میں خود لے آتی ہوں۔ اتنی سی بات تھی۔“

ہنستے ہنستے وہ انھی اور فرحت کو چھیڑتی ہوئی اپنے گھر کی طرف چل پڑی۔ اسے جانے پہلے تو ایلی کا دل گھبرا گیا۔ پھر ہمت کر کے دیوانہ وار اٹھا اور دوسرے راستے بیٹھ کر فائدہ تاکہ شنزار کے وہاں پہنچنے سے پہلے ہی کھلی کھڑی کے ذریعے کمرے کے اندر جا پہنچے۔

ایلی کی تجویز کارگر ہو چکی تھی لیکن عین موقع پر اس کا دل ڈوبا جا رہا تھا۔ اس کی دہکرائیوں سے نفرین کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ہر تزیل کر رہا ہو۔ اس روز پہلی مرتبہ اس نے محسوس کیا کہ وہ گناہ کر رہا ہے۔ دوسرے کی سے محبت کی جذبات وابستہ کرنا اس کے نزدیک قاتل نفرین نہ تھا۔ مگر محبت میں جسمانی ملوث خواہش کرنا یقیناً ”گناہ تھا۔“

ذہنی طور پر ایلی سمجھتا تھا کہ محبت دراصل ایک فطری تقاضا ہے۔ ایسا فطری تقاضا جو جسمانی قرب ضروری ہے مگر جذباتی طور پر وہ سمجھتا تھا کہ محبت ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ ایک لگاؤ جو جسم کی آلائش سے قطعی پاک ہے۔ یوسف زلیخا، ہیرا پنجا اور سسی پنڈت کے قصے کی اسے یقین ہو چکا تھا کہ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس میں محرومی کا عنصر لازم ہوتا ہے اور نتیجہ موت ہوتا ہے۔ ان قصوں کے علاوہ علی احمد کے کمرے کے قرب میں رہ کر اسے محبت سے نفرت ہو چکی تھی۔ وہ جسمانی محبت جس نے اسے والد کے قرب اور اس کی محبت محروم رکھا تھا۔

بند بیٹھک

ان خیالات کے باوجود ایلی دیوانہ وار شنزار کی بیٹھک کی طرف بھاگا جا رہا تھا۔ اس میں شنزار کے حسین جسم کا شوق نہ تھا بلکہ جب بھی اسے اس کا خیال آتا تو وہ گھبراہٹ محسوس کرتا۔ اسے محسوس ہوتا جیسے وہ چاند کو میلا کر رہا ہو۔ اسے اپنے جسم سے نفرت اسے اپنی جسمانی کمتری کا شدت سے احساس تھا لیکن ان سب باتوں کے باوجود وہ آگے بڑھتا تھا۔ اس کے رویہ شفیق مسکرا رہا تھا: ”ان کی آرزوؤں پوری نہ کرو تو وہ انتقام لیتی ہیں۔“

بیٹھک کے پاس پہنچ کر اس نے دھڑکتے دل سے کھڑکی کھولی اور اندر داخل ہو گیا۔ اس نے احتیاط سے کھڑکی کے پٹ بند کئے اور کباڑ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ کمرے میں ٹوٹی ہوئی چارپائیاں، چند میزیں کرسیاں اور دیگر سامان گرد سے اٹا پڑا تھا۔ نہ جانے کب سے وہ کمرہ بند پڑا تھا۔ جگہ جگہ مٹی کے جالے تھے ہوئے تھے۔ کڑے بڑی بڑی ٹانگیں پھیلائے دیواروں پر بیٹھے تھے۔ ہر جگہ گرد کی تہہ جھی ہوئی تھی۔

پاؤں کی آہٹ سن کر وہ ایک جھنجھی ہوئی چارپائی کے نیچے دبک کر بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا۔ کوئی بیڑھیاں اتر رہا تھا۔

”اوموں۔ پاؤں کی چاپ میں بھدا پن واضح ہے وہ نہیں ہو سکتی۔ اس کے قدموں کی چاپ میں ایک لے ہوتی ہے۔“

پاؤں کی چاپ قریب تر ہو گئی۔ پھر وہ آواز مدھم پڑ گئی۔ حتیٰ کہ خاموشی چھا گئی۔ ایلی نے اطمینان کا سانس لیا۔ اس کے دل کا ایک حصہ دعائیں مانگ رہا تھا کہ شنزار نہ آئے۔

وہ غور سے اوپر کی منزل کی آوازیں سننے لگا۔ شنزار کا چوبارہ اوپر تیسری منزل پر تھا اس لئے اس کی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ درمیانی منزل میں عام طور پر سیدھ رہا کرتی تھی جو ان دنوں اپنے خلود کے ساتھ کہیں باہر گئی ہوئی تھی۔ اب وہاں اکیلی راہبہ رہتی تھی۔ راہبہ اپنے بیٹے کے ساتھ باتیں کر رہی تھی۔ ”خبردار۔ اسے ہاتھ نہ لگانا۔۔۔۔۔ نہ تجھے جو کہتا ہے بڑا پیارا بیٹا ہے یہ۔“

پھر خاموش چھا گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے صدیاں بیت گئی ہوں۔ اسے اس بند کمرے سے خوف آنے لگا۔ باہر چوکن کی طرف سے شور سن کر وہ چونکا۔ اس نے محسوس کیا جیسے اس کے وہاں چھپنے کا راز آشکار ہو چکا ہو۔

لورہ سب اس کمرے کی طرف آرہے ہوں۔ اس کا دل ڈوبنے لگا۔

اس مٹی سے اٹے ہوئے کباڑ خانے میں ایلی ایک قیدی کی طرح دبک کر بیٹھا ہوا تھا۔ ان ملامت میں وہ اپنی محبوبہ شنزار کا انتظار کر رہا تھا تاکہ اس کی آرزوؤں کو پورا کر کے اسے ہمیشہ کے لئے اپنا لے۔ اور محبوبہ بھی وہ جو پہلے سے ہی کسی اور کی تھی جو ایک چھوٹی سی بچی کی ماں بن

چکی تھی اور اس کا اپنا دل اس کے اپنے ارادوں پر نفیر سمجھ رہا تھا اور دل ہی دل میں پھر چوری دعائیں مانگ رہا تھا کہ شہزاد نہ آئے۔

دھنسا شہزاد کی آواز سنائی دی۔ اس کی پیٹھ پر گویا ایک چوہا پھدکا۔ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھ کر کی آواز میں نہ جانے وہ لوچ کیسے آجاتا تھا۔ اس کے گلے میں تار ہی تار تھے۔ اور اس کی بات میں مینڈ سی سنائی دیتی تھی۔ شہزاد کی آواز سن کر اس کے جسم میں جھانجھن بجنے لگیں۔ مگر اس وقت وہ آواز اسے یوں سنائی دی جیسے موت کی کھنٹی بج رہی ہو۔ ایلی کا دل جھلک رہا تھا۔ دل میں دھکی بجتے گلی اور جسم منوں بوجھل ہو گیا۔

”کیا ہو رہا ہے رابعہ؟“ اوپر کی منزل سے شہزاد کی آواز سنائی دی۔

”کہاں جا رہی ہے تو؟“ رابعہ نے پوچھا۔ ”چابیوں کا گچھا اٹھائے۔“

”ذرا نیچے بیٹھک میں جا رہی ہوں کچھ چیزیں لانے کے لئے۔“

”جانو کو بھیج دیجی۔ وہاں تو ایک منٹ کے لئے ٹھہرا نہیں جاتا۔“ رابعہ کہہ رہی تھی۔

”جانو باہر گئی ہے۔“ شہزاد بولی۔

”تو انتظار کر لیا ہوتا۔“

شہزاد ہنسی:

”وہ کہاں کرتی ہے ایسے کام۔“ یہ کہتے ہوئے وہ بیڑھیاں اترنے لگی۔

اپنے احساس کمتری کو دبانے کے لئے، احساس گناہ کو معطل کرنے کے لئے اور اس آئے والے خطرے کا مقابلہ کرنے کے لئے صرف ایک طریقہ تھا جیسے گھرے ہوئے کبوتر کے لئے عقاب سے بچنے کا ایک ہی طریق ہوتا ہے۔ وہ مڑ کر عقاب پر جھپٹتا ہے اور یہ حقیقت بھول جاتا ہے کہ وہ ایک کبوتر ہے۔

جوں جوں آواز قریب تر ہوتی گئی۔ ایلی اپنے آپ میں وہی خود ساختہ وحشت پیدا کرنے لگی سہی کرتا رہا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہوتی گئیں۔ بند بند جوش سے تھرکتے لگا۔ اور وہ بھول گیا کہ وہ ایلی ہے۔ اس نے سن رکھا تھا کہ ایسے حالات کا مردانہ وار مقابلہ کرنا چاہیے اور مردہ ہونا جس میں وحشت اور بربریت ہو۔ وحشت اور بربریت عورتوں کو محبوب ہوتی ہے۔

دروازہ کھلا۔ شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی سی تیزی سے اپنی جگہ سی ٹکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے

کر ایک بجلی سی چج ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی: ”تم یہاں۔“

ایلی کی خاموشی اور وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ ”یہ سب کیا ہو رہا ہے۔“ وہ بولی ”تمہیں کیا ہو گیا ہے۔“

ایلی جواب دینے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا؟“ وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید

کتری کی فتنہ منائی کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی

کھل پننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے۔“ وہ چلائی۔ ”بہت جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔“

وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔

”غور نہ تم پاگل ہو گئے ہو“ وہ بولی۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”ہاں۔۔۔۔۔“ ایلی نے بھیاں آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں ہوں۔“

”ایلی۔ کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔“

ایک رنگین دھندلا ایلی کے قریب تر آتا گیا۔ اور قریب اور قریب۔ اور وہ دیوانہ وار اس

کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جھونک کی طرح آگے بڑھے۔

ہاتھ باز نہ سرجم، وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے

اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چمڑانے کی کوشش کی۔ پھر وہ تھک ہار کر ایک لاش کی طرح میز

پر گر پڑی۔ بھیاں خاموش طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھٹی میں نی

لہر من دھکینے کی کوشش کی۔

”تھار۔۔۔۔۔ چار۔۔۔۔۔“ ریشمیں کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

”ایلی۔ پاگل نہ بنو۔“ ایک بار پھر مرمریں جسم میں حرکت ہوئی۔ ”پاگل نہ بنو۔“

مردم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی پھر گیا۔

فرار

دھپ — ایک ہوائی سی چھوٹ گئی۔ اور معاً ”گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو۔ چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا تھا۔ ناکہائی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سہارا چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی۔ اس کے عقب میں معصیت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اٹھا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے منہ میں گھاس کا تنکا ہو۔ وہی تنکا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور حاضر ہوا تھا۔

اس نئی فخت کو مٹانے کے لئے ایلی ایک بار پھر آگے بڑھا اور شنراؤ کے بند بندہ کو ہونے لگا۔ اور بالاخر تھک کر بچے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا:

”مجھے تم سے محبت ہے شنراؤ۔ مجھے تم سے.....“

پسپائی

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شنراؤ اٹھ بیٹھی۔ اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھپکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد اسے تھپک رہا ہو۔

جب وہ واپس گھر پہنچا تو وہ تھکا ہارا محروم و ناکام ایلی تھا۔ چپکے سے چور کی طرح وہ اندر داخل ہوا اور دے پاؤں چلتا ہوا اپنی چارپائی پر گر گیا۔ اس نے اپنا منہ تکیے میں گاڑ دیا اور مایوسی کے اقلہ سمندر میں ڈوب گیا۔

اگر ایلی اس پہلی کوشش میں کامیاب ہو جاتا تو ممکن ہے کہ اس کی تمام تر زندگی کا رخ ہی بدل جاتا۔ ممکن ہے محبت اور عورت کے متعلق اس کے خیالات از سر نو ترتیب پاتے۔ جذبات میں توازن پیدا ہو جاتا لیکن ایسا نہ ہونا تھا نہ ہوا۔ ایلی کا احساس کمتری اور بھی شدید ہو گیا۔ دل میں جسم کی نفرت اور بھی شدید ہو گئی۔ عورت کا ڈر اس کی روح پر خوفناک پراسرار سائے کی طرح مسلط ہو گیا۔ اور محبت کے تخیل میں چھوٹی روحانیت کی ایک اور کلی لگ گئی۔

نہ جانے کب تک ایلی اسی طرح تکیے میں منہ گاڑے پڑا رہا۔

”سوچ رہا تھا۔ اس پر ثابت ہو چکا تھا کہ اس میں آرزوئیں پوری کرنے کی صلاحیت کس سے ہی مفقود ہے اب شنراؤ کا انتقام اور بھی یقینی ہو چکا تھا۔ اب وہ کس منہ سے شنراؤ کے لئے ہانک سکتا تھا۔ کس برستے پر اس سے محبت جتا سکتا تھا۔“

”نہیں نہیں میں اس کے روبرو نہیں جاؤں گا کبھی نہیں جاؤں گا۔“

”مجھے محبت کرنے کا کوئی حق نہیں مجھ میں کوئی ایسا خزانہ نہیں جو محبت کا حق دار بنا سکے۔“

میری تمام تر زندگی ہی بے کار ہے۔“

آصف نے لہٹے کی سفید چادر کو منہ سے ہٹا کر ایلی کی طرف دیکھا اور مسکرایا۔ مسکراہٹ جیسے اس کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہو۔ اسے بلا رہا ہو۔ ”آ جاؤ ایلی آ جاؤ۔“ وہ ڈر کر اٹھ بیٹھا۔ اور گھبرا کر گھر سے باہر نکل گیا۔

اس روز وہ پہلی مرتبہ باہر نکلا تھا۔ اب حالات بدل چکے تھے اس کے لیے اس کے سوا چارہ نہ تھا کہ وہ بھاگ جائے کس دور بھاگ جائے۔ شہزاد کے چوبارے سے دور اس بیٹھک دور جہاں وہ شکست کھا کر منہ میں گھاس پکڑے سکندر کے روبرو حاضر ہوا تھا۔ اور اس نے جھکا کر کہا تھا۔ حضور مجھ سے ایسا سلوک کیا جائے جو بادشاہ بھکاریوں سے کرتے ہیں۔ اسے چوگان سے گزرتے دیکھ کر محلے والیاں چلانے لگیں۔

”کون ایلی ہے بسم اللہ۔“

”شکر ہے تو بھی گھر سے باہر نکلا۔“

”نہ بیٹا۔“ ایک بولی ”اپنے باپ کے قدموں پر نہ چلنا۔ اسے ہی گھر میں بیٹھے رہنا عادت ہے۔“

دوسری بولی ”لو ماں تم بھی حد کرتی ہو یہ آج کل کی لڑکیاں تو راہ چلنے کو بلاتی ہیں۔ جلدی دیتی ہیں اس بیچارے کا کیا دوش ہے، بس پتھر کا بتا کر چولے پر رکھ لیتی ہیں۔“

”نہ بیٹا تو نہ پڑنا ان کے فریب میں۔“

”اللہ تعالیٰ کا فضل ہے بہن ابھی اس محلے کی لڑکیوں پر اللہ اپنا فضل ہی رکھے۔“

ایلی چوگان سے نکلا ہی تھا کہ سامنے رضا لاشی ٹیکتا ہوا آ نکلا۔

”نکل آئے تمہ خانے سے۔“ وہ مسکرا کر بولا۔ ”کیسے آنے دیا۔ امان نے گود کے پٹنے کر لئے کیا۔“

”بکو نہیں۔“ وہ بیٹاؤنی غصے میں چلایا۔

”بیٹا کچھ دن اور یونہی اندر رہے تو لاشی کے سارے چلنا پڑے گا۔ تجربے کی بات کرنا ہوں۔“ رضا نے تہقہ لگایا۔

”شرم تو نہیں آتی تمہیں۔“ ایلی نے کھسپائے ہو کر کہا۔

”اونہوں۔“ رضا چلایا ”شرم شروع شروع میں آتی ہے، جب لکڑی اٹھاوے تو شرم نہیں

آئے گی۔“

”جاںکوں رہے ہو؟۔“ ایلی نے بات بدلنے کی کوشش کی۔

”ابھی آتا ہوں۔ تمہیں فرصت ہو تو بیٹھنا ذرا دوکان پر۔“ رضا بولا۔

رسوائی

رضائی دوکان تک پہنچتے پہنچتے کئی ایک لوگ اسے ملے وہ سب درپردہ اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھ رہے تھے اور باتوں ہی باتوں میں سبھی شہزاد کا طعنہ دے رہے تھے۔ اس نے اس روز پہلی دفعہ محسوس کیا کہ وہ راز جو وہ اپنے دل میں چھپائے بیٹھا تھا تمام محلے میں زبان زد خلق ہو چکا تھا۔ اس بات کو محسوس کر کے وہ لرز گیا لیکن اب کیا تھا اب تو سب ختم ہو چکا تھا۔ اب وہ شہزاد کے روبرو نہیں جاسکتا تھا۔ اس خیال پر اس کے دل کو ڈھارس سی ہو گئی۔

کیپ کی کھڑکی کی طرف دیکھ کر اسے ارجمند یاد آ گیا جو نہ جانے اس تیل کے کارخانے میں کیسے دن گزار رہا تھا۔ کھڑکی میں کیپ کھڑی نہ جانے کس سے باتیں کر رہی تھی۔ وہ رک گیا اور کیپ کو دیکھنے لگا۔ کیپ نے اسے دیکھتے ہی کھڑکی کے پٹ زناٹے سے بند کر دیے۔

”اوہ۔“ اس نے سوچا۔ ”تو بات اس حد تک پہنچ چکی ہے۔“

کونوئیں کے قریب دو منزلہ مکان کے دروازے میں اپنی منگیت کو کھڑے دیکھ کر ایلی چونکا۔ ”جوان ہو گئی ہے بچھلی مرتبہ جب دیکھا تھا تو بچی سی تھی۔ لڑکیاں کتنی جلدی جوان ہو جاتی ہیں۔ رنگ کتنا کھرم گیا ہے اور اعضاء میں نہ جانے کیا ہر گیا ہے جیسے آٹے میں خیر اٹھ گیا ہو۔“ ”اے۔“ وہ تعجب سے چلایا۔ اسے دیکھ لینے کے باوجود شرمہ اسی طرح بازو اوپر اٹھائے ہوئے کھڑکی میں کھڑی رہی جیسے وہ ایلی کی حیثیت سے منکر ہونے کا اظہار کر رہی ہو۔ اس نے ایلی کی طرف دیکھ کر ناک سکونڈی۔ اس کے ہونٹوں کے نوٹوں میں طنز دہنی ہوئی تھی ایلی کھڑا اسے دیکھتا ہلہ پھرہ گویا آتا تھی۔ اس نے بے پروائی سے گھر با معنی انداز سے تھوک دیا اور پھر اندر گئی۔

”ہوں۔“ ایلی نے مسکراتے کی کوشش کی ”ہوں تو اب بات یہیں تک نہ کا جی

اگرچہ ایلی نے بار بار چلا چلا کر لوگوں سے کہا تھا کہ منگنی محض ایک بھول تھی حاصل

الفاظ صرف اس لیے رچایا تھا کہ اس کا دل کا چاؤ پورا ہو جائے۔ اور اعلان اس کے

زیادہ نہیں کرے گا مگر اس وقت اپنی مصیبت کی بے پروائی اور اظہارِ تحقیر کو دیکھ کر اسے تلخ محسوس ہوئی اس نے محسوس کیا جیسے اس کی توہین کی گئی ہو۔ اس خیال پر اس کا وہل رگنا ملنے ہو گیا اور وہ سیدھا رضا کی دوکان پر پہنچا اور چپکے سے دوکان کے عقب میں پڑی ہوئی چوکی پر بیٹھ کر سوچنے لگا۔

اس روز وہ محسوس کر رہا تھا کہ محلے کے سبھی لوگ اس سے شکی تھے۔ شنراؤ کی بات دور تک پہنچ چکی تھی۔ نہ جانے بات کیوں نکل گئی تھی۔ اس کا صرف یہی تصور تھا کہ وہ سارا دن گھر بیٹھا رہتا تھا کیا اتنی سی بات پر وہ سب اس سے بدظن ہو چکے تھے کیا اتنی سی بات سے انہوں نے وہ سب کچھ اخذ کر لیا تھا۔ حیرانی کی بات تھی۔ پھر اس کے دل میں شکوک پیدا ہونے لگتے نہیں نہیں اتنی سی بات سے سب کچھ اخذ کرنا ممکن نہیں۔ شاید کسی نے انہیں دیکھ لیا ہو۔ تو کیا بیشک۔۔۔ اس خیال پر اسے پسینہ آ جاتا۔ محبت کے راز کا کھل جانا اور بات تھی۔ مگر اس کی شکست کی بات کا کھل جانا۔۔۔؟

”ارے ایللی تو میرا؟“۔۔۔ کسی کی آواز سنائی دی۔

گھبراہٹ میں اس نے سر اٹھایا۔ سامنے صفدر بازو پھیلائے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھوں میں دھندلک تھی۔

”گھبراؤ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں ہوں لیکن تم نے کبھی نہیں جانا بھی ہو، سمجھا بھی ہو۔ تمہاری آواز تو اکثر سن لیتے ہیں بھئی لیکن ملنا کبھی کبھار ہوتا ہے۔“

”جی۔ جی۔“ ایللی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔

”میں آج کل ٹپلی بیشک میں ہوتا ہوں نا۔“ صفدر بولا ”اس کے چوبارے کے عین آج تمہاری آوازیں آتی رہتی ہیں ہم تو بھی آوازوں کے سہارے جی رہے ہیں۔“

اس کی آواز میں مایوسی اور حسرت محسوس کر کے ایللی اور بھی گھبرایا۔

”مل لیا کرو ایللی۔“ وہ بولا ”کبھی ہم سے بھی مل لیا کرو۔ مانا کہ آج کل انجینی فڈوں میں ”بیناس کی آواز منٹاک ہو گئی۔“ خدا کی قسم مجھے خوشی ہوتی ہے اس بات پر مگر ہم ہوں۔“ رضا یک نہیں۔ آیا کرو گے نا۔“ یہ کہہ کر وہ بازو ہلاتا ہوا یوں دوکان سے باہر نکل گیا۔

”شرم تو نہ ادا کر کے جا رہا ہو۔“

”اوسوں نے نہ پایا تھا کہ رضا لاٹھی دیکھتا ہوا آ پہنچا۔“ بیٹھے ہو۔“ وہ باہر سے چلا آیا۔

ایللی خاموش ہو گیا۔ رضا کے سامنے قسمیں کھانا بے کار تھا۔ بالکل بے کار۔ رضا کے پاس وہ ایک کھٹے بیٹھا وہ بھی بادل ناخواستہ، پھر وہ واپس گھر آ گیا۔ کئی ایک مرتبہ اسے خیال آیا کہ رضا سے ساری بات کہہ دے لیکن شنراؤ کی عزت کا سوال تھا۔ اگر وہ شادی شدہ نہ ہوتی تو وہ نفسِ قدر دشوار نہ تھا لیکن وہ اس خفت کا تذکرہ کیسے کر سکتا تھا جس کی وجہ سے ایللی تباہ حال ہو کر رہا تھا۔ انہیں وجوہات کی بنا پر ایللی نے رضا سے بات نہ کی۔ اس کے باوجود اس کا جی تھا کہ وہ رضا سے ساری بات کہہ دے اور دل کا راز کہہ کر اس ٹھٹھن سے نجات حاصل کرے جس کی وجہ سے وہ مضطرب تھا۔ جو اس کے بند بند میں رچی ہوئی تھی۔ وہ راز اس کے

کپ کپ کیا حال ہے۔ رپورٹ دو۔ ساری کیس ہسٹری سنیں گے اپن تو کس حال میں ہیں یار
وطن۔ اس نے اشارہ کیا۔ لیکن کھانسی کا دورہ پھر شروع ہو گیا۔ پہلے تو وہ دیوار کا
سارالے کر کھڑا رہا لیکن دورے کی شدت کی وجہ سے اسے بیٹھنا پڑا جب دورہ ختم ہوا تو ارجمند
نے ایک بار پھر مسکرانے کی شدید کوشش کی۔

”یہ کھانسی بھی اپن سے مذاق کرتی ہے۔ اپنا سارا کھیل غارت کر کے رکھ دیا سالی نے۔
دورہ م نے پیم سندیس سے لڑکی پر جادو کیا ادھر اس کبخت نے سر نکالا۔ اپنا جادو ٹوٹنے کا کھیل
مکمل کریں یا بیٹھ کر کھائیں۔۔۔ سب ملیا میٹ کر دیا۔ اپنے گاؤں میں ایک ایسی ٹیار آئی ہے
ارے رے کیا بتاؤں کیا چیز ہے۔ سمجھ لو گھی کی مٹکی ہے اور کھی بھی وہ جیسے کچی مگری ہو۔ کچی
گڑی کیا پھین ہے کیا با کچن ہے۔ اور پھر چال۔ یوں چلتی ہے جیسے ناگ رانی ہو۔“ اس کی
آنکھوں میں پھر سے وہی چمک لہرانے لگی چہرے پر وہی انبساط دکھنے لگی۔

دفترا“ گلی سے ارجمند کی ماں نے سر نکالا جیسے وہ وہاں کھڑی اس کی راہ دیکھ رہی ہو۔ ماں کو
دیکھ کر ارجمند نے پینٹر بدلا۔ ”ارے یار۔“ وہ بولا ”سنائیں گے کسی وقت تمہیں یہ قصہ ارے
مکی وہاں آؤ تو کھائیں تمہیں سارے گاؤں کو مرید بنا رکھا ہے۔ تمہارے اس خاکسار نے۔ نام
پتہ ہیں لوگ۔“ پھر وہ ماں کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ ”ماں تو کیوں یہاں کھڑی ہے۔ کوئی کام
ہے تو حکم کر کسی سے ملنا ہے تو میں ڈھونڈ کر لے آؤں۔“

”میں تو تجھے دیکھ رہی تھی۔“ ماں نے کہا۔ اس کی آواز بھرائی ہوئی تھی۔ آنکھیں پر نم
تھیں۔

”مجھے دیکھ رہی تھی۔ کیوں۔ میرے لائق کیا حکم ہے ماں۔“ وہ چلانے لگا۔
”ہم تو کوئی نہیں۔“ وہ بولی ”ویسے ہی دیکھ رہی تھی تجھے۔“

”اچھا تو صرف دیکھتا ہے۔ تو دیکھ لو۔ دیکھ لو۔ ادھر سے اور ادھر سے بھی۔“ اس نے اپنا
چہرہ مٹاتے ہوئے کہا۔

ماں نے ہنس پڑی۔ ”تو تو مذاق کر رہا ہے۔“ وہ بولی۔ ”چل اب گھر چل آرام سے لیٹ تیری
فوجت اچھی نہیں۔“ ”لو ماں۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”ہنا کتنا تو ہوں۔ دیکھ تو میری طرف۔“ یہ کہتے
ہوئے ارجمند کو پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔ اس نے اسے روکنے کی شدید کوشش کی لیکن بے سود وہ
بہانے لگا کہ وہ دیوار کا سارالے کر کھانسنے لگا۔ اس کی حالت دیکھ کر ماں کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ

اس نکمکش سے مخلص پانے کے لیے وہ اٹھ بیٹھا۔ ”میں اب جاتا ہوں۔“
”ہاں بھائی۔“ رضائے مسکرا کر کہا ”اب تو میرے پاس کیوں بیٹھنے لگا۔“

”رضاء خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کرو۔“ ایللی نے منت سے کہا۔ ”تیرے منہ سے ایللی
مجھے اچھی نہیں لگتی۔“

”میرے منہ سے تجھے کوئی بات اب اچھی لگے گی کیا۔“ رضائے بٹاؤنی سنجیدگی سے کہہ
”پھر وہی بات۔“ ایللی چلایا۔ ”تم سے تو بات کرنا بھی مشکل ہو گیا ہے۔ اچھا مگر
ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ چل پڑا۔

”جانے کے لیے بہانہ مل گیا۔“ رضائے چلا کر کہا۔ لیکن ایللی نے اس کی بات کا
پروانہ کی۔۔۔۔

ماں اور بیٹا

بڑی ڈیوڑھی میں ارجمند کو دیکھ کر وہ خوشی سے چلایا۔ ”ارے تم کب آئے؟“
لیکن ارجمند کو دیکھ کر اسے تعجب ہوا۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ گل پتے ہونے
چہرے پر مرونی چھائی ہوئی تھی۔

ایللی کی آواز سن کر ارجمند نے شور مچانے کی کوشش کی۔ ”ماں کیا سمجھا ہے تم نے
لیکن کھانسی کی وجہ سے وہ پوری بات نہ کر سکا۔

چھاتی لرز رہی تھی۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ ایللی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔
”ہے؟“ اس نے سنجیدگی سے پوچھا۔ ”تم بیمار تو نہیں ہو؟“

ارجمند کی آنکھیں پر نم تھیں۔ اس نے مسکرانے کی شدید کوشش کی ”اپن کھانسی دانی
پروانیں کرتے۔“ وہ بولا۔ ”کھانسی کا کیا ہے۔ اور بیماری۔ نہ بھی اس خاکسار کو لگ گیا۔
تو سالی کو حاصل کیا ہو گا۔ واہ یار۔“

لیکن ایللی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”تمہاری یہ حالت کیا ہو رہی ہے۔“
”ہاں بھی یہ تو ہے۔“ ارجمند بولا۔ ”وہ کہا ہے نا استاد نے ہمارے
میں کھل کھل کے بن گئے ہاتھی۔ استاد کی بات عین صادق آتی ہے اپن پر۔ تم گھر نہ
چلا۔“

آنسو گرنے لگے۔

”کسی کا دوش نہیں۔“ وہ بولی۔ ”میرے نصیب؟“ اس نے ماتھے پر زور سے ہاتھ دبا دیا۔
”میرے نصیب وہ اس سے بڑا لڑکا تھا۔“ اس نے ایللی سے مخاطب ہو کر کہہ دیا۔
پور جوانی آئی تھی اس پر بیٹے آنکھ نہیں نکلتی تھی۔ اور قدیوں نکلا تھا جیسے سرسوں کا پودا
بس نظر کھا گئی اسے۔ کتے تھے دن ہو گیا ہے۔ اونٹوں دن نہیں اسے تو نظر کھا گئی۔
یہ۔“ اس نے ارجمند کی طرف اشارہ کی اور دوپٹے کے پلو سے آنکھیں پونچھنے لگی۔

ارجمند کو دورہ ختم ہوا تو اس نے بڑھ کر ماں کو آغوش میں لے لیا۔ ”اونٹوں ملنا
نہیں گئے گی۔ میں تو نظر بڑھوں۔ اور دن میں تو سینکڑوں دن ہضم کر جاؤں۔ اپنی مراد
نہیں۔ موت کی کیا مجال ہے جو ادھر ہماری اور آنکھ اٹھا کر دیکھ۔ تم تو کسی ہی جی بڑا کر
اپنا۔“ ارجمند نے یہ کہہ کر ماں کو آغوش میں اٹھالیا اور ایللی سے بولا۔ ”ملو گے ناشام کباب
کرنے چلیں گے۔“ اور خود گھر کی طرف چل پڑا۔

اس کی ماں چیخ رہی تھی ”اب مجھے چھوڑ دے۔ چھوڑ بھی دے۔“ اور وہ ہنسنے لگا۔
”کیسے چھوڑ دوں بڑی مشکل سے قابو میں آئی ہے تو۔“

یہ دن وہ دن

ارجمند کے جانے کے بعد ایللی نے محسوس کیا جیسے وہ محلہ ایک ویرانہ ہو۔ ایک
ویرانہ۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کیا کرے۔ گھر جانا تو اس کے لیے قلعہ
ناممکن ہو چکا تھا۔ فرحت اور ہارہہ کیا کہیں گی شہزاد تو خیر اب ان کے ہاں کبھی نہ آئے گا۔
اس کا نہ آنا بھی تو بذات خود ایک واضح اشارہ ہو گا۔ اور فرحت کو تو طعنے دینے کی بات
بڑی معصومیت سے کہے گی۔

”نہ جانے اب شہزاد کیوں نہیں آتی ادھر۔ کیوں ایللی کیا بات ہے؟“ اور اس نے
میں بلا کا تسخیر ہو گا۔ شہزاد کے گھر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا اس کی نگاہ میں
تحقیر ہو گی۔ ”آگئے تم۔ بڑی مردانگی کا زعم لئے پھرتے تھے۔ میری بات ہی نہیں سننے
منتیں کیوں میں نے کہ نہ یہ خیال نکال دو اپنے دل سے لیکن سر پر بھوت سوار تھا۔“
ایللی نے جھرجھری لی۔ ”توبہ ہے۔“ وہ بولا اور پھر سہ پڑنے لگا۔ ”کہاں جاؤں میں کیا کروں؟“

”ارے تم یہاں ایللی۔“ صفر کی آواز سن کر ایللی چونک۔ ”یہاں کیا کر رہے ہو تم؟ تمہیں
باہر نکلنے کی فرصت مل گئی کیا۔ لیکن یار۔“ اس نے پینتر ابدلا ”بڑے خوش نصیب ہو تم؟ خدا کی
تم نہیں دیکھ کر مجھے بے حد خوشی ہوتی ہے۔ بس صرف یہ التجا ہے کہ کبھی ہمیں بھی ملاقات کا
شرٹ حاصل ہو جائے۔ تمہیں نہیں معلوم ایللی۔“ صفر اپنے مخصوص انداز میں یوں کہنے لگا
چپے پینتر ڈرامہ کھیل رہا ہو۔ ”زندگی میں مجھے بھی بڑے بڑے موقعے ملے ہیں۔ ایسے موقعے
کہ لوگ میری طرف دیکھا کرتے تھے۔ سر اٹھا اٹھا کر دیکھا کرتے تھے جیسے آج میں تمہاری
طرف دیکھ رہا ہوں لیکن ان دنوں ہم ہوا کے گھوڑے پر سوار تھے۔ ایک عجیب شان تھی اپنی
کسی کی آنکھ کا تارا بننے میں عجیب شان ہوتی ہے اور پھر اس کی آنکھ کا تارا جو خود زمانے بھر کی
آنکھ کا تارا ہو جسے دنیا آنکھوں پر بٹھائے اس کی آنکھوں کا تارا تم جانتے ہی ہو لیکن اس زمانے
میں مجھے یہ معلوم نہ تھا کبھی آنکھ سے گر کر دنیا کے پاؤں میں روندنا جاؤں۔ سو آج ہم تو پاؤں میں
روندے جانے کے قاتل رہ گئے ہیں۔ تم بھی روند لو۔“ لیکن بھائی ہر کسی کو۔ ”صفر آہ بھر کر
بولا ”وہ دن بھی میسر آتے ہیں اور یہ دن بھی دیکھنے پڑتے ہیں۔“ اس نے پر معنی انداز سے کہا۔
”مرد فحشا“ چونک کر بولا۔ ”یہاں کیوں کھڑے ہو۔ انتظار کر رہے ہو کیا۔ فرصت ملے تو آ جانا کبھی
میرے پاس اسی چوبارے کے قدموں میں پڑا رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ یوں چل پڑا جیسے مکالمہ ادا
کر کے بچنے جا رہا ہو۔

صفر کے جانے کے بعد دنیا ایللی کی نگاہ میں اور بھی تاریک ہو گئی۔

”وہ چپ چاپ محلے سے باہر نکل گیا اور شہر کی فسیل سے نکل کر کھیتوں کی طرف چل پڑا۔
اسے کچھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جا رہا ہے۔ کس مقصد کے لئے جا رہا ہے۔ اسے صرف ایک
دھن تھی کہ شہزاد سے دور اس محلے سے دو۔ کہیں جنگل میں چلا جائے لیکن وہاں جا کر کیا کرے
یہ اسے معلوم نہ تھا۔

کوئی پہنچ کر وہ ایک پتھر پر بیٹھ گیا اور کنکر اٹھا کر تالاب میں پھینکنے لگا۔ دیر تک وہ وہاں بیٹھا
رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے اور آسمان پر شفق کی سرخ دھاریاں دوڑ گئیں۔ پھر بھی اس میں گھر
بلنے کی ہمت نہیں پڑتی تھی۔ گلی کی عورتیں اسے دیکھ کر کیا کہیں گی۔ وہ اس سے پوچھیں گی
”یہ ایللی آن تو سارا دن باہر کیسے رہا۔“

کاش کہ

مگر جب شفق کی شہرینی دھاریاں سیاہی مایل ہو گئیں تو وہ اٹھا اور محلے کی طرف چل پڑا۔

”ایلی۔“ وہ سکرانی اس کی آنکھیں گویا جھیلوں میں تیر رہی تھیں ”یہ تمہیں کیا ہو گیا

”نہیں نہیں۔“ وہ چلانے لگا۔ ”میں۔ میں تمہیں کبھی تنگ نہیں کروں گا۔ میرے غلطی
 ہمارے پاکیزہ جسم کو چھونے کے قابل نہیں۔“ ایلی نے شہزاد کا ہاتھ ہلاتے ہوئے کہا۔
 ”میں اپنے وجود سے تمہاری زندگی کو ویران نہیں کروں گا۔ صرف ایک بار، ایک بار مجھے معاف
 کرو۔ میری حماقت کو معاف کر دو ایک بار کہہ دو کہ تم نے مجھے معاف کر دیا پھر میں چپ چاپ
 چلا جاؤں گا۔ چپ چاپ اور چاہے میری زندگی تاریک ہی کیوں نہ ہو جائے میں کبھی بھول کر بھی

”ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”تم نے مجھے کیا سمجھا ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ از سر نو منتیں کرنے لگا۔ ”مجھ سے غلطی ہوئی میں تسلیم کرتا ہوں۔“
 ”یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔“ وہ بولی۔ ”ایلی میری طرف دیکھو۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر
 رہے تھے۔

”تم مجھے کیا سمجھتے ہو۔ کس قسم کی عورت سمجھتے ہو مجھے کیا میں —؟“
 ”نہیں نہیں مجھ سے غلطی ہوئی۔“ وہ از سر نو گھبرا گیا۔

شہزاد نے ہجہ کر اس کے بازو پکڑ لیے۔ ”تم سمجھتے ہو کہ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ مجھے
 خواہش۔“ وہ رک گئی اس کی آنکھوں سے آنسو گرا۔ وہ گھبرا گیا۔ وہ کیوں رو رہی تھی۔ کیوں رو
 رہی تھی وہ۔

”کاش تم اس قسم کی غلطی نہ کرتے۔“ وہ بولی۔ ”کاش تم میرے لیے صرف ایلی ہی رہتے
 ہر قسم معلوم ہوتا کہ مجھے صرف تم پیارے ہو مجھے تم سے کوئی غرض نہیں۔“ وہ پھر رونے
 لگی۔

اگرچہ ایلی نے کبھی اس بات کو واضح طور پر تسلیم نہ کیا تھا کہ اسے شہزاد کے جسم کی ہوس
 تھی۔ اگرچہ وہ اس کی خوبصورتی سے بے حد متاثر ہوا تھا مگر یہ تاثر اس قسم کا نہ تھا جسے عشق کہا
 جاسکے۔ خوب صورت عورتیں تو اس نے کئی ایک دیکھی تھیں لیکن اسے ان سے عشق پیدا نہ
 ہوا تھا۔ یہ تاثر عملی طور پر اس حد تک صرف اس لیے بڑھ گیا تھا کیونکہ اسے شہزاد کا قرب
 حاصل تھا کیونکہ اسے شہزاد کے قریب رہنے کے مواقع حاصل تھے۔ شاید دل ہی دل میں سوچا ہو

چھتی گلی کے پاس جا کر وہ پھر رک گیا۔ شاید وہ چھتی گلی میں بیٹھی ہوں۔ لیکن چھتی
 ویران پڑی تھی۔ شہزاد کے مکان کی ٹپلی منزل میں سے آوازیں آرہی تھیں۔ وہ دگ کر
 لگا۔

دھنسا۔ اسے خیال آیا کہ کیسے وہ باہر نہ نکل آئیں اس خیال پر وہ ڈر کر بھاگا۔
 اندھیری ڈیوڑھی میں وہ دھم سے کسی چیز سے ٹکرایا۔
 ”ہائے۔“ کسی نے چیخ سی ماری۔

اس کا دل ڈوب گیا۔

”کون ہے کون؟“ اس نے چلا کر کہا مگر اس اندھیری ڈیوڑھی پر خاموشی طاری رہی۔
 اس نے محسوس کیا جیسے کوئی دھندلی شکل اس کے قریب ہی کھڑی ہو۔
 ”کون ہے کون ہے۔“ وہ پھر چلایا۔ اس نے اپنے آپ کو محفوظ کرنے کے لیے ہاتھ چاٹا۔
 نرم و گرم لمس سے گھبرا کر اس نے وہ لنگتی ہوئی چیز تھام لی۔ اس کے سامنے شہزاد کی ڈوڑھی
 کشتی نما آنکھیں ابھر آئیں۔

”اوہ۔“ اس نے گھبرا کر شہزاد کا بازو چھوڑ دیا۔ اور بھاگنے لگا۔

”ایلی۔“ شہزاد کی آواز میں منت تھی۔ ”ایلی افسوس ہے تم پر۔“ اس نے اسے
 کوٹ پکڑ لیا وہ تڑپ کر مڑا اور سمجھے سوچے بغیر وہ اس کے قدموں میں ڈوب ہو گیا۔ وہ پکڑ
 لینے لگا۔ ”میں نے جرم کیا ہے شہزاد۔ میں نے چاند پر — وہ بات پوری نہ کر سکا شہزاد
 خاموشی سے بت بنی کھڑی رہی۔ ”میں تمہارے قابل نہیں ہوں شہزاد نہیں ہوں۔ کاش کہ
 تم سے کبھی نہ ملتا۔ میری نگاہ تم پر کبھی نہ پڑتی۔ مجھے، زمین جگہ دے دیتی اور میں اس میں
 جاتا۔“

”ایلی۔“ وہ چلائی۔ ”یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟“

لیکن ایلی اس کی بات سننے بغیر بچے کی طرح روتا اور چلاتا رہا۔ ”شہزاد تم اپنے دل میں
 کہتی ہو گی۔ تم کیا سمجھتی ہو گی۔ کاش میں اس قاتل ہوتا کہ تمہیں اپنی ناکامی میں نے
 اپنی ملکہ بتایا تھا۔ میں نے تمہیں اپنی دیوی بنایا تھا مگر میں تمہاری پوجا نہ کر سکا۔ میرے پاس
 ہی کیا جو تمہیں ملکہ بناؤں۔ مجھے معاف کر دو شہزاد شہزاد۔“

کہ وہ شنراؤ سے تفریح کے چند لمحات حاصل کر سکتا تھا کیونکہ ایک تو شنراؤ محلے والوں کا پتھر دل نہ تھی۔ اور اس لیے اس سے دل کی بات کہی جاسکتی تھی اور دوسرے چونکہ وہ تمام نوجوانوں کی نگاہوں کا مرکز تھی شاید اس کا خیال ہو کہ شنراؤ اس کی جرات اور جھڑپ نہ مانے گی۔

”کاش کہ تم مجھے سمجھ سکتے۔“ شنراؤ نے بمشکل کہا۔ ”کاش کہ تم جانتے۔“ یہ کہہ کر وہ پڑی اور وہ چپ چاپ حیران وہیں کھڑا رہا۔

دیر تک وہ وہیں کھڑا رہا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس کی بے عزتی کی گئی ہو۔ شاید اس کا خیال تھا جب وہ شنراؤ سے معافی مانگے گا تو شنراؤ اسے تھپک کر کہے گی اب تو معاف کر لیں۔ آئندہ سے کبھی ایسی حرکت نہ کرنا اور بات آئی گئی ہو جائے گی۔ مگر شنراؤ کے برعکس وہ ہوتا تھا جیسے وہ کسی بات پر دکھ محسوس کر رہی ہو۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں اس اعتبار پر کھڑا رہا کہ وہ دونوں اس اندھیری ڈیوڑھی میں چھلکے طرح آنکھ پھولی کھیل رہے تھے اس کا خیال تھا کہ شنراؤ وہیں کہیں چھپی کھڑی ہے اور چوری اسے دیکھ رہی ہے۔ اس صورت میں تو اسے فوراً ”جانا نہیں چاہئے آخر وہ کیا کچھ ایللی کا جذبہ اس قدر کمزور ہے کہ گرنے کے بعد فوراً ہی سنبھل جاتا ہے۔ اس میں اور کیا فائدہ نہ تھی بس ایک محبت ہی تھی تا صرف محبت اس لیے اس کے محبت کے جذبے میں تو اس کمزوری نہیں ہونا چاہئے۔

لیکن جلد ہی اسے احساس ہوا کہ اندھیری ڈیوڑھی میں اندھیرے کے سوا اور کچھ نہیں اندھیرا بھی وہ جس میں نہ جانے کیسے کیسے کپڑے کوڑے رینگ رہے تھے اس خیال کے آگے وہ گھبرا گیا اور آخری مرتبہ ڈیوڑھی کا جائزہ لے کر میڑھیاں چرھنے لگا۔

گھر جا کر دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ کیا واقعی شنراؤ کو اس سے شکایت تھی؟ اگر اس کے انداز میں غصے کی نسبت دکھ کی جھلک تھی۔ اس نے اسے دکھ تو نہیں پہنچایا تھا۔ مگر اس نے آنکھوں میں آنسو کیوں تھے؟ وہ رو کیوں رہی تھی کیا وہ ایللی کی خفت پر رو رہی تھی؟ خفت پر اسے رونے کی کیا ضرورت تھی۔ کیا وہ اس لیے رو رہی تھی کہ ایللی سے اسے میر نہ ہو سکتی تھی۔

دراصل شنراؤ کے متعلق ایللی کے خیالات اور جذبات متضاد قسم کے تھے ایک طرف تو

لے ایک بلند و بالا ہستی سمجھتا تھا۔ ایسی ہستی جو اس قابل تھی کہ اسے دیوی بنا کر پوجا جائے۔ اس طرف وہ سمجھتا تھا کہ وہ ایک مشاق کھلاڑی تھی ورنہ وہ کبھی اس رات اس کا ہاتھ تھانے کی جرات نہ کرتا اگرچہ اس خیال کو اس نے شعوری طور پر کبھی نہ اپنایا تھا وہ سمجھتا تھا کہ شنراؤ کا ہم دیکھنے والے کو شہہ دینے کی غرض سے ہونٹوں پر آتا ہے اس کی چال اس اہر انداز اس کی ہنسی اس کی ہر چھوٹی جیش دعوت تھی، صدائے عام تھی۔ اسے کبھی یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ شنراؤ کسی کی ایسی لغزش پر دکھ محسوس کر سکتی ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ تھا کہ محلے کے تمام نوجوان شنراؤ کے گرد پروانوں کی طرح گھومنا کرتے تھے اور وہ ہر ایک سے ہنس نہی کر بات کرنے کی بلوی تھی۔ رفتی ریشمیں روہاں ہلاتا ہوا اور ”جھمکتا ہوا پوچھتا۔“ میں نے کہا پوچھ آؤں شاید ایللی سوا سگونا ہو میں نے کہا پوچھ آؤں۔“

”ہوں تو آگئے تم۔ میں بھی کہتی تھی۔“ میں نے کہا پوچھ آؤں ”صبح سے نہیں آیا۔ اچھا نہ۔“ میں نے کہا پوچھ آؤں ”ذرا بیٹھ جاؤ۔“ پھر وہ اپنی سیاہ آنکھیں گھما گھما کر اس کی طرف دیکھتی اور مسکراتی۔ اس وقت ایللی محسوس کرتا جیسے اس کے پوچھنے کی عادت پر مذہن اڑا رہی ہو۔ اور اسے یقین کر رہی ہو کہ پوچھنے کی عادت چھوڑ دے اور بنا پوچھنے کی جرات پدا کرے۔

یاد جب کبھی صدر اس کی نظر پڑ جاتا۔ تو وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر چلائی۔ ”میں نے کہا کس خیال میں کھڑا ہے تو۔ وہ پار سن نہیں بھولی ابھی تک لیکن میں کہتی ہوں لب آئیں بھرنے سے کیا حاصل۔ جب موقعہ تھا تب کھو دیا۔“

جب شنراؤ اس قسم کی بے تکلف باتیں کرتی تو ایللی محسوس کرتا جیسے وہ لوگوں کو اکسار ہی ہو — متوجہ کر رہی ہو۔ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ وہ ایک کھلاڑی ہے۔ لیکن جب وہ پر غم آنکھوں سے ایللی کی طرف دیکھتی اور کہتی ”ہے ایللی یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ تم نے مجھے کیا سمجھتا ہے۔“ اس وقت وہ محسوس کرتا کہ اس کی بظاہر شوخی محض ایک دکھلاوا ہے اور درحقیقت وہ ایک عظیم شخصیت کی مالک ہے۔

شنراؤ کے دل کی گہرائیوں کو محسوس کر کے ایللی اس سے محبت کرتا تھا۔ ایسی محبت جس میں ناگاہی کا عنصر تھا۔ اس وقت ایللی کی نگاہ میں شنراؤ دیوی کا روپ دکھا رہی تھی وہ بچاری بن کر اس کے قدموں میں گر جاتا۔

لیکن جب شنراؤ میں شوخی کا عنصر بیدار ہوتا اور وہ دوسروں سے چمک کر بات کرتی تو ایللی

آتش رقابت میں جلتا۔ اس کا دل یوں سلگنے لگتا جیسے کسی نے بھس میں آگ لگا دی ہو۔
شہزاد اس کی نگاہ میں قلو پطرہ کی حیثیت اختیار کر لیتی اور وہ سمجھتا کہ شہزاد کو اس سے کیا
نہیں وہ صرف اس سے کھیل رہی ہے جیسے وہ اک کھلوتا ہو۔ وقتی تفریح کا ساملاں۔
اس روز اندھیری گلی میں شہزاد کا برتاؤ دیکھ کر ایلی کو بے حد تعجب ہوا آخر وہ
روپے پر اس قدر پریشان کیوں تھی۔ اسے دکھ کیوں ہو رہا تھا۔ ایلی کے خیال کے مطابق
اسے فرحت کے گھر آنا ہی نہیں چاہئے تھا۔ اور اگر آتی بھی تو اس کے انداز میں تسکین
عصر ہونا چاہئے تھا۔

جلو کا کھیل

ایلی گھر پہنچا تو فرحت نے اسے دیکھ کر کہا۔ ”تو کہاں رہا آج سارا دن ایلی شہزاد
تجھے تلاش کرتی رہی آج۔ توبہ ہے صبح سے اب تک بیسیوں مرتبہ آئی ہوگی لوہر۔“
”کہاں چلا گیا تھا تو۔“ ہاجرہ بلی زبان سے بولی۔ ”میں تو ڈر گئی۔“ کیوں خیر تو ہے۔“
نے پوچھا۔ ”بولتا کیوں نہیں۔“

”ویسے ہی باہر چلا گیا تھا۔“ ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔
”تو تو کبھی نہیں نکلا باہر۔“ فرحت نے کہا۔ ”ہر وقت وہیں گھسا رہتا ہے شہزادے۔“
”اے ہے کیا کہہ رہی ہے تو۔“ ہاجرہ نے فرحت کو ٹوکا۔ ”چاہے کہیں رہ بیٹا لیکن وہ
سے باہر نکل جانا بتائے بغیر۔ تیری تو عادت ایسی تو نہیں۔“

”لڑائی تو نہیں ہو گئی تمہاری آپس میں۔“ فرحت بولی ”بیچاری صبح سے سرگردان
تھی۔“

”جا جا کر اسے مل آ۔ اسے معلوم ہو کہ تو آگیا ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔
”نہ اس وقت میں تھا کہ ہوا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔“
”اے ہے وہ بیچاری۔“ ہاجرہ نے اس کی منت کی۔

”چھوڑ بھی ماں۔“ فرحت بات کاٹ کر بولی۔ ”زبردستی کیوں کرتی ہو۔ اس کا منہ
تو نہ سہی۔ خواہ مخواہ۔ ایسا بھی کیا ہے صبح ہو آئے گا۔“

رات کو دیر تک وہ چارپائی پر پڑا سوچتا رہا۔ ”نہیں نہیں وہ مجھے کبھی اچھا نہیں سمجھا
اور محبت۔ محبت کس برتے پر کی جاتی ہے زبانی دعوے کون خاطر میں لاتا ہے۔“
باتیں۔“ اس وقت رات کے اندھیرے میں دو رنگین بازو اس کی طرف بڑھتے۔ ”ایلی! تو
لے۔“ ارشد چلا۔ ”وہ گھڑا۔“ ارشد دیکھ بھی۔ میرے منہ کی طرف کسا دیکھتا ہے بار۔ یہاں تو

”ارے تم اتنی سویرے۔“ ارشد اسے دیکھ کر چلا۔ ”کہیں تم نمازی تو نہیں بن گئے
اپنے اپولش کا انالٹا تو نہیں ہو گیا۔ آؤ آؤ اہل رک کیوں گئے۔ بیٹھ جاؤ آج وہ چیز دکھائیں گے
تمہیں کہ قسم ہے عمر بھر نہ دیکھی ہو کبھی۔ کیا یاد کرو گے کہ کوئی دوست تھا اپنا۔ یہ کھڑکی کھولنا
زل۔ یہ جو سرہانے کی طرف ہے۔“

”ارے رے رے۔“ وہ چلایا۔ ”تم نے تو بالکل ہی کھول دی۔“ اس نے ہاتھ بڑھا کر
کھڑکی کے پٹ بند کرتے ہوئے کہا۔ ”اہل کوئی ہوا تھوڑی کھانی ہے کہ پٹ کھول دیں۔ اپن
نے تو محض دیوٹی درشن کرتے ہیں اور چوٹ کھلی ہو تو دیوٹیاں چوکی ہو جاتی ہیں اور پھر درشن
مما وہ بات نہیں رہتی۔ یہ اتنی درز کافی ہے اب دیکھو۔ اونہوں گھبراؤ نہیں۔“ ارشد بولا۔

”میں لوہر نماز کے بعد وظیفہ پڑھ رہی ہے اور باقی سب سو رہے ہیں بے تکلف دیکھو۔ سامنے
چوبارے میں ساری کوریاں اور ڈکورے پازنی باری جاگیں گے اور پھر جاگتے ہی ہر کوئی پہلے
آئینے کے سامنے آکھڑی ہوگی یہ ان کی ریت ہے۔ جاگتے ہی پہلے آئینے میں اپنا آپ دیکھتی ہیں
کہ جن دن رات کو چوری تو نہیں کر لیا کسی نے آنکھیں ملیں گی۔ انگریزیاں لیں گی۔ آہا۔“ وہ

چلایا۔ ”عورت کو دیکھنا ہو تو صبح سویرے دیکھو۔ آہا۔ کیا جین ہوتا ہے۔ جب وہ سو کر اٹھتی
ہے آنکھوں میں غماز بال الجھے ہوئے۔ جسم گدرا لیا ہوا۔ اور پھر انگریزیاں۔ وہ کہا ہے نا استلو
نے ہاتھ انگریز کی صورت آنکھ شرمائی ہوئی۔ آہا کیا کیفیت ہوئی ہے۔ واہ واہ واہ۔“

”ارشد چلایا۔“ وہ گھڑا۔ ارشد دیکھ بھی۔ میرے منہ کی طرف کسا دیکھتا ہے بار۔ یہاں تو

کمرے پر کچھ دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر بیڑھیوں میں وہی چوکڑی بھرنے کی آواز سنائی دی چھن چھن چھن کوئی میز میز تھا۔

”ارے رے رے۔“ ارجمند چلایا۔ ”ہا۔ مندر میں گھینٹیاں بجیں دیوی آئی اور چائے تو ابے اور حرامی تجھ سے کہہ رہا ہوں۔ سالے تو اندھا ہے۔ بد نصیب ہے۔ گدھا ہے تم پر ایک بار وہ اپن کا منہ سہلا دے تو دنیا تیاگ کر یوگی بن جاؤں۔ ارے دیوی کی دیوی ہے کے رو برو سب بیچ ہیں۔ ایسا چاند ہے جو چمک کر سب تاروں کو ماند کر دیتا ہے۔ دلوں کا ہے۔ اور تو۔ تو وہاں رہتا ہے اس کے پڑوس میں۔ اور وہ تیرے منہ کو ہاتھوں سے مسلاتے اور تجھ سے اشاروں میں باتیں کرتی ہے۔ اور پھر اتنی قریب۔ رام رام رام۔ ارے بارہ دو کے ہی میں رکھا آج تک۔“

”کیا فضول بک رہا ہے تو۔“ ایللی نے چیخ کر کہا۔ ”چھوڑ —“ ”ارے کس کو چھوڑوں بھنورا پھول کو چھوڑ دے چکورا چاند کو چھوڑ دے پر اپن دیوی پوجا نہیں چھوڑے پھر دیوی بھی ذہ جس کے چرنوں میں سکھ ہے شانتی ہے۔ گود نہیں چرنوں میں۔ گود لالہ نیسیوں پھرتی ہیں۔ ان کی بات اور ہے۔“

شہزادہ کو گئے ابھی زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی کہ ہاجرہ آگئی۔ ”ہے ایللی تو یہاں بیٹھا ہے۔ سب وہاں ڈھونڈ کر پاگل ہو رہے ہیں۔“ وہ چلانے لگی۔ ”کسی کو بتا کر آیا ہوتا یہاں۔ کوئی بندش لگا رکھی ہے تیرے آنے جانے پر۔ نہ کھانا نہ پینا نہ کسی کو بتایا کہ میں ارجمند کی جا رہا ہوں۔ یہ بھی کوئی بات ہے بہن ناحق پریشان ہو رہی ہے وہ تو اللہ بھلا کرے شہزادہ نے ڈھونڈ نکالا تجھے۔“

”ارے۔“ ارجمند زیر لب بولا۔ ”تو تجھے ڈھونڈنے آئی تھی۔ اپن سمجھے اپن کی بات پڑی۔“

”اور دیکھ بہن ویسے تو یہ اپنا ہی گھر ہے جس وقت چاہے آئے جائے لیکن میں آتا۔“ پھر دیکھ کرے میں آداخل ہوئی۔ ”کیا کر رہا ہے تو چل اب گھر چل پھر آجائے۔“

پاس ارجمند۔

دب آیا ہے تو۔ نوکری کا معاملہ تو ٹھیک ہے نا۔“ ہاجرہ نے پوچھا اور جواب سننے بغیر ایللی سے چلب ہو کر بولی۔ چل بھی نا فرحت انتظار کر رہی ہے تیرا چل اٹھ پھر آجانا۔“

میلو

جب وہ گھر پہنچا تو چھن سے شہزادہ اس کے رو برو آکھڑی ہوئی۔ ”میں کے کہنے پر آگیا تو۔ اور جب میں گئی تھی اس وقت تو یوں چپ چاپ بیٹھا رہا تھا جیسے منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ جیسے جسم میں جان نہ ہو۔“

”آگیا ایللی۔“ فرحت اسے دیکھ کر بھاگی آئی۔ ”اے ہے۔ چائے تو پی کر جاتا۔ کب سے رکھی ہے اب تو ٹھنڈی بھی ہو گئی ہوگی۔ گرم کر دوں یا پھر سے بنا دوں۔“

”مجھے بھوک نہیں۔“ ایللی نے بے پروائی سے کہا۔

”تو چائے ہی پی لے۔“ ہاجرہ بولی۔

”میرا جی نہیں چاہتا۔“ وہ روکھی آواز میں بولا۔

شہزادہ نے بڑھ کر اس کی کلائی پکڑ لی۔ اور اسے کھینچتے ہوئے بولی۔ ”چل جو تیرا جی چاہتا ہے وہ کھاؤں تجھے چل۔“

فرحت نے شرارت بھری مسکراہٹ سے ان کی طرف دیکھا۔ ”تم ہی جانتو کیا جی چاہتا ہے اس کا۔ اپنے بس کی بات تو نہیں۔“

”جی تو لیے جا رہی ہوں اسے۔“ شہزادہ نے ہنس کر کہا۔ ”تم بیچاری کیا جانو۔“

”ہاں ہاں۔“ ہاجرہ بولی ”لے جا اسے لے جا بس خوش رہے میں تو یہی چاہتی ہوں۔ تیری بیٹی مرنے لگی۔“

پہلے تو ایللی نے بازو چھڑانے کی خفیف سی کوشش کی لیکن شہزادہ سے بازو چھڑانا یہ اس کے بس کی بات نہ تھی۔ پھر وہ اس کے پیچھے پیچھے گیند کی طرح لڑھکتا چل پڑا۔

”توبہ ہے۔“ وہ اکیلے میں کہنے لگی ”بڑے خڑے آگئے ہیں تجھے۔ مانتا ہی نہیں کسی صورت۔ دو روز سے پاگل کر رکھا ہے مجھے۔“

”لے بیٹھ یہاں۔“ شہزادہ نے اپنے کمرے میں پہنچ کر اسی کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ ”توبہ ہے دو روز سے کیا حال کر دیا ہے۔ میری طرف دیکھ۔“ اس نے ایللی کا سراپنہ ہاتھوں میں تھام

لیا شنراؤ کی آنکھوں میں آنسو تھے۔ ”میں نے تیرا کیا بگاڑا تھا ایللی۔“ اس نے پوچھا۔
 شنراؤ کی آنکھوں میں آنسو دیکھ کر ایللی کا ضبط پاش پاش ہو گیا۔ وہ دم سے اس کے چلن پر
 گر پڑا۔ ”میں تمہارے قاتل نہیں ہوں شنراؤ۔“ وہ بولا۔ ”میں تمہارے قاتل نہیں ہوں۔ میں
 نااہل ہوں بچ ہوں بچ۔“ اس کی گھٹکی بندھ گئی۔ شنراؤ نے اس کا سراپے جسم سے لگا لیا اور
 تھپکنے لگی۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم کیا ہو یہ مجھ سے پوچھو۔ جو حالت میری ہوئی ہے تمہارے
 بغیر میں ہی جانتی ہوں۔“

”میں کچھ کھا کر مر جاؤں گا۔ زندگی بے کار ہے اب۔“ ایللی نے کہا۔
 ”چپ ایسی باتیں نہیں کیا کرتے۔ تم مر جاؤ گے تو میرا کیا ہو گا۔ مجھے تمہاری ضرورت ہے
 ایللی۔ مجھے تمہاری لگن ہے صرف تمہاری تم سے کچھ نہیں چاہئے۔ بس تم میرے پاس رہو۔
 میرے سامنے رہو اور کچھ نہیں مانگتی میں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلایا ”میں اپنی زندگی ختم کروں گا۔ اگر تم سے محبت نہیں کر سکا تو
 بیچ ہے بیچ ہے۔“

”محبت اسے نہیں کہتے پنگے۔“ وہ بولی۔ ”مجھے اس کی پروا نہیں۔ مجھے کسی چیز کی پروا نہیں
 مجھے صرف ایللی چاہئے۔ صرف ایللی۔“ اس کی آنکھوں سے ایک آنسو گرا۔
 ایللی سکیں بھرنے لگا۔ ”تم اتنی حسین ہو تم اتنی پیاری ہو۔ دنیا تمہارے دروازے پر
 شنراؤ تم اتنی رکتیں ہو کہ تمہیں دیکھ کر میں نشے میں جھونے لگتا ہوں۔ تمہیں محسوس کرتے
 میری کائنات بدل جاتی ہے اور میں میں ایک ذلیل نااہل شخص ہوں۔ بیچ ہوں۔“

”تمہیں کیا معلوم۔“ وہ بولی ”تم کیا ہو۔ چھوڑو اب۔ معاف کر دو مجھے۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر
 سامنے کھڑی ہو گئی۔ اسے یوں ہاتھ جوڑے کھڑی دیکھ کر وہ دیوانہ وار اٹھا اور شنراؤ کا ہاتھ
 چومنے لگا۔ جانو کے پاؤں کی چاپ سن کر وہ الگ ہو گئی۔ اور کھڑکی میں یوں کھڑی ہو گئی جیسے روز
 ازل سے وہاں کھڑی ہو۔ پھر جانو آئی تو شنراؤ بولی۔ ”کیا کر رہی ہے تو جانو کچھ خبر بھی نہ لے
 کتنی محنت سے ایللی کو تلاش کر کے لائی ہوں اب اگر تو نے اس مادہ کو کی خاطر تواضع نہ کی تو
 پھر روٹھ کر چلا جائے گا۔“

”بڑا مادہ ہے منہ تو دیکھو۔“ جانو نے کہا۔ ”خبرے کرتا پھر تارے اول تو گھر سے باہر نہیں
 اگلے روز جب وہ دونوں بظاہر ایک دوسرے کے قریب لیکن حقیقتاً ایک دوسرے سے
 مدت دور بیٹھے تھے تو شریف آگیا۔ شریف کو دیکھ کر ایللی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے اس نے یوں
 محسوس کیا جیسے وہ پکڑا گیا ہو وہ گھبرا کر اٹھا۔ بات کرنے کے لیے اسے الفاظ نہیں ملتے تھے زبان
 ٹٹا گیا قوت گویائی مفقود ہو چکی تھی۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اپنے بازوؤں کو کیسے سنبھالے جو
 ٹٹا ٹٹا کر گویا زمین سے جا گئے تھے اس نے خوشی کا اظہار کرنے کے لیے ہنسنے کی کوشش کی
 لیکن اس کی باجھوں پر گویا تالے لگے ہوئے تھے۔ آنکھیں اس حد تک کھل گئی تھیں کہ کوشش
 کے بغیر وہ انہیں قابو میں نہیں رکھ سکتا تھا۔

جوش رقابت

444

”میں میں ایں۔ آپ آپ۔ یعنی میں۔“ اس نے شریف کے آنے پر خوشی کا اظہار کرنے کے لیے کچھ کہنا چاہا۔

شہزاد اطمینان سے بیٹھی اپنی کام میں یوں مصروف رہی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔ مجھے ٹھنڈے کا آنا یا نہ آنا، ایللی کا اس قدر قریب بیٹھے ہونا یا نہ ہونا سب برابر ہو۔

”کیوں ایللی۔“ شریف نے کہا۔ ”خوش ہو تم بڑی مشکل سے چھٹی ملی ہے مجھے۔ ہمارا حقہ تو بھرتا۔“

”چائے بھی تو بنا دو جانو۔“ شہزاد بولی۔ ”اور کھانا بھی تو کھائیں گے۔“

شریف نے بیک وقت متبسم اور مغموم نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ لیکن شہزادے کا من مصروف تھی۔ اہلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے کھسک جانا چاہئے اس نے ہلکی سی شہزاد کے گھر میں محسوس کیا جیسے اس کی حیثیت جملہ معترضہ کی ہو۔ کچھ دیر وہ وہاں ہلکا ہلکا بیٹھا رہا پھر اٹھا۔ ”ابھی آؤں گا۔“ وہ بولا ”ذرا گھر سے ہو آؤں۔“

”اچھا۔“ شریف نے جواب دیا۔ ”لیکن آنا ضرور تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔“

نے سوچا۔ اس نے محسوس کیا جیسے شریف صورت حالات سے پورے طور پر واقف ہے۔

اسے علم ہے کہ اہلی وہاں کیوں آتا ہے اور اس نے اسی بارے میں باتیں کرنی ہیں۔

گھر پہنچ کر وہ دھڑام سے چارپائی پر گر پڑا۔
 ”کیوں کیا ہوا؟“ ہاجرہ دوڑتی ہوئی آئی۔ ”خیر تو ہے۔ پھر کوئی ہلت تو نہیں ہو گیا۔“
 ”بات کیا ہوئی ہے۔“ فرحت نے ہنس کر کہا۔ ”گھر والے اپنے گھر آ گئے اور کیا۔“
 ”کیا مطلب ہے تیرا فرحت؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”شریف چھنی لے کر آیا ہے اور کیا۔“ فرحت بولی۔
 ”ہائیں شریف آیا ہے۔“ ہاجرہ نے حیرانی سے دہرایا ”لیکن اس میں کیا ہے۔“
 ”پوچھو ایلی سے۔“ وہ بولی ”آخر اس نے تو گھر آنا ہی ہوا۔“

اس وقت ایلی اس قدر گھبرایا ہوا تھا کہ اس نے فرحت کی بات کا برانہ محسوس کیا۔ عجیب کیفیت تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ شریف کی آمد پر اسے دکھ کیوں محسوس ہے۔ شریف کو تو وہ بہت اچھا سمجھتا تھا وہ تو ایلی کا پیارا دوست تھا پھر اس کی آمد اس قدر ناگوار محسوس ہوئی۔

”حکیم نے تو نہیں کہا۔“ وہ اٹھ کر بولی۔ ”البتہ تم ایسے سیانوں کو دیکھ کر مٹی چاہتا ہے ہو کر کہیں نکل جاؤں۔“

شنزاد کے انداز تکلم میں غضب کی دھار تھی۔ لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک معصوم تھا۔ ”اب آؤ گے بھی یا نہیں۔“ وہ ایللی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”اب آگئی جاؤ۔ وہ انتظار رہے ہیں چائے سامنے رکھی ہے ٹھنڈی ہو جائے گی۔“

ایللی وہاں پہنچا تو شریف چائے کا پیالہ سامنے رکھے اسی طرح چھت کی طرف ہلکی ہلکی بیٹھ تھا۔ ایللی کو دیکھ کر اس نے اپنی مخصوص حسرت زدہ مسکراہٹ سے کہا۔ ”نہ جانے کیا یاد ہے جسے چاہو وہی دور بھاگتا ہے۔ اب یہ ایللی بھی محبوب سے غم کرنے لگا۔ اپنی قسمت ایسی ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ ایللی چلایا ”میں تو وہاں —“

انوکھے اظہار

”اب چھوڑو ان باتوں کو۔“ شریف نے کہا۔ ”یہ بہانے اپنے لیے نئی چیز نہیں تم بہ طبیعت ملی تھی سوچا تھا خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے لیکن اب تم بھی کئی کڑے لگے یاد آیا۔ یہ تو بتاؤ امر تسروالی کا کیا حال ہے کچھ بات بنی یا نہیں۔ اسے علم ہوا یا نہیں۔ کیوں نہ گا علم محبت اثر کیے بغیر رہ سکتی ہے کیا یہ نہیں ہو سکتا۔ محبت میں بڑی طاقت ہے۔ اس سے نہ کر اور کوئی طاقت نہیں۔ تو بتاؤ نا ہمیں۔ کیا وہ بھی مضطرب ہے۔ کیا اسے بھی خیال ہے۔ نہ ہو گا۔ لیکن اس کا اظہار بھی ہوا ہے یا نہیں۔ تمہارے جذبے کی آزمائش ہے ایللی۔ دیکھا تمہارے جذبے میں کتنا اثر ہے۔“ ایللی کو خاموش دیکھ کر شریف نے کیوترکی سی آنکھیں ملنے ہوئے کہا۔ ”کیوں تمہیں تو معلوم ہے کچھ۔“ اس نے شنزاد سے مخاطب ہو کر پوچھا۔

”سارے محلے میں چرچا ہے۔“ شنزاد بولی ”سنا ہے حسن میں جواب نہیں اس کا جی وہاں کی یہ حالت ہو رہی ہے۔ دیکھو تو اس کی طرف مجھ سے کتنا تھا۔“ وہ ہنسی بے تحاشہ ہنسی ملی گئی۔ ”مجھ سے کتنا تھا کہ زہر کھالوں گا۔“ ایللی نے غصے سے شنزاد کی طرف دیکھا۔

”اب دیکھ لیجئے کیسے دیکھ رہا ہے میری طرف۔ پر ایمان سے کتنا ایللی تم نے کہا نہیں وہ سے میں زہر کھالوں گا۔“

ایللی جرنی سے شنزاد کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کی شوخی اور بے یابی دیکھ کر وہ گویا سکتے میں

ایلی تھا۔

”ہو نہوں۔“ شریف مسکرایا۔ ”زہر کھانا مردوں کا کام نہیں۔“

”میں نے اس سے کہا تھا۔“ شنزاد قہقہہ مار کر — ہنسی ”لیکن یہ کہتا ہے میں مرد نہیں۔ کوئی پوچھے کیسے نہیں۔ میں تو مرد سمجھتی ہوں اسے۔“

”زہر کھانا مردانہ مرد کا کام نہیں۔“ شریف بولا۔ ”میری طرف دیکھو جی رہا ہوں۔ اتنا کچھ جمل کر بھی جی رہا ہوں۔ تم یہ بتاؤ اس کو بھی خیال ہے تمہارا یا نہیں۔“

شنزاد نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”وہ تو مرنے ہے۔“ وہ بولی ”اسی کو یقین نہیں آتا یہ سمجھتا ہے کہ اسے زرا بھی پروا نہیں۔ اب وہ بیچاری کیا کرے۔“

”کیوں ایللی۔“ شریف نے پوچھا۔

ایللی شنزاد کی دو دھاری باتوں پر طیش میں آ رہا تھا۔ لیکن ان باتوں میں جو کنٹائی کی مدد سے ایللی سے کی جا رہی تھیں ایک عجیب سی لذت تھی۔

”کیوں مذاق کر رہی ہیں آپ۔“ ایللی نے شنزاد کو گھورا۔

”مذاق۔“ وہ بولی۔ ”اب میں تمہیں کیسے یقین دلاؤں کہ میں نے زندگی بھر میں کبھی اس قدر عجیبی سے بات نہیں کی۔ مشکل تو یہ ہے کہ تمہیں یقین نہیں آتا اب میں کیا کروں۔“ شنزاد کی آنکھوں میں آنسو بھرے تھے۔ ایللی گھبرا گیا۔ وہ شریف کی موجودگی میں براہ راست اس سے ”وہ باتیں کر رہی تھی جو اس نے ایللی سے کبھی نہ سنی تھیں۔“

اور شریف بھولا بھالا شریف مسکرا رہا تھا۔ ”ٹھیک کہتی ہے یہ۔“ وہ شنزاد کی طرف اشارہ کر کے کہہ رہا تھا۔ ”ابتداء میں ایسا ہی ہوتا ہے۔ دوسرے کی بات کا یقین نہیں آتا۔“ بس ایللی کو جی ہی نہیں آتا۔ ”شنزاد بولی۔“ ”اب میں کیسے یقین دلاؤں اسے۔“

”ہاں ہاں۔“ شریف نے کہا — پھر اس نے آہ بھری لیکن وہ بولا ”جب عشق پرانا ہو جاتا ہے تو پھر دنیا ہی بدل جاتی ہے نہ شکوک نہ گلے نہ بے یقینی۔“

”نہ جانے وہ دن کب آئے گا۔“ شنزاد نے حسرت ناک آواز میں کہا۔

”اب آئے گا؟“ شریف چونک پڑا۔ پھر آپ ہی آپ ہنس کر بولا۔ ”اچھا تو تم ایللی کے

محفل کر رہی ہو۔ میں سمجھا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”اور کیا آپ کے متعلق کہہ رہی ہوں۔“ شہزاد ققمہ مار کر بولی۔ اس کی بات سن کر دونوں میں بلا کی تحقیر تھی۔ ایللی کانپ گیا۔

شہزاد اس کے نزدیک ایک معمہ تھی۔ اس میں بلا کی جرأت تھی اور وہ بات اعلیٰ سے بچکاتی نہ تھی اور سب سے عجیب ترین بات یہ تھی کہ کسی تیسرے آدمی کی موجودگی میں ایللی سے اس قدر قریب ہو جاتی تھی جیسے اس کی گود میں بیٹھی ہو۔ اس کے اشارات کی وضاحت اور رنگین ہوتے تھے اس کی حرکات سے محبت آمیز شرارت یا شرارت آمیز محبت کی۔ لیکن تنہائی میں اس کا انداز قطعی طور پر بدل جاتا تھا جیسے وہ ایللی کے وجود ہی سے منکر ہو۔

کے خدوخال پر سرد مہری کا دیز پر وہ پڑ جاتا اور اس کا حسن بے جان ہو کر رہ جاتا تھا۔ جب ایللی اپنے بستر پر پڑا تھا تو وہ سوچ رہا تھا کہ وہ دونوں مل کر شریف کو دھوکا دے رہے ہیں۔ کا مذاق اڑا رہے ہیں اور معصوم اور پیارا شریف بے خبری میں دھوکے کھائے جا رہا ہے۔

ایک دوسرے سے اظہار محبت کا ذریعہ بن رہا ہے۔ ایللی کو یہ باتیں سوچ کر دکھ ہو رہا تھا کہ رہا تھا کہ وہ ایک مجرم ہے۔ اسے شریف سے ہمدردی ہوتی جا رہی تھی۔ لیکن ساتھ ہی اسے یہ خیال آتا کہ شریف اس وقت شہزاد کے قریب بیٹھا ہو گا۔ وہ اس سے اظہار محبت کرے گا۔ اور شہزاد اپنے خاوند کی آمد پر شوق محبت سے بے تاب ہوئی جا رہی ہو گی تو اس کے بچے

پر سانپ لوٹ جاتا۔ اور اسے شریف سے نفرت ہونے لگتی۔ ”لا حول ولا قوۃ کیا یہ وہ آواز ہے وقف جس کے منہ سے ہر وقت رال نکلتی ہے۔ جو ہر وقت کبوتر کی طرح آنکھیں ہلکے پھٹتے کو گھورنے کے سوا کچھ نہیں جانتا۔ جو شہزاد کی رنگین شخصیت کے قریب بچ کر گزشتہ عشق کی محرومی پر آہیں بھرتا رہتا ہے۔ نہیں نہیں وہ شہزاد کے قابل نہیں۔ ایللی

دوسرے سے کوئی سروکار نہیں ہونا چاہئے۔ زندگی اور موت کی طرح وہ دونوں متضاد چیزیں ہیں۔ شہزاد زندگی ہے رنگینی ہے اور شریف مایوسی حسرت اور موت۔ ”لیکن اس کے بعد لگا آتا ”شہزاد اسے کیسے برداشت کر سکتی ہے۔ کیوں برداشت کرتی ہے۔“ پھر اسے شہزاد کے غصہ آنا شروع ہو جاتا اور اس کے تخیل میں شہزاد اور شریف کے قرب کی عجیب تصاویر کرتیں اور دل میں رقابت کی جلن محسوس ہوتی۔

کروٹیں

اس روز وہ ساری رات کروٹیں بدلتا رہا۔ ساری رات اسے نیند نہ آئی۔ جب

ہنے لگا یا جب بھی اس کی آنکھ لگتی تو گویا کوئی اسے جھنجھوڑ کر جگا دیتا۔ ”اٹھو وہ قریب آرہے ہیں ایک دوسرے کے قریب۔“ وہ چونک کر اٹھ بیٹھتا اس کے ذہن کی چادر پر پھر سے تصاویر نکلیں ہو جائیں۔ شہزاد برہنہ حالت میں آنکھری ہوتی اس کا چہرہ خواہش کی شدت سے بھیا نک ہو جاتا اس کا جسم غلاط کے کیڑے کی طرح گندگی کی طرف رینگتا۔ اس کی آنکھوں میں وہیں شعلے لپکتے۔ اور وہ شریف کی طرف بڑھتی جاتی۔ ایللی کے دل میں درد بھری ٹیسیں اٹھتیں اور وہ بے تاب ہو کر ترپتا۔

ساری رات وہ پہلو بدلتا رہا ساری رات وہ ترپتا رہا۔ رقابت اور تکلیف کا یہ احساس اس کے لیے بالکل نیا تھا۔ نیا اور بے حد تکلیف وہ اگلے روز جب شہزاد اسے بلانے آئی تو ایللی نے اسے انداز میں جواب دیا۔ ”تم جاؤ۔ میں پہنچ جاؤں گا۔“

لیکن شہزاد نے اصرار کیا۔ ”میں تو ضرور ساتھ لے کر جاؤں گی کوئی بات ہے۔ تمہارا کیا انتہا بات کر کے مکر جاؤ۔“ شہزاد نے اس بات پر اس قدر ہنگامہ مچایا کہ ہاجرہ کے اصرار پر ایللی کو باہر بلا دیا۔

”میزبوں میں جب وہ اکیلے تھے تو شہزاد نے اس کا بازو پکڑ لیا۔ اور وہ بولی ”پارہ بہت چڑھا ہوا ہے آج۔“

”مجھے ہاتھ نہ لگاؤ۔“ ایللی نے اس کا ہاتھ جھٹک کر کہا۔

”کیوں کیا ہے اس ہاتھ کو۔“ شہزاد بولی۔

”اس ہاتھ سے شریف کے منہ کی رال کی بو آتی ہے۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔

”شریف کے منہ کی رال۔ ہونہ۔“ وہ نفرت سے کہنے لگی۔ ”تم نے کیا سمجھا ہے مجھے۔“

کیا ہو تم۔“ ایللی نے پوچھا۔

”میں میں ہوں۔“ وہ سینہ تان کر بولی۔

”مگر وہ تمہارا خاوند ہے نا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ہو گا۔“ وہ بولی۔ ”پڑا ہو اس سے کیا فرق پڑتا ہے۔“

”رات بھر محفل گرم رہتی ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”ہونہ محفل گرم رہتی ہے۔“ وہ بولی۔ ”وہ بیچارہ کیا محفل گرم کرے گا۔“ تو تم کرتی ہو

گی۔ ”ایلی نے کہا۔

”کبھی کروں گی ہی نا۔“ شہزاد نے آہ بھر کر کہا۔ ”دیکھ ایلی میری بات سن۔“ شہزاد نے دونوں شانوں سے پکڑ کر کہا۔ ”کسی کو جہاں نہیں ہے جو مجھے ہاتھ لگائے۔ تم تو باقی جتنے بھی لکھا ہے۔“ نہ جانے کیوں شریف نے ننھی نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ جو اس دن مشین پر بیٹھی کام میں مصروف ہو چکی تھی جیسے گردو پیش کے متعلق کچھ خبری نہ ہو۔ باہر جا کر ہی ہنسی ہے۔“ شریف نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا ”ہمارے ساتھ کوئی بھی ہنستا۔“

پھنس گئی تو پھڑکن کیسا

”معلوم ہوتا ہے۔“ شریف نے ایلی سے مخاطب ہو کر پوچھا۔ ”اب تمہیں بھی میرا نہیں رہا مجھ سے محبت نہیں رہی کب سے انتظار کر رہا ہوں۔ ہماری قسمت میں تو انتظار لکھا ہے۔“ نہ جانے کیوں شریف نے ننھی نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ جو اس دن مشین پر بیٹھی کام میں مصروف ہو چکی تھی جیسے گردو پیش کے متعلق کچھ خبری نہ ہو۔ باہر جا کر ہی ہنسی ہے۔“ شریف نے شہزاد کی طرف اشارہ کیا ”ہمارے ساتھ کوئی بھی ہنستا۔“

”روتوں کے ساتھ کون بنے۔“ شہزاد بولی۔ ”سن رہے ہو ایلی۔ سچ کہہ رہی ہوں نا۔“ ”یہ بھی ٹھیک ہے۔“ شریف نے آہ بھر کر کہا۔ روتوں کے ساتھ کون بنے۔ ”چلو نہ روتے کو تسلی تو دو اس کے آنسو تو پوچھو اس سے ہمدردی تو کرو۔“

”نہ جی۔“ شہزاد بولی ”یہ یتیم خانہ نہیں ہے کہ یہاں ہم ہر وقت روتوں کو چپ کر رہیں۔“

”سن لیا تم نے۔“ شریف نے ایلی سے کہا ”یہی خوش نہ ہو سکی تو کس کو خوش کر ہوں میں۔ اپنے اپنے نصیب ہیں بھائی۔ تم پر امید باندھی تھی تم نے بھی اتنا جانا چھوڑا نا۔ بیٹھا انتظار کر رہا تھا کہ کب ایلی آئے۔ شاید تمہارا بھی میرے پاس بیٹھنے کوئی نہیں ٹھیک تو ہے ہری کو نپلیں سوکھے پتوں سے کیسے لگاؤ رکھیں۔ ہم تو اب سوکھے پتے سے ہوتے ہو چکے۔“ اس نے پھر سے چمت کی طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ اور باتیں کرتے ہوئے ان منہ سے رال کے تار نکلنے لگے۔

شرف نے ٹھنڈی آہ بھری ”کبھی ہم بھی ہری کو نہیں تھے۔ کبھی ہم میں بھی زندگی تھی۔ لیکن زمانے نے وفانہ کی۔ محبت راس نہ آئی۔ لوگ سب کچھ برواشت کر لیتے ہیں لیکن یہ برواشت نہیں کر سکتے کہ دو محبت کرنے والے ملیں۔ زمانے کا رنگ ہی ایسا ہے لیکن۔“ وہ یک دم جلیں میں آگیا۔ ”وہ محبت کو زندگی سے خارج نہیں کر سکتے صرف محبت کرنے والوں کو ایک دوسرے سے الگ کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔ لوگوں کو محبت کرنے سے باز نہیں رکھ سکتے۔ کیوں ایلی ٹھیک ہے نا۔“ شریف نے مسکرا کر ایلی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ”تم بھی ان سے ڈرنا نہیں۔ ان کی پروا نہ کرنا۔ اپنے آپ میں جرأت پیدا کرنا۔ سچائی میں جرات ہوتی ہے

ایلی۔“

”نہ۔“ شہزاد بولی ”اس کا تو ڈر ڈر کر برا حال ہو رہا ہے۔ اس سے دلیری کی امید رکھنا ناممکن ہے۔“ شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔

”کیوں ایلی ٹھیک کہتی ہے یہ تم ڈر جاؤ گے کیا؟“ شریف نے پوچھا۔

”میں میں۔“ ایلی گھبرا گیا۔

”تو دیکھ لو۔“ شہزاد ہنسی۔ ”یہ تو اتنی سی بات پر گھبرا جاتا ہے۔“

شریف نے شہزاد کی بات کو نظر انداز کر دیا۔ ”لیکن یہ بتاؤ ایلی کیا اسے تمہاری پرواہ ہے۔

کیسی ہے وہ۔“

”وہ۔“ ایلی نے دہرایا۔ اور پھر پہلی مرتبہ اس نے جرأت سے کہا ”اتنی رنگین ہے وہ۔“ وہ

معنی خیز نگاہوں سے شہزاد کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

”اتنی رنگین ہے اتنی شوخ ہے اتنی پیاری ہے کہ میں کیا بتاؤں۔“

”لیکن کیا رفتار بھی ہے یا نہیں۔“ شریف نے پوچھا۔

”رفتار — ایلی نے پھر شرارت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور پھر آہ بھر کر بولا

”بیاریوں میں وفا کب ہوتی ہے۔ وہ تو بے نیاز ہے۔ بلند و بالا جو ہوئی۔ وہ بیچاری وفا کیا جانے۔“

”جھوٹ۔“ اتنی وفا ہے اس میں۔“ شہزاد نے مشین چلاتے ہوئے کہا۔ ”کہ کیا بتاؤں۔“

”تم کیسے جانتی ہو اسے“ شریف بولا ”خواہ خواہ۔“

”واہ میں نہیں جانتی تو کون جانتا ہے۔“ وہ قہقہہ مار کر بولی ”وہ تو —

لیکن — ایلی نے گھبرا کر اس کی بات کاٹنے ہوئے کہا۔

واقعی شہزاد سے محبت ہو چکی تھی۔

وہ سلسلہ جو محض ایک تفریحی حرکت سے شروع ہوا تھا ایک عظیم جذبے میں تبدیل ہو چکا تھا۔ یا تو اپنے اس خود ساختہ اعتبار کو جذبات کی بجھی میں ڈال کر ایلے نے اسے اس قدر آگ بکائی تھی کہ وہ واقعی لندن بن چکا تھا۔ اور یا شہزاد کی رنگینی نے اس کے کردار کی عظمت میں شامل ہو کر شہزاد کی کشش کو ہزاروں گنا بڑھا دیا تھا۔ اور اب وہ بچے دل سے اس سے محبت کرنے لگا تھا۔ ہر حال حقیقت چاہے کچھ بھی ہو اس کے دل میں شہزاد کے لیے جذبات کا ایک سندرہ کھول رہا تھا۔

بجھتا پ

جب وہ ارچند کی گلی میں پہنچا تو ارچند سوٹ کیس ہاتھ میں اٹھائے باہر نکل رہا تھا اور اس کی ماں اس کے قریب کھڑی آنسو پونچھ رہی تھی۔

”آگئے تم۔“ ارچند اسے دیکھ کر بولا۔ ”چلو آؤ گئے۔“ وہ حسرت آلود مسکراہٹ سے بولا۔ ”اتنا کرم کیا کم ہے۔ نہ آتے تو اپن کیا کر لیتے تمہارا کیوں ماں۔“ پھر اسے کھانسی کا دوزخہ پڑ گیا۔ اور وہ دیوار سے سارالے کر کھانسنے لگا۔

”آخر تم جاتے ہی کیوں ہو۔“ ارچند کی ماں نے روتے ہوئے کہا۔ ”چھٹی نہیں ملتی تو مجوزہ نوکری کو اسے جان ہے تو جہاں ہے جان ہی نہ ہوئی تو نوکری کو کیا کرتا ہے۔“

”واہ اہ۔“ ارچند نے کہا۔ ”معمولی کھانسی سے اپن گھبرانے والے نہیں۔ اور پھر ماں تمہارے بیٹے ہیں ہم۔ بڑی بڑی تکلیفیں ہمارا کچھ بگاڑ نہ سکیں یہ تو معمولی کھانسی ہے۔ تم تو خواہ تو لاؤ گھبراتی ہو۔“

”گھبراتی نہیں میں۔“ ماں بولی ”مجھے معلوم ہے میں جانتی ہوں۔ میں سب جانتی ہوں مجھے غر آ رہا ہے۔“ یہ کہتے ہوئے وہ پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ ارچند نے بڑھ کر اس کو آغوش میں لے لیا اور یوں تھکنے اور پیار کرنے لگا جیسے وہ چھوٹی سی بچی ہو۔

”دیکھو ماں میں ترقی کرتے کرتے پتہ ہے کیا بنوں گا۔ فیکٹری کا مینجر بنوں گا معلوم ہے اس کی تنخواہ کیا ہوتی ہے ڈیڑھ ہزار۔ یعنی پندرہ سو۔ اعتبار نہ ہو تو یہ دیکھ لو میرا ہاتھ۔“ اس نے اپنا ہاتھ دکھاتے ہوئے ارچند کی ماں کے ہاتھ میں دے دیا۔ ”یہ دیکھو یہ کیر عمر کی کیر ہے یہ۔ اور کرو حساب

ایلے کے لیے وہ سلسلہ گفتگو ناقابل برداشت اور خطرناک ہوتا جا رہا تھا۔ وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ براہ راست محبت کی باتیں کر رہے تھے عہد و پیاں کر رہے تھے اور وہ پردہ جس کے انہوں نے اپنے جذبات کو چھپایا ہوا تھا۔ ہر ساعت باریک سے باریک تر ہوا جا رہا تھا۔ لیکن کانٹے کے بعد وہ گھبرا گیا اسے سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا کہے۔

پھر گھبراہٹ میں اس کے منہ سے نکل گیا۔ ”لیکن مجھ میں کوئی خوبی ہے کہ وہ مجھ سے کرے۔ میری شکل و صورت ملاحظہ ہو۔“

شہزاد ہنس پڑی۔ ”بھئی عورتیں بیوقوف ہوتی ہیں۔“ وہ بولی ”وہ شکل و صورت ہم جانتیں۔ خوبیاں نہیں تلاش کرتیں۔ سمجھ لو پھنس جاتی ہیں اور بس پھنس گئی تو پھر کن کیلا۔ وہ ہنسی اور پھر بولی۔ ”اور پھنس جائیں ایک بار تو پھر یا ہر لکنا پسند نہیں کرتیں۔ عورتوں کا کیا ہے۔“ شہزاد نے آہ بھر کر کہا ”ڈٹ جائیں تو دنیا کا مقابلہ کرنے پر آمادہ ہو جاتی ہیں۔ ہانڈا کر چیر دیتی ہیں اور عاجز ہونے لگیں۔ تو نالی کے کنارے بیٹھ کر رو دیتی ہیں۔“

”بڑی سیانی ہو گئی ہو تم۔“ شریف نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

ایلے کے لیے اس موضوع پر باتیں کرنا بالکل ہی ناممکن ہو گیا۔ اس کا پیانہ ممبر لبر ہوا تھا۔ شہزاد کی ہر بات ہر حرکت واضح طور پر ایلے کے لیے مخصوص ہو چکی تھی۔ اس قدر اٹھان واضح ہو چکے تھے۔ ایلے گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔

”اچھا میں اب چلتا ہوں۔“ وہ بولا ”مجھے ارچند کی طرف جانا ہے وہ آج والہیں جا رہا اس کی چھٹی ختم ہو چکی ہے۔ اسے مل کر واپس آؤں گا۔“

”کب آؤ گے؟“ شریف نے پوچھا۔

”اور اگر نہ آئے۔“ شہزاد بولی ”تو ہم کھانا نہیں کھائیں گے سنا تم نے۔“

سیڑھاں اترتے ہوئے ایلے سوچنے لگا۔ کہ کہاں جائے۔ ارچند نے واقعی اس روز ٹاپ سے جانا تھا۔ اور اس نے ایلے سے تاکید کی تھی کہ اسے ملے۔ لیکن اس وقت اس کے طائفہ عجیب و غریب جذبات چمک رہے تھے۔ شہزاد کی ایک بات جو اس نے اشارتاً اس سے کہی تھی اس کے دل میں طوفان بن کر کھول رہی تھی۔ دل بھرا ہوا تھا۔ جی چاہتا تھا کہ کسی دوسری میں جا کر رو دے۔ کسی کھیت میں اونڈھے منہ پر ذکر بچیں مارے۔ حتیٰ کہ شام ہو جائے اور رات کے اندھیرے میں چپکے سے چارپائی پر پڑ کر شہزاد کے تصور میں اپنا آپ کو دے۔

نے آفرین کے ہاں ہوتا۔

”لیکن تم کیا کہہ رہے ہو۔“ ایلی نے تجاہل عارفانہ سے پوچھا۔

”ہم کچھ نہیں کہہ رہے بیٹا۔“ اس نے اپنے انداز میں کہا ”ہم تمہیں دھندلا دے رہے ہیں تم نے اپنے ترو کی لاج رکھ لی۔ مگر پتر صرف ایک بات کا کھٹکا ہے۔ ستاروں سے کھیلو گے تو

کھلاڑی رہو گے اور آکر سورج کو پالینے کی کوشش کرو گے تو پر جل جائیں گے اور پھراڑنے کی ہمت نہ رہے گی۔ اپنے گرو کے اس قول کو یاد رکھو۔ پتر کھلاڑی بنو۔ پروانہ نہیں اپنے پر نہ

ورنہ کیا

اگرچہ کوکے میں بٹھانے کے بعد ایلی سوچنے لگا۔ اب کیا کروں۔ کہاں جاؤں۔ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ شریف اور شہزاد کی طرف جائے۔ فرحت کے پاس جانا بھی اسے پسند نہ تھا۔ عزت کی محبت بھری باتوں میں طنز کا عنصر شامل ہوتا تھا اور وہ بات بات پر شہزاد کا طعنہ دیتی تھی۔ رضایا مندر کے پاس جانا بے کار تھا۔ وہ بھی گفتگو کی ابتداء شہزاد سے ہی کرتے تھے جب وہ وہاں آ رہا تھا تو راستے میں اسے رضاملا۔

”ایلی۔“ رضائے اسے لکھارا۔ ”دیکھ میری طرف“ جب تک میرا دم میں دم ہے تو چاہے کسی سے محبت لگا اور اگر کوئی تیری طرف نظر بھر کر دیکھے تو بس مجھے بتا دینا سمجھے وہ پاگل لمبا وہی تیرا دوست ہے ابھی کیے میں بٹھایا ہے اگر اس نے کوئی گڑبڑ کی تو اس ہاکی سے اس کی کھوپڑی توڑ دوں گا۔“ اس نے اپنی ننگری ٹانگ کو یوں چلایا جیسے وہ ہاکی سنگ ہو۔ ”سمجھے۔ لیکن یار۔“ وہ اس کے قریب ہو کر بولا۔ ”ایک بار ہمارے سامنے تسلیم تو کر لے کہ تو اسے پیار کرتا ہے۔ بڑی لڑائی ہو گئی تھی مگر ہمارا ہے۔ دوست اپنے کو تو ان باتوں میں دلچسپی نہیں مگر تو نے تو بڑے بڑوں کے بات کئے کر دیئے خدا کی قسم جی چاہتا ہے تجھے جھنڈا بنا کر لہراتا پھروں۔ ہاں تو پھر کیسے رام کر لیا تو نے اسے اور صرف اسے ہی نہیں ساتھ ہی اس کے مالک کو بھی پچھاڑ دیا ہے سالہ بول نہیں سکتا بول۔ بول۔ بول۔ بتا دے اچھا یار نہیں جانتا تو نہ سہی۔“ رضائے ایلی کو خاموش کھڑے کر دیا۔ ”پھر بھی ہم تیرے ساتھ ہیں ہاں۔“ یہ کہہ کر وہ آگے چل پڑا۔

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ مرکز اس ہاکی والے کو پکڑ لے اور اس کے سامنے رو کر سارا حال کہہ

یہاں تک ہوئے چالیس برس یہاں بچپن ختم ہوئے اور یہ اسی سے اوپر کا حصہ ہے پھر نوے تک جیویں یا سو سو تک۔ اور یہ دیکھو یہ ستارہ جو بتا ہے تلیہ والا اس کا مطلب ہے یار بہت بڑا عمد یعنی فیکٹری کا مینجر اور سمجھ لو پچاس کے لگ بھگ ملے گا۔ یہ عمدہ اور تمہارا ابھی سے اپن کے ٹین ہاٹ کا فکر کر رہی ہو۔ بھی حد ہو گئی۔“

مل سے جدا ہو کر اس نے ماتھے سے پسینہ پونچھا اور حسرت زدہ نگاہ سے مٹی کی فرسٹ دیکھا۔ پھر ایلی کی طرف دیکھا۔ یوں چونکا جیسے اس کی موجودگی کو بھول چکا ہو۔ کتنے لگ بھگ کھڑے کھڑے اپنے تو مرنے ورنے سے ڈرتے نہیں۔ بھی آخر کیا ہو گا وہ کہا ہے نا اسٹول سے پڑے کھائیں گے احباب فاتحہ ہو گا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اور جہاں تک اپن کا خیال ہے لکلی یہاں اڑایا وہاں جا بیٹھا۔ یہاں کپ کیپ ہیں اور بکوری، ڈوکوری ہیں اور وہاں حوریں ہوں گی یار انگریزی پر محنت کرنی پڑتی ہے وہاں محنت کیے بغیر سب ملتا ہے۔ اپن کے ایسے نصیب ملک اور ابھی سے حوروں کی دنیا کا پاسپورٹ مل جائے۔ اپن کہاں مرتے ہیں میاں مگر اہل کو جو اپن کی موت کا فکر لگا ہے کہیں اس غم سے نہ مر جائیں ہم ویسے کھانسی تو اپن کا کچھ نہیں بگاڑ سکتے لیکن یار۔“ وہ کچھ وقفے کے بعد بولا۔ ”ایک بات کا افسوس رہ جائے گا۔“

”کس بات کا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ ملال رہ جائے گا کہ تم نے وہاں فیکٹری — میں آ کر اپنی شہنشاہی نہ دیکھی۔ پھر کی گوریاں جب ہاتھ جوڑ کھ اپنے حضور میں کورنش بجالانے کے لئے آتی ہیں کمی اڑنے کے بدلے سلام ہوتے ہیں گھڑا اٹھانے کے بدلے کورنش بجالائی جاتی ہیں ہے کھیل کے بدلے چلیں پیش کی جاتی ہیں اور مبدولت ملاحظہ فرماتے ہیں اور دھندلا دیتے ہیں۔ لیکن فاتحہ؟“ اس نے آہ بھری ”تم نے اگر یہ نظارے اپنی آنکھوں سے نہ دیکھے تو بے کار ہو جی ایک ملال لے جاؤں گا۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو تیر رہے تھے۔

”ملال لے جاؤں گا۔ کیا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔

اگرچہ نے دغمتا ”بینیتر“ بدلا۔ صاف تو ہے۔“ وہ بولا۔ ”مبدولت اس وقت جاری ہیں۔ اور یہ ملال لیے جا رہے ہیں۔ مگر یار تم کیسے آسکتے ہو وہاں تم تو خود مصروف ہو۔ پھر کیا کیا ہاتھ مارا ہے۔ واہ واہ کیا چیز پائی ہے تم نے۔ آخر ہمارے شاگرد ہوئے۔ بیٹا۔ آف کیا چاہے گا چال ہے کیا انداز ہے کیا بات ہے۔ جواب نہیں بڑے بڑے کھلاڑیوں کے دانت کھنکھاتے

نئی پرانی

”اے ہے باجرہ کہاں گئی میں کہتی ہوں راجہ، شزاو تم کہاں ہو۔“ دفعتاً ”مگ سے اس کی بھیلی پر پڑی۔ اسے دیکھ کر وہ پھر چلانے لگی۔“ اے تو یہاں کھڑا ہے ایلہ۔ لڑکے جا جا کر اپنے باپ کو لا۔“ تو اسے شیش پر ملنے نہیں گیا۔ سنا ہے علی احمد آرہا ہے۔“ ایلہ اس کی بات سن کر بوچکا رہ گیا۔ نہ جانے وہ بڑھیا کیا کہہ رہی تھی۔ شاید وہ علی احمد کو قطعی طور پر بھول چکا تھا۔

”میں نے کہاں بات تو سن۔“ وہ شور مچاتا ہوا اس کے پیچھے بھاگا مگر وہ تو آندھ سی کی طرح چلاتی ہوئی جا رہی تھی۔ ابھی ابھی شیش سے آیا ہے کتا ہے میں اپنی آنکھوں سے دیکھ کر آیا ہوں۔ اب کی مرتبہ ایک اور ساتھ ہے۔“

”کون آیا ہے ماں برکتے“ جانو کھڑکی سے چلانے لگی۔

”اے ہے اپنا علی احمد آیا ہے۔“

”ساتھ کون ہے“ جانو نے پوچھا۔

”کہتے ہیں اب کی بار کوئی نئی نویلی ساتھ ہے۔“ برکتے نے شور مچایا۔

”اے بس“ مائی جاہل دوڑی دوڑی چھٹی لگی سے باہر نکلی۔ ”اس کے ساتھ تو ہمیشہ کوئی نہ کوئی ہوتی ہے بس۔ نئی ہو یا پرانی تمیز نہیں بس ساتھ ہو۔“

”ہوں نئی“ بی بی فاطم کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔ ”نہ جانے کہاں سے گلی سڑی ہوئی اٹھا لیا ہے۔ اسے آج تک الم نہیں ہوا کہ نئی کیا ہوتی ہے اور پرانی کیا۔“

”اے ہے اپنی طرف سے تو نئی ہی لاتا ہے۔ پر کیا کرے نصیب ہی میں پرانی لکھی ہیں۔“

ماں جاہل بولی۔

”بہن“ برکتے نے کہا ”مما کہتا ہے اب کے تو حد ہی کر دی علی احمد نے۔“

”کیا کیا ماں برکتے۔ بات بھی تو کرنا ماں۔ وہ تو ہر مرتبہ ہی حد کرتا ہے۔“ چاروں طرف شور مچا گیا۔

”پر لڑکی کیا بتاؤں میں۔“ ماں برکتے نے ہاتھ مل کر کہا۔ ”اب کی مرتبہ جسے لایا ہے اس کی گود میں بچہ ہے۔ ماں بچہ۔ لو کر لو بات۔“

”ہائیں بچہ کیا کہاں۔ بچہ گود میں ہے۔“ چاروں طرف سے قہقہے بلند ہوئے۔

سنائے، اس کا جی چاہتا تھا کہ دل کی بات چیخ چیخ کر لوگوں کو سنائے اور اس طرح دل کا بوجھ لے۔ مگر جب بھی وہ بات کہہ دینے کا ارادہ کرتا تو چمن سے شزاو اس کے سامنے آکر کھڑی ہوتی۔ ”اے ایلہ چلاتا“ میں کسی سے نہ کہوں گا میں تم سے بے وفائی نہ کروں گا میں تمہارا نہیں کروں گا۔“ اور ایلہ کے دل کا بوجھ اور بھی بڑھ جاتا۔

”ایک نا ایک روز تم ضرور بتاؤ گے۔“ شزاو آنسو بھری آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتا۔ ”تم اپنے دوستوں سے بات کیے بغیر نہیں رہ سکو گے۔ اچھا تمہاری خوشی۔ میری بدنامی۔“ خوش ہو تو ایسا ہی سہی۔ ”شزاو کی یہ کیفیت دیکھ کر وہ بھاگتا اس ہلکی دالے سے دور بازار سے دور اور دور۔ کہیں وہ کسی سے کہہ نہ دے کہیں اس کے دل کی بات زبان پر نہ آئے۔ جب وہ شزاو کے پاس پہنچا تو وہ مسکرا رہی تھی عین اسی طرح جس طرح بازار میں اس کے سامنے اس کے سامنے آکر مسکرانے لگی تھی۔ ”وہ کہاں ہے؟“ ایلہ نے پوچھا۔

شزاو نے منہ بتایا اور اوپر کی طرف اشارہ کیا۔ ”کہاں بھاگ گئے تھے تم۔“ وہ بولی۔

”کہاں جاؤں گا۔ جاسکتا ہوں کیا؟“

وہ از سر نو مسکرانے لگی۔ ”بھاگ جاؤ۔“ وہ ہنستے ہوئی چلائی ”دور۔ بہت دور۔ ورنہ۔“

”ورنہ کیا۔“ ایلہ نے پوچھا۔

”ورنہ۔“ شزاو نے اپنے سڈول بازو اس کی طرف بڑھا کر اسے تھام لیا ”ورنہ تم بھاگ جاؤ گے۔ قید کر لیے جاؤ گے۔“ اس کے بال اڑ کر ایلہ کے منہ پر آ پڑے دم رک گیا۔

تالی پیٹ کر بولی۔ ”بات کرنے سے بھی گئے بولو۔ بولتے نہیں۔“ ایلہ کی آنکھیں گھبراہٹ سے

اس نے شزاو کو اپنی گرفت میں لیتا چاہا مگر وہ بازو چمڑا کر بھاگ گئی۔ ”اونسو۔“ وہ اسے

دار پیچھے بھاگتے ہوئے دیکھ کر بولی ”وہ اوپر ہیں اگر۔“ پھر کھڑکی پر کھڑی ہو کر باہر

باتیں کرنے میں یوں مشغول ہو گئی جیسے آن کی آن میں ایلہ کے وجود کو تعقل طور پر

ہو جیسے احساس ہی نہ ہو کہ قریب ہی ایلہ اگڑائیاں لے لے کر اپنی ہڈیاں توڑ رہا ہے۔ سرخ ہو کر ایلہ جا رہی ہیں۔

ابھی وہ کھڑا سوچ ہی رہا تھا کہ شریف کے پاس جائے یا نہ جائے۔ کہ محلے کی ایک

عورت نیچے شور مچاتی ہوئی بولی۔

”چلو یہ بھی اچھا ہوا۔ آج تک بچے والی نہ آئی تھی۔“

”ابھی تو دیکھو بہن۔ وہ کشمیر کا سیب ایک سال تک نہ چل سکا تو یہ بیچاری کب تک چلے گی۔“

”میں نے کہا ماں برکتے۔“ شہزاد کھڑکی میں آکر چیخنے لگی۔ ”کیا واقعی بچے والی لایا ہے؟“

احمد یا مذاق کر رہی ہو۔“

”لو میں کیا تم سے بچاک کروں گی۔“ ماں برکتے بولی۔ ”اے ہے حملہ نے بتایا ہے۔“

”اے لو۔“ بی بی نقو بولی۔ ”قافلہ تو ابھی پہنچا“ اس نے کچی حویلی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

لے اب اپنی آنکھوں سے دیکھ لے لڑکی۔“ ماں حاجاں شہزاد سے کہنے لگی۔ ”سراغ کوبا آج ابھی دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو جائے گا۔“

حاجاں نے ابھی بات ختم نہ کی تھی کہ علی احمد سینہ تانے چوگان میں داخل ہوئے۔

”علی احمد مبارک ہو۔“ ایک بولی۔

”میں نے کہا باقی قافلہ کہاں ہے تیرا۔“

”اے چچی پر آیا ہے کیا۔ اچھا کیا جو آگیا۔ تیرے بغیر یہاں رونق نہیں ہوتی۔“

”اے علی احمد اب کی بار سنا ہے نئی لایا ہے تو۔“

علی احمد چوگان میں ہیرو کی طرح کھڑے مسکرا رہے تھے جیسے ہیروئین کو دیو کے چنگل سے چھڑا کر لائے ہوں۔

”لو ماں“ وہ بولے ”کون کتنا ہے نئی ہے ماں ہم تو پرانی کے بیچاری ہیں وہ کہتے ہیں ناؤ دن پرانی سودن اور اگر اکیلا آتا تو سواگت کے لئے تم سب یہاں نہ ہوتیں۔ کسی کو پتہ نہ چلا کہ میں آیا ہوں۔“

”اے ہے لڑکے“ حاجاں مائی بولی ”تو کیا ہمیں پتہ دینے کے لئے لاتا ہے تو۔“

”اور تو کیا اپنے لئے لاتا ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کے بولے ”تم بھی کتنی بھولی ہو بی بی نقو۔“

شوق و مدت سے ختم ہو چکا اب تو محلے کی نفری بڑھانے کے لئے لے آتا ہوں۔“

”جسبی اب کے بچے والی لایا ہے“ جانو کھڑکی سے چیخنے لگی۔

”اور کیا جانو“ علی احمد ہنسے۔ ”تو تو آپ سیانی ہے۔“

”علی احمد“ مائی حاجاں کہنے لگی ”تجھے کوئی لڑکی نہیں ملتی کیا۔“

”لڑکی“ علی احمد ہنسے ”لڑکی کو کیا کرتا ہے مائی حاجاں کام کی وہ ہوتی ہے جو تجربہ کار ہو۔“

”علی احمد“ نقو بی بی نے ہنستے ہوئے کہا ”کام کی تو تو لایا نہیں کبھی۔ کباڑ خانہ ہی اکٹھا کر

رکھا ہے۔ لے ماں برکتے ایمان سے کہنا دیکھنے میں ہے کوئی کام کی۔“

”سو ن لو بی بی کی بات“ علی احمد ہنسے۔ ”میں کیا دیکھنے کے لئے لاتا ہوں بی بی میں کیا بچہ

ہوں کہ دیکھ کر کر بیچ جاؤں وہ دن گئے بی بی۔ اور ہاتھی دانت لانے کا فائدہ۔ تمہاری آنکھیں چکا

چند ہو جائیں تو اپنا کیا فائدہ ہوا اس میں۔ کیوں بی بی۔“ وہ چوگان میں کھڑے ہو کر ہیرو کی طرح

ہنسنے لگے۔

”ہائے علی احمد“ ایک نے ہونٹوں پر انگلی رکھ رکھ کر کہا۔

”تو ہے علی احمد“ دوسری ہنستے ہوئے چلائی۔

”کچھ شرم کیا کیا بات کرتے ہوئے۔“ تیسری قہقہہ مار کر بولی۔ چوگان ان کے قہقہوں سے

گونجنے لگا۔ اور علی احمد فاتح کی حیثیت سے گھر کی طرف چل پڑے جیسے سٹیج پر ایک خوب

صورت جملہ کہہ کر ایکڑ باہر نکل جاتا ہے۔ اور تماشائی تالیاں پیٹتے رہ جاتے ہیں۔

علی احمد کے پیچھے پیچھے وہی پرانی راجو نیا برقعہ لئے آ رہی تھی گود میں دو سال کا بچہ تھا اور وہ

بال بال رہی تھی جیسے مشکل سے اپنے آپ کو گھسیٹ رہی ہو۔

”اے ہے“ ماں برکتے بولی۔ ”ہم سے بھی پردہ ہے کیا۔ لڑکی برقعہ تو اٹھا لے۔“

”ماں ہمیں سے تو پردہ ہے۔“ نقو بی بی نے کہا۔ ”یہ نیا زمانہ ہے اپنوں سے پردہ غیروں

سے۔ تم جانتی ہی ہو ماں۔“

جانو بولی۔ ”اے بی بی ڈرتی ہے کہیں نظرنہ لگ جائے ہماری۔“

اس کے پیچھے پیچھے تانگے والے کے ہاتھ میں سلمان تھا اور آخر میں شمیم ایک لڑکی اٹھائے

اور دوسری کو انگلی لگائے آ رہی تھی۔

شمیم کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ بھوسیں تنی ہوئی تھیں اور آنکھ کا فرق بے حد نمایاں

ہو رہا تھا اس نے محلے والیوں کو دیکھتے ہی پیشنا شروع کر دیا۔

”اے ماں برکتے دیکھ لے میرے تو نصیب ہی پھوٹ گئے۔ میری طرف کیا دیکھ رہی ہو میں

تو بالہ بن کر رہ گئی ہوں اپنے ہی گھر میں۔“

”اے تم کیوں دلالہ بنو۔“ تم تو اللہ کے فضل و کرم سے سروں سے بیانی ہوئی ہو اور
فصلی بیروں کا کیا ہے یہ تو آتی جاتی رہتی ہیں۔“

”نہ ماں یہ نہ کو اس کھیت میں تو خالی فصلی بیڑے ہی پلتے ہیں۔“ شمیم بولی ”میل ڈال
جانے والیاں ہی چلتی ہیں۔ تم اس گھر کو کیا جانو۔“

”غم نہ کرو“ بی بی نقو نے کہا ”یہ دور بھی گزر جائے گا۔“

”یہ چاہے گزر جائے۔ اپنا دور نہیں آئے گا یہاں ہاں۔“ وہ بولی۔ ”لکھ لو میری بات ہاں
تو سوکنیں ہی آئیں گی۔ اپنے نصیب میں سکھ نہیں۔“

”اب تو ایللی پر بھی سوکن آگئی“ شہزاد اپنی کھڑکی سے چلائی۔

اے ہے ایللی پر کیوں سوکن آنے لگی۔“ ماں برکتے نے کہا۔

”اب تو ایک ننھا ایللی بھی آگیا۔“ وہ ہنسی۔

”لو یہ بھی کوئی بات ہے۔“ بی بی نقو نے کہا۔ ”نہ بہن، ایللی ایللی ہی ہے۔ جو مریا
ہے وہ کسی اور کا نہیں ہو سکتا میں توچ کموں گی۔“

”نہ جانے ایللی جو ان ہو کر کیا گل کھلائے گا۔“ برکتے نے کہا۔

”آخر بیٹا کس کا ہے۔“ حاجاں بولی۔

”وہ کہتے ہیں نا۔“ ننھو چلائی۔ ”ہو نہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ ابھی تو لڑکے نے ابتدائی
ہے۔ کیوں شہزاد ٹھیک کتتی ہوں نا میں۔“ ننھو نے اسے طعنہ دیا۔

”تو جو کتتی ہے بی بی تو ٹھیک ہی کتتی ہو گی۔“ شہزاد بولی۔ ”تجھ سے بدھ کر تجرے کے
ان باتوں کا۔“

یہ سن کر چوگان میں قہقہہ گونجا۔ ”تو نہ اس سے نپٹ سکے گی۔“ ماں حاجاں نے کہا
مائی برکتے کہنے لگی ”نہ مائی اس سے کون بٹے ایسی چیج کہ قہنجی کی طرح چلتی ہے۔“

”پر ماں“ ایک نے مدہم آواز سے سرگوشی کی ”بری نہیں محبت سے ملتی ہے کھاتو وہ کھا
ہے۔ بیچاری بڑی اچھی ہے۔ بس صرف یہی اللہ مارا اک شوق ہے۔“

ماں حاجاں قریب تر ہو گئی ”ہو گا شاید تم ٹھیک کتتی ہو لیکن جی بات تو یہ ہے کہ
والے بھی تو جینے نہیں دیتے۔“

”اے ہے“ بی بی نے کہا ”مجھے کیوں دیتے ہیں جینے۔“

ہے ہمت

محلے والیوں کی باتیں سن کر ایللی کو غصہ آ رہا تھا۔ وہ شہزاد کے خلاف بات کرنے سے بھی نہ
چمکتی تھی حالانکہ شہزاد کے تعلقات محلے والیوں سے بے حد اچھے تھے وہ انکی عزت کیا کرتی تھی
اور ان سب کی حد سے زیادہ خاطر و مدارت کیا کرتی۔ کسی نہ کسی بہانے وہ انہیں گھر بلا لیتی۔
جوت موٹ مشورہ لینے کے لئے یا کوئی دوا دارو پوچھنے کے لئے یا کوئی اور بات نہ سوچتی تو کتتی
”ہاں ہاں تو ذرا مجھے بتا کہ مٹھی سویاں کیسے پکاتے ہیں۔ ہائے مجھ سے تو ہر بار خراب ہو جاتی ہیں
اصل میں مجھے یہ نہیں معلوم کہ میٹھا کتنا ہونا چاہئے اور سویاں کتنی۔“ گھر لے جا کر وہ جانو سے
کتی ”لے جانو ذرا لا تو ایک پلیٹ ماں کے لئے۔“ اور پھر ماں سے مخاطب ہو کر کتتی ”دیکھ تو کھا
کے اسے تاکہ معلوم ہو کیا خرابی ہے۔ نہ جانے کیا نقص رہ جاتا ہے۔“

حالانکہ شہزاد پکانے میں بے حد ماہر تھی۔ اور پکانے کے معاملے میں محلے والیاں تو بالکل
بھلی تھیں۔ جب میاں ہی کھانے کے شوقین نہ ہوں تو بیویاں بھلا کیسے اچھا پکا سکتی ہیں۔ لیکن
اس کے باوجود شہزاد نے کبھی اپنی چیز کی تعریف نہ کی تھی۔ ایللی نے محسوس کیا کہ شہزاد کی بڑھتی
ہوئی بدنامی کا ذمہ دار وہ خود ہے۔ اس کے شہزاد کے ہاں رہنے کی وجہ سے سب اس سے بدظن
ہو چکے ہیں۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ شہزاد کا رنگ انوکھا تھا۔ اس میں عجیب سا بانجھن تھا ایک شوخی
فی رعینہ تھی اس لئے وہ محلے میں آتے ہی محلے والیوں کی نگاہ پر چڑھ گئی تھی۔ لیکن
اس کی اس خصوصیت نے بدظنی کی فضا پیدا کی تھی۔ بدنامی کی نہیں اور اب ایللی کی وجہ سے وہ
بدظن ہوئی جارہی تھی۔

اس خیال سے ایللی نے محسوس کیا کہ وہ مجرم ہے۔ اور اپنے جرم کی شدت کو کم کرنے کے
لئے چپ چاپ اوپر چوہارے کی طرف چل پڑا۔

”آگئے تم“ شریف اس کی طرف دیکھ کر بولا ”ہم تو کب سے انتظار کر رہے تھے۔“

”نہ کھڑا علی احمد کو کوئی نہیں پوچھتا محلے میں یہ جتنے جلوس چاہے نکالے جسے چاہے لے
اُسے ہاتھ بڑا بھارت۔“ شریف نے آہ بھری ”ہمیں تو ظالموں نے کچھ بھی نہ کرنے دیا۔“

”جس میں جرأت ہو اسے کوئی نہیں پوچھتا۔“ شنراو بولی اور اس نے ایک جڑوا
نگاہ ایللی پر ڈالی۔ ”کیوں ایللی“ وہ بولی ”ٹھیک ہے نا۔“
”مجھے کیا معلوم۔“ ایللی نے جواب دیا۔

تو پھر تمہارا حشر بھی ایسے ہی ہو گا جیسا ان کا ہوا ہے۔“ شنراو نے شریف کی طرف
کرتے ہوئے کہا۔

”سچ کہتی ہو تم“ شریف نے آہ بھری ”وہ اصل وہی ڈرتے ہیں جن کی میت بکائی
ہو۔“

ہونہ سچی اور پاکیزہ“ شنراو نے کہا۔ ”بزدلی کو سچائی کے پردے میں چھپایا نہیں جا سکتا
”اب یہ نئی کون ہے“ جیسے علی احمد نے تو اپنے گھر کباڑی کی دوکان کھولی ہوئی ہے
کہاں سے لائے گا۔ وہ کشمیر والی نئی لایا تھا بالکل بے کار پھولی ہوئی روٹی کی طرح۔ وہ
پچک کر رہ گئی۔“

”میرے خیال میں“ ایللی بولا ”وہی راجو ہے دولت پور والی۔ دولت پور میں اسے
تھے۔“

”پٹاخہ“ شنراو ہنسی۔ ”چلا ہوا نا۔“
”کون ہے وہ۔“ شریف نے پوچھا۔
”نام ہی سے پتہ چل رہا ہے۔ پوچھنے کی ضرورت باقی ہے کیا۔“ شنراو نے کہا۔
تمہاری نگاہ میں تو کوئی جتنی ہی نہیں۔“ شریف مسکرا کر بولا۔ ”سوائے اپنے والا
نگاہیں جو تک کی طرح شنراو پر گاڑ دیں۔“

”جھوٹ ہے کیا“ وہ قہقہہ مار کر بولی۔ ”میری برابری کون کر سکتا ہے۔ اور بھرا
جہاں سب کاٹھ کباڑ بھرا ہے۔ کیوں ایللی کیا یہ جھوٹ ہے“ وہ ایللی کی طرف دیکھ کر شہ
مسکرائی۔

کھانا کھا کر ایللی علی احمد سے ملنے کے بدلے وہاں سے چلا آیا۔ نہ جانے کیوں
موجودگی میں وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا تھا حالانکہ شریف کی موجودگی میں شنراو کا افسانہ
جاتا تھا وہ ہر بات پر کوئی نہ کوئی اشارہ کرتی۔ کبھی ہاتھ بڑھا دیتی جیسے کہہ رہی ہو اگرچہ
پکڑ لو۔ کبھی اپنا بلوری پاؤں ننگا کر کے دکھاتی اور کبھی یوں بازو پھیلا دیتی جیسے اسے

بلنے کے لئے بے تاب ہے۔

شاید انہی اشارات کی وجہ سے اس کے صبر کا پیمانہ چھلک جاتا اور وہ وہاں سے اٹھ کر چلے
بلنے پر مجبور ہو جاتا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ وہ شریف کی موجودگی میں بار بار محسوس کرتا تھا
کہ وہ مل کر اسے دھوکا دے رہے تھے اور احساس جرم اس قدر شدید ہو جاتا تھا کہ اس کے لئے
وہاں بیٹھنا مشکل ہو جاتا۔

ابلے کی راجپوتی

جب وہ گھر پہنچا تو علی احمد قہقہہ پر قہقہہ لگا رہے تھے ”دیکھو تاسیدہ“ وہ کہہ رہے تھے ”پہلے
میں آئی تھی راجو پر پہلے تو وہ غسیم کی مسمان تھی نا پرانی سیلیاں ہیں یہ دونوں۔“
”ہونہ“ غسیم چلائی ”جان نہ پہچان خالہ جی سلام۔“
علی احمد نے غسیم کی بات گویا سنی ہی نہیں۔ ”اور اب اب تو ہمیں بن گئی ہیں۔“
”ہونہ بن“ غسیم چلائی۔

”تو اس کی باتیں نہ سن“ علی احمد نے ہنس کر غسیم کی بات کاٹ دی ”ایسے مذاق یہ راجو
سے کیا ہی کرتی ہے بے تکلفی جو ہوئی۔ میں نے سوچا کہ اگر یہ دونوں ہمیں بنی ہوئی ہیں تو
انہیں اکٹھا کر دو سو میں نے راجو سے نکاح پڑھوا لیا۔ پوچھ لو غسیم سے غلط بات نہیں کہہ رہا
میں“ اور پھر اس کے کہ غسیم کوئی بات کرے وہ معا“ ایللی کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”ہائیں ایللی
تم بھل۔“ پھر خود ہی بولے ”اور ٹھیک تو ہے تو تو اب امتحان سے فارغ ہو چکا ہو گا۔ لیکن تم
نے اپنی اہلی کو سلام نہیں کیا۔ تو تو اچھی طرح واقف ہے راجو سے۔ ان کی بڑی دوستی ہے ایک
دوسرے سے جب یہ دولت پور میں تھا تو آکر زبجایا کرتا تھا راجو کے ہاں“ وہ ہنسنے لگے۔ ”راجو ساہو
تو بھی سے واقف ہے ایللی“ لیکن کو بھی بانٹتا ہے کیوں ایللی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”اور ایللی تو بہت
خوش ہو گا مفت کا ایک بھائی مل گیا ہے اسے۔ تم نے شیرد کو نہیں دیکھا ایللی آ۔ مجھے شیرد سے
لامک۔ لا بھئی راجو لانا شیرد کو۔ جاؤ بھی تم دونوں کھیلو چوگان میں لے جاؤ اسے ایللی سیر کرالا
زار۔“

ایللی کو چپ چاپ کھڑے دیکھ کر وہ حمیدہ رشیدہ کو بلانے لگے۔ ”لو بھی تم لے جاؤ اسے ایللی
تو شہنا ہے شہنا تو ہوا۔ کبھی چھوٹا بچہ اٹھایا بھی ہو۔“

”تو اندر جا کر کیا کرے گی بی بی نھو۔“ سیدہ بولی ”تو بھی کیا اجلے کی راجہوتی ہے۔“
جائے گی۔“

لیکن یہ جس معاملے میں اب پھنسے ہو تم یہ ہمیں پسند نہیں۔ اول تو وہ بچوں والی ہے اس کا میں تمہارا دوست ہے اور — پھر چلو یہ بھی مانے لیتے ہیں لیکن بشرطیکہ تم

اپنے منہ سے کہ دو اپنی زبان سے مانو اور کبھی مجبور ہوں پھنس گیا ہوں۔ پھر ہمارا تیار ہوں گے ایسے نہیں۔ چالاکی سے کام نہیں چلے گا ایل۔ ہمارے ساتھ جس نے گیا سالہ منہ کے بل گرا۔

”یہ تم کیا بک رہے ہو۔“ ایل نے منہ پکا کر کے کہا۔

”تمہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ کون بک رہا ہے۔“ رضا بولا ”سارے غم میں“

ہوا ہے ہر جگہ یہی بات ہو رہی ہے۔“

”کون سی بات؟“ ایل نے پوچھا۔

”تم جو سارا سارا دن اور آدھی آدھی رات تک اس کے گھر میں گھسے رہتے ہو۔“

لیے وہاں چائے بنتی ہے۔ کھانے پکتنے ہیں مٹھائیاں خریدی جاتی ہیں۔ لوگ اندر سے نہیں علی پور میں بات چیتی نہیں۔ یہ محلے والیاں تو تیر پچانتی ہیں۔“

”تمہیں مجھ پر یقین نہیں کیا۔“ ایل نے غصے میں کہا۔ ”اچھے دوست ہو تم مجھے۔“

”مجھے ہو مگر یقین نہیں کرتے میری بات پر۔“

”ایمان سے کہتا ہوں میرا دل گواہی دے رہا ہے کہ تم مجھ سے بات چہا رہے ہو۔“

چھپا مجھ سے نہ چھپا۔ ظالم اس کا نتیجہ اچھا نہیں ہو گا۔ تجھے یار نہ کہا ہوتا تو اب تک اگلا ہوتی میں نے۔“

”رضا۔“ ایل آنکھوں میں آنسو چھلکا کر بولا ”میں نے تم سے کبھی جھوٹ نہیں“

سے میں جھوٹ نہیں بول سکتا۔“

رضا کے انداز کی درشتی یک قلم مفقود ہو گئی۔ ”دیکھ ایل۔“ وہ بولا ”میں تیرا دوست“

بول کیا چاہتا ہے تو چاہے جائز ہوتا جائز ہو۔ روپیہ چاہئے تو مجھ سے لے چاہے چوری کر لے“

لیکن تیرے سامنے ڈھیر کر دوں گا۔ کسی سے دشمنی ہے تو بلا خوف کہ دے۔ اسے ایک لاکھ

سنگ نہ دلا دوں تو میرا ذمہ۔ کسی سے محبت ہو گئی ہے تجھے تو بتا۔ کیسے نہیں ماننے کی“

جان ہے جو ہمارے یار کی بات رد کرے جینا مشکل کر دوں گا۔ اور نہ ماننے کی تو

طریقے بھی ہیں۔ تو کسی طرح خوش رہ اپنا تو صرف یہی ایک مقصد ہے کہ تجھے تکلیف نہ ہو۔“

رضا کی آنکھیں بھر آئیں۔ اس کے چہرے پر حسرت جھلک رہی تھی ”مجھے معلوم تھا“

وہ بولا ”میں نے کبھی کسی دوست کے لیے اتنی محبت محسوس نہیں کی۔ پتہ نہیں تم کو“

فریادیں ہیں۔ تمہارا خیال کیوں رہتا ہے مجھے۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

ایل کے دل میں اک بھیڑ لگ گئی۔ رضا کے اظہار محبت پر اسے شدت سے احساس ہو رہا

فکرو اس کے سامنے جھوٹ بول رہا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ رضا کے گلے لگ کر رو پڑے

لیے ماری بات بتا دے لیکن جب وہ بات کرنے کے لیے منہ کھولتا تو شہزاد سامنے آکھڑی

پڑتا۔ مجھے بدنام نہ کرنا ایل۔ کھلونا بنا کر مجھ سے کھیلتا نہیں۔ اس وقت شہزاد کی تمام تر رنگینی

اور شفی غم و حسرت میں بدل جاتی اور ایل بات کتے کتے رک جاتا۔ نہیں میں تمہیں بدنام نہیں

کرنا لگ تم کھلونا نہیں ہو شہزاد تم تو رانی ہو ملکہ ہو۔ تم سے بھلا کون کھیل سکتا ہے لیکن اس

کے بدبودار ایل محسوس کر رہا تھا کہ وہ مجرم ہے جو اپنے عزیز دوست رضا کو دھوکا دے رہا ہے۔

ہمارا بی یا مہترانی

در تک وہ دونوں خاموشی سے کئی کئی میٹھی روٹی کھاتے رہے پھر دفعتاً ”ساتھ والے مکان

سے شہزاد کی حسین آواز یوں گونجی جیسے کوئی کونسل ٹان اڑا رہی ہو۔ اس آواز کو سن کر ایل

ایک پراس کے جسم پر روٹنے کھڑے ہو گئے۔“

”ہاں دی تو ہے“ رضا ہنسنے لگا۔ ”اس کی آواز سن کر تمہاری کیا حالت ہو جاتی ہے۔“

”کیا حالت ہو جاتی ہے؟“ ایل نے پوچھا۔

”اب میں تمہیں کیا بتاؤں۔“ وہ بولا ”سنو سنو فضول باتیں نہ کرو۔“

شہزاد کا قہقہہ پھر سنائی دیا۔ اس کے ساتھ بھدی سی آواز میں کوئی ہنس رہا تھا۔

”اس محلے کے جوہڑ میں یہ اکیلی ایک ہی راج ہنس ہے۔ چلتی ہے تو جیسے پانی کی لہرائی رہی

ہو جاتی ہے تو جیسے کونسل کوک رہی ہو۔ بات کرتی ہے تو منہ سے پھول جھرتے ہیں۔ مگر ایل“

رضا بولا ”میرا دل کہتا ہے یا تو یہ مہترانی ہے اور یا — یا مہترانی۔“

”کیا مطلب؟“ ایل نے پوچھا۔

”جس کی تو بہت ہی اونچی چیز ہے اور یا بچ ہے بے حد بچ۔ یا تو واقعی پرستش کے لائق ہے۔“

اور یا۔“

”میرا دوسرے چوتھے روز یہ اس گھر میں آتی ہے جہاں اس وقت ہنس رہی ہے۔ رضا نے

مطلوبہ کام جاری رکھا اور غفور یا ظفر کے ساتھ وہ وہ مذاق کرتی ہے وہ قہقہے لگاتی ہے اور پھر یا

خیرلو کا غفور سے ملنا ایلی کو قطعی طور پر ناپسند تھا لیکن شریف کی سگی ہمشیرہ غفور کے بھائی
ہے۔ اللہ کرے رانی ہی ثابت ہو ورنہ تمہاری خیر نہیں۔“

”ہونہ“ شہزاد کی آواز سنائی دی۔ ”ان کا کیا ہے وہ تو کیو ترکی طرح آنکھیں ہونکھ
نے منہ میں دبا کر بیٹھ رہتے ہیں۔ وہ کہاں آتے جاتے ہیں۔ ان کا یہاں چھٹی پر اتار دینا
ہے۔“ وہ تہقہ مار کر ہنسنے لگی۔

”سن لیا“ رضا بولا ”وہ گدھ کہاں اس لائق تھا کہ اسے مورنی مل جائے۔ ہے واقعی
لیکن تمہیں کیا۔ تم مجھ سے جھوٹ تو بولتے ہی نہیں۔“

رضا کے گھر سے نکل کر وہ چپ چاپ فرحت کی طرف چلا آیا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ
کر چارپائی پر لیٹ جائے۔ رضا کی بات اس کے دل میں کلنے کی طرح چبھ گئی تھی۔ اور
باتوں اور قہقہے نے ان شہت کو ہوا دی تھی شہزاد کے رویے اور رضا کی باتوں کی وجہ سے۔
کے دل میں شکوک پیدا ہو رہے تھے۔

ایلی کو غفور سے خدا واسطے کی نفرت تھی۔ اسے انکے سارے خاندان سے نفرت تھی۔
کے چار بھائی تھے۔ ان کا تمام ترکہ مکے والوں سے الگ تھلک رہا کرتا تھا۔ ان کی روایات
مختلف تھیں۔ وہ مکے کے آصفیوں سے زیادہ تعلقات نہیں رکھتے تھے چونکہ ان کے والدین
آکر وہاں مقیم ہوئے تھے البتہ ان کی والدہ مکے ہی کی لڑکی تھی جو رشتے میں ایلی کی دینی کا
تھی۔

غفور ایلی سے عمر میں چار ایک سال بڑا تھا۔ غفور کو دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے
گوشت کا لوتھڑا ہو۔ اس کی شخصیت میں جسم کا عنصر بے حد غالب تھا۔ نگاہوں سے غمناک
تھا جیسے وہ روح کی روشنی سے محروم ہو۔ جب وہ کھجاتا تھا تو اس کی آنکھوں میں گرنا ہلک
دکھائی دیتی تھی اور وہ اکثر نامناسب مقامات پر کھجایا کرتا تھا۔

اس کے علاوہ اس کی نگاہیں تندی سے بھری ہوتی تھیں۔ بات کرنا تو اس میں جلد
عنصر جھلکا ایلی کی غفور سے نفرت کی ایک وجہ یہ بھی تھی کہ ایلی میں کسری کا احساس تھا اور
روبیہ جھوٹی عظمت اور زعم کا حامل تھا تمام بھائیوں میں صرف غفور کی شخصیت میں
بھائی الگ رہنے کے باوجود شوکت نفس سے بھرے ہوئے نہیں تھے۔ وہ سب غفور
تلاں تھے۔ اور بوڑھا باپ تو اس کی وجہ سے سراسر زچ تھا۔

شہزاد کی باتیں سننے کے بعد اس کے لیے رضا کے پاس بیٹھے رہنا ناممکن ہو گیا اور وہ اٹھ
ہاگ اسے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ اسے کہاں جانا ہے۔ جانے کے لیے کوئی جگہ بھی تو نہ
تھی۔ علی احمد کے گھر میں نین کا سپاہی ربڑ کی گڑیا سے کھیلنے میں مصروف تھا باہر شمیم آنسو بہا
رہی تھی۔ ہاڑہ چپکے سے کونے میں کھڑی تھی جیسے اس گھر کے تمام افراد کی زر خرید غلام ہو۔
بدو چپ چاپ جائے نماز پر بیٹھی تھی۔ وہ یا تو نماز پڑھتی اور یا گھٹنوں میں سر دے کر آلو چھیلنے
میں مصروف رہتی۔ بڑے سے بڑا ہنگامہ بھی اس پر کوئی اثر نہ رکھتا تھا جیسے آندھی میں کوئی چھوٹا
ماپوہا جھک کر زمین پر لیٹ جاتا ہے چمٹ جاتا ہے حتیٰ کہ آندھی کا زور کم ہو جاتا اور وہ پھر
بروہا کھڑا ہو جاتا ہے۔ سیدہ کو دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتا تھا جیسے کسی بہت زور دار آندھی نے
اسے پیش کے لیے ہموار کر دیا ہو اور اب یہ چھوٹے چھوٹے ہنگامے اس کے لیے بے معنی ہو
چکے ہوں۔

علی احمد کے گھر میں وہی ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو ایلی کے لیے جاذب توجہ تھا۔ وہ کمرہ جس
میں داوی الہاں رہا کرتی تھی۔ داوی الہاں کی موت کے بعد وہ کمرہ اجوں کا توں پڑا تھا۔ اس میں کوئی
تہہ نہ رہا تھا۔ تخت ویسے ہی کونے میں بچھا ہوا تھا جہاں وہ نماز پڑھا کرتی تھی اور اس
کے پس منہ وہ کھوکھا تھا جس میں وہ ایلی کا گیند یا دوسری چیزیں سنبھال کر رکھا کرتی تھی۔
اور ایلی اسی طرح پائے ستون پر لگی ہوئی تھیں جن کے نیچے مٹی کے برتنوں کی قطاریں تھیں
اور انہیں چھوٹے صندوق رکھے ہوئے تھے۔

ان چیزوں کو دیکھ کر ایللی کا دل بھر آتا تھا اس کمرے میں جانا ایللی کے لیے تکلیف فرحت کا گھر تھا۔ وہاں فرحت کے علاوہ اجمل کے والد فیروز مقیم تھے۔ نیچے فرحت اور اجمل تھیں اوپر چوبارے میں فیروز رہا کرتے تھے۔ فیروز کو وقت پر نہانے وقت پر چائے پینے کا اور وقت پر سیر کرنے کے علاوہ کوئی کام نہ تھا۔ ان مقررہ کاموں کے علاوہ یا تو وہ سارا دن پر پڑے رہتے اور یا ریل اور نجوم کی جتنیوں کا مطالعہ کیا کرتے۔ نیچے فرحت بھی کام دھونے یا سینے یا کھانا پکانا میں مصروف رہا کرتی تھی۔ ایللی کے لیے وہاں بیٹھنا بے حد مشکل اول تو وہ کمرے بے حد اداس تھے۔ دوسرے فرحت جوش محبت کی وجہ سے ہر بات میں ایللی بھلائی اور بہتری کا تذکرہ کرنے کی عادی تھی۔ اور ایللی کی بھلائی اور بہتری کے متعلق فرحت خیالات سے ایللی کو قطعی طور پر اتفاق نہ تھا۔ فرحت ایللی کی لا تعلقی کو محسوس کر کے شہزادہ چھیڑ دیتی تھی اور طنز میں فرحت کا جواب نہ تھا۔

محلے میں وہ کسی کے ہاں جانے کا عادی نہ تھا۔ اسے دوسروں کے گھر میں جاتے ہو وحشت ہوتی تھی محلے والیاں اگرچہ بڑی محبت اور ہمدردی سے اسے ملا کرتی تھیں۔ لیکن ہمدردی میں ترس کا عنصر شامل ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ فطری طور پر وہ لوگوں کی نگاہوں سے اُکرتا تھا۔ چاہے ان میں ہمدردی ہو یا تحسین اس کے لیے باہر نکلتا بھی مشکل تھا چونکہ ایللی کے ڈیوڑھیوں میں عورتوں کا تنگٹھا ضرور ہوتا تھا۔ چوگان میں بیٹھ کر عورتیں اپنے کام کا کرتی تھیں جیسے وہ گھر کا صحن ہو۔

عورتیں بالے کے مکان کی ڈیوڑھی میں بیٹھی رہتی تھیں یا تو وہ اپنے اپنے کام میں ہوتیں اور یا خالی بیٹھ کر باتوں میں مصروف رہتیں۔ محلے میں آزار بند بننا سب سے برا مشق اور آزار بند بننے میں محلے کی عورتوں کو اس قدر مہارت ہو چکی تھی کہ ان کی انگوٹیاں کھینکتے تھے۔ نگاہیں آوارہ رہتی تھیں اور زبانیں یوں چلتی تھیں جسے قینچیاں ہوں۔ اندھیرے کمرے میں بلا تخت پر اپنی چیزیں رکھے بیٹھا آپ ہی آپ باتیں کرتا رہتا۔ اس روز ایللی نے سوچا چلو بالا کے ہاں جا بیٹھو کچھ وقت گزر جائے گا۔ جب وہ چوگان پہنچا تو شہزاد کے چوبارے کی کھڑکی میں کسی نے اشارے سے اسے بلایا۔ نہ جانے کون ہے نے سوچا۔ شاید جانو ہو۔ پھر اس نے شریف کی آواز پہچان لی کھڑکی میں شریف کھڑا ہوا تھا۔ نہ جانے کیا بات ہے وہ سوچنے لگا۔ بہر صورت شریف سے انکار کرنے کی اس میں

نہیں۔ چوبارے میں شریف اکیلا بیٹھا تھا۔ ”وہ تو محض اتفاق سے میری نگاہ پڑ گئی۔“ شریف نے کہا ”وہ نہ تو شاید آتے ہی نہ۔ کیا بات ہے ایللی۔“ شریف نے لمبی نگاہوں سے اسے دیکھتے ہوئے کہا ”تم ہم سے اس قدر گریز کیوں کرتے ہو۔ میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تمہاری میں شاید تم مجھے اپنی نیم کا قصہ سنا سکو شہزاد کے سامنے تو ہچکچاتے ہو نا۔ بتاؤ کبھی ملی بھی ہے تم سے۔“

ایللی مسکرایا۔

”درو نہیں۔ میں کسی سے نہیں کہوں گا“ وہ بولا ”گھبراؤ نہیں۔“

ایللی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے ”طے نہ طے“ وہ بولا ”مطلب تو جذبے سے ہے“

”بالکل بالکل“ شریف کا چہرہ مسرت سے جگمگا اٹھا اگر جذبے میں خلوص ہے تو سمجھ لو پیرا پار ہے کچ کچتے ہو کچ کتے ہو“ شریف نے ٹھنڈی آہ بھری ”چاہے تباہ ہو جاؤ۔ لیکن جذبہ میں غلطی اور شدت قائم رہے۔ ایسی تباہی پر سینکڑوں آبادیاں قربان ہیں۔ اچھا اس کے عزیزوں کو طے ہے کیا؟“

”معلوم نہیں“ ایللی نے کہا ”شاید علم ہو۔ لیکن کیسے معلوم ہو سکتا ہے انہیں۔ میں نے تو کبھی کسی سے بات نہیں کی اور ابا کو تو ابھی اپنے چاؤ سے فرصت نہیں۔“

شریف ہنسنے لگا۔

”اے اپنے چاؤ سے فرصت کیسے طے“ شہزاد داخل ہو کر بولی ”سارا محلہ چھان مارا میں لیکن تمہارا پتہ نہ چلا۔ پہلے بالے کے ہاں گئی پھر ار حند کے گھر گئی ادھر غفور کی طرف جا پہنچی بلکہ نہ ملا تو میں نے کہا شاید اپنے ابا کے پاس بیٹھا ہو۔ آخر اپنی نئی اماں کو بھی تو سلام کرنا تھا۔“

”دیکھ لے ہم نے بیٹھے بیٹھے تلاش کر لیا“ شریف نے کہا ”کچے دھاگے سے بندھا آیا ہے۔“

”پوچھ لے اس سے خود نہیں آیا یہ۔“

شہزاد نے آہ بھری ”ہمیں یہ کچا دھاگا نصیب نہ ہوا۔ ہم نے اپنی زندگی ویسے ہی کھو دی۔ ہمیں اللہ نے عشق نصیب ہی نہ کیا۔ اپنے اپنے نصیب ہیں جس کے ساتھ ہماری سبجگ طے وہ پلے سے کسی اور کے ہو چکے تھے۔“

”اچھا۔۔۔۔۔“ شریف بولا اس کے انداز میں احتجاج تھا۔

”غلط کہہ رہی ہوں کیا“ شہزاد چمک کر بولی۔ ”میاں اپنی دھن میں بیٹھے رہتے ہیں ایلہ دھن میں آوارہ رہتا ہے۔ ایک میں ہوں جو بغیر کسی دھن کے کوئے کی طرح میل سے وہاں جا بیٹھی۔“

”اب پنچھیوں کو بھی کوئے بننے کا شوق چرایا“ ایلہ بولا۔

”پنچھی۔“ شہزاد نے غصے سے ایلہ کی طرف دیکھا ”کبھی تھے ہی پنچھی۔“

”کیا کہہ رہے ہو تم۔ تمہاری باتیں میری سمجھ میں نہیں آتیں“ شریف بولا۔

”نہ ہی آئیں تو بہتر ہے۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”محسوسات کی دنیا میں رہنے والوں کو سمجھنا کیا ضرورت۔“

”اچھا بھئی تم جو کہتی ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔“ شریف آہ بھر کر بولا۔ اور پھر خاموش ہو گیا۔

کروٹیں اور قوتہ

رات کے وقت جب ایلہ چارپائی پر لیٹا تو اس کے دل میں متضاد قسم کے احساسات۔ شہزاد اور شریف کے پاس بیٹھے ہوئے اسے شریف پر ترس آتا تھا۔ اس وقت شریف کی بیڑ بیچ ہو کر رہ جاتی تھی۔ اور شہزاد کی باتیں اور اس کے اشارات ایلہ کے دل میں پختہ یقین پیدا دیتے تھے کہ وہ اس سے کھیل نہیں رہی بلکہ اس کی نگن میں بری طرح سے سرشار ہے۔ جو نہی وہ اکیلے میں لیٹتا تو شہزاد کی باتیں دھندلی پڑتی جاتیں اور ارجمند اور رضا کی آوازیں ہوتیں۔ میں بتاؤں ایلہ یا تو وہ مہارانی ہے اور یا مہترانی۔ مہترانی مہترانی۔ دور کوئی چلا تا پھر غوراً بھدی آواز ابھرتی اور شہزاد چیخ کر کہتی ان کا کیا ہے ان کا میاں چھٹی پر آنا نہ آتا برابر ہے۔ فرق پڑتا ہے۔ کھلاڑی! محلے کی مسجد کے گنبد سے کوئی الو چیخ کھلاڑی دور کوئی چھگڑا اس انداز پر جاتی۔

پھر ایک رنگین اور شوخ کھلاڑی اس کے روبرو آکر کھڑی ہو جاتی اور وہ شریف کو بلانے کرتی۔ اپنی طرف بلاتی۔ اور اس کا جسم ابھرتا سمٹتا جیسے شدید خواہش اسے بلواری ہو۔ مگر اس کے کپڑے دھجیاں بن کر اڑ جاتے اور وہ برہنہ رہ جاتی۔ اس وقت ایلہ محسوس کرتا جیسے وہاں ہو۔ اس خیال پر اس پر دیوانگی طاری ہو جاتی۔ اس کے دل کی اقلہ گمراہیوں سے ایک کربا

اور جسم کے روئیں روئیں کو یوں دھنکتا جیسے روٹی کا گلا ہو۔ وہ دیوانہ وار چارپائی پر کروٹیں

باندھ

ساری رات وہ چارپائی پر تڑپتا رہتا حتیٰ کہ صبح کلاب کا وقت ہو جاتا اور پھر تھک کر اس کی آنکھ لگ جاتی۔ پھر بھی اس سونے کو نیند سے تعلق نہ ہوتا۔ جیسے کوئی مریض کسی خوف ناک تکلیف کے تحت کچھ عرصے کے لیے تھک ہار کر بے جان ہو کر پڑ جاتا ہے۔

اس لیے صبح جب وہ جاگتا تو وہ تازگی محسوس نہ ہوتی۔ جو نیند کے بعد انسان محسوس کرتا ہے۔ ہند بند درد کرنا اینٹھن کی وجہ سے اعصاب دکتے۔ اور چہرے پر پڑمردگی چھائی ہوتی۔ ابھی وہ رات کی واردات کی تعلق سوچ رہا ہوتا کہ میڑھیوں میں کسی کے پاؤں کے رقص کی آواز گونجتی اور چھن سے شہزاد اس کے روبرو آکھڑی ہوتی۔

”جہل اٹھ وہ چائے کے لیے کب سے تیرا انتظار کر رہے ہیں۔ ابھی لاث صاحب جاگے بھی نہیں۔ کیا زندگی ہے جیسے کوئی نواب زاہد ہو۔“ وہ ہنستی۔

شہزاد کی باتیں سن کر اس کی تمام تر تھکن فرو ہو جاتی۔ اس کی ہر بات محبت کا پیغام ہوتی اور یہ پیغامات ایسی خوشی اور رنگین سے ایلہ تک پہنچائے جاتے کہ اس پر نشے کی سی کیفیت طاری ہو جاتی اور رات کے شکوک اور بے خوابی گویا اسے یاد ہی نہ رہتے۔ اگر کسی وقت اسے رات کے کرب کا خیال آتا بھی تو وہ ہنس دیتا۔ میں بھی کیسا پاگل ہوں وہ سوچتا جو خواہ مخواہ کے شکوک پال لیتا ہوں۔

لیکن اس کے باوجود پھر جب رات پڑتی تو دن کے وہ لطیف اور رنگین پیغامات اس کے ذہن سے مٹ جاتے اور اس کی آنکھوں کے سامنے وہی بھیانک تصاویر متحرک ہو جاتیں اور وہ شدت کرب سے تڑپتا اور کروٹیں لیتا۔ تڑپتا اور کروٹیں لیتا حتیٰ کہ صبح کلاب کے وقت تھک کر بے ہوش ہو جاتا۔

اس طرح اس کی زندگی دو زخنی حیثیت اختیار کر گئی اس کے ساتھ ہی شہزاد کی شخصیت اس کے نزدیک راوہا اور راہو دونوں کی خصوصیات سے مزین ہو گئی۔ وہ بیک وقت اسے پاکیزہ ترین محسوس محبوب اور چالباز کھلاڑی دکھائی دیتی تھی۔ ایک ساعت میں ایلہ اسے خلوص بھرے سجدے کرتا تھا۔ دوسری ساعت میں ناگن سمجھ کر اس سے دور بھاگنے کی کوشش کرتا۔

یہ کیفیت ایک دیوانگی کی حیثیت اختیار کر گئی حتیٰ کہ اس کے لیے یہ جاننا مشکل ہو گیا کہ آیا

”لیکن آپ نے تو کہا تھا“ ایلی بولا ”کہ آپ مجھے کسی اور کالج میں داخل کریں گے۔“
 ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ یہ کیسے ممکن ہے۔“ وہ ننگے پیٹ کو کھجاتے ہوئے بولے ”سیدہ او
 سیدہ زرا دھر آئے۔ آنا ذرا ایک منٹ کے لیے“ اور جب سیدہ آئی تو کہنے لگے ”جھلا بتاؤ تو کیا یہ
 ممکن ہو سکتا ہے کہ ہم ایلی کو مشن کالج میں داخل کرائیں۔ جب اپنا اسلامی کالج موجود ہو تو
 مسابوں کے کالج میں کیسے داخل کرائیں کیوں سیدہ ایمان سے کہنا۔“
 ”ہے“ سیدہ ہاتھ ملتے ہوئے بولی ”اس عیسائی کالج میں جہاں اپنے محسن کا لڑکا پرویز ایسا گیا
 کہ پھر لوٹ کر نہ آیا۔ بس عیسائی ہو گیا اور نتیجہ کیا ہوا ماں نے اسی غم میں جان دے دی اور
 بپ کا جو حال ہو رہا ہے وہ کس سے چھپا ہے۔“

”دیکھو سیدہ“ وہ بڑی سنجیدگی سے بولے ”مجھے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہے گورنمنٹ کے کالج
 میں داخل ہو جائے یا عیسائیوں کے کالج میں دس ایک روپے کا فرق پڑ جائے تو کیا ہوا۔ مطلب تو
 یہ ہے کہ تعلیم اچھی ہو جائے لڑکے کی۔ بس صرف یہ خیال آتا ہے کہ اگر اپنا اسلامی کالج موجود
 ہے تو پھر کیا ہمیں ایلی کو عیسائیوں کے کالج میں داخل کرانا چاہیے یا نہیں۔ اس کا فیصلہ تم پر رہا۔
 جو تم کو وہی کروں گا میں ذرا شیم کو بھی بلا لوں نا اس کی مرضی بھی پوچھ لیں۔ اور باجرہ کہاں
 ہے اس کا موجود ہونا بھی ضروری ہے۔ کیوں سیدہ۔“

سیدہ شیم کو بلانے گئی تو وہ اٹھ کر جنگلے میں جا کھڑے ہوئے اور چلا چلا کر محلے والیوں کو
 بلانے لگے۔ ”میں نے کہا ماماں برکتے ذرا آنا تو ایک منٹ کے لیے اے بی بی تنھو تو کیا کر رہی ہے۔
 ہر وقت آزار بند ہی بنتی رہتی ہے کبھی اللہ اور رسول کا کام بھی کر لیا کر۔ آذرا یہاں تیرا مشورہ
 لینا ہے۔ بہت ضروری بات ہے۔“

علی احمد نے شور مچا کر محلے والیوں کو اکٹھا کر لیا اور پھر اس جرگے کے سامنے ایلی کے داخلے
 کا مقدمہ نمائیت خوب صورتی سے پیش کر دیا۔ محلے والیاں یک زبان ہو کر علی احمد کی رائے پر
 عمل کر دی تھیں۔ اور وہ بار بار چلا رہے تھے ”دیکھ ماں برکتے میرا کیا ہے مجھے تو لڑکے کو
 داخل کرنا ہے تاہیں نہ کیا وہاں کر دیا۔ کیا فرق پڑتا ہے اول تو اخراجات میں کمی زیادتی ہوتی
 نہیں اور اگر وہ بھی بی بی تنھو تو کیا ہے اپنے بیٹے سے بڑھ کر کون ہوتا ہے۔ انہیں کے لیے محنت
 ڈالنی کرتے ہیں ہم اور پھر جہاں سو وہاں سو۔ کیا فرق پڑتا ہے۔ اب سوچ لو تم ایک تو
 عیسائیوں کا کالج ہے جہاں عیسائی مسیح کی بائبل پڑھتے ہیں اور دوسرا ہے اپنا اسلامی کالج جہاں اللہ

وہ اس حسین اور پاکیزہ دیوی کی وجہ سے وہاں سیس نوانے پر مجبور تھا یا اس دلکش ہانگے
 ڈسے جانے کے شوق نے اسے وہاں رہنے پر مجبور کر رکھا تھا۔ یہ بھی ممکن ہے کہ اس کربا
 شدید لذت جو وہ رات کے وقت محسوس کیا کرتا تھا اسے شہزاد سے محبت کرنے پر مجبور کر رہی
 اور ایذا پرستی کا جنون اس کے سر پر سوار ہو۔

بہر حال یہ تو ایک مسلم امر ہے کہ اگر شہزاد صرف حسین و جمیل عورت ہوتی تو شاید ایلی
 کے دل میں اس کے لیے اس قدر عظیم جذبہ پیدا نہ ہوتا اور ہوتا بھی تو اسے اس قدر دائم
 حاصل نہ ہوتا۔

جرگہ

کچھ دن کے بعد ایلی کا نتیجہ نکل آیا وہ ایف۔ اے میں پاس ہو گیا۔ علی احمد نے اسے فرائض
 ائیر میں داخل کرانے کے لیے لاہور بھیجے کا فیصلہ کر دیا۔ ساتھ ہی انہوں نے ایلی کو بہت لمبا چوڑا
 لکچر دیا۔

ایلی ان کی باتیں بڑے غور سے سنتا رہا جب وہ سب داؤ اور گر بتا چکے تو ایلی نے کہا ”بکے
 ابا جان آپ کے فرمان بالکل درست ہیں لیکن آپ مجھے اسلامیہ کالج میں داخل نہ کرائیں چونکہ
 وہاں کا ماحول ایسا ہے کہ وہاں میں اطمینان سے نہیں رہ سکتا۔ اگر آپ واقعی چاہتے ہیں کہ
 بے ضابطگیوں کا اعادہ نہ ہو جو پہلے مجھ سے سرزد ہوئی ہیں تو مہربانی سے مجھے گورنمنٹ کالج
 کالج میں داخل کرا دیجئے۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولے ”ہمیں اس میں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ ہمارا مقصد تو صرف یہ ہے کہ
 تمہاری تعلیم مکمل ہو جائے۔“

اس کے بعد انہوں نے مختلف لڑکوں کو ادھر ادھر بھیجا تا کہ وہ تینوں کالجوں کے پرائنٹس
 لے آئیں۔ پرائنٹس میا کرنے کے بعد وہ اپنے بڑے بڑے رجسٹر لے کر چٹائی پر بیٹھ گئے اور
 سارا دن مختلف کالجوں کی فیس اور دیگر اخراجات جوڑتے رہے انہوں نے رقبے بار بار لکھیں
 بار انہیں جمع کیا ایک میزان کو دوسرے میزانوں سے ملایا۔ اور کئی ایک گھنٹوں کے بعد
 سے ہر اٹھا کر بولے ”ٹھیک تو ہے تم کل ہی لاہور روانہ ہو جاؤ اور جا کر اسلامیہ کالج میں داخل
 ہو جاؤ۔“

اور رسولؐ کے احکامات اور اسلام کے ارکان کی تعلیم دیتے ہیں۔ اب تم ہی فیصلہ کر لو ہاں۔
جوں کے فیصلے کے بعد علی احمد نے ایک بار پھر رجسٹر میں اندراج شدہ رقوم کے معائنہ
دیکھے۔ ایک بار پھر رقیں جمع کیں اور پھر یوں فاتحانہ انداز سے مسکرانے لگے جیسے کوئی سرانجام
بہت بڑے منافع کا سودا اپنا کر گردو پیش پر نگاہ ڈال رہا ہو۔

اگلے روز سیڑھیوں میں دھما چوکڑی کی آواز کے بغیر چھن چھٹان کے بغیر شہزاد چپکے
داخل ہوئی۔ ”تو جا رہا ہے“ وہ بولی ”سنا ہے کلج میں داخل ہونے کے لیے جا رہا ہے۔“
”ہاں“ ایلی نے کہا۔ ”تمہارے لیے کیا فرق پڑتا ہے۔“
”پڑتا ہے۔“ وہ بولی ”صرف ساٹھ میل کا فرق ہے۔ چار گھنٹے کا فرق سمجھ لو۔“
”اچھا۔“ وہ ہنسا۔ ”میں تو سمجھا تھا کہ۔۔۔۔۔۔“
”یہ سمجھ کی بات نہیں ہاں“ وہ بولی ”یہ احساس کی بات ہے۔ چلو وہ چائے پر ملا رہے
ہیں۔“

ایلی بگڑ گیا ”میں نہیں جاتا۔ وہ بلانے والے کون ہیں۔“
”بلانے والے کا خیال نہ کرو۔ بلاوی کا تو خیال کرو۔ میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔
”نہ میں نہیں دیکھتا۔“ وہ منہ پھیر کر بولا۔
”دیکھے بغیر رہ بھی سکو گے۔“ وہ ہنسی۔
فرحت چپکے سے داخل ہو کر جھٹ سے بولی ”کون کے دیکھے بغیر نہیں رہ سکے گا۔“
”میں دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔“ شہزاد ہنستے ہوئے کہنے لگی۔
”کے دیکھے بغیر“ اس نے پوچھا۔
”تمہیں اور کے“ شہزاد ہنسے چلی گئی۔
”مجھے؟“

اور کیا ایلی کو دیکھے بغیر نہیں رہ سکتی۔ اس ایلی کے۔ ذرا اپنے بھائی کی صورت تو دیکھو۔
جانے بھائیوں کے متعلق بہنیں غلط فہمیاں کیوں پال رکھتی ہیں۔“
”چلو بھی نا اب کہ مجھے فرحت سے پڑا کے رہو گے“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔
بھی نا“ اور ایلی چپکے سے اٹھ کر اس کے ساتھ ہو لیا۔
ایلی کا خیال تھا کہ شریف کے رخصت ہو جانے کے بعد وہ لاہور جائے گا تاکہ ایک

شہزادے اکیلے میں مل سکے مگر شریف نے چپکے سے اپنی چھٹی بڑھالی تھی اس لیے اس کی یہ
آرزد پوری نہ ہو سکی۔ ادھر علی احمد تقاضا کر رہے تھے کہ جلد جائے لہذا اسے اپنی مرضی کے
خلاف لاہور جانا ہی پڑا۔ جاتے وقت اس نے ان بے آنسوؤں سے شہزاد کی طرف دیکھا اور
بونٹ بلائے بغیر اشاروں کی مدد سے شہزاد سے اظہار درد دل کیا اور رخصت ہو گیا۔



تیگ

”اتنی دیر نہ رہنا دیکھے بنا اور کیا۔“

اور اس نے جواب میں کہا تھا: ”اگر رہنا پڑے تو؟“

تو وہ بے پرواہی سے بولی تھی: ”تو کیا ہوا۔ تم نہ آسکو گے تو میں آجاؤں گی۔“

”تم آؤ گی لاہور۔“ ایللی نے حیرت سی شنراؤ کی طرف دیکھا تھا۔

”ہیوں۔“ شنراؤ ہنس کر بولی تھی۔ ”اس میں کیا مشکل ہے۔ ایک گاڑی سے آؤں گی۔“

دوسری سے لوٹ آؤں گی۔ تم دیکھ لیتا جی بھر کے۔“

کتنی جرات تھی اس میں۔

ریلوے سٹیشن سے وہ سیدھا کالج پہنچا اور علی احمد کی ہدایات کے مطابق دفتر میں داخلہ اور فیس ادا کرنے کے بعد حسن منزل کی طرف چل پڑا تھا۔ جہاں اسے رہنے کے لئے جگہ ملی تھی۔

اس نے کوشش سے حسن منزل میں جگہ لی تھی کیونکہ ریواز ہوٹل میں رہنا پسند نہ تھا۔

تاہا اس کی وجہ یہ تھی کہ ریواز ہوٹل سے گزشتہ کئی ایک تلخ یادیں وابستہ تھیں اور وہاں اب

بھی گاؤں کے چودھری بھرے پڑے تھے۔ وہی چودھری جن کے ساتھ گاؤں کے کہیں نوکر

ہوتے۔ حقہ اور تمباکو کی تھیلیاں ہوتیں اور جو شلوار کی جگہ چادریں باندھے یوں بورڈنگ میں

گھومتے پھرتے جیسے ریواز ہوٹل ان کے گاؤں کا کھیت ہو وہ چلا چلا کر بات کرتے۔ بات بات پر

لنگارتے۔ بورڈنگ کے نوکروں کو گالیاں دیتے۔ دھمکاتے اور ہر نئے لڑکے کو گھورتے۔

اسلامیہ کالج کے اب تین بورڈنگ تھے۔ ریواز ہوٹل اور رحیم بلڈنگ تو کالج کی عمارت

کے پہلو میں واقع تھے اور حسن منزل کافی فاصلہ پر تھی۔ کالج والے حسن منزل کے قریب کوپر

روڈ پر ایک نیا بورڈنگ بنوا رہے تھے لیکن یہ باکریٹ ہوٹل ابھی زیر تعمیر تھا۔

آگے میں بیٹھے ہوئے ایللی غور سے لاہور کے ان علاقوں کو دیکھتا رہا۔ جنوب کی طرف ایک

دستا میدان تھا جس میں جگہ جگہ پانی کھڑا تھا۔ اس وسیع میدان میں دو ایک مکانات زیر تعمیر

تھے۔ بیڈن روڈ پر چند ٹوٹے پھوٹے ویران سے مکانات تھے۔ میکلوڈ روڈ ویران سڑک تھی

جس کے دونوں طرف کوئی عمارت نہ تھی۔

میکلوڈ روڈ کوپر روڈ اور بیڈن روڈ کے وسیع ویرانے کے عین درمیان میں حسن منزل

واقع تھی۔ اس وسیع اور ویران علاقے میں وہ واحد دو منزلہ بلڈنگ تھی۔ میکلوڈ روڈ پر

اگلی لاگوٹی نشین نہ تھا۔ صرف ایک سڑک جس کے غریب حصے میں یہاں اکا دکا عمارت

حسن منزل

گاڑی علی پور کے سٹیشن سے روانہ ہوئی تو ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ جا رہا ہے

شنراؤ سے دور جا رہا ہے۔ اس کے گورے پنپے ہاتھوں سے دور۔ اس کے لگتے ہوئے بالوں

سے دور۔ ناؤسی ڈولتی آنکھوں اور ماتھے کے تنک سے دور۔ پھر اسے ان رنگین اور شرمندہ

بیان کا خیال آیا جو انہوں نے شریف کے روپرو لطیف کنایوں اور رنگین اشارات کی مدد سے

ایک دوسرے سے کئے تھے۔ اس کے دل میں اضطراب کھولنے لگا۔

کیا میں ان رنگینوں سے محروم ہو جاؤں گا؟

کھڑکی سے باہر شنراؤ مسکرا رہی تھی۔ ”کیا فرق پڑتا ہے۔“ وہ ہنس رہی تھی۔

کھٹنے کا فرق ”وہ تہقہ مار کر ہنسنے لگی۔“

ایللی کے چہرے پر مسرت کی لہر دوڑ گئی۔

”میری ہے تو پھر کیا غم؟“ اس نے سوچا۔ پھر اسے شنراؤ کی وہ بات یاد آئی جب ایللی نے

ایکے میں شنراؤ سے کہا تھا۔

”شنراؤ اگر میں وہاں سے نہ آسکا تو پھر میں تمہیں کیسے دیکھوں گا۔ اتنی دیر دیکھے جائے

رہوں گا۔“

یہ سن کر وہ ہنس پڑی تھی۔

کھڑی تھی۔ کوپر روڈ اور بیٹن روڈ کا تمام علاقہ ویران تھا جہاں رات کے وقت گزرتا آسمان تھا کیونکہ اس علاقے میں چوری اور ڈکیتی کی واردات عام تھیں۔ میکلوڈ روڈ پر صرف ایک سینما ہال تھا جس کا نام ایپرس سینما تھا اور جہاں زیادہ تر ٹائی فلم دیکھتے تھے۔ فلم کے دوران میں وہ ایک دوسرے کو گالیاں بکتے۔ مونگ پھلی کھاتے اور متحرک مگر خاموش تصویروں میں ہنس مکھ ٹانگیں دیکھ کر چنگاڑوں کی طرح جینیں مارتے تھے۔

حسن منزل ایک بہت بڑی دو منزلہ عمارت تھی جس کی چلی منزل میں ایک ہوٹل تھا اور اوپر کی منزل کالج نے کرایہ پر لے رکھی تھی۔ اس منزل کے پچھواڑے میں ایک پرائیویٹ لڑکھاڑہ تھا۔ منزل کے عین مقابل میں ایک پرانی کوٹھی جس میں ایک پارسی شراب پیچھا تھا اس کے گاہک زیادہ تر ٹائی تھے جو ڈھائی آنے میں ڈرافٹ بیر کا گلاس خریدتے تھے۔ اور ایک گلاس سے دو بوتل کا نشہ حاصل کرنے کے لئے شور مچاتے دنگا کرتے اور سیٹیاں بجاتے تھے۔

حسن منزل کی اوپر کی منزل کالج والوں نے اس لئے کرایہ پر لے رکھی تھی تاکہ بورڈروں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو جگہ دی جاسکے۔ غالباً کالج کے تانھوں کو بورڈروں میں صرف اس تک دلچسپی تھی کہ ان کی وجہ سے کالج کی آمدنی میں اضافہ ہو رہا تھا ورنہ حسن منزل کو کالج نے نوجوانوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ سمجھتے۔ حسن منزل تو کیا ریواز ہوٹل بذات خود کالج کے لڑکوں کی رہائش کے لئے موزوں نہ رہا تھا کیونکہ اس کے گرد بہت سے مکانات تعمیر ہو چکے تھے۔ ریواز ہوٹل کے مقابل کالج کے مشرقی سرے پر جو عمارت بورڈنگ کے طور پر خریدی گئی تھی اس کی کھڑکیوں سے تو گرد و نواح کے تمام مکانات کے اندرونی حصے تک دکھائی دیتے تھے۔

حسن منزل کے جس کمرے میں ایلی کو جگہ ملی وہاں کل تین سیٹیں تھیں۔ ایلی کے علاوہ وہاں دو لڑکے تھے ایک کا نام جمال اور دوسرے کا ریاض تھا۔ ریاض ایک دلا پٹا طالب علم تھا جس کی ناک چونچ کی طرح نکلی ہوئی تھی اور جس کی آنکھیں روٹی سی تھیں۔ جب وہ چنانچہ اس کا سرا جہم جھوٹا تھا۔ اعضاء اکھڑے اکھڑے معلوم ہوتے تھے جیسے وقتی طور پر مزارا کرنے کے لئے فٹ کئے بغیر جوڑ دیئے گئے ہوں۔ وہ خود بات کرنے سے گریز کرتا تھا لیکن کوئی بات نہ کرنا تو اس کے کان کھڑے ہو جاتے بلکہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے اس کے کانوں کے اوپر سے ہوا سا ٹم کھالیتے تھے تاکہ بات کا کوئی حصہ کان سے ٹکرا کر باہر نہ نکل جائے۔ بات سننے وقت اس کی آنکھیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا کہ وہ بات کو قطعی طور پر نہیں سمجھ رہا۔ اس کے چہرے پر

خوش فضا یا شرارت کا اظہار نہیں ہوتا تھا بلکہ دائمی طور پر اس کے چہرے پر ایک کیفیت گویا کندہ کر دی گئی تھی جیسے کہہ رہا ہو۔ ”معاف کیجئے بات سمجھ میں نہیں آئی“ — بات کو سننے اور سمجھنے کے بلکہ اس کے چہرے پر لا علمی اور بے بسی کے طے جملے جذبات طاری رہتے تھے۔ بلکہ اپنے لیے قد کا خوب صورت جوان تھا۔ رنگ گورا تھا بال سنہرے تھے آنکھیں بھوری اور مدخل ستواں ہونے کے باوجود مردانہ قسم کے تھے۔ اس کا جسم بھرا ہوا اور اعضاء میں ایک پگ تھی۔

جمال لا پور کے کسی چک کا رہنے والا تھا۔ اس کی عادت دہمائی رنگ لئے ہوئے تھیں۔ طارو تہ بند باندھنے، ملل کا کرتہ پہننے اور پھر بھرپور قہقہے لگانے میں خاص مسرت محسوس کیا کرتا اور اسے جسم کھانے کی عادت تھی۔

ہر ایک روز وہ تینوں ایک دوسرے سے جھگ محسوس کرتے رہے اور تکلف برتتے رہے لیکن جلد ہی جمال ایلی سے کھل کر باتیں کرنے لگا۔ جمال اور ایلی دونوں کو معلوم ہو گیا کہ رات کے ان سے مکمل مل جانے کی توقع بے سود ہے کیونکہ وہ اپنی طبیعت کی وجہ سے مجبور ہے۔

کالج سے واپسی پر ایلی اپنی چارپائی پر بیٹھ جاتا اور خیالات کی دنیا میں کھو جاتا۔ کمرے کی مشق دیوار آہستہ آہستہ سرکتی۔ ایک زینہ نمودار ہوتا۔ پھر اس زینے سے دھما چوڑی کی آواز آتی اور چمن تن سے کوئی اس کے روبرو آکھڑی ہوتی۔

”ہلو! وہ جائے پر انتظار کر رہے ہیں۔“

ایلی چونک پڑتا اور گہرا کر اپنے ساتھیوں کی طرف دیکھتا۔ ریاض چپ چاپ دیوار سے ٹک لگے ہاتھ میں کتب لئے چھت کی طرف گھور رہا ہوتا۔ جمال اپنے کپڑوں کو تہہ کر کے لولہ تے جملے میں شدت سے مصروف ہوتا۔ ایلی سوچنے لگتا شاید انہوں نے شہزاد کے قہقہوں کی آواز سن پائی ہو۔ شاید وہ اس کے راز سے واقف ہو گئے ہوں شاید —

پھر وہ اپنے اعتقاد غدشات پر ہنس دیتا ”میں بھی پاگل ہوں۔“ وہ سوچتا۔ اپنے دونوں ساتھیوں کو اپنے آپ میں کھوئے ہوئے دیکھ کر اسے خیال آتا۔ نہ جانے ان دونوں پر کیا بیت رہا ہے اس کمرے میں ہوتے ہوئے نہ جانے یہ کہاں کہاں گھوم رہے ہیں۔ بیچاروں کو اپنی

یہ کہہ کر جل کھٹا ہوا اور تہہ بند جھاڑتا ہوا نیچے اتر جاتا اور — پھر میزروں سے

”چلا گیا۔۔۔ اہلی تم ہر وقت اسے کیوں پاس کھڑا کر لیتے ہو۔ خواہ مخواہ بھیڑ لگا لیتے ہو۔ کوئی
تجربہ بھی نہیں کر سکتا۔“
اہلی چونک کر دیکھتا۔

شہزادہ نس کر عائب ہو جاتی اور وہ پھر سے اندر چارپائی پر جا بیٹھتا۔

ہزاروں کی پراپیگنڈا اور اپنے کام میں مصروف ہو جاتی اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ دور
جیسے وہ قریب آکر بہت دور ہو گئی ہو۔ ساتھ میل قریب آکر چھ ہزار میل
میل دور ہو گئی ہو۔

انکی انہیں اکٹھے رہتے چند دن ہوئے تھے کہ جمل نے اپنا پتارہ کھول لیا۔ وہ ایلچی کے پاس رازدارانہ انداز سے کہنے لگا:-

”ایلی کچھ کرنا ہی پڑے گا ورنہ یہاں اپنی زندگی کیسے بسر ہوگی۔ دن کیسے کٹیں گے۔“
 ”زندگی!“ ایلی کو اس کی بات سن کر حیرت ہوئی۔ ”زندگی تو گزر رہی ہے۔“ اس نے
 ”زندگی گزرنے میں وقت کیسی؟ نہ جانے جمل کیا کہہ رہا تھا۔“

پہل کس مصیبت میں آپڑے ہیں؟“ جمال نے ہاتھ بھر کر کھجاتے ہوئے کہا۔ ”ہر
بند کے بعد اس کا خط آ جاتا ہے اور پھر ٹرک کھوتا ہوں تو ہر چیز سے اس کی یادیں
نکلنے لگتی ہیں۔ اس کا ریشمیں رومل ہے۔ آزار بند ہے۔ اس کا ایک دوپٹہ بھی میں اٹھالایا تھا۔
اس کا اٹھالایا تھا۔ وہ چینی رہی اسے ہے میرا دوپٹہ کیوں لے جا رہے ہو میرے پاس پہلے ہی کم
پس میں اس کا اٹھالایا اور اس کی سرمہ دانی غلطی سے آگئی۔ آؤ تمہیں دکھاؤں۔“

یہ دیکھو۔“ اس نے ریشمی رد مال کھولتے ہوئے کہا: ”اسے سو گھونٹا ذرا۔ کیسی بھینی بھینی
 آٹا ہے اور یہ دیکھو اس کا کلپ ہے۔ سالی کلپ پہنتی ہے۔ گلاؤں والوں سے چوری
 کئی دیکھ لے تو نہ جانے کیا فتوے صادر کر دے اس لئے رات کو سونے کے وقت پہنتی

ریاضت کو چھت کی طرف گھورتے ہوئے دیکھ کر اسے شریف یاد آ جاتا شاید رازِ راز
ایک شریف ہو جو کسی انور کے خیال میں اپنی سدھ بدھ کھو چکا ہو۔ نہ جانے اس پر کیا اثر
ہے۔ اس کے محلے والوں نے اس کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے کہ یہ شریف بن گیا ہے۔ قبا
ریشمیں رومال سے منہ پونچھتے ہوئے دیکھ کر اس کی نگاہ تلے رہ گئی تھی رومال سے گور
ہاتھ نکلتے۔ مخروطی انگلیاں اس کے گالوں کو سلالتیں لیکن جلد ہی جمال کا بھونڈا اقبہ اسے
دستا۔

”ارے یار۔“ وہ ہنستے ہوئے کہتا: ”مجھے ابھی روہل کی پہچان نہیں۔“

”ہاں۔ اس کھیل میں یہ چیز بے حد ضروری ہے۔ اسے تھانے رکھو۔ یوں کھل سکتا۔“
میں اڑا دو یوں۔ مطلب ہوا آنا زور ادا کر بھی مری جان کبھی کبھی“

اور پھر شنوار چھن سے ادھر آجاتی اور ارجمند کپ کیپ سب ماند پڑ جاتے۔ وہ مسکرا کر کہتی:- ”صرف ساٹھ میل کا فرق ہے صرف ساٹھ میل کا۔“

روہاں کو منہ پر رکھ کر جمال انگڑائی لیتا اور پھر تہ بند کھجانا اور دو ایک گرم گرم آہیں! باہر برآمدے میں نکل جاتا۔ چند ایک منٹ کے بعد وہاں سے وہ ایلچی کو پکارتا:

”اند ر کیا کر رہے ہو تم۔ بے کار بیٹھ رہتے ہو یا! یہاں آؤ۔ یہاں نیچے اتارے جا رہے ہیں۔ سالوں نے پی رکھی ہے اور دیکھو تو کیا کیا حرکتیں کر رہے ہیں۔“

”وہ دیکھو سامنے — ارے ارے وہ بھاگے وہ بھاگے سب کے سب بھاگ رہے ہیں۔“

بھاگ کیوں رہے ہیں سالے۔ اس مونڈ سائیکل کو دیکھ کر ڈر گئے ہیں کیا۔ کیوں ایلے۔“

”جب بھی موٹر سائیکل آتا ہے۔ یہ سب یوں بھاگ لیتے ہیں جیسے —
والا دیکھا تم نے۔ یہ جو ٹھلی منزل میں ہوٹل ہے۔ گاہک آتے کبھی دیکھا نہیں کسی نے پہلے۔“

لائبل کو دیکھ کر رنگ محسوس کیا کرتا تھا۔ کس قدر حسین جوان تھا وہ جیسے سانچے میں ہو۔ اس کا رنگ صرف سفید ہی نہیں تھا بلکہ اس میں سرخی کی آمیزش تھی جیسے گلابی رنگ نمبرے کی جعل ہو اور اس کے بال کتنے حسین تھے اور ان میں وہ ہلکا سا گھمراہ پالہ پن اور وہ س کے قدر چمکتے تھے۔ ان باتوں کے علاوہ اس کا مردانہ جوش۔ جب وہ کھجاتے ہوئے رہے

”باہر چلو۔“ جمل نے آہستہ سے کہا ”میں بات نہ ہو سکے گی۔“ اس نے
 طرف اشارہ کیا۔ ”باہر برآمدے میں کھڑے ہوں گے۔ آؤ۔“
 برآمدے میں جا کر اس نے ایک ہاتھ میں وہ تصویر پکڑ لی اور دوسرے ہاتھ سے

ہے کہہ کر شانے ہلاتا تھا تو ایللی کو محسوس ہوتا تھا جیسے وہ دھکا دے کر برآمدے سے نکلتا ہے اور جب جمال نے اس لڑکی کے متعلق باتیں کرتے ہوئے کہا تھا:

”اور پھر جب اپنا بس چلتا ہے تو گمن گمن کر بدلے لیتا ہوں۔“

اس وقت اس کے چہرے پر عجیب و وحشت ابھر آئی تھی جیسے واقعی گمن گمن کر رہا ہو۔ اس وقت ایللی کو دکھ محسوس ہوا تھا۔ کاش وہ بھی گمن گمن کر بدلے لے سکتا ہو۔ دیوانہ وار جھپٹ سکتا۔ اس کے خیال میں مردانگی دیوانہ وار جھپٹنے کی صلاحیت کا ہم قدر نہ جانے کیوں مگر ایللی کے دل میں یہ خیال جاگزیں ہو چکا ہوا تھا کہ عورت مرد سے محبت کرتی ہے اور صرف اسی کی عزت کرتی ہے جس میں جھپٹنے کی صلاحیت ہو۔ جس میں بے رحمی اور تشدد کی جھلک ہو۔ اسے علی احمد پر بھی یہی گتہ تھا کہ اس کی صلاحیت نہ تھی اور وہ صرف ٹین کا سپاہی بننا جانتے تھے اور جھوٹ موت کی لڑائی کر رہے ہو اور قاتل حاصل کرنے کی ناکام کوشش کیا کرتے تھے اور اس سچی لاش حاصل سے الٹا ہمارا کھو دیتے تھے۔

ایللی کو اچھی طرح سے معلوم تھا کہ خصوصی قسم کی عورتیں علی احمد کی طرف بڑھتی ہیں۔ علی احمد میں ایک بے نام کشش تھی جس کی وجہ سے عورت ان کی جانب آنے مجبور پاتی تھی۔ ایللی اس اسرار کو نہ سمجھ سکا تھا کہ آخر علی احمد میں وہ کیا خصوصیت تھی بے پناہ کشش کی ذمہ دار تھی۔ ان کے خدو خال میں کوئی خصوصی بات نہ تھی۔ انداز میں کوئی کشش نہ تھی۔ ان کی باتیں بے حد دلچسپ ہوتی تھیں لیکن باتیں تو زیب ہونے کے بعد اثر انداز ہو سکتی ہیں۔ دور سے کھینچ کر قریب نہیں لاسکتیں۔ اب لہذا احساس ہو چکا تھا کہ عورت کو اپنی طرف متوجہ کرنا ایک بات ہے لیکن اسے اپنے اپنے دوسری بات — اس کا خیال تھا کہ علی احمد میں عورت کے لئے کشش تو ہے لیکن اپنے اثر میں رکھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اس کا اندازہ تھا کہ وہ ان کے کردار میں داخل نہ تھا۔ ان میں وہ جھپٹ نہ تھی۔

جمال کو دیکھ کر وہ اس جھپٹ کا اندازہ لگاتا تھا۔ جمال میں کس قدر اضطراب تھا۔ ایللی نے کہا تھا:

”یوں زندگی کیسے گزرے گی؟“

اس وقت اسے شزا کی بند بیشک کا خیال آگیا۔ اس روز وہ کتنے جوش و خروش سے اٹھ کر اس کا خیال کیا تھا۔ کس قدر خود ساختہ دیوانگی سے اس نے جھپٹنے کی کوشش کی تھی۔ شزا کی منتوں نے کہا اسے اور ابھارا تھا مگر — ایللی کی آنکھوں تلے اندھیرا آگیا — اس نے وہ بتی ہوئی بے عزتی پھر سے شدت سے محسوس کی۔ اور پھر حسرت و تحسین بھری نظروں سے جمال کی طرف دیکھا جو بالکل نئی کے ستون کو دونوں ہاتھوں سے تھامے ہوئے یوں کھڑا تھا جیسے ایک ہی جھکا رہے۔ وہ ہماری ستون ٹوٹ کر دو حصے ہو جائے گا۔

دیر تک وہ برآمدے میں کھڑا سوچتا رہتا۔ حتیٰ کہ شام کی شفق اندھیرے میں تبدیل ہو گئی اور غمی غمی بیاں ٹٹلنے لگیں۔

فری پاس

یہڑیوں میں قدموں کی آواز سن کر ایللی چونکا جمال فاختانہ انداز سے برآمد ہوا۔ ”ارے“

جمال نے ایللی کے گرد اپنے بازو حائل کر دیئے ”علی“ اس نے ایک نعرہ بلند کیا ”ایللی کمال ہو گیا“

”اچھا“ حد ہو گئی ایللی حد ہو گئی۔“

جوش سرت میں وہ پاگل ہو رہا تھا جیسے بیٹھے بٹھائے کوئی خزانہ مل گیا ہو۔ ”میں نے کہا ایللی کمال ہو گیا ہم بھی پاگل رہے پاگل“ وہ اسے دو ہتھ مار کر بولا ”بے وقوف بے وقوف“ اس نے قسم مارا اور پھر کھاتے ہوئے بولا ”کنوئیں کے کنارے پر بیٹھ کر ہم پانی کو ترستے رہے ہیں۔ کوئی اتنا بڑا احسن۔ حد ہو گئی۔ ایللی حد ہو گئی۔ ہم ایک تلاش کر رہے تھے اور وہاں ایک نہیں پاتا پڑیں پوری پانچ چھ۔ بہت اعلیٰ قسم کی چیزیں ہیں صرف گزارہ نہیں اور گزارہ کہاں یا ایک کو تو میں خود دیکھ کر آیا ہوں۔ سال کا جسم یوں تھا جیسے جیسے چکنی مٹی کا بنا ہوا اور زرد رنگ جیسے بہت بدل آئی ہوئی ہو۔ بار حد ہو گئی۔“

ایللی کو جمال کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی تھیں اسے یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے سامنے کوئی سے ہار کر آیا ہو۔ یوں بے کار مصل قسم کی باتیں کرنا اور پھر دو ہتھ چلانا اور نعرے لگانا۔

آئی۔ اس وجہ سے اس کی حیرانگی اور بھی بڑھ گئی۔

”نہ جانے کیا کہہ رہے ہو“ ایلی نے جمل سے کہا ”میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کیا تم پی کر آئے ہو۔“

”لاحول ولا قوۃ جمل گویا دفعتاً“ ہوش میں آگیا ”ایسا کام کبھی نہیں کیا میں نے“ لیکن ”وہ پھر بدست ہو گیا۔“ سمجھ لو پی کر ہی آیا ہوں۔ شراب نہیں پی۔ لیکن سمجھ لو پی ہوں۔ بند بوتل تو نہ تھی پر بڑی نشلی تھی۔“ وہ چلایا ”سمجھ لو مکمل ہو گیا۔ آؤ میں تمہیں واقعہ سناؤں۔“ وہ ایلی کو کھینچنے لگا۔ ”میں نہیں یہاں بات کی تو ریاضت سن لے گا کہ اس کے کان کھڑے ہو جاتے ہیں۔“ وہ رک کر جسم کھانے لگا اور پھر بولا۔

”ویسے یوں بیٹھا رہتا ہے جیسے بھس بھرا ہو مجھے نہیں اچھا لگتا۔“ جمل اسے کھینچ کر نیچے سڑک پر لے گیا۔ ”وہ دیکھو۔ وہ“ اس نے اشارہ کر کے کہا ”مینجر ٹھل رہا ہے میں بھی سوچتا تھا کہ یہ کس قسم کا بزنس ہے کہ کوئی گاہک آتا نہیں دے ہوٹل کھولے بیٹھا ہے۔ اب تو میرا دوست بن گیا ہے۔“ وہ رک گیا۔ ”سلام علیکم“ ہوٹل کے مینجر نے پاس سے گزرتے ہوئے کہا جمل نے ہنس کر اس کی طرف دیکھا۔

مینجر مسکرانے لگا ”سیر کر رہے ہیں آپ“ اس نے جمل سے کہا۔ ”ہاں ذرا یہاں تک جا رہے ہیں۔“ جمل نے جواب دیا۔ مینجر سے دور نکل کر جمل پھر ہنسنے لگا۔ ”اب تو مزے ہو گئے۔ اب زندگی سنے کی ہے۔“

”آخر کچھ پتہ بھی چلے۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”اب کیا ہو گیا ہے۔“ ”میں بھی روز سوچا کرتا تھا۔“ جمل نے کہا ”کہ جب موٹر سائیکل والا آتا ہے اور میں میں تو یہ ٹامی بھاگتے کیوں ہیں۔“

”تو کیا پتہ چلا۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”موٹر سائیکل والا ڈنڈا گورا ہے۔“ جمل بولا ”ڈنڈا گورا۔“ ایلی نے تعجب سے دہرایا۔ ”ہاں۔ ان ٹامیوں کا سارا جنٹ ہے وہ“ اسے ڈنڈا گورا کہتے ہیں یہ سالے اس بارے میں

شراب پیتے ہیں اور ہوٹل والے نے اپنے ہاں پانچ چھ لال بیسیاں رکھی ہوئی ہیں۔“ ”مال بیسیاں؟“ ایلی نے تعجب سے جمل کی طرف دیکھا۔

”ارے وہی۔ ہیرامنڈی کی عورتیں اور کون۔“ جمل مسکرانے لگا۔

”کیا مطلب۔“ ایلی نے حیرانی سے کہا۔ ”اس ہوٹل میں جو بورڈنگ تھ واقع ہے۔“

”ہاں۔ یہ ہوٹل تو محض بھانہ ہے دراصل مینجر کا کاروبار ہی یہی ہے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر کیا۔“ جمل ہنسا۔ ”میں نے گوروں سے کہا میں نے کہا سالو ڈنڈا گورا آئے گا تو بتاؤں گا

میں کہ تم بد معاشی کرتے ہو۔ پہلے تو وہ بات کو مذاق میں ٹالتے رہے پھر کہنے لگے اور تم یہاں

کیوں آتے۔ تم بھی تو لال بی بی کے لیے آتا ہوٹل میں۔“ جمل ہنسنے لگا۔ ”میں نے کہا: ”ہم

رپورٹ کرے گا کہ تم نے گند چھایا ہے یہاں۔ اور ایلی کچھ دیر کے بعد ایک جیب سے چاکلیٹ

نکالا اور مجھے دیکر کہنے لگا اچھا بھائی نہیں چاکلیٹ دینا ہم تم کو۔ میں نے کہا نہیں سالو چاکلیٹ دے

کرنا ہے ہمیں۔ ہم رپورٹ کرے گا ضرور کرنے گا۔ پھر وہ بولا کیا لے گا۔ بس میں نے کہا

اب بھنے سالے۔ میں نے کہا ہم کو لال بی بی کے پاس لے چلو۔ اس پر وہ ہنسنے لگے بہت ہنسے

بولے۔ ”اچھا دل دل تم بھی جانا نکلتا۔“ پھر ان میں سے دو مینجر کے پاس گئے اور کچھ دیر تک

اس سے باتیں کرتے رہے۔ پھر انہوں نے اشارے سے مجھے بلایا اور ہوٹل والا مجھے اندر لے

گیا۔

”ارے ایلی۔“ جمل نے تہہ بند جھانڈ کر کہا۔ ”سالی کا جسم یوں تھا جیسے گاجنی سے بنی ہوئی

ہے۔ زرد زرد جیسے زردے کی پلیٹ اتنا گھسا ہوا کہ انگلی نہ چبھے واہ واہ اور وہ ہنستی تھی مجھے دیکھ

دیکھ کر مسکراتی تھی۔“

”اچھا۔“ اچھا۔“ ایلی کا حلق بند ہوا جا رہا تھا۔

زرد

اور جب میں باہر نکلا تو مینجر نے سوچا۔ شاید بخشش دے گا۔ میں نے اٹا جھانڈ دی۔

میں نے کہا ”لوگوں کے بورڈنگ تھ تم ایسا کام کرتا ہے۔ ہم رپورٹ کریں گے۔ اس پر وہ ڈر

گیا اور فحش کرنے لگا۔ اور مالوم ہے اس نے کیا کہا۔“

”کیا؟“ ایلی کی آواز بیٹھ چکی تھی۔

کننے لگا ”نہیں جی رپورٹ نہ کرنا۔ جب جی چاہے آجایا کرو۔“ اس نے قہقہہ مارا۔
اب ہم کو فری پاس مل گیا ہے۔ اور اس کے پاس ایک نہیں چھ ہیں۔ چھ۔“ اس نے قہقہہ
جھاڑتے ہوئے کہا۔ ”اب مزا آئے گا۔ سمجھ لو زندگی بن گئی۔“

”اور اور — وہ لڑکی“ ایلی نے پوچھا۔

”کون لڑکی۔“

”جس کی تصویر تم نے مجھے دکھائی تھی۔“ ایلی نے کہا۔

”لڑکی۔“ جمال نے ایک قہقہہ بلند کیا۔ ”ارے ایلی وہ لڑکی نہیں وہ تو میری بیوی ہے
ارے اس کی کیا بات ہے۔ اس کا جواب نہیں۔ مگر یہ زردہ بھی خاصی ہے۔ بڑی اچھی ہے۔
پھر کھانے لگا۔ ”اگرچہ اس میں گڑ کی آمیزش ہے۔ لیکن ایلی اس میں کڑا کا ہے۔ یار کل ہم
کب پڑے گی۔ دعا مانگو کل شام ابھی ہو جائے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”اور دیکھو ایلی۔“ اس نے ہن
سے ایلی کا ہاتھ دباتے ہوئے کہا۔ ”تمہیں بھی لے چلوں گا کسی روز۔ ذرا اپنے پاؤں جلاؤں۔
چلو گے نا۔“

”لا حول ولا قوۃ“ ایلی چلایا

”کیوں لا حول کی اس میں کیا بات ہے ارے کیا تم بھی ریاضت کی طرح مولوی ہو۔ انا
دکنے میں تو نظر نہیں آتے۔ ارے بے وقوف کی تو زندگی ہے۔“

”نہ نہ“ ایلی بولا۔ ”میں نہیں جاؤں گا۔ تم جایا کرو۔“

”لیکن کیوں؟“ جمال نے پوچھا

”بس میرا جی نہیں چاہتا۔“

ویسے ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ زبردستی اسے لے جائے اس کرے میں بند کر دے اور وہ ایل
بی بی جس میں گڑ کی آمیزش تھی چاروں طرف سے زبردستی اسے گھیر لے حتیٰ کہ فراہ کی تم
راہیں بند ہو جائیں — لیکن دفعتاً اسے شہزاد کی بند بیشک کا خیال آ گیا — لال بابا
قہقہہ مار کر ہنسی۔ بس بابو۔ بس۔ اس کی آواز میں ہلا کی تحقیر تھی۔

”نہیں نہیں“ ایلی چلا کر بولا۔ ”میں مجبور ہوں بالکل مجبور۔“

اگلے روز سارا دن جمال بے تلی سے شام کا انتظار کرتا رہا۔ پھر جب سورج غروب ہوا

لو میکلوڈ روڈ کی بتیاں روشن ہو گئیں تو جمال کھانا ہوا ایلی کے پاس آیا۔

”ایلی میں جا رہا ہوں۔ اگر کوئی گڑ ہو جائے تو خیال رکھنا۔“

اس کے بعد ان کا یہ معمول ہو گیا۔ سارا دن جمال بڑی بے تلی سے شام کا انتظار کرتا۔
جن جوں دن ڈھلتا اس کے کھانے کی شدت بڑھتی جاتی اور پھر جب شام کا دھند لگا چھا جاتا اور

میکلوڈ روڈ پر بتیاں ٹٹٹٹٹ لگتیں تو جمال کپڑے بدل کر تیار ہو جاتا اور مسکراتا ہوا نیچے اتر
جاتا اور ایلی چپکے سے اپنی چارپائی پر دراز ہو کر آنکھیں بند کر لیتا اسے یوں محسوس ہوتا جیسے وہ

دلت پور میں ہو۔ اور بالائی چارپائی اس کے قریب ہو۔ اور پھر لال کے ہاتھ جنبش میں آجاتے۔

ایک روز جمال خوشی خوشی ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“ وہ چلانے لگا۔ ”ذرا باہر آؤ۔ تمہیں

کچھ بتاؤں۔ باہر برآمدے میں۔“ اس نے ایک ریشمی رومال جیب سے نکالا۔ ”یہ دیکھو۔“ وہ بولا
”کتنا خوبصورت ہے“ ہے نا۔ یہ اس نے دیا ہے۔

”کس نے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اسی نے جو زرد رنگ کی ہے جسے میں پہلے روز ملا تھا۔“ جمال بولا۔

”اچھا۔“

”آج جب میں باہر آنے لگا تو برآمدے میں اس نے مجھے پکڑ لیا۔ کننے لگی آپ تو ملتے ہی

نہیں۔ اچھا میری نشانی تو لیتے جاؤ۔ کیا بتاؤں تمہیں اس کی آنکھوں میں کیا عالم تھا اس وقت جیسے

بتیاں روشن ہوں۔ کبکنت نے ایسی محبت بھری نظر ڈالی کہ میری ہڈیاں پختنے لگیں میں بتاؤں

تمہیں۔“ — جمال دفعتاً رک گیا۔

”بتاؤ نا“ ایلی نے کہا

”اسے مجھ سے عشق ہو گیا ہے۔“ جمال نے رومال لہراتے ہوئے کہا۔

”ان کو بھی عشق ہوتا ہے کیا۔“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”تمہیں نہیں معلوم۔“ جمال قہقہہ مار کر ہنس۔ ”جب ان کو عشق ہوتا ہے تو مزہ آ جاتا

ہے جس سے عشق ہو جائے۔ اپنا آپ بیچ کر اسے دے دیتی ہیں۔“

”کیا واقعی؟“ ایلی نے پوچھا۔

”تمہاری قسم“ جمال نے چھاتی نکال کر کہا ”ان کے عشق کی کیا بات ہے۔“

”اچھا۔“

”تم جاگ رہے ہو ایللی۔ مجھے بھی نیند نہیں آتی۔ کبخت کا خیال سونے نہیں دیتا۔ لیکن جنہیں کیا ہے جنہیں نیند کیوں نہیں آتی۔“
 ”مجھے تو کچھ بھی نہیں“ ایللی جواب دیتا۔
 ”کچھ بھی نہیں پھر بھی نیند نہیں آتی۔“ جمل ہنستا ”وہ دیکھو ریاضت یوں پڑا ہے جیسے کل کامرا ہوا ہو۔“

ہنگامہ

اسی طرح ان کی زندگی حسن منزل میں گزرتی رہی۔ لیکن ایک روز جب شام کے وقت ایللی برآمدے میں محوم رہا تھا اور جمل بن سنور کر نیچے جا چکا تھا تو سڑک پر شور و غل ہوا۔ بہت سے سپاہیوں نے ہوٹل پر یورش کر دی۔ ایللی کو معلوم نہ تھا کہ آیا جمل ہوٹل میں ہے یا کہیں اور اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ اگر وہ ہوٹل میں ہے تو کس طرح اسے باہر نکل لائے۔ اسے اس بات کے متعلق بھی علم نہ تھا کہ پولیس کے سپاہی وہاں کیوں کھڑے تھے۔ اور گورے بھاگ کر پارسی کی کوٹھی میں کیوں داخل ہو گئے تھے۔ وہ کچھ دیر تک وہاں کھڑا رہا پھر جی کڑا کر کے نیچے اترا کیونکہ بورڈنگ کے تمام طلباء برآمدے میں آکھڑے ہوئے تھے اور وہاں ایک بھیڑ لگ گئی تھی۔

سڑک پر پہنچ کر پہلے تو وہ سپاہیوں کی طرف دیکھتا رہا پھر ہمت کر کے آگے بڑھا لیکن ایک سپاہی نے اسے روک دیا۔ ”اونموں آگے جانے کا حکم بند ہے۔“

وہ ڈر کر رک گیا دیر تک وہاں کھڑا رہا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ سپاہی مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ گھبرا گیا اور کوپر روڈ پر تکیے کی طرف چل پڑا ابھی وہ چار ایک قدم چلا تھا کہ تکیے کے قریب سے جمل نے سر نکالا۔

”ارے ایللی ارے ایللی۔“ وہ آہستہ سے چلایا ”تم ہو کیا۔“ وہ رک گیا۔
 ”شکر ہے۔“ جمل بولا ”تم آگئے ہو۔ ارے یار میں تو پھنس گیا۔ اور اگر پولیس پکڑ لیتی تو میں غسل خانے میں تھا کہ وہ آگئے۔ میں نے جو شور سنا تو فوراً پھجواڑے کے دروازے کی طرف سے نکل کر تکیے میں آگیا۔ وہ ادھر تو نہیں آرہے۔“
 ”نہیں تو۔“ ایللی نے کہا۔ ”وہ تو ادھر کھڑے ہیں۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“

”ہاں۔ یار کبھی تم بھی چلو تمہیں دکھاؤں۔ واقعی زروے کی پلیٹ ہے اتنی مٹاس ہے لٹا رس ہے کہ حد ہو گئی یار“ وہ جوش میں کھجائے لگا۔ ”کسی روز جب میجر ادھر ادھر ہو جائے گا میں تمہیں لے چلوں گا۔“
 ”نہیں نہیں“ ایللی چلایا۔

”ویسے نہیں۔“ جمل نے کہا۔ ”یونہی دکھانے کے لیے۔ بڑی پیاری باتیں کرتی ہے اور پھر میل نہ لین نہ دین۔ مجھ سے کیا لالچ کرتا ہے اس نے۔ میں تو فری پاس والا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

جمل کی باتیں سن کر ایللی کو خیال آتا کہ کاش وہ بھی فری پاس والا ہوتا۔ اسے بھی کوئی شغل کے طور پر رومل دیتا۔ لیکن کس برتے پر۔ وہ سوچتا مجھ میں وہ جھپٹ بھی ہو۔ وہ مردانہ چہرہ وہ جوش جس کے بغیر عورت کسی کو پیار نہیں کر سکتی۔ پھر اسے شہزاد کا خیال آ جاتا۔
 نہ جانے شہزاد کیا کہہ رہی ہو گی۔ نہ جانے شریف وہیں ہے یا جا چکا ہے۔ اگر شریف وہیں ہے تو وہ اسے لہانے میں مصروف ہو گی۔ آخر وہ اس کا خاوند ہے۔

”نہیں نہیں“ وہ گھبرا کر چلاتا ”شریف وہاں نہیں ہے۔ وہ تو کب کا جا چکا ہو گا اس کی چٹی عرصہ دراز سے ختم ہو چکی ہو گی آخر سرکار ان گنت چھٹیاں تو نہیں دیتی اپنے ملازمین کو کپے دے سکتی ہے۔ ورنہ کام کیسے چلے۔“ اس خیال پر اس کی تسکین سی ہو جاتی لیکن پھر اس کے تجھیل میں رضا سونٹا نکلتے ہوئے آکر چلاتا۔

”بچ۔۔۔ بچ۔“

پھر ارجمند کی آواز سنائی دیتی۔

”ارے اندھے یہ وہ دیوی ہے کہ جس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ لے اس کا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ تیاگ کر سادھو بن جائے۔ واہ واہ کیا جاوہ ہے۔“

پھر شہزاد غفور کے ساتھ کوٹھے پر ٹہلنے لگتی۔ ”ہی ہی ہی ہی“ اس کے رتھیں تھپتھپ گونجن اور غفور کی بھدی آواز سنائی دیتی۔ اور پھر دفعتاً خاموشی چھا جاتی اور خاموشی معنی خیز بن جاتی۔ اور اس کا مفہوم ایللی کی آنکھوں کے سامنے کئی ایک منظر پیش کر دیتا۔ جنہیں دیکھ کر اس پر دی دیوانگی طاری ہو جاتی۔ وہ یوں کروٹیں بدلتا جیسے دار پر چڑھا ہوا ہو۔ اس وقت جمل آہستہ سے آواز دیتا۔

”یار حد ہو گئی پولیس نے ریڈ کر دی شکر ہے بچ گیا میں۔“

وہ دونوں باہر نکل کر ویران سڑک پر یوں ٹہلنے لگے جیسے اتفاقاً سیر کرتے کرتے لومر آئے ہوں۔

اس ڈر کے مارے کہ کہیں پولیس بورڈنگ میں آکر تفتیش نہ شروع کر دے وہ دیر تک آوارہ گردی کرتے رہے۔ اور آخر تھک ہار کر اپنے کمرے میں جا بیچے اور اپنی اپنی چارپائی پر کرلیٹ گئے۔

اگلے روز کالج جاتے ہوئے انہوں نے ہوٹل کی طرف دیکھا۔ وہاں تالہ پڑا ہوا تھا۔

”ارے“ جمال چلایا۔ ”یہ لوگ کہاں چلے گئے۔“

”جہاں سے آئے تھے وہیں چلے گئے باؤ۔ اور کہاں جائیں گے۔“ گنڈیری والے نے کہا۔

”کہاں“ جمال نے پوچھا۔

”وہیں ہیرا منڈی یا موتی بازار میں اور کہاں جائیں گے۔ کبھی دھند ابھی چھٹا ہے۔“ وہ بولا۔

”اور یہ جگہ؟“ جمال نے پوچھا۔

”یہ جگہ“ گنڈیری والا ہنسا۔ ”یہ جگہ کسی تیل صابن والے نے لے لی ہے۔ دکان کھولے گا“

”یہاں“

راتے میں جمال بار بار ایللی سے کہتا۔ ”اب کیا ہو گا ایللی اب ہم کیا کریں گے زردے کی پلیٹ کیسے ملے گی۔ کیا خوب چیز تھی۔ اب میں تمہیں کیا بتاؤں اس کے گمن تو اب کھلے گئے تھے مجھ پر اب کیا کروں ایللی۔“

وہ بار بار ایللی سے یوں پوچھ رہا تھا جیسے ان معاملات میں ایللی سے بڑھ کر کوئی اتھارٹی نہ ہو۔

اور ایللی چپ چاپ اس کی باتیں سنے جا رہا تھا۔ درحقیقت اسے خود دکھ محسوس ہو رہا تھا اگر وہ

زردہ کو دیکھنے کی کوئی صورت نہ تھی۔ پھر بھی امکان تو تھا۔ اس نے کئی بار سوچا کہ کسی روز بچے

سے نیچے اتر جائے اور پھر زردہ سے مل کر کہے ”نہیں نہیں میرا میں آنے سے کوئی مقصد نہیں

میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لئے آیا ہوں۔“

اس وقت ایک زرد رنگ کی نوجوان لڑکی اس کے رویرو آکھڑی ہوتی۔ وہ پٹی پٹی آنکھوں

سے ایللی کی طرف دیکھتی جو صرف اسے دیکھنے کے لئے آیا تھا۔ پھر اس کی حیرت بھری نگاہیں

احساس خمیں سے چھلکتیں اور ایللی دفعتاً ہیرو بن جاتا اور وہ زرد رو لڑکی اس کی منتیں کرنے

”لیکن ذرا بیٹھے تو۔ صرف دیکھنے کے لیے ہے۔ میرے لیے اتنی تکلیف نہ کرو گے۔“

مرف دیکھنے کے لئے اس کے بازو ایللی کے گرد حائل ہو جاتے اس کی آنکھوں میں وہ نگاہ چمکتی

دی نگاہ جس کی وجہ سے وہ شہزاد کو بھول نہ سکتا تھا۔

ہوٹل کے بند ہو جانے کے بعد جمال کی توجہ پھر اسی تصویر پر مرکوز ہو گئی جسے وہ ہوٹل میں

ہلنے سے پہلے دیکھ دیکھ کر وقت گزارا کرتا تھا۔

”آج کوئی خط نہیں آیا ایللی“ آج پھر کوئی خط نہیں آیا۔ اس طرح زندگی کیسے کٹے گی میں

نے کہا میں دو روز کی رخصت لے کر گھر سے نہ ہو آؤں۔ یہاں اب میراجی نہیں لگتا۔ اور وہ

بکاکے گی کہ گئے ہوئے اتنی دیر ہو چکی ابھی تک مجھ سے ملنے نہیں آیا۔ کیا سمجھے گی۔ اسے کیا

معلوم کہ یہاں اس کے بغیر وقت کاٹنا مشکل ہو رہا ہے۔“ جمال شدت سے کھجنا شروع کر دیتا۔

”راصل ایللی مجھے اس سے بہت ہی محبت ہے۔ بے حد۔ اس کے بغیر چلنا دو بھر ہو جاتا ہے۔ کیا

کروں۔“

بمردہ یکدم پیشتر بدل کر کہتا۔ ”ایللی۔ وہ زردہ کیا کہے گی کہ مجھے بھی نہیں ملنے کی کوشش

بھی نہیں کی۔“

”لیکن وہ تو چلی گئی ہے یہاں سے۔“ ایللی نے کہا

”لیکن وہیں گئی ہے نابیرا منڈی میں۔ اسے ڈھونڈنا کیا مشکل ہے۔ یار مجھے اس کا شکریہ تو

لوا کرنا چاہیے کم از کم۔“

”تو پھر“ ایللی نے پوچھا۔

”تم ہاتھ تو دونوں چل کر اسے ڈھونڈیں۔“

”لیکن ڈھونڈیں گے کیسے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”گویہ بھی کیا مشکل ہے کیا اس کو بچے سے گزرتے جائیں گے اور دیکھتے جائیں گے اگر وہ

نہیں ہے تو کھڑکی یا دروازے میں بیٹھی ہو گی۔ چھپ کر تو نہیں بیٹھیں۔ ان کا تو کام ہی ایسا

ہے۔“

ایللی کو ہینہ ملیا۔ ”یار“ وہ بولا ”مجھے تو نہ لے کر جاؤ اپنے ساتھ۔“

”لو اس میں کیا ہے۔“ جمال کہنے لگا۔ ”وہاں کوئی اپنا جان پہچان تو ہو گا نہیں پھر ڈر کیسا۔“

”مجھے تو ڈر آتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو گھڑی باندھ لینا تاکہ کوئی پچانے نہیں۔“

اس روز وہ دونوں راستے میں اسی بحث میں الجھے رہے۔ ایلی کو اس کے کپے میں بند سے ڈر لگتا تھا لیکن ساتھ ہی وہ چاہتا تھا کہ کسی طریقے سے جمل اسے زبردستی لے جائے اور جا کر دیکھے کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ وہ کس طرح بیٹھتی ہیں۔ کس طرح اپنی نمائش کرتی ہیں اور اگر زندہ مل جائے تو وہ اس سے کسے گا۔ میں تو صرف تمہیں دیکھنے کے لیے آیا ہوں لیکن میں کو نہ بتانا۔ میں اب چلتا ہوں صرف دیکھنے کے لئے۔ زندہ کی نگاہوں میں خمیں جھکنے لگی۔ وہ بیڑہ کر اسے اپنے بازوؤں میں لے لے گی اور کہے گی۔ نہیں میں جمل کو کیوں ہٹانے لگی۔

اس کوچے میں

پہننے کو شام ہی سے جمل نے تیاریاں شروع کر دیں تھیں۔ پہلے اس نے ایک طویل حل کیا پھر ٹنک کے پاس بیٹھ کر دیر تک پہننے کے لیے کپڑوں کا انتخاب کرتا رہا۔ بلاخر کپڑے پہن کر خوشبو لگائی۔ سرے بالوں کو بڑے اہتمام سے بنایا۔ منہ پر کریم کی مالش کی بوٹ چپکایا اور ہلرا تیار ہو بیٹھا جیسے عید کی نماز پڑھنے جا رہا ہو۔

شام کے قریب وہ دونوں چل پڑے تھے۔ بھائی دروازے پر وہ تانکے سے اتر گئے تاکہ والے سے یہ نہ کہنا پڑے کہ انہیں کہاں جانا ہے۔

اس علاقے میں گھومتے گھومتے انہیں کافی دیر ہو گئی۔ کیونکہ انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ کوچہ کہاں واقع ہے۔ جمل چوباروں میں راگ رنگہ کی محفلیں ہو رہی تھیں۔ ساز مرکے با رہے تھے۔ بانیاں تائیں اڑا رہی تھیں لوگ یوں گھوم پھر رہے تھے جیسے میلے پر آئے ہوں۔ کسی سے پوچھے بغیر اس بازار میں پہنچنا آسان کام نہ تھا۔ لیکن اس کوچے میں پہنچنا بہ مشکل تھا۔

دیر تک وہ چکر لگاتے رہے اور اس امر پر بحث کرتے رہے کہ آخر وہ کیسے وہاں پہنچیں گے۔

اس کوچے کے متعلق کسی سے دریافت کرنے کی ان دونوں میں ہمت نہ تھی۔ اور وہاں کیے بغیر وہاں پہنچنا ناممکن معلوم ہو رہا تھا۔ آخر تھک کر وہ ایک بائی کے حمارے کے ملنے

وہاں ہوٹل میں چائے پینے کے بہانے بیٹھ گئے لیکن چائے کا پیالہ لے کر وہاں دیر تک بیٹھنا تھکنہ تھا۔

”وہاں بھی لوگ بلا تکلف بائیوں کے متعلق باتیں کر رہے تھے۔“

”اس منہی بائی کے متعلق سنا تھا تم نے استاد۔ کہتے ہیں سیٹھ جمناداس سے مینڈی کھلوانے کی تیاریاں ہو رہی ہیں۔“

”اور بھی اس نے تو میں ہجار دیا ہے بڑی بائی کو مینڈی کھلوانے کے لیے۔“

”کیوں نہ لے میں ہجار جچ بھی تو غضب کی ہے۔“

”پر گناہاں نہیں آوے ہے لڑخی کو۔“

”ایلی قدرت بھی حساب سے دیتی ہے۔ کسی کو گلا دیوے ہے تو کسی کو جوبن کیوں پاو۔“

اس نے جمل کو کہنی مار کر پوچھا۔

ایلی اور جمل نے دانت نکالے ”ٹھیک ہے میر صاحب۔“

”ہاں کمالے دو ایک سال پھر وہاں گلی میں جا کر بیٹھ جائے گی۔“ استاد ہنسنے لگا۔ ”بازار میں تو اسی کا ٹھکانہ رہ سکتا ہے جس کا گلا اچھا ہو۔ کیوں فٹلے۔“

فٹلے ہنسنے لگا ”ٹھیک ہے استاد۔ گلی میں ہی بیٹھنے کی اور کیا۔“

”کوئی گلی میں۔“ ایلی نے فٹلے کے قریب ہو کر پوچھا۔

”ایلی اسی میں۔“ پھر اس نے غور سے ایلی اور جمل کی طرف دیکھا۔ ”تم پردیسی ہو پاو۔“

”ہاں ہاں۔“ جمل بولا۔ ”امرتسرے آئے ہیں۔“

”ہی ہی ہی ہی“ فٹلے ہنسنے لگا جیسی گلی کا پتہ نہیں۔“

”بھرمی کہاں ہے وہ“ جمل نے دوبارہ پوچھا۔

”یہ تھانے کے سامنے جو ہے۔ پر پاو یہاں کامل اچھا نہیں۔ بس دو تین ہی کام کی ہیں باقی سب براتی کامل ہے۔“

چائے ختم کر کے وہ پھر اسی چکر میں مصروف ہو گئے۔ لیکن اب مشکل حل ہو چکی تھی۔

”اب وہ کی راہ گیر سے پوچھ سکتے تھے کیوں میاں تھانہ کدھر ہے اس علاقے کا۔“

دفتر“ ایلی خوشی سے چلایا۔ ”تھانے کا بورڈ تو میں نے پڑھا تھا۔ کسی چوک کے قریب تھا۔

ایلیس رہا کس چوک کے قریب تھا۔“

دراصل وہ بے حد گھبرایا ہوا تھا۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور نگاہوں میں گھبراہٹ

نہی۔ کئی دیر تک تو ایلی نے آنکھیں اٹھا کر ان بیٹھی ہوئی عورتوں کی طرف دیکھنے کی جرأت نہ کی۔ مجرب اس نے محسوس کیا کہ کوئی بھی اس کی طرف نہیں دیکھ رہا تو اس نے ایک سرسری نظر بھری نگاہ ریشیوں پر ڈالی۔ انہیں دیکھ کر اس کا جی متلانے لگا۔ لاجول دلاقوہ اس نے زیر

اس جگہ و تاریک محل کھاتی ہوئی کھلی میں وہ لالٹینوں کی بیڑوں کے نیچے بن سنور کر بیٹھی ہوئی تھیں۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے مویشیوں کی سیلے میں بھینس دیکھ رہا ہو۔ ان کی جوانیاں لٹی ہوئی تھیں۔ آنکھیں سوچ رہی تھیں۔ ہونٹ یوں لٹکے ہوئے تھے جیسے جو تکس ہوں۔ چروں پر تھپا ہوا پاؤں اور سرخی انہیں اور بھی بھیاں بنا رہا تھا۔ ایلی نے جھرجھری لی۔ وہ بازار حسن نہیں تھا بلکہ بڑے ہوئے بدبودار گوشت کی منڈی تھی۔

ریشیوں کے چروں پر ترو تازگی اور معصومیت نہ تھی۔ بلکہ حزن و ملال اور اداسی چھائی ہوئی تھی۔ ان کی حرکت بھونڈی تھیں۔ آوازیں یوں سنائی دے رہی تھیں جیسے پھٹے ہوئے لٹائی ہوئے ہوں اور وہ اعلانیہ لوگوں کو بلا رہی تھیں۔ یا یوں بازو اٹھاتیں جیسے کسی کو گلے لگنے کی خواہش میں بے قرار ہو رہی ہوں۔ ایک انگڑائیاں لیے جا رہی تھی۔ لیکن اس کی انگڑائیوں میں اکتاہٹ اور حسرت تھی۔ دوسری روٹی لے میں کچھ گنگنا رہی تھی۔ اس کا گیت دکھ بھرا تھا۔

نواہ تر عورتیں چپ چاپ بیٹھی انتظار کر رہی تھیں کہ کب کوئی آکر ان سے سودا کرے۔ مودل کے گرد ان کے سامنے کھڑے انہیں گھور رہے تھے۔ ان کے جسموں کو ٹٹل رہے تھے ان کے ناک نقشے پر پھبتیلیں اڑا رہے تھے۔ ان کی عمروں کے متعلق اندازے لگا رہے تھے اور ان سے قش مذاق کر رہے تھے۔ وہ ان کی باتیں سنتی تھیں لیکن انہیں ان سنی کر دینے پر مجبور تھیں۔ وہ ان کی منگھل خیر نگاہوں کو برداشت کرنے پر مجبور تھیں۔ ان کی نکتہ چینی کے غلبہ میں سکرانے پر مجبور تھیں۔

دفعہ ایلی نے محسوس کیا کہ عورت کے لیے اس سے بڑی بے عزتی کوئی نہیں ہو سکتی کہ اس کے سامنے کھڑے ہو کر اس کے کولوں، چھاتیوں اور جسم کے نکالیں گتیں یا اس کے منہ میں یا عمر کے متعلق پھبتیلیں اڑائیں۔

تھانہ تلاش کرنے میں انہیں چنداں وقت نہ ہوئی۔ تھانے پہنچ کر اس کھلی کو نہ دیکھنا ناممکن تھا کیونکہ بہت سے لوگ ادھر سے آرہے تھے۔ وہ قہقہے لگا رہے تھے۔ ایک دوسرا کنیاں مار رہے تھے آنکھیں چکا رہے تھے۔ کئی ایک تو با آواز بلند گارہے تھے۔

وہاں پہنچ کر ایلی کا دل بیٹھنے لگا۔ اس کی ہمت نہ پڑ رہی تھی کہ کھلی میں داخل ہو جائے بات اور تھی۔ وہ تو دوسرے بازاروں کی طرح ایک عام گزر گاہ تھی۔ وہاں چلے ہوئے لوگوں کے متعلق یہ نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ ریشیوں کو دیکھنے کے لیے آئے ہیں یا انہوں نے چھپا رہے ہیں۔

لیکن اس کھلی میں جانا تو اعلانیہ اس بات کا اظہار تھا کہ وہ ان عورتوں کے لیے آئے ہیں۔ اور پھر گانے والیوں کو دیکھنا یا ان کا گانا سننا برائے تھا۔ کھلی کی ریشیوں کو دیکھنا ایلی کی ناگسٹیاں لگائیں۔ لیکن اتنی دور آنے کے بعد اب کھلی میں جانے سے انکار کرنا بھی تو ٹھیک نہ تھا۔

”میں کہتا ہوں۔“ اس نے جمل سے کہا۔ ”میں اندر جا کر کیا کروں گا۔ تم جا کر اے لہو۔ میں تمہارا یہاں انتظار کروں گا۔ اسی جگہ۔“

”نہیں یار۔“ جمل نے اس کے کندھے پر ہاتھ مار کر کہا ”اکٹھے چلے ہیں۔“

”لیکن“ ایلی نے کہا۔ ”اگر وہ مل گئی تو میں وہاں کیسے انتظار کروں گا۔“

”ہاں۔“ جمل سوچ میں پڑ گیا۔ ”مل گئی۔“ اس نے کہا ”تم پھر تم یہاں آکر انتظار کرو۔“

چلوں۔“ وہ اسے کھیٹ کر لے چلا۔

کھلی میں بے حد ہجوم تھا لوگ قہقہے لگا رہے تھے۔ بھونڈے مذاق کر رہے تھے۔ ریشیوں سے بحث کر رہے تھے۔ انہیں چھیڑ رہے تھے۔ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہے تھے جیسے ریشیاں ہی نہ ہوں۔ ایلی یوں جمل کے ساتھ چل رہا تھا جیسے اسے کھلی سے قطعی طور پر نا دلچسپی نہ ہو۔ جیسے وہ وہاں زبردستی لایا گیا ہو۔ ہر راہ گیر کی طرف وہ کچھ اس انداز سے دیکھا جیسے اسے ذہن نشین کر رہا ہو کہ میں تو ویسے ہی آیا ہوں ان کے ساتھ دلچسپی تو صرف انہیں ہے مجھے نہیں۔

خود جمل وہاں پہنچ کر بھول چکا تھا کہ وہ دو گھنٹے کی تیاری کے بعد آیا ہے۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ اس نے نئے کپڑے زیب تن کیے ہوئے ہیں اور ان پر خوشبو لگا رکھی ہے اسے وہ دلچسپی نہ تھی۔ شمس رومل بھی یاد نہ رہے تھے جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔

پھر وہ وہاں کیوں بیٹھی تھیں۔

اس کا خیال تھا کہ جسمانی ہوس پوری کرنے کے لئے عورتیں اس کے لومیں ہانپ کر جسمانی لذت ”یہ بیچاریاں“ وہ سوچنے لگا ”ان کے چہرے تو دکھ بھرے ہیں۔ ان کے اندر صرف آہیں بھرنے کے لیے بنے ہیں۔ اور ان کے لئے ہوئے لپاچ جسم، جسمانی لذت ہی پیدا نہیں ہوتا۔“

ایک ضعیف عورت کو وہاں بیٹھے دیکھ کر وہ حیران ہوا ”یا اللہ یہ اس عمر میں یہ ہے۔“ وہ رک گیا۔ بڑھیا کے سامنے دو جوان مزدور کھڑے اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ ایک مزدور بڑھیا کے قریب تر ہو گیا اور اسے چھیڑنے لگا ”اے لیل تو یہاں کی لپاچ ہے۔“

بڑھیا نے کچھ جواب نہ دیا اور ویسے ہی بیٹھی حقہ چتی رہی۔

مزدور کے ساتھی نے تہقہ لگایا۔ ”مالی تیرے پاس کوئی آتا بھی ہے کیا۔“

”تو ہی آجا بیٹا جو تجھے اتار دے میرا۔“ بڑھیا نے نفرت سے کہا۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اسے گندگی میں دھکا دے کر گرا دیا ہو۔ اس کا دل ہل رہا تھا۔ سرور سے پھٹا جا رہا تھا اور سارے جسم میں جھنجھن سی ہو رہی تھی۔ جیسے اسے جسم کا بند بند کراہ رہا ہو۔ اس کے لیے اس کو بچے میں رہنا ناممکن ہو گیا۔ وہ چاہتا تھا کہ نکل۔ کہہ دے میں جا رہا ہوں۔ میں اب یہاں نہیں ٹھہر سکتا۔

”ایلی ایلی“ کسی نے اس کا شانہ پکڑ کر کہا ”ایلی وہ مل گئی۔“

ایلی نے مڑ کر دیکھا۔ جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیلی ہوئی تھی۔ ”وہ مل گئی ایلی! نے مجھے پہچان لیا ہے۔ اور رومال سے اشارہ کر کے مجھے بلارہی ہے۔ وہ دیکھو۔“ جمال نے لپک کر کوٹھڑی کی طرف اشارہ کیا۔ ”وہ دیکھو جو سرخ قیض پٹنے ہوئے ہے۔ جس کے ہاتھ رومال ہے۔ وہ دیکھا وہ مسکرا رہی ہے۔ ارے“ وہ چلایا ”وہ مجھے بوسے پھینک رہی ہے۔“ ایلی نے اس طرف دیکھا ایک تنگ و تاریک کوٹھڑی کے دروازے میں سرخ قیض ایک دہلی پتلی عورت بیٹھی تھی۔ اس کے کلوں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں۔ ہاتھوں میں جھوڑی پڑی تھیں۔ اور آنکھیں یوں کھینچی ہوئی تھیں جیسے ان میں بند ہونے کی صلاحیت ہی نہ رہی۔ ”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”گلی کے باہر تمہارا انتظار کروں گا۔“

گلی کے باہر انتظار کرتے ہوئے وہ سوچتا رہا لیکن اس میں سوچنے کی صلاحیت نہ رہی تھی۔ غلبہ نفرت کی وجہ سے اس کے جسم کا بند بند کانپ رہا تھا۔ گلی کے بد صورت چہرے اس کے سامنے تھے۔ ان کے سوجے ہوئے منہ۔ پھٹی پھٹی آنکھیں اور مجروح جسم ایلی کے دل میں نفرت کی بجلی بج رہی تھی۔ اور یہ نفرت اس حد تک شدت اختیار کر چکی تھی کہ اس کا جی چاہتا تھا کہ ہمارا کر دیوانہ دار گلی میں جا داخل ہو۔ اور کسی بد صورت ڈائن کی کوٹھڑی میں داخل ہو کر کے میں آگیا ہوں میں آگیا ہوں مجھے اپنی غلاطت سے بھر دے۔ مجھے اس گندگی سے شرابور کر دے۔ میری ہڈیاں توڑ دے، مجھے فنا کر دے۔ اور پھر اس کے غلیظ جسم پر ڈھیر ہو جائے۔

ایلی کے دل میں عجیب متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ کسی وقت اس تضاد کو محسوس کر کے گہرا جاتا اور اسے خیال آتا کہ اس کی سرشت میں نہ جانے کیا خاں ہے کہ اس کے دل میں ایک وقت ایسی متضاد خواہشات پیدا ہوتی تھیں۔ بسا اوقات اسے شک پڑتا کہ وہ دیوانگی کا شکار ہے۔

ان خیالات سے بچنے کے لیے دیر تک وہ تھانے کی عمارت کا جائزہ لیتا رہا۔ بازار کو غور سے دیکھتا رہا۔ راہ گروں کو جانچنے کی کوشش میں شدت سے مصروف رہا۔ لیکن جب وہ ذرا بے خبر ہوتا تو اس کی نگاہ کے تلے اسی گلی کے چہرے نمودار ہو جاتے ان کی کمرہ مسکراہٹیں اسے ہلاں طرف سے گھیر لیتیں۔ ان کے تباہ شدہ لٹے ہوئے جسم اس کی طرف بڑھتے دل میں نفرت کی دھمکی بچا شروع ہو جاتی۔ اور پھر وہی دیوانہ پن اس پر مسلط و محیط ہو جاتا۔

”کس خیال میں پڑے ہو“ جمال نے اس کے قریب آ کر اسے جھنجوڑا۔ ”سننے ہی نہیں“

”وہ تم آگئے“ وہ چونکا۔ ”مل آئے زورہ سے“ اس نے پوچھا۔

”ارے نہیں وہ تو کوئی اور ہی نکلی لیکن اچھی تھی بیچاری۔ اتنی اچھی تھی کہ میں تمہیں کیا بتاؤں کتنی تھی مجھے تم سے پیار ہو گیا ہے۔ ایمان سے یہی کہتی تھی دیکھتے ہی پیار ہو گیا اور اس قدر شوق محسوس کیا میں نے کہ اگر تم اشارے سے نہ آتے تو خود آکر تمہارا ہاتھ پکڑ لیتی۔“

ایلی نے حیرانی سے جمال کی طرف دیکھا۔ خوش قسمت تھا وہ جو بھی اسے دیکھتی تھی اسے ہمارا کرتے لگتی تھی۔ کاش ایلی نے آہ بھری۔

راستے میں جمال اسے اپنے اس نئے عشق کے قصے سنا رہا تھا۔ تفصیلات بتا رہا تھا لیکن ایلی اپنے ہی خیالات میں گمن چلا جا رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ جمال میں کون سی بات ہے جس کی وجہ

انٹرنیشنل ڈرامہ پڑھانے والے پروفیسر کی مونچھوں سے اسے ڈر آتا تھا۔ اسے دیکھ کر وہ
موس کیا کرتا تھا کہ کسی سکول کے ماسٹر نے پروفیسر کا چٹا پن رکھا ہو۔ اس لیے ڈرامے کے
ویڈیو میں ایلی بیٹھے کے لیے خاص طور پر ایسے مقامات تلاش کرتا تھا جہاں پروفیسر کی نگاہ نہ
پڑے۔ ڈرامہ کے پروفیسر کے پڑھانے کا انداز بھی تو عجیب تھا۔ سبق کی ابتدا میں تو پروفیسر کی
طرح بات شروع کرتا۔ پھر بتدریج جوں جوں وقت گزرتا پڑھانے کے بجائے پلیٹ فارم پر ڈرامہ
کھیلنا شروع کر دیتا۔

وہ ایکٹروں کی طرح ہاتھ چلاتا۔ منہ بتاتا۔ پروفیسر کو ایکٹنگ کرتے دیکھ کر اسے علی پور کا وہ
زخ من یاد آ جاتا جہاں انہوں نے ڈرامہ کھیلا تھا اور پھر سانوری اس کے سامنے آ جیتی تھی اور
ڈیک اسے دیکھ کر جوش میں آ جاتا اور اپنا ڈنڈا بے پرواہی سے گھماتا اور سٹیج پر کھڑے دیگر
ایکٹرز پر چلاتے۔ ”اے خیال سے بے کسین زخمی نہ کر دیتا کسی کو۔“ اور ناظرین ڈیک کی
بہترین حرکات کو دیکھ کر تائیاں پیٹتے اور واہ واہ کا شور مچا جاتا۔

ایلی کو امرتسر کی آم والی کوٹھی یاد آ جاتی اور نور اپنی تمام تر رعنائی سے ٹپکتے ہوئے گانے
گاتا پھر شہر گلوں سے ہمارا آ جاتی۔ ندی کا پانی رک جاتا اور ندی ایک وسیع نیلی جھیل میں تبدیل
ہو جاتی اور درختوں پر کوئل کوکتی۔ کھیتوں میں سروسوں لہلہاتی اور آصف مسکرا کر اس کی طرف
دیکھتا اور آہ بھر کر کتا آ جاؤں ایلی یہاں شہر گلوں ہے۔

گلی بار ایسا بھی ہوا تھا کہ جب وہ جماعت میں اپنے تخیل میں کھویا ہوا تھا تو اس کے ساتھی
نے اسے جھجھوڑ کر جگایا تھا اور اس نے دیکھا تھا کہ جماعت کے تمام لڑکوں کی نگاہیں اس پر مرکوز
تھیں اور مونچھوں والا ایکٹر پروفیسر اس پر پھبتیاں کس رہا تھا۔

آئناکس کے پیریڈ میں ایسا حادثہ ہر لمحہ ہوا تھا۔ اسی لیے آئناکس کے پیریڈ میں کبھی کسی کا
اور عموں نہ ہوا تھا۔ آئناکس کے پروفیسر ہر لحاظ سے انگریڈ ریٹرنڈ قسم کی طبیعت کے مالک تھے۔
اگرچہ وہ انگلستان سے ڈگری لے کر واپس آ چکے تھے۔ مگر ذہنی طور پر وہ ہمیشہ کے لیے انگلستان
میں مقیم ہو چکے تھے۔ وہ خوبصورت لباس پہن کر جماعت میں داخل ہوتے تھے اور آتے ہی
ڈانسر کھول کر حاضری لگانے میں مصروف ہو جاتے تھے۔ حاضری لگاتے وقت انہوں نے کبھی سر
ٹھاکر لڑکوں کی طرف نہ دیکھا تھا۔ حالانکہ انہیں اچھی طرح معلوم تھا کہ لڑکے یس سرکنے کے
بہت عرصے سے باہر نکلتے جا رہے ہیں۔ انہیں اس بات کی قطعاً پرواہ نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے

سے وہ اس سے عشق کا اظہار کرنے پر مجبور ہو جاتی ہیں۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس
مردانہ جھپٹ ہوتی۔ کاش۔

چار ایک روز کے بعد جمل بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی!“ اس نے شکر
”کما“ یہ مجھے کیا ہو گیا ہے؟“ مجھے کچھ ہو گیا ہے۔“

”کیا ہو گیا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔
”کچھ پتہ نہیں چلتا۔ مجھے نہیں پڑتی ہے اور میں نے ڈاکٹر کو دکھایا تو وہ کہتا ہے
”بیاری ہو گئی ہے۔“

”بیاری کوئی بیاری“ ایلی نے پوچھا۔
”وہ بیاری“ جمل بولا۔ اس کے چہرے پر تشویش کا اظہار ہو رہا تھا۔ ”اگر میں
تمام لڑکوں کو معلوم ہو جائے گا۔ مجھ سے چلا جو نہیں جاتا۔ اس لیے میں گاؤں جا رہا ہوں“
”گاؤں جا رہے ہو۔“

”ہاں ہاں“ وہ بولا۔ ”اس کے سوا اب کوئی چارہ نہیں مجھے جانتا ہی ہو گا“ یہ کہہ کر
ایلی کے ہاتھ میں جھٹی کی عرضی تھادی۔ اور بات کی وضاحت، کیے بغیر اپنے ڈیک پر
قریب سے رکھے لگا۔

”لیکن“ ایلی نے کہا ”آخر بات کیا ہے۔ کچھ بتاؤ گے بھی یار۔“
”ابھی اس نے جملہ مکمل نہ کیا تھا کہ ریاضت داخل ہوا اور جمل نے اشارہ کرنا
خاموش کر دیا۔

اوٹ میں شانتی

جمل کے جانے کے بعد ایلی بالکل ہی تنہا رہ گیا۔ دوپہر تک وہ کالج میں وقت گزرتا
جماعت میں چلا جاتا تھا لیکن ابھی تک اس نے ہم جماعتوں سے کوئی رسم و رواج پیدائشی
اکیلا برآمدوں میں گھومتا رہتا خالی پیریڈ میں یا تو باہر لان میں ٹھٹھا اور یا بازار کی طرف نکلتا۔
ان مقامات پر جانے سے احتراز کرتا جمل کالج کے لڑکے جمع ہوتے۔

جماعت میں وہ آخری بچوں میں بیٹھ جاتا اور جب پروفیسر لیکچر شروع کر دیتا تو وہ کھانسی
لڑکے کے پیچھے ہو کر تخیلات کی دنیا میں کھو جاتا۔

پیرٹ میں حاضر رہنا چاہتے ہیں یا بھاگ جانا چاہتے ہیں۔ انا وہ بھاگنے والوں کے لیے کمر بستہ کرنے کے قائل تھے۔ انہیں اس کی بھی فکر نہ تھی کہ آیا لڑکے ان کے پیکچر کو سمجھ رہے ہیں یا نہیں۔ آیا وہ اسے سمجھتا بھی چاہتے ہیں یا نہیں۔ ان کا انداز بالکل پروفیسرانہ تھا بلی پروفیسر کی بات پر کلن کھڑے کرنے کے عادی تھے جیسے سکول ماسٹر ہوں۔

بہر حال اہلی جماعت میں ضرور بیٹھتا تھا۔ وہ حاضری لگوا کر بھاگتا نہیں تھا۔ اس لیے اسے تعلیم سے دلچسپی تھی یا پیکچر سننے کی خواہش تھی بلکہ صرف اس لیے کہ جماعت کے ایسی جگہ نہ تھی جہاں وہ بیٹھ سکتا ہو۔ جہاں اسے کالج کے لڑکوں سے پناہ مل سکتی ہو۔ کیونکہ اس کے لیے بہترین پناہ گاہ تھی۔ جہاں وہ اپنے تخیل سے کھیل سکتا تھا۔

کالج میں وہ ایک گنہگار لڑکا تھا۔ حتیٰ کہ جماعت کے پروفیسر اور لڑکے اس سے واقف نہ تھے اگر تھے بھی تو سرسری طور پر جب وہ اہلی کی طرف دیکھتے۔ تو ان کی نگاہ میں تحقیق بھری ہوتی محسوس کر کے اہلی کو ایک جھٹکا سا لگتا۔ اس کا جی چاہتا کہ وہ اس جگہ سے بھاگ جائے۔ ان خبر بھری کریدتی ہوئی نگاہوں سے دور بھاگ جائے اور پھر جھم سے شتراداس کے دروازے پر آکر بیٹھ جائے اور اپنی دونوں ہاتھیں اٹھاتی اور وہ اس کی آغوش میں گر جاتا۔

ان دنوں حسن منزل کے قریب کالج والے ایک نیا بورڈنگ تعمیر کر رہے تھے جس میں صرف کیوبیکل بنے ہوئے تھے۔ یہ خبر عام تھی کہ حسن منزل کو خالی کر دیا جائے گا۔ اور حسن منزل کے لڑکوں کو ریوازا یا نئے بورڈنگ میں جگہ دی جائے گی۔ جو کالج کی عمارت کے ساتھ ہی تھے۔ یہ خبر اہلی کے لیے بڑی پریشان کن تھی کیونکہ اہلی کو حسن منزل کی تمنا تھی اور خاموشی کا حد پسند تھی۔ وہ ریوازا ہوٹل میں جانا نہیں چاہتا تھا۔ جہاں لڑکے بے حد ہنگامہ پسند تھے۔

اہلی کی خواہش تھی کہ اسے ایک کمرہ مل جائے جہاں وہ تنہائی میں اطمینان سے رہ سکے۔ الگ کمرہ ملنا آسان نہ تھا۔ نئے ہوٹل کے کیوبیکل خصوصی طور پر سیکنڈ اور فورٹھ ایئر کے لڑکوں کے لیے بنائے گئے تھے اہلی تو تھرڈ ایئر میں تھا اس کے لیے کیوبیکل حاصل کرنا تقریباً ناممکن تھا۔ پھر یوسف اعظم سے جو کالج کے نئے پرنسپل بن کر آئے تھے اور جنہوں نے آتے ہی ان کی وجہ سے کالج میں اپنی دھماک بٹھادی تھی۔

ایک روز جب اہلی اپنے کمرے میں بیٹھا تھا اس کی اس عجیب و غریب بیماری کے متعلق حلقہ رہا تھا جو ابھی تک ٹھیک نہ ہوئی تھی۔ اور جس کی وجہ سے اس نے مزید ایک ہفتے کی چھٹی

لیکھت مسکرا کر کہنے لگا "میرے ابا ڈاکٹر ہیں۔ انہوں نے پرنسپل کو لکھا ہے۔ اس لیے اصل بات یہ ہے۔" وہ گھبرا کر بولا "اگر میں شور و شغب میں رہوں تو مجھے قبض کا عارضہ ہو جاتا ہے۔"

اہلی نے حیرانی سے ریاضت کی بات سنی۔ شور و شغب سے قبض؟ یہ بات اس کے لیے نئی تھی۔ سارا دن وہ سوچتا رہا کہ وہ بھی ایسا ہی کوئی بہانہ تراش لے تو شاید اسے بھی نئے ہوٹل میں جگہ مل جائے اور وہ ریوازا ہوٹل میں جانے سے بچ جائے۔

واٹ ناسن

دو روز کی مسلسل سوچ بچار کے بعد اس نے ایک عرضی لکھی جس میں درج تھا کہ میں ذہنی انتشار کا مریض ہوں اور شور و شغب میں تعلیم کی طرف توجہ دینے سے معذور ہوں۔ لہذا اسے رات کو مجھے ایک کیوبیکل میں رہنے کی اجازت دی جائے۔

عرضی ہاتھ میں پکڑے وہ دیر تک پرنسپل کے چپڑاسی کے ساتھ دفتر کے باہر بیٹھا رہا۔ پھر پرنسپل نے اسے بلایا۔ اندر داخل ہو کر اس نے مودبانہ سلام کیا اور عرضی پرنسپل کے سامنے رکھ دی۔

"دل دل" عرضی پڑھ کر پرنسپل غصے میں بولا۔ "تم نیو راسس کا مریض ہے؟"

"جی ہاں جی ہاں۔" اہلی نے نیو راسس کا مطلب سمجھ بغیر سر ہلایا۔

"دل دل" پرنسپل بولا۔ "تو تمہیں کالج میں کس نے داخل کیا۔ نیو راسس کے مریض کا کالج میں کیا کام۔"

"جی جی۔" اہلی گھبرا گیا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا جواب دے۔

"تم تمہیں کالج میں رہنے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ جب تک تم فنسنس کا سارٹیفکیٹ نہیں لے کر۔" سمجھا۔

”جی جی۔“ ایلی کی گھنگھی بندھی ہوئی تھی۔

”کیا نام ہے تمہارا؟“ پرنسپل نے گھورا۔

”جی جی۔ ایلی۔ ایلی جی ہاں ایلی۔“

”ایلی۔“ پرنسپل نے حیرانی سے دہرایا ”یہ کیا نام ہے۔“

”جی نام تو ایلاس ہے ایلاس ویسے ایلی ایلی کہتے ہیں۔“

اس پر پرنسپل نہ جانے کیوں ہنسنے لگا۔ ”تم کالج میں پڑھتا ہے۔ اس کالج میں۔“ اس وقت چھت کے گارڈز پر بیٹھے ہوئے کبوتر نے بیٹ کے جو پرنسپل کے سر پر گری۔ ”ہے۔“ وہ چلانے لگا۔ ”واٹ بن سینس۔ اے چوکیدار۔ چوکیدار۔“ اس نے بھائی شروع کر دی۔ اور پھر غصے میں کمرے میں ٹپکنے لگا۔

ایلی ڈر کر دیوار سے لگ گیا۔ چوکیدار بھاگا بھاگا اندر داخل ہوا۔ ”حضور حضور۔“

کہاں تھا تم۔ کہاں تھا۔ وائس پرنسپل کو بلاؤ۔ وائس پرنسپل کو فوراً۔“

چوکیدار باہر بھاگا پرنسپل دیوانہ وار کمرے میں گھوم رہا تھا۔ کبھی وہ چھت کی طرف دیکھتا اپنے سر پر ہاتھ پھیرتا وہ مسلسل چلائے جا رہا تھا۔ ”واٹ بن سینس دس از آفس آرا۔ ہول دس از نو خانقاہ۔“ وہ کبوتر کو دیکھ کر کہتا۔

مونچھوں والا پروفیسر گھبراہٹ میں داخل ہوا۔

”اے وائس پرنسپل۔ واٹ از دس۔ یہ کالج ہے یا خانقاہ ہے۔“

”خانقاہ۔“ وائس پرنسپل نے تعجب سے دہرایا۔

”دل دل دو بچن دیکھو۔ وہ چھت پر وہ۔“ اس نے اشارہ کیا۔ ”سی وٹ اٹ از روم۔“

”ابھی ابھی۔ دس از پرنسپل روم نان سس اس نے چوکیدار اور وائس پرنسپل کو چلبا

کے کما چوکیدار باہر سے ایک لمبا بانس لے کر آیا اور وائس پرنسپل اور چوکیدار کبوتر کو کالنے مصروف ہو گئے۔

دفترا پرنسپل کی نظر ایلی پر پڑی۔ ”دل تم یہاں کیوں ہے۔“

”جی وہ عرضی۔“ ایلی نے کہا۔

”عرضی۔ کیسی عرضی۔“ وہ عرضی کی طرف لپکا۔

”آپ نے کہا تھا۔ آپ نے یعنی۔“ ایلی گھبراہٹ میں بولا۔

”دل دل چٹنی مانتا ہے۔“

”جی جی یعنی میرا مطلب ہے۔“ ایلی کی گھبراہٹ اور بڑھ گئی۔

پرنسپل نے جب سے پن نکالا اور عرضی پر کچھ لکھ کر ایلی کے ہاتھ میں عرضی تھادی۔ رن

لوے رن اوے وہ ایلی اور کبوتر سے مخاطب ہو کر چلانے لگا۔

اپنے کمرے میں پہنچ کر ایلی نے عرضی میز پر پھینک دی۔ اور خود چارپائی پر پڑ گیا نہ جانے اب کیا ہو گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ کہیں وہ کالج سے نہ نکال دیں۔ اسے پرنسپل نے کہہ جو دیا تھا کہ جس کالج میں کس نے داخل کیا تھا۔ لیکن میں یہ عرضی پھاڑ دوں گا مجھے کیا پڑی ہے کہ کسی کو دکھاؤں یہ عرضی۔

وہ سوچنے لگا کیا کالج کے پرنسپل ایسے ہوتے ہیں اور پھر یوسف اعظم کتنا مشہور آدمی تھا وہ مادی دنیا میں اس کے علم کا چرچا تھا۔ انگریزی کا عالم گنا جاتا تھا۔ کیا بڑے آدمی اس طرح کے ہوتے ہیں۔ اور وہ یوں کمروں میں کبوتر اڑاتے ہیں۔

کمرے میں دوسری جانب ریاضت اپنا سامان اکٹھا کر رہا تھا کیونکہ اسی روز وہ نئے بورڈنگ میں جا رہا تھا۔

”یہ کانڈ یہ کانڈ“ اس نے میز سے کانڈ اٹھاتے ہوئے کہا۔ یہ میرا کانڈ ہے کیا؟“

”ہے نہیں۔“ ایلی اس کی بات سمجھے بغیر بولا۔

”ارے ہائیں۔“ ریاضت چلایا۔ ”یہ تو تمہاری عرضی ہے۔“

”میری عرضی۔“ ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”میری عرضی۔ ہاں ارے“ اسے یاد آیا۔ ”اسے مجھے دے

لاؤ اسے پڑھو نہیں یہ تو پرائیوٹ کانڈ ہے۔ وہ ریاضت کی طرف لپکا۔

ریاضت گھبرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ ”میں نے تو پڑھ لی ہے۔“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ

جس بھی نئے بورڈنگ میں کمرہ دے دیا گیا ہے۔“

”کمرہ دے دیا گیا ہے۔“ ایلی نے حیرت سے ریاضت کی طرف دیکھا ”کس کو کمرہ دے دیا

گیا ہے۔“

”یہ دیکھ لو اس پر جو لکھا ہے۔“ ریاضت نے عرضی اس کی طرف بڑھا دی۔

ایلی نے حیرانی سے عرضی کی طرف دیکھا تھا۔ یس او کے نیچے پرنسپل کے دستخط جو تھے۔

خوشی سے ایلی کی چیخ نکل گئی۔ ”ارے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑا ارے وہ کبوتر اڑانے والا مسخرا۔

کھلاڑی یا بھکارن

”اے ہے کی تو موقعہ تھا“ میں ہنسنے لگی۔ ”اللہ رکھے سیانا لڑکا ہے کوئی بیوقوف ہے کیا۔“

پر پڑا ہے۔“

”رضا“ ابلی نے اسے کہا۔ ”خلو کبھی وہاں چلیں۔ ارجمند سے مل آئیں۔“

معلوم وہ بڑی فٹیں کرتا تھا کتا تھا۔ دو ایک بار میرے پاس آؤ صرف ایک بار۔“

آخر کس باپ کا بیٹا ہے۔“

وہ سب قہقہہ مار کر ہنسنے لگیں۔

”آجا آجا تو رک کیوں گیا۔ ایللی ایللی صدے۔“

”پر میں تو ہے ہی نہیں جو صدے ہو۔ کیوں میں“ ایک ہنس کر بولی۔

”اس کی تو اللہ رکھے ان گنت مائیں ہیں کیوں ایللی۔“

عین اس وقت کھڑکی میں سے شہزاد نے سر نکال کر کہا ”کب آیا تو ایللی۔“

دوسری بولی ”ایک تو یہ بولی۔“

اس پر ایک قہقہہ بلند ہوا۔ ایللی پسینے میں شرابور ہو گیا۔

”میں“ شہزاد کھڑکی سے چلانے لگی ”جو بولنے میں مزا ہے وہ چپکے چپکے چوری چوری میں

نہیں۔“

”ہائے ری لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو“ میں نے منہ میں انگلی ڈال لی۔ ”جو منہ میں آتا ہے کہ

دیتی ہے۔ ذرا نہیں سمجھتی۔“

”جھجکنے کا زمانہ میں گزر گیا۔ بات پرانی ہو جائے تو جھجکتا گیا۔“

”لو سن لو بس یہ لڑکی تو بس جد ہے۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگیں لیکن یہ ہنسی سے کس قدر

مختلف تھی۔ ایللی کا پسینہ سوکھ گیا۔

”آج تجھے چائے پلاؤں۔ بالکل تیار ہے ایللی۔“ شہزاد نے با آواز بلند کہا۔

”جا چا پللی اس کی تو۔“ میں نے پھر بات شروع کی۔

”اچھے موقع پر آیا ہے تو محلے میں ایک نہیں چار شادیاں“ ایک نے بات کا رخ بدلنے کا

کوشش کی۔

”اے بی بی“ میں بولی ”اب تو اس کی شادی کی فکر کرنی چاہیے۔“

”سن رہی ہے تو“ ایک نے شہزاد کی طرف مخاطب ہو کر کہا۔ ”کوئی اس کے بارے میں کچھ

فکر کر۔“

”ایسی بیوی لاؤں گی اس کی“ شہزاد نے گھبراہٹ کے بغیر کہا ”کہہ دیکھ کر حیران رہ جاؤ گی۔“

”کوئی ایسی نہ لے آئے۔“ میں نے شہزاد کو طعنہ دیا۔ ”جو اپنی ہی برات میں پچھتا شہزاد کر

دے۔“

”اور کیا تم میں گھسن گھسیاں ڈال کر بیٹھ رہے۔ نہ بھئی ایسی کس کام کی۔“ شہزاد نے

جواب دیا۔ ”میں کام کی تو تو ہی آئی محلے میں۔“ وہ پھر ہنسنے لگیں۔

”میں میں دیکھ تو کام کی نہیں ہوں کیا۔“ اس نے سینہ تپ کر کہا۔

شہزاد کی ہنس کچھ جرات اور بات کی رنگینی انہیں خاموش کر دیتی تھی۔ اور وہ سب دل ہی

دل میں شہزاد کو برا سمجھنے کے باوجود داد دینے پر مجبور ہو جاتی تھیں۔ شہزاد کی اس بات پر وہ سب

ہنسنے لگیں۔ اور ایللی کو موقع مل گیا۔ انہیں مصروف دیکھ کر وہ سیدھا شہزاد کی طرف چل پڑا۔

”یہ بڑا دوسری میں اسے مائی حاجیاں مل گئی۔“ آجا کبھی ہماری طرف بھی آیا کرو۔“ اس نے

ایللی کا ہاتھ پکڑ لیا۔ ”کبھی ہم سے بھی کر لیا کر بات۔ اے ہے اتنی بے اعتنائی بھی اچھی نہیں

ہوتی۔“

”اے پکڑ کر اپنے گھر لے گئی۔ اور صحن میں چلاتی ہوئی کمرے کی طرف چلی۔ صحن میں

کا ایک عورتیں بیٹھی تھیں۔ دہلی پتلی، زرد رو میلی عورتیں۔“

”نہ لڑکی یہ خود تو نہیں آیا میں زبردستی لائی ہوں اسے۔ یہ کہاں آتا ہے کسی کے ہاں یہ تو

مرف کٹے پر ہی چڑھنا جانتا ہے چپکے سے بیڑھیاں چڑھ جاتا ہے جیسے چور دبے پاؤں آتے

ہا۔“

ایللی حاجیاں کا کمرہ بہت چھوٹا اور تاریک تھا۔ اس میں ایک طرف ایک پرانا پلنگ بچھا ہوا تھا۔

اس کے سرانے مٹی کے برتن نیچے اوپر رکھے ہوئے تھے۔ ایک طرف ایک میلا ساتھت پڑا تھا۔

ایللی حاجیاں نے اسے پلنگ پر بٹھا دیا۔ اور خود ایک چوکی لے کر بیٹھ گئی کہنے لگی ”اے ہے

مما تو دیر سے سوچ رہی تھی کہ کبھی تو اکیلا مل جائے تو بات کروں۔ آخر میں نہ کروں تجھ سے

بات نہ بناؤں کون کرے گا۔“

ایللی کا ماتھا ٹھکانا نہ جانے کیا کہنے کے لیے وہ اسے وہاں کھینچ لائی تھی۔ ضرور کوئی بات ہو

گے۔ مگر ایللی۔

”اے ہے۔“ بولی ”لوگ تو ویسے ہی باتیں بتاتے رہتے ہیں۔ ان کے دل میں درد نہیں

ہوتا۔ لیکن میرے لیے تو تو اپنا ہے بلکہ اپنوں سے بھی بڑھ کر عزیز۔“

”میں معلوم ہے میں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”میری بات کا برا تو نہیں مانتا تو نے۔“

”نہیں میں۔“

”میں بھی لے تو کیا ہوا“ وہ بولی ”ہم تو سچی بات کرنا نہیں چھوڑیں گے چاہے تو برا ہی
کارا تو کام ہے کہ اپنے بچوں کو بھلائی کا راستہ بتائیں۔ ہاں۔“

بھانجان سے دیا

ابھی وہ محن میں ہی پہنچا تھا کہ چھن سے شہزاد ناچتی ہوئی آ پہنچی۔

”ہے میں نے کہا۔“ وہ بولی ”نہ جانے کہاں گم ہو گیا ہے۔ میرے سامنے تو چل پڑا تھا

دھن سے پھر چلا کہاں گیا۔ حیرت کی بات تھی، کیوں میں۔“

”تو کیا اس کے ایک ایک منٹ کا حساب رکھتی ہے لڑکی۔“ میں نے ہنس کر طعنہ دیا۔

”کیوں نہ رکھوں میں“ وہ ہنسنے لگی ”رکھنا پڑتا ہے۔ ذمہ داری کی بات جو ہوئی۔“

”اب تو میرا ہی سہماں ہے یہ۔ جب فرحت اور باجرہ ہوتی تھیں جب اور بات تھی۔ اب

مندانہ میان رکھوں گی تو وہ آکر کیا کہیں گی۔“

”اب تو ان کا بہانہ نہ بنا۔“ میں بولی۔

”بھانے بھی بنائے ہی پڑتے ہیں۔“ وہ رازدارانہ انداز سے کہنے لگی۔

”ہائے دی کیا کہہ رہی ہے تو“ میں نے انگلی منہ میں دبالی۔ ”تیری یہ باتیں لے ڈوبیں مٹکے

دھن کو۔“

”گولم“ وہ پھر ہنسنے لگی۔ ”فی الحال تو مجھے ہی لے ڈوب رہی ہیں۔“

”تو نہ ڈوب کس نے تجھ سے کہا ہے کہ جو منہ میں آیا بک دیتا۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”جہاں اب جو چائے ٹھنڈی ہو گئی تو پھر سے کون بنائے گا چائے تیرے لیے چل“ وہ ایللی
نے کہنے لگی۔

”بس تیری چائے پیتا ہے یہ۔ میں نے کتنی ہی منتیں کیں کہ یہاں پی لے۔ پر اس لڑکے

سازش کی رٹ لگائے رکھی۔“

منہ دھو میز میاں چڑھنے لگے تو ایللی نے شہزاد کا پلو پکڑ لیا۔

”دراہت تو سن“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

”اے ہے۔ برا نہ مانو میری بات کا میں تو تیرا ہی بھلا چاہتی ہوں۔“ میں نے تھیرا کر
پر کہا۔

”ہاں ہاں میں“ وہ بولا

”اور دیکھو یہ نہ سمجھتا کہ میں کسی خیل سے کتنی ہوں۔ نہ بھی مجھے کوئی خیال ہے

خوش رہ میں صرف یہی چاہتی ہوں چاہے جہاں مرضی ہے وہ بس میری خوشی تو اسی میں ہے

لڑکے آخر دنیا دینا ہے۔ دنیا کا منہ کون بند کر سکتا ہے۔ جب لوگ تیرے متعلق باتیں کرتے

تو دل دکھتا ہے اور دیکھتا۔ پھر یہ لڑکی ہے کیا نام ہے اس کا آج کل کے نام بھی تو عجیب ہے

ہیں۔ میں اسے برا نہیں کہتی بچاری بڑی اچھی ہے ہنس کھ ہے اور ایمانداری سے کہتی ہوں

چلا جائے۔ اس قدر محبت سے ملتی ہے اور اتنی خاطر تواضع کرتی ہے کہ میں کیا کہوں۔“

ساعت کے لیے وہ چپ ہو گئی پھر خود ہی بولی ”لیکن تو جانتا ہے کہ آخر اصل اصل ہے تو

نقل ہاں خون خون کی بات ہوتی ہے۔ ہم غریب سہی مگر ہمارا خاندان اصلی ہے۔ اس میں

ملاوٹ نہیں تو جانتا ہی ہے۔ خاندان بڑی چیز ہوتی ہے۔ ہاں اور سچ پوچھ تو وہ کبھی چھپائیں

تم ہی کو کیا اپنے بیاہ پر کبھی کسی کو گاتے سنا ہے۔ ایمان سے کہتا۔ تو ہے آخر لان بھی لگاؤ

ہے۔ ہے نا اپنے ہی بیاہ پر گاتی رہی اور مٹکے والیاں سب منہ میں انگلیاں ڈالے حیرت سے

رہی تھیں۔“ وہ خاموش ہو گئی۔

”سو بیٹا“ وہ پھر بولی۔ ”اس طرح آنکھوں پر پٹی باندھ کر چلتا کیا تو کیا ہو گا یہ رانا

نہیں۔ اس کے لیے تو گھڑی بھر کا تماشا ہو جائے گا۔ کھلاڑی کو تو کھیل چاہیے پر تمہاری

جنگدگ حرام ہو جائے گی ہاں کسے دیتی ہوں میں تجھے۔ آگے تو چاہے جو کر ہمارا کام تو صرف

دیتا ہے۔ آخر تو باجرہ کا بیٹا ہے اور باجرہ سے بڑھ کر ہمیں اور کون عزیز ہے اور ایللی

مرضی ہے کر پر اپنے ابا کے قدموں پر نہ چلنا نہ بیٹا۔ یہ راستہ اچھا نہیں۔ نہ اللہ رحل کرنا

ہے۔ اور نہ کسی اللہ کے بندے کو تو تو برا ہی اچھا لڑکا ہے۔ اب بتا کیا باتوں تیرے

گایا شہرت؟“

”نہیں میں میں کچھ نہیں پیوں گا۔ تو تکلیف نہ کر۔“ ایللی اٹھ بیٹھا۔

”اے ہے بیٹھ تو سہی کچھ دیر کے لیے۔“

”پھر آؤں گا میں۔“ وہ بولا

لیکن شنراو قہقہے لگاتی ہوئی ہوائی کی طرح اوپر چڑھ گئی۔

اوپر جا کر وہ چیخنے لگی۔ ”اب آؤ گے بھی یا دو مزدوروں کو بلاؤں اٹھانے کے لیے۔“

دوپٹہ ایللی کے ہاتھ میں رہ گیا۔

اس کی بات سن کر راجہ اپنے کمرے سے نکل آئی۔ ”کس کو اٹھوانا پڑے گا۔“

باتیں کر رہی ہو تم۔“

”تمہارا ہی بھائی بند ہے کوئی۔ اوپر چڑھنے کا نام ہی نہیں لیتا“ شنراو ہنسی۔

”اوه تمہارا دوپٹہ کیا ہوا۔“ راجہ نے پوچھا۔

”پوچھو اسی سے“ وہ بولی ”اس کا کیا اعتبار ہے آج میرا دوپٹہ اتار لیا ہے۔ اس نے کہنے

جانے زیور اتارنے کے لیے کلن مروڑ لے۔ نہ بھائی یہ تمہارے رشتے دار مجھ سے نہیں ہنرا

جاتے۔“

”سلام کہتا ہوں۔“ ایللی نے اوپر آکر راجہ سے کہا۔

”تو ہے ایللی“ وہ بولی ”میں سمجھی نہ جانے کس سے کشتی لڑتی ہوئی آئی ہے۔“

”یہ تیرا بھائی بند کیا لڑے گا کشتی۔“ شنراو ہنسی۔ ”اس کی صورت تو دیکھو۔“

”صورت تو اچھی بھلی ہے۔“ راجہ نے ہنستے ہوئے کہا۔

”دیکھ لو۔“ وہ بولی ”یوں معلوم ہوتا ہے جیسے ابھی رو دے گا۔“

ایللی کو شنراو پر بے حد غصہ آ رہا تھا۔ لیکن اس کی باتیں سن کر اور اس کی ہنسی دیکھ کر وہ

ہنسنے لگا۔ اور وہ دونوں ہنستے ہوئے اوپر چو بارے میں چلے گئے۔

چو بارے میں جانو کھڑی تھی۔

”کیوں جانو چائے بھی بنائی یا نہیں۔ دیکھ تو مہمان عین سر پر پہنچ گیا ہے۔“ شنراو نے پوچھا۔

”بڑا مہمان تو دیکھو۔“ جانو بولی۔ ”ایسوں کو ہم مہمان نہیں سمجھتے۔“

”تو کیا سمجھتے ہو ہمیں بھی بتاؤ بھئی۔“ اس نے جانو سے کہا۔

”یہ تو بے ایمان ہے۔ مہمان تو دو دن کا ہوتا ہے۔“ جانو نے کہا۔

”کیوں تم سے کوئی بے ایمانی کی ہے اس نے۔ شرماتی کیوں ہو بتا دے میں کسی کو بتاؤ۔“

”تھوڑی۔“

”اے ہے مجھ سے کیوں کرے بے ایمانی تم جو ہو۔“ جانو غصے میں آگئی۔

”اے ایللی مجھ سے کراس سے نہ کریو۔ یہ تو رو پڑی۔“ شنراو نے کہا۔

”بانچے چائے بنانے کے لیے مٹی تو ایللی نے پھر سے ہاتھ پھیلا دیئے۔“

”شنراو“ وہ بولا ”شنراو میری طرف دیکھو۔“

”میں تم تو بھکاری ہی رہے۔“ وہ پھر سے ہنسنے لگی ”ہاتھ پھیلانے کے علاوہ تمہیں کچھ

نہیں آتا ہے۔“

”میں کچھ نہیں سوچتا۔ کچھ مل جائے ہمیں۔“ ایللی نے پھر ہاتھ بڑھایا۔

”مہمان سے دیا مانگتے ہو۔ اب یہاں رکھا ہی کیا ہے۔“ شنراو نے آہ بھری۔ ”بسمی کچھ

نہیں کیا۔ اب بھکاری آیا بھی تو کیا آیا۔ اب اسے کوئی کیا دے، کیا دے۔“ شنراو نے بھرپور نگاہ

ایللی کی طرف دیکھا۔

”شنراو“ ایللی دیوانہ وار اس پر جھپٹا ”میں پاگل ہو جاؤں گا۔“

”ہو جاؤ ہو جاؤ۔ جلدی کرو۔“ شنراو ہنسنے لگی۔

ایللی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور دیوانہ وار اسے چومنے لگا۔ اور شنراو یوں کھڑکی میں کھڑی ہو

کر اڑ پڑ گئی جیسے اس ہاتھ سے اسے کوئی تعلق نہ ہو۔

جانو چائے لائی تو وہ چونکی۔ ٹرے لے کر شنراو نے میز پر رکھ دیا۔ اور زبردستی ایللی کو کرسی

پر بٹھا کر کھانے لگی ”لو اب یہاں بیٹھ کر چائے پیو۔ میرے سامنے بیٹھے رہو اور میں تم سے کچھ

نہیں مانگتی۔“ اور پھر اس کے سامنے تخت پر بیٹھ کر یوں سلائی کے کام میں مصروف ہو گئی جیسے

اسے ایللی سے دور کا واسطہ بھی نہ ہو۔ ایللی پاگلوں کی طرح اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ

پٹا بلاؤں اور ماتھے کے تل کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی چھوٹی سی چھوٹی حرکت پر ہنسا ہوئے جا رہا

تھا۔

”دراہر مہمان میں جانو بیٹھی ایللی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔“

آخر جانو سے نہ رہا گیا وہیں سے چلا کر بولی ”اے لڑکے کیا ہو گیا ہے تجھے، یوں دیکھ رہا ہے

جیسے پاگل ہو گیا ہو۔ ہوش میں آ۔“

”مونٹوس“ شنراو سر اٹھائے بغیر بولی۔ ”سب بے کار ہے جانو۔ پاگل کبھی ہوش میں نہیں آیا

کرتے تم کیوں اپنا جی جلا رہی ہو۔“

”تو نے ہی اسے کر دیا پاگل“ جانو غصے میں پھٹکارنے لگی۔

”اونسوں۔“ وہ ویسے ہی بے پرواہی سے بولی۔ ”میں کیا کروں گی پاگل جانے۔“
میاں کو پاگل نہ کر سکی۔

”وہ تو پہلے ہی پاگل ہو رہا تھا۔ اس کی کیا بات“ جانو بولی۔

”تو بہ پھر“ شہزاد نے ہنس کر کہا ”یہ بھی پہلے ہی سے پاگل ہے۔“

”تو بہ ہے۔“ جانو نے کانوں کو ہاتھ لگاتے ہوئے کہا ”اب تجھ سے کون کسے بہت

کہہ کر وہ غصے میں اٹھ کر نیچے چلی گئی۔

”تو نے مجھے بدنام کرنے کی ٹھان رکھی ہے۔ ہے نا۔“ شہزاد نے آنکھیں اٹھائے بولی

مخاطب کیے بغیر کہا۔

”بھی مجھے طعنے دیتے ہیں میں سمجھتی نہیں۔ سب سمجھتی ہوں میں لیکن کیا کلام ہو۔

نے مجھے یہاں رہنے کے قابل نہیں چھوڑا۔“

”میں بہت برا ہوں۔“ ایللی نے خلوص سے کہا۔

”ہو گا۔“ شہزاد نے بے پرواہی سے کہا ”لیکن مجھے نہ جانے کیوں اچھا لگتا ہے۔ میرا ہی ہے

ہے تجھے سامنے بٹھائے رکھوں۔ سمجھ میں نہیں آتا۔ کیوں تیری خاطر میں ان کے ساتھ

نہیں گئی ہے کتنی منتیں کی تھیں انہوں نے میری اب کی بار لیکن میرا جی ہی نہیں چاہتا۔

کہا چلی گئی تو پھر نہ جانے کب ملاقات ہو تم سے اور پھر تم نے آنے میں اتنے دن لگا دیے

انتظار کرتے کرتے آنکھیں تھک گئیں۔“ شہزاد نے سر اٹھایا۔ اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں

آواز بھرائی ہوئی تھی۔ ”نہ جانے کیا ہو گیا ہے ایللی۔“ وہ بولی ”ہائے میں تو انجانے ہی میں

گئی اور یہ سب محلے والیاں مجھے تمہارے طعنے دیتی ہیں۔ جلی کئی سناتی ہیں۔ ہر روز ہر وقت

”شہزاد۔“ ایللی اچھل کر اس کے قریب آگیا۔

د فشتا ”وہ طلسم ٹوٹا اور شہزاد گویا جاگ پڑی۔

”نہ“ وہ بولی ”ایسا نہ کر ایللی میری اپنی نگاہ میں تو میری عزت رہنے دے۔ مجھے اپنی شان

نہ گرا تمہارا تو کچھ نہیں بگڑے گا ایللی میں اپنے آپ سے جاؤں گی۔“

”تو میں کیا کروں۔“ ایللی نے گھبرا کر کہا۔

”وہیں بیٹھ کر مجھ سے باتیں کر۔ میری باتیں سن۔ میں اپنی بات کسے سنائوں۔ تو نے ہی

سنی تو کون سے گا۔ ایللی۔“ وہ دوپٹے کے پلو سے آنسو پونچھنے لگی۔ ”لیکن تم نے مجھے

نہ۔ تو صرف ہاتھ پھیلاتا جانتا ہے۔ تجھے دینے کے لیے میرے پاس کیا ہے۔ کچھ بھی تو
نہ۔ کیا لگتا ہے مجھ سے تو جس کے پاس دینے کو کچھ بھی نہ ہو اس کے سامنے ہاتھ پھیلانے کا
نہ۔ دلایل۔“ اس نے اپنا سر دوپٹے میں لپیٹ لیا اور گٹھڑی بن کر پڑ گئی۔

گشت کالو تھڑا

شام کے وقت شہزاد نے کپڑے بدلے اور بڑے اہتمام سے ہٹاؤ سنگار کر کے بیٹھ گئی۔ ایللی کو

بے خیال پیدا ہو گیا کہ یہ اہتمام اس کی آمد کی وجہ سے ہے۔ شہزاد کے اس اہتمام کی وجہ سے وہ

بے حد خوش ہو رہا تھا۔

شہزاد کی طبیعت میں ہلاکی بے نیازی تھی۔ اس نے کبھی سنگار کے لیے سرخی یا پاؤڈر استعمال

یا کافاس زمانے میں عورتیں سرخی پاؤڈر استعمال کرنے کو باعث عار سمجھتی تھیں۔ کیونکہ بڑی

ہارے اس بات کو پسند نہیں کرتے تھے کہ عورتیں سرخی پاؤڈر لگا کر اپنی نمائش کریں۔ اگرچہ

بہارت کپڑے اور زیور پہننے کو معیوب نہ سمجھا جاتا۔ کپڑا اور زیور پہننا تو عورت کا ازلی حق

بہ

شہزاد بیٹھ خوبصورت کپڑے پہنے رکھتی تھی اگرچہ اس کی پوشاک میں نمائش کی جگہ سادگی

افروہا تھا اس کی آنکھیں لمبی اور خوبصورت تھیں اور اس کے ماتھے پر قدرتی طور پر ایسے

مہر لگے تھے جنہیں ہندو عورتیں میکا یا ہندی لگاتی ہیں۔ اس کی پیشانی اور آنکھیں اس قدر جاذب

تھیں کہ ہونٹوں کا موٹاپا اس کے حسن میں کبھی حارج نہیں ہوا تھا۔

ایللی اس کے سیاہ جالی دار دوپٹے جس پر سفید پھول کاڑھے ہوئے تھے کو دیکھ دیکھ کر حیران

ہوا تھا اسے یقین نہیں پڑتا تھا کہ شام کے وقت شہزاد کا کپڑے بدل کر بیٹھ جائے۔ اس کی آمد کی

وجہ سے قلعہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کوئی میرے لیے اس قدر پروا کرے۔ میرے لیے بنے

نہ۔ مگر میری چوری چوری دل ہی دل میں وہ سمجھ رہا تھا کہ وہ اسی کے لیے ہے شام کے

قلعے سے فاصلہ ہو کر وہ ابھی بیٹھے ہی تھے کہ نیچے سے شور بلند ہوا۔ چھٹی گلی سے عورتیں

نہ۔ سے رہی تھیں۔ بلا رہی تھیں۔

محب تو بلدی بھی کرے گی یا نہیں۔“ جانو نے شہزاد سے کہا ”تو یہاں اپنی دھن میں لگی

نہ۔ سب نیچے تیرا انتظار کر رہی ہیں۔“

”انتظار کر رہی ہیں۔ کون انتظار کر رہی ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اے ہے محلے کی عورتیں اور کون۔ شادی والے گھر گانے کے لیے نہ جلتے ہیں۔ سمجھتا ہے یہاں تیرے سرہانے بیٹھ رہے گی کیا۔“

”شادی والے گھر۔“ ایلی نے گھبراہٹ بھری شرمندگی سے کہا۔ وہ شادیوں کی بڑی طور پر بھول چکا تھا۔

”اور کہاں“ جانو بولی۔ ”تیری شادی ہوگی تو تجھے معلوم ہو گا تاکہ شادی والے گھر کی لیے جانا ضروری ہوتا ہے۔ ہاں۔“

”اے ہے کیوں خواہ مخواہ مغز چاٹ رہی ہو۔“ شہزاد جانو کو کہنے لگی۔ ”جانو بولی جلدی آجاؤں گی میں۔“ وہ ایلی سے کہنے لگی۔ ”تو جب تک کوئی اپنی کتاب پڑھاں اس پر ایک نگاہ التفات ڈالی اور پھر سیاہ پھولدار دوپٹے کے سر پر لے کر یوں آنکھیں ماکر اپنی طرف دیکھنے لگی کہ اس کی قوت گویائی سلب ہو کر رہ گئی۔ اور پھر جب جانو بیڑھیوں میں ہو گئی تو شہزاد نے چپکے سے ہاتھ بڑھا کر اس کے منہ پر رکھ دیا۔ اور اس کے چہرے کو سنا ہوئے بولی ”سو نہ جانا۔ میں ابھی آئی۔“ یہ کہہ کر وہ بیڑھیوں میں داخل ہو گئی اور ابنا گیا۔

دیر تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شادی والا گھر تو دی ہے اور غفور رہتا ہے۔

اسے بچپن ہی سے غفور سے نفرت تھی۔ صرف غفور ہی سے نہیں ان کے ساتھ سے نفرت تھی۔ اگرچہ وہ آصفی محلے میں رہتے تھے اور آصفیوں سے گہرے تعلقات تھے بھی غفور اور اس کے پانچوں بھائی آصفیوں کو نفرت کی نظر سے دیکھا کرتے تھے اور خود کو کسلواتے تھے۔

وہ محلے سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جسمانی لحاظ سے بھی ان کی ساخت الگ ہی تھی۔ ان کے جسم بھرے ہوئے تھے قد چھوٹے اور چہرے گول تھے انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کیا کرتے تھے وہ گوشت کے لو تھڑے ہوں ایسے غلیظ ننگے لو تھڑے جیسے علی پور کے بچے تھے۔ شہزاد نے بار بار دیکھے تھے۔ جمل گائیاں اور بھینسیں ذبح کی جاتی تھیں۔ حالانکہ غفور کے علاوہ باقی بھائی بہن شریف سمجھے جاتے تھے۔ وہ چپ چاپ سر جھکائے محلے میں داخل ہوتے تھے۔

ہاپ سر جھکائے باہر نکل آتے۔ اول تو وہ محلے میں آتے ہی نہیں تھے کیونکہ ان کا مکان محلے کے ایک کونے میں واقع تھا۔ یہ کو نہ بازار سے عین ملا ہوا تھا اور انہوں نے براہ راست بازار سے آنے جانے کا راستہ بنا رکھا تھا جو محلے کی ڈیوڑھی سے بھی ہٹ کر تھا۔ لہذا انہیں گھر آنے جانے کے لیے محلے کی ڈیوڑھی میں داخل ہونے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی تھی۔

انہیں دیکھ کر ایلی محسوس کرتا تھا جیسے وہ سب ویسے نہ ہوں جیسے وہ دوسروں کے درہو درہو دیکھ دیتے تھے جتنکے ہوئے سر کے باوجود ان کی نگاہوں میں محلے والوں کے لیے تسخر کی جھلک دکھائی دیتی تھی۔ ہونٹوں میں تحقیر کا احساس دبا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ جب وہ ادب و احترام سے کسی کو سلام علیکم کہتے تھے تو محسوس ہوتا جیسے محض دکھاوے کے لیے بات کر رہے ہوں اور اگر ان کے ہاں کوئی محلے دار چلا جاتا تو اس کی آمد پر یوں خاموشی چھا جاتی جیسے نہ جانے کیا ہو گیا ہو۔ جی کہ نو وارد کو محسوس ہونے لگتا کہ بگائوں کی محفل میں بیگانہ آ گیا ہے۔ وہ سب کان سے منہ جوڑ کر بات کرنے والے تھے۔ ان کی شکلیں دکھانے کی محسوس ہوتی تھیں اور ان کی باتیں ہاتھی رات۔ ممکن ہے ایلی کے یہ احساسات دراصل ایلی کے من گھڑت بغض ہوں۔ ممکن ہے کسی وجہ سے ایلی نے کوئی لاشعوری الجھن پال رکھی ہو۔ اور اس کو جائز ثابت کرنے کے لیے اس نے ایسے احساسات اختراع کر رکھے ہوں۔ بہر حال یہ ایک حقیقت تھی کہ ایلی کو غفور اور اس کے بھائیوں سے بغض تھا۔ بھائیوں کی بات چھوڑیے غفور کی ذات سے تو اسے بے انتہا چڑ تھی اور غلغلے میں ہر کوئی جانتا تھا کہ غفور کے رویے سے خود اس کے بھائی بھی تالاں تھے۔

عام طور پر ایلی کی غفور سے ملاقات نہیں ہوتی تھی۔ اور اگر کبھی ہوتی تھی تو کبھی حویلی کے قریب چونکہ عام طور پر غفور محلے کی مسجد میں نہانے جایا کرتا تھا نہانے کے لیے وہ اس راستے سے باہر نکلتا تھا جو محلے کے اندر کی چھوٹی گلی میں نکلتا تھا۔ ایلی نے چھوٹی گلی میں ہاتھ میں صلیبن والی لور تکیہ پکڑے اسے کئی بار دیکھا تھا۔ وہ بے تکلفی سے ادھر ادھر دیکھتا ہوا بے حس انداز میں آگے بڑھے چلا جاتا۔ اور ہر عورت اور لڑکی کی طرف ایسے بے باکانہ دیکھتا جیسے اس کے جسم کو جانچ رہا ہو۔ جیسے قصائی بوچڑ خانے میں گایوں کی طرف دیکھا کرتے تھے۔ ساتھ ہی وہ جسم کو کھانڈ اس وقت ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ کوئی بورا بھالو ہو اور اوپر نیچے سے اپنے جسم کو غور غور دے رہا ہو۔ یا کسی کو کچھ سمجھا رہا ہو۔ یہ محسوس کر کے ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا لیکن غور غور میں ایلی کے مقابلے میں پہلو ان کی حیثیت رکھتا تھا۔ یہ بے بسی بھرا غصہ ایلی کے

احساس کتری پر تازیانے کی حیثیت رکھتا وہ کھولتا۔ اور پھر بھاگ لیتا۔

انہوں نے شعلے نکل رہے تھے۔ لیکن محلہ پر موت کی سی خاموشی طاری تھی۔
انہوں میں اس کے انتظار میں پاگل ہو رہا ہوں ایللی نے سوچا۔ جب جی چاہے آئے مجھے کیا۔
پانچ ساری رات گلی کے اس تاریک کونے میں بسر کر دے آخر مجھے اس سے کیا غرض یہ سوچ
توڑ لیت گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ اس کی نگاہوں تلے بھالو ناچ رہا تھا۔ قریب ہی ایک رنگین
ڈھیر سا پڑا تھا اور گلی خوف کے مارے بھیانک اور سنسان ہو رہی تھی۔

ہنٹے روتے

دروازہ بجا تو چونکا۔ بھاگ کر اس نے کنڈی کھول دی اس وقت وہ بھول گیا کہ شہزاد کے
آنے یا نہ آنے سے اسے کیا غرض تھی۔ اسے یہ احساس بھی نہ ہوا تھا کہ عرصہ دراز تک اس
نے یوں آنکھیں بند کر رکھی تھیں جیسے مدت سے سوچا ہو۔

شہزاد گھر پہنچے ہی اپنی چارپائی پر ڈھیر ہو گئی۔ ”توبہ ہے۔“ وہ بولی ”گاگا کر ہلکان ہو گئی
مروں بہن بہن کر رہا ہے جیسے بھڑوں کا جھتہ ہو۔“
”کو“ جانو چلائی ”تو کیا اب کپڑے بھی نہ بدلو گی۔“

”اپنی جان کھائیں کپڑے۔ مجھ میں اٹھنے کی ہمت بھی ہو۔“ یہ کہہ کر وہ سرہانے تلے بازو
رک کر ایللی کو بلانے بغیر یوں سو گئی جیسے ایللی وہاں موجود ہی نہ ہو جیسے ایللی نہ جانے کون ہو۔
اور ایللی پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس رنگین ڈھیر کو دیکھتا اور کمرے کے دروازے سے باہر
اندھیرے کونے میں بھالو ناچتا رہا۔ اور سرخ گوشت کے لو تھڑے ابھرتے رہے۔ حتیٰ کہ صبح کی
پھوٹی جھلکنے لگی اور تھک ہار ایللی کی آنکھ لگ گئی۔

اگلے روز جاگتے ہی شہزاد نے ایللی کے کان میں جینے جیونے شروع کر دیے۔
”گھوڑے بیچ کر سوئے ہو کیا اب جاگو گے بھی یا نہیں۔ دیکھو تو دن چڑھ آیا ہے۔“ شرم
نہیں آئی ”ایللی چلایا۔“ ساری رات انتظار کرایا اور اب تنگ کر رہی ہے۔“ ”توبہ ہے۔“ وہ
نہی ”جب کوئی موجود نہ ہو بیٹھ کر انتظار کرتا ہے اور جب موجود ہو۔“ وہ ہنٹے ہنٹے رک گئی۔
”تو پڑا خزانے لے کر سوئے جاتا ہے۔“

اس بات پر ایللی کو اور غصہ آیا۔ شاید وہ سمجھتا تھا کہ شہزاد اپنی غلطی تسلیم کر لے گی اور اس
سے وعدہ کرے گی کہ آئندہ وہ کبھی اتنی دیر باہر نہ رہے گی۔ لیکن شہزاد اس معاملہ میں بالکل

اس روز شہزاد کے انتظار میں بیٹھے بیٹھے ایللی سوچ رہا تھا کہ وہ بیٹھی گا رہی ہو گی۔
وقت وہ کتنی پیاری لگتی ہے معلوم ہوتا ہے جیسے اس سے اس کی آنکھوں میں نمی کی
روشن ہو جاتی ہیں اور ان سے چھن چھن کر شعاعیں نکلتی ہیں۔ عورتیں تعجب سے اس کی
دیکھتیں تھیں۔ اس وقت رنگین دوپٹوں کے اس ڈھیر کے قریب ایک بھورا بھلا آکڑا
اس کی نگاہیں شہزاد پر مرکوز ہو جاتیں۔ اور پھر اس کا بچہ اٹھتا۔ اور وہ کھانے لگتا۔ اتنے ذرا
کھجائے کہ اس کے بال اکھڑ جاتے اور نیچے سے نیچے غلیظ گوشت کا لو تھڑا نکل آتا۔
ایللی غصے سے کھولنے لگتا۔

پھر وہ لاجول پڑھ کر اپنی توجہ کسی اور طرف منعطف کرنے کی کوشش کرتا مگر جلد ہی
اس گانے والیوں کے رنگین جھرمٹ سے وہی بھالو ابھرتا اور وہی بھیانک منظر حقیقت بن کر
کے رو برو آ کر کھڑا ہوتا۔

”نن“ گھڑی نے ایک بجایا۔

ایک، اس نے گھڑی کی طرف غور سے دیکھا۔ ساڑھے ساڑھے بارہ ساڑھے بارہ بجے تک لگا
ہے اس نے سوچا۔

عین اس وقت نیچے چوگان سے اسے عورتوں کی آوازیں سنائی دیں۔ شکر ہے اس نے ۴
یقیناً ”وہ بھی ان کے ساتھ ہی آ رہی ہو گی۔ بس پہنچا ہی چاہتی ہو گی۔ وہ منظر ہو کر بیٹھ گیا
وہ آکر آواز دے گی اور میں جھٹ سے دروازہ کھول دوں گا اور کسوں گا دیکھا یوں کیا کرتے ہیں
انتظار۔ آواز دیئے بغیر دروازہ کھول دیا۔ پاؤں کی چاپ سمجھتا ہوں۔ کیا سمجھا ہے تم نے۔
عورتوں کی آواز مدھم پڑ گئی۔ دروازوں پر دستکیں دی گئیں۔ دروازے کھلے اور بند ہو گئے۔
محلے پر ایک بار پھر سناٹا چھا گیا لیکن شہزاد کے پاؤں کی چاپ سنائی نہ دی۔

دفترا۔ ایللی کی نگاہ کے سامنے وہ تنگ گلی آگئی جس میں غفور صابون دانی اور قید خانہ
ہوئے کھجائے ہوا گزرا کرتا تھا۔ گلی میں ایک طرف شہزاد سہمی ہوئی گھڑی تھی دوسری طرف لہ
بھالو کھچا کھچا کر گوشت کے لو تھڑے بنائے جا رہا تھا۔ پھر وہ شہزاد کی طرف لپکا اور گلی کے اس
پر تاریکی اور بھیانک خاموشی چھا گئی۔

ایللی پاگلوں کی طرح اٹھ بیٹھا اور دیوانہ وار ابھر اھر شلنے لگا۔ بے بسی اور غصے میں

چلنے لگی۔ ”معلوم ہوتا ہے تیرا داگ بھی چل گیا ہے۔ تم دونوں ہی کا پتہ نہیں چلتا۔“ وہ بولی
 ”بے وجہ نہ ہے ہو بے وجہ روتے ہو۔“
 ”ایلی اٹھ بیٹا۔“ ”اچھا میں ذرا باہر جاؤں گا۔“
 ”ہاں ہاں۔“ ”جانو گرائی“ ”اب تو یہاں کیوں بیٹھنے لگا جا جا کر بری دیکھ تو لوگ بری دیکھیں
 گے۔“ ”تو اسے دیکھنا یہاں بیٹھا کیا کری گا۔“
 جب وہ بیڑھیاں اترنے لگا۔ تو جانو اس کے پاس آئی اور دونوں ہاتھوں سے اس کا منہ پکڑ
 کر بولی۔ ”میں داری کیوں اپنی جان ہلکان کر رہا ہے تو تجھے کس چیز کی کمی ہے۔ جیسی چاہے گا
 وہ مل جائے گی۔ یہاں سے تجھے کیا حاصل ہو گا۔ پھر کیوں اپنا ایمان گنوا رہا ہے تو یہاں۔“

جلو

چوہن میں پہنچ کر اس نے محسوس کیا جیسے خلا میں چل پھر رہا ہو۔ اس کے لیے سارا علی پور
 ایک دیرانہ حقائق دق ویرانہ جس میں صرف ایک قندیل روشن تھی۔ اور جب وہ رنگین قندیل
 نگہ سے دور ہو جاتی تو گھٹاؤ پ اندھیرا چھا جاتا اور کچھ دکھائی نہ دیتا۔
 ”بے توبہ۔“ ”رضا اسے یوں کھڑے دیکھ کر چلایا۔“ ”یہاں کیا کر رہا ہے تو جیسے کوئی کھو گیا
 ہو۔“

”کوئی نہیں“ ایلی نے جواب دیا ”میں خود کھو گیا ہوں رضا۔“ وہ پسلا دن تھا جب اس نے
 رضا کے دہو اس بات کا اقرار کیا تھا۔ اگر اس وقت رضا اس کی بات نہ کاٹتا تو غالباً وہ اپنا سر
 اس کے کندھے پر رکھ کر رو دیتا۔ اور رو کر اپنی داستان کہہ دیتا۔ لیکن اس روز نہ جلنے کیوں
 رضا خود کسی رنگین اضطراب میں کھویا ہوا تھا۔

”ارے یار“ وہ بولا ”آج وہ رونق ہے وہ مشتعل ہیں کہ حد ہے۔ ہر لڑکا کسی نہ کسی داؤ پر لگا
 ہے۔ لڑکیوں کے جھنڈ کے جھنڈ آ جا رہے ہیں۔ تاکہ جھانک ہو رہی ہے۔ لوگ ڈیوڑھیوں اور
 ٹنگ گلیوں میں گھوم پھر رہے ہیں اور تو۔ تو یہاں کھڑا ہے جیسے۔“

ایلی چپ کھڑا رہا۔ اسے خاموش دیکھ کر رضا بولا ”آئیں تجھے سائیں کے پیڑے کھلاؤں کیا
 یاد کرے گا تو چل اب۔“ اور وہ دونوں سائیں کی دکان کی طرف چل پڑے۔ دیر تک وہ دونوں
 جہ چاہ چلتے رہے ایلی اپنے خیال میں کھویا ہوا تھا۔ اور رضا کسی اپنی ہی بات میں گمن تھا۔

مجبور تھی۔ نمائش کا جذبہ آن کی آن میں اس میں یوں ابھرتا تھا جیسے بوتل سے جن لکھ رہی ہو
 پھر وہ اپنا آپ بھول جاتی۔ اور دیوانہ وار اس جذبے کی تسکین کے لیے مضطرب ہو جاتی۔
 اس روز جب وہ ایلی کو سمجھا رہی تھی۔ ”نہ پیارے اس طرح بات بات پر نہیں
 کرتے۔ یہ کیا بگڑنے کی بات ہے چلو تم برا ماننے ہو تو میں آج سے گلے نہ جاؤں گی لیکن سہم
 ہے میں نہ مٹی تو محلے والیں کیا سمجھیں گی کیا کہیں گی۔ ایک دوسری سے گانا تو کوئی بری چیز نہیں
 زرا دل لگا رہتا ہے۔ ہم بھی دو منٹ کے لیے جی لیتے ہیں۔ اگر تو برا ماننا ہے تو نہ سہی۔“
 عین اس وقت نیچے ڈیوڑھی سے نائن کی آواز آئی۔ ”بی بی حسن دین کے گھر سے بلا
 ہے۔ آکر بری کی چیزیں دیکھ لو۔“

”بلاوا ہے۔“ ”شہزاد اپنے آپ بولی۔“ ”بری کی چیزیں دیکھنے کا بلاوا ہے۔“

بری کی بات سن کر شہزاد کی آنکھوں میں چمک لہرائی اور گرد و پیش دھندلا کر رہ گئے۔ کدم
 ایلی کا وجود اس کے لیے بے معنی ہو کر رہ گیا اور ایلی سے کیے ہوئے تمام وعدے فراموش ہو
 گئے۔ لپک کر اٹھی اور ٹنک کھول کر کپڑے نکالنے لگی اور پھر آئینے کے سامنے سنگار منا
 مصروف ہو گئی۔ ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

آخر وہ اس کے قریب جا کھڑا ہوا۔ ”تم جاری ہو۔“ اس نے پوچھا۔
 شہزاد نے خالی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”تم کہہ رہے ہو کچھ۔“ اس نے ایلی سے
 پوچھا۔ اس بے تعلقی کے اظہار پر ایلی کا منہ غصے میں لال ہو گیا۔ لیکن شہزاد نے اس کی طرف
 کوئی توجہ نہ دی۔ اس وقت وہ ٹنک سے اپنا محبوب سوٹ نکال رہی تھی۔ پھر وہ بات کے لیے
 غسل خانے میں داخل ہو کر کپڑے بدلنے لگی۔

جلدی جلدی وہ تیز ہو کر یوں بیڑھیاں اترنے لگی۔ جیسے جانے کے سوا کسی اور بات کا
 سدھ سدھ نہ ہو۔ بیڑھیوں میں پہنچ کر وہ چلائی۔ ”جانو تو ہنڈیا چڑھا دتا میں ابھی لوٹ آؤں گی۔“
 شہزاد کے جانے کے بعد ایلی ویر تک غصے سے کھوتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ شہزاد
 کو بیٹھے بیٹھے کیا ہو جاتا تھا۔ کہاں وہ محبت بھری باتیں کرنے والی شہزاد جو محلے میں اس کا
 تلاش میں سرگردان پھرتی تھی اور کہاں یہ شہزاد جو اس کے وجود ہی سے منکر تھی۔ اسے
 میں نہیں آتا تھا کہ ان دونوں میں سے اصلی شہزاد کون سی ہے۔

دیر تک وہ غصے میں کھوتا رہا اور پھر اپنی حماقت پر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ جانو اسے

فرق یہ تھا کہ ایللی کی خاموشی مایوسی بھری تھی اور رضا میں ایک امید بھرا اضطراب کروٹ میں لہا تھا۔

دفعاً ایللی رک گیا۔ ”رضا ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“ رضا نے اپنا سونٹا زمین پر ٹیک کر لنگڑی ٹانگ اٹھائی ”کہو۔“ وہ بولا۔

اس وقت ایللی کو احساس ہوا کہ اس نے رضا سے کچھ کہا ہے۔ شاید وہ اپنا راز بیلے کے لیے مضطرب ہو رہا تھا۔

”کہو نا“ رضا بے تابانہ بولا۔

ایللی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کہے۔ وہ ایک ساعت کے لیے سوچتا رہا۔ پھر بولا

”رضا میرا جی نہیں لگتا۔“

”تو پھر“ وہ بولا

”پھر“ ایللی نے دہرایا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ پھر کے جواب میں کیا کہے۔

”یہاں سے کیسے چلے جائیں؟“ ایللی کے منہ نکل گیا۔

”لیکن جائیں کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں یہ سوچنے کی بات ہے۔“ رضا بولا پھر دفعاً وہ چلایا ”ارے وہ ارجمند جو ہے پکارا

کب سے ہماری راہ دیکھ رہا ہے۔ بیمار پڑا ہے۔ کہتے ہیں دق ہے۔ اس کا بڑا بھائی تو جوانی میں دق

سے مرا تھا۔“

”ہاں ارجمند جو ہے۔“ ایللی نے محسوس کیا کہ اس کا علی پور سے جانے کا شوق دم بڑا ہوا

رہا ہے۔

”تو کب چلیں؟“ رضا نے پوچھا۔ ”آج ہی سہی۔ چاہے ابھی چلو۔“

ایللی سوچ میں پڑ گیا۔

رضا نے سونٹا دونوں ہاتھوں میں تھام لیا ”اب آپ ہی بات کر کے پیچھے ہٹا ہے۔“

اسے گھورنے لگا۔

ایللی بھی جوش میں آ گیا ”تو چل ابھی سہی۔ میں اپنا سوٹ کیس اٹھا لوں۔“ ”ہوں سوٹ

کیس“ رضا چلایا اس کی کیا ضرورت ہوگی۔ بلاو بنا پھرتا ہے۔“

”اچھا تو ابھی لا سوٹ کیس اپنا میں انتظار کروں گا۔“

”تو نہیں جائے گا گھر اطلاع دینے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہنا کیا ہے۔“ وہ بولا ”کسی کے ہاتھ کھلا بھیجوں گا کہ مل لینے جا رہا ہوں۔“ تو جا۔

بھاگ۔“

بب ایللی گھر پہنچا تو اس کا دل دو متضاد خواہشات میں بنا ہوا تھا۔ ایک لمحے میں اسے خیال

آتا ہے جائے بغیر میں کیسے جا سکتا ہوں۔ جب اسی معلوم ہو گا تو وہ کیا کہے گا۔ اور پھر آٹھ

پنیاں ضائع کر دینا پھر نہ جانے کب علی پور آنا نصیب ہو۔

دوسرے لمحے میں وہ سوچتا یہاں کیوں بیٹھا اس کا انتظار کھینچتا رہوں اور وہ یوں گانے میں

اور بری چیز دیکھنے میں مصروف رہے۔ گانا تو محض بہانہ ہوتا ہے۔ مقصد تو اپنی نمائش کرنا ہوتا

ہے۔ اور اور پھر اس وقت اس کی نگاہوں تلے وہ کھاتا ہوا بھالو آکھڑا ہوتا۔ شہزاد گڈنگی بجا بجا کر

گاتی اس خیال پر ایللی کو از سر نو غصہ آ گیا۔ اس نے لپک کر سوٹ کیس اٹھا لیا اور چپکے سے

بیڑھیاں اترنے لگا۔ راستے میں کئی بار جی چاہا کہ لوٹ جائے۔

علی پور سے نکلتے ہی ایللی کو وہاں سے چلے آنے پر افسوس ہونے لگا۔ دل میں درد ہونے

لگا گاڑی چمکا چمک چلے جا رہی تھی۔ دور ہرے بھرے کھیتوں کے پرے شہزاد اس کے پیچھے

پچھے بھاگ رہی تھی۔ ”نہ جاؤ نہ جاؤ تم کیوں چلے گئے ہو ایللی کیا تم مجھ پر اعتماد نہیں کر سکتے۔“

”ایللی۔“ شہزاد چیخ رہی تھی چلا رہی تھی۔

شیشن پر اترنے کے بعد ایللی نے ان چند کچے گھروندوں پر نگاہ ڈالی جو ریلوے شیشن کے

پاں ڈھیر ہو رہے تھے۔

ہمار کی دوکان پر چار ایک آدمی کھاٹ پر بیٹھے حقہ پی رہے تھے۔

ان کے قریب ہی دو آدمی زمین پر بیٹھے لوگھ رہے تھے۔ بائیں ہاتھ بیکر کے درخت تلے

ایک گدما کھڑا تھا جس پر لکڑیاں لدی ہوئی تھیں اس کے قریب ہی کونیں پر چار ایک بھدی اور

کل عورتیں ہائی بھر رہی تھیں۔ کچے گھروندوں کے چاروں طرف دور دور تک بھر زمین کا وسیع

بھیڑاؤ۔

گھنٹوں دیکھ کر ایللی گھبرا گیا۔ ”کیا یہی گاؤں ہے“ اس نے رضا سے پوچھا۔ ”یہ تو محض دیرانہ

ہے۔“

”گور کیا ہو بیمارے۔“ رضا چلایا۔ ”گھنٹوں تو ایسے ہی ہوتے ہیں۔“

”لیکن لیکن ارجمند تو کہتا تھا۔“

رضانے قہقہہ لگایا ”اسے تو بچنے کی عادت ہے کبے جاتا ہے۔“ ”وہ تو بندر لینا ملے ہیں۔“

”ایلی نے کہا۔“

”دیکھ لو بندر ابن رضا ہنسنے لگا۔“

”وہ تو کارخانے میں کام کرتا ہے نا۔“ ایلی نے پوچھا۔

جلو کا تارپین کا کارخانہ گاؤں سے میل کے فاصلے پر تھا۔ مشین سے ایک چھوٹی سی لائن

کارخانے کی طرف جاتی تھی جس پر چھوٹی چھوٹی ٹرالیاں چلتی تھیں۔

کارخانہ ایک وسیع جوگن میں تھا جس میں عمارتیں اور مشینیں تو کافی تھیں لیکن بیشتر عمارتیں

دیران پڑی تھیں اور اکثر مشینیں بے کار کھڑی رنگ آلود ہو چکی تھیں۔

کارخانے کے جنوبی حصے میں مزدوروں اور ملازمین کے لیے کوارٹروں کی چند ایک قطاریں بنی

ہوئی تھیں۔ بہت دیر تلاش کرنے کے بعد انہیں ارجمند کا گھر ملا۔

مرلی کا رسیا

وہ ایک چھوٹا سا کوارٹر تھا۔ مختصر سے صحن میں ایک چھوٹا سا باورچی خانہ اور غسل خانہ

ہوا تھا۔ دوسری طرف ایک کمرہ تھا۔

کمرے میں ایک طرف چارپائی پر ارجمند لیٹا ہوا تھا۔ چارپائی کے قریب اس کی ماں بٹھی

آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔ دوسری طرف ارجمند کی ہمیشہ چپ چاپ بیٹھی رو رہی تھی۔

چارپائی پر ارجمند کا ڈھانچہ پڑا ہوا تھا۔ چہرے کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں، آنکھوں کے گرد سیاہی

پڑے ہوئے تھے۔ ایلی نے گہرا کر چاروں طرف دیکھا ”یا اللہ یہ میں کہاں آگیا ہوں۔“ اس نے

قریب رضا لانگی زمین سے نیچے چپ چاپ کھڑا تھا۔

دفعۃً ارجمند کی ماں نے مڑ کر ان دونوں کی طرف دیکھا۔ ایک ساعت کے لیے انہیں

پھٹی نگاہوں سے دیکھتی رہی پھر چونکی۔ اس نے مسکرائے کی شدید کوشش کی۔ لیکن اس کی

نکل گئی۔ اور پھر ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔

”دیکھ تو بیٹا۔“ وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔ ”تیرے دوست تجھ سے ملنے آئے ہیں۔“

تو ادھر آنکھیں تو کھول۔“

لیکن ارجمند اسی طرح آنکھیں بند کیے پڑا رہا۔

وہ ایلی اور رضا سے مخاطب ہو کر بولی ”اسے تو اپنی سدھ بھی نہیں رہی۔ بس یوں ہی

آنکھیں بند کیے پڑا رہتا ہے۔ نہ خود بات کرتا ہے۔ نہ کسی کی بات سنتا ہے۔ آؤ بیٹھ جاؤ۔ دیکھ لو

اپنے دوست کا حال۔“

وہ دونوں چپ چاپ چوکیوں پر بیٹھ گئے ماں پھر سے اپنے بیٹے کی طرف ٹٹکی باندھ کر دیکھنے

میں کھنکی اور کواڑ پر ایک خوفناک خاموشی مسلط ہو گئی۔

نہ جانے کب تک وہ یوں ہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔

رضانے اپنا سر گھٹنوں میں دے رکھا تھا۔ ایلی غور سے ارجمند کی طرف ٹٹکی باندھ دیکھ

دہاقت۔ پھر اس کی نگاہ اس میز پر پڑی جو ارجمند کے سر ہانے پڑی تھی۔ میز پر ایک موتی سی جلد

کاپی تھی جس کے سرورق پر خوش خط حروف میں انگریزی ملباؤں لکھا ہوا تھا۔ ایک طرف

بائری دیوار سے لگی کھڑی تھی۔ اور اس کے قریب ہی سستی خوشبو کی چند خالی شیشیاں تھیں

اور اشعار کی کئی ایک چھوٹی چھوٹی کتابیں پڑی تھیں اپنی انگریزی پریم سندیس پریم پتر اور پونم

نواسے بے نیاز گوگل کے بن کا وہ کنسیا آنکھیں بند کیے ہوں بے حس لیٹا ہوا تھا جیسے اس میں

حرکت کی سکت نہ رہی ہو۔“

اس منظر کو دیکھ کر ایلی کا جی چاہتا تھا کہ چیخیں مار مار کر رو دے۔

دفعۃً ارجمند کو کھانسی کا دورہ شروع ہو گیا اور اس کا سارا جسم کھانسی کی شدت سے

لڑنے لگا۔ سینے میں دھنکی سی چل رہی تھی۔ ہڈیاں چیختی ہوئی معلوم ہوتی تھیں۔ ماں نے بڑھ

کر اسے قلم لیا۔ بن چوڑے بھرا پیالہ اٹھا کر پاس آکھڑی ہوئی تاکہ اسے تھوکنے میں وقت نہ

ہو۔ دیر تک ہڈیوں کا ڈھانچہ یوں ہلتا رہا۔ جیسے روٹی سے بنا ہوا ہو۔ پھر اس نے منہ کھول دیا اور

بہتر خون کی پچکاری سی چل گئی۔ ماں نے اسی لٹا دیا۔ اس کی آنکھیں کھلی تھیں لیکن ان میں

دیکھنے کی سکت نہ تھی ماں چلانے لگی۔ ”بیٹا دیکھ تو تیرے دوست آئے ہیں۔“ مگر وہ جوں کا توں

پڑا رہا۔

پھر ایلی اٹھ کر اس کے سامنے چارپائی پر جا بیٹھا۔ ”ارجمند“ اس نے اسے آواز دی۔

”ارجمند ارجمند۔“ ارجمند کی نگاہ میں ایک چمک سی لڑائی۔

”میں ہوں ارجمند میں اور رضا بھی آیا ہے۔“ ایلی نے رضا کی طرف اشارہ کیا۔ ارجمند نے

”جی“ وہ بولا ”برا مزار ہے گا وہاں۔“
”کیا اس نہ کر۔“ رضا چلایا۔

”اوسوں“ ”دوبنا“ یہ بند نہ ہوگی۔“
دیر تک وہ باتیں کرتے رہے۔ پھر ایلی اور رضا اٹھ بیٹھے ”اچھا اب ہم جاتے ہیں۔“
”اوسوں۔“ ارجمند نے سر ہلایا۔
”چچے دوکان آگئی ہے۔“ رضا بولا۔

”ہمیں اب اجازت ہی دو۔“ ایلی نے کہا۔
ارجمند نے غور سے ان کی طرف دیکھا۔ اور جب ایلی رضا مصافحہ کرنے لگے۔ ارجمند کا
اپنے ہاتھ میں تھا تو اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر رخسار پر بہ گیا۔
”ہل برا نہ کرو ارجمند۔“ ایلی نے کہا ”پھر ملیں گے۔“
ارجمند کی آنکھ میں عجیب سی مایوسی تھی۔ بے بسی بھری مایوسی۔
”اچھا خدا حافظ“ رضائے کہا۔ اور وہ دونوں چپ چاپ باہر نکل آئے۔

شیش تک وہ دونوں چپ چاپ چلتے رہے۔ ان کے دلوں پر بوجھ پڑا ہوا تھا۔
ہاروں طرف اواسی چھائی ہوئی تھی۔ فضا بوجھل محسوس ہو رہی تھی۔ اور وہ رینگتا ہوا
دیرانہ پھیل کر کیا لامتناہی ہوا جا رہا تھا۔
گاز کے قریب پہنچ کر وہ دونوں رک گئے۔

”کنویں سے پانی نہ پانی لوں تمہوڑا سا۔“ رضائے کہا۔
”ہی لو۔“ اور وہ دونوں کنویں کی طرف چل پڑے۔
کنویں پر عورتیں پانی بھر رہی تھیں۔
”میں پانی پانا ڈرا۔“ رضائے اپنے مخصوص انداز میں کہا۔ پانی پی کر وہ دونوں چل پڑے۔
کنویں پر عورتیں ان کے متعلق باتیں کرنے لگیں۔

”کون تھے یہ؟“ کوئی پوچھ رہی تھی۔
ایک مرد کہہ رہا تھا۔ ”کارخانے میں کسی کے مہمان آئے تھے۔ وہ پتلا دھلا چھوکر اشیاء
دلائے۔“
”اچھا وہ سوداگاری سا“ ایک ہنسنے لگی۔

گردن موڑنے کی کوشش کی اپنی بے بسی محسوس کر کے اس کی آنکھیں پر غم سی ہو گئیں۔
”کوئی بات کر ان سے بیٹا۔“ اس کی ماں آنسو پونچھتے ہوئے بولی۔

”کیا حال ہے تیرا۔“ ایلی نے چلا کر کہا۔

ارجمند نے بعد مشکل اپنا ہاتھ اٹھایا اور یوں اشارہ کیا جیسے کہہ رہا ہو ”ٹھیک ہوں امیر۔“
”جلد جلد صحت یاب ہوتا۔“ وہ بولا۔
ارجمند مسکرا دیا۔

دو روز انہوں نے وہاں قیام کیا۔ پلے دن تو ارجمند ان سے کوئی بات نہ کر سکا مگر اگلی
اس کی طبیعت بہتر معلوم ہوتی تھی۔

”تم اچھے ہو تا۔“ ارجمند نے اشاروں کی مدد سے ایلی سے پوچھا۔

”تم اپنی بات کرو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”مزے میں ہوں۔“ وہ بولا ”لیکن تم دیر سے آئے ہو۔ بہت دیر سے۔“ ارجمند نے رک
رک کر کہا۔

”کیوں اب کیا ہے۔“ رضائے پوچھا۔

”اب۔ اب۔“ وہ سوچ میں پڑ گیا۔ ”اب بھی ٹھیک ہے۔ لیکن وہ تمہیں بند رہیں کن
دکھائے گا۔ اور اور وہ۔“ رک گیا۔

”اے مسخرے یہ کیا ڈھونگ رچایا ہے تو نے۔“ رضائے شرارت سے کہا۔

”ڈھونگ رچائے بنا رہے ہیں کبھی۔“ وہ بولا ”ماں ڈھونگ بھی نہ ہو تو ہو کیا۔“

”اب جلد ٹھیک ہو جائے۔ اور علی پور آؤ۔ بیاہ ہو رہے وہاں۔“

”کپ کپ کی سناؤ۔“ ارجمند نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ”مری تو نہیں جاری اپنے فرائض
میں۔“

”تو شرارت سے کب باز آئے گا۔“ رضا چلایا۔

”اوسوں“ ارجمند بولا ”باز آنا اپن کا کام نہیں۔“

وہ دونوں ہنسنے لگے۔

”وہاں جا کر بھی یہی کام کروں گا۔“ ارجمند نے کہا۔

”کہاں جا کر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں وی۔“

”سنا ہے آج کل بیمار پڑا ہے۔ بڑا روگ کتے ہیں۔“

”تت تت تت تت پچارہ۔“

ایلی کے روبو ار چند کھڑا مسکرا رہا تھا سمجھ ہو اس کو کتے ہیں لان گوکل کی دیو پیاں لٹتی ہیں۔ جان جائے پر آن نہ جائے۔ اندر ہی اندر محبت کی آگ سے پھلک مریں گی۔ ٹھوکر تک بات آجائے اونہوں۔ دھنیا ہے گوپیوں نے آج کرشن کنہیا کی بھی لان رکھ لی۔ کیا کچھ کہہ کر وہ مری کارسیا بانسری بجانے لگا۔

کنویں پر کھڑی وہ ٹیار ہنس رہی تھی۔ ”تیری طرف ہی دیکھ دیکھ کر آنکھیں ٹپکنا کرنا تو اور پھریوں مری بجانے لگتا جیسے بڑا مین کار ہو پر خاک بھی نہ بچتی تھی اس سے۔“
کا کا کا کایں درخت پر بیٹھا ہوا کوا یوں بولنے لگا جیسے کسی مری کے رسیا کی نقل انداز رہا۔
دور گاؤں کی چکی ہو تک رہی تھی۔ اور کھیتوں میں کوئی ماہیا گا رہا تھا۔
”اساں کل ترو بختیں تس راہ پئے تکتے نی۔“

ان جانا تیاگ

دیر تک وہ دونوں شیشن کے پنج پر اس ریختے ہوئے دیرانے میں بیٹھے گاڑی کا انتظار کرتے رہے۔ وہ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ دو ایک بار رضانے بات کرنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن بات اس مسلط اور محیط اداسی کے پھیلاؤ میں یوں بے کار ہو کر رہ گئی تھی جیسے ریگستان میں ہلانا ایک بوند گر گئی ہو۔

پھر جب گاڑی کی کھنٹی بجی تو وہ چونکے۔ ”میں نکٹ لے آؤں۔“ رضانے کہا۔
”صرف ایک لانا۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک“ رضانے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں“ ایلی نے رضا کی طرف دیکھے بغیر کہا ”ایک۔“

”کیوں۔؟“

”بس۔“

”تم کیا بیس بیٹھے رہو گے باقی عمر“ رضانے پوچھا۔

”ہیں۔“ ایلی بولا۔

”تو پھر۔“

”میں علی پور نہیں جاؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو کہیں جاؤ گے۔؟“

”لاہور۔“ ایلی سوچے سمجھے بغیر بولا۔ اس چھائی ہوئی اداسی اور ویرانی نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا تھا۔ اس کی نگاہ میں شتراد اور اس کی تمام ریگنیاں عبث ہو کر رہ گئی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے ساری دنیا کو تیاگ دیا ہو۔ اور سادھو بن کر باہر نکل آیا ہو۔

”لیکن۔“ رضا بولا۔ ”محلے میں تو اتنی شادیاں ہیں۔“

”شادیاں۔“ ایلی نے برا سامنہ بنایا ”ہونے دو۔“

”اور اور۔“ رضانے پوچھا ”اور وہ۔“

”وہ“ ایلی نے تعجب سے پوچھا ”وہ کون۔“

”کیا اسے نہ لو گے۔؟“ رضانے پوچھا۔

”کیا فرق پڑتا ہے۔“ ایلی نے سمجھے بغیر آہ بھری۔

”اور تمہاری چھٹیاں۔“

”چھٹی ہی چھٹی ہے اب اور کیا۔“ ایلی بولا۔

”اور۔“ رضا خاموش ہو گیا۔ دیر تک وہ خاموش بیٹھے رہے۔

جب گاڑی آئی تو رضانے ایک مرتبہ پھر ایلی کی منت کی۔ ”چلو اکٹھے چلتے ہیں۔“

”لوں ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو میں اسے کیا جواب دوں گا۔“ رضانے پوچھا۔

”جو جی چاہے کہہ دیتا۔“ ایلی نے آہ بھری۔

”وہ مجھ سے ناراض ہو گی۔“

”مجھ سے کون سی خوش ہے وہ۔“ ایلی سمجھے سوچے بغیر باتیں کیے جا رہا تھا۔ اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ رضا اس کے متعلق بات کر رہا ہے۔ جس کے متعلق وہ کسی سے بات کرنے کو تیار نہ تھا۔

لاہور پہنچ کر ایلی یوں چارپائی پر لیٹ گیا جیسے اس وسیع دنیا میں اس کے لیے کوئی جگہ نہ ہو

جیسے دنیا محض ایک دیرانہ ہولق ووق ویرانہ۔

نیا بورنگ خالی پڑا تھا۔ لڑکے اپنے اپنے گھر گئے ہوئے تھے۔ صرف چند ایک نوکر بکریاں گھومتے پھرتے دکھائی دیتے تھے جیسے کسی پرانے قلعے میں بھوت چل پھر رہے ہوں۔ چار روزہ چپ چاپ اپنے کمرے میں پڑا رہا۔ اس کا ذہن ایک غلامش تبدیل ہو چکا تھا۔ علی پور شہزادہ تیم گویا اس کی زندگی سے معدوم ہو چکے تھے۔

کرینٹ ہوسٹل

پھر آہستہ آہستہ کرینٹ ہوسٹل میں حرکت پیدا ہوئی اور وہ نئے ماحول میں کھو گیا۔ کرینٹ ہوسٹل ریواز سے قطعی طور پر مختلف تھا۔ اس میں سب سے بڑی خوبی یہ تھی کہ ہر شخص کو ایک الگ کمرہ حاصل تھا۔ جب بھی وہ چاہتا اپنے کمرے میں جا کر لوگوں کو اپنی زندگی سے خارج کر سکتا تھا اور جب چاہتا کمرے سے باہر نکل کر بیچڑ میں شامل ہو سکتا تھا۔ اگرچہ بیچڑ میں شامل ہونے کی خواہش اس نے کبھی محسوس نہ کی تھی اس کے برعکس ریواز ہوسٹل میں کمرے کے اندر اور کمرے کے باہر ہر جگہ بیچڑ لگی رہتی تھی۔ اس بیچڑ سے بچنا قطعی طور پر ناممکن تھا۔ لیکن یہاں اس نے ہوسٹل میں کمرے سے باہر بھی بیچڑ نہ تھی۔ یہاں باہر بھی افراد تھے ایسے افراد تھے جو اس کی طرح اذلی طور پر اکیلے تھے تنہا تھے۔

کرینٹ ہوسٹل میں پہنچ کر اس نے غالباً پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ بیشتر افراد اکیلے اور تنہا ہونے کی وجہ سے لوگوں کے شور و شغب سے دور بھاگتے ہیں۔ اس احساس کو رد کرنے کے لیے ہنگامہ پیدا کرتے ہیں اور بیچڑ کی طرف بھاگتے ہیں یا بیچڑ لگا لیتے ہیں۔

کرینٹ ہوسٹل میں جا کر اسے تسلی سی ہو گئی۔ اب وہ دوسرے طالب علموں سے اس تک نہیں ڈرتا تھا۔ شاید اس لیے کہ اس نے سمجھ لیا تھا کہ بیچڑ لگانے والے خود احساس غمی اور احساس کمتری سے عاجز آئے ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ اب وہ فٹ ایئر کا نہیں بلکہ تھرو ایئر کا طالب علم تھا۔ اگرچہ اس کے باوجود کالج کے بیشتر پروفیسر اور لڑکے اس سے قطعی طور پر نا آشنا تھے۔

بہر صورت اس نے ہوسٹل میں اسے تنہائی میسر تھی اور اس لیے ہوسٹل کے لوگوں کا نگاہیں اس کی آمد و رفت میں دخل انداز نہیں ہوتی تھیں اسے چھپڑی نہ تھیں اس پر تنہا

نہیں تھیں۔ جب بھی اہلی پر شہزاد طاری ہو جاتی تو وہ اپنے کمرے میں جا گھستا اور دروازہ بند کر کے چاہائی پر لیٹ کر جیتی ہوئی باتیں از سر نو پیتا شروع کر دیتا۔ یوں زندگی کی ویرانی کو بر طرف کرنے کے لیے تخیل کا سہارا لیتا۔ اور جب اس سے بھی تسکین نہ ہوتی تو چپ چاپ اٹھ کر بیچڑ میں بیٹھا مین بیٹھ کر اہلو اور پیڈرو بہادر کے کارنامے دیکھتا اور پھر واپس اپنے کمرے میں چپ کر چاہائی پر لیٹ کر اپنی لیڈنگ لیڈی کو اس قید خانے سے چھڑانے کی تجاویز سوچتا تخیل میں ان تجاویز کو عملی صورت دیتا۔ اس کی زندگی میں شہزاد سے بڑھ کر کوئی عشرت نہ تھی۔

لیکن جب سے وہ ارہمند سے مل کر آیا تھا۔ یہ خوش فہمی پیدا کرنے کی کوشش میں شدت سے لگا ہوا تھا کہ شہزاد کی بے پروائی کے پیش نظر اسے اس سے چنداں دلچسپی نہیں رہی۔ اسے اپنا غصہ آتا تھا کہ جب شہزاد اس کی طرف سے اس حد تک بے پروا ہو سکتی ہے تو وہ اس کا دلچا کیوں ہے۔ اس کے دل میں شہزاد کے لیے اس حد تک نیاز کیوں ہے۔ اس خیال پر اسے دکھ ہوتا اور اس دکھ کی کک سے مخلصی پانے کے لیے وہ یہ اعتبار پیدا کرنا چاہتا تھا کہ اسے بھی شہزاد کی چنداں پروا نہیں پر داتا تو تھی لیکن صرف اسی صورت میں کہ شہزاد کو بھی اس کی چاہ ہو۔ وہ بھی اس کا انتظار کھینچے۔ وہ بھی اس کے بغیر نہ رہ سکے۔

کرینٹ کے نئے ماحول میں اس نے اس اعتبار کو تقویت دینے کی کوشش کی۔ جو فہمی اس کی توجہ شہزاد کے بھڑور سے نکلی تو اس نے دیکھا کہ بھاء اس کی طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا ہے۔

بھا اور چاہ

بھا کی مسکراہٹ میں تسخیر نام کو نہ تھا۔ الٹا اس میں تو بلا کا خلوص ہمدردی اور اک ان جانی باہمی گہری تھی۔ محبت تھی۔ ایسی محبت نہیں جیسی اسے شہزاد سے تھی جو جلا کر جسم کر لیا تھا۔ بلکہ ایک ایسی گہری جس کے تحت سکون ملتا ہے۔ ٹھنڈی مٹھاس بھری مدھم گرمی۔ ہمدردیوں کو کڑی نگاہ سے نہیں دیکھتا۔ الٹا وہ تو نگاہیں جھکا لیتا تھا اور پھر بن دیکھے دوسرے کے قریب کو محسوس کرتا اور مسکراتا جیسے کہ رہا ہو میں جانتا ہوں۔ میں تمہاری مشکلات کا حل ہوں۔ میں تمہاری آہ بیکہ بن سکتا ہوں۔ اگر تم چاہو۔ ورنہ کوئی بات نہیں کوئی بات نہیں۔

بھنہ کی علت تھی کہ وہ ہر وقت کسی نہ کسی کام میں مصروف رہتا تھا۔ دن میں کئی مرتبہ فکر کرتا۔ اکثر نماز پڑھتا نظر آتا اور ہاتھ دھو تا تو اس کا مسلسل شغل تھا۔ اسے ہاتھ دھوتے دیکھ

کر ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سمجھتا ہو کہ اس کے ہاتھ کبھی صاف نہیں ہو سکتے اگرچہ وہ
میں شیشے کی طرح صاف اور چمکدار تھے پھر نہ جانے کیوں بار بار بھانکی توجہ ہاتھوں کی
مبذول ہو جاتی اور وہ کہتا "چھاتو میں ذرا ہاتھ دھو لوں۔" ہاتھ دھونے کے بعد دیر تک ہاتھ
صاف ستھرے ہاتھوں کو تولیے سے رگڑ رگڑ کر صاف کرتا رہتا۔

بھا کی طبیعت میں مٹھاس کے علاوہ ایک نظم بھی تھا۔ اس کی ہر بات قاعدے کے مطابق
ہوتی۔ ہر کام پروگرام کے تحت تکمیل پاتا تھا۔ نظم کے اس شدید جذبے کی وجہ سے لوگ
ایسی کام سوچ دیا کرتے جو باقاعدگی اور سلیقے کے بغیر سرانجام نہیں دیئے جاسکتے اور موسم
توجہ چاہتے ہیں۔ اگر کسی کا پن خراب ہو جاتا تو وہ اسے بھاہ کو دے دیتا۔ "بھائیہ ذرا دیکھو
قلم میں کیا گڑبڑ ہے۔" اگر کسی کی گھڑی صحیح وقت نہ دیتی ہو تو وہ بھی بھاہ کو سوپ دی جاتی۔
ایسی چیز بھاہ کو دیتے ہوئے تاکید توجہ یا احتیاط سے متعلق ہدایات دینا بالکل عادت تھا۔
و کھانا ہی کافی تھا۔ "بھائیہ ذرا دیکھنا۔" اور پھر بھاہ کی تمام تر توجہ اس پر مرکوز ہو جاتی اس حد تک
وہ ہر وقت اسے اٹھائے پھرتا اور راہ چلتے یا فرصت کے وقت بیٹھے ہوئے اسے ٹھیک کرتے
شدت سے مصروف رہتا اور جب وہ بالکل ٹھیک ہو جاتی تو دھنستا "اس چیز سے بھاہ کی دلچسپی
جاتی۔

بھا کو ٹوٹی ہوئی یا بگڑی ہوئی چیزوں کو بنانے سنوارنے سے دلچسپی تھی۔ لیکن ایسے عموماً
ہوتا تھا جیسے وہ خود ایک ٹوٹی ہوئی چیز ہو۔ لیکن اپنے آپ کو بنانے سنوارنے کی اس نے
کوشش نہ کی تھی۔ اسے بننے سنورنے سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اسے دیکھ کر عموماً
ہوتا تھا جیسے مٹی کا دیا ہو جو مدھم لوجھل رہا ہو۔ بھانے کبھی بھڑک کر جلنے کی کوشش نہ کی۔
اس کی شخصیت اس فرد کی چمک سے عاری تھی جو کالج کے لڑکے اپنی طرف توجہ منصف کرنے
کے لیے پیدا کرنے کے عادی ہوتے ہیں۔

ویسے بھڑک کر جلنے کی خواہش جاہ میں بھی نہ تھی بنیادی طور پر وہ بھی جھوڑے یا
چراغ تھا۔ لیکن اس کے انداز میں ایک عجیب سی جھجک تھی۔ وہ ہر نووارد کی آمد پر ہنسنے کو
رہ جاتا۔ پیشانی پر تیوری چڑھ جاتی ہونٹوں پر تحقیر کی ہلکی سی لرزش پیدا ہوتی۔ اور پھر وہ گوارا
کے کپڑے کی طرح اپنے کونے میں گھس جاتا۔ لیکن اس عمل کی وجہ سے اسے کونے میں
رہنے کی عادت ہو گئی تھی۔ اور بسا اوقات وہ تنہائی میں بھی بے حسی اور بے پرواہی سے

میں رہتا بیٹا لیکن کبھی کبھار اس کی حقیقی شخصیت کی مختصر سی جھلک ایک رنگین اور رنگین
بنت بھری سکرپٹ کی صورت میں ہویدا ہوتی جیسی برکھارت میں بادلوں میں سے سورج کی
نیش میں پھٹ نکلتی ہیں اور ایک ساعت کے لیے منظر پر رنگین دھاریاں دکھائی دیتی ہیں۔
بھانے کے اس جھجک اور ڈر کا بظاہر کوئی جواز دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن اس کی شدت سے ظاہر
تھا کہ یہ نفوش کسی شدید ذہنی طوفان کے چھوڑے ہوئے ہیں۔ جس کی وجہ سے اس کی
نفس کا دھار ا خارجی سمت کی طرف بننے کی بجائے داخلیت کی طرف مڑ گیا تھا۔ اور اس طرح
وہ اپنی ہی انا کا بنور بنا کر اس میں ڈبکیں کھا رہا تھا۔

کتابیں

خارجیت سے ہٹ کر جاہ کی توجہ کتابی دنیا کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔ اور اس کتابی دنیا
نے حقیقی دنیا کی حیثیت اختیار کر لی تھی جس میں وہ جیتا تھا کتابی کرداروں سے جھجکے بغیر ملتا تھا۔
ان سے تعلقات پیدا کرتا تھا۔ اپنے ارد گرد ان کی بھیر لگا کر بیٹھ رہتا تھا کرینٹ ہوٹل میں ایل
کے لیے بھا اور جاہ دو پناہ گاہیں تھیں۔ اس لیے روز بروز وہ ان دونوں بھائیوں کے قریب تر ہو
گیا۔ ایک تو ان دونوں کے کیوبیکل ایل کے کمرے کے پاس ہی واقع تھے۔ دوسرے وہ دونوں طنز
اور تمسخر سے عاری تھے اور ان میں دوسروں کا مذاق اڑانے کی عادت نہ تھی۔ ان سی مل کر ایل
کا احساس کمتری ابھرنے کی بجائے دب جاتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ جاہ سے ایک بعد سا محسوس
کرتا۔ جاہ کی بظاہر سرد مزی ایل میں جھجک پیدا کرتی تھی۔

جب بھی ایل جاہ کے کمرے میں جاتا تو وہ یوں سراٹھا کر اس کی طرف دیکھتا جیسے پوچھ رہا
ہو۔ تمہارا یہاں آنے کا مطلب؟ جاہ کے ماتھے پر تیوری چڑھ جاتی۔ ایک ساعت کے لیے وہ ایل
کی طرف دیکھ کر گھورتا اور پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا اور ایل جاہ کے قریب بیٹھے ہونے
کے باوجود تنہا رہ جاتا۔ ابتدا میں تو ایل جاہ کے اس رویے پر گھبرا جاتا تھا اور کچھ دیر جاہ کے کمرے
میں بیٹھے کے بعد چپکے سے وہاں سے کھسک آتا۔ لیکن آہستہ آہستہ وہ جاہ کی اس علوت سے
دنوں ہو تاکہ انا کہ جاہ کی بے رخی اور بے پروائی وہ بھی لیکن دوسرے لڑکوں کی طرح اس کی
تجلیں ٹوٹتی تو نہ تھیں۔ اور جب بھی وہ جاہ کی بے حسی سے گھبرا جاتا تو آزادانہ طور پر وہاں سے
الٹ کر آسکتا تھا۔

جہ نے کبھی اس سے نہ پوچھا تھا کہ تم جا رہے ہو یا تم کیوں یا کہاں جا رہے ہو۔

باہر آمدے میں اس کی طرف آنکھ اٹھا کر دیکھے بغیر بھاگتا۔ ”ایلی۔ آؤ یار میں تو اس کے چکر میں پڑا ہوں نہ جانے کیا خرابی ہے۔ یہ ٹھیک وقت نہیں دیتی۔ وہ سعید ہے ابھی چوہدری کرم دین کا بیٹا اس کی ہے یہ گھڑی۔ کیا وقت ہو گا بھی اودہ یہ تو چار بج گئے۔ ابھی وضو کر لوں“ جاہ ٹھٹک کر اس کی طرف دیکھتا اس کی نگاہ میں چمکوک اور اعتراض نمایاں ہوتا ہے پھر بات کیے بغیر مطالعہ میں کھو جاتا حتیٰ کہ اسے احساس ہی نہ رہتا کہ کوئی شخص کمرے میں بند ہے۔

جاہ کا کمرہ کتابوں اور رسائل اور تصاویر سے بھرا رہتا تھا۔ ہر ماہ کتابوں اور رسائل کا ایک پتہ لکھا آ جاتا۔ اور جاہ ان کے مطالعہ میں کھو جاتا۔ صبح سے شام تک جاہ کو ان کتب اور رسائل کے علاوہ اور کسی چیز سے دلچسپی نہ تھی پڑھتے پڑھتے وہ آپ ہی آپ ہنسنے لگتا۔ ”خوب طوب“ وہ اپنے آپ سے کہتا۔ ”یہ شخص بھی عجیب مسخرا ہے ہی ہی ہی۔“

ایلی ہنسنے لگتا۔ کون مسخرو ہے ایلی کی موجودگی کو محسوس کر کے دفعتاً ”جاہ کا انداز بدل جانا کون مسخرو ہے جاہ دہراتا“ ہوں ہوں“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر وہ پھر سے کتاب میں کوبتا اور پھر کچھ دیر کے بعد آپ ہنسنے لگتا۔ ”جروم کے جروم بھی عجیب ہے عجیب ہے عجیب ہے انگلیاں چٹختے ہوئے جاہ مدھم آواز میں بولے جاتا اور پھر سے بھول جاتا کہ اس کے کمرے میں کتابوں کے شلت کے قریب کوئی بیٹھا ہے ایلی وہاں بیٹھ کر کوئی کتاب یا رسالہ کھول کر تصویریں دیکھنا شروع کر دیتا تھا۔ اور چپ چاپ ورق گردانی میں مصروف رہتا۔

اس سے پہلے ایلی کو یہ احساس نہ تھا کہ کتاب کو کالج یا امتحان کے نقطہ نظر سے ہٹ کر نگاہ پڑھا جا سکتا ہے جاہ سے مل کر اسے پہلی مرتبہ کتاب کا احساس ہوا۔ پہلی مرتبہ اسے کتاب کا ورق گردانی کا موقع ملا لیکن اس کے باوجود کتاب کے نفس مضمون کی اہمیت کا اسے احساس نہ تھا۔

پھر کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ جاہ اپنے کمرے میں ایلی کی موجودگی کے احساس سے ہلنا ہوتا گیا لیکن اس کے باوجود طنز بھری نگاہوں کی توں قائم رہی اس کی بے اعتنائی کچھ بڑھ گئی لیکن اس کے ساتھ آشنائی اور مسرت کے ان لمحات کی تعداد بھی بڑھ گئی جب وہ اپنے کمرے سے باہر نکلتا تھا۔

رتکین بھنور

علی پور سے آنے کے بعد ایک ہی بار ایلی کے دل میں ایک عجیب سی خواہش ابھر آئی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ شنراؤ کے خیال کے بھنور سے نکل جائے۔ وہ خوب جانتا تھا کہ شنراؤ کا سحر اس حد تک مسلط اور محیط ہو چکا ہے کہ اس سے بچاؤ ممکن نہیں لیکن شنراؤ کی بے پروائی کی وجہ سے اس کے دل میں ایک کرب پیدا ہوتا تھا ایک ایسا کرب جو اس کی روح کو یوں بلوتا جیسے وہی کا ایک برتن ہو بسا اوقات سوتے وقت جب اسے شنراؤ کا خیال آتا تو اس کے ذہن میں شنراؤ کا برے ہوئے تاروں سے بھرا ہوا نقاب آ جاتا اور وہ ان ابھرے ہوئے تاروں کو گنتا۔ اس وقت ایک گوشت کا لوتھرا غفور کی شکل اختیار کر لیتا۔ ”ہی ہی ہی“ وہ قہقہہ مار کر ہنستا ہنسنے ہنسنے اس کا منہ بات کا رنگ اختیار کر لیتا۔ بازو اور ٹانگیں کٹ جاتیں اور وہ چلاتا۔ ”ایلی تم ایلی۔“ ایلی کی نگاہ تلے اس وقت وہ اندھیری بند بینٹک ابھر آتی بینٹک کے وسط میں آب زم زم کی ایک جھیل ابھرتی اور جھیل میں سے شنراؤ سر نکل کر کھتی ایلی تم۔ اس وقت شنراؤ کے انداز میں طنزیہ تسخیر کا ایک طوفان کھولتا اور ایلی کو اپنی پلیٹ میں لے لیتا۔ پھر گوشت کا ٹنڈ منڈ لو تھرا قہقہہ لگاتا ”تم۔“

اس وقت مختلف شکلیں ایلی کے روبرو آ کر ناچتیں گاتیں بھیڑیے کی کھال اتر جاتی اور اندر سے علی احمد ہنسنے شنراؤ یہ تم کیا بچوں کو اکٹھا کر کے بیٹھ رہتی ہو کبھی ہمارے ہاں بھی آؤ نا کیا کھتی ہے۔ ہی ہی ہی۔“

تھیر کا پردہ اٹھا اور صفدر ایک ڈرامائی انداز سے داخل ہو کر کہتا۔ ”ایلی ایلی میری طرف دیکھو ایلی میں یہیں رہتا ہوں اس رتکین چوہارے کے نیچے میں یہاں دلیپز پر پڑا ہوں کبھی مجھے مل گیا کہ لیا کرو۔ کبھی مجھے بھی مل لیا کرو کبھی مجھے بھی کبھی۔“ پھر وہ گانے لگتا۔ ”اے دلبر ہوں میں ذرا۔“ گاتے ہوئے اس کی آنکھوں میں گلابی پھوار پڑنے لگی پیشانی پر دیا روشن ہوا۔

پھر شنراؤ اٹھ بیٹھتی اور ٹریک کھول کر سفید پھول دار دوپٹہ لے کر کہتی۔ ”ہاں ہاں مجھے جانا ہے مجھے جانا ہی ہو گا۔ میں جاؤں گی۔ میں جا رہی ہوں۔“ اور گوشت کا لوتھرا قہقہے لگاتا۔ ایکٹر مگر آتا اور علی احمد ہنسنے ”ہی ہی ہی۔“ اور ایلی کو محسوس ہوتا جیسے وہ سب اس پر ہنس رہے

یوں ساکت و جاہلو جیسا ہوتا ہے پھر کا بنا ہو۔ اور ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھتا دیکھے جاتا جاہ کی باتیں سن کر ایلی کو دفعتاً یہ احساس ہوتا جیسے کوئی کنویں کا مینڈک پھدک کر سمندر میں جاگرا ہو۔ جاہ کی مینس فیلڈ رسل و لٹرفرائیڈ شاہ اور برگسان کی دنیا عجیب دنیا تھی اور ایلی کے لیے یہ دنیا جاہ کے مرکز کے گرد گھومتی تھی۔

پھر جب ایلی واپس اپنے کمرے میں پہنچتا تو چھن سے شنراؤ آسن جگا کر سامنے آکھڑی ہوتی۔ "بس بات پر بگڑے ہو مہاراج وہ پوچھتی۔ کب تک غیر حاضر رہو گے۔ کب تک پناہ گاہوں میں چھپے رہوں گے کب تک مانوٹرا میں کھوئے رہو گے میری طرف دیکھو مانوٹرا میں ہوں میں۔" اس کے چہرے پر ایک پر اسرار مسکراہٹ جھلکتی "دیکھو نا۔ یلدرم نے میرے بارے میں لکھا ہے ماتھے پر ہندی آنکھ میں جادو" اس وقت شنراؤ کے ماتھے کا تل نک سے یوں روشن ہو جاتا جیسے بجلی کا ہنڈا ہو۔ اور آنکھیں ناچتیں اور رسل و لٹرفرائیڈ ازر وئے اوب ایک طرف تظار لگا کر کھڑے ہو جاتے اور پھر چپکے سے ایک ایک کر کے کمرے سے باہر نکل جاتے اور شنراؤ وہاں اکیل رہ جاتی اور اس کی شخصیت دو حصوں میں بٹ جاتی۔ ایک طرف میڈونا کا جمال اس کے گرد ہلکا ہوتا اور دوسری جانب ڈانکا کا خیال۔ اس میں وقار بھر دیتا۔ اور ایلی محسوس کرتا جیسے وہ سنگ لٹی ہو اور وہ دم ہلاتا ہوا ڈانکا کے قدوں میں جا بیٹھتا۔

رازی اور زو

ایک روز جاہ کے کمرے میں کیو پڈ اور سائیکی۔ بولا کڈ آؤٹ ریفن ڈی مائیلو کی تصاویر دیکھے کے بعد جب ایلی اپنے کمرے میں پہنچا اور لحاف لے کر لیٹا اور حسب معمول چھن سے شنراؤ روہو آکھڑی ہوئی تو وہ گھبرا کر اٹھ بیٹھا۔ ارے کیا شنراؤ کے ناچ میں آواز پیدا ہو گئی۔ وہ اٹھ کر سننے لگا۔ چھن چھن تھکھک کی آواز نے اسے چونکا دیا۔ کوئی واقعی ناچ رہا تھا۔ ایلی ڈر گیا۔ کیا اس کے حواس اس حد تک مفلوج ہو چکے تھے۔ اس کے تخیل کے ساتھ آواز کا عنصر کیسے شامل ہو گیا تھا۔ یادہ ناچ کسی متکلم فلم کا ایک ٹکڑا تھا۔

اس زمانے میں متحرک تصاویر نے ایک بار روپ بدلا تھا۔ انہی دنوں چند ایک ایسی نئی تصاویر کی تلاش ہو رہی تھی جو پرانی تصاویر کی سیریل قسم کی نہ تھیں بلکہ کہانی ایک ہی نشست میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ

ہوں اور شنراؤ در پردہ ان کے ساتھ ملی ہوئی ہو۔ ساری رات ایلی کروٹیں بدلتا آئیں مگر نہ شدت سی کوشش کرنا کہ ان خیالات کو اپنے دامن سے جھٹک دے لیکن ان خیالات سے بھی پانا اس کے بس کا روگ نہ تھا۔ اس روحانی کرب کی وجہ سے وہ چاہتا تھا کہ شنراؤ کی گرفت سے نکل جائے لیکن اس کے ساتھ ہی شنراؤ کے تصور کی رنگینی شنراؤ کی جاذبت اور شنراؤ کی توجہ کی عظمت بے پناہ کیف کے حامل تھے۔

صبح کے وقت شنراؤ کے سحر سے بچنے کے لیے وہ جاہ کے کمرے میں جا پناہ لیتا تھا۔ شاید اس وجہ سے اس نے جاہ کی سرد مہری اور بے رخی کو گوارا کر لیا تھا۔ جاہ کی شکوک بھری نگاہوں سے بچنے کے لیے اس نے ان رسائل اخبارات اور کتابوں کی ورق گردانی شروع کر دی تھی جن کا جاہ کے کمرے میں ڈھیر لگا رہتا تھا۔ ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا تھا کہ مطالعہ امتحان کے خیال سے ہر کر بھی ممکن ہے پہلے پہل اس کی توجہ تصاویر کی طرف مبذول ہوئی تھی اور تصاویر کا تفصیلی مفہوم سمجھنے کے لیے اس نے ان کے نیچے لکھے اشارات پڑھنے شروع کر دیے تھے پھر آہستہ آہستہ اس کی توجہ رسائل کے مضامین کی طرف مبذول ہو گئی تھی۔

ایلی کو کتابوں اور رسالوں کی طرف متوجہ دیکھ کر جاہ کی سرد مہری تسخیر میں بدل گئی۔ "تم برسالتہ پڑھ رہے ہو کیا۔ اونوں کتاب کو یوں نہ موڑو۔ پہلے کتاب پڑھنے کا سلیقہ سیکھو میں اور جلد یہ دنیا کے عظیم نقوش کا مجموعہ ہے اسے دیکھ کر تم کیا سمجھو گے۔"

لیکن ایلی کے لیے جاہ کی باتیں ہاتھی دانت کی حیثیت رکھتی تھیں۔ اگرچہ وہ باتیں ناخوشاں لیکن تلخ تر حقائق کی یاد ایلی کے دل سے محو کرنے کا ذریعہ تھیں۔

پھر آہستہ آہستہ ایلی کی ہٹ دھرمی کی وجہ سے ان کے قرب کے لمحات بڑھتے گئے۔ کتاب کے مطالعہ سے تھک کر دفعتاً "جاہ ایلی کی طرف دیکھتا ہے۔" "تو تم برٹریڈ رسل کا مضمون پڑھ رہے ہو۔ اچھی چیز ہے۔ بڑی دیر کے بعد رسل نے اپنے انداز کی چیز لکھی ہے۔ معلومات ایک پٹارہ ہے یہ شخص حد ہو گئی۔" یہ کہہ کر وہ رسل کے متعلق ایک لمبی چوڑی تقریر جھانڈتا جسے ایلی حیرت سے سنتا۔ وہ اس وقت یوں منہ کھولے بیٹھا ہوتا کہ دفعتاً "جاہ رک جائے۔" "وہ انگلیاں جھٹکاتے ہوئے چلاتا اور پھر وہ گویا اپنے آپ سے مخاطب ہو کر کہتا "میاں تم کوئی سیدھی چیز شروع کرو کوئی داستان کوئی کہانی اور وہ بھی مینس فیلڈ کی نہیں۔" اشاروں میں بات سمجھاتی ہے پلو مار کے دیا بھجاتی ہے۔ کیا چیز لکھتی ہے۔ واہ واہ واہ لکھ رہا ہے۔"

مقرر۔ وہ اٹھ بیٹھا اپنے کیوبیکل کا دروازہ کھولا۔ باہر ہوٹل میں خاموشی چھائی ہوئی تھی جہاں بھی ہوئی تھیں۔ لیکن تھنکروؤں کی آواز وضاحت سے سنائی دے رہی تھی۔ اور اس کے ساتھ ہی سیرلا مرہم ساز بج رہا تھا۔ دیر تک وہ کھڑا اس آواز کو سنتا رہا اور پھر اس کے کھوج میں نکلا۔

آواز کو نے کے کمرے سے آرہی تھی۔ وہ کو نے کے کمرے کے قریب جا کھڑا ہوا اور باہر کمرہ ساز سنتا رہا۔ اس کا جی تو چاہتا تھا کہ دروازے کے شیشے سے جھانک کر اندر دیکھے یا دروازہ کھٹک کر اندر داخل ہو جائے مگر اس میں ہمت نہ پڑی۔ اس لیے وہ وہیں بت بنا کھڑا رہا۔ وہ ساز کس قدر سیرلا تھا اور دھن کس قدر جاذب پھر اس کے ساتھ ساتھ وہ تھنکرو۔

دفعتاً ”کمرے کا دروازہ کھلا کوئی شخص باہر نکلا۔

”کون ہو تم۔“ وہ بولا۔

”میں میں۔“ ایلی گھبرا گیا۔ ”میرا نام الیاس ہے۔“

”لوہ“ نودارو نے ماچس چلائی۔

روشنی میں ایلی نے اس کا چہرہ دیکھا اور سہم گیا۔ اس کا چہرہ کچھ ایسا تھا کہ اسے دیکھ کر محسوس ہوتا جیسے جھٹی ہو۔

”میں کے ہونا ہوٹل کے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

وہ قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تو بھی پھر اندر کیوں نہیں آجاتے۔ چلو۔“ وہ ایلی کو گھورنے لگا۔ اس کا تفسیر سن کر ساز اور تھنکرو جتنا بند ہو گئے۔ ”کون ہے بھی ذو۔“ اندر سے آواز سنائی دی۔ ذو نے دروازہ کھول کر اندر جھانکا۔

”لڑکا ہے بورڈنگ کا۔“ وہ بولا ”باہر کھڑا سن رہا ہے۔“

”کون ہے۔“ پھر آواز آئی۔

ایلی مجرموں کی طرح کمرے میں جھانکنے لگا۔

”جی میں ہوں الیاس۔“ وہ بولا۔

”تمہیں دیکھا نہیں کبھی میاں۔“ اس نے پوچھا۔

”جی میرا نمبر سترہ ہے۔“

ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہو جاتی تھی۔ یہ ایک انوکھی بات تھی کیونکہ اس سے پہلے فلمی کہانیاں اتنی لمبی ہوتی تھیں کہ ایک کہانی کئی ایک نشستوں میں ختم ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی کے صرف تین اسی سوڈ دکھائے جاتے تھے اور ہر کہانی عموماً ”پندرہ یا بیس اسی سوڈ“ مشتمل ہوتی تھی۔ ایک نشست میں کہانی ختم کرنے کی یہ نئی تحریک فلم دیکھنے والوں کے لیے ایک انوکھی بات تھی۔ اور فلم سازوں نے صرف اسی بات پہ اکتفا نہیں کیا تھا۔ انہوں نے ان مختصر فلمی کہانیوں کے ساتھ ایسے ریکارڈ بھیجنے شروع کر دیئے تھے جو کہانی کے مناسب مقلات پر مناسب صوتی اثرات پیدا کرتے تھے۔ مثلاً بن حور فلم میں بحری لڑائیوں کے مناظر کے ساتھ ساتھ توپوں اور طبل جنگ کی آوازیں اور پس منظر کی موسیقی یہ صوتی کلیاں فلم دیکھنے والوں کے لیے عجیب تھیں۔ انہی دنوں میں جاہ کے ساتھ ایلی نے دو ایک ایسے فلم دیکھے تھے۔ فلم دیکھنے میں جاہ کو بھی دلچسپی تھی لیکن جاہ چونکہ تمام زائد روپوں کی کتابیں اور رسائل خرید کر لیتا تھا اس لیے روز فلم چل رہا ہے اور میرے پاس صرف آٹھ آنے ہیں۔ وہ آٹھ آنے میرے اٹاکر کتا ”اگر دیکھنا ہو تو چلو میرے ساتھ۔“

اور وہ دونوں چپکے سے پیلس سینما کی طرف چل پڑتے جو میکلوڈ روڈ کے کو نے پر بنایا تھا۔ اکثر وہ دونوں بہت لیت بیچتے جب کہ چار آنے والے درجے کی تمام تریٹیں بھر جاتی ہوتیں۔ اور وہ حسب معمول اندھیرے میں چلتے چلتے ہال کی دوسری دیوار کے قریب پہنچ کر بند دروازے کی سیڑھیوں پر بیٹھ جاتے۔ کئی مرتبہ ایسا بھی ہوا تھا کہ وہ حسب معمول سینما میں لیت پہنچتے تھے اور حسب معمول سیڑھیوں پر بیٹھ گئے تھے۔ اور انٹروں میں جب بقیں جلی تھیں تو ایلی نے دیکھا کہ چار آنے کے درجے کی تمام سیٹیں خالی پڑی تھیں۔ اور ہال میں گنڈیریاں بیچنے والے انہیں سیڑھیوں پر بیٹھے دیکھ دیکھ کر ہنس رہے تھے ”ارے“ ایلی چلا تا۔ ”جاہ سیٹیں تو تمام کی تمام خالی پڑی ہیں۔“ ”اچھا۔“ جاہ اپنی بے اعتنائی سے کہتا تھا۔ اور پھر اپنے خیال میں کھوجا تھا۔ جیسے سیٹوں کا خالی ہونا اور ان کا سیڑھیوں پر بیٹھنا کوئی قاتل توجہ یا غور طلب امر نہ ہو۔

”تو چلو وہاں چل بیٹھیں۔“ ایلی نے کہا تھا اور اس نے منہ بنا کر شائے جھک دیے تھے اور جوں کا توں بیٹھا رہا تھا۔

ہاں تو اس روز اپنے کمرے میں تھنکروؤں کی آواز سن کر ایلی چونک پڑا اس نے محسوس کیا جیسے فلم کی طرح اس کے تخیل کے ساتھ بھی کوئی ایسا ریکارڈ چل رہا تھا۔ لیکن بورڈنگ میں

اس روز شام کو سینا جانے کی بجائے وہ دونوں مشن کالج کے بورڈنگ میں جا پہنچے۔ اندر جا کر پتہ اسے ایک کمرے میں لے گیا جہاں ایک پتلا دبلا لڑکا مطالعہ میں مصروف تھا۔ ”یہ جی کے

ہے۔" جاہ نے کہا "اور یہ ہمارے دوست الیاس صاحب ہیں۔" یہ کہہ کر وہ الیاس صاحب کی موجودگی کو قطعی طور پر بھول گیا۔ "ہم اس لیے آئے ہیں۔" جاہ بات کرتے ہوئے رک گیا۔ "دراصل میں سوچ رہا تھا کہ جو رنڈ گریٹ پیٹنگنز جریدے کی صورت میں آ رہی ہیں ان کی خریدنے تو دیکھی ہی نہیں وہ۔"

"نہیں تو۔" جی کے نے جواب دیا۔

"میں سوچ رہا تھا اگر ہم انہیں فریم کر لیں تو کیسا رہے۔ بازار سے تو بات نہ بنے گی۔ کیوں نہ فریم بنائیں۔"

"ٹھہرو۔" جی کے نے گویا اپنی تمام تر توجہ ناک پر مرکوز کر دی۔ اس کی ناک لمبی اور ہڈی دار تھی۔ انداز میں ہلا کی پھرتی تھی اور ذہانت میں تیزی تھی۔

جی کے قاعدے اور اصول کا آدمی تھا۔ وہ قاعدوں اور اصول میں سوچتا تھا۔ خشک اور کڑوا دلیلیں دینے کا عادی تھا۔ دوسروں کو خشک اصولوں پر پرکھنے کا متوالہ تھا۔ اس کی آنکھوں میں بنیادی طور پر حزن و ملال کی گہرائی جھلکتی تھی۔ چہرے سے غم خوری چپٹی تھی لیکن وہ اپنے آپ پر خوشی اور انبساط کے شدید لمحات طاری کر سکتا تھا۔ اور اپنی بے پناہ ذہانت کے بل بوتے پر نہایت چمکیلی اور جاذب توجہ باتیں کرنے کا اہل تھا۔

"ٹھہرو۔" کہہ کر جی کے یوں سوچ میں پڑ گیا جیسے کوئی بیوپاری لین دین کے حساب میں کو گیا ہو۔ دیر تک اپنی ناک کو گھورتا اور چہرہ سر اٹھا کر کہنے لگا۔ "ہاں چلے گا ضرور چلے گا۔ نوک تیل کے بغیر ادا ہا نا پے گی۔"

"اچھا" جاہ نے بچوں کی طرح تلی بھائی "کیسے۔"

"سانچہ ہم خود بنالیں گے۔" وہ بولا۔ "آری مل جائے گی۔ بس فریم کی لکڑی پیشہ کیل خریدنے پڑیں گے۔"

"اگر کچھ خریدے بغیر فریم بنا سکیں ہم تو بہتر نہ ہو گا۔" جاہ نے مزاح پیدا کرنے کی کوشش کی۔ جی کے کی ناک اور بھی لمبی ہو گئیں۔

"چلو یہ دھندا ابھی طے ہو جائے۔ جاہ اٹھ بیٹھا اور وہ تینوں انارکلی کی طرف چل پڑے۔ جب وہ واپس آئے تو جی کے کے کمرے سے باہر آمدے میں ایک لڑکا بیٹھتا تھا شہر نما رہا تھا۔

"جی کے چلایا۔" اپنے آپ ہی کھیل رہے ہو۔

"جہیں اعتراض ہے کیا۔" وہ چمک کر بولا۔

"ہم نے تو سنا تھا میاں۔" جاہ نے کہا "کہ یہ کھیل دو کے بغیر نہیں کھیلا جاتا۔"

"جی کے نے بات کا کیا بھروسہ۔" لڑکا بولا۔

یہ میرا دوست ایم کے ہے۔" جی کے نے ایلے سے کہا "بڑے معرکے کا آدمی ہے۔" دو کا کھیل اکیلا کھیلتا ہے۔ اکیلے کے کھیل کے لیے ساتھی ڈھونڈتا ہے۔" جی کے ہنسنے لگا۔

ایلے نے ایم کے کی طرف دیکھا وہ ایک اونچا لمبا دپلا پٹلا نوجوان تھا اس کے ہونٹوں پر ایک مزاح گویا ثبت ہو چکی تھی اور اس کی آنکھیں شرارت سے ابل رہی تھیں۔ "جو بھی آتا ہے اپنی بے عزتی کرتا ہے۔" ایم کے نے قہقہہ لگایا۔

"جہیں کیا خطرہ" جی کے نے اپنی ناک کو گھورتے ہوئے کہا "تمہاری بے عزتی کیسے ہو گی ہے کوئی عزت ہو تو بے عزتی کا امکان ہوتا۔ لگاؤ یا اس سے کوئی بازی" جی کے نے ایلے اور ہلے مخاطب ہو کر کہا۔

"کونوں" جاہ نے انگلیاں ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ "اپنے بس کا روگ نہیں۔ اس کھیل کے لمبے وقت کھل سے آئے قانونی طور پر جوانوں کو یہ کھیل کھیلنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے۔ بوزموں کا کھیل ہے۔ جب انسان کو کوئی کام نہ ہو تب۔"

"اور تم کھل کے جوان ہو۔" ایم کے نے جاہ سے کہا۔

"یہ تو ٹھیک ہے۔" جاہ بولا "جوان تو نہیں لیکن ابھی بوڑھا نہیں ہوا۔" تم خود کیوں نہیں کھیلے اس کے ساتھ۔" اس نے جی کے سے پوچھا۔

"کونوں۔" وہ بولا "مجھ سے تو روز پٹتا ہے۔"

ایم کے نے قہقہہ لگایا اور سر کھانے لگا "بات تو ٹھیک ہے۔"

ٹھہریں

جی کے اور ایم کے سے ملاقات کے بعد ایلے کے مشاغل بڑھ گئے جاہ کی سرد مہری سے آگاہ کر دیا۔ حانوتی ہل چلا جاتا جس میں وہ دونوں رہتے تھے۔ یا تو ایلے جی کے کے ساتھ بیٹھ کر تصاویر کے لیے فریم بناتا رہتا اور یا ایم کے کے ساتھ شہر نما کی بازی لگا لیتا۔ اسے ایم کے سے بے حد

دلچسپی ہو گئی تھی۔ اس میں زندگی تھی جو ولولہ تھا جاہ کی طرح اس کی زندگی اصولوں کا علم تھا۔
دھونڈتی تھی۔

اس کے بعد کئی ایک دن وہ سب تصاویر فریم کرنے میں شدت سے مصروف رہی۔
لکڑی کاٹنے اور اسے کیلوں سے جوڑنے کا کام جی کے کے سپرد تھا۔

جی کے وزیر آباد کے ایسے خاندان سے تعلق رکھتا تھا جو ٹیکنیکل کام کے لیے فرم
صلاحیت رکھتا تھا۔

تصویر کی پینٹش کرنے کے بعد جی کے فریم کی لکڑی سانچے میں رکھ کر آدی سے لے کر
اور پھر ان لکڑیوں کے سرے جوڑ کر ان میں کیل ٹھونک کر فریم تیار کرتا۔ جاہ اس دوران میں
اس خصوصی تصویر اور تصویر کار کے متعلق معلومات بہم پہنچاتا اور تصویر کے خصوصی پہلو
روشنی ڈالتا۔ ایلی مناسب ساز کے مطابق گتہ کاٹا ایم کے ہتھوڑی اور کیل اٹھائے رکھتا
مناسب وقت پر جی کے کو بہم پہنچا سکے۔ اس کے علاوہ سرکس کے مسخرے کی طرح ہر
سیدھی حرکات سے ان کا دل بہلاتا رہتا۔

تصاویر فریم کرتے ہوئے ان میں سے کسی ایک کو خیال نہ آیا کہ ان میں بیشتر تصاویر
تھیں اور انہیں ہوشل کے کمرے میں آویزاں کرنا قابل اعتراض سمجھا جاسکتا تھا۔ جاہ کے
لیکچر سننے کے بعد ان سب کی توجہ اس حد تک تصاویر کے معانی پر مرکوز ہو چکی تھی کہ انہیں
خیال بھی نہ آیا کہ بیشتر نقوش ملبوسات سے معرا تھے حتیٰ کہ بھاجب نماز پڑھنے کے بعد
بنانے کے کام کی رفتار کا جائزہ لینے کے لیے فریم شدہ تصاویر کی طرف دیکھتا تو اسے بھی داخل
پڑھنے کا خیال نہ آتا۔

پھر جب انہوں نے اپنے اپنے کمرے میں وہ تصاویر آویزاں کر دیں اور ہوشل کے ڈول
نے انہیں دیکھا اور ان کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اور وہ شدت سے جسم سمجھانے لگے
نے محسوس کیا کہ وہ تصاویر برہنہ تھیں۔ اس نے جاہ سے بات کی ”جاہ یہ تصاویر تو“
رک گیا۔

”ہوں۔“ جاہ نے تیوری چڑھا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میرا مطلب ہے۔“ ایلی گھبرا کر بولا ”یعنی۔“

”ہوں۔“ جاہ نے گھور کر اس کی طرف دیکھا۔

”یہ تصاویر تو برہنہ ہیں۔“ ایلی نے بعد مشکل جملہ مکمل کیا۔

”تصاویر۔“ اس نے کمرے میں بٹکی ہوئی تصاویر کا جائزہ لیا۔ پھر اس کی نگاہ میں
”غیر جملہ“ برہنہ“ اس نے حقارت بھری نگاہ ایلی پر ڈالی۔ جیسے اس کی نگاہ میں کمرے کی جملہ

”غیر جملہ“ صرف ایلی کا وجود عریانی اور برہنگی کا منظر ہو۔ تسخر اور نفرت کے اس اظہار پر ایلی
ہلکی سے ہلکے اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کیا کرے۔ برآمدے میں بھاوضو کر رہا تھا۔ ایلی
کئی چہانتا تھا کہ بھاکے گلے لگ کر رو پڑے۔ لیکن بھاپنی ہی دھن میں گمن تھا۔

”بھاکے“ وہ بولا ”یہ تصویریں جو ہم نے کمروں میں آویزاں کی ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ بھاپاؤں دھوتے ہوئے بولا۔

”وہ عریاں ہیں۔ میرا مطلب ہیں برہنہ ہیں۔“

بھاسوج میں پڑ گیا۔ ”ہاں ہاں“ وہ بولا ”مجھے بھی کئی بار شک سا پڑا ہے۔“

”وہ انہیں دیکھ کر کھاتے ہیں۔“ ایلی بولا ”اور پھر کمرے سے باہر نکل کر چنگھاڑتے ہیں۔
فرے لگاتے ہیں۔ اور ان کی آنکھیں۔“

”ہاں ہاں۔“ بھابولا۔ ”مجھے اب خیال آتا ہے کہ۔“

”اور وہ ایک دوسرے سے کہتے ہیں۔ میاں میاں۔“

”میاں میاں سن کر بھاجھل کر کھڑا ہو گیا“ ہاں۔“ وہ بولا ”میاں میاں مجھے خیال ہی نہیں
آتا۔“

”لیکن میاں میاں کا مطلب کیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میاں میاں کا مطلب“ بھانے تعجب سے ایلی کی طرف دیکھا۔

میاں۔ میاں

میاں میاں در حقیقت کالج میں فارسی پڑھانے والے مولانا کا تکیہ کلام تھا۔ مولانا کا نام محمد
نور محمد کالج میں فارسی پڑھایا کرتے تھے۔ کالج میں وہ اپنی چار ایک نمایاں خصوصیات کی وجہ
سے مشہور تھے۔

ان کا وطن ایک ایسے وسیع ہال کی مانند تھا جہاں ہلکی سے ہلکی آواز گونج کر پھر گونجتی۔

اس لیے ان کی معمولی سے معمولی بات بھی یوں سنائی دیتی تھی جیسے کوئی مجاہد حملہ کرنے

سے پہلے سپاہیوں کو جوش اور غیرت دلا رہا ہو۔

مسلط طور پر جوش اور جذبہ محسوس کرتی رہنے کی وجہ سے مولانا کے خد و خصل نہ ترتیب اختیار کر لی تھی کہ ان کا چہرہ احتجاج اور جذبے کی آمیزش بن کر رہ گیا تھا۔ ان کے کو دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے جملہ نامناسب باتوں کے خلاف ایک گھونٹہ کسا ہوا ہو۔ مولانا کی تیسری خصوصیت یہ تھی کہ معمولی سے معمولی نامناسب بات پر وہ غصہ جاتا اور اس شدت سے احتجاج کا اظہار کرتے کہ لڑکے محسوس کرتے کہ نہ جلتے وہ کیا کر گئے۔ لیکن اس شدت بھرے احتجاج کے بعد وہ ہر نامناسب بات کو یوں برداشت کر لیتے کہ کوئی بات ہی نہ ہو جیسے نامناسب باتوں کو برداشت کرنا ان کی عادت ہو۔ اور وہ اپنی اس عادت سے مجبور ہوں۔

مولانا کی آخری خصوصیت ان کا تکیہ کلام تھا۔ وہ جماعت یا افراد سے میاں میاں مخاطب ہوتے۔ اسی وجہ سے لڑکوں میں وہ میاں میاں کے نام سے مشہور تھے۔ داخل ہوتے ہی وہ گونجتے ”میاں میاں یہ کیا شور ہے۔“ اس پر لڑکے خاموش ہو جاتے۔ مسخرا چپکے سے سہٹی بجاتا اور اس پر مولانا چونکتے ”لا حول ولا قوۃ“ سارا کالج مولانا کے اس نعرے سے گونجتا۔ پھر چاروں طرف سے پر اسرار آوازوں کی یورش شروع ہو جاتی ایک میں چکی ہو جکتی۔ دوسری طرف ریل گاڑی چھکا چھک کرتی اور تیسری طرف میزنگ لڑتے کوکتی۔ اور مولانا نہفتا ”ان آوازوں کے وجود سے بے نیاز ہو کر صائب کے اشعار پڑھ مصروف ہو جاتے۔

کرینٹ ہوسٹل کے اجراء کے بعد وقتی طور پر مولانا کو ہوسٹل پرنسٹنٹ ماسٹر بورڈنگ کی مین بلڈنگ سے باہر ملحقہ عمارت کے ایک کمرے میں مقیم تھے جو کھانا کھانے کمرے کے قریب تھا۔

لڑکے ڈانٹنگ ہال کی طرف جاتے تو انہیں محسوس ہوتا کہ وہ بورڈنگ میں موجود ہیں۔ عام طور پر مولانا نماز پڑھتے ہوئے یا وضو کرتے ہوئے دکھائی دیتے۔ البتہ کوئی غیر مناسب وقوع میں آتی تو مولانا کا لا حول ولا قوۃ ملحقہ بلڈنگ سے ابھر کر ہوسٹل کی مین بلڈنگ میں گونجتا اور لڑکے چونک کر اٹھ بیٹھتے اور انہیں یہ امر یاد آتا کہ میاں میاں اس بورڈنگ پرنسٹنٹ ہیں اور ملحقہ بلڈنگ میں کوئی مناسب بات وقوع میں آئی ہے۔ اس پر بیٹھتے

مناہک مرگوشی ابھرتی۔ ”میاں میاں۔“ اور ہر کمرے میں دہرائی جاتی تھی کہ ساری بلڈنگ میں ”میاں میاں“ سے گونجنے لگی۔

مولا نان میں صرف ایک بار مین بلڈنگ میں آتے تھے۔ عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر بلڈنگ کے قریب وہ حاضری کارجر بنفل میں دبا کر مین بلڈنگ میں داخل ہو جاتے۔ اور بلڈنگ کے قریب سے گزرتے اور بند کمرے پر دستک دے کر کہتے ”میاں میاں۔“ جس پر لڑکے بھی سر کہہ دیتے اور مولانا حاضری لگا کر دوسرے کمرے کی طرف چل پڑتے۔

اول ولا قوۃ

حاضری کے وقت کرینٹ ہوسٹل میں خاصہ ہنگامہ رہتا تھا چونکہ کئی ایک حاضر لڑکوں کو کئی بار غیر حاضر لڑکوں کی حاضریاں لگوانی ہوتی تھیں۔ مثلاً ”کمرہ نمبر ایک کا لڑکا پہلے اپنی حاضری لگوانا پھر باری باری کمرہ نمبر ۲، ۳ اور ۵۶ میں داخل ہو کر لیس سرپول کر اپنے دوستوں کی حاضری لگوانا۔ لڑکا چاہے موجود نہ ہو لیکن کمرہ ضرور اندر سے بند ہو۔ کمرے میں جتنی جلائے نما ضروری ہو۔ اور اس بات کا خیال رکھا جاتا کہ باہر تالہ نہ پڑا ہو۔ جب مولانا سولہ نمبر پر جگہ دیتے تو سولہ نمبر کا لڑکا اندر سے لیس سر کہہ دیتا اور جب وہ سترہ نمبر پر دستک دیتے تو سولہ بر لا بھر سے لیس سر چلا کر سترہ نمبر والے کی حاضری لگوا دیتا۔

ایک روز وہی ہوا جس کا اہلی کو ڈر تھا جس وقت مولانا نے حاضری کے وقت جاہ کے اندر سے دستک دے کر میاں میاں کہا اس وقت جاہ نہ جانے داستو دسکی یا ٹامس مین کے علاوہ میں اس حد تک مصروف تھا کہ یاں میاں کے جواب میں لیس سر کہنے کے بجائے بے نیام میں اس نے کہا ”کم آن۔“

دستور کے مطابق مولانا کو چاہئے تھا کہ آواز سن کر رجسٹر میں حاضری لگائیں اور اگلے کمرے کی طرف چل پڑیں۔ چونکہ دستور کے مطابق اہم بات یہ تھی کہ اندر سے آواز آجائے۔ لیس سر کہنا یا گولوسے سے کوئی فرق نہیں پڑتا چاہئے تھا لیکن جاہ کے کمرے کے دروازے پر کھڑے ہو کر نہ جانے مولانا کو کیا ہوا۔ وہ یہ بھول گئے کہ وہ حاضری کے لے راؤنڈ کر رہے ہیں ممکن ہے کہ انگریزی لب و لہجہ کو بھی اس سے تعلق ہوتا۔ بہر حال مولانا سمجھ بیٹھے کہ وہ پرنسٹنٹ کے باہر کھڑے ہیں۔ لہذا جاہ کے کم ان پر وہ انجانے میں پٹ کھول کر اندر داخل ہو

گئے۔

اس چھوٹے سے کیوبیکل میں ان اٹھائیس تصاویر کی طرف دیکھ کر مولانا لڑکھائے۔
آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ ایک ہی جست میں وہ باہر برآمدے میں پہنچے اور پھر
اجتاج اور غم و غصہ حسب معمول اس مجاہدانہ نعرے میں گونجا۔ ”لا حول ولا قوۃ“
یہ پہلا موقع تھا کہ مین بلڈنگ میں مولانا نے لا حول کی لٹکار لگائی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ
روز ہو شل کے کمروں میں میزوں پر پڑے ہوئے گلاس جل ترنگ کی طرح بیچے تھے۔ اور
گھبرا کر کمروں سے باہر نکل آئے تھے۔ اس وقت وہ میاں میاں کہنا یا تسخیر سے چلتا ہوا
تھے۔

باہر نکل کر لڑکوں نے دیکھا کہ مولانا ہو شل کے صدر دروازے کی طرف بھاگے جا رہے
ہیں اور حاضری کے رجسٹر کے ورق ہو شل کے صحن میں اڑ رہے ہیں۔ مولانا حاضری لگا رہے
گئے تھے۔ اور انہیں حاضری کے رجسٹر کا خیال بھی نہ رہا تھا۔ اس روز کریٹ ہو شل کے
لڑکوں میں سے صرف جاہ واحد لڑکا تھا جو اس حادثہ سے بے خبر اپنے کمرے میں بیٹھا کتب پڑھنے
میں منہمک رہا تھا۔

اگلے روز نوٹن ہال میں بیٹھے ہوئے جب بھا اور اہلی گزشتہ رات کے واقعہ پر تبصرہ کر رہے
تھے۔ تو جاہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”اچھا میں نے خیال نہیں کیا۔“ وہ انگلیوں سے کھیلتے ہوئے کہہ رہا تھا۔

ایم کے نے قہقہہ لگایا ”اچھا ہوا۔“ وہ بولا ”اپنی بھی روز بے عزتی ہے۔“

”تم چپ رہو جی۔“ جی کے نے اسے ڈانٹا۔

”اچھا بھئی۔“ وہ بولا ”تو کوئی اور بولے اب۔“

بھانے کہا۔ ”لیکن اب ہو گا کیا۔“

”اللہ جانے کیا ہو گا۔“ اہلی نے کہا۔

وہ سب خاموش ہو گئے۔

دیر تک خاموشی چھائی رہی۔

پھر دفعتاً ”جاہ بڑبڑانے لگا“ نہیں نہیں — نہیں نہیں۔“

سب کی نگاہیں جاہ پر مرکوز ہو گئیں۔

کی۔ اور ایل۔" جاہ بولا "تم چاہو تو ہمیں ہمارے ساتھ رہو۔ ہاں اور اگر وہ تمہارا دوست بخوشی آنا چاہے تو آجائے ہمیں کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ تم کہتے ہو ناوہ اچھا لڑکا ہے تو اچھا ہی ہو گا اور اگر ایسا ہی ہے تو آجائے کیا حرج ہے اوپر کا کرہ ہم اس کے لئے مخصوص کر دیں گے۔ کیا نام ہے اس کاہل۔ جمل۔ جمل۔" بھابھ بولا۔ "پانچ ہو جائیں گے تو کفایت رہے گی اور تم ایل تم کہاں آجائے تو بہتر ہے۔" بھابھ بولا۔ "پانچ ہو جائیں گے تو کفایت رہے گی اور تم ایل تم کہاں رہو گے۔"

گوریاں

"میں میں۔" ایل نے کہا "میں تو نیم چھتی میں رہوں گا۔"

"نیم چھتی؟" جاہ کے ہونٹ حقارت سے کھلے "ہوں نیم چھتی۔" وہ انگلیاں چلاتے ہوئے کہنے لگا۔ "اے نیم چھتیوں سے دلچسپی ہے۔ کھلے کمرؤں سے نہیں بس ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔ جو ذہنی طور پر خود نیم چھتی ہو وہ۔" وہ خاموش ہو گیا۔

جاہ کے منہ سے ایسی بات سن کر ایل نے کبھی برا نہ بانا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایل نے بلو کی ذہنی عظمت کو سچے دل سے تسلیم کر رکھا تھا۔ اس کے دل میں جاہ کے لئے محبت بھی تھی اور احترام بھی مگر جذبہ احترام اس حد تک حاوی ہو چکا تھا کہ اس کے بوجھ تلے محبت دب کر رہ گئی تھی۔ وہ جاہ کی بات سے ڈرتا تھا۔ تسخیر سے ڈرتا تھا۔ لیکن اس ڈر میں نفرت کا عنصر نہ تھا۔ ایل جاہ کے قریب رہنے کی خواہش کے باوجود اس سے ذرا ہٹ کر رہنا پسند کرتا تھا۔ اس لئے ناؤ گھر کو دیکھتے ہی اس نے نیم چھتی میں رہنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ وہ ڈرتا تھا کہیں جاہ اسے اپنے کمرے میں رہنے پر مجبور نہ کر دے۔ اس لئے جاہ کی بات سننے کے بعد ایل نے اطمینان کا سانس لیا کہ شکر ہے طوفان نکل گیا۔ مطلع صاف ہو گیا اور اب وہ اطمینان سے نیم چھتی میں اکیلا رہے گا اور شراد چھن سے بیڑھوں سے اترے گی اور نیم چھتی میں جھانک کر کہنے لگی۔ چلو ناچائے بھٹی ہو رہی ہے۔"

مئل تیسری منزل کے کمرے کو دیکھ کر ان تین کھڑکیوں کی طرف لپکا جو سڑک کی طرف کھلی تھیں۔ کھڑکیوں کو کھول کر وہ خوشی میں چلایا۔

"اے یہاں سے تو سامنے مکمل کے سارے مکانات نظر آتے ہیں۔ کتنے خوبصورت مکانات ہیں۔ کھاتے پیتے فیشن ایبل لوگ رہتے ہوں گے کیوں ایل۔"

ایل کو یہ بات نہ سوجھی تھی۔ "ظاہر ہے۔" وہ بولا۔

ناؤ گھر

ان کا نیا لاج ایک عظیم تنکون نما بلڈنگ کے کونے کا ایک حصہ تھا جہاں انہوں نے اس کام ناؤ گھر رکھ دیا تھا بلڈنگ کی پہلی منزل میں گودام اور دوکانیں تھیں۔ کونے کے قریب ٹکی سیڑھیاں دوسری منزل میں چلی گئی تھیں۔ جہاں غسل خانہ باورچی خانہ ایک والان اور دو کمرے تھے۔ جن کے ایک طرف جدھر سڑک واقع تھی لکڑی کا جنگلا بنا ہوا تھا۔ جو اب بوسیدہ ہو چکا تھا۔ باورچی خانے اور غسل خانے کے اوپر ایک نیم چھتی تھی۔ جس کا دروازہ اوپر کی بیڑھیاں کے درمیان کھلتا تھا اور اوپر تیسری منزل میں ایک کمرہ ایک وسیع برساتی اور کچھ کھلی چھت تھی۔ ناؤ گھر میں پہنچتے ہی جاہ نے اعلان کر دیا کہ وہ دوسری منزل میں قیام کرے گا۔ "یہ کمرہ بولا۔" ہمارا بیڈ روم رہے گا۔ دوسرا کمرہ سٹنگ روم اور اس والان کو ہم کھانے کا کمرہ بنائیں۔"

"کیوں۔ بھابی نے پوچھا۔"

بھانے والان سے ملحقہ جنگل کی طرف دیکھا "بالکل۔" وہ بولا "یہ جنگلہ نماز کے لئے تپا موزوں ہے۔ ہے نا پال۔"

وہ سب جی کے کو پیار سے پال کہا کرتے تھے۔

"بالکل۔" پال چلایا "اور جنگلے میں یہاں حمام رکھ دیا جائے تو وضو کی جگہ بھی بن جائے۔"

”لیکن۔“ جمال نے ہاتھ سے بال سنوارتے ہوئے کہا ”ذرا دور ہیں۔“

پھر وہ برساتی کی کھڑکیوں میں جا کھڑا ہوا۔ ”یہاں سے تو اور بھی اچھا ہے۔“ اس نے ایک لمبے پور مسرت بھری نگاہ ایللی پر ڈالی۔ ”ذرا غور سے دیکھو نا۔“ وہ چلایا اور جسم کھجانے لگا۔ پھر وہ مکان کی عقبی دیوار کے پردے پر جا کھڑا ہوا اور چاروں طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ”اونہوں اس جانب تو امید کی کوئی صورت نہیں۔“ ”زردہ سے پھر ملاقات نہیں ہوئی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”زردہ۔“ جمال نے قہقہہ لگایا۔ ”توبہ ہے یار۔“ اس نے ہنستے ہوئے اپنا کلاں پکڑ لیا۔

”توبہ ہے یار۔ اتنی تکلیف ہوئی کہ جس کی انتہا نہیں۔ ایسی خالم بیماری ہے یہ کہ توبہ ہے۔ بیوی کے سامنے سارا بھانڈہ پھوٹ گیا اور معلوم ہے ڈاکٹر کیا کتا تھا۔ کتا تھا یہ بیماری کبھی نہیں جاتی۔ کبھی نہیں۔ اب میں نے توبہ کر لی ہے۔“ اس نے پھر قہقہہ لگایا ”بالکل توبہ کر لی ہے۔ لیکن یار۔ تم کتنے اچھے ہو۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”تمہارا جواب نہیں ایللی دوست ہو تو ایسا ہو۔“ اس نے ہنستے ہوئے ایللی کے دونوں ہاتھ پکڑ لئے۔ ”ایسا اچھا کمرہ میرے لئے مخصوص رکھا جس کا جواب نہیں۔ جواب نہیں ایمان سے اور پھر محلہ کے عین مقابل اور محلہ بھی فیشن ایبل لوگوں کا بھی واہ خوب گزرے گی۔ جو مل بیٹیں گے دیوانے دو۔“ جمال نے پھر قہقہہ لگایا۔ ”تم نیم چستی میں اور میں چوبارے میں واہ واہ واہ اور وہ ٹپلی منزل والے دور۔ یار ایللی وہ تو کتابوں میں جیتے ہیں۔ کتابیں ہی کتابیں۔“ حد ہو گئی۔

بانورہ ہوشمند

ابھی وہ نیم چستی میں چیزیں لگانے میں مصروف تھا کہ کرینٹ ہوشل کا بلور بیجی دتہ آگیا۔ ”باہو جی۔“ وہ بولا ”آپ کو نیچے بلا رہے ہیں۔“

نیچے بیڈ روم میں جاہ، بھا اور پال بیٹھے ایللی کا انتظار کر رہے تھے۔

”ہاں بھئی۔“ اسے دیکھ کر جاہ نے کہا ”بیٹھ جاؤ۔ اچھا ہوا کہ جمال نے یہاں آنا پسند کر لیا۔ اچھا ہوا۔ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ خاصہ ہے خاصہ میرا مطلب ہے۔“ اس نے مٹکائے ہوئے کہا ”گوارا قسم کا ہے، بشرطیکہ ناگوار ہونا نہ شروع کر دے۔ کیوں پال۔“ جاہ کا مزاج اس

نک بک ہوتا تھا کہ اس کا اور اک مشکل سے ہوتا تھا۔ لیکن ایللی نے جاہ کی خصوصی مسکراہٹ سے ہنپ لیا کہ وہ اپنے مزاج کی داد کا طالب ہے۔ ایللی نے قہقہہ لگایا۔

”ہے نا۔“ وہ ایللی سے مخاطب ہوا۔ ”لیکن اس وقت مسئلہ درپیش یہ ہے کہ اپنا نوکروں کے ساتھ ایک نوکر لایا ہے۔ نوکر تو ہمیں یہاں رکھنا ہی ہو گا۔ اس سے کہا تھا کہ بھی کوئی جانا چاہنا نوکر لادو۔“

”بالکل۔“ پال نے کہا ”نوکر کے بغیر کیسے ہو گا۔“

”لیکن رقت یہ ہے۔“ جاہ نے کہا ”کہ یہ نوکر جو وہ لایا ہے اس کا جانا پچھانا نہیں اور بندہ تو ہمارے بچانے کے معاملے میں یہ بوقوف ہے۔“ جاہ اس روز مزاج کے موڈ میں تھا۔

”جوڑنے یا نفی کرنے کی بات ہو تو میں حاضر ہوں۔“ پال نے کہا۔

”یہ تو کھانا پکانے کی بات ہے۔“ بھانے کہا۔

”اچھا؟“ جاہ تعجب سے بولا۔

”معلوم تو ایسا ہی ہوتا ہے۔“ پال کی ناک اور بھی لمبی ہو گئی۔

”کھانے کے متعلق میں صرف اتنا جانتا ہوں۔“ جاہ نے کہا کہ نمک اور مرچ ہو تو کھانا

ٹھیک ہوتا ہے اور نمک مرچ کی مجھے خوب پچھان ہے۔ وہاں کرینٹ میں کھانے کی میز پر جب

کوئی چلتا۔ دتے نمک بھیجے۔ تو دختا۔“ مجھے احساس ہوتا کہ میں بھی سوچ رہا تھا کہ آخر کھانے

میں کس بات کی کمی محسوس ہو رہی ہے۔“ ایللی نے قہقہہ لگایا۔ اس پر جاہ نے بڑے التفات سے

ایللی کو مخاطب کر کے کہا ”کیوں میاں ہے نا یہی بات۔“

لیکن بھانے کہا۔ ”معاملہ تو یہ ہے کہ نوکر کی تنخواہ مقرر کی جائے۔“

”بغ اجازت دیں۔“ جاہ مسکرایا۔ ”تو بندہ کتاب پڑھنے کا کام کرے چونکہ اس معاملے میں

لپٹا ہونا نہ ہونا برابر ہے۔ لپٹا اپنا دخل دینا نقصان دہ ہو گا۔ کیوں پال۔“ ”لو جی یہ گیا غفار۔“ دتہ

چلا کر بولا۔

غفار پتلا دلا سناٹا لٹا ہوا جوان تھا۔ اس کے نقش چٹکے تھے اور بشرے پر ذہانت کے آثار تھے۔

”سلام علیکم۔“ اس نے بے پروائی سے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ پھر خود ہی بات شروع

کر کے ”دیکھئے صاحب۔“ وہ بولا ”میرا نام غفار ہے۔“

”ذرا گھبرائے۔“ جاہ نے اس کی بات کٹی۔ ”کیا آپ اپنا نام نہیں بدل سکتے؟“ غفار نے غور

”بہت اچھا صاحب۔“ بانورہ مسکرایا۔ ”اب مجھے ازاقت ہے کیا۔ السلام علیکم۔“ یہ کہہ کر رخصت ہو گیا۔

”عجب نوکر ہے۔“ بھانے کہا۔

”جی بننے لگا“ کہتا ہے ابھی پودہ اگا نہیں تو پھل پھول کی بات کیسی۔“

”جی تو میں نے کہا تھا۔“ جاہ بولا ”کہہ پوئٹری کا طالب علم معلوم ہوتا ہے۔ جیسے کل اس کا نہیں بلکہ ہمارا امتحان ہو گا اور نتیجے کا اعلان وہ کرے گا۔ بانورہ۔ یار اس کا نام ہوشمند ہونا چاہیے۔“

اگلے روز بانورہ آیا تو وہ سبھی جاہ کے کمرے میں اکٹھے ہو گئے۔

”ہاں بھئی بانورے کیا پکائے گا تو۔“

”جو آپ چاہیں۔“ بانورے نے جواب دیا۔

”بھئی مجھے تو بھنا ہوا گوشت پسند ہے۔“ جاہ نے کہا۔

”وہ تو جی۔“ بانورہ بولا ”کھانے میں پسند ہے نا آپ تو پکانے کے لئے پکوارہے رہیں۔“

”ہائیں۔“ ایک نگاہ جاہ نے بانورے کی طرف دیکھا اور پھریوں سر ہلانے لگا جیسے روٹی کا باوا ہو۔

”چلو بھائی کرلیے گوشت بناؤ آج۔“

”کرلیے کھا کھا کر تو تھک گئے بھلا۔ پالک نہ ہو جائے۔“ پال نے کہا۔

”ہو جائے۔“ بھابھولا۔

”ایک گجارس میں بھی کروں۔“ بانورہ نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ بھانے کہا۔

”دیے پکانے کے لئے جو بھی چاہیں تیار کر دوں لیکن ایسے موخر پر مناسب رہتا ہے۔ کوئی لکھا جی آج نمونے کے طور پر پکوائی جائے جسے پکانا مشکل ہو۔“

”اچھا بھائی تو کیا کیا چیز پکانی مشکل ہوتی ہے۔“ پال نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“ جاہ بولا ”ذرا لگے ہاتھوں یہ بھی بتا ہی دیجئے۔“

بانورہ نے کہا ”صاحب گوشت تو سبھی بنا لیتے ہیں لیکن کام پر کھنا ہو تو دال پکوائیے اور وہ بھی اس کی۔ جو ایک زائد آج سے ڈھل جاتی ہے اور ایک آج کم ہو تو کھڑی رہتی ہے۔ ویسے

سے جاہ کی طرف دیکھا۔

”آپ کا نام خاصہ بوجھل ہے۔“ جاہ بولا ”سارے حلق کو تکلیف ہوتی ہے۔ میرے لئے آپ کو بلانا مشکل ہو گا۔“

”جی صاحب۔“ غفار نے مسکرا کر کہا۔ ”نام تو سکھار ہی ہے اگرچہ گھر کے لوگ مجھے بانورہ سے بانورہ کہتے تھے۔“

”اگر ہم بھی بانورہ کہیں تو آپ کو اعتراض تو نہ ہو گا۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ کہیں گے محبت سے۔“ جاہ مسکرانے لگا۔

”اجی محبت سے پکاریے تو جوجی میں آئے کہئے۔“ غفار بولا۔

”اچھا بھئی بانورے۔“ بھانے بمشکل مطلب کی بات شروع کی۔ ”تمہیں پانچ آدمیوں کا کھانا پکانا ہو گا۔ سودا بھی خود ہی لانا ہو گا۔ تو یہ بتاؤ کہ تم لوگ کیا۔“ بانورہ مسکرایا بولا ”مضمر ابھی پودا اگا نہیں اور پہلے ہی سے پھل پھول کی بات کرنا تو مناسب نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ پال چلایا۔

”معلوم ہوتا ہے۔“ جاہ بولا ”یہ بانورہ پوئٹری کا طالب علم ہے۔“

”مطلب یہ ہے حضور۔“ بانورہ چمک کر بولا۔ ”پہلے کام پھر دام۔“

”بھئی واہ۔“ جاہ چلایا۔ ”معقول بات ہے۔ جیسے آسکروائیڈ کی لائن ہو۔“

”یعنی۔“ بھانے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”واہ بھلا۔“ جاہ نے کہا ”تم بھی حد ہو میاں پہلے بات اپر۔ شیٹ کرو پھر سمجھنے کی کوشش کرو۔ جو طریقہ ہوتا ہے۔“

”جی میرا مطلب ہے۔“ بانورہ بولا۔ ”طریقے کے مطابق تو مناسب ہے کہ ایک روز کے لئے آپ میرا کام دیکھیں اور پھر اگر آپ کو میرا کام پسند ہو تو مجھ سے تنخواہ کی بات کریں۔ اگر میری مانگ آپ کو منظور ہو تو میں کام شروع کر دوں اور نہ ہو تو اللہ حافظ کہہ کر رخصت جاؤں۔“

”بات تو معقول ہے۔“ پال نے ناک کو گھورتے ہوئے کہا۔

”کچھ زیادہ ہی معقول ہے۔“ جاہ بولا۔

”اچھا میاں۔“ بھانے کہا ”تو کل صبح آجانا۔“

کھانے کے لئے نہیں آیا بلکہ عقل سلیم سکھانے آیا ہے۔ اونہوں۔ یہ بات نہ فہمے گی۔“ وہ بولا
”ہر وقت کی معقولیت اور بات بات پر طریقے سلیقے۔ منگنا دیا ہے دوستو۔ آگے آپ مالک
ہیں۔ اپنی تو صرف ایک گجارس ہے۔

ایک روز جب ایک نیا نوکر گاما آیا تو اس کی حواس باختہ شکل کو دیکھ کر جاہ خوشی سے چلانے
لگا۔ ”یہ ہوئی نا بات۔“ وہ بولا ”یہ تو اپنا بھائی بند معلوم ہوتا ہے۔ دیکھنے سے ہی تسلی ہو گئی۔“
”کی گوس روٹی پکالیتا ہوں۔“ پوچھنے پر نئے نوکر نے مختصر جواب دیا۔

”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ جاہ نے قہقہہ لگایا۔ ”آہا گوس روٹی گوس روٹی سے بڑھ کر کیا چیز
ہوگی۔ میاں۔ بات ہوئی نا ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے بظہر میں پہنچ گئی ہو۔“ — اور گامے کو
ذکر کر لیا گیا۔

گوریاں

ناؤ گھر میں ایلی کی مصروفیات کرینٹ ہوٹل سے چنداں مختلف نہ تھیں۔ کالج سے واپس
آکر وہ چپکے سے جاہ کی ایک کتاب اٹھا کر نیم چھتی میں بیٹھ کر اس کا مطالعہ کرتا جب تک جاہ کے
واپس آنے کا وقت نہ ہو جاتا۔ جاہ کے آنے سے پہلے ہی ایلی وہ کتاب واپس اپنی جگہ پر رکھ دیتا۔
پھر کچھ دیر تک جاہ کے پاس بیٹھ کر اس کی ترش مگر بصیرت افروز باتیں سنتا اور پھر شام کے وقت
لاور ہل دونوں سیر کو نکل جاتے اور جمال اسے تفصیلاً بتاتا کہ سفید منزل میں ایک کالی کلونی
مگر جوان دو شیر رہتی ہے۔ جس کی آنکھوں میں ہلا کی مستی ہے۔ پہلے مکان میں دو ادھیڑ عمر کی
گورنمیں ہیں جو سو کنیں معلوم ہوتی ہیں اور۔ ماننے منزل میں دو چنی سفید گوریاں رہتی ہیں جو اتنی
گوری ہیں کہ توبہ ہے اور ہر وقت ہنستی ہیں ہنسنے ہی جاتی ہیں۔

بتل گوریوں کا تذکرہ کرتے ہوئے قہقہہ لگا کر ہنسا۔ اس کے گالوں پر سرخی جھلکتی آنکھوں
میں مستی جھلکتی اور وہ بار بار جوش میں کھجاتا پھر فرط جوش میں جمال ایلی کو اپنی آغوش میں لے
لیا۔

”یار ایلی۔“ وہ کہتا ”تم بڑے اچھے ہو۔ کیا جگہ دلوائی ہے مجھے واہ واہ۔ ناؤ گھرا جواب گھر
ہے بس اگر ذرا سا چھو چلا دو بھائی تو اپنی زندگی میں بھی حرکت پیدا ہو جائے۔ لیکن ایلی۔“ وہ
دلائل ہاتھوں سے ایلی کے شانے پکڑ لیتا اور پھر مست آنکھیں بنا کر اس کی طرف دیکھ کر

جو آپ چاہیں۔ اپنا کیا ہے۔“
”اچھا بھئی تو وال ہی پکاؤ۔“ پال بولا۔
”ہاں۔“ بھانے کہا۔

جب ہنڈیا میں کھی ڈالنے کا وقت آیا تو بانورہ نے آکر کہا۔ ”صاحب ایک گجارس ہے
میں ڈالنے کے لئے کھی دیا جائے۔“

”واہ میاں۔“ بھانے جواب دیا۔ ”کھی وہاں الماری میں پڑا ہے۔ ڈال لو۔“
”یہ تو درست بات نہیں صاحب۔“ بانورہ بولا۔
”کیوں پال۔“ نے پوچھا۔

”جھو رکھانے میں کھی ڈال کر اسے مجیدار بنانا تو مشکل نہیں اور جو پر کھنا ہو تو جھوڑی
کہ کم کھی دیا جائے۔“

”ارے بھائی۔“ جاہ کتاب رکھتے ہوئے بولا ”بانورے کی بات رد کرنے کا خیال دلانے
نکل دو پال کی حساب دانی یہاں کام نہ آئے گی۔“

روٹی پکانے سے پہلے بانورہ پھر آگیا بولا ”حضور کھانا تیار ہے تشریف لائیے۔“
”اچھا بھئی۔“ بھانے جواب دیا اور اپنے کام میں مصروف ہو گیا۔
”میں تو میاں کچھ دیر کے بعد کھاؤں گا۔“ جاہ نے کہا۔

”جھو گجارس ہے کہ ایسے وقت یوں ہونا چاہئے کہ آپ سب باورچی خانے میں میرا
پاس آ بیٹھیں ادھر آپ سب کھانا شروع کریں ادھر میں پھلکے اتارنا شروع کروں۔“
”ہوں۔“ جاہ بولا۔

”دیکھنا تو یہ ہے صاحب کہ میں اس تیزی سے پھلکے اتار سکتا ہوں کیا کہ پانچ آدمی کھانے
جائیں اور پھلکا کم نہ ہو۔ تار نہ ٹوٹے اور پھر پھلکے کچے نہ اتریں پھول کر اتریں اور کھانے میں
اچھے ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”کو بھئی اس کے جواب میں کیا کہتے ہو۔“ جاہ نے پوچھا۔

”بات تو معقول ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اچھا بھئی ہم آتے ہیں۔“ بھانے کہا۔

جب بانورہ چلا گیا تو جاہ بولا ”میاں میں محسوس کرتا ہوں جیسے یہ بانورہ ہمیں

”مجھے کیا معلوم۔“ ایلی جواب دیتا۔

”پھر بھی — بتاؤ تو سہی۔“

یہ ہوتی ہی ایسی ہیں۔“ ایللی کہتا۔ ”اگر گوری نہ ہوں تو مرجلی ہوتی ہیں اور مرجلی ہوں۔ تو میٹھی رس بھری۔“

”ہے نا۔“ جمل قہقہہ مار کر ہنستا۔ ”اور وہ زردہ تھی۔ وہ زرد ہو گئی تھی کتنی زرد تھی۔“

”گلابی تو یہ ہیں۔“ جمال کہتا۔ ”ضرور گلابی ہوں گی۔ جو دور سے خالی سفید دکھ رہیں۔“
 سے گلابی ہوتی ہے۔ لیکن یار۔۔“ وہ پھر ایلچی کو شانوں سے پکڑ لیتا۔ ”یار وہ اس قدر نہیں کھلا
 ہیں۔ دیکھتی ہیں اور ہنستی ہیں۔ ہنستی ہیں اور دیکھتی ہیں۔ دیکھ دیکھ کر ہنستی ہیں۔“

”تو کیا تم چاہتے ہو کہ دیکھ کر رو دیں۔“ ایلی پوچھتا۔

”ارے نہیں۔۔۔۔۔“ جمال رک کر سوچنے لگتا۔

”شکر کر بھائی روتی نہیں وہ۔ جو رو دے تو تمہاری زندگی حرام ہو جائے۔“ اعلیٰ جواب دہ۔

”یار اہلی۔“ جمال چلاتا۔ ”کوئی ملنے کی صورت بتاؤ۔ پھر جاؤں نہیں پاروں میں۔“

”کیوں پھر کیا ہو گا۔“ امی اسے چھیڑتا۔

”پھر۔۔۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستا اور سر کھٹاتا۔ ”بھر بہت کچھ ہو چلا کرتا ہے۔“ ہنسنے لگتا ہے۔

دفعۃً وہ خاموش ہو جاتا۔ پھر سنجیدگی سے کہتا۔ ”یاد رکھو یہ ہے کہ وہ دور رہیں اور مجھے“
 سے پتہ نہیں چلتا کہ کون کون سی ہے اور کون سی۔ کون بڑی ہے کون چھوٹی بڑی مشکل ہے۔“

”بڑی چھوٹی ہو یا چھوٹی بڑی کیا فرق پڑتا ہے۔“ اعلیٰ فلسفیانہ انداز سے بولا۔

”بڑا فرق پڑتا ہے۔“ جمل کہتا۔ ”چھوٹی چھوٹی ہی ہوتی ہے تمہیں کیا خبر۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

”نہیں یار۔“ وہ اس کا ہاتھ جھٹک کر کہتا۔ ”تجھے سب خبر ہے۔“

نہ جانے جمل کو یہ خیال کیسے پیدا ہو گیا تھا کہ لڑکیوں کے معاملے میں ایلی جی اس کا کماحقہ واقف ہے جمل سچے دل سے سمجھتا تھا کہ اس معاملے میں ایلی بڑا سانا ہے ایلی جی اس کا

رومیؒ نے بیانوں کا رویہ اختیار کر لیتا اس وقت وہ بھول جاتا کہ شہزاد کے رویہ اس کی اپنی کیا بھی یاد نہ رہتا کہ وہ بند بیٹھک سے کس شان سے باہر نکلتا تھا۔

یہاں تک کہ کسی نہ کسی بہانہ جمل اسے آملے۔ اگر اہلی چاہ کے پاس بیٹھا ہو تا تو وہ ہر روز شام کے وقت کسی نہ کسی بہانہ جمل اسے آملے۔ اگر اہلی چاہ کے پاس بیٹھا ہو تا تو وہ

”خاصہ۔“ جاہ چونک کر اس کی طرف دیکھا اور پھر جمال کے چہرے کا جائزہ لے کر کہتا

— ”نیک ہے۔ خلاصہ ہاں۔“ جی جی۔ ”

جہاں کے انداز میں بلائی ہفت ہوتی۔ میں نہیں سے جس کی بات میں نہ ہو اور اس کی بات میں نہ ہو۔

بڑے ہوئے بچے کی سی تھی اور کبھی کبھار تو ایلی کو محسوس ہوتا کہ جاہ صرف اس لئے علم

ماصل کر رہا ہے کہ نوبیت حاصل کر لے دو سروں پر رعب بنائے۔

میں پال لی بات مختلف تھی۔ وہ بھی جاہلی بات سن کر اس قدر سراسیمہ ہوا تھا کہ اپنی

باتیں اچھا کاکیل تھا۔ ناؤ گھر میں ایل بھا اور جمل تینوں جاہ اور پال کی بات کی عظمت کو تسلیم

یہ ہے۔ ”کہہ کر خاموش ہو جاتا۔ جمال طبعی طور پر خاموش آدمی تھا۔ بلکہ وہ ایسی معمولی

اس بات پر لڑھکے ہوئے کہ تو دیتا لیکن بعد میں اسے غصہ آتا۔ اس بات پر لڑھکے ہوئے کہ تو دیتا لیکن بعد میں اسے غصہ آتا۔ اس بات پر لڑھکے ہوئے کہ تو دیتا لیکن بعد میں اسے غصہ آتا۔

بہر حال کسی نہ کسی بہانے جمل اسے وہاں سے نکال کر لے جاتا اور جو نئی دہ اکیلے ہوتے

”یہ ارباب“ وہ چلاتا۔ ”وہ اتنی شوخ ہیں اتنی نڈر ہیں کہ حد ہو گئی۔ اعلانیہ سامنے آ کھڑے ہوئے۔“

یہ سلام لے کر تو اعلانیہ جواب دیتی ہیں حالانکہ اس وقت اور لوگ بھی موجود ہوتے ہیں

جل کی وہ بات بھل کر کی حیثیت اختیار کرتی گئی اس کا اشتیاق بڑھتا گیا۔ اس کے قہقہے اور ہلکے ہنسنے کا اعتبار کرتا چلا گیا۔ وہ گوریاں جو اتنی دور رہتی تھیں اور جن کی حیثیت محض ایک تہہ کھانی کی سی تھی قریب آتی گئیں اور قریب اور قریب حتیٰ کہ وہ نیم چھتی اور چوبارے پر ملا دھبہ ہو کر رہ گئیں بن دیکھے بن جانے ایللی ان سے اس حد تک مانوس ہو گیا جیسے وہ بھی ان کے ساتھ ٹائمر میں رہتی ہوں۔ مثلاً ایللی کو معلوم تھا کہ ان کی چال کیسی ہے ان کے بال کس طرح گردن پر لگتے ہیں ان کی چونیاں کیسے مل کھاتی ہیں۔ ان کے دوپٹے کس رنگ کے ہوتے ہیں اور وہ ہوا میں کس طرح لہراتے ہیں اور ان کی آنکھیں کن کن زاویوں سے دیکھی جاتی ہیں ان میں کیسی کیسی چمک لہراتی ہے۔ ان کی ٹانگیں کتنی لمبی ہیں اور وہ بن کتنے چھوٹے۔ ان کے حلق کوئی بات بھی تو نہ تھی جو جمال نے تفصیل سے ایللی کو نہ بتائی تھی۔ صرف ایک عقدہ بتائی تھا جو جمال حل نہ کر سکا تھا۔ اسے یہ معلوم نہ ہو سکا تھا کہ کون کونسی ہے اور اس بارے میں ایللی بھی اس کی مدد نہ کر سکتا تھا۔

مل کرانی

ایللی تو اس معاملے میں جمال کی مدد نہ کر سکتا تھا لیکن نہ جانے کیوں جمال اس بات پر مصر تھا کہ ایللی کے بغیر اسے گوریوں سے قرب حاصل نہیں ہو سکتا اور وہ اس خلوص اور یقین کے ساتھ بار بار یہ بات دہراتا رہا کہ ایللی کی بے تعلقی کے باوجود اس کے احساس کمتری کے باوجود ایللی مجھ کی سے سوچنے لگا کہ کس طریقہ سے وہ جمال کی آرزو پوری کر سکتا ہے۔ کئی ایک روز وہ سوچتا رہا لیکن کوئی بات اس کے ذہن میں نہ آئی۔ آخر ایک روز جب وہ نیم چھتی میں پڑا سلیمانی لٹلے کے متعلق سوچ رہا تھا کیونکہ انہیں ایام میں اس نے ایچ جی ویلز کا ناول ”دی ان دز بیل مین“ ختم کیا تھا کہ دفعتاً اس نے آنکھ اٹھائی تو کھڑکی میں ارجمند کھڑا تھا۔ اس کے ایک ہاتھ میں پلم پٹر تھا اور ہونٹوں سے پریم سندیس لگی ہوئی تھی۔ چند ایک ساعت تو وہ کرشن کنیا کی طرح سکائی آنکھوں سے کھڑا مہل بجاتا رہا پھر مرلی کو ہونٹوں سے الگ کر کے بولا۔

”موسے ہم روشن کرو نہ کرو پر نتو اپنے گرو کی لاج تو رکھ لو۔ ایک کلی میں کھو جائے بیٹا تو ہنوز کا کلیان نہیں ہوتا دھرم پالن نہیں ہوتا۔“ نروان نہیں ملتا۔ کلی کلی پتر کلی کلی اور بیٹا کنیا کے بندے کا دوار کھٹکھٹاتا ہو تو ————— ”ارجمند مسکرایا اور اس نے پتر والا ہاتھ آگے بڑھا

حد ہو گئی یار۔ آج تو دونوں نے بال کھول رکھے تھے۔ اتنے لمبے بال جیسے کسی بال بال مٹی ہو۔ یہاں سے وہاں تک اور پھر اتنے کالے اتنے کالے اور ان کئی زلفوں میں اس کے چہرے حد ہو گئی ایللی بالکل جیسے کچی گری کی بنی ہوئی ہوں۔ یار ایللی ”وہ اس کے ٹکڑے ٹکڑے کہتا۔“ ”اب میں کیا کروں۔“

ایللی کو بھی جمال کی یہ باتیں بے حد پسند تھیں۔ سارے ٹائمر میں صرف تیشی ہی ہستی تھی۔ جس کے روبرو ایللی کی حیثیت پیدا ہو جاتی تھی۔ جمال کے پاس جا کر دھم دھم سے سیانا بن جاتا اور ان پڑھ سے عالم ہو جاتا۔ ایسی صورت میں اسے جمال کی باتیں کچھ نہ ہوتیں اور جمال کا بار بار کہنا یار ایللی تم ہی کچھ کرو گے تو بات بنے گی۔ تمہارے یہ بیل مٹی نہیں چڑھے گی۔ کچھ کرونا ایللی۔ کچھ ہو جائے۔ اب تو یہ دوری مجھ سے برداشت نہیں ہو سکتی کیا کروں میں کیا کروں۔

جمال کو یہ معلوم نہیں تھا کہ رات کو جب وہ ایللی کو نیم چھتی میں چھوڑ کر اپنے چوبارے میں چڑھ جاتا ہے تو سیڑھیوں میں سے چھن چھانن کی آواز آتی ہے اور پھر چھن سے کوئی ایللی کے روبرو آکھڑی ہوتی ہے اور ایللی کے حواس باختہ ہو جاتے ہیں اور وہ حواس گم قیاس گم مصداق یوں اٹھ کر کھڑا ہو جاتا ہے۔ جیسے دیوی کی آمد پر باندیاں عزت اور احترام سے کمانے جاتی ہیں اور پھر وہ حسرت بھری نگاہ سے ان کے بلوری پاؤں کی طرف دیکھتا ہے دیکھے جانے اسے ہمت نہیں پڑتی کہ نگاہ اٹھا کر اوپر دیکھے جہاں گلابی چاند جھلکا رہا ہوتا ہے۔ اس کا نام ہوتا ہے کہ بلوری قدموں پر اپنا سر رکھ کر رو دے۔ آنکھیں ملے اور کہے ”دیوی میں تمہارے لائق نہیں ہوں۔ لیکن کیا کروں میں۔ کیا کروں۔“

جمال کو معلوم نہیں تھا کہ گوریوں سے قرب حاصل کرنے کے لئے جس پر اس نے تمام امیدیں استوار کر رکھی تھیں۔ اس میں اتنی حرارت نہ تھی اتنی سوجھ بوجھ نہ تھی کہ تیلنے میں بھی قرب حاصل کر سکتا۔ الٹا تنخیلے میں وہ اور بھی دور ہو جاتا تھا اور کوششوں کو وہ نہ کر کے باوجود گوری کو اپنا نہ بنا سکا تھا جو اعلان یہ اس کی ہو چکی تھی۔

جمال کی موجودگی میں ایللی کو بھی یہ تفصیل بھول جاتی تھیں۔ گھڑی کی جھونکی غفلت مائل کرنے کے لئے وہ شہزاد کو بھی بھول جاتا وہ شہزاد جو اس کے لئے زندگی تھی۔ جیسی کچھ تھی۔ جس کے بغیر اس کی کوئی حیثیت نہ تھی۔

”مسترفانی۔۔۔؟“ جمال نے پوچھا۔

”اچھا۔“ جمال نے خوشی سے تالی بجائی۔ ”کیا واقعی؟“

”میں نے تو اسے کبھی دیکھا بھی نہیں۔“

”بات؟ کیا بات کروں میں اس سے پوچھوں میں کون کونسی ہے۔“

”پہلے اس سے ادھر ادھر کی بات کرو ویسے ہی گپ شپ اور اگر دیکھو کہ بات چیت کرنے

ہے تو — ” اہلی خاموش ہو گیا۔

”تو کیا؟“

”تو اسے کہو کہ تمہارا خط پہنچا دے ان تک۔“

”خط؟“۔ جمل چلایا اس کا چہرہ یوں چمکنے لگا۔ جیسے کسی بچے کو نیا کھلونا مل جاتا ہے لیکن ایلہ

نہ سائنوں کی طرح احتیاطی تدبیروں کی وضاحت شروع کر دی۔

”لیکن آج ہی بھانڈہ نہ پھوڑ دینا۔ آج تو ٹٹولواے۔“

میں اس وقت سڑکیوں میں مہترانی کے پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

”اچھا تو میں باہر کوٹھے پر جاتا ہوں تم یہیں بیٹھے رہنا۔“

”میسک بیٹھا ہوں۔۔۔۔۔“ امی کا دل ڈوب گیا۔ ”نہیں نہیں میں چلتا ہوں۔“

”ارے نہیں۔“ جمال نے کہا۔ ”مجھے اکیلا نہ چھوڑو۔“

دیا۔۔۔ ”پریم پتر۔ پریم پتر سے کواڑ کھل جاتے ہیں۔ مندر میں دیوتا برا جملن ہو جاتا ہے اور پھر پچاننا کیا مشکل ہے۔ تم نے تو اپنے گرد کا اپمان کر رکھا ہے۔“

ایلی اٹھ بیٹھا۔ پریم پتر وہ سوچنے لگا۔ پھر وہ کھڑکی میں جا کھڑا ہوا اور اس مکان کی طرف دیکھنے لگا جہاں گوریاں رہتی تھیں۔ اس نے اس مکان کی طرف کئی بار غور سے دیکھا تھا لیکن اسے وہاں کوئی بھی تو جگہ نظر نہ آئی تھی جس کی راہ کینوں کو دیکھا جاسکتا تھا۔ اس کی طرف دیواریں حصار کی طرح کھڑی تھیں۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ وہ کھڑکیاں عسائی بند رہتی تھیں۔ کیونکہ اس جانب مکان کا چھوڑا تھا۔ گلی سنسان پڑی تھی نہ جانے وہ کتنی دیر تک وہی کھڑا سنسان گلی کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر مکان کا عقبی دروازہ کھلتے دیکھ کر وہ چونکا۔ نہ جانے کیا ہے۔ ایک سیاہ فام ادھیز عمر کی عورت کو باہر نکلتے دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ وہ کولے مکان کی طرف ناؤ گھر کی جانب آ رہی تھی۔ ارے اس کے ہاتھ میں تو جھاڑو تھا۔ مہترانی ہے بڑی ملک ملک کر چلتی ہے۔۔۔۔۔ ہائیں حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ مہرانی ناؤ گھر میں داخل ہو چکی تھی۔ ارے مہترانی۔۔۔۔۔ اسے یہ بات کیوں نہ سوجھی۔

”ہوں۔“ سامنے درخت کے پتوں سے ارجند جھانکنے لگا۔ ”بیٹا تو اکر اینڈی کا پلاسٹن ہے۔ اسے مہترانی نہ سمجھو اینٹ البحر میں اس کا نام ”میل کرانی۔“ ہے جب تک اپنی جسم ہونا میں میل کرانی موجود ہے۔ بھنوروں کو غم کس بات کا۔“ پھر اس نے مری ہونٹوں سے لگائی اور پریم ودیا میں کھو گیا۔

ایلی جانتا تھا کہ چند ایک منٹ کے بعد مسترانی ٹپلی منزل میں صفائی کرنے کے بعد لوہا لپٹا
گی۔ چونکہ بیت الخلاء اوپر ہی تھا۔ لیکن اس سے بات کرنا۔ ایلی میں اتنی جرأت نہ تھی اگر اسی
نے جواب میں ایلی سے بات کہدی اگر اس نے شور مچا دیا تو جہاں کیا کے گا بھلا حول پڑے گا۔
پھر اس سے کس انداز سے بات کی جائے اونہوں یہ ایلی کے بس کا روگ نہ تھا۔ لیکن اسے خیال
آیا بات کرنے میں جمل کا تو جواب نہ تھا خصوصاً "اس قسم کی بات۔ اس نے جلدی جلدی لپٹ
پٹنے اور چوبارے کی طرف بھاگ۔

”میں نے کہا۔“ وہ چلایا۔ ”وہ آ رہی ہے۔“

”آ رہی ہے؟“ جمل نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ”کون آ رہی ہے؟“

”بھئی وہی۔“ اہلی نے کہا۔ ”مہترانی۔“

اس پر ذرا مسکرائی، بولی ”اچھا تو میں کر دیتی ہوں صاف۔“ اس پر میں نے دہائی مچا دی۔
 اس نے ہلکے میں بولا۔ ”میں تو غریب آدمی ہوں ایک روپیہ نذر کہاں سے دوں گا۔“ اس پر وہ
 ہنسی میں ہی بولی۔ ”نہیں میں اور نہیں مانگتی۔“ لیکن میں نے اسے ایک اور روپیہ دے
 دیا۔ اس نے کہا ”بھئی تمہارا حق تو میں دے کر رہوں گا اور اور ایلی میں نے دل میں کہا سالی
 اب تو رام ہو جائے گی نا۔ وہی ہوا۔ وہ ہنس ہنس کر مجھ سے باتیں کرتی رہی۔ اس کا نام گجبری ہے
 کچھ کوئی نہیں۔ میں سمجھتا ہوں بڑی گرم ہے۔ ایمان سے اور ہے بھی تو اچھی خاصی۔“ جمال
 کہتے ہوئے بولا۔

”کہا گوریوں کی بات کی۔“ ایلی نے پوچھا۔

جل ہنسنے لگا۔ ”یار میرا خیال ہے کام بن جائے گا۔“

”خط۔“ ایلی نے پہنچھا۔ ”کیسا خط۔“

”یہی مہترانی۔ اس کا نام گجبری ہے۔ کیا نام ہے۔ ہے نا۔“

خواہ مخواہ کا منہ

”مب تمہاری وجہ سے ہے۔“ جمال نے کہا۔ ”اگر تم یہ راستہ نہ سمجھاتے تو مجھے کبھی

”ہاں ہاں۔“ ایلی بولا۔ یہ کہہ کہ وہ سیڑھیاں اترنے لگا۔ نیم چھتی کر...

جب مہترانی چلی گئی تو جمل بھاگا بھاگا ایللی کے پاس آیا۔

”یار۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو سمجھو پہلے سے ہی گرم ہے۔ محبت کرنے کی ضرورت ہی نہ رہی۔“

”کس طرح بات کی تھی تم نے۔“ اعلیٰ پھر سے سیانا بن کر بیٹھ گیا۔

”کچھ بھی نہیں میں نے کہا تھا بعد ارن اگر جو یو مارے کے سامنے کا کوٹھا بھی صاف کرنا

”اس پر وہ تنک کر کہنے لگی۔ دیتے تو کل دو روپے ہیں اور کہتے ہیں سارا گھر صاف کرو۔“

”چلو کر دیا کرو۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”نہ جی۔“ وہ بولی۔ ”اتنا سارا کام ہوتا ہے زائد کام کرنے لگیں تو کھامیں کیا۔“ ”ہاں“

”تو کیا میں خود جھاڑ دیا کروں۔“ میں نے ہنس کر پوچھا۔

”اور کون لکھے گا۔“

”تم خود لکھو نا۔“

”نہیں یار میں انپ شتاب لکھ دوں گا۔ پڑھ کر وہ کیا کہیں گی۔“

”میں نے تو کبھی نہیں لکھا محبت کا خط۔“

”نہیں یار۔“ جمال اس کی منتیں کرنے لگا۔ ”تم لکھ سکتے ہو۔ ایسی ایسی باتیں لکھو“

حیرت سے میری طرف دیکھنے لگیں۔

اس روز سارا دن جمال ایللی کے گلے کا ہار بنا رہا۔ ”یار لکھ دو نا لکھا دو نا یار۔“ ایللی کو یہ میں نہ آتا تھا کہ کیا لکھے۔ اس نے زندگی میں صرف ایک محبت نامہ لکھا تھا۔ وہ بھی ارمنیوں سے جو انہوں نے صبرہ کے جوتے میں رکھ دیا تھا تو بہ کتنا ہنگامہ ہوا تھا۔ جب بھی اس کا خیال آتا تو ایللی کو پسینہ آ جاتا تھا اور وہ خط تھا بھی تو بے حد دواہیات۔ اس خط کے خیال سے ایللی کو بے شمار زندگی محسوس ہوتی تھی۔ نہیں نہیں وہ سوچتا میں نہیں لکھوں گا۔ میں کیوں لکھوں نے کچھ دیکھا تک نہ ہو کیا اسے محبت نامہ لکھا جا سکتا ہے۔ نہ جانے وہ کون ہیں کیسی ہیں اور پھر کیسی ہوں۔ مجھے ان سے کیا لینا دینا۔ میں خواہ مخواہ میں کیا منشی ہوں ان کا۔ واہ۔ خواہ مخواہ منشی ہو رکھا ہے کیا۔ لیکن ایللی کے دل کے کسی عینق ترین کونے میں یہ آرزو چھپی بیٹھی تھی کہ وہ اسرار گوریوں کو خط لکھے۔ جو اتنی چٹی سفید تھیں جو ہنسنے جاتی تھیں جن میں اس قدر زلف تھی۔ ایسا خط لکھے کہ وہ پاگل ہو کر باہر نکل آئیں۔ گلی کی کھڑکیاں کھول کر ان میں آکر بیٹھیں اور لیکن اس کے ذہن میں کوئی بات نہ آتی تھی۔

جمال مسلسل اصرار کرتے جا رہا تھا ”لکھو نا یار۔“ ایللی کو لکھنے سے ڈر آتا تھا چونکہ لکھنے والے اس کے ذہن میں کچھ بھی تو نہ تھا۔ اس زمانے میں اس نے کئی ایک نظمیں اور غزلیں پڑھی تھیں اور کئی ایک تو اسے حفظ تھیں مثلاً ”وہ تھی اکثر شب تنہائی میں کچھ دیر جا بٹا ہے۔“ لیکن وہ تو گزری ہوئی دلچسپی کی یاد تھی۔ پھر وہ تھی مجھے تجھ سے عشق نہیں نہیں یہاں تو عشق ہے ہے کی ضرورت تھی۔ پھر وہ نظم تھی۔ ابھی تو میں جوان ہوں یا فرصت کا تھنا میں اور یا وہ خوبصورت نقش ماتھے پہ بندی آنکھ میں جاو۔

وہ سب موقعہ کی چیزیں نہ تھیں۔ اس روز اسے احساس ہو رہا تھا کہ شاعر بننے کی بات چیزیں لکھتے ہیں۔ نہیں، اس نے فیصلہ کیا۔ کیوں لکھوں۔ خود ہی لکھے وہ۔ وہ تو ہر شے ایللی کے

ہت بند لکھا کرتا ہے۔

”نہیں نہیں۔“ جمال کہنے لگا۔ ”بیوی کو خط لکھتا اور ہوتا ہے۔ وہ چیز ہی اور ہے یار تمہیں

معلوم نہیں۔“ جمال پھر اس کی منتیں کرنے لگا۔

رات بھر ایللی سوچتا رہا لیکن اسے کوئی بات نہ سوچھی۔ آخر تھک کر اس نے ایک پرزے پر ایک جملہ اور ایک شعر لکھا اور پھر سو گیا۔

صبح سویرے ہی جمال نے اسے آجگایا۔ ”لکھ لیا یار۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ ایللی نے وہ پرزہ سرانے سے نکال کر اسے دے دیا۔

”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”بس اتنا۔“

دھنسا۔ ”سیانا بیدار ہوا۔“ اور کیا۔“ ایللی نے کہا۔ ”بھئی پہلی مرتبہ تو لمبے قصبے نہیں چلتے۔“

”واہ۔“ جمال نے کہا۔ ”پہلی مرتبہ ہی تو اثر ڈالنے کی ضرورت ہوتی ہے۔“

”تم تو پاگل ہو۔ پہلی مرتبہ تو صرف دیا سلائی دکھائی جاتی ہے۔ آگ تو بعد میں لگانی چاہئے۔“

نہیں کیا معلوم۔“

”اچھا یار۔“ جمال کا جوش ٹھنڈا پڑ گیا۔ ”تم جو کہتے ہو تو ٹھیک ہی ہو گا۔“

”تم پڑھو تو سہی۔“ ایللی نے کہا۔ جمال اسے پڑھنے لگا۔

”گورو کچھ کو کچھ سنو۔ یوں ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھی ہو۔ واہ۔“

”ارے۔“ جمال چلایا اس میں تو شعر بھی لکھا ہے تم نے۔

”یہ ہے دامن یہ گریباں آؤ کوئی کام کریں

موسم کا منہ نہ سکتے رہنا کام نہیں دیوانوں کا۔“

جمال نے کہا۔ ”اس کا مطلب کیا ہوا؟۔“

”تم پڑھو مطلب و طلب کو۔“ ایللی نے کہا۔ ”تمہیں آم کھانے ہیں پیر گننے سے کیا کام۔“

”اچھا۔“ وہ جوش میں کھجائے لگا اور پھر بولا۔ ”اچھا یار میں یہ نقل کر کے بھیج دوں گا۔ تم

کہتے ہو پہلے خط میں لمبی بات نہیں ہونی چاہئے یار ایللی اگر تم نہ ہو تو یہ باتیں مجھے کون

ماتھے۔“ جمال نے فرط محبت اور انبساط سے ایللی کے شانے پکڑ کر اسے جھنجھوڑا۔ ”اچھا میں اب

باہر لکھتا ہوں۔ ایسا اچھا کاندہ اور لفافہ خرید کر لایا ہوں میں کہ دیکھ کر طبیعت خوش ہو جائے اور

پھر بیٹ کی شیشی بھی۔ معطر کر کے بھیجوں گا۔“

میں نہیں آتا کچھ اور تم پلو چھڑا رہے ہو۔“ جمال بولا۔

”ہاں بھئی۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”یہ تو بڑی مشکل پڑ گئی۔ میرا خیال تھا کوئی بیرونی بات لکھیں گی۔“

”تم نے شروع ہی میں بات الٹی چلائی ہے۔ اب تم ہی سنبھالو گے تو سنبھالنے کی کیا بات بھائی اس وقت شروع ہو گا جب آئے سامنے کھڑے ہوں گے۔“

”اس کے جواب میں تو عام محبت نامہ نہیں لکھا جاسکتا۔“ ایلی نے کہا۔

”تو بھائی لکھو جو جی میں آئے لکھو۔“ جمال بولا۔

”لیکن مختصر ہی ہو سکتا ہے۔“

”مختصر ہی سہی یار۔ تم لکھو تو۔ بات رک نہ جائے۔“

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”لکھ دوں گا۔“

جمال کے چہرے پر بشارت دوڑ گئی۔

اس کے بعد اس کے معمول ہو گیا۔ ایلی سوچ سوچ کر دو ایک چست اور چمکے چمکے کرنا کو دے دیتا۔ جمال رنگین معطر کاغذ پر انہیں نقل کر دیتا اور پھر گجری کے انتظار میں بیٹھ جاتا۔ دوپہر ڈھلنے لگتی تو جمال چوبارے سے نکل کر برساتی میں جا بیٹھتا چونکہ برساتی سے وہ اٹھنا نہیں سکتا تھا۔ پھر شام تک وہ ایک دوسرے سے اشارے کرتے رہتے۔ اگلے روز صبح سویرے وہ دونوں جمال اور ایلی بے صبری سے جواب کا انتظار کرتے اور پھر اسے پڑھتے سمجھنے کی کوشش کرتے۔

”ارے یہ تو فارسی کے شعر لکھتی ہیں۔“ ایلی نے ان کی دوسرے خط پر شور مچا دیا۔ وہ میں کورا تھا۔ ”اب بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”اب تو کسی مولانا کو ساتھ ملانا پڑے گا ورنہ نہ ہلائی میں آئے گا نہ جواب سوچے گا۔“

”میں بتاؤں۔“ جمال کہنے لگا۔ ”ایک لغات کیوں نہ خرید لیں۔“

”تو کیا میں سارا دن معانی دیکھتا رہوں گا۔“

”بھائے پوچھ لیا کرنا اسے کیا معلوم کہ خط میں لکھا آیا ہے شعر۔“ تیسرے خط میں گوریوں نے سسرے بالوں شریر آنکھوں تانک جھانک اور ان اشاروں متعلق جو جمال کیا کرتا تھا۔ ایک نظم لکھ بھیجی۔

”ایلی چلایا۔“ ”یہ تو شاعر بھی ہیں اب بولو۔“ لیکن اس کے باوجود ایلی کو ان کے لکھنے کے جواب لکھنے میں حزا آنے لگا تھا۔ وہ ہر بات میں نکتہ پیدا کرتی تھیں اور ہر لطیف سے طنز اشارہ کو خوب سمجھتی تھیں۔

”نہیں یار۔“ جمال گھبرا گیا۔ ”تمہارا ان سے تعارف کرائے بغیر کام نہ چلے گا۔ یہ تو اب کرای ہو گا۔ آج ہی سی۔“

کلی کلوتا

ایلی نے دو ایک بار تو انکار کیا۔ پھر خاموش ہو گیا اور اصل دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ ان کو دیکھے۔ ان کے قریب تر ہو جائے۔ وہ چاہتا تھا کہ جمال زبردستی اسے کھینچ کر ان کے سامنے لے جائے۔

اس لئے اس روز دوپہر ڈھلنے کے وقت جب جمال ایلی کے انکار کے باوجود اسے کھینچتا ہوا برساتی میں لے گیا تو اس نے سرسری ضد کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا حتیٰ کہ وہ ان کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا۔

”وہ سامنے مکان کی عقبی دیوار ہے نا۔“ جمال اسے سمجھانے لگا۔ ”اس میں اینٹوں کی جالی ٹائی ہے یہ جالی ان کی میزبانیوں میں ہے۔ جالی کے ”عین سامنے دروازہ ہے جس کے پرے ان کا کونہ ہے۔ دروازہ کھلا ہو تو جالی میں سے صاف دکھائی دیتا ہے اور اگر بند ہو تو جالی اندھی ہو جاتی ہے۔ لود کھو۔“ اس نے ایلی سے کہا۔ ”وہ سامنے کھڑی ہے ایک حرامزادی مارک ٹائیم کر رہی ہے۔ ہلی شر ہیں یہ۔“ جمال ہنسنے لگا۔

پھر جمال نے عجیب سے اشارے کرنے شروع کر دیے۔ ایلی کے کندھوں پر بازو رکھ کر اسے اپنے قریب تر کھینچ لیا وہ اشاروں کی مدد سے گوریوں کو سمجھانے لگا۔ یہ میرا عزیز ترین دوست ہے۔ اس میں اور مجھ میں کوئی فرق نہیں۔

ایلی کو بھی دھندلی دھندلی اشکال دکھائی دینے لگی تھیں۔ جیسے فضا میں دھبے سے تیر رہے ہوں۔

دھندلا جمال چلایا۔ ”ارے انہوں نے دروازہ بند کر لیا۔“

ایلی نے دیوار کی جالی کی طرف دیکھا۔ وہاں تو مسلسل دیوار کھڑی تھی۔ ”یہ کیا حماقت

”تو کیا میں اسے چلانے کا ذمہ دار ہوں۔“
 ”نہیں بھئی۔“ جمل ہنسنے لگا۔ ”ذمہ دار تو نہیں لیکن یار اگر نیا پار لگا دو گے تو یاد کروں گا
 ملٹی مریٹس ایک مرتبہ ملاقات ہو جائے پھر میں سنبھال لوں گا۔ پھر چاہے چلے جائے۔“

ایلی نے تڑپ کر سیزھیوں کی طرف دیکھا۔ ”کیا تم رنگ روپ میں مدھوش نہیں ہو گیام
میلے پر جانے کے لئے بیتاب نہیں ہو۔ بھول گئیں جب گمانے کے لئے جاتی تھیں یہ بھلا کتنے
کے لئے بلاوہ آتا تھا۔“

”نہیں بھی۔“ ایلی چلایا۔ ”جب انہیں دخل اندازی ناپسند ہے تو۔۔۔“
 ”اونہوں۔“ جمال بولا۔ ”انہیں کیا پتہ کہ یہ دخل اندازی نہیں وہ تمہاری قدر کیا جانیں؟“
 سے پوچھو یار۔ اپنی قدر و منزلت مجھ سے پوچھو۔“
 ایلی خاموش ہو گیا۔
 ”نہ جانا۔ خدا کے لئے۔“ جمال نے اس کی منتیں شروع کر دیں۔ ”کچھ دن غم نہ کرو۔“
 جانا۔ میں تمہیں نہیں روکوں گا۔“

بیڑھیوں میں شہزاد امید بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ وہ چپ چاپ کھڑی تھی۔ چپ چاپ۔ اس کی نگاہ میں حسرت کی جھلک تھی۔ ہونٹوں میں گویا سسکی جا رہی تھی۔

جمال کی نگاہ میں منت تھی۔ عین اس وقت بھا اوپر سے آگیا۔ ”کیا ہو رہا ہے؟“ اس نے سرسری طور پر جمال سے پوچھا۔

”ایلی گھر جانے کی تیاری کر رہا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میں کتنا ہوں نہ جا۔“

بھا ہنسنے لگا۔ ”مجھے بھی یہی خیال پیدا ہوا تھا۔ میں سمجھا ایلی جا رہا ہے۔ لیکن وہ نہیں جا رہا۔“

”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”تم نہیں جا رہے۔“

”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا یا؟“ جمال نے فرط انبساط سے ایلی کے شانے پر زور سے ہاتھ مارا۔ ”تم تو کہہ رہے تھے۔ جا رہا ہوں۔“

”ویسے مذاق میں کہا ہو گا۔“ بھا مسکرایا اور بیڑھیاں اترنے لگا۔

”تمہارا بھی کچھ پتہ نہیں چلتا؟ جمال خوشی سے چلانے لگا۔ ”تم بڑے ہی پیارے ہو لیکن تنگ کرتے ہو۔ یار بہت تنگ کرتے ہو۔ میں پہلے ہی تنگ ہوں۔“ وہ کھجائے لگا۔ ”تم چلتی ہو؟“
 چھڑک کر تماشہ دیکھتے ہو۔ ہے نا۔“ اس نے قہقہہ لگایا۔ ”بڑے تماش بین ہو۔“

”ارے۔“ وہ دھنستا چلایا۔ ”میں تو ان کے خط کا جواب دیتا ہے۔“

”تو دونا۔“ ایلی نے کہا۔ ”اب میں کل کلونے کے بارے میں کیا لکھوں۔“

”ہمار تم اپنی طرف سے ایک خط کیوں نہیں لکھتے۔“

”کیا فائدہ۔“

”ہمارے ساتھ شامل ہو جاؤ گے۔“

”مجھے کوئی دلچسپی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”پھر کس حیثیت سے لکھوں۔“

”ہر اور نہ طور پر لکھ دو۔“

”کیوں۔“ ایلی نے غصے میں کہا جیسے جمال نے اس کی توہین کر دی ہو۔

”میں بھی لکھتا ہوں۔ تمہارے متعلق وضاحت کر دوں گا۔ لیکن یار تم میرا لکھا صحیح کر دینا مجھے نہیں آتا خط لکھنا۔ ٹھیک ٹھاک کر دینا۔ بے عزتی نہ ہو جائے کہیں۔“

اگرچہ بظاہر ایلی خط لکھنے پر رضامند نہ تھا لیکن دل میں شاید اسے بے حد خوشی ہو رہی تھی کہ اپنی طرف سے خط لکھنے کا موقع ملا۔ رومانی خط تو وہ لکھ نہیں سکتا تھا چلو مزاحیہ ہی سہی۔ کسی نہ کسی طور پر وہ اپنی شخصیت کا اظہار تو کر سکے گا۔ شاید اس کے دل کی گمراہیوں میں کل کلونا کا کانا لگا تھا اور وہ چاہتا تھا کہ ان پر اس حد تک اثر انداز ہو کہ اس کانے کا گھاؤ بھر جائے یا شاید یہ کہ انہیں بھی کانا لگ جائے۔

بہر حال پلاٹ جو ایلی نے لکھا ہے حد مختصر تھا گوری سانورے کننائی توری سدھ بسرانی۔

جمال نے اپنے خط میں ایلی کی عظمت کے گمن گائے ہوئے تھے۔ ایلی کے بغیر میں ادھورا ہوں اس کی مدد کے بغیر کچھ نہیں ہو سکتا۔ خدا کے لئے اس سے ایسا سلوک نہ کرو۔ وہ میرا دوست ہے۔
 بہت گمراہ دوست۔

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو گوارا کر لیا گیا اور گوارا بھی نہیں بلکہ ہر بار دو چٹھیاں موصول ہونگی۔ ایک سنہرے بالوں کے نام اور دوسری میں کل کلونے سے مذاق کئے جاتے اور آج کی فلموں کی طرح اس پریم کتھا میں جو چوہا رو اور چھتوں پر کھیلی جا رہی تھی۔ ہیرو کے ساتھ ایک مضرا بھی شامل کر لیا گیا۔ لیکن اوہر وہ دونوں گوریاں ہیروئن ہی رہیں۔ بلکہ جمال اور ایلی پر یہ عقدہ نہ کھلا کہ لون کو خطوط لکھ سکتی ہے اور وہ خطوط دونوں کی جانب سے لکھے جاتے تھے یا ایک کی۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ جمال کو معلوم ہو گیا کہ کون کون سی ہے۔ اسے یہ بھی علم ہو گیا کہ چھوٹی سیدھ شمر ہے۔ اس کا چہرہ ہنستا چہرہ ہے اور بڑی کی شکل کتلی ہے اور اس کے انداز میں غم کی جھلک ہے۔

”جی“ کا چہرہ بنا۔
 ”بات بھی کرنے دو۔“ بھانے کہا۔ ”ہاں گامے۔“
 ”جی وہ آئے تھے۔ جی ہاں۔“
 ”کیوں آئے تھے۔؟“ بھانے پوچھا۔

”یہ اور کون۔“ پال بولا۔
 ”کون آئے تھے؟“ بھانے اپنا سوال دہرایا۔
 ”جی ہاں نہیں کون۔“ گمانے کہا۔
 ”ہے اس کا کوئی جواب۔“ جاہ ہنسنے لگا۔

”کس سے ملنے آئے تھے۔؟“ بھانے پوچھا۔
 ”جی۔“ گکا شرا کر بولا۔ ”جی مالم نہیں۔“
 ”عد ہو گئی۔“ بھانہسی ضبط نہ کر سکا۔

”یہ دہم بات تو ہے معلوم نہیں آئے تھے معلوم نہیں کس سے ملنے آئے تھے۔“

”وہ کہتے تھے۔“ گامے نے کہا۔ ”ہمیں اس سے ملنا ہے۔“

”کس سے؟“ بھانے پوچھا۔
 ”سنہرے بالوں سے۔“ گمانے جواب دیا۔
 ”سنہرے بالوں سے۔“ بھانے کا نوالہ اڑ کر باہر نکل آیا۔
 ”جی وہ کہتے تھے۔“ گمانے بات کی وضاحت کی۔ ”جن کے بال سنہرے ہیں، ان سے ملنا
 ایلی کا منہ فٹ ہو گیا۔“

”کیوں بھئی کس کے بال سنہرے ہیں؟“ جاہ نے حاضرین کو مخاطب کر کے کہا۔ ”میرے تو گھرے بھورے ہیں پال کے سیاہ ہیں اور ایللی تمہارے۔ اونہوں تمہارے بھی سنہرے نہیں۔“

”وہ آیا نہیں آج۔“ جاہ نے ایللی سے پوچھا۔
 ”مینگٹ میں بیٹھا تھا۔ ابھی آ جائے گا۔“ ایللی نے جواب دیا۔
 ”اچھا بھئی۔“ جاہ پھر ہنسنے لگا۔ ”اگر اس کے سنہرے ہوں تو اسے بتا دینا کہ معلوم نہیں اس نے آئے تھے۔“

”جی وہ پھر آئیں گے۔“ گلابولا۔ ”کتنے تھے ہم پھر آئیں گے۔“

اس نامعلوم آنے والے کا واقعہ سن کر جمال بے حد مضطرب ہو گیا۔

”کیا واقعی۔“ وہ چلایا۔ ”یار حد ہو گئی۔ مگر وہ تھا کون۔؟“

”مجھے کیا معلوم۔“ ایللی نے کہا۔

”شاید انہوں نے بھیجا ہو۔“ جمال نے کھجوتے ہوئے کہا۔

”سنہرے بالوں سے تو یہی ظاہر ہوتا ہے۔“

”لیکن یار۔“ جمال مضطربانہ انداز سے کہنے لگا۔ ”یہ لوگ کیا کہیں گے۔ انہیں شک نہ ہو۔“

”ہو۔ تمہارے جاہ سے تو ڈر لگتا ہے۔ تو کیا وہ پھر آئے گا۔“

”ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”گمانے تو یہی کہا تھا۔“

”تو پھر کیا کریں ایللی۔“ جوش میں جمال اس سے لپٹ گیا۔

اس روز شام کے وقت برساتی میں کھڑے ہو کر جمال نے گوریوں سے پوچھنے کی کوشش کی کہ

کیا انہوں نے کسی کو بھیجا تھا۔ لیکن اشارہ کرنے میں جمال اس قدر بھونڈا دکھائی دیتا تھا کہ ہاتھ پائے

وقت وہ سرسک کا جو کہ معلوم ہوتا۔ وہ دیوانہ وار اشارے کرتا رہا اور ساتھ ہی ایللی سے پوچھتا رہا۔

”ارے یار یہ اشارہ تو بہت مشکل ہوتا ہے۔ کیسے پوچھوں ان سے۔“ اوہر گوریاں اس کے

اضطراب پر ہنسنے جاری تھیں، مسلسل ہنسنے جاری تھیں۔

مغرب کے وقت نیچے دروازے پر دستک سن کر ایللی چونک کر اٹھ بیٹھا۔ کبھی کسی نے نوکر

کے دروازے پر دستک نہ دی تھی۔ دستک نہ دی تھی۔ دستک دینے کی ضرورت ہی کیا تھی۔ ہاں بابا

پردہ دار لوگ بستے تھے۔ وہ تو ایک لاج تھا۔ جو بھی آتا دستک دیئے بغیر بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آجاتا۔

ایللی نے کھڑکی سے نیچے جھانکا۔ دروازے پر کوئی کھڑا تھا۔ پھر وہ دیوانہ وار بیڑھیاں اترنے لگا۔

کیس گمانہ جاپنپے اور سنہری بالوں کا بھید نہ کھل جائے ایللی جاہ سے ڈرتا تھا۔ اس کی طنز آمیز بات

ڈرتا تھا۔ جاہ کے گلا۔ ”ہوں تو کوٹھے پر پریم دو یا کھلی پڑی ہے۔ سنہرے بال اور گوریوں کا میل ہونا

ہے اور تم ایللی تم مسخرے کا پارٹ ادا کر رہے ہو۔ رازداں مسخرہ بھی واہ کیا رد ہے۔ جی ہاں تو

کھیل کھیلنا نہ آیا کبھی۔ بہتر اسرینچا۔ اونہوں اپنے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ یہ تو مہرور

تھل کا کھیل ہے کنڈی پر کچھو لگایا اور ڈوری پھینک کر بیٹھ رہے۔ نہ بھی اپنے میں اتنا مہرور

اونہوں۔“

شام کے دھندلکے میں ایللی اچھی طرح سے اجنبی کا جائزہ نہ لے سکا جو ناؤ گھر کے دروازے پر

مردانہ سر ڈھکی تھی۔ ایک بے ڈھب سا کوٹ پہن رکھا تھا اور ساتھ شلوار۔ انداز سے ظاہر ہوتا

تھی۔ ”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ ایللی نے کہا۔

پون گھسنے کے بعد جمال فاتح کی طرح نیم چھتی میں داخل ہوا۔

”کیوں کیا ہوا۔ کون تھا وہ؟“ ایلی نے چلایا۔

”ہوں ہوں ہوں۔“ جمال گنگتایا اور پھر بیڑھیوں میں منہ ڈال کر با آواز بلند چلایا۔

”لے آؤ اوپر۔ ہاں ہاں۔ یہاں نیم چھتی میں۔“

اتنے سارے پھل

اس پر گما ایک بڑا سا نوکرا اٹھائے ہوئے داخل ہوا۔

”ہمیں رکھ دو۔“ جمال نے کہا اور پھر نوکرا اتارنے میں اس کی مدد کرنے لگا۔

کے بعد ایلی نے پھر سے سوالوں کی بوچھاڑ کر دی۔

”اس نوکرے میں کیا ہے؟“

”پھل ہیں۔“ جمال نے کہا۔

”اتنے سارے پھل۔“

”ہاں۔ انہوں نے بھیجے ہیں۔“ جمال نے ہنستے ہوئے کہا۔

”ہائیں۔“

جمال قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”وہ تو مسخریاں معلوم ہوتی ہیں۔ اتنا بڑا نوکرا بھیج دیا جیسے ہم

پھلوں کی دوکان کھولنی ہو۔“

”لیکن وہ رومی ٹوپی والا کیا ہوا۔“

”وہی تو لایا ہے“ اس نے کہا ”ذرا ٹھہریے میں ابھی آیا۔ میں وہاں انتظار کرتا رہا پھر جب

اس کے ساتھ ایک مزدور نے یہ نوکرا اٹھایا ہوا تھا۔“

”ارے اور وہ تھا کون رومی ٹوپی والا۔“

جمال نے ہنستے ہوئے تالی بجائی۔ ”یار اس کا کچھ پتہ ہی نہیں چلا۔ عجیب باتیں کرتا تھا۔“

بہت دیر تک میرے بالوں کی طرف دیکھتا رہا۔ ”تم ہی ہو نا“ وہ بولا۔ ”ہمارے رشتہ دار وہ چوہا

میں رہتا ہے۔ وہ وہاں اوپر۔ سنہرے بالوں والا۔“ عجیب باتیں کرتا رہا۔ جمال نے قہقہہ مار کر

معلوم نہ ہو سکا کہ وہ ہے کون۔“

”لیکن کیا وہ انہیں کی طرف سے آیا تھا۔“

”ہاں ہاں۔“

”لیکن یار۔ شاید۔“

”ارے۔“ جمال چلایا۔ ”ان کا خط بھی تو لایا تھا۔ میں تو بھول ہی گیا۔“

”خط۔“

”ہاں۔“ یہ کہہ کر جیٹ نے وہ خط ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ رنگین کاغذ پر دو مختصر سے فقرے

لکھے ہوئے تھے۔ ”آپ بھی کیا کہیں گے کہ اپنے جنم دن پر کچھ کھلایا ہی نہیں خوب کھائیے۔ بے فکر

ہو کر کھائیے۔ ڈاکٹر کی ضرورت پڑے تو وہ بھی بھجوا دیں گے۔“

”ارے۔“ ایلی ہنسنے لگا۔ ”کیا شے ہیں یہ اور کیا دونوں کا جنم دن ایک ہی ہے۔“

”کچھ پتہ نہیں چلتا یار۔ لیکن چھوڑو اس بات کو۔“ جمال نے نوکرے میں ہاتھ ڈالا۔

”پلے پھل تو کھالیں۔“

”ارے۔“ پھل کھاتے ہوئے ایلی چلایا۔ ”یہ تم نے کیا غضب کر دیا۔“

”کیا۔“

”یہ نوکرا گاما سے اٹھوایا تھا نا۔“

”ہاں ہاں۔“

”اور اس وقت وہ رومی ٹوپی والا وہیں تھا نا۔“

”ہاں۔“

”میں غضب کر دیا۔“

”کیوں۔“

”گاما انہیں بتا دے گا کہ وہی معلوم نہیں پھل کا نوکرا دے گیا ہے۔“

اگلے روز جب ایلی کالج سے لوٹا تو وہ سب والاں میں بیٹھے پھل کھا رہے تھے اور پھلوں کا نوکرا

ان کے سامنے پڑا تھا۔

”ارے مجھے آؤ جلدی آؤ۔“ جاہ ایلی کو دیکھ کر کہنے لگا۔ ”تمہیں بھی آج ہی لیٹ آنا تھا کیا، قسم

ہے اگر مجھے اس نوکرے کے وجود کا علم ہوتا تو آج سرے سے کالج جاتا ہی نہ۔ آج آ جاؤ روٹی روٹی کا

خیال چھوڑو۔ بس اسی پر گزارا کر لو۔“

”اتنا سارا پھل۔“ ایلی نے بناوٹی تعجب سے کہا۔

”جمال کے چچا معلوم نہیں کو دعائیں دو۔“ جاہ بولا۔ ”اگر وہ گاؤں سے چل کر شہر تک نہ آئے ہم اس کا کیا باگڑ لیتے۔ کیوں بھی۔“ اس نے جملہ لوگوں کو مخاطب ہو کر کہا۔

”کون چچا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”یہ تو نہ سمجھو کہ معلوم ہے نہ خود چچا کو اور ہم بچارے کس شمار میں ہیں۔ میاں ہمیں دینے سے واسطہ۔ چچا معلوم ہو یا معلوم نہ ہو۔ کوئی بھی ہو۔ بہر حال یہ حقیقت نہیں جھوٹائی جائیگی کہ ہم پھل کھا رہے ہیں۔“

”اور پیٹ بھر کر کھا رہے ہیں۔“ پال ہنسا۔

”کوئی تعجب نہیں ہو گا۔“ پال نے کہا۔ ”اگر ابھی ناؤ گھر کا دروازہ بجے اور وہ میاں نام لے کر کہیں کہ بھئی اب جو ہمیں یاد آیا تو ہمارے بھتیجے کے بال سنرے نہیں بلکہ کالے ہیں۔“ ”کوئی ہلاہلا کرو اگر ایسا ہوا۔“ جاہ بولا۔ ”تو ظاہر ہے جمال نہیں بلکہ تم اس کے بھتیجے ہو۔ چونکہ تمہارے بال کالے ہیں۔“

”مطلب یہ ہوا کہ گھر سے تازگی لاتی ہے۔“ ایللی نے نکتہ پیدا کیا۔
 ”شاید گھر سے ہی لاتی ہو۔“ جاہ بولا۔ ”لیکن شاید اوپر سے لاتی ہو۔“ جاہ ہنسا۔
 ”میاں الزام نہیں دھر رہا میں ویسے بات کر رہا ہوں اور پھر مجھے ایللی اور جمال بھی کچھ کچھ بدلے
 بدلے دکھائی دیتے ہیں۔“
 ”میں۔“ جمال ہنس کر بولا۔

”پوچھنے کی کیا بات ہے۔“ پال بولا۔ ”مہینے میں دو مرتبہ تو آئیں گے ہی۔“

”چونکہ ہر معقول چچا کو ایسا کرنا چاہئے۔“ جاہ منے لگا۔

پھر وہ سب دیر تک پھل کھانے میں مصروف رہے۔

”ایسا معلوم ہوتا ہے۔“ جاہ نے کہا۔ ”جیسے یہ گھراپنا گھر نہ ہو۔“

”کیوں۔؟“ پال نے پوچھا۔

”یہاں عجیب سے واقعات ہونے لگے ہیں۔ جو اپنے گھر میں نہیں ہو سکتے۔“

”مثلاً۔“ بھانے پوچھا۔

”مثلاً۔“ جاہ بولا۔ ”یہ پھل ہی لو اتنا پھل ہمارے گھر میں دکھائی دے سکتا ہے کیا۔“

قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ ”گویا پھل نہ ہوا کتابیں ہو گئیں۔“

”بات تو درست ہے۔“ پال نے کہا۔

”مثلاً اور۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ جمال بولا۔ ”گھر میں نے ان کی والدہ اور ایک ضعیف عورت کو دیکھا ہے۔“
 ”اچھا۔“ ایللی سوچ میں پڑ گیا۔

”جیسی تو میں سوچتا ہوں اپنے بس کا روگ نہیں معلوم ہوتا اور پھر ان کے خطوط۔ خطا کا کلمہ ہیں پورے جواب مضمون ہوتے ہیں۔“ جمل بننے لگا۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن الٹا یہ بات تو تمہارے حق میں ہے۔“

”وہ کیسے۔“ جمل نے پوچھا۔

”اگر ان میں اس قدر جرات ہے تو خوبی ملاقات کی صورت پیدا کریں گی۔“

”اچھا یا؟“ جمال نے تعجب آمیز مسرت سے ایلچی کے شانے پر ایک بھروسہ ہاتھ مارا ”تو کچھ“

یار۔ اب کی بار خط میں لکھ دو۔“

”کیا لکھ دوں۔؟“

”لکھ دو کہ ہم ملنا چاہتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی لکھ دو۔“

گوریوں کا جواب پڑھ کر دونوں بھوہنچکے رہ گئے۔ لکھا تھا۔ ”جسے ملاقات کا شوق ہے“

کرے کو شش اللہ کا ساز ہے۔ ہمیں تو ملاقات سے کوئی دلچسپی نہیں۔“

”بھئی بڑی تیز ہیں۔“ جمال تھمہ مار کر ہنسا۔

ایلی چپ چاپ بیٹھا سوچتا رہا۔
ویر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

باقی ملاقات پر

اس چند منٹ کی خاموشی کے بعد گویا ایک طوفان اٹھ آیا۔ ایللی نے اعلان کر دیا کہ بڑھل کر نکلا جائے اور گوریوں کو کوئی خط نہ لکھا جائے جب تک وہ ملاقات پر آمادہ نہ ہو جائیں۔ اس کا توجہ: خیال تھا کہ احتجاج کے تحت جمل کو ٹھہرے پر ان کے روبرو کھڑا ہونا بھی موقوف کر دے۔ جمل کو ایسا کے خیال سے اتفاق نہیں تھا۔

”نہیں یار ایسا نہ کرو۔“ وہ یار یار چلا رہا تھا۔ ”کہیں اس ضد میں بات ہی نہ ٹوٹ جائے۔“ علی اس کی فٹیں کر رہا تھا ہاتھ جوڑ رہا تھا مگر ایلی اپنی بات پر اڑا ہوا تھا۔

”یہ میرا فیصلہ ہے اٹل فیصلہ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اگر تمہیں میرا فیصلہ منظور نہیں تو بات

”مثنیٰ و محبت میں تو ایسا ہوتا ہی ہے۔“ ایلی نے اسے چھیڑا۔
”لیکن یار میں سوچتا رہا ہوں۔“

”کیا؟“

”مثنیٰ یہ کہنے سے اچھا ملاقات ہوگی ملاقات تو نہیں ہو جاتی۔“
”بھئی پور آیا ہے تو پھل بھی لگے گا۔“ ایلی نے فلسفہ بھگارتا شروع کیا۔
”لیکن ملاقات ہوگی کیسے۔“ جمال نے پوچھا۔

”جب ہوگی تو کوائف خود بخود معلوم ہو جائیں گے۔“
”مثالیں کا مطلب ہو کہ ہم انتظام کریں۔“ جمال نے کہا۔
”یہ توقف نہیں ہیں وہ۔“ ایلی بولا۔
”مثالیہ وہ انتظام نہ کر سکیں۔“

”جوانا برا تو کرنا بھیجنے کا انتظام کر سکتی ہیں وہ۔“ ایلی ہنسنے لگا۔

”لیکن یار یہ تو کرنا بھیجنے کی بات تو نہیں اور شاید انہوں نے بات ٹالنے کے لئے کہہ دیا ہو۔“
”مارا دن جمال نے اپنے شکوک اور وہم سے ایلی کا سر کھالیا۔ ہر آدھ گھنٹے کے بعد وہ نیم چھتی
میں آجودہ ہوتا۔“ یار ایلی اگر انہوں نے دفعتاً بلالیا تو ہمیں تیار رہنا چاہئے۔ دیکھو تو یہ رومال کیسا
لپٹا ہوا ہے۔ یہ کچھ اچھا نہیں اور یہ خوشبو یہ میں نے بھائیوں کی دوکان سے لی تھی۔ لیکن یار بہت ہی
مہم ہے۔“

”پھر آہستہ آہستہ جمال بات کا رخ بدلتا۔“ یار ایلی اگر ہم یہاں تیار بیٹھے رہیں اور کوئی ہمیں
بلانے کی نہیں تو کیا ہوگا۔“

”جل کی باتوں سے ایلی چڑ گیا۔ شام کے وقت جب جمال نے آکر اپنے شکوک کو ہوا دی تو ایلی
نہ اس کے شکوک کو رفع کرنے کے بجائے انہیں تقویت دینے کی کوشش۔

”مثالیہ وہ مذاق کر رہی ہوں۔“ جمال نے کہا۔ ”ہیں تو بلا کی مسخریاں۔“
”ہاں یار۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں سمجھتا ہوں مذاق کیا ہے انہوں نے۔“
”کی۔“ جمال کی آنکھیں ابل آئیں۔
”بلکہ۔“ ایلی نے کہا۔
”لیکن تم تو کہتے تھے۔“

اس روز جمال کی خوشی کی انتہا نہ تھی۔ وہ بات بات پر قہقہہ لگاتا اور جوش مسرت میں دھول
سے بغل گیر ہوتا اور پیار سے دھول مارتا اور پھر بے اختیار کھجاتا۔ کھجاتا ہی چلا جاتا۔ جمال کے
جوش انبساط کو سب سے پہلے بھانے محسوس کیا کیونکہ بھا اکثر اوپر نیم چھتی اور چوڑے میں ٹپکتا
تھا۔

”کیوں بھی کیا بات ہے۔؟“ بھانے پن کائب درست کرتے ہوئے جمال کی طرف دیکھے
پوچھا ”کیا تمہارے چچا پھر تو نہیں آرہے شہر۔؟“
”نہیں تو۔“ ایلی ہنسا۔

”میں سمجھا شاید۔“ بھاسکراتے ہوئے بولا۔ ”بہر حال کوئی بات ضرور ہے۔“

”گھر سے خط آیا ہے۔“ ایلی نے بات ٹالنے کی کوشش کی۔

لیکن جاہ کے سامنے ایلی کو کوئی بات نہ سوچھی۔ جاہ نے ایک ساعت کے لئے غور سے جل کی
طرف دیکھا اور کہنے لگا۔ ”آج تو جمال یوں مسکرا رہا ہے جیسے بعد ارن مسکراتے ہوئے بیڑیاں اڑا
کرتی ہے۔ اب تو کلیا پلٹ گئی ہے اس کی۔“

”ہوں۔“ جاہ نے کہا۔ ”ان عورتوں کی کلیا پلٹ ہوتے دیر نہیں لگتی۔ ایک نگاہ ایک جملہ سچی
مغرور اور محتاج ہے یہ مخلوق جس کی ایک نگاہ سے کلیا پلٹ ہو جاتی ہے۔“
”کیوں ایلی۔“ پال نے چمک کر پوچھا۔ ”تمہاری ہی نظر تو نہیں۔“
”ہاں۔“ ایلی ہنسنے لگا۔ ”میری ہی تو ہے۔“

جاہ نے غور سے ایلی کی طرف دیکھا اور شانے جھٹک کر کہا۔ ”بہر حال اپنی نہیں اپنی نظر تو لٹاؤ
کرتی ہے۔“ وہ ہنسا۔ ”اگر کبھی ڈال دوں ایک نظر تو بھاڑوں نہ اٹھائے تو اپنا ذمہ۔“
اس روز تو جمال فرط انبساط سے بات بات پر قہقہے لگاتا رہا لیکن اگلے روز صبح سویرے اتنا لبا ہوا
لئے نیم چھتی میں آ گیا۔

”یار ایلی۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ساری رات نیند نہیں آئی۔“

”کیسے آئی۔“ ایلی نے کہا۔

”مذاق نہیں کر رہا۔“ جمال سنجیدگی سے بولا۔

”میں کب کہتا ہوں کہ۔۔۔۔۔“

”یار ساری رات کروٹیں بدلتے بدلتے پہلو چھل گئے ہیں۔“

”کبواس کرتا تھا میں۔“ ایللی نے سنجیدگی سے کہا۔

”نہیں۔“ جمال بولا۔ ”اب کبواس کر رہے ہو تم۔ وہ ملیں گی ضرور ملیں گی جو ان کا ہاتھ بچھ سکتی ہیں وہ ضرور کوئی انتظام کریں گی۔“

ایللی کی ہنسی نکل گئی۔ جمال نے بڑھ کر اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔ ”یار تم نے تو مجھے جان نکالی لی یہ کہہ کر۔“

”تو کیا کہوں؟“ ایللی چلایا۔ ”یہ کہوں تو تم بحث کرتے ہو وہ کہوں تو چیختے ہو۔“

”یار میں پاگل ہو رہا ہوں۔“ جمال ہنسا۔

”وہ تو ظاہر ہے۔“ ایللی بھی ہنسنے لگا۔

جمال کا یہ نگلا پن تین دن جوں کا توں قائم رہا چوتھے روز گوریوں کا بلاوا آگیا اور ایک بار جمال کی باجیس کھل گئیں۔

سفید منزل

گوریوں کے سہ منزلہ مکان کا نام سفید منزل تھا۔ سفید منزل کا پچھواڑا ناؤ گھر کی جانب تھا گھر کے عین مقابل ایک مختصر سی مگر فراخ گلی تھی۔ جس کے بائیں بازو میں چار مکانات اور دائیں بازو میں صرف سفید منزل تھی جو گلی کے پرلے سرے پر واقع تھی۔ اس سے پہلے ایک مختصر سے قبرستان سے ملحقہ کچھ خالی زمین تھی اور بازار میں دو ایک ایک منزلہ دکانیں تھیں۔ اسی وجہ سے سفید منزل کا پچھواڑا ناؤ گھر کے چوبارے اور نیم چھتی سے پورے طور پر دکھائی دیتا تھا۔ سفید منزل کے پچھواڑے میں صرف دو کھڑکیاں تھیں۔ پہلی منزل میں کھلتی تھیں بلکہ دونوں منزلوں میں ان اینٹوں کے سوراخوں کے سوا جو سفید منزل کی سیڑھیوں میں بنے ہوئے تھے کوئی کھڑکی یا روشن دان نہ تھا۔ گوریوں نے جمال کو ان دونوں میں سے ایک کھڑکی میں تباہی و عورت دی تھی۔ یہ کھڑکی گلی کے عین قریب تھی۔ انہوں نے وضاحت سے لکھا تھا کہ منظر کے وقت آپ اس کھڑکی کی طرف دیکھتے رہیں۔ جب کھڑکی میں روشنی دکھائی دے تو گلی سے ہوتے ہوئے کھڑکی تک پہنچ جائیں۔ لیکن آپ کی آمد پر کھڑکی کی روشنی بجھ جائے گی۔ اس روز سارا دن جمال تیاری میں مصروف رہا اس نے دو ایک ریشمیں روئی خریدیں ایک عطر کی شیشیاں حاصل کیں پھر وہ اپنے لباس کی طرف متوجہ ہو گیا۔ بار بار ایک بار ایک بار

دروازہ اور دوسرا نکل کر بیٹھ جاتا شام کے قریب وہ بن ٹھن کر ایللی کے پاس آ بیٹھا ”یار ایللی“ دیکھنے لگا۔ ”کوئی مجھے وہاں کھڑا دیکھ نہ لے۔ تم جو کس رہتا اگر کوئی ایسی ویسی بات ہوئی نہیں لے لگا۔“ ایللی نے کہا۔ ”اکیلا ہی نہ پٹ جاؤں۔“

”منظر کی نماز کے وقت کھڑکی میں بجلی سے چمکتی۔“ ارے۔“ ایللی چلایا۔ ”دیکھا۔“

”جل نے کہا۔“ عجیب سی روشنی تھی۔ چکا چوند کر دینے والی روشنی۔ اچھا تو میں جاتا ہوں۔“

”بچوں والوں سے خبردار رہنا۔“ ایللی بولا۔ ”اگر انہوں نے دیکھ لیا تجھے تو خیر نہ ہوگی۔“

جمال نے سکرانے کی کوشش کی لیکن اس کے چہرے پر فکر اور پریشانی کے آثار تھے جیسے گوریوں سے ملنے نہیں بلکہ دیوار پر چڑھنے کے لئے جا رہا ہو۔

جمال کے جانے کے بعد فوراً ہی سیڑھیوں میں شہزاد آکھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ سا ہوا تھا جیسا کہ ایللی نے دیکھ کر چونکا۔ وہ واقعی شہزاد کو بھولا ہوا تھا۔

”یہ کیا حال بنایا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”دیکھ لو۔“ وہ بولی۔ اس کی آنکھ سے ایک آنسو ڈھلک کر گال پر بہہ گیا۔

ایللی کے دل پر ٹھیس لگی۔ لیکن وہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

”دعہ تو پورا ہو گیا۔“ وہ بولی۔

”دعہ؟“

”جو تم نے کیا تھا۔ اب تو ملاقات ہو گئی نا۔“ یہ کہہ کر وہ مڑی اور آہستہ آہستہ سیڑھیاں

ہٹنے لگی۔

”شہزاد شہزاد۔“ ایللی تڑپ کر اٹھا لیکن وہ جا چکی تھی۔

جمال نے اپنے آپ سے کہنے لگا اب تو ملاقات ہو گئی۔ دعہ پورا ہو گیا۔ چلو جان چھٹی۔ مجھے کیا ملتا ہے۔ خواہ مخواہ مجھے تو کوئی دلچسپی نہیں۔ اب میں علی پور جا سکتا ہوں۔ وہ اٹھ بیٹھا

منظر کیس سے ٹام نیمل نکالا۔ ”ارے۔“ وہ چلایا ”تو بچے بھی تو جاتی ہے ایک گاڑی۔“ اس

مذمت بچے تھے۔ ایللی نے جلدی میں سوٹ کیس میں چیزیں رکھیں۔ پھر ایک رقعہ جمال کے

ہم گھر میں علی پور جا رہا ہوں۔ ملاقات مبارک ہو۔“ یہ رقعہ چوبارے میں رکھ کر ایللی نے

منظر کیس اٹھایا اور نیچے اتر گیا۔

”جوہر“ ایلی بولا۔

شیشن کی طرف جاتے ہوئے اس کے چاروں طرف دھندلے دھندلے نقوش نمودار رہے تھے۔ جیسے او اس آسمان پر بادل تیر رہے ہوں گرد و پیش ان دھندلے دھندلے نقوش تھے۔ بے معنی بے مصرف دھبے جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو گرد و پیش کی ہر چیز منہموم سے نظر آ رہی تھی۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں ہو۔

تھا۔ بے معنی بے مصرف دھبے جیسے وہ خواب دیکھ رہا ہو گرد و پیش کی ہر چیز منہموم سے نظر آتی ہو۔ وہ خود محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھو گیا ہو اور اپنے آپ کو ڈھونڈنے کے لئے سرگرداں ہو۔

پھر وہ ریلوے اسٹیشن میں نہ جانے کہاں سے کہاں جا رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں تلوار

نکٹ تھا مگر وہ سمجھ رہا تھا۔ جیسے علی پور کروڑوں میل دور آسمان پر چمکتے ہوئے ستاروں سے ۱۱

ثریا کی دودھیا سفیدی سے دور۔

”ایلی۔ ایلی۔“

اپنا نام سن کر وہ چونکا اور ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ ایک بڑا سادہ جہ تیرتا ہوا اس کے قریب آیا۔

”ایلی تم ہو۔“ اس نے ایک جانی پہچانی آواز سنی۔ پھر اس میلے سے دھبے نے واضح شکل اختیار

لی۔ اپنے روبرو چچا عماد کو دیکھ کر وہ ٹھٹھکا۔ ”آپ ہیں چچا۔“ وہ بولا۔

”میں نے اتنی آوازیں دیں۔“ چچا نے کہا۔ ”لیکن تم تو قدرے اپنے آپ کا

تھے۔

”میں میں۔“ ایلی کھبرا کیا۔ ”دراصل میں جلدی میں تھا مجھے گاڑی میں سوار ہونا۔“

”کڑی میں۔“ چچا عماد نے دہرایا۔

”علی پور جا رہا ہوں میں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اوہ۔“ چچا بولے۔ ”خیر تو ہے۔“

”ایک ضروری کام ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”اچھا۔“ چچا غمو نے کہا۔ ”میں تو اسی گاڑی سے آیا ہوں۔ سی پور۔“

اسی کاڑھی ہے۔" ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”میں نے کیا حال ہے بچا۔“ ایسی بے پوچھا۔

دورِ ان پڑا ہے۔ پہنچا جو ہے۔ سادیوں کے بعد سب سے پہلے

کامایا اور نہ جانے کس طرف چل دیا۔

کچھ دیر کے بعد اسے ہوش آیا تو وہ فی سٹال پر کھڑا چائے پی رہا تھا۔

سٹیشن کے باہر پہنچ کر وہ بنگ آفس کے سامنے رک گیا۔ ”ایک نکٹ علی پور۔“ ایک نکٹ علی پور۔“
 شخص چلا رہا تھا۔ ”ایک نکٹ علی پور۔“ ایلی نے اپنی مٹھی کھولی۔ نکٹ پر حسرت بھرا نظر
 پھر اس نے چپکے سے نکٹ اس آدمی کی مٹھی میں تھمادی اور باہر نکل گیا۔

تاگوں کے اڈے کے قریب وہ سٹیشن کے چھوٹے سے باغیچے میں پہنچ کر بیٹھ گیا۔
 طرف اندھیرا چھایا ہوا تھا۔ جس میں بتیاں غٹمانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ قریب ہی دالہ
 لے درخت اس کا کھڑے تھے۔ سامنے ایک دیران مسجد کے مینار گویا محو حیرت کھڑے تھے۔
 کوئی چلی ہوئی نہ تھی۔

دیر تک وہ وہیں بیٹھا رہا۔ آہستہ آہستہ سڑک دیران ہو گئی۔ دوکانیں بند ہو گئیں۔
 بھیڑ سے خالی ہو گیا۔ کتے بھونکنے لگے۔

”باو جی چلو گے۔؟“ ایک تانگے والا اس کے قریب آ کر کہنے لگا۔ ”کھل جاؤ گے۔؟“
 جی۔؟“ وہ چونکا ”کہاں جاؤ گے باو جی۔؟“ ”کتنا رو رہا تھا۔ دفعتاً“ اسے خیال آیا کہ اسے جانے
 کیسے نہ کہیں جانا ہی ہو گا۔

”ہاں۔“ اس نے تانگے والے سے کہل۔ تانگے والے نے بڑھ کر اس کا سوت کس اتھا
 اور وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑا۔

ملاقاتیں

اگلے روز جب ایلی بیدار ہوا تو جمال اس کے سرہانے بیٹھا تھا۔
 ”مار لے یار تم نے حد کر دی۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”تم کہاں چلے گئے تھے۔ شکر ہے تم ملے
 نہیں گئے یار مجھے منہ ہار میں چھوڑ کر تو نہ جاؤ۔“ وہ چلائے جا رہا تھا۔ ”تم بولے کیوں نہیں
 کیا ہوا ہے تمہیں۔“

”جمال مسلسل طور پر چلا رہا تھا لیکن ایلی خاموش تھا۔ ایلی محسوس کر رہا تھا چپے سے
 بل اور گوریوں سے کوئی تعلق نہ ہو۔ جیسے زندگی میں کوئی دلچسپی باقی نہ رہی ہو۔ اس کے لئے
 آصف کھڑا مسکرا رہا تھا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ ایلی۔“ وہ اسے اپنے مخصوص انداز میں بلا رہا تھا۔
 اس روز کئی مرتبہ جمال اس کے پاس آیا۔ کئی مرتبہ جمال نے کوشش کی کہ ایلی اسے

کچھ ملاقات کیسی رہی۔ لیکن ایلی نے ہر بار اسے یہ کہہ کر ٹال دیا۔ ”یار میری طبیعت اچھی
 نہیں۔“ لیکن رات کے وقت جب ایلی چارپائی پر لیٹا ہوا تھا تو جمال نے آ کر خود بخود قصہ چھیڑ
 دیا۔

”یار ایلی ملاقات کا کیا فائدہ۔ وہ سلاخ دار کھڑکی کے اندر رہیں اور میں باہر اور پھر ہر آہٹ
 کے غم کوئی دیکھ نہ لے پوچھ نہ بیٹھے کہ میاں میاں کھڑے کیا کر رہے ہو۔ اوہر وہ
 درجہ میں کھڑی تھیں۔ اندر جی بھی نہیں تھی۔ گھپ اندھیرا کچھ دکھائی نہیں دیتا تھا۔ لیکن
 بارش کی آوازیں اتنی پیاری ہیں اور ان کی باتیں اتنی رنگین ہیں کہ میں تمہیں کیا بتاؤں۔ بڑی
 تجربہ دار اور بڑی نڈر اور یار انہوں نے مجھے سرگٹ پلائے پان کھلائے میں نے بہتیری کوشش
 کی کہ سرگٹ دیتے وقت ہاتھ سینوں سے باہر نکالیں۔ لیکن وہ بڑی چالاک ہیں فوراً” بھانپ
 لیں اور تھم مار کر ہنستیں۔“ ”ہم سے چالاک نہیں چلے گی صاحب۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”وہ مسلسل
 باتیں کئے جا رہی تھیں۔ اور میں حیران کھڑا تھا۔ بت بنا کھڑا تھا۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کیا کہوں
 اور وہ کہہ رہی تھیں آپ گونگے ہیں یا بات کیجئے کوئی یوں تصویر بن کر کھڑے رہنے سے فائدہ۔
 بل یار۔“ جمال چلانے لگا ”انہوں نے کئی بار مجھ سے کہا ہاں صاحب تو وہ باقی ملاقات پر جو لکھتے
 نے آپ بار بار اب بتائیے تا وہ باقی کیا ہے اب کیا ہو گیا آپ کو۔“

چار روز بعد پھر بلاوا آیا اور جمال نئی امیدیں لے کر نئے جوش اور نئی تیاریوں کے بعد کھڑکی
 پر جا کھڑا ہوا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کے شانے اندر دھنسنے ہوئے تھے۔ گردن لٹکی ہوئی تھی۔ اس روز
 ”چپ چاپ آ کر بیٹھ گیا اور گہری فکر میں کھو گیا۔“ ”یار وہ طعنے دیتی ہیں۔“ وہ کچھ دیر کے بعد
 بولا۔ ”کتنی ہیں خطوں میں تو بڑی باتیں بگھارتے ہیں آپ۔ بڑے نکتے پیدا کرتے ہیں لیکن
 ملنے آ کر کیا ہو جاتا ہے منہ سے بات نہیں نکلتی۔“

”نور یار۔“ کچھ دیر کے بعد وہ پھر جوش میں کہنے لگا۔ ”اب تو سارا راز فاش ہو گیا۔ اس
 سے تو ہنستا تھا کہ ملاقات ہی نہ ہوتی۔“
 ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

چار روز کے بعد جب پھر بلاوا آیا تو جمال خوش ہونے کی بجائے برا سامنے بنا کر کہنے لگا۔
 ”میں تمہیں جاکوں گا۔ جانے کا کیا فائدہ۔ البتہ تم ساتھ چلو تو ٹھیک ہے چلو گے۔“

”اونہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میرا وہاں کیا کام اور پھر جس کو بلایا جاتا ہے وہی جائے۔“

لیکن میں ان سے کسوں گا کہ میں اسے زبردستی لایا ہوں۔“ جمل نے کلمہ ”اگر وہ پوچھیں کہ زبردستی لانے کا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔ ”کہہ دوں گا باتیں کرنے کے لئے۔“

ایلی کی ہنسی نکل گئی۔ ”بھئی واہ۔“ وہ بولا۔ ”خط میں لکھوں۔ باتیں میں کروں۔ پھر تم کو دے۔“

”ہاں یا رب بات تو درست ہے۔“

”میں بتاؤں۔“ ایلی بولا۔

”بتاؤ۔“

”تمہارا مطلب ہے کہ سودا خرید کر ہنڈیا پکا کر برتن میں ڈال کر میں تمہارے سامنے رکھوں اور پھر تم اسے کھاؤ۔“

جمل نے قہقہہ مار کر کھانا شروع کر دیا۔ ”یار بات تو کچھ ایسی ہی ہے۔“

ایلی دھنستا“ سنجیدہ ہو گیا۔ ”دیکھو جمل اس کھیل میں سودا لانے اور ہنڈیا پکانے کی ہی دہلی ہوئی ہے کھانا اہم نہیں ہوتا۔“

”لیکن یار۔“ جمل بولا۔ ”میں کیا کروں میرا دل جو چاہتا ہے۔“

اس وقت ایک ساعت کے لئے ایلی نے جمل سے نفرت کا جذبہ محسوس کیا۔ لیکن خاموش رہا۔ شام کے وقت جب کھڑکی میں چمکدار روشنی نظر آئی تو ایلی نے زبردستی جمل کو اٹھایا اور باہر دھکیل کر بیچے لے گیا تاکہ ان سے ملے بیچے جا کر جمل نے ایلی کی منتیں شروع کر دیں۔

”اب آ بھی جاؤ یار۔ دس قدم تو ہے یہاں سے تیرا کیا بگڑ جائے گا۔ اپنی بات ہی بولنے کی۔“ جمل کو ابھی تک احساس نہیں ہوا تھا کہ ایلی کو اپنے معاملے میں ڈال کر وہ بات بگاڑ رہا ہے۔ لیکن ایلی کو پورے طور پر احساس ہو چکا تھا کہ جمل بات بولنے کا خواہشمند نہیں ہے۔ مرنے ملاپ کا متمنی ہے۔ خصوصی ملاپ ایسا ملاپ جس میں لوہے کی سلاخیں شامل نہ ہوں۔ لہٰذا:

بھی معلوم ہو چکا تھا کہ گوریاں اس کی اس خواہش سے کما حقہ واقف ہو چکی ہیں۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں ایلی نے جمل کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔

اس روز ان کی ملاقات کافی مختصر رہی۔ واپس آ کر نہ تو جمل نے کوئی بات کی اور نہ ہی ڈنڈیا کو بے اعتبار کیا۔

اگلے روز گوریوں کا جو خط موصول ہوا وہ سارا کھل کھلے کے نام تھا۔ جس میں اسے بار بار ”آئیے“ کی جگہ تھی کہ ان سے ملنے کے لئے سنہری بالوں کے ہمراہ آئے اور اس سے پہلے وہ کیوں نہ آیا تھا اور کھل کھلانا ہونے پر جتنا کیوں ہے۔ منہ کیوں چھپاتا پھرتا ہے۔ روتا کیوں ہے اور نہیں روتا تو کل ایسی کیوں ہے۔

اس خط پر ایلی حیران ہوا اتنا لمبا چوڑا خط اسے کبھی موصول نہ ہوا تھا اور پھر سارا کا سارا اس کے ہم اس سے پہلے تو کبھی کبھار اس کا نام کا رقعہ ملفوف ہوتا تھا اور اس رفیع کی حیثیت ضمنی ہوتی تھی۔ حیرت کی بات تھی۔

ایلی سارا دن اس بارے میں سوچتا رہا پھر اسے قرائن سے معلوم ہوا کہ یہ سب کچھ جمل کے کہنے پر ہوا ہے۔ پچھلی ملاقات میں اس نے اس کے سوا کوئی اور بات ہی نہ کی تھی۔

شام کے وقت جمل اس کے پاس آ بیٹھا اور سفید منزل کی طرف خنجر نگاہوں سے دیکھنے لگا۔ منہ کے وقت کھڑکی میں تیز روشنی دیکھ کر وہ اچھلا۔

”لوہہ بلاری ہیں۔“ اس نے ایلی سے کہا۔

”ابھی تو تم کل ہی مل کر آئے ہو۔“ ایلی نے کہا اور آج کے خط میں تو اس ملاقات کا تذکرہ نہ تھا۔

”انہوں نے زبانی بتایا تھا مجھے۔“ جمل بولا ”کہ شام کو اگر روشنی جلتے تو آ جانا ورنہ نہیں۔“

مگر وہ ایلی کی منتیں کرنے لگا۔

ایلی حیرتاً“ وہاں جانا نہیں چاہتا تھا۔ غالباً“ وہ ”کھل کھلے“ نے اس کی انکو صدمہ پہنچایا تھا اس واسطے ایلی ان میں کوئی دلچسپی محسوس نہ کرتا تھا۔ یا شاید اس کی کوئی اور وجہ ہو۔ بہر حال اس نے ہر ممکن کوشش کی کہ جمل اس کے بغیر اکیلا ہی چلا جائے لیکن جمل گویا اسے ساتھ لے کر جانے کی قسم کھائے ہوئے تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کو جمل کے ساتھ جانا پڑا۔

مگر کانسیڈریشن

مگر سنسن تھی۔ قبرستان کے پیچھے کھڑکی کے پاس کھڑے ہونا خصوصی طور پر خطرناک نہ

تھا۔ اول تو اس گلی میں آمد و رفت بہت کم تھی دوسرے گلی میں گزرتا ہوا شخص اگر کوئی دیکھتا تو اسے اندھیرے کی وجہ سے وضاحت سے کچھ دکھائی نہ دیتا۔

وہ دونوں چپ چاپ قبرستان میں داخل ہو گئے اور پھر کھڑکی کے پاس جا کھڑے ہوئے۔ ایک نے دو ایک مرتبہ کھڑکی کی طرف دیکھا لیکن وہاں گھپ اندھیرا تھا۔ جگہ سنبھل معلوم ہوا تو اس نے سمجھا ابھی گوریاں نہیں آئیں اس لئے وہ جمل سے کہنے لگا۔

”میں نہیں سمجھتا آخر مجھے یہاں لانے سے کیا فائدہ۔“

”حرج بھی کیا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”واہ۔“ ایللی چمک کر بولا۔ ”تم تو بھلا عشق لڑاؤ گے۔ میں کیا کروں گا۔“

”آپ دیکھئے عشق کس طرح سے لڑایا جاتا ہے۔“ کھڑکی سے آواز آئی۔

”ارے۔۔۔۔۔“ ایللی چونکا۔ ”یہ تو اندر ہی ہیں۔“

اندر سے کسی کے ہنسنے کی آواز آئی۔

”یہ تو بڑی بے انصافی ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”کہ آپ تو سیلمانی ٹوپی پہنے رہیں اور ہم دونوں سر سے پاؤں تک بیوقوف بنے کھڑے رہیں۔“

”تو کیا آپ یہاں انصاف کے لئے آئے ہیں یہ کیا جانتیہر کا مقبرہ ہے۔“ آواز آئی۔

”نور جمال بھی تو دکھائی نہیں دیتی۔“ ایللی نے کہا۔

”آپ ملنے آئے ہیں یا لڑنے کے لئے۔“ اندر کوئی ہنسی۔

”ہاں پہلے یہ ملے کر دیتے کہ مجھے کس حیثیت سے بلایا گیا ہے۔ کیا اس لئے کہ میں بیوہ ہوں؟“

ہیروئین کا تماشا دیکھوں۔ یا مسخرے کی طرح آپ لوگوں کو محظوظ کروں یا گورے کے لئے غلام کا کام دوں۔“

”چلے ہم نے آپ کو بھائی کا مرتبہ بخشا۔“ آواز آئی۔

”سوچ لیجئے۔“ ایللی نے کہا۔

”سوچ لیا۔“ آواز آئی۔

”تو بھی دونوں اپنی اپنے کان نیچے کرو اور میرے ہاتھ میں دے دو۔“

”کیوں۔“ کوئی ہنسی۔

”تاکہ میں انہیں سمجھوں اور کموں تم دونوں یہاں کھڑی کیا کر رہی ہو چلو کھڑے ہو۔“

اتنا ڈنڈا ہے یا نہیں اور یہ سنہری بالوں والے ہمیشہ معصوم بچیوں کو پہلے درغلالتے ہیں اور پھر کھڑے ہیں۔“

”ارے۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”نہ صاحب ہم آپ کو بھائی نہیں بتاتے۔“

”تو پھر پہلے یہ فیصلہ کیجئے کہ میں کس حیثیت سے بلایا گیا ہوں۔“

”کچھ دیر وہ دونوں کھی کھی کر کے ہنسی رہیں۔“

پھر ایک بولی۔ ”چلے آپ انڈر کانسٹیبل ریشن سہی۔“ یہ سن کر ایللی کو پینہ آگیا اور

لے کوئی جواب نہ سوچا۔

”معلوم ہوتا ہے اب مطمئن ہو گئے ہیں۔“ کوئی ہنسی۔

”دیکھئے۔“ غصے میں ایللی نے جانے کیا کہنے لگا۔

”نہرے جی۔“ وہ بولی۔ ”انہیں بھی کوئی بات کرنے دیتے اب۔۔۔۔۔ یہ نہیں کہ آپ

یہ کہتے رہیں باری باری موقعہ دیا جائے گا۔“ ایللی کا غصہ بخ ہو گیا۔

”انہیں باتوں سے دلچسپی ہوتی۔“ ایللی نے کہا۔ ”تو مجھے نہ بلایا جاتا۔“

”اب آپ اس کا ناجائز فائدہ حاصل نہ کیجئے۔“ اندر سے آواز آئی۔

ایللی خاموش ہو گیا محفل پر کچھ دیر کے لئے خاموشی طاری رہی۔

”گرد نا کوئی بات بھی۔“ ایللی نے جمال سے کہا۔

”لیجئے اب تو سفارش کر دی آپ کے دوست نے۔“ کوئی ہنسی۔

”میں تو جدائی کا مارا ہوا ہوں۔ میں کیا بات کروں۔“ جمال کھجائے لگا۔

”دیکھ لیجئے۔“ وہ بولی۔ ”یہ پاس آکر بھی جدائی کے مارے رہتے ہیں۔“

”یہ کیا ملاقات ہے۔“ جمال نے آہ بھری۔

”اور ملاقات کسے کہتے ہیں جی۔“ وہ بولی۔

جمال لا جواب ہو کر خاموش ہو گیا۔

”میں نے کہا۔“ ایللی نے بات شروع کی۔ ”اس کمرے کا دروازہ باہر گلی میں بھی تو کھلتا ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔ جس کے باہر تالا پڑا ہے۔“

”تو پھر اسے کھول لیجئے نا۔“ وہ ہنسی

”جی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جواب۔“

”ہاؤ تو منظر عام پر آئے گا۔“ ایلی نے کہا۔

”ارے۔“ وہ ہنسی۔ ”انہیں بازو دیکھنے کا شوق ہے۔ بچوں کی سی بات کرتے ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیا آپ بچہ ہیں۔؟“ وہ بولی۔

”ہوں تو نہیں لیکن بننے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”شاید آپ میں ماسٹا جاگ اٹھے۔“

”ارے۔“ وہ تھوڑے مار کر ہنسی اور اندر کسی سے کہنے لگی۔ ”یہ بھی انہیں کے ہم خیال

معلوم دیتے ہیں۔“

”ہوکن کے۔؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنے دوست کے اور کن کے آپ کے دوست کا خیال ہے کہ درمیان میں لوہے کی

مٹائیں ہوں تو ملاقات نہیں ہو سکتی اور ہمیں معلوم ہے کہ اگر سلاخیں ہٹا دی جائیں تو یہ کیا

مطلبہ کریں گے۔“

”پھر تو میں اپنے دوست کا ہم خیال نہیں ہوں۔“

”کیوں۔“

”میں تو کہتا ہوں کہ ان سلاخوں کو ڈبل کر دیا جائے تاکہ میں اپنے آپ کو زیادہ محفوظ

تھیں اور آپ کی قسم اگر یہ سلاخیں نہ ہوں تو مجھ سے بات بھی نہ ہو سکے۔“

”کیا مطلب۔“ انہوں نے پوچھا۔

”آپ نے وہ قصہ سنا۔“ ایلی کو معاف۔ ”سپ کی کہانی یاد آگئی۔“

”کوئی۔“

ایلی نے کہانی سنانا شروع کی ”بھیڑیا گھوم پھر رہا تھا۔ وہ ایک سو فٹ اونچی دیوار کے قریب

پہنچ کر دیکھا کہ دیوار کے اوپر ایک بھیڑ کا بچہ بیٹھا ہے۔ بھیڑ کے بچے نے چلا کر کہا چچا جان سلام

اؤں کرتا ہوں۔ بھیڑ نے جواب دیا بیٹا یہ تو نہیں بول رہا یہ سو فٹ اونچی دیوار بول رہی

ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”محترمہ یہ میں نہیں بول رہا۔ بلکہ لوہے کی سلاخیں بول رہی ہیں۔“

آیا تو ایلی چو بارے میں گیا۔ ”کیوں بھی کیا ہوا کل۔“ اس نے پوچھا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ بولا۔

”کچھ نہیں کا کیا مطلب۔“ ایلی نے پوچھا۔

”انہوں نے مجھے دیکھتے ہی کھڑکی بند کر لی اور کہنے لگیں جب تک اسے ساتھ نہ

گے۔ اب کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یہ کہہ کر وہ چلی گئیں اور میں حیران کھڑا کھڑا رہ گیا۔“

ایلی یہ سن کر حیران رہ گیا اس نے محسوس کیا جیسے اس کا کلارنگ دھل کر گورا ہو گیا ہو۔

”اب تم کیوں جانے لگے۔“ جمال نے کہا۔ نہ جانے جمال کی حالت دیکھ کر یا اس لئے کہ اس کا

رنگ گورا ہو چکا تھا۔ اس نے جمال کا ہاتھ تھام لیا۔ ”مجھے معلوم نہ تھا جمال۔“ وہ بولا۔ ”مجھے

معلوم نہ تھا کہ وہ ایسا کریں گی۔“

”میں جاؤں گا ضرور جاؤں گا۔ تم دل برا نہ کرو۔“ ایلی نے کہا۔

جمال کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی۔ ”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”تو تم جاؤ گے نا۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”پھر کبھی انکار نہ کرو گے نا۔“

”نہیں۔“

شام کو جب وہ دونوں کھڑکی کے قریب پہنچے تو آواز آئی۔ ”آپ کس حیثیت سے آئے ہیں

جی۔“

”انڈر کانسٹیبل بریڈش کی حیثیت سے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اوہ۔ اور کل کیوں نہیں آئے تھے جی۔“

”اس لئے کہ کل میں اپنے آپ کو ابھی ”کانسٹیبل بریڈش سمجھتا تھا۔“

”تو کیا سزا ملنی چاہئے آپ کو۔“ وہ بولی۔

”سزا تو ضرور ملنی چاہئے۔“ ایلی نے کہا۔ ”ایک تھپڑ کانی ہو گا کیا۔“

”ہاں۔“ وہ بولی اور پھر جمال سی مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”آپ انہیں ایک تھپڑ مار جائے۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ کو خود تکلیف کرنی ہو گی۔“

”کیوں کیا اس لئے کہ ہمارے ہاتھ سے چوٹ نہیں لگے گی۔ بتائیے۔“

”اوسوں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔

اس کے بعد ان کا معمول ہو گیا کہ شام کے وقت جب کھڑکی میں تیز روشنی دکھائی دیتی وہ دن قبرستان کی طرف چل پڑتے۔ ان کی آمد پر وہ پوچھتیں آپ کے پاس ٹارچ ہے تو اسے دیکھ کر وہ نہ کھڑکی نہیں کھلے گی۔ یقین دہانی پر کھڑکی کھل جاتی اور کوئی نہ کوئی بات چل نکلتی اور وہ اپنے ہاتھ کرتے سرگت پیتے حتیٰ کہ ان کے جانے کا وقت ہو جاتا اور وہ شب بخیر کہہ کر کھڑکی بند کر لیتیں۔

ان ملاقاتوں میں ایلی باتوں میں جوش پیش کرتا تھا اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ ابھی تک وہ اپنی باتوں پر گوروں سے وابستہ نہیں ہوا تھا۔ اس لئے جو جی میں آئے کہہ سکتا تھا اس کے لئے مزید قرب کی آرزو نہ تھی۔ حتیٰ کہ اسے یہ بھی خواہش نہ تھی کہ ان کو روشنی میں دیکھ لیں اس کا مطلب نہیں کہ ایلی ان کی شخصیتوں سے متاثر نہ ہوا تھا۔

وہ ان کی ذہانت، جرأت اور علم پر حیران تھا۔ ان کی باتیں رنگین ہونے کے علاوہ پر معنی ہونے۔ ان کی زبان شستہ تھی۔ مذاق لطیف اور خیالات بلند تھے۔

ایلی نے اچھی طرح سے جان لیا تھا کہ وہ صرف باتوں کی دلدادہ ہیں اور ان ملاقاتوں سے ان کا عقد محفل آرائی کے سوا کچھ نہیں۔ وہ رنگین باتیں کرنے اور سننے کی شوقین تھیں اور انہیں بونڈی باتوں سے نفرت تھی۔

ملازمتوں کی آمد پر ملاقات کا وقت بدل گیا۔ اب شام کی بجائے وہ سحری کے وقت ملنے لگے رات کے دو بجے کے قریب سفید منزل کے چوبارے میں روشنی چمکتی۔ جسے دیکھ کر دونوں کڑیاں سے ملنے کے لئے چل پڑتے۔ اس تبدیلی اوقات پر جمال چلا اٹھا۔

”یارے بہت مشکل کام ہے رات کے دو بجے کون جاگے۔“

چونکہ جو گھر کے رہنے والے سب کے سب امتحان کی تیاری میں مصروف تھے۔ بھا کے سوا کسی سے کوئی روزہ نہ رکھتا تھا اس لئے سحری کے وقت ناؤ گھر میں کوئی نہیں جا رہا تھا۔ بھانے کی خصوصی انتظام کر رکھا تھا۔ شام کے وقت وہ دو انڈے بنوا لیتا جو صبح ڈبل روٹی کے ساتھ کھا کر اندر لے جاتا تھا۔ بھانے سے یہ کہنا کہ ہمیں دو بجے جگا دینا مناسب معلوم نہیں ہوتا تھا۔ گھڑی کو بھانے کا لالچ لگانے سے بھی وہ ڈرتے تھے۔ تاکہ گھروالوں کو شک نہ پڑے۔ رات کے دو بجے نہ ہی آپ جاگنا بہت بڑی مشکل تھی۔

ان دنوں کالج امتحان کی تیاری کی چھٹیوں کی وجہ سے بند ہو چکا تھا اور بی اے کے امتحان

”یہ تو بکواس کر رہا ہے۔“ جمال نے کہا۔

”تو پھر آپ بات کیجئے نا۔“ وہ ہنس کر بولی۔

”انہیں بکواس کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو اندر کا انسٹیٹیوٹ ہیں۔“ وہ نہیں۔ ”یہ آپ کو بات نہیں کرنے دیں گے۔“ انہوں نے جمال کو چلبلا کر کہا۔ ”نہ جانے آپ انہیں ساتھ کیوں لے آتے ہیں۔“

”آپ نے تو خود ہی کھڑکی بند کر لی تھی کل۔“ جمال نے کہا۔ ”اور کہا تھا جب تک ساتھ نہیں لائیں گے کھڑکی نہیں کھلے گی۔“

”وہ تو اس لئے کہا تھا کہ آپ پر صرف ایک دھن سوار ہے۔ چونکہ آپ کے خطرناک ہیں۔ اس لئے تیسرے آدمی کا ہونا ضروری ہے۔“

”نہیں نہیں خدا کے لئے ایسا نہ کہئے۔“ جمال کھڑکی کے قریب تر ہو گیا۔ ”اندر ہاتھ نہ ڈالئے۔“ وہ بولی۔ ”منہ زبانی بات کیجئے آپ کو تو کشتی کرنے کا شوق ہے۔“

ہوتا ہے۔ ”ذرا انہیں پیچھے ہٹا دیجئے نا۔“ انہوں نے ایلی سے اپیل کی۔ ایلی خاموش کھڑا رہا۔

”خدا کے لئے ذرا دیا سلائی تو جلائیے۔“ جمال نے منت کی۔ ”کیوں؟“

”یہاں بہت اندھیرا ہے۔“ وہ بولا۔ ”بس ان کو یہی ایک بات کر آتی ہے۔“ وہ ایلی سے کہنے لگی۔

”خدا کے لئے۔“ جمال نے اپنا بازو سلاخوں کے اندر ڈال دیا اور وہ ٹارچ جلا دی جو گھر کے ساتھ لایا تھا۔ کمرے سے دو ایک ہلکی ہلکی چیخوں کی آوازیں آئیں دو ملفوف سی اشیاں باہر

ہوئی بھاگیں اور پھر خاموشی چھا گئی۔ دیر تک وہ دونوں وہاں چپ چاپ کھڑے رہے۔

”بھاگ گئیں آخر۔“ جمال بولا۔ ”وہ یونہی بھاگ جایا کرتی ہیں۔“ ”لیکن یہ ٹارچ تم کیسے لے آئے تھے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”چھپا کر لایا تھا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یار اتنی دیر ہو گئی ہے ابھی تک ان کی ٹیکسٹیں بھی نہیں دیکھیں میرے صبر کا پیمانہ لبرز ہو چکا ہے۔“

”جتنی نہیں کھولیں گی۔“

”جلدی نہ کرو۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”یہ بات مجھ پر چھوڑو۔“

”یاد رکھو۔“ جمل نے فٹیں کرنا شروع کر دیں۔ ”ایسی چالاکی کرو کہ بات بن جائے۔“

اتنی رات وہ دو بجے سے پہلے ہی وہاں جا پہنچے انہوں نے تالہ اور کٹڈی کھول دی۔

پھر وہ گوریوں کا انتظار کرنے لگے۔ اس دوران میں ایلی نے اچھی طرح جمال کو تاکید کر دی

کہ دروازہ کھولنے کے بارے میں گوریوں کا انتظار نہ کرے۔ جب وہ دونوں کھڑکی میں آئیں تو

ایلی نے سب معمول ادھر ادھر کی بات چھیڑ دی اور دیر تک وہ یوں باتوں میں محو رہا جیسے

دروازے کی تفصیل بھول چکا ہو۔ پھر دفعتاً ”وہ زمین پر بیٹھ گیا۔“

”ہائیں آپ بیٹھ کیوں گئے۔“ وہ بولی۔

”ہوا لگتی ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہوا تو بلکہ اچھی لگتی ہے۔“ وہ بولی۔

”اے کل سے بخار آتا ہے۔“ جمل نے کہا۔

”ارے۔“ وہ بولی۔ ”تو آپ نے بتایا کیوں نہیں۔“

”تو بتاتا تو کیا کرتیں آپ کیا دروازہ کھول کر اندر بلا لیتیں۔“

”ہاں کیوں نہیں۔“ وہ ہنسی۔

”جیسی تو بتایا نہیں۔ ڈر تھا کہ مجھے اندر نہ بلاؤ۔“

”اگر باہر تالہ نہ پڑا ہوتا تو میں ابھی آپ کو اندر لے آتی۔“

ایلی نے قہقہہ لگایا۔ ”آپ میں اتنی جرأت کہاں۔ آپ —۔“

”کیوں۔“ اندر سے آواز آئی۔

”نہیں۔“ قرآن سے یہی ظاہر ہوتا ہے۔ آپ شاید اس خوشی فہمی میں ہیں۔“ وہ بولا۔ ”کہ

نہ لٹا ہیں۔ اور ہم بھوکے جاٹ۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”بھوکے جاٹ نہیں البتہ بھکاریوں سے

ماتہ ضرور پڑا ہے ہمیں۔“

”بھکاریوں سے ڈرتی ہیں آپ۔“ ایلی نے قہقہہ لگایا۔

”ہم تو کسی سے بھی نہیں ڈرتے۔“ وہ بولی۔

”تو پھر اندر کی چٹنی کھول دکھائیے۔“ اس گفتگو کے دوران میں جمل تھوکنے کے بہانے کلی

کی طرف نکل گیا تھا۔ لیکن ایلی جبکہ پر جمارہا۔

میں صرف ڈیڑھ مہینہ باقی تھا۔ ان حالات میں گوریوں کے سنگٹل کو دیکھنے کے لئے لازم تھا

جمال یا ایلی ان میں سے کوئی دو بجے تک جاگے۔ چونکہ جمال جاگنے کے لئے تیار نہ تھا اس

یہ ذمہ داری ایلی کو اپنے سر لینی پڑی۔ وہ دو بجے تک مطالعہ میں مصروف رہتا اور پھر وہ

دیکھ کر جمال کو جگاتا اور پھر وہ دونوں مخصوص مقام پر پہنچتے اور وہاں اندھرے میں اوپر

بات چل نکلتی اور ایلی بے سکی ہانکتا۔ گوریاں فقرے چست کرتیں اور ہنستیں اور سبیل کی

آنکھیں بنا کر گوریوں کی طرف دیکھتا۔ ان جانے میں کھجوتا اور جب ضبط کا دامن ہاتھ سے پھر

جاتا تو بھکاری کی حیثیت سے سلاخوں کے قریب جا کھڑا ہوتا۔ ”خدا کے لئے خدا کے لئے

چلاتا اور گوریوں کے ماتھے پر شکن پڑ جاتے۔“

دروازہ

دراصل جمال کا پیمانہ صبر لہریز ہو چکا تھا۔ وہ ان ملاقاتوں اور بے کاری باتوں سے آٹا پکا

اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ گھنٹوں کھڑے ہو کر باتیں کرتے رہنے کا مطلب کیا تھا۔ اسی

سے وہ بار بار ایلی کو کہتا رہا۔

”ایلی یار کچھ کرنا چاہئے اگر ہم کسی طرح اس دروازے کو کھول لیں جو باہر گلی میں کھتا

تو اندر جا سکیں گے۔“ ایلی کو یہ تجویز ناپسند نہ تھی۔ لیکن وہ اس کے لئے بہت ہی نا

در حقیقت دل ہی دل میں ایلی ان لڑکیوں کے قرب سے ڈرتا تھا۔ اس کی وجہ غالباً اس کا

کمتری تھا جو عورت سے متعلق اس کے دل کی گمراہیوں میں جا گزین ہو چکا تھا۔ شاید اس کا

سے وہ جمال کے اس مطالبے کو ٹالتا رہا۔ لیکن آخر کار اسے جمال کی بات ماننا ہی پڑی۔

ایک روز گوریوں سے ملاقات کے اختتام پر وہ دونوں وہاں رک گئے۔ انہوں نے مل جل

کر تالے کی ساخت کو بغور دیکھا اور لیوروں کی تعداد معلوم کی اور بالا خر موم کے ایک کلو

جو وہ جاتے ہوئے ہمراہ لے گئے تھے تالے کے سوراخ کا نقش حاصل کر لیا۔

اس روز وہ دونوں بازار میں تالوں کی دوکانوں پر گھومتے رہے اور انجام کار دیے

تالے خرید کر لے آئے۔ اگلے روز ملاقات کے بعد انہوں نے وہ چاروں چابیاں اس لئے

آزمائیں خوش نصیبی سے ایک چابی لگ گئی اور تالہ کھل گیا۔ انہوں نے کٹڈی کھلا

دروازے کو کھولنے کی کوشش کی مگر اندر سے چٹنی لگی ہوئی تھی۔

”اب کیا ہو گا۔“ جمال کہنے لگا۔ ”ساری محنت اکارت گئی۔ اگر ہم نے تالہ کھول دیا

”لو اس میں کیا ہے۔“ اندر کوئی بولی اور پھر چنٹی کھولنے کی آواز سنائی دی اور پھر اس نے کہ وہ اسے پھر سے بند کر لیتیں جمل نے دروازے کو دھکیل کر کھول دیا۔ دروازہ کھلا دیکھ کر دونوں چنٹیں مار کر بھاگیں اور ایک دوسری پر گرتی پڑتی نظر سے غائب ہو گئیں۔ سلسلہ وار کھانے کے پیچھے وہ جگہ جسے وہ کمرہ سمجھتے تھے درحقیقت زینے کا نچلا حصہ تھا۔

سامنے ایک دروازہ عمارت کے اندر کھلتا تھا۔ دوسری طرف زینہ تھا۔ جس میں گورنر کا کباڑ بھرا ہوا تھا۔ ٹوٹی ہوئی میزیں کرسیاں کھوکھے اور جانے کیا کیا۔ دوسرے کونے میں اندر دروازے کے پاس دو پاٹ رکھے ہوئے تھے۔ کمرے کی چوڑائی چار فٹ سے زیادہ نہ تھی۔ اگلے روز دروازہ کھولنے کا جھگڑا از سر نو شروع ہو گیا۔ آخر میں وہ جلال میں آگیا۔ ”دیکھئے صاحب۔“ ایک بولی۔ ”ہمیں دروازہ کھلنے میں کوئی عذر نہیں آپ شوق سے ٹکرائیں لیکن۔۔۔“ ایلی نے اس کی بات کٹ کر کہا ”اگر اس لیکن کی وضاحت ہمیں اندر بلانے کے بعد کی جائے تو بہتر ہو گا۔“

جب دروازہ کھلا اور وہ اندر داخل ہو گئے تو وہ نہایت سنجیدگی سے کہنے لگی۔ ”دیکھئے ملکہ ہے آپ ہمارے متعلق کسی غلط فہمی میں مبتلا ہوں۔ شاید آپ یہ سمجھ بیٹھے ہیں کہ آپ کی ملاقات کی دعوت دینے سے ہمارا کچھ مقصد ہے۔ یہ خوش فہمیاں دل سے نکال دیجیے تو بہتر ہو گا اور اگر آپ نے کوئی نامناسب حرکت کی تو ہمیں بے حد دکھ ہو گا۔“

”ذرا پیچھے ہٹ جائیے محترمہ مجھے بو آتی ہے۔“ ایلی نے کہا۔ یہ کہہ کر وہ زمین پر جھک گیا۔ ”ہو۔“ وہ بولی۔ ”نہیں یہ پاٹ تو خالی پڑنے ہیں۔“

”نہیں پاٹ والی بو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن ہم نے کوئی خوشبو تو لگا رکھی ہوئی نہیں۔“ ”لگائی ہو یا نہ بہر صورت آتی ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ کی ساری قوم سے آتی ہے۔“ ”بڑے بد تمیز ہیں آپ۔“ وہ ہنسی

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”الٹا مجھے آپ سے شکایت ہے کہ آپ ضرورت سے زیادہ باتیں ہیں۔“

عین اس وقت جمل نے دیا سنائی سے موم بنی جلائی جو وہ اپنے ساتھ لایا تھا اور پھر لے کرے کے پرلے کونے میں رکھ دیا۔

”ارے۔“ وہ چلائیں۔ لیکن جلد ہی سنبھل گئیں۔ ”تو آپ شکل و صورت دیکھنا چاہتے ہیں۔“ ”کچھ دیر تک وہ خاموش رہتی تھیں۔“

”میں رہیں۔ پھر ایک بولی۔“

”میں بند ہے آپ کو۔“

”میں بند ہے آپ کو۔“ ایلی نے انداز میں اتنی طعنتی کہ ایلی پر گھڑوں پانی پڑ گیا۔ لیکن جمل نے جا رہا تھا۔ ”میں بند ہے آپ کو۔“ ایلی بولا۔ ”معموم اور پاکیزہ چٹ کپڑیاں بڑی خطرناک ہوتی ہیں۔“ ”کیس بہتر ہیں جو آنکھیں منکاتی ہیں لپاتی ہیں شرماتی ہیں اور کولھے۔۔۔“

”میں اس سے کہیں بہتر ہیں جو آپ کا۔“ وہ بولی۔

”مطلب یہ ہے محترمہ کہ کم از کم مجھے باہر نکل دیا جائے۔ میرا تو یہ خیال تھا کہ اندر میری رہائش باہر کی نسبت بہتر ہو جائے گی۔ لیکن یہاں آکر تو اپنی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ بہت ممل خطرناک ہو گئی ہے۔“

”تو خود ہی باہر نکل جائیے۔“ وہ جلال میں بولی۔

”خود نکلنے کوئی نہیں چاہتا۔“ ایلی نے کہا۔

”پہلے کہہ کر وہ آگے بڑھی۔“

”نہیں نہیں نہیں۔“ ایلی نے شور مچا دیا۔ ”خدا کے لئے مجھے چھوٹا نہیں میرا دل پہلے بکھرا ہے۔“

”فانس پڑی۔“ آپ بھی عجیب ہیں۔ لیکن آپ انہیں تو بات کرنے دیتے ہی نہیں آپ لاکھ بات کیجئے۔“ اس نے جمل کو مخاطب کر کے کہا۔

”جمل من میں تو۔۔۔“ جمل نے آگے بڑھتے ہوئے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”ذہن سے بات کیجئے۔“ وہ بولی اور خود پیچھے ہٹ گئی۔

”ملی ٹری“

اس روز روشنی میں ایلی نے پہلی مرتبہ انہیں دیکھا۔ شکل و صورت طبیعت اور انداز میں جمل ایک دوسری سے مختلف تھیں بڑی کا چہرہ کتابی قنائتوش ستواں تھے۔ جسم دھاپلا موٹی لہلہ آنکھوں میں غم کی جھلک ہونٹ پتے اور یوں بیٹھے ہوئے تھے جیسے کراہ دبائے ہوئے لہلہ لہلہ کا چہرہ جسم اور زندگی سے بھرپور تھا اس کا جسم بھرا بھرا تھا۔ ہونٹ یوں کھلے ہوئے تھے کہ لہلہ لہلہ سن کے بیٹھی ہو۔ بڑی خاموش تھی نہ تو وہ کھیل کی متنی تھی نہ اس میں کوئی صلاحیت تھی چھوٹی میں جلال اور جمل کی عجیب آمیزش تھی دفعتاً۔۔۔ ہنستے ہنستے

وہ سنجیدگی اختیار کر لیتی اور پھر جلد ہی آپ ہی آپ ہنسنے لگتی۔ ان دونوں کے لبوں پر مسکراہٹ بظاہر سنگار سے عاری تھیں۔

”آپ بیٹھ کیوں گئے۔“ چھوٹی نے کہا۔ ”اٹھ کر کوئی بات کیجئے۔“

”اونسوں۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”بہل جمل کی باری ہے۔“

”انہیں تو صرف ایک ہفتہ آتی ہے۔“ چھوٹی نے کہا۔

”وہ بھی سن لیجئے کیا حرج ہے۔ جب تک میری باچھیں ٹھیک ہو جائیں گی۔“

”باچھیں ٹھیک ہونے کا مطلب؟“

”محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”بول بول کر میری باچھیں دکنے لگی ہیں۔“

”ارے۔“ وہ دونوں ہنسنے لگیں۔

”میں گھٹوں کا رہنے والا ہوں محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو کبھی کبھار عید شب بزلت کا

بولتے ہیں۔ یا جب کبھی غصہ آجائے۔ آپ سی ایلر، زمان کو ملنے کا مجھے موقعہ نہیں ملا گی۔“

ازراہ مذاق وہ پختلی میں کہنے لگا۔

”ہن مینوں سلہ لے لین دیو۔“

”لے لو جی سلہ ڈھڈ بھر کے۔“ وہ ٹھیکہ پختلی میں بولتے ہوئے ہنسی۔

”ارے۔“ ایللی اٹھ کر حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگا۔ ”پختلی؟“

”ٹھیکہ — پختلی۔“ وہ بولی

”پختلی فارسی اردو انگریزی — یا اللہ۔“ ایللی مسخروں کی طرح منہ بنا کر چلا۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“ دفعتاً وہ غصے میں چلائی۔ ”بہل صاحب ایسا فضل

نہ کیجئے۔“

”میری جان۔“ بہل بولا۔ ”میں کیا کروں میں مجبور ہوں۔“

”چلو باجی چلیں۔“ اس نے بڑی بہن سے کہا۔ ”چلو۔“

”خدا کے لئے۔“ بہل چلایا۔ ”میں تباہ ہو جاؤں گا۔“ اور پھر دھڑم سے زانو

گر پڑا۔

”ارے۔“ ایللی اس کی طرف لپکا۔ ”یہ کیا کر رہے ہو؟“

”دیکھئے۔“ چھوٹی بیڑھیاں چڑھتے ہوئے بولی۔ ”جب یہ ہوش میں آجائیں وہ انہیں

سے اٹھا کر لے جائیے گا۔ خدا حافظ۔“

دہل جاتے ہوئے ایللی نے بہل سے کہا۔ ”یہ کیا کیا تم نے۔ سارا کیا کر لیا تباہ کر دیا۔“

بہل تھکے مار کر نہلا۔ ”یار ایللی یہ لڑکیاں یونہی کیا کرتی ہیں۔ تمہیں کیا خبر۔“

”بہل۔“ ایللی نے چڑ کر کہا۔ ”وہ ایسی باتیں پسند نہیں کرتیں۔“

”نہیں یار۔“ ایللی نے پہلی مرتبہ ایللی کے خیال سے اتفاق نہ کیا۔ ”تم اس

فانسی ظاہر کیا کرتی ہیں۔“ بہل نے ایک بار احتجاج کریں گی پھر۔ ”وہ معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔

”اے نہیں سمجھتے۔ دو ایک بار احتجاج کریں گی پھر۔“ وہ معنی خیز انداز میں ہنسنے لگا۔

ایللی کو فضا آ رہا تھا لیکن وہ خاموش رہا۔

”تھک رہی۔“ وہ بولا۔ ”آخر یہ ساری رچنا تمہاری ہی رچائی ہوئی ہے۔“

”جی تو۔“ بہل بولا۔ ”اس معاملے میں تم دخل نہ دو۔ بس دیکھتے جاؤ۔“

نہن دان گزر گئے نہ تو گوریوں نے خط لکھا اور نہ انہوں نے رات کے وقت انہیں بلایا۔

بہل گہرا گیا اور اس نے از سر نو برساتی سے انہیں دیوانہ وار اشارے کرنے شروع کر

دے دیے۔ بہل کو دیکھ کر وہ ہنسنے جاتیں اور جب وہ رات کی ملاقات کے لئے اشارہ کرتا تو نفی میں سر

نہی۔

نہرے روز ان کا ایک لمبا چوڑا خط موصول ہوا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ جب تک آپ

نہن نہ دلائیں گے کہ مجھوڑی اور فحش حرکات کے مرتکب نہ ہوں گے ملاقات نہیں ہوگی۔

اپ کے دست آسکتے ہیں۔ بشرطیکہ وہ ہمیں یقین دلائیں کہ وہ آپ کو ساتھ نہیں لائیں

۔

”ایلی۔“ بہل نیم چھتی میں بیٹھ کر کہنے لگا۔ ”یار تم مجھے چھپا کر ساتھ لے چلو میں صرف

بہل سے ملنا چاہتا ہوں۔“

”نہن یقین کیوں نہیں دلا دیتے کہ تم ایسی حرکت نہ کرو گے۔“

”مگر حرکت نہ کرنی ہو تو پھر راتوں کی نیند حرام کرنے کا فائدہ۔“ وہ بولا۔

”دونوں اس موضوع پر سارا دن بحث کرتے رہے۔ بہل چاہتا تھا کہ ایللی اکیلا آنے کا

نہن کر ساتھ اسے لے جائے۔ لیکن ایللی کو یہ بات منظور نہ تھی۔ آخر بہل کو ایللی کی بات

پہنچا اور انہوں نے ایک مختصر خط میں انہیں یقین دلانے کی کوشش کی کہ کوئی ایسی حرکت نہ

کرے۔

اس ملازمت کی مرتبہ ایللی کا جی چاہا وہ اپنی طرف سے بھی ایک رقعہ لکھے۔ نہ جانے کیوں

اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کچھ کہے۔ ایسی بات کہے جو تاروں کو چھیڑ دے ایسی بات جو کہیں رہی ہو اور بھی کچھ کہہ دے۔ اسے اس بات کا شعور نہیں تھا کہ کیا کتنا چاہتا ہے ایللی نے پہلی مرتبہ یہ خواہش محسوس کی کہ وہ جمل کو نہ بتائے بلکہ چپکے سے رقم دے اور جمل کو علم بھی نہ ہو۔ چونکہ شعوری طور پر اس کا کوئی خاص مقصد نہ تھا اس نے یہ سوچ کر اپنے آپ کو مطمئن کر لیا کہ یہ تو محض چھیڑ چھاڑ ہے۔ لیکن دراصل اس نے چھیڑ چھاڑ کے بدلے وہ اس محفل میں اپنے لئے ایک مقام پیدا کر رہا تھا۔ اور جان بوجھ کر بات کرتا تھا۔ ایسا انداز اپناتا تھا۔ جس سے جمل اور ایللی کا فرق نمایاں ہو۔ دونوں کا جواب دے۔ ایللی نے کبھی اپنے آپ کو اس سلسلے میں مورد الزام نہ ٹھہرایا تھا نہ ہی اس نے سہا وہ چلائی سے اپنے دوست کو بھونڈی شکل میں پیش کر رہا ہے۔ اس کی ایسی حرکت اور باتوں کا مقصد کیا تھا یہ اسے خود بھی معلوم نہ تھا۔ شاید وہ گوریوں سے انتقام لے رہا تھا۔ نے اس پر ناقابل التفات کا لیبل لگایا تھا۔ جو تسخیر سے اس پر ہنسی رہی تھیں یا شاید اس وجہ ہو کہ ان کی رنگین باتیں سن کر ان کی خود داری اور ذہنی عظمت کو محسوس کر کے وہ ان سے محبت کرنے لگا تھا۔

جب جمل خط نقل کر کے چوبارے میں چلا گیا تو ایللی اپنا رقعہ لکھنے کے لئے بیڑی لے چار ایک سطور لکھیں۔ لیکن دوبارہ پڑھنے پر اس نے محسوس کیا کہ وہ سطور بے معنی تھیں اس نے وہ ورق پھاڑ دیا اور پھر بے لکھنے لگا۔ لیکن سات آٹھ الفاظ لکھنے کے بعد اس نے پھر محسوس کیا کہ مضمون تاثر سے خالی ہے۔

گھڑی نے ایک بجایا اور ابھی وہ اپنا رقعہ مکمل نہ کر پایا تھا۔ یہ پملا دن تھا جب ایللی نے انہیں خط لکھنا مشکل ہو رہا تھا۔ حالانکہ وہ انہیں سوچے سمجھے بغیر بیسیوں خط لکھ چکا تھا۔ خطوں پر اسے سوچنا ضرور پڑتا تھا۔ لیکن اس نے کبھی لکھے ہوئے خط کو پھاڑا نہ تھا۔ کبھی نہ کیا تھا کہ خط کا مضمون تاثر سے خالی ہے۔ شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ پملا دن تھا جب ایللی گوریوں سے لگاؤ محسوس کر رہا تھا۔ اگرچہ اسے اس لگاؤ کا شعوری احساس نہ تھا۔ ڈیڑھ بجے کے قریب ایللی نے محسوس کیا کہ جو کچھ بھی وہ کہنا چاہتا ہے اسے لکھنا نہیں لایا جا سکتا اس لئے اس نے صرف ایک سطر لکھ کر ایک چھوٹا سا پرزہ جمل کے سامنے رکھ دیا۔ لکھا تھا۔

”اب نہ ملے محترمہ! اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔ جب سے آپ سے خط لکھا

میں نے اپنا ہونے کا سلسلہ مسدود ہو جائے ورنہ —“ ایللی کا وہ دن رنگ لایا اگلے روز دوران ملاقات جب ایللی نے کہا۔ ”اللہ کرے اب کی بار اس قدر بلاؤں ہو چاہوں کہ ملاقاتوں کا امکان ہی ختم ہو جائے۔“

”میں؟“ بڑی نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ ایللی نے کہا۔ ”کتنے سادہ لوح ہیں ہم کہ آگ سے کھیلنے کے لئے گھر میں تکلیف ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”جمل کر آتے ہیں۔“

”میں؟“ ایللی نے کہا۔ ”اور —“

”اب ملاقات کی ہمت نہیں رہی۔“ ایللی نے کہا۔ ”اور —“

”میں؟“ بڑی نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ ایللی نے کہا۔ ”کتنے سادہ لوح ہیں ہم کہ آگ سے کھیلنے کے لئے گھر میں تکلیف ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”جمل کر آتے ہیں۔“

”میں؟“ بڑی نے پوچھا۔ ”آپ کو کیا تکلیف ہے؟“ ایللی نے کہا۔ ”کتنے سادہ لوح ہیں ہم کہ آگ سے کھیلنے کے لئے گھر میں تکلیف ہے۔“ ایللی نے کہا۔ ”جمل کر آتے ہیں۔“

”ہر مظلوم آدمی پہلے چلاتا ہے پھر خاموش ہو جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ہلکی سی ہنسی آئی پھر خاموشی طاری ہو گئی۔ ایلی کے سر پر کسی نے ہاتھ رکھ دیا۔ پھر اس نے محسوس کیا کہ اس کے قریب ہی سلپروں میں نیم چپے پہاڑوں کے ہیں۔ وہ جھک کر پاؤں دیکھنے لگا۔ اس نے پاؤں کو چھوا۔

”یہ کیا کر رہے ہیں آپ؟ آپا چلائی۔“
”مجھے خزانہ مل گیا ہے اسے کھود کر نکال رہا ہوں۔“ وہ بولا۔

وہ ہنسی۔ ”یہ زمین پر بیٹھنے کا کیا مطلب ہے؟“ وہ بولی۔ ”آپ تو سرا سر جٹ ہیں۔“ ایلی نے اس کی بات کا جواب نہ دیا بلکہ پاؤں سلپروں سے نکال کر ہاتھوں میں قلم لیا۔ ”میرا پیر تو چھوٹیے۔“ آپا چلائی۔

”لوہ — میں سمجھا میرا پاؤں ہے۔“ وہ بولا
آپ کی زبان قاتل قطع ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”ٹھیک ہے رنگ روپ اللہ نے نہیں دیا۔ رہی سہی ایک زبان ہے وہ آپ کا لہجہ وہ ہنسی۔ پھر خاموشی چھا گئی۔

”آج جمل صاحب نے اپنی بات نہیں دہرائی۔“ آپا نے کہا۔
”دہرا رہے ہیں۔“ ایلی نے کہا۔
”کیا مطلب؟“ وہ بولی۔

”دہرا رہے ہیں مگر منہ زبانی نہیں آج انہیں اپنا مقام مل گیا ہے۔“
آپا قہقہہ مار کر ہنسی۔ ”ابھی تو انڈر کانسٹیبل ریشن ہوں۔“

اس روز کمرے کی خاموشی بے حد شکم تھی۔ اس خاموشی میں نہ جلنے کیا کیا ہو ہاتھ کوئی ہاتھ ایلی کے بالوں کو تھپک رہا تھا۔ منہ کو سہلا رہا تھا۔ کمرے کے دوسرے کمرے پر ہی سی آوازیں پیدا ہو رہی تھیں۔ عجیب سی گھٹن محسوس ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے ہاتھ کا جھنجھٹا ہو اور اس اضطراب سے نجات پانے کے لئے جی چاہتا تھا کہ دو واں کھول کر باہر نکل جائے اور جلتے ہوئے کے۔ ”مخترمہ ظلم کی حد ہوتی ہے۔“

اس روز جب وہ ناؤ گھر لوٹ رہا تھا تو پہلی مرتبہ اس کے دل میں کچھ ہو رہا تھا اس دن پہلی مرتبہ وہ بے تعلق فاتح کی حیثیت سے نہیں لوٹ رہا تھا۔ بلکہ جیسے اس کا کچھ حصہ وہاں رہا تھا۔

بچہ میں رہا تھا۔ دل میں کچھ کچھ ہو رہا تھا۔ دل کے تاروں کو کوئی چٹا سفید گدگد ہاتھ چھیڑ رہا تھا۔ جسم کے اندر رہے تھے۔ اس روز اسے یہ بھی یاد نہ رہا تھا کہ اسے جمل کے برتاؤ کی یہ خبر تھی۔ جیسے واپسی پر وہ روز کیا کرتے تھے۔ بلکہ اس روز وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ جمل کے ساتھ تھا۔ جب جمل نے بات چھیڑی تو ایلی تو وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اس کھیل کا ہیرو وہ ہے نہ جمل ہو۔ جب جمل نے اپنی حیثیت کوئی نہیں۔

جمل نے اور اس کی اپنی حیثیت کوئی نہیں۔
”یار میں تو بھولا ہی رہا۔“ جمل نے ایلی کے شلے پر ہاتھ مار کر کہا۔
”ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہی وہی دل تو بہت ہی اچھی ہے۔ کیا کہتے ہیں اسے ہاں بائی؟ اور وہ آپا وہ تو ظالم کچھ کرنے لائیں دیتی تھی اور میں بھی ایسا ہیوقوف ہوں کہ میں نے کبھی بائی کی طرف توجہ ہی نہیں کی تھی۔“

”ہوں۔“ ایلی اپنے خیال میں گمن تھا۔
”وہ اتنی چیز نہیں اور وہ چھوٹی آپا تو پولیس کی افسر مظلوم ہوتی ہے!“
”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”تم نے ٹھیک کہا تھا۔“ جمل نے ہنسنے ہوئے کہا۔
”ہاں؟“

”کہا تھا میرے بارے میں کہ آج اسے اپنا مقام مل گیا ہے۔ یار تم بات دیکھے بغیر بھانپ لیتے ہو۔“

”میں نے تو دیے ہی بکواس کی تھی۔“
”لیکن یار۔“ جمل بولا۔ ”خدا کے لئے وہاں ایسی بات نہ کیا کرو۔“
”کیوں؟“

”تمہاری بات سن کر وہ پیچھے ہٹ گئی اور پھر دیر تک —“ وہ ہنسنے لگا۔
”تو مبارک ہو۔“ ایلی نے کہا۔ ”تمہاری بات بن گئی نا؟“

”ہاں تو نہیں بنی۔“ وہ بولا۔ ”یار یہ دونوں عجیب لڑکیاں ہیں کسی کو قریب آنے نہیں دیتے۔ میں نے ایسی لڑکیاں آج تک نہیں دیکھیں۔“
”کیسی دیکھی ہیں؟“ ایلی نے بے توجہی سے پوچھا۔

جمل نے قہقہہ مار کر ایک بھر پور ہاتھ ایلے کے شانے پر مارا۔ ”یار لڑکیاں تو چمتو ہیں جھینپی بھی ہیں، لچاتی بھی ہیں، نہ نہ بھی کرتی ہیں، لیکن ساتھ ہی چٹی بھی جالی جڑی۔“ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

”اچھا!“ ایلے بولا۔ ہمیں بھی پتہ چتا کسی ایسی لڑکی کا۔“

”مذاق نہ کرو یار۔“ جمل بولا۔ ”یہ بات بھی خاموش لڑکی ہے اور نہ نہ کرتے ہوئے بہت کچھ برداشت کر لیتی ہے۔“

”تو یار۔“ ایلے نے نہ جانے کس خیال سے کہا۔ ”کل ہم اپنی اپنی جگہ بدل نہ لیں۔“

”نہ نہ نہ۔“ وہ شور مچانے لگا۔ ”آپا تو مجھے ڈانٹنے کی۔“

”مجھے تو نہیں ڈانٹنی۔“ ایلے نے کہا۔

”تمہاری بات اور ہے۔“ وہ بولا۔

”وہ کیسے؟“

جمل ہنسنے لگا۔ ”برانہ ماننا۔ تمہیں دونوں ہی پسند نہیں کرتیں اس لئے۔“

”چلو یہ بھی اچھا ہے۔“ ایلے بولا۔ ”جان چنی لاکھوں پائے۔“

یہ باتیں ایلے شاید اس لئے کر رہا تھا کہ وہ بات کو راز بنا کر محفوظ کر لیتا چاہتا تھا۔ اس کا راز بتانا بذات خود اس بات کا شاہد تھا کہ وہ آپا سے تعلق محسوس کرنے لگا تھا وہ نہیں چاہتا تھا کہ جمل کے رویہ کوئی ایسی بات کرے جس سے آپا پر حرف آئے۔

اس روز ایلے سارا دن مضطرب رہا۔ وہ پہلا دن تھا جب اس نے اس کھیل کو اہمیت دے تھی۔ ان کیفیات کے متعلق سوچ رہا تھا۔ جو اس نے سفید منزل کے زینے میں محسوس کی تھیں۔ اس روز وہ ایک لفظ بھی نہ پڑھ سکا۔

شام کو جب وہ دونوں ٹیم چھٹی میں بیٹھے تھے تو نیچے سے بھا آیا۔ ”یہ تمہارا گدہ ہے“ نے تار جمل کی طرف بدھلتے ہوئے کہا۔ ”تمہاری بیوی بیمار ہے تمہیں بلایا ہے۔“ لیکن یار۔“ نے حیرت سے کہا۔ ”تم شادی شدہ ہو جمل یہ مجھے آج ہی معلوم ہوا؟“

”کئی لوگوں کو اب تک معلوم نہیں۔“ ایلے نے با معنی انداز سے کہا۔

جمل تار پڑھ کر اٹھ بیٹھا۔ اس کے چہرے کی حالت بدل گئی۔ ”یار مجھے جانا ہوا۔“ کوئی گاڑی جاتی ہے اس وقت؟“

”لیکن گھبرانے کی کوئی بات نہیں، بیماری عام سی معلوم ہوتی ہے۔“

”نہیں یار۔“ جمل بولا۔ ”مجھے اپنی بیوی سے بڑی محبت ہے۔“ اس کی آنکھیں پر نرم

خیمہ گاڑی میں بیٹھ کر پہلی مرتبہ جمل کو خیال آیا کہنے لگا۔ ”یار ایلے تم تو شاید اب ان سے ملنے کے لئے۔“ لیکن ایک مرتبہ تو جانا ہی پڑے گا ضرور جانا کہیں ان سے یہ نہ کہہ دیتا یار کہ بیوی پار ہے بلکہ کہنا والدہ کی بیماری کا تار آیا تھا یار انہیں یہ معلوم نہ ہو کہ میں شادی شدہ ہوں۔“

ہولڈ اپ

رات کو جب گوریوں نے دیکھا کہ ایلے اکیلا ہی آیا ہے تو باتی بولی۔ ”وہ کہاں ہیں؟“ ”مے گاؤں جانا پڑا“ ایلے نے انہیں تار کے متعلق بتایا۔ پھر وہ باتوں میں مصروف ہو گئے۔ ”دل اس کے دائیں بائیں آکھڑی ہو گئی۔“ ”یہ بات تو غلط ہے۔“ اس نے شور مچا دیا۔ ”آپ دو اور میں اکیلا۔“ دونوں نے اس کے ٹانگوں پر ہاتھ رکھ دیے۔

”ہاتھ لگانا فاول ہے۔“ وہ چیخنے لگا۔ پھر اسے دفعتاً ”سو جھی“ ڈیکھیے جی۔“ وہ بولا۔ ”شاید آپ نے میرے متعلق کوئی خوشی غمی پال رکھی ہو۔ شاید آپ سمجھے بیٹی ہوں کہ ملاقات سے برا لگی خاص مقصد ہے میرانی سے یہ خیال دل سے نکل دیں۔“ ”انتقام لینے میں تو آپ کا جواب نہیں۔“ آپا ہنسنے لگی۔

”نہیں نہیں انتقام کی بات نہیں۔ ابھی کل کی مصیبت سر سے نہیں ٹلی۔“

”کل کی مصیبت کیا؟“ انہوں نے پوچھا۔

”کل رات کسی کی لاپرواہی سے ایک خوشبو دار رنگین ہاتھ میرے چہرے سے چھو گیا تھا یا شاید کسی نے شرارت کی ہو۔ ایمان سے ابھی تک جھنجھٹا ہوا ہوں۔ اصل میں میرا دل بہت کھو رہا ہے اور مجرمہ شاید آپ کو معلوم نہیں میں اپنی ماں کا اکوٹا بیٹا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ زمین پر گر پڑا۔

”یہ کیا کرتے ہیں آپ؟“ وہ چلائیں۔ ”زمین پر بیٹھ جاتے ہیں اس طرح۔“

”آپ نے بددقیق جو اٹھا رکھی ہیں۔“ کوئی تو پتہ نہیں دیتا رہتا ہوں۔“

”بددقیق۔“ کون سی بددقیق۔“ ”پڑی لے پوچھا۔“

”جو آپ نے بظنوں میں دبا رکھی۔“ ایلے رک گیا۔

”چپ چپ۔“ چھوٹی چلائی۔ ”آپ بھی غضب کرتے ہیں۔“
”لیکن —“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

اندھیرے میں پھر وہی ہاتھ اس کے منہ پر آٹکا۔
”جھن جھن جھن جھن۔“ وہ شور مچانے لگا۔

”کیا ہوا؟“ باقی نے پوچھا۔ آپا نے چپکے سے ہاتھ اٹھالیا۔
”جھنجھنا بن گیا ہوں۔ مجھے بچائیے۔ خدا کے لئے مجھے کوئی بچائے۔“
دیر تک وہ ہنستی رہیں۔ پھر کسی نے چپکے سے اسے چنگلی بھری۔
”تمہارے گھر میں آیا ہوں جو جی میں آئے کر لیجئے اور پھر آج ہی کا تو دن ہے۔“
”کیوں؟“ آپا بولی۔

”میں تو صرف یہ پیغام دینے آیا تھا کہ جمل نہیں آسکے گا کچھ روز کے لئے۔“
”لیکن آپ تو آئیں گے نا؟“ چھوٹی نے پوچھا۔

”آئے گا مطلب؟“ ایلی نے کہا۔

”تو کیا آنے کا کوئی مطلب نہیں؟“ آپا بولی۔

آپا نے چنگلی بھری اور بولی۔ ”آپ ہی بتائیے۔“

”میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ میری حیثیت کھانے میں ٹمک کی سی ہے۔ کھانا نہ ہو تو خالی ٹمک پھانکنا ہے۔“

وہ خاموش ہو گئیں۔ ”اب آپ سے کون بحث کرے لیکن آپا پڑے گا روز آپا پڑے گا۔“
”آپ ورنہ۔“

”ورنہ کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”ورنہ کیا بتایا نہیں جاتا عمل میں لایا جاتا ہے۔“ آپا ہنسی۔

اس وقت اوپر سے ایسی آواز آئی جیسے کسی نے بڑا سا برتن دیوار سے دے مارا ہو۔

”یہ کیا تھا باقی؟“ آپا نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“ باقی نے کہا۔ ”میں دیکھتی ہوں ابھی آئی۔“ کہہ کر وہ دبے پاؤں پڑھیلیا

چڑھنے لگی۔

ایلی باہر کھڑکی سے جھانک رہا تھا کہ باہر تو کوئی نہیں۔

دفعتاً آپا نے پیچھے سے اسے اپنی آغوش میں لے لیا۔

”ارے۔“ ایلی چلائی۔

”خاموش کھڑے رہئے۔“ آپا ہنس کر بولی۔

”لیکن یہ کیا ہے۔“ ایلی نے بھولے بن کر کہا۔

”کچھ نہیں صرف آپ کو آنے کا مطلب سمجھا رہی ہوں۔“

”لیکن میں تو کچھ بھی نہیں سمجھ رہا۔“ ایلی نے کہا۔

”یہ اور بھی اچھا ہے۔“ وہ بولی۔

”مجھے تو ایسے معلوم ہو رہا ہے جیسے اپنا ہولڈ اپ ہو گیا ہو۔ لیکن میری کمر میں دو پستول کی
پلیں رکھے کا مطلب؟“

”خاموش۔“ وہ ہنستے ہوئی بولی اور اس نے اپنے دونوں ہاتھ ایلی کے منہ پر رکھ دیئے۔

دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

پھر بیڑیوں سے باقی کی آواز سنائی دی۔ ”آپا جلدی آؤ۔ جلدی!“

اس نے ایلی کو زور سے بھینچا۔

”کل ضرور آئیے گا۔“ وہ بولی۔ ”ضرور۔“

”اور اگر نہ آؤں تو؟“ ایلی نے کہا۔

”کیسے نہ آئیں گے آپ۔“ وہ بولی۔ ”نہ آئے تو میں خود ناؤ گھر آؤں گی۔“

”اتنی جرات۔“ ایلی نے کہا۔

”میں سے بھی زیادہ۔“ وہ بولی۔ آپ نے سمجھا کیا ہے؟“

”میں تو صرف یہ سمجھتا ہوں کہ ایک خوبصورت شوخ رنگین اور دست دراز لڑکی —“

”دست دراز۔ اچھا تو یہ لیجئے۔“ اس نے پیار سے ایلی کے منہ پر چپت ماری۔ ”ضرور آئیے
اور پھر بیڑیاں چڑھنے لگی۔ ایلی نے لپک کر اس کا دہنہ کھینچ لیا۔

”کیا بد تمیزی ہے؟“ وہ بولی۔

”تمہاری نہیں ضرورت ہے میں اس کے رومل بناؤں گا۔“

”مہیلا۔“ وہ ہنسی۔ ”تو بنا لیجئے۔“ اور بیڑیوں میں گم ہو گئی۔

ملاوطن ایلی سوچتا رہا اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ وہ رومان کا کھیل جو تفریحاً شروع ہوا

تھا۔ یکدم کیسی کروٹ لے گیا تھا۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کون تھیں وہ تو ان کے پاس سے بھی واقف نہ تھا۔ اس نے کئی مرتبہ ان سے پوچھا تھا۔
 ”اپنا نام تو بتا دیجئے۔“ اور جواب میں انہوں نے کہا تھا۔
 ”نام سے کیا فرق پڑتا ہے، جی کچھ سمجھ لو۔“
 صرف یہ سمجھا ہوں کہ تم میں ایک ہل جی ہے اور ایک نہ جی اب یہ تم خود فیصلہ کرو کہ
 ہل جی کون ہے اور نہ جی کون۔“

سارا دن وہ سوچتا رہا تھا کہ اس ڈرامے میں جو سفید منزل کے زینے میں کھیلا جا رہا تھا اس کا کردار کیا تھا۔ وہ ان گوریوں کے کردار کا معترف تھا ان کی جرأت ان کی عظمت اور رعینہ ان کے ادبی ذوق پر متعجب تھا لیکن —؟
 ایللی اس لیکن کا جواب نہ دے سکتا تھا۔

نیم چھٹی میں لیٹے ہوئے اس طرف کھڑکی میں سے چھوٹی جھانکتی۔ ”لیجئے میں آگئی ہوں“ میں آگئی۔ آپ سے ملنے کے لئے نہیں دیے ہی۔“ اس کے چہرے سے عجب سی سرت لڑکی اور زندگی کا اظہار ہوتا تھا۔ ”آئیے آئیے آپ اواس کیوں ہیں؟ یوں لیٹے ہوئے ہیں۔ جیسے کسی کچھ ہار کر آئے ہوں۔ آپ نے کچھ بھی نہیں ہارا۔ جنہوں نے ہارا ہے ان سے پوچھئے۔“
 اس طرف زینے میں شہزاد اکھڑی ہوئی۔ اس کا چہرہ مغموم تھا۔ میں جانتی تھی۔ کیا انہم ہو گا اور ہو بھی کیا سکتا تھا۔ ہماری کمائی ہی ایسی تھی۔ جس کا انجام نہیں ہو سکتا چلو اچھا ہوا
 تمہیں مناسب ساتھ مل گیا۔“

ایللی گھبرا کر اٹھ بیٹھتا اور پھر سوچ میں پڑ جاتا۔
 گھڑی نے نو بجائے تو وہ چونکا اور پھر سوچے سمجھے بغیر اس نے پہلی بار محبت بھرا خط لکھا اور اسے پڑھتے وقت پہلی مرتبہ شدت سے محسوس کیا کہ اس کے دل میں کس قدر جذبات لٹ رہے تھے۔ خط لکھ کر اس نے اس کا گولہ سا بنا کر اپنی جیب میں ڈال لیا اور پھر لیٹ گیا۔
 اس رات جب وہ سفید منزل میں داخل ہوا تو اکیلی چھوٹی موجود تھی۔

”تم اکیلی ہو کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔
 ”ہاں۔“ وہ بولی۔ بائی کی طبیعت اچھی نہیں۔“
 نہ جانے کیوں یہ سن کر ایللی گھبرا گیا۔

”ہوں آپ ڈرتے ہیں۔“ وہ بولی۔
 ”ایللی نے کہا۔“ تم نہیں جانتی کہ میں تم سے کتنا ڈرتا ہوں۔ میں تمہارے حسن سے نہیں ڈرتا تمہارے جسم سے نہیں ڈرتا۔“ ایللی کی آواز بھرا گئی۔ ”میں تمہاری نگاہ کرم سے برا ہوں میں تمہاری رعینہ سے ڈرتا ہوں میں تمہاری جرأت سے ڈرتا ہوں۔“
 ”آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔“ وہ ہنسنے لگی۔
 ”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”جی باتیں عجیب معلوم ہوتی ہیں۔ ہم سچ سے اس قدر بیگانہ ہو چکے

ہیں۔“
 ”چھوڑیے ان فلسفوں کو۔“ وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر بولی۔ ”کوئی ہنسی خوشی کی بات کیجئے۔“
 ”آج مجھے جی باتیں کہہ لینے دو پھر شاید کبھی موقع نہ ملے۔“ ایللی کے انداز میں اس قدر ناز تھا کہ وہ خاموش بت بنے کھڑی رہی۔

”تم سمجھتی ہو کہ میں مسخرا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مسخر اپن تو خفت ملانے کے لئے تھا۔ میرے بل نہرے نہیں ناس لئے۔ میرا رنگ —“
 ”خاموش ہو جائیے۔“ وہ چیخ کر بولی۔ ”خاموشی ورنہ میں منہ پر ہاتھ رکھ دوں گی۔“
 ”منہ پر ہاتھ رکھنے سے دل کی بات تو نہیں نکلتی۔“ ایللی نے کہا۔
 ”ہم نہیں سنتے آپ کے دل کی بات۔“ وہ بولی۔
 ایللی نے اپنے دونوں ہاتھ اس کے شانوں پر رکھ دیئے۔
 ”اچھا نہ سنو۔“

دیر تک وہ دونوں خاموش کھڑے رہے۔

”کوئی بات کیجئے نا۔“ وہ چلائی۔

”کر تو رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”کہن آپ تو خاموش کھڑے ہیں۔“ وہ بولی۔

”یہ خاموشی بھی تو اک اظہار ہے۔“ وہ بولا۔ ”میرا منہ بند کر دو گی تو میرے ہاتھ بولیں گے۔“

”یہ تو سناکت پڑے ہیں۔“ اس نے ایللی کے دونوں ہاتھوں پر اپنے ہاتھ رکھ دیئے۔

”یہ اپنے ہاتھ اٹھاؤ۔“ وہ بولا۔

”کیوں؟“

”یہ مجھ سے باتیں کرتے ہیں اور پھر سارا دن گھر بیٹھے ہوئے مجھے ان کی باتیں یاد آتی ہیں۔“

”آج آپ کیسی باتیں کر رہے ہیں۔“ وہ چلائی اس کی آواز میں بلا کا اضطراب تھا۔ ”مگر کی تم پر بھی ایک ہی دن سوار ہے۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ چلائی۔

”جیسے سنہرے بالوں کے بارے میں کہتی تھی۔“ ایللی نے کہا۔ ”مجھ کو بھی ڈانٹ ڈھنک کر تات۔“

”نہیں تو۔“ وہ تڑپ کر بولی۔ ”آپ تو بڑے ہی اچھے ہیں۔ جمال صاحب کی بات اور ہے۔“

”وہ تو مجھے معلوم ہے۔“ ایللی نے طنز بھرا تیر چلایا۔

”ہائے اللہ کیا آپ مجھے کبھی معاف نہ کریں گے۔ جمال تو یہ سمجھتے ہیں۔ جیسے ہم دلاؤ ہوں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ ”اور وہ سوچتے ہیں کہ کس طرح منہ میں ڈال لوں۔ سگرت پکڑے آپ۔“ غالباً وہ بات بدلنے کے لئے کہنے لگی۔

سلگا سگرت

”ہاں۔“ ایللی نے کہا۔ ”بیوں گا بشرطیکہ تم سلگا کر دو۔“

”یہ کیا ضد ہے۔ آپ ہر مرتبہ یہی کہتے ہیں۔“

”ضد تو نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”درخواست ہے۔“

”یہ کبھی ہو سکتا ہے کیا؟“

”کیا نہیں ہو سکتا۔“ وہ بولا۔

”بہت زعم ہے آپ کو۔“

”جی ہے۔“

”تو پی کر دکھائیے وہ سگرت جو میں نے سلگایا ہو۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”مجھ سے ضد نہ کیجئے۔ میں بہت ضدی ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”بھیس۔“ وہ بولی۔

”چال۔“ وہ بیٹھ گیا۔ ”اب میں سے اس وقت اٹھوں گا۔ جب آپ کا سلگایا ہوا سگرت میرے ہاتھ میں ہو گا۔“

”چلے پونی سی۔“ وہ جوش میں آگئی۔ ”تو لیجئے میں چلی خدا حافظ۔“ یہ کہہ کر وہ بڑبڑاتی پڑنے لگی۔ ”اب بھی مان جاؤ ضد چھوڑ دو۔“ وہ بیڑھیوں سے بولی۔

”سگرت سلگا دیجئے۔“ ایللی نے کہا۔

کچھ دیر تک اس کے قدموں کی چاپ سنائی دیتی رہی پھر خاموشی چھا گئی۔ ایللی چپ چاپ بیٹھا رہا۔

پہلے تو اسے امید تھی کہ وہ ابھی لوٹ آئے گی۔ آخر وہ ان کے مکان میں بیٹھا تھا اور اس کا خط ان کے ذمہ داری تھی۔ اس لئے وہ اطمینان سے بیٹھا رہا۔ پھر آہستہ آہستہ اس کے دل میں شک پیدا ہونا شروع ہو گئے اگر وہ نہ آئی تو — اگر کوئی پاٹ استعمال کرنے کے لئے اس کمرے میں آگیا تو —

ایللی بنیادی طور پر بے حد ڈر پوک واقع ہوا تھا۔ لیکن کبھی اس کی زندگی میں ایسے موقعے بھی آتے تھے جب وہ نتائج سے لاپرواہ ہو کر اسی حد تک بڑھ جاتا تھا، جس حد تک بنیادی طور پر وہ ڈر پوک تھا۔

کچھ دیر تک وہ بے حد متذبذب رہا پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ وہ جانتا تھا کہ اگر اس روز وہ اپنی بات منوانے میں ناکام رہا تو آپا کے دل میں اس کے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور اس رنگین لڑکی کے دل میں اپنے لئے تحقیر کا جذبہ پیدا کرنے کی لئے وہ تیار نہ تھا۔ وہ اس بات سے غافل تھا کہ وہ کیا کہے گی۔ آہستہ آہستہ یہ ڈر حاوی ہوتا گیا فوراً کسی کے آجانے کا خوف دم بڑھ گیا حتیٰ کہ وہ وہاں یوں بیٹھا تھا جیسے سفید منزل نہیں بلکہ نیم چھتی ہو۔

ایک محض گزر گیا دو گھنٹے گزر گئے دور کسی مسجد سے پہلی اذان کی آواز سن کر وہ ٹھٹھکا کر اُسے وہ سوچنے لگا صبح ہو گئی۔ پھر چاروں طرف سے مؤذنوں کی آوازیں سنائی دینے لگیں۔ کلی محلہ دروازے کھلنے لگے۔ نمازیوں کے قدموں کی چاپ سنائی دے رہی تھی۔

دفتر قریب ہی پاؤں کی چاپ سنائی دی وہ ٹھٹھکا۔ پھر کسی نے دیا سلائی جلائی باجی کو قریب کمرے دیکھ کر وہ مطمئن ہو گیا۔

”یہ کیا حماقت ہے؟“ باہی نے کہا۔ ”آپ جانتے کیوں نہیں اگر کوئی آگیا تو۔“ اس نے خوف زدہ ہو رہا تھا۔

”ابھی چلا جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو پھر جائیں نا۔ آپ کو ہماری عزت کا خیال نہیں کیا؟“ وہ بولی۔

”سگرا کر سگرت پلا دیجئے تو ابھی چلا جاؤں گا۔“ ایللی نے کہا۔

”یہ کیا فضول سی ضد ہے؟“ وہ غصے میں بولی۔

”ہے کیا کیا جائے؟“

”لیجئے میں سگرائے دیتی ہوں سگرت۔“ باہی نے کہا۔

”اونسوں۔“ ایللی نے نفی میں سر ہلادیا۔

”کیوں میری سگلی ہوئی پسند نہیں؟“ اس نے عجیب انداز سے آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر

کہا۔

”تم نے ہمارا اعلان نہیں کیا“ وہ یوں بولا جیسے جتنی سستی یوگی ہو۔

”ہتے میں کیا کروں؟“ وہ چلائی۔ ”لوپر سادی ضد کئے بیٹھی ہے۔“

”سادی!“ ایللی نے دہرایا۔

”ہاں! گھر والے اسے سادی کہتے ہیں۔“ باہی نے کہا۔

”اور آپ کو مرصع کہتے ہوں گے؟“

”نہیں تو۔“ وہ ہنسی۔ ”مجھے تو باہی ہی کہتے ہیں۔ لیکن اب آپ جائیں گے بھی یا نہیں؟“

”کیا بچوں کی سی ضد ہے۔“

”بچے کبھی نہیں سمجھا کرتے۔“ ایللی نے کہا۔

”تو پیٹتے بھی ہیں۔“ وہ بولی۔

”پیٹنے کے لئے کوئی اور آئے گا۔“ وہ بولی۔ ”ہے کوئی آگیا تو سمجھ جا چوری۔“

”تو کہہ دینا ڈاکو ہے چور نہیں۔“ ایللی بولا۔

”خدا کے لئے چلے جائیں۔“ وہ فٹیں کرنے لگی۔

”سگرا ہو اسگرت، سگرا ہو اسگرت۔“ ایللی نے رٹ لگا دی۔

”مان جائیے۔“ باہی نے منت کی۔

”سگرا ہو اسگرت۔“ ایللی گویا وظیفے میں مشغول ہو گیا۔

جی آکر وہ چلی گئی اور ایللی تنہا رہ گیا۔

انٹا۔ اس کی نگاہ کھڑکی کی طرف پڑی۔ باہر صبح کی سپیدی پھیلی ہوئی تھی۔

اب اس کا ذہن قطعی طور پر مفقود ہو گیا تھا چونکہ اب عزت کا معاملہ تھا اور وہ بھی ایک

عزت کے دل میں۔ اس وقت وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ہر خطرے کا مقابلہ کر سکتا ہے۔ سفید

خون میں داخل ہو کر چلا چلا کر کہا سکتا ہے میں چور ہوں مجھے پکڑ لو۔ میں چور ہوں۔

قرب ہی کسی کھڑکی نے چھ بجائے۔ دفعتاً اسے یاد آیا کہ اس کی جیب میں محبت نامہ تھا

وہ لکھ کر گھر سے لایا تھا۔ جب وہ اس کی تلاشی لیں گے تو خط برآمد ہو جائے گا اور راز کھل

جائے گا اس میں گوریوں کی عزت کا سوال ہے۔ نہیں نہیں میں ان کی عزت پر آنچ نہ آنے

دلاں گا اس نے خط کا وہ گولہ جیب سے نکالا اور قریب پڑے کاٹھ کباڑ میں اسے چھپا دیا اور پھر

ملین ہو کر بیٹھ گیا۔

گھڑکی نے سات بجائے وہ اٹھ بیٹھا۔ کھڑکی سے سورج کی شعاعیں اندر داخل ہو رہی تھیں

ان نے کھڑکی بند کر دی اور درز سے باہر دیکھنے لگا۔ قبرستان سنسان پڑا تھا۔ گلی میں چند بچے

کھیل رہے تھے۔ پرلے بازار میں اکا دکا لوگ چل پھر رہے تھے۔ دیر تک وہ وہاں کھڑا دیکھتا رہا۔

پہاں کی آہٹ سن کر وہ مڑا زینے میں کوئی آ رہا تھا۔ وہ جھٹ آتی پانپتی مار کر بیٹھ گیا۔

اس کے رو برو سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”آپ بڑے ہٹ دھرم ہیں۔“ وہ بولی۔

”جو کچھ بھی ہوں حاضر ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

”اب آپ جائیں گے کس طرح؟“ سادی نے پوچھا۔

”جائے گا سلمان ہو جائے گا گوری تو بھکاری چلے جائیں گے۔“ ایللی نے کہا۔

”اگر کسی نے دیکھ لیا تو؟“ سادی بولی۔

”کچھ گامبھکاری ہے بھکشا لے کر جا رہا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”شکل سے تو بھکاری نہیں دیکھتے۔“ وہ ہنسی۔

”ہاں شکل سے تو چور دیکھتا ہوں۔ لیکن شکل کون دیکھتا ہے۔“

”آپ بڑے نڈر نکلتے۔“ سادی کی نگاہ میں تحسین جھلک رہی تھی۔

”تو نمول۔“ ایللی نے کہا۔ ”مقابلہ ایسے مہلویو سے تھا کہ اسے دیکھ کر اپنے میں بھی کچھ کچھ

مروت پیدا ہو گئی۔“

”آپ کی باتوں نے مجھے —“ وہ رک گئی اس کی آواز آبدیدہ تھی۔

”آپ کے انداز نے مجھے —“ وہ بھی رک گیا۔

”کیا؟“ وہ بولی۔ ”پوری بات کیجئے نا۔“

”مجھے کیا سے کیا کر دیا۔“ اس نے کہا۔

”سگریٹ کہاں ہیں؟“ وہ بولی۔

”مجھے کیا معلوم۔“

”میں سارا پیکٹ سلگا کر دوں گی۔“ وہ سگریٹ سلگانے لگی۔

”دان کرنے والے ایسے ہی ہوتے ہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”چپ کرو جی۔“ وہ غصے میں بولی۔ اس کا غصہ پیار سے بھیگا ہوا تھا۔

”سلوی۔“ وہ کچھ دیر کے بعد کہنے لگا۔

وہ چونکی — ”سلوی! آپ کو کیسے معلوم ہوا؟۔“

”تمہاری اس دیا کے عوض میں ایک ختہ پیش کروں۔“

”دیا۔“ وہ ہنسی۔ ”ہم تو ہر گئے۔“

”ہاں!“ ایللی نے کہا۔ ”کچھ لوگ ہار کر جیت جاتے ہیں اور کچھ۔“ اس نے تو بولی۔

”کچھ جیت کر بھی ہار جاتے ہیں۔ تمہارا ہاتھ کہاں ہے؟ دکھاؤ۔“

سلوی نے اپنا ہاتھ پھیلا دیا۔ ایللی نے وہ کانڈ کا گولا اٹھا کر اس کے ہاتھ میں رکھا اور ہر گز

بند کر دی۔ ”برگ سبزا ست —“ وہ بولا۔

”یہ لیجئے اپنے سگریٹ۔“ وہ بولی۔ ”اب آپ جائیں۔ لیکن آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے

تھا۔ پھر نہ ایسا کیجئے گا کبھی وعدہ کرو۔“

”کیوں؟“ وہ بولا۔

”میں بہت ضدی ہوں۔“ سلوی نے کہا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ ”مجھے دیکھ

کہ —“ اس نے مسکرانے کی کوشش کی۔ ”وعدہ کیجئے۔“

”وعدہ کرتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو خدا حافظ۔“

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”تم جاؤ پھر میں باہر نکلوں گا۔“

”نہیں۔“ سلوی نے کہا۔ ”اگر کچھ ہو گیا تو میں قریب تو ہوں گی۔“

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”تم اوپر جنگلے میں جا کر کھڑی ہو جاؤ۔“

”نہیں۔“ وہ چلائی۔ ”پھر وہی ضد۔“

”اچھا۔“ وہ اٹھ بیٹھا۔ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔

ایللی چپ چاپ باہر نکلا کچھ دیر دروازے میں رکا۔ وہ وہاں سے یوں اطمینان سے نکلا جیسے اس کا اپنا گھر ہو۔ پھر خرابی خرابی گلی میں چل پڑا۔ دروازے کی درز میں سے ایک پر غم آنکھ لے دیکھ رہی تھی۔

رنگی سلوی

اس سگے ہوئے سگریٹ نے گویا آگ لگا دی اور اس گولے خط نے اس پر بارود چھڑک دیا۔ اگلے روز ایللی کے سامنے سلوی کا خط پڑا تھا۔ ایسا خط پہلے انہیں کبھی موصول نہ ہوا تھا وہ خط ہلہ مفتاح پر مشتمل تھا۔ جس میں سلوی نے بھی کچھ شامل کر دیا تھا۔ کوئی بات تھی جو رہ گئی تھی۔ کبھی وہ اسے چھپرتی، مذاق کرتی، کبھی بسلاقی پھسلاتی، کبھی جرات دلاتی کبھی تعریف کرتی کبھی ہنسی ہنساتی کبھی روتی رلاتی۔ وہ خط ایک کائنات تھی جسے پڑھ کر ایللی ساکت و جامد رہ گیا تھا وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے ایک طوفانی رو بہ رہی تھی۔ لیکن جھولا جھلار رہی تھیں تھیں بڑے مارتی نہیں بڑھتی تھیں۔ سستی تھیں ساکن ہو جاتی تھیں۔

خط پڑھ کر وہ شرابور ہو گیا۔ تحریر کس قدر برجستہ اور بے تکلان تھی اشعار کس قدر موزوں اور بلند پایہ تھے۔ اشارے کسی قدر رنگین اور لطیف تھے بات سے بات ٹپکتی تھی اور ہر بات کی لوث میں وہ ان کی بات چھپی تھی جو ان کے منے تعلق کی مظہر تھی۔ بات بات میں وہ ان کی بات لیاں تھی واضح تھی اجاگر تھی۔ اس حد تک واضح ہو جاتی تھی کہ کسی بات پس پشت پڑ جائے۔

سارا دن وہ اس خط کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا رہتا رات کو وہ اس شوق مگر خوددار شخصیت میں ڈبا رہتا اور اگلے روز ایک نیا خط اس کے سامنے پڑا ہوتا۔

رات کو جب باہی اور سلوی دونوں موجود ہوتیں تو وہ باہی کے شانوں پر ہاتھ رکھ کر کھڑا ہو جاتا اور باہی سے مخاطب ہو کر کنایہ کی مدد سے سادی سے باتیں کرتا۔ وہ مزاح کے پردے میں آنسو بہاتا حاضر جوابی کی لوث میں اپنے گنگے پن کا دکھڑا دوتا اور سلوی اس کی ہر بات کو پابا جاتی اور

اس کے قریب ہوتے ہوئے تڑپتی۔ ماہی بے آب کی طرح تڑپتی اور پھر جھجک کر کہتی آپ باہر کریں نہ کریں۔ لیکن اس کے اضطراب کا باہی پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ وہ محسوس کرتا کہ اس باہر ہاتھوں تلے باہی پکھل کر چھلک رہی ہے۔ اس کی اس چھلکن کی وجہ سے ایللی پر جھپٹے پڑتے۔ اس کی لئے مشکلات پیدا کر دیتے آسمانیاں نہیں۔ باہی چھلک چھلک کر بار بار جاتی اور اس پر چھلک جاتا اور پھر وہ محروم نگاہوں سے ان دونوں کی طرف دیکھتی اور اس کی نگاہیں اور بھی لولہس جاتیں۔

”آپ میری باہی کو تنگ کر رہے ہیں۔“ سادی قریب تر آ جاتی۔ ”چھوڑ دیجئے باہی کو۔ بہت برے ہیں باہی ان کی باتوں میں نہ آؤ۔ ان کی باتیں نہ سنو۔ ورنہ تم پانی ہو کر بہ جلاؤ گی۔ وہ تیراک ہیں جو اس پانی میں تیر کر نکل جائیں گے۔ یہ ڈوبتے نہیں۔“

”ہاں!“ ایللی نے کہا۔ ”میں ڈوبتا نہیں بلکہ ڈوبے جاتا ہوں“ ڈوبے جاتا ہوں۔ ڈوب جاؤں تو کتنا اچھا ہو۔“

”پھر وہی باتیں۔“ سادی چلاتی اور پھر بات کا رخ بدلنے کے لئے کچھ نہ کچھ کہہ دیتی۔

”باہی آپ نے انہیں میرا نام کیوں بتایا؟“

ایللی جواب دیتا۔ ”ہاں تم بھی انتقام لو باہی سے تم اس کا نام بتا دو مجھے۔“

سادی ہنستی۔ ”کتنے چالاک ہیں آپ۔“

”سادی کیا نام ہے۔“ ایللی چلایا۔

”مجھے بہت پسند ہے۔“ سادی ہنس کر کہتی۔

”مجھے نہیں۔“ ایللی منہ بنا دیتا۔

”کیوں؟“

”غلط نام ہے۔“

”غلط کیسے؟“

”رنگی ہونا چاہئے۔ رنگی کو سادی کہیں دیکھ کبیرا ہے۔“ ایللی قہقہہ مار کر کہتا۔

اس طرح وہ بچوں کی طرح باتیں کرتے رہتے۔

اور اگر سادی اکیلے آتی تو ایللی کو پسینہ آ جاتا۔ سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کہے۔

اس کی آواز میں وہ بے پروائی بے نیازی ختم ہو جاتی اور وہ بھیجی بھیجی آواز میں ہوتا۔

”بڑے جملے بولے جاتا جیسے لکنت کا مریض ہو۔“

”سادی جمل آئے گا تو۔“

”تو کیا؟“

”کیا ہوگا؟“

”کچھ بھی نہیں۔ باہی بڑی بے تابی سے اس کا انتظار کر رہی ہیں۔“

”تم اور باہی اس قدر مختلف کیوں ہو؟“

”کیسے؟“

”تم نہ جی ہو وہ ہاں جی۔“

”میری باہی ایسی نہیں۔“ وہ غصے میں بولی۔ ”میں آپ کی سب باتیں سمجھتی ہوں۔“

”چلو کوئی ہمدرد تو ملا۔“

”ہمدرد؟“ وہ چلاتی۔

”تو کیا ہو تم؟“

”آپ ہمیں نہیں جانتے۔ آپ نہیں سمجھتے۔ نہیں سمجھ سکتے؟“ سادی چیختی

”مہر ہو۔“ ایللی پوچھتا۔

”نہیں۔“

”تو پھر۔“

”بس کہ جو دیا آپ ہمیں نہیں سمجھتے۔“

”تو سمجھا دیجئے۔“

”اُس گھر کی ہر موم جی دونوں سروں پر جلتی ہے۔“ سادی مسکرا کر کہتی۔

”تو کیا یہاں دیوالی ہے؟“

”ہاں ہر سہ دیوالی ہے۔ میرے ہنستے چہرے پر نہ بھولے۔“

”تو کیا آپ روتی ہیں؟“

”مجھے ٹسوے بہانا نہیں آتا۔ آنسو بہانا نہیں آتا۔“

”تو پھر۔“

”نہ کیجئے اس موضوع کو۔ آپ نہیں سمجھ سکیں گے۔“

فانہ پور کھڑی ہو کر بے کار اشارے کرنے سے اسے کیا دلچسپی ہو سکتی تھی۔ اس کے برعکس
 فضل اس لئے پسند تھا کہ وہاں کھڑے ہو کر اسے بات کرنے کی ضرورت نہ ہوتی تھی
 بلکہ وہ اپنے برساتی میں حاضری دیا کرتا تھا۔

میں نے وہ روز جلائے برسنے کے لئے اس دھوپ میں بھلا کون آتا ہے کوٹھے پر۔ ”وہ چلایا۔“ اور یار اب پھر وند لکے
کے ملکہ کچھ نظر نہیں آتے۔ پہلے تو مشق ہو گئی تھی تاب آٹھ روز کے وقفے کے بعد پھر وہی
نڈول والی بات ہے۔“
خیم بجے کے قریب جمال دوڑتا ہوا نیم چھتی میں داخل ہوا اس کے باپجیس کھلی ہوئی تھیں
دور ریزی پھیلی ہوئی تھی۔

”بارہابی انہیں معلوم ہو گیا ہے کہ میں آ گیا ہوں۔ ایک کو پتہ چلا تو وہ بھاگی دوسری کو خبر پانے کے لئے اور پھر وہ دونوں آ گئیں۔ میں نے سلام کیا بہت خوش ہوئیں مجھے دیکھ کر آج رات کو برا مزاج رہے گا۔ میں پھر جاتا ہوں وہاں شاید وہ پھر آئیں۔“

”اُٹھ کھٹے کے بعد وہ پھر نیم چھتی میں آیا۔ اس کا رنگ زرد تھا۔ بازو لگ رہے تھے۔“

”یاد اعلیٰ غضب ہو گیا۔ میں وہاں گیا تو سامنے کوئی بیٹھی تھی۔ میں نے سمجھا انہیں میں سے ایک ہو گی میں نے اشارے کرنے شروع کر دیئے وہ بھی اشارے کرتی رہی۔ پھر فحشا“ اس نے

”نہ نہ اتار کر رکھ دیا اور نیچے سے سوٹ والا ایک نوجوان نکل آیا غالباً“ ان کا بھائی ہو گا۔ اب کیا ہو

”یاد اعلیٰ بتاؤ نا؟“

”مجھے کیا معلوم۔“

رات کو وہ دونوں نیم چھتی میں بیٹھے روشنی کا انتظار کرتے رہے۔ تین بجے کے قریب ان یاموئی چلنے لگی اور ساڑھے تین بجے جمال کرسی میں بیٹھا بیٹھا سو گیا لیکن ایلی چپ چاپ غریبہ کی طرف ٹھنکی باندھے بیٹھا رہا۔ وہ غم یا مایوسی محسوس نہیں کر رہا تھا۔ کچھ بھی محسوس نہ کر رہا تھا۔ اس کا ذہن قطعی پر خالی تھا۔ کھڑکی میں سادی ہنس رہی تھی۔ ”کوئی بات کیجئے ٹپ تواتی باتیں کیا کرتے ہیں۔“ ”زینے میں شیزاد کھڑی کہہ رہی تھی۔“ ”نہیں میں تو کچھ نہیں کہتی۔“ درمیان میں جمال آرام کرسی پر پڑا خراٹے لے رہا تھا۔

آٹھ روز کے بعد جب ایک روز اہلی نیم چھتی میں بیٹھا سادی کا تازہ خط پڑھ رہا تھا تو اس نے نگاہ اٹھائی زینے میں جمال کھڑا تھا۔ جمال کو دیکھ کر وہ بھونچکا رہ گیا وہ آٹھ دنوں میں اس کے وجود ہی کو بھول چکا تھا۔

جمال نے آتے ہی کئی ایک سوالات کر دیئے۔

”بتاؤ یار ان کا حال کیا ہے۔ لیکن تم تو صرف ایک بار اطلاع دینے گئے ہو گے۔ انتظار کر رہی ہوں گی۔ کوٹھے پر ٹہلتی ہوں گی دیکھنے کے لئے کہ آیا ہے یا نہیں اور تم برساتی میں جاتے ہی نہیں، تمہیں کیا معلوم کوئی چٹھی آئی ہے کیا۔ لیکن چٹھی کیسے آئی تو ہوا تھا۔ یار میرا جی تو چاہتا تھا کہ جلدی لوٹ آؤں لیکن کیا کرتا وہ مجھے آنے نہیں دیتی تھی برا بیوی اور تم جانتے ہو مجھے اپنی بیوی سے عشق ہے۔ ایمان سے۔“

جمال کی باتیں سن کر ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ مجرم ہو۔ جیسے اس نے ایک بچے کو دھوکا دیا ہو۔ وہ چپ چاپ اس کی باتیں سنتا رہا اور مختصر جواب دیتا رہا۔
 ”آؤنا، آؤنا۔“ جمال چلانے لگا۔ ”وہاں برساتی میں بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ ذرا دیکھو! شاید وہ سامنے ہی ہوں۔ انہیں تسلی ہو جائے گی کہ میں آ گیا ہوں۔“

برساتی میں پہنچ کر جمال کھڑکیوں کے سامنے کھڑا ہو گیا اور ایللی ایک کونے میں جا رہی تھی۔ ایللی کبھی کھڑکیوں میں نہ کھڑا ہوا تھا۔ دو ایک بار انہوں نے کہا بھی تھا۔ ”آپ سامنے کیلنا نہیں آتے اپنی برساتی میں۔“ اس نے کہا تھا ”ایک بار جو آیا تھا۔“ ”ہے اللہ“ اس پر سولی ہاں تڑپتی تھی۔ جیسے آتش بازی کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ درحقیقت ایللی وہاں کھڑے ہو کر اثرات کرنے کے خلاف تھا۔ اس لئے کہ اسے ڈر تھا کہ کہیں ناؤ گھر کا کوئی لڑکا دیکھ نہ لے۔ وہ بلا سے ڈرتا تھا۔ جاہ کو معلوم ہو گیا تو وہ کہنے لگا۔ ”ہاں بھئی یہ بھی ایک فن ہے اور اگر ایللی کو یہ فن پتہ ہے تو ہم کیا کہہ سکتے ہیں ذرا یہ سستا کام ہے میرا مطلب ہے چپ ہے۔“ ایللی اس جملے کو لڑکھ سے ڈرتا تھا اس کے علاوہ جب روز ملاقات ہوتی تھی اور وہ باتوں کے ذریعے اپنی فحاشی کر سکتا

اگلے روز سفید منزل کے چوبارے میں مزدور کام کر رہے تھے۔ میڑھیوں والی دیوار پر اینٹوں کے جنگلے بنے ہوئے تھے۔ جن کی وجہ سے میڑھیوں کا دروازہ کھلنے پر ٹٹو گھومتا تھا۔ منزل کے چوبارے کا ایک حصہ دکھائی دیتا تھا انیس سینٹ سے پر کیا جا رہا تھا۔

”ایلی ایلی۔“ جمال چلانے لگا۔ ”یہ دیکھا تم نے انہوں نے وہ جنگلے بند کر دیئے ہیں۔“

”ہوں۔“ ایلی نے کھڑکی کی درز سے دیکھتے ہوئے کہا پھر وہ دونوں دیر تک خاموشی کو رہے پھر جمال بولا۔

”لیکن شاید ملاقات پر پابندی نہ لگے گھر والوں کو اس کا علم تو نہیں ہوا ہو گا۔ اور ایلی! وہ بھیجیں گی۔ ضرور بھیجیں گی۔“

جب جمعدارن آئی تو ایلی نے دیکھا کہ اس کے چہرے پر مسکراہٹ نہیں بلکہ ماتے پرانی شکن پڑی تھی۔ اس نے فوراً محسوس کر لیا کہ اب خط و کتابت ممکن نہ ہوگی۔ کچھ دیر بعد جمال آیا۔

”یار وہ جمعدارن تو بات ہی نہیں کرتی۔ کتنی تھی نہ بابو جی وہاں ان کے گھر میں قلعہ بنا ہوا ہے۔ لڑکی کو دورے پڑ رہے ہیں۔ دورے میں لڑکی کی ہاتھ پاؤں مڑ جاتے ہیں اب ہاتھ پاؤں جمال نے پوچھا۔

ان حالات کے باوجود وہ دل ہی دل میں امید رکھتے رہے کہ شاید کوئی صورت پیدا جائے شاید وہ کوئی ترکیب لڑائیں۔ ایک ہفتہ گزر گیا۔ عید آگئی لیکن گوروں کی طرف سے کوئی پیغام موصول ہوا اور نہ ہی سفید منزل میں کسی جگہ ان کی جھلک دکھائی دی۔

جمال کو اس بات کا قلق ضرور تھا کہ ایک دلچسپی کی صورت ختم ہو گئی اس کے علاوہ کوئی دکھ نہ ہوا۔

جس روز وہ واقعہ رونما ہوا تھا جس کی وجہ سے ان کا سلسلہ ملاقات ٹوٹ گیا تھا۔ اس دن ایلی نے محسوس کیا تھا جیسے وہ خالی الذہن ہو پھر حسب عادت دکھ بوند بوند اس کے دل میں بھرا گیا۔ دنیا ویران ہوتی گئی۔ چیزیں مغموم سے خالی ہوتی گئیں مناظر و صحنے پڑتے گئے اور لوگ یوں گھومتے بھرتے دکھائی دینے لگے۔ جیسے دیرانے میں بھوت پریت چل پھر رہے ہوں۔

وہ محسوس کر رہا تھا جیسے اس نے کوئی نعت عظمیٰ کھو دی ہو۔ جیسے امد کی کرنٹ ہو گئی ہو۔

جب کی بات تھی کہ ایلی کو سادی سے وہ محبت پیدا نہ ہوئی تھی جس میں آرزو کا عنصر ہوتا ہے۔ لیکن اس کی شخصیت کی عظمت کا بے پناہ احساس تھا۔ اس کی رنگین باتیں اس کا ادبی ذوق اس کے بے پناہ جرات سادی سے محروم ہو جانے پر وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ دنیا کی تمام اچھی چیزیں سے محروم کر دیا گیا ہو۔ جیسے لطافت ختم ہو گئی ہو اور صرف دھندلی کثافت باقی رہ گئی ہو۔

ایلی نے کبھی یہ آرزو محسوس نہ کی تھی کہ وہ سادی کو آغوش میں لے یا اس کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں ڈال لے یا اس سے حسن کی بھیک مانگے یا ملاپ کی خواہش کرے۔

ایلی روز سادی کے خط نکال لیتا اور انہیں پڑھتا۔ بار بار پڑھتا اور پھر حیرت میں ڈوب جاتا۔ نہ جانے یہ لڑکی کون ہے۔ نہ جانے وہ لوگ کتنے اونچے ہوں گے نہ جانے۔ پھر وہ شدت سے کٹری کا جذبہ محسوس کرتا۔ نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ نہیں ہو سکتا کہ ہمارا میل ہو سکے اور ہو بھی جائے تو وہ جلد مجھ سے اکٹا جائے گی۔ مجھ میں ہے ہی کیا جو اتنی بڑی شخصیت کو جذب کر سکے۔ ایلی نے سادی کو کبھی عورت کی حیثیت سے نہ دیکھا تھا اور نہ ہی اس کی آرزو کی تھی۔ اس نے ایلی کا غم عجیب سا تھا۔ ایسا غم جو اس نے پہلے کبھی محسوس نہیں کیا تھا۔ وہ یہ محسوس نہیں کرتا تھا جیسے کھو گیا ہو بلکہ جیسے کچھ کھو دیا ہو جیسے روشنی کی کرن بجھ گئی تھی۔ جیسے رنگ ختم ہو گئے تھے اور محض ایک خاکستری دھند لکا باقی رہ گیا تھا۔

دس روز کے بعد جمال کے نام پھر ایک تار آگیا۔ لکھا تھا۔ ”فورا“ پینچے۔“

”کیا بات ہے؟“ ایلی نے جمال سے پوچھا۔ ”یہ کیسا بلاوا ہے؟“

”کچھ ہونے والا ہے۔“ جمال ہنسنے لگا۔ ”میں کہہ آیا تھا مجھے تار دے دیتا۔“

جمال کے جانے کے ایک دن بعد ایلی کو ڈاک سے ایک خط موصول ہوا۔

اس نے اس لئے خط کو کچھ اہمیت نہ دی۔ پتہ ناموس خط میں لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا خط ہے اس نے سوچا۔ طرز تحریر جانی پہچانی سے تھی لیکن —

در اصل اسے یہ خیال بھی نہ آیا تھا کہ سادی اسے ڈاک کے ذریعے بھی خط لکھ سکتی ہے۔ لفظ ہلکا کر کے اس نے خط باہر نکالا تو دفعتاً حیرت سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں اسے سادی کا خط۔ لکھا تھا۔

”گھر والوں کو پتہ چل گیا ہے۔ ملاقات کے تمام راستے مسدود کر دیئے گئے ہیں۔ اب میں میل نہیں رہ سکتی۔ سو موافق کو رات کے دو بجے اسی جگہ میرا انتظار کیجئے اور مجھے ساتھ لے

جائے۔ اگر آپ نہ آئے تو — ضرور آئیے گا ضرور ورنہ —
ایک کونے میں جلدی میں چند الفاظ لکھتے تھے :-

”جس روز آپ کو یہ خط ملے اسی روز رات کو بارہ سے ایک بجے تک اپنا برساتی کا
جلائے رکھئے تاکہ مجھے علم ہو جائے کہ آپ کو میرا خط مل گیا ہے۔ وہ حق ہمارے بڑے
دکھائی دیتی ہی۔“

خط پڑھ کر ایلی سن رہ گیا۔ اس کا ذہن پھر سے ایک خلا میں تبدیل ہو گیا۔ وہ اٹھ بڑا
پھر برساتی میں ادھر سے ادھر سے ادھر گھومنے لگا۔ پھر وہ باہر نکل گیا۔
سارا دن وہ آوارہ گھومتا رہا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ وہ کون ہے کھل جا رہا ہے۔ کسی
سے سرگرداں ہے۔ اسے سادی کا بھی خیال نہ رہا تھا۔ وہ بھول چکا تھا کہ سوموار کو رات کے
بجے اسے بلایا گیا ہے اور اسے کسی کو ساتھ لے کر چلے جانا ہے نہ جانے کھل چلے جانا ہے کہ
چلے جانا ہے مگر چلے جانا ہے ورنہ۔

اس کے ذہن میں کوئی بات نہ تھی کوئی فکر نہ تھا کوئی پریشانی نہ تھی۔ البتہ وہ بذاتِ خود
پریشان تھا۔ اس کی شخصیت گویا بکھر گئی تھی۔ شعور شل ہو چکا تھا۔ وہ دیکھتا تھا لیکن سمجھتا تو
نہیں۔ اس کی دیکھنے کی قوت دھندلائی ہوئی تھی۔ کان بند ہو چکے تھے۔ وہ ایک دم مگر مسل
شور سن رہا تھا۔ جیسے کھیاں جھنجھٹا رہی ہوں۔ جیسے سادی کائنات کھیوں کے ایک عظیم جتے
تبدیل ہو گئی۔

دوپہر کے وقت وہ ایک ویران سڑک پر چل رہا تھا۔ پھر شام کو اس نے دیکھا کہ وہ بلا ٹھہرا
ایک بچہ پر بیٹھا ہے۔ پھر وہ سڑک کے عین درمیان میں کھڑا تھا۔ ایک موٹر کے قریب کھڑا تھا
ارد گرد چند لوگ کھڑے تھے۔

بخشی بخاری

پھر وہ شخص اس سے کچھ پوچھ رہے تھے اور چوک میں کھڑا سپاہی اس کی طرف دیکھ رہا تھا
مسکرا رہا تھا۔

لبا شخص اس کے اوپر جھکا ہوا تھا۔

”تم الیاس ہو؟“ وہ پوچھ رہا تھا۔

الیاس — اہلی کو وہ لفظ کچھ مانوس سا معلوم ہو رہا تھا۔ ہاں الیاس ایلی۔ علی پور کا ایلی۔
اپنی آپ سے کہہ رہا تھا۔

”چلو۔“ ٹھٹھا شخص بولا۔ ”سامنے چائے کی دوکان میں بیٹھ کر بات کریں گے۔“
”جی ہاں چل پڑے۔“

الی نے غور سے لمبے آدمی کی طرف دیکھا۔ ہاں یہ شخص ’اس نے محسوس کیا جیسے اسے
میں دیکھا ہو۔ لیکن کوشش کے باوجود وہ سمجھ نہ سکا کہ وہ کون تھا۔
”مجھے جانتے ہوئے۔“ لمبے آدمی نے مسکرا کر کہا۔

”ہاں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔ لیکن اس کا ذہن سر کے اشارے سے بیگانہ رہا۔ ”میں ناؤ گھر
آئی ہوں۔“

”ہاں۔“ ایلی کے ذہن میں روشنی کی ایک اور کرن جھلکائی۔
”میں جاہ کا دوست ہوں۔“ لمبا آدمی بولا۔

جاہ — ایک اور کرن۔

”مجھے جانتے ہوئے۔“ لمبے آدمی نے دہرایا۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”جانتا ہوں۔“ لیکن اس کی نگاہیں اسے جھٹلا رہی تھیں۔
”نہیں نہیں۔“ چھوٹے آدمی نے اشارہ کیا۔ ”ابھی نہیں۔ معلوم ہوتا ہے۔ ابھی ہوش
نہیں۔“

”تم نے کچھ استعمال تو نہیں کیا؟“ لمبے آدمی نے ایلی سے پوچھا۔

”استعمال۔“ ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھا۔

”تو نہیں۔“ چھوٹے آدمی نے اشارہ کیا۔ ”یہ بات نہیں۔“

”تمہاری طبیعت تو اچھی ہے۔؟“ لمبے آدمی نے چائے کی میز پر بیٹھے ہوئے ایلی سے
پوچھا۔

”ہاں نہیں مجھے تو کچھ بھی نہیں کچھ بھی تو نہیں۔“ ایلی نے اپنے آپ کو جھنجھوڑ کر بات
سنائی کوشش کی۔

”تم تمہارے دوست ہیں۔“ چھوٹا بولا۔ ”میرا نام بخشی ہے اور یہ بخاری ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ ایلی نے سر ہلایا۔ ”اور یہ کیا ہے۔؟“ بخشی نے پوچھا۔

”یہ — ایللی نے پہلی مرتبہ اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھوں میں
کانڈ تھا جسے وہ ان جانے میں مروڑ رہا تھا۔ ”یہ — ایللی نے کہا۔ ”یہ تو کانڈ ہے۔ اس نے نہ کر
بخاری کو دیتے ہوئے کچھ اس انداز میں کہا جیسے انہیں دکھانا چاہتا ہو کہ واقعی وہ کانڈ ہے اور اس
ثابت کرنا چاہتا ہو کہ اسے کچھ بھی نہیں وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ وہ کانڈ سلوی گا۔
بخاری نے وہ کانڈ ایللی کے ہاتھ سے لے لیا اور اسے دیکھنے لگا۔

”چائے پیو۔“ بخشی مسکرایا۔

ایللی چائے پینے لگا۔

”اب کیا گھر جاؤ گے؟“ بخشی نے پوچھا۔

”ہاں۔“

”تمہیں چھوڑ آئیں؟“

”نہیں میں چلا جاؤں گا۔“ ایللی بولا۔

”اچھی بات ہے۔“ بخشی نے کہا۔

”تم ذرا بیٹھو میں بل دے دوں۔“ بخاری نے کہا۔

”میرے پاس ہیں۔“ ایللی نے اپنی جب کی طرف اشارہ کیا۔ ”میرے پاس ہیں۔“

”نہیں میں دوں گا۔“ بخاری نے مسکرا کر کہا۔

پھر بخاری نے بخشی کو اشارہ کیا۔ ”ذرا ادھر آنا۔“ اور وہ دونوں اٹھ کر چلے گئے۔

ایللی کی نگاہوں میں اب چیزیں اور ان کا مفہوم ابھر رہا تھا اور وہ شرمندگی کی محسوس کیا

لگا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ سوچ رہا تھا۔

کچھ دیر کے بعد بخشی اور بخاری دونوں واپس آ گئے۔ ”چلو ہم بھی تمہاری ماٹھ

گئے۔“ بخاری نے کہا۔

”نہیں نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ ”آپ تکلیف نہ کریں۔“

”نہیں۔“ بخاری نے کہا۔ ”ہم ادھر ہی جا رہے ہیں۔“

”اچھا۔“ ایللی لاجواب ہو گیا اور تینوں چل پڑے۔

جب وہ ناؤ گھر کے مقابل میں پہنچے تو دفعتاً ایللی کو یاد آیا اور وہ دیوانہ وار اپنی

”کچھ کھو گیا ہے کیا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”ہوئی میں تم نے ایک کانڈ اس جیب میں ڈالا تھا۔“ بخاری نے یہ کہتے ہوئے ایللی کے

جیب کی لپڑ والی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک کانڈ نکالا۔

”یہ کیا ہے؟“ بخاری نے ایللی سے پوچھا۔

ایللی نے دیوانہ وار اسے کھولا۔ دیکھا اور پھر کہنے لگا۔ ”ہاں یہی ہے۔“ اس کی آنکھیں جذبہ

پر غزاری سے پر خم ہو گئیں۔

”اچھا تو ہم کل صبح آئیں گے۔“ بخاری نے کہا۔ ”کیس چلے نہ جانا ہمارے آنے سے

پلے۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”میں کہاں جاؤں گا۔“

اگلے روز صبح سویرے ہی بخشی اور بخاری آ گئے۔

”آج تو طبیعت اچھی معلوم ہوتی ہے۔“ بخاری نے بات شروع کی۔

”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کل کیا ہوا تھا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں ہوا تھا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”تو کل گھوم رہے تھے تم؟“

”جی گھوم رہا تھا۔“

”کئی کلم سے نکلے تھے کیا؟“

”نہیں تو دیسے ہی میں بیٹھے بیٹھے طبیعت گھبرا گئی تھی۔ جدھر منہ اٹھایا چل پڑا۔“ ایللی نے

نئی کی کوشش کی۔

”آج تو نہیں گھبرا رہی طبیعت؟“

”نہیں تو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آج تو کوئی ایسی بات نہیں۔“

”کل کیا بات تھی؟“ بخشی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”میں ہم کچھ مدد کر سکیں۔“ بخاری نے کہا۔

”تو کوئی نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”تو اس بات کے متعلق کیا فیصلہ کیا ہے؟“

”کس بات کے متعلق؟“ ایلی نے پوچھا۔

”سوموار کو دو بجے۔“ اس نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا پھر دھڑکتے ہوئے اسے
”ارے یعنی میرا مطلب ہے یعنی میرا۔۔۔“ ایلی گھبرا گیا۔
”دیکھو بھائی الیاس!۔“ بخشی مسکرایا اس کی مسکراہٹ بڑی تسلی بخش تھی۔
”ہم نے وہ خط پڑھ لیا ہے۔“

”خط؟“

”تم نے خود ہی تو دیا تھا ہمیں چائے کی دو کھن میں۔“ بخاری مسکرانے لگا۔

”میں نے؟“

”گھبراؤ نہیں تمہارا راز ہمارے پاس محفوظ رہے گا۔“ بخاری نے اسے تسلی دی۔

ایلی سر جھکائے خاموش بیٹھا رہا۔ دیر تک کمرے میں خاموشی چھائی رہی۔

”تمہیں اس لڑکی سے محبت ہے کیا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”محبت؟ مجھے معلوم نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہوں۔“

”تو کیا تم دو بجے وہاں جاؤ گے؟“

”ہاں۔۔۔ مجھے جانا ہی ہو گا۔“

”کیوں کوئی مجبوری ہے کیا۔“ بخشی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو پھر جانا ہی ہو گا کیوں؟“ بخاری نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں اسے دھوکہ نہیں دے سکتا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”اور اگر میں نہ گیا تو۔۔۔؟“

”تو کیا؟“ بخاری نے پوچھا۔

”تو دور نہ۔۔۔“ ایلی نے وضاحت کرنے کی کوشش کی۔

”دور نہ؟“

”ہاں۔“ اس نے لکھا ہے ضرور آنا دور نہ۔۔۔

”دور نہ تو یہ ہمیشہ ہی لکھتی ہیں۔“ بخاری ہنسنے لگا۔

”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”تم اسے نہیں جانتے میں اسے جانتا ہوں اور اس کے دور نہ کوئی۔“

”یہاں۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

”الیاس برا نہ بنو تو میں پوچھوں کہ وہ کون ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”کون ہے۔۔۔؟ مجھے نہیں معلوم کہ وہ کون ہے؟“ ایلی نے جواب دیا۔

”میرا مطلب ہے کس گھرانے سے ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”میں نہیں جانتا۔ مجھے اس کا علم نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بخاری نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔“ اس کے رشتے داروں کے متعلق

”بخشی نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم؟“ ایلی نے بخشی کی بات کاٹ دی۔

”اچھا۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔ ”تعب کی بات ہے۔“ کچھ دیر تک وہ خاموش رہے۔

”تو کیا تمہارا فیصلہ اٹل ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”ہاں میں جاؤں گا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”مجھے جانا ہی ہو گا۔“

”اس کے نتائج سوچے ہیں تم نے؟“

”نہیں۔ مجھے نتائج کی پروا نہیں۔“

”وہ۔۔۔“

”تمہارے پاس کوئی جگہ ہے جہاں اسے لے جاسکو؟“

”نہیں۔“

”کوئی بھی نہیں۔“

”تو نہیں۔“

”لوپے کا انتظام ہے؟“

”ایلی نہیں پڑا۔“ میرے پاس روپیہ کھلیں۔“

”کوئی دوست ہے؟“

”تو نہیں۔“

”کچھ دیر تک وہ خاموش رہے بخشی کی آنکھوں میں غم کی گھٹائیں چھائے جاری تھیں۔ بخاری

”مور اگر تم پکڑے گئے تو؟“

”اور اگر لڑکی نے تمہارے خلاف بیان دے دیا پھر؟“

”نہیں کیا۔۔۔؟“

”تمہیں یقین ہے؟“

”اور اگر —“

مگنی۔ کچھ دیر کے بعد بخاری نے کہا۔ ”بھائی الیاس مجھے تم سے مل کر بے حد خوشی ہو رہی ہے۔“

”تم ان سوالات کا برا تو نہیں مان رہے۔“

”اور اگر تم ہار گئے؟“

”اس کا مطلب ہے کہ تم اس سے محبت کرتے ہو۔“

”مجھے نہیں معلوم۔“ ایلی نے کہا۔ ”اگر مجھے وہ نہ ملی تو میں حسوس کروں گا۔“

”اچھا۔“ بخشش نے کہا۔ ”ابھی تو دو دن باقی ہیں۔ آج ہفتہ ہے نا۔“

”اچھا۔“ امی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ابھی دو دن باقی ہیں۔

”اگر تم ہمیں سارا قصہ سنا دو تو کوئی حرج ہے؟“ بخاری نے پوچھا۔

”اب کیا ہے؟“ اعلیٰ نے کہا۔ ”لیکن جاہ کو پتہ نہ چلے۔“

”اچھا تو کل ہم پھر آئیں گے۔ شاید کچھ ہو سکے۔۔“

”بھگوان کرے۔“ بخشی بولا اور وہ دونوں رخصت ہو گئے۔

اکلے روزہ دونوں اسے باغ میں لے گئے اور وہاں بیٹھ کر ایلہی نے مختصر طور پر

بچہ انہیں ستائیے اور ان کی خواہش پر واپسی پر سفید منزل انہیں دکھادی۔

اللہ ہو اکبر

بخشی اور بخاری سے مل کر ایللی کو اک ان جانی قسلی ہو گئی۔ حالانکہ انہوں نے اس کی لداؤ
لئے کاغذ نہیں کیا تھا۔ لیکن بخشی اور بخاری دو عجیب شخصیتیں تھیں۔ ان کے پاس بیٹھ کر
فوں بوتھا۔ جیسے اپنوں کے پاس ہو۔ بخاری کی باتیں تلخ تھیں۔ لیکن اس کے شگ روپہ سے
بت اور ہمدی کو یارستی تھی۔ بخشی کی باتیں مٹاس بھری تھیں اور وہ یوں جذبات سے سرشار
ہے کا ملی تھا۔ جیسے بھی ہو اکبوتر ایللی نے عجیب سے قسلی محسوس کی تھی۔ نہ جانے کیسے ایللی کو
فوں ہو چکا تھا کہ وہ دوستوں سے گھرا ہوا ہے۔ پکڑے جانے یا قید ہو جانے کے فکر سے تو ایللی آزاد
نہا بلکہ دے ہی جیسے اس روز سگے ہوئے سگریٹ کے لئے وہ سادی کے زینے میں پانچ گھنٹے بیٹھا رہا
نہا بلکہ اسے ایک ڈھاکہ کس ایسا نہ ہو کہ وہ سوموار کو رات کے دو بجے مقررہ جگہ پہنچ نہ سکے۔
گواس وقت اس کا مقصد حیات صرف یہ تھا کہ رات کے دو بجے وہاں پہنچ جائے اس کے بعد کیا ہو
گے گی کہ وہ اس کے متعلق اس نے کچھ نہ سوچا تھا۔ وہ اس کے متعلق سوچنا نہیں چاہتا تھا۔ اس کے
لوہا ہے کچھ ہو جائے یا نہ ہو۔

سوموار کے روز بخشی اور بخاری دونوں بار بار ایلی کے پاس آئے اور اسے موہوم سے تسلی دے لیا کرتے تھے۔ ان کے انداز سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ انتظامات میں مصروف ہیں۔ ایلی کے پاس آکر محاورہ الگ ہو کر آپس میں بحث کرتے لڑتے جھگڑتے اور پھر کہیں چلے جاتے۔

شام کے وقت وہ دونوں ایلی کو باہر لے گئے۔

بارک میں پہنچ کر وہ ایک منہج پر بیٹھ گئے بخاری نے اہلی کے دونوں شانے پکڑ لئے۔

فکر کو بھائی جو کچھ ہم سے ہو سکا ہم نے کر دیا ہے۔ اب غور سے سن لو اور اچھی طرح سمجھ لو۔
 بات کو تم اکیلے جاؤ گے لیکن ہم تمہارے بالکل قریب ہوں گے۔ فکر نہ کرنا۔ اگر کوئی مشکل پڑی تو

الگ بات بن گئی تو تم اسے لے کر ناؤ گھر کی طرف نہ آنا بلکہ اس سے مفصلہ ست کی گلی
تھوٹے ہوئے سڑک پر پہنچ جانا۔ سڑک وہاں سے چالیس پچاس قدم دور ہے۔ وہاں تمہارے لئے
ایک موٹر گاڑی ہوگی یہ موٹر تمہیں سیدھی کراچی لے جائے گی۔ اگر تم کراچی بخیر و عافیت پہنچ گئے تو

پھر اللہ مالک ہے۔“

عین اس وقت قریب کی مسجد سے مؤذن لکارا۔ ”اللہ اکبر۔“

ایلی کی نس نس میں ایک برقی روسی دوڑ گئی۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے بخشی عظمیٰ کی طرف دیکھا اور محسوس کیا۔ جیسے وہ اللہ کے بھیجے ہوئے فرشتے ہوں جو اللہ واسطے اس کی آمد کو کر دے ہوں بے مقصد بے لاگ ادا۔ اللہ — اس کے دل میں پہلی مرتبہ ایک گونج سی پیدا ہوئی۔ اس کی آنکھوں میں شدت تاثر سے آنسو آ گئے۔

”میں میں“ ایلی نے شکر گزاری سے ان کی طرف دیکھا۔ ”یعنی۔“ وہ بولا۔ اس کی تیز بھرائی ہوئی تھی۔ بخاری ہنس پڑا۔ ”ہم یہ کام تمہارے لئے نہیں کر رہے۔“ اس نے کندھ میں اس احسان مندی یا شکر گزاری کا کوئی موقعہ محل نہیں۔ ”بخاری نے ایک دبی دبی آہ بھری اور پھر گونج آواز میں بولا۔ ”جو خود روشنی سے محروم کر دئے گئے ہوں وہ دوسروں کو راہ دکھانے میں مرت محسوس کرتے ہیں۔“

ایلی نے حیرت سے بخاری کی طرف دیکھا اس نے محسوس کیا جیسے اس کے پہلوؤں ایک لائن خلا ہو جسے دنیا کی تمام نعمتیں اور مسرتیں پر نہ کر سکتی ہوں۔ اللہ ہو اکبر مؤذن لوان ختم کر رہا تھا۔ اللہ ہو اکبر ایلی کے دل کی گہرائیوں سے آواز آئی۔ سامنے بخاری مسکرانے کی شدید کوشش کر رہا تھا۔ قریب ہی بخشی کی آنکھوں میں بوند اباندی ہو رہی تھی۔

تمام تفصیلات سمجھا کر وہ دونوں ایلی کو سفید منزل کی طرف لے گئے اور عملی طور پر ل سمجھانے لگے ”یہ گلی ہے۔ ادھر سے تمہیں آنا ہے۔ اس طرف کو۔ یہاں موٹر کھڑی ہو گی غن الا جگہ اور ہم تمہارے ساتھ ساتھ رہیں گے۔ پاس نہیں بلکہ قریب یہ نہ سمجھنا کہ تم اکیلے ہو۔“ تمام تفصیلات سمجھانے کے بعد جب وہ ناؤ گھر پہنچے تو ساڑھے نو بجے تھے۔ وہ سیدھے لوہنم چھتی کی طرف چل دیئے تاکہ جاہ بھا اور پال کو ان کی آمد کا علم نہ ہو۔

حد ہو گئی

جب وہ نیم چھتی میں پہنچے تو دروازے میں جمل کھڑا مسکرا رہا تھا۔ جمل کو دیکھ کر ایلی کا دل پٹ گیا۔ جمل کو دیکھتے ہی یہ احساس اس کے رگ و پے میں سرایت کر گیا کہ وہ مجرم ہے۔ اس نے جمل کو دھوکا دیا ہے۔ احساس گناہ سے اس کی گردن لٹک گئی۔

ایلی نے اس احساس سے مخلصی پانے کی شدید کوشش کی مگر ناکام۔ وہ احساس اس شدت سے اٹھ اٹھا رہا تھا۔ کہ اس دہائے میں ایلی کی شخصیت بد گئی۔ وہ جمل کے روبرو کھڑا نہیں ہو سکتا تھا۔ اس کی طرف نگاہ بھر کر دیکھ نہ سکتا تھا۔

پھر اس نے اپنا دل کڑا کر لیا۔ اور پھر بن کر کھڑا ہو گیا اس ڈر کے مارے کہیں جمل کے قدموں میں گر کر معافی مانگنے کے لئے فتنیں کرنا شروع نہ کر دے۔

جمل ایلی کی طرف بڑھا۔ ”ایلی سب ٹھیک ہے نا؟“

ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”بخشی بخاری جی کیا حال ہے جاہ سے ملنے آئے تھے کیا۔“ جمل نے ان سے بات کی۔

”ہاں۔“ بخشی نے کہا اور پھر وہ دونوں خاموش ہو گئے۔

”ان کا حال ساؤ ایلی۔“ اس نے اشارتاً ”پوچھا۔“

”ٹھیک ہیں۔“ ایل نے کہا۔

”کوئی آیا تھا؟“

”نہیں۔“

”خدا بھی نہیں؟“

”نہیں۔“

”پیٹم؟“

”نہیں۔“

”تو بات ختم ہو گئی۔“

”ہاں۔“

جمل بایوس ہو گیا اور برساتی کے باہر کو ٹھہر کر ٹھٹھنے لگا۔

بخاری ایلی کے قریب تر ہو گیا۔ ”یہ تمہارا ساتھی تھا؟“

”ہاں۔“ ایلی بولا۔

”ساتھی کو اپنے خلاف کر لیتا دانشمندی نہیں۔“

ایلی خاموش رہا۔

”اسے متاثر نہ جاہیے۔“ بخاری نے کہا۔

کہاں جاؤ گے؟" جمال پھر رک کر پوچھنے لگا۔

"پتہ نہیں۔" ایلی بولا۔

"پتہ نہیں۔ حد ہو گئی۔" جمال چلایا۔

بخشی اور بخاری چپ چاپ دیوار کے قریب کھڑے تھے ایلی زینے کے پاس تیوری چڑھائے
مل کی طرف دیکھ رہا تھا۔

جمال کوٹھے پر دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ "حد ہو گئی۔" وہ اپنے آپ چلا رہا تھا۔ "یہ کیسے ہو سکتا

ہے۔ عیب بات ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے؟"

رفتہ "جمال رک۔" خط آیا تھا کیا؟

"ہاں۔" ایلی نے کہا۔

"اسی کے ہاتھ؟"

"نہیں۔"

"روی ٹوپی والا لایا تھا؟"

"نہیں؟"

"تو پھر؟"

"ڈاک سے۔"

"اوہ۔ ڈاک سے۔" جمال پھر مضطربانہ طور پر ٹہلنے لگا۔ پھر رک۔ "اگر اگر میں میں یعنی۔" اس

نے تہی نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھا۔

"ہاں۔" ایلی نے جواب دیا اور لفافے سمیت سادی کا خط جمال کی طرف بڑھا دیا۔

جمال نے لپک کر وہ خط اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ پتہ دیکھا پھر بے صبری سے رقعہ نکالا اور
دشٹی سے کھرا ہو کر اسے پڑھنے لگا۔

دیر تک وہ وہاں کھڑا رہا۔ نہ جانے کتنی مرتبہ خط پڑھا ہو گا۔ پھر گویا اس کے جسم کا تار ٹوٹ گیا
بڑھتے بڑھتے گلے گلے ڈھلک گئے۔ "حد ہو گئی۔" اب اس نے اور انداز سے کہا۔ "اچھا بھئی۔" وہ ایلی
کے قریب آگیا۔ "تمہیں مبارک ہو۔" اس نے خط واپس دیتے ہوئے کہا

"جمال صاحب۔" بخاری نے کہا۔ "آپ تو انہیں جانتے ہیں۔ کیا وہ آئے گی؟"

"آئے گی؟" جمال نے دھرایا۔

"لیکن میں — میں کیسے بتاؤں۔"

"اس سے بات چھی نہ رہ سکے گی۔" بخاری بولا۔

"ہوں۔" ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی کہ جمال کے لہجہ
اقبل جرم کرے۔ کچھ دیر کے بعد جمال مڑا۔ "ایلی انہوں نے بلایا تو نہیں تھا؟"

"ہاں۔"

"بلایا تھا؟" جمال نے دہرایا۔

"بلایا ہے۔" ایلی نے جواب دیا۔

"کب؟"

"آج رات کے دو بجے۔"

"آج۔" جمال کا چہرہ سرخ ہو گیا۔ "دو بجے؟" حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

"ہاں دو بجے۔"

"رفتہ" جمال نے محسوس کیا کہ وہ بخشی کے سامنے ہی باتیں کئے جا رہا ہے۔ "اوہ۔" اس نے
ان کی طرف دیکھ کر مسکرائے کی کوشش کی۔

"جمال بھئی۔" بخاری نے پہلی مرتبہ جمال سے بات کی۔ "الیاس آج جا رہا ہے۔"

"جا رہا ہے۔ کہاں؟"

"اس لڑکی کو ساتھ لے کر جا رہا ہے۔"

"کیا مطلب۔ تم جا رہے ہو ایلی؟" وہ ایلی سے مخاطب ہوا۔

"ہاں۔" ایلی نے سر ہلا دیا۔

"کس کے ساتھ؟"

"چھوٹی کے ساتھ۔"

"چھوٹی کے ساتھ۔" وہ حیرت سے سر کھانے لگا۔ "حد ہو گئی۔" اس نے من میں ایک ہنر

"چھوٹی نے بلایا ہے کیا؟" جمال نے پوچھا۔

"ہاں۔"

"حد ہو گئی۔ حد ہو گئی۔" وہ دیوانہ وار من میں گھومنے لگا۔

”مطلب ہے کیا وہ بات کی پکی ہے۔“ بخاری نے پوچھا۔

”مجھے نہیں معلوم۔“ جمال بولا۔ ”ایلی کو معلوم ہے۔ میں تو اسی کے سارے۔“ اس نے اس کی طرف اشارہ کیا۔ اس کی آنکھیں پر نم ہو گئیں۔ بخشی گھبرا کر سی سی کرنے لگا جیسے اسے بہت برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔

”مجھے تو کچھ علم نہیں۔ میں تو میں تو۔“ جمال بولا۔ ”میں تو حیران ہوں۔ مجھ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔“

بخاری بت بنا کھڑا تھا۔

ایلی احساسِ ندامت سے بھیگا ہوا تھا۔

بخشی چپ چاپ ظلم سے جا رہا تھا۔

جمال کبھی سوچ میں پڑ جاتا۔ کبھی سر لٹا کرتا کبھی مسکرانے کی کوشش کرتا کبھی سر کھاتا اور آپ سے کہا۔ ”حد ہو گئی۔“ پھر دفعتاً ”ایلی کی طرف دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا بھاگ کر وہ ایلی سے لپٹ گیا۔

”ایلی۔ تم کمال ہو۔ تمہارا جواب نہیں ایلی تم نے حد کر دی۔ تم ہمیشہ حد کرتے ہو۔ لیکن یاد میں یہ کیسے کر دیا۔ مجھے بڑی خوشی ہے ایلی۔ بڑی خوشی ہے۔ مجھے تم پر یہی امید تھی۔“ جذبات کی شدت کی وجہ سے وہ رک گیا۔ ایلی کی گردن لٹک گئی۔ اس نے محسوس کیا جیسے واقعی وہ مجرم ہو۔

”آپ کو نہیں معلوم۔“ وہ بخشی بخاری نے مخاطب ہو کر کہنے لگا۔ ”ایلی نے شیر مارا ہے۔ شیر بہر۔ آسمان کا تارہ توڑ لایا ہے۔ یہ جادو گر ہے۔ جادو گر۔ اس کا جادو سر چڑھ کر ہوتا ہے۔ میں اس کے جادو سے واقف ہوں۔“

بخشی۔ بخاری حیرت سے جمال کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”اور وہ۔“ جمال ہنسنے لگا۔ ”وہ پیچھے ہٹنے والی نہیں۔ وہ معمولی لڑکی نہیں۔“

”اس کی بات کا کوئی جواب نہیں دے سکتا۔ کون ہے جو اسے روک سکے کون ہے جو اس کی طرف ہاتھ بڑھا سکے۔“ جمال ہنسنے لگا اس کی ہنسی میں ہسٹیریا کا عنصر تھا بخشی بخاری چپ چاپ کھڑے اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔

گھڑی نے بارہ بجادیئے۔

”اچھا تو۔“ جمال چلایا۔ ”میرا دوست آج جا رہا ہے وہ کہتے ہیں تاکیا کہتے ہیں وہ۔“ اس نے

ہاتھ باندھ کر نہیں رہا۔“ وہ بولا۔

”چھ۔“ بخاری نے کہا۔ ”وقت کم ہے۔ ہم ذرا موٹروالے کو دیکھ آئیں جب تک تم تیاری کرنا۔“

”ایلی نے دہرایا۔“ ”میں کیا تیاری کروں گا؟“

”ایلی نے دہرایا۔“

”میرے پاس کچھ بھی نہیں۔“

”جمال صاحب آپ ایلی کے ساتھ جائیں گے۔ میرا مطلب ہے صرف اسے لانے کے لئے۔“

بخاری نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ جمال چلانے لگا۔ ”میں ساتھ جاؤں گا۔ میں اس کا ساتھی ہوں۔ اس نے میرا ساتھ

دیا۔ اب میں اس کا ساتھ دوں گا۔ میں انہیں خود موٹر میں بٹھاؤں گا۔ کیوں ایلی مجھ کے ساتھ لے چلو

لے؟“

ایلی ڈرتا تھا کہ بخشی بخاری کے جانے کے بعد وہ جمال کے ساتھ اکیلا نہ رہ جائے اس لئے وہ

بچے اڑ گیا۔

”میں ذرا جاہ اور پال سے مل لوں۔“ وہ بولا۔

جاہ اپنی چارپائی پر پڑا سو رہا تھا۔ ایک ساعت کے لئے ایلی ہچکچایا۔ پھر اسے خیال آیا کہ شاید پھر

کبھی ملاقات نہ ہو۔

”جاہ جاہ۔“ ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

جاہ نے کڑھائی۔ ”جاہ۔“ وہ چلایا۔ جاہ نے سر اٹھایا۔ ”ہوں؟“

”میں جا رہا ہوں۔“ ایلی بولا۔

”اچھا۔“ وہ نیند میں بولا اور پھر اپنا ذہن ہاتھ بڑھا دیا۔ ”خدا حافظ۔“

ایلی نے جاہ کا ہاتھ پکڑ لیا اور بے پناہ پیار سے اسے سلانے لگا۔ لیکن جاہ پھر سو گیا تھا۔

پلی ایلی پورے طور پر نہیں سویا تھا۔ ”کہیں جا رہے ہو؟“ اس نے پوچھا۔

”گھر جا رہا ہوں۔“

”تو جاؤ۔ میں سمجھا شاید سات سمندر پار جا رہے ہو۔“ پال بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”سات سمندر پار جا رہا ہوں۔ وہیں گھر بٹاؤں گا۔“ پال اٹھ بیٹھا اور پھر

مذاق میں ایلی سے لپٹ گیا۔

لیون کھڑا تھا

”سلاوی؟“ ایلی نے پوچھا۔

”جواب میں اس نے لوہے کا ایک ٹپھی آگے بڑھا دیا۔

”کیا ہے؟“ ایل نے بلی زبان میں پوچھا۔

”میرا زیور ہے۔“ سادی نے جواب دیا۔

”لو نہوں۔“ ایلی بولا۔ ”اسے واپس رکھ آؤ۔“

”کیوں؟“

”یہ تو بالکل ہے۔“ جمال بولا۔ ”لاؤ مجھے دو۔“ یہ کہتے ہوئے اس نے اٹیچی اٹھالیا۔

”نہیں سادی۔“ ایلی دروازے کے سامنے کھڑا ہو گیا۔ ”یہ ہمارے ساتھ نہیں جائے گا۔“

منفید منزل سے ایسی آواز آئی جیسے کوئی بڑا سا ٹرنک کسی نے اٹھا کر فرش پر دے مارا ہو۔

”ہائے اللہ۔“ سادی نے ہاتھ سینے پر رکھ لئے۔ ”باجی۔“ وہ بولی۔

ہمارے ایک مردان کی طرف لپکے۔ وہ اہلی کے قریب آئے اور پھر نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر

مانے، حمل کو دیوچ لیا۔ سادی نے چیخ ماری اور بیہوش ہو کر اندر گر پڑی۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ کیا ہو رہا ہے۔ نیچے گلی میں وہ جمال کو پیٹ رہے تھے اور پر کوئی

اسی تھی کوئی بن کر رہی تھی۔ بند کھڑکیں کھل رہی تھیں۔ پھر اہل چلانے لگا۔

”میں ہوں میں ہوں میں“ ادھر دیکھو ادھر دیکھو میں ادھر ہوں۔“ لیکن وہ اس کی طرف

”یہ ہوئے بادی بادی اس نے ہر شخص کو شانے سے جھنجھوڑا۔ ”یہ نہیں میں ہوں۔ اسے چھوڑ

لیکن کسی نے اس کی طرف توجہ نہ دی وہ سب دیوانہ وار جہاں سے کشتی لڑنے

۱۴

”کون ہے کون ہے۔ کیا ہوا۔“ دو شخص ایلی کی طرف لپکے۔

میں ہوں میں۔" وہ چلایا۔

”ایلی دو ہی بجے ہیں کیا؟“ ایلی نے کوئی جواب نہ دیا۔

دیر تک وہ دونوں چپ چاپ کھڑے رہے۔

پھر سفید منزل سے یوں آواز سی آئی جیسے کوئی ٹرنک کھینچ رہا ہو۔ وہ چوکنے ہو گئے۔

پھر خاموشی چھا گئی۔

پھر زینے میں پاؤں کی چاپ سنائی دی۔

”وہ۔ وہ۔“ جمل بولا۔

ایلی نے آہستہ سے بند کھڑکی کو انگلی سے بجایا۔

نذر سے دروازے کی چٹخنی کھلنے کی آواز آئی۔

”اچھا تو تم ہو۔“ ان دونوں نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر گھسیٹنا شروع کر دیا۔

پھر وہ دونوں ایلی کو کسی تنگ جگہ میں ٹھونس رہے تھے۔

ہوا کے چار ایک جھونکے لگے تو ایلی نے دیکھا کہ وہ موٹر پر سوار ہے اور اس کے پاس بخاری ہوئی ہے۔

”نہیں نہیں۔“ وہ انہیں دیکھ کر چلایا۔ ”مجھے جانے دو۔ مجھے جانا ہے۔“ وہ چلا آیا لیکن گاڑی فرائے بھرتی چلتی رہی۔

”یہ تم کیا کر رہے ہو۔“ ”نہیں نہیں میں نہیں جاؤں گا۔ مجھے جانا ہے۔ مجھے چھوڑ دو۔“

”روک لو۔ روک لو۔“ ایلی چیخ رہا تھا۔ دیر تک وہ چلاتا رہا پھر دھنسا۔ ”بخاری بولا۔“

”روک لو۔“

گاڑی رک گئی۔

”مجھے جانا ہے بخاری جی مجھے جانا چاہیے مجھے جانا ہو گا۔“ ایلی کے سر پر گویا جنون سوار تھا۔

”لیکن۔“ ”بخشی بولا۔“

”لیکن دیکھ کچھ نہیں۔ اگر میں نہ گیا تو زندگی بھر۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”زندگی بھر۔“ اس نے پھر ناکام کوشش کی۔

”موڑ لو۔“ بخاری نے ڈرائیور سے کہا۔

موٹر واپس جا رہی تھی۔ وہ تینوں خاموش تھے۔

ایلی کو کچھ احساس نہ تھا کہ وہ کیا کر رہا ہے۔ اسے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ وہ کیوں واپس جا رہا ہے۔

واپس جا کر اسے کیا کرنا ہے۔ اسے اس وقت یہ بھی خیال نہ آیا کہ سادی خطرے میں تھی۔

بھی احساس بھی نہ تھا کہ جیل کو چھڑانا اس کا اخلاقی فرض تھا۔ اس وقت فرض اور اخلاقی ایلی کے لیے دو مہمل لفظ تھے۔ اسے صرف ایک خیال تھا کہ سادی کیا کے گی کہ ایلی بھاگ گیا سفید منزل سے۔

ہی انہوں نے اسے موٹر سے اتار دیا۔

”اچھا بھائی۔“ بخاری نے کہا۔ ”خدا حافظ۔“

ایلی نے اس کی بات نہ سنی اور دیوانہ وار سفید منزل کی طرف بھاگا۔

گلی میں کوئی نہ تھا لیکن سفید منزل کے ارد گرد کے سبھی مکانات میں بتیاں جل رہی تھیں۔

زیر لجن باتیں سنائی دے رہی تھیں۔

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

منزل کا پھانک نما صدر دروازہ بند تھا۔ اندر سے آوازیں آرہی تھیں کوئی کسی کو

نوادرو نے غصے میں ہاتھ اٹھایا۔ میں تمہاری ہڈی پتلی توڑ دوں گا۔

ایلی چپ چاپ کھڑا رہا۔ ”توڑ دیجئے۔“ وہ بولا۔

”تم نے کوئی دھوکا یا فریب کیا تو یاد رکھو میرے سرہانے تلے پستول پڑا ہے۔“

”میں کب کہتا ہوں کہ میں نے احسان کیا ہے آپ پر۔“ ایلی نے غصے سے پھر کر کہا۔

”تو کس پر احسان کیا ہے۔“ نوجوان چلایا۔

”کسی پر بھی نہیں۔“

”تم پہلے کبھی آئے اس گھر میں؟“

”نہیں۔“

”کیا تمہیں معلوم ہے کہ یہ گھر کس کا ہے مجھے جانتے ہو؟“

”نہیں۔“

نوجوان خاموش ہو گیا اور ایک سگرت سلگا کر پینے لگا۔

ایلی غور سے اسے دیکھ رہا تھا۔

وہ ایک خوبصورت جوان تھا۔ درمیانہ قد بھرا بھرا جسم گدے سے ہاتھ پاؤں۔ سفید رنگ

فراخ ماتھے پر تیوری تھی۔ خمدار ہونٹوں میں مسکراہٹ دہی ہوئی تھی۔ اس نے انگریزی لہجہ

سلیڈنگ سوٹ پہن رکھا تھا۔

وہ کمرہ نہایت مختصر تھا۔ دیواروں پر ہلکا گلابی پینٹ کیا ہوا تھا۔ پانگ پر جدید طرز کی چادر

ہوئی تھی۔ سرہانے کا غلاف ہم رنگ تھا۔ تپائی پر دو ایک کتابیں پڑی تھیں۔ پانی کے لئے

کانچ کی صراحی تھی۔ کارنس پر دو ایک چیزیں بکھری ہوئی تھیں۔

پانگ پر لیٹے ہوئے سگرت کے کش لگاتے ہوئے نوجوان کبھی کبھی آنکھ پچا کر ایلی کی طرف

دیکھتا اور پھر یوں چھت کو گھورنے لگتا جیسے خوفناک ارادے قائم کرنے میں شدت سے

مذاہدہ کر رہا ہو۔

دھنچکا اور پے چنچوں کی آواز سنائی دی کوئی چلا رہی تھی۔ کوئی نین کے ذریعہ جاگتا

کوئی کراہ رہی تھی۔ پھر کوئی تھکے مار کر بیٹس رہی تھی۔

نوجوان چھلانگ مار کر اٹھا۔ دروازے میں کھڑے ہو کر اس نے اوپر چنگی کی طرف اشارہ

پھر رعب سے لٹکارا۔ ”کیا ہو رہا ہے۔“

توڑنا بدستور جاری رہیں۔

نوجوان ایلی کی طرف مڑا خبردار ”نوجوان چلایا۔“ اگر بھاگنے کی کوشش کی۔ اور پھر

یہی ذہن میں داخل ہو گیا۔

ایلی

ایلی اکیلا رہ گیا صدر دروازے سے ملحقہ کمرے میں سے چار ایک شخص باہر نکل کر

میں کمرے ہو گئے۔ ایلی غور سے ان آوازوں کو سن رہا تھا۔ جو اوپر سے آرہی تھیں۔

نہ تو بلی اور نہ سادی کی آواز سنائی دے رہی تھی۔ وہ حیران ہو رہا تھا کہ اوپر صورت حال

بہرحال صورت حال تسلی بخش نہیں معلوم ہوتی تھی۔ نہ جانے کیوں وہ اس بات پر

غور کر رہا تھا کہ اوپر حالات تسلی بخش نہیں معلوم ہوتے تھے۔

خیال آیا وہ مڑا اوپر والے زینے کے مقابل میں ایک دروازہ تھا۔ ہوں اس نے سوچا تو یہ

اکو جس میں ہم ملا کرتے تھے۔ دروازہ بند تھا۔ لیکن وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے کھلا ہو۔

پانٹ پڑے تھے۔ اس کے قریب ہی کاٹھ کباڑ والا زینہ تھا۔ سلاخوں والی کھڑکی کے

ایک لہجہ سگرت پڑا تھا۔

ایلی نے دے پاؤں زینے سے اتر رہی تھی۔ ”خدا کے لئے۔“ وہ بولی۔ ”آپ اب جائیں

۔“

نوجوان کا چلا جاؤں گا۔ گہرائی کیوں ہیں آپ اب جانا ہی ہے نا۔“

نہیں نہیں۔“ اوپر کوئی چیخ کر بولی۔

نوجوان اوپر دیکھنے لگا۔

نہ لاد رہی تھی۔

نوجوان سیزھیوں سے نکل کر اندر داخل ہوا۔ ”آپ؟“ اس نے ایلی کی طرف

نہ لاد رہی تھی۔

کچھ دیر کے بعد نوجوان نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ تم نے میری

نہ لاد رہی تھی۔“ اس نے زور سے دروازے پر لات ماری۔ ”تم نے وہ جرم کیا ہے کہ

میں کل بھرا کروں تو کم ہے۔“

”ہاں“ ایلی نے کہا۔ ”میں نے چوری کرنے کی کوشش کی ہے۔“

”بکو نہیں۔“ نوجوان کی آنکھیں انگاروں کی طرح روشن ہو گئیں۔ ”میں تمہاری ہڈی توڑ کر رکھ دوں گا۔“ وہ جوش میں ایلی کی طرف لپکا۔ اس نے دونوں ہاتھ اٹھا رکھے تھے چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔ قریب آکر نوجوان نے اپنی بائیں ایلی کے گرد حائل کر دیا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر بچوں کی طرح بلک بلک کر رونے لگا۔ نوجوان کی کراہیں سن کر لوہڑا چٹا ہوا ہو گیا۔

پہلے تو ایلی حیران کھڑا رہا۔ پھر اسے وہی خوشبو سی محسوس ہوئی جو سلامی کے لباس میں تھی اور کمرے کی فضا میں اڑا کرتی تھی۔ وہ نوجوان کے قریب تر ہو گیا۔ اس کا پیچھا کرنا دامن پکڑے اور اسے اپنی آنکھوں پر ملے۔ دیر تک وہ دونوں بغل گیر رہے۔

خوش شکل جوان نے آنکھیں پونچھیں اپنا آپ قابو کر کے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو چکا ہو گیا۔

”مجھے ساری بات بتا دیجئے۔“ اس نے ایلی سے کہا۔ اس کا انداز بالکل بدلا ہوا تھا۔

”ساری بات؟“ ایلی نے منصوبی حیرت کا اظہار کیا۔

”مجھ سے کوئی بات نہ چھپائیے۔“ نوجوان نے منت کی۔

”لیکن۔“ ایلی بولا ”میں تو چور ہوں چوری کے لئے آیا تھا۔“

نوجوان خاموش ہو گیا۔

”ایک بات پوچھوں۔“ کچھ دیر کے بعد نوجوان نے بات کی۔

”فرمائیے۔“

”اگر ہم پولیس بلوا لیتے تو کیا آپ وہی بیان دیتے۔“

”جے شک۔“ ایلی نے کہا۔

نوجوان پھر سوچ میں پڑ گیا۔

”آپ نے اغوا کا فیصلہ کیسے کیا۔“ نوجوان نے پوچھا۔

ایلی خاموش رہا۔

کیا یہ تجویز آپ کی طرف سے تھی۔“ نوجوان رک گیا۔

میری طرف سے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”جی کہ رہے ہیں آپ“ نوجوان نے پوچھا۔

”ہاں۔“ ایلی بولا۔

”آپ کا مقصد اسے گمراہ کر کے خراب کرنا تھا۔“

”یہ غلط ہے۔“ ایلی نے غصے میں نوجوان کی طرف دیکھا۔

”تو کیا مقصد تھا۔“ نوجوان نے پوچھا۔

”ظاہر ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”میں بیک میل کرتا ہوں۔“ نوجوان کو پھر سے غصہ آ گیا۔

”یہ الزام ہے۔“ ایلی نے دانت پیسے۔

”وہ“ نوجوان پھر حلال میں آ گیا۔ ”دور ہو جائیے میری نگاہوں سے میں آپ کی شکل دیکھنا نہیں چاہتا۔ ہماری زندگی میں آپ کے لئے کوئی جگہ نہیں۔ جائیے جائیے۔“

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”آپ نے ہمیں وہ دکھ پہنچایا ہے کہ۔“ نوجوان کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔ لیکن یاد

لے کر آپ نے پھر کسی قسم کا رابطہ قائم کرنے کی کوشش کی تو۔۔۔۔۔ جاؤ۔“

ایلی پھر بھی بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد نوجوان پھر لپک کر باہر نکلا ”محمد علی۔“ اس نے کسی کو آواز دی۔ ”باہر نکال اے۔“

پتلا رطلان فص صدر دروازے سے لپک کر آیا اور ایلی کا ہاتھ کھینچنے لگا۔ پھر اس نے صدر

اند کی ہماری چٹنی کھولی اور ایلی کو باہر دھکیل کر اندر سے کنڈی لگا دی۔

باہر صبح کی روشنی پھیلی ہوئی تھی۔

کمرہ کیوں سے لوگ سر نکال کر دیکھ رہے تھے۔ وہ اس کی طرف اشارے کر رہے تھے۔

”گوان ہے؟“

”گدھر ہے؟“

ایلی چپ چاپ سر جھکائے یوں چل رہا تھا۔ جیسے رام باس کو جا رہے ہوں۔

سادی

بہی کل رات ہم سے بغل گیر ہو رہا تھا۔ ”پال بولا
 ”میں نے بھی کہا بارہ بجے کوئی گاڑی جاتی ہے۔“
 ”معلوم نہ تھا کہ ایلچی چھپا رستم ہے“ جاہ نے کہا ”انسان کو سمجھنا کس قدر مشکل
 ہے۔“ فرف تودہ پایاب کنارہ اور دوسری طرف یہ علق ”وہ فلسفیانہ انداز میں مسکرایا۔ اس
 ٹراٹ میں تھخیر کی جھلک تھی۔

پال نے لگا ”بھئی عشق و محبت کے دن ہیں۔“
 ”ہم پر تو نہ آئے یہ دن“ جاہ نے کہا ایک سے ذرا سی راہ و رسم ہوئی تھی۔ لیکن یار یہ کام
 ہاں کا نہیں۔ کون سا راقص ضائع کرے۔“ وہ ہنسنے لگا۔
 ”لیکن کیا واقعی وہ جا رہے تھے؟“ پال نے پوچھا۔
 ”ہاں ہاں“ بھانے کہا۔

نیت ہے۔“ جاہ بولا ایلچی پر کوئی اس قدر مفتون ہو جائے کہ — ”وہ ہنسنے لگا ”ہاں بھی
 اپر ہوتی تو بات بھی تھی اور پھر انصار منصر کا گھرانہ۔ کوئی معمولی گھرانہ نہیں۔“
 انصار منصر ”پال نے پوچھا وہ کون ہے۔“
 ”میر تو خیر نہیں مگر بڑا منذب متدن گھرانہ ہے اور منصر کی قابلیت کا بڑا چرچا ہے اصلیت کا
 میں مجھے شاید واقعی قاتل ہو۔ ویسے اونچے ہو نلوں میں بیٹھنے والا آدمی ہے۔“
 ”او تو بڑا آدمی ہوا۔“ پال تمسخر سے بولا جاہ ہنسا ”باقی اللہ جانے۔“
 ”ایلی سے پوچھیں تو ہی“ بھانے کہا۔

”نفس“ بولا جس بات کو اس نے ہم سے خود جان بوجھ کر راز رکھا ہے — اور پھر
 کے پائینٹ معاملات میں دخل دیتا — ”
 ”میں نے بھی پہلے روز تذکرہ چھیڑا تھا۔“

”یہ نہ خواتمہ بڑا دیا۔“ وہ بولا ”میں چیخا چلاتا رہا کہ میں نہیں ہوں لیکن انہوں نے
 ”یہ نہ خواتمہ“ اور پھر اندر لے جا کر پھر سے پٹائی شروع کر دی پھر دھونس بھانے لگے میں
 ”یہ نہ خواتمہ“ حضور میں نہیں ہوں۔ آپ غلط آدمی کو پکڑ لائے ہیں لیکن وہ میری بات ہی
 ”یہ نہ خواتمہ“ تم تو شکر ہے تم واپس آگئے اور تمہاری آواز سن کر میں نے شور مچا دیا کہ وہ ہے وہ
 ”یہ نہ خواتمہ“ آتے تو نہ جانے کیا ہوتا۔“

بہتا تنکا

سفید منزل سے آنے کے بعد ایلچی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ لکڑی کا ایک چھوٹا سا ٹکڑا ہو
 جہاز کے پاش پاش ہو جانے کے بعد طوفان میں بہتا ہوا ایک ویران ساحل پر آگیا ہو۔
 لاہور کی وہ ہما بھی گویا معدوم ہو چکی تھی۔ عمارتوں کا وہ پھیلاؤ سمٹ کر بے معنی تھرا
 بن گیا تھا۔ جسے چاروں طرف سے پھیکے نیلے آسمان نے گھیر لیا تھا سڑکوں پر دھول اڑتی تھی۔
 مکانات گڈمڈ ہو رہے تھے۔ جیسے دفعتاً ”زندگی سے حرکت مفقود ہو گئی ہو اور چادر پر ایک ساکن
 تصویر رہ گئی ہو۔“

سارا دن وہ نیم چھتی میں بیٹھ کر اوگھٹا شام کو سوچتا کیا کروں کدھر جاؤں۔
 اس کی اس تواریخی واپسی کے بعد صرف ایک دن کے لیے ٹاؤ گھر میں ہنگامہ سا واقعہ
 جانے کیسے لیکن بھاجہ اور پال کو اس رات کے ہنگامے کا علم ہو چکا تھا۔ ممکن ہے جتنی
 نے بات کہندی ہو یا خونِ بلغم کے لب کے اس ڈاکٹر نے انہیں قصہ سنا دیا ہو جو سفید چٹل کے
 قریب ہی رہتا تھا۔ یا شاید بھانے ہنگامہ سن کر خود جا کر تحقیق کی ہو ہر حال اس روز وہ چوں
 تک بیٹھے باتیں کرتے رہے تھے۔

”بڑا ہنگامہ ہوا۔“ بھانے کہا ”سارے محلے والے جانتے ہیں۔“
 ”ہوں۔“ جاہ نے منہ بتایا۔

یہ قصہ سنانے کے بعد وہ الیاس سے پوچھتا رہا کہ اس کے ساتھ سفید حملی سلوک کیا۔ ایلی نے مختصر سی بات بتا کر قصہ ختم کر دیا۔

دو دن تو ایلی چپ چاپ اس وسیع دیرانے کو حیرت سے گھورتا رہا جو اس کے ارد گرد ہوا تھا۔ تیسرے روز اس دھندلے میں روشنی کی ایک کرن دکھائی دی ڈاک سے ایلی کے کا ایک خط موصول ہوا جس میں لکھا تھا ازراہ کرم مجھے شام کے وقت میرے دفتر میں بیٹہ دفتر کا منسل پتہ تحریر تھا۔

خط موصول ہونے کے بعد ایلی کے گرد و پیش پھر سے استوار ہو گئے۔ چیزیں بہت اصلی روپ میں اباگر ہو گئیں۔ آسمان سمناشر پھیل گیا۔ نہ جانے کیوں بلایا ہے ایلی شاید کیس پولیس کے حوالے کر دینے کا ارادہ ہو۔ یا شاید پھر سے تحقیق کرنی ہو۔ چاہے یہ ہو۔ چاہے اس ملاقات کی نوعیت ضرر رساں ہو۔ پھر بھی ملاقات تو ہوگی۔ چاہے کئی ایک تعلق تو استوار ہو گا۔ اور پھر منصر کا قرب اس کے گدے سے ہاتھ پاؤں اس کے ہونے۔ غم۔ اس کا ذہانت بھرا حسین چہرہ — ایلی بے حد خوش تھا۔

انصار منصر

شام کے وقت جب وہ دفتر پہنچا تو منصر نے اس کی آمد کو خاص اہمیت نہ دی۔ ”بیٹھے۔“ وہ بولا ذرا میں کام ختم کر لوں۔ سگرت پیجئے۔“ اس نے پیک ایلی کی طرف دیا اور یوں کام میں منہمک ہو گیا جیسے اسے خصوصی طور پر بلایا ہی نہ گیا ہو۔ دیر تک ایلی وہاں بیٹھا رہا وہ حیرت اور احترام بھری نگاہوں سے منصر کو دیکھتا رہا۔

آپ کو زیادہ دیر کے لیے انتظار تو نہیں کرنا پڑا؟“ منصر نے اس کے قریب آ کر بے لطف سے کہا ایلی اس کے رویے پر حیران تھا۔

”آئیے“ منصر نے کہا ”اب چلیں۔“

لیکن ”ایلی نے کہا۔ آپ نے تو مجھے بلایا تھا۔“

”ہاں ہاں“ منصر بولا چلئے ناگھو میں پھرے۔“

ایلی نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا۔

کئی جگہ کربا تیں کریں گے۔“ منصر نے پینتر ابدلا۔

منصر نے ایلی کو اپنے موٹر سائیکل کے پیچھے سوار کر لیا وہ دو دونوں چل پڑے۔

منصر ہوسٹل میں پہنچ کر منصر نے سرسری طور پر کہا۔

”میں نے سوچا آج شام آکھٹے بسر کریں۔ آپ تو سارا دن مطالعہ کرتے تھک جاتے ہوں۔“

ایلی سوچ رہا تھا کہ کہاں وہ باہر نکال دو اس بد معاش کو۔ اور کہاں یہ آکھٹے شام بسر کرنے کی

بلاور حیرت کی بات یہ تھی کہ دو گھنٹے آکھٹے رہنے کے بعد منصر نے اشارتاً ”بھی کسی ایسی بات

کرنا کیا تھا جو گزشتہ واقعہ سے متعلق ہو۔ وہ نہایت بے تکلفی اور گرم جوشی سے ایلی سی

با کر رہا تھا۔ جیسے دونوں بہت پرانے دوست ہوں۔

انصار منصر کی شخصیت کو دیکھ کر ایلی بھونچکا رہ گیا۔ وہ ایک خوب صورت اور پیارا جوان

اس کا لباس سادہ ہونے کے باوجود نفیس تھا۔ جس میں رنگوں کا حسین امتزاج تھا۔ اس کی

لٹ میں لے تھی۔ ہاتھوں میں مزاج کی جھلک تھی۔ مزاج رنگین تھا اور شعر و سخن ادب اور

نہ سے لگاؤ تھا اور اس کی علمی معلومات بہت وسیع تھیں۔

منصر نے جب ایلی کو ناؤ گھر کے دروازے پر موٹر سائیکل سے اتارا تو وہ کہنے لگا اگر اعتراض

ہو۔ میرا مطلب ہے اگر آپ کو کوئی پروگرام نہ ہو اور تعلیم کا حرج نہ ہو تو کل شام کو دفتر

آئیے گا۔“

اس کے بعد ایلی کا معمول ہو گیا کہ سارا دن وہ کتاب سامنے رکھ کر شام کے خواب دیکھتا

تھم کو منصر کے دفتر میں پہنچ جاتا اور پھر جب منصر کام سے فارغ ہوتا تو وہ اس کے موٹر

نگاہوں میں بیٹھا جیسے شاہی تخت پر بیٹھا ہو۔ شاہ کا جلوس سڑکوں پر گھومتا۔ لوگ حیرت سے

ماں طرف دیکھتے اور ادب سے صف آرا ہو جاتے کورٹش بجالاتے۔ جب وہ مشغلہ ہوٹل میں

پہنچتا تو میرے تعلیم کے لیے کھڑے ہو جاتے۔

اگرچہ منصر کی عادت تھی کہ وہ عالمانہ باتیں کرنے سے احتراز کرتا تھا پھر بھی کوئی نہ کوئی

تعلیم کے منہ سے نکل جاتی جسے ایلی یوں حفظ کر لیتا جیسے وہ قرآن کریم کی آیت

تھی۔ بلکہ بات چھوڑے منصر کوئی بھی ایسی بات کرنے سے احتراز کرتا تھا۔ جس سے اس کی

بہتلی جہت ہو۔ یا جو ایلی کو احساس کمتری دلائے۔ عجیب بات تھی یہ کہ منصر نے کبھی ایلی کو اس

لیکن سبھی کبھار جاہ تک بات پہنچ ہی جاتی اور وہ منہ ہٹا کر کہتا۔

”ابن سبھی آج کل اہلی صاحب اونچی ہواؤں میں اڑتے ہیں۔ ہم ریگننے والے لوگ ان کی جہن میں کھل جاتے ہیں۔“

لیکن ایک حقیقت تھی جب سے اہلی منصر سے واقف ہوا تھا اس کے دل میں جاہ کے لیے لوریہ ایک احترام نہ رہا تھا۔ وہ محسوس کرنے لگا تا جیسے وہ کتابی دنیا میں محصور ہو۔ وہ اس رنگینی سے بے گدز ہو جو زندگی کی جان ہے اس کی شخصیت میں کتابی علم کے علاوہ اور کچھ بھی نہ تھا۔

سبھی کبھار جب وہ منصر کے پاس ہوتا تو اسے خیال آتا کہ اگر میں بی۔ اے نہ کر سکا تو کیا ہو گا۔ یہ لوگ کیا سمجھیں گے شاید وہ ایک انڈر گریجویٹ کو درخور اعتناء نہ سمجھیں۔ اس روز گھر آکر بیوی نے اسے کتابیں کھول کر بیٹھ گیا۔ لیکن کتاب کے صفحات سے سادی جھانکتی۔ ”میں بیمار ہوں۔“ منصر ہنستا ”آپ مجھ سے بات کریں الیاس صاحب۔ براہ راست ان سے بات نہ کرنے کا آپ نے وعدہ کیا ہے۔“ سادی چلائی۔ اوموں۔ ان کا آپ سے تعلق صرف میری وجہ سے ہے ان کی مہربانیاں میری وجہ سے ہیں۔ ان میں نہ کھو جائیے گا۔ یہ صرف آپ کی توجہ کو جذب کرنا ہے جس میں تاکہ مرکز ٹوٹ جائے۔“

اہلی کتب بند کر دیتا۔ پھر اسے محسوس ہوتا کہ زینے میں شزاؤ کھڑی حرام بھری نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ رہی ہے۔ وہ مڑتا۔ شزاؤ آنکھیں جھکا لیتی اور زیر لب کہتی ”نہیں میں نے بل نہیں کیا“ اور پھر بیڑھیاں اترنا شروع کر دیتی۔

اجتہاد

ایک روز جب منصر اور اہلی دونوں ہوٹل میں بیٹھے تھے تو منصر نے غیر معمولی ہیرے کو اُٹھا دیتے ہوئے کہا ”دو چھوٹا“ اہلی چونکا۔ دو چھوٹا اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ اس سے پہلے تو منصر نے کبھی دو کا آرڈر نہ دیا تھا۔ شاید بے خبری میں — لیکن منصر تو بے خبری نہیں بلکہ ہوشمندی کا مظاہرہ کیا کرتا تھا۔ اس میں عقل اور جذبے کی عجیب سی آمیزش تھی۔ اس نے ایک نیک کہ جذبہ حاوی رہتا تھا لیکن اظہار کرنا منصر کے نزدیک مستاپن تھا۔ اس کا وقار ان کی اجازت نہ دیتا تھا۔

مکس نے دونوں چھوٹے میز پر رکھ دیے۔ منصر نے سگٹ پھینکتے ہوئے تعجب سے میز کی

حقیقت کا احساس نہ دلایا تھا کہ وہ سادی کا بھائی ہے یا اسے اس گھرانے سے کوئی تعلق ہے۔ اہلی پر چوری کا الزام لگایا گیا تھا۔ منصر نے اس دوران میں الزام اپنے گھر کے متعلق مرفی کی بات کی تھی اور وہ بھی سرسری طور پر کہنے لگا۔

”الیاس صاحب آپ سفید منزل کی طرف کبھی نہ جائیے گا۔ ورنہ وہی تباہی ہو بیچیدگیں پیدا ہو جائیں گی اور ممکن ہے —“ وہ رک گیا اور پھر معنی خیز مسکراہٹ سے کہنے لگا ”مجھے یقین ہے کہ آپ ایسی حفاظت نہیں کریں گے لہذا جملہ مکمل کرنے کی کیا ضرورت ہے۔“ اس کے علاوہ ایک روزانہ جانے میں منصر کے منہ سے گھر کی بات نکل گئی تھی جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ سادی بیمار ہے اور کسی سپیشلسٹ کے زیر علاج ہے۔ اس پر اہلی چونکا تھا۔ اس جی چاہتا تھا کہ منصر سے پوچھے کہ اسے کیا تکلیف ہے اور اب کیا حال ہے۔ لیکن منصر نے موضوع بدل دیا تھا اور اہلی میں پوچھنے کی جرات نہ ہوئی تھی پھر کچھ دیر کے بعد وہ منصر کی حد تک جذب ہو کر رہ گیا تھا کہ وہ یہ بھول چکا تھا کہ سادی بیمار ہے۔

پھر شام گزارنے کے بعد رات کے گیارہ بجے جب منصر نے اسے اپنے موٹر سائیکل سے اتارا تھا تو ناؤ گھر کی سیڑھیاں چڑھتے ہوئے دفعتاً ”اہلی کو یاد آیا تھا کہ سادی بیمار ہے۔ وہ تپ کر مڑا تھا کہ منصر سے پوچھے لیکن منصر جا چکا تھا۔ چند ایک روز کے بعد منصر نے خود ناؤ گھر آنا شروع کر دیا تھا۔ وہ کبھی اوپر نہ آیا تھا۔ شام کے وقت وہ ناؤ گھر کے نیچے بارن بجاتا اور اہلی فوراً اُتر آتا۔ روز موٹر سائیکل کو ناؤ گھر آتے دیکھ کر بھا جاہ اور پال حیرانی سے اہلی کی طرف دیکھتے تھے اور جمل تو اسے دیکھ کر یوں کھل جاتا جیسے خربوزہ منٹاس کی وجہ سے پھٹ جاتا ہے۔

”یار اہلی تم کمال ہو۔“ وہ چلاتا ”یار تم تو منزل تک پہنچ کر رہے۔ اب کیا ہے اب تو ب رام ہو گئے ہیں۔ کیوں۔“

لیکن اہلی کو نہ جانے کیا ہوا تھا وہ جمل سے اجتناب کرنے لگا تھا۔ اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ جمل کے دروہ اہلی احساس جرم محسوس کرتا تھا۔ جیسے اس نے جمل کے سفید رنگ اور سنہرے بالوں کو اپنے مفاد کے لئے استعمال کیا ہو جیسے اس نے شکار کرنے کے لیے شہرے ہلکا دانا پھینکا ہو۔ اسی وجہ سے وہ اس سے زیادہ بات نہ کرتا بلکہ کوشش کرتا کہ اس کی بات نہ دے۔

نیم چمکتی سے نیچے تو اہلی جاتا ہی نہ تھا۔ اگر کبھی جاتا بھی تو کوشش کرتا کہ جاہ سے دور رہے۔

”ہوں۔ تو کیا آخری واقعہ کے متعلق وہ تجویز آپ کی ہی تھی؟“

”ہاں“

”اس سے آپ کا مقصد کیا تھا۔“

”جذبہ اور کیا۔ میں نے سوچا نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”آپ نے یہ نہ سوچا کہ کسی کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

”نہیں“ ایللی نے کہا۔

”اور آپ کی تجویز منظور کیسے کر لی گئی؟“

میں نے خود کشی کی دھمکی دی تھی۔ شاید اس لیے۔“

منصرہ قہقہہ مار کر ہنسا۔

”اور وہ زیور۔ کیا آپ کے کہنے پر لایا گیا تھا۔“

”نہیں۔ بلکہ اگر وہ اٹھتی نہ ہوتا تو ہم جا چکے ہوتے۔“

”کیسے۔“

”میں نے اسے ساتھ لے جانے سے انکار کر دیا تھا۔“

”پھر آپ موقع سے بھاگ کیوں گئے؟“

”مجھے میرے دو دوست زبردستی گھسیٹ کر لے گئے تھے۔“

”ہوں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسا آپ بھی خوب ہیں الیاس صاحب۔“

”کچھ دیر کے بعد اس نے پوچھا اگر آپ لوگ چلے جاتے تو کیا کرتے۔“

”شادی۔۔۔ ایللی نے کہا۔

”ہوں۔“ منصرہ نے ایک بھر پور نگاہ ایللی پر ڈالی۔

آپ کو امداد دینے والا کوئی تھا۔ میرا مطلب ہے جہاں سے امداد کی توقع لگائی جائے

”نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”آپ کے والدین زندہ ہیں۔“

”جی۔“

”تو ظاہر ہے کہ وہ آپ کی مدد کریں گے۔“

”اوہوں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”کیوں“ منصرہ نے پوچھا۔

”والدہ صاحب کی تین بیویاں ہیں۔“

”ہوں۔ اور آپ کی اپنی والدہ۔“

”وہ ان کی پہلی بیوی ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”ایللی اٹھ بیٹھا اس کا ضبط ختم ہو چکا تھا ہوش کا وہ کمرہ لٹو کی طرح گھوم رہا تھا۔ میز ایک

”دوسرے سے ٹکرا رہے تھے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ کسی نالی میں گر کر رہے ہوش ہو جائے

منصرہ بار بار اسے کہہ رہا تھا کچھ کھائے تاہم تلوے ہوئے آلوؤں کے علاوہ کھانے کو جی نہیں

پاہتا تھا۔

”بیٹھے ہا“ منصرہ نے کہا۔

”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”چلے میں آپ کو ٹھیک کر دوں۔“ منصرہ نے ایللی کو سائیکل پر بٹھالیا۔ ایللی نے مضبوطی سے

منصرہ کو پکڑ لیا۔ اور پھر ایللی کو اس وقت ہوش آیا جب سائیکل رک چکا تھا۔ اس نے سمجھا کہ ناؤ

گھر آیا وہ ہونچکا رہ گیا۔ شاید نشے کی وجہ سے اسے ناؤ گھر کا چھوٹا سادہ روازہ بھانک دکھائی دے

رہا تھا۔

”آئیے۔“ منصرہ نے آکر اپنا ہاتھ اس کے شانے پر رکھ دیا۔

اسے۔“ حیرت سے اس نے منصرہ کی طرف دیکھا۔ وہ دونوں سفید منزل میں داخل ہو رہے

تھے۔

”ایک بات کہوں۔“ منصرہ نے ہنس کر ایللی سے کہا۔ ”پہلے تو ہم نے آپ کی بات تسلیم کر لی

تھی لیکن اگر اب آپ کہیں کہ آج پینے کا آپ کا پہلا موقع تھا۔“ تو وہ رک گیا۔ ”بات قابل

قبل نہیں۔“

”بیٹھے منصرہ نے کہا۔ ایللی نے کمرے کی طرف دیکھا یہ وہی کمرہ تھا جہاں وہ چند روز پہلے چور

کی حیثیت سے داخل ہوا تھا۔ اور آج — لیکن آج تو اسے اپنی حیثیت کا علم نہ تھا۔ وہ

محسوس کر رہا تھا کہ واقعات پر اسرار طور پر رخ بدل رہے تھے نہ جانے کیا ہونے والا ہے نہ

بلنے کیا ہو گا۔ ایللی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔ منصرہ نے کئی بار اسے تاکیدا ”کہا تھا۔“ الیاس

صاحب آپ کا ہمارے گھر جانا یا کسی قسم کا کوئی رابطہ پیدا کرنا ہمارے لیے تکلیف کا باعث ہو گا اور اب جب کہ ہمارے دوستانہ مراسم ہو چکے ہیں اگر آپ نے چوری چھپے کوئی بات کی یا کوئی بات مجھ سے چھپائی تو مجھے دکھ ہو گا۔

”آپ شاید یہ سوچ رہے ہیں کہ یہاں آپ کو کیوں لایا گیا ہے۔ مجھے دفعتاً خیال آیا کہ اس حالت میں آپ کو اپنے لاج میں نہیں جانا چاہئے۔ ابھی ٹھیک ہو جائیں گے۔ آپ لیجئے سگریٹ پیجئے۔ اوہ میں ہمیشہ بھول جاتا ہوں کہ آپ سگریٹ نہیں پیتے۔ لیکن اس میں میرا قصور نہیں کیونکہ اس عمر میں کم و بیش لوگ سگریٹ پینا شروع کر ہی دیتے ہیں۔“

سائیکل پر ہوا کھانے کے بعد ایللی کی حالت اور بھی خراب ہو چکی تھی۔ اس کے تہم جہم میں شعلے بھڑک رہے تھے۔ منہ سخت کڑوا ہو رہا تھا طبیعت مالاں کر رہی تھی۔

”آپ کچھ دیر کے لیے یہاں آرام کیجئے۔ لیٹ جائیے۔“ لیکن ایللی اپنے آپ کو سنبھالنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں ابھی آیا“ کہہ کر منصر چلا گیا اور ایللی کمرے میں اکیلا رہ گیا۔

پھر دفعتاً اس کی طبیعت گھبرائی وہ باہر نکلا گا۔ سامنے اس زینے کا دروازہ تھا جہاں وہ پہلے کی ایک بار آچکا تھا ایک کرکڈی کھولی اور اندر پہنچتے ہی شدت سے نلے کرنا شروع کر دیا۔

تے کے بعد اس کی طبیعت ہلکی ہو گئی۔ اس نے اس کمرے کی طرف حسرت بھری نظر ڈالی۔ فرش پر ابھی تک سگریٹوں کے ٹکڑے پڑے ہوئے تھے۔ گھیر دھوئیں پر ایک ماہی پڑی تھی۔ اسے ان ملاقاتوں کا خیال آگیا۔ یہاں وہ بیٹھ جایا کرتا تھا اور کوئی کلمہ نہ کرتی تھی آپ بیٹھ کیوں گئے۔ اٹھئے نا۔“

”آئیے نا۔“ اس کی پشت پر منصر کھڑا تھا۔ ”یہاں کھڑے کیا کر رہے ہیں۔ آپ۔“ اسی روز باتوں ہی باتوں میں منصر نے پروے کا موضوع چھیڑ دیا۔ ”پردے کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے۔“

”میں نہیں سمجھا ایللی نے کہا۔ میرا مطلب ہے۔“ منصر نے کہا جہاں تک اس کے تعلق ہے آپ کی حیثیت ایک اجنبی کی ہے ایک بیگانے کی۔ لہذا کوئی وجہ نہیں کہ اسے خصوصی سلوک کیا جائے۔“

ایللی کو منصر کی بات سمجھ میں نہیں آ رہی تھی۔

منصر نے لگا ”اگر ہمارے لوگ آپ کے سامنے آئیں تو تخصیص کیوں کی جائے کیوں نہ وہ غلام آپسب کے سامنے۔“

”میں نہیں سمجھا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”دنت تو یہ ہے کہ میں خود بھی نہیں سمجھ رہا۔“ منصر چلایا ”اگرچہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔“ اس قدر بیڑھا ہے کہ — اور میں نے آج تک اس مسئلے پر غور نہیں کیا تھا۔

”وہ خاموش ہو گیا۔ اس کے چہرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کسی کشش میں گرفتار ہے۔“

”جی“ ایللی نے کہا۔

”جی کیل۔“ وہ بولا کیا سمجھے آپ۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ ایللی نے کہا۔ منصر نے ایک تہقہ لگایا۔

”تجربہ کی بات ہے“ وہ بولا ”ہم دونوں اس قدر قریب ہیں بہت قریب اتنے قریب کہ آپ

کو اندازہ نہیں ہو سکتا اور پھر ہم دونوں بیک وقت اس قدر بیگانہ ہیں اس قدر دور کہ —“

منصر کیل۔ ”سگریٹ پیجئے۔ اوہ — سگریٹ تو آپ پیتے ہی نہیں — ہاں تو میں کہہ رہا

نا — کیا کہہ رہا تھا میں —“ وہ ہنسنے لگا ”ہاں — آپ نے داستودسکی کا ناول برادرز

کیرامونڈ پڑھا ہے؟“

”جی نہیں۔“ ایللی نے کہا ”میں نے صرف ایڈیٹ اور کرائم ایڈ پبلیکیشنز پڑھے

ہے۔“

”منصر پڑھے۔ وہ بولا — اے پڑھے بغیر آپ ہم کو نہیں سمجھ پائیں گے۔“

”آپ کی کتنی ہمیشیں ہیں؟“ منصر نے دفعتاً بات بدلی۔

”ایک“ ایللی نے کہا۔

”بڑی ہیں یا چھوٹی۔“

”بڑی۔“

”تو آپ نہیں سمجھ سکتے کہ چھوٹی بہن کا مفہوم کیا ہے۔“ منصر نے جوش اور جذبے سے

ایللی نے سوچا کہ شاید منصر نشے میں باتیں کیے جا رہا ہے۔ لیکن خصوصی طور پر آج کیوں؟

میل کے دوران میں ایللی نے دو ایک بار چوری چوری سادی کی طرف دیکھا۔ اس کے ہاتھ پر لکھا مسکراہٹ کھیل رہی تھی جیسے وہ سادی نہیں بلکہ سکندر ہو جو دریائے جہلم کے کنارے کھڑا ہو۔

میل کے وقت میں والدہ کے اشارے پر منصر نے بیرے کو آواز دی لیکن اس کی آواز کسی نے نہ سنی اور وہ اٹھ کر چلا گیا۔

والدہ نے مسکرا کر ایللی کی طرف دیکھا۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں۔“ ایللی نے کچھ کہنے کے لیے کہا۔

”مسکرائیں اور پھر کہنے لگیں۔“ کبھی مجھ سے ملو، مجھے تم سے باتیں کرنا ہے۔“

”ہی“ ایللی نے جواب دیا۔

”مگر آئیے۔ کوئی بارہ بجے کے قریب۔“ والدہ نے کہا۔

”ہمت اچھا۔“ ایللی نے جھکی جھکی نگاہوں سے جواب دیا۔

”مگر دے دیجئے انہیں“ سادی چمک کر بولی۔

”ہی۔“ ایللی نے سادی کی طرف دیکھ کر بغیر کہا ”کہیں دو بجے نہ آجائیں۔“ وہ بولی۔

”منور آتا بیٹا“ والدہ نے یوں جواب دیا جیسے اس کی بات سنی ہی نہ ہو۔

”جی۔“

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اور

اگلے روز دوسرے وقت جب ایللی سفید منزل میں داخل ہوا تو وہ "لوڑو نہ لڑو" اس کے روبرو آگیا۔ والدہ پہلے ہی سے اوپر جھنگے میں اس کا انتظار کر رہی تھیں۔ ایللی کو دیکھ کر والدہ نے اسے رکنے کا اشارہ کیا۔ کچھ دیر تک وہ دستک دیئے بغیر دروازے پر کھڑا ہوا اور کھلا۔ جب وہ اندر داخل ہوا تو دروازہ بند کر لیا گیا۔ چلی منزل ویران پڑی تھی۔

رسی باتوں کے بعد والدہ نے کہا "مجھے اپنی بچیوں سے بڑی محبت ہے۔ بڑی محبت ہے۔ ان آنکھیں آبدیدہ ہو گئیں۔ کیا کروں میں مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ اور چھوٹی تو بڑی ہی ہے۔ بڑی ہی۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

"تم بڑے اچھے ہو۔" دفعتاً والدہ نے موضوع بدلا "تم سے مل کر مجھے بڑی خوشی ہے۔"

"مجھے تم سے اتنی ہی محبت ہے جتنی "وہ رک گئی۔

"آپ کی بڑی نوازش ہے۔" ایللی نے کہا۔

"مجھے باتیں نہیں کرنا آتیں بیٹا۔" وہ بولی۔

"جی۔" ایللی نے اس رسی جملے پر شرمندگی سی محسوس کی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اس خاتون کو یوں آغوش میں لے لے جیسے وہ ایک نصیحتی سی بچی ہو مگر اس میں ہمت نہ پڑی ابھی باتیں ہی کر رہے تھے کہ کمرے کا دروازہ آہستہ سے بجلا۔

آؤ نا ادھر اس کمرے میں آجاؤ اس بغلی کمرے میں آئیے اگر المان کو پتہ چلا کہ تم اس میں آئے ہو۔ تو قیامت آجائے گی۔"

"المان؟" ایللی نے دہرایا۔

ہاں۔ وہ ہمارا عزیز ہے اللہ رکھے بڑی کامیاب ہے۔ چھوٹی کی منگنی ابھی نہیں ہوئی المان جو شیلہ ہے۔ پتہ نہیں کیا کر دے۔ آؤ ادھر آجاؤ۔"

جب وہ بغلی کمرے میں داخل ہوا تو قریب ہی سے ہنسی کی آوازیں سنائی دیں۔ "وہ وہ" سادی اور باجی بیٹھی آپس میں کانا پھوسی کر رہی تھیں۔

"بیٹھ جاؤ بیٹا۔ اب تم سے کیا پردہ ہے۔ بیٹھ جاؤ۔"

ایللی سر جھکا کر اوب سے بیٹھ گیا۔

سادی نے باجی کے کان میں کہا۔ "وہ پتہ لاؤ انہیں باجی۔" اور اس نے جان بوجھ کر

دہنیں کیا کہ ایللی سن لے۔

ایللی خاموش بیٹھا رہا اور والدہ سے رسی باتیں کرنے کی کوشش میں لگا رہا۔ "دیکھو تو۔" سادی پھر بولی جیسے منہ میں زبان نہ ہو۔

"اب میں کیا کروں۔" ایللی نے والدہ کو مخاطب کر کے کہا۔

"کیا کام تم نے میں نہیں سمجھی۔" وہ بولیں۔

"میں نے عرض کیا کہ۔۔۔" ایللی رک گیا۔

"جملہ عمل کرو باجی۔" سادی پھر بولی۔

"جملہ نہیں "وہ بولا "کمانی۔"

"وہ کیا میں تھوڑا کروں گی۔" سادی تہقہ مار کر ہنسی۔

"نہ جانے تم کیا کہہ رہے ہو۔" والدہ بولیں۔ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھیں "میں ذرا دیکھوں تو

لمن تو نہیں آیا۔" یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئی۔

"یہ کس مشکل میں ڈال دیا مجھے نہ جی۔" وہ چمک کر بولا۔

"اپنی نہ اٹھانے کی سزا بھی تو ملنے چاہیے باجی انہوں نے ضد کر کے سب کچھ کھو دیا۔"

"کھویا تو نہیں پالیا ہے۔" ایللی نے کہا۔

"لوںوں پالیا ہے۔" وہ بولی بڑی ہمت والے تو دیکھو یہ تو مابدولت کی محنت کا نتیجہ ہے۔"

"جی" ایللی نے کہا "مابدولت تو غش کھا کر گرنا جانتے ہیں۔"

وہ تہقہ مار کر ہنسی "غش نہ کھاتے تو بات بھی نہ بنتی۔"

"میں نے سنا تھا تم بیمار تھیں سادی۔"

"اٹنی تو وہی بات ہے کہ فراق یار میں کھس کھل کے بن گئے ہاتھی۔" وہ ہنسنے لگی۔

"جھوٹ۔" باجی نے کہا۔

"خاموش باجی۔" سادی اٹھ بیٹھی۔

"دراصل۔۔۔" باجی نے بات کرنے کی کوشش کی۔

"ایک لفظ منہ سے نکالنے کی اجازت نہیں۔" سادی نے کہا اور کل "وہ ایللی سے مخاطب ہوئی۔

"کیوں نہیں بال پر نگاہیں جما کر بیٹھ رہے جیسے جانف حلوے پر جملے رہتے ہیں۔"

”ایک گھنٹہ تباہ کر دیا۔ کیون جی۔ ہم سے بات بھی نہ کی۔“

”تم سے باتیں کرنے کا مزہ تو کچھ لیا۔“

”ابھی سے گھبرا گئے۔ اور ہم تو حضور سے امیدیں لگائیں بیٹھے ہیں وہ کیا ہوں گی۔“

چمک کر بولی۔

”ایک کال کلوٹے سے —“ ایللی رک گیا۔

”خاموش —“ سادی نے ایللی کو ڈانٹا۔ ”ہائے باجی یہ تو ساری عمر معاف نہ کریں گے مجھے“ وہ ہنسنے لگی۔

”اور وہ سنہری بال خواہ مخواہ پٹ گیا بیچارہ۔“

”ہئے واقعی۔“ باجی بولی۔

”دونوں طرف پٹ گیا۔“ ایللی نے کہا۔

”کچھ کہتے تھے وہ“ سادی نے پوچھا۔

”کہتا تھا یہ لڑکیاں بھی کیا ہوتی ہیں کبھی کبھی کچھ سمجھ میں ہی نہیں آتیں۔“

”آپ انہیں ساتھ کیوں لائے تھے جی۔ ساتھ لاکر پڑا دیا۔“ سادی نے پوچھا۔

”خود ضد کر کے آیا تھا۔“ ایللی نے کہا۔

مجھے حیرانی ہے۔“ سادی ہنسی انہوں نے انہیں کیوں پکڑ لیا۔ آپ کو کیوں نہ پکڑا۔“

”اس میں حیرانی کی کیا بات ہے۔“ ایللی بولا۔

”کیوں۔“ باجی نے پوچھا۔

”سنہری رنگت والی گوری کے ساتھ گلفام ہی ہونا چاہئے نا۔“

”بس ان سے بات بھی نہ کرو باجی۔“ سادی غصے میں اٹھ بیٹھی۔

”مجھے دیر ہو گئی۔“ والدہ نے داخل ہوتے ہوئے کہا لیکن امان نہیں ہے چلو فکر تو در

ہوا۔“

کیراموزوز

اس کے بعد ایللی کے شب و روز میں ایک نئے باب کا اضافہ ہو گیا۔ دوسرے یا تیسرے دن اسے گھربلا یا جاتا۔ وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھ جاتے سادی زیر لب بات چھیڑا۔ ایللی

باتیں کرتا لیکن روئے سخن سادی کی طرف ہوتا۔ وہ دونوں ہنستی۔ چھیڑتیں اور ایللی کے

بابت والدہ حیرانی سے کستی میں نہیں سمجھی۔“

باب والدہ امان کو دیکھنے کے لیے باہر چلی جاتیں اور وہ اکیلے رہ جاتے اور پھر وہ بچوں کی طرح پھر والدہ امان کو دیکھنے کے لیے باہر چلی جاتیں اور وہ اکیلے رہ جاتے اور پھر وہ بچوں کی طرح

بچہ عزت حتیٰ کہ ہاتھ پائی کی نوبت آجاتی اور والدہ واپس آجاتی اور ان کا وہ شور شرابا پھر سے

بچہ عزت کی شکل اختیار کر لیتا۔

باب کو ایللی منصر کے دفتر جا پہنچتا اور پھر لاہور کی سڑکوں پر شاہ کی سواری نکلتی اور لوگ بصد

باب و احترام دو روئے کھڑے ہو کر کورنش بجالاتے اور پھر ہوٹل میں وہ اس عظیم شخصیت کے

درد و ادب و احترام کے جذبات لیے بیٹھ جاتا اور حیرت سے اس کی طرف دیکھے جاتا۔ اسے منصر

سے نبت ہو چکی تھی۔ والمانہ محبت۔

پھر ایک روز جب وہ چاروں چھوٹے کمرے میں بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو دروازے پر کسی

نے ٹکے ماری۔

”دروازہ کھولو۔“ کوئی راکشش چنگھاڑا۔

والدہ صاحبہ نے آواز سنی چڑا زرد پڑ گیا۔ ”ہے“ وہ ہاتھ ملنے لگیں اب کیا ہو گا۔ امان کو پتہ

پہل گیا۔

”کون ہے۔“ امان نے پوچھا۔

”میں ہوں امان“ وہ چیخنے لگا دروازہ کھولو۔“

”اے ہے۔“ امان بولیں اس وقت کیا ہے ہم کمرے میں بیٹھی باتیں کر رہی ہیں۔“

مجھے معلوم ہے۔“ وہ چلایا کہ کمرے میں کیا ہو رہا ہے۔ میں جانتا ہوں۔ دروازہ کھولو۔“

”اے دروازے پر کئے مارنے شروع کر دیئے۔ کھول دو ورنہ میں اسے توڑ دوں گا۔“

”کھولتی ہوں“ امان بولیں۔ ”ذرا ٹھہر تو۔“

”ابھی کھولو ابھی۔ میں اس کی گردن مروڑ دوں گا۔“ وہ چلایا۔

”کس کی گردن مروڑ دو گے“ ماں نے ہنس کر کہا۔

”مجھے معلوم ہے کس کی گردن مروڑنا ہے مجھ“ وہ غرایا۔

”ان لڑکیوں نے بگاڑا کیا ہے تمہارا۔“

”میں انہیں بھی دیکھ لوں گا میں۔“

”ایسی دھمکی ہے تو نہیں کھولتے ہم۔ توڑ دو دروازے کو“ ماں بولی۔
 ”اچھا“ اس نے وانت پیسے کہاں ہے میری بندوق۔“ وہ دیوانہ وار میڑھیاں چڑھنے لگا
 یا اللہ یا اللہ ————— ”اماں گھبرا کر دعائیں مانگنے لگی۔
 ”میں جانتا ہوں“ ایللی نے کہا۔

”وہ گولی چلا دے گا چلا دے گا“ اماں نے کہا۔
 ”دیکھوں گی میں کیسے چلائیں گے“ سادی جوش میں آگئی اس نے ایللی کا ہاتھ تھم لیا۔
 ”مجھے جانے دو سادی۔“ ایللی نے کہا۔
 ”نہیں میں ساتھ جاؤں گی۔ میں آپ کو گھر چھوڑ کر آؤں گی۔“ غصے میں سادی کی آنکھوں
 سے انگارے جھڑ رہے تھے۔

”سادی۔“ ماں کی آنکھیں گویا ابل کر باہر نکل آئیں۔
 ”پہلے مجھے گولی مارنا پڑے گی انہیں! چلے۔“ وہ ایللی سے بولی۔
 ”سادی یہ تمہاری عزت کا سوال ہے مجھے جانے دو۔“ ایللی نے کہا۔
 اماں سادی کے پاؤں پڑ گئی۔

ایللی بھاگا خوش قسمتی سے صدر دروازے کا ایک پٹ کھلا تھا۔ دروازے میں پہنچ کر وہ رگ
 گیا۔ دیوار کے ساتھ لگ گیا تاکہ اوپر سے اسے کوئی دیکھ نہ سکے کافی دیر وہ کھڑا رہا۔ پھر جب شہ
 سے معلوم ہوا کہ اماں زینہ اتر رہا ہے تو ایللی چپکے سے پڑوس کے مکان کی ڈیوڑھی میں داخل
 کر کونے میں دبک گیا۔ پھر اماں گلی میں چلا رہا تھا۔ کہاں ہے وہ کہاں ہے۔“
 ایک اونچے لمبے خنومند مرد کو ہاتھ میں بندوق لیے دیکھ کر گلی کی تمام لوگ تھڑکیں ٹٹا
 آگئے۔ وہ اسے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔

”کہاں ہے وہ کہاں ہے وہ۔“ اماں گلی میں یوں چکر کاٹ رہا تھا جیسے شیر پنجرے میں پھرنے لگا
 ہے۔ پھر منصر آگیا اور اماں کو پکڑ کر اندر لے گیا۔

یعین اس وقت کوئی اس ڈیوڑھی میں داخل ہوا جہاں ایللی چھپا ہوا تھا۔ بیشتر اس کے کہ
 ایللی کو دیکھتا ایللی کونے سے نکل آیا اور معصومانہ انداز سے پوچھنے لگا جی یہ مولوی محمد علی کا گھر
 ہے۔“

”محمد علی کون محمد علی۔“ نو وارد نے مشکوک نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

جو اسلامہ کالج میں پروفیسر ہیں۔“ اس نے کہا۔
 نہیں“ نو وارد بولا۔ یہ ان کا مکان نہیں۔“

تکلیف معاف کہہ کر وہ باہر نکلا اور گلی میں اس سمت کو چل پڑا جو تازہ گھر سے برعکس جاتی
 تھی۔ ایللی باغ میں پہنچ کر ایک پلاٹ میں وہ ڈھیر ہو کر گر پڑا۔
 ایللی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ آخر اماں کون تھا۔ اس سے ان کی والدہ کیوں خائف
 تھی وہ کس کی گردن مروڑنے کی بات کر رہا تھا۔ پھر وہ چیخ کیوں رہا تھا۔ بھلا بندوق کی کیا ضرورت
 تھی اور یوں گلا پھاڑ پھاڑ کر چلانے اور محلے والوں کو اکٹھا کرنے میں کیا مصلحت تھی۔ اسے کچھ
 سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ اس کے روبرو منصر کھڑا مسکرا رہا تھا ”ایلیاس صاحب آپ نے داستو و سکی
 کی برادرزیرا موزدوڑ نہیں پڑھی ————— (Brothers Karamozovs) ضرور پڑھے۔

ایک اور

— شام کے قریب نیم چھتی میں لیٹے ہوئے ایللی کو یاد آگیا کہ اسے منصر سے ملنے جانا
 ہے۔ چونکہ خصوصی طور پر منصر نے طے کر رکھا تھا۔ کہ اس روز وہ دفتر میں ملیں گے۔ لیکن
 امت نہ پڑی۔ اس نے اٹھنے کی کوشش کی لیکن اٹھنا محال تھا۔ چلو نہ سہی اس نے سوچا کوئی بہانہ
 بناؤں گا۔ اور وہ پھر لیٹ گیا۔

دغنا! اسے پھر خیال آیا۔ نہ گیا تو منصر سمجھے گا کہ کوئی خصوصی بات ہے۔ اور دوپہر کا واقعہ
 اس کی نظر میں حقیقت کا روپ اختیار کر لے گا اور وہ سمجھے گا کہ واقعی ایللی سفید منزل میں گیا تھا۔
 ”نہیں نہیں وہ اٹھ بیٹھا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ نہیں ہو سکتا۔“ منصر پر یہ ظاہر نہ ہونے پائے
 کہ میں دہل جاتا ہوں۔

شام کے وقت جب وہ منصر کے دفتر میں پہنچا تو منصر کے طبعی اخلاق کے باوجود اس کے انداز
 سے عجیبی کا انکار ہو رہا تھا۔

”میں فارغ ہوں تو ابھی چلتے ہیں۔“ منصر نے حسب معمول کہا۔

”آج پریشان معلوم ہوتا ہے۔ شاید دوپہر کے واقعہ کے متعلق کبیدہ خاطر ہے۔ ضرور مجھ سے
 انتظار ہو گا۔ نہیں میں کبھی تسلیم نہیں کروں گا۔“ ایللی سوچ رہا تھا۔ اس میں اماں کی عزت کا
 ہل ہے۔ اماں کتنی قابل تعظیم ہے۔ لیکن اماں نے اماں کا بھی خیال نہیں کیا نہ جانے کون ہے

وہ امان“ پھر وہ منصر کی طرف دیکھنے لگا۔ منصر اپنے کام میں مصروف تھا۔ وہی حسین اور پناہ چرا۔ وہی شان استغنیٰ وہی وقار۔ لیکن ان سب پر پڑمردگی کا پردہ پڑا ہوا تھا۔ اس کی منکرانہ میں جاذبیت کے باوجود شکستگی کی جھلک تھی جیسے پیانے میں بال آگیا ہو۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ منصر دکھی تھا۔ اگرچہ وہ اپنے دکھ کو چھپانے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھا۔

”پریشان سے دیکھتے ہیں آپ“ اس نے منصر سے کہا۔

وہ چونکا ہاں“ اس نے ہنسنے کی کوشش کی آج ایسا کام آن پڑا ہے کہ —

”تو دفتری پریشانی ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”اور کیا ہو سکتا ہے۔“ وہ بولا۔

لیکن ایللی نے محسوس کیا کہ وہ بات ٹال رہا ہے۔ ظاہر تھا کہ اس کے احساس وقار پر ضرب پڑی ہے ورنہ دفتری معاملات کو اتنی اہمیت کون دیتا ہے اور پھر منصر — ضرور یہ دوسرے واقعہ کا اثر ہے۔ ایللی نے محسوس کیا کہ تمام تر ذمہ داری ایللی پر عائد ہوتی ہے۔ وہی ان کی پریشانی اور دکھ کا باعث ہے۔ احساس گناہ سے اس کی نس نس بھیگ گئی۔

جب وہ ہوٹل میں بیٹھے ہوئے تھے تو دفعتاً منصر نے کہا کیا اتفاق سے آج آپ ہماری گلی سے تو نہیں گزرے تھے۔

ایللی چونکا۔ اور سوچنے لگا۔ منصر کا سوال اس کی خوش اخلاقی پر دلیل تھا۔

”میرا مطلب ہے۔“ منصر نے کہا شاید آپ ادھر سے گزرے ہوں۔“

ایللی کا جی چاہتا تھا کہ چلا چلا کر کہے نہیں نہیں یہ بہتان ہے دردغ بیانی ہے۔ لیکن منصر کے دکھ بھرے چہرے کو دیکھ کر نہ جانے اسے کیا ہوا اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تو آپ ادھر گئے تھے؟“

”جی۔“

”گھر گئے تھے۔“

”جی ہاں۔“

وہ سوچ میں پڑ گیا۔

”خود سے گئے تھے“ اس نے ہر اٹھا کر پوچھا۔

”جی ہاں۔“
”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ وہ بولا آپ مذاق کر رہے ہیں یا —
”خود سے گیا تھا۔“
”ہیرا“ وہ چلایا ایک بڑا — ہیرا — جلدی ایک بڑا۔“

تعارف

اس روز واپسی پر منصر ایللی کو اپنے گھر لے گیا۔ اسے کمرے میں بٹھا کر اس نے آوازیں دینا شروع کر دیا۔ امان صاحب ہوں تو انہیں ذرا نیچے بھیجے ابھی۔“
امان ایک اونچا لمبا جاٹ نما شخص تھا۔ انداز میں وہ بات نہیں تھی۔ جو منصر اور سادی میں درجہ اتم نظر آتی تھی۔ ”آئیے آپ کو اپنے نئے دوست سے ملواؤں۔“ منصر نے کہا یہ ہیں ایساں صاحب۔“

امان چونکا لیکن جلدی اس نے اپنے آپ پر قابو پا لیا۔

”آپ میرے عزیز ہیں۔“ منصر نے امان کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ بھائی ہی سمجھ لیجئے بس فرق صرف اتنا ہے کہ یہ زمیندار ہیں اور میں مزدور۔“
امان نے کوئی استفار نہ کیا بلکہ چپ چاپ بیٹھ کر ایللی کو بغور اور بے تکلف دیکھنا شروع کر دیا۔ غالباً وہ ایللی کو جانچ رہا تھا۔ ایللی کو یقین نہ آ رہا تھا کہ یہ وہی شخص ہے جو دوسرے وقت شیر کا طرح دھاڑ رہا تھا اور پھر بندوق لے کر اس کے پیچھے بھاگا تھا۔

”امان صاحب کا گاؤں یہاں سے کچھ زیادہ دور نہیں اگر آپ کبھی ان کے ہمراہ گاؤں جائیں تو آپ کو معلوم ہو کر زمیندار کس شے کا نام ہے۔“ منصر ہنسنے لگا۔ ”اگر یہ جلال میں ہوں تو میز بڑا ہوا کاناغ کا گلاس جلت رنگ کی طرح بچنے لگتا ہے۔ اور ہاں۔“ منصر نے کہا ”آپ میرے لاکرے بھائیوں سے ملے ہی نہیں۔ ان سے بھی تعارف ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ آج اتفاق سے آپ یہاں آئے ہیں تو ان سے بھی مل لیجئے۔ امان صاحب آپ لمبو پر جائیں تو انور اور محمد علی کو بھی دیں شکریہ۔“

امان اٹھ بیٹھا اور جواب دیئے بغیر چلا گیا۔

انور ایک شوخ نوجوان تھا جس کی آنکھیں بے حد جاذب تھیں اس کے خدو حال بہت موندل تھے۔ ان دنوں وہ کالج میں پڑھتا تھا۔ محمد علی کی آنکھیں دکھنے والی تھیں انور کی طرح

اس روز کے واقعات کس قدر عجیب تھے۔ سفید منزل کے تمام افراد کس قدر انوکھے اور

امتحان کی تیاری کرنے کا سوال پیدا نہ ہوتا تھا۔ سارا دن وہ نیم چھٹی میں کتاب لکھتا تھا۔ سوچتا اور پھر تھک کر پڑ جاتا۔ وقت اس کے لیے گویا تھم گیا تھا۔ کسی چیز میں دلچسپی نہ رہتی تھی۔ ناؤ گھر پھیل کر جہاز بن گیا تھا۔ اور وہ جہاز کسی نامعلوم سمت میں بہہ رہا تھا۔ مصروف۔

منزل اور راہی

امتحان ختم ہونے کے بعد وہ سب اپنے گھر جانے کے لیے تیاری کر رہے تھے جا بھلا۔ جمال جاہ کے لیے کہیں سے آنے میں قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی البتہ بھپال اور جمل تیل ڈنڈ تھے۔ وہ ہمیشہ کے لیے ناؤ گھر چھوڑ رہے تھے۔

ایلی سوچتا رہا اور آخر اس نے فیصلہ کر لیا کہ علی پور جانے سے پہلے وہ سفید منزل چلے گا تاکہ منصر سے آخری ملاقات کر سکے۔ دل ہی دل میں وہ چاہتا تھا کہ جب وہاں پہنچے تو منصر موجود ہو اور سادی اسے جنگل سے دیکھ لے اور وہ دونوں اس چھوٹے کمرے میں جا بیٹھیں اور سادی اس کی راست گوئی کا مذاق اڑائے۔ ”بیچے باقی آگئے ہمارے راست گو۔ جھوٹ صرف ہم بولتے ہیں۔ دوسروں سے نہیں۔ کیوں جی ٹھیک ہے نا۔“

لیکن جب وہ امتحان سے فارغ ہو کر سفید منزل میں گیا تو وہاں انور اور محمد علی کے سوا کونسا نہ تھا۔ انور نے اسے بتایا کہ وہ سب ہسپتال گئے ہوئے ہیں لیکن کوشش کے باوجود وہ یہ نہ معلوم کر سکا کہ آخر وہ ہسپتال کیوں گئے تھے۔

اسی روز امتحان کے بعد منصر اسے ملا تھا۔ امتحان کے دوران میں منصر اسے تقریباً روز نما تھا۔ پہلے روز جب ایلی پرچہ دے کر ہال سے نکلا تھا تو اس نے دیکھا تھا کہ سامنے منصر اپنے سائیکل پر آ رہا ہے۔ اور منصر نے حسب عادت کہا تھا۔ ”کیا عجیب اتفاق ہے میں ابھی لکھا کر رہا تھا۔ آئیے آئیے چلے آپ کو لے چلوں کہنے پرچہ کیا ہوا۔“ اس کے بعد ان کا معاملہ ہو گیا تھا کہ عین اس وقت منصر لچکھا کر ادھر سے واپس آتا جب ایلی کے پرچے کا وقت ختم ہوا تو سرسری طور پر اسے پوچھتا کہنے پرچہ کیا ہوا۔ اس روز بھی وہ اس سے ملا تھا اور سرسری طور کے بعد اس نے کہا تھا۔ ”تو آج آپ جا رہے ہیں اور ناؤ گھر کے دروازے پر بسے ہو رہا ہے۔ اتار کر کہا تھا اچھا الیاس صاحب خدا حافظ۔ خط تو آپ لکھا ہی کریں گے میرا مطلب ہے یہ

فنی ضروری بات ہو اور آپ تو لاہور آتے ہی رہتے ہوں گے علی پور قریب ہی تو ہے انشا اللہ بل ملاقات ہوگی۔“ اس روز منصر نے تو ہسپتال کی بات نہ کی تھی۔ ایلی محروم واپس آ گیا۔ اس کا جی تو نہیں چاہتا تھا کہ سلمان باندھے یا جانے کی تیاری کرے لیکن سب تیاریوں میں مصروف تھے اور وہ لاج چھوڑ رہے تھے ناچار اسے بھی تیاری میں مصروف ہونا پڑا۔ لیکن اس کی تمام توجہ گلی کی طرف لگی ہوئی تھی۔ نہ جانے وہ لوگ کب ہسپتال سے واپس آ جائیں لیکن گاڑی کا وقت آ گیا اور گلی میں سے موڑ یا تانگا نہ گزرا۔ ناچار وہ باہر ہمارے ساتھ تانگے میں سوار ہو گیا۔ اس نے ناؤ گھر اور سفید منزل پر آخری حسرت بھری نگاہ ڈالی اس وقت ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ منزل کو چھوڑ کر راہی بن رہا ہو۔ منزل اس کے سامنے تھی لیکن وہ متضاد راستے پر جانے پر مجبور تھا۔ کالی سڑک دوڑ رہی تھی۔ دوڑے جا رہی تھی گھوڑے کے سم یوں بج رہے تھے جیسے کوئی چھاتی پیٹ رہا ہو۔ ریل گاڑی کے پیسے اس پر نہیں رہے تھے۔ اس کا مذاق اڑا رہے تھے۔ لاہور سمٹ رہا تھا نیلا آسمان چاروں طرف سے یورش کر رہا تھا چھائے جا رہا تھا مسلط ہوا جا رہا تھا۔

بلیک

علی پور پہنچ کر وہ بلا سوچے سمجھے سیدھا محلے کی طرف چل پڑا۔ اس کا ذہن ایک خلا میں نہیل ہو چکا تھا۔ اسے قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ وہ کہاں جا رہا ہے۔ کیوں جا رہا ہے یا علی ہار کے گلی کوچوں میں جا رہا ہے۔ اسے راستے میں کوئی نہ ملا۔ کچی حویلی سنسان پڑی تھی۔ ٹھنڈی مٹھوسے جل رہی تھی۔ میدان میں اندھیرا تھا علی احمد کے مکان کے دروازے بند تھے نہ ایک کمرہ کیوں میں دھندلی روشنیاں جھللا رہی تھیں۔ وہ سر جھکائے چل رہا تھا۔

جب وہ شہزاد کے چوبارے میں پہنچا تو اسے کھلا دیکھ کر وہ چونکا اسے یاد آیا کہ وہ تو باہر گئی دلی تھی۔ یہ دروازے کیسے کھلے ہیں اور میں ادھر کیسے آ گیا۔

سامنے چار پائی پر شہزاد بیٹھی تھی۔ قریب ہی ایک نو مولود بچہ لیٹا ہوا تھا۔ شہزاد نے اس کی طرف دیکھا اور وہ بولیں حیران بیٹھی رہ گئی جیسے پتھر کی بنی ہوئی ہو۔ جانو چلانے لگی۔ ”گویہ تو ایلی آیا ہے۔“

”کون آیا ہے۔“ قریب ہی سے ان جانی یاد قار آواز سنائی دی۔ اور پھر بیگم اس کے ملا
آکھڑی ہوئی۔

”ہے۔“ شہزادہ بولی۔ ”ایلی کے لیے چائے بناؤ جانو منہ کیا دیکھ رہی ہو۔ اتنی دیر کے بعد
ہے چلو آیا تو ہے۔“

وہ مسکرائی ”اب بھی نہ آتا تو اس کا کیا بگاڑ لیتے۔ اب تو جا کھل رہا ہے۔“ وہ دروازہ
ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”ادھر کون ہے وہ تو سبھی کھل گئے ہوئے ہیں۔“

ایلی نے بیگم کی طرف دیکھا۔ بیگم بوئے رعب سے اسے گھور رہی تھی۔
”بیگم کو نہیں پہچانتا تو نے ایلی۔“

بیگم۔ اسے وہ نام جانا پہچانا معلوم ہو رہا تھا۔
”اب یہ کیوں پہچانے گا۔“ بیگم نے کہا ”اب تو جوان ہو گیا ہے۔“

”جوان“ شہزادہ ہنسی۔ ”شکل تو دیکھو جوان کی جیسے راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔“
”راستہ کھو کر ادھر آ نکلا ہو۔“ کسی نے اس کے کان میں دہرایا۔ اس کی نگاہوں میں

منزل آکھڑی ہوئی۔ راستہ اور چیز ہے منزل اور! سادی مسکرائی۔ منزل! منزل!! منزل!!! ہجر
چمگاڑ چیچی۔ ”چلو راستہ بھول کر ہی سہی۔“ شہزادہ ہنسی۔ ”اب بیٹھ بھی جا۔“

وہ بیٹھ گیا۔
”مجھ سے نہیں تو اماں سے ہی بات کر کوئی۔“ شہزادہ پھر ہنسی۔

”اماں۔“ دغمتا“ اسے یاد آیا۔ ہاں بیگم شہزادہ کی ماں تھی۔ پھر اس کی نگاہوں میں
دن پھر گئے جب محلہ گوکل کا بن بنا ہوا تھا۔ سانوری کی نیم وا آنکھیں ڈول رہی تھیں۔ اس کے

ڈھلکے ہوئے شانے اس کی ترچھی نگاہ اور مرچیلی مسکراہٹ نیچے ارجند چلا تھا۔ ”بے بے کا
شے ہیں یہ گوکل کے کنہیا جب سے آئے ہیں۔ سارا محلہ پتھت بن گیا ہے۔ بے بے کا

کیا کروں۔“
پھر تھیر کی سٹیج پر رنیک اپنا سونا لہرا رہا تھا۔ اس کی نگاہیں سامنے گیلیری پر مچی ہوئی تھیں

جہاں سانوری تخت پر جلوہ افروز تھی اور گھدم اور گلخیرو آہستہ آہستہ چلا رہے تھے۔
دیکھ کر بے لیکن تینوں ہی گیلیری کی طرف دیکھ رہے تھے۔

شہزادہ کے والد غلام علی باگے رینگیلے محض تھے۔ عورت ان کی واحد کمزوری تھی لیکن

وہ اس کے عورتوں کو گھرانے کے عادی نہ تھے۔ وہ اس نکتہ کو خوب سمجھتے تھے کہ عورت کو
تربیت دینے سے شوق کی تسکین نہیں ہوتی۔ وہ عورت کو محسوس کرتے اور اس کے حصول کی
پیش کرتے ان کے نزدیک حصول وقتی ملاپ کے مترادف تھا اور اسے دوام بخشے کی چنداں
پیش نہ تھی۔ ”بے“ وہ ایک بھنورا تھے۔ کلی کلی کا رس چوسنا انکا شغل تھا۔ لیکن گھر میں
بہت سے تھے لگنا انہیں پسند نہ تھا۔ گھر میں صرف ایک پھول تھا۔ بیگم۔ چونکہ غلام علی
کے معاملات میں دخل دینے کے قائل نہ تھے گھر پر بیگم کی حکومت تھی۔

جس سے نہیں کہا جاسکتا کہ آیا بیگم ”بے“ حاکم تھی یا برسوں کی حکومت کے بعد اس میں
ایک صبر پیدا ہو گیا تھا۔ بہر حال گھر کے معاملات میں وہ دخل اندازی گوارا نہیں کرتی تھی۔

ہاتھ نہ ملے اسے اپنا حق سمجھتی تھی کہ کوئی بات اس کی رضامندی کے بغیر واقعہ نہ ہو۔ وہ
ماں کا حکم کرنے والوں اور حتیٰ کہ محلے والوں پر حکم چلاتی تھی۔ دراصل اسے کسی محلے میں

نہ لگائی افق نہ ہوا تھا چونکہ اس کا خاوند محکمہ ریل میں شیٹن ماسٹر تھا اس لیے ساری عمر
نے ریلوے شیٹنوں کے کوارٹروں میں بسر کی تھی۔ جہاں ارد گرد قلی خواہنے والے کارندے

ہر لوگ رہتے تھے جو سب غلام علی کے ماتحت کام کرتے تھے۔ لہذا بیگم ان سب کو اور ان
حقیقین کو براہ راست اپنے ماتحت سمجھتی تھی۔ اس تفصیل کی وجہ سے اس کے انداز میں

تجاہزت اور نور جماعت کے سے عناصر پیدا ہو چکے تھے۔
بیگم کو خاوند کی کمزوری کا علم تھا۔ اسے صرف ایک دکھ تھا کہ خاوند اس کے حکم سے کیوں

نہ اس بات پر اکثر گھر میں فساد ہوتا تھا لیکن غلام علی اپنی رنگیلی اور شوخ باتوں کے بل
پہلے پا کر کرتے۔

اس کے علاوہ چونکہ غلام علی کا جادو صرف ان عورتوں پر چلتا جن کی سماجی طور پر کوئی
بہت نہ ہوتی تھی۔ اس لیے بیگم ان کی خوش فطریوں پر حقارت کا اظہار کرتیں اور خاوند کی ہر

بے وفائی پر بیگم کی اپنی حیثیت اور بھی بڑھ جاتی۔
لوگوں کے ایک معاملے پر گھر میں غلام علی کی حکومت تھی۔ وہ مقوی اور لذیذ غذا کھانے

کا شوق تھا کہ ان کا خیال تھا کہ ایسے شوق کو پورا کرنے کے لیے غذا بے حد اہم چیز ہے۔
اس لیے کھانے سے متعلقہ کوئی بات ان کی رضامندی اور خواہش کے بغیر عمل میں نہ آ سکتی
تھی۔ اس لیے انہوں نے انہیں تیار کروائے

اور پھر جب وہ دسترخوان پر بیٹھتے تو اہل خانہ پر ہو کا عالم طاری ہو جاتا سب کی نگاہیں غلام پر جم جاتیں ذل و دھڑکتے ہاتھ کا پچھتے نہ جانے کیا ہو گا۔

پہلا نوالہ منہ میں رکھنے کے بعد یا تو غلام علی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ سب کے دل قائم ہو جاتے ہاتھ رواں ہو جاتے اور چروں پر مسرت بھرا غر بھرا ہوتا۔ غلام علی کے چہرے پر مسکراہٹ نہ آتی تو برتن دھم سے دیوار سے ٹکراتے "یہ کیا ہے" اور پھر گھر میں سناٹا چھا جاتا۔

غلام علی کے شوق کو بیگم روک نہ سکی تھی اس نے پیار محبت سے سمجھایا۔ دھمکیاں دیں کئی ایک عورتیں جنہوں نے غلام علی کے شوق کو پورا کیا تھا انہیں پانچ بات جوں کی توں قائم رہی۔ لہذا یہ بات بیگم کو گوارا کرنی ہی پڑی بہر حال بیگم بھی ہٹا تھی۔ اور اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ غلام علی عورت کے بغیر خوش نہیں رہ سکا اور ان مواقع آتے تھے جب غلام علی کو یاد آتا کہ بیگم بھی عورت ہے اس وقت بیگم غلام کی بخشی کے ذریعے انتقام لیتی تھی۔ حیوان تڑپتا اور بیگم کو اس کا تڑپنا دیکھ کر لذت حاصل دھاڑتا چیختا چلاتا اور پھر باہر نکل جاتا اور دیوانہ وار عورت کو تلاش کرتا۔

ایک مرتبہ جب وہ ان حالات میں باہر نکلے تو پلیٹ فارم پر گاڑی کھڑی تھی۔ اور ایک ایسی خاتون باہر نکل رہی تھی جو خود کسی ایسے شخص کی تلاش میں تھی جس سے روپیہ بنو سکتی ہو۔ وہ فیشن ایبل لباس میں ملبوس تھی ہاتھ میں ہینڈ بیگ اور ماتھے سے معلوم ہوتا تھا جیسے کچھ کماتو فر فر انگریزی بولنے لگے گی۔ غلام علی بھانپنے میں فوراً "تاڑ گئے کہ حالات سازگار ہیں اگرچہ پہلے کبھی اس نوعیت کی عورت سے سابقہ نہ پھر بھی آخر عورت ہی تھی۔

ان کا مقصد تو محض ملاپ تھا۔ لہذا وہ اس کے پیچھے پیچھے چل پڑے اور پلے چلے ڈانٹنگ روم میں پہنچ گئے۔

خاتون بڑی ہوشیار تھی اس کا مقصد ملاپ نہ تھا۔ حصول زر کی خواہش بھی دینی دوام کی قائل تھی چونکہ ضرورت وقتی چیز نہیں۔ لہذا اس نے تنگ بخشی کو ہم لاکر غلام آگ میں تیل ڈال کر اسے بھڑکا دیا۔

بیگم کو علم ہوا تو وہ چیختی چلائی لیکن بیگم کو یہ علم نہ ہوا کہ غلام علی کے اس سے دوام کا خطرہ ہے لہذا وہ چیخ چلا کر خاموش ہو گئی۔

اور خاتون نے غلام علی کو پورے طور پر ہاتھ میں لے کر اسے صاف الفاظ میں کہہ دیا کہ یہ تعلق صرف اس لیے گوارا کیا تھا کہ اسے پہلی ہی نظر میں غلام علی سے محبت ہو گئی۔ آج تک کبھی کسی عورت نے ان سے محبت کا جتن کیا۔ اور ان کی اپنی بیوی تو بے رحمی کا انپکڑ تھی۔ لہذا وہ خاتون کے سحر میں آ گئے۔ جن کے غفلت سے متعلقہ تمام شرائط کو تسلیم کر کے انہوں نے خفیہ طور پر اس سے نکاح کر لیا۔ جن کے غفلت کے طور پر بیگم کو طلاق دینے کا بھی مطالبہ کر دیا۔

جب بیگم کو معلوم ہوا تو وہ سناٹے میں آ گئی۔ اسے یقین نہ آتا تھا۔ وہ سمجھتی تھی یہ محض ایک نالیک ناخوش کن خواب۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ دفعتاً اسے معزول کر دیا جائے اور فریضے سے اتار دیا جائے جب کہ وہ چار جوان بچوں کی ماں تھی جن میں دو شادی شدہ ہیں جب طلاق نامہ اس کے ہاتھ میں تھمایا گیا تو اس کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اور اب وہ ہمیشہ کے لیے اپنی بیٹی شہزاد کے پاس آ گئی تھی۔

بیگم نے اپنی کی طرف دیکھا گھورتے ہوئے کہا۔ "یہ یہاں ٹھہرے گا کہاں۔" ٹھہرنے لگی۔ "آخر اپنے ہی گھر ٹھہرتا ہے نا انسان۔"

بیگم نے حیرت سے شہزاد کی طرف دیکھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ ابھی بیگم اٹھ کر ایلی کے کان پکڑا دے گی۔

بیگم کے اس رویے کے بعد شہزاد نے اپنی تمام تر توجہ ایلی کی طرف مبذول کر دی۔ وہ بڑا بھلا انسان میز پوش نکالا اور پھر خود میز اٹھا کر ایلی کے سامنے لا رکھا۔

مطلب چائے لاؤ جانو۔" وہ بولی۔

بیگم نے ہم کیے دیتی ہوں۔" بیگم بولی۔ "تم کیوں خواہ مخواہ تمہاری طبیعت جو اچھی

ہم کے لیے اچھی ہے۔" شہزاد جان بوجھ کر بیگم کو چڑا رہی تھی۔

شہزاد نے بیگم کو نہیں آتی تمہاری باتیں۔" بیگم نے بعد حقل کہا۔

"بے شک کی سمجھ۔" شہزاد بولی۔ "آؤ نا ایلی تو اب چائے بھی پیئے گا یا نہیں۔"

ایلی بولا اس نے ان دونوں کی باتیں سنی ہی نہ تھیں۔ نہ جانے وہ کہاں

ٹھہر رہی تھی۔ "اچھا تو یہ بات ہے اب یہاں پہنچ کر بھی کھوئے ہوئے ہو۔"

چند ہی روز میں بیگم اور ایللی ایک دوسرے سے بہت قریب ہو گئے ایللی نے محسوس کر لیا کہ پر رعب اور طمطراق بھری بیگم دراصل ایک ٹوٹی ہوئی گڑیا ہے۔ اپنے گھر کی باتیں یاد کرے ہوئے یا غلام علی کا کوئی قصہ سناتے ہوئے اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے ہیں انہیں لاشعور کو شش میں ضبط ٹوٹ جاتا ہے پھر بچوں کی طرح ہلک ہلک کر روتی ہے۔

شنزاد کے گھر میں بیگم کی باتیں سننے والا کوئی نہ تھا۔ شنزاد کی دو بچیاں مکمل طور پر رتھیں تیسری بچی ابھی صرف دو ایک ماہ کی تھی۔ ان کے علاوہ جانو تھی جو ہر وقت گھر کے اندر لگی رہتی تھی محلے والیوں کے دروہرو ایسی باتیں بیان کرتا بیگم کے وقار کے متعلق تھا۔ شنزاد کی شادی کے بعد علی پور میں بیگم صرف دو تین مرتبہ آتی تھی۔ محلے پر وہ پہنچا اڑایا کرتی۔ ناک بھوں چڑھاتی ”یہ تمہارے کیا طریقے ہیں۔ اور یہ یہاں کے لوگ کیسے بیگم کے انداز میں نفرت کی جھلک نمایاں ہوتی۔“ لوہن تمہارے خاوند کیسے ہیں بے میرے گھر کے مجال ہے جو نمک ذرا زیادہ یا کم ہو اگر گوشت زیادہ گل گیا ہے یا ذرا کم گلا ہے تو بھی ہم میں جرات نہیں ہوتی کہ اس اللہ کے بندے کے سامنے رکھیں۔ بس سمجھ لو زلزلہ آ جاتا ہے تو دھم سے دیوار سے ٹکرا کر ٹکڑے ہو جاتے ہیں اور پھر ان کی آواز گونجتی ہے شوک کی لہر ہے ہے لاجول ولا قوۃ ————— توبہ ہے بہن“ خاوند کی بات سناتے ہوئے بیگم پر کیفیت طاری ہو جاتی تھی۔

بات بات پر اپنے گھر کی بات کرنا گھر میں اشیاء کی افزائ کا تذکرہ کرنا اور پھر اپنے غلام غصے اور دبدبے کا اظہار کرنا بیگم کی عادت تھی اور صرف یہی نہیں غالباً وہ سمجھتی تھی کہ دوسروں کے لیے حقارت اور تضحیک کا اظہار نہ ہو تو اپنے گھر کی بات سنائی ہی نہیں جاسکتی اب بھلا بیگم کس منہ سے ان محلے والیوں کو اپنی تنقید کا قصہ سنائی کس طرح بتائی کہ ان کی حکومت چھن چکی ہے۔ وہ معزول ہو چکی ہے۔ فی الحال یہ بات تو گھر کے چند ایک افراد کے درمیان سر بستہ راز تھی اور محلے والیوں کے سامنے بیگم اسی انداز سے بات کرتی تھی جیسے ان کا گھر قائم ہو اور اس کے میاں بدستور اس کے میاں ہوں۔

لہذا بیگم کے لیے محلے والیوں سے بات کرنا ممکن نہ تھا۔ شنزاد سے بات کرتی تو وہ قصہ کر بنتی ”اماں پھر کیا ہوا۔ اسے بھی کر لینے دو مزے چند ایک سال سننے فیشن کی پٹی لٹی ہے۔“ کو ”وہ بنتی۔“

”بے لگی۔“ بیگم حیرت سے شنزاد کی طرف دیکھتی۔

شنزاد ہر نقہ لگاتی ”اماں جو ہوا اب چھوڑو یہ قصہ تمہارے بال بچے ہیں۔ اتنے گھر کے اپنے ہیں جس کے پاس جی چاہے رہو جو چاہے کھاؤ پیو۔ پھر رونا کس بات کا۔ اور پھر شنزاد کی عمر بھی اب پینتالیس کے قریب ہو گی اس عمر میں خاوند سے جدائی ہو بھی جائے تو کیا لگتا ہے۔“

وہ ایک دن میں بیگم نے محسوس کر لیا کہ ایللی وہاں صرف اس لیے موجود تھا کہ سارا دن لائی باتیں سننے اور اظہار ہمدردی کرے۔ اس میں شک نہیں کہ ایللی کو بیگم سے بے حد روتی تھی لیکن وقت یہ تھی کہ جب بیگم اسے کوئی قصہ سناتی تو سنتے سنتے کسی لفظ یا اشارے کی بے ایلی کا خیال نہ جانے کہاں جا پہنچتا اور وہ بیگم اور جانو کے پاس بیٹھ کر خالی سر ہلاتا رہتا۔ پھر بیگم کی آپ بیتیوں کے بعد ایک اور دور آیا اور بیگم اور ایللی مل کر عجیب و غریب روایات میں کود گئے۔ بیگم ایللی کو اشارہ کرتی کہ چلو میں آئی۔ وہ رابعہ کے خالی چوبارے میں جا ٹکڑے کر کے بعد بیگم آ جاتی وہ سیاہ روٹی سی تھیلے سے نکال کر کہتی۔ ”اس نے کہا ہے اس لڑکی سات بڑیاں بنا لو۔ کورے برتن میں موم کی پتلی بنا کر رکھو۔ پھر اس پتی کو آگ لگا کر اس میں ڈال دو لیکن اس طریق سے ڈالو کہ پتی بجھے نہیں۔ اور جب تک برتن سے دھواں نکلتا ہے ایک ٹانگ پر کھڑی ہو کر ”آئی بلا کو ٹال تو“ پڑھتی رہو۔

”یہ حال سمجھنا بھی دکھتا ہے یا نہیں“ ایللی پوچھتا۔

”بھائیابا ہے۔“ بیگم جواب دیتی ”ہزاروں کے گھر آباؤ کر دیئے اس نے۔“

”پھر توبہ اچھا ہے۔“ ایللی کہتا۔

”میں ایک ہی مشکل ہے۔“

”تو کیا؟“

”میں ایک ٹانگ پر کیسے کھڑی ہو سکوں گی اتنی دیر کے لیے۔“

”مگر اس میں کیا ہے ہاتھ سے کرسی کو تھامے رکھنا۔“

”مگر تو میں سارا دیکھ رہی ہوں۔“ ایللی اس سے ہمدردی جتا۔

”اسے سے ایللی کی طرف دیکھتی۔ بیگم کو ہر ایسی بات بری لگی تھی جس سے قرب کا احساس

ہو یا بے تکلفی کا اظہار ہو۔ اس کی دانست میں بے تکلفی جنسی تعلق کی دلیل تھی۔ اور عجب تعلق کے لیے بیگم کے دل میں نفرت کے جذبات قائم ہو چکے تھے۔

بیگم عامل کے دیئے ہوئے تعویذ لے آتی اور وہ دونوں بیٹھ کر انہیں پانی میں گھولتے رہتے۔ ان عملیات کے بعد وہ ان کے نتائج کا انتظار کرتے۔ ایللی کو تو خیر ان عملیات پر کئی انتہا تھی۔ وہ جادو سحر تعویذ یا اس قسم کی دوسری چیزوں کے اثر سے قطعی طور پر منکر تھا۔ البتہ بیگم کی تسلی کے لیے وہ کما کرتا تھا۔ ”ہاں ان چیزوں کا اثر ہوتا ہے۔“ لیکن شنزاد تو بے باک نہ ان باتوں مذاق اڑایا کرتی۔

دوپہر کے وقت دروازہ بچتا تو وہ جانو سے کہتی۔ ”جا میرا منہ کیا دیکھ رہی ہے نیچے ادا رجسٹری لایا ہے۔“

”رجسٹری۔“ جانو حیرت سے پوچھتی۔

”کیا مطلب؟“ ایللی دریافت کرتا۔

پھر وہ نہایت سنجیدگی سے جواب دیتی۔ ”اماں کا عمل جو ختم ہو گیا ہے اب ابا کی طرف اطلاع تو آئے گی ہی کہ وہ قصہ ختم ہو گیا ہے اب گھر آجاؤ کیوں اماں۔“

یا جب بیگم اور ایللی جی جلائے میں مصروف ہوتے تو وہ نہایت سنجیدگی سے پوچھتی۔ ”یہ موسم کی پتلی تم ہو یا ہماری سوتیلی۔“ اس طرح وہ اکثر مذاق ہی مذاق میں ماں کے ان عملیات مضحکہ اڑایا کرتی۔ اکثر اس کی باتیں ذومعنی ہوتیں اور ایللی انہیں سن کر چونکتا۔

مثلاً ”پہلے روز ہی اس نے بیگم سے کہا تھا۔“ اماں چھوڑو ان عملیات کو بھلا جیاں جلا سے کیا ہوتا ہے، اگر یہ عمل پر اثر ہوتے تو میں تعویذ کے زور پر کسی کو اپنا نہ بنا لیتی۔“ ایللی کی طرف دیکھا۔ اس وقت اس کے ماتھے کا قل بے حد شوخ ہو رہا تھا اور اس کی آنکھوں میں مایوسی اور حسرت بھری تمنا کی تھی۔

پھر ایک روز شنزاد کے سامنے روٹی پڑی دیکھ کر بیگم نے پوچھا تھا۔ ”روٹی کیا کرے گی۔“ اور اس نے جواب دیا تھا۔ ”میں بھی جیاں بناؤں گی۔“ ”کیوں تمہیں کیا ہے؟“ ”میں نے پوچھا اور اس نے جواب دیا تھا۔ ”بہت کچھ ہے اوپر سے نہیں دکھتا شاید جیاں جلائے سے بڑا سا تھی واپس آ جائے۔“ اور ساتھ ہی اس نے بڑی جرات اور بے باکی سے ایللی کی طرف دیکھا تھا۔ ”کیوں ایللی۔“ اس نے کہا تھا ”جانے والے واپس بھی آسکتے ہیں کیا۔“ اور پھر وہ جیسے آگینہ کسی ان جانے واؤ سے چور چور ہو گیا ہو۔

سرور کو بیگم کے ان عملیات اور اس کے قصے کہانیوں کے خلاف سخت شکایات تھیں چونکہ وہ عورت کی وجہ سے ایللی اس سے دور ہو گیا تھا۔ شنزاد کو ایللی کے قرب میں چنداں دلچسپی نہ تھی بلکہ وہ ایللی کے قرب سے گھبرا جاتی تھی لیکن اس کی خواہش تھی کہ ایللی کے دل کی طرف سے عملی طور پر کوشش کر کے تنہائی میں اس سے ملے اس کے لنگتے بازو کو اسی طرح بچے ڈبچے کے لیے تنکا ہو۔ اس کے پاؤں کو اپنی نگاہوں سے گھیرے رکھے۔ دور بیٹھ کر اور اس کی طرف دیکھتا رہے۔

لیکن اب کی بار جب سے ایللی علی پور آیا تھا وہ ان سب باتوں سے یوں بے نیاز ہو چکا تھا کہ ایللی ہی نہ ہو۔ النادہ جھوٹے سے چھوٹے موقع پر بیگم کو ساتھ لے کر رابعہ کے پاس جا بیٹھتا اور بیگم کی باتوں میں مصروف ہو جاتا۔ یہ دیکھ کر شنزاد بار بار ہانے ہانے میں آتی ایللی کے قریب تر آکھڑی ہوتی چوری چوری اس کا منہ سلاتی۔ چٹکیاں بھرتی کرتی تھی ہاتھوں میں بہت کچھ کہہ جاتی۔

باشین

ایللی کی ظاہر بے نیازی نے شنزاد کے شوق کو بھڑکا دیا تھا۔ یہ شنزاد کی پرانی عادت تھی۔ اس نے بچے بچے ہو کر وہ آگے کی سمت بھاگتی تھی اس سے دور ہوا وہ تعاقب کرتی تھی حتیٰ کہ دور لال کے پیچھے پیچھے چل پڑتا اور پھر وہ دفعتاً بے نیاز ہو جاتی۔

لیکن روز جب بیگم کسی عامل کے ہاں گئی ہوئی تھی۔ جانو نیچے باورچی خانے میں مصروف رہا۔ چپ چپ چوبارے میں بیٹھا ہوا تھا۔ تو شنزاد نے چپکے سے آکر اس کی آنکھیں بند کر دیں۔ ایللی سے پہلے ایسے حالات میں وہ جھنجھنے کی طرح بجنے لگتا اس کی نس نس میں گویا جھنجھٹانے لگتا تھا اور وہ دیوانہ وار اس کے ہاتھوں کو چومنا شروع کر دیتا تھا لیکن اس کو ہلچل بیٹھا رہا۔ اور پھر کہنے لگا۔

”شنزاد۔“

”جلو آخر ایک نہ ایک دن جانے والے نے جانا ہی

تھیں اور اس قدر جڑ پکڑ چکی تھیں کہ انہیں دل سے نکالنا ناممکن ہو چکا تھا۔ وہ ان باتوں پر حد تک یقین رکھتا تھا کہ وہ اس کی شخصیت کی بنیاد بن چکی تھیں۔ یہ باتیں تجربے بدل گیا شعور سے اخذ نہیں کی گئی تھیں۔ بلکہ اس کے دل کے گہرے ترین جذبات ان کا منبع تھے۔ اہلی سمجھتا تھا کہ محبت صرف ایک محبوب سے ہو سکتی ہے اور مقصود شادی نہ ہو تو وہ نہیں ہوتی۔ اس کے ذہن میں کسی سے محبت لگا کر بے وفائی کرنا شدید ترین گناہ تھا اس کا خیال تھا کہ ایک سے زیادہ شادیاں کرنے کی اہازت نہیں ہونی چاہیے۔ عورت کو مکمل آزادی چاہیے اس سے ایسا سلوک روا نہیں رکھنا چاہئے جس میں امتیاز کا عنصر ہو اسے بھڑکنی یاد نہیں سمجھتا چاہئے۔

یہ سب خیالات اس نے علی احمد ہاجرہ اور اپنی زندگی سے اخذ کیے تھے۔

اس نے اپنے باپ کی جنسی بے راہ روی کی وجہ سے بہت دکھ سنا تھا۔ اپنی والدہ مظلومیت کی وجہ سے اس کا بچپن تباہ حالی میں گزرا تھا۔ اور سب سے بڑھ کر وہ اس محبت محروم رہا تھا جس کے بغیر بچے کی شخصیت پھل پھول نہیں سکتی۔

وہ سوچ رہا تھا کہ اگر اسے شہزاد سے محبت ہے تو پھر سادی سے کیا ہے اسے سادی تنہائی میں ملنے کے کئی ایک مواقع ملے تھے۔ گھنٹوں وہ اس کے پاس کھڑا رہتا لیکن اس نے کوئی خصوصی خواہش محسوس نہ کی تھی اسے سادی سے مل کر ایک ان جانی خوشی ہوتی تھی کا خط پڑھ کر وہ مسرت کی ایک روح محسوس کرتا تھا۔

اگر اسے سادی سے محبت ہے تو پھر شہزاد سے کیا تھا۔ کیا اس روز جب وہ کئی سال تھی۔ اور اہلی نے اس کے ہاتھ تھام لیے تھے اس کا آواز وہ ہوس کاری پر مبنی تھا۔ اس وقت اس نس میں دھکی سی کیوں بجی تھی جب وہ شہزاد کا ہاتھ پکڑتا تھا تو اس کے جسم میں جھل کیوں چلنے لگتی تھیں کیوں اس کا جی چاہتا تھا کہ اس کے قریب تر ہو جائے اور قریب اور قریب کیا یہ ہوس تھی کیا جسمانی قرب کی خواہش ہوس ہوتی ہے۔

لیکن محبت میں آرزو تو ضرور ہوتی ہے۔ قرب کی آرزو نہ ہو تو کیا ہو سکتی ہے۔ اسے سمجھ نہیں آتا تھا۔

یہ درست تھا کہ سادی کے ساتھ اس نے جسمانی قرب کی خواہش محسوس نہ کی تھی

طی موجودگی میں ایک لطیف سانسہ اس کی نس پر چھا جاتا تھا۔ لیکن شہزاد کے لیے وہ شادی کرنا تھا اور تنہائی میسر ہوتی تو اس کا جی چاہتا اس کے قریب تر ہو جائے۔ اگر شہزاد بے وفائی کرے تو وہ جیسا کرتی تو نہ جانے اس قریب کا نتیجہ کیا نکلتا۔ بہر حال وہ نتیجہ اسے بے وفائی پر گوارا نہ تھا۔ جو اس روز بند بیٹھک میں ہوا تھا اس کی اہلی نے آرزو نہ کی تھی بلکہ اس نے وہ قدم صرف اس لیے اٹھایا تھا کہ اس کو یقین تھا کہ اگر عورت سے منہ زبانی محبت کی بات نہ آتا جاتی ہے۔

بہر حال جہاں تک اس کے اپنے جذبات کا تعلق تھا وہ دل کی گہرائیوں میں سادی کی محبت کو سمجھتا تھا چونکہ اس میں گناہ کا عنصر شامل نہ تھا سادی کسی کی بیابتا بیوی نہ تھی اس کے علاوہ شہزاد پر اعتماد نہ تھا نہ جانے کیوں وہ سمجھتا تھا بھلے کے تمام جوان اس کے عشق میں سرشار ہوا شہزاد فطرتاً ہی محبت بھری نگاہوں کے سحر سے خود کو محفوظ کرنے کی خواہشمند نہ تھی۔

بے وفائی کسی کی بھی ہوں۔

شہزاد کا حسن اس کے دل میں احساس رقابت پیدا کرتا تھا اور وہ سمجھتا تھا کہ ساری دنیا اس راز پر ہے اور وہ شہزاد کے نقاب کے ابھرے تاروں کو گنتا رہتا لیکن شاید یہی محبت کا ثبوت ہے۔ بہر حال یہ احساس اس قدر اذیت دہ تھا کہ وہ چاہتا تھا کہ اس سے نجات حاصل کرے۔

وہ چوری چوری دعائیں مانگتا تھا کہ سادی کی بات میں مشکلات حائل نہ ہو جائیں سادی اس کا خوف، رقابت اور احساس گناہ خارج ہو جائے جو شہزاد کی بات سے وابستہ تھا لیکن اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ اطلاع اس آرزو کو اپنالے کیونکہ وہ مانگا کہ اسے یہ بات تسلیم کرنی پڑے گی کہ وہ شہزاد سے بے وفائی کر رہا ہے اور یہ بات اسے اس صورت میں گوارا نہ تھی۔

جب سے اہلی لاہور سے آیا تھا اس نے شہزاد کی طرف خصوصی توجہ نہ دی تھی۔ اس نے شہزاد کو باوجود پکڑنے کی کوشش نہ کی تھی۔ اس نے غور نہ کیا تھا کہ اس کے ماتھے کا قتل کب ہو گیا اور کب سرخی مائل۔ اس نے شہزاد کے جسم کی خوشبو کو اس شدت سے محسوس نہ کیا تھا اس تبدیلی اس بے رخی کا جواز یہ پیدا کیا تھا کہ وہ شہزاد سے ناراض ہے چونکہ پچھلی شہزاد وہ علی پور آیا تھا تو شہزاد نے اس سے بے پروائی کا سلوک کیا تھا۔

بہر حال اندرونی طور پر وہ ایک شدید کشش میں مبتلا تھا اس میں اس قدر جرأت نہ تھی کہ

شعوری طور پر فیصلہ کرنا کہ آیا اسے سلوی سے محبت تھی یا شنراؤ سے یا بیک وقت دونوں سے

دیوتا

اگر شنراؤ ایک عام عورت ہوتی تو وہ ایلی کو یوں بے پروا دیکھ کر بے زار ہو جاتی شنراؤ لیے ایلی بدنامی کے ٹیکے کے سوا اور کیا تھا۔ ایلی کی وجہ سے محلے والیاں اسے طعنے دیا کرتی تھیں۔ ہاجرہ اور فرحت سمجھتی تھیں کہ شنراؤ نے جادو کے زور پر ایلی کو طوطا بنا کر اپنی انگلی پر غبار کر کے۔ حتیٰ کہ اس کا خاوند اس سے بدظن ہوا جا رہا تھا۔ اس کی اپنی والدہ شکوک سے بھر پور تھی لیکن مجبور تھی۔ شنراؤ کے تیور دیکھ کر خاموش ہو رہتی بذات خود ایلی ہر روز شنراؤ سے ایک نیا جھگڑا کھڑا کر لیتا تھا تم نے فلاں کی طرف کیوں دیکھا تھا۔ تم میرے پاس بیٹھنے سے گریز کیوں کرتی ہو۔ سارا دن ایلی کے سامنے چڑھاوے چڑھتے رہتے۔ نئی نئی چیزیں پکا کر اس کے سامنے رکھی جاتیں جیسے گھر میں دیوتا بٹھا رکھا ہو۔

شنراؤ کا صرف ایک مطالبہ تھا کہ وہ دیوتا سامنے بیٹھا رہے۔ نہ تو اس کے آگے بٹھائے لیے ہاتھ پھیلائے اور نہ ہی اٹھ کر کہیں جائے لیکن اس کی پریم مرلیا مدھر گیت بجاتی رہے دراصل شنراؤ فطری طور پر ”ان لنگی“ عورت تھی۔ اسے جسم سے لاگ تھی اسے اپنے گرا محبت کا ہالہ قائم رکھنے کا جنون تھا وہ پگھٹ کی پیاری تھی لیکن مگر بھرنے سے اسے ہر قدر جسمانی قرب کو صرف اسی صورت میں برداشت کرنے کے لیے تیار تھی جب پریم کے رہا جتنا رکھنے کے لیے اس میں تیل ڈالنا اذی ضروری ہو جائے۔

ایلی کی بے پروائی کو محسوس کر کے شنراؤ یوں بڑپنے لگی جیسے مچھلی جل بنا تر پتی ہے۔ ہنر کا روپ بگھٹتا جا رہا تھا۔ اس کی آنکھوں، ہاتھوں، ہونٹوں، اور انگ سے تیل کی بوندیں پڑ رہی تھیں۔ دیوتا کو منانے کے لیے ناری اپنی بیعت لیے کھڑی تھی۔

ایلی کو ابھی تک یہ علم نہ تھا کہ عشق میں ازلی طور پر خود کشی کا عنصر ہوتا ہے۔ عشق بیک خود عاشق کو محبوب کے وصال سے محروم کر دیتا ہے۔ اسے علم نہ تھا کہ محبت محبوب کا درد عاشق کا نہیں اور اگر کسی کی محبت حاصل کرنا مقصود ہو تو اسے محبوب بننے کی کوشش کرنا چاہیے نہ کہ عاشق۔ اور بے نیازی محبوب کی بنیادی خصوصیت ہے۔ اسے یہ احساس نہ تھا کہ سلوی کے خیال میں کھو کر وہ شنراؤ کا محبوب بن گیا اور ناری کی تمام قوتیں اس بات پر قسطنطینی تھیں کہ

ہاتھ کا روپ جلا کر اسے وہی پرانی حیثیت بخش دی جائے اور پھر شنراؤ شنراؤ بن کر وہی پرانا ہاتھ کا روپ دھارے اور پھولدار دوپٹے لے کر قتل کی ادھر ادھر اڑتی پھرے۔

محض اتفاق کی بات تھی کہ بیگم اس وقت علی پور آئی تھی جب شنراؤ اور ایلی نے اپنے اپنے گھر بدل لیے تھے۔ اور ایلی کی حیثیت محبوب کی بن چکی تھی۔

پندرہ سال پہلے آئی تو ممکن ہے وہ سمجھتی کہ ایلی شنراؤ کی طرف ہاتھ بڑھا رہا ہے اور شنراؤ اسے ہاتھ نہیں لیکن وہ دیکھ رہی تھی کہ شنراؤ ہاتھ پھیلا رہی ہے اور ایلی دیوتا سامنے بے نیاز بیٹھا ہے۔ لہذا اس نے محسوس کیا شنراؤ غلام علی ہے اور ایلی ایک بیچ عورت جو خریدی جاسکتی ہو نتیجہ ہوا کہ بیگم کے دل میں شنراؤ کے لیے وہی جذبات پیدا ہو گئے جو غلام علی سے وابستہ تھے۔ اور خرات کا یہ طوفان چونکہ چل نہ سکتا تھا لہذا اس کے دل کی گہرائیوں میں اکٹھا ہوتا اور اس کے اکٹھا ہونے کی وجہ سے شنراؤ اور ایلی کا مستقبل تاریک ہوتا گیا۔

سب سے پہلے بیگم نے اس کا اظہار جانو کے سامنے کیا۔

جانو نے اپنی تمام تر زندگی تیاگ کے تحت بسر کی تھی۔ وہ جوانی میں خوش شکل تھی اور لڑکی میں اس کا خاوند مرچکا تھا اور اس نے اپنی تمام تر زندگی لوگوں کے کام کاج کرنے اور محبت کے تحفظ میں بسر کی تھی۔ بیگم کی بات سن کر وہ آتش فشاں پھٹ گیا۔

”اے ہے۔“ جانو بولی ”بیگم یہاں تو آئے دن یہی کچھ ہوتا ہے اب رانی سے کون کے کہنے پہنچا۔“

”آفرین کس کی ہے۔“ بیگم کے دل میں غلام علی بسا ہوا تھا۔

”میں تو تمہاری ہی ہے۔“ جانو بولی۔

”اے میری ہوتی تو یہ چلن نہ ہوتے۔“

”اور شریف میاں بدھو۔“ جانو بولی۔ ”وہ سب کچھ دیکھ کر بھی لٹ سے مس نہیں ہوتا بیگم کو غلام ہے۔“

”خاوند۔“ بیگم نے کہا ”اس محلے کے خاوند تو نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے ہیں خاوند! بات ہی نہیں۔“ بیگم کے نزدیک تو صرف ایک خاوند ایسا تھا جو خاوند کہلانے کا تھا اس نے بیگم کو گھر سے نکال کر ازلی محبوب کی حیثیت اختیار کر لی تھی۔

بیگم اور جانو کی یہ دلی دلی باتیں ابھریں اور پھر اس پر اسرار اصول کے ماتحت باہر نکل گئیں

جسے آج تک کوئی نہیں سمجھ سکا۔

محلے والے جو ایلی اور شہزاد کے قصے پر اظہار خیال کرتے کرتے آگے آگے تھے لیکن جوش میں آگئے اور تازہ دم ہو کر اس پٹی ہوئی لکیر کو پینے لگے۔
ایلی یہ حالات دیکھ کر اور بھی گھبرا گیا۔

محبت نامہ

— ایک روز جب وہ سب چوبارے میں بیٹھے تھے۔ ایلی آلتی پالتی مارے دانا تھا شہزاد کے ہاتھوں میں پوجا کے پھول تھے اور وہ بنس بنس آرتی پتی ہوئی تھی۔
بیگم کے دل سے شعلے نکل رہے تھے جانو کے ہونٹوں پر تحقیر تھی تو دروازہ بجلا۔
”جا دیکھ جا کر۔“ شہزاد جانو سے مخاطب ہوئی ”نیچے ڈاکیہ کب سے محبت نامہ لے رہا ہے۔“ وہ حسب معمول مسکرائی۔

”محبت نامہ“ بیگم نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں وہ کہتے ہیں جادو برحق ہے۔“

دوسری مرتبہ دروازہ بجلا تو جانو نیچے اتر گئی۔

شہزاد ہنسنے لگی ”اماں اگر آج بھی محبت نامہ موصول نہ ہوا تو پھر چھوڑو ان تعویذ گنار کو۔“

”کیسے چھوڑوں“ بیگم بولی۔ ”جس کا راج پاٹ لٹ گیا۔“ وہ رک گئی اس کی آنکھ ڈبڈبائی چکی تھیں۔

شہزاد پھر ہنسی۔ ”تو اماں راج پاٹ کے لیے روتی ہوتا۔“ میں سمجھتی تھی بھگت کے لے رو رہی ہو۔“

”جس پر بیٹے وہی جانے ہے۔“ بیگم نے کہا۔

”مجھ پر بیٹے تو میں سمجھوں۔“ خس کم جہاں پاک۔“ شہزاد نے معنی خیز نگاہ ایلی پر ڈالی۔

”تیری نظر میں کوئی ہو گا۔“ بیگم نے ایلی پر جلی کٹی نگاہ ڈالی۔

شہزاد نے قہقہہ لگایا۔ ”ہاں ہے۔“ وہ بولی۔ ”نہ بھی ہوتا جب بھی یہی سمجھتی۔“

جانو آئی تو اس کے ہاتھ میں خط تھا۔

”کیا نامیں نے کہا نہ تھا۔“ شہزاد بولی۔

”شہزادی محبت نامہ ہو گا۔“ بیگم بولی۔

”کون لکھتا ہے جی اور پھر محبت نامہ۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی ”محبت نامے“ میں زیادہ مجھے کون لکھتا ہے کہ روٹی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روٹی کا مطالبہ ہے کھائی اور نہ لانا۔“ لکھا ہوتا ہے کہ روٹی کی تکلیف ہے۔ ان کا تو صرف روٹی کا مطالبہ ہے کھائی اور نہ لانا۔“

”یہ تو میرا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”مثالی غلطی سے تمہارا نام لکھ دیا ہو۔“ کھولو تو۔“ شہزاد بولی۔

ایلی نے اسے کھولا تو وہ بھونچکا رہ گیا وہ سادی کا خط تھا۔

”یہ تو خط ہے۔“ یہ تو اخبار معلوم ہوتا ہے۔“

”اور کیا محبت کی بات مختصر ہوتی ہے کیا۔“ شہزاد بولی۔

ایلی کا رنگ فق ہو گیا۔

”اور جس کے نام آیا ہے اس سے پوچھو وہ تو بیباک رہ جاتا ہے۔“ شہزاد مسکرائی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے شہزاد سادی کے تمام قصے سے واقف ہو۔

”یہ تو کلچر کے متعلق ہے۔“ ایلی کہنے لگا۔

”جیسی خط نہیں دفتر ہے۔“ جانو بولی۔

ایلی خط اٹھا کر ایک طرف چلا گیا۔

سادی کا خط پڑھ کر ایلی ایک مرتبہ پھر اسی فضا میں پہنچ گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ زینے

الے کرے میں کھڑا ہو اور سادی مسکرا رہی ہو مسکرائے جا رہی ہو سارے خط میں محبت کا تو

لکھا نام ہی نہ تھا۔ وہ خود ہنستی تھی اور ایلی کو گدگداتی تھی۔ اور ہانے ہانے لگاؤ کی بات

بجھاتی تھی۔

ایلی نے وہ خط کئی ایک مرتبہ پڑھا۔ اور وہ قطعی طور پر بھول گیا کہ وہ علی پور میں ہے اور

یہ نامائے آلتی پالتی مارے بیٹھا ہے سامنے آرتی۔ پڑی ہے پوجا کے پھول بکھرے ہوئے

نہ۔ بیگم میں غصے بھرا طوفان اٹھ رہا ہے محلے میں لوگ ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بیٹھے ہیں۔

اس روز پہلی مرتبہ وہ باہر نکل گیا۔

محلے سے وہ جلدی جلدی نکل گیا تاکہ کوئی بات نہ چھیڑے پھر کھیتوں میں پہنچ کر وہ کوٹلی کی

طرف چلا گیا۔

اس کے سامنے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ ”خط کا جواب کیوں دیں گے آپ؟“
رہی تھی ”ان پیسوں کا بالائی کا برف کھائیے نہیں تو پتلون رفو کرا لیجئے“ وہ اپنے کلمے ہوئے
دہرا رہی تھی۔

دوسری طرف منصر کھڑا کہہ رہا تھا ”وعدہ کیجئے کہ آپ ان لوگوں سے براہ راست رابطہ
نہ کریں گے۔“ تیسری طرف امان بندوق اٹھائے اس کی جانب آ رہا تھا۔ امان ہاتھ مل رہی تھی
”بیٹے اب کیا ہو گا۔“

سادوی کے خط میں دو باتیں امید افزا تھیں۔ اس نے لکھا تھا کہ جلد ہی کوئی صاحب علی
آئیں گے تاکہ ایللی اور آصفی خاندان کے متعلق تحقیق کریں۔ کرتے پھر میں تحقیق میں
دوسرے اس نے خط میں پتہ لکھا تھا اور مطالبہ کیا تھا کہ جواب ضرور دیا جائے۔ اور اس پتہ پر
جائے اور اس کی راست گوئی کا مسئلہ اڑایا تھا۔ جس سے ظاہر تھا کہ معاملہ کو راز رکھنا ضرور
ہے۔

ویر تک ایللی بیٹھ کر اس کے خط کو ذہن میں دہراتا رہا پھر وہ اس کا جواب سوچنے میں مشغول
ہو گیا۔ واپسی پر ایللی کو خیال آیا کہ کیوں نہ رضا سے مل لوں۔ وہ اپنی بے اعتنائی پر شرمندہ
محسوس کر رہا تھا۔ رضا کی دوکان بند تھی اس لیے وہ اس کے گھر چلا گیا۔ ایللی کو گھر کے دروازے
پر دیکھ کر رضا کی حیرت کی انتہا نہ رہی۔

”تم یہاں۔“ وہ چلایا۔ ”یار بڑے خوش نصیب ہو جو گھر آ گئے ورنہ آج ہی میں نے؟
خطرناک فیصلہ کیا تھا۔“

”کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”اب بتانے کا کیا فائدہ۔ تم آ گئے ہو تو چلو معاف کر دیا۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”آؤ بیٹھو اندر۔“

تھیں ایک خبر سناؤں۔“

”کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”شادی ہو رہی ہے۔“

”کس کی۔“

”اپنی اور کس کی۔“

ایللی نے حیرت سے اس کی لنگڑی ٹانگ کی طرف دیکھا۔
”بھئی شادی کو لنگڑے پن سے کیا تعلق“ رضائے تقہر مار کر کہا۔ ”بلکہ لنگڑے کی پکڑ تو
شور ہے۔“

”عجب کی بات ہے۔“ ایللی بولا۔

”بھئی اپنا اللہ مالک ہے آج تک بھی روزی پہنچتی رہی ہے اب مستقل صورت پیدا ہو
ہوئی۔“

اس کے بعد ایللی کا معمول ہو گیا کہ وہ روز کسی نہ کسی وقت رضا کو ملنے چلا جاتا۔ اور وہ
روزوں یا تو دکان میں بیٹھے رہتے یا شیخ ہمد کے ہاں چلے جاتے۔

شیخ ہمد اسے دیکھ کر شور مچا دیتا۔

”بھئی اب تو چھوڑو بھائی تاؤ ہمارے مہمان آئے ہیں اب تو سودا ہو گیا ساڑھے دس آنے
پر۔“ ایللی تو الیاس صاحب آئے ہیں آئیے کیا پوچھ گئے بھئی ہم سے بھی کچھ کھا پی لیا کرو
مال کا مال کھاؤ گے تو موٹے ہو جاؤ گے چلو ایک شطرنج کی بازی رہے او لڑکے دینا ہمیں
شطرنج۔“

ہمد کے ساتھ شطرنج کھیلتے ہوئے ایللی سب کچھ بھول جاتا کہ وہ دیوتا بنا بیٹھا ہے۔ سامنے
ٹھنڈا آتی کے پھول اٹھائے کھڑی ہے اور محلے والے اس دیوتا کو شیطان سمجھتے ہیں۔ اور لاہور
سے لوگ آ رہے ہیں اور اسے علی احمد کو اس بات پر رضامند کرتا ہے کہ باقاعدہ طور پر پیغام لے
کر ملے اور منصر سے ملے۔

ایللی بڑا ہو گیا تھا۔ لہذا کچی حویلی یا محلے کے میدان میں کھڑا ہونا یا کھیلنا اس کے لیے مشکل
ہو گیا تھا۔ کچی حویلی اور میدان میں نئی پودنے جگہ لے لی تھی۔ اب یہ ممکن نہ رہا تھا چونکہ یہ
نئی روایات کے منافی تھا۔

ایللی کے تمام ساتھی اپنے اپنے کام پر چلے گئے تھے۔ رفیق یوسف اور جمیل اب ملازم تھے
اور مختلف مقامات پر متعین تھے محلے میں صرف رضا کا بھائی ضیاء تھا۔ رفیق کا بھائی صندر اور چند
ایک اور لڑکے تھے جن سے ایللی کے زیادہ تعلقات نہ تھے البتہ صندر اب بھی اپنی بیشک میں
لیونٹ کوٹنے چھاننے میں مصروف رہتا تھا اس نے تنگ آ کر اشتہاری حکیم کا کام شروع کر رکھا
تھا۔

”بیگم بولی۔ ”وہ تو پہلے ہی سے نامزد ہو چکا ہے۔“

”ایلی! میں نے ان لوگوں کا کیا اعتبار۔ وہ تو بڑی بڑی مبارکیں دیتے تھے کہتے تھے وہ اب بھی ہیں مگر انا اچھا ہے اور لڑکی کا بھائی جو آیا تھا وہ تو مشہور آدمی ہے۔ یہی کہتے تھے بھی سب تو بھی کچھ بولے گا۔“ جانو نے ایلی کو جھنجھوڑ کر کہا۔

”ہو نہیوں۔“ بیگم بولی ”یہ مجنوں کہاں بولے گا۔“
”تو کیا وہ لیلے کا خط تھا جو اس روز آیا تھا۔“ شہزاد مسکرائی۔
”ہے وہ اخبار؟“ جانو نے کہا۔

”پلو یہ بھی اچھا ہوا۔“ شہزاد بولی۔ ”اس کا گھر بھی بس گیا۔“
”بے گاتو جانیں گے۔“ بیگم نے کہا۔ اس کا چہرہ غصے سے لال ہو رہا تھا۔

لسان

چار ایک دن کے بعد جب ایلی اکیلا بیٹھا ہوا تھا۔ تو شہزاد چپکے سے دبے پاؤں اوپر آگئی۔ اور
”اے کہنے لگی۔“ آخر مجھ سے بھاگنے کی کیا ضرورت ہے۔ تم کیوں خواہ مخواہ بھاگتے پھرتے

ایلی ہنسنے لگا۔ ”خطرناک لوگوں سے دور رہنا ہی اچھا ہوتا ہے۔“ اس نے بات ٹالنے کے لیے کہا۔

”کب سے ہوئی ہوں خطرناک۔“ وہ بولی۔

”شروع سے ہی تھی۔ مجھے احساس اب ہوا ہے۔“

”ایلی! وہ بولی ”بات مذاق میں نہ ٹالو۔“

”میں ان سے مجھے تو سن کر بے حد خوشی ہوئی ہے۔ بے حد۔ تمہیں ایک ساتھی مل گیا۔
مجھے بے حد خوشی ہے ایلی۔“ وہ سنجیدہ ہو گئی۔ ”مجھے صرف یہ افسوس ہے کہ تم نے مجھے غلط
گمان کی آنکھیں پر ہم ہو گئیں، ماتھے کا قلعہ سرخ پڑ گیا۔“ مجھے تم سے کوئی غرض نہیں ایلی۔

”میں راستے میں دیوار نہیں بننا چاہتی۔ میں تو بری طرح چھنی ہوئی ہوں۔ ورنہ
میں اتنی جرات ہے کہ سب کو چھوڑ کر تمہارے ساتھ چل پڑوں۔ لیکن ایلی میرے پاس
تمہیں دینے کے لیے اب کیا دھرا ہے۔ کچھ بھی نہیں میں اس قاتل نہیں کہ تمہاری زندگی کو

صفر ایلی کو دیکھ کر مسکراتا۔ اس کی مسکراہٹ سے ظاہر ہوتا تھا جیسے وہ ایلی کے راز
واقف ہو۔ ایلی کو دیکھ کر وہ اسے پکڑ لیتا۔ ”آؤ بھائی ہمارے پاس بھی بیٹھ جایا کرو گھڑی تو
کے لیے ہم بھی تو تمہارے چرنوں میں رہتے ہیں۔“ ایلی اسے دیکھ کر گھبرا جاتا تھا۔ اس کی
صرف یہ تھی کہ صفر ہمیشہ ایسے انداز سے بات کرتا کہ ایلی کو شہزاد یاد آ جاتی اور اسے
ہوتا جیسے صفر جان بوجھ کر شہزاد کی بات چھیڑنا چاہتا ہے جیسے وہ ایلی کو زبردستی اس بات پر
کر رہا ہو کہ ایلی اسے راز داں بنالے اور راز داں بننے کے بعد وہ دونوں مل کر شہزاد سے
کریں۔

اے ہے

ایک روز جانو ہانپتی ہوئی آئی اور سیدھی ایلی کے دروازے پر آگئی اور پھر ہونٹوں پر
رکھ کر حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ ایلی اپنے ہی خیال میں مگن بیٹھا رہا۔ اس پر شہزاد
”کب تک کھڑی رہے گی تو وہاں۔ اسے تو اپنی بھی خبر نہیں کچھ۔“
”تو کیوں پتلی بنی کھڑی ہے۔“

”اے ہے میں تو حیران ہوں۔“ جانو نے کہا۔

”پڑی ہو حیران یہاں کیا فرق پڑتا ہے۔“ شہزاد ہنسی۔

”آخر بات کیا ہے۔“ بیگم نے پوچھا۔

”ہے وہاں تو مبارکیں مل رہی ہیں۔“

”کے مبارک مل رہی ہے۔“

”ہے انہوں نے تو مجھے پکڑ لیا۔ تھانیدار کے گھر گئی تھی یہی جو بڑی ڈیوڑھی کے اندر
ہے۔ انہوں نے پکڑ لیا۔ مجھے کہنے لگیں۔ بڑا گھرتا کا ہے تم نے۔ اور اب تو سمجھ لو بات
گئی۔ ہمارے گھر آئے تھے نا پوچھ گچھ کرنے۔ کیا پڑی تھی جانو جو اندر کی باتیں کرتے۔
چھپا گئے۔ اب سمجھ لو معاملہ چل نکلا۔“

”تو کھل کے بات کرے گی یا نہیں۔“ بیگم نے اسے ڈانٹا۔

”صاف بات تو کر رہی ہوں۔“ جانو بولی۔

”خاک صاف ہے۔ اپنی تو سمجھ میں کچھ نہیں آیا۔“ بیگم بولی۔

روشن کر سکوں۔“ وہ خاموش ہو گئی اور ایللی کے پاس کھڑی ہو کر اس کے بالوں سے کینے لگی۔
”مجھ سے ڈرو نہیں گھبراؤ نہیں میں تمہاری وہی شہزاد ہوں مجھ سے کیا پردہ رکھو گے لیکن تم
مجھ پر اعتماد بھی ہو۔ تم یہ سمجھتے ہو کہ میں ہر راہ گیر سے آنکھیں لڑانے کی شوقین ہوں۔
تم سمجھتے ہو جس طرح تم نے میرے ہاتھ پکڑے تھے اسی طرح ہر کوئی میرے ہاتھ پکڑ لیتا ہے
میں چپ رہتی ہوں۔“

پتلی کی آواز سن کر ایللی نے تڑپ کر پیچھے دیکھا۔ لیکن شہزاد نے منہ موڑ لیا تھا۔
تک وہ خاموش رہی پھر بولی۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ تم میری زندگی میں خلعتان ہو۔ اس صحران
میں ایک خلعتان ہے۔“

”جب میں نے پہلی مرتبہ تمہیں دیکھا تھا تو میں حقارت سے منہ پڑی تھی۔ جب راہ
نے مجھے بتایا تھا کہ اسے تم سے محبت ہے تو میں نے اس کا مذاق اڑایا تھا۔ میں نے کہا تھا
نظر آیا ہے ایللی میں۔ بڑا ہی مضحکہ اڑایا میں نے اس کا پھر اس روز جب میں تمہیں کمانی مار
تھی اور تم نے میرے ہاتھ پکڑ لیے تھے نہ جانے اس وقت میں کیوں خاموش رہی دیے
تمہاری حرکت بہت بری لگی تھی۔ پھر نہ جانے کیا ہو گیا تم نے باتیں کر کے مجھ پر کیا جادو کر
تیری نگاہوں نے مجھے چاروں طرف سے گھیر لیا۔ اور پھر مجھ میں سکت نہ رہی اور
شہزاد نے ایک لمبی آہ بھری۔

”دیکھو شہزاد“ ایللی بولا ”میں۔“

شہزاد نے اپنا ہاتھ اس کے منہ پر رکھ دیا۔

”مجھے کہہ لینے دو آج۔ تم تو روز کہتے رہے ہو۔ آج میرا جی چاہتا ہے کہ سب کچھ
جو شاید میں کبھی نہ کہتی وہ بھی کہہ دوں۔ میں کئی بار بیٹھی سوچا کرتی تھی مجھے کیا ہو
ہے۔ میرا گھر ہے میرے بچے ہیں میرا خاندان ہے جو میری ہر بات ماننے کے لیے بے چین ہے
مجھے کیا ہو گیا ہے میں کیا کر رہی ہوں۔ انجام کیا ہو۔“ وہ رک گئی۔
”میں نے بہت ہی سوچا لیکن میں ہار گئی۔ ہار گئی۔“ ایللی اس کی پتلی نکل گئی۔

”میں نے یہ محسوس کیا کہ تم ہو تو زندگی میں سبھی کچھ ہے تم نہیں تو کچھ بھی نہیں۔
جانے کیوں جی چاہتا کہ تم میرے پاس رہو صرف یہی اور کچھ نہیں مجھے تم سے کوئی غرض نہ

ایللی نے نہیں۔“ ایللی کے سر پر پانی کی اک بوند گری۔ اس نے سر اٹھایا۔ شہزاد نے اس
بار کو زندگی موڑ دیا۔

”وہ بولی۔“

”میں نے خواہ مخواہ ان سے بگاڑ کی صورت پیدا کر لی۔ معلوم نہیں کیوں لیکن انہیں دیکھ کر
میں نے آنا ہے خواہ مخواہ میں ان کی ہر بات رد کر دیتی ہوں۔ میں نے ان کو عاجز کر دیا
ہے۔“ وہ میرے میاں ہی نہ ہوں۔ مجھے ان سے نفرت ہو چکی ہے۔ نفرت“

”پھر وہ میرے میاں ہی نہ ہوں۔“ ”نو تم یہاں ہو اور میں تمہیں وہاں ڈھونڈ رہی
ہوں۔“ وہ بولی۔

”جانو تم جاؤ۔“ شہزاد نے سرد مہری سے کہا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”میں کہہ چکا ہوں۔“

”اے ہے ہٹاؤ جوں کی توں پڑی ہے۔“ جانو نے کہا ”اور تم۔“

”ہٹاؤ کو چلوے میں ڈال دو۔“ شہزاد نے اپنے ہاتھ ایللی کے سر سے ہٹائے بغیر کہا۔

”لیکن تم یہاں کیا کر رہی ہو۔“ جانو نے پوچھا۔

”میں ایللی سے بات کر رہی ہوں۔“

”اے ہے اتنی ہی خاص بات ہے کیا؟“

”ہاں اس سے بھی زیادہ۔“

جانو ہنٹوں پر انگلی رکھے اٹے قدم چلے ہوئے بولی ”اے کوئی خدا کا خوف کرو اگر تمہاری
انگلی دیکھ لیا تو۔“

”اگر وہ آئے۔“ شہزاد نے کہا۔ ”تو اسے بھی کہہ دینا کہ اوپر نہ آئے میں ایللی سے بات کر
نا ہوں۔“ جانو نے سینہ تمام لیا۔ ”تو یہ ہے تمہارا تو جواب نہیں۔“

”مجھ کو دیر کے لیے وہ خاموش کھڑی اس کے بالوں سے کھیتی رہی پھر بولی ”تم میرا ہاتھ تھامتے
تو میں اسے جھک دیتی تھی تاکہ بات کا رخ نہ بدل جائے۔ یہ بہشت دونوں نہ بن جائے۔
تاکہ میں اپنی نگاہ میں آپ نہ گر جاؤں چور نہ بن جاؤں اور پھر مجھ میں اتنی ہمت نہ رہے
میں تکی کر لوگوں سے بات کر سکوں۔“

”مجھے بدنامی کی پروا نہیں اہلی لوگوں کی باتوں کی پروا نہیں لیکن اپنی نظر میں آپ کو براہ کی پروا ہے۔ اس لیے میں تمہارا ہاتھ جھٹکتی رہی تمہیں روکتی رہی مجھے معلوم نہ تھا کہ تم اس برا مانو گے۔“

”تم سمجھتے رہے کہ مجھے تم سے صرف دکھانے کی دلچسپی ہے تم سمجھتے رہے کہ میں بڑا ہوں بے حس ہوں۔ لیکن۔۔۔“ اس کی ہچکی نکل گئی۔

اہلی دیوانہ وار اٹھ بیٹھا۔ شہزاد نے اسے روکا۔ ”میری بات سن لو۔“ لیکن شہزاد کی بات ناقابل برداشت ہوئی جاری تھیں۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔

عین اس وقت بیگم نے زینے سے سر نکالا۔ ”تمہاری خاص بات ابھی ختم نہیں ہوئی کیا۔ اس کے انداز میں غصہ اور طعنہ تھا۔

”تمہارے دخل دینے سے کیا ختم ہو جائے گی، ماں“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تم تو اس گھر کو تباہ کرنے پر تلے ہوئے ہو۔“ بیگم غصے میں چلائی۔

”یہ تو گھروالا جانے ماں تم کیوں فکر میں گھلی جا رہی ہو۔“

”وہ تو مجھے پتہ ہے کہ یہ گھر میرا نہیں۔“ بیگم کی آنکھیں چھلکنے لگیں۔

”تو کیا اس گھر کو بھی تباہ کرنے کا ارادہ ہے۔“ شہزاد نے مسکرا کر کہا۔

بیگم دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر بیٹھ گئی۔

”آؤ اہلی۔“ شہزاد بولی۔ ”نیچے چل کر چائے پیئیں۔“ یہ کہہ کر وہ بیڑھیاں اترنے لگی۔

اہلی بیگم کے پاس بیٹھ گیا۔ یوں بیگم کو چھوڑ کر نیچے جانے کی اس میں جرات نہ تھی۔

تک وہ بیگم کو بسلاتا رہا۔ تبلی دیتا رہا اور بیگم ٹپ ٹپ آنسو بہاتی رہی۔

گھر میں کوئی نہیں

استحان کا نتیجہ نکلنے سے چار ایک روز پہلے اہلی لاہور روانہ ہو گیا۔ اسے نتیجہ کے متعلق کوئی دلچسپی نہ تھی چونکہ وہ جانتا تھا کہ وہ پاس نہیں ہو سکتا۔ جس زمانے میں اس کے ہم جماعت شاہ شام مطالعہ میں مصروف رہتے تھے۔ وہ کتاب کھول کر خیالات میں کھو جایا کرتا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ پوری توجہ سے پڑھے تاکہ اس کا سال ضائع نہ ہو۔ پہلے ہی وہ اتنے سال ضائع کر چکا تھا اس کے علاوہ اسے معلوم تھا کہ منصر کی خواہش ہے کہ وہ اچھے نمبروں پر پاس ہو۔ منصر اسے ایک لائق

بہیمان فائور اہلی چاہتا تھا کہ منصر کی توقعات پر پورا اترے لیکن جونہی وہ کتاب اٹھاتا پہلی ہی پشیمانی نہ کوئی ایسا لفظ آجاتا کہ اس کے خیالات کا رخ بدل جاتا اور وہ سوچ میں کھو جاتا اور پشیمانی کی توں اس کے ہاتھوں میں دھری کی دھری رہ جاتی۔

پشیمانی کی توں اس کے ہاتھوں میں دھری کی دھری نہ تھی۔ نتیجہ کے لیے لاہور جانے سے اس کا مقصد صرف اہلی کو پاس ہونے کی قطعی امید نہ تھی۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔ پشیمانی کے افراد سے ملنا تھا۔

”اوسوں شرمائے نہیں۔“

”ڈریے بھی نہیں وہ بددوق والے چلے گئے۔“

وہ دونوں ایک ساتھ چلا رہی تھیں قہقہہ لگا رہی تھیں۔

”قرب کیوں نہیں آتے۔“

”پتلون پیچھے سے رنوی ہوئی ہے ناس لیے۔“

”ہے دبلے ہو گئے ہیں۔“

”نہ بھاؤں سوکھے نہ ساون ہرے۔“

اس پر وہ دونوں قہقہے لگائے لگیں پھر خاموشی چھا گئی۔

ایلی جون کا توں کھڑا رہا۔

پھر زینے میں بڑے بڑے بوٹوں کی چاپ سنائی دی۔ ایلی چونکا۔

ایک زینے سے سادی اتری اس کے سر پر پانچ چھ دوپٹے یوں لپٹے ہوئے تھے۔ جیسے

بڑی گھڑی ہو۔ جسم پر کالا اچکن تھا اور پاؤں میں فوجی بوٹ تھے۔

وہ وہیں رک گئی۔ ”کون ہے؟“ اس نے بھاری آواز بنا کر کہا ”گھر میں کوئی نہیں۔“

بولی۔

اتنی سی چوری

ایلی خاموش کھڑا رہا۔ اوپر جنگل کی سلاخوں سے باجی کا چرا صاف دکھائی دے رہا تھا۔

”آپ کس سے ملیں گے۔“ وہ بولی۔

”آپ سے“ ایلی اس کی طرف بڑھا۔

سادی نے شور مچا دیا۔ ایک بار پھر سارا گھر قہقہوں سے گونجنے لگا۔

ایلی سادی کے پیچھے بھاگا وہ آگے آگے قہقہے لگاتی دوڑ رہی تھی۔

ایلی کی کوشش تھی کہ اس کے سر سے ایک دوپٹہ اتارے۔

وہ دونوں اوپر جا پہنچے ایلی زینے کے دروازے میں رک گیا۔

”بس“ باجی چلائی۔

”آگے پر چلتے ہیں۔“ سادی نے شور مچایا۔

”دوپٹہ مجھے دے دو۔“ ایلی نے کہا۔

”کہیں گھڑی باندھنے کا ارادہ ہے۔“

”روبل بناؤں گا۔“

”نہ روبل۔ یہ دوکان نہیں شریف زادیوں کا گھر ہے۔“ سادی ہنسی۔

ایلی جلال میں آگیا۔ ”وہ سلگا ہوا سگرٹ یاد ہے۔“ وہ بولا۔

”چھا“ وہ چلائی ”جب خلیل فاختہ اڑایا کرتے تھے۔“

”اب بھی فاختہ اڑا سکتے ہیں خلیل۔“ وہ بولا۔

”ان تو سنگتوں کو دیتے ہیں۔“ سادی ہنسی۔ ”چھین کر لے جائیے۔“

”ہے ہمت“ باجی بولی۔

”اوسوں“ سادی چلائی ”صرف دروازے تک۔“

”اور اگر چھین لیا تو۔ انعام۔“ ایلی بولا۔

”جو مانگو گے ملے گا۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”شرط یہ ہے کہ سر کا دوپٹہ اتار دو۔“ باجی بولی۔

”میں شور مچا کر محلے کو اکٹھا کر لوں گی۔ سوچ لیجئے۔“ سادی ہنسنے لگی۔

”اور اگر کوئی آگیا تو؟“ باجی نے کہا۔

”تو یک بنی دو گوش“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”تو تیار ہو جاؤ۔“ ایلی نے کہا ”مابدولت تشریف لاتے ہیں۔“

”حزم میں تو صرف خواجہ سرا آتے ہیں مابدولت نہیں“ سادی ہنسنے لگی۔

”کیا واقعی۔“ یاد دھمکی دے رہے ہیں۔“ باجی نے سادی کو مخاطب کر کے کہا۔

”یہ تو بھگت ہیں۔ سورا ہوتے تو خطرہ بھی ہوتا۔“ سادی چلائی۔

”خلی ملا جپتے ہیں کیا؟“

”وہ بھی رام ٹہم کی جیسی تو بن باسی ہیں آج کل“ سادی بولی۔

”نہ جست بھری اور سادی کی طرف لپکا۔“

سفید منزل میں کرام مچ گیا وہ آگے بھاگ رہی تھیں۔ چیخ رہی تھیں قہقہے لگا رہی تھیں وہ

پہلے اس وقت وہ بھول چکا تھا کہ وہ سفید منزل میں آنکھ پھولی کھیل رہا ہے۔ وہ بھول چکا تھا

کہ گلی کے سب لوگوں دروازے کھول کر سفید منزل کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ وہ بھول چکا تھا کہ وہ منصر کا دوست ہے۔ اس نے منصر سے وعدہ کیا ہے کہ براہ راست ان سے رابطہ پیدا کرنے کی کوشش نہ کرے گا۔ اور اسے سفید منزل کے جغرافیہ سے قطعی طور پر واقف نہیں۔

دیر تک وہ بھاگتے رہے پھر ایلی نے سادی کو پکڑ لیا۔ سادی نے با آواز بلند چار ایک پنجی ماریں اور دوپٹہ اپنے گرد لپیٹ لیا۔
بھد مشکل ایلی نے دوپٹہ الگ کیا۔ سادی نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے کانٹا۔ اس کے بل بکھرے ہوئے تھے منہ سرخ ہو رہا تھا۔
ایلی دوپٹہ لے کر بھاگا۔

جب وہ صحن میں پہنچا تو سامنے ایک ضعیف عورت کھڑی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ چند ایک ساعت کے لیے وہ دونوں ایک دوسرے کے رو برو کھڑے رہے۔ پھر ایلی گھبرا گیا۔
ضعیف عورت نے چیخا شروع کر دیا ”چور چور۔“
ایلی گھبراہٹ میں اندر کی طرف بھاگا۔
پٹلی منزل سے شور مچائی دیا۔

سادی اور باقی دونوں سنجیدہ ہو کر پوچھنے لگیں۔ ”کون چور؟ کہاں ہے چور دلائی اگ؟“
لیکن بڑھیا برابر چلاتی رہی۔ ”چور چور۔ دوڑ دوڑو۔“
پھر صحن میں دو چار مردوں کی آوازیں سنائی دیں ”کیا بات ہے کیا ہوا؟“
ایلی کا دل ڈوب گیا اب وہ باہر نہیں نکل سکتا تھا۔

اس وقت سادی بھاگی بھاگی آئی اس نے ایلی کی بانہ پکڑ کر اسے گھسیٹا اور ایک زینے میں دھکیل دیا۔

کچھ دیر تک تو وہ وہاں چپ بیٹھا رہا۔ باہر سے باتیں صاف سنائی دے رہی تھیں۔ ”میلانہ کوئی چور نہیں ہے۔“ سادی کہہ رہی تھی۔ ”میں بھائی جان کے کپڑے پن کر باقی کو ڈرا رہی تھی۔“

”اے ہے میں کیا یاگل ہوں میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا ہے۔“
دفعاً ایلی کو خیال آیا۔ ارے وہ چونکا یہ تو وہی زینہ ہے جس کے نیچے ہم ملا کرتے تھے۔

زینہ بہت اس کاٹھ کباڑ سے بچتا ہوا نیچے اتر گیا۔
نیچے جا کر اس نے اس دروازے کو آزمایا جو باہر گلی میں کھلتا تھا لیکن وہ باہر سے بند تھا۔ وہ وہاں ہو گیا۔ اوپر وہ مکان کا کونہ کونہ دیکھ رہے تھے۔
نہ جلتے کب کوئی زینے سے آئے۔

ایلی نے اس دروازے کی درز میں سے دیکھا جو سفید منزل کے اندر کھلتا تھا۔ باہر ہال نما پڑوسی میں کچھ لوگ کھڑے تھے۔ ہر حال باہر نکلتا مشکل تھا۔
اس نے دروازے کی کنڈی کھلی رہنے دی اور پھر آہستہ آہستہ پٹ کھولنے شروع کر دیا۔ آگہ دروازہ کھلا ہو تو انہیں وہاں دیکھنے کی ضرورت محسوس نہ ہو پھر وہ دروازے کے پٹ کے نیچے کھڑا ہو گیا۔

چند ساعت کے بعد ایک محلے دار داخل ہوا۔ ایلی کا دل ڈوب گیا۔
محلے دار سیدھا آگے نکل گیا۔ پھر وہ زینے میں جھانک کر بولا ”میلانہ تو کوئی بھی نہیں۔“ یہ کہہ کر وہ ایلی کی طرف مڑا۔ وہ ایلی کی طرف دیکھ کر مسکرایا اور بولا ”کیوں صاحب اس کونے میں ہے کوئی۔“ ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

اس کی مسکراہٹ معنی خیز تھی۔ اس کے انداز سے دوستانہ محبت نپک رہی تھی۔
”میلانہ بھی نہیں نا۔“ وہ بولا ”میرا خیال ہے گھر والوں کو خواہ مخواہ شک پڑا ہے۔ ہے نا۔“
”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

نواردار اس کی طرف بڑھا۔ اس نے اپنا ہاتھ ایلی کے شانے پر رکھ دیا۔ ”آؤ چلیں۔“ وہ بولا ”نٹنل بے کار ہے۔“

اس کا خاموش ہاتھ ایلی سے سب کچھ کہہ رہا تھا لیکن گھبراہٹ کی وجہ سے ایلی نے اس کے گانے پیغام کو نہ سمجھا۔

”جی جی۔ میں میرا مطلب ہے۔“ ایلی نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔
”ٹھیک ہے ٹھیک ہے۔“ اس نے ایلی کو تھپکتے ہوئے کہا۔ اور پھر اس کے قریب تر ہو گیا۔
”میں جانتا ہوں۔“ میں سامنے گھر میں رہتا ہوں۔“ یہ کہہ کر وہ اسے باہر لے آیا۔
لورڈ سب سفید منزل سے باہر نکل گئے۔

ایلی کے دل میں جذبات کا ایک عظیم تلاطم موجزن تھا۔

اپنے مکان کے سامنے پہنچ کر محلے دار رکا۔ ”آئیے بیٹھے۔“ اس نے ایلی سے کہا۔
”کر جائیے۔“

”بڑی مہربانی ہے مجھے جانا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

محلے دار کے مکان پر ایک سختی آویزاں تھی جس پر لکھا تھا۔ ڈاکٹر اسماعیل۔
”ارے۔“ ڈاکٹر اسماعیل چلایا۔ ”یہ دیکھئے۔“ اس نے ایلی کی پتلون کی طرف اشارہ کیا۔

پتلون کی جیب میں سے سادی کے دوپٹے کا ایک حصہ باہر نکلا ہوا تھا۔

”کیا یہ چوری کا مال ہے؟“ ڈاکٹر ہنسنے لگا۔

”جی“ ایلی بولا۔

”کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”دوپٹہ ہے۔“

ڈاکٹر نے تفتہ لگایا۔ ”بس صرف اتنی سی چوری۔ اس کو تو تقسیم بھی نہیں کیا جائیگا۔

لہذا حصہ مانگنا بے کار ہے۔“

ایلی ہنستا ہوا رخصت ہو گیا۔

شاہ کی سواری

گلی پر خاموشی چھا چکی تھی۔ جنگلے ویران پڑے تھے۔ سفید منزل میں کوئی دکھائی نہ دے رہا تھا۔

دو روز ایلی چھپ کر ہوٹل میں بیٹھا رہا تاکہ اسے کوئی دیکھ نہ پائے اور یہ ثابت نہ ہو جائے کہ وہ اس روز لاہور میں موجود تھا جب سفید منزل میں ہنگامہ ہوا تھا۔

اسے یقین تھا کہ منصر کی آمد پر گھر میں ایک بار پھر ہنگامہ ہو گا اور کرامو روز اس واقعہ کی نوعیت پر بحث کریں گے۔ اسے یہ بھی معلوم تھا کہ منصر کو سب سے پہلے ایلی کا خیال آئے گا اور ممکن ہے وہ اس امر کی تحقیق بھی کرے کہ ایلی لاہور تو نہیں۔

ایلی کو عجیب سے دہم ستارہ تھے شاید وہ علی پور میں تھانے دار کے نام جوبلی تارنگا دے۔ جس تھانیدار کے ہاں انہوں نے ایلی کے متعلق تحقیق کی تھی۔ شاید ڈاکٹر اسماعیل اسے وہ راز افشا کر دے اور ہنس کر کہہ دے:

نمبر ۱ کی بات نہیں۔ کوئی چور دور نہیں آیا۔ اپنے آدمی کو چور نہیں سمجھا کرتے۔“
ایلی نے سوچ کر کہ ایلی نے تو راست گوئی کے تحت سچی بات بتائی وہی ہے سادی اور باقی

ایلی نے گہرے
دو روز بیٹھا سوچتا رہا۔

نمبر ۲ روز رات کے بارہ بجے نتیجہ کا اعلان ہونا تھا۔ ایلی نے ٹائم ٹیبل دیکھا اور گاڑی کے
نیشن پر پہنچا وہاں سے وہ ایک دوسرے ہوٹل میں گیا اور وہاں جا کر کمرہ لے لیا تاکہ رجسٹر
پر اندراج ہو بروقت ضرورت اسے ثبوت کے طور پر پیش کیا جاسکے پھر مطمئن ہو کر وہ باہر

ایلی نے گہرے
نمبر ۳ میں جب وہ چائے پی کر باہر نکلا تو اس نے دیکھا کہ منصر موٹر سائیکل پر آ رہا ہے۔

ایلی نے آواز دی۔ منصر رک گیا۔

”ارے“ وہ بولا ”آپ یہاں؟“

”جی“ ایلی نے کہا۔

”کب ہے؟“ منصر نے سرسری انداز سے پوچھا۔

”دوہری گاڑی سے پہنچا تھا۔ ہوٹل میں سلمان رکھ کر اب آپ کی طرف جا رہا تھا۔“

”کچھ دیر ٹھہرنے کا ارادہ ہے کیا؟“ منصر نے پوچھا۔

”اب جو نتیجہ سننے کے لیے آیا ہوں تو۔۔۔“

”اے“ منصر بولا ”آج تو آپ کا نتیجہ نکلنے والا ہے۔“

”جی“ ایلی نے کہا۔

”تپ“ وہ شاید پاس ہیں۔“ منصر نے سوچتے ہوئے کہا ”یا شاید۔۔۔“ وہ رک گیا۔

”دراصل“ اس نے بات شروع کی ”مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ کیا تھا؟“

ایلی نے اپنا رول نمبر بتایا۔

”اب“ منصر بولا۔ ”شاید یہی تھا۔ مجھے اچھی طرح یاد نہ تھا لیکن اپنے ایک جاننے والے کو
اسے نتیجہ کی ایک نقل مل گئی تھی۔ میں نے اس سے پوچھا تو تھا اگرچہ اچھی طرح مجھے
نمبر یاد نہ تھا۔ اوہ۔“ وہ چونکا ”شاید میں نے پڑے پر نقل بھی تو کیا تھا۔“ اس نے جیب

”میرا بچنے کا کیا فائدہ“ ایم۔ کے حیرانی سے چلایا۔

اتفاق سے

ایم کے سے رخصت ہو کر جب وہ پھر سائیکل پر سوار ہوا تو وہ گہری سوچ میں کھویا ہوا تھا اس کی نگاہوں تلے منصر کھڑا کہہ رہا تھا۔
”اچھا تو آج آپ کا نتیجہ نکل رہا تھا۔“
”آپ تو شاید پاس ہیں یا شاید۔۔۔ دراصل مجھے آپ کا رول نمبر یاد نہیں تھا۔ ایک جلتے والے کے پاس نتیجہ کی نقل تھی لیکن مجھے آپ کا نمبر۔۔۔ پاس ہی سمجھنے کیا کہتے ہیں اے۔۔۔ ہل کپارٹمنٹ میں ہیں آپ“
پھر اسے ان دنوں کا خیال آیا جب وہ مشن کالج میں امتحان دیا کرتا تھا۔ اور جب پرچہ دے کر باہر آتا تو منصر آؤٹ۔ ”اوہ آپ یہاں امتحان دے رہے ہیں۔ اتفاق کی بات ہے کہ میں آج کل اصرار لے کے لیے جاتا ہوں۔“

”اتفاق سے کیس آپ ان دنوں سفید منزل کی طرف تو نہیں گزرے؟“
منصر کی تمام باتیں بالتفصیل باری باری اس کے سامنے آ رہی تھیں۔ اس نے حیرت سے منصر کی طرف دیکھا تو یہ سب اتفاقات سمجھے بوجھے ہوئے تھے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ منصر کے گرد اپنے بازو محال کر دے۔ ”آپ پریشان کیوں ہیں پرسوں میں آپ کے ہاں گیا تھا۔ دادی لال ٹھیک کہتی ہیں۔ وہ میں تھا۔ اور اب میں پھر ایسی حرکت بھی نہ کروں گا یقین جانیئے کبھی نہیں۔“

لیکن سائیکل تیزی سے چلا جا رہا تھا اور اس کے لیے اپنی جگہ قائم رہنا مشکل ہو رہا تھا۔ سفید منزل پہنچ کر منصر نے اسے اپنے کمرے میں بٹھادیا۔ ”الیاس صاحب آپ ذرا بیٹھئے۔ یہ کتب ہی دیکھئے میں ابھی آیا۔“ یہ کہہ کر وہ اوپر چلا گیا۔

ایلی کے دل میں منصر کے لیے احترام اور محبت کے جذبات موجزن تھے۔ اسے آج تک کی ایسی شخصیت سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔ جس کا اظہار اس قدر انوکھا اور رنگین ہو۔

منصر کا کہہ بھی اس کی بے پروائی، رنگینی، ذہانت اور عظمت کا مظہر تھا۔ کمرے میں رنگول کا ہم آہنگی کس قدر دلنواز تھی۔ پلنگ کی چادر بھی اس کا ایک جزو محسوس ہو رہی تھی۔

”قوال اور قریب آگئے۔“ ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“

”اپنی ماں سے مانگو اپنی اماں سے مانگو۔“ سادی تالی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

سے کانڈ کا ٹکڑا ڈھونڈ نکالا۔ ”ہاں یہی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”اتفاق کی بات ہے۔“ وہ تھوڑا گیا۔

پھر آپ ہی آپ کہنے لگا۔ ”تو سمجھ لیجئے کہ آپ پاس ہی ہیں۔ پاس ہی ہوئے۔“
ہے ہاں شاید (Compartment) کپارٹمنٹ کہتے ہیں اسے، آپ کپارٹمنٹ میں ہیں۔ صاحب آپ نے کمال کر دکھایا۔ جن حالات میں آپ نے امتحان دیا تھا۔ وہ ہنسنے لگا۔ ”باوجود اگر کپارٹمنٹ میں آسکتے ہیں تو مجھے ڈر ہے کہ ہمیں آپ کی عزت کرنی پڑے گی۔ ہنسنے لگا۔ ”آئیے چلیں۔“

ایلی موٹر سائیکل کے پیچھے بیٹھ گیا اتنی دیر کے بعد شاہ کی سواری رسی ترک و اختتام ایک مرتبہ پھر لاہور کے بازاروں میں چل پڑی۔ لوگ دو روپہ کھڑے ہو کر نعرے لگ رہے لیکن ان نعروں میں کبھی کبھار چور چور کی آوازیں بھی سنائی دے رہی تھیں۔
دفعۃً ”بھیر میں سے ایک شخص آگے بڑھا اس نے ہاتھ سے اشارہ کیا۔“
”آپ کا کوئی جاننے والا معلوم ہوتا ہے۔“ منصر نے سائیکل روکے ہوئے کہا۔ ”جب میں سامنے والی دوکان سے سگرت خرید لوں۔“

وہ سائیکل سے اترا۔ اس کے روبرو ایم۔ کے کھڑا ہنس رہا تھا۔
”تم کب آئے؟“ ایم کے نے پوچھا۔

”نتیجہ سنئے آیا تھا“

”ارے نتیجہ تمہیں معلوم نہیں ہوا۔ میرا تو خیال تھا کہ تمہیں آٹھ روز پہلے ہی پتہ چلے ہو گا۔“

”وہ کیسے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”یار میرا بھائی یونیورسٹی میں ہے۔ ایک روز میں وہاں بیٹھا تھا تو منصر کا ٹیلی فون آیا فاضل نے اسے تمہارا رول نمبر لکھوایا تھا کہ نتیجہ مرتب ہو جائے تو اسے اطلاع دے۔ بھائی جانے آج مجھے بتایا تھا کہ آٹھ روز ہوئے منصر کو اطلاع دے دی تھی۔“

”اچھا۔“ ایلی نے حیرانی سے کہا۔

”منصر نے تمہیں اطلاع نہیں دی؟“

”نہیں تو۔“

پلنگ کے پاس ہی سلپیر پڑے تھے۔ کیسے گدگدے پاؤں ہیں اور اس کی وہ تصویر جو کارکن پر پڑی تھی۔ کس قدر جاذب نگاہ تھی۔

”الیاس صاحب“ منصر نے داخل ہوتے ہوئے کہا ”اماں کتنی ہیں کہ آپ بیس کھانا کھائیں گے اگرچہ یہ دعوت رسمی نہیں۔ رسم کے ہم قاتل نہیں اور ہوتے بھی تو اس وقت کچھ بھی تیار نہیں ہو سکتا۔ اور پھر چار ایک لقمے کھانے والے کے لیے کوئی تیاری بھی کیا کرے۔ اب آپ کا تکلف بنا دیجئے کہ آپ چاول کھائیں گے یا روٹی۔ میں تو ذاتی طور پر چاول کھانا پسند کرتا ہوں۔ لیکن دونوں چیزیں تیار ہیں۔ اس لئے تکلف برطرف۔“

”جی میں تو روٹی کھاتا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”تو ٹھیک ہے۔“ پھر اس نے اوپر کی طرف منہ کر کے آواز دی۔ ”بھئی الیاس صاحب روٹی کھائیں گے اور میں تو آپ جانتے ہیں چاولوں کے ہوتے ہوئے اور کچھ نہیں کھاتا۔“

”تو کیا بھجوا دیں کھانا؟“ اوپر سے اماں کی آواز آئی۔

”کیوں الیاس صاحب کیا خیال ہے؟“

”جب آپ کا جی چاہے۔“ ایللی نے کہا۔

وہ ہنس کر بولا ”بھئی ہم تو جب مل جائے تب کھاتے ہیں جی کا کیا ہے وہ تو ہر وقت چاہتا رہتا ہے۔ اپنا تو اصول ہے جب ملے کھاؤ۔ بھجوا دیجئے اماں جان“ منصر نے با آواز بلند کہا۔

”آپ تو شاید ہاتھ دھونا پسند کریں میں تو دیسے ہی اڑا جاتا ہوں۔“ وہ ایللی سے کہنے لگا۔

کھانے میں پلاؤ کے علاوہ تین قسم کے سالن تھے۔

”ارے“ منصر کھانا دیکھ کر چلایا ”آج تو بڑے خوش قسمت معلوم ہوتے ہیں ہم‘ آج تو اتفاق سے پلاؤ ہے۔ پلاؤ کے ہوتے ہوئے آپ روٹی کھانا کیسے گوارا کریں گے۔ تعجب ہے صاحب اگر میں آپ کی جگہ ہوتا تو ارادہ بدل لیتا“ لیکن ایللی کے لیے اب اپنی بات بدانا ممکن نہ تھا۔ اس میں اتنی جرات نہ تھی۔

”اتفاق سے آج پلاؤ ہے۔“ منصر کے منہ سے ”اتفاق سے“ سن کر ایللی کے ہونٹوں پر مسکراہٹ آگئی۔

منصر نے کبھی سہواً بھی ایسی بات نہ کی تھی جس سے ذاتی خاندانی یا گھرانے کی عفت یا امارت ظاہر ہو۔ وہ کوئی ایسی بات نہ کرتا جس سے دوسرا کمتر محسوس کرے۔ وہ اپنے آپ کو بیش

ہدایت اور حیثیت کا محض ظاہر کرتا تھا۔

ننگ بھری روٹی

ایللی نے پہلا ہی نوالا منہ میں ڈالا تو اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ روٹی میں کوٹ کوٹ کر نمک

برہم تھا۔

”یوں کیا بات ہے؟“ منصر نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ ایللی نے کہا ”ذرا گرم ہے۔“

”وہ یہ بات ہے۔“

ایللی کو فوراً معلوم ہو گیا کہ یہ سادی کی شرارت ہے اور وہ نہیں چاہتا تھا کہ منصر کو اس کا لہو۔ لیکن اس قدر نمک کھانا کچھ آسان نہ تھا۔ بہر حال وہ یوں روٹی کھاتا رہا جیسے کوئی بات ہی

نہ تھی۔

”ارے صاحب یہ کیا کھانے کا طریقہ ہے۔“ منصر نے کہا ”آپ تو یوں کھا رہے ہیں جیسے کچھ رہے ہوں۔ شاید تہذیب کے خیال سے ایسا کر رہے ہوں بہر صورت کھانے کے طے میں ہم لوگ پیٹ بھر کر بد تہذیب ہیں۔ جب تک تمیز اور تہذیب کو بلائے طاق نہ رکھیں۔ ہم سے کھایا ہی نہیں جاتا۔ اور صاحب پلاؤ دیکھ کر تہذیب کسے یاد رہے گی۔ مرزا غالب نے آہ کے متعلق کہا ہے ناکہ آم اعلیٰ ہوں اور بہت ہوں اگر میں شاعر ہوتا تو یہی بات پلاؤ کے حق کہتا۔“

کچھ دیر تک منصر پلاؤ کھانے میں منہمک رہا لیکن اس دوران میں اس نے چار ایک بار سے ایللی کی طرف دیکھا پھر کہنے لگا۔ ”الیاس صاحب ذرا یہ ساتھ والے کمرے سے گارڈ کی بوتل تو لا دیجئے مجھے۔ معاف کرنا بھائی کھاتے وقت ہم سے تو اٹھا نہیں جاتا۔“

”کمال ہے؟“ ایللی جھٹ اٹھ بیٹھا۔

”اس لمحہ کمرے میں جائیے نا تو آپ کو بتاؤں۔“

ایللی ساتھ والے کمرے میں داخل ہو گیا۔

منصر نے چلا کر کہا ”پہلے تو جی جلائیے نادائیں ہاتھ دروازے کے پیچھے سوچ گئے ہے۔“

”جی“ ایلی نے جی جلاتے ہوئے کہا۔

”کارنس پر دیکھئے۔“ منصر بولا۔

”یہاں تو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو دونوں الماریاں دیکھئے۔“

”پہلیے نہیں ملتی تو چھوڑیے۔“ منصر نے چلا کر کہا۔

جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا۔ ”ابو ہو ہو۔“

بے تحاشا مسکرائے جا رہا تھا۔

”یہ دیکھ لیجئے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا۔ ”تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔“ ٹھہریے میں اور مگرانا

”اماں“ اس نے اوپر آواز دی۔ ”دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجئے میرے لیے۔ میں

ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے۔ ذرا جلدی کیجئے

منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی۔ ”اتفاق سے۔“

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس

کی آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور پلیٹ میں

بوند تک نہ گری تھی۔ ”اتفاق سے۔“ کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر ہنس رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ایلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی کا

سانوالہ اگلا پڑا ہے۔ ”اتفاق سے۔“ اتفاق سے۔ ”کمرے میں لگی ہوئی گھڑی؟

رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا ”کب جا رہے ہیں آپ؟“

”کل“ ایلی نے جواب دیا۔

”جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ“ وہ مسکرانے لگا۔

”جی ہاں۔“

”ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پورے

ہوں۔ اتفاقاً وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلئے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا چلوں۔

کے ہونٹوں پر ایک نہایت ولفریب مسکراہٹ تھی۔ ”اب مزید اتفاق سنئے جہاں میں غصہ

”جی“ ایلی نے جی جلاتے ہوئے کہا۔

”کارنس پر دیکھئے۔“ منصر بولا۔

”یہاں تو نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو دونوں الماریاں دیکھئے۔“

”پہلیے نہیں ملتی تو چھوڑیے۔“ منصر نے چلا کر کہا۔

جونہی ایلی واپس کمرے میں داخل ہوا تو منصر نے شور مچا دیا۔ ”ابو ہو ہو۔“

بے تحاشا مسکرائے جا رہا تھا۔

”یہ دیکھ لیجئے میری پلاؤ کھانے کی گرم جوشی کا نتیجہ۔“ اس نے گلاس کی طرف اشارہ کیا۔

ایلی کی روٹی کی پلیٹ پر گرا ہوا تھا۔ ”تمام روٹیاں تر ہو گئی ہیں۔“ ٹھہریے میں اور مگرانا

”اماں“ اس نے اوپر آواز دی۔ ”دو ایک روٹیاں اور بھیج دیجئے میرے لیے۔ میں

ہوں الیاس صاحب کے ساتھ روٹی کھانے میں بھی مجھے ساتھ دینا چاہیے۔ ذرا جلدی کیجئے

منصر کی بامعنی مسکراہٹ کو دیکھ کر ایلی کے کان میں آواز آئی۔ ”اتفاق سے۔“

وہ سوچنے لگا کہ کہیں منصر کو روٹی کے نمک کا راز تو نہیں معلوم ہو گیا اس نے گلاس

کی آواز نہیں سنی تھی اس کے علاوہ پانی سے صرف روٹیاں بھیگی تھیں کسی اور پلیٹ میں

بوند تک نہ گری تھی۔ ”اتفاق سے۔“ کوئی اس کے کان میں منہ ڈال کر ہنس رہا تھا۔

جب منصر کھانے سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو ایلی نے دیکھا کہ پلنگ کے نیچے روٹی کا

سانوالہ اگلا پڑا ہے۔ ”اتفاق سے۔“ اتفاق سے۔ ”کمرے میں لگی ہوئی گھڑی؟

رہی تھی۔

ایلی رخصت ہونے لگا تو منصر نے کہا ”کب جا رہے ہیں آپ؟“

”کل“ ایلی نے جواب دیا۔

”جانے سے پہلے ملیں گے تو ضرور آپ“ وہ مسکرانے لگا۔

”جی ہاں۔“

”ہاں وہ ایک بات تو میں بھول گیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں آپ کے علی پورے

ہوں۔ اتفاقاً وہاں جانا ہوا۔ تو پھر میں نے سوچا کہ چلئے آپ کے محلے کو بھی دیکھتا چلوں۔

کے ہونٹوں پر ایک نہایت ولفریب مسکراہٹ تھی۔ ”اب مزید اتفاق سنئے جہاں میں غصہ

اماں اسے بڑی محبت اور شفقت سے ملی۔ بات بات پر اس کی آنکھوں میں آنسو بہتا آتے اور وہ کمال محبت سے کہتی۔ ”تم نہیں جانتے بیٹا مجھے اپنی بیٹی سے کتنی محبت ہے۔“ لادلی بھی ہے اور تم بھی مجھے اتنے ہی پیارے ہو جتنی کہ وہ ہے لیکن — وہ رک گئی۔

”تمہیں کیا معلوم کہ بیٹیوں کی بات کیا ہوتی ہے اگر میری بیٹی کو تکلیف ہوئی تو میں تو جی مرجاؤں گی۔“ بیٹے میرا دل ڈوب جاتا ہے اس خیال پر اس روز جب اماں آگیا تھا تو بیٹے روز میرا دل بیٹھا رہا۔ دل سے ہول نہ جاتا تھا۔ اگر کچھ ہو جاتا تو کیا ہوتا۔

عین اس وقت دروازے سے آواز آئی۔ ”اماں تو ویسے ہی غم کھاتی ہیں۔ جو کچھ بھی بیچ اماں ہم دونوں پر بیٹے گئے۔“ سادی سامنے آکر ہنسنے لگی ”کیوں الیاس صاحب“ اماں اسے دیکھ گھبرا گئی۔ ”نہ بیٹی تو نہ آ۔ ویسے پردہ و ردہ کی تو میں قائل نہیں لیکن سب بھائی برا ماننے ہیں۔ کیا فائدہ۔“ وہ اٹھ کر سادی کی طرف بھاگی۔

”اچھا تو الیاس صاحب کل رات بڑی چالاکی سے روٹی پر پانی کا گلاس اٹھیل دیا۔ جو چالاک ہیں آپ۔“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنی لگی ”اماں کل باجی نے الیاس صاحب کے لیے روٹی پکائی تھی تا اس میں دبا کر نمک ٹھونس دیا تھا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم ایل کی کو دق کرتی ہو۔“ اماں ہنسی۔

”کیوں نہ کریں۔“ سادی قہقہہ مار کر ہنسنے لگی۔ ”یہ تو صرف آپ کے سامنے بھیجی ملی۔ رہتے ہیں۔“

اوپر نگ سے باجی چلائی۔ ”اماں میں نے نہیں ڈالا تھا روٹی میں نمک سادی نے خود ڈالا تھا۔“

سادی قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔ ”میں نے سوچا کہ الیاس صاحب کھائیں گے تو کچھ بھی نہ شرم کے مارے اگر میں نمک ڈال دوں تو کیا حرج ہے۔ شرما تے بہت ہیں۔ دیکھ لیجئے اس وقت بھی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”اے ہے کیوں پیچھے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑی ہو تم۔“ اماں بولی۔

”بہت درد ہے آپ کو الیاس صاحب کا“ سادی نے کہا۔

”کیوں نہیں۔“ اماں بولی۔

”لیکن اماں یہ ان کی شرم جو ہے خالص ہاتھی دانت ہے یہ کیوں صاحب۔“ وہ الیاس

ہو کر بولی۔

”بھئی توج بھی بول دکھائے۔ آپ کو موقعہ دے رہے ہیں ہم۔“

”بھئی مجھے راست گوئی پر آمادہ کیا جا رہا ہے۔“ ایل دبی زبان سے بولا۔

”نہیں نہیں نہیں۔“ سادی چیخنے لگی۔ ”معافی معافی“ اور وہ قہقہے مارتی ہوئی اوپر چلی گئی۔

سادی کے جانے کے بعد اماں پھر بیٹھ گئی اور ایل سے باتیں کرنے لگی۔

جب وہ منصر کے علی پور جانے کے متعلق بات کر رہی تھی تو سادی پھر درمیان میں آئی اور معلوم ہے اماں علی پور میں الیاس صاحب کیوتروں کے ڈریوں میں رہتے ہیں۔ وہ نہ مار کر ہنسنے لگی۔ بھائی کہتے تھے ویسے تو وہ مکانات محلوں کی طرح ہیں لیکن پرانی وضع کے بات آج کل ڈربے معلوم ہوتے ہیں۔ اور اماں ”وہ بولی“ مجھے ڈریوں میں رہنے والے کیوتروں پر بند ہیں۔ بشرطیکہ اصل ہوں اور اصل تو سفید رنگ کے ہوتے ہیں تاہم“ وہ قہقہہ مار کر

”فضول باتیں نہ کیا کر۔“ اماں ہنسی۔

”تو الیاس صاحب علمی باتوں کو اماں فضول سمجھ رہی ہیں۔“ وہ الیاس سے مخاطب ہوئی۔

”میں کوئی الیاس صاحب پر تو فقرہ نہیں کس رہی۔ یہ تو کیوتروں میں۔“

”تو خاموش بھی ہوگی یا نہیں۔“ اماں نے مصنوعی غصے سے کہا۔

”جیسے بھی آپ فرمائیں — ویسے الیاس صاحب کی خصلت تو کوئے کی سی ہے چھین لے کھاتے ہیں ویسے نہیں۔ کیوں الیاس صاحب۔“ سادی ہنسی۔

”کیا ہیں الیاس صاحب۔“ باجی داخل ہو کر پوچھنے لگی۔

”اب کیا تو بھی آگئی۔“ اماں نے باجی سے کہا۔

”میرے آنے میں تو کوئی حرج نہیں۔“ باجی نے کہا۔ ”البتہ سادی کو نہیں آنا چاہیے کیوں

ایل صاحب۔“

”کیوں مجھے کیوں نہیں آنا چاہیے۔“ سادی نے پوچھا۔

”اماں جان سے پوچھ لو۔“ باجی بولی۔

”اور اصل اس سارے فساد کی وجہ تسمیہ الیاس صاحب ہیں اور دیکھو تو یوں خاموش بیٹھے

”کو بولا نہیں کرتے۔“ ایلی نے دبی زبان سے کہا ”یہ میرا کام ہے۔“

”جواب دو بانی تم سے کہہ رہی ہیں۔“ سادی ہنسنے لگی ”اگرچہ مثل غلط دی ہے انہوں نے مجھ سے کوئی پوچھے تو میں کموں میری پیاری بانی تو جل پری ہے۔ ہائے اتنی پیاری ہے میری بانی کہ میرا دم نکلتا ہے البتہ کبھی کبھار ٹرنک پر گر کر بے ہوش ہو جاتی ہے اور سب ملایا کر دیتی ہے۔“ یہ کہہ کر سادی قہقہے لگاتی ہوئی اوپر کی طرف بھاگی۔

سادی کے جانے کے بعد اماں کو خدا حافظ کہہ کر ایلی چلا آیا۔

دل کی بات

جب ایلی علی پور پہنچا تو ہاجرہ اور فرحت کاہل سے واپس آ چکی تھیں۔ ان کی آمد کی وجہ سے گھر میں شور مچا رہا تھا۔ عورتیں آ جا رہی تھیں۔ فرحت اور ہاجرہ دونوں افغانستان کے متعلق یوں باتیں کر رہی تھیں جیسے ولایت سے ہو کر آئی ہوں ہر بات پر انگلیاں ہونٹوں پر رکھ لی جاتیں۔ سینے تمام لیے جاتے ”ہے میں مر گئی ایسا۔“

”ہاں بسن اور یہ تو کچھ بھی نہیں۔“

ان کے واپس آنے کے بعد ایلی کا شہزاد کی طرف رہنے کا کوئی جواز نہ رہا تھا اس بات پر ہم بے حد مسرور تھی۔ لیکن شہزاد کو اس کی مطلق پروا نہ تھی اس کے لیے گویا کوئی فرق نہ پڑتا تھا۔ اٹنا وہ دن میں چار ایک مرتبہ اسی طرح داورے کی چال پر ناچتی ہوئی آتی۔ ”کیوں گھروالو کیا ہو رہا ہے وہ بدھو میاں کہاں ہے صبح سے آیا کیوں نہیں بے اب تو فرحت بھی طعنے دے دے کر آتا چکی تھی۔ البتہ محلے والیاں ہاجرہ اور فرحت کے سامنے شہزاد کے متعلق اشاروں میں باتیں کرتی رہیں۔

چار ایک دن کے بعد ہاجرہ اور فرحت ایلی کے گرد آکھڑی ہوئیں۔ ہاجرہ بولی ”ایلی ایک بات پوچھوں جج بتاؤ گے۔“

”کیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”جانو کہہ رہی تھی کچھ لوگ یہاں تمہارے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔“

ایلی کی زبان سے سادی کے خاندان کی بات سن کر فرحت اور ہاجرہ کے خوشی سے ہاتھ پٹا پھول گئے۔ ”کیا یہ جج ہے۔ کیا تم چاہتے ہو کہ وہاں بات طے ہو جائے۔“ کیا واقعی انہیں

نہ تھا آتا تھا کہ ایلی شہزاد کے چنگل سے آزاد ہو سکتا ہے۔

نہ تھا اور فرحت دونوں شہزاد کو غلط سمجھتی تھیں ان کا خیال تھا کہ شہزاد نے جان بوجھ کر ایلی سے کرنا ہے تاکہ وہ اس کے ہاتھ کا پنجھی بنا رہے۔ وہ سمجھتی تھیں کہ ایلی کو اپنا بنانے میں ہر ایک کا مقصد ہے اگرچہ انہیں کبھی سمجھ میں نہ آیا تھا کہ وہ خصوصی مقصد کیا ہو سکتا ہے۔

ایلی کی بات ہی نہیں شہزاد کے متعلق محلے میں عام خیال تھا کہ اسے فوجوانوں کی نگاہوں پر بے لاشق ہے ان کا خیال تھا کہ شہزاد کو دیکھ کر محلے کے مرد اپنے ہوش و حواس کھو دیتے ہیں اور بے حواس کھونے کی تمام تر ذمہ داری شہزاد پر ہے۔

فرحت نے سب سے پہلے اس بات کا تذکرہ شہزاد سے کیا۔ غالباً ”اس کا مقصد یا تو شہزاد کو ہتھیار دیا جائے جتنا کہ ایلی اب اس کے سحر سے آزاد ہو چکا ہے۔“

”میں نے کہا شہزاد۔“ وہ بولی ”سنا ہے یہاں لوگ ایلی کے متعلق تحقیق کرنے آئے تھے۔“

”ایلی شہزاد نے بے پروائی سے جواب دیا۔“ ”جانو نے بتایا تھا مجھے۔“

”کیا یہ جج ہے؟“ وہ شہزاد کے قریب تر ہو کر بولی۔

”پوچھو ایلی سے مجھے کیا خبر۔“ شہزاد نے کہا۔

”میرا مطلب ہے۔“ فرحت نے کہا ”ایلی دل کی بات کب بتاتا ہے۔“

”نہی۔“ مجھے دل کی بات بتائے گا کیا؟“

”بالکل“ فرحت بولی۔

”تم سے اتنا ہی لگاؤ ہے کیا؟ اس نے پوچھا۔

”نہ تو کتنی سمجھتے ہیں۔“ فرحت نے کہا۔

”تو پھر پوچھنے کی کیا ضرورت ہے۔“ شہزاد نہی۔

”کیوں؟“

”تمہاری خبر غلط ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا بس نہیں ہو سکتا۔“ وہ قہقہہ مار کر نہی۔

فرحت کا رنگ فق ہو گیا۔

”وہی صورتیں ہیں۔“ شہزاد ہنسنے ہوئے بولی۔ ”اگر ایلی کو مجھ سے لگاؤ ہے تو مجھے اس کا پچھنے کی ضرورت نہیں اور اگر نہیں ہے تو پھر وہ کیوں بتانے لگا۔“

”کیوں ایلی۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولی جو لمحہ کمرے میں بیٹھا پڑھ رہا تھا۔
 نے ”فرحت نے ہاتھ جوڑ دیے۔“ خدا کے لیے اسے نہ بتانا۔“
 ”بتاتی تو نہیں پوچھتی ہوں۔“ وہ ہنسی۔ ”کیوں ایلی؟ وہ بولی ”وہ لاہور والی تھی۔“
 کیسی ہے وہ؟“

”کیا مطلب؟“ ایلی نے پوچھا۔
 ”جس کے عزیز یہاں تحقیق کرنے آئے تھے تھانیدار کے گھر کیسی ہے وہ؟“
 ”بہت خوب صورت ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”مجھ سے بھی زیادہ۔“ وہ فرحت کی طرف دیکھ کر با معنی انداز سے بولی۔
 ”کوئی مقابلہ ہی نہیں۔“ ایلی بولا۔

”یہی تمہارا مطلب ہے مجھ سے وہ مقابلہ نہیں کر سکتی۔“ شنراؤ نے شرارت سے کہا۔
 ”تم تو ہندو ہو۔“ ایلی بولا۔ ”تمہارے ماتھے پر بندی ہے۔“
 ”اور وہ مسلمان ہے۔“

”ہاں ہاں۔“

”مسلمان تو خوب صورتی میں ہندوؤں کا مقابلہ نہیں کر سکتے کیوں فرحت۔“ شنراؤ نے کہا۔
 ”توبہ“ فرحت بولی۔ ”تو تو بات کا بتکلو بنا دیتی ہے۔ میں پوچھتی ہوں ایلی وہ لوگ پر
 کون؟“

”بڑے اچھے لوگ ہیں۔“

”خاندان کیا ہے۔“ فرحت نے پوچھا۔

”خاندان کا تو پتہ نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سنا ہے اس کے ابا کسی ریاست میں رہتے
 ہیں۔“

”ارے“ شنراؤ نے منہ بتایا۔ ”وزیر۔“

”بھائی دو ہیں ایک بیر شتر ہیں اور دوسرے بڑے عمدے پر ہیں۔“

”ارے“ شنراؤ نے پھر منہ بتایا۔

”تو پھر ہمیں خاطر میں کیوں لانے لگے وہ۔“ فرحت بولی۔

”خاطر میں نہ لاتے تو پوچھ گچھ کیوں ہوتی۔“ شنراؤ نے کہا۔

”کیوں ایلی۔“ فرحت بولی۔

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“ کیوں ایلی۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“ اس نے معنی خیز نگاہ سے شنراؤ کی طرف دیکھا۔
 ”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”یہی ہے۔“ فرحت نے کہا۔ ”شنراؤ نے کہا۔“

”غلط“ شتراد بولی۔ ”جہاں بات کرنا چاہوں وہاں ہو نہیں پاتی۔ میں تو نہ بات کی دوسری بات کی بے مصرف باتوں میں البتہ ہوں۔“

کپارٹمنٹ کے ضمنی امتحان میں ایلی کامیاب ہو گیا۔ اب کی بار منصر سے مل کر اسے اسے نتیجے سے آگاہ کر دیا۔ اس لیے لاہور جانے کا اسے موقع نہ ملا۔

اس دوران میں ہاجرہ اور فرحت ایک بار لاہور جا کر سادی کی والدہ سے مل چکی تھیں ہاجرہ ان لوگوں سے مل کر بے حد خوش ہوئی تھی۔ ”ہائے وہ تو بہت ہی اچھے لوگ ہیں۔“ نے ایلی سے کہا تھا۔ ”امیر کبیر ہوتے ہوئے اتنے سادہ اور منسار ہیں وہ۔ مجھے تو یوں دکھایا ہے کہ بات بن جائے گی بس لڑکی کے ابا سے بات کرنی باقی ہے اور وہ کہتے ہیں کہ ان کی خاطر لینے کے بعد وہ ہمیں بتائیں گے ہے اگر ایلی کے ابا نے بات نہ مانی تو کیا ہو گا۔“

ہاجرہ نے لاہور جا کر سادی کی والدہ کے سامنے اپنے تمام حالات صاف صاف بیان کر دیے تھے جیسے کہ اس کی عادت تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ”بہن ہم تو غریب لوگ ہیں یہ تو آپ کی مہربانی ہے جو ہم پر نظر عنایت کی ہے۔ ورنہ ہماری کیا حیثیت ہے نہ اپنا گھر ہے نہ وہ ہے ساری زندگی سوکنوں کی خدمت میں گزاری بس صرف لے دے کر ایک ایلی ہے وہی میری لادت ہے ان ساری امیدیں ہیں لیکن آج کل کی اولاد کب امیدوں پر اترتی ہے اپنے اپنے نصیب پر نصیب کا کسی سے کیا گلہ باقی رہے ہم تو ہمارا فکر نہ کیجیے ہم تو جیسے ایلی کے خادم ہیں وہی سادی کے سمجھ لیجئے۔“

”ہمارے سر آنکھوں پر رہے گی لیکن ہم اس قابل نہیں کہ چاؤ جو نچلے کر سکیں ہم تو خدمت گزاری کر سکتے ہیں۔“

جب وہ دونوں لاہور سے واپس آئی تھیں تو شتراد اور بیگم ان کے گلے کے ہار بن گئی تھیں ان دونوں کے سوالات ختم ہونے ہی میں نہ آتے تھے۔ ”لڑکی کیسی ہے کتنے بن بھائی ہیں ان کے ابا کیا کرتے ہیں؟“ شتراد کے انداز سے دلچسپی چلتی تھی لیکن ایلی کو محسوس ہو رہا تھا جیسے ان تفصیلات کو جاننے پر اسے دکھ ہو رہا ہو۔

ایلی کی سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ سادی کے متعلق بیگم کا رویہ ایسا کیوں تھا؟ خوش ہونا چاہیے تھا کہ ایلی اس کی بیٹی کے گھر سے مل جائے گا اور بیگم کے خیال کے مطابق وہ شتراد کے گھر کی تباہی کا باعث تھا تو اس تباہی سے بچنے کی صرف یہی ایک صورت تھی۔

معلوم ہو رہا تھا جیسے اسے اس بات پر غصہ آ رہا ہو کہ شتراد سے عہد و پیمان کے بعد اب وہ یوں اپنا دامن چھا رہا ہے۔ اس کی اتنی جرات!

ایک روز ہی انہیں ایک خط موصول ہوا یہ خط منصر کی والدہ کی طرف سی تھا۔ جس میں لکھا تھا کہ منصر کے بڑے بھائی رانا کی شادی پر بلایا تھا۔

اب رانا کی شادی پر جانے کے لیے تیار ہوئے تو شتراد کہنے لگی۔ ”اے ہے مجھے بھی ملے پلو میرا بھی جی چاہتا ہے کہ لڑکی کو دیکھوں۔“

”ہاں ہاجرہ بولی۔“ ”یہ تو اور بھی اچھا ہے کم از کم ان سے بات تو کرو گی۔“

”مجھے تو سمجھی اس قسم کی بات کرنا نہیں آتی مشکل میں پڑ جاتی ہوں۔“

”اس تو کیس جاتی ہے تو وہاں دلہن بن کر بیٹھ رہتی ہے۔“ ایلی نے ہنستے ہوئے کہا۔ ہر

مہمانی مل اور جہاں بیٹھ جائے وہاں سے اٹھنا مشکل ہو جاتا ہے اسے۔“

اس روز پہلا موقع تھا جب شتراد نے اپنی طبعی بے نیازی چھوڑ کر اس قسم کی درخواست کی۔

ایلی اس کی بات سن کر حیران ہوا تھا اس نے محسوس کیا تھا کہ وہ سادی کو ملنے کے لیے کس قدر ترقی تھی۔ شتراد کو دیکھ کر راجہ بھی نہ رہ سکی۔ وہ بھی ساتھ تیار ہو گئی۔

جب وہ جانے لگے تو بیگم ان کے ساتھ چل پڑی۔

”اس تم کیا ساتھ چلو گی۔“ شتراد نے پوچھا۔

”میں کیوں نہ چلوں۔“ بیگم بولی۔

”بچے گھر میں کون رہے گا۔“ شتراد نے پوچھا۔

”میں کیا گھر کی ذمہ دار ہوں جس کا گھر وہی جانے۔“

”لیکن اہل تیرا وہاں کیا کام۔“ شتراد نے پوچھا۔

”مجھے تو ایک کام ہیں لاہور میں۔ سانوری کب سے بلا رہی ہے اسے بھی تو ملنا ہے۔“

اور جب وہ آگے میں سوار ہوئے تو ایلی نے بیگم کی شکل دیکھ کر محسوس کیا کہ وہ بڑے غصے میں تھی۔ لیکن اس وقت ایلی کو یہ خیال نہ آیا کہ اس کے نتائج کیا ہوں گے؟

رانا میں اگرچہ منصر کی سی خصوصیات نہ تھیں لیکن پہلی مرتبہ ہی اسے مل کر ایلی نے

”پچھا تو آپ ہیں ایلی۔“ وہ اسے دیکھ کر بولا۔ ”ایلی سے میں سمجھا تھا کہ کوئی تیلی قسم کی چیز

ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اور جناب کو معلوم ہونا چاہیے
میں دولہا میاں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا
وہ ایک بھر پور جسم کا آدمی تھا۔ پر رعب چرا کرتی جسم لیکن اس کے چہرے پر لاہور
تھی جو منصر کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مسمن کا دن پڑا ہو۔ مگر
مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ اور اس کے علاوہ
بھانت کے لوگ آ جا رہے تھے وہ شاید غالباً اس کے رشتے دار تھے۔ اہلی حیران تھا کہ کدیم
رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ اہلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مکان کرائے کا نہیں بلکہ ان کا گھر
لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہنے والے تھے اگر وہ لاہور کے رہنے والے
تھے تو پھر گھر میں سبھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا لہجہ اہل زبان کا سا تھا اور نہ
نمایت مذہب اور شستہ تھی۔

ان حالات میں ظاہر تھا کہ سادی کو دیکھنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اہلی کی خواہش تھی
کہ سادی سے ملے اسے یاد دلائے کہ وہ اپنے چھینے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت
ہے اور جو حکم وہ دے گا سادی کو اسے ماننا پڑے گا۔ سادی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو ملے گا
کئی ایک دن وہ سوچتا رہا کہ کیا مانگوں دوپٹہ تو لے چکا اب قیص لینے کا فائدہ؟ اہلی نے کہا
سادی کا دوپٹہ سو گھا تھا لیکن اس میں سادی کے جسم کی بو نہ تھی۔ اس میں سینٹ کی بو تھی
تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار سادی سے ملا تھا لیکن اس نے کبھی سادی کے جسم کو بو محسوس نہ
تھی۔ شزاؤ کے جسم کی بو کو محسوس کر کے نہ جانے اہلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں اٹھ اٹھتی
تھیں۔

نہیں نہیں قیص مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کئی ایک دن
بعد دھنمٹا اسے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ سادی سے کہوں گا کہ مجھ سے ملے
ایکلی ملے۔ گھر سے باہر مقبرے یا شایمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔
ہاجرہ فرحت رابعہ شزاؤ اور بیگم کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا
کہ وہ بھی اوپر جا سکتا۔ شاید اہل اسے بلائیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں اسے
کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اہل کو تو شاید اپنا ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف

ابہ شکر ہے

شزاؤ نے ایک دن پہلے رانا اہلی کے پاس آ بیٹھا۔ کہنے لگا ”ایسا صاحب کل برات میں کیا
پڑا ہوا نہیں گئے۔“

”نہیں ہلا“ اہلی نے رانا کی طرف استفسار بھری نگاہ سے دیکھا۔

”نہیں ہلا کا مطلب ”بیٹھ مین“ ہے“ وہ بولا۔

”اب کا مطلب ہے۔“ اہلی ہنسنے لگا۔ ”کہ سرے لگا کر میرا کارٹون بنایا جائے۔“

ہو گی لیکن آپ تو بڑے معقول آدمی معلوم ہو رہے ہیں۔ اور جناب کو معلوم ہونا چاہیے
میں دولہا میاں ہوں جس کے دم قدم سے یہ رونق ہو رہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا
وہ ایک بھر پور جسم کا آدمی تھا۔ پر رعب چرا کرتی جسم لیکن اس کے چہرے پر لاہور
تھی جو منصر کی خصوصیت تھی۔

شادی کی وجہ سے سفید منزل میں یوں معلوم ہوتا تھا جیسے مسمن کا دن پڑا ہو۔ مگر
مصروف تھا سب بیک وقت بات کرتے تھے۔ جسے شاید کوئی نہ سنتا تھا۔ اور اس کے علاوہ
بھانت کے لوگ آ جا رہے تھے وہ شاید غالباً اس کے رشتے دار تھے۔ اہلی حیران تھا کہ کدیم
رشتے دار کہاں سے آ گئے۔ اہلی کو یہ تو معلوم تھا کہ وہ مکان کرائے کا نہیں بلکہ ان کا گھر
لیکن اسے اس بات کا علم نہ تھا کہ منصر کہاں کے رہنے والے تھے اگر وہ لاہور کے رہنے والے
تھے تو پھر گھر میں سبھی لوگ اردو کیوں بولتے تھے اور پھر ان کا لہجہ اہل زبان کا سا تھا اور نہ
نمایت مذہب اور شستہ تھی۔

ان حالات میں ظاہر تھا کہ سادی کو دیکھنے یا ملنے کا کوئی امکان نہیں تھا۔ اہلی کی خواہش تھی
کہ سادی سے ملے اسے یاد دلائے کہ وہ اپنے چھینے کی شرط جیتنے کی وجہ سے اس کی حیثیت
ہے اور جو حکم وہ دے گا سادی کو اسے ماننا پڑے گا۔ سادی نے خود ہی کہا تھا جو مانگو ملے گا
کئی ایک دن وہ سوچتا رہا کہ کیا مانگوں دوپٹہ تو لے چکا اب قیص لینے کا فائدہ؟ اہلی نے کہا
سادی کا دوپٹہ سو گھا تھا لیکن اس میں سادی کے جسم کی بو نہ تھی۔ اس میں سینٹ کی بو تھی
تھی۔ حالانکہ وہ کئی ایک بار سادی سے ملا تھا لیکن اس نے کبھی سادی کے جسم کو بو محسوس نہ
تھی۔ شزاؤ کے جسم کی بو کو محسوس کر کے نہ جانے اہلی کو کیا ہو جاتا تھا اس کی آنکھیں اٹھ اٹھتی
تھیں۔

نہیں نہیں قیص مانگنا بے کار ہے تو پھر کیا مانگوں؟ اس نے بہت سوچا تھا کئی ایک دن
بعد دھنمٹا اسے خیال آیا تھا۔ ہاں وہ خوشی سے اچھل پڑا تھا۔ سادی سے کہوں گا کہ مجھ سے ملے
ایکلی ملے۔ گھر سے باہر مقبرے یا شایمار میں اور کم از کم دو گھنٹے میرے ساتھ رہے۔
ہاجرہ فرحت رابعہ شزاؤ اور بیگم کو کوٹھے پر جاتے ہوئے اس نے حسرت سے دیکھا تھا
کہ وہ بھی اوپر جا سکتا۔ شاید اہل اسے بلائیں۔ لیکن اتنے رشتہ داروں کی موجودگی میں اسے
کس طرح بلا سکتی تھیں۔ اہل کو تو شاید اپنا ہوش بھی نہ تھا چونکہ وہ انتظامات میں مصروف

”نہیں تو رات نامے کما“ ہمارے ہاں نہ سرے ہوتے ہیں اور نہ مھوڑے پر سوار ہوتے۔
”تو پھر“ ایلی نے پوچھا۔

”برات سفید منزل سے چلے گی اور موتی محلہ پر جا کر رکی جائے گی جہاں ہماری بہن
بتکم رہتی ہیں۔ برات کے آگے بینڈ بجانا ہو گا۔ بینڈ کے پیچھے دو لہنا اور شہرہ بلا ہوں گے
کے پیچھے براتی نہ کوئی ہار ہو گا نہ سرا۔ اور ابھی لوگ پیدل ہوں گے۔“
”اچھا۔۔۔“ ایلیاس سوچنے لگا۔

”یہ تو آپ کی مرضی پر موقوف ہے کہ شہرہ بلا بنیں یا نہ بنیں۔ میں نے تو بھی تو
بھلے کی کمی ہے اگر تمہیں منظور نہیں تو نہ سہی۔“
”میرے بھلے کی؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”وہ کیسے؟“

”ایک سہرا موقعہ ہے اگر فائدہ اٹھانا چاہو تو۔۔۔“ رات نامے شرارت بھری مسکراہٹ
جملہ مکمل کر دیا۔

”میں نہیں سمجھا۔“ ایلی نے کہا۔

”ویسے بات معمولی سی ہی لیکن صاحب ذوق کے لیے بڑی بات ہے۔“ وہ کہنے لگا۔
راستے میں جتنی کھڑکیاں اور جھروکے ہیں برات گزرے گی تو وہ سب کھلیں گی جو کھلی نہ
کھلی۔ وہ بھی کھل جائے گی اس وقت اور جو کبھی کھڑکی میں نہیں آئی وہ بھی کھڑکی میں آکر
گی اور دو لہنا اور شہرہ بلا کو دیکھے گی رنگ رنگ کی آنکھیں طرح طرح کی نگاہیں دو لہنا اور شہرہ
پر مرکوز ہو جائیں گی۔ صرف یہی نہیں۔ ہر کوئی کوشش کرے گی کہ ان کو صرف دیکھے
بلکہ اپنا آپ دکھائے بھی اور وہ جب خود اپنا آپ دکھاتی ہیں تو کیا کیا پوز بننے ہیں کیا کیا پوز
بننے لگا۔ اپنا خوب صورت ترین حصہ دکھاتی ہیں خوب صورت ترین انداز اگر شہرہ بلا
ہمارے ساتھ چلو گے تو لاہور کی ساری پدائیاں اور نہ جانے کون کون تمہاری نگاہوں کے
استاد ہوں گی اور تمہیں اندازہ ہو گا کہ میاں کیا کیا چیز چھپی پڑی ہے۔ اسے صاحب ذوق

”اے“ رات نامے اس ڈرامائی انداز سے جھرجھری لے کر ایلی کے جسم میں ابھی ایک لرزدہ لگا۔
”اگر تم صاحب ذوق ہو تو شاید تمہارے لیے کوئی دروازہ مستقل طور پر کھل جائے۔“

”ہاں۔“ نور اگر ذوق نہیں تو علمی دلچسپی ہی سہی۔ پنڈت کو کاکا کتاب کی تفسیر لکھ سکیں گے
پنڈت کر رات ناموں کسی کام میں مصروف ہو گیا جیسے ایلی کے فیصلے سے اسے خاص دلچسپی نہ

”وہ اپنی ایک مصروفیت سے ایک ساعت کے لیے فارغ ہوتا اور آکر ایلی سے سرسری طور
پر بات کرتا۔“

”کیا ایلیاس صاحب کیا فیصلہ کیا آپ نے؟“ اور پھر جواب کا انتظار کیے بغیر۔ ادھر ادھر چلا
آکر اور اسے فارغ ہو کر ادھر آتے ہوئے ایلی کو کہنی مار کر پوچھتا۔ ”کیا فیصلہ کیا؟“

”نہیں یہ ہوا کہ اگلے روز برات کے جلوس میں ایلی رات نامے کے ساتھ ساتھ شہرہ بلا کی حیثیت
پر چل رہا تھا۔ اور قدم قدم پر رات نامے دہلی آواز میں کہہ رہا تھا۔ ”ادھر بھی ادھر دائیں ہاتھ۔
ادھا کیا چیز تھی۔ سبحان اللہ۔ تم نے موقعہ کھو دیا۔“ بے بے حد تھی حد تھی۔ ذرا چوکس رہو بھائی

”بھئی واہ ادھر تو چاند چڑھا ہوا ہے۔۔۔ وہی بات ہے وقت تنگ است و کار ہائے بسیار
۔۔۔“ تم تو بھی اپنے آپ میں کھوئے ہوئے ہو۔“

ایلیاس کے دو برو کھڑکیاں کھل رہی تھیں چتیں سرک رہی تھیں انگلیاں بوڑھ رہی تھیں
بائیں آٹھیں ظلوں ہو رہی تھیں۔ تبسم لہرا رہے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ساتھ سادی چل
رہی تھی وہ مسکرائے جارہی تھی ہنس کر کہہ رہی تھی۔ دیکھ سکتے ہیں تو دیکھ لیجئے۔ اور وہ محسوس
کر رہا تھا جیسے دیکھنے کی قوت سلب ہو چکی ہو۔ دیکھنے کے باوجود اسے دکھتا نہیں تھا۔ چاروں
طرف سادی ہی سادی نظر آرہی تھی۔ سارے لاہور پر مسلط تھی۔

جب وہ موتی محلے کی گلی میں پہنچے تو سفید بازوؤں لہرائی انگلیوں متبسم چہروں اور شوخ
شہرہ بلا کا گویا ایک طوفان اٹھ آیا۔

بیزرک گیا۔ جلوس ختم گیا۔ رات نامے کی نگاہیں پھلجھڑیاں چلا رہی تھیں۔ ایلی میں نہ جانے
کیا گہراہٹ سی پیدا ہوئی جارہی تھی۔

سانے کی ایک کھڑکی میں سادی کی جھلک دکھائی دی وہ مسکرا رہی تھی لیکن اس کی
مسکراہٹ پھکی اور بے جان تھی جیسے کوئی کھوئی ہوئی ہو سادی تو ایسی نہ تھی۔ ایلی نے کوشش

ہفتاک موڑ

ایلی کو معلوم نہ تھا کہ بیٹیم نے موقع پا کر سادی کی والدہ سے ایسے موقع پر بات کی تھی جب اس فیصلہ ہی موجود تھی۔ اس نے کہا ”ایلی لڑکا تو اچھا خاصہ ہے لیکن یہ نیل منڈھے چڑھتی نہیں، بس بن میں تو بچ کھوں گی لڑکے کو میری اپنی بیٹی سے محبت ہے۔ اس بات کو سمجھی جانتے ہو بہ گنتی بدنامی ہے بن میری بیٹی شادی شدہ ہے یہی جو میرے ساتھ آئی ہے۔ دراصل

”لیکن تم ساتھ تھے تو انی وہ حیثیت سرا ہو کر نہ رہا، کبھی نہ ہو سکتی کبھی نہ ہو سکتی۔“

خون کا اثر نہیں جاتا ایللی کے باپ کو اب تک عورتوں کا شوق ہے چار بیویاں کر چکا ہے۔
ایلی کو خبر نہ تھی کہ اتنی سی سرسری بات کر کے بیگم نے حالات کا دھماکا ہی بدل دیا تو
اس کی زندگی کا رخ ایک ایسے موڑ کی طرف بدل دیا گیا تھا جس طرف بدنامی، رسوائی اور
عزت کی مہیب چٹانیں کھڑی تھیں۔

در اصل بیگم کی اپنی زندگی تباہ ہو چکی تھی اور اس کی تباہی کا باعث اس کی اپنی جہتی
میری تھی۔ اسی وجہ سے جنس سے اسے نفرت تھی براہ راست یا بالواسطہ ہر جنسی تعلق کو توڑ
میں درپردہ خوشی محسوس کرتی تھی۔

علی پور واپس جاتے ہوئے بیگم ایک سکندر تھی اور ایللی اور شنراؤ شریف اور سادی کے
تاراج شدہ ریاستیں تھیں جو اس کے قدموں میں پھیلی ہوئی تھیں اس کا دل فخر سے دھڑک
تھا۔ کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے۔ گاڑی سبک رفتاری سے علی پور کو چلی جا رہی تھی۔

ہاجرہ کے چہرے پر مسکراہٹوں کے ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ وہ بار بار اپنی ناک کی طرف ہانک
اور مسکراتی اور پھر ناک کی طرف دیکھنے لگتی۔ فرحت مسرور تھی لیکن اس کی سرست میں پریشانی
اور فکر کا عنصر نمایاں تھا غالباً "وہ سوچ رہی تھی کہ بیگم اور رابعہ خود اپنے دکھ میں گم تھیں۔"

طرح ایک روز اس کی اپنی شادی ہوئی تھی۔ اس کا خاندان محلے میں سب سے زیادہ خوب صورت
اور لائق تھا لیکن — وہ عیسائی ہو چکا تھا اور اب وہیں لاہور میں ایک میم کے ساتھ زندگی گزار
کر رہا تھا اور رابعہ کی گود میں اس کا اکلوتا بیٹا ایسا تھا جس کے پیدا ہوتے ہی رابعہ کے سال

سورج غروب ہو چکا تھا۔ وہ محبت بھرے جذبات سے امی کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کا ہاں
تھا اسے گھر میں پیار سے سب امی کہتے تھے۔ کب امی بڑا ہو گا۔ دولہن بیاہ کر لائے گا اور رابعہ
زندگی کا اندھیرا دور ہو گا۔ کبھی کبھی رابعہ سر اٹھا کر ہاجرہ کی طرف دیکھتی تو معاً "اے یاد آگیا"

کہاں ہے اور پھر اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل جاتی اور اس کا حسین چہرہ سرخ سے لہو
اور وہ کہتی "ہے کتنے اچھے لوگ تھے کتنے سادہ اور پیار کرنے والے اور لڑکی تو بے اتنی پائیاں
کہ خواہ مخواہ اسے اپنانے کو جی چاہتا ہے۔" شنراؤ اس روز مغموم سی تھی اور خلاف معمول

میں کھوئی ہوئی تھی۔
فرحت اسے کہتی "اے آج سوچ میں کیوں پڑ گئی۔" لیکن شنراؤ اس کی بات کا جواب
نہ چاہتی تھی۔ وہ پہلا دن تھا جب شنراؤ خاموش بیٹھی تھی جو اب تو خیر وہ بیسیوں دنوں

شہینہ بلے کیوں وہ خاموش تھی۔ سر اٹھاتی اور کھیانی مسکراہٹ کے بعد پھر سر جھکا کر سوچنے
نہی۔ دراصل بیگم کا انداز دیکھ کر اسے شک پڑ گیا تھا کہ بیگم کچھ کر کے آئی ہے۔ وہ اپنی ماں کی
پلیٹ کی دانت تھی وہ سوچ رہی تھی اگر بیگم نے کچھ کہہ دیا اور بات بگڑ گئی تو وہ سب اس پر
لے کریں گے۔

ایللی اپنے خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ اس نے بڑی شدت سے کوشش کی تھی کہ سادی کو
پیام بھیجے اور آخری روز وہ کامیاب ہو گیا تھا۔ کسی مہمان کا بچہ جو ایللی سے خاصہ مانوس ہو گیا تھا
اس کے ہاتھ اس نے یہ پیغام بھیجا تھا۔ یاد ہے تم شرط بارگاہی تھی اور جواب میں سادی جھنگے کے
نہ کڑی ہوئی با آواز بلند چلائی تھی۔ "جاؤ ان سے کہہ دو ہمیں یاد ہے۔ اور — نہیں اور
کہ نہیں۔" سادی کی آواز تو وہی تھی۔ لیکن بات کا انداز بدل بدل لاسا تھا۔ ایللی سوچ رہا تھا نہ
بلے کیا بات ہے برات کے دن کھڑکی میں بھی وہ غمگین کھڑی تھی اور اس وقت بھی اس کی
نوازش نہ مرت نہ تھی جس کے چشمے الجھا کرتے تھے سادی کی ہر بات میں ہر حرکت میں۔

ایللی کو خبر نہ تھی کہ سادی کی اداسی کا راز اس وقت بیگم کے ہونٹوں پر فاختانہ مسکراہٹ کی
ہورت میں ظاہر تھا۔ گاڑی کے پیسوں میں گونج رہا تھا "کیا یاد کرو گے کیا یاد کرو گے۔" دور سبز
نہیں سے پڑے کاغذ کے کی سلاخی چٹانیں کھڑی تھیں۔ اور گاڑی ایللی کو اس مہیب اور
لہاک موڑ کی طرف لیے جا رہی تھی جس کی طرف حالات اسے دھکیل رہے تھے بیگم کی وہ
نقد مسکراہٹ بھی تو حالات کا ایک جزو تھی بے حد اہم جزو اور ایللی اس سے بالکل بے خبر تھا
کھتا تھا کسی نہ کسی صورت وہ منصر کے گھرانے سے منسلک ہو جائے گا اور اس طرح زندگی کا
— یاد رکھنا چاہئے گا۔

ایلی ایسی ہی —!

علی پور واپس آکر ایللی نے دو خط سادی کو لکھے اور غیر از معمولی دونوں سے ایک کا جواب
موصول نہ ہوا۔ اس کے باوجود یہ بات اس کے ذہن میں نہ آئی کہ بیاہ سے متعلقہ مصروفیت
نہ شرط جتنے کی وجہ ہو سکتی ہے۔ ان دونوں خطوط میں اس نے مطالبہ کیا تھا کہ عہد و پیمان کے
ساتھ

رہے۔

وہ سمجھتا تھا کہ شاید وہ خط سادی تک نہ پہنچے ہوں شاید اس سہیلی نے جس کی معرفت خط بھیجتا تھا خطوں کا راز فاش کر دیا ہو۔ شاید وہ لوگ کہیں چلے گئے ہوں شاید سادی ایک خیال آتے لیکن یہ خیال کبھی نہ آیا تھا کہ شاید بیگم نے سادی کو ایلی سے متفرک کر دیا ہو جانے کیوں اسے سادی پر مکمل اعتماد تھا۔ وہ اپنی نسبت شک کر سکتا تھا لیکن سادی۔ اونہوں جس عظیم کردار کا سادی نے مظاہرہ کیا تھا اس کی وجہ سے ایلی کو کبھی شک نہیں پڑا تھا کہ کوئی سادی کو درغلا سکتا ہے۔

پھر سادی کا خط دیکھ کر ایلی حیران رہ گیا۔ مضمون پڑھ کر اسے یقین نہ آ رہا تھا کہ وہ سادی نے لکھا تھا۔ پہلے چند ایک جملے نہایت سنجیدہ اور خشک انداز میں تحریر کیے گئے تھے۔ م کے نیچے پانچ چھ لائنیں لکھ کر انہیں کاٹ دیا گیا تھا اور اس قدر احتیاط سے ایک ایک لفظ کاٹا کہ یہ اندازہ لگانا ممکن نہ تھا کہ کٹا ہوا حصہ کس بات کے متعلق ہے۔ کٹے ہوئے مضمون نے تحریر تھا ”خیر چھوڑیے اس بات کو۔“

اوپر لکھا ہوا تھا۔

مورخہ ۳۲ ماہ حال کو اس بات کا امکان ہو گا کہ میں آپ سے مل سکوں۔ اس روز شام۔ تین بجے سے پانچ بجے تک آپ بوڑھے دریا کے پل پر میرا انتظار کریں۔ امید تو ہے کہ ضرور آؤں گی لیکن پانچ بجے تک نہ آئی تو سمجھ لیجئے کہ مجبوری کی وجہ سے رکنا پڑا اس صورت میں پھر اطلاع دوں گی۔

ایلی حیران تھا۔ ایسا خط تو سادی نے کبھی نہ لکھا تھا۔ مضمون کا انداز ہی نیا تھا۔ اس کے علاوہ سادی نے تو کبھی اپنے خط کا ایک لفظ بھی نہ لکھا تھا۔ وہ بے تکلف اور بے ہنگام لکھا کرتی تھی۔ اس کے خطوط اتنے لمبے ہوتے تھے کہ دیکھنے میں اخبار معلوم ہوتے تھے، آخر کیا بات تھا اس نے لکھ کر کاٹ دی تھی۔ ایلی دیر تک سوچتا رہا لیکن کسی نتیجے پر نہ پہنچ سکا۔ پھر شاید اس نے سوچا کہ ملاقات پر ساری بات معلوم ہو جائے گی اس لیے وہ تیاری میں مصروف ہو گیا۔ لاہور جا کر اس نے سوچا کہ شاید اسے دیر تک پل پر انتظار کرنا پڑے اس لیے اس نے اپنے ایک عزیز کا سائیکل مستعار لے لیا اور پل پر جا پہنچا۔

بوڑھے دریا کے پل پر چند منٹ انتظار کے بعد سادی کا آنا اس کے قریب

نہیں آئی تھی۔

مدی کا چہرہ انبساط کی وجہ سے گلاب کے پھول کی طرح کھلا ہوا تھا۔ ایلی کو دیکھتے ہی وہ نہ لگی۔

”ہوئے آپ تو پہلے ہی سے موجود ہیں اور میں سمجھی میں پہلے پہنچوں گی۔“

”پہلے پہنچ جاتی تو یہاں کیا کرتی تھ۔“ ایلی نے کہا۔

”انتظار اور کیا۔“

”انتظار کرنے کا بہت شوق ہے کیا۔“ ایلی بولا۔

”مفق کیا کر رہی ہوں انتظار نہ جانے کب تک کرنا ہو گا۔ اب تو عادت سی ہو گئی ہے۔“

”ہوئے اس نے تانگے والے کو پیسے دے دیئے اور تانگے سے نیچے اتر آئی۔“

”ارے“ ایلی چلایا ”تاںگا کیوں چھوڑ دیا۔“

”ہائیں“ وہ بولی ”مجھے خیال ہی نہیں آیا۔“

”تو رین سوچے ہی کرایہ چکا دیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”آپ کو بھی تو یاد نہیں آیا جو چپکے سے کھڑے رہے۔“ وہ ہنسی۔

”تم تو خیر مصروف تھا۔“

”مصروف۔“

”ہاں شدت سے۔“

”تو میں بھی مصروف ہی ہوں گی۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”آپ کیا کریں گے ہم نہ جانے کب کونسا خالی تانگہ آئے اوھر۔“

”مانگل جو ہے۔“ وہ چلائی۔ ”مجھے آگے بٹھالے۔“

”ہائیں“ ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

اس زمانے میں لاہور میں عورتیں خیرہ نمائندہ کے بغیر دکھائی نہیں دیتی تھیں بے نقاب مائل تو نظر نہیں آتی تھیں اور آتی بھی تو میس ایٹکو انڈین یا ہندو عورتیں۔ پردے کے لپٹائی ہوئی سے کی جاتی تھی اس حد تک کہ نقاب اٹھا کر چلنا بھی معیوب سمجھا جاتا۔

اس دور کے لاہور میں زیادہ تر رونق شہر کی فسیل کے اندر والے علاقوں میں پائی جاتی تھی لہذا مولیٰ بازار میں شوقین مزاج لوگ شام کے وقت جمع ہو جاتے چونکہ عورت کی بہار

دیکھنا کسی اور جگہ ممکن نہ تھا۔ ویسے تو شہر سے باہر اتار کھلی میں خاصی روشنی ہوتی تھی لیکن با سیر و تفریح یا خرید و فروخت کرنے والے صرف مرد ہوتے تھے۔ عورتوں کے لیے ایسے علاقے ڈبی بازار اور اس کے ملحقہ علاقوں میں زیورات اور پارچہ جات کے چند ایک بازار مخصوص تھے اتار کھلی سے باہر کے علاقے آباد تھے۔ مال روڈ پر سارا دن الوبولتا تھا شام کو چند ایک گاڑیاں آ جاتی دکھائی دیتیں یہ علاقے صرف گوروں اینگلو انڈین اور صاحبو کے لیے مخصوص تھے۔ اس زمانے میں کسی لڑکی کو سائیکل پر بٹھا کر چلنا آسان کام نہ تھا۔ سائیکل پر آگے بٹل کی بات چھوڑیے ان دنوں تو اگر کوئی اینگلو انڈین لڑکی سائیکل پر سوار دکھائی دیتی تو لوگ آواز کتے نعرے لگاتے۔

سادی کی بات سن کر ایلچی چونکا لیکن سادی ہنس رہی تھی ہنسے جاری تھی۔
”بس ڈر گئے؟“ وہ چلائی۔

”لیکن یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ایلچی نے کہا۔

”میں بتاتی ہوں۔“ وہ بولی۔ ”اور پھر پھدک کر ایلچی کے سائیکل کے آگے بیٹھ گئی۔“
یوں ہوتا ہے۔ اب آپ چلائیے۔“
”لیکن اگر گر گئی تو؟“

”تو اٹھ بیٹھوں گی اور پھر سے سوار ہو جاؤں گی۔ دونوں اکٹھے ہی گریں گے۔“
ایلچی حیرت سے سادی کی طرف دیکھ رہا تھا۔

راہ گیر انہیں دیکھ کر رک گئے تھے۔ ان کے گرد بھیڑ مچ گئی جاری تھی۔ ”ہی ہی ہی نا“
وہ ہنس رہے تھے لیکن سادی راہ گیروں کی نگاہوں سے گویا بے خبر تھی بے نیاز تھی۔
”چلے باجی میں پہنچا آؤں۔“ ایک تانگے والا رک کر بولا۔

ایلچی نے ہلکتی نگاہوں سے سادی کی طرف دیکھا۔

”نہیں۔“ سادی نے بارعب آواز سے کہا ”ہم سائیکل پر جائیں گے۔“

راہ گیروں نے قہقہہ لگایا۔ ہی ہی ہی سڑک گونجنے لگی دور کھڑے پولیس مین نے اپنے مشکوک نگاہوں سے دیکھا۔ ایلچی گھبرا گیا۔ اس بھیڑ میں خصوصاً سپاہی سے بچنے کے لیے ان سائیکل ڈول رہی تھی سادی ایک ساتھ چینی مار رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔ سڑک پر جانے والے لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ کوئی ہنس رہا تھا۔ ”ہی ہی ہی نا“

لیکن سائیکل ڈولتی ہوئی چلے جاری تھی۔

ایلچی کو اس وقت قطعی طور پر احساس نہیں تھا کہ سادی کا جسم گویا اس کی آغوش میں تھا اس کی ہڈی کے گرد جمائے تھے۔ سادی کی پیٹھ اس کی چھاتی سے چھو رہی تھی۔ اور سادی کی ہڈی کی ہڈی بھی خوشبو آ رہی تھی۔ ایلچی کی تمام تر توجہ راہ گیروں پر مرکوز تھی اسے اتنی نہ تھی کہ سادی کے جسمانی لمس کو محسوس کرے۔ سادی کو بھی یہ احساس نہ تھا کہ اس کی ہڈی سے اس کی ہڈی پر ہے۔ اور وہ اس کے آغوش میں بیٹھی ہے۔ اسے صرف اس قرب کا نا تھا اور وہ اس احساس میں اس حد تک کھوئی ہوئی تھی کہ اسے راہ گیروں کا خیال ہی نہ لے لے قطعی طور پر معلوم نہ تھا کہ لوگ ان کی طرف حیرت سے دیکھ رہے ہیں یا تسخیر سے رہے ہیں۔ وہ محسوس کر رہی تھی جیسے دو بچے ایک انوکھا کھیل کھیل رہے ہوں ایک نئے نئے کو آزار رہے ہوں۔ وہ مسرت سے چھلک رہی تھی، چیخ رہی تھی۔ چلا رہی تھی قہقہے لگا رہی تھی۔

ان دنوں وکالت کا فاسٹل امتحان قریب تھا اور مقبرہ وکالت کے طالب علموں سے بھرا ہوا ہر جگہ ہر پلاٹ میں ہر بیٹج پر ہر پردے تلے طالب علم قانون کی مونی موتی کتابیں کھولے لے میں مصروف تھے۔ ان کی آنکھیں پڑھ پڑھ کر چند ہیائی ہوئی تھیں۔ چہرے بے خوابی کی سب سے سب سے دکھائی دے رہے تھے۔ جیسی فکر کی وجہ سے پریشان تھیں۔ قانونی پابندییں کرتے کرتے ان کی آوازیں بیٹھ چکی تھیں۔

لیکن سادی اور ایلچی کو ان کے وجود کا احساس نہ تھا۔ جب وہ باغ میں داخل ہوئے تو ایلچی اسے چاروں طرف دیکھا دو چار ایک پلاٹوں میں چند ایک لڑکے دکھائی دیتے۔ ایلچی نے ان کا سامن لیا اور سڑک کے جمیلے سے نکل کر یوں محسوس کیا جیسے باغ صرف سادی اور ایلچی کے لیے مخصوص ہو۔ ان چند ایک لڑکوں کا کیا تھا جو در اپنی کتابوں میں کھوئے ہوئے تھے۔ ایلچی معلوم نہ ہوا کہ قریب کے پودوں جھاڑیوں اور پھولوں کے تختوں کی اوٹ میں جگہ جگہ لڑکھری آنکھیں انہیں دیکھ رہی ہیں۔

ایلچی کے ایک دیر ان کو نے میں پہنچ کر ایلچی نے کلیوں سے لدی ہوئی چینی کی جھاڑی کی شاخوں کے لیے کہا ”یہ تم ہو سادی۔“

ایلچی نے حسب عادت قہقہہ لگایا۔ ”کیوں“ وہ بولی ”میں کیا جھاڑی ہوں۔“

”چنبیلی پھولوں میں چٹ کپڑی ہے۔“ ایللی نے کہا ”اور تم عورتوں میں۔“
 ”لیکن راہ چلنے کا ہاتھ پکڑتی ہے یہ تو۔“ سادی مسکرائی۔
 ”اور تم پکڑی اچھاتی ہو۔“ ایللی نے کہا۔

سادی نے قہقہہ لگایا ”جیسی آپ ننگے سر رہتے ہیں۔“ وہ خوشی سے تکیا بجانے لگی۔
 چنبیلی کی جھاڑی میں حرکت ہوئی۔ اور ٹہنیوں سے ایک سر یا ہر نکل آیا۔ ایک لہا لہو
 چہرہ چار ایک سفید دانت۔

ایللی گھبرا گیا۔

”ارے“ سادی نے قہقہہ لگایا ”سبحان اللہ“ وہ چلائی ”ذرا کیمرہ تو نکالے“ سر نے فوٹو
 اور سبز ٹہنیوں میں گم ہو گیا۔
 ”کون تھا یہ“ ایللی نے گھبرا کر پوچھا۔

لڈو

”کیا معلوم۔“ وہ ہنسنے جا رہی تھی۔
 ”ارے۔“ وہ پھر چلائی۔

ایللی نے مڑ کر دیکھا۔ ان کی پشت کی طرف آنکھوں کے چار جوڑے ان کی طرف
 رہے تھے۔ ”یہ تو تین جھاڑی معلوم ہوتی ہے۔“ وہ ہنسی۔ ایللی نے اس کا بازو پکڑ کر گھینا
 کر دیا۔

”تم مجھے پٹاؤ گی۔“ وہ بولی۔
 ”کیا مزار ہے گا۔“ وہ ہنسی۔
 ”تمنا دیکھتی ہو۔“

”دیکھتی ہوں۔ کرتی نہیں۔“

”لیکن وہ تو تمہیں تمنا دیکھتے ہیں۔“

”پڑے سمجھیں۔ اس سے کیا ہوتا ہے۔“

”سادی۔“ ایللی نے سنجیدگی سے پوچھا ”تم ان کی نگاہوں سے گھبراتی نہیں۔“

”نہیں تو“ وہ بولی۔ ”گنوار پن سے کیوں گھبراؤں۔“

”مجھے تو ڈر آتا ہے۔“ ایللی نے کہا۔
 ”آپ کا کیا ہے۔“ وہ ہنسی ”آپ تو یوں ہیں جیسے گھبراہٹ میں جان پڑ گئی ہو۔ لیکن ہم
 نہیں گھبراتے آپ۔“
 ”جو کیا تم سے بھی گھبراؤں۔“
 ”کیوں نہیں۔“ وہ بولی۔ ”گوری چٹی لڑکی کو دیکھ کر لوگوں کے ہاتھ پاؤں پھول جاتے

”ہو نموں ان کی بات نہ کیجئے۔“ کیوں“ ایللی نے پوچھا۔
 ”نہیں“ وہ ہنسی ”چلنے کی کوئی بات نہیں۔ اخلاق مانع ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔؟“

”وہ بھی ہوتا ہے۔“ سمجھ لیجئے مجھے کوفت ہوتی ہے۔“

”اور ان کی گنوار نگاہوں سے کوفت نہیں ہوتی۔“

”لو نموں۔“ وہ ہنسنے لگتی۔

”یہ تو یوں دیکھتے ہیں جیسے تم لڈو ہو۔“

”ہوں؟“ وہ ہنسی۔

”ہاں۔ ہو“ وہ بولا۔

”تو ہاتھ کیوں نہیں بڑھاتے آپ۔“

”لو نموں مجھے لڈو سے دلچسپی نہیں۔“

”جھوٹ“ وہ چلائی ”سفید جھوٹ۔“

”کیوں“ ایللی نے پوچھا ”وہ کیسے۔“

”آپ کے منہ سے تو کسی اور لڈو کی بو آتی ہے۔“

”کیا مطلب؟“ وہ بو کھلا گیا۔

”ہریت کا مطلب نہیں بتایا کرتے۔“

”کیوں؟“

”بس سمجھ لیجئے خود بخود۔“

”تو تو دو۔“ اس نے منت کی۔

”نہیں بتاؤں گی نہیں بتاؤں گی۔“ وہ بولی۔

”بھاڑ میں جاؤ بھاڑ میں جاؤ۔“ وہ بولا۔

”بھاڑ میں گئے تو کئی دن ہو گئے۔“

”اور جلی نہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”پر بل نہیں گیا۔“ وہ بولی۔

”نہ جانے کیا کہہ رہی ہو۔“

”جائے کو کون جگائے۔“

دفتا“ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ سنجیدگی سے بات کر رہی تھی۔ لیکن ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ شہزاد کی طرف اشارہ کر رہی تھی۔ اسے یہ بات کیسے سمجھ میں آ سکتی تھی۔ اسے یہ خیال بھی نہیں آ سکتا کہ بیگم ماں ہو کر اپنی بیٹی کے خلاف بات کر سکتی ہے۔ دفتا“ ان کے قریب ہی سے چار ایک آدمی مل کر گانے لگے۔

”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“

”وہ سب مل کر یوں گارہے تھے جیسے قوال گاتے ہیں۔ ان کی آوازوں میں تسخر قائلین تسخر کی حیثیت ایسی تھی جیسے آرزو کے تھل پر حرص کے پتے چھڑکے ہوئے ہوں۔

”ارے“ سادی حسب عادت تہقہ مار کر بولی۔ ”ہم تو قوالوں میں آگئے۔“

ایلی نے ادھر ادھر دیکھا سادی کے پیچھے پودوں کے جھنڈ میں بیٹھے ہوئے پانچ سات لڑکوں کی ٹولی سادی کی طرف دیکھ رہی تھی۔

”ایلیاس صاحب آپ بھی لگائیے آواز۔“ سادی ہنسی۔

ایلی گھبرا گیا۔

”خدا کے لیے نہ بولو۔“ اس نے اشارہ کیا۔

”کیوں نہ بولوں۔“

”چلو یہاں سے چلیں۔“

”ان بزرگوں کے درشن تو کر لوں۔“ وہ ہنستے ہوئے بولی۔

قوال قریب تر آگئے۔ ”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“

”ارے“ وہ مڑی۔

”ہمیں لڈو کھلاؤ ہمیں لڈو کھلاؤ۔“

”اپنی ماں سے مانگو اپنی ماں سے مانگو۔“ سادی تلی بجاتے ہوئے گانے لگی۔

ایلی گھبرا کر جل پڑا۔

ایسی وہ چار ایک قدم ہی چلا تھا کہ قوالی کی آوازیں بند ہو گئیں۔

”ایلیاس صاحب ایلیاس صاحب“ سادی کی آواز سنائی دی ”یہاں آئیے۔“

جب ایلی قریب پہنچا تو وہ کہنے لگی۔ ”یہ بھائی صاحب آم دے رہے ہیں تحفتاً“ کھائیں گے

”نہ۔“

”آم دے رہے ہیں۔“

”لڈو مانگتے سے بات شروع ہوئی تھی آم کھلانے پر ختم ہو رہی ہے۔ اچھے رہے نا۔“ وہ

ہنسی۔

”معاذ کیجئے وہ تو ویسے مذاق تھا۔“ ایک نوجوان جھینپتے ہوئے بولا۔

”کیس یہ آم والی بات بھی مذاق نہ وہ۔“ سادی نے کہا۔

وہ سب ہنسنے لگے۔

دور اور لنگور

پھر وہ دونوں آم چوتے ہوئے باغ میں یوں گھومنے لگے جیسے میلے پر آئے ہوئے ہوں۔ اور

بلاخر ایک بڑے سے پلاٹ میں بیٹھ کر گئیں مارنے لگے۔ سادی بات بات پر ہنسی تہقہ لگاتی تلی

بجا بجا کر ہنسی۔ وہ اپنے آپ میں اس قدر گم تھے کہ انہیں گرد و پیش کا احساس ہی نہیں تھا انہیں

معلوم ہی نہ تھا کہ دور دور سے طلبا اس پلاٹ کے گرد جمع ہو رہے تھے۔ وہ چپکے سے پودوں کی

لوٹ میں بیٹھ جاتے اور پھر دور بیٹھے ہوئے ساتھیوں کو اشارے سے بلاتے۔ حتیٰ کہ ان کی تعداد

تیس چالیس تک پہنچ گئی۔ پھر وہ چپکے سے پودوں کی اوٹ سے نکل کر آئے اور انہوں نے سادی

اور ایلی کے گرد چاروں طرف حلقہ بنا لیا اور گانے لگے۔

”پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔“

ایلی نے گھبرا کر ادھر دیکھا اس کا دل ڈوب گیا۔

وہ جھوم جھوم کر گارہے تھے۔ تلی بیٹ رہے تھے آنکھیں مٹکا رہے تھے۔

”ارے“ سادی نے مسکرا کر ایلی کی طرف دیکھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ ایلی نے زیر لب کہا۔

”وہ تو ہے۔“ سادی نے کہا۔ ”لیکن کتنے سچ ہیں۔“

لڑکے سادی کی بات سن کر تالیاں پیٹنے لگے ”ہمیر ہیر۔“

پھر سادی نے دونوں بازو اونچے کر دیئے۔ دیکھتے بھائی صاحب ”وہ یوں چلانے لگی ہیں میں مٹھائی فروش بات شروع کرنے سے پہلے لوگوں کی توجہ حاصل کرنے کے لیے چلاتا ہے“

”یہ بتا دیجئے۔“ وہ بولی۔ ”کہہ حور کون ہے اور لنگور کون؟“

لڑکوں نے دلچسپی اور تعجب سے سادی کی طرف دیکھا اور تھمتے مارنے لگے۔

”اپنے ان سے پوچھئے۔“ ایک شوخ نوجوان ایلی کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگا۔

”کیوں میرے ان صاحب“ سادی ایلی سے مخاطب ہو کر بولی۔ ”آپ کے لیے نام تو ہمارا تجویز کیا ہے۔ ان لوگوں نے“

”لنگور، لنگور، لنگور“ چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔ ایلی نے محسوس کیا کہ سادی کے مقابل میں وہ واقعی لنگور تھا۔ اس کی ٹانگوں میں دم لٹکنے لگی۔

”لیکن لنگور ہے کون۔“ سادی نے پوچھا

لڑکوں نے دایاں ہاتھ اٹھایا جس طرف سادی کھڑی تھی اور چلائے ”حور حور“ پھر بائیں ہاتھ اٹھایا اور چلانے لگے لنگور لنگور۔ ”پھر وہ ایک ساتھ بار بار اپنے ہاتھ اٹھ کر چلائے۔“ لنگور، لنگور“ تک وہ شور مچاتے رہے۔ اور سادی تھمتے لگاتی رہی۔

پھر سادی ان کے ساتھ شامل ہو گئی ان کے حلقے سے ذرا ہٹ کر ایلی کی طرف اشارہ کر کے گلے لگی

”پہلوئے حور میں لنگور خدا کی قدرت۔“

لڑکے جوش میں اس کے ساتھ چلانے لگے۔ ایلی چپ چاپ گھاس پر بیٹھا ہوا دونوں ہاتھوں میں تنکا چلائے جا رہا تھا۔ اس نے دو ایک مرتبہ بھاگنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن اس کے تیر دیکھ کر لڑکوں نے حلقہ اور بھی تنگ کر دیا تھا۔ اس لیے بیٹھ رہنے کے سوا اس کے لئے چارہ کار نہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد جب سادی رخصت ہو رہی تھی وہ بھول گئے تھے کہ سادی ایک لڑکی تھی نوجوان اور خوب صورت لڑکی۔ ان کی آنکھیں پر نم تھیں۔

”تو آپ جا رہے“ ایک نے حسرت بھری نگاہ ڈال کر کہا۔

”یہ دونوں حور اور لنگور۔“

”ہنسنے لگے۔“ خدا حافظ“ سادی نے کہا۔

”جن نے جواب میں سلوٹ مارا اور تانگہ چل پڑا لنگور پائیدان پر رکھے ہوئے سائیکل سے بھاگتا۔“

”آگے میں وہ دیر تک چپ چاپ بیٹھی رہی۔ اس نے دونوں ہاتھوں کا پیالہ بنا کر ان میں ڈال دیا۔“

”وہ ایک دیکھی تھی اور سڑک پر نگاہیں جمائے ہوئے تھی۔“

”میں سوچ میں پڑی ہو؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ نہیں“ اس نے مسکراتے کی کوشش کی۔

”آخر کیا بات ہے؟“

”کچھ بھی تو نہیں۔“

”ذرا بتاؤ کہ بھائی جان کو پتہ نہ چل جائے۔“

”وہ نہیں۔“ کیا فرق پڑتا ہے۔“

”پھر سوچ کیسی؟“

”سوچ کے سوا اب ہے ہی کیا۔“ وہ بولی۔

”کیوں؟“

”خود کردہ راجہ ہے نیست۔“

”پیشانی ہو رہی ہے۔“

”کوئی نہیں۔ پریشان ہوں۔“

”کیوں؟“

”میں ہوں۔“ وہ ہنسی۔

”تم تو بت کہہ دیا کرتی تھی۔“ ایلی نے گھبرا کر اس کی طرف دیکھا۔

”نہ کہنے والی بات حائل ہو جائے تو۔“ اس نے حسرت بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا۔

”نہ حائل ہونے دو۔“ ایلی بولا۔

”اگر آپ نے حائل کر رکھی ہو تو۔“

”میں نے۔“ ایللی کے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔
دیر تک وہ دونوں خاموش رہے۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے دفعتاً وہ اس قدر سنجیدہ کیوں ہو گئی تھی۔ لیکن تو اس کی وہ نہ تھی۔ وہ تو ایک انبساط کا دھارا تھی جو کبھی رکنا نہ تھا۔
”ضرور کوئی بات ہوئی ہے۔“ ایللی نے کہا۔
”ہوئی تو نہیں“ وہ بولی ”پہلے ہی سے تھی۔“ چلو چھوڑو“ دفعتاً وہ ہنسی۔ ”بہنو مافیہ کیا“
”ارے تو کیا یہ مذاق تھا۔“

”ہاں“ وہ ہنسی۔ لیکن اس کی ہنسی میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔
”آپ نے اپنے والد صاحب سے بات کی؟“ سادی نے پوچھا۔
”نہیں تو۔“ ایللی نے جواب دیا۔
”کیا وہ مان جائیں گے؟“
”پتہ نہیں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ڈر آتا ہے۔“
”اچھا۔“ سادی نے آہ بھری۔

”کیا یہ ضروری ہے“ ایللی نے پوچھا۔
”ہاں“ وہ بولی ”ان کی طرف سے رسمی پیغام کا آنا ضروری ہے۔“
”کیوں؟“

”بڑے خاندانوں کے بڑے بکھیرے ہوتے ہیں۔ اس بات پر لوگ بضد ہیں۔“
”اچھا۔“ ایللی نے کہا۔ ”اور۔۔۔۔۔“
سادی نے اس کی بات کاٹ کر کہا۔ ”میں نے غلطی کی“
”کیا؟“

”میں نے ان سے وعدہ کر لیا کہ اس معاملے میں انہیں مجبور نہ کروں گی۔“
”کیا دیواریں ہی کھڑی ہوتی جائیں گی؟“
”اونہوں۔ یہ تو دیواریں نہیں۔“ وہ ہنسی ”دیوار تو۔۔۔۔۔“ وہ رک گئی۔
”کہو نا۔“

”بہن سنی ہے کیل۔“
”ہاں“ ایللی جلال میں آگیا۔
”مائی نے قہقہہ لگایا۔“
”نہیں بتانا پڑے گا۔“ وہ غریبا۔
”نہیں بتاؤں گی، نہیں بتاؤں گی۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔
”جہلہ ہی مکمل کر دو۔“
”ہو نہوں۔“

”نہیں میری قسم“ ایللی نے منت کی۔ ”کیا کوئی دیوار ہے۔“
”ہاں“ وہ ہنسی ہے۔ ”آپ کی جانب سے۔“
”میری جانب سے؟“
”ہاں۔“

”جھوٹ بکواس۔ کوئی دیوار نہیں۔“
”پورہ۔۔۔۔۔“ سادی نے قہقہہ لگایا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ ایللی سوچنے لگا۔ ”وہ کون؟ بتاؤ نا۔“ ”جوش میں وہ بھول گیا کہ اس نے دونوں
فوں میں سائیکل تھام رکھا تھا۔ اس نے سادی کا بازو پکڑنے کے لیے ہاتھ بدھائے۔ دھڑام
، سائیکل تانگے سے گر پڑی۔ ایللی تانگے سے اتر آیا۔

سادی نے ایک اور قہقہہ لگایا۔ اور پھر چلا کر بولی ”خدا حافظ“ اور تانگا چل پڑا۔ ایللی نے
نگل سنبھلی اور تانگے کو جا لینے کے خیال سے اس پر سوار ہو گیا لیکن گرنے کی وجہ سے پیڈل
آپ ہو گیا تھا۔ اور زنجیر جام ہو چکی تھی۔ وہ سائیکل سے اتر آیا۔ اور پیڈل چلتے ہوئے سادی
ا طرف دیکھنے لگا۔ وہ الوداعی انداز میں ہاتھ ہلا رہی تھی۔ ”خدا حافظ“ خدا حافظ۔“ اس کے
نشان مل رہے تھے۔

ٹانگا

ٹل پور آتے ہوئے گاڑی میں ایللی مسلسل سوچتا رہا لیکن اسے سمجھ میں نہ آیا کہ کوئی

دیوار اس کی اپنی جانب سے حائل تھی ”وہ“ سے سادی کا کیا مطلب ہو سکتا ہے۔
ایک دیوار تھی جو سادی اور ایلی کے درمیان حائل تھی لیکن نہ جانے کیوں اس جذباتی تعلق کے باوجود جو وہ شہزاد کے متعلق محسوس کرتا تھا وہ اسے دیوار نہیں سمجھتا تھا۔ اگر وہ اس موضوع پر غور سے سوچتا تو محسوس کرتا کہ الٹا سادی تو بذات خود شہزاد اور ایلی کے درمیان ایک دیوار نہیں چلی تھی۔ ایک ایسی دیوار جو راستے کی مشکل نہیں تھی بلکہ ایلی کے تحفظ سکون اطمینان اور خوشی کی دیوار تھی۔ یہ صحیح تھا کہ ایلی کو شہزاد سے بے حد وابستگی تھی لیکن ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ شہزاد کے شادی شدہ ہونے کی وجہ سے ان کے تعلقات صحت مند نہیں رہ سکتے تھے۔

بہر حال وہ سادی کے اس اشارے کو نہ سمجھ سکا۔ اسے خیال بھی نہ آیا کہ کسی نے سادی سے شہزاد کی بات کہہ دی تھی۔ اور پھر بیگم کے یہ خیال اس کے دل میں نہ آیا اگر وہ سادی کے اس اشارے کو سمجھ پاتا تو یقیناً وہ سادی سے مل کر اسے تمام رویہ اور سناوٹ اور سادی اپنی ظلم پسندی اور سادی کی وجہ سے اس پھانس کو اپنے دل سے نکال دیتی جو بیگم نے انتقام کے جذبے کی وجہ سے اس کے دل میں پیدا کر دی تھی۔

لیکن حالات کا تقاضہ کچھ اور تھا۔ مستقبل کے بطن کے واقعات کا رخ کسی اور جانب نہیں تھا۔ ہونے والے واقعات مستقبل کے بطن میں چلا رہے تھے اپنی نمو کے لیے بلک رہے تھے۔ علی پور پہنچ کر جب ایلی شہزاد کے چوہارے میں پہنچا تو اس نے دیکھا کہ صدر اور شہزاد ایک جگہ بیٹھے باتیں کر رہے ہیں۔ لیکن اس وقت وہ سادی کی باتوں کی وجہ سے اس قدر پریشان تھا کہ اسے خیال ہی نہ آیا تھا۔ اس نے صدر کی آنکھ میں گرسنہ چمک کی طرف توجہ نہ دی اور اس نے بھی نہ دیکھا کہ شہزاد اس کی آمد پر گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی ہے۔

ایلی کو دیکھ کر بیگم قریب آگئی ”تو آ بھی گیا۔“ وہ بولی۔

”ہاں“ ایلی نے جواب دیا۔

”دو ایک روز بھی باہر نہ رہ سکا“ بیگم کی مسکراہٹ میں طنز کی دھار تھی۔

ایلی نے غصے سے بیگم کی طرف دیکھا۔

صدر کے چہرے پر چمک ابھری۔

شہزاد جوں کی توں خاموش بیٹھی رہی۔

ایلی کی بات کا جواب دیئے بغیر فرحت کی طرف چل پڑا۔

ایلی کی بات کے بعد ایلی پر صرف ایک دھن سوار تھی کہ جس قدر جلد ممکن ہو وہ علی احمد پر ہندی حاصل کر لے۔ اس کا خیال تھا کہ اب اس معاملے میں خمد نہیں کریں گے۔ اسے اطمینان تھا کہ علی احمد ہر اس بات کے خلاف ہیں جس میں روپیہ خرچ ہوتا ہے اس لحاظ سے ایلی کی شادی کی بات ان کے لیے ایک مصیبت تھی زبانی بات چیت بھی ناگوار تھی۔ ان بات سے ہٹ کر انہیں قطعی طور پر اس بات میں کوئی دلچسپی نہ تھی کہ ایلی کی شادی ہوئی ہے یا وہ خاندان کیسا ہے یا لڑکی کی ناک اونچی ہے یا بیٹھی ہوئی۔

اگر ایلی علی احمد سے کہتا اباجان میری شادی کر دیجئے تو علی احمد اس بات پر ذرا بھی چپیں بہ نہ ہوتے۔ وہ ان بزرگوں کی طرح نہ تھے جو ایسی بات پر مشتعل ہو جاتے ہیں اور کھنکار کر لہو جاتے ہیں یا آنکھیں نکال کر کہتے ہیں ”شرم کرو بیٹا اپنے منہ سے ایسی بات کہتے ہوئے ماہر مآں چاہئے۔“

ایسے وقت ان کا رویہ ایک تماش بین سا ہو جاتا۔

”ہمت اچھا“ بہت اچھا وہ نہایت خوش اخلاقی سے کہتے۔ اور پھر اپنی بیویوں کو مخاطب کر لے۔ ”لو بھی راجو شیم سنا تم نے ایلی کہتا ہے میری شادی کر دو۔ ہی ہی ہی۔ سن لیا تم؟“ وہ اٹھ کر کہتے۔ اس قہقہہ میں تسخیر کا عنصر نمایاں ہوتا۔ پھر دفعتاً ”وہ سنجیدہ ہو جاتے“ راجو بھی کہتا ٹھیک ہے۔ اب اس کی شادی کی فکر کرنا ہی چاہئے۔ اب تو جوان ہو گیا اور ایلی جی پوچھو تو شادی کیا ہے اک روگ ہے۔ راجو سن رہی ہے تو کیا کہہ رہا ہوں میں۔ تم نے سننے سے کیا فرق پڑتا ہے سن بھی لے تو کیا سمجھ لے گی میری بات! ہی ہی ہی۔ لیکن وہ واہ کیا روگ ہے ہزار روگ سے بچانے والا ہزار بری عادتوں سے محفوظ رہا۔ بس ایک روگ لگا لو ہزار مصیبتوں سے محفوظ ہو جاؤ۔ سن رہی ہو راجو مثلاً تمہارا بھائی ہزار مصیبتوں سے بچا ہوا ہوں۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنستے۔ ”ہاں بھی“۔ وہ ایلی کو قہقہہ ہو کر کہتے۔ ”ٹھیک کہتے ہو تم تمہاری شادی فوراً ہو جانی چاہئے۔ لو بھی راجو شیم کر لیا تیری ہم بھی کوئی مناسب لڑکی دیکھتے ہیں ہی ہی ہی۔“ وہ ہنستے۔ ”راجو اب میں کوئی لڑکی تو نہ دیکھتا ہوں اب تو مجھے مجبوراً“ ایلی کے لیے لڑکیوں کو دیکھنا ہی پڑتا ہے۔ ہی ہی

ابو طالبؑ اہلی نے حیرت سے پوچھا۔
 بچے کی خوشی ہے کہ تیری شادی ہو لیکن میں اس معاملے میں کیسے آسکتی ہوں۔“
 نبیؐ نے دھن سے جواب دیا۔

”میرا دل تو اس نے ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ ایک اس کی امید
 مٹ گئی۔ اس کو دیکھ کر جیتی رہی۔ خاوند کی بے رخی برداشت کی سونکوں کی خدمت
 دہائی۔ زندگی بھر محنت مزدوری کر کے اسے پالا۔“ ہاجرہ کی ہچکی بندھ گئی۔
 ہاتھ محسوس کیا جیسے ہاجرہ کے آنسو اس کے آشیں کے تنکے ہوں جو بے جا رہے

”صنوبر کی نگاہ ایللی پر پڑی۔“ ”آئیے آئیے۔“ وہ چلایا۔ ”الیاس صاحب آئے ہیں۔“
 نرگس ایللی کی طرف دیکھا اور پھر منہ موڑ کر صنوبر سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گئی۔
 ”ہاں ہاں“ مجھے اس ڈیزائن کے بندے پسند نہیں مجھے تو کوئی نئے فیشن کا نمونہ دکھاؤ۔
 ہانسی خیرجی اور بھردی دقینوسی چیز۔ کام کرنا ہے تو دل سے کرو ورنہ کیا فائدہ“ وہ

ایلی سوچ رہا تھا کہ اب اسے اس انداز سے بات کی جائے کہ انہیں واضح طور پر محسوس
اخراجات کا انتظام ہو چکا ہے۔ تنکا تنکا اکٹھا ہو چکا ہے فاختہ بھی موجود ہے اور ان سے مراد
توقع کی جارہی ہے کہ رسم کے مطابق فاختہ کو اپنی انگلی پر بٹھا کر لے آئیں اور بنے پائے گھر
میں بٹھادیں۔ اس صورت میں شاید وہ اعتراض نہ کریں۔

ماں کے متعلق ابلی نے کبھی سوچا ہی نہ تھا۔ اس کی دانست میں ماں تو اس بات پر باجو
مسرور تھی۔ وہ تو خوش تھی کہ اس کا بیٹا ایک بیابان عورت کے دام سے نکل رہا ہے۔ اور لڑکا
سلوی کے ہاں دو تین مرتبہ ہو آئی تھی اگر وہ اس بات پر خوش نہ ہوتی تو بھلا وہاں جا لیا
کیوں۔ لہذا یہ بات تو طے شدہ تھی کہ ماں اس امر میں اس کا ساتھ دے گی۔

لیکن جب اہلی نے ماں سے بات کی تو وہ حیران رہ گیا۔
 ”نہ بھئی“ وہ بولی ”میں اس معاملے میں نہیں آؤں گی۔“

سٹم ہانٹ واول سٹم ہے۔

مشرگپتا بڑی محنت سے نئے لڑکوں کو سمجھاتے کہ جائنٹ واول سٹم کا کیا مطلب ہے اور یہی سٹم سے کیا مراد ہے اور پھر جب لڑکا داخل ہو جاتا تو پھر بات پر اسے تاکید کرتے ہیں کہ وہ پلینک کا خیال رکھے۔

ایلی ان کی اس بات پر بے حد محفوظ ہوتا اور بڑی سنجیدگی سے پوچھتا:

”ہاں مشرگپتا یہ سٹم صوتی ہے تاہی اس میں صرف آواز کا خیال رکھا جاتا ہے۔“

”ہاں بالکل الیاس صاحب بس اس نکتہ کو آپ ہی نے سمجھا ہے لڑکے توجہ سے بات نہ سنتے۔“

”دست“ ایلی کہتا۔ ”لیکن ہمیں پلینک کا خیال رکھنا چاہئے۔“ وہ طنزاً کہتا۔

”ہاں“ وہ خوشی سے چلاتے۔ ”بس یہی ایک نکتہ ہے۔“ اور پھر وہ فوراً مثال دیتے صبح آپ نے بے اوجھل لکھا تھا اس کی وجہ یہ تھی کہ آپ نے لفظ کے پلینک کی طرف خیال نہ آپ کو یہ خیال نہ رہا تھا کہ یہ لفظ جے او سے لکھا جاتا ہے۔ آپ نے یوں لکھا جیسے یہ لفظ اے لکھا جاتا ہو۔“

مشرگپتا سے باتیں کرنے میں ایلی کو بہت لطف آتا تھا لہذا وہ اکثر مشرگپتا کے ہاں جا بیٹھتا۔ سنی لیتے ہوئے بھی وہ مشرگپتا سے گپ بازی کیا کرتا۔ کالج میں ایلی واحد طالب علم تھا جس نے مشرگپتا نے دوستانہ مراسم پیدا کر رکھے تھے اور اس کی وجہ شاید یہ تھی کہ ایلی بی اے تھا اور لڑکپن کے کالج میں تمام طلباء میٹرک پاس تھے۔

دلتا محلے میں شور اٹھا کہ ایلی کی منیگریٹر شرمہ کی شادی ہو رہی ہے۔ ہاجرہ یہ سن کر حیران رہ گئی۔ ایلی کی پوچھ گچھ کی۔ بات کی تصدیق ہو گئی تو ٹھنڈی ہو کر بستر پر آ پڑی۔

اس پر ایلی ماں کے پاس آ بیٹھا بولا ماں اب تو تمہارا یہ اعتراض بھی دور ہو گیا۔ چل اٹھ مجھے ساتھ چل کہ مظفر آباد میں اب اسے ملیں۔ شاید وہ مان جائیں۔

ہاجرہ نے جب ایلی کی بات سنی تو پہلے تو وہ ادھر ادھر کے بہانے بتاتی رہی لیکن ایلی نے بار بار کی باتیں کیں حتیٰ کہ ایک روز ماں ایلی کے ساتھ مظفر آباد جانے کے لیے مان گئیں۔

ماں اور بیٹا ملنے پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ سیلاب کی وجہ سے مظفر آباد کی لائن ٹوٹی ہوئی

شہزاد فارغ ہو کر چوبارے میں ادھر ادھر گھومنے لگی جیسے کچھ تلاش کر رہی ہو۔ کالجز پر کپڑا دیا۔ کالجز پر پڑی سرے والی کو ایک طرف رکھا صندوق کھول کر کئے کاغذ اسے سرانے پر چڑھایا اور پھر تیل کی کچی اٹھا کر مشین کو تیل دینے لگی۔ ایلی چپ چاپ اسے دیکھتا رہا دیکھتا رہا اور پھر مایوس ہو کر نیچے اتر آیا۔

مشرگپتا

جن دنوں ایلی نے بی اے پاس کیا تھا وہ مالی بحران کے دن تھے۔ دوسری جنگ عظیم سانپ کو گزرے سالہا سال گزر چکے تھے۔ لیکن لیکریس اب ابھر رہی تھیں۔ ہر لمحے کا کھانا اچل رہا تھا نوکری حاصل کرنا ناممکن تھا۔

مجبوری میں ایلی نے ایک شارٹ ہینڈ کالج میں داخلہ لے لیا تھا یہ کالج علی پور کے دو دروازے کے قریب ایک چوبارے میں واقع تھا جس کے ملحقہ مکان میں مشرگپتا کالج اور واحد انسٹرکشن کی رہائش تھی مشرگپتا پرانی وضع کے باعزت لالہ جی تھے۔

وہ صبح سویرے جاگتے اور چھڑی لے کر باہر چل قادی کے لیے نکل جاتے۔ مشرگپتا سارے کے لیے استعمال نہیں کرتے تھے۔ ان کی چال اس قدر چست اور تیز تھی کہ با محاذوں ثابت ہونے کی بجائے انارکلوٹ معلوم ہوتی۔ لیکن مشرگپتا چھڑی یا چھڑی کے بڑے ٹکڑے کے قائل نہ تھے۔ وہ ایک پرانے باعزت خاندان سے تعلق رکھتے تھے اور ان کے ہاں میں کسی شخص نے چھڑی یا چھڑی کے بغیر باہر نکلنے کی حماقت نہ کی تھی۔ میر کرنا کہ مندر سے ہوتے ہوئے سیدھے اپنے کالج میں پہنچتے۔ اپنے شاگردوں کو دونوں ہاتھ جوڑ کر کرتے اور پھر انہیں پڑھانے میں مصروف ہو جاتے۔

مشرگپتا اس بات پر بے حد ناز کرتے تھے کہ ہندوستان میں صوتی شارٹ ہینڈ کالج کے لیے انہوں نے ساری عمر جدوجہد کی تھی۔

جب کوئی نیا لڑکا کالج میں معلومات حاصل کرنے کے لیے آتا تو مشرگپتا اپنی مصروفیات چھوڑ کر اس کے پاس بہ مکمل شفقت آ بیٹھتے اور اسے سمجھاتے کہ شارٹ ہینڈ سٹم جسے پٹ میں کہا جاتا تھا بالکل بے کار ہے اور ان کے نئے سٹم کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔

انہیں اس حالت میں دیکھ کر علی احمد کے گھر میں شور مچ گیا راجو اور شمیم
کے جیت سے ان کی طرف دیکھنے لگیں۔ شمیم کی دونوں بیٹیاں اور راجو کے
دو بھائی اب شور مچانے لگے۔
”آپ ہیں۔ یا میری آنکھوں کو دھوکا ہو رہا ہے۔“
”راجو بولی۔“

جب کلمات ہو رہی ہے تمہاری۔“ شمیم نے ایللی کی طرف دیکھ کر کہا۔
”آپ نے۔“ راجو نے علی احمد کو مخاطب کر کے کہا۔ ”سننے ہیں کیا کہہ رہی ہوں
میں اب لگے اس حساب کے رجسٹر کو ہر وقت اسی میں کھوئے رہتے ہیں آپ۔ نہ آئے کا
لگے گا ہوش۔ میں نے کہا آپ سے کہہ رہی ہوں۔“
”جیسے کہہ رہی ہو کچھ راجو۔“ اندر سے علی احمد کی آواز سنائی دی۔
”مگر ہے سن لیا آپ نے۔“ وہ بولی۔

”یہی ہی ہے۔“ وہ ہنسنے۔ ”دیکھو نا راجو یا تو بیوی گونگی ہو اور یا خاوند بہرہ ہو جیسی نہستی
وہ نہیں۔ تم تو طوطے کی طرح ٹیس ٹیس کرتی رہتی ہو اب میں بھی بہرہ نہ بنوں تو نئے
یہی ہی ہے۔“ وہ ہنسنے لگے ”کیا کہتی ہے۔“
”میں کہتی ہوں۔“ راجو چلائی۔ ”ذرا باہر تو دیکھو لو کون آیا ہے۔“
”کوئی آیا ہے کیا؟“ وہ بولے۔

”ہاں بلکہ کہہ رہی ہوں۔“
”علی احمد نے جلدی سے ننگی ہوئی قمیض کو اتارا اور اسے پہننے لگے۔ ان کی عادت تھی کہ
پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہتے کہ وہ سمجھیں خرچ درج کا مسئلہ نہ
گا۔“
”لیکن پھر شادی کیسے ہوگی کیا وہ ختمیں خانہ داماد بنالیں گے۔“
”نہیں امیں۔“

”ایسی بات ہے تو میں تو جیتے ہی مر جاؤں گی۔“ ہاجرہ چلائی۔ اور بات جوں کی
ادھوری رہ جاتی۔
چار ایک روز کے بعد بعد مشکل گھنٹے گھنٹے پانی سے گزر کر وہ مظفر آباد میں علی احمد

ہے اور وہ آگے نہیں جاسکتے۔ مجبوراً وہ ملتان ایک رشتہ دار کے ہاں ٹھہر گئے اور انتظار کرنے
لگے کہ کب راستہ صاف ہو اور وہ منزل مقصود پر پہنچیں۔ ملتان کے قیام کے دوران میں ایللی
ماں کو باہر لے جاتا اور کسی باغ یا میدان میں پہنچ کر وہ دونوں کسی دیران کوئے میں بیٹھ جاتے
ایللی ماں کو سمجھاتا کہ علی احمد سے کس طرح بات کی جائے۔

”دیکھو نا امیں“ وہ کہتا ”اگر ابانے محسوس کیا کہ شادی پر بہت خرچ اٹھے گا تو وہ کسی نہ
بہانے یہ رشتہ نامنظور کر دیں گے اور اگر یہ موقعہ ہاتھ سے نکل گیا تو پھر شاید کبھی ایسا موقع
ملے اور امیں سادی ایک ایسی ناؤ ہے جو مجھے اس بھنور سے باہر نکال سکتی ہے جس میں میں غرق
کھا رہا ہوں اور اگر یہ ناؤ بھی نہ رہی تو پھر۔۔۔ پھر تم جانتی ہو۔“ ایللی وضاحت سے اپنا
سمجھا رہا تھا کہ اگر وہ ناکام رہا تو پھر وہ اپنے آپ کو از سر نو اسی بھنور کے حوالے کر دے گا
میں وہ عرصہ دراز سے ڈبکیاں کھا رہا تھا۔

اس روز پہلی مرتبہ ایللی نے اپنے منہ سے یہ تسلیم کیا تھا کہ شہزاد ایک بھنور تھی اور وہ
بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا۔ درحقیقت وہ اس حقیقت کو تسلیم نہیں کر رہا تھا بلکہ اسے استہل
رہا تھا اور دھمکی کے طور پر بوڑھی ماں کے سامنے پیش کر رہا تھا۔
لیکن ہاجرہ بار بار کہتی اگر تمہارے ابانے شادی پر خرچ نہ کیا تو کرے گا کون اور بات
بنے گی۔

”تم اس بات کی پروا نہ کرو امیں۔ یہ بعد کی بات ہے فی الحال ضروری بات یہ ہے کہ باہر
چلیں اور ہمیں ان کی قدر امداد حاصل ہو جائے کہ وہ سادی کے ابانے مل کر
پیش کر دیں۔ اس لیے بات اس انداز سے کرنا چاہتے کہ وہ سمجھیں خرچ درج کا مسئلہ نہ
گا۔“

”لیکن پھر شادی کیسے ہوگی کیا وہ ختمیں خانہ داماد بنالیں گے۔“
”نہیں امیں۔“
”ایسی بات ہے تو میں تو جیتے ہی مر جاؤں گی۔“ ہاجرہ چلائی۔ اور بات جوں کی
ادھوری رہ جاتی۔
چار ایک روز کے بعد بعد مشکل گھنٹے گھنٹے پانی سے گزر کر وہ مظفر آباد میں علی احمد

اور یہ سیلاب، کیسے پہنچے تم۔ سنا ہے ریل کی لائن ٹوٹی ہوئی ہے اور سارا شہر تباہی میں مبتلا ہے۔ دو دو فٹ پانی کھڑا ہے پہلے اطلاع دیتے تو ہم کوئی انتظام کر دیتے۔ خیر خیر ہمارا کیا تم آگئے۔ راجو راجو۔ یہ دیکھا تم نے ایلچی کی ماں کو۔ ذرا غور سے دیکھو۔ اب تو ایلچی ہو گئی ہے۔ اور راجو تمہیں معلوم ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایک مرتبہ ہماری پڑوسن نے کیا کیا وہ ہنسنے لگے۔ ایلچی کی ماں سے اللہ رکھے کل کتنے لڑکے ہیں تمہارے اور یہ پلوٹھی کا ہے ہی ہی۔ وہ ہنسنے لگے۔ پھر میری طرف اشارہ کر کے بولی اللہ رکھے۔ ”کیوں ایلچی کی ماں باجھے۔ ہی ہی ہی ہی حد ہو گئی سنا تم نے راجو۔ ہی ہی ہی ہی۔“

جب علی احمد کو معلوم ہوا کہ وہ ان سے ایک اہم بات کرنے آئے ہیں تو دفتر میں آئے۔ یہ علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ اگر انہیں کسی بات میں خاص اہمیت دی جاتی تو وہ ان کو خاص اہمیت دینا شروع کر دیتے اور خود اپنی رائے کو اہمیت دینے لگتے۔ اور اس کے کسی مسئلے میں انہیں نظر انداز کر دیا جاتا تو وہ اس مسئلے کو قطعی طور پر اہمیت نہ دیتے اور اندازی کو درخور اعتنا نہ سمجھتے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ علی احمد نے سوچا کہ یہ لوگ اتنی دور سے چل کر آئے ہیں۔ تاکہ مجھ سے بات ظاہر ہے کہ مجھ سے بات کرنے کو بہت اہمیت دی جا رہی ہے تو بات اتنی آسانی سے طے نہ جانی چاہئے۔

”ہاں ہاں ہاں ہاں۔“ وہ ہنسنے لگے ”بھئی اب جو تم یہاں آ پہنچے ہو تو اب باتیں ہی باتوں کے سوا اور کیا ہوتا ہے انہوں کے درمیان۔ ہی ہی ہی ہی۔ اب دیکھ لو راجو ہے راجو سے باتیں کرتے ہیں ہم۔ کیوں راجو ٹھیک ہے نا ہی ہی ہی ہی۔ یہ اور بات ہے کبھی جواب نہیں دے سکی لیکن کمال یہ ہے کہ لا جواب بھی نہیں ہوتی۔ کیوں راجو ہی۔“

”آپ میری بات چھوڑیں۔“ راجو بولی۔ ”ان سے بات کریں اتنی دور سے نہ بات کرنے کے لیے۔“

”ان سے بھی کریں گے ان سے بھی کریں گے۔ لیکن ابھی یہ لوگ سفر کر کے نہ پھر اتنی تکلیف جمیل کے۔ انہیں چار ایک دن آرام کرنا چاہئے۔ آرام کرو کھانا کھاؤ۔“

کیوں راجو تم نے چائے پٹائی اور کیا کالے سے بسکٹ منگوائے پھر کوئی خاطر نہ کرنا کی تمہارے مہمان آئے ہیں۔“ یہ کہہ کر انہوں نے اپنی صندوقچی سے ایک چونی لیا اور راجو کو دیتے ہوئے بولے۔ ”منگواؤ بسکٹ۔ ذرا جلدی کرو نا بھئی ایلچی کی ماں بیٹھ جاؤ نا۔“

مسلح چار روزہ ہاجرہ اور ایلچی نے متعدد بار کوشش کی کہ علی احمد سے بات کی جائے لیکن وہ کسی اہمیت سے اس حد تک واقف ہو چکے تھے کہ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے بات ٹال دی بات شروع کرتا تو علی احمد کہتے۔ او ہو۔ میں بھول ہی گیا۔ دیکھو نا اتنے بکھیرے ہیں کہ میں لیا جاتا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔ سب سے بڑا بکھیرا تو یہ راجو ہی ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے کیا کیا کہنا میں۔ ہونا تم بکھیرا۔ بکھیرے درد سر ہوتے ہیں اور درد دل والے بکھیرے بھی ہوتے ہیں۔ اور راجو تم تو درد دل والا بکھیرا ہو۔ ہی ہی ہی ہی۔ سنا تم نے کیا کیا کہہ رہا ہوں میں۔ لیکن یہ تم درد سر والا بکھیرا بنی جا رہی ہو پہلے خالص درد دل والا تھی۔ تمہیں درد دل والے بکھیرے نہیں ایلچی۔ بڑا عظیم بکھیرا ہوتا ہے یہ۔ توبہ ہے۔ اچھا ہے اچھا ہے ابھی یہ درد دل لاکھڑا نہ ہی ہوا ابھی ساری عمر پڑی ہے۔ کچھ دن اور سکھ کے گزار لو تو تمہاری خوش نصیبی دلی۔ یہ بیماری کچھ اور دیر نہ لگے تو بہتر ہے۔ کیوں راجو سنا تم نے ہی ہی ہی ہی۔“

اس طرح وہ مسلسل باتیں کیے جاتے اور ایلچی کی بات پس پشت پڑ جاتی۔

کئی وقت وہ جواب دیتے۔ ”ہاں ہاں بھی آج تو بات ضروری کرنی چاہئے اتنے دن ہو گئے نا تمہیں آئے ہوئے لیکن ابھی میں تو جا رہا ہوں ڈپٹی صاحب کو ملنے کے لیے۔ انہوں نے بلایا ہے۔ بے ہمارے بڑا خیال رکھتے ہیں بات بات پر مشورہ کرتے ہیں۔ ان سے مل آؤں میں پھر لیکن سے بات کریں گے۔“

اس کے بعد دیر تک وہ جوں کے توں بیٹھ رہتے۔ وہ ڈپٹی صاحب کی طرف جاتے ہی نہ تھے بلکہ بات کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ اور اگر ایلچی انہیں یاد دلاتا کہ آپ تو جا رہے تھے نا صاحب کی طرف تو وہ ہنس کر کہتے ہاں ہاں بھی جا رہا ہوں۔ اور پھر بیٹھ رہتے۔ اس طرح ایلچی اور احمد کو وہاں رہتے آٹھ روز ہو گئے۔ اور ان آٹھ روز میں ایلچی کو صبر و سکون ریزہ ریزہ ہو کر دیکھنا ایلچی طبعی طور پر مزاح اور مزاحیہ صورت حال کو محسوس کرنے سے کورا تھا۔ وہ علی احمد کی

رتگین شخصیت، ان کے انوکھے انداز اور پر کیف انداز گفتگو سے محظوظ نہیں ہوتا تھا۔ رتگین بیٹے کی حیثیت سے دیکھا اور اپنے مقاصد کے زائے سے ان کی باتوں پر غور کرتا اس لیے رتگین اس کی نگاہ میں دنیا داری مکر فریب چالاک کے مترادف نظر آتی۔ اسے ان کی ہر بات غصہ آتا تھا۔ نتیجہ یہ ہوتا کہ باپ بیٹے کی لڑائی ہو جاتی تھی۔

مظفر آباد میں ایلی نے مسلسل طور پر کوشش کی کہ جھگڑا نہ ہو اس لیے وہ بڑے مردانہ سے کام لیتا رہا۔ علی احمد ایلی کی اس خصوصیت سے واقف تھے اور اکثر جان بوجھ کر ایلی باتیں کرتے تھے جنہیں سن کر وہ آگتا جائے اور جھگڑ کر اٹھ بیٹھے تاکہ انہیں بات سے غصے حاصل جائے لیکن ایسے حالات علی احمد ایسے وقت پیدا کرتے تھے جب انہیں بات کی نوعیت کا علم ہوتا اور بات کے متعلق کچھ کرنے کا ان کا اپنا ارادہ نہ ہوتا اس طرح بات کے ٹوٹنے کی تلم تراد داری ایلی پر عائد ہو جاتی اور علی احمد پر کوئی حرف نہ آتا۔

ان دنوں مظفر آباد میں بھی وہ اسی بات سے ڈرتا تھا اسی وجہ سے اس نے ہاجرہ کو پارہ نائید کی تھی کہ راجو یا شمیم سے بات نہ کرے کیونکہ اکثر مرتبہ ایسے حالات میں وہ راجو اور شمیم کو کہا کرتے بھی کیا معاملہ ہے کچھ پتہ تو لگاؤ یہ کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ اور بات کی نوعیت سمجھ کر وہ یوں ظاہر کرتے جیسے انہیں کچھ علم ہی نہ ہو اور پھر معاملے کی نوعیت کے مطابق عمل کرتے۔ بہر حال نویں روز بھد مشکل بات شروع ہوئی۔

حق و انصاف

”ہوں۔“ علی احمد بولے ”تو ایلی شادی کرنا چاہتا ہے۔ ٹھیک ہے بالکل ٹھیک ہے۔ لی اے کر چکا ہے۔ وال روٹی کما سکتا ہے۔ لہذا ضرور کرنی چاہیے اسے شادی۔ اور ایلی کی ماں سناٹا م نے تو ایلی کی منگنی کر رکھی تھی۔ وہ کیا ہوئی۔ بھی ہم نے تو سنا تھا۔ شاید غلط ہو لیکن سناٹا تھا۔ اچھا تو کیا چاہ تھا۔“ انہوں نے ہاجرہ کے اثبات میں سر ہلانے کے بعد کہا۔ ”بہر صورت ہا اچھا کیا تھا تم نے۔ اور اگر تم اب شادی کرنا چاہتی ہو ایلی کی تو ضرور کرو۔ فوراً“ کر دو ہمیں کب اعتراض ہو سکتا ہے بھی جیسے میرا بیٹا ہے دیے ہی تمہارا ہے میں شادی کروں یا تم کد کد کرے یا ماں کرے کیا فرق پڑتا ہے۔ تو اتنی سی بات کے لیے تم دونوں اتنا لبا ستر کر کے آئے“

”سمجھانہ جانے کیا ہوا ہے۔ آسمان ٹوٹ پڑا ہے یا زمین ڈوب گئی ہے حد ہو گئی۔ ہی ہی کی ہی راجو۔“

”ہاجرہ بولی ”ایلی وہاں شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”تپ مجھے کیوں درمیان میں گھسیٹ لیتے ہیں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”وہ مسکرائے۔“ خواہ خواہ بگڑ رہی ہے بھی تو میری بیوی جو ہوئی۔“

”وہ بھی تو بیوی ہی ہے نا۔“ راجو نے شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

”ہاں ہاں بالکل ہے بے شک وہ بھی بیوی ہے۔ لیکن درمیان میں گھسیٹنے والی نہیں وہ صرف ہوتی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔

”راجو کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔“

”ہاں بھی تو میں کہہ رہا تھا ایلی کی ماں اتنی لڑکیاں جو پڑی ہیں محلے میں کسی ایک کو پکڑ لو یہ لڑکی سر انجام دے دو اللہ اللہ خیر بھلا ہمیں بھی اطلاع کرو۔ ایسا نہ کرنا جیسے منگنی پر کیا ہمیں خبری نہ بھیجی۔ اور ہمیں اطلاع کرو گی ایلی کی ماں تو اگر چھٹی ملی تو انشاء اللہ ضرور ہاں گا اور ان دونوں کو تو چاہے آج ہی لے جاؤ۔“ انہوں نے راجو اور شمیم کی طرف اشارہ کیا۔

”اے ہے۔“ راجو بولی۔ ”محلے میں کوئی لڑکی ہے کام کی۔“

”تو“ علی احمد بولے۔ ”یہ سمجھتی ہے بس یہی ایک کام کی تھی اور اس کے چلے آنے کے بعد پورے کوئی کام کی لڑکی باقی نہیں رہی۔“

”آپ میری بات نہ کیا کریں۔“ راجو غصے میں بولی۔

”اچھا“ علی احمد بولے۔ ”سوچ لو۔ شمیم بھی یہی کہہ کرتی تھی۔ اور میں نے شمیم کی بات مان لی تو اب خود ہی ناراض بیٹھی ہے۔ کہتی ہے مجھ سے بات نہیں کرتے۔“

”بس میرے زخموں پر نمک نہ چھڑکے کوئی۔“ شمیم بولی۔

”اے ہے آپ خواہ مخواہ دوسری بات چھیڑ بیٹھے۔“ راجو نے کہا ”یہ ایل کی بات نہ کرو۔ میں کہتی ہوں محلے میں کوئی کام کی لڑکی ہو بھی۔“

”اوہو۔“ علی احمد بولے۔ ”بیا سب کام کی ہوتیں ہیں۔ چاہے ناک اونچی ہو یا جھنی ہو رنگ گندی ہو یا سانولا۔ آنکھ موٹی ہو یا چھوٹی۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔“

”ہوں فرق نہیں پڑتا۔“ شمیم چلائی۔ ”فرق نہیں پڑتا تو خود اتنی شادیاں کرنے کی ضرورت تھی۔“

”ہائیں۔“ وہ ایک ساعت کے لیے رکے۔ پھر ہنسنے لگے ”بھئی اتنی شادیاں نہ کرنا توہم نکتہ کا پتہ کیسے چلتا۔ اتنی شادیاں کرنے کے بعد تو یہ تجربہ ہوا۔ ہی ہی ہی ہی۔ ایل کو تو اس بار کا تجربہ نہیں جیسی اسے بتا رہا ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔“

”لیکن۔“ ہاجرہ بولی ”ایل کی محلے میں کسی سے شادی کرنا نہیں چاہتا۔“

”ہائیں۔“ دفتا علی احمد خاموش ہو گئے۔ ”محلے میں نہیں کرے گا تو باہر اسے کون ڈال دے گا۔“

”کیوں اسے کیا ہے۔“ راجو بولی۔

”بھئی آخر باہر والے کسی بات پر لڑکی دیتے ہیں۔ یا دولت ہو یا عمدہ ہو یا پھر۔“

خیر۔ نہ یہاں دولت ہے نہ عمدہ۔“

”وہ تو دینے کو تیار ہیں۔“ ہاجرہ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔

”وہ۔۔۔۔۔“ علی احمد بولے ”کون ہیں وہ؟“

”بڑے اونچے کھاتے پیتے ہیں باعزت خاندان سے ہیں۔ باپ ریاست میں وزیر ہیں۔ بڑے عہدوں پر فائز ہیں لڑکی کو ہم دیکھ آئے ہیں۔ بڑے اچھے لوگ ہیں۔“

”اوہ۔۔۔۔۔“ علی احمد بھونچکے رہ گئے۔

”بس آپ کی رضامندی اور صرف آئیر باد کی ضرورت ہے۔“ ایل بولا۔

”ہوں۔۔۔۔۔“ علی احمد دفتا ”سنجیدہ ہو گئے۔“ ”تو یہ بات ہے۔“

”آپ کے شامل ہوئے بغیر۔۔۔۔۔“ ایل نے کچھ کہنے کی کوشش کی۔

”دیکھ ایل کی ماں“ علی احمد نہایت سنجیدگی سے بولے۔ ”ایل کی شادی کا براہ راست ہندسہ قطع ہے۔ ایک تو ایل خود ہے جس نے شادی کرنی ہے اور دوسرے ہم سب تم ہمارے راجو شمیم اور میں جنہوں نے لڑکی کے ساتھ رہتا ہے تو ایل کی شادی دونوں پارٹیوں

میں سے ہونی چاہیے۔“

”مجب ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”میں راجو یہ بات حق و انصاف کی ہے یا نہیں۔“

”ہاں ہے تو مناسب“ راجو نے جواب دیا۔

”جس کی صورت یہ ہو سکتی ہے۔“ علی احمد نے کہا ”یا تو ہم لڑکی کا چٹاؤ کریں اور ایل پر ہر کرے اور یا یہ کہ ایل چٹاؤ کرے اور ہم اسے پسند کریں۔ کیوں راجو۔ ہے ناحق و کی بات۔“

”اور اگر آپ چٹاؤ ہی نہ کریں تو۔۔۔۔۔“ راجو بولی۔

”میں موقع دوں۔ آج بات کی ہے ایل کی ماں نے۔ ہمیں چھ مہینے کی مہلت دی جائے چھ ماہ لڑکی کا چٹاؤ کریں گے۔ اسے آزمائیں گے۔“

”اوہ ایل کو پسند نہ آئی تو۔“ شمیم نے کہا۔

”تو پھر موقع دیا جائے گا کہ کوئی اور پسند کریں۔ انصاف کی بات ہے نا۔“

”بس آپ پسند کرتے رہیں۔۔۔۔۔“ علی احمد بولے ”ایل کی بوڑھا ہو جائے۔“ راجو بولی۔ ”اچھا تو

اور صورت ہے۔“ علی احمد بولے ”ایل نہیں چار یا پانچ لڑکیوں کے نام دے دے جن سے

لی کرنے کے لیے تیار ہے ان میں سے ہم ایک چن لیں گے۔“

”اچھا بھئی لگا چار پانچ نام۔۔۔۔۔“ وہ بولا ”آپ بھی کمال کرتے ہیں۔“

”اچھی لڑکی تو بڑی مشکل سے ملتی ہے۔“ راجو بولی۔

”تو ایک لڑکی ہے جو بڑی مشکل سے تلاش کی ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ”ایسی لڑکی کہاں ملتی

نا کر۔“

”لیا احمد خاموش ہو گئے۔“

”مجب توجہ کیوں نہیں دیتے۔“ راجو نے کہا۔

”ہاں“ ہاجرہ بولی ”یہ رشتہ جو ہم نے چنا ہے۔“

”یہ رشتہ —“ علی احمد رک گئے۔“

”ہاں ہاں یہ رشتہ“ ہاجرہ نے دہرایا۔

”اس سے اچھا رشتہ نہیں ملے گا۔“ راجو بولی۔

”جو جو کچھ بتایا ہے ایللی کی ماں نے اس کے مطابق تو بڑا اچھا رشتہ ہے۔“ ٹیم نے لڑکھاتے ہوئے کہا۔

”بات کیجئے نا“ راجو علی احمد کو خاموش دیکھ کر غصے میں چیخنے لگی۔

”یہ رشتہ مجھے پسند نہیں“ علی احمد نے کہا۔

ایللی کا دل ڈوب گیا۔

”لیکن وجہ؟“ ہاجرہ غصے میں بولی۔

”وہ بہت اونچے لوگ ہیں۔“ علی احمد نے سنجیدگی سے کہا۔

”یہ تو الٹا اچھا ہے۔“ راجو دبلی زبان سے بولی۔

”میں بہت چھوٹا شخص ہوں۔“ علی احمد کہنے لگے ”اور میں اعلیٰ اور اونچے خاندان

رشتہ نہیں کروں گا۔ میں تو اپنے بچوں کا وہاں رشتہ کروں گا جہاں میری ایک حیثیت ہو

میری بات کو اہم سمجھا جائے جہاں میری عزت ہو۔ جہاں —“

”اے ہے وہ تو بڑی عزت کرنے والے لوگ ہیں۔“ ہاجرہ بولی۔

”نہیں یہاں نہیں ہو گا۔“ علی احمد نے کہا۔ ”اگر میری رضامندی کوئی حیثیت رکھتی ہے

یہاں نہیں ہو گا۔“ یہ کہہ کر وہ اٹھ بیٹھے اور اپنی ڈسک پر بیٹھ کر حساب کے رجسٹر میں لکھنے

مصرف ہو گئے۔

منظر آباد سے واپسی پر ایللی کے سامنے چاروں طرف پانی ہی پانی کھڑا تھا اور پانی کے

پھیلاؤ میں گاڑی ہو تک رہی تھی وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ پھیلا ہوا پانی علی احمد کا انکار تھا

یہ انکار ہی انکار اور اس پر چاروں طرف اواس آسمان محیط و مسلط۔

گاڑی کراہ رہی تھی۔ ہوا شائیں شائیں کر رہی تھی۔ ہاجرہ گھٹنوں میں سر دبے بیٹھی تھی

ایللی کھڑکی سے باہر ٹٹکتی باندھ کر دیکھ رہا تھا۔

”دور دور“ ساوی یہ کہتے ہوئے بھاگی جا رہی تھی۔ ”نہیں میں وعدہ کر چکی ہوں“

ملنے میں میں مجبور ہوں۔ میں مجبور ہوں میں مجبور ہوں۔“

چاروں طرف ٹھہرا ہوا پانی ابھر رہا تھا۔ پانی ہی پانی ہی پانی ہی پانی۔ آسمان پانی میں گر کر ڈوب

پاکستان کہیں کہیں اس کے ٹکڑے ٹکڑے دکھائی دے رہے تھے۔

دھنسا ”باہر کوئی چیخنے لگا۔“ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔ گاڑی آگے نہیں جائے گی۔“

مٹی اُتار کر رہے تھے۔
ایلی محسوس کر رہا تھا جیسے وہ راجہ پورس ہو۔ اور منہ میں گھاس لئے سکندر کے روہرو
بہت کھٹ کرنے جا رہا ہو۔ ”مجھ سے ایسا سلوک کرو جیسا بادشاہ شکست خوردہ غلاموں سے
کرتے ہیں۔“

وہ محسوس کر رہا تھا کہ ان سب کو اس کی شکست کا علم تھا۔ وہ اس کے منہ کے گھاس کو دیکھ
رہے تھے۔ وہ اس کی شکست پر خوش تھے۔ لیکن وہ سکندر کون تھا جس کے روہرو پیش ہونے
ایسا جارہا تھا۔ نہ جانے کون تھا۔ بہر حال وہ سکندر تھا وہ فاتح تھا وہ اس کا منتظر تھا۔
چوگان میں انہیں مل دیکھ کر رک گئی اس نے ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔

”ہے تم ہاجرہ۔“ وہ چلائی ”جو جی کی ماں لویہ آگئے۔“

”کون آگئے۔“ ایک کھڑکی سے سر نکال کر بولی۔

”کیا کہاں“ دوسری چلائی۔

”ہے ہاجرہ تم ہو کیا۔“

”اب کیا مل بیٹا نیا گل کھلا کر آئے ہیں۔“

”میں کتنی ہوں بسن پرانے بندھنوں کا بھی خیال کر لیا کرو۔ کب تک آگے دوڑ اور پچھلے
اڑ پر عمل کرو گی۔“

”تو تو ہاجرہ لڑکے کے پیچھے دیوانی ہو گئی۔“

ہاجرہ حیرت سے ان کی طرف دیکھ رہی تھی۔ ان کی تعداد ہر ساعت بڑھتی جا رہی تھی کوئی
لے لے نکل کر رک جاتی کوئی کھڑکی سے سر نکالتی۔ کوئی چھت سے جھانکتی چند ساعت تو ایلی
لڑائیت سے ان کی طرف دیکھتا رہا پھر وہ بھاگا اندھا دھند بھاگا۔ اس نے محسوس کیا جیسے
جتن میں ڈانٹوں نے اسے گھیر لیا ہو۔

”بے تم“ راجہ نے ایلی کو دیکھ کر سینہ تھام لیا۔ اس کی آنکھیں ابل آئیں اور وہ حیرت
میت بنی دیکھتی رہی۔

ایلی ڈر گیا۔ نہ جانے کیا بات۔

”گو تم آگئے۔“ جانو اسے دیکھ کر ٹھٹھکی اور اس نے چیخ سی ماری شتراد کے ہاتھ
پکڑ کر پڑی اور فرش پر ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گئی۔ اس کے قریب ہی صفدر کھڑا حیرت سے

چھ لڑکیاں

علی پور علی پور — اس کے کان میں آوازیں پڑیں۔

ایلی چونکا۔ گاڑی ایک دھچکے سے رک گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس سا ہو۔ جیسے وہاں اسے کچھ کرنا ہو۔ اس نے سامنے
دیکھا ہاجرہ سوٹ کیس اٹھانے کی کوشش میں مصروف تھی۔ وہ سلمان اٹھانے لگا باہر پلٹ فارم پر
دھندلکے کا ایک پھیلاؤ تھا۔ اس پھیلاؤ میں گویا لوگ تیر رہے تھے۔ وردی والا بابو ہاتھ میں
جھنڈی اٹھائے گھور رہا تھا۔ سر پر بسترے اٹھائے وہ ایک سرخ پوش بہاؤ کو چیرتے ہوئے جارہے
تھے۔

دفعۃً ایک چہرہ ان کی طرف بڑھا۔ قریب اور قریب اس چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ
تھی۔

”تم ہو بسن۔“ چچا عماد کہہ رہا تھا۔ ”تم کہاں گئے ہوئے تھے۔ محلے میں تمہاری ڈھونڈ بگنی
ہوئی تھی۔ ہر جگہ پوچھ گچھ ہو رہی تھی۔ جلدی پہنچو جلدی ورنہ وہ چلے گئے تو پھر کیا فائدہ۔“

ذرا مہجور والی جا رہا ہوں۔ ”یہ کہہ کر اس نے ایک ڈبکی لگائی اور دھندلکے میں گم ہو گیا۔

ڈھونڈھ مچی ہے۔ ہاجرہ بڑبڑانے لگی۔ ڈھونڈھ کیوں مچی ہے۔ کیوں مچی ہے ڈھونڈھ بگنی
ہے۔ ڈھونڈھ مچی ہے — یکے کے پیچے چیخ رہے تھے۔

جب وہ بازار میں پہنچے تو دور سے حکیم نے انہیں دیکھا اور پھر اشارہ کرنے لگا۔ بہت سے
لوگ جھک جھک کر مڑ مڑ کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ دودھ والے کا، دوکان پر لوگ ان کے

دیکھ رہا تھا۔ چند قدم پرے بیگم اسے گھور رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے مرنے لگا۔ بدروح کی شکل میں واپس آیا ہو اور وہ سب ڈر اور حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہے ہو۔ دیر تک بات کئے بغیر وہ اس کی طرف دیکھتے رہے اتنی دیر میں ہاجرہ بھی آپہنچیں۔ پہلے رابعہ بولی۔ ”ہے ایک گھنٹہ پہلے آ جاتے تو۔۔۔“

”اتنے دن تمہاری ڈھونڈھ پڑی رہی۔“

”انتظار میں راہ سکتے رہے۔“

”ہے کتنا ظلم کیا تم نے۔“

”اتنی دیر لگا دی تم نے۔“

”آخر ملتان میں کیوں رکے رہے۔“

وہ سب باری باری بول رہے تھے۔ ایللی کو ان کی باتیں سمجھ میں نہیں آ رہی تھیں۔ جانے وہ کس بات پر اظہارِ افسوس کر رہے تھے۔

پھر رابعہ نے طلسم توڑا۔ ”ہے اتنی پیاری ہے وہ کہ کیا بتاؤں۔ اتنی رونق لگا رکھی تھی اس نے وہ تو یوں کھل مل گئی جیسے ہم میں سے ہو اتنی اچھی طبیعت مزاج نہیں بونیس خوش طبیعت۔ ہنس کھ۔ تم تو اتنے خوش قسمت ہو، وہ ایللی کی طرف دیکھ کر بولی۔

”یہ تو سکندر کا نصیب لے کر آیا ہے۔“ شہزاد بولی۔

”ہے اب جلدی کرو جلدی، نیک کلام میں دیر نہ کرو۔“

”لو وہ اپنے منہ سے کہتی تھی۔ کہتی تھی میں تو تمہاری ہو گئی اب تم بنا لو بات بنے۔“

”توبہ ایسی منہ پھٹ ہوتا بھی کیا۔“ بیگم نے جل بھن کر کہا۔

ایللی نے غور سے بیگم کی طرف دیکھا۔

”اوسر کیا دیکھتا ہے“ شہزاد بولی۔ اماں اور کیا کہے گی۔“ وہ ہنسی۔

”اور بہن اتنی خوبصورت اور پھر اتنی اچھی۔“

”یہ تو ساری مر مٹی ہیں اس پر“ شہزاد ہنسی۔

”کوئی ایسی بات کرو جو میرے پلے بھی پڑے۔“ ہاجرہ بولی۔ ”کس کی بات کر رہی ہو۔“

”اے وہ آئے تھے۔“ جانو نے کہا۔

”کون آئے تھے۔؟“

”آئے ہے وہی لاہور والے کیا نام ہے اس لڑکی کا۔“

”اے سلوی اور کون۔“ رابعہ بولی۔

”ایللی کا دل ڈوب گیا۔“

”سلوی“ ہاجرہ نے زیر لب کہا۔ ”کہاں آئے تھے۔“

”ایللی“ علی پور میں۔ شہزاد کے گھر پورے دو دن رہے۔“ رابعہ چلائی۔

”شہزاد انتظار کرتے رہے۔“ جانو بولی۔

”وہ اس کی بہن اور اس کی خالہ۔ تینوں۔“

”ایللی آئے تھے؟“ ہاجرہ نے حیرت سے پوچھا۔

”ہاں ہاں ایللی ایللی دو دن یہاں رہے وہ۔ اتنی پیاری ہے وہ سادی اتنی رنگین اور

افراد پار کرنے والی اور پھر خوبصورت کوئی جواب ہے اس کا“ رابعہ نے ڈرامائی انداز میں کہا۔

اک دھند لگا

ایللی کا دل دھک سے رہ گیا۔ آنکھیں دھندلا گئیں۔ پانی ہی پانی پانی ہی پانی چاروں طرف پانی

اس پر نگاہ پڑا اور اس آسمان قریب ہی کوئی چیخ کر بولا ”گاڑی آگے نہیں جائے گی۔“

ایللی یوں نہ وار بھاگا۔ فرحت کے کمرے میں پہنچ کر وہ دھم سے چارپائی پر گر پڑا۔ اس

ہاتھ تکیے میں ڈبو دیا۔ پانی ہی پانی۔ تکیہ بھیگ گیا۔ اس نے سر اٹھایا کمرہ

نہانک دھندلکے سے بھرا ہوا تھا۔ دور ہاجرہ سہمی ہوئی کھڑی اس کی طرف دیکھ رہی

”دھند لگا کئی ایک روز جوں کا توں قائم رہا۔“

”ایسی بڑھتی گئی۔ پھر مایوسی کے اس تاریک آسمان پر دھندلا“ گویا امید کا ایک تارا

ایک رات کیلئے روشنی کی کرن جھلکائی۔

نہیں نہیں سلوی ضرور کچھ کرے گی وہ گھروالوں پر اثر ڈال سکتی ہے اس کی والدہ اس کا

بہن اور پھر سارے کیرا موزوں غصے میں غرانے کے بعد رو پڑیں گے منصر جوش میں

بہن دیدہ دلبری پر اسے مارنے کیلئے ہاتھ اٹھائے گا اور پھر اسی ہاتھ سے اپنے آپ کو پیٹنے

اور پھر وہ پھوٹ پھوٹ کر رو پڑے گا اور جوش محبت سے سادی سے بے تکلیف ہو جائے گا

اور پھر جب وہ ایلی سے ملے گا تو کہے گا۔ ”ایلی صاحب اتفاق سے۔۔۔“

لیکن جلد ہی ٹوٹے تارے کے وہ روشن ذرات بکھر گئے روشنی بجھ گئی اور وہی تاریکی مٹی۔

”نہیں نہیں اس معاملے میں میں مجبور ہوں۔ میں ان سے وعدہ کر چکی ہوں کہ اس بات میں ضد نہیں کروں گی۔“ سادی چلاتی۔ ”خاندانی عزت“ وہ طنز سے ہنسی ”ان کی مجبوریاں آخر تسلیم کرنی پڑتی ہیں۔ ہاں اس معاملے میں مجبور ہوں۔“ یہ کہتے ہوئے وہ دور بٹے چلی اور دور دور دور حتیٰ کہ۔۔۔ جوں جوں وہ دور ہوتی جاتی تاریکی چاروں طرف سے پھرتی۔

مظفر آباد سے آنے کے بعد دس پندرہ روز کے لئے تو ایلی بے حد پریشان رہا اس کے میں کئی مرتبہ خیال پیدا ہوا کہ سادی کو ساری بات لکھ دے تاکہ وہ حالات سے واقف رہے؟ پھر اسے خیال آتا کہ یہ بات خط میں لکھنے والی نہیں۔ بلکہ زبانی کرنے والی ہے لہذا وہ سچا بات کیسے بات کرے ملنے کی کوئی صورت بھی تو نہ تھی۔

آخر اس کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ شاید صورت پیدا ہو جائے آخر کوئی نہ کوئی صورت پیدا ہو گی ہی۔ لیکن اس کا لاہور جانا ضروری تھا۔ علی پور میں بیٹھے تو صورت پیدا نہیں ہو سادی کے خط کے انتظار میں تھا۔ خط سے حالات کا کچھ تو علم ہو گا۔ وہ علی پور کیسے آئے تھے کیا چوری آئے تھے یا سب کو علم تھا یا ممکن ہے صرف اہاں سے بات کی ہو اور پھر علی پور کے بعد ان کے تاثرات کیا تھے لیکن سادی کا کوئی خط موصول نہ ہو رہا تھا۔ ہر روز ایلی امید لگا بیٹھ رہتا۔ ڈاکیہ کی آمد کے وقت ہر آہٹ پر اس کے کان بجتے لیکن سادی کا خط موصول نہ ہوا اب مزید انتظار کرنا ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کر لیا۔

گاڑی میں وہ مختلف قسم کے منصوبے بنا رہا۔

لاہور پہنچتے ہی ایسے وقت سفید منزل جاؤں جبکہ گھر کوئی نہ ہو۔ منصرف دفتر کیا ہوا۔ کالج میں ہو ممکن ہے کوئی صورت نکل آئے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ کوئی صورت نہ ملے ممکن ہے امان آیا ہو۔

فرض کیجئے گھر کوئی نہ ہو پھر بھی والدہ تو ہوں گی۔ اور اب شاید وہ سادی کو اس کے سے بلانا پسند نہ کریں۔ بلا بھی لیں تو وہ ان کے سامنے یہ بات کیسے کہے گا۔ بات کی نوعیت کیا ہے؟

کسی کے روبرو نہیں ہو سکتی۔ باقی کے روبرو بھی نہیں تو پھر۔۔۔ اگر وہ ایک مرتبہ سفید منزل میں چلا گیا تو پھر سب کو معلوم ہو جائے گا کہ وہ لاہور آیا ہوا ہے۔ اس کے بعد سادی سے یہ ملاقات کی صورت نہ رہے گی اور اگر سفید منزل نہ جائے تو پھر سادی کو کیسے معلوم ہو گا کہ لاہور آیا ہوا ہے۔۔۔ نہیں نہیں یہ ناممکن ہے۔ سادی کو خفیہ پیغام بھیجنا ممکن نہیں۔

ایلی اسی اوجیز بن میں مصروف تھا کہ گاڑی لاہور کے سٹیشن میں داخل ہو گئی ایلی گاڑی سے اترے۔

ہوٹل میں سالن رکھ کر وہ سیدھا سفید منزل پہنچا۔ صدر دروازہ بند تھا۔ اس نے دستک کوئی جواب نہ ملا۔ اس نے پھر دستک دی۔

جب ایلی نے تیسری مرتبہ دستک دی تو بوڑھا ستھ جو گلی سے گزر رہا تھا ہنس کر بولا ”میاں دستک تو دے رہے ہو پر دروازے پر تو تالا پڑا ہے۔“

”تالا۔۔۔“ ایلی نے حریت سے دہرایا۔۔۔ دروازے پر واقعی تالا پڑا تھا۔

”لیکن“ وہ چلایا ”یہ لوگ کہاں ہیں۔“

”میاں کس گئے ہوں گے۔“ ستھ نے کہا۔

دیر تک ایلی وہیں کھڑا رہا کہ کسی سے پوچھے لیکن کوئی ادھر سے نہ گزرا۔ ساتھ والے گھر کا دروازہ کھٹکنا کر پوچھنے کی اس میں جرات نہ تھی۔

شام کو وہ منصر کے دفتر میں پہنچا لیکن وہاں بھی تالا لگا ہوا تھا۔ ”ارے“ وہ حیرانی سے چلایا ”ہیل بھی تالا“ سامنے دوکان پر جا کر اس نے پتواڑی سے پوچھا۔

”کیوں بھی یہ دفتر نہیں کھلے گا آج۔؟“

”یہ دفتر“ پتواڑی بولا۔ ”یہ دفتر تو بند۔“ گیا یا بچی۔“

”بند ہو گیا۔“

”جی آٹھ روج ہوئے بند ہوئے اسے۔“

”کیا کسی اور جگہ چلا گیا۔“

”یہ تو عالم نہیں یا۔۔۔“

دوکاندار کی بات سن کر ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کے روبرو ایک آہنی دیوار آکھڑی ہو۔ ہوٹل میں پہنچ کر ساری رات وہ سوچتا رہا۔ سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کس سے دریافت کرے

لوگ دوستوں سے وہ واقف نہ تھا۔ اگرچہ اسے معلوم تھا کہ موتی دروازے کے ایک محلے

میں دھنسا ہوا تھا۔ ریت ریت ریت۔ منناک دھند لگا اور ریت!!

اد صاحب

سادی کے یوں اطلاع دیئے بغیر چلے جانے پر ایلی غم نہیں بلکہ حیرت محسوس کر رہا تھا کم از کم اطلاع تو دی ہوتی۔ سادی کو اس کے گھر کے لوگ جانے پر مجبور نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن گمراہوں نے چالاکی سے اسے ہسلا پھسلا کر رضامند کر لیا ہو اور وہ دھوکے میں آگئی ہو پھر نے جان بوجھ کر نوکری سے استعفیٰ دے دیا ہو تاکہ ان کے لاہور میں رہنے کا جواز نہ ہے اور یہ سب کچھ اس لئے کیا گیا ہو کہ ایلی سے سادی کا جذباتی تعلق ٹوٹ جائے۔ نہ بھی لے تو اس میں شدت نہ رہے۔ دوری اور وقت مل کر اس کی توجہ کو کسی اور طرف منحطف لے لیں میں مہربان ہوں۔

جب اسے یہ خیال آتا تو دکھ محسوس ہوتا۔ دراصل ایلی کو منصر سے محبت ہو چکی تھی۔ منصر ان کا آئینہ بن چکا تھا۔ اور منصر کی حیثیت سے ایلی کے ذہن میں اگر سادی سے زیادہ نہ تھی تو اس صورت میں اس سے کم بھی نہ تھی۔

منصر کا وہ حسن اس کا بانہیں رنگین طبع اس کی خودداری اور اس کے علاوہ منصر کی نسبت سے غلوں بھری محبت کی شعاعیں سی نکلتی ہوئی محسوس ہوتی تھیں ایسی شعاعیں جو کسی نہیں بلکہ محسوس ہوتی ہیں۔ جیسے ہلاکی سردی میں کوئی انجمانی انگلیٹھی کے پاس جا بیٹھا ہو۔

ایلی کی سب سے بڑی بد قسمتی یہ تھی کہ وہ درپردہ منصر سے محبت رکھا بیٹھا تھا حالانکہ سادی نے کئی بار غلوں کے ذریعے اور زبانی اسے خبردار کیا تھا۔ ”دیکھنا یہ نہ بھولنا کہ یہ سب لوگ ہٹ میری وجہ سے — آپ سے التفات محسوس کرتے ہیں۔ صرف میری وجہ سے ورنہ ناگاہی چلے تو —“ سادی کی تنبیہ کے باوجود ایلی منصر کا ہو چکا تھا۔ وہ منصر کی ہدایات پر توجہ نہیں کرتا تھا لیکن ان کی خلاف ورزی کرتے ہوئے اسے تکلیف محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں نہیں“ وہ آپ ہی چلایا ”منصر ایسا نہیں کر سکتا۔ منصر اسے دھوکا نہیں دے گا۔ منصر کوئی مجبوری پیش آگئی ہوگی کہ انہیں لاہور کو خیر باد کہنا پڑا ورنہ منصر — اگر قطع تعلق نہ کرے گا تو وہ اعلان یہ کہہ دیتا۔“ ایلی صاحب اگر آپ سادی کے راستے سے ہٹ جائیں تو منصر کا منہ منہ ہوں گا۔ پھر ایسی چال چلنے کا فائدہ۔ نہیں نہیں منصر ایسا نہیں کر سکتا۔“

میں ان کے رشتہ دار رہتے تھے جہاں رانا کی شادی پر وہ گیا تھا۔ اسے وہ راستہ اچھی طرح یاد تھا لیکن آخر وہاں جا کر وہ کس کا دروازہ کھٹکھٹائے کس سے پوچھے اور اگر انہوں نے پوچھا میں تم کوں ہو تو وہ کیا جواب دے گا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا — ڈاکٹر وہی ڈاکٹر جس نے دوپٹے کی چوری کے موقع پر اسے تسلی دی تھی۔ ”مجھے سب معلوم ہے گھبراؤ نہیں۔“

صبح سویرے ہی ڈاکٹر کے مکان پر جا پہنچا۔ ”معاف کیجئے۔“ وہ بولا ”آپ کو تکلیف دی۔“ ڈاکٹر اسے دیکھ کر ہنسنے لگا ”کیوں کیا پھر دوپٹہ چرانے کا ارادہ ہے۔“ ”جی نہیں“ ایلی مسکرایا۔

”لیکن اب تو دوپٹہ چرانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ وہ لوگ تو چلے گئے۔“ ”چلے گئے۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا ”کیوں؟“

”انہوں نے یہ مکان بیچ دیا۔ منصر صاحب نے دفتر میں استعفیٰ دے دیا اور وہ ہمیشہ کے لیے یہاں سے چلے گئے ہیں۔“

”ہمیشہ کیلئے؟“ ایلی نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔ ”منصر صاحب کے والد کسی ریاست میں اونچے عہدے پر فائز ہیں۔“ ڈاکٹر نے مکرانے ہوئے کہا ”اس لئے غالباً انہوں نے سب کو وہیں بلا لیا ہے۔“ ”لیکن —“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

ڈاکٹر نے اسے تھپکنا شروع کر دیا ”میرے نوجوان دوست زندگی میں ایسے واقعات اکثر ہوتے رہتے ہیں۔ شروع شروع میں انسان دکھ محسوس کرتا ہے یہ عمر ہی ایسی ہے پھر آہستہ آہستہ —“ وہ مسکرایا ”سب ٹھیک ہو جائے گا وقت لا جواب مہم ہے۔ چائے پیئیں آپ۔“

”شکریہ۔“ ایلی گنگنایا اور گردن لٹکا کر چل پڑا۔ اسے یہ احساس بھی نہ تھا کہ وہ ڈاکٹر صاحب سے سلام علیکم کئے بغیر شکر یہ ادا کئے بغیر چل پڑا تھا۔ اس کے ردِ برد ایک خوفناک دھند پھیلا ہوا تھا تمام راستے مسدود ہو چکے تھے۔ مناظر اپنا مفہوم کھو چکے تھے آوازیں گھٹن شہر میں تبدیلی ہو چکی تھیں۔ لاہور طبع کا ایک ڈھیر دکھائی دے رہا تھا اس کے ردِ برد ڈاکٹر صاحب

کئی ایک روز ایلی اس سلسلے پر سنجیدگی سے سوچتا رہا۔ مگر زیادہ سوچنے سے بات لڑ رہی تھی۔ وہ الجھ کر رہ گیا۔

پھر سادی کا خط موصول ہوا۔ لکھا ہوا تھا ”بھائی جان کی وجہ سے میں مجبور ہو گئی۔ بھائی جان کے لئے اس کے سوا اور چارہ کار نہ تھا کہ لاہور چھوڑ کر یہاں ریاست گرد گم میں جائیں مجھے بھائی جان سے محبت ہے۔ آپ جلتے ہیں تو پڑے جلتے۔ میں بھائی جان کیلئے سب قربان کر دینے کے لئے تیار ہوں چاہے میری جان ہی کیوں نہ جائے۔

لیکن گھبرائیے نہیں ہمارے یہاں آنے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ آپ اپنے وار صاحب سے بات کر کے ان کے ہاتھ پیغام بھیجنے میں سستی نہ کریں چونکہ میرے والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں اور ابا کے سامنے اپنی دال نہیں کھتی لہذا یہ کام تو آپ کو کرنا ہو گا۔

”یہاں کب آئیں گے آپ کی منتظر رہوں گی۔ منتظر ہوں۔“

سادی کا خط پڑھ کر ایلی کو خوشی کی بجائے ناغہ ہوا اور وہ بالکل ہی مایوس ہو گیا۔

”والد صاحب“ وہ زیر لب بولا ”بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ والد صاحب“

کاجی چاہتا تھا کہ قلمہ مار کر ہنس پڑے اور دیوانہ وار چلائے ”والد صاحب ہا ہا ہا ہا“

”والد صاحب۔ والد صاحب بڑے رکھ رکھاؤ کے دلدادہ ہیں۔ ہا ہا ہا۔“

”والد صاحب۔ والد صاحب کے سامنے ہماری دال نہیں کھتی۔ ہی ہی ہی۔“

”والد صاحب سے کون بات کرے۔ اور کی بھی جائے تو کسی احسن طریق سے کی جائے

والد صاحب کی رضامندی ضروری ہے۔ انہیں خود پیغام لانا چاہئے۔“

”نہیں مجھے یہ رشتہ منظور نہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ بچوں کا رشتہ ایسے گھرانوں

ہو جہاں میری حیثیت ہو۔ میری عزت ہو۔ میری آؤ بھگت ہو۔ میری عزت۔“

والد صاحب۔“

ایلی کاجی چاہتا تھا کہ دیوانہ وار باہر نکل جائے اور لوگوں کو اپنا پیغام سنائے ”تمہارے بل

والد صاحب ہیں کوئی۔ ان سے بچو۔ والد صاحب سے بچ کر رہو۔ ان سے دور رہو۔ وہ ایک نئی

جاگتی لعنت ہیں۔ بد قسمتی ہیں۔ ان کا رکھ رکھاؤ جھوٹ ہے ان کی خاندانی عظمت فریب ہے

والد صاحب ایک سردہ ہیں جو فریب سے گھر کی گدی پر آ بیٹھے ہیں۔ والدہ محترمہ نے انہیں

مرد مار کا ہے تو کسی ذاتی غرض کی وجہ سے۔ والدہ محترمہ نے اپنی آسانی کے لئے

انہماک بنا رکھا ہے تو زرد و ان جوں کو توڑ دو۔“

بچپن ہی سے ایلی کو اپنے باپ سے میر تھا۔ اسے علی احمد کو دیکھتے ہی غصہ آ جاتا تھا۔ باپ کی

وجہ سے ہی وہ والدین کی محبت سے محروم رہا تھا۔ باپ کی وجہ سے وہ نوکرانی کا بیٹا تھا باپ کی وجہ

سے لے سستی اور کبھی عورتوں کے لئے چلیقاتی دھوپ میں بوتل میں رہٹ سے پانی بھرنا پڑا

تھا باپ کی وجہ سے محلے والیاں کہا کرتی تھیں ”بسن آخر بیٹا کس کا ہے اپنے باپ کے قدموں

پر چلے گا اور کیا وہ بھی گودی میں پلا تھا۔ یہ بھی گودی میں پل رہا ہے“

نور والد صاحب ہی کی وجہ سے آج ایلی کے ہاتھ سے سکون اور اطمینان سے زندگی بسر

کرنے کا موقعہ ہمیشہ کے لئے جا رہا تھا۔ اگر سادی چھن گئی۔ اگر اس کی پناہ گاہ ہاتھ سے جاتی رہی

نہ تو۔۔۔ ایلی نے دانت بھیجنے لئے تو۔۔۔ تو میں گندی بد رو میں چھلانگ لگا دوں

میں اپنا آپ کتوں کو کھلا دوں گا۔ میں اپنے تعفن کو چاروں طرف پھیلا دوں گا۔ میں بھی گودی

میں پلں گا۔ میرے کمرے میں بھی ٹین کا سپاہی برسر پیکار رہے گا۔ والد صاحب زندہ باد

پاکستان

برائے نگاہ

پھر جوالی کو ہوش آیا تو اس کے سامنے ہاجرہ اور فرحت سہمی ہوئی کھڑی تھیں۔

”کیوں ایلی“ ہاجرہ کہہ رہی تھی ”خیر تو ہے۔“

”خیر۔۔۔“ اسے بات سمجھ میں نہیں آرہی تھی۔

”تجھے کیا ہوا ہے ایلی“ فرحت پوچھ رہی تھی۔

”مجھے۔۔۔“ وہ بولا ”کیوں؟“

”تمہی چنیں تو سارے محلے میں سنائی دے رہی تھیں بیٹا۔“

”چنیں۔۔۔“ اس نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔

”نہ بیٹا“ ہاجرہ قریب آ کر بولی ”خود کو اختیار میں رکھا کرتے ہیں۔ اللہ کرے گا کوئی نہ کوئی

موت نکل ہی آئے گی۔“

”وہ تو خیر نہ جانے کب نکلے گی۔ لیکن جو صورت نکلی ہوئی ہے اسے تو دیکھو ذرا“ شہزاد

داخل ہو کر بولی۔

”کیا نکلی ہوئی ہے۔؟“ ہاجرہ نے کہا۔

”یہ“ شہزاد نے بڑھ کر ایلی کی ٹھوڑی کو دونوں ہاتھوں سے پکڑ لیا۔

”اب تو تو بھی نہیں آتی۔“ فرحت بولی ”آج نہ جانے کتنی دیر کے بعد شکل دکھائی ہے۔“

”میری شکل —“ وہ ہنسی ”میری شکل دیکھ کر پہلے تم کب خوش ہوا کرتی تھیں مرز“

ایک ایلی تھا اور اب اسے اپنی سدھ بدھ نہیں رہی — کیوں ایلی“ وہ چلائی۔

”اپنی سدھ بدھ پہلے کب تھی۔“ ایلی نے اسے چھیڑا۔

”اچھا“ اس نے منہ پکا کر کے جواب دیا ”میں کبھی پہلے تھی۔“

”اگر سمجھ لیتی تو بات نہ بگڑتی۔“ ایلی نے کہا۔

”نت ت — تم نے ہی سمجھا دیا ہوتا“ وہ ہنسی ”چل تجھے چائے پلاؤں۔“ یہل اکیلا

بیٹھا رہتا ہے فصول چل۔“ شہزاد نے اسے پکڑ لیا۔

ایک ساعت کے لئے ایلی نے شدت سے محسوس کیا کہ سب کے روبرو شہزاد کو اپنے

بازوؤں میں جکڑ اور اس کا بند بند چومنا شروع کر دے اور پھر چلا کر کہے: ”چل اگر یہی ہے تو یہی

سہی۔“

اس نے شہزاد پر ایک برہنہ نظر ڈالی اور اس کی طرف بڑھا۔

شہزاد بھانپ گئی اور پھدک کر پیچھے ہٹی اور پھر بھاگی۔ ”آؤنا پھر۔“ وہ چلائی۔ ”جلدی

آؤ۔“ ایلی بھاگا۔

اس وقت نہ جانے ایلی کو کیا ہو گیا تھا۔ اس وقت گویا وہ اپنے آپ میں نہ تھا۔ جیسے کوئی اور

روح اس کے جسم میں حلول کر گئی تھی۔ وہ بھول چکا تھا کہ ہاجرہ اور فرحت کھڑی دیکھ رہی ہیں۔

وہ بھول چکا تھا کہ شہزاد شریف کی بیابتا بیوی ہے وہ بھول چکا تھا کہ اسے سدا سے مت ہے۔

اپنا آپ بھول چکا تھا۔ اس وقت اسے کسی فرد یا اصول کا لحاظ نہ تھا۔ وہ نگاہ تھا۔ شرم و حیا سے

قطعی طور پر بے گانہ۔ اسے صرف ایک خواہش تھی۔ کہ اعلانیہ اپنے آپ کو کنوئیں میں پینک

دے اور پھر بھینس کی غلاظت میں لت پت ہو جائے۔ اس کا شدت سے جی چاہتا تھا کہ سب کے

روبرو اپنی تذلیل کرے۔ سب کے روبرو کسی کی تذلیل کرے۔

شہزاد نے مرکز ایلی کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ خوف سے بھیاںک ہو رہا تھا۔ یا شاید ایلی کا

ہاتھیں شہزاد پر بھی اثر کر چکی تھی۔ اور اس کا چہرہ ڈر نہیں بلکہ کسی اور جذبے سے بھیاںک ہو

رہا تھا۔ ممکن ہے دونوں ہی باتیں درست ہوں اور ایلی کے قرب سے خائف تھی اور اس کی آرزو

کر رہی تھی۔

اگر اس وقت بیڑیوں میں ایلی کا پاؤں نہ پھسلتا اور وہ دھڑام سے نہ گرتا تو اس کی زندگی

میں انقلاب کا دھارا کسی اور رخ پر چل پڑتا حالات نئی کروٹ لیتے۔ لیکن گرتے ہی اس کی توجہ

ہٹ کی طرف مبذول ہو گئی اور اس کو یہ بھی معلوم نہ ہوا کہ شہزاد اس پر جھگی ہوئی ہے اور

اسے اسی برہنہ نگاہ سے دیکھ رہی ہے۔

کچھ دیر کے بعد ایلی چارپائی پر پڑا ہوا تھا وفتا“ اسے خیال آیا کہ اس وقت اسے کیا ہو گیا

تھا نہ جانے کیا ہو گیا تھا۔ عجیب سی وحشت تھی عجیب سی“ اس وقت اسے ایسے محسوس ہو رہا تھا

جیسے شہزاد کا بھت ہو اور وہ خود رچھہ کتنے خطرناک عزائم لئے وہ اس کی طرف بڑھ رہا تھا۔

اور شہزاد نے جب مرکز اس کی طرف دیکھا تو اس کی نگاہ میں کس قدر خوف تھا — لیکن

اس خوف میں لذت کی جھلک تھی وحشت بھری لذت اور پھر وہ نگاہ جو شہزاد نے اس پر ڈالی تھی

بہرہ گر پڑا تھا۔ کیا شہزاد خواہش کے مجذوبانہ اظہار کو پسند کرتی تھی لیکن وہ تخلصیے میں بھی

ذات کے اظہار سے گھبراتی تھی وہ تو آرزو کی ہلکی پھلکی کی دلدادہ تھی۔ موسلا دھار بوجھاڑ کو وہ

کیسے پسند کر سکتی تھی۔ لیکن اس وقت — ایلی کو کچھ سمجھ نہیں آ رہا تھا۔

کیا کبھی عورتیں ایسی ہوتی ہیں آرزو کے ہلکے سے اظہار کو ناپسند کرتی ہیں۔ براماتی ہیں۔

مگر مجذوبانہ وحشت بھری خواہش کے اعلانیہ اظہار کے روبرو انکار رکھ رکھاؤ احتیاط ضبط سب

اٹھاپاش ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی نگاہ میں فخر بھری انبساط جھلکتی ہے اور ایک ساعت کے لئے

انہم دنیا اور پابندیوں سے آزاد ہو جاتی ہیں۔

ایلی نے کئی ایک مرتبہ دیکھا تھا کہ وہ شہزاد جو خواہش کے عملی اظہار سے ڈرتی تھی۔ اور

تخلصیے میں بھی اس سے بچنے کی کوشش کیا کرتی وحشت بھرے اعلانیہ اظہار پر اس میں ایک

لبیکینٹ پیدا ہو جاتی جیسے سانپ کو دیکھ کر چوبیا بموت ہو کر بے حس ہو جاتی ہے اور پھر

اس عالم میں شہزاد کو بھول جاتا کہ وہ شریف کی بیوی ہے چارپائیوں کی ماں ہے اور — گویا

مگر کچھ بھول جاتا تھا اور وہ بے پروا بے خوف ہو کر میدان میں آکھڑی ہوتی دعوت دیتی کہ وہ

حشت طوفان بن کر چلے لیکن ایسے مواقع پر ایلی گھبرا جاتا تھا۔ اور قدم پیچھے ہٹا لیتا تھا۔ یہ دیکھ

ہاں سر۔ ”فرحت مسکرائی۔ ”نوکری گھر بیٹھے تو نہیں ملتی انسان تلاش کرتا ہے جو تے نوکری۔“ لیکن یہ تو اور باتوں میں کھویا بیٹھا ہے۔“
 ”اب تو چھوڑ اس بات کو۔“ ہاجرہ بولی ”اللہ کرے امر تر نوکری مل جائے۔“
 لیکن دور ملے تو اچھا ہے ”فرحت نے کہا ”امرت سے تو روز ہی آجائے گا۔ یہ نوکری مل لگی تو چلے گی نہیں۔

ایلی نے امر تر جانے کی تجویز نہ سوچی تھی۔ اسے خیال نہ تھا کہ وہ امر تر جائے گا۔ اور ایلی کی بات تو ایلی نے ویسے ہی چلا دی تھی۔ ساری بات ہی عجیب تھی۔ اسے ابھی تک معلوم نہ تھا کہ امر تر جا کر کرے گا کیا۔ کہاں ٹھہرے گا۔ کدھر جائے گا بات اس کے منہ سے یوں ہی لگی تھی جیسے میز پر پڑا پستول آپ ہی آپ چل جائے۔ اور حیرت کی بات تھی کہ اسے اس پر تعجب محسوس نہیں ہو رہا تھا۔ آخر امر تر کیوں۔ جانا ہی تھا تو لاہور جاتا۔ لیکن لاہور اب ایک نئے خوش کن جگہ نہ رہی تھی۔ لاہور سے بڑی خوشگوار یادیں وابستہ تھیں جو اس کے لئے بھٹ تکلیف تھیں۔

امرت پہنچ کر بھی اسے شعوری طور پر احساس نہ ہوا کہ وہ وہاں کیوں آیا ہے۔ بہر صورت وطن انداز سے آوارہ گھومتا رہا۔ ہال بازار میں چار ایک چکر کاٹنے کے بعد وہ کمپنی باغ میں جا بند رہ گیا وہ بیٹھا لوگوں کو دیکھتا رہا پھر آموں والی کوٹھی کی طرف چلا گیا۔

آموں والی کوٹھی ویران پڑی تھی۔ دیواریں بوسیدہ ہو چکی تھیں دو ایک کمروں کی چھتیں بھی ہوئی تھیں۔ صحن میں گھاس پھوس اکی ہوئی تھی۔

سڑک کے کنارے وہ ایک ٹوٹے ہوئے پل پر بیٹھ گیا۔ پرانی یادیں ایک ایک کر کے اس کے ذہن میں تازہ ہو رہی تھیں۔

روٹی میں رسوئی اور چھو کرے چل پھر رہے تھے۔ رسوئی کھیر پکانے میں مصروف تھا۔ کھیر کی گاڑیں قطار میں پڑی تھیں۔ سکھ لڑکے کیس سکھا رہے تھے۔ بنگالی باپو پرنسڈنٹ کے کمرے سے پھلی تلنے کی بو آ رہی تھی۔ پھر دفعتاً ”آف آگیا وہ اسے دیکھ کر مسکرائے گا۔“
 ”نور آئے گا۔“ نور کا نام سنتے ہی گویا لڑکوں سے بہار آگئی۔ آموں پر بور آگیا۔ کوئل کو کئے گئی۔

کرشنراد کے انداز میں ہلکی سی تحقیر جھلکتی جیسے کہہ رہی ہو۔ بس اتنی ہی جرات تھی۔ مگر ایلی کو صرف اس لئے پسند کیا تھا کہ اس نے دو تین مرتبہ جرات کا اظہار کیا تھا۔ شام جب اس نے ضد سے سادی کا سلگا ہوا سگرت حاصل کیا تھا۔ دوپٹہ جھینا تھا اور اس رات جب وہ لاہور کے بعد سفید منزل میں لوٹ آیا تھا۔ سادی کتنی عظیم شخصیت تھی اس کی وہ بے نیازی وہ مہر وہ رعینہ۔ ایلی نے آہ بھری۔ سنہ جانے کیوں رات کے اندھیرے میں تنہا مٹلے کے اس قدر قریب ہونے کے باوجود اس نے کبھی خواہش محسوس نہ کی تھی وحشت اور بزدلی اظہار کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ سادی کے متعلق سوچتا تو ایلی کا دل بیٹھ جاتا۔ اسے دکھ ہوتا اور اس کی توجہ پھر والد صاحب کی طرف مبذول ہو جاتی۔ اس پر ایک اور قسم کا جنون سوار ہو جاتا اور پھر وہ چاہتا کسی اور طرف توجہ مبذول کرے اور یوں اپنے آپ کو محفوظ کر دیتا۔ لیکن اس کی توجہ مبذول نہ ہوتی اور وہی دیوانہ پن اس پر مسلط ہو جاتا۔ اور اس کا جی چاہتا کہ سادی دنیا سے اختتام لے۔ اپنے آپ کو تباہ کر دے۔ کسی اندھے کنویں میں چھلانگ لگا دے اور عین کی طرح غلاطت میں لت پت ہو جائے۔ اس وقت شہزاد مڑ کر ایلی کی طرف دیکھی اس کی آنکھوں میں وحشت بھرا خوف جھلکتا جو دفعتاً ”وحشت بھری لذت میں بدل جاتا۔ اور وہ گرے ہوئے ایلی کی طرف بڑھتی۔ اس کے کپڑے تار تار ہو جاتے۔ دمچیاں ہوا میں اڑتیں۔ شہزاد کے بلوری جسم سے گلابی شعاعیں نکلتیں اور قریب اور قریب۔ اور قریب پھرنے اور رنگ کی ایک بو چھاڑ پڑتی اور وہ لت پت ہو جاتا۔

ایلی کے دل میں ایک پوشیدہ خوفناک عزم پیدا ہو رہا تھا۔ جس کی نوعیت سے وہ خود بھی واقف نہ تھا۔

جب وہ چلتے پھرنے کے قابل ہوا تو ایک روز سوچے سمجھے بغیر وہ ہاجرہ سے کہنے لگا۔
 ”اماں میں امر تر جاؤں گا۔“

”امرت سے۔“ ہاجرہ حیرت سے اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ”امرت کون ہے۔“ وہ بولا
 ”کس کے پاس جاؤ گے۔؟“

”مجھے معلوم ہوا ہے کہ وہاں ایک نوکری ہے۔“
 ”نوکری“ ہاجرہ نے سینہ تمام لیا اس کی باچھیں کھل گئیں۔ ”ہے تجھے نوکری مل جائے؟“
 کتنا اچھا ہو۔ تیرا خیال بٹ جائے۔ شغل میں لگ جائے اور ہمیں چار پیسے مل جائیں۔

ورنہ شادی کا چوبارہ ہو اور موٹروں سے خالی ہو۔ پڑاوی بننے لگا اور پھر ایللی کی طرف جھوٹا بولا "اے بابو جی اگر جو کسی کو خنجل نہ آئے تو پھر دوس سے کیا سلوک کیا جائے۔" ایللی سرگرمی سے "اے سمجھا رہا ہوں کہ بھائی میرے دو روح سے شادی کی طبیعت اچھی نہیں اس لیے پانسو بچپن کے سگرٹ کے ڈبے آج نہیں بکیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسل "طبیعت خراب ہے۔" ایللی نے کہا۔

"یہی تو میں کہہ رہا تھا بابو جی۔"

"اچھی نہیں بابو جی بڑی ضد والی ہے طبیعت اچھی نہ ہو تو گاہک سے نہیں ملتی۔"

یہ بن کر ایللی کو سو جھی پھر وہ اس چوبارے کے سامنے کھڑا تھا۔ جہاں پہلے تم اور ہم رہتے تھے۔ اور اب خالی پڑا تھا۔ دیر تک وہ اسے غور سے دیکھتا رہا۔ پھر جو اس نے دیکھا تو اس کے سامنے ایک ہی چوبارہ تھا۔ سامنے الماس کھڑی ہنس رہی تھی۔ "آ جاؤ" وہ بولی "تم تو میرے نام ہو الیاس اور الماس میں کیا فرق ہے۔ میں الماس ہوں باقی نہیں چند روز الماس بن کر بیٹا پھر تو" وہ آہ بھر کر بولی "باقی بن کر جانا ہی پڑے گا کیوں حسی" وہ آٹکا کے بھائی سے پوچھ کر "جانا ہی پڑے گا نا۔" میرے ایسے نصیب کہاں کہ بیٹھے کے لئے الماس بن کر تیرا قدموں میں پڑی رہوں۔"

دفعتا "الماس کا چہرہ بدل گیا اور ایک اتنی بڑی نتھ والی لڑکی اس کی جگہ آکھڑی ہوئی اس نے آہ بھری۔

"شادی بن کر جینا میرے نصیب کہاں۔ تم دیکھتے کیا ہو" وہ بولی "شادی گھر ہی ہے۔ ایللی کی طبیعت اچھی نہیں۔"

پھر وہ شادی کے چوبارے کی میز چھایاں چڑھ رہا تھا جیسے واقعی شادی نے اسے بلایا ہو۔ کہاں میں ایک موٹے سے میرا لٹی کو دیکھ کر وہ گھبرا کر رک گیا۔

پیغام بر

"کون ہے" میرا لٹی نے فرعون بن کر پوچھا۔ ایللی چپکے سے دبا کھڑا رہا۔ پھر میرا لٹی نے زینے کی طرف آیا۔ "کون ہے" وہ چلایا۔ "میں ہوں۔"

میں کون؟" میرا لٹی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ایللی ہانپ رہی تھی۔ "اے میرا لٹی چلا کہ دوڑ کر واپس زینے سے اتر جائے لیکن اب واپسی کی بھی ہمت نہ تھی۔" ایللی نے "وہ بولا" مجھے شادی کو پیغام میں پیغام لایا ہوں۔"

میں نے "اندروں سے بڑھیا کی آواز آئی۔"

میرا لٹی بولا۔

میں کی طرف سے ہے۔" بڑھیا بولی۔

"اے آنے دو۔" ایک نوجوان لڑکی کی آواز آئی۔

میرا لٹی چل پڑا ایللی چپکے سے اس کے پیچھے پیچھے ہو لیا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا۔

کمرے کے دروازے پر پہنچ کر میرا لٹی رک گیا۔ شادی ہنگ پر لپٹی ہوئی تھی۔ "آ جاؤ" وہ حسی ہوئی آواز میں بولی۔ میرا لٹی چلا گیا۔

ایللی بات کرنے کے لئے منہ سنوار رہا تھا کہ بڑھیا آگئی۔

"کہاں سے آئے ہو۔" وہ تحکمانہ انداز میں بولی۔

"رہات سے آیا ہوں" ایللی نے جواب دیا۔

"رہات سے۔" بڑھیا چلائی۔

ایللی نے سر ہلا دیا۔

"کسی نے سمجھا ہے کیا۔"

"ہاں۔"

"کس نے؟"

"پیغام لایا ہوں۔"

"کس کا؟"

"اے بیٹھ کر ذرا دم تو لینے دو اسے۔" شادی نے کہا "تم جاؤ اماں۔"

پھر وہ ایک ساعت کے لئے کھڑی رہی پھر میرا لٹی کے بلانے پر چلی گئی۔

"بیٹھ جلد" شادی نے کہا۔

پھر میرا لٹی کے قریب بڑے صوفے میں ایللی بیٹھ گیا۔

اس کے روبرو ایک غبار حسین عورت لیٹی ہوئی تھی۔ چہرے پر تھکاوٹ کے آثار
 بیل بکھرے ہوئے تھے۔ قیض ڈھیلی تھی۔ آنکھیں خراب آلود تھیں۔
 ”نہیں نہیں یہ وہ شادی نہیں۔“ ایللی نے سوچا ”وہ ننھ والی شادی چار سال میں لا-
 ہو جائے۔۔۔ نہیں نہیں یہ کوئی اور شادی ہے۔“

”پیغام لائے ہو“ شادی نے ایللی کی طرف دیکھے بغیر پوچھا۔

”نہیں“ ایللی نے جواب دیا۔

”نہیں۔“ شادی چونک کر اٹھ بیٹھی۔

”اور تم تو کہتے تھے پیغام لایا ہوں۔“

”جھوٹ بول رہا تھا۔“

”ہائیں“ اس نے آنکھیں گھمائیں۔ ”سچ“

ایللی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”جھوٹ کیوں بولا۔“

”نہ بولتا تو مجھے آنے نہ دیتے۔“

”کیا آنا اتنا ہی ضروری تھا۔“

”اس سے بھی زیادہ۔“

”ادہ۔۔۔ اچھا“ وہ قریب تر ہو گئی۔

ایللی نے انگلی ہونٹوں پر رکھ کر باہر کی طرف اشارہ کیا۔

دونے

شادی نے آنکھوں سے اثبات کا اظہار کیا۔ اس وقت بالی یوں مسکرا رہی تھی۔ ”جیسے“
 اکٹھے مل کر شرارت سوچ رہے ہوں۔

”چار سال پہلے“ ایللی نے کہا ”تو مجھ سے ملی تھی۔“

”سچ۔“

”ہاں اتنی بڑی ننھ تھی تیرے ناک میں۔۔۔ دلی پتلی تھی تو۔“

”اور ملی کیوں تھی۔“

”نہ ایک ریٹھی گھڑی مجھے دی تھی۔“
 ”نہی۔“

”ہاں۔“
 ”میں نے تو کبھی کبڑے نہیں بیچے۔“ وہ ہنسی۔

”پوچھو بڑائی کی نہیں تھی۔ اس پر اتنی لمبی چوٹی تھی۔ اور تو نے وہ گھڑی میری طرف
 پانچویں اور تیرے ساتھ بت سی لڑکیاں بھی تھیں۔ اس چوبارے کی ٹپلی منزل میں چاروں

لڑکیاں تھے اور صحن کے درمیان میری سائیکل تھی۔“

”اے اللہ“ وہ چونکی ”اچھا وہ تسلیم کے گھر مجھے یاد آیا۔“

”تم وہی شادی ہو کیا۔“

”ہاں۔“

”جھوٹ۔“

”کیوں۔“

”نہیں۔۔۔ کمال وہ زرد روسی لڑکی اور کمال تم۔“ ایللی نے حیرت سے اس کی طرف

دیکھا۔

”اے مجھے۔“ وہ خنجرے سے بولی۔

”پہنیں“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن کٹھڑے میں لوگ کہہ رہے تھے سارا شر پانگل ہو رہا

تھا۔“

”نہی۔“ اس نے ہونٹ ہونٹ بنائے۔ ”سب اپنے مطلب کے سیانے ہیں کوئی بھی پانگل

نہی۔“

”تو مجھے تو میں آیا تھا۔ میں نے کہا میں بھی ایک نظر دیکھ آؤں۔“
 ”نہی کیا دیکھا۔“

”میں نے اثبات میں اشارہ کیا۔“ سب کچھ دیکھا۔“

”میں نے جنون سے پوچھا کیا۔“

”اگلیں ہو جاتا ہے۔“

”نہی۔“

بات کے مبارک کا پیغام لے آئے۔ وہ ہنسی۔
 ایللی نے جھک کر سلام کیا۔

چاندنی کے کمرے میں اترا تو لوگ اوپر کی طرف دیکھ رہے تھے اس نے اوپر دیکھا جنگل
 کی مسکراہٹ تھی۔ ولین پر سائیں کے کھلے ہونٹوں سے لعاب نچک رہا تھا۔

بارش میں سے گزرتے ہوئے ایللی غور سے ہربائی کی طرف دیکھ رہا تھا جو بارے
 کی لہجہ کی سہ نشینوں اور جدید طرز کے مکانات کی بالکونیوں میں بیٹھی ہوئی تھیں۔
 بے سوزے خود داخل اور سنگار کی طرف غور سے دیکھ رہا تھا۔ ہربائی میں اسے شادی
 کی دیکھ رہی تھی۔ دیکھ رہی تھی جو عورت محروم دیکھ عورت۔ جس قدر ہائی اپنی نمائش
 قدر دیکھ رہی رہتی ہے جس قدر زنی سنوری دکھائی دیتی ہے اسی قدر پریشان حال ہوتی ہے
 ایللی۔

اے نکل کر دفعتاً اسے خیال آیا اب مجھے کیا کرنا ہے۔ وہ چونک پڑا۔ سوچنے لگا۔
 ہل آیا ہی کیوں تھا۔ ویسے ہی سیر کے لئے۔ کیا شادی سے ملنے۔ یہ کیسے
 مجھے تو شادی کا علم بھی نہ تھا پھر۔ اے کوئی جواب نہ سوجھا۔ اس نے اپنا قدم
 رلا۔

رے رے۔ ایک راہ گیر اس کی طرف جھپٹا اس نے ایللی کو بازوؤں میں تھام لیا۔
 ایک بار درمیان گرو گئے۔

اتنے درمیان کے عین کنارے پر کھڑا تھا۔

اٹھ گرو گئے! بدرو میں گرو گئے!! چاروں طرف سے آوازیں آنے لگیں۔

فت میں لت پت ہونے کا شوق ہے کیا۔ کوئی ہنسا۔

میں میں گرو گئے۔ کوئی چلائی۔

بڑا آجاؤ۔ میں یہاں ہوں۔ آرام باغ کے ایک چوبارے سے ایک بد شکل کسی نے
 کر نکل کر اسے آواز دی۔

نکل کر۔ چپک کے داغوں بھرا ہوس سے پھولا ہوا چہرہ اس کے روبرو آ گیا۔ یہ

دیکھنے والا۔

وہ ہنسی۔ جھوٹ! کوئی نہیں ہوتا۔

”جو بائی کے پاس آتے ہیں وہ نہیں آتے۔ جو شادی کے پاس آتے ہیں وہ ہو جاتے ہیں۔“
 ”تم ہو گئے ہو۔“ وہ ہنسی۔

”ہو گیا ہوں۔“ اس نے سنجیدگی سے کہا۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

”بیٹھو۔“ وہ بولی۔

ایللی نے نفی میں سر ہلا دیا۔

”کیوں۔“

”زیادہ پاگل ہونے کا فائدہ؟“

وہ ہنسی۔ ”تمہاری باتیں الٹی ہیں۔“

”الٹی نہیں سچی ہیں۔“

”کیسے؟“

”تم سے کون سچی باتیں کرتا ہے یہاں کوئی نہیں۔“

”یہ سچ ہے۔“ وہ بولی۔

”سبھی سچ تھیں۔“

”اے ہے میں نے تمہاری تواضع نہیں کی۔“

”لو“ وہ بولا۔ ”شادی سے ملا دیا اس سے بڑھ کر اور کیا تواضع ہو سکتی ہے۔“

وہ چل پڑا۔ اچھل کر شادی نے سلیر پن لئے اور ساتھ چل پڑی۔

”تیرا نام کیا ہے؟“

”ایللی۔“

وہ ہنسی۔ ”کیا نام ہے۔ کوئی سمجھ تیلی ہو“

”نہیک سمجھ۔“ وہ بولا ”میں تیلی ہوں تو عطر ہے۔“

شادی نے گویا اس کی بات نہ سنی۔

”پھر آؤ گے۔“ اس نے پوچھا۔

”کون آنے دے گا۔“

کیا لت پت ہو گا، لت پت ہونا تو مردوں کا کام ہے۔

”بند کمرے کی بات بھول گیا۔“ ایک بڑھیا لالھی شیکتی ہوئی آگئی۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔ اس کی بات نہ سنو۔“ ایک نے کہا۔

چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں آرام باغ کے چوباروں میں بیٹھی ہر کسی کی طرف دیکھ کر مسکرا رہی تھی۔

وہ رک گیا۔ اور مردانہ شان سے دانت بھیج کر بولا۔

”ہاں میں لت پت ہوں گا۔ کیوں میری مرضی — مجھے کون روک سکتا ہے۔ اگر آپ کی طرف جانے کے لئے روکائیں کھڑی کر دی گئی ہیں تو میں کنوئیں میں کودوں گا۔ لت پت ہو گا۔ لت پت ہوں گا۔ لت پت ہوں گا۔“ وہ اعلانیہ کبیوں کی طرف دیکھنے لگا۔

”کیا کہا باو“ ایک مزدور رک گیا ”کیا ہو گے تم۔“

”میں“ ایللی چونکا۔

”کہہ جو رہے ہو کچھ“ مزدور بولا ”میں سمجھا شاید مجھ سے کہہ رہے تھے۔“

”تم سے نہیں کہہ رہا“ ایللی نے جواب دیا۔ اور وہ دونوں کھڑے ہو کر سامنے کی کوئی کھڑی پٹھانی کی طرف دیکھنے لگے۔

”دیکھ باو“ مزدور قریب تر ہو گیا۔ یہ جو پٹھانی ہے نا یہ سامنے چوبارے والی ہے تو پانہ طریقے آتے ہیں کہ بس سمجھ لو آنکھیں روشن ہو جائیں پر اسے بیماری ہے۔“

”بیماری۔“ ایللی نے حیرت سے دہرایا۔

مزدور نے آنکھ ماری۔ ”وہی بیماری۔“ وہ بولا ”جو ہوا کرتی ہے۔“

کچھ دیر تو ایللی گھور گھور کر اعلانیہ کبیوں کو جانچتا رہا پھر دفعتاً اسے شرم محسوس ہوئی۔

کبیوں کی باتیں بھدی اور تنگی تھیں اور وہ محسوس کر رہا تھا جیسے چوکیوں پر ٹپکی جسم ڈھیر لگے تھے پلپلاتے جسم جو نکلیں۔ بڑی بری جو نکلیں۔ اس کا وہ مردانہ عزم ختم ہو گیا تھا۔

جھک گئیں دل دھک دھک کرنے لگا — پھر جو اس نے دیکھا تو وہ آرام باغ سے دور نکلا۔

پھر دفعتاً ایک عظیم شور سنائی دی۔ ادور دور پیچھے بہت پیچھے وہ چیخ رہی تھیں پانہ

”دیکھا باگ گیا۔“

”پتہ لپے کچھ ہوتا تو —“

”یہ مرد کا کام ہے —“

”بند کمرے ہی میں جانے گا —“

مگر اگر ایللی پل پر بیٹھ گیا۔ لوگ آ جا رہے تھے۔ ہر کوئی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔

اچانک اس کی سی مسکراہٹ، کوئی بات نہیں کی سی ہنسی۔ پیچھا کرتی ہوئی نگاہیں۔ اس نے

ہنسی کی جیسے آرام باغ والیوں نے انہیں سب کچھ بتا دیا ہو سب کچھ۔

ظلم جیسی

کئی ایک بار وہ آرام باغ میں ادھر سے ادھر تک اور ادھر سے ادھر تک آیا گیا۔ کئی مرتبہ

ہاتھ شید کو شش کی کہ کسی چوبارے کے زینے پر چڑھ جائے لیکن عین قریب پہنچ کر نہ

لے کیا ہو جاتا۔ وہ محسوس کرتا جیسے سبھی اس کی طرف دیکھ رہے ہوں۔ دوکان دار، راہ گیر،

ٹہن اور کیسیں۔ یہ محسوس کر کے وہ گھبرا جاتا اور آگے چلنا شروع کر دیا۔

اس نے کئی مرتبہ ان میں سے ایک کا چناؤ کیا۔ کئی مرتبہ ”اچھا یہ ٹھیک ہے یہ والی واپسی پر

اٹ گا تو سیدھا اوپر چڑھ جاؤں گا۔“ لیکن جب وہ واپس آتا تو وقت پر نہ پہچان نہ پاتا اور پھر

لے نکل جاتا اور پھر جب وہ آگے نکل جاتا تو اسے خیال آتا ”نہیں یہ تو اچھی نہیں۔ اس کی

تو توجہ باک ہیں، تنگی نگاہیں، دیکھو تو کیسے چھاتیاں ہلا کر آگے کو بڑھاتی ہیں۔ لاجول دلا

ایللی تنک کر چور ہو گیا۔ لیکن ابھی تک وہ آرام باغ میں گھوم رہا تھا۔ دوکانیں بند ہو چکی

تھیں۔ پٹائیوں کے گرد ہجوم اکٹھا ہو رہا تھا لوگ اوپر دیکھ رہے تھے اشارے کر رہے تھے

لیٹل سے دام چکا رہے تھے کیسیں مسکرا رہی تھیں با آواز بلند گالیاں دے رہی تھیں۔ ننگے

ٹائٹلٹ کر رہی تھیں۔

ایللی کے دل میں نفرت کا ایک طوفان پیدا ہو چکا تھا۔ ساڑھے گیارہ بج چکے تھے کسی چوبارے

بڑھنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ چونکہ پٹائی کی دوکان پر کھڑے تماش بینوں سے آنکھ بچا

کر اوپر چڑھتا تقریباً ناممکن تھا۔ وہ سب ایک دوسرے پر آوازے کس رہے تھے جہنمیاں رہا
رے تھے۔ اس کے باوجود ابلی وہیں ایک تاریک کونے میں کھڑا تھا۔ وہ اس گھٹ میں تھا کہ کب
کوئی دروازہ دکھائی دے جو لوگوں کی نگاہوں سے دور ہو لوٹ میں ہو اور وہ آنکھیں بند کر کے
کاتوں میں انگلیاں ٹھونس کر بیڑھیاں چڑھ جائے اس کا عزم اور بھی مضبوط ہوا جا رہا تھا۔ اس
عزم کی وجہ حصول لذت نہ تھی۔ وہ خواہش کی شدت سے بیقرار نہ تھا۔ بلکہ ان حالات میں
لذت اور عیش کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اس وقت ابلی خوف اور نفرت کے طے بے جذبات
کے جنگل میں بری طرح پھنسا تھا ان کسبوں کی طرف دیکھ دیکھ کر اس نے نفرت سے کہا
جھر جھری لی تھی اور اب وہ نفرت اس قدر شدید ہو چکی تھی کہ اسے کوڑے مار دی تھی۔ اور
مظلوم حبشی کی طرح کوڑے کھا کھا کر وہ خود کو مشتعل کئے جا رہا تھا۔

وہ کسبیاں در حقیقت اس وقت ابلی کی نگاہ میں وہ رہنمائی نہ تھیں بلکہ اس ابلی کورت
کی جج تھیں جہاں وہ آخری ایبل پیش کرنے جا رہا تھا۔
”مجھ میں لت پت ہونے کی ہمت ہے۔“

اس وقت وہ یوں محسوس کر رہا تھا جیسے میں نے دارو پنی رکھی ہو۔ اس کا سر گھوم رہا تھا
اس کی نگاہوں میں ستارے ٹکرا رہے تھے غلیظ جسموں سے گندگی کی بو چھاڑیں اڑ رہی تھیں
ہوئے سر۔ ڈھیر ہوئے جا رہے تھے۔ خون بتا ہوا خون۔ بازو اٹھے ہوئے تھے۔ ہاتھ ٹٹل رہے
تھے۔ ہتھکنپوں کی سونڈیں اس کی طرف بڑھ رہی تھیں تاکہ اسے گرفت میں لے لیں۔
پھر دفعتاً ایک چیخ سی سنائی دی کسی کٹے ہوئے دھڑکی چیخ۔ تمام فضا سرخ ہو گئی۔ وہ کس
سے یوں باہر نکل آیا جیسے اسے کوئی بھی نہ دیکھ رہا ہو۔ جیسے کسی کے دیکھنے یا نہ دیکھنے سے کچھ
فرق نہ پڑتا ہو۔

زینہ چڑھتے ہوئے اس نے نیچے شور و غل کی آواز سنی وہ رک گیا اور اس نے دونوں ہاتھ
اوپر اٹھائے اور نعرہ لگایا ”لت پت زندہ باد۔“

ابلی کی نگاہ اوپر کی طرف اٹھی اوپر دروازے پر بھدا بد نما چہرہ اس کی طرف گھور رہا تھا
چاروں طرف سے چپک کے داغوں کی بو چھاڑ پڑ رہی تھی۔

پھر وہ بد نما بھدا بد نما چہرہ پھیلنے لگا۔ گویا چپک کے داغوں کا بھرا تھل کسی نے ابلی کی
پسینے اور گوشت کی مکروہ بو۔ سرکٹ کرنے جلنے کہاں گر گیا لاش۔ ٹھنڈے گوشت کی

مقام حبشی نے کوڑوں کی ایک بو چھاڑ محسوس کی۔ بو کا ایک رپٹا آیا۔ جوش اور غصے
نے آنکھیں بند کر کے چھلانگ لگا دی۔ تعفن کی وجہ سے اس کا سر پھٹا جا رہا تھا۔ چھیننے
پہننے اور پھر ایک ہوائی۔

اور پھر وہ نیچے فقیر کی طرح کچھو میں لت پت تھا۔ شرم سے اس کی گردن لٹک گئی تھی۔
اپنے آپ سے گھن آ رہی تھی۔

گھٹ کا بد نما سند رپٹ رہا تھا۔ ایک کمرہ منظر چہرہ ابھر رہا تھا۔ بد نما دانت۔ رینگتی ہوئی
ہاں آنکھیں۔

ہر کوئی اسے تسلی دے رہا تھا۔ اپنا گھر ہو اپنی عورت ہو۔ اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔ یہ چیز
اب ہرے کی ہے۔ غناغٹ کی نہیں۔

”پخت کا کھیل ہے۔ سووے کا نہیں۔ محبت کا۔“

”پلے پلے ایسا ہی ہوتا ہے۔ پھر ٹھیک ہو جاتا ہے۔“

”پلے پلے لاشی مارنے کا شوق ہوتا ہے۔ لاشی تو ٹیک نیک کر دھری جاتی ہے۔“

ابلی کو اپنے آپ سے بو آ رہی تھی۔ اس کمرے سے وحشت ہو رہی تھی۔ اس میں اتنی
گند تھی کہ سر اٹھا کر دیکھتا کہ کون اسے تسلیاں دے رہا ہے۔ اس کی باتیں سننے کی اسے
شدت تھی۔ چسکیں بھرنا۔ ٹیک نیک کر چلنا یہ سب اس کے لئے بے معنی تھا۔ ابلی یوں
کہا رہا تھا جیسے گندم کا دانہ کھانے کے بعد وہ تنگا ہو۔ احساس گناہ اور احساس پستی چاروں
سے پوش کر رہے تھے۔

بوتل اپنا جام

بوتل اپنا جام
بوتل اپنا جام

بوتل اپنا جام
بوتل اپنا جام

لئے بے تاب تھے۔ وہ لیٹ گیا۔ یوں لیٹ گیا جیسے خود ایک لاش ہو گئے ہوئے سر کی لاش تھوڑی اور بدلو سے بھری گلی سڑی لاش۔

جب وہ محلے میں پہنچا تو تین بجے تھے۔ فرحت کی ڈیوڑھی بند تھی۔ وہ وہاں بیٹھ گیا۔

شاید شہزاد کا دروازہ کھلا ہو۔ اسے دو ایک مرتبہ خیال آیا۔ لیکن وہ شہزاد کی طرف جانا نہیں چاہتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس سے بو آ رہی ہے اور وہ اب اس قابل نہیں کہ شہزاد کی طرف جائے۔ ایک کراہتے ہوئے مظلوم حبشی کا قصر شاہی میں ملکہ کے رو بہ رو جانے سے کیا مطلب۔

دیر تک وہ وہاں بیٹھا رہا۔ پھر اس نے سوچا۔ دیکھوں تو سہی — چاہے اندر نہ جاؤں۔ دیکھوں تو سہی۔ وہ اٹھ بیٹھا۔

شہزاد کا دروازہ بند تھا۔ اس نے آہستہ سے اسے آزمایا شاید کھل جائے۔

”کون ہے۔“ اندر سے رابعہ کی آواز آئی۔ وہ خاموش رہا۔

”کون۔“ رابعہ پھر چلائی۔

”میں ہوں ایللی۔“

”تو ہے ایللی۔“ وہ بولی ”غصہ ذرا۔“

دروازہ کھل گیا۔ وہ چپکے سے اوپر چڑھ گیا چوبارے کے سامنے صحن میں صرف دو چار پائیاں بچھی ہوئی تھیں۔ ایک پر بچیاں پڑی تھیں دوسری پر شہزاد تھی۔ وہ بے خبر سو رہی تھی۔ ایللی نے چاروں طرف دیکھا۔ لیکن بیگم کی چارپائی کیسے دکھائی نہ دی۔ پھر وہ چوبارے کے اندر گیا۔

دوسرے چوبارے میں۔ اور بالا خرچہ پست پر چڑھ گیا لیکن بیگم کا کیس نشان نہ تھا۔ واپس آ کر وہ شہزاد کے قریب کھڑا ہو گیا۔ وہ یوں پڑی تھی جیسے جھوٹ موت آنکھیں بند رکھی ہوں اور ویسے جاگتی ہو۔ اس کی پیشانی کا تل چمک رہا تھا۔ بازو چھاتی پر رکھے ہوئے تھے۔

غیض کے بٹن کھلے تھے کتنا روشن جسم تھا۔ جیسے پھولوں سے بنا ہو۔ عجیب سی ہاس آ رہی تھی۔

”یہ تو محبت کا کھیل ہے۔“ کوئی آہستہ سے بولی۔

”اپنی بوتل ہو اپنا گلاس ہو۔“

شہزاد کا جسم یوں دکھائی دے رہا تھا — جیسے بوتل ہو۔

ہاتھ مرنے کے لئے بوتل الٹی ہوئی تھی۔

منٹ منٹ نہیں۔ ”کسی نے اس کے کان میں کہا ”یہ تو چسکیاں لینے کی چیز ہے۔“

شہزاد نے کڑھائی لی اور ہاتھ سینے سے اٹھائے۔

ایللی کی نگاہ کھلے بٹنوں پر پڑی — حیرت اور خوشی سے اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ

ایللی بھول گیا کہ اس سے تعفن بھری بو آتی تھی۔ وہ بھول گیا کہ اس کے جسم سے چپک

ایللی ابھی تک چپے ہوئے تھے۔ وہ قریب تر ہو کر بیٹھ گیا۔

”کون۔“ کسی نے اس کے کان میں کہا ”لاٹھی تو نیک نیک کر رکھنے کے لئے ہوتی

ایللی نے آنکھیں بند کر لیں اور نیک نیک کر لاٹھی رکھنے لگا قریب اور قریب اور قریب

— خوشبو کا ایک رپلا آیا۔ نرم نرم لمس — ایک جھرجھری۔

ایللی نے اس کے گرد حائل ہو گئے۔

اعلم

اگلے روز ابھی وہ سویا ہوا تھا کہ علی احمد کا خط موصول ہوا جس میں انہوں نے لکھا ہوا تھا کہ

ملازمت ملنا مشکل ہو رہا ہے۔ اور گورنمنٹ نے آوی بھرتی کرنے کی بجائے تخفیف کی

پیشکش کی ہے۔ لہذا ایللی کو چاہیے کہ وقت ضائع نہ کرے اور سنٹرل ٹرننگ کالج میں داخلہ

لی کر کوشش کرے تاکہ اسے ٹیبکنیکل تعلیم حاصل ہو جائے اور ملازمت ملنے میں

تلاش پیدا ہوں۔

شہزاد کی تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایللی کے دل میں بڑی امیدیں تھیں۔ اس زمانے

میں گورنمنٹ کم یاب تھے اور پھر ایللی نے سینئر گرافر کا ملنا تو قطعی طور پر مشکل تھا۔ ایللی کا

تاکہ اسے ملازمت مل جائے گی۔

ایللی نے کئی ایک محکموں میں درخواستیں دے رکھی تھیں۔ دو ایک جگہ سے اسے انٹرویو کا

ٹکٹ آیا تھا مگر یہ خط اسے انٹرویو کے دن کے بعد موصول ہوئے تھے ظاہر تھا کہ دفتر والوں نے

تعمیل رکھنے کیلئے وہ خط دیر سے حوالہ ڈاک کئے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ مسلمان تھا

اور دفنوں پر ہندوؤں کا راج تھا۔ یا شاید دفن والے اپنے آدمیوں کے لئے مواقع پیدا کرنا چاہتے تھے ایک جگہ وہ دلت پر انڈیو میں پہنچ گیا تھا لیکن جب وہ پولیس کا سب انسپکٹر اس کے پاس دے رہا تھا تو ایلی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کس زبان میں بول رہا ہے اس کی انگریزی۔ پشتو اور پنجابی کا مرکب معلوم ہو رہی تھی۔ لہذا اس نے کوراچہ رکھ دیا تھا اور یہ ایک ٹین کے سینما ہاؤس میں جا کر تماشا دیکھنے لگا۔ حکمہ ریل کے ایک انڈیو میں اسے ایک سے مقابلہ کرنا پڑا تھا۔

یہ بڑے صاحب کی آرام کرسی کے ایک بازو پر بیٹھی ہوئی تھی۔ اور بڑا صاحب ہنس کر سے پوچھ رہا تھا۔ ”تم اس سے مقابلہ کر سکو گے۔“ ایلی نے جواب دیا تھا صاحب غلط گولائیوں میں تو نہیں البتہ سپیڈ میں کوشش کروں گا اور بڑے صاحب نے قہقہہ لگا کر ہنس لیا۔ ”سنا تم نے کیا کہہ رہا ہے یہ۔“ اور وہ مسکرا دی تھی اور پھر اس نے ایلی پر ایک بھری نگاہ ڈالی تھی ایسی نگاہ کہ ایلی کا دل چاہا کہ وہ ہاتھ جوڑ کر صاحب سے کہہ دے ”حضور چاہتا ہوں کہ مجھے اس مقابلے میں امیدوار تصور نہ کیا جائے۔“ اس کا نام روزی تھا اور اس کپڑوں سے وہ ایٹ روز کی خوشبو آ رہی تھی۔ پھر صاحب قہقہہ مار کر رہے تھے۔ ہمیں تم پر آئے ہو کیا نام ہے تمہارا۔ اگر اب کوئی جگہ خالی ہوئی تو ہم تمہیں بلا لیں گے۔ اپنا پتہ دفتر چھوڑ جانا۔“ پھر وہ روزی سے کہہ رہے تھے ”میں روزی اب اس سے ہاتھ تو ملاؤ۔“ اور یوں باہر نکلا تھا۔ جیسے اسے نوکری کے لئے چن لیا گیا ہو۔ اس روز وہ اتنا خوش تھا کہ غم کرنے کے لئے اسے ٹین کے سینما ہاؤس میں جانے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی تھی۔

اتنی بار کوشش کے باوجود وہ کامیاب نہ ہو سکا تھا۔ اب تو ایلی واقعی یاس ہوا جا رہا تھا اگرچہ نوکری پر جانے کی اس میں قطعی طور پر کوئی خواہش نہ تھی۔ ہاں اگر سلی ہوئی۔ اگر لبا انکار نہ کرتے اگر منصر سے تعلق قائم رہتا تو۔

لیکن اب — خصوصاً جب اسے اپنی بوتل اور اپنے جام سے واقفیت ہو چکی تھی جب وہ چسکیں لینا سیکھ رہا تھا۔ جب وہ لاشی ٹیک ٹیک کر چلنے سے واقف ہو رہا تھا۔ اب نوکری کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اہل اور بہن شدت سے مصر تھیں کہ وہ داخلہ لے لے۔ اور نوکری ہنس کر کہہ رہی تھی۔ ”دو گھنٹے کا تو فاصلہ ہے۔ صرف دو گھنٹے کا خواہ مخواہ کیوں دلتی رہا ہے۔“ یہ سنا کہ وہ آسکے تو میں جو ہوں۔ میرے پاؤں میں مہندھی لگی ہے کیا اب تو ہاتھ لگے۔

جب تجھے ہی اچھے نہیں لگتے تو پھر کیوں رنگوں میں اپنے ہاتھ۔“

مختل ٹینگ کالج میں جب وہ ایڈ مشن بورڈ کے سامنے پیش ہوا تو اس کے کوائف پڑھ کر بے ہوش ہو گئے۔

”ایلی تو آپ کا نام الیاس آصفی ہے۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”میرا کیا نام جان سکتے ہیں کہ آپ یہاں کیوں داخلہ لینا چاہتے ہیں۔“

”میں اسٹوڈنٹ چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”آخر کیوں۔“

”یہ ایک نوٹل پروفیشن ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہ آپ نے کب جانا کہ ٹیچنگ نوٹل پروفیشن ہے۔“

”جی جی۔“ وہ رک گیا۔ یہ تو میں اچھی طرح سے جانتا ہوں۔ دیر سے میرا مطلب

ہے میرے تمام بزرگ درس و تدریس میں۔“

”اسٹوڈنٹ کی خواہش کب سے آپ نے محسوس کی۔“ ایک اور صاحب نے وضاحت کی۔

”یہ تو میری پرانی خواہش ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر آپ نے پچھلے سال سٹوڈنٹ کیوں نہ کی۔“

”جی جی۔ میرا مطلب ہے۔“ ایلی کھینا نہ ہو کر رہ گیا۔

”نوجوان۔“ ایک اور صاحب بولے ”آپ سٹوڈنٹ گرافر ہیں بی۔ اے ہیں آپ کو معقول

ڈگری مل سکتی ہے لہذا یہاں داخلہ لینا بے کار ہے۔“

ایک اور صاحب بولے۔ ”ایسے کیسز پر غور کرنا سراسر غلطی ہوگی اس نوجوان نے بی۔ اے

لیکن پھر پھر یہ دونوں مضامین سکول کے مضامین نہیں یہاں ٹینگ میں آپ

ان کے مضامین لیں گے۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا۔

”جی میں سائنس لے سکتا ہوں میں نے دسویں سائنس ڈرائینگ میں پاس کی تھی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”جنگلیں“ کو نے میں بیٹھا ہوا انگریز پروفیسر بولا۔ ”تمہارا سائنس کا مبلغ علم۔“ اس نے

نگہ بھری کر دیا۔ ”مجھے تو اس سے بھی کم ہے۔“

ایلی کو علم نہ تھا کہ وہ آرام سڑانگ تھا اور سائنسی تحقیق میں بین الاقوامی حیثیت رکھتا تھا۔
 ”حضور۔“ ایلی چلایا ”میرے والد اور دادا عمر بھر پڑھانے کا کام۔“
 ”پڑھانا تم نے ہے۔“ بورڈ کے صدر نے کہا ”تمہارے والد نے نہیں۔“
 ایلی کچھ کہنے کے لیے سوچ رہا تھا کہ صدر بولا۔ ”یوے گو نکسٹ دن۔“

بینن لٹ

تمام امیدواروں کو کالج کے ہوسٹل میں رہنے کی اجازت تھی۔ وہ تعداد میں بہت زیادہ تھے اس روز ہوسٹل میں شور مچا ہوا تھا بہت سے امیدوار جنہیں داخل کرنے سے انکار کر دیا گیا تھا اپنا سامان باندھنے میں مصروف تھے ایلی بھی اپنا بستر باندھ رہا تھا کہ ڈارمیزی کا نوکر بچا اور مرے گزرا۔

”ارے گامے۔“ وہ چلایا ”یار آخری مرتبہ کی چائے تو پلا دے۔ سڑانگ ہو۔“

ایلی کے انداز گفتگو میں صاحبیت کا عنصر نہ تھا۔ عام طور پر امیدوار نوکروں سے یوں بات کرتے جیسے کوئی گورا کالا میں سے بات کر رہا ہو۔ وہ سب بی۔ اے، ایم۔ اے اور چونکے تھے۔ لہذا انہیں اپنی عظمت کا شدت سے احساس تھا۔

ایلی میں نہ جانے کیوں یہ بات کبھی پیدا نہ ہو سکی تھی۔ اس لئے نوکر یا ایسے ہی دوسرے ان پڑھ لوگ عام طور پر ایلی سے خوش رہا کرتے تھے۔

”آخری مرتبہ کیوں باہوچی۔“ گمانے پوچھا۔

”ارے یار گامے ہمیں تو چھٹی مل گئی۔“

”نہ باہوچی جباک نہ کرو۔“ وہ بولا۔

”ارے ٹھیک کہہ رہا ہوں بیوقوف اپنا تو پتہ کٹ گیا۔“ ایلی چلایا۔

”میں نے کہا باہوچی۔“ وہ جھجکتے ہوئے بولا۔

”کیا ہے؟“

”جو میں ایسی ترکیب لڑاؤں کہ بات بن جائے تو۔“

”بیوقوف۔“ ایلی ہنسا۔ ”ابے ہمارے والد صاحب نے چار سفارشیں پہنچائی تھیں ایک تھا

پوری چار سب بے کار گئیں۔ تو کیسی ترکیب لڑائے گا۔“

پھر دوسری بات مانو تو سمجھ لو بات پکی ہے۔“ گمانے دانت نکالے۔
 ”ایلی ہنسا۔“

”میں میں سے جاؤ نہیں بیٹھے رہو۔ آرام سے بیٹھے رہو باہوچی سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 ”یعنی خلو خلو بیٹھا رہوں۔ لوگ کیا کہیں گے۔“
 ”کئی کچھ نہیں کہے گا۔ کسی کو معلوم ہی نہ ہو گا۔“ گامے نے کہا۔

”اور اگر پرنسڈنٹ نے پوچھا۔“

”تو کہے بینن لٹ پہ ہوں۔“

”بے ٹن لٹ؟“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”کیا کہتے ہیں اسے جن کا پھیلہ ابھی نہیں ہوا۔“ گامے نے وضاحت کی۔

”پھل۔“ ایلی ہنسا۔ ”ویننگ لٹ۔“

”ہی۔ گمانات نکالے۔“ بات پکی سمجھو باہوچی مجھ پر اقیقن کرو۔“

”تجہ دن رہتا پڑے گا میں۔“

”میں کی آٹھ روج۔“

اس روز تو ایلی رک گیا لیکن اگلے روز اسے خیال آیا کہ ایک جاہل نوکر کی بات یوں اس آٹھ روز پڑے رہنا اونٹنوں۔ اس نے پھر سامان باندھنا شروع کر دیا۔ لیکن گامے کے اصرار پر ایک گیلہ پھر اسے خیال آیا چلو جانے کی جلدی کیا ہے۔ بینن لٹ نہ سہی آٹھ روز سینما

روز باندھ وہ کالج میں جاتا۔ بی بی کی کلاس میں تو بہت کم لڑکے تھے لیکن ایس۔ اے۔ وی ایس۔ اے۔ کارن پڑا رہتا تھا۔ اس لئے وہ ایس اے وی میں جا گھستا۔ اور پچھلی سیٹوں پر بیٹھ کر لڑکوں کے ساتھ بچ بچاتا۔ بوٹ زمین پر گھساتا۔ اور منہ بند کر کے گلے سے شی شی لٹا پیرا کرتا۔

ایلی اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں گھبراہٹ محسوس نہیں ہوتی تھی۔

”بھئی۔“ اسے تک وہ محسوس کرتا رہا تھا۔ وہ پرانا احساس کتری شدت کو بیٹھا تھا۔ یا شاید ابھی یہ تھی کہ بینن لٹ پر ہونے کی وجہ سے وہ اسے محض تفریح سمجھ رہا تھا۔

ایک دن جب ہنگامہ ہوتا تو پروفیسر غصے میں آکر حاضری کارجرسٹر منکوا لیتا اور پھر ان لڑکوں

ابا ہل صرف ایک روح اور۔ اگر آتے ہی بات نہ بنی تو سجا چاہیں دیں پر جون گئی تو ٹھونک بجا
 ابا ہل میں گئے۔
 لیکن یہ ہو گا کیسے۔ "ایلی نے پوچھا۔
 جس یہ نہ پوچھئے۔ "گائے جواب دیا۔

اگھیا

ایلی پور پہنچنے کے بعد دوسرے چوتھے روز ہی شہزاد نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اسے پٹنگ پر بٹھا دیا
 رڈ وہاں کھڑی ہو کر سنجیدگی سے کہنے لگی۔
 "ایلی یہ تمہیں کیا ہو گیا۔"
 "کیا ہو گیا ہے۔" اس نے حیرت سے دہرایا۔
 "یہ تم کیا کر رہے ہو؟"
 "کیا کر رہا ہوں۔ بیٹھا ہوں۔" ایلی نے دیا۔

"ہت کو مذاق میں نہ ٹالو" وہ بولی۔ "جب سے تم امر تر سے آئے ہو تمہارا انداز ہی بدل
 ہے۔ نگاہ بدل گئی ہے۔ تم نے مجھے کیا سمجھا ہے ایلی۔"

شہزاد کی آواز جذبات سے کانپ رہی تھی۔
 "میں سمجھتی تھی تمہیں مجھ سے محبت ہے۔" اس کی آنکھیں ننناک ہو گئیں۔ "چلو محبت
 کی۔ مجھ سے محبت کون کرتا ہے۔ اور۔ اور میرے پاس اب ہے ہی کیا جو میرے ساتھ محبت
 رکھے۔ لیکن لیکن پھر بھی میرا خیال تھا کہ تمہارے دل میں میری عزت ضرور ہے۔ لیکن۔"
 روکی لگی نکل گئی۔

"تربات کیا ہے۔" ایلی نے گھبرا کر پوچھا۔

"ہت۔" وہ غصے میں بولی۔ "تم تو مجھ سے یوں سلوک کرنے لگے ہو جیسے میں بازار میں
 ٹالہل۔ جیسے۔" وہ رک گئی۔ "بازار میں بیٹھی ہوئی بھی یہ برداشت نہ کر سکے گی۔"
 "روا چلتے ہوئے چھینرتے ہو۔ انگلیاں کھبوتے ہو۔ ہاتھ پائی کرتے ہو۔ سب کے سامنے
 "وہ رک گئی۔

ایلی کو سمجھ میں نہ آتا تھا کہ کیا جواب دے۔ "میرا خیال تھا کہ تم میں جرات ہے۔" اس

سے پوچھتا جن کے نام رجسٹر میں درج نہیں تھے کہ وہ جماعت میں کیوں بیٹھے ہیں۔ اس کا ہل
 باری لڑکے اٹھ کر اپنی شان نزول کی وجہ تسمیہ بتاتے۔
 "صاحب میرے کیس کا ابھی فیصلہ نہیں ہوا۔"
 "میرا کیس بھی زیر غور ہے۔"

"جی میرا نام تو چننا جا چکا ہے ابھی رجسٹر میں اندراج نہیں ہوا۔"
 پہلی مرتبہ جب ایلی سے پوچھا گیا اس نے جواب میں کہا۔ "جناب میں بیٹن لست
 ہوں۔"

"بیٹن لست۔" پروفیسر نے دہرایا لڑکوں نے قہقہہ لگایا۔
 "تمہیں کس نے بتایا کہ تم ویننگ لست پر ہو۔" پروفیسر نے پوچھا۔
 "جناب مجھے گائے نے بتایا ہے۔" ایلی نے سنجیدگی سے جواب دیا۔
 "گائے۔" پروفیسر ہلکتے ہوئے گھبرا گیا۔ "گائے کون۔"
 "ہمارا باورچی۔"

اس پر جماعت کے لڑکے قہقہہ مار کر رہے۔ ڈسکیں بجنے لگیں۔ سیٹیوں کی آوازیں
 ہوئیں اور پروفیسر ہلکتے ہوئے غصے سے احتجاجاً "کمرے سے باہر نکل گئے۔ ان کے جانے کے
 سبھی شور مچا رہے تھے۔ "ارے وہ بیٹن لست کون سا ہے۔" وہ سب محبت اور احترام
 نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ اور ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ کلاس میں
 کامرکز بننے میں کتنی لذت ہے۔

لیکن یہ سب کچھ محض تصنع تھا۔ اس میں کوئی شک نہیں ایلی کا وہ حجاب اٹھ گیا تھا
 بنیادی طور پر وہ ابھی تک وہی ایلی تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا ڈر اور خوف کے جذبات
 ایلی۔

آٹھ روز کے بعد کالج پندرہ دن کے لئے بند ہو گیا۔ پھر دفعہ "ایلی کو خیال آیا کہ ہاتھ
 تک بیٹن لست پر ہی تھا۔ اسے اپنے آپ پر غصہ آرہا تھا۔ کہ ایک نوکر کے کہنے پر وہ اپنے
 کو احمق بنائے ہوئے تھا۔

"صرف ایک روح کے لئے پاہی۔" گائے اس کی منتیں کر رہا تھا۔ "جب کالج بند
 صرف ایک روح کے لئے یہاں آجائیں صرف ایک روح کے لئے۔ جس اتنے دنوں

نے سوچ کر کہا۔

”جرات۔“ وہ ہنسی۔ ”جرات کی بات کر رہے ہو مجھ میں وہ جرات ہے کہ تم سب کو ہتھیار ڈال لو۔ جرات چھوٹی اور گری ہوئی باتوں میں نہیں ہوتی۔ تم نے ہمارا تعلق چھٹی کر دیا ہوئی بات بنا دیا ہے۔ کیا ہوس کے لئے جرات پیدا کروں۔“

اس کی آنکھوں سے آنسو گرنے لگے۔

”روتی کیوں ہو۔“ ایلی کچھ کہنے کے لیے بولا۔

”روؤں نہ تو کیا کروں۔“ وہ بولی۔ ”میں سمجھی تھی کچھ پایا ہے اب معلوم ہوا کہ کویا ہے۔“

”تم سمجھتے ہو میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے ہوس پوری کر دے کاشق فراہم کی آگ کو ٹھنڈا کرنے کی ہوس تھی۔“ الٹا میں نے تو ہوس پوری کرنے کے ذریعے ہوس توڑ دیئے میں نے اپنے خاوند سے تعلق توڑ لیا میں نے اس سے بات کرنی چھوڑ دی۔ منہ نہ کھولا۔ اور تم سمجھتے ہو کہ میں ہوس پوری کرنے کے لئے تمہاری طرف بڑھی تھی۔“ وہ روتی ہوئی کمرے میں گری خاموشی چھا گئی۔ ایلی چپ بیٹھا تھا۔

”میں بھی احمق ہوں۔“ وہ بولی ”جو یہ سمجھ بیٹھی کہ میں تمہاری نگاہ میں بہت کم ہوں۔ مجھے کسی کی نگاہ میں بہت کچھ ہونے کی ہوس تھی۔ میں نے سمجھا مجھے دو جہاں کی امان مل گئی۔ میں نے لوگوں کی نگاہ میں ذلیل ہونا گوارا کیا میں نے لوگوں کے طعنے سننا گوارا کیا میں نے اپنی ماں کی زبان سے وہ وہ لفظ سنے جو کوئی سن کر برداشت نہیں کر سکتا۔ میں نے تمہاری ماں بہن کے نیچے طعنے سنے اور ہنستی رہی۔ میں نے تمہارے طعنے سنے تم یہ سمجھتے رہے اور مجھے کہ میں ہر آتے جاتے کو مسکرا مسکرا کر اپنے دام میں پھنساتی ہوں۔ تاکہ اپنی ہنسی کو لفظ نہ سکوں۔ میں نے تمہارا جلا پا بھی برداشت کیا اور یہ سب کس لئے۔ کیا سلسلہ ملا مجھے۔ کہ اب مجھے۔۔۔ تم۔۔۔ اپنی ہوس کا شکار بنا رہے ہو تمہاری نگاہ میں میری کوئی وقعت نہ تھا۔ تمہارے لئے میں ایک دل بسلاوا ہوں۔ ہوس پوری کرنے کا ذریعہ ہوں۔“

وہ رونے لگی۔

ایلی چپ بیٹھا تھا۔

”یہ میری اپنی بد قسمتی ہے۔ خاوند ملا جو پہلے ہی کسی کی محبت میں پاگل تھا۔ اس نے مجھ

بھائی نہیں۔ جب بھی وہ میرے پاس آیا تو اس کی نگاہ میں نہیں انور ہوتی تھی۔ گویا وہ اپنے ہوتے تھے۔ وہ اور انور۔“ وہ یوں ہنسی جیسے چینی کا پیالہ ترختا ہے۔ ”اور میں میں نہ ہوں۔“ ایلی ساقی کے بغیر۔ انور سے ملانے کے لئے مجھے استعمال کیا جاتا تھا۔ اور تم سدا کو بھولنے کے لئے تم۔۔۔ مجھے استعمال کر رہے ہو۔“ یہ کہہ کر وہ روتی ہوئی باہر نکل گئی۔ ایلی چپ بیٹھا سوچتا رہا۔

اس کے ذہن میں ایک خلا پھیل رہا تھا۔ ایک دھند لگا۔

اس کے ذہن میں ایک خوبصورت عورت تھی۔ وہ اس کی طرف یوں دیکھتا تھا جیسے بچہ مٹھائی کی طرف دیکھتا ہے ایلی کی نگاہ میں شہزاد کے ماتھے کی بندی معدوم ہو چکی تھی۔ اس کی آنکھیں ایلی کی نگاہ سے گویا او جھل ہو گئی تھیں۔ ان کی بجائے شہزاد کے جسم کی گولیاں آتی تھیں۔ اس کے کولھے مٹکنے لگے تھے۔ اس کی کرریشی جھولنے کی طرح جھولنے لگی اس کی سڈول پنڈلیاں برہنہ ہو گئی تھیں۔ اس کی نگاہ میں شہزاد دیوی نہیں رہی تھی۔ شہزاد کرب اس کی جبین میں سجدے بیتاب نہ ہوتے تھے۔

لیکن ایلی اس واضح تبدیلی سے بے خبر تھا۔ اور اس سے بے خبر رہنے کے لئے اس نے کئی دلائل اور دلائل پیدا کر رکھے تھے۔

ایلی خود ہوس کار نہ تھا۔ اور ہوس کاری سے اس قدر بیگانہ تھا کہ محبت کا بہانہ بنائے بغیر وہ کوئی کاکھیل نہیں کھیل کر سکتا تھا۔ اس کی ہوس کاری درحقیقت جذبہ کسری سے بچنے کا ذریعہ تھا۔ شہزاد بھوکے نگاہیں ڈال کر وہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ وہ مرد ہے اور اس قاتل ہے کہ محبت کر سکے۔ درحقیقت وہ اپنی اہلیت کا سرٹیفکیٹ پیش کر رہا تھا۔

ایلی اس کی وجہ سدا سے محرومی ہو۔

اکاتل

ایلی دہل۔ بیٹھا رہا حتیٰ کہ سائے ڈھل گئے۔ شام پڑ گئی۔ پھر دیئے جل گئے اور لوگ اٹھ اٹھ کر لیٹ گئے لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا رہا۔

ایلی نے آکر شور مچا دیا۔ ”یہ کیوں بیٹھا ہے۔ اٹھ باہر آ۔ یہاں کیا کر رہا ہے تو۔“

ایلی کو خاموش دیکھ کر اس نے شنراؤ کو آوازیں دیں۔ ”دیکھ تو اسے کیا ہے۔ یہ کیسا بنا بیٹھا ہے۔“ ”کیا ہے۔“ شنراؤ داکٹائی ہوئی آواز میں بولی۔
 نوبچے کے قریب بیگم آکر بولی۔ ”بہ بدھ مہاراج یہاں آلتی پالتی مارے بیٹھے ہیں۔“
 پھر ہاجرہ اور فرحت آگئیں۔ وہ دونوں چیختی چلاتی رہیں۔ لیکن ایلی جوں کا توں رہا گیارہ بجے کے قریب شنراؤ آئی۔

”اب کیوں مجھے ذلیل کر رہے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”خدا کے لئے مجھے معاف کر دینا۔“
 غصے میں کیا کیا بک مگنی ہوں۔“
 ”نہیں تم نے تو کچھ نہیں کہا۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”تو پھر تم اس طرح کیوں بیٹھے ہو۔“
 وہ بولی۔

”میرا بس چلے تو میں اسے کاٹ کر تمہیں دے دوں۔“ وہ اپنا ہاتھ بڑھاتے ہوتے بولی۔
 ایلی نے شنراؤ کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”ہونہ۔“ بیگم اندر آکر ہنسی۔ ”یہاں تو کچھ اور ہی ہو رہا ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔
 شنراؤ نے بیگم کو دیکھ کر ہاتھ چھڑانے کی کوشش نہ کی۔ بلکہ دوسرا ہاتھ بھی ایلی کو دے دیا۔
 ”تو بے حیائی کی کوئی حد ہوتی ہے۔“ بیگم چلائی۔
 ”نہیں ام۔“ شنراؤ نے ہنس کر کہا۔ ”بے حیائی کی حد نہیں ہوتی حیا کی ہوتی ہے۔“
 ”تو بے لڑکی۔“ وہ چلائی۔ ”تو یہ گھر رنڈی کا چوبارہ بنا رکھا ہے۔“
 ”ہی ہی۔“ چوبارہ۔ ”وہ ہنسی۔

”کس طرح بیٹھوں۔“
 ”جس طرح روز بیٹھتے ہو۔ ہنسو کھیلو۔“
 ”کیسے کھیلوں کیسے ہنسوں کب تک ڈھیٹ بن کر ہنستا رہوں۔“
 ”چلو اب اٹھ بیٹھو۔“ شنراؤ نے پیار سے اپنا ہاتھ اس کے کندھوں پر رکھ دیا۔
 ”شنراؤ“ وہ بولا۔
 ”جی۔“

”شرم نہیں آتی“ بیگم بولتی کبھی ہوئی باہر نکل گئی۔
 اس کے جاتے ہی شنراؤ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گرنے لگے۔
 ”تمہیں پانے کے لئے ایلی مجھے نہ جانے کیا کیا دینا پڑے گا۔ لیکن میں سب کچھ دے دوں۔“
 ”سب کچھ۔“ خوشی سے لیکن تم میرے ساتھ ایسا سلوک نہ کرو۔ سب مجھے رنڈی سمجھتے ہیں۔“
 ”سمجھیں۔ لیکن تم مجھے رنڈی نہ سمجھو۔“ اس کی ہچکی نکل گئی۔
 ایلی کی نگاہ میں اس کے جسم۔۔۔ کی گونیاں سمٹ کر معدوم ہو گئیں۔۔۔ شنراؤ کا چہرہ
 سے ٹپٹپ ہو گیا۔ دیوی لوٹ آئی۔ اس کے ماتھے کا تل روشن ہو گیا۔
 اس روز شنراؤ کی باتوں نے ایلی کو چونکا دیا وہ ایک گہری سوچ میں پڑ گیا۔

”میری ایک بات مانو گی۔“
 ”کیا۔“
 ”چلو کہیں چلے جائیں۔“
 ”چلے جائیں۔“
 ”ہاں کہیں بھاگ جائیں۔“
 ”پاکل ہو گئے ہو۔“ وہ ہنسی۔ ”میرے ساتھ بھاگ کر۔ اپنی زندگی تباہ کر گئے کیا۔“
 ”ویسے بھی تو تباہی ہے۔“ وہ بولا۔

”ایسی باتیں نہیں کیا کرتے“ وہ اس قریب تر ہو گئی۔
 ”مجھ سے اب برداشت نہیں ہو۔“ میں پاکل ہوا جا رہا ہوں۔“
 ”ایسی باتیں نہ کرو۔“ وہ بولی۔ ”مجھے اکساؤ نہیں۔ اگر ایک مرتبہ میں نے برتن لے ڈالا۔“

جانی پل ”جو جی چاہے کرو۔ تمہارے بس میں ہوں۔“
 شہزادی آنکھوں میں محبت بھری چمک لہرائی۔ ”میں آؤں گی“ وہ بولی ”میں خود تم سے ملنے
 آئی گی میں لاہور آؤں گی۔“
 ”وہ بولا“ لاہور آؤں گی۔“

”م“ کے لئے میں سات سمندر پار جاسکتی ہوں یہ تو لاہور ہے۔“
 لاہور بورڈنگ پہنچنے ہی گما دوڑا ایللی کے پاس آیا۔ ”آگے باجوہ برا اچھا کیا میرا انعام ساتھ
 لے کر آئے۔“

ایللی نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔ کیا واقعی اسے اپنی بات پر اس قدر یقین تھا۔
 ایللی سمجھ میں نہ آ رہا تھا کہ یہ معجزہ کیسے رونما ہو گا۔
 اگلے روز جب ایللی کلاس میں پہنچا تو ایک نہیں چھ لڑکے غیر حاضر تھے وہ لڑکے جن کو چن لیا
 تھا اور جن کے نام رجسٹر میں درج تھے۔ دلفتا ”ایللی کی نگاہ سے گویا پردہ ہٹ گیا۔“

گمانہ لگا۔ ”باجوہی ہر بار ایسا ہوتا ہے کسی کو نوکری مل جاتی ہے کوئی کسی اور لین میں چلا
 آئے۔ کوئی ویسے ہی نہیں آتا۔ ہر سال دس ایک باجوہ چھٹیوں کے بعد نہیں لوٹتے۔ بس پھر جو
 باجوہ اس کا نام رجسٹر پر آ جاتا ہے۔ ہاں باجوہ جی تو ڈا خٹری ملاحظہ ہو گا۔ نہ جانے کتنے اس میں
 لگ جائیں گے۔“

پچھتے روز ہی ایللی نے جماعت میں شور مچا دیا۔ جی میرا نام آپ بولتے ہی نہیں میں بیٹھ
 نہ لا ہوں میرا نام رجسٹر میں نہ ہو گا تو حضرات کیسے پوری ہوں گی۔“ ایللی کا نام رجسٹر
 پر درج کر لیا گیا۔

شہزادہ شنگ کالج کی عمارت بھائی دروازے کے قریب ایک وسیع چوگن میں واقع تھی۔
 شنگ کالج کی عمارت تھی جس کے شرقی اور غربی پہلو میں بڑے بڑے لان تھے۔ شنگ کالج کی عمارت ایک وسیع دائرے میں بنی ہوئی تھی۔ صدر دروازے کے ارد گرد دو روہ
 راستے جن کے اوپر چوہارے بنے ہوئے تھے اوپر کی منزل میں بورڈنگ کے سپرنٹنڈنٹ لالہ
 غلام تھے نچلے کمروں میں ملاقات کا کمرہ۔ کومن روم اور دیگر کمرے تھے۔ ان کمروں سے
 لالہ کے بعد بورڈنگ کا وسیع صحن تھا جس میں لان بنے ہوئے تھے ایک باغیچہ تھا۔ لان کے
 کنارے ایک کوچی دیوار تھی جس میں سات دروازے کھلتے تھے۔ نیز دروازے کے اندر داخل

کیا یہ غلط ہے کہ کل کھوٹے کی غفلت مٹانے کے لئے میں نے اسے جیتنے کی کوشش کی تم
 اپنی انا کو تسکین دینے کے خیال سے اسے جیت لیا تھا۔ تو کیا مجھے ساری اور شہزادہ لالہ
 نہیں۔ تیم سے بھی تو مجھے محبت نہ تھی میں نے اپنے باپ سے انتقام لینے کے لئے اسے
 رچائی تھی۔ تو محبت کیا ہے کیا مجھے کسی سے بھی محبت نہیں ہے۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ
 اس کے باوجود ایللی کے دل میں شہزاد کا احترام تھا اس کی آرزو تھی لیکن ساری کے
 کے دل میں ایک جذبہ تھا۔ وہ چاہتا تھا۔ کہ اسے پالے اور پھر اس کے ساتھ ہی اس کے
 چھپی ہوئی آرزو تھی کہ وہ شہزاد کے سحر سے نکل کر نارمل زندگی بسر کرے ساری بات
 الجھاؤ تھی۔ اور اس الجھاؤ سے لکنا نامکن تھا۔ سوچ سوچ کر وہ تھک گیا اور پھر اس
 آپ کو حالات کے رحم و کرم پر پیٹک دیا چلو کہیں تو کنارے لگوں گا۔
 لیکن اسے معلوم نہ تھا کہ افق سے پرے ایک طوفان اٹھنا ہو رہا ہے۔

ایللی۔ اے۔ وی

پندرہ روز کی چھٹی گزارنے کے بعد واپس سنٹرل ٹریننگ کالج لاہور جانے کا سوال
 نہیں ہوتا تھا۔ ایک معمولی سے نوکری بات کا یقین کر لیتا۔ کتنی مضحکہ خیز بات تھی۔ اگر
 شہزاد ایللی سے بات نہ کرتی اگر وہ ایللی سے احتجاج نہ کرتی۔ اگر ایللی کی نگاہ میں شہزاد کا جہم
 رہتا اور اس کا ماتھے کا قتل ظہور نہ ہوتا اور وہ سوچ میں نہ کھو جاتا تو وہ غالباً لاہور نہ جا
 اس کی زندگی کا دھارا کسی اور طرف بہتا۔ لیکن اس ایک چھوٹی سی تفصیل نے حالات کار
 دیا۔

ایللی کو گامے کی بات کا چنداں یقین نہ تھا۔ وہ صرف اس خیال سے لاہور جا رہا تھا کہ
 روز کے لئے سینما دیکھیں گے۔ شاید کسی نوکری کا پتہ چل جائے۔ شاید شادی کے غفلت
 ملے۔ نہیں تو سیر ہی سہی۔

جب وہ روانہ ہونے لگا تو شہزاد آگئی۔
 ”تم اس قدر خاموش کیوں ہو“ وہ بولی ”میں کیا کروں اگر تمہارا ہاتھ نہ روک نہ
 نگاہ میں آپ گر جاتی ہوں اور روک دوں تو مجھے دکھ ہوتا ہے چونکہ تم برف کی طرح
 ہو۔ کیا کروں میں۔“

ہوتے ہی ایک بست لمبا صحن۔ جس کے ساتھ ساتھ ایک برآمدہ اور ایک بست لمبا کمرہ تھا۔
لمبا کمرہ ڈارمیٹری کمرہ تھا۔ اسی ساخت کی کل چھ ڈارمیٹریاں تھیں ہر ڈارمیٹری میں دو دروازے
کے رہائش کی جگہ تھی۔ ساتویں ڈارمیٹری میں کچن نوکروں کے رہنے کی جگہ اور ڈائٹنگ
تھی۔

چند ایک ڈارمیٹریوں میں ہر سیٹ کے بعد ایک چھوٹی سی پارٹیشن لگی تھی۔ یہ ڈارمیٹریاں
ٹی کے طلباء کے لئے مخصوص تھیں۔ پارٹیشن کے بغیر جتنی ڈارمیٹریاں تھیں وہ سب لڑکوں
دی کے طلباء کے لئے تھیں۔ بورڈنگ میں داخل ہونے کے لئے صدر دروازے کے علاوہ
راستہ نہ تھا۔ ڈارمیٹریوں کے گرد اونچی دیواریں بنائی گئی تھیں۔ باہر کھلنے والی کھڑکیوں پر لمبے
مضبوط جالی لگی ہوئی تھی۔

یہ بورڈنگ دوسرے کالجوں کے عام بورڈنگ کی طرح نہیں تھا۔ یہاں بست سی تختوں
پابندیاں تھیں۔ باہر کا مہمان بورڈنگ میں داخل نہیں ہو سکتا تھا۔ مہمان کو ملنے کے لئے (بڑے)
باہر ملاقاتی کمرے میں جانا پڑتا۔ رات کو دس بجے صدر دروازہ بند کر دیا جاتا اس کے بعد کسی
اندر آنے کی اجازت جا کر رجسٹر میں حاضری لگاتے اور غیر حاضر طلباء کی رپورٹ کی جاتی اور طلباء
طور پر غیر حاضر رہنے والے کو کالج سے نکال دیا جاتا۔ ایلی کو وہاں پورے آٹھ مہینے گزارنے تھے۔
اسی روز نہ جانے کیوں وہ چلتے چلتے ملاقاتی کمرے میں رک گیا اچھا خاصہ کمرہ ہے اس نے
سوچا۔ وہ صوفے پر بیٹھ گیا اور پھر سوچتے سوچتے نہ جانے کہاں جا پہنچا۔ اگر منصر لے آئے تو
یہاں آئے گا اور پھر —

”ارے تم۔“ جی کے اندر جھانکتے ہوئے چلایا۔

ایلی چونکا۔

”تم یہاں — کس سے ملنے آئے ہو۔ کیا مجھ سے؟“

”تم جی کے تم یہاں۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں تم سے پوچھ رہا ہوں۔ تمہیں کیسے معلوم ہو گیا کہ میں یہاں ہوں“

”تم یہاں ہو۔“ ایلی تعجب سے بولا۔

”تم کس سے ملنے آئے ہو۔“

”کسی سے بھی نہیں۔“

”تم پھر۔“

”جہلی میں یہاں ہوں۔“

”یہاں تو ہو لیکن کس طرح آئے ہو۔“ جی کے بولا۔

”جہلی میں اسی کالج میں ہوں۔“

”ایک کلمہ۔“

”ہاں تم بھی یہاں داخل ہوئے ہو۔“

”بالکل — لیکن یار یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ اتنے دن سے ہم دونوں یہاں ہیں اور ایک

رہے کو دکھا تک نہیں۔“

”تم تو بی بی میں ہو گئے۔“

”ہاں ہاں۔“

”میں تو ایسے وی میں ہوں۔“

”پھر بھی رہتے تو اسی بورڈنگ میں ہوتا۔“

”میں نے ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا اور کھینچتا ہوا اسے ملاقاتی کمرے سے باہر لے گیا۔ وہ تاج رہا

بانا تھا تائیاں بجا رہا تھا۔ ”یار یہ تو بہت اچھا ہوا۔ بہت اچھے بہت اچھے دونوں اکٹھے رہیں

لوہر کو لوہر۔“ وہ اسے ڈیوڑھی سے ملحقہ ایک کمرے کی طرف لے گیا۔

”یہ کدھر لے جا رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

ایک چھوٹے سے کمرے میں پہنچ کر اس نے ایلی کو کرسی میں بٹھا دیا۔ ”اب آرام سے

لو۔ وہ چائے پلاؤں گا تمہیں کہ ناؤ گھر بھول جاؤ گے۔“

”لیکن یہ کمرہ کس کا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میرا اپنا کمرہ ہے۔“ پال نے چھاتی ٹھونک کر کہا۔

”لیکن یہاں تو ڈارمیٹریوں میں رہتے ہیں سب۔“

”پڑے رہیں میں تو ان خچر پاتری اسٹبلوں میں نہیں رہ سکا۔ اور اب تم بھی یہیں رہو

”کیا مطلب؟“

”مطلب یہ کہ ابھی اپنا سامان یہاں منگوالو۔ دیے تو چار سیٹوں کے لئے ہے لیکن ہم اسے

بچہ اور خاموش تھیں اس کے باوجود ان کا توجہ کا مرکز ہوتا۔ وجہ فقط یہ تھی کہ اس زمانے میں کسی کالج میں مخلوط تعلیم رائج نہ تھی۔ سنٹرل ٹریننگ کالج واحد کالج تھا جس میں لڑکیاں لڑکوں کے ساتھ تعلیم پاتی تھیں۔ اسی وجہ سے گورنمنٹ اور مشن کالج کے طلباء بھی بھانے بھانے سنٹرل ٹریننگ کالج آیا کرتے تھے تاکہ ایک نظر انہیں دیکھ سکیں اور اگر ممکن ہو تو — شاید کوئی رات نکل آئے۔

بی بی کے پانچ چھ لڑکے تو ہر وقت ان کے گلے کا ہار بنے رہتے تھے۔ وہ جیب میں زائد پنسل اور قلم رکھتے اس بات کے منتظر رہتے کہ کب ان میں سے کسی کے قلم کی سیاہی ختم ہو یا پنسل کا مکڑ ٹوٹ جائے تاکہ انہیں پنسل یا قلم پیش کر سکیں۔

وہ بڑی محنت سے کلاس کے لکچروں کے نوٹ لکھتے اور بورڈنگ آکر ہا سناور کر انہیں نقل کرتے کہ شاید لڑکیوں کو نوٹ پڑھنے کی ضرورت محسوس ہو۔ جیب میں زائد رومال اٹھائے پڑتے نہ جانے کب کوئی لڑکی لان میں بیٹھنا چاہے تاکہ وہ فوراً رومال گھاس پر بچھا دیں۔ ان لڑکیوں کو کوٹ بردار کہا جاتا تھا چونکہ وہ لڑکیوں کے کوٹ اٹھاتے پھرتے تھے۔ اکثر لڑکے طنز سے انہیں دکت بردار کہا کرتے تھے لیکن حقیقت یہ تھی کہ کوٹ برداری ایک بڑا اعزاز سمجھا جاتا تھا اور کوئی لڑکی کسی کو اپنا کوٹ اٹھانے کے لئے وے دیتی تو وہ لڑکا پھولے نہ سماتا اور اس بات پر فخر کرنا دوسرے لڑکے اس کا مذاق اڑاتے درپردہ اسے تحسین بھری نظروں سے دیکھتے۔

ایلی کے لئے یہ محور قطعی طور پر دلچسپی سے خالی تھا۔ ان چھ میں نہ تو کوئی سادی تھی اور نہ ٹیڑھ۔ اور پھر وہ تھیں بھی کیا ایک دو تو والدہ قسم کی تھیں ایک دو وہ چیزیں بن چکی تھیں جو کہیں جمع ٹیک جمع دلاپن جمع جلی کئی نگاہ جمع نسوانیت کا فقدان کا مجموعہ ہوتی ہیں دو ایک البتہ فطرتاً ہی صورت تھیں مطلب ہے اچھی خاصی وہ خاموش رہتی تھیں۔ ہنسی نہ تھیں کہ کوئی ان کی باتوں کو التفات نہ سمجھ لے۔ آنکھیں نہ مٹکاتی تھیں کہ کوئی ان کی چٹون کی جنبش کو اشارہ نہ سمجھ لے کل کر بات نہیں کرتی تھیں کہ کوئی بات منہ سے نکل نہ جائے۔

ایلی کے کالوں میں ابھی تک سادی کی باتیں گونجتی تھیں اس کی نگاہوں میں شہزاد کے ماتھے والی عطر کی طرح چمک رہا تھا۔ لیکن اس کے باوجود ایلی کے لئے وہ چھ لڑکیاں جاذب نظر جماعت میں بیٹھے ہوئے وہ یہ آرزو کرتا کہ جلدی پیڑ ٹوٹ ختم ہو اور وہ برآمدے سے

ڈبل سیٹر بنالیں گے۔
”لیکن پرنسڈنٹ۔“

”لالہ جی۔“ وہ چلایا ”لالہ جی میری ہریات مانتے ہیں۔ ان کا فکر نہ کرو۔“
ایلی کا سامان اسی روز جی کے کمرے میں آگیا اور وہ دونوں وہاں اکٹھے رہنے لگے۔

چھ لڑکیاں

سنٹرل ٹریننگ کالج میں زندگی ایک محور کے گرد گھومتی تھی۔ اور یہ محور چھ لڑکیاں تھیں یہ لڑکیاں بی بی گھاس کی طلبا تھیں۔ دن بھر کالج کے وقت بی بی کے طلباء شدت سے محرم کرتے کہ وہ کلاس میں بیٹھی ہیں۔ ان کے منہ سے نکلا ہوا ایک ایک لفظ سن رہی ہیں۔ ایک ایک حرکت کو نوٹ کر رہی ہیں۔ صرف لڑکے ہی نہیں۔ بیشتر پروفیسر بھی ان کی موجودگی شدید احساس رکھتے تھے۔

ایس اے وی کے طلباء کو یہ احساس ہو تاکہ ساتھ والے کمرے میں لڑکیاں ہیں ایک ہی چھ۔ اور ان کے اپنے کمرے میں کوئی بھی نہیں۔ اور ابھی جب وہ حساب کا پیڑ ختم کرے برآمدے سے گزر کر جغرافیہ پڑھنے کے لئے جائیں گے تو راستے میں گزرتے ہوئے انہیں دیکھ گئے۔ وہ بچی نگاہ کئے بیٹھی ہوں گی۔ یوں کام میں منہمک ہوں گی۔ جیسے کچھ خبری نہ ہو مگر ان کے باوجود انہیں سب خبر ہو گی۔ ہر لڑکا یہ سوچتا کہ وہ اس کی چال دیکھیں گی۔ یہ دیکھیں گی۔ اس نے کیسے کپڑے پہن رکھے ہیں ٹائی کس رنگ کی ہے۔ بال کیسے بناتا ہے۔ اور اس کا لہجہ کس قدر رومانٹک ہے کالج سے فارغ ہو کر جب وہ بورڈنگ میں آتے تو آپس میں ان کے متعلق بحثیں کرتے۔

”بھئی مس رومو بڑی چالاک ہے بن دیکھے بات تاڑ جاتی ہے۔“
”یار آج مس میتا نے حد کر دی۔ دفعتاً ایسی نگاہ ڈالی کہ اپنے ہوش گم ہو گئے۔“
”آج مس راواہاشام کے ساتھ ٹک شاپ میں گئی تھی۔“
”اور وہ دیکھا تھا تم نے مس میتا نے کیسے کپڑے پہن رکھے تھے۔ یار بڑا لکسنری۔“
”اے۔“

وہ لڑکیاں چنداں خوب صورت نہ تھیں نہ ہی ان میں زندگی کی خصوصی چمک تھی۔

موٹی موٹی کتابیں

سنٹرل ٹرننگ کالج میں داخل ہوتے ہی ایللی پنجاب پبلک لائبریری کا ممبر بن گیا تھا جہاں سے اسے بیک وقت آٹھ کتابیں مستعار مل سکتی تھیں اور وہ ہر پینتے موٹی موٹی مختصم کتابیں جن کو لایا کرتا تھا ایللی نے کتابوں سے از سر نو دلچسپی پیدا کر لی تھی۔ اور اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لڑکے لڑکیوں سے کتابوں کی باتیں کیا کرتے تھے۔

”آپ نے فلاں کتاب پڑھی ہے کیا۔“

”فلاں مصنف نے تعلیم کے متعلق ایک انوکھی تصوری پیش کی ہے۔“

”نفسیات میں دلچسپی ہو تو فلاں مصنف کا مطالعہ کرو۔“

ایللی کالج کے اوقات میں کتابیں لانے کا خاص پروگرام بنایا کرتا تھا۔ اگرچہ اسے کافی لڑبا کر کاٹنا پڑتا لیکن لائبریری سے آتے ہوئے وہ ایسا راستہ اختیار کرتا کہ واپسی پر اسے کالج کے برآمدے سے گزرتا پڑے اور وہ کتابوں کے اس انبار کو یوں اٹھائے برآمدے سے گزرتا جیسے اسے خبری نہ ہو کہ وہاں بی بی کلاس میں لڑکیاں بیٹھی ہیں اور وہ اس کی طرف حیرت سے دیکھ رہی ہیں۔ جب وہ کتابیں اٹھائے ہوئے ہوتا اس وقت اس کے لئے ضروری ہو جاتا کہ وہ لڑکیوں کی طرف قطعی طور پر نہ دیکھے لیکن وہ اس انداز سے اٹھاتا کہ ان کی پشتیں واضح طور پر دکھائی دیں۔

جاہ کی صحبت کی بدولت ایللی چند ایک مشہور مصنفوں کی کچھ کتابیں پڑھ چکا تھا اس مطالعہ کی ابتداء برٹنڈرسل سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد اس نے کسلے ہالڈین شاپن ہارنٹیا کی چند ایک کتابیں پڑھی تھیں۔ پھر انصار منصر سے متاثر ہو کر اس نے داستودسکی اور انگریزی نظموں کا مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کے باوجود اسے مطالعہ سے براہ راست خاص دلچسپی نہ تھی۔ جب بھی سادی کی یاد اسے ستاتی تو وہ اپنی توجہ منعطف کرنے کے لئے نظمے یا برگستان کی کوئی کتاب پڑھنے کی کوشش کرتا یا جب کبھی شہزاد کے رویے سے وہ محسوس کرتا کہ وہ کسی دوسرے کی طرف متوجہ ہو رہی ہے تو وہ احتجاجاً ”کتاب لے کر بیٹھ جاتا اور بصد مشکل اس کے چار ایک صفحات پڑھتا لیکن پھر اسے نفس مضمون سے دلچسپی محسوس ہونے لگتی اور اس طرح اس کا مطالعہ منفی حیثیت چھوڑ کر اثباتی حیثیت اختیار کر لیتا مگر حال مطالعہ اس کے لئے محض فرار تھا۔

سنٹرل ٹرننگ کالج میں بھی اسے زیادہ تر دلچسپی کتابیں لانے اور ان کی نمائش کرنے سے نہیں کتابیں جو وہ لاتا تھا۔ تمام فلسفے سے متعلق ہوتی تھیں۔ یا فزیکس کے ایسے مسائل کے متعلق جن میں فلسفے کا رنگ حاوی تھا۔ ناول پڑھنے سے اسے چنداں دلچسپی نہ تھی۔ چونکہ ناول کا محض وقت کی داستانیں ہوتی تھیں اور پڑھتے ہوئے اسے شہزاد کا کمرہ یاد آجاتا سادی کے زمانے کی وہ بیڑمیاں جہاں وہ رات کے اندھیرے میں ملا کرتے تھے اس طرح مطالعے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اس سنجیدہ قسم کے مطالعے سے اس کے جذبات کی چھلکن تو دور نہ ہو سکتی البتہ ان کے چہرے پر عجیب قسم کی کرخشکی سی پیدا ہو گئی۔ جیسے زیادہ ابلے ہوئے انڈے پر ہوتی ہے اس کی لچرہ لبوزا ہوا جا رہا تھا ٹھوڑی ٹھٹکی آ رہی تھی۔ اور پیشانی پر گہری تیوری قائم ہوئی جا رہی تھی۔

شاہد ایللی ان نمائش کتابوں کو کبھی نہ پڑھتا لیکن جی کے کے طعنوں نے اسے مجبور کر دیا ان انہوں سے غلطی پانے کیلئے چارونا چار اسے ہر روز وہ کتابیں کھول کر بیٹھنا پڑتا۔

نی کے

نی کے کے ایک نہیں بلکہ دو مزاج تھے۔ وہ بیک وقت بے حد خوش مزاج اور بہت دکھی تھا۔ ان دو مزاجوں کی کھینچا تانی جی کے کی زندگی کا حاصل تھی۔ جب وہ چپ ہوتا تو بالکل خاموش ہو جاتا۔ اس کی طوطا نما خمدار ناک کی دیوار پر بد مزاجی کا ڈھیر لگ جاتا۔ اس کی چھوٹی ہانڈا آنکھوں میں دکھ کے انبار لگنا شروع ہو جاتے۔ جب وہ بات کرنے کے موڈ میں ہوتا تو وہ اٹھ کھڑے جاتا۔ شور مچاتا۔ مذاق کرتا۔ شوخ باتیں کرتا۔ اس وقت اس کی کیفیت یوں ہوتی جیسے اس کی بوتل کھل گئی ہو۔ چھینٹے اڑتے بلبلے اٹھتے اور سب کو بھگودیتے۔ یقین سے نہیں کہا جا سکتا کہ نی کے کا اصلی مزاج کونسا تھا اور نقلی کونسا۔

مخصوصت ایللی کے نزدیک جی کے کی سب سے بڑی خصوصیت اس کی انا پسندی تھی۔ وہ اپنے خیالات کو درست سمجھتا تھا اپنی بات کو حق تصور کرتا اپنے جذبات کو خارجی حالات کا مناسب ”عکس“ سمجھتا تھا۔

نی کے کی انی طور پر آقا طبیعت کا مالک تھا۔ اس کا برتاؤ محبت و رحمت کر خنکی خود اعتمادی اور انا پرستی کا مجموعہ تھا۔ وہ اپنے حلقے کا از خود سردار بن جاتا اور پھر سردار بن لیا جاتا۔ اس بات پر

ایلی کو بے حد غصہ آتا تھا۔ ایلی میں سردار بننے کی نہ تو ہوس تھی اور نہ اہلیست۔ وہ بھی اس کے پیچھے چلنے پر مجبور تھا لیکن جب پیچھے چلتا تو محسوس کرتا کہ اسے پیچھے چلنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ اور یہ زیادتی ہے۔ لہذا اسے غصہ آتا شروع ہو جاتا دراصل ذہنی طور پر ایلی میں شدت کی انفرامیت موجود تھی ذہنی طور پر ایلی مضبوط تھا لیکن طبعی طور پر بے حد کمزور اور بودا تھا اس لیے جی کے کی اتنا پرستی سے بے حد تالاں تھا۔

مثلاً "ایلی کی کتابوں کو دیکھ جی کے طنزاً" چلاتا۔

"ارے یہ کتابیں پڑھے گا کون۔"

"کچھ نہ کچھ تو دیکھ لوں گا۔" ایلی جواب دیتا۔

"کیوں ان میں تصویریں ہیں کیا۔" جی کے کی طنز شدت اختیار کر لیتی۔

"نہیں تو۔"

"تو پھر دیکھنے کا کیا مطلب؟"

"مطلب ہے کچھ نہ کچھ پڑھوں گا۔"

"یہ فرائیڈ۔ دانش۔ ایلس۔ جیم جینز ورڈز ور تھ۔ انہیں پڑھو گے تو تم۔ لیکن مجھے کون؟"

"تم جو ہو تمہاری مدد سے کچھ پتہ چل ہی جائے گا۔" ایلی طنزاً کہتا۔

"اونہوں۔ بجھی ہم تو حساب دان ہیں۔ حساب کا کوئی مسئلہ لے آؤ۔ لیکن یہ غلط اور نفسیات اور جنسیات یہ اپنے بس کا روگ نہیں۔"

جی کے کی ان باتوں کی وجہ سے ایلی کو لازماً ہر روز کسی ایک کتاب کو کھول کر بیٹھنا پڑتا۔ پھر وہ بھول جاتا کہ اسے صرف کتاب کھول کر بیٹھنا ہے پڑھنے کی چنداں ضرورت نہیں۔ پڑھنے کی جگہ وہ سادی کی خوش گہیوں کے متعلق سوچ سکتا ہے شہزاد کے حسین جسم کا تصور کر سکا ہے پہلوئے حور میں لنگور کے واقعہ پر غور کر سکتا ہے لیکن اس واقعہ پر غور کرنا تو ایلی کے لئے بے حد تکلیف دہ تھا۔ اب تو یہ صورت پیدا ہوئی جا رہی تھی کہ سادی کا خیال آنا نہ تو نہیں لگتی اور وہ شدت سے محسوس کرتا کہ سادی ہمیشہ کے لئے چلی گئی۔ نہ جانے کہاں چلی گئی۔ اگر وہ رہتی وہیں لاہور میں رہتی تو والد صاحب کا انکار بھی بے معنی ہو کر رہ جاتا۔ کوئی نہ کوئی صورت نکل ہی آتی۔

جی کے کو کالج کی ان چھ لڑکیوں سے قطعی دلچسپی نہ تھی۔

"لا حول ولا قوۃ" وہ چلاتا۔

"یہ لڑکیاں سب کے اعصاب پر سوار ہیں۔ اور پھر لڑکیاں کہاں وہ تو بیشتر عورتیں ہیں والدہ

یہ لڑکیاں۔ کیوں ایلی کیا تمہیں والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی ہو سکتی ہے۔"

جی کے کا سوال سن کر ایلی کا دل دھک سے رہ جاتا۔ اس کے روبرو صفیہ آکھڑی ہوتی اور

لپٹ جاتا ہاتھ اس کی طرف بڑھاتی۔ خاتم گورے گدے سے ہاتھوں سے اس کے گل

سلائی۔ ایلی کو والدہ قسم کی عورت سے دلچسپی نہیں بلکہ عشق تھا۔ عورت در حقیقت اس کے

ذہن میں بھرے بھرے جسم کی ایک گود تھی جس کے پہلوؤں پر بازو اور ہاتھ لٹکتے تھے جو سسلانے

اور چمکنے کے لئے بے قرار تھے لیکن ایلی نے کھلے طور پر اس شدید جذبے کو کبھی اظہار نہ کیا تھا۔

"لا حول ولا قوۃ" وہ گویا شدت جذبات کا اظہار کرتا۔ نہ جانے کیوں یہ سب پاگل ہو رہے

ہیں۔ کیوں پاگل ہو رہے ہیں۔ بتاؤ نا۔ بول۔" جی کے ترنگ میں آجاتا "جواب دو۔"

"یہ تو اپنی اپنی پسند ہے۔" ایلی کو جی کے پر غصہ آنے لگتا۔

"کیا مطلب" وہ چلاتا "نوجوان والدہ قسم کی عورتوں کو پسند کریں۔ عجیب بات نہیں کیا۔"

"نوجوان نہ کریں تو کیا بوڑھے کریں گے۔" ایلی جواب دیتا۔

"تم بھی بے وقوف ہو۔" جی کے جوش میں آجاتا۔

"ہم دونوں ہی بے وقوف ہیں۔ فرق صرف یہ ہے کہ تمہیں اپنی حماقتوں کا احساس

نہیں۔" بالکل غلط۔ "وہ چلاتا "تم ہو گے ہم تو نہیں۔ ہم تو دانش ور ہیں۔ دراصل یہ فرائیڈ پڑھ

پڑھ کر تم اپنے آپ کو تباہ کر رہے ہو۔ تم سے بات کرنا بے کار ہے تم نہیں سمجھ سکتے۔"

جی کے اٹھ کر اپنے کام میں مصروف ہو جاتا۔ وہ خاموش وہ جاتا۔ اس کی ناک پر بد مزاجی

کے ڈھیر لگ جاتے آنکھوں سے دکھ جھاٹتا۔ مظلومیت کی پھوار پڑتی۔

جی کے کی ایک اہم خصوصیت یہ بھی تھی کہ وہ اپنے آپ کو بے حد مظلوم سمجھتا تھا۔ اسے

یہ خیال تھا کہ وہ قربانی کا کبرا ہے۔ دوسروں کے مفاد کے لئے وہ اپنے خیالات یا مفاد کی قربانی نہیں

دیتا تھا سمجھتا تھا کہ دے رہا ہے۔ لہذا وہ اپنے آپ کو مظلوم سمجھتا تھا ایلی۔ اس قسم کے

خیالات سے اسے مستفید کرتا تھا لیکن اس کے باوجود ایلی سمجھتا تھا کہ وہ خیالات غلط ہیں۔ ایک

ٹھہر گیا ناچتی ہوئی سورج کی ایک کرن تھی۔ جہاں بھی وہ پہنچ جاتا وہ جگہ انبساط کے دو دھیا

لڑکیوں کے متعلق کئی ایک مختلف زاویہ نظر رائج تھے۔ بابا کا نقطہ نظر بہت دلچسپ تھا بابا۔ بزرگ تھا اس کی عمر چالیس برس تھی چہرہ ڈھلک چکا تھا۔ جسم میں بیل کی سی بے بسی تھی۔

”اچالے سے منور ہو جاتی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں شام آجاتا تو بحث خوش فہم گفتگو میں بدل جاتی دلائل رنگین اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔“

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بی ٹی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس نئے ٹی نوکری ملنی ہے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے ”یار تم ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو وہ ہنس کر کہتا ”ایم۔ ایس۔ سی ہو تو اب اے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔“

لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو وہ ہنس کر چلاتا ”یار ہم تو فیل ہو گئے کوئی اپنی طرف تو دیکھو نہیں حالانکہ قسم ہے پر ماتما کی منہ پر روز کریم مل کر آتا ہوں۔ شیو کے بعد اسٹریٹ لگتا ہوں۔ بال بڑی احتیاط سے بناتا ہوں۔ کلاس میں جان بوجھ کر چمکدار باتیں کرتا ہوں۔ ذہانت اور رنگیز سے بھرے ہوئے جتنے جملے یاد ہیں ان کا بروقت بر محل استعمال کرتا ہوں لیکن سب بے گورہ دیکھتی ہی نہیں اپنی طرف۔“

”کوئی نہیں دیکھتی۔“ جی کے پوچھتا۔
”کوئی سی ہے دیکھ لے بھائی اس میں کیا ہے۔ بھوکے کیک پیسٹری نہیں مانگا کرتے اور میاں وہ انگریز نے کہا ہے نا بھی کیا خوب کہا ہے۔“ بیگز آرٹس چوزرز“ مگتے کس منہ چٹاؤ کریں۔“

”اے فکر نہ کر۔“ بابا چلاتا۔ ”خود آجائیں گی ایک نہ ایک روز۔“
”فی الحال خط ہی بھیج دیں۔“ شام چلاتا۔
”جو خط آگیا تو مصیبت پڑ جائے۔ جی کے شور مچاتا۔ پر ماتما کے لئے مصیبت پڑ جائے جلدی پڑے“ شام کہتا ”اس خیریت ہی خیریت سے تم ہم تک آ گئے۔ ڈر ہے کسی روز نہ نہ کھالوں۔“

”زہر خریدنے جاؤ گے تو مجھے بتا دیتا۔“ ایلی کہتا۔
”تو لو بتائے دیتے ہیں۔“ شام ہنستا۔
”بڑک تھا اس لی مرچا۔ ہے ہو خریدنے۔“ ایلی پوچھتا۔
”یہ۔“

”اچالے سے منور ہو جاتی۔ سنجیدہ سے سنجیدہ بحث کے دوران میں شام آجاتا تو بحث خوش فہم گفتگو میں بدل جاتی دلائل رنگین اشارات کا انداز اختیار کر لیتے۔“

شام ایم۔ ایس۔ سی کر چکا اور اب بی ٹی میں اس لئے داخل ہوا تھا کہ اس نئے ٹی نوکری ملنی ہے حد مشکل تھی۔ لیکن اس کے رویے سے کبھی ظاہر نہیں ہوا تھا کہ وہ ایم۔ ایس۔ سی ہے۔ اس سے پوچھتے ”یار تم ایم۔ ایس۔ سی ہو۔“ تو وہ ہنس کر کہتا ”ایم۔ ایس۔ سی ہو تو اب اے بی سی میں کیوں داخلہ لیتا۔“

لڑکیوں کی بات چھڑ جاتی تو وہ ہنس کر چلاتا ”یار ہم تو فیل ہو گئے کوئی اپنی طرف تو دیکھو نہیں حالانکہ قسم ہے پر ماتما کی منہ پر روز کریم مل کر آتا ہوں۔ شیو کے بعد اسٹریٹ لگتا ہوں۔ بال بڑی احتیاط سے بناتا ہوں۔ کلاس میں جان بوجھ کر چمکدار باتیں کرتا ہوں۔ ذہانت اور رنگیز سے بھرے ہوئے جتنے جملے یاد ہیں ان کا بروقت بر محل استعمال کرتا ہوں لیکن سب بے گورہ دیکھتی ہی نہیں اپنی طرف۔“

”کوئی نہیں دیکھتی۔“ جی کے پوچھتا۔
”کوئی سی ہے دیکھ لے بھائی اس میں کیا ہے۔ بھوکے کیک پیسٹری نہیں مانگا کرتے اور میاں وہ انگریز نے کہا ہے نا بھی کیا خوب کہا ہے۔“ بیگز آرٹس چوزرز“ مگتے کس منہ چٹاؤ کریں۔“

”اے فکر نہ کر۔“ بابا چلاتا۔ ”خود آجائیں گی ایک نہ ایک روز۔“
”فی الحال خط ہی بھیج دیں۔“ شام چلاتا۔
”جو خط آگیا تو مصیبت پڑ جائے۔ جی کے شور مچاتا۔ پر ماتما کے لئے مصیبت پڑ جائے جلدی پڑے“ شام کہتا ”اس خیریت ہی خیریت سے تم ہم تک آ گئے۔ ڈر ہے کسی روز نہ نہ کھالوں۔“

”زہر خریدنے جاؤ گے تو مجھے بتا دیتا۔“ ایلی کہتا۔
”تو لو بتائے دیتے ہیں۔“ شام ہنستا۔
”بڑک تھا اس لی مرچا۔ ہے ہو خریدنے۔“ ایلی پوچھتا۔
”یہ۔“

شام کا بات کرنے کا انداز کچھ ایسا تھا کہ اس کی بات پر نکتہ چینی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوا تھا۔ وہ سچ کہہ دیتا تھا۔ حالانکہ سچ کی نوعیت اس قسم کی ہوتی تھی کہ اسے کہہ دینے میں بڑے جرات کی ضرورت ہوتی ایلی بھی چاہتا تھا کہ وہ سچی بات کہہ دے لیکن اس میں کبھی جرات نہ ہوتی وہ ڈرتا تھا کہ لوگ کیا سمجھیں گے وہ ڈرتا تھا کہ لوگ اسے اخلاق سے گرا ہوا سمجھ گئے۔ لیکن شام جب بھی اس قسم کی بات کرتا تو اس طرح سے اسے ادا کرتا جیسے اس میں دلچسپی ہو لوگوں کے دلوں میں نفرت احتجاج یا کچھ اور پیدا ہونے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ایلی ہر وقت کہ وہ شام کی طرح باتیں کر سکے۔ سچی باتیں جن میں رنگینی اس قدر غالب ہوتی ہے کہ لوگوں کے دلوں میں کوئی اور رد عمل پیدا نہیں ہونے دیتیں۔ لیکن ایلی کی یہ خواہش خالی خواہش ہی اور اس میں اتنی جرات نہ پیدا ہو سکی کہ اس پر عمل کر سکے۔

جو گرد نواح میں رہتے تھے اس پر ہزار جان سے عاشق تھے اسے راہ چلے چھڑتے تھے لیکن وہ
کے سوا اسے کوئی پسند نہ تھا چونکہ اسے رائے سے محبت تھی۔

رائے کی تیسری محبوبہ لاہور ہی میں تھی۔ وہ بے حد معصوم اور خوبصورت تھی۔ ان
معصوم تھی کہ ان دنوں ایک بد معاش لڑکے نے اسے قابو میں کر رکھا تھا۔ اور وہ بچاری ان چل
سیدھی راہ سے بھٹک گئی تھی ہر صورت رائے جانتا تھا کہ وہ دن دور نہیں جب وہ سمجھ جائے
کہ وہ بد معاش نوجوان محض اپنا مطلب پورا کر رہا ہے اور پھر وہ ایک نئے شوق اور تازہ عزم سے
رائے کی طرف لوٹے گی اور ان کا رومان پھر سے تازہ ہو جائے گا۔ ان دنوں رائے کی سب سے
بڑی خواہش یہ نہ تھی کہ گاؤں والی محبوبہ اسے بلائے یا شہر والی محبوبہ کو نوجوان دن کرنا چھوڑ
یا لاہور والی محبوبہ کی آنکھیں کھل جائیں۔

ان دنوں تو اس کی صرف یہ خواہش تھی کہ کالج کی ان چھ لڑکیوں میں سے کسی ایک کے
ساتھ اس کا رومان چل پڑے اور اسے ہر ماہ دو بار اتنی دور گاؤں تک سفر نہ کرنا پڑے۔

اس سلسلے میں وہ اکثر ایللی سے مشورہ طلب کیا کرتا تھا۔

”یار ایللی کوئی ایسی تجویز بتاؤ کہ اپنی بات بن جائے۔“

اور اگر ایللی جواب دیتا۔ ”لو۔ اس میں کیا ہے جاکر کسی کا ہاتھ پکڑ لو۔“

”اور اس نے تھپڑ مار دیا تو۔“

”تھپڑ مار دیا تو سمجھ لو بات پکی ہو گئی۔“ ایللی کہتا۔ ”ایکپرس کا یہی فیصلہ ہے۔“

”کیسے؟“

”سیدھی بات ہے اگر ہاتھ چھوڑ دیا تو سمجھو بات ٹوٹ گئی۔ پکڑے رکھا تو تعلقات قائم ہو

گئے اور اگر جرات کر کے اسی وقت آغوش میں لے لو تو ہمیشہ کے لئے اس کے دل میں ملا ہو
مسلط ہو جاؤ گے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ رائے جواب دیتا۔ ”لیکن کبھی یار اکیلے میں کوئی لے تو بات بنے گا
کوشش میں لگا تھا کہ کبھی اکیلے میں کوئی مل جائے۔“

ویسے ایللی کو کئی مرتبہ وہ اکیلے میں ملتی تھیں لیکن ایللی نے کبھی ہاتھ تھامنے کی کوشش نہ کی
تھی۔ ہاتھ تھامنا چھوڑ — اس وقت نہ جانے کیا ہو جاتا تھا۔ دور سے کوئی ایللی چلی آتی
دکھائی دیتی تو ایللی کا دل دھک سے رہ جاتا جیسے لڑکی نہیں جگا ڈاکو آ رہا ہو۔ اس کا جی چاہتا کہ کوئی

ہاتھ نہ لے سکے۔ اس کا جی چاہتا کہ مڑ کر بھاگ لے۔ نہیں نہیں وہ سوچتا یہ
پتہ نہیں کیا کہ کی وہ۔ مجھے تو یوں گزر جانا چاہیے جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ آخر بات کیا ہے
نہ وہ کی گزر رہی ہے نا اور کیا اور لڑکی بھی وہ جو مجھے قطعی پسند نہیں۔ پھر گھبراہٹ کیسی۔ وہ
لڑکی اٹا کر یوں چلے گئی جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ لیکن جب وہ لڑکی کے قریب پہنچتا تو اس
لڑکی جک جاتی۔ نگاہیں کوئے تلاش کرنے لگتیں اور دل بیٹھ جاتا پسینے چھوٹ جاتے۔

لیکن ایللی کی بات چھوڑیے اسے تو ان چھ لڑکیوں میں چنداں دلچسپی نہ تھی اور ایسی لڑکیوں
کا دل کسے قائم کیا جاسکتا ہے بھلا۔ جنہیں انسان جب جی چاہے جاکر مل سکے۔ ان حالات
بابت پتہ نہ تھا۔

ایللی کی دانت میں محبت کے لئے ضروری تھا کہ بند شیش ہوں قیود ہوں۔ پردے اور
ایں مائل ہوں۔ برقعہ ہو گھونگھٹ ہو۔ نگاہ ترچھی۔ مسکراہٹ زیر لبی ہو۔ دور سے
اے ہوں۔ ساتھ سے کبھی اڑانے کے بہانے سلام کیا جائے لولیر لکھے جائیں۔ اور یہ کیا ہوا
اس دیکھنے مزاج کیسے ہیں۔ لاجل ولا قوۃ۔

لڑکیوں کے بارے میں ایللی کو شام کا طرز عمل بے حد پسند تھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کسی
لڑکی لڑکی سے اکیلے میں ملے اور کسے جسٹ اے منٹ مس یہ تو بتائیے کہ بھلا آپ کو دیکھ کر
ہاتھ کچھ کیوں ہونے لگتا ہے۔ گردن کیوں لٹک جاتی ہے۔ نگاہیں کوئے کیوں تلاش کرتی
— اور اگر وہ جواب میں تھپڑ مار دے تو اس کا ہاتھ پکڑنے کی بجائے جھٹ جیب سے
اور روٹی نکالے اور کسے اب ایک تکلیف اور کیجئے ذرا چوٹ پر نکچر لگا دیکھئے مجھے جگہ دکھتی

شام سے دلچسپی کی ایک وجہ اور بھی تھی دونوں کو اسفند یار سے بغض تھا۔ اسفند نہایت
ناراضی تھا اور ذہین لڑکا تھا۔ وہ کسی ٹڈل سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور ریفرنسز کورس کے لئے بی
کال میں داخل ہوا تھا۔ وہ راہ چلنے لڑکے کو روک لیتا۔ ”کہاں جا رہے ہو بھائی کینے وقت
ہو گھڑتا ہے۔“ اور اس کے قریب تر ہو جاتا اور قریب حتیٰ کہ آپ محسوس کرتے کہ ابھی وہ
ہاتھ بٹل گیر ہو کر آپ کا منہ چوم لے گا۔ اور اس طرح ہمیشہ کے لئے آپ کا دوست بن

جائے گا۔

وہ السلام علیکم کہہ کر جی کے کے کمرے میں آ پہنچا۔ ”بھائی تم ملنے ہی نہیں کی مڑے ہوں نہ جانے کہاں گم رہتے ہو تم دونوں۔ یار وہ ایک مشکل آن پڑی تھی۔ میں نے کڑھائی سے جا کر پوچھوں اپنے کو تو حساب سے کوئی دلچسپی نہیں۔ یہاں اسے بی کورس وار صرف تم ہو۔“

شام کی ڈارمیٹری میں جا کر وہ شام سے پوچھتا۔ ”بھئی وہ چنگ آف کسٹری میں کوئی لڑکے یار بتاؤ کچھ ہم بھی پڑھ لیں پڑھنے کو جی نہیں چاہتا۔ ایک زمانے کے بعد پھر کے چکر میں پڑ پڑھ گئے اب عادت بنتے بنتے بنے گی۔“

اسفند ہر ایک سے ملتا تھا۔ بڑے پیار سے ملتا تھا۔ پیار کا اظہار کرتا تھا اپنی ذہنی کمزوری اظہار بھی کرتا تھا محبت بھری نگاہیں بھی ڈالتا۔ قریب تر ہو کر اپنا بازو آپ کے شانے پر رکھ دیا یا آپ کا بازو اپنی بغل میں ڈال لیتا۔ اس کے باوجود نہ جانے کیوں کسی اصول کے تحت لوگ بور سمجھتے تھے بور کا لفظ تو خیر اس زمانے میں رائج نہ تھا لیکن لڑکے اس سے کی کڑھائی تھے۔ اس کی مٹاس کثیف محسوس ہوتی اس کا قرب کھلتا ایسے محسوس ہوتا جیسے ایک نرم لیس دار چیز آپ سے چٹنی جا رہی ہو۔

نہ جانے قدرت کے کس قانون کے تحت اسفند کے آتے ہی دفعتاً یاد آیا کہ آپ ضروری کام سے کہیں جاتا ہے۔ اسے دیکھ کر آپ اپنا پروگرام بدل دیتے کسی اور سمت کی طرف جانے کا فیصلہ کر لیتے۔

شاید اس کی وجہ لڑکیوں ہوں؟

اسفند سب سے بڑا کوٹ بردار تھا۔ وہ ہر وقت لڑکیوں کے جھرمٹ میں رہتا ہر وقت طواف کرتا۔ چاہے وہ واضح طور پر اس امر کا اظہار کرتیں۔ موڈ آف ہے آپ جانیے چاہیے؟ کا ساتھ منہ موڑ لیتا یا پوچھ لیتا۔ ”کیوں اسفند صاحب آپ لائبریری کو جا رہے ہیں؟“ اسفند اپنی جگہ سے نہ ہٹتا اور ہزار طنز کے باوجود اس کے ہونٹوں پر وہ یسوار مسکراہٹ رہتی۔ اس کی طبیعت محاسن جو کی توں قائم رہتی اخلاق بدستور خوش گوار رہتا اس کی بات جاری اور ساری رہتیں حالانکہ باقی لوگ وضاحت سے اس امر کا اظہار کر چکے ہوتے کہ اس میں گنجائش نہیں لیکن اسفند کا رویہ یہ ظاہر کرتا کہ وہ اپنے پیارے دوستوں کو چھوڑ کر نہیں

تھا بے وفا نہیں۔ چاہے اس کا اپنا حرج ہی کیوں نہ وہ آداب محفل کو نظر انداز کرنے کے لئے نہیں۔ لڑکیوں کو آئیں کریم کھانے کی دعوت دیتا تو اکثر وہ ساتھ ہی یہ بھی کہہ دیتا کہ ”آئی کریم کھانا ہی نہیں۔“

مراسفند فوراً بولتا ”کھانا تو نہیں لیکن تمہارے جیسا پیارا دوست کے تو انکار نہیں کروں“

”میاں یہ بل شام یا موہن ادا کرے گا۔“ ویسے کسی دوسرے کی دعوت میں بھی اسفند کا یہ کچھ ایسا ہوتا اور وہ انہماک اور شوق سے لوگوں کو کھلاتا تاکہ ہر کسی کے دل میں احساس پیدا ہو کہ اسفند کی طرف سے تھی۔

ان ہی باتوں کی وجہ سے لوگ اسفند سے گھبراتے تھے لیکن ان باتوں کی وجہ سے تو صرف لڑکیوں کو گھبرانا چاہیے تھا جو لڑکیوں کے حلقے میں رہتے تھے۔ وہ لڑکے جنہیں لڑکیوں کے حلقے دور کا تعلق بھی نہ تھا انہیں گھبرانے کی کیا ضرورت تھی۔ لیکن اسفند کے متعلق ان کے بات بھی اسی قسم کے تھے اور یہ وہاں اس قدر عام ہو چکی تھی کہ ایک روز ہنگامہ ہو گیا۔ ہوٹل باغداد دروازے سے باہر برگد کے درخت کے نیچے وسیع میدان میں شور شرابے کی آوازیں آئیں۔ تمام لڑکے بورڈنگ سے باہر نکل آئے ادھر کالج سے بھی لڑکے آ موجود ہوئے برگد کے نیچے دو لڑکے آپس میں لڑ رہے تھے۔ لڑائی نے ہاتھ پائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔ دونوں ہاتھ سے جج رہے تھے۔

”گلبے جا بے تیری حیثیت کیا ہے کل کالوڑا ہے۔ تو ہمارا کیا مقابلہ کرے گا۔ میں وہ کینہ لانا وہ کینہ ہوں کہ۔۔۔“

”گلبے ہٹ بے بڑا آیا ہے کہیں سے۔ میرے روبرو تیری دال نہیں گل سکتی۔ تو میری نگاہ سے واقف نہیں شکل و صورت تو دیکھ اپنی بھگووان کی سوگند جیسے چھپکلی ہو۔“

”گلبے جا۔ ماروں گھٹنا پھوٹے آنکھ۔“

اس طرح دیر تک وہ چلاتے رہے۔

”بات کیا ہے بات کیا ہے۔“ لڑکوں نے چاروں طرف سے شور مچا دیا۔
بورڈنگ اور کالج میں ایک ہنگامہ ہو گیا۔ لڑکے بھاگے بھاگے آ پہنچے۔

چاروں طرف خبر مشہور ہو گئی کہ برگد تلے جھگڑا ہو رہا ہے۔ ایک لڑکا کہتا ہے میں کینہ ہوں دوسرا کہتا ہے کہ تیری کیا حیثیت ہے اپنے سامنے۔ میں بہت بڑا کینہ ہوں۔ عجیب جھگڑا تھا۔ لہذا سب برگد کے درخت کی طرف بھاگے حتیٰ کہ پروفیسر اور چھ لڑکیں بھی آ پہنچیں۔
دونوں لڑکے بڑی شدت سے چلا رہے تھے منہ سے کف جاری تھا آستینیں ہٹ گئی ہوئی تھیں جیسے ابھی ہاتھ پائی کی نوبت آ جائے گی۔

”میں کہتا ہوں میں کینہ ہوں میں۔“ ایک چیخ رہا تھا۔

”اے جا۔“ دوسرا کہہ رہا تھا۔ ”تو کیا ہے تیری اوقات کیا ہے۔“

جب سے لڑکوں نے جھگڑے کا انداز دیکھا تو چاروں طرف سناتا چھا گیا۔ لڑکے فوراً تازے کہ یہ جھگڑا نہیں کچھ اور ہے نہ جانے مداری کے پٹارے سے کیسا سانپ نکلے گا۔
دیر تک چیخ چیخ جاری رہی۔ حتیٰ کہ سب لڑکیں آ پہنچیں پروفیسر بھگت سنگھ بھی آ گئے۔ لالہ جی تو دور سے تماشہ دیکھتے رہے لیکن پروفیسر بھگت سنگھ بڑے سادہ لوح اور مخلص تھے وہ گہرائے انہوں نے بچاؤ کرانے کی کوششیں کیں۔

عین اس وقت دونوں لڑکوں نے جھگڑے کا نقطہ عروج پیدا کر دیا۔

ایک بولا۔ ”اے کیننگی میں میں تیرا باپ ہوں۔“

”بے جا۔“ دوسرا چلایا۔ ”گلیسکو بے بی تو دیکھو۔“ ”جمعہ جمعہ آٹھ دن کی پیدائش؟“

اور آیا ہے ہم سے مقابلہ کرنے اے میں تیرے باپ کا باپ ہوں وہ کینہ ہوں میں۔

”میں خالی کینہ نہیں ذلیل بھی ہوں۔“

”کس قدر ذلیل ہو تم“ دوسرے نے غصے سے پوچھا۔ ”میں“ پہلا بولا ”میں پروفیسر بھگت سنگھ کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

”اے بس۔“ دوسرا چلایا۔ ”اے میں کہتا کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

پہلا بولا۔ ”میں اسفند کا جوٹھا کھا سکتا ہوں۔“

دوسرا خاموش ہو گیا۔ ”بھئی میں اسفند کا جوٹھا نہیں کھا سکتا۔ میں ہار گیا ہار گیا۔“

چاروں طرف سے تفتوں کا شور اٹھا۔

چاروں طرف سے تفتوں کا شور اٹھا۔ لڑکوں نے بڑھ کر پہلے لڑکے کو شانوں پر اٹھا لیا۔ اور اسے لے بھاگے جیت گیا!!! جیت گیا!!! وہ چلا رہے تھے اس سے بڑی ذلت نہیں ہو سکتی زندہ بلا شام زندہ بلا شام۔

”اے“ اہلی حیرت سے چلایا۔ ”یہ تو شام ہے۔“

لوح اسفند کھڑا مسکرا رہا تھا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو جیسے شام نے اس کا نام ہی نہ لیا ہو۔ اور باہمی ہو تو محض مذاق اور تفریح کے طور پر لیا ہو۔

لیکن بھگت سنگھ چلاتے جا رہے تھے ”ملا تفتوں نے میرا نام خواہ مخواہ لے دیا ارے میں تو گرد کا پارا ہوں۔ مجھے کیوں تھمتیے ہو اپنے جھگڑوں میں۔“

پھر شام چپکے سے اہلی کے کان میں کہہ رہا تھا۔ ”وہ پچھاڑا ہے آج کہ سلا کبھی اٹھ نہ سکے گی“ اور اسفندیوں دیکھ رہا تھا جیسے پوچھ رہا ہو۔ کسے بھائی؟

اس روز رات کو بورڈنگ میں بہت ہنگامہ ہوا۔ ہر ڈار میٹری میں لڑکے اس ڈارے کو دھرا رہے تھے جو اس شام برگد کے درخت کے نیچے شام نے کھلیا تھا۔ ”میں کینہ ہوں۔“ ایک ڈار بڑی سے آواز آتی۔ ”اے تیری کیا ہمت ہے جو ہمارے ہوتے ہوئے یہ دعویٰ کرے۔“

”ہری ڈار میٹری سے کوئی چلاتا۔“ ”اے جا بے۔“ تیسری ڈار میٹری سے شور بلند ہوتا۔ اوپر چڑھنے میں کھڑے لالہ جی مسکرا رہے تھے ”میں کہتا ہوں بھئی۔“ وہ کہہ رہے تھے ”اس بات کا

ڈیفنڈ شام کو ہو چکا اب کوئی اور دعوے کرو۔“

ڈیفنڈ بل میں کو من روم میں لان میں ہر جگہ لڑکے باتیں کر رہے تھے۔

”یار شام نے وہ مار دی ہے وہ مار دی ہے اسفند کو کہ چاروں شانے چت گریا ہے۔“

”ارے لڑکیوں کو دیکھا تھا مارے ہنسی کے پیٹ میں بل پڑ رہے تھے۔“

”لب اسفند کا لڑکیوں پر جادو نہیں چلے گا۔“

”اونوں“ اندر شام کہہ رہا تھا ”یار اپنی محنت بیکار مگنی۔ اسفند پر تو کوئی اثر ہی نہیں ہوا مجھ سے پوچھ رہا تھا یار یہ گڑبڑ کس بات پر تھی اپنی سمجھ میں نہیں آیا کچھ۔ اب تباؤ ایسے آدمی سے لگی کیا کرے۔“

”ارے نہیں یار بنتا ہے۔“ ایک نے جواب دیا۔

”ہل اندر سے تو چکنا چور ہو گیا ہے۔“

”نہ چکنا چور نہیں۔“ دوسرا بولا ”بھئی وہ تو مٹی کا پتلوان ہے اور حر کر لیا اور لٹھ کر لیا۔“

”جھگوان جانے ٹھیک کتے ہو“ شام ہنسنے لگا ”مٹی کے پتلوان کو کون کر سکتا ہے۔“

شام کے اس اعلان پر ہوشل کے سب لڑکے تھملا اٹھے۔ چاروں طرف شور مچ گیا۔

”ارے یار سنا تم نے اتنی بڑی فتح حاصل کرنے کے بعد شام اسفند سے ہار گیا۔“

”نہیں یار اسفند نہیں ہار سکتا۔“

جا کر پوچھ لو۔“

لڑکے شام کے پاس آئے۔ لڑکوں کو اس کا بہت غم تھا اسفند کو بچھاڑنے کے لئے شام کا واحد پتلوان تھا۔ اگر اس نے بھی میدان چھوڑ دیا تو ہو گا کیا۔ یہ خیال ان کے لئے سونہاں دلدادہ رہا تھا۔ بھی چاہتے تھے کہ اسفند کے ساتھ جنگ جاری رہے اگرچہ کسی کو بھی علم نہ تھا کہ اسفند کے خلاف کیوں تھے۔ اسفند نے کبھی کسی لڑکے کو شکایت کا موقع نہیں دیا تھا اس کے باوجود اسفند ایک ایسا پلپلا کیڑا تھا کہ ہر لڑکے کا جی چاہتا تھا کہ پاؤں سے مل دے۔

جی کے کی ٹاک پر ڈھیر لگے ہوئے تھے۔ ”لہذا“ وہ چلا رہا تھا۔ ”یہ سب کیا ہے کیا ہے یہ دکھلاؤ اور کیا۔“ مقصد یہ ہے کہ لڑکیوں پر اثر ڈالا جائے۔“

ایلی خاموش بیٹھا اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”خالی۔“ ایگزیشن خالی کیوں غلط ہے۔“ اس نے ایلی کو مخاطب کر کے پوچھا۔

”ٹھیک ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”بڑا بد معاش ہے یہ شام۔ لڑکیوں کے دل میں اپنی جگہ بنا رہا ہے۔“

عین اس وقت گھانا نوکر داخل ہوا۔

”کیوں گامے کیا بات ہے۔“ جی کے نے پوچھا۔

اندر مہاراج

”جی۔ جی وہ۔“ گھانا بولا ”شام بابو نے حلوہ بھیجا ہے کتے ہیں گاؤں سے آیا ہے۔“

”حلوہ دکھاؤ۔“ ارے یہ تو گاجر کا ہے۔“ جی کے پلٹ کر دیکھ کر چلایا حلوے کو دیکھ کر لائے

بابو کی سڑک اپنی جگہ پر آگئی۔ ”اچھا“ وہ بولا ”جا کر شام بابو سے کو ہم نے تمہاری سب بابو کی سیف کر دیں۔“

بابو کر دیں۔“ گھانا پوچھنے لگا۔

”ہاں جی کو خوش کرنے کے لئے جو تماشا کھیلا ہے۔ شام نے۔“ جی کے نے وضاحت کی۔

”جی جو تماشا پچھلے سال ہوا تھا اس کا تو جواب نہیں۔“

”ہاں جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔“

”ہوں“ گھانا مسکرا کر بولا ”جی یہ تو کچھ بھی نہیں۔ جی پچھلے سال ایک بابو تھے ایس بی میں

ابوں نے توحہ کر دی تھی۔ سات کی سات لڑکیوں کو ساتھ لئے پھرتے تھے بس سمجھ لو اندر

دراں تھے وہ اپنے وقت کے۔“

”ساتھ لئے پھرتے تھے سات کی سات“ ایلی نے حیرت سے دہرایا۔

”جی“ گھانا بولا۔ ”کالج والوں نے دھمکیاں دیں لالہ جی نے کما نکل دیں گے بورڈنگ سے

لیئے لکھ کر بھیج دیا کہ کالج سے نام کاٹ دو پر اس پٹھے نے جرا پر داہ نہ کی۔ اور خدا جھوٹ

بلائے پڑی۔ ہر رोज رات کے وقت وہ یہاں آ جاتی تھیں۔ سب لڑکیاں بورڈنگ کے باہر

لے لان میں اور بابو جی دیوار پھلانگ کر باہر نکل جاتے تھے لان میں۔ پھر وہ آدمی آدمی رات

دہلی گھومتے رہتے تھے۔ سب کو معلوم ہوتا کہ وہ کالج کے لان میں گھوم رہے ہیں لالہ جی کو

ناہ نہ ہوتا پھر جب وہ دیوار پھلانگ کر واپس آتے تو لالہ جی پوچھتے چوٹ تو نہیں لگی اور وہ ہنس

خواب دیتے لالہ جی میری الماری میں ٹیپنر رکھی ہوئی ہے۔ لگا لوں گا تو ٹھیک ہو جائے گی یہ

تھی۔“ گھانا ہنسنے لگا۔

گھانا نہیں کر رہا تھا تو ام کے داخل ہوا۔

”تمہ سے تم“ جی کے چلایا ”تم کہاں۔ اور تم بورڈنگ کے اندر کیسے آ گئے۔“

”م کے ہنسنے لگا“ دیکھ لو۔“ وہ بولا پھر گامے کو دیکھ کر اس سے مخاطب ہوا۔

”کیاں بھی گامے کیا حال چال ہے۔“

گامے کی آنکھوں میں عجیب سا تبسم چھلک رہا تھا ”اچھا ہوں بابو جی بڑی مہربانی ہے۔ اور بابو

جی عمر ہے آپ کی ابھی آپ ہی کی بات کر رہا تھا۔“

”آپ ہی کی بات“ جی کے نے حیرت سے گامے کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں“ گنا بولا ”تم وہ رستم زمین ہو۔“

”دیکھ لو“ ام کے ہنسنے لگا۔

”بالکل بکواس جھوٹ“ جی کے بولا ”تمہیں تو بات کرنے کا ڈھنگ نہیں آتا۔“

”اب بھی نہیں آتا۔“ وہ بولا۔

”تو پھر۔“

”صرف ہانہ پکڑنے کا ڈھنگ آتا ہے۔“ ام کے ہنسنے لگا۔

”اکٹھی سات بانہیں۔“ ایلہی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”نہیں“ ام کے بولا۔ ”میں تو ایک ہی پکڑتا تھا باقی چھ میری ہانہ پکڑتی تھیں“ مورقہ

کر ہنسنے لگا۔

”اچھا تو یہ آپ کے بھی دوست ہیں۔“ لالہ جی کمرے میں داخل ہوتے ہوئے بولا
پھرام کے سے مخاطب ہو کر کہنے لگے ”کو بھی آج کل کہیں ہو۔ کیا ابھی قصور ہی میں ہو۔“

”جی ہاں“ اس نے جواب دیا۔ ”لیکن وہ مجھے پسند کرنے والے ہیں۔“

”کیوں وہاں بھی کیا لڑکیوں کا قصہ ہے“ لالہ جی نے۔

”نہیں لالہ جی۔“

”تو پھر کیوں“

”ویسے ہی جلتے ہیں۔“ ام کے ہنسنے لگا۔ ”شرمیں تو ہوں گی نالائکیں“ جی کے نے

جی سے کہا۔

”شرمیں تو وہ وہ چیز ہے کہ لالہ جی کیا بتاؤں“ طوفان پاپا ہے۔“

”کیا رات یہیں رہنے کا ارادہ ہے۔“ لالہ جی نے پوچھا۔

”نہیں لالہ جی۔“ ام کے بولا ”البتہ جی چاہتا ہے کہ پھر سے کالج میں داخل ہو جاؤں۔“

”تو ہو جاؤ۔“ لالہ جی بولے۔

”کر لیں گے آپ“ ام کے ہنسنے لگا۔

لالہ جی کے جانے کے بعد کچھ دیر وہ باتیں کرتے رہے پھرام کے تیار ہو گیا۔

”اچھا یار میں چلتا ہوں۔ مجھے ایک ضروری کام ہے پھر آؤں گا۔ اب تو آئی رہوں گی۔“

پھر ایلہی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا ”چلو یار ذرا کچھ دیر میرے ساتھ چلو پھر واپس آ جاؤ۔“

بیٹہ ہوٹل

دیر تک ایم کے اور ایلہی لاہور کی ویران سڑکوں پر چلتے رہے۔ ایک دو مرتبہ ایلہی نے کہا مجھے
بہانے دیا۔ لیکن ام کے نے بس تھوڑی سی دور اور کہہ کر اسے مطمئن کر دیا۔ پھر وہ

لیں کی باتوں میں مصروف ہو گئے۔ اور ایلہی کو خیال ہی نہ رہا کہ اسے واپس جانا ہے اور ٹائٹوس
لے میں ہو اتنی دور نکل آیا ہے کہ واپس بورڈنگ میں پہنچنا مشکل ہو جائے گا۔ ام کے اسے

ہنگامی میں لڑکیوں سے متعلق کارنامے سنا رہا تھا۔
ایک وسیع کوٹھی کے سامنے ام کے رک گیا۔ کوٹھی کے چاروں طرف قد آدم دیوار بنی
لی تھی۔ اور سڑک کی جانب ایک بہت بڑا دروازہ تھا۔

”ایک بات مانو گے“ اس نے ایلہی سے کہا ”اگر تم صرف پندرہ منٹ یہاں میرا انتظار کرو تو
ہاںے دوست سے مل کر واپس آ جاؤں گا پھر ہم اکٹھے واپس جائیں گے تم بورڈنگ چلے جانا
میں ملال دروازے چلا جاؤں گا۔“

اس وقت آدمی رات ہو چکی تھی ایلہی اس ویران جگہ انتظار کرنے کے لئے تیار نہ تھا لیکن
وہاں کے راستے کا بھی تو علم نہ تھا۔ اس لئے مجبوری میں اس نے ام کے کی بات مان لی۔
بڑے دروازے کے قریب ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔

دیر تک ایلہی وہاں بیٹھا رہا پھر وہ گھبرا کر ٹپٹپٹنے لگا۔ ام کے کو گئے تقریباً ”آدھ گھنٹہ ہو چکا تھا۔
رک کی گزری نے ساڑھے بارہ بجائے۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے ٹپٹپٹے ٹپٹپٹے تھک
لاہور گیا۔

دلہن مکان کے اندر سے شور اٹھا۔ لوگ دوڑ رہے تھے۔ کون ہے؟ کیا ہے؟
لا ایک عورتیں چیخ رہی تھیں۔ ایلہی وہ آوازیں سن کر چونکا۔ پھر اس نے سمجھا شاید کوئی
”ہو“ ہوئی کوئی بات۔ پھر قریب ہی لوگ چل پھر رہے تھے ٹھک ٹھک جیسے کوئی اونچی
پاؤں فرش پر مار رہا ہو۔

پھر دروازے سے صدر دروازہ کھل گیا۔ کچھ لوگ لالٹین اٹھائے باہر نکل آئے۔ ایلہی بیٹھے
چپ چاپ ان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ نہ جانے کون ہیں یہ لوگ۔ وہ سوچ رہا تھا۔
ایک نوجوان ہاتھ میں لٹھ سنبھالے دوسرے میں لالٹین پکڑے اس کے قریب آیا اس کے

بیچے دو مرد تھے اور ایک اوجیز عمر کی میم تھی۔

”کون ہو تم۔“ اس نے درشت لہجے میں پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”یہاں کیوں بیٹھے ہو۔“

”تھک گیا تھا بیٹھ گیا۔“ ایلی نے بے پروائی سے کہا۔

اس پر میم آگے بڑھی اور انگریزی میں پوچھنے لگی۔

”زنانہ بورڈنگ ہاؤس کے سامنے بیٹھنے کا مطلب۔“

”زنانہ بورڈنگ ہاؤس۔“ ایلی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا ”مجھے یہ معلوم نہ تھا۔“

”لیکن تم ہو کون۔“ وہ بولی۔

”لیکن تم ہو کون۔“ وہ بولی۔

زنانہ بورڈنگ کا نام سن کر ایلی کو خیال آیا کہ ضرور ام کے نے کوئی شرارت کی ہوگی۔ اس

خیال پر وہ محتاط ہو گیا۔ ”دیکھئے محترمہ“ وہ بولا ”میں راہ گیر ہوں بھائی دروازے جانا ہے تھک

گیا۔ تو ذرا سستانے بیٹھ گیا مجھے علم نہ تھا کہ یہ زنانہ بورڈنگ ہے۔“

”کیا کرتے ہو“ وہ بولی۔

”پڑھتی ہوں۔ کام سے لاہور آیا ہوں۔“

”ہوں۔“ وہ غور سے ایلی کی طرف دیکھنے لگی۔ پھر اس کا رویہ بدل گیا۔ بولی ”تم

نے ادھر سے کوئی آدمی گزرتے ہوئے نہیں دیکھا ہے کیا۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا ”کیوں کیا بات ہے۔“

”یہاں چوری کی وارداتیں ہو رہی ہیں آج کل“ وہ بولی۔

”اچھا“ ایلی نے کہا۔ ”تو مجھے چلے جانا چاہیے یہاں سے۔“

”ٹھہرو۔“ لائین والا جوان چلایا۔

”نہیں نہیں جانے دو شریف آدمی ہے۔“ میم نے کہا۔ اور ایلی چپ چاپ چلا رہا۔

ابھی چند ہی قدم چلا ہو گا کہ اندھیرے سے ایک سایہ اس کی طرف لپکا۔ وہ گھبرا کر روک

”ڈر گئے کیا۔“ ام کے کی آواز آئی۔

”ارے تم ہو۔“

”ہاں میں ہوں۔“

”کسی سبلی سے ملے آئے تھے کیا۔“

”ہرے پار“ وہ بولا ”مصیبت یہ ہوئی کہ دیوار پھلانگتے ہوئے کسی چوکیدار نے دیکھ لیا۔“

”کیا دیوار پھلانگ کر اندر گئے تھے۔“

”جور کیا صدر دروازے سے جاتا۔ بیٹا زنانہ بورڈنگ ہے اندر جانے دیتا ہے کوئی۔“

”کسی روز مار کر بھر کس نکل دیں گے تمہارا۔“ ایلی نے کہا۔

”پار کیا کروں“ ام کے بننے لگا۔ ”اس ظالم سے ملے بغیر رہا بھی نہیں جاتا۔ جان من ان

کے دل میں عزت اور محبت پیدا کرنی ہو تو دلیری دکھانی پڑتی ہے سیکھ لو گر یہ ہم سے۔“

ایلی کے رو بہو سادی اکھڑی ہوئی۔ ”نہ“ وہ بولی ”یوں نہیں ملے گا دوشہ لیتا ہے تو خود آکر

ہاتھ کر لے جاؤ۔ پھر ہانوں گی آپ کی ہمت۔“

ہر ایک بزرگ کی گٹھڑی لڑھک کر اس کے پاؤں میں آگری اور سادی مسکرا کر کہنے

”گٹھکٹ کے پٹ کھول رہے تو ملیں گے رام۔“

نہ جانے ام کے کیا کہہ رہا تھا۔ غالباً وہ زنانہ بورڈنگ میں داخل ہونے کا قصہ یا تفصیل

نہ دہا لے رہا تھا کہ اس کی سبلی کس قدر حسین ہے اور کتنی رنگین۔ لیکن ایلی کے

یک اور حسین رنگین تصویر کھڑی تھی۔ وہ اس سے باتیں کر رہی تھی۔ ”میں یہاں ہوں

ٹائی۔ اگر ہمت ہے تو یہاں آ جاؤ۔ آ جاؤ نا۔ ابھی جاؤ آ جاؤ گے تو سب کچھ مل جائے

۔ کچھ لیکن تم کیوں آنے لگے۔ نہ جانے تمہیں کس کی لگن لگی ہے تمہارے لئے تو میں

رہا ہوں۔“

ایلی طرف شڑاؤ کھڑی اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھ رہی تھی۔

”نہ نزع ہی سی۔“ وہ آہ بھر کر کہہ رہی تھی۔ ”تمہارے لئے باعث تفریح ہوں نا۔ یہ

ٹائی فوش قسمتی ہے اور میں تمہیں دے ہی کیا سکتی ہوں۔ میرے پاس ہے ہی کیا جو

گے روز سارا دن ایلی اسی خیال میں کھویا رہا اسے بار بار زنانہ بورڈنگ کا خیال آتا اور پھر

بھول تے سادی کی سفید منزل آجاتی اور وہ اس کے پیچھے بھاگتا اور دو بھینس جینٹ

”اگے!! اگے!!“ سارا دن وہ اسی خیال میں کھویا رہا شام کے وقت چپ چاپ

”اگے!! اگے!!“ سارا دن وہ اسی خیال میں کھویا رہا شام کے وقت چپ چاپ

بیمہ اور اپنے دل کو ہلکا کر لے۔ اس کے انداز بیان میں دکھ تھا اس کے تبسم میں

بیمہ کسی سے محبت کرنی پڑے گی۔ ہاں۔ ابھی فوراً ”ورنہ زندگی کیسے کئے گی۔ لیکن مجھ
بت کرنے والا کوئی بھی تو نہیں ماما جی بچپن ہی میں چلی گئیں۔ کوئی بڑی بہن ہوتی تو شاید
بت جانی میری کوئی بہن نہیں اور پتا جی — لیکن کبھی پتا نے بھی محبت کی ہے۔
ابھی۔ آج تک مجھ سے کسی نے محبت نہیں کی اور اب انہوں نے میرا ناطہ ایسی لڑکی سے جوڑ
پتا زرد پوشہ اوڑھتی ہے۔ مجھ سے زیادہ دکھی کون ہو گا۔“ وہ باتیں کئے گیا اور ایلچی چپ
ہوا۔

انہوں نے تعجب سے اس کھلی کی طرف دیکھا جس کی طرف لوگ بھاگے جا رہے
ہے۔ ”تم ہو شام۔“ وہ بولا شام اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔
”شام آپ کیوں بھر رہے تھے؟“ ایلچی نے پوچھا۔
”اب عمر بھر آپ ہی بروں گا اور کیا۔“
”لیکن کیوں۔“
”یار کیا بتاؤں۔“ شام بولا ”مسخروں نے میری سنگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے
زرد پوشہ اوڑھتی ہے۔“
”تو کیا ہو؟“

اور بیٹا

”اپنی تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔“
”کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟“
”جو سر پر زرد پوشہ اوڑھ سکتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ ہمیں نہیں ملتا
ایسا“ شام ”افت“ سنجیدہ ہو گیا ”میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زرد پوشہ اوڑھتی
ہو۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو یہ بات ایلچی کے لئے حیران کن تھی۔
”لیکن تمہاری سنگنی کب ہوئی؟“ ایلچی نے پوچھا۔
”آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کس چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں
جا کر کھو جائیں سب بھول جائیں۔“

ایلچی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام سے
نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ اپنی دکھی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی

کالج کے لان کے ایک اند میرے کونے میں جا بیٹھا اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ کسی سے ملے
کے کے پاس بیٹھے۔

زرد پوشہ

لان میں بیٹھے بیٹھے ”افت“ اسے احساس ہوا کہ قریب ہی کوئی ٹھنڈی آہیں بھر رہا ہے
چونکا سامنے پیڑ کے پیچھے کوئی بیٹھا تھا۔ شاید کوئی لڑکی ہو۔ وہ گھبرا گیا۔ لیکن اس نے اٹھ کر
مناسب نہ سمجھا۔ پھر کچھ دیر کے بعد پودے کے پیچھے کسی نے ماچس جلا کر سرٹ سلگایا۔
شام کو پہچان کر وہ چلایا۔

”تم ہو شام۔“ وہ بولا شام اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔

”شام آپ کیوں بھر رہے تھے؟“ ایلچی نے پوچھا۔

”اب عمر بھر آپ ہی بروں گا اور کیا۔“

”لیکن کیوں۔“

”یار کیا بتاؤں۔“ شام بولا ”مسخروں نے میری سنگنی ایک ایسی لڑکی کے ساتھ کر دی ہے

زرد پوشہ اوڑھتی ہے۔“

”تو کیا ہو؟“

”اپنی تو زندگی ہی تباہ ہو گئی۔“

”کیوں؟ کیا وہ خوب صورت نہیں؟“

”جو سر پر زرد پوشہ اوڑھ سکتی ہو وہ کیا خوب صورت ہو سکتی ہے۔ ہمیں نہیں ملتا

ایسا“ شام ”افت“ سنجیدہ ہو گیا ”میں ایسی لڑکی سے محبت نہیں کر سکتا جو زرد پوشہ اوڑھتی

ہو۔“ وہ بے حد سنجیدہ تھا۔ شام اور یوں سنجیدہ ہو یہ بات ایلچی کے لئے حیران کن تھی۔

”لیکن تمہاری سنگنی کب ہوئی؟“ ایلچی نے پوچھا۔

”آج۔ ابھی ابھی وہاں سے آ رہا ہوں۔ چلو یار چلیں۔ کس چلیں کسی ایسی جگہ چلیں جہاں

جا کر کھو جائیں سب بھول جائیں۔“

ایلچی چپ چاپ اس کے ساتھ ہو لیا۔ کچھ دیر تو وہ خاموشی سے چلتے رہے پھر شام سے
نہ ہو سکا اور وہ باتیں کرنے لگا۔ دراصل وہ اپنی دکھی بھڑاس نکالنا چاہتا تھا وہ چاہتا تھا کہ کسی

شرم کے مارے اہلی ڈوب گیا۔ پھر وہ بھاگ پڑا۔

”ارے ٹھہرو تو۔ میں نے کہا ٹھہرو نا۔“ شام چلا رہا تھا۔ لیکن اہلی بھاگے جا رہا تھا۔ پھر پھر شام آ رہا تھا۔ اور گلی کے سب تماشائین ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔

ٹھہراؤ

ٹرننگ کالج کی زندگی کے پہلے دور میں ایک مسلسل کش مکش تھی اضطراب تھا ہر گلی، جوش تھا۔ پر امید تھا۔ کوشاں تھا۔ لیکن چھ ایک ماہ کے بعد لڑکیوں کی زندگی نے دوسرا رخ لیا۔ بیشتر لڑکے جو لڑکیوں پر اثر ڈالنے کے لئے بے تاب تھے۔ مایوس ہو گئے۔ اور ان کی توجہ کسی اور طرف منحطف ہو گئی۔

ادھر لڑکیوں نے اپنا اپنا حلقہ اور اپنا اپنا مرکز متعین کر لیا۔ اس طرح زندگی میں ایک نمبر پیدا ہو گیا۔ جیسے گدلے پانی کا بھرا گلاس کچھ دیر کے بعد پتھر کر صاف ہو جاتا ہے گرد و غبار بیٹھ جاتا ہے۔

لڑکیوں کی وہ پر شور محفلیں ختم ہو چکی تھیں۔ اب ہر لڑکی نے امتحان کی تیاری کے لئے ایک مخصوص کونہ مقرر کر لیا تھا مثلاً ”مس روماس اس بیچ پر بیٹھا کرتی جو لان کے ٹیبل کے لئے جھاڑیوں کے نیچے رکھا ہوا تھا۔ مس راد ہانے سائنس روم کے عقب میں بنی ہوئی گلی اپنے لئے مخصوص کر رکھی تھی۔ جس سے ادھر ادھر جانے کا کوئی راستہ نہ تھا۔ کالج کے لان میں پڑے ہوئے بیچ سب غائب ہو چکے تھے اور مخصوص مقامات پر رکھ دیئے گئے تھے۔

ظاہر ہے کہ امتحان کی تیاری اکیلے میں تو نہیں ہو سکتی ایک ساتھی کا ہونا ضروری ہوتا ہے اور ایک سے زیادہ ساتھی ہوں تو بھیڑ لگ جاتی ہے اور پوری توجہ سے کام نہیں ہوتا۔ اب اس وجہ سے لڑکیاں تقریباً ”تقریباً“ عفا ہو چکی تھیں۔ عام طور پر وہ دکھائی نہیں دیتی تھیں۔ بلکہ کمال خاص لیکچر ہوتا تو وہ اپنے اپنے ڈربوں سے نکل آتیں اور لیکچر ختم ہونے کے بعد پھر وہیں لوٹ جاتیں۔

رائے نے پھر سے گاؤں جانا شروع کر دیا تھا۔ اور ہر بار گاؤں سے واپس آنے کے بعد اہلی کو اس لڑکی کے قصے سناتا جو اتنی بولڈ تھی کہ حد نہیں اور جس کی بولڈنس کی وجہ سے اس کے پیرش نے احتجاجاً ”کھانسا اور تیوری چڑھانا چھوڑ دیا تھا۔

یہاں تک کہ تمام تر توجہ بورڈنگ کے پچھواڑے کے ایک مکان پر مرکوز ہو چکی تھی اور وہ روز اہلی کے ساتھ لاجونٹی بچاری سارا سارا دن دھوپ میں کھڑی رہتی ہے۔ پگل لڑکی اس طرح وہ صاف خراب کرے گی۔ لیکن بابا کے سمجھانے کے باوجود لاجونٹی اپنے مکان کی کھڑکی میں بیٹھ کر بابا کو دیکھنے پر مجبور تھی۔

لجونی

لجونی کا قصہ بھی عجیب تھا۔ سب سے پہلے لاجونٹی کو شام نے دیکھا تھا۔

”میں دوڑا دوڑا اہلی کے پاس آیا ”لو بھئی“ وہ چلانے لگا ”اپنا تو جیون سپھل ہو گیا۔“ وہ کہے ”اہلی نے پوچھا۔

”ہاں ابھی ایک گاہک پیدا ہو گیا۔“

”کیوں کیا کالج والیوں میں سے کوئی مریاں ہو گئی۔“

”نہیں۔ وہ سب سخت مٹی سے بنی ہیں۔ یار ان پر اثر ہی نہیں ہوتا۔ انہیں وہ وہ باتیں کہیں کہ ذرا شرم ہوتی تو میرے پریم میں ڈوب جاتیں۔ اور صرف باتیں ہی نہیں تماشے لے ہیں کرب دکھائے ہیں مسخرا بن کر رانیوں کو محفوظ کیا ہے اور پھر کلاس میں وہ وہ برلینٹ مانی ہیں۔ اپنی لیاقت کی دھاک بٹھادی ہے۔ اتنا اثر ڈالا ہے کہ کوئی حد نہیں۔“

”تو کیا ان سب باتوں کا اثر نہیں ہوا۔“ اہلی نے پوچھا۔

”اثر تو ہوتا ہے۔ ہنساتا ہوں تو ہنستی ہیں۔ اتنا ہنستی ہیں اتنا ہنستی ہیں کہ پیٹ میں بل پڑ لیں۔ چکرا بات کرتا ہوں تو اتنی بڑی بڑی آنکھیں کھول کر دیکھتی ہیں جب لیاقت کی سناٹا ہوں تو مڑ مڑ کر دیکھتی ہیں۔“

”اہلی نے پوچھا۔

”میں جب ایک منٹ تو بیٹگی رہتی ہیں پھر بے خشک ہو جاتے ہیں تو سالی پھر سے اڑ جاتی ہیں اچھے باقی ہی نہ ہوں۔“

”گھر پر کیا گاہک کون ہے۔“ اہلی نے پوچھا۔

”میں نہیں یاد کون ہے۔ کوئی سکول کی دکھتی ہے۔ ہماری ڈار میٹری کے پچھواڑے میں ان کے ساتھ ایک روز میں نے ویسے چھینر خانی کے لئے دو ایک اشارے کر دیئے تھے اب سالی

کھڑکی میں یوں جی رہتی ہے جیسے سریش لگا کر جوڑ دیا ہو کسی نے اپنے لئے جی تھی ہو رہی ہے۔

”ٹھیک ہے۔“ ایلی بولا۔ ”تمہیں بھی لٹکنے کے لئے ایک کھوئی ہی چاہیے۔“

”وہ تو ٹھیک ہے۔“ شام ہنسا۔ ”لیکن وہ تو خود لٹک رہی ہے۔“

”یہ تو بلکہ اور بھی اچھا ہے“ ایلی نے کہا۔ ”پکا پکایا مل گیا۔“

”اونسوں“ وہ بولا ”یار لوگوں کو تو مار کر کھانے کی لت پڑی ہے۔“ عجیب بات ہے؟“

”اگر وہ لٹک جائے تو اپنی طبیعت نہیں جیتی اور اگر وہ پروانہ کرے تو ہم خود لٹک جاتے ہیں۔“

ایلی ہنسنے لگی۔

”ایک بات اور ہے“ شام بولا۔

”وہ کیا؟“

”لاجونتی کی عمر بہت چھوٹی ہے۔“

”اس میں کیا برا ہے۔ جتنی چھوٹی عمر ہوگی۔ اتنا جذبہ بے لوث ہو گا۔“

”اونسوں۔ ہمیں تو شیار چاہیے جو ہمیں لوریاں دے دے کر سلائے پٹ پٹ کر لے

اپنے بازوؤں میں سنبھالے۔“

اسی شام وہ دونوں بورڈنگ سے نکل کر اس مکان کی طرف سیر کے لئے نکل گئے جہاں

لاجونتی کا گھر تھا تاکہ قریب سے لاجونتی کو دیکھ سکیں۔

لاجونتی چودہ سال کی لڑکی تھی۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن نقوش جاذب نظر تھے۔

میں عجیب دیوانگی سی تھی اور انداز سے ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے محبت کی دنیا کے طور طریقے

ابھی ناواقف ہو جیسے کوئی دلہیز پر کھڑا ہو اور زندگی کے ایوان میں داخل ہونے کے لئے تکیہ

ہو۔

والیسی پر ایلی کو سوجھی۔ ”یار ایک بات کہوں برا مزار ہے گا جو تم مان جاؤ تو۔“

اس روز انہوں نے مل کر سازش کی کہ کسی طرح بابا کو یہ غلط فہمی دے دی جائے کہ

لاجونتی اسے دیکھنے کے لئے کھڑکی میں کھڑی ہوتی ہے۔ چونکہ بابا جس ڈار میٹری میں رہتا تھا

سے بھی لاجونتی کا مکان صاف دکھائی دیتا تھا۔

اس مذاق کی وجہ یہ تھی کہ ایلی بابا کی باتیں سن کر تنگ آچکا تھا۔ بابا یوں بات کیا کرتا تھا

ایلی کی اس پر رنج بھی ہوئی ہو۔ اسے یہ خیال کبھی نہیں آیا تھا کہ وہ بوڑھا ہو چکا ہے۔

جہاں بڑی ہوتی ہیں اور جوان لڑکیاں بھلا بابا سے کیسے محبت کر سکتی ہیں۔

چھ روز میں ایلی نے بابا کو یقین دلادیا تھا کہ لاجونتی اس پر دل و جان سے نذا ہو چکی

اور اس کے لئے ہر وقت کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے۔

اس کے بعد بابا روز ایلی کو لاجونتی کے قصے سنایا کرتا تھا۔ اور ایلی سمجھتا کہ بابا نے ایک الف

ایلی بابا بار کھی ہے۔ جسے حقائق سے کوئی تعلق نہیں اس لئے وہ بابا کے قصے یوں سنا کرتا تھا

طوطا جیٹا کی کہانیاں ہوں اس نے انہیں کبھی اہمیت نہ دی تھی۔ دل ہی دل میں وہ بابا کی

نہ پر ہنسا کرتا تھا پھر ایک روز رات کے نو بجے کے قریب بابا ایلی کے پاس آیا۔ اس وقت وہ

باہن ٹھن کر آیا تھا۔

”مرے“ ایلی نے کہا ”آج تو دو لہا بنے ہوئے ہو۔“

”ہاں یار۔ آج وہاں جانا ہے نا۔ اس لئے میں نے کما ذرا اچھے کپڑے پہن لوں۔“

”کھل جاتا ہے؟“

”ہی نہیں“ بابا بولا۔ اس نے اشارہ کر کے کہا۔

”وہاں کہاں؟“

”لاجونتی نے بلایا ہے۔“ بابا نے اس کے کان میں کہا۔

”مرے۔۔۔“ ایلی کو بھولی ہوئی لاجونتی یاد آگئی۔ اس نے بلوایا ہے۔“

”ہاں“ وہ بولا ”بیچاری کتنے دنوں سے بلا رہی ہے۔ کتنی ہے گھر والے کیس گئے ہوئے

مگر میں وہ اکیلی ہے۔“

”مرے“ ایلی سمجھ رہا تھا کہ بابا ویسے ہی گپ چلا رہا ہے۔ یا شاید لاجونتی اسے بلا رہی ہو۔

”ذرا میرے ساتھ چلو مرے۔“ بابا نے کہا ”وہاں تنک۔“

”کھل؟“

”ایسے معاملے میں ساتھی ہو تو اچھا رہتا ہے۔ صرف مکان تک چلنا پھر چلے آنا۔“ بابا نے

”گپ“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔

”میں کب اور کب۔“

”ابھی۔۔۔!“ ایلی نے حیرانی سے بابا کی طرف یوں دیکھا۔۔۔ جیسے وہ ہانگ ہو گیا ہو۔
دونوں چل پڑے ایلی سمجھ رہا تھا کہ شائد بابا کا دماغ چل گیا ہے۔ وہ چپ چاپ چلتے گئے۔ ایلی
ہی دل میں بابا کی سادہ لوحی پر ہنس رہا تھا۔

لاجوتی کے مکان کے نیچے وہ دونوں رک گئے۔ بابا نے کھڑے ہو کر سرگٹ سلگا کر شہر
بابا نے ایک ایک دو ماچیس جلائیں اور انہیں بچا دیا تاکہ انہیں وہاں رکنے کا بہانہ ملے۔ جب
نے چوتھی ماچس جلائی تو آہستہ سے مکان کا دروازہ کھلا۔ ہاتھ میں لائین اٹھائے لڑکے
دروازے میں کھڑی تھی۔ ”اچھا بھئی۔“ کہہ کر بابا اندر داخل ہو گیا۔ اور اہل حیرت
پھٹی پھٹی آنکھوں سے دیکھتا رہ گیا۔

وہاں سے واپس آتے ہی ایلی شام کی طرف گیا۔ وہ شام کو لاجونٹی اور بابا کی ملاقات کا دن
 سنانے کے لئے بے قرار ہو رہا تھا۔ ڈار میٹری میں شام اسے دکھائی نہ دیا تو اس نے گوند لورہا
 سے پوچھا کہ شام کہاں ہے۔

”یہیں تو تھا ابھی۔“ وہ بولے ”شاید کسی اور ڈارمیںٹری میں بیٹھا گئیں ہانک رہا ہو۔“
 دیر تک ڈارمیںٹریوں میں گھومتا رہا۔ جب وہ باہر آنے لگا تو راستے میں لالہ جی مل گئے۔
 ”کسے تلاش کر رہے ہو۔“ وہ بولے۔

”شام کو دھو بیٹ رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔ ”کیس چھٹی پر تو نہیں گیا۔“
 ”نہیں وہ تو حاضر ہے۔“ وہ بولے ”اس کہہ رہا تھا کہ اس کی طبیعت خراب ہے اور“
 گیا ہے۔“

”اوہ“ ایلی بولا ”طبیعت خراب ہے۔“
 ”لالہ جی کے جانے کے بعد وہ پھر سے شام کی ڈار میٹری میں داخل ہوا۔
 ”شام کہاں ہے۔“ اس نے داس سے پوچھا۔
 ”اس کی طبیعت اچھی نہیں“ داس نے جواب دیا ”سو گیا ہے۔“
 ایلی شام کی سیٹ کی طرف جانے لگا تو داس نے اس کی بانہ پکڑ لی۔ ”نہیں بار“
 سے بولا ”اے نہ جگاؤ۔ مشکل سے آنکھ لگی ہے۔“

پڑے ہوئے تھے۔ لہذا جی کے اور ایللی نے اپنا تمام سامان کتابیں صندوق چار پائیاں میز پر وہاں منتقل کر دی تھیں۔

چونکہ جی کے ڈیڑھ ماہ سے صاحب فراش تھا اس لئے کالج اور بورڈنگ کے لئے اس کے اکثر آگے لئے وہاں آ جایا کرتے۔ سارا سارا دن وہاں تاش کھیلنا جاتا کیرم چلنا۔ شطرنج کی بازیابی جاتیں۔ اس طرح وہ کمرہ کو من روم کی حیثیت اختیار کر گیا تھا ایک ایسا کو من روم جہاں ہر دمہاچو کڑی رہتی۔ اور جہاں شور مچانا اور دنگا فساد کرنا قابل اعتراض نہیں سمجھا جاتا تھا۔ وارڈ میں منتقل ہونے کا ایک فائدہ یہ بھی ہوا تھا کہ ایللی کو ہر وقت بورڈنگ میں رہا ہونے یا وہاں سے باہر جانے کی اجازت مل چکی تھی۔ دروازے پر بیٹھا ہوا چوکیدار اسے دیکھ آپ ہی آپ اٹھتا اور پھر بن پوچھے آہنی دروازہ کھول دیتا۔ شام کی ڈائریز سے نکل کر جب باہر آیا تو چوکیدار نے حسب معمول دروازہ کھول دیا اس وقت گیارہ بجے تھے جب وہ کمرے داخل ہوا۔ تو بتی جل رہی تھی اور جی کے اکثر دن بیٹھا کچھ لکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے لکھنے کا پڑا تھا اور قلم ہاتھ میں تھا۔

وہ چپ چاپ اپنے بستر کی طرف بڑھا۔ بستر جھاڑے ہوئے اس نے جی کے سے پوچھا۔ ”کیا لکھ رہے ہو؟“

جی کے نے کوئی جواب نہ دیا۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

کوئی جواب نہ پا کر وہ مڑا۔ جی کے کے قریب گیا۔ جی کے اسی طرح بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا بڑی محنت کر رہا ہے بیچارہ۔“ ایللی نے سوچا۔

دفترا“ اس کی نگاہ پیڑ پر بڑی عنوان کو دیکھ کر وہ پھونچکا رہ گیا۔ لکھا تھا میری پیاری سفینہ۔ ارے سفینہ کون تھی اور پھر پیاری جی کے اور پیاری۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے ایللی کے کے سب قریبی رشتہ داروں کو جانتا تھا اسے جی کے کی ہمیشہ والدہ کے نام معلوم تھے۔ سفینہ کون تھی۔ کیا جی کے بھی کسی کی محبت میں گرفتار تھا۔ نہیں نہیں یہ کیسے ہو سکتا ہے لڑکیوں سے محبت کرنے کے شغل سے سخت نفرت تھی وہ محبت کا مذاق اڑایا کرتا تھا اول ہوس سے تعبیر کرتا تھا۔ مصلحت مستقیم پر چلنے والا شخص کسی کو میری پیاری سفینہ لکھنے ایک دلچسپ دان۔ ایک اصولی آدمی۔ نہیں یہ نہیں ہو سکتا شاید یہ خط کسی عزیز کو لکھا ہو۔ ایللی نے یہ

دیکھ کر غصہ ہو گیا۔

دانش وہ ایک محبت بھرا خط تھا۔ جی کے اور یہ جذبات! ایللی حیرت سے اس سوئی ہوئی گھڑی کے طرف دیکھ رہا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا سمجھے کیا جی کے کی وہ شخصیت جس سے اپنی تمام غماض ایک ہروپ تھی۔

ایللی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ ابھی اسے انسانی کردار کے تضاد کا شعور نہ تھا۔ اس نے اوروں کا اور سوچ بچار میں کھو گیا۔ دفترا“ اس نے محسوس کیا کہ کمرے میں اس کا دم گھٹ رہا ہے۔ ہر وہ چپکے سے باہر نکل گیا۔

باہر گرگ کے درخت کے نیچے ساوی گھڑی ہنس رہی تھی۔ ”آؤ ہمارا جی آئیں نوں“ وہ ایللی نے ایللی نے ماہس کی ڈبہ ہاتھ میں تھا م رکھی تھی۔ سگرت ہونٹوں میں دبا رکھا تھا جسے ادا بول گیا تھا۔

ملدی نے اس ان سگرت کی طرف دیکھا۔ ”سگرت خود لگائیں گے ہمارا جی یا میں لگا دوں۔“ مسکرائی ایللی چونکا اس کو وہ رات یاد آگئی جب وہ سفید منزل کی سیڑھیوں میں ضد کے بدلتا کہ ساوی خود سگرت سلگا کر دے۔

”تو ہے۔“ ساوی بولی ”کوئی ایسا ضدی بھی نہ ہو۔“

ایللی نے سگرت سلگایا اور پھر کالج کی طرف چل پڑا۔

کالج کی عمارت چاندنی میں چمک رہی تھی۔ عمارت کی چھت پر شہزاد گھڑی تھی۔ ارے وہ کجا کر کا واقعی کالج کی چھت پر کوئی تھا۔ نہ جانے کون ہے۔ کوئی ہو گا اس نے سوچا۔ شاید لکھتا ہو۔ وہ سمجھا گیا کالج کا چوکیدار بہت سخت آدمی تھا۔ وہ پر پھل کو رپورٹ کرنے سے نہ ہٹتا تھا۔ اسی وجہ سے لڑکے رات کے وقت ادھر آنے سے ڈرتے تھے۔

ایللی نے اپنا رخ بدل لیا۔ وہ مغربی سمت کو چل پڑا جس طرف کالج کا لان تھا۔ اس وقت لان چاندنی میں جھلکا رہا تھا۔ ایللی کا جی چاہتا تھا کہ کسی بچ پر بیٹھ کر اس پھیلی ہوئی چاندنی کو دیکھ کر اسے ساوی اور شہزاد کی یاد دل رہی تھی لیکن لان میں جانا خطرناک تھا۔ اوپر سے چوکیدار نے دیکھ لیا تو۔ لان میں کوئی بچ بھی تو نہ تھا۔ تمام بچ لڑکوں نے لان سے اٹھا کر اس سے لمحہ مٹا کر رکھ دیئے تھے جہاں بڑی بڑی جھڑیاں تھیں۔ ایللی ان جھڑیوں کی طرف چل پڑا۔

دفترا“ وہ رکا۔ ان جھڑیوں سے آوازیں آ رہی تھیں۔ وہ محتاط ہو گیا اور ایک پودے کے

لیکن بچہ چھپ گیا۔
 ”بھگوان کی سوگند میں زہر کھالوں گا۔“ کوئی چلا رہا تھا۔ ”میرے پاس ہے۔ میرے نزدیک میں پڑی ہے سچ کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھا دوں گا۔“
 ”زہر — ٹریک — ارے“ ایلی نے شام کی آواز پہنچا لی۔
 شام یہاں — اور یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی چپکے سے بیٹھ گیا کہ کسی کو نظر نہ آئے کہ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی — ”بس اس قصبے کا یہی انجام ہو گا۔“

ہلا سبق

امتحان کے قریب آنے پر لڑکوں کے پریکٹیکل لیسنر شروع ہو گئے اور اسباق کی تیاری میں صرف ہو گئے پھر انہیں پریکٹیکل کے لئے مختلف سکولوں کی جماعتیں مل گئیں جہاں انہیں چوں کو ایک مینے کے لئے عملی طور پر پڑھانا تھا۔
 بیٹی اور ایس ڈی کے طلبہ کی ڈیوٹیاں مختلف سکولوں میں لگ گئیں۔ کسی کو دلی دروازے کے درے میں متعین کر دیا گیا کسی کو بھائی دروازے اور کوئی شیرانوالے بھیج دیا گیا۔ ان فہمائوں کی وجہ سے کالج کی زندگی کا شیرازہ بکھر کر رہ گیا۔ کالج لان کی جھاڑیوں میں رکھی ہوئی نام نہانیں ویران ہو گئیں۔ جماعتوں کے کمرے خالی دکھائی دینے لگے۔ بورڈنگ میں آنے جانے اور ملے لانے کے اوقات اور بورڈنگ کے معمولات بالکل بدل کر رہ گئے۔

خوش قسمتی سے ایلی کی ڈیوٹی سنٹرل ماڈل سکول میں لگ گئی جو ان کے ہوسٹل کے متصل واقع تھا۔ اس بات پر اسے بے حد خوشی تھی۔ اس کے علاوہ سنٹرل ماڈل سکول لاہور کے تمام سکولوں میں ایک معیاری سکول مانا جاتا تھا۔ وہاں کے اساتذہ جدید طریقہ تعلیم سے واقف تھے اور بچہ بہت ذہین سمجھے جاتے تھے۔

پہلی مرتبہ جب ایلی سنٹرل ماڈل سکول کی جماعت میں داخل ہوا تو کلاس ٹیچر نے اس کی فہم فہم کر دیکھا لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مار کر ہنسنے لگے۔

کلاس ٹیچر ایک بھاری اور بھدے جسم کا شخص تھا۔ اس کے ماتھے پر دائمی شکن تھا جیسے وہ کھانا کھود دیا گیا ہو۔ آنکھیں سوجی ہوئی تھیں۔ چہرے پر بے حسی کا دبیز پردہ پڑا تھا۔ اور ہونٹ مسڑھے تھے۔ اس کے ہاتھ میں چھڑی تھی جسے وہ بار بار میز پر بجاتا تھا۔

”میں سنٹرل ٹریننگ کالج سے آیا ہوں۔“ ایلی نے کہا ”میرا نام ایلیاس ہے۔“
 ”ہوں“ کلاس ٹیچر نے اسے گھورتے ہوئے کہا اور ویسے ہی بیٹھا رہا۔ پیچھے لڑکوں کی ہنسی کی

”بھگوان کی سوگند میں زہر کھالوں گا۔“ کوئی چلا رہا تھا۔ ”میرے پاس ہے۔ میرے نزدیک میں پڑی ہے سچ کہہ رہا ہوں۔ صبح آؤ گی تو دکھا دوں گا۔“

”زہر — ٹریک — ارے“ ایلی نے شام کی آواز پہنچا لی۔
 شام یہاں — اور یہ ساتھ کون ہے۔ ایلی چپکے سے بیٹھ گیا کہ کسی کو نظر نہ آئے کہ دیر خاموشی طاری رہی۔ پھر آواز آئی — ”بس اس قصبے کا یہی انجام ہو گا۔“

آواز یوں دفعتاً بند ہو گئی جیسے کسی نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا ہو۔
 ”ایسی باتیں مت کیجئے۔“ کوئی بولی۔

”تو کیسی باتیں کروں۔“
 ”پیار کی باتیں۔“

”اس پیار نے اپنا دیوالیہ نکال دیا ہے۔“
 ”کیوں۔“ وہ بولی۔

شام ہنسا۔ ”بس صبح شام مر رہے ہیں۔ پڑھنے کی فرصت کسے ہے۔ اور بھگوان جانے امتحان میں بطح کا انڈا ملے گا مرغی کا نہیں۔“

ایلی ہنسنے لگا واقعی شام ہے اس نے سوچا۔
 وہ ہنسی۔

”لیکن کچھ پرواہ نہیں۔“ شام نے کہا۔ ”چاہے شتر مرغ کا ملے پر اگر تم نے ایسی بے پرواہی کی تو پھر۔“

”اونہوں“ وہ بولی ”پھر وہی بات۔“
 ”بھگوان جانے میں جھوٹ۔“

اس کی بات اودھوری رہ گئی باغیچے میں خاموشی چھا گئی پر اسرار خاموشی ایلی نے محسوس کیا کہ اسے وہاں سے چلے جانا چاہئے وہ اٹھ بیٹھا اور دبے پاؤں باہر نکل آیا پھر وہ اپنے کمرے کی طرف چل پڑا کمرے میں پہنچ کر اس نے بجلی بجھادی اس کے دل میں ایک عجیب طوفان مچا ہوا تھا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ سب اپنی اپنی دھن میں کھوئے ہوئے تھے۔ ہر کوئی لاپرواہ

آوازیں آرہی تھیں۔

ایلی نے ایک بار پھر ملتجیانہ نگاہ سے کلاس ٹیچر کی طرف دیکھا لیکن وہ جوں کا توں بیٹھا۔

”تو مجھے کب سے کام شروع کرنا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہوں۔“ کلاس ٹیچر کی تیوری اور گمری ہو گئی۔

لڑکے قہقہے مار کر ہنس پڑے۔

اس پر کلاس ٹیچر کی توجہ لڑکوں کی طرف مبذول ہو گئی۔ اس نے چھڑی اٹھا کر زور سے بڑی باری۔ اور پھر اٹھ بیٹھا۔

”یہ کیا بد تمیزی ہے۔“ وہ غرایا۔

”کیا اسے اپنی تیز داری کے متعلق کچھ علم ہے۔“ ایلی نے سوچا۔

”اوہر آؤ وحید۔“ وہ غرایا۔ نیچے اترو۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ بھی اس جماعت کا ایک لڑکا ہو اور کلاس ماسٹر نے وحید کی طرح اسے بھی نیچے بلا رکھا ہو اور اب وحید کے بعد اس کی باری ہو۔ گھبرا کر وہ کمرے سے باہر نکل آیا اور برآمدے میں کھڑا ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد کلاس ٹیچر باہر نکلا۔

”ہوں۔“ وہ ایلی کو ڈانٹتے ہوئے بولا۔ ”تو تمہیں ملی ہے یہ جماعت۔“

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”اور ایک ماہ میں تم اس کا ستیاناس کر دو گے؟“

ایلی محسوس کر رہا تھا کہ اب وہ گامے کا۔ ”نکالو ہاتھ۔“

”دیکھو۔“ کلاس ٹیچر نے اسے پھر ڈانٹا۔ ”کیا تمہیں علم ہے کہ ایک ماہ کے بعد مجھے تین سو روپوت دینا ہو گی۔“

”جی۔“ ایلی بولا۔

”اور اگر میں نے گندی روپوت دی تو تم فیل کر دیئے جاؤ گے۔“

”جی۔“

”اگر مجھ سے اچھی روپوت لیتی ہے۔“ وہ بولا ”تو وعدہ کرو۔“

اس کے انداز میں اس قدر واضح دھونس تھی کہ ایلی جھٹ بولا اٹھا ”جی کرتا ہوں۔ کرتا

”وعدہ کرو کہ جو جدید طریقے تعلیم کے تم نے سیکھے ہیں وہ میری جماعت پر نہیں برتو گے۔“

نہیں آج سے بھول جاؤ گے۔ وہ محض ہاتھی کے دانت ہیں۔“

ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”یہ ڈنڈا ہے۔“ کلاس ٹیچر چھڑی ہلاتے ہوئے بولا۔ ”اس کا استعمال فرائضی سے کرنا ہو

”جی ہاں۔ جی ہاں۔“ ایلی چلایا۔

”سبق پڑھا کر یاد کرانا ہو گا چاہے سمجھیں یا نہ سمجھیں۔“

”جی۔“

”ہمیں نتیجہ دکھانا ہے پڑھانا نہیں۔“

”جی اچھا۔“

”تو تم وعدہ کرتے ہو۔“

”جی کرتا ہوں۔“

”تو جاؤ پڑھاؤ۔“ اس نے ڈرانائی انداز سے جماعت کی طرف اشارہ کیا۔

”بہت اچھا“ کہہ کر ایلی چل پڑا۔

”نہرو۔“ وہ بولا۔ ”تم ڈنڈا تو بھول گئے۔“

”اوہ۔“

کلاس ٹیچر نے چھڑی ایلی کے ہاتھ میں بٹھاتے ہوئے کئی بار پھر اسے ڈانٹا۔

”شہزادہ جو اسے بھولے۔ ورنہ تمہاری روپوت۔“

ایلی کانپتے ہوئے جماعت میں داخل ہو گیا۔

لڑکے کھڑے ہو گئے۔

”سٹ ڈاؤن“ ایلی نے کہا اور پیشانی سے ہینہ پونچھنے لگا۔

لڑکے جوں کے تو کھڑے رہے۔

”سٹ ڈاؤن۔“ اس نے دہرایا۔

وہ ہنسنے لگے۔

”بیٹھ کر ہنسو۔“ وہ بولا۔

انہوں نے ایللی کو منہ چڑانا شروع کر دیا۔ جماعت سے عجیب و غریب قسم کی آوازیں بڑا ہونے لگیں اس کو نے میں گھڑی چل رہی تھی ٹک ٹک ٹک ٹک۔ اوجھڑ چکی آتا ہیں رہی تھی گھمّر۔ گھمّر۔ گھمّر۔ گھمّر۔ پرلی طرف موٹر شارٹ ہو رہی تھی۔ دور الو بول رہا تھا۔ کیر مرغا ازان دے رہا تھا۔ بلیاں لڑ رہی تھیں۔

ایللی حیرت سے لڑکوں کی طرف دیکھ رہا تھا۔

دیر تک وہ ان کی طرف دیکھتا رہا۔

پھر کلاس ٹیچر نے دروازے سے جھانکا۔

دفعۃً کمرے پر بھیانک خاموشی طاری ہو گئی۔

”تم ڈنڈے کو پھر بھول گئے۔“ ماسٹر نے ایللی کو ڈانٹا۔ ”اور تم نے وعدہ کیا تھا کیا تھا؟“

نہیں؟“

ایللی نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

”تم اچھی رپورٹ کے قابل نہیں ہو۔“ وہ بولا

پھر کلاس ٹیچر جس سرعت سے آیا تھا اسی سرعت سے چلا گیا۔

جماعت میں پھر سے آوازیں گھونجنے لگیں۔

”فول۔ فول۔“ کوئی چلا رہا تھا اگرچہ سب کے ہونٹ بند تھے۔

”سلی۔ سلی۔ ٹون۔“ میاؤں دھپ۔ دھڑاڑاڑ دم۔“

ایللی سر تھام کر کرسی میں بیٹھ گیا۔

وہ۔ وہ۔ وہ۔

جوں جوں امتحان قریب آتا جا رہا تھا کالج پر اداسی کا ایک دبیز پردہ پڑتا جا رہا تھا۔ لڑکوں کا خوش گلیاں ختم ہوتی جا رہی تھیں۔ لڑکیوں کے چہروں سے مسکراہٹیں مفقود ہوتی جا رہی تھیں۔ پروفیسروں کا رویہ حیرت انگیز طور پر بدل چکا تھا۔ اب وہ کالج کے لڑکوں سے یوں سلوک کرنے لگے تھے جیسے وہ طالب علم نہیں بلکہ ہم کار ہوں۔

لڑکوں میں پڑے ہوئے بچوں سے رنگین قمقمے سنائی دینے بند ہو گئے تھے۔ وہاں یا تو ہنسنے چلائی رہتی اور یا کبھی کبھار ہچکیوں کی آوازیں سنائی دیتیں۔ وہاں سے لڑکیاں باہر نکلتیں تو بے معلوم ہوتا جیسے روٹی روٹی ہوں۔

شام کی رنگین باتیں بالکل ختم ہو چکی تھیں۔ اس کی گھنی بھنویں اور بھی بوجھل ہو گئی تھیں۔

”ایلی شام ہے تمہیں۔“ ایللی شام سے پوچھتا۔ ”تم وہ شام دکھائی نہیں دیتے۔“

”وہ شام ہوں تو دکھائی دوں۔“ وہ جواب دیتا۔

”وہ شام کیا ہوا؟“

”شام ختم۔ اب تو رات پڑ چکی ہے۔ جدائی کی رات۔“

”ارے اتنے ہی مرچکے ہو تم اس مرہن راواہ پر۔“ ایللی نے بھانڈا پھوڑ دیا۔ ”شاید تم مجھ رہے ہو مجھے معلوم نہیں وہ چلایا۔“ مجھے معلوم ہے۔“

شام نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”تمہیں ہی کیا۔“ وہ بولا ”سب کو معلوم ہے۔“ سب جانتے ہیں حتیٰ کہ ہماری لیبارٹری کا

بچہ بھی جانتا ہے۔ صرف ہم دو ہیں۔ راواہ اور میں جو ابھی تک اپنے آپ کو فریب دیئے جا رہے ہیں کہ کوئی نہیں جانتا۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ ایللی نے کہا۔

”پوچھو۔“ شام بولا۔

”راواہ میں وہ کونسی خوبی ہے۔ جو تمہیں پسند آگئی ہے۔“

وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔ اور پھر اپنی مست آنکھیں ایللی کی آنکھوں میں ڈال کر کہنے لگا۔

”صرف ایک۔ اور اس ایک خوبی پر ساری دنیا قریان کی جاسکتی ہے۔“

”وہ کیا؟“

”وہ مجھ سے محبت کرتی ہے۔ عورت میں بس یہی ایک خوبی ہوتی ہے جس پر مرد مرتا ہے۔“

”نہ انقیات پڑھتے ہو۔ تمہیں تو جانا چاہیے۔ باقی جو ناک نقشے اور رنگ کی بات ہے۔ سب باتیں میں منہ زبانی باتیں۔“

”کیا واقعی وہ محبت کرتی ہے تم سے۔ سچی محبت۔“

نہیں ہو سکتا تھا۔ لیکن خط پڑھنے کے بعد ایللی کے مفروضات کا محل دھڑام سے
اوپر اٹھ اٹھا۔ کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا۔ سرجل اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ جی کے
دلے بدلے مؤثر حقیقت اس راز کی وجہ سے تھے جسے وہ یوں سینے سے لگائے بیٹھا تھا۔ نہ
بنا وہ کون لڑکی تھی۔ نہ جانے وہ کہاں رہتی تھی۔ نہ جانے وہ دونوں کبھی ملتے بھی تھے یا
نہیں۔ البتہ ایک بات اس خط سے واضح تھی کہ جی کے اپنی محبوبہ کے سامنے سرخوں ہونے کا
اہل نہ تھا۔ اس کے انداز میں پردگی نہ تھی لیکن اس کے باوجود جی کے کے جذبات کی شدت
ہاتھ کن تھی۔

جس روز وہ ایک دوسرے سے جدا ہونے والے تھے ایللی کے منہ سے بات نکل گئی۔
”جی کے“ وہ بولا ”مجھے معلوم نہ تھا کہ تمہاری زندگی میں دکھ کا عنصر اس حد تک حاوی
ہو گیا تھا کہ تمہارا رویہ بد مزاجی کا شاہد ہے۔“

اس پر جی کے کی ٹانگ یوں تن گئی جیسے کسی نے تلوار نکال لی ہو لیکن وہ خاموش رہا۔
”پہلے مجھے تمہاری محبت کا علم نہ تھا۔“ ایللی نے کہا ”لیکن اب میں جانتا ہوں کہ تم دکھی
ہو۔“

”نہیں نہیں۔“ جی کے سنجیدگی سے بولا۔ ”میرے دکھ کو چھوڑو۔ مجھے تو صرف یہ دکھ ہے
کہ وہ دکھی ہے۔ اس کے دکھ کا کوئی اندازہ نہیں کر سکتا اور — اور —“ جی کے کی
انگوٹھوں میں آنسو آگئے۔

”اس کے لئے محرومی کے سوا کچھ نہیں کچھ نہیں۔ مجھ سے اس کا دکھ دیکھا نہیں جاتا۔“
اس وقت وہ سلمان باندھ رہے تھے۔

”کب سے دکھی ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بہل سے“ وہ بولا۔

”ازل سے!“

”بہل۔ ازل سے۔“ جی کے نے بڑے دکھ سے کہا۔ صدیاں گزر گئیں۔ صدیاں۔ اب تو
کچھ بچاری کی ہڈیاں بھی گل سڑ گئی ہیں۔ ایک ڈھانچہ رہ گیا ہے اور وہ صرف اسی لئے جی رہی
ہے صرف ایک آرزو۔ ”ایک امید کی زور پر۔“ جی کے کے منہ سے ایک سسکی سی نکل گئی اور
”ازل سے“ کی طرف دوڑا۔ غالباً وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ کوئی اسے اس عالم میں دیکھے۔

”سچی محبت کا تو اپنے کو پتہ نہیں کچھ البتہ پیار کرتی ہے۔ جیسے میں بچے کو کیا کرتی ہے۔“
عمر میں ماما مل گئی اور مجھے کیا چاہئے۔“

”تو کیا ماما کی تلاش تھی تمہیں۔“

”سچی کو ہوتی ہے۔ کیا تمہیں نہیں!“ وہ ہنسنے لگا۔ ”یاد رہے فلسفہ چھوڑو۔ مجھے تو غم کھائے جا
رہا ہے اب میں کیا کروں گا۔ ہم کیسے دن گزارا کریں گے۔ پرمانہ کرے ہم دنوں میں ہو
جائیں۔“

شام کی باتیں عجیب تھیں۔ اس کی شخصیت میں عجب مٹھاس تھی اور سب سے بڑھ کر
کہ وہ تمام باتیں بلاتامل کہہ سکتا تھا جو ایللی کے دل میں بھی تھیں لیکن وہ انہیں زبان پر لانے کا
اپنے آپ سے اظہار کرنے سے ہچکچاتا تھا۔ ”دُرا تھا غالباً“ اسی وجہ سے ایللی کو شام سے بہت
تھی۔

اس روز شام کی بات سن کر ایللی نے محسوس کیا جیسے اس نے ایللی کے دل کا راز فاش کر دیا
ہو۔ جیسے وہ ایللی کے اس راز سے کما حقہ واقف ہو اور اس بات کو اچھی طرح جانتا ہو کہ ایللی
شزاو سے کیوں محبت تھی۔ اور وہ ایللی کا راز فاش کر رہا تھا۔ راوہا کا تو محض بہانہ تھا۔

ایللی کو پسینہ آگیا اس کی زبان بند ہو گئی اس کے بعد نہ جانے شام کیا کہہ رہا تھا۔ شاید
سرسری جسم کی تعریف کر رہا تھا۔ یا اس کے جسم کے غم و بچ کی بات کر رہا تھا۔ ایللی کے
اس وقت شزاو کھڑی تھی۔ اس کی آنکھیں نمناک تھیں۔ کہہ رہی تھی۔

”میں نے اس سودے میں کچھ پایا نہیں کھویا ہے۔ ایللی میں نے اپنا آپ کھو دیا ہے۔“
جانتے ہیں کہ میں اپنے آپ سے گئی ہوں۔ ایک تم ہو جس نے آج تک اس بات کو نہیں پایا۔
جی۔ کے کی ٹانگ ٹھیک ہو چکی تھی لیکن وہ ابھی تک اسی کمرے میں مقیم تھی۔

آخری ایام میں کمرہ بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ بیماری کے ایام میں جی کے کی طبیعت
کیفیت کچھ عجیب سی تھی۔

جس روز سے ایللی نے اس کا محبت نامہ پڑھا تھا جی کے کے متعلق ایللی کا نقطہ نظریہ
تھا پہلے اس کا خیال تھا کہ جی کے جذبات سے قطعی طور پر عاری ہے۔ دوستوں سے تو وہ
طور پر اظہار محبت کیا کرتا تھا لیکن ایللی کے اندازے کے مطابق وہ لڑکیوں سے محبت کرنے کا
نہ تھا چونکہ بنیادی طور پر وہ خود پسند شخص تھا۔ اور جو اس حد تک خود پسند ہو ایللی کے

نئی اہلی سوچنے لگا اس میں شہزاد کا کیا تصور کہ وہ شادی شدہ تھی۔ شہزاد نے تو اس کا ہاتھ
مانگے خود اہلی نے اس کا ہاتھ تھاما تھا اور ہاتھ تھاتے ہوئے تو اس کو احساس نہ تھا کہ اسے
عزت ہے اس وقت تو محض ہوس کی وجہ سے اس نے ہاتھ تھاما تھا۔ مانا کہ اس کا کوئی
فائدہ صرف ایک حسین عورت کا قرب۔ اور وہ قرب اسے حاصل ہو گیا تھا۔ اب وہ

کھڑکی سے باہر ہرے بھرے کھیت دوڑ رہے تھے۔ دور پہاڑوں کی چوٹیاں دکھائی دے رہی
میں اور اس کے اوپر نیلا آسمان۔ پھر اسے وہ دن یاد آگیا جب وہ براتیوں کی حیثیت سے شہر لوگو
رہے تھے۔ جب شہزاد زلف نے ڈبے میں سبز گٹھڑی بنی بیٹھی تھی اور محلے کے لڑکے باری بارنگ

صرف اس لئے دکھی تھا کہ وہ شہزاد کو اعلانیہ اپنانا چاہتا تھا۔ یہ تو ایک ناممکن خواہش قرار پوری نہ ہو سکتی تھی لہذا اسے آتش رقابت میں جلنا شروع کر دیا تھا۔ وہ شہزاد کے فائدے ابھرنے ہوئے تاروں کو گنا کرتا تھا۔

ایلی کو ان باتوں پر از سر نو ندامت ہو رہی تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس نے قدر نہیں کی۔ اس کی محبت کی قدر نہیں کی۔ اس کی قربانی اور جرات کی قدر نہیں کی۔ ”نہیں نہیں۔ اب میں ایسا نہیں کروں گا۔ وہ دیوی ہے دیوی۔ اور میرا کام ہے اس کے آگے سب نوانا۔“

ہاں ہاں۔ اب میں اس کے پاس پہنچ لوں اب کی بار۔

محلے کا میدان ویران پڑا تھا۔ غالباً محلے کے لڑکے دوسری طرف کھیل رہے تھے۔ غالباً گرمی کی وجہ سے اپنے اپنے مکانات کی چھتوں پر جا چڑھی تھیں۔ اس وقت غالباً ہوں گے لیکن گرمیوں میں رات کے ۹ بجے تک تو میدان میں چل پھل رہا کرتی تھی۔ ایلی نے اوپر کھڑکیوں کی طرف نگاہ ڈالی۔ رابعہ کی کھڑکی بند تھی۔ اوپر کے چہارہ کھڑکی کھلی تھی۔ لیکن وہاں کوئی نہیں تھا۔ جب وہ چھتی گلی میں داخل ہوا تو مائی نتھی کی سن کر ڈر گیا۔ اس کا خیال تھا کہ وہاں کوئی نہیں۔ مائی نتھی اتنی لاغر اور نحیف تھی کہ بچہ کے دروازے کے ساتھ لگی ہوئی وہ ایلی کو دکھائی نہ دی تھی۔

”کون ہے؟“ مائی نتھی نے پوچھا۔

”میں ہوں۔“ ایلی نے اسے پہچانے بغیر جواب دیا۔

”میں کون۔“ اس نے پوچھا۔

”ایلی۔“ وہ بولا۔ ”سلام کہتا ہوں۔“

”ہے اپنا ایلی ہے۔“ اللہ تجھے خوش رکھے۔ تیرا گھر آباد ہو۔ ہے۔ اب کی بار تو بتاؤ۔

سے آیا ہے تو خیر سے تو ہے نا۔

”ہاں ہاں۔“

”اے اچھا کیا دیر سے آیا تو۔ یہاں روز آکر کیا کرتا ہے تو نے۔ لڑکے اپنے کھانے پکارتے لگتے ہیں۔ اچھا ہوا جو دیر سے آیا تو۔ جان چھنی تیری۔ اس دلدل میں پھنس کر تو نے کیا کیا کیا۔“ خواہ خواہ۔ اس کے تو لپھن ہی ایسے ہیں۔“

ایلی اس کی بات سن کر چونکا۔ نہ جانے کیا کہہ رہی تھی۔ ایلی نے اس کے بے معنی باتوں نہیں پلنے کے لئے بات کا رخ بدلا۔

”جو خیریت سے ہے ناں۔“

”خیریت سے ہے ناں۔“

”چھانو کل ملوں گاں۔“ کہہ کر وہ چل دیا۔

لیکن وہ رہ کر اس کی بات یاد آ رہی تھی کس کے لپھن کی بات کر رہی تھی۔ وہ اور دیر نے کون سا فائدہ جتا رہی تھی۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔

آگے ماراج

رابعہ کا چہرہ منتقل تھا۔ شہزاد کو حیرت میں ڈالنے کے لئے وہ دبے پاؤں اوپر چڑھنے لگا۔ اوپر پہنچ کر وہ رک گیا اور چہرے کا جائزہ لینے لگا۔ اندر شہزاد چوکی پر بیٹھی تھی۔ اس کا تذبذب صفر اکڑوں بیٹھا تھا۔ صفر نے اپنی آنکھیں شہزاد پر گاڑ رکھی تھی۔ اس کے رہے پر عجیب سا تبسم تھا۔

ایلی یہ منظر دیکھ کر گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا جیسے زینہ بیٹھتا جا رہا ہو اور وہ گرجا جا رہا ہو۔

ایلی کو دیکھ کر صفر گھبرا گیا اور فوراً ”سرک کر پیچھے ہو گیا۔ ایک ساعت کے لئے شہزاد کی لموں میں تذبذب لہرایا۔ پھر وہ سنبھل کر بولی۔

”آگے ماراج۔“ اس کی آواز میں خوشی کا عنصر نہ تھا۔

”ہی۔ آگے۔“ وہ بولا غالباً ”اس کی آواز میں دھار تھی۔

”تو آ جاؤ۔“ وہ ہنسی۔

”کئی خشک تھی وہ ہنسی۔“

ایلی سوٹ کیس اٹھائے آگے فرحت کے گھر کی طرف نکل گیا۔

فرحت اور امل سے باتیں کرتے ہوئے وہ مسلسل شہزاد کے چہرے کی طرف دیکھتا رہا کہ اب آکر اسے لے جائے۔“

”میں تجھے کر لے کھاؤں۔ لوکب سے اوھر چائے بنی پڑی ہے چلو چائے تو پی لو پیلے۔“

لیکن اس روز شہزاد فرحت کی طرف نہ آئی۔ البتہ اس کے آنے کے چند منٹ بعد جھومتا ہوا آیا اور رسمی طور پر ایلی کی مزاج پر سی کرتا ہوا اپنے مکان کی طرف چلا گیا۔ یہ ایک غیر معمولی بات تھی۔ یہی نہیں کئی ایک باتیں غیر معمولی تھیں۔ اور پھر اس کا دل شہزاد کے اس قدر قریب بیٹھنا اور آنکھوں میں وہ تبسم اور پھر ایلی کو دیکھ کر گہرا کرچہ بچہ ہوا۔ یہ سب باتیں بڑی عجیب تھیں۔ پھر شہزاد کا وہ روکھا لہجہ اور خشک رویہ۔ یہ سب کیا تو اہلی سوچ رہا تھا۔ نہ جانے اس کا کیا مطلب ہے۔

اس کی نگاہوں تلے میں نقی آگئی۔ ”اے اچھا کیا جو تو دیر سے آیا۔“ وہ بولی ”اچھا کیا جو جان چھٹی اس کے تو پھن ہی ایسے ہیں۔“

دفترا میں نقی کی بے ربط باتیں معافی سے بھر گئیں۔ ان میں منہمک پیدا ہو گیا خطرناک، ڈراؤنا منہمک۔ ایلی بری طرح لڑکھڑا رہا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے زلزلہ آگیا ہو۔ دیوار گھوم رہے تھے جھول رہے تھے۔ چاروں طرف سے اندھیرا یورش کر رہا تھا۔ وہ دیوار اٹھا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ شہزاد کے چوہارے میں جا گھسے اور با آواز بلند اس سے کہے۔

”اچھا کیا جو میں دیر سے علی پور آیا۔ میری جان چھوٹ گئی۔“ اور پھر وہ واپس آکر آرام سے سو جائے۔

رت آئے رت جائے

ساری رات وہ کانٹوں پر پڑا رہا۔ اس کے ذہن میں عجیب و غریب منظر آرہے تھے۔ اب وہ کھڑکیوں میں کھڑے ایک دوسرے سے باتیں کر رہے ہیں۔ ان کے مکانات کھڑکیاں ایک دوسری سے جڑی ہوئی تھیں۔ صدف نے اپنی آنکھیں شہزاد کی آنکھوں میں ڈال رکھی ہیں۔ وہ مسکرا رہا ہے۔ شہزاد اسے اشارے کر رہی ہے۔ ابھی نہیں ذرا ٹھہرا۔ بچہ بچہ رہے ہیں۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوہارے میں آتا ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑ رہا ہے۔ اب اس نے شہزاد کو جگایا۔ شہزاد آنکھیں کھول دیں اور اور — اس خیال پر ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جلنے لگا۔

پھر اسے خیال آتا کہ اب وہ چپ چاپ کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوہارے میں آتا ہے اب وہ دبے پاؤں اس کی چارپائی کی طرف بڑ رہا ہے۔ اب اس نے شہزاد کو جگایا۔ شہزاد آنکھیں کھول دیں اور اور — اس خیال پر ایلی تڑپ اٹھتا۔ آگ کا ایک شعلہ نہ جلنے لگا۔

سے اٹھتا اور اس کے تن بدن کو اپنی لپیٹ میں لے لیتا

”تو پھر روتی کیوں ہو؟“

”رورہی ہوں کیا؟“ وہ تہقہ مار کر نہی۔

”تم خواہ مخواہ جھگڑتی ہو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”چھوڑو اب۔“

”آجائے پی لے۔“ فرحت نے شزاو سے کہا۔

”پلاوے۔“ شزاو نے جواب دیا۔ ”ہمارے ہاں کوئی پینے نہ آئے تو پھر ہمیں ہی پینے کے لئے آنا ہو گا۔ کیوں مہاراج۔“ وہ ایللی کی طرف مخاطب ہوئی۔ ”ہم درشن کرنے کے لئے آئے ہیں۔“

ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے۔

”دکشنا دوتا۔“ فرحت ہنسنے لگی۔

”دیں گے۔“ شزاو بولی۔ ”دیو تابات تو کریں۔“

”یہ دیو تاپتھر کا نہیں بنا“ ایللی نے کہا۔

”ہم کب کتے ہیں۔“ وہ نہی۔

”کہتی نہیں سمجھتی ہو۔“ ایللی نے روکے انداز سے جواب دیا۔

”اونہوں۔“ شزاو بولی۔ ”ابھی نہیں۔ ابھی مہاراج غصے میں ہیں۔ ابھی وال نہیں گئے۔“

”گی۔“

”ہاں ہاں۔“ ایللی بولا۔ ”ابھی چولے پر چڑھائے رکھو۔“

”ایللی سے جیتے تو جانیں۔“ فرحت بولی۔ ”ہمیں کو لا جواب کرنا آتا ہے تمہیں۔“

”گرو مہاراج سے کیسے جیتوں۔“ وہ بولی۔

عین اس وقت جانو آگئی۔

”ہے ایللی آیا ہے۔ کب آیا تو۔ اب کی بار تو تیری شکل ہی نہیں دیکھی۔“ پھر وہ شزاو سے

مخاطب ہو کر کہنے لگی۔ ”وہ آیا ہے۔ تیرا صفدر ادھر بیٹھا انتظار کر رہا ہے۔ کتا ہے سارے بار

جارہا ہوں۔ بندے ٹھیک کرانے ہیں تو دیدے۔“

”ہے میں تو بھول ہی گئی۔“ شزاو چلائی۔ ”میں ذرا بتا آؤں اسے۔“ اور پھر ایللی کی طرف

دیکھے بغیر بھاگ گئی۔

ایللی نے محسوس کیا جیسے صفدر کی آمد کی بات سننے شزاو کا رنگ ہی بدل گیا ہو۔ نہ جانے؟

”مقامی حقیقت پر مبنی تھا کہ صفدر کی خبر سن کر شزاو کی آنکھوں میں وہی مسکراہٹ لہرائی

”اس کی آمد پر لہرایا کرتی تھی۔“

”بچے کے بعد ایللی باہر جانے کے لئے تیار ہو گیا۔“

”ملنا جائے گا تو۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”ہاں ہاں ہوں۔ لوگوں سے ملنے کے لئے۔“

”آج لوگوں کو ملنا یاد آ گیا

”نہی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”تو کیا شزاو سے ناراض ہو؟“

”نہی تو۔“ وہ بولا۔

”دوہر گیا کیوں نہیں۔“

”ہاں گے۔“

”فرحت بولی۔“ ”تو بھی حد کرتی ہے خواہ مخواہ۔“

”نہی بیٹی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”نہ کسی سے اتنا بیٹھا ہوتا چاہیے اور نہ اتنا کڑوا۔ جا کر مل لے

”اور نہ لوگ کیا کہیں گے۔“

”مخے لوگوں کی پردا نہیں اٹاں۔“ ایللی بولا۔

”دیکھنا ایللی۔“ فرحت بولی ”اب تو تعلیم سے فارغ ہو گیا ہے اب تجھے یہاں نہیں رہنا

”ہاں اسی جھنجھٹ میں پھنس جائے گا۔ اب تو تجھے کسی نہ کسی نوکری پر چلے جانا چاہئے۔“

”اگلی تو نتیجہ نہیں نکلا۔ ابھی سے نوکری کہاں ملے گی۔“ ایللی اسے گھورنے لگا۔

”بائے ہمیں لکھا ہے کہ فوراً اسے بھیج دو۔ نتیجہ نکلنے سے پہلے ہی نوکری مل سکتی ہے۔“

”نہی تباب دیا۔“

”ہاں بیٹا۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت ضائع نہ کرنا۔ اتنے سال ضائع کر چکا ہے اس طرح تو

”نہی کبھی نہیں سنو رہے گی۔ تباہ رہے گی ساتھ ہماری بھی۔“

”ایللی غاموش ہو گیا۔“

”تو کیا میری بات مان لے گا۔“ ہاجرہ نے پوچھا ”دیکھ میں اک تیری امید کے آسرے پر جی

”ہاں ہاں ہوں۔“ ہاجرہ کی آنکھوں میں آنسو بڑبا آئے۔

”ایا ہے تو ٹھیک ہے۔“ وہ بولی ”میں کیا جانتی نہیں کہ آیا ہے۔“

ایلی کو دھچکا سا لگا۔

”چائے نہیں پلائے گی کیا۔“ ایلی نے دل کڑا کر کہہ دیا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ ویسے ہی کام میں مصروف ہوئی۔ ”جا جانو لے آجائے۔ لگا دے اس میز پر۔“

یہ انتہائی۔ ایلی کا جی چاہا کہ اٹھ کر چلا جائے لیکن وہ ضبط کئے بیٹھا رہا۔ جانو چائے لانے کے لئے نیچے چلی گئی تو اس نے شنراؤ پر نگاہیں گاڑ دیں لیکن وہ اس قدر مصروف تھی کہ اس نے انہیں اٹھا کر بھی نہ دیکھا۔

”یہ مفدر یہاں کب سے آتا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جب میں بلاتی ہوں آتا ہے۔“ اس نے روکھے انداز سے جواب دیا۔

”دن میں کئے بار بلاتی ہو۔“

”جتنی بار دل چاہے۔“ وہ بولی۔

”بہت دل چاہتا ہے تمہارا۔“ ایلی نے نفرت سے پوچھا۔

”اپنا اپنا دل ہے۔“ وہ بولی۔ ”مجھ پر کون بندشیں ڈال سکتا ہے۔“

ایلی حیرت سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ کیا یہ وہی شنراؤ تھی جو ابھی ابھی فرحت کے پاس بیٹھے ہوئے اسے دیوتا کہہ رہی تھی۔

”شنراؤ کیا تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا ”کہ وہ ایک اوباش آدمی ہے۔ شرابی ہے اور اسے کسی کی عزت کا خیال نہیں۔“

”جس کی عزت ہو وہ سوچے یہ باتیں۔ مجھے ان سے کہا۔“ اس نے جملے کٹے انداز سے ختم کر دیے۔

ایلی اٹھ بیٹھا اور شنراؤ کی طرف بڑھنے لگا۔

”نہ مہربانی کرو۔“ وہ ہاتھ جوڑ کر طنزاً بولی۔ ”مجھے آرام سے جینے بھی دو گے یا نہیں۔“

”لیکن تم نہیں سمجھتی۔“ وہ چلایا۔

”میں سمجھتا نہیں چاہتی۔ مجھے کوئی نہ سمجھائے۔“

”تو کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”چلا جاؤں گا میں“ ایلی نے کہا۔

”دو ایک دن میں ملے۔“ فرحت نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بولا ”دو ایک دن میں“

”اور اگر شنراؤ سے صلح ہو گئی پھر بھی۔“ فرحت نے چمک کر کہا۔

”اے ہے تو چھوڑو۔ خواہ مخواہ ایسی بات کرتی ہے۔“ ہاجرہ بولی۔ اور دیکھ شنراؤ سے

ہنستے جدا ہونا غصے میں نہیں۔ کیا فائدہ ہے؟“

”اس بے چاری نے تیرا کیا بگاڑا ہے۔“ الٹا اس نے تو ہم سے بہت ہی اچھا سلوک

ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”ہوں۔“ ایلی بولا اور چل پڑا۔

اجنبی عورت

میڈھیوں کے قریب پہنچ کر دو گھنٹہ اس نے باہر جانے کا ارادہ بدل دیا اور شنراؤ کے کمرے کی طرف چل پڑا وہ سوچ رہا تھا شاید یہ میرا وہم ہے ناحق اس پر شک کر رہا ہوں۔ شاید کوئی بات نہ ہو۔

اسے وہ دن یاد آگیا۔ جب سنٹر ٹینگ کالج میں جانے سے پہلے وہ رابعہ کے چہرے شنراؤ سے ملا تھا۔ شنراؤ اس کے رویہ آکھڑی ہوئی۔

”تم سمجھتے ہو۔“ اس نے کہا۔ ”کہ میں تمہاری طرف اس لئے بڑھی تھی کہ مجھے پوری کرنا تھی۔“ الٹا میں نے تو ہوس پوری کرنے کے سب راستے بند کر دیے ہیں۔ میں اپنے خاوند سے بگاڑ کر لیا۔ میں اس کے ساتھ نہیں جاتی۔ یہاں میں کس لئے بیٹھی ہوں۔ لئے کس امید پر۔“

ایلی گھبرا گیا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا تھا۔ یقیناً اس کا وہم تھا۔ ناحق اس پر شک تھا۔ جب وہ شنراؤ کے کمرے میں پہنچا تو وہ چپ چاپ بیٹھی مشین پر کام کر رہی تھی۔

”یہ دیکھ کون آیا ہے۔“ جانو چلائی۔

شنراؤ چپ چاپ کام کئے گئی۔

”میں نے کہا ایلی آیا ہے۔“ جانو بولی۔

ہاں ہاتھ لگوں سے ملے۔ رضا تو امر تر جا چکا تھا۔ چلو ہم کی طرف ہی سہی یا بھا اور جاہ کے
مڑا جائے۔ لیکن یہ محسوس کر کے کہ اس کا چہرہ ضبط کے باوجود بھیاںک دکھائی دے رہا ہے۔
باز قریب کی طرف چلا گیا اور نہ جانے کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔

وہ سوچ رہا تھا میں کیا کروں؟ کیا کروں میں؟

شہزاد وہ شہزاد نہیں تھی۔ کہاں وہ ہنسی کھیلتی مسکراتی ہوئی شہزاد اور کہاں یہ عورت۔ ایسا
لوں ہو تا تھا جیسے وہ ایک اجنبی عورت ہو جسے ایلہی نے پہلے کبھی نہ دیکھا ہو۔ ہنسی تو وہ تھی مگر
اس کی وہ ہنسی کسی اور کے لئے مخصوص ہو چکی تھی اور پھر صفر کے لئے۔ ایلہی کے دل میں
یہی ہی تھی۔ اگر شہزاد ویسے ہی ٹھکرا دیتی تو اسے تکلیف نہ ہوتی۔ کسی ایسے کے لئے ٹھکراتی
اس کی حیثیت کا مالک ہوتا۔ جس کی کوئی شخصیت ہوتی۔ کچھ بھی ہوتا لیکن صفر ایک خود غرض
لڑکا۔ یہ سوچ کر اس کا دل ڈوب جاتا۔

اس وقت اس کی نگاہوں کے سامنے صفر ابھرتا۔ اس کی آنکھوں میں تحقیر بھری مسکراہٹ
ملتی اور وہ ایلہی کی طرف دیکھتا۔

”میں نے تو کہا تھا بانٹ کر کھائیں کتنی منتیں کی تھیں کہ ہمیں بھی اس دلہیز پر بیٹھنے کی
بات دو۔“ وہ قہقہہ لگاتا۔ ”لیکن تم کب سنتے تھے“ — پھر وہ ایڑیاں اٹھا کر گلے لگتا
”خدا تمہارا۔“ — اور یوں اشارے کرتا جیسے کہ رہا ہو۔ ”اب چھٹی کرو بھائی۔“
— پھر وہ شہزاد کی طرف متوجہ ہوتا اور دوسرا مصرع اسے مخاطب کر کے کہتا ”اے دلربا ہوں
لڑکا۔“

مگر بچ کر بھی ایلہی کو سمجھ میں نہ آیا کہ کیا کرے۔ بہر حال ایک بات واضح تھی اس کا ایلہی
ارمنا رہتا لیکن ہو چکا تھا۔ اسے جانا ہی ہو گا۔ اس کے بغیر چارہ نہ تھا۔ لیکن وہ چاہتا تھا کہ
اپنے جائے۔ شاید کسی روز شہزاد کے۔ تم خود مجھے چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ وہ سبھی کچھ برداشت
رہتا تھا لیکن یہ الزام برداشت نہیں کر سکتا تھا کہ اس نے شہزاد سے بے وفائی کی۔

”چاہتا تھا کہ جانے سے پہلے ثابت کر دی کہ شہزاد اس سے بے وفائی کر رہی ہے لیکن اس
کے پاس کوئی ثبوت نہ تھا۔ بات تو واضح تھی۔ شہزاد کی ہر حرکت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ اس کی
انتہا توجہ صفر پر مرکوز ہو چکی ہے اور اب وہ ایلہی کو محض ایک رکاوٹ سمجھ رہی ہے۔ لیکن وہ
چاہتا تھا کہ ڈرامائی انداز سے اس وقت ان کے سر پر جا کھڑا ہو جب وہ ایک دوسرے سے محبت کا

”مجھ سے یہ سوال پوچھنے کا کسی کو حق نہیں۔“ وہ اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی آنکھوں سے
نفرت کے شرارے نکل رہے تھے۔

”شہزاد یہ تم کہہ رہی ہو۔“ وہ چلایا۔

وہ خاموش رہی۔

”میں کیا پوچھ رہا ہوں؟“

”میں کیا مجرم ہوں کہ جواب دیتی پھروں۔“

وہ چپ چاپ پھر سے کرسی پر بیٹھ گیا اور وہ مشین چلانے لگی۔ دیر تک وہ دونوں چپ چاپ
بیٹھے رہے۔

کچھ دیر کے بعد جانو کی نیچے سے آواز آئی۔

”یہ آگیا ہے صفر۔“ وہ بولی۔

”اچھا میں آئی۔“ یہ کہہ کر وہ فلاں نہیں بھرتی ہوئی میزھیاں اترنے لگیں

ایلہی چپ چاپ اٹھا اور نہ جانے کدھر کو چل پڑا۔ اس کے حواس معطل ہو چکے تھے۔ اسے
کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ دماغ میں ایک بھیاںک خلا پھیل رہا تھا۔ اس وقت نہ اسے غم تھا نہ
غصہ۔ اس کا ذہن ایک سادہ ورق میں تبدیلی ہو چکا تھا۔ اس کے ارد گرد چاروں طرف لامحدود
وسعتیں پھیل گئی تھیں۔ اور ان میں ایلہی گویا کھو گیا تھا۔ وہ بوجھل اور بھیاںک خلا یوں جھول رہا
تھا جیسے سمندر ہو۔ اس میں لہریں اٹھ رہی تھیں اور ایلہی کی ناؤ جھول رہی تھی۔ بہہ رہی تھی۔
یسے جا رہی تھی۔ نہ بادبان تھے نہ چپو۔ نہ کوئی راستہ نہ منزل۔

سارا دن نہ جانے وہ کہاں کہاں مارا مارا پھرتا رہا۔ محلے والے اسے دیکھ کر رک جاتے۔

”ایلہی ہے۔ کب آیا تو۔ ارے۔“ وہ چلاتے۔ ”یہ تجھے کیا ہوا ہے۔ اپنی شکل کی طرف تو
دیکھ۔ بیمار ہے کیا؟“

پہلے تو اس نے یہ بات سن کر تعجب کا اظہار کیا۔ پھر اس نے کہنا شروع کر دیا۔ ”ہاں بھلا
ہوں۔“

”کیا بیماری ہے؟“ وہ پوچھتے۔

”بخار آتا رہا ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

لوگوں کو ایسے سوال کرتے دیکھ کر اس نے اپنا پروگرام بدل دیا۔ اس کا ارادہ تھا کسی

مطلوعِ سکوت طاری تھا۔ تمام آوازیں بند ہو چکی تھیں البتہ احاطہ میں چنگاؤں جیج رہی تھیں۔ سکوت کو اور بھی بھیاںک بنا رہی تھیں۔ احاطے میں گھٹاؤپ اندھیرا تھا۔ شہزاد کے لئے بھی خاصا اندھیرا تھا۔ اندر چوبارے میں ایک چھوٹا سا دیا جل رہا تھا۔ جس کی مدھم مدھم بجائی میں پڑ رہی تھی۔

اگر صفر نے آتا تھا تو شہزاد نے دیا کیوں جلا رکھا تھا۔ وہ سوچنے لگا۔ شاید اس لئے کہ اس کی بجائے اس کے آنے میں اسے دقت نہ ہو۔ وہ کھڑکی پر نگاہیں جمائے سوچتا رہا۔ مسجد کی گھڑی نے بجنا شروع کیا اور وہ چونکا۔ دو بج گئے۔

پھر وہ دبے پاؤں نکلا اور شہزاد کے سرہانے آکھڑا ہوا۔ وہ بازو سرتلے رکھی بے خبر سو رہی تھی۔ اس کی عادت تھی۔ ایلی کا دل چاہا کہ اسے جگا دے اور پھر اس کے پاؤں پر سر رکھ کر دلائے لیکن اسے شہزاد کے قہقہے یاد آگئے۔ اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایلی دکھی ہے۔ دکھی کی سبب ناراض ہی سہی اور وہ جان بوجھ کر صفر کے ساتھ قہقہے لگا رہی تھی۔ اور پھر جب وہ لڑکتی اس کے پاس آیا تھا تو کس بے اعتنائی سے اس نے کہا تھا۔ جانو اسے چائے پلا دے۔ یہ کی بھاری کو بھیک دی جاتی ہے۔

چند منٹ وہاں رک کر وہ شہزاد کے چوبارے میں داخل ہو گیا۔

وہاں وہ صندوقوں کے پیچھے چھپ کر بیٹھ گیا۔ اور سوچنے لگا۔ بہت رات بیت چکی اب تو صفر نہیں آئے گا۔ اسے اس بات پر دکھ ہو رہا تھا۔ اس وقت اس کی سب سے بڑی خوشی بات پر منحصر تھی کہ صفر کھڑکی پھلانگ کر آجائے۔ اگر شہزاد کو جگائے اور شہزاد اس کے لئے پانی ڈال دے پھر ایلی چپکے سے باہر نکلے اور ان کے روبرو آکر کہے۔

”اب عرض ہے محترمہ۔“

اور پھر چپ چاپ اپنے گھر آجائے اور اگلے روز صبح سویرے ہی بیٹھ کے لئے علی پور کو بلا کر دس گھنٹے کے تین بجادیئے۔ اب اسے یقین ہو گیا کہ اس کی آرزو پوری نہ ہو سکے۔ شاید وہ اس لئے نہیں مل رہے تھے کہ ایلی وہیں تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں بھانڈا پھوٹ جائے۔ پھر وہ اعلانِ قہقہے کیوں مارتی تھی۔ ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

بہر صورت کوئی ثبوت تو ضرور ہونا چاہیے۔ شاید شہزاد کے ٹرک میں صفر کے محبت نامے لکھے صفر نے ضرور خط لکھے ہوں گے۔ جیسے وہ خود شہزاد کو لکھا کرتا تھا۔

اظہار کر رہے ہوں تاکہ وہ شہزاد کی بیوفائی اور اپنی مظلومیت کی دھاک بٹھا دے اور پھر ایک عاشق کی طرح ان کے راستے سے ہٹ جائے اور باقی ساری زندگی اس بے وفا محبوب کی یاد میں رو کر بسر کر دے۔

رات تک وہ فیصلہ کر چکا تھا۔

رت جگا

فیصلہ کرنے کے بعد وہ مطمئن ہو گیا۔ اسے یقین تھا کہ رات کے وقت وہ دونوں ضرور ملے ہونگے صفر اپنی کھڑکی سے پھلانگ کر شہزاد کے چوبارے میں آجاتا ہو گا۔ شہزاد ایلی ہی تو تھی اس کی ماں بیگم کہیں گئی ہوئی تھی۔ جانو گھر کا کام ختم کرنے کے بعد اپنے گھر چلی جایا کرتی تھی صرف شہزاد اور اس کی چار بچیاں چوبارہ میں رہ جاتی تھیں۔ پھر رکاوٹ کوئی تھی۔ وہ ضرور ملے ہوں گے ضرور۔

بارہ بجے تک وہ چپ چاپ پڑا رہا۔ اس نے ہمانہ بتایا جیسے سو رہا ہو۔ پھر وہ چپ چاپ اٹھ اور دبے پاؤں شہزاد کے چوبارے کی طرف چل پڑا۔ وہ اس دروازے میں جا کھڑا ہوا جو شہزاد کے کونے پر کھلتا تھا۔ اور حالات کا جائزہ لینے لگا۔ شہزاد کی بچیاں باہر صحن میں سوئی ہوئی تھیں اور وہ خود اندر کھڑکی میں کھڑی غالباً صفر سے باتیں کر رہی تھی۔ اسے یوں مصروف دیکھ کر وہ دبے پاؤں اندر داخل ہوا اور راجہ کے خالی چوبارے میں جا کر چھپ گیا۔

وہاں کھڑا ہو کر وہ شہزاد کی طرف دیکھتا رہا۔ وہ ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھی۔ اسے ان کی گفتگو کے متعلق کچھ علم نہ ہو سکا چونکہ وہ ان سے کافی دور تھا لیکن ان کے قہقہے ایلی کو غلطی دے رہے تھے۔ وہ کتنی خوش نظر آ رہی تھی۔

پھر دھننا! اس نے ہنسا موقوف کر دیا اور وہ زیر لب باتیں کرنے لگے۔ ضرور وہ لے لی تفصیلات ملے کر رہے تھے۔

تقریباً آدھ گھنٹے کے بعد شہزاد چلائی۔

”ہے۔ آدھی رات ہو چکی ہے اب مجھے نیند آئی ہے۔“ یہ کہہ کر اس نے آخری نند لگایا اور پھر باہر چارپائی پر آکر لیٹ گئی۔

دیر تک ایلی وہاں کھڑا رہا۔ پھر وہ بیٹھ گیا۔

ہانہ خدا

مگر آکر بھی وہ سونہ سکا۔ وہ چاہتا تھا کہ جلد صبح ہو اور وہ کفنزد روشنی میں پڑھ سکے۔
پڑھ کے اس کفنزد پر سرٹے کی جگہ واضح طور پر صفر لکھا ہوا تھا اور اختتام پر شزاو۔ ایل
نے ہر ممکن طریقے سے کوشش کی کہ اسے نفس مضمون کے متعلق کچھ علم ہو جائے لیکن وہ
نوش بے حد مدہم تھے اور ان سے کوئی اندازہ نہ لگ سکتا تھا۔

مارادون وہ اس خط کو پڑھنے کی ترکیبیں سوچتا رہا۔ اس نے خورد بین مہیا کی۔ آئینہ استعمال
کیا۔ اس کفنزد کی فوٹو لی اور آخرش اس پر سیاہی ملی تاکہ دباؤ سے بنے ہوئی الفاظ کی سفیدی واضح
ہو جائے۔ لیکن اس کی کوئی ترکیب کامیاب نہ ہوئی۔

اس پر دفعتاً اسے غصہ آگیا۔ میں بھی کمینہ ہوں وہ سوچنے لگا۔ جو ثبوت مہیا کر رہا ہوں کیا
شزاو کی ہر حرکت ایک واضح ثبوت نہیں ہے۔ کیا اس کا برتاؤ واضح ثبوت نہیں ہے۔ تو پھر
ثبوت کیوں۔ یہ سوچ کر اس نے اہل کو بلایا۔

”اہل۔“ وہ بولا ”اہل۔ میں خان پور جا رہا ہوں۔“

”اچھا۔“ ہاجرہ کی باچھیں کھل گئیں۔ ”کب؟“

”آج رات کی گاڑی سے۔“

”آج“ وہ گھبرائی۔ ”اے ہے دو چار دن تو رہ لے۔“

”اہل تم بھی حد کرتی ہو۔ اگر وہ خوشی سے جاتا ہے تو روکو نہیں۔“ فرحت بولی۔

”تو خوشی سے جا رہا ہے ایل؟“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”تو کیا مجبوری سے جا رہا ہوں۔“ ایل نے جواب دیا۔

”تو شزاو سے ناراض ہو کر تو نہیں جا رہا؟“ ہاجرہ بولی۔

”واہ اہل۔“ فرحت چلائی۔

”بے کوئی بری بات کر رہی ہوں کیا؟“ ہاجرہ نے معصوم انداز سے کہا۔

”تو بھی بڑی بھولی ہے اہل۔“

”مجھے نہیں آتیں ٹیڑھی باتیں۔“ ہاجرہ نے کہا ”بے کسی سے ناراض ہو کر کیوں جدا ہو
لے۔“

اس نے شزاو کا صندوق کھول کر اس کی ہر چیز باہر نکال کر دیکھی لیکن اس میں کوئی خانہ
تھا البتہ اس میں کئی ایک ایسی بیکار چیزیں پڑی تھیں جو کسی زمانے میں ایل نے اسے دی تھیں
مثلاً ایل نے ایک مرتبہ شزاو کو ایک کھلونا دیا تھا۔ سیاہ لکڑی کا بنا ہوا ایک چلبلی کپڑا۔ اور ایل
نے یہ کپڑا دیتے ہوئے اس سے کہا تھا۔

”جانتی ہو یہ کون ہے؟ یہ تمہارے میاں ہیں دیکھ لو۔“ پہچان لو۔“

اور شزاو نے قطعہ لگایا تھا۔

پھر وہ تسبیح تھی جو اند میرے میں روشن دکھائی دیتی تھی۔ اس کے علاوہ ٹریک میں شزاو نے
اپنی پرانی پمپی ہوئی دو بنیاں سنبھال کر رکھی ہوئی تھیں۔

جب بھی ایل شزاو سے ملتا تو وہ تقاضا کیا کرتا کہ شزاو اسے اپنی پرانی سیلی بنیان دے۔ ایل کو
شزاو کے جسم کی بو سے بہت محبت تھی۔ وہ اس کی پسینہ ہوئی سیلی بنیان پن کر بے حد صدمت
محسوس کیا کرتا تھا کہتا تھا۔ یہ بنیان پن کر میں محسوس کرتا ہوں جیسے تم مجھ سے بھل گئے ہو۔ اسی
لئے شزاو اپنی پرانی بنیاں سنبھال کر رکھا کرتی تھی کہ ایل آئے تو اسے تنہا دے۔

ایل ان سب چیزوں کو غور سے دیکھ رہا تھا۔ اسے ان چیزوں کو دیکھ کر دکھ ہو رہا تھا۔
مایوس ہو کر اس نے صندوق بند کر دیا۔

دفعتاً اس کی نگاہ لیٹر پیڈ پر پڑی۔ ہائیں۔ اس نے سوچا، لیٹر پیڈ۔ شزاو نے تو کبھی لیٹر پیڈ
استعمال نہیں کیا۔ جب بھی اسے خط لکھتا ہوتا تھا تو وہ اپنی بچیوں کی سکول کی کاپی سے ورق پھاڑ
لیا کرتی تھی۔ پھر یہ پیڈ۔

اس نے پیڈ کو اٹھا لیا۔ اچھا خاصا خوب صورت پیڈ تھا۔ ابھی نیا ہی تو تھا۔ صرف پندرہ ایک
ورق ہی پھاڑے گئے تھے۔

ارے — وہ پیڈ اٹھا کر دیئے کے پاس جا بیٹھا۔ اوپر کے ورق پر الفاظ کھدے ہوئے نظر
آ رہے تھے جیسے کسی نے پنسل سے کسی ورق پر کچھ لکھا ہو اور نچلے ورق پر دباؤ کی وجہ سے
نشانات پڑ گئے ہوں۔

اس نے پیڈ کا اوپر کا ورق پھاڑ لیا اور اسے دیکھنے لگا لیکن روشنی کافی نہیں تھی اس لئے
کچھ پڑھ نہ سکا بہر حال الفاظ واضح طور پر موجود تھے۔

اس نے وہ کفنزد اٹھایا اور دبے پاؤں چپ چاپ گھر واپس آگیا۔

”تو پھر ان دونوں کو منادے۔“ فرحت ہنسنے لگی۔

”ہاں ہاں۔“ ہاجرہ بولی ”اس میں کیا حرج ہے۔“

”تو اس کی باتیں نہ سن ماں۔“ ایللی نے کہا۔

”مجھے نہیں سمجھ میں آتیں یہ باتیں۔ میرا دل تو صاف ہے۔“ ہاجرہ بولی۔

”کچھ زیادہ ہی صاف ہے ماں۔“ فرحت ہنسی۔

”چل میرے ساتھ شہزاد کی طرف۔“ ماں نے فرحت کی بات پر غور کئے بغیر کہا۔

”نہیں ماں چھوڑ اس بات کو۔“ ایللی گھبرا کر بولا۔

ایللی رخصت ہونے لگا تو جانو نے شور مچا دیا۔

”کچھ خبر ہے یا اپنی ہی دھن میں غرق رہو گی۔“ وہ شہزاد سے کہنے لگی جو اس وقت منور

سے باتوں میں مصروف تھی۔

”کیا ہے؟“ شہزاد بولی۔

”ایللی خان پور جا رہا ہے۔“

شہزاد نے قہقہہ لگایا ”تو پھر؟“

”اے میں کتنی ہوں واقعی وہ جا رہا ہے۔“ جانو چلائی۔

شہزاد پھر ہنسی۔ ”تو کیا کروں؟“ وہ بولی ”کیا گھوڑا گاڑی جوت کر لاؤں۔“

”ہے کیا باتیں کر رہی ہے تو۔ ابھی کل تو —“ جانو رک گئی۔

”بہت منادیکھا میں نے۔“ شہزاد نے کہا ”اب نہیں —“

ایللی نے سنا۔ اس کے دل پر کسی نے گویا جلتی ہوئی میخ گاڑ دی۔

محلے کے چوگان میں محلے والیوں نے ایللی کو روک لیا۔

”کون جا رہا ہے ماں؟“ ایک کھڑکی میں آکھڑی ہوئی۔

”اپنا ایللی ہے۔“ ماں نے کہا۔

”جا رہا ہے۔ علی پور چھوڑ کر جا رہا ہے۔“ دوسری بولی۔

”ہے شہزاد کی کھڑکی خالی ہے۔“ ایک نے طعنہ دیا۔

”وہ ادھر دوسری کھڑکی میں کھڑی ہے نا۔ اس لئے۔“

”ہے کتنی کھڑکیاں کھلتی ہیں اس کے چوہارے میں۔“

”اے رولی ہے ماں۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑی۔

”ہیک دن جانا ہی پڑتا ہے بیٹا۔“ ماں بولی ”چلو اچھا ہی ہوا تو بھی کام کاج پر گئے گا۔“

ایللی کا سر جھک گیا۔ اسے ایسا محسوس ہوا جیسے ان سب نے گوبر کی نوکری اس کے سر پر گرا

۔ شرمساری اور ذلت سے لت پت وہ چل پڑا۔ اس کے قدم بوجھل ہو رہے تھے۔ گردن

ہائیراٹ کیا تھا۔ سامنے ایک خلا تھا۔ ایک دھندلا تاریکی جو منہ کھولے بیٹھی تھی۔ دور

ہاں اسو فون چلا رہا تھا۔

ملا خدا تمہارا۔ اے دلریا ہوں میں فدا۔

”تم“ ایللی کی چیچ نکل گئی۔ ”تم یہیں ہو؟“

بن باسی

اور جب وہ خان پور پہنچے گا تو علی احمد نہیں ملے۔

”کیوں؟“

”بس سگ ناتہ لیلے۔“ شام ہنسا۔ ”وہ میرے لئے بیس رک جائے تو پھر میں کس جا سکتی ہوں کیا؟“

”رک گئی ہے؟“ ایلی بولا۔

”ہاں۔ اس نے یہاں نوکری کر لی ہے۔“

”اور تم؟“

”میں نے لاء کالج جان کر لیا ہے۔ کالج تو بمانہ ہی ہے۔“ شام نے آنکھ ماری۔ ”مطلب ہے جہاں فیزکس بوتل وہاں گلیکسو بے بی۔“

شام ایلی کو اپنے نئے بورڈنگ میں لے گیا۔ لیکن کمرے میں پہنچتے ہی جب اس نے روٹنی میں ایلی کی طرف دیکھا تو چلانے لگا۔

”ارے تم۔ تمہیں کیا ہوا؟“

”مجھے۔“ ایلی نے جھوٹ موٹ دہرایا۔ ”کیوں مجھے کیا ہے؟“

”واہ سے پیٹ چھپاتے ہو۔“ شام چلایا۔

”تمہیں کیا دکھائی دیتا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

شام کی آنکھ میں چمک لرائی۔

”بتاؤں؟“ وہ بولا۔

”ہاں بتاؤ۔“

”ٹھس س س س۔“ وہ چلایا۔ ”پنچر۔“

”پنچر“ ایلی نے بتادنی حیرت سے دہرایا۔

”وہ پنچر ہوا ہے کہ ساری ہوا نکل گئی ہے۔“ کیوں اب بولتے نہیں۔“ شام پلا۔

”بولو نا۔“

”جج کہتے ہو۔“ ایلی کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔

”ارے۔“ شام اس کی آنسو دیکھ کر گھبرا گیا۔

سب ختم ہو گیا۔ ”ایلی بولا ”وہ تخت وہ تاج و شہنشاہی سب۔ صرف میں باقی رہ گیا ہوں۔“

اور شاید میں بھی ختم ہو جاؤں۔“

”شام نے بات کو مذاق میں ٹالنے کے لئے کہا ”ابھی تک میرے ٹرنک میں ڈیر ہے اور ہلیاس، جھگوان کی سوگند بس ساری عمر ٹرنک میں پڑی رہے گی۔ نہ مجھ میں کھانے کی مٹ ہوئی نہ تم میں ہوگی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”نہیں شام“ ایلی بولا ”ساری زندگی چوہٹ ہو گئی۔ بساط ہی الٹ گئی۔ اب جینا بے کار

ہمیں کے بل وجود جڑے جاؤ گے بیٹا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ زندگی پٹ سے

تھوڑے ہو جائے گی۔ بساط پھر قائم ہو جائے گی۔ غم نہ کھاؤ۔“

”غم تو اب لگ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ایک بات پوچھوں۔؟“ شام نے کہا۔

ایلی نے اثبات میں اشارہ کیا۔

”اس نے بے وفائی کی۔ بس یہی بات ہے نا؟“

”ہاں۔“ ایلی بولا ”پہلے تخت پر بٹھایا۔ پھر مور چھل کرتی رہی اور پھر دھکا دے کر وہاں سے رانا۔“

”بس تم سمجھ لو رشی منی بن گئے۔ تمہارا کلیان ہو گیا۔“

”کیوں؟“

”جس نے کامیابی دیکھی۔ تخت پر بٹھایا گیا۔ مور چھل کروایا۔ وہ مکمل نہیں ہوتا جب تک

لوہج پر سے گرایا نہ جائے۔ سمجھ لو تمہارا کلیان ہو گیا۔ آؤ تمہیں بیڑ پلاؤں۔“ وہ چلانے

لگتا تو اب چیز ہے پنچر لگ جائے گا۔ پھر سے تخت پر بٹھا دے گی۔ مور چھل کرے گی۔ آؤ

لب لپٹا آپ سنبھالو۔ ”شام کہنے لگا۔“ جوتیاں کھانا تو اپنا پرانا پیشہ ہے۔ تم تو یوں شکل بنائے

نہ ہو جیسے پہلی بار جو تاکھایا ہو۔ ہمت کرو۔“

”مجھے نصیحتیں کرتا ہے بے سالے۔“ ایلی جلال میں آگیا۔

”کر لینے دو۔ کر لینے دو۔“ شام چلایا۔ ”تمہارا کیا بگڑتا ہے۔ میری نصیحتوں سے تم نے کونا

لا ہے لیکن اپنی بات بن رہی ہے۔ کر لینے دو نصیحتیں مجھے۔“

”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”پیار ایلی۔“ شام بولا ”ساری عمر بیت گئی ہے۔ ہمیشہ مجھے ہی پنچر ہوتا رہا۔ ہمیشہ لوگ مجھے

میں آپ مع کر لیا تھا۔ از خود۔

ابھی کی چوتھی بیوی راجو، جو کسی زمانے میں دوراہے کی رانی تھی اب چار دیواری سے ہونے لگی خاتون بن کر رہ گئی تھی۔

نہاں کی نگاہوں میں شوخی تھی نہ انداز میں نمائش اور نہ چال میں منک جو نگاہوں کو دلتا ہے۔ اس کی یہ تبدیلی حیرت انگیز تھی۔ لیکن اس سے زیادہ حیران کن بات یہ تھی کہ اپنی اہلی تک اس قلعے کی تسخیر میں جوں کا توں منہمک تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے گھر بھائیوں کی آمد و رفت قطعی طور پر ختم ہو چکی تھی۔ ممکن ہے علی احمد نے خود ہی اس کو دبا دیا ہو یا شاید اس کی وجہ راجو کا رویہ ہو۔ بہر حال علی احمد کا گھر اب ایک گھر تھا۔

ریش علی احمد تھے۔ شیم اور اس کی دو بیٹیاں۔ نانہ اور انجم، اور راجو کے دو بیٹے شیر

لی کے پلے شوہر سے تھا اور نصیر جو علی احمد سے تھا۔
اپنی بچی کر دیکھ کر روز تو ایلی کھویا کھویا رہا۔ پھر محض اتفاق سے اس کی توجہ کتاب پر مرکوز
اور شہزاد کو بھولنے کے لئے — اپنے کھوئے ہوئے تخت و تاج کو بھولنے کے لئے
میں لگو گیا۔

مادان وہ کتابیں پڑھنے میں مصروف رہتا اور جب مطالعہ سے اکتا جاتا یا جب سادی اور
اب کے صفحات سے جھانک کر مسکراتیں، اشارہ کرتیں تو وہ کتاب پھینک کر جمیل کی
پا جانے اور جمیل فارغ ہوتا تو وہ اسے اپنے دوستوں کی محفل میں لے جاتا جہاں وہ تاش
میں بائیں اور حالات حاضرہ پر بحث کرتے۔

میں کے ساتھی تو بہت تھے لیکن ان میں صرف دو ایسے تھے جنہوں نے ایلی کو اپنی طرف
لے کر لیا اور راز۔

نہاں عمر کا دلا پتلا آدمی تھا۔ اس کا چہرہ پچکا ہوا تھا۔ جسم مضنی تھا۔ آنکھیں اندر دھنسی
تھیں۔ ناک اس حد تک ابھری ہوئی تھی کہ سوائے ناک کے کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ لیکن
انہیں بے حد دلچسپ تھیں۔ ان میں رنگینی یا مزاح کی جھلک نہ تھی۔ اس کے برعکس ان
کی ہوتی اور نفی کو یہ احساس نہ ہوتا کہ وہ کوئی اچھے کی بات کر رہا ہے یا اس کی شخصیت
میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ غالباً ناامیدی اور مایوسی کی شدت کی وجہ سے

ی نصیحتیں کرتے رہے۔ بھگوان جانے یہ پہلا موقع ملا ہے جب میں تمہیں نصیحت کر سکا ہوں۔
دل چھوٹا نہ کرو۔

”بائے بائے۔“ ہوٹل میں پہنچ کر شام چلایا ”چار بوتل۔ اچھی سی لائٹ۔“ وہ ہنسل ”تیری
تخت پر بٹھائے اور مور جھل کرے۔“

خانپور پہنچتے ہی سب سے پہلے اسے جمیل مل گیا۔ جب ایلی پلیٹ فارم پر قلی ڈھونڈ رہا تھا
اس نے دیکھا کہ بریک کے قریب جمیل کھڑا ہے۔

”ارے تم۔“ وہ حیرت سے جمیل کی طرف دیکھنے لگا۔
جمیل مسکرا رہا تھا۔

”میں تو یہیں ملازم ہوں۔ ابھی ٹھہروا کٹھے چلیں گے۔“

خانپور کے اس صحرائے اعظم میں جمیل ایلی کے لئے واحد نخلستان تھا۔ اگرچہ ایلی کو جمیل
سے حجاب سا محسوس وہ رہا تھا۔ چونکہ جمیل صفر کا چھوٹا بھائی تھا اس لئے وہ جمیل پر ظاہر
کرنا چاہتا تھا کہ اس کی زندگی میں کیا المیہ واقع ہوا ہے۔

آج تک ایلی نے شہزاد کو راز بنائے رکھا تھا۔ اس نے شہزاد کے متعلق اپنے کسی دوست
سے بات نہ کی تھی۔ لیکن اب اس عظیم شکست کے بعد اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ ہر کسی کو راز
کر اپنی کٹھانائے اور راہ چلتوں کو بتائے کہ اس نے ایلی سے کیا سلوک کیا ہے۔ ہلے رے۔
کو خبردار کرے کہ کبھی کسی عورت پر بھروسہ نہ کرے کبھی اس کی محبت پر اپنی خوشی کا انحصار
رکھنا۔ لیکن ایلی یہ بات جمیل سے نہیں کر سکتا تھا۔ صفر کے چھوٹے بھائی سے یہ بات کرنا
اسے گوارا نہ تھا۔

محفل

علی احمد کے گھر میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔

مثلاً ”ان کی تیسری بیوی شیم جو کشمیر کے سیب کھا کھا کر پلی تھی۔ اور علی احمد کے گڑ
بیان کے مطابق بذات خود ایک سیب تھی اب قطعی طور پر اپنی شخصیت کھو چکی تھی۔ شیم
سیب اب گل سڑ گیا تھا۔ صرف یہی نہیں وہ اس حد تک اعتراف شکست کر چکی تھی کہ اب
میں یہ احساس ہی نہیں رہا تھا کہ وہ عورت ہے۔ غالباً ناامیدی اور مایوسی کی شدت کی وجہ سے

”ہاں یار۔“ وہ سنجیدگی سے کہتا ”مجھے احساس نہ تھا کہ میں اتنی باطنی بات کر رہا ہوں۔“
 تو کسی ہی بن سوچے سمجھے برسبیل تذکرہ کچھ کہنے کے لئے بات کر رہا تھا۔
 مثلاً ”اگر وہ دفعتاً خاموش ہو جاتا تو جمیل پوچھتا:
 ”کیوں نفی! تم کس سوچ میں پڑے ہو؟“
 نفی چوکتا ”کیا میں واقعی سوچ میں پڑا تھا؟“
 ”ہاں ہاں۔“ راز چٹکی بجا کر گنگنا ”کس سوچ میں بیٹھا ہوں آخر مجھے کیا کرنا؟“
 اس پر نفی چیخا ”یار اس کا اگلا مصرع کیا ہے؟“
 راز اپنے آپ پر کیفیت طاری کر کے ”آنکھوں میں مستی پیدا کر کے دوسرا مصرع گانے
 ”دلبر کا کما کر نیا دل کا کما کرنا۔“

گھونٹ

نفی کے مشاغل بے حد دلچسپ تھے۔ وہ حقہ پیتا تھا۔ چائے کا شوقین تھا۔ بحث میں بڑے
 ذہن سے حصہ لیتا تھا۔ شطرنج اور تاش کھیلتا تھا۔ شعر کہتا تھا اور فرصت کے اوقات میں کپڑے پر
 لکھنے سے رنگین چیزیاں کاڑھتا تھا اور ہر رات بیگم کو پیتا تھا۔
 راز کو گانے کا شوق تھا۔ جب وہ گاتا تو اس کی آنکھوں میں عجب مستی چھلکتی۔ برج کھیلنے کا
 ذہنی تاثیر طیکہ سٹیکس سے کھیلا جائے اور شوق کے باوجود ہارنے لگتا تو دفعتاً ”یا تو اسے کام یاد
 ہانا اور یاد دے ہی کھیلتا چھوڑ دیتا۔ اس کی باتیں رنگین ہوتی تھیں۔ اپنے والد صاحب کے
 خلق قصبے سنانے کا ضبط تھا جو بنگال کی طرف کسی علاقے میں بڑے عمدے پر مامور تھے۔
 جمیل ایک خاموش لڑکا تھا لیکن اس کا دل جذبات اور ذہن خیالات سے بھرا ہوا تھا۔ وہ چاہتا
 تھا کہ اپنے جذبات اور خیالات کا اظہار کرے۔ لیکن جہاں تک بات کرنے کا تعلق تھا اس پر
 ایک جالب مسلط تھا۔ اس حجاب کی وجہ سے اس کی طبیعت جولانی گھٹ کر رہ گئی تھی۔ غالباً اس کی
 شائستگی کثرت کی شدت تھی۔ وہ ملنسار تھا لیکن اس کی یہ عادت گونگے پن کی وجہ سے اذیت
 پہنچا دیتی تھی۔ پھر ایک روز اسے اتفاق سے اس اذیت سے نکلنے کا ایک راستہ مل گیا اور اسے
 گونگیا کہ شراب کے چند گھونٹ پینے سے وہ اپنے گونگے پن کو دور کر سکتا ہے اور سوسائٹی
 میں ایسے ہی چمک سکتا ہے جیسے راز چمکاتا تھا۔ غالباً اس سے پہلے اسے یہ معلوم نہ تھا کہ اس
 لڑکے اور ذہن جذبات و خیالات سے بھرے ہیں۔ اس روز اسے اپنے خیالات و جذبات اپنی زبان
 سے نکال کر حیرت ہوئی اور اسے یقین ہو گیا کہ اس نے چھپے ہوئے خزانے کی کنجی پالی ہے۔

”تم نے یہ تو بتایا ہی نہیں کہ کیا سوچ رہے تھے۔“ جمیل اسے چھیڑتا۔
 ”ٹھہرو۔“ نفی چیخا ”ایک سیکنڈ۔۔۔ ہاں ٹھیک ٹھیک سوچ رہا تھا میں واقعی۔“
 رہا تھا کہ کیا واقعی مجھ میں اس قدر ضبط ہے کہ دو دن بیوی کو بیٹے بغیر رہ سکوں۔“
 معصومیت سے کہتا جیسے بیوی کو پشیمانہ خاوند کے لئے نارمل بات ہو بلکہ اس کا فرض ہو۔
 یا راہ چلتے ہوئے دفعتاً ”نفی رک جاتا۔“ ”یار! عجیب بات ہے۔“ وہ گویا اپنے
 مخاطب ہو کر کہتا۔ ”ہے نا عجیب بات۔“
 ”کیا بات ہے؟“ ایللی پوچھتا۔
 ”یار حد ہو گئی۔“ نفی سر جھکاتے ہوئے سنجیدگی سے کہتا۔ ”یہ جو ٹانگ مثلاً
 ہوئی حویلی ہے نا۔ یہ سامنے میں محسوس کرتا ہوں کہ میں اس حویلی سے پورے
 ہوں اور اس کا ایک ایک کرا اور والان جانتا ہوں۔ حالانکہ میں کبھی اس کے اندر
 ہوا۔ بلکہ اس سے پہلے میں نے اسے باہر سے بھی کبھی نہیں دیکھا۔ اس راستے
 نہیں میں۔ ہے نا عجیب بات۔“ یہ کہہ کر نفی آنکھیں بند کر لیتا اور پھر کہتا: ”یار
 ڈیور می ہے۔ دو دروازے ہیں۔ باباں دروازہ ایک کمرے میں کھلتا ہے۔ اس
 والان ہے۔ والان میں ہرن کے سینک دیوار پر لگے ہوئے ہیں۔“

نقی کو شراب سے خاص دلچسپی نہ تھی چونکہ اس کی شخصیت ہی میں مسقی کا عنصر قہر راز کے لئے شراب محض ایک پھلجھڑی کی حیثیت رکھتی تھی جس سے کھیلتا اسے پسند تھا لیکن اس پھلجھڑی کی حیثیت محض تفریحی تھی۔ وہ اپنی شخصیت کے اظہار کے لئے اس کا محتاج نہیں تھا۔ ایللی کے لئے شراب کا اثر خاصہ تکلیف دہ ہوتا تھا پی کر اسے وہ دن یاد آ جاتا جب وہ اور منصر ہوٹل میں بیٹھے تھے۔ جب منصر نے چلا کر کہا تھا۔

”میرا د بڑے۔“

اور ایللی کو یہ فکر وامن گیر ہو گیا تھا کہ شراب پلانے سے منصر کا مقصد صرف یہ ہے کہ ترمگ میں آکر ایللی سلوی کے اس رومان کا راز کہہ دے اور ایللی نے عزم کر لیا تھا کہ چاہے وہ نئے میں دھت ہی کیوں نہ ہو جائے وہ منصر کو حقیقت حال سے آگاہ نہیں کرے گا اور یہ سوچ کر وہ پتھر بن گیا تھا۔ اس کے بعد جب کبھی اسے شراب پینے پر مجبور کیا جاتا تو اس پر وہی کیفیت ملاری ہو جاتی۔ وہ محسوس کرتا جیسے اس کے ساتھی منصر ہوں اور اس کا راز پالنے کے لئے بروستی پلا رہے ہوں۔

ایللی نے ذہنی طور پر اپنے آپ کو کئی بار سمجھایا تھا کہ یہ خیال غلط ہے وہاں کوئی منصر نہیں۔ پینے سے مقصد صرف تفریح ہے لیکن سب بیکار۔ گلاس ہونٹوں سی لگاتے ہی خواہ مخواہ وہی کیفیت طاری ہو جاتی۔ شاید اسے ڈر تھا کہ کہیں شہزاد کی بات نہ چھیڑ دے۔ بہر حال شراب بیشہ کے لئے اس پر حرام ہو چکی تھی۔ اس کے لئے وہ گھونٹ تلخ بن جاتا۔ جس کے بعد اس پر جمود ری ہو جاتا۔ جسم منوں بوجھل ہو جاتا۔ سر چکراتا۔

ایللی کے لئے جمیل، نقی اور راز کی محفلیں یوں تھیں جیسی کسی طوفان زدہ ڈولتی ہوئی کشتی کے لئے کنارہ ہو۔ وہ چاہتا تھا کہ ہر وقت اسی محفل میں بیٹھا رہے لیکن جب وہ وہاں پہنچتا تو نہ نے کس اصول کے تحت اسے اپنی گزشتہ تباہی پھر سے یاد آ جاتی اور وہ محفل میں بیٹھ کر پھر اپنے آپ میں کھو جاتا۔ کنارے پر پہنچ کر پھر سے طوفان بیتا شروع کر دیتا۔

ایللی نے اپنا راز جمیل سے نہ کہا لیکن جمیل کے طرز عمل سے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ سب جانتا ہو۔ سمجھتا ہو اور اس کا سب سے بڑا ثبوت یہ تھا کہ خود جمیل نے کبھی شہزاد کی بات نہ کی تھی۔ جمیل نے ایللی کو کبھی نہ بتایا تھا کہ وہ دکھی ہے۔ شاید اس لئے کہ اسی مزید دکھ نہ۔ جمیل نے ایللی کی آمد پر اس کی کیفیت بھانپ کر خاموش، بے لاگ ہمدردی کی گود پھیلا دی

فی اور شاید اس گود نے ایللی کو تباہ ہونے سے بچا لیا تھا۔ ایللی کی آمد پر جمیل کی تمام توجہ ایللی پر مرکوز ہو گئی۔ وہ اس کی چھوٹی چھوٹی ضروریات کا نگار رہتا تھا۔ اپنی گونگی محاسن سے اس کی تنگی اور اضطراب کو دور کرتا اور ہر وقت اس کے ہاتھ ریت اس پر جمیل کی بیوی جو مہما "خاوند کو جذب کر لینے کی قائل تھی۔ بگڑ گئی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ جمیل کے گھر میں مشکلات پیدا ہو گئیں۔

گھر میں اسے کتابوں میں منہمک دیکھ کر علی احمد ہنستے۔ "کیونکہ تائیسیر کی ماں! ہمارا ایللی بھی عجیب شے ہے۔ جب پڑھنے کے دن تھے تب سینما دیکھتا اور اب جب پڑھنے کے دن ختم ہو چکے ہیں تو کتابوں کا کیرا بنا ہوا ہے۔ ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے۔ "کیوں ایللی؟"

"اب اللہ رکھے جو ان ہو گیا ہے۔" راجو کہتی۔ "اب اس کی شادی کی فکر کیجئے نا۔" "یہ کسی کی شادی کا فکر کیوں کرنے لگے۔" شیم بولتی "یہ تو اپنی ہی ٹانگ جھانک میں لگے رہے ہیں۔"

"سو نصیر کی ماں۔" وہ ہنستے۔ "اسی کے لئے ٹانگ جھانک کرتا ہوں۔ تم سمجھتی ہو اپنے لئے لڑا ہوں۔ لا حول ولاقوہ" وہ چلاتے۔

"وہیں کیوں نہیں کر دیتے جہاں وہ چاہتا ہے۔" راجو بولتی۔ "وہاں کیسے کر سکتے ہیں۔" علی احمد جواب دیتے۔ "کیوں نہیں کر سکتے؟"

"وہ لوگ تو بہت بڑے ہیں اس لئے۔"

"پھر کیا ہوا؟" شیم بولتی۔

"میاں بیوی راضی تو کیا کرے گا قاضی۔" راجو ہنستی۔

"بھئی تمہارے ہی بھلے کی سوچتا ہوں۔" علی احمد منہ پکا کر لیتے۔

"تمہارے بھلے کی۔ وہ کیسے؟"

"بھئی۔" علی احمد جواب دیتے۔ "اگر وہاں ایللی کا بیاہ کر دوں تو کیا وہ تمہاری قدر کریں گے لوگ! مل! جمیں! دیکھ کر ناک بھوں چڑھائیں گے۔ کہیں گے یہ کیا چیز ہے نہ شکل نہ صورت نہ نہ ہاتھ نہ ہاتھ نہ تہذیب نہ تعلیم۔ یہ کیا چیز ہے ہی ہی ہی۔" وہ ہنستے "لو بھی شیم! تم ہی

انصاف کرو۔ میرا کیا ہے۔ اپنا گزار تو ہو جائے گا۔ چند جماعتیں بھی پڑھی ہیں۔ اچھی بری بات بھی کر لیتا ہوں لیکن نصیر کی ماں کا کیا ہو گا۔ ہی ہی ہی۔ اب نہیں بولتی۔ ہو گئی بولتی بند۔ ان کا تقہر گو بخت۔

”آپ سے کون سر کھپائے۔“ راجو جواب دیتی اور پھر اٹھ کر اندر چلی جاتی۔ اس پر علی ابو بھی اپنی میلی دھوئی سنبھالتے ہوئے اس کے پیچھے چل پڑتے۔

”اب دے نا جواب۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

”نہ میں نہیں دیتی۔“

”کیسے نہیں دے گی۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنستے۔

”چھوڑو بھی۔“ اندر راجو تنک کر نخرے سے کہتی۔

”حافظ قرآن ہوتی تو چھوڑ دیتے لیکن تو کیا سمجھ گی اس لطیف اشارے کو۔ ذات کی ہوئی رنگر پلی دولت پور میں۔ ہی ہی ہی۔“

دھنستا۔ ”ٹھیس اور اس کی دونوں پچیاں ناظمہ اور انجم محسوس کرتیں کہ ٹین کا سپاہی نمودار ہو رہا ہے اور وہ گھبرا کر کھسک جاتیں اور اندر اپنے کمرے میں جا پناہ لیتیں اور ایللی کو سمجھ میں نہ آتا کہ کیا کرے۔ اور وہ اٹھ کر جیل کی طرف چل پڑتا۔

دیپال پور

چار ایک ماہ خانپور کے بعد ایللی کی تعیناتی دیپال پور ہو گئی۔

دیپال پور ایک وسیع صحرا تھا جس میں یہاں وہاں دور دور مکانات بنے ہوئے تھے۔ اس وسیع صحرا کو دیکھ کر ایللی نے محسوس کیا کہ جیسے بظ تلاب میں آ پھنچی ہو۔ ایللی ذہنی طور پر خود ایک ویرانہ تھا دیوانہ ویرانے میں مل گیا۔ اسے ریت کے اس پھیلاؤ کو دیکھ کر سکون سا محسوس ہوا جیسے وہ اپنے گھر آ گیا ہو۔ وہاں پہنچ کر ایللی نے جانا کہ خانپور میں محفل جما کر اپنے آپ کو بھلانے کی کوشش غلطی تھی۔ اس کی زندگی میں دورخی پیدا ہو رہی تھی۔ وہ دل کے ویرانے کو بھولنے کے لئے ٹھکرتانوں کا تلاشی تھا۔ دیپال پور پہنچ کر اس نے شدت سے محسوس کیا کہ اپنی اصلیت کو بھولنے کی کوشش سے سکون حاصل نہیں ہوتا بلکہ اپنی اصلیت میں ڈوب جانے سے حاصل ہوتا ہے۔ اسے تسلیم کر لینے میں راحت ہے جھٹلانے میں نہیں۔

دیپال پور میں اس کا ساتھی کوئی نہ تھا۔ کوئی دوست نہ تھا اس لئے وہ اکیلا ریت کے تودوں کی طرف نکل جاتا اور پھر کسی ٹیلہ نما تودے کے سائے میں بیٹھ کر ماضی کی یاد میں کھو جاتا۔

ان دونوں وہ ساوی کو بھول چکا تھا۔ اس کے صبح و شام شنراؤ کے خیال سے پر تھے۔ شنراؤ

نہ کی زندگی پر یوں مسلط و محیط تھی کہ کسی اور کی گنجائش نہ رہی تھی۔ ساوی کا خیال —

یک سرت بھرا جام تھا۔ جس میں رنگ تھا لطافت تھی۔ اس کے برعکس شنراؤ کے خیال میں تلخی

فیہر تھا اور اسی لئے شدت تھی۔ شنراؤ نے اسے بے عزت کر کے اپنی محفل سے نکل دیا

اس کے احساس خودی پر کاری زخم لگایا تھا جسے یاد کر کے وہ ترہتا تھا اور اس ترہن، گھٹاؤ اور

روت کی وجہ سے شنراؤ کا خیال اس کے دل میں گھر کر چکا تھا۔ ایللی دراصل ایک غم خور نوجوان

اور اس کا ایمان تھا کہ عشق کو محرومی اور غم سے تعلق ہے — اس کے برعکس سرت اور

ٹیٹھس تفریق یا عیاشی کا نام ہے۔ شنراؤ سے ایللی کی محبت اب عشق میں بدل چکی تھی۔ اس

نے آہیں بھرا ریت کے تودوں تلے بیٹھ کر رونا، کوٹیں لیتا اس کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔

اس کے علاوہ شنراؤ کا خیال آتے ہی اسے اپنے رقیب کا خیال آجاتا۔ وہ دونوں ایک

رے کے قریب بیٹھے ہوں گے۔ نگاہوں میں نگاہیں ڈالے ہاتھ میں ہاتھ دیئے وہ ہنس رہے

لاگے اشاروں میں باتیں کر رہے ہوں گے عمد و بیان — اب وہ مل رہے ہوں گے۔

اب اور قریب۔

ایللی کے دل پر ایک چوٹ لگتی۔ وہ گھائل ہو کر ترہتا۔ اس ترپنے میں اسے لذت محسوس

لایا شاید دل ہی دل میں وہ انتقام لینے کی آرزو کو پال پوس رہا ہو۔

دیپال پور میں پہلی مرتبہ اسے بچوں کو پڑھانے کا موقع ملا۔ لیکن وقت یہ تھی کہ وہاں کے

بچے غلطی طور پر سچے نہ تھے۔ نویں جماعت کے طلبہ ایللی سے زیادہ طاقت ور اور قدم میں لمبے

پہلوں پر مرتبہ جب وہ جماعت میں داخل ہوا تو انہیں دیکھ کر حیران رہ گیا۔ لیکن جلد ہی وہ اپنے

پہلوں کو گھیرا اسے اتنی فرصت نہ تھی کہ دوسروں کے متعلق سوچے۔

اس کے ہم کار اساتذہ سب کے سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے تھے۔ ان کی چال ڈھال،

نہال میں ایک رسمی اور مصنوعی وقار تھا۔ ان کی حرکات بھدی اور بے جان تھیں۔ اور ان

نہالوں میں ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

کے نیچے ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

کے نیچے ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

کے نیچے ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

کے نیچے ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

کے نیچے ایک ہی سمت میں چلتے تھے۔ ایللی نے شدت سے محسوس کیا کہ وہ سب کو لوہے کے تیل

سارے مدرسے میں صرف ایک شخص تھا جس کا انداز مختلف تھا۔ اس کا نام محمود تھا اور اسکول کا کلرک تھا۔ شاید اس فرق کی وجہ یہ تھی کہ وہ استاد نہ تھا۔ تو کیا استاد کا وہ رویہ اور انداز بچوں کو پڑھانے کے مشغلے کی قیمت تھی جو وہ ادا کر رہے تھے۔ اہلی مری سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے علاوہ محمود کی عمر بہت چھوٹی تھی۔ وہ عنوان شباب میں تھا۔ اگرچہ اس کی شکل بوجھ چکی تھی اور ایک بچی بھی تھی۔ محمود کا قد چھوٹا تھا اور اس کا جسم گٹھا ہوا تھا۔ بال گٹھے اور سرور کالے تھے رنگ میلا میلا سا تھا۔ بھونئیں سمی تھیں۔ پیشانی سے شدت کا اظہار ہوتا تھا۔ ہونٹوں میں شرارت دہی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں غصہ جھلکتا اور بھوڑوں سے شوقی اور لالہ شپکتا اور ایسے محسوس ہوتا جیسے وہ روی ٹوپی جو وہ پہنتا تھا اور نمازیں جو وہ باقاعدہ پڑھتا تھا محسوس جھوٹ تھیں۔

محمود کے کردار کا سب سے بڑا جزو جذبہ اور اسکی شدت تھی۔ یہ جذبہ گہری کے پندار کی طرح مذہب اور عورت کے درمیان گردش کرتا تھا۔ اس کے علاوہ اس میں بے باک ذہانت تھی۔

محمود سے مراسم پیدا ہونے کی وجہ محض یہ تھی کہ اہلی کو جو مکان رہنے کے لئے ملا وہ مکان کے مکان کے بالکل قریب تھا۔ ابتدا میں اہلی نے محمود کے لئے کوئی جاذبیت محسوس نہ کی تھی۔ غالباً نہ ہی اہلی اسے متاثر کر سکا تھا۔ چند ایک مرتبہ ان کی ملاقات ہوئی۔ پھر محمود نے آنا شروع کر دیا۔ محمود کو صرف دو چیزوں سے دلچسپی تھی۔ ایک تو اہلی کی کتابوں سے اور دوسرا اس کے مکان کے جنسزانیے سے۔ چونکہ اس کے چوبارے سے محلے کے بیشتر مکانات دکھائی دیتے تھے۔ محمود کو عورتیں دیکھنے کا شوق تھا اور عورتوں کے لئے اس کی شخصیت میں ایک بڑی جاذبیت تھی۔ محمود کو دیکھ کر وہ چڑچاٹیں۔ انہیں یوں غصہ آنے لگتا جیسے انہیں چھینا گیا ہو۔ پھر نہ جانے کس اصول کے تحت وہ غصہ دفعتاً روپ بدل لیتا اور عورت محمود کو لے کے بڑی بے باکی سے باہر نکل آتی۔

اہلی کو محمود کی اس خصوصیت کا نہ تو علم تھا اور نہ اس سے کوئی دلچسپی تھی۔ ان کے ملاپ کی تمام تر وجہ انگریزی نہایت تھی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھا لڑکا

انہی۔ اگرچہ وہ فقط میٹرکولیٹ تھا لیکن نہایت اچھی انگریزی لکھتا تھا اور اہلی کو یہ جان کر ہوتی کہ محمود کنسٹنٹ آکسفورڈ ڈکشنری کو دو مرتبہ یوں پڑھ چکا تھا جیسے ناول پڑھتے ہیں۔ چند ماہ پہلا پور رہنے کے بعد اہلی کو دھرم سالہ بھیج دیا گیا جہاں صحرا کی جگہ پہاڑوں نے لے اور تودوں کے نیچے بیٹھنے کی بجائے وہ جبل اور دیواروں تلے بیٹھ کر آہیں بھرنے میں مصروف رہا۔

دھرم سالہ سکول میں وہ اکیلا مسلمان بچہ تھا۔ چونکہ فارسی کا مولوی چند ایک ماہ ملازمت کرنے کے بعد لمبی رخصت لے کر وہاں سے چلا گیا تھا۔ وہاں پہلی مرتبہ اسے احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔ اس سے پہلے اہلی نے کبھی مذہب کے نقطہ نظر سے زندگی کو نہ دیکھا تھا بلکہ جہاں تک مذہب کا تعلق تھا وہ اس سے قطعی طور پر کورا تھا۔ اگرچہ دسویں جماعت میں اس نے کئی ایک روزے رکھے تھے اور زندگی بھر وہ عید کی نماز پڑھنے جاتا رہا تھا۔

مرف علم ہی کی بات نہیں جذبے کے لحاظ سے بھی وہ مسلمان نہ تھا۔ پہلی مرتبہ جب منصر نے اس کے دہرو اپنے اسلامی جذبے کی وضاحت کی تھی تو اسے بات سمجھ میں نہ آئی تھی اگرچہ بات کی رنگینی سے متاثر ہوا تھا۔

اس روز وہ دونوں سفید منزل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ منصر نے جذبہ اسلام کی بات کی تو اہلی کی انہی گل گئی۔ چونکہ منصر میں کوئی بات بھی اسلامی رنگ کی نہ تھی۔ وہ شراب پیتا تھا۔ نماز نہیں پڑھتا تھا۔ روزے نہیں رکھتا تھا اور عاشق مزاج تھا۔

اہلی نے طوا "منصر سے کہا:

"اچھا تو آپ مسلمان ہیں؟"

"بالکل۔" منصر جوش میں آکر بولا۔ "الحمد للہ کہ میں مسلمان ہوں۔"

"مجھ میں نہیں آتا۔" اہلی نے کہا۔ "آپ کیسے مسلمان ہیں۔"

"نہریے۔" منصر ایک سیکنڈ کے لئے سوچ میں پڑ گیا۔ پھر بولا۔ "دیکھئے اگر اس وقت چھت ہن ہائے اور جبرائیل اتریں اور آکر مجھ سے کہیں۔ مجھے باری تعالیٰ نے بھیجا ہے۔ فرمایا ہے کہ انصار منصر کو ہمارا اسلام پہنچا دو اور کہو کہ اسلام جھوٹا مذہب ہے اور عیسائیت سچی ہے۔ تو میں جبرائیل سے کہوں گا کہ باری تعالیٰ کو میرا سلام دو اور کہو حضور کا ارشاد گرامی موصول ہوا۔ کہہ گا کہ ہم ہر آنکھوں پر لیکن انصاری منصر مسلمان ہے اور مسلمان ہی رہے گا۔"

”چہا تم جاؤ۔ کمند۔“

کمند بھی چپ چاپ کھڑا ہو گیا۔

ایلی کے دل پر ایک ٹھیس لگی۔ اس نے جماعت کی طرف دیکھا۔ سبھی لڑکے سر اٹکائے بیٹھے۔

ایلی کی نگاہوں سے گویا پردہ ہٹ گیا۔

”میں مسلمان ہوں۔“ نہ جانے کون اس کے دل میں چیخ رہا تھا۔

”اللہ کہ میں مسلمان ہوں۔“ آواز بلند ہوتی جا رہی تھی۔ وہ جماعت سے باہر نکل گیا۔

اگلے روز ابھی وہ رام دین کے بھنور میں ڈبکیاں کھا رہا تھا کہ ڈاکیا آگیا اور اس نے ایک

ایلی کے ہاتھ میں تھما دیا۔ لفافے پر غیر مانوس خط میں اس کا پتہ لکھا ہوا تھا۔ نہ جانے کس کا

پتہ ہے۔ پتہ بھی تو کئی ایک لکھے ہوئے تھے۔ علی پور کا پتہ۔ خانپور کا پتہ اور دھرم سالہ کا۔ جا

ہیں لگی ہوئی تھیں۔

اس نے لفافہ کھولا۔ ایک چھوٹے سے کاغذ پر سرخی میں ایک شعر لکھا ہوا تھا۔

دلاست میری یاد سے کچھ تلخیاں بھی تھیں

اچھا کیا کہ مجھ کو فراموش کر دیا

اسے کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا اور اس نے لفافے کی مہر پر پڑھنے کی

ٹٹکی۔ لفافے کی پشت پر صاف طور پر مہر لگی ہوئی تھی۔ گرد کل بیٹھ۔

”اے۔“ اس کا دل ڈوب گیا۔ وہ خط کو سامنے رکھ کر بیٹھ گیا۔

عجب کی سیاسی تھی۔ نہ وہ سرخ تھی نہ — شعر کے نیچے ایک وجہ سا پڑا تھا۔ دفعتاً

خیال آیا۔ خون۔ پھر اسے معلوم نہیں۔

”جسہ لک۔ وہ خلا۔“

لا بھل گیا کہ وہ رام دین ہے۔ کمرے کی کانس پر سلاوی کی مورتی رقص کرنے لگی۔ وہ

ماہرست بھری حرکات سے عاری تھا۔ اس کے بال کھلے تھے۔ سیاہ لباس زیب تن تھا۔

ماہرست حزن و ملال تھا۔ نرت میں اداسی اور غم کوٹ کوٹ کر بھرا ہوا تھا۔

اس کے بعد ایلی کا خیال سلاوی پر مرکوز ہو گیا۔ شہزاد کی صورت دھندلی پڑتی گئی۔ صفدر کے

جہان میں ہوتے گئے:

ایلی اس نقطہ نظر سے قطعی طور پر ناواقف تھا۔ صرف ناواقف ہی نہیں اس لئے اس نے ایسے جذباتی نقطہ نظر کو سمجھنے کی اہلیت ہی نہ تھی۔ خصوصاً مذہب کے بارے میں۔ اس کے برعکس جذباتی طور پر وہ مسلمان ہونے پر شرمندگی محسوس کیا کرتا تھا۔ وہ سمجھتا تھا کہ مذہبی نقطہ نظر کا قائل ہونا ذہنی وسعت کے فقدان کا اظہار کرنے کے مترادف ہے۔ اسی وجہ سے وہ نہایت طور پر مذہب سے بے تعلقی اور بے زاری کا اظہار کرنے کا دلدادہ تھا۔ اور کفر و الحاد کی پست کر۔ میں دلچسپی لیا کرتا تھا۔

رام دین

دھرم سالہ میں پہلی مرتبہ ایلی کو احساس ہوا کہ وہ مسلمان ہے۔

اس روز وہ حسب معمول پڑھا رہا تھا۔ پڑھاتے ہوئے اس نے پیاس محسوس کی۔

”دین محمد۔“ وہ چلایا۔ چونکہ اس کی جماعت میں صرف ایک مسلمان لڑکا تھا جو اسے پانی

کر دیا کرتا تھا۔

اس روز دین محمد حاضر نہ تھا۔

”رام لال۔“ وہ بولا۔ ”مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔“

رام لال جوں کا توں اپنے ڈسک پر کھڑا رہا۔

”تم جانتے نہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی ماسٹر جی۔ میں ہندو ہوں۔“

”تو کیا ہوا؟“ ایلی ہنسنے لگا۔

”جی میں بھر شٹ ہو جاؤں گا۔“

ایلی تھمہ مار کر ہنس پڑا۔ ”دیکھو رام لال۔“ وہ اسے سمجھانے لگا۔ ”اگر تم میرے ہاتھ

پانی پیو گے تو بے شک بھر شٹ ہو جاؤ گے لیکن اگر تم مجھے پانی لا دو تو اس میں بھر شٹ ہونے کی

کیا بات ہے؟“

اس پر بھی رام لال جوں کا توں کھڑا رہا۔

”جاؤ نا۔“ ایلی کو غصہ آگیا۔

”جی میں بھر شٹ ہو جاؤں گا۔“ وہ بولا۔

”ٹھیک ہے۔ اگر وہ صغیر کو چاہتی ہے تو ٹھیک ہے بلکہ اور بھی اچھا ہوا۔ جین چلی ہو لاکھوں پائے۔“

سانے سادی کھڑی مسکرا رہی تھی۔ دھرم سالہ کے سرسبز پہاڑوں پر دوڑ رہی تھی۔ ایلہ نے سونا اٹھالیا۔ کندھے پر بیگ ڈال لیا اور باہر نکل گیا۔ اسی طرح اس نے دو ماہ بسر کر دیئے۔ وہاں وہ صرف دو ماہ کے لئے بیٹھا گیا تھا۔ پہاڑوں کی خاک چھانتا رہا۔ سادی کے ساتھ وادیوں اور چوٹیوں پر گھومتا رہا۔ وہ اسے کہتا: ”نہیں نہیں سادی۔ میں نے تمہیں فراموش نہیں کیا۔ کیسے فراموش کر سکا ہوں لیکن کیا کروں۔ میرے بس کی بات نہیں۔ کاش کہ تم والد صاحب کی رضامندی کی شرط نہ لگاتیں۔“

اور سادی جواب میں کہتی: ”میرا بس بھی تو نہیں چلتا۔ میں کیا کروں۔“ اور پھر وہ دونوں بانہ میں بانہ ڈال کر چل پڑتے جیسے اس مجبوری کو بھولنے کی کوشش میں سرگرداں ہوں۔

ہیڈ ماسٹر

دھرم سالہ کے بعد اس کی تعیناتی جلدور میں ہو گئی اور وہ جلدور چلا آیا۔ جلدور لاہور کے قریب ایک مشہور قصبہ ہے۔ وہاں کا مدرسہ نہایت فراخ اور خوبصورت تھا اور اس کے ساتھ بہت فراخ گراؤنڈ اور باغ اور پارک ملتی ہے۔ ایسا معلوم ہوتا تھا جیسے وہ ایک کالج ہو۔ جب پہلے روز اس نے سکول کا بیڈ دیکھا جس میں گیارہ بیک پاپ بنیں بیٹھے تھے۔ ایلہ پر نشہ ساطاری ہو گیا۔

سب سے حیران کن چیز جو جلدور اسکول میں نظر آئی سکول کا ہیڈ ماسٹر تھا۔ اس نے کئی ایک سکولوں کے ہیڈ ماسٹر دیکھے تھے۔ وہ سب گویا ایک سانچے میں ڈھلے ہوئے تھے۔ ان کے چہرے رسمی وقار اس قدر چھایا رہتا تھا۔ جیسے دور کا سفر کرنے کے بعد جو تپ پر غبار کی تہ جم جاتی ہے۔ غبار کی اس دبیز تہ کی وجہ سے ان کے چہرے بے حس اور مردہ نظر آتے تھے۔ ان کی گردنیں گویا مکلف ہوتیں جو بڑے مکلف سے حرکت کرتیں۔ آنکھیں نہ تو ہمدردی نہ اہمیت کا چمک سے واقف ہوتیں۔ وہ دیکھتی نہیں بلکہ کریدتی تھیں۔ نکتہ چینی کرتیں۔ وہ ب

ہوک ہوک کر قدم رکھتے تھے۔ ایک مخصوص انداز سے کھانتے۔ ایلہ انہیں دیکھ کر لرز جاتا تھا۔ بولنے وقار کے حصول کے لئے وہ کتنی بڑی قیمت ادا کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنے آپ کو زندگی حرام کر رکھی تھی۔ اور وہ سب علم کی دولت سے کورے تھے چونکہ ان میں طلب علم نہ تھا۔ طلب کیسے ہوتی جبکہ انہیں کامل یقین تھا کہ وہ جانتے ہیں۔ ان کے دلوں میں یہ شبہ کبھی نہ پڑا۔ انہیں ہوا تھا کہ وہ جو جانتے ہیں شاید غلط ہو۔ شاید اس میں ترمیم کی ضرورت ہو۔ وقت کے گزرنے کے مطابق رد و بدل کی ضرورت ہو۔ انہیں دیکھ کر ایلہ کے دل پر خوف مسلط ہو جاتا تھا۔ کہ ایک روز وہ بھی بیڈ ماسٹر بن جائے گا۔ ہاتھ میں چھری تھام لے گا۔ آنکھوں سے دیکھنا چھوڑ کر گھورنا شروع کر دے گا اور بچوں کے دل میں دہشت کی نفرت و حقارت پیدا کر لے گا۔ جلدور اسکول کا ہیڈ ماسٹر قطعی طور پر مختلف تھا اور یہ امر ایلہ کے لئے باعث تعجب اور مسرت تھا۔ اس کا نام شیخ مسعود تھا۔ وہ چالیس کے لگ بھگ ہو گا۔ جسم گٹھا ہوا۔ کلین شیو۔ آنکھوں میں جھجکاؤ تھا اور انداز میں ہیڈ ماسٹریت نام کو نہ تھی۔

”آئیے آصفی صاحب۔“ وہ ایلہ کو دیکھ کر چلایا۔ ”تو آپ ہیں ہمارے نئے ٹیچر۔ اگر آپ فیملی کا خط نہ دیتے مجھے کچھ دیر اور تو میں کہنے ہی والا تھا کہ آپ کون سی جماعت میں داخلہ پاتے ہیں۔“ اس نے بھرپور تہنیت لگایا۔ ”اب آپ ہی بتائیے آصفی صاحب۔ اگر سکول میں بے اساتذہ آجائیں تو کس قدر مشکل ہو جاتی ہے۔ کیسے پتہ چلے کہ استاد کون ہے اور سٹوڈنٹ کون؟ غیر ضرور مگر ایک بات ہے۔ آپس کی بات ہے میں کسی سے کون سا نہیں۔ یہ بتائیے کہ دعوت کو منہال بھی لیں گے۔“ شیخ مسعود نے پھر تہنیت لگایا اور پھر ایلہ کی گھبراہٹ کو سمجھ کر فوراً بات بدلی۔ ”چلے وہ تو بعد میں دیکھا جائے گا۔ پہلے کھانا کیوں نہ کھالیں۔ کتے ہیں پہلے طعام لے کر کھاؤ۔ آئیے۔ گھر سے میرا کھانا آیا ہوا ہے اور وہ مقدار میں اتنا ہوتا ہے کہ دو شخص بیٹ بھر لے سکیں۔“

شیخ مسعود باتیں کرتے ہوئے آگے آگے جا رہے تھے۔ ایلہ ان کے پیچھے پیچھے چل رہا تھا۔ ”لیکن ایک بات ہے۔“ وہ ڈھکے ہوئے دسترخوان کے قریب جا کر کہنے لگے۔ ”شرط لگاؤ۔ اگر میری بیوی نے آج وال کے علاوہ کچھ بھیجا ہو۔ خدا کی قسم۔ بیگم ولی اللہ سے کم نہیں۔ جب کھانا آتا ہو سو فیصدی وال پکاتی ہے۔“

یہ کہہ کر شیخ نے دسترخوان ہٹا دیا اور برتن کو دیکھ کر بے تحاشہ تہنیت لگایا:

”نودیکھو آصفی صاحب۔ میں نے کہا نہ تھا۔ ہی ہی ہی۔“ وہ قہقہے پر قہقہہ مارنے لگے۔

شیخ مسعود ایک عجیب شخصیت کا مالک تھا۔ اس کی طبیعت بیک وقت رکی اور فری رہتی تھی۔ کبھی وہ اعلیٰ قسم کا سوٹ پہنے مدرسے میں آ جاتا اور انگریزی بولنا شروع کر دیتا۔ کبھی کبھی پیسے آوارہ ہوتا اور دھانوں کی طرح باتیں کرتا۔ اسے کام کرنے کا جنون تھا اور وہ اکیلے بیٹھے بے حد خائف تھا جیسے اسے خود سے ڈر لگتا ہو۔ دفتر میں بھی اکیلا نہ بیٹھتا بلکہ اساتذہ کو بلا کر اپنے گرد ایک بھیڑ لگا لیتا اور پھر ان سے بے تکلف دوستانہ باتیں کرتا۔ ان کے دروہ گلیاں دیندے قہقہے لگاتے۔ گلی دینا اس کی عادت تھی۔ یقین سے نہیں کہا جاسکتا تھا کہ وہ غصے میں کھل دے رہا ہے، بے تکلفی کے اظہار کے لئے یا ویسے ہی عادت پوری کرنے کے لئے۔ نہ جانے کس اصول کے تحت قہقہے مارتے مارتے دفعتاً ”وہ غصے میں آ جاتا اور پھر منظر ہی بدل جاتا۔ عام طور سے“ بے تکلف گفتگو کے دوران میں اپنی طبیعت کی ستم ظریفی کے متعلق باتیں کرنے کا عادی تھا۔

”میں وہ ——— فحش ہوں۔“ وہ گلی دے کر کہتا۔ ”جو گرگٹ کی طرح اوتا بدلتا رہتا ہے۔ خدا کی قسم۔ آج تک اپنی طبیعت کا جہز منتر سمجھ میں نہیں آیا۔ ہنس تو یقین نہ کیجئے کہ ہنس رہا ہوں۔ اور غصہ۔ غصہ تو اس حد تک آتا ہے مجھے اور اس قدر آتا ”فانا“ کہ کچھ پتہ نہیں چلتا۔ ایک بندوق خریدی تھی کہ چور چکار سے محفوظ رہوں لیکن اسے کھول کر اس کے کل پرزے الگ الگ صندوقوں میں بند کر رکھے ہیں کہ جب تک انہیں اکٹھا کر کے جوڑوں تب تک شاید غصہ اتر جائے اور نہ بھی اترے تو بیگم دہائی تو بچا سکے۔“

اس کی باتیں بے جوڑ ہوتی تھیں۔ بیٹھے بٹھائے اسے کوئی نہ کوئی خیال آ جاتا اور وہ فوراً اٹھ بیٹھتا اور اس خیال کے مطابق عمل کرنا شروع کر دیتا۔

اس عجیب و غریب طبیعت کے باوجود اہلی کو شیخ مسعود بے حد پسند آیا لیکن رفت یہ خلی کشت مسعود اہلی کو کسی وقت بھی تو اکیلا نہ رہنے دیتا تھا۔ سکول بند ہوتا تھا تو وہ اسے بلا لیتا۔

”چلو آصفی صاحب۔ تمہیں شہر دکھلاؤں۔ بڑے بڑے دلچپ لوگ ہیں یہاں۔“ وہ دونوں شہر کی طرف چل پڑتے۔ راستے میں شیخ گہیں ہانکتا جاتا اور ہر آتے جاتے سے

اور بے تکلفی سے باتیں کرتا۔

”ارے۔“ چلتے چلتے وہ چونکے۔ ”آج بدھ ہے نا۔ آج تو مجھے چک بیس جانا تھا۔ ہے آئے والے۔“ وہ شور مچا دیتا اور پھر زبردستی اہلی کو تانگے میں سوار کر کے وہ چک بیس کو چلے جاتے۔

ہم کو جب وہ لوٹے تو وہ زبردستی اہلی کو پکڑ لیتا:

”اب کھانا کھائے بغیر نہیں جانے دوں گا۔“

کھانا کھانے کے بعد وہ کوئی قصہ چھیڑ لیتا اور اہلی سوچتا کہ کب بات ختم ہو اور وہ اجازت مانگ کرے۔

طبی طور پر اہلی ایک تنہا شخص تھا۔ اس کی نشوونما کے لئے تنہائی بے حد ضروری تھی جیسے ہڈوں کے لئے کھانا ضروری ہوتی ہے۔ سوسائٹی میں بیٹھ تو جاتا تھا اور بات بھی کر لیتا تھا لیکن اسے سوسائٹی میں بیٹھ کر سکون یا خوشی حاصل نہ ہوتی تھی۔ اس کے برعکس اس پر ایک اضطراب چھائے رہتا۔

اس کے علاوہ سادی اس کی منتھ رہتی تھی کہ کب اسے تنہائی حاصل ہو اور وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کریں۔

صرف اس وجہ سے اہلی چند ایک روز ہی میں شیخ مسعود کی مصاحبت سے اکتا گیا لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ زبردستی اپنے آپ کو الگ کر سکے۔ ہمارے تو وہ بتاتا تھا یا چوری چوری رک جانے کی کوشش کرتا سب کوششیں بے کار ہو جاتیں چونکہ شیخ مسعود اسے ڈھونڈ نکالتا اور ہر شے سے بچھا چھڑانا مشکل ہو جاتا۔

ماہی

جلدرا میں اہلی نے صرف چند ایک ساتھی بنائے اور وہ سب متفقہ طور پر شیخ کے متعلق اچھے رائے نہیں رکھتے تھے۔ سکول کے اساتذہ بھی جہاں تک ممکن تھا اس سے دور رہنے کی کوشش میں رہتے تھے۔ اہلی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ آخر لوگ اس کے خلاف کیوں تھے۔ شیخ کی شخصیت کے کئی ایک روشن پہلو تھے۔ ممکن ہے دو ایک تاریک بھی ہوں۔ تاریک بالوں میں نہیں ہوتے۔

جلدرا میں سکول کے قریب ہی اہلی اور افضل نے مل کر ایک مکان لے رکھا تھا اور کام کاج کے لئے ایک نوکر رکھ لیا تھا۔ افضل ڈاکھانے کا ایک کلرک تھا۔ وہ ایک دہلا پتلا قد آور نوجوان قد مسلسل کلرک کی وجہ سے اس کا چہرہ لمبا ہو چکا تھا۔ منہ پر جھریاں پڑ گئی تھیں لیکن آنکھوں میں اُپاریشانی کے بجائے شرارت کوٹ کوٹ کر بھری تھی۔ یہ تضاد کئی بار اہلی کو چونکا دیتا۔

غیر کامت زرد ہو رہا تھا۔

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”تم تو ایسے بات کر رہے ہو جیسے روزمرہ کی بات ہو۔“

”یہ ہے یا پہلوان ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”میں جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”میرے شانوں پر تو صرف ایک ہی سر ہے

پور ہو۔ ذرا سی آہٹ پر گھبرا جاتا۔

ابھی شبیر کو آئے چند ہی منٹ ہوئے تھے کہ گلی کا ایک لڑکا آیا۔

ایلی جواب میں کچھ کہنے ہی والا تھا کہ شبیر پھدک کر کونے میں جا چھپا اور اشارے سے ایلی

لک کر ڈرائنگ ماسٹر کے گھر چلا گیا جس کے مکان کا دروازہ پرلی گلی میں کھلتا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ

میرا کمر چلا گیا تاکہ جگمگ سمجھ کر کہیں اور جانب سے آتا ہے۔ اس روز اہلی کو اندازہ ہوا کہ

یہی مولوی داعی سلول کا بچہ ہو جو لھر سے چوری چوری ادا

لور وہ انکس ماسٹر احمد تھا جو کلاس میں اونٹنھنے کا عادی تھا۔

رژیم اثر چودھری تھا۔

نڈھری کی بوٹی بوٹی تھرکتے تھے۔ اس کامات میں دھار تھی اور نگاہوں کی مسکراہٹ قینچی

ایلی اسے پوچھتا:

ہونٹوں پر گیت رہتا ہے اور آنکھیں نت نئی شرارت سے چمکتی ہیں۔ یہ سب کماے؟ "

کیسی؟“

کے باوجود مولوی دکھائی نہیں دیتا تھا۔ اس کے خوب صورت چہرے پر محبوبیت کی جھلک نمایاں

اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے وہ فرانس یا اٹلی کا باشندہ ہو۔ شبیر کی زندگی بیوی کے مرکز

سے اسے بھی ازم، مرکز سے کچھ لگاؤ ہو، لیکن نظام اسے معلوم ہوتا تھا جسے وہ ایک بچہ ہو اور گھر

والی اس کی دیکھ بھال کرنا اپنا فرض سمجھتی ہو۔ وقت پر اسے کھانا کھلائی۔ وقت پر بسر پر کار

لئے۔ صرف ایسی جگہ جانے کی اجازت دیتی جہاں اس کے اخلاق پر برا اثر نہ پڑے۔

بیٹھک میں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ پھر دفعتاً "اند ر سے کسی نے چلا کر شبیر کو پکارا۔"

”بیگم بلار ہی ہے۔“ شبیر نے مسکرا کر جواب دیا۔

”پھر سہی۔“ وہ بولا۔ ”ہاں تو کیا کہہ رہا تھا میں۔“ وہ پھر باتوں میں معروف ہو گئے۔

”دھڑ دھڑ دھڑ دھڑا م۔۔۔۔۔“ قریب ہی ایک دھماکہ ہوا۔

کی طرح کٹ دیتی تھی۔ سیدھی بات میں الجھاؤ ڈالتا۔ دوسروں کو بیٹا اور سنجیدہ ترین مسئلے
ہی میں ٹال دیتا اس کے بامیں ہاتھ کا کرتب تھا۔

ایلی کے یہ ساتھی اس کے شیخ کے ساتھ زیادہ میل ملاپ رکھنے کے حق میں نہ تھے۔
سمجھتے تھے کہ شیخ مسعود قابل اعتماد آدمی نہیں۔ ایلی سمجھتا تھا کہ شیخ کے متعلق ان کے اندازے
درست نہ تھے۔ اس کے علاوہ ان سب کی خواہش تھا کہ مل بیٹھیں۔ کہیں ہانگیں۔ ہنس کھیل
یا گھومیں پھریں۔ شاید اس لئے وہ ایلی کے شیخ سے زیادہ میل جول رکھنے کے خلاف تھے۔

جاوڑا اسکول میں آتے ہی ایلی کی حیثیت شیخ کے مصاحب کی طرح ہو گئی۔ وہ اس کا مشیر
بن سکتا تھا چونکہ شیخ اپنی مرضی کا مالک تھا اور کسی کے مشورے پر عمل کرنے کے لئے تیار نہ
تھا۔ اسے کسی پر اعتماد نہ تھا۔ اس کے علاوہ ایلی اپنے احساس کمتری کی وجہ سے کسی کا مشیر نہ بن
سکتا تھا۔

اسکول سے فارغ ہو کر شیخ ایلی کو اپنے گھر لے جاتا۔ کھانا کھا کر وہ ایلی سے کہتا:
”دو ایک خط لکھ لیں تو کیا حرج ہے۔“

اور پھر اٹھ کر کمرے کی کھڑکیاں اور دروازے بند کرنا شروع کر دیتا۔ ساتھ ہی قہقہہ مار کر
ہنستا:

”بھئی آصفی! معلوم ہے میں دروازے کیوں بند کر رہا ہوں۔ جو نبی مجھے خط لکھنے کا خیال
آیا تو ساتھ ہی بے سوچے سمجھے میں نے دروازے بند کرنے شروع کر دیئے تاکہ خط لکھواؤں تو
کوئی سن نہ لے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگتا۔

”تو کیا کافی ڈنشل خط لکھوانے ہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”عام سرکاری خط ہیں لیکن میرے لئے ہر خط کافی ڈنشل ہے۔
میری طبیعت ہی ایسی ہے۔ مجھے یوں محسوس ہوتا ہے جیسے ساری دنیا میری دشمن ہے۔ سب میرا
بھید جاننے کی کوشش میں لگے ہیں۔ رات کو جب میں کمرے میں سوتا ہوں تو دیکھتا ہوں کہ کدھر
سے مجھ پر وار کیا جاسکتا ہے۔ کھڑکیاں کھول کر نہیں سوتا چاہے کتنی گرمی ہو۔ چونکہ مجھے خیال
آتا ہے کہ کوئی کھڑکی سے پتہ تول چلائے گا اور خود بھاگ جائے گا۔“ شیخ مسعود ہنسنے لگا۔ ”میری
طبیعت ہی ایسی ہے۔“

اس قسم کی باتیں سن کر ایلی کو شیخ پر ترس آتا تھا اور ساتھ ہی ڈر بھی۔ اس حد تک غلطی اور

بہت فحش پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا! وہ سوچتا۔

پھر ایک ایسا واقعہ پیش آیا جس کی وجہ سے ایلی کی طبیعت میں شیخ کے لئے نفرت پیدا ہو گئی
اور شیخ ایلی پر شک کرنے لگا اور جاوڑا میں ایلی کی زندگی کا دھارا کسی اور رخ پر بننے لگا۔

ایلی مولوی

یہ جانے ایک روز بیٹھے بیٹھے شیخ کو کیا سوچھی ایلی سے کہنے لگا:

”آصفی۔ آؤ ہمیں تماشہ دکھائیں۔“

شیخ اسے دفتر میں لے گیا۔ پھر اس نے مولوی رحمت اللہ عربی ماسٹر کو بلا بھیجا۔ پہلے تو عربی
مذہب سے اس نے چند ایک سوالات کئے پھر جوش میں آکر انہیں ڈانٹنے لگا۔ پھر نہ جانے کیا ہوا۔
یہ پلانے کو آگ دکھادی گئی ہو — شیخ مسعود نے انہیں گالیاں دینا شروع کر دیں۔ غلیظ
گالیاں۔

اس پر عربی ماسٹر کا رنگ فق ہو گیا۔ انہوں نے بولنے کی کوشش کی لیکن زبان سے مہمل
واژوں کے سوا کچھ نہ نکل سکا۔ ظاہر تھا کہ شدت و غصہ اور بے بسی کی وجہ سے مولوی صاحب
بات غیر ہوتی جا رہی تھی۔ جوں جوں ان کی حالت غیر ہوتی توں توں شیخ کا جوش بڑھتا۔

آخر مولوی صاحب کے لئے حالات ناقابل برداشت ہو گئے۔ ناقابل برداشت تو ہو پہلے ہی
لیکن مولوی صاحب کو یہ خیال نہ آیا تھا کہ مزید بے عزتی سے بچنے کے لئے وہ کمرے سے
اڑ پٹے جائیں۔ یہ خیال آتے ہی وہ دروازے کی طرف بڑھے۔ جب انہوں نے دیکھا کہ
درازے کے باہر اساتذہ اور طلبہ کی بھیڑ لگی ہے تو انہیں مزید بے عزتی کا احساس ہوا اور اس
بدمذہب ہوا کہ بے ہوش ہو کر گر پڑے۔

مولوی رحمت اللہ جاوڑا کے ایک معزز شخص تھے۔ صوم و صلوة کے پابند تھے۔ اکثر جمعہ
مذہب کا جامع مسجد میں خطبہ پڑھتے۔ کم گو تھے اور مدرسے کا کام بڑی محنت سے کرتے تھے۔

جب انہیں ہوش آیا تو انہوں نے غصے میں ڈویژنل انسپکٹر کو ایک پرائیویٹ خط لکھ دیا جس
میں انہوں نے اس واقعہ اور شیخ کی زیادتی کا قصہ تفصیل سے بیان کر دیا۔

اس واقعہ پر ایلی بھی بھونچکا رہ گیا۔ کیا یہ تماشہ تھا؟ کیا یہ بات شیخ کے لیے مذاق کی حیثیت
مندی تھی؟ وہ گہری سوچ میں پڑ گیا۔

اس سے جواب طلبی کی ہے۔ بے چارہ پٹ جائے گا۔

ایلی کو مطلع مل گیا۔ بولا: ”ہاں آپ نے واقعی مولوی صاحب سے زیادتی کی تھی۔“
”جواب سس طرح سے اس کا تذکرہ کریں۔“ شیخ نے ہنس کر پوچھا۔

”ہرگز تو بہتر ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”میں معافی مانگ لوں۔“ شیخ چلایا۔

ایلی نے جرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں معافی مانگنے کے لئے تیار ہوں۔ بشرطیکہ وہ کانفہ پر اپنے ہاتھ سے لکھ دے کہ میں مدتی دل سے معاف کروں۔“

شیخ کی یہ بات سن کر ایلی کے دل میں پھر سے اس کے لئے احترام پیدا ہو گیا۔

اس کے بعد مسلسل دو روز سارا شاف مولوی صاحب کی فتنیں کرنے میں لگا رہا کہ شیخ کو کر دیں اور تحریر لکھ کر دیدیں۔ مولوی صاحب اس پر آمادہ نہ تھے لیکن آخر کار انہوں نے ایلی صاحب کو مجبور کر دیا اور انہوں نے یہ تحریر لکھ دی کہ اگرچہ شیخ کا طرز عمل ناروا تھا تاہم اراغی نامہ ہو گیا ہے اور انہوں نے شیخ کو معاف کر دیا ہے۔

یہ تحریر حاصل کرنے کے بعد شیخ نے سکول بند ہونے پر مولوی صاحب کو اپنے کمرے میں ایلی کے سب اساتذہ اور طلبہ جا چکے تھے اور پھر سے انہیں لاتعداد فتنیں گالیاں دیں اور جان کر ایلی سخت کلمات کہے کہ وہ پھر غصے میں آکر انسپٹر کو شکایت کریں۔ شیخ کا یہ اقدام سوچے بچانے کے مطابق تھا۔ بلکہ ایک چڑاسی کو آگ لگانے کے لئے ان کے گھر بھیجا۔ چڑاسی نے ایلی صاحب کو بتایا کہ انسپکٹر نے شیخ کی بھی جواب طلبی کی ہے۔ مقصد یہ تھا کہ مولوی صاحب کے خلاف شکایت کا ایک اور خط لکھیں۔ جب اسے اچھی طرح معلوم ہو گیا کہ مولوی صاحب نے مؤلفہ لکھ دیا ہے تو شیخ نے انسپٹر کو اپنی طرف سے خط لکھا جس کا نفس مضمون یہ تھا:

”مولوی رحمت اللہ میرے باپ کی جگہ ہیں ان کی عزت کرتا ہوں۔

عرصہ چھ ماہ کا ہوا کہ وہ اونٹ سے سر کے بل گر پڑے تھے۔ ان کے سر

باجوت آئی تھی جب سے ان کا ذہن کا توازن ٹھیک نہیں۔ کبھی کبھی

بلوچ ناراض ہو جاتے ہیں اور پھر خود ہی مجھے معاف کر دیتے ہیں۔

بلکہ وہ جلورامیں رہنا نہیں چاہتے۔ اس کی وجہ خانگی امور ہیں۔ بہر حال

اسے سوچ بچار میں کھوئے دیکھ کر شیخ بھی تاڑ گیا کہ ضرور مولوی کے واقعہ نے اس پر گہرا اثر کیا ہے۔ یہ محسوس کر کے شیخ نے ایلی کی ہمدردی حاصل کرنے کے لئے مولوی صاحب کا تذکرہ شروع کر دیا۔

”یہ مولوی لوگ بھی عجیب لوگ ہیں۔“ وہ بولا۔ ”انسان اتنا بھی مسئلے مسائل میں نہ کمر جائے کہ اسے یہ تمیز ہی نہ رہے کہ اس کے گھر میں کیا ہو رہا ہے۔ مولوی خود تو بے حد شریف اور بے زبان ہے لیکن اس کی بیوی اس کی شرافت اور بے زبانی کا خاطر خواہ فائدہ حاصل کرتی ہے۔“ شیخ نے قہقہہ مارا۔ ”اویڑ عمر کی عورت خود کیا فائدہ حاصل کرے گی لیکن اس کی بیٹیاں جو۔۔۔“ شیخ نے ایلی کو آنکھ ماری اور پھر قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

ایلی کو اس کی ہنسی بری لگی لیکن اس میں اس قدر جرات نہ تھی کہ اعلائیہ احتجاج کرتا۔ بہر حال اس شام ایلی گھنا گھنا رہا اور شیخ ہر ممکن طریقے سے دلچسپ اور مزاحیہ باتیں بنا کر اسے خوش کرنے کی کوشش کرتا رہا۔

جب ایلی گھر پہنچا تو وہاں تمام ساتھی بیٹھے اس کا انتظار کر رہے تھے۔ وہ سب غصے میں تھے۔ ایلی پر وہ یوں برس پڑے جیسے مولوی کی بے عزتی اسی کی وجہ سے ہوئی ہو۔ افضل غصے سے کانپ رہا تھا شیر کا رنگ زرد ہو رہا تھا اور اس روز وہ بھول گیا کہ اس کی بیوی دیکھ رہی تھی کہ وہ ایلی کے مکان میں بیٹھا ہے۔ سب شیخ کو گالیاں دے رہا تھا۔ احمد سر جھکائے بیٹھا تھا اور چوہدری مسکرا مسکرا کر کہہ رہا تھا: ”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ یہ تمام شرارت الیاس آصفی کی ہے۔“

پانچ چھ روز کے بعد ڈویژنل انسپکٹر سے دو خط موصول ہوئے۔ ایک تو شیخ کے نام تھا جس میں لکھا تھا کہ جواب دے کہ اس نے ایسا سلوک مولوی سے کیوں روا رکھا اور دوسرا خط بیڈاؤ کے توسط سے مولوی صاحب کے نام تھا جس میں ان سے اس امر کی جواب طلبی کی گئی تھی کہ انہوں نے براہ راست انسپکٹر کو خط کیوں لکھا۔

شیخ نے اپنے نام کے خط کے متعلق تو کسی سے تذکرہ نہ کیا لیکن مولوی صاحب کے خط کا اس قدر تشویر کی کہ بچے بچے کو علم ہو گیا کہ انسپکٹر نے الٹا مولوی صاحب کو ڈانٹا ہے۔

اس روز رات کو شیخ ایلی کو اپنے گھر لے گیا۔ کہنے لگا:

”بھئی آصفی۔ میں سمجھتا ہوں مولوی صاحب سے زیادتی ہوئی ہے۔ ایک تو اس روز تذکرہ نے انہیں بلاوجہ برا بھلا کہا حالانکہ وہ محض مذاق تھا۔ مجھے ایسا نہیں کرنا چاہئے تھا اور اب انہیں

پتھر صورت تمہید تھی۔ بیگم نے محلے کے چار بزرگوں کو بٹھا کر کہا کہ میں تو ہرگز اس بات کے ساتھ نہ رہوں گی۔ اور یہ فیصلہ کرا لیا کہ وہ لا پور رہے اور مولوی صاحب انہیں ہندو فرج بھیجے رہیں۔ اس فیصلے کے بعد وہ بچیوں کو لے کر چلی گئی اور مولوی صاحب تنہا رہ گئے۔

ملاٹ کو یوں بدلنے دیکھ کر مولوی صاحب بھونچکے رہ گئے۔ انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ یہ ملاٹ چاروں طرف آگ سی کیوں لگ گئی ہے۔ کیوں لوگ انہیں پاگل سمجھنے لگے ہیں۔ پتھر گھبراہٹ سے ان کی شکل و صورت میں دیوانگی کی جھلک پیدا ہو گئی۔

شیخ مسعود واحد آدمی تھا جو حالات کے رخ کو سمجھ رہا تھا۔ مولوی صاحب کا ذکر آ جاتا تو وہ نے گا اور خوش ہوتا جیسے کسان اپنی بوٹی ہوئی فصل کاٹنے وقت خوشی سے پھولا نہیں ساتا۔ شیخ ہنس کر دلی پر اس قدر خوش ہوا کہ اس نے اپنی اس صنائی میں مزید تیل بوٹے کاڑھنے کا ارادہ کر لیا۔

اس نے اپنے ایک سکھ شاگرد سو بھانگہ کو جو سکھوں کے ایک چک میں مل سکول کا ہیڈ رہتا تھا اس بات پر آمادہ کر لیا کہ وہ مولوی صاحب کو اپنے سکول میں لے لینے کی پیش کش کرے اور بعد میں ذرا ان کے مزاج صاف کرنے کا انتظام کرے۔

الہ پڑ صاحب کو بھلا بات کی حقیقت سمجھنے کی کیا ضرورت تھی وہ تو صرف لقمہ و نسق چلانے اور تھے انہوں نے سکھ ہیڈ ماسٹر کے اس اقدام کی تعریف کی اور مولوی رحمت اللہ وہاں لے کر دیئے گئے۔ ہیڈ ماسٹر سو بھانگہ کے توسط سے مولانا کو چک میں کوٹھڑی مل گئی۔ اور وہ کچھری کے عالم میں جا پڑے سو بھانگہ نے پہلے ہی چک میں مشور کر دیا کہ ان کے دماغ کو تیز ہے۔

ایک روز مولانا نے جوش اسلام میں آکر با آواز بلند اذان فرمادی۔ سو بھانگہ کا اشارہ تو پہلے ہی تھا کہ لوگ مولوی صاحب پر پل پڑے۔ انہوں نے پیٹ پیٹ کر انہیں ادھ موا کر دیا اور ان سے ان کا سامان نکال کر باہر پھٹکوا دیا۔ سامان کیا تھا۔ ایک بستر، ایک لوٹا، ایک جائے نماز ایک کتبہ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ چک سے دیس نکالا ملنے کے بعد مولوی صاحب نے عالم مجبوری طے کی اس واحد مسجد میں قیام کیا جو وہاں سے چار میل دور بر سر راہ مسافروں کے نماز کے لئے بنائی تھی اور جو چار مربع فٹ انیٹوں کے چبوترے پر مشتمل تھی۔ اس علاقے میں

میں نہیں چاہتا کہ ان کی بہتری میں حائل ہوں۔ مولوی صاحب کا معافی نامہ ارسال خدمت ہے۔ مجھے خوشی ہے کہ انہوں نے مجھے معاف کر دیا۔ اگرچہ میں نے کوئی گستاخی نہیں کی تھی۔ سہواً کوئی بات منہ سے نکل گئی ہو جسے غلط فہمی کی وجہ سے انہوں نے برا مان لیا ہو تو مجھے علم نہیں۔“

ایم معروف ولایت سے بیرسری کی ڈگری لے کر نئے نئے ہندوستان میں آئے تھے اور آتے ہی کالج میں پروفیسر ہو گئے تھے۔ پھر چند ماہ کے بعد محکمہ میں ڈویژنل انسپکٹر کے عہدے پر فائز ہوئے تھے۔ وہ ایسے ہتھکنڈوں سے واقف نہ تھے اور چونکہ طبعی طور پر کسی کا برا نہیں چاہتے تھے لہذا شیخ مسعود کے اس خط سے جو مولوی رحمت اللہ کے دوسرے شکایتی خط کے ساتھ موصول ہوا تھا انہیں یقین ہو گیا کہ واقعی مولوی صاحب کا ذہنی توازن ٹھیک نہیں۔ انہوں نے مولوی صاحب کے لئے بے انتہا ہمدردی محسوس کی۔ اپنے ڈپٹیوں کو بلا کر انہیں ساری بات سمجھائی کہ وہ دورے پر جائیں تو کوئی مناسب مقام تلاش کریں جہاں مولوی صاحب کو تبدیل کیا جائے۔

نتیجہ یہ ہوا کہ جہاں بھی ڈپٹی یا معروف جاتے کمال ہمدردی سے کہتے:

”ہمارے ایک عربی مولوی ہیں جو بڑے معزز اور شریف آدمی ہیں البتہ ذرا ذہنی توازن ٹھیک نہیں ان کا۔ اگر آپ انہیں اپنے سکول میں لے لیں تو کیا اچھا ہو۔“

افران کی اس بے پناہ ہمدردی کا نتیجہ یہ ہوا کہ مولوی صاحب کی دیوانگی پر مہربان ہو گئی اور ڈویژن کے کونے کونے میں مولوی صاحب کے دماغی عارضے کا پتہ چار ہو گیا۔ اور شیخ مسعود نے اسے ہوا دی۔

مولوی صاحب کی بیگم کے کانوں تک بات پہنچی تو اس نے سر بیٹ لیا۔ کہنے لگی:

”میں تو پہلے ہی کہتی تھی کہ وہ باؤلا ہے کوئی مانتا ہی نہ تھا۔“

یہ بات ان کی بیوی کے حق میں تھی چونکہ وہ مولوی صاحب سے الگ آزادی میں رہنا چاہتی تھی۔ اسے بہانہ مل گیا۔ ایک روز دغتاً اس نے شور مچا دیا جب مولوی صاحب دغتہ پڑنے میں معروف تھے۔ لوگ اکٹھے ہو گئے۔ اس پر بیگم نے پینتر ابدلہ:

”دہائی خدا کی اب لوگوں کو دکھانے کے لئے جائے نماز پر جا بیٹھا ہے۔“

”وہ چل چلو“ چودھری مسکرا رہا تھا۔ کہ زندگی بھر شیخ کو معلوم نہ ہو کہ کون چال چل
بدلیں چاروں شانے چت گرا ہو۔“
اس رات دیر تک ایلی کے مکان پر کانفرنس ہوتی رہی۔ طے پایا کہ فوری اقدام کیا جائے مگر
شیخ کو علم نہ ہو کہ وار کدھر سے ہو رہا ہے ورنہ اگر وہ خبردار ہو گیا تو حملہ کرے گا اور اس میں
طاہر کی عظیم صلاحیت ہے۔ جاوے کے تمام لوگ مل کر بھی اعلانیہ اس کا مقابلہ نہیں کر
سکتے تھے۔

حلقہ کی تباہی و تباہی کو طے کرنا ایلی کے ذمے کر دیا گیا۔
اس کے بعد ایلی اور افضل کا گھر سازش کے اڈے میں بدل گیا۔ افضل کی آنکھوں میں
ہلہول چلنے لگیں جیسے تلخ تلاب میں آہنجی ہو۔ چودھری کے گل ابھر کر گلہاں ہو گئے۔ احمد
نے فوریہ غدوغل میں ہلکی سی بیداری پیدا ہو سنی۔ شبیر میں خارجی دنیا میں اس حد تک دلچسپی
باہولی کہ وہ بیوی کو بھول گیا۔ اور مسلسل گھر سے باہر وقت گزارنے لگا۔
ایلی کا مکان چونکہ گلی کی کڑے واقع تھا اس لئے اسبلی ہل بن گیا۔ وہاں بحث مباحثے ہونے
لگے۔ فرارداریں پیش ہونے لگیں۔ پلان بننے لگے۔ تفصیلات طے ہونے لگیں۔ ایک روز جب
مرگم بحث تھے تو دروازہ بجا اور شبیر داخل ہوا:
”کچھ ہوش بھی ہے۔“ وہ بولا۔

”بہم ہوش و حواس کی دنیا سے نکل آئے ہیں۔“ افضل نے جواب دیا۔
”اب تو ایک دھن سونو ہے۔“ چودھری نے اپنی زندان آنکھوں کو گھماتے ہوئے کہا۔
”لوٹنوں۔ یہ غلط بات ہے۔“ شبیر بولا۔ ”اگر بات نکل گئی تو سازش دھری کی دھری رہ
گئی۔ دنگل شروع ہو جائے گا۔“

”نہ بھی۔“ جمل بولا۔ ”ہم تو سازش کے قائل ہیں، دنگل کے نہیں۔“
”دنگل تو ان پڑھ اور غیر منہب آدمیوں کا کام ہے۔“
”ہے نا۔“ شبیر نے رازدارانہ طور پر کہا۔ ”تو تمہیں معلوم ہونا چاہئے کہ سازشیں کیا یہ
”ابھی ختم ہے۔“

اس بات پر افضل بگڑ گیا۔
”ٹھہری تو ہیں کرتے ہو؟“ وہ بولا۔ ”ہم جو پیدائشی کیا خاندانی طور پر مانے ہوئے سازش

صرف وہی پناہ گاہ انہیں مل سکی۔ انہوں نے اپنا سامان وہاں رکھ دیا اور خود اللہ کی یاد میں بیٹھ
گئے۔ پھر ایک روز سو بھانگہ کے اشارے پر کوئی ان کا بستر اٹھا کر لے گیا۔ جب وہ سکول سے
واپس آئے تو بستر کا کچھ پتہ نہ تھا۔ رات کو سردی کی وجہ سے وہ اگڑ گئے اور اگلے روز سکول میں
لوکے ان کے گرد جھگڑا کئے انہیں چھیڑ رہے تھے
”پاکل پاکل۔“

پھر معلوم نہیں کہ انہیں کیا ہوا۔ زمین نکل گئی یا آسمان نے ڈھانپ لیا۔

سازشی

مولوی صاحب کے اس المیہ پر ایلی ششدر رہ گیا۔ ملازمت کی دنیا سے متعلق یہ ہلکی
جھلک تھی جو اس نے دیکھی تھی۔ ملازمت میں سازش کا یہ پہلا تجربہ تھا آج تک وہ زندگی کو گلیا
کنارے پر بیٹھ کر دیکھتا رہا تھا۔ اس کے روبرو سنٹرل ماڈل سکول کا نیچر کھڑا چھڑی ہلا رہا تھا۔
”بھول جاؤ۔ جو کچھ تم نے پڑھا ہے سب بھول جاؤ۔ کتابوں کی دنیا کو فراموش کر دو۔“
چھڑی آگے بڑھا رہا تھا۔ ”یہ لو اسے استعمال کرنے میں درلغ کیا تو پٹ جاؤ گے۔“

دوسری طرف شیخ مسعود ممتدہ مار کر ہنس رہا تھا:
”دیکھا۔ کیسا تماشا دکھایا تمہیں۔ یہ قوف کیس کا۔ میری شکایت کرتا ہے۔ میری۔ مری کا
بچہ جنگلی سڑ سے کھینکا چاہتا ہے۔ بے وقوف دیوانہ۔“

ایک طرف مولوی خود کھڑا تھا۔ اس کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ آنکھیں کھنچ گئی تھیں۔ ہونٹ
سوچے ہوئے تھے۔ ”یا اللہ۔“ وہ بڑبڑا رہا تھا۔ ”یا اللہ۔ یہ کیا ہو رہا ہے؟“

”یا اللہ۔“ ایلی دانت پس کر بولا۔ ”یہ تیری دنیا ہے کیا۔“
اللہ تعالیٰ کے خلاف اسے ایک اور شکایت پیدا ہو گئی اس زمانے میں وہ اس مشہور شعر
قائل تھا۔ انسان پر ایک اور ظلم۔ اللہ تعالیٰ کی ایک اور توہین۔

”سور۔ سور۔“ جنگلی سور۔ ”ایلی کے کانوں میں آوازیں آ رہی تھیں۔ مگر
اس کے تمام ساتھی غصے سے بھرے بیٹھے تھے۔“

”اب ہمارے ہاتھ سے بچ کر نہ جائے۔“ افضل کی ٹانگ ہل رہی تھیں۔ آنکھیں ٹرات
سے چمک رہی تھیں۔

ہیں۔“

”تو خاندانی سازشی کو معلوم ہونا چاہئے ابھی آدھ گھنٹہ ہوا۔ آپ کے دروازے پر فوراً
مسعود کھڑا تھا اور وہ یہاں پورے پانچ منٹ کھڑا رہا۔“

”ارے۔“ سب کے منہ سے چیخ نکل گئی اور پھر محفل پر سناٹا چھا گیا۔

”ابھی تو شیخ پروار نہیں ہوا اور وہ مطمئن ہے اس کے باوجود وہ اس قدر شکی مزاج واقع ہوا
ہے کہ فضا کو سو گھنٹے سے نہیں چوکتا۔ جب وار ہو جائے گا پھر تو وہ ساری ساری رات ہتھی کے
چکر کاٹے گا جیسے مسلمان بادشاہ بھییں بدل کر رعایا کا حال جاننے کے لئے گھوما کرتے تھے۔“
”بھئی یہ تو ٹھیک ہے۔“ افضل بولا۔

”اور اس گھر میں جو بات ہوتی ہے وہ آدمی گلی تک سنائی دیتی ہے۔“

اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ چندہ کر کے ایک پرانا ہارمونیم خریدا گیا۔ چند ایک تاش کر گزیاں
منگوائی گئیں جب بھی بحث کا آغاز ہوتا تو ایک آدمی ہارمونیم بجانے پر تعینات کیا جاتا۔ تاکہ اپنے
کے شور میں بات سنائی نہ دے اور سازشی ہر وقت تاش کے پتے تھامے رہتے تاکہ کوئی آجائے
تو سمجھے تاش کھیلنے کے لئے اکٹھے ہوئے ہیں۔ اس کے بعد کہیں سے ایک پرانا ٹاپ رائٹر حاصل
کیا گیا اور شیخ کے خلاف گمنام چٹھیوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا گیا۔

ان چٹھیوں کا انداز انوکھا تھا اور ایلی نے التزاماً انہیں ایسی شکل دی کہ وہ عام گمنام چٹھیوں
سے ہٹ کر ہوں تاکہ افسران بالا انہیں دلچسپی سے پڑھیں۔ دوسری بات یہ تھی کہ وہ نہایت
مختصر ہوتیں۔ زبان میں دفتری انداز مفقود ہوتا۔ کوشش کی جاتی ان میں مزاح کا رنگ غالب
رہے، مظلومیت اور شکایت کا عنصر نہ ہو۔

ڈویژنل انسپکٹر کو روز ایک چٹھی لکھی جاتی جس کا مستقل عنوان جاوڑا لیٹین تھا۔ مستقل
عنوان کے نیچے ایک ذیلی عنوان ہوتا۔ اس کے نیچے سیریل نمبر اور نیچے نفس مضمون۔

مثلاً

فلاں سال میں ۱۲۰۰ روپیہ ہمارے ریلیف فنڈ اکٹھا کیا گیا۔ چار صد روپیہ سرکاری بک میں ملنا
کرایا گیا۔

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

باقی آٹھ سو روپیہ کیا ہوا؟

ناچور

ان انوکھے خطوط وجہ سے ڈویژنل دفتر میں ایک شور مچا گیا۔ پرانے افسران حیران تھے کہ
ایم خط کیسے ہیں؟ ایسے گمنام خط تو کبھی موصول نہیں ہوئے تھے۔ مسٹر معروف انہیں پڑھ کر
بڑھ ہو رہے تھے۔ غالباً انہیں اس بات پر خوشی ہو رہی تھی کہ اپنے ملک میں بھی ایسے لوگ
ہو رہے جو ایسے رنگین قسم کے شکایتی خط لکھنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔

شیخ مسعود کو جب معلوم ہوا تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ یا اللہ یہ کیسے گمنام خط
؟ اور ان کا جواب کس طرح دیا جاسکتا ہے؟ اور لکھنے والا کون ہے؟ اور یہ انداز اسے کچھ سمجھ
نہیں آ رہا تھا لیکن شیخ کا رنگ زرد پڑ گیا۔ اس کی آنکھیں گویا خانوں سے باہر نکل آئیں۔ پھر
بے علم معلوم ہوا کہ خطوط کا یہ سلسلہ لاشعاری ہے تو اس پر ایک وحشت اور دیوانگی طاری ہو
گئی۔

اس نے ایلی کو اپنے کمرے میں بلایا اور چاروں طرف کے دروازے بند کر کے کہنے لگا:
”کیوں بھئی آصفی صاحب۔ آج کل کچھ دور رہتے ہیں۔ کیا وجہ ہے۔ مجھ سے ناراضگی ہے

کیا؟

ایلی نے ایک ساعت کے لئے سوچا کہ اسے کیا رویہ اختیار کرنا چاہئے۔ بہر صورت ایلی طبعی
اور پریمی رویے کا حامی نہ تھا لہذا اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ عام سازشی نہیں بنے گا اور یہ نہ
کے گا۔ ”اچھا۔ یہ بات ہے۔“ یا ”آخر بات کیا ہے۔“

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”میں آپ سے سخت ناراض ہوں اور جان بوجھ کر آپ سے
لڑ رہا ہوں۔“

شیخ بھونچکا سا رہ گیا۔ ”کیا وجہ ہے؟“ اس نے کہا۔

”وجہ آپ کو معلوم ہے۔“ یہ کہتے ہوئے ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ الٹا چور ہو۔

شیخ اور گھبرایا۔ ”مجھے معلوم نہیں۔ میں نہیں سمجھا۔“ وہ بولا۔

”آپ سمجھتے نہیں جانتے ہیں لیکن کسی سے کہتے نہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ اور شیخ کو
دل پریشانی سے بچانے کے لئے اس نے بات کی وضاحت کی۔ ”دیکھئے شیخ صاحب۔“ وہ بولا۔
”زشتہ دو تین روز سے آپ پریشان ہیں۔ آپ کا چہرہ۔ آپ کی چال ڈھل۔ آپ کی باتیں پکار

پکار کر کہہ رہی ہیں کہ کوئی اہم واقعہ ہوا ہے جس کی وجہ سے آپ گھبرائے ہوئے ہیں اور سوچ بچار میں پڑے ہیں۔ صرف آپ کی زبان خاموش ہے باقی تمام اعضا چلا چلا کر وہ راز کہہ رہے ہیں لیکن آپ سمجھتے ہیں کہ وہ راز آپ نے دل میں چھپا رکھا ہے۔ ”ایلی ہنسنے لگا۔

شیخ کا رنگ فق ہو گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ لیا۔ ”کیا واقعی؟“

بولی۔ ”تو کیا آپ اسی لئے مجھ سے ناراض ہیں؟“

”ناراض اس لئے ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”کہ آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں اور آپ مجھے بات نہیں بتا رہے۔“

شیخ نے تفتہ لگایا۔

”اب ہنسنے نہیں شیخ صاحب۔“ ایلی جلال میں آکر بولا۔ ”ایسا راز رکھنے کا فائدہ جس کا آپ کے جسم کا بند بند اعلان کر رہا ہے۔“

”تو کیا تمہیں معلوم ہے وہ راز؟“

”اوموں۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے صرف یہ معلوم ہے کہ آپ کوئی اہم بات چھپا رہے ہیں آپ بہت اہم سمجھتے ہیں۔ اگرچہ مجھے اسے جاننے میں کوئی دلچسپی نہیں۔ صرف اسے بتائیے جس پر آپ کو اعتماد ہے۔“

”اعتماد تو مجھے کسی پر بھی نہیں۔“ شیخ ہنسنے لگا۔

”تو نہ بتائیے۔ لیکن پھر یہ بھی ضروری ہے کہ آپ ضبط سے کام لیں اور یہ بھی ظاہر نہ ہونے دیں کہ کوئی چیز اندر ہی اندر آپ کو کھائے جا رہی ہے۔“

شیخ کھیانہ ہو گیا۔

ایلی ڈرتا تھا کہ کہیں شیخ اسے اس امر میں راز دیاں نہ بتالے۔ اس حد تک وہ ہر ادل لدا کرنے کی اس میں ہمت نہ تھی۔ بہر حال اس کی باتیں سن کر شیخ اور بھی گھبرا گیا اور ایلی کو شیخ سے دور رہنے کا جواز مل گیا۔

مسلل ایک ماہ کی جواب طلبیوں پر شیخ کے ممبر کا پیمانہ لبرز ہو گیا۔ اسے شک تو ہر اسند پر تھا لیکن اسے یہ ثبوت نہ مل سکا کہ کون اس کے خلاف خط لکھ رہا ہے اور شکایت کی نوعیت اس قسم کی تھی کہ انکا جواب اس سے بن نہ آتا تھا۔ اس کے پرانے جھگڑے سب لیں ہو چکے تھے۔

شاہد اسی وجہ سے اس نے ایک نیا طریقہ کار آزمانے کا فیصلہ کر لیا۔ پھر ایک خصوصی سٹاف بنگ بانی اور اساتذہ کو جمع کر کے سب کے سامنے اس نے وہ راز افشا کر دیا۔

”حضرات۔“ وہ بولا۔ ”یہ میٹنگ میں نے اس لئے منعقد کی ہے کہ میں آپ سے بردارانہ دھڑکنا چاہتا ہوں۔ بات یہ ہے کہ کوئی شخص میرے خلاف مسلسل شکایات لکھ کر بھیج رہا ہے اس معاملے کو چلتے ہوئے دو ماہ ہو چکے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ جس صاحب کو مجھ سے لڑت ہے اور یہ مہم چلا رہا ہے وہ میرے روبرو آجائے اور میں حلف اٹھا کر کہتا ہوں کہ میں اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کروں گا۔ بلکہ میں اس سے سمجھوتہ کرنے کو تیار ہوں اور اس کی جائز بات دور کرنے کے لئے کوشش کروں گا۔“

شیخ یہ کہہ کر رک گیا۔ تمام اساتذہ سر جھکائے چپ چاپ بیٹھے رہے۔ دیر تک وہ انہیں اس سے کریدتا رہا۔

ایلی اٹھ بیٹھا۔

”میں دو ایک باتیں پوچھنا چاہتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”پوچھئے آصفی صاحب۔“

”یہ بتائیے کہ شکایات کی نوعیت کیا ہے؟“

ایک ساعت کے لئے شیخ سوچ میں پڑ گیا۔ پھر حسب عادت بات ٹالنے کے لئے اس نے کہا: ”معمولی قسم کی شکایات۔ اوہرا دھر کی۔“

”لیکن حضور۔“ چودھری کھڑا ہو کر کہنے لگا۔ ”ایسی گمنام شکایات کو کوئی اہمیت نہیں دی لہ کر کے دیتے۔ خود ہی تھک کر رک جائے گا۔“

”آپ کو کسی پر شک ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں تو مجھے آصفی صاحب آپ پر بھی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

ملا اسٹاف تفتہ مار کر ہنس پڑا۔

”یہ خط۔“ شیخ نے وضاحت کی۔ ”جدید انگریزی میں لکھے جاتے ہیں اور جدید ترین ٹیپراس لہ میں صرف آپ ہیں۔ اور اسپیکر صاحب نے مجھے لکھا ہے کہ ان لوگوں کے نام لکھ بھیجوں یا نہیں شک ہے۔“

”ہاں ہاں تو ضرور لکھئے میرا نام۔“ ایلی نے جواب دیا۔

ایلی نے بلی گویا جلورے کا بن کر رہ گیا۔“

”معروف صاحب کی کیا بات ہے؟“ ایلی نے بلی زبان سے پوچھا۔

”جی ہاں، مجھے تو معلوم نہیں۔ تم تو جانتے ہو اپنے ان سے تعلقات ہیں۔ سبھی افر عزت لے رہے ہیں۔ دوستانہ سلوک سمجھ لو۔ یہ ان کی محبت ہے ورنہ — خیر خیر تو وہیں چائے پارٹی بیٹھے تھے۔ اتفاق سے جلورے کی بات چل پڑی تو میں نے ڈپٹی کمشنر صاحب سے کہا ہمارا ارادہ ہے وہیں جانے کا۔ اپنا لڑکا ہے نا وہیں۔ اس بات پر مسٹر معروف چونکے۔ اچھا تو الیاس وہیں ہے نا کل — آپ ہی نے تو تعیناتی کی تھی، میں نے جواب دیا۔ اس پر وہ بولے۔ ”تو اسے“

”اولد ایک دن کے لئے اور جب وہ یہاں آئے تو ذرا میری کوٹھی پر بھیجوا دیتا۔ ہی ہی ہی ہی۔“

ایلی نے ہنس لگے۔ ”وہ تمہیں اچھی طرح جانتے ہیں۔ سبھی افر تمہیں جانتے ہیں۔ کبھی بلکہ اکثر ہی میں تمہارا تذکرہ آجاتا ہے نا اس لئے۔ دوست جو ہوئے اپنے۔ کیوں نصیر کی ماں۔ تو کیا دیکھ رہے ہو۔ جیسے سمجھنے کی کوشش کر رہی ہو بات کو۔ میں بتاؤں بالکل بیکار ہے سمجھ کا خانہ ہی نہ ہو تو پھر کوشش بیکار ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔ کیوں شمیم۔ کیا یہ غلط ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“

”اچھا ابھی ایلی آج شام کو تم معروف صاحب سے ضرور مل لیتا۔ ان کی کوٹھی سے واقف بنا دینا کی دوکان کے بائیں ہاتھ صدر میں۔ تم شام کو آٹھ بجے پہنچ جانا ورنہ وہ کلب ولب لے جاتے ہیں۔ بیرے کو بلا کر کہنا میں آصفی صاحب کا بیٹا ہوں۔ وہ مجھے جانتا ہے جب جاؤ بڑی طرہ دار کرتا ہے۔ جملیہ ہے نا۔ یہ جملیہ بڑے مہمان نواز ہوتے ہیں اور معروف صاحب کو دانا نہ کہ تم آصفی صاحب کے بیٹے ہو ورنہ شاید انہیں یاد نہ رہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگے۔ ”یہ نہ ہو کہ تمہیں واپس لوٹا دیں۔ ہی ہی ہی ہی ہاں بھی تم جیسے ماتحت تو ان کے سینکڑوں رہ چکے ہوں۔“

”آصفی صاحب سے دوستانہ جو ہوا۔“ نصیر کی ماں نے طنزاً کہا۔

”ابھی احمد ہنسنے لگے۔“

”گلاب چمکڑوں نے بھی بات کرنا سیکھ لیا۔ ہی ہی ہی ہی۔ سن رہی ہو شمیم۔ چیونٹیوں کی طرح پر نکل آئے۔ کتنی ہے میں پرندہ ہوں۔ ہی ہی ہی ہی۔“

”معروف ایک خوبصورت رنگین مزاج، خاموش اور نہایت سے بھرے ہوئے نوجوان

”تو پھر اقبل کرونا کہ تمہیں مجھ سے شکایات ہیں۔“ شیخ ہنسنے لگا۔

”ہاں۔ مجھے آپ سے دو شکایات ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”پہلی شکایت یہ کہ آپ نے دو ماہ تک ہم سے یہ بات چھپائے رکھی ورنہ شاید حالات اس حد تک نہ بگڑتے اور دوسری شکایت یہ کہ آپ ہم سب سے تو مطالبہ کرتے ہیں کہ ہم آپ پر اعتماد کریں لیکن آپ کو ہم سے کسی شخص پر اعتماد نہیں۔“

سارا شاف حیرت سے ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔

مسٹر معروف

عین اس وقت تار والا ڈاکہ داخل ہوا۔ اسے دیکھ کر شیخ از سر نو گھبرا گیا۔

”کیوں؟“ وہ بولا۔ ”کوئی تار ہے کیا میرے واسطے؟“

”نہیں جی۔“ وہ بولا۔ ”الیاس آصفی کے نام کا ہے۔“ اس نے ایک تار ایلی کی طرف پھرا

دیا۔

ایلی نے تار کھول کر پڑھا۔

”کیوں خیریت تو ہے؟“ شیخ نے پوچھا۔

”جی ہاں بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”والد صاحب نے مجھے خانپور بلایا ہے۔“

”خیر سے بلایا ہے کیا؟“

”لکھا ہے مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔“

”مسٹر معروف تم سے ملنا چاہتے ہیں۔ لیکن کیوں؟“

”مجھے نہیں علم۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”وہ والد صاحب کو اچھی طرح سے جانتے ہیں۔“

”شاید میری تعیناتی کی بات ہو کوئی۔“

ایلی خانپور پہنچا تو گھر میں سب لوگ اطمینان سے بیٹھے تھے۔ اس کا خیال تھا نہ جانے تھی

اہم بات ہو جس کے لئے مجھے بلایا ہے۔ شاید مسٹر معروف کو شک پڑ گیا ہو کہ وہ جلورہ میں

ایڈیٹر ہے یا کسی نے بھید کھول دیا ہو۔ ممکن ہے شیخ مسعود نے خود شکایت کی ہو۔ بہر صورت

بات اہم تھی لیکن وہاں جا کر اس نے محسوس کیا جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔

”اچھا ایلی آیا ہے۔“ علی احمد نے اس کی آمد کی خبر سن کر کہا۔ ”بہت اچھا کیا جو آئے؟“

تھے۔ وہ عام انجیکٹروں سے قطعی طور پر مختلف تھے اور ان کا انداز بالکل انوکھا تھا۔ غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ براہ راست اس عمدے پر فائز ہوئے تھے۔ ویسے عام طور پر محکمہ تعلیم کے افسر بتدریج ترقی کرنے کے بعد ڈیوٹیل انجیکٹر بنا کرتے تھے۔ اس کے علاوہ غالباً وہ پہلے ڈیوٹیل انجیکٹر تھے جو ولایت سے ڈگری حاصل کر کے آئے تھے۔ پرانے افسروں کا طرز عمل تحصیل دار اور پٹواری کے بین بین ہوا کرتا تھا۔ وہ دیکھنے کی بجائے گھورتے۔ بات کرنے کی بجائے ڈانٹنے اور اساتذہ سے دور رہتے تھے۔ اس کے برعکس معروف نہایت اخلاق سے ملنے یوں باتیں کرتے جیسے وہ افسری نہیں اور ڈانٹنے کے فن سے تو وہ بالکل ناواقف تھے۔

ایلی معروف سے مل کر حیران رہ گیا۔ معروف نے اسے پاس بٹھالیا۔ سرسٹ پیش کیا اور پھر یوں باتوں میں معروف ہو گئے جیسے ایلی کو صرف ٹیبل ٹاک کے لئے بلایا ہو۔ پھر دفعتاً انہوں نے موضوع بدلا اور جاوڑا کے متعلق پوچھنے لگے۔ کیا وہ اچھی جگہ ہے؟ موسم کیسا ہے؟ لوگ کیسے ہیں؟ سکول کیسا ہے؟ آپ کا دل لگ گیا کیا؟

پہلے تو ایلی بے پروائی سے ان کے سوالات کا جواب دیتا رہا پھر دفعتاً اسے خیال آیا کہ شاید جاوڑا ایلیٹن کا بھید پانے کے لئے اس سے حالات پوچھ رہے تھے۔ اس پر ایلی سوچ میں پڑ گیا۔ اور اس نے فیصلہ کر لیا کہ وہ شیخ کے خلاف کوئی بات نہ کرے گا۔

”ہاں تو الیاس صاحب۔ آپ کے سکول میں تو پارٹی بندی نہیں ہوگی کوئی؟“ معروف نے پوچھا۔

”میں نے تو نہیں دیکھی۔“ وہ بولا۔

”ہیڈ ماسٹر تو وہاں کے بہت قاتل اور کارکن آدمی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”اور بے حد دلچسپ ہیں۔“

معروف صاحب نے طرح طرح سے ایلی کو بات کرنے پر اکسایا لیکن اس نے انہیں سرسری جواب دیکر ٹل دیا۔

آخر انہوں نے واضح بات کی:

”دیکھو الیاس۔ میں نے تمہیں صرف اس لئے بلایا ہے کہ جاوڑا سکول میں سخت گڑبڑ ہے۔ معلوم ہوتا ہے کچھ لوگ ہیڈ ماسٹر کے خلاف سازش کر رہے ہیں اور چونکہ میرا اصول ہے کہ ایسے سازشیوں کو سخت سزا دیتا ہوں اس لئے تم خاص طور پر خیال رکھو۔ ایسے لوگوں سے بات

وہ اگرچہ چلے تو ہمیں بتاؤ کہ وہ کون ہیں۔ میں نہیں چاہتا کہ میرے ایک دوست کا لڑکا ایسے پس میں الجھے۔ گڈ بائٹ۔“

معروف صاحب نے اٹھ کر اس سے مصافحہ کیا اور ایلی گھر چلا آیا۔

اگلے روز معروف نے غالباً علی احمد سے بھی بات کی جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ سارا دن وہ اسے قہقہے کرتے رہے۔

”دیکھو نا ایلی۔ ایسے لوگ ملازمت میں کبھی فائدے میں نہیں رہے جو اس قسم کی سازشوں میں حصہ لیتے ہیں ہمیشہ اپنے افسر سے بنا کر رکھنی چاہئے۔ چاہئے دوسروں سے اس کا ملک کیا بھی ہو ہمیں اس سے کیا۔ تم ہمیشہ ہیڈ ماسٹر کا ساتھ دینا اور بلکہ اگر تمہارا کوئی جاننے والا اس سازش میں شریک ہو تو اسے بھی خبر دوا کر دینا۔ اس کا بھلا کر دینا چونکہ معروف صاحب بہت سخت ایکشن لیں گے۔ یہ تو ان کی مہربانی ہے کہ تمہیں خود بلا کر بات سمجھا دی ہے۔ تم برے بیٹے ہو اس لئے۔ ورنہ تمہاری کیا حیثیت ہے۔ ایک معمولی ٹیچر۔ ایسے سینکڑوں ٹیچر مارے مارے پھرتے ہیں کون پوچھتا ہے جی۔ اور ڈگریاں ان کی قیمت کیا ہے آج کل۔ اگر تم میرے بیٹے نہ ہوتے تو کیا تمہیں نوکری مل جاتی۔ اچھی توبہ کرو۔ کون پوچھتا ہے۔ ہی ہی ہی۔ کیوں نصیر کی ماں۔“

گڈی میں بیٹھے ہوئے ایلی سوچ رہا تھا کیا مسٹر معروف کا مجھے بلانے سے یہ مقصد تھا کہ بلور کے حالات سے واقفیت حاصل کرے۔ اونہوں۔ معروف کو صبح حالات جاننے کی خواہش تھی۔ اسے اس بات سے دلچسپی نہیں کہ نظم و نسق کی خرابیوں کو دور کیا جائے۔ انہیں تو صرف یہ فکر امن گیر ہے کہ کسی جائز یا ناجائز طریقے سے نظم و نسق قائم کیا جائے قائم رکھا جائے۔ انہوں نے مجھے بلوایا تھا تاکہ میری معرفت ان لوگوں کو ڈرا دیا جائے کہ ایسی سازشوں کا نتیجہ پتہ نہیں ہوتا اور سازشیوں کو انجیکٹر صاحب سخت سزا دینے کے قائل ہیں۔

بلور پہنچ کر ایلی نے ساری بات کارنگ ہی بدل دیا۔ سازشیوں کی محفل میں اس نے ایسی باتیں کیں جن سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ مسٹر معروف انصاف کرنے کے قائل تھے لیکن وہ ایسے لوگوں کو پسند نہیں کرتے تھے جو جرات سے شکایت نہیں کر سکتے اور شیخ صاحب کے پاس جا کر ملنے انہیں بتایا کہ معروف آپ کے بڑے مداح ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ آپ ان لوگوں سے نمونہ کر لیں جنہیں آپ سے شکایت ہے تاکہ جاوڑا سکول کی مزید بدنامی نہ ہو۔

”یہی رعب ڈالتی ہے اور کیا۔“
 ”ہوں۔“ شیر بولا۔ ”یہ نہ کہو تم اس سے واقف نہیں۔ وہ کر مزرے گی۔ وہ بڑی
 دانا دوت ہے۔“
 ”پھر نہ آیا کرو یہاں۔“ افضل بولا۔
 ”تم سب سے نفرت ہے۔“ شیر بولا۔ ”وہ اس مکان کو بہت برا سمجھتی ہے۔ کوئی
 نہیں کہ وہ شیخ کے گھر جا کر اسے صورت حال سے مطلع کر دے۔“
 ”پھر کیا کیا جائے۔“ احمد نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔
 ”کرنا کیا ہے۔“ چودھری نے کہا۔ ”آخر ایک نہ ایک دن تو بات نکلے گی۔“

شیر کی بیوی کے رخ کو بدلتا آسمان کلام نہ تھا۔ اسے راز فاش کرنے سے باز رکھنے کی صرف
 ایک صورت تھی کہ شیر کو وہاں آنے سے منع کر دیا جائے۔ لیکن شیر نے اعلان کر دیا۔ ”میں
 یہاں چاہے لاکھ کوشش کروں میں تم سے ملنے سے باز نہ رہ سکوں گا۔“
 ”تو پھر اپنی بیوی کا ذمہ لو کہ وہ ایسی واہیات حرکت نہ کرے گی۔“ افضل نے کہا۔
 ”نہ بھلی۔“ وہ بولا۔ ”یہ میرے بس کا روگ نہیں۔“

اس نئے جھیلے کی وجہ سے کٹڑ والے مکان کا نقشہ ہی بدل گیا۔ وہ سب گہری سوچ میں پڑ
 گئے۔
 شیر کی بیوی کو ہر اس مکان سے نفرت تھی۔ جس میں کوئی عورت نہیں رہتی تھی۔ اس
 کا خیال کے مطابق صرف وہی مرد معزز ہو سکتا تھا۔ جس کے گھر ایک اپنی بیٹا بیوی ہو اور
 بڑے افضل اور اہلی کے گھر میں کوئی عورت نہ تھی۔ لہذا ساری دنیا کے گنہ اس مکان میں
 آئے تھے۔ وہاں تاش کھیل جاتا تھا۔ واہیات گفتگو ہوتی تھی۔ شراب پی جاتی تھی۔ جو اٹھایا جاتا
 تھا وہاں آتی تھیں۔

ان حالات میں اس مکان اور اس کے کینوں کے خیالات کو بدلتا قطعی طور پر ممکن نہ تھا۔
 ”بھئی کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔“ افضل بولا۔
 ”اچھا۔“ اہلی نے کہا۔ ”میں کوشش کروں گا۔“ لیکن اس کے باوجود اسے سمجھ میں نہیں
 آتا کہ کس طرح کوشش کرے۔

ملری رات وہ سوچتا رہا پھر دفعتاً اسے دعوت کا خیال آ گیا جو شیر نے انہیں کھلائی تھی۔

اس ملاقات کا نتیجہ یہ ہوا کہ جب اہلی واپس جاؤرا پہنچا تو جلاور اسکول کی سازش اور نفرت
 پکڑ گئی۔ وہ لوگ جو تقریباً سازشیوں کا ساتھ دے رہے تھے اس میں نمایاں حصہ لینے لگے
 بلیٹن کے لئے تازہ مواد دستیاب ہونے لگا۔ اور شیخ مسعود اس کا مقابلہ کرنے کی امید کو بیٹھے
 اور انتہائی خطرناک اقدام کو عمل میں لانے کی سوچنے لگے۔ اس سلسلے میں انہوں نے ڈپٹی کمشنر
 پشیل پولیس، سی آئی ڈی اور سول پولیس سے خط و کتابت شروع کر دی۔ اپنے پرانے
 جھگڑوں کے مطابق وہ اس بات کے قائل تھے کہ دشمن پر سخت وار کرنا چاہئے تاکہ وہ اپنے ہتھیار
 کی کوشش میں لگ جائے اور مزید وار نہ کر سکے۔

ضدی عورت

پھر ایک عجیب واقعہ ہوا۔ ایک روز جب وہ سب مل کر ایک نئی سکیم پر بحث کر رہے تھے تو
 شیر کا بھانجہ جلوہ داخل ہوا۔ اس کی عمر نو سال کی ہوگی۔
 ”کیوں کیا بات ہے۔“ شیر اسے دیکھ کر چلایا۔ ”کیا مجھے بلایا ہے؟“
 ”جی نہیں خاں صاحب۔“ وہ بولا۔
 ”تو پھر؟“

”پیغام دیا ہے۔“
 ”اچھا۔“ شیر بولا۔ ”تو ٹھہرو میں ابھی سنتا ہوں۔“
 ”جی۔“ جلوہ نے کہا۔ ”انہوں نے کہا ہے کہ سب کے سامنے دینا پیغام سب کے
 سامنے۔“

”اچھا تو دے۔“ افضل چلایا۔
 ”جی انہوں نے کہا ہے کہ جا کر کہو اگر خان صاحب اس گھر میں پھر داخل ہوئے تو میں
 شیخ کے گھر جا کر ساری بات بتا دوں گی۔“
 ”کیا کہا؟“ سب کے منہ کھلے کھلے رہ گئے۔
 ”جی یہی کہا تھا۔“

”کس نے کہا ہے؟“ اہلی نے پوچھا۔
 ”شیر کی بیگم نے اور کس نے۔“ افضل بولا۔

اس دعوت کے کوائف بھی انوکھے تھے۔

کریلے

ایک مرتبہ انہوں نے شیر کو مجبور کیا کہ وہ انہیں دعوت کھلائے۔ پہلے تو شیر انہیں جانا دیا لیکن آخر اس نے محسوس کیا کہ دعوت کھلائے بغیر چارہ نہیں اس نے ایک دن مقرر کر دیا۔ مقررہ دن وہ سب تیار بیٹھے رہے کہ کب بلاوا آئے۔ آخر شیر آیا اور کہنے لگا: ”تو بھی ابھی کھانا آتا ہے۔“

”آتا ہے کا کیا مطلب؟ افضل نے کہا کیا ہم تمہارے گھر نہ جائیں گے؟“

”نہیں یار۔“ وہ بولا۔ ”وہاں جا کر کھانے کا کیا مزہ۔ یہیں بھجوا دیتا ہوں میں تم میری بیوی کی علوت سے واقف نہیں کوئی ایسی بات ہو گئی تو سارا مذاکرہ ہو جائے گا۔“

اس کے بعد انہوں نے دیکھا کہ شیر کا بھانجا جاوہ ہاتھ میں ٹرے اٹھائے ان کے گھر کی طرف آ رہا ہے۔ لیکن ان کی حیرت کی انتہا نہ رہی جب انہوں نے دیکھا کہ ان کے ہاں آئے کے بجائے وہ سیدھا آگے نکل گیا۔

انہوں نے جاوہ کو آوازیں دیں شور مچایا مگر وہ چپ چاپ سیدھا نکل گیا۔

”یتیم کی سبیلی کے ہاں کھانا پہنچانے گیا ہے“ شیر بولا۔ ”ابھی واپس آکر ہمارا کھانا لے آئے گا۔ کھیراؤ نہیں۔“ کچھ دیر کے بعد جاوہ وہی بھرا ہوا ٹرے اٹھائے واپس آ گیا۔ اسے دیکھ کر شیر بولا۔

”اچھا تو کیا وہ لوگ گھر نہیں ملے؟ اچھا تو انہیں پھر دے آتا۔ یہ ہمیں دے دو۔“ شیر نے کچھ اس انداز سے بات کی کہ افضل اور ایللی کو سمجھ میں نہ آیا۔

دراصل بات یہ تھی کہ شیر کی بیوی ایللی اور افضل سے مشینوں کا کھانا پکانے کے لئے چار نہ تھی۔ اس لئے شیر نے یہ بمانہ بنایا تھا کہ مسجد میں دو ولی اللہ ٹھہرے ہوئے ہیں۔ ان کی دعوت کرنا ہے۔ یتیم اس کی چال میں آگئی اور اس نے کھانا تیار کر دیا۔ جب جاوہ کھانے کے مسجد کی طرف روانہ ہوا تو وہ حسب علوت دروازے میں کھڑی دیکھ رہی تھی کہ کھڑا لے گیا پر تو نہیں رکتا اور شیر کی ہدایات کے مطابق جاوہ سیدھا نکل گیا تھا اور موڑ مڑنے کے بعد کچھ دیر وہاں انتظار کرتا رہا تھا تاکہ یتیم شیر مطمئن ہو کر اپنے کام کاج میں لگ جائے اور وہ کھانا لے کر

بہرمل ایللی اور افضل کو اس بھید کا علم نہ تھا۔ ان کا خیال تھا کہ شیر نے فتیں کر کے بیوی دعوت پکانے پر تیار کر لیا ہے۔

اس دن اسے خیال آیا کہ یتیم شیر کو راضی کرنے کا صرف ایک طریقہ ہے اگلے روز ایللی نے دروازہ جاکھٹکھٹایا۔

”ہیں بھئی۔“ ایللی نے پوچھا۔ ”شیر کہاں ہے؟“

”وہ تو ابھی سکول سے نہیں آئے۔“ جاوہ بولا۔

ایللی نے با آواز بلند چلا کر کہا۔ ”لیکن شیر تو آج سکول آیا ہی نہیں تھا۔“ اس کا مقصد یہ تھا کہ یتیم ہاتھ سن کر چونک جائے۔

”گھر سے تو سکول ہی گئے تھے“ جاوہ نے کہا۔

”میں نے کہا جاوہ۔“ ایللی بڑے رازدارانہ انداز سے بولا۔ ”تمہارے گھر جب بھی کریلے لیا تو تیار توڑے سے مجھے دینا۔ اتنے اچھے کریلے تمہارے ہاں بنتے ہیں کہ جواب نہیں۔ یار نے کریلے بے حد پسند ہیں۔“

جاوہ چپ چاپ کھڑا تھا۔

ایللی نے آواز اور آہستہ کر لی اور بولا۔ ”چاہے چرا کر کھلاؤ لیکن صرف ایک بار کھلاؤ۔“

ایللی ایک مرتبہ تمہارے گھر کے کپے ہوئے کریلے کھائے ہیں۔ اس روز جب شیر نے ہماری انت کی تھی۔ کھلاؤ گے یار؟“ اس نے کہا۔ ”گھر نہ بتانا۔ چوری چوری کھلاؤ۔ ضرور۔“

ایللی نے اچھی طرح علم تھا کہ شیر کی یتیم بڑے غور سے اس کی ہر بات سن رہی ہے اس لئے اس نے جاوہ کی بہت فتیں کیں اور پھر چلا آیا۔

مگر اس نے افضل کو کہا۔ ”بھئی پتھر تو پھینک آیا ہوں اب پتہ نہیں کیسی لہرس اٹھیں گی۔“

”کیا پتھر پھینکا ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”ہاں سمجھ لو پتھر تھا۔ اب تو لہرس دیکھو۔“

ایللی کو شیر آیا تو اس نے آتے ہی شور مچا دیا۔ ”یار یہ کیا سحر کر دیا تم نے الیاس حد ہو

”کیوں کیا بات ہے؟“ افضل نے پوچھا۔

”بات؟“ وہ بولا۔ ”بات کہیں تو معجزہ ہو چکا ہے۔“

”معجزہ؟“ افضل نے دہرایا۔ ”کچھ پلے بھی پڑے یار۔“

”بات بتانے سے پہلے میں تمہیں پچھلا قصہ سنا دوں۔“ شبیر نے کہا۔ جب پہلی مرتبہ تم نے مجھ سے دعوت کھلانے کی بات کی تھی تو میں نے اپنی بیوی سے اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا۔ تمہارے لئے دعوت پکائے یہ تو وہی نہیں سکتا تھا۔ اس لئے میں نے اسے کہا تھا کہ مجھ میں مولوی ٹھہرے ہوئے ہیں ان کی دعوت کرنی ہے۔“

”ارے۔“ افضل چلایا۔

”اچھا۔“ ایلی بولا۔ ”جسبی جاوہ پہلے خوان لے کر آگے چلا گیا تھا۔“

”بھئی بیگم تو تمہارا نام تک سننے کے لئے تیار نہیں۔ لیکن آج۔ معلوم ہے آج کیا مطلب۔“

”کیا ہے اس نے؟“

”کیا؟“ افضل بولا۔

”کہ کل تمام سالان خرید کر لاؤ میں ان کی دعوت کروں گی۔“

”کس کی؟“ افضل چلایا۔

”بھئی تمہاری اور کس کی۔“ شبیر ہنسنے لگا۔ ”مجھے تو اپنے کانوں پر یقین نہیں آتا تھا۔ جانے آصفی نے وہاں جا کر کیا کیا ہے۔ نقشہ ہی بدل گیا ہے گھر کا۔“

”لیکن یہ ہوا کیسے؟ ساری بات بتاؤ یار۔“ افضل بولا۔

”گھر لوٹا تو پہلے تو جواب طلبی ہوئی کہ بتاؤ آج سکول کیوں نہیں گئے تھے اور گئے کہاں تھے۔ پھر دوسری جواب طلبی ہوئی۔ کہنے لگی اس روز مجھے دھوکا دیا تھا تھا۔ دعوت دوستوں کی کی تھی اور بہانہ مولوی صاحب کا بنایا تھا۔ بیگم کو یہ شکایت ہے۔“ وہ ہنسنے ہوئے بولا کہ اگر دوستوں کی دعوت کرنی تھی تو مجھے بتایا ہوتا کہ میں دل لگا کر پکاتی۔ میں نے تو ویسے ہی بے پروائی سے کٹا پکایا تھا۔ حیرت ہے یار۔“

”تو حیرت نشانے پر بیٹھا۔“ ایلی ہنسنے لگا۔

”بیجان اللہ کیا حیر ہے اور کیا تیرا انداز ہے۔“ شبیر نے کہا۔ ”ایسی بات کرو کہانی ہے تم نے

جو میری دانست میں ممکن ہی نہ تھی۔“

”ایلی بولا۔“ شیخ سے جا کر شکایت کرنے کا خطرہ تو ٹل گیا۔“

”ارے۔“ شبیر چلایا۔ ”تو کیا اس لئے یہ حیر چلایا ہے۔“

”خود کیا دعوت کھانے کے لئے؟“ ایلی ہنسنے لگا۔

”میں تو دعوت کھانے کے لئے ہی آیا ہوں۔“ محمود داخل ہو کر بولا۔

”ارے تم؟“ ایلی اسے دیکھ کر چلایا۔ ”تم یہاں کہاں؟“

”دیکھ لو۔“ وہ بولا۔ ”ڈھونڈ ہی نکالا تمہیں۔“

”لیکن اس وقت کو کسی گاڑی سے آئے ہو؟“ ایلی نے پوچھا۔

”گاڑی کا تو وقت نہیں۔“ افضل بولا۔

”میں موٹر سے آیا ہوں۔“ محمود مسکراتے لگا۔

”بس سے اس وقت؟“

”تو کیا کار سے آئے ہو۔“ ایلی نے طنزاً کہا۔

”ہاں ہاں کار سے بیٹھ کر سب کتنا سناؤں گا۔“

”چھا تو بیٹھ جاؤ۔“ ایلی نے کہا۔ ”پہلے ہماری بھین منٹلی کی کتھان لو پھر تمہاری کتھا بھی سن لیں گے۔ چلو بھئی۔“ ایلی چلایا۔ ”پہلے کلام پھر کلام۔“

اس پر اس کے ساتھی دو حصوں میں بٹ گئے۔ دو ایک طرف بیٹھ کر ہارمونیم بجانے لگے۔ ہاتھ کھینچنے میں معروف ہو گئے۔ کھیلتا تو کیا تھا وہ یوں شور مچانے لگے۔ جیسے تاش کھیل رہے۔

”ایلی نے اٹھ کر اپلوں کے ڈھیر تلے سے ٹاپ مشین نکالی اور ٹاپ کرنے لگا۔“

”ارے۔“ محمود حیرت سے چلایا۔ ”یہ کیسی کتھا ہے۔“

”یہ سازش ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”سازش۔“ محمود کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔

لب کی بار محمود آیا تو اس کا حدودا روبر بدلہ ہوا تھا۔ وہ روی ٹوپی اور شلوار عائب تھیں۔

”اگر کی جگہ چٹون نے لے لی تھی اور سر نہ تھا۔“

جب وہ دونوں اکیلے ہوئے تو انہوں نے بات چھیڑی

”کہاں ہو تم آج کل؟“ ایلی نے پوچھا۔

”یہی تو مجھے معلوم نہیں۔“ محمود نے کہا۔

”آخر کس تو ہو گے۔“

”یہ تو ٹھیک ہے۔“

”کیا دیر پالو ہو؟“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تبدیل کر دیا ہے۔“

”کہاں؟“

”لاٹپور۔“

”لائل پور میں تو کوئی گورنمنٹ سکول نہیں۔“

”کوئی نہیں۔“ وہ مسکرایا۔

”تو پھر؟“ میں نے ویلفیئر کے محکمہ میں نوکری کر لی ہے لیکن۔“

یار میں یہاں کام نہیں کرنا چاہتا۔“ محمود نے جملہ ختم کیا۔

”کیوں؟“

”اس محکمہ میں تو عورتیں ہی عورتیں ہیں۔“

”اس میں کیا دقت ہے۔“

جس انفر کے ساتھ میں ہوں وہ تو ہر بات میں جذباتی پہلو مد نظر رکھتی ہے۔ پول

دیکھ لے تو یوں خوشی سے ٹہکتی ہے جیسے نہ جانے کیا دیکھ لیا ہو۔ کوئی نوکر آکر اپنا دکھا دوے تو

آنکھوں میں آنسو آجاتے ہیں۔ ہر بات میں ذاتی زاویہ ہر معاملے میں پرسل دیونہ بھی ان کے

ساتھ میرا گزارہ نہیں۔“

”تم بھی جذباتی پہلو اختیار کر لو۔“

”عورت کے ساتھ میں تو صرف ایک ہی پہلو اختیار کر سکتا ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”تو کر لو۔“ ایلی نے کہا۔

”نوکری ہاتھ سے جائے گی۔“

”جانے لگے تو سامنے جا کر رو رہا۔ وہ بھی رو پڑے گی بات ختم ہو جائے گی۔“

”ج۔“ محمود کی آنکھوں میں عجیب چمک لہرائی۔

”مخود ہی کہتے ہو۔ نوکر رو کر کتھانائے تو اس کے آنسو نکل آتے ہیں۔“

”لیکن جذباتی پہلو اختیار کیسے کیا جائے۔“ اس نے پوچھا۔

”یہ تو آسان ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”نئے کپڑے پہنے تو شوق بھری نگاہوں سے دیکھو اور کو

بڑا پیارا لگتا ہے۔“

”یہ تو میں کرتے کرتے تھک گیا۔“ وہ بولا۔ ”خوش تو ہو جاتی ہے وہ مگر میری طرف نگاہ بھر

رہیں دیکھتی۔“

”خوب صورت ہے؟“

”ایسی خوب صورت تو نہیں لیکن میم ہے۔“

”ہم۔“ ایلی اچھل کر بیٹھ گیا۔

”موجود کی ہوتی تو کیا تم سے ہی پوچھتا آکر۔“

”ہاں میں کیسے آئے تھے؟“

”اسی کی کار ہے۔“ وہ بولا۔

”اے تو کیا اس نے اپنی کار دے دی تمہیں یہاں آنے کے لئے؟“

”نہ پچھائے آئی تھی۔“ وہ ہنسا۔

”خود۔۔۔؟“

”ایک ساعت کے لئے خاموشی چھائی رہی۔“

”اور اب وہ کہاں ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”واپس چلی گئی۔“

”واپس کہاں؟“

”آئی پور۔“

”تو کیا وہ تمہاری شوفر ہے اور تم پوچھ رہے ہو کہ کیا کروں بھی واہ۔“ ایلی ہنسا۔ ”جو آتا

ہمیں بے وقوف بناتا ہے۔“

”تین کرو۔“ محمود بولا۔ ”میں خود بھی بے وقوف بنا ہوا ہوں۔ کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔“

”کیا نہیں آتا سمجھ میں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”کچھ بھی تو نہیں آتا۔“ وہ بولا۔ ”کسی وقت میری ہر بات مانتی ہے۔ کسی وقت بات نہیں

سختی۔ کسی وقت بات بات پر ضد کرتی ہے۔ جیسے ہر بات میری خواہش کے خلاف کرنے کی تم کھائے بیٹھی ہو۔ کسی وقت ایسا ہوتا ہے۔ جیسے مجھ سے بہت قریب آگئی ہو لور پھر ایک ساعت میں یوں دور چلی جاتی ہے۔ جیسے کوئی واسطہ ہی نہ ہو۔ نہیں یار۔” وہ چلایا۔ ”میں تجھ سے آگیا ہوں۔ اگر میں اس زمانہ تجھے میں کلام کرتا رہا تو کسی روز موقوف ہو جاؤں گا۔“ محمود کے آنے پر ایلی مسلسل دو روز اس کے پاس بیٹھا رہا وہ دونوں کنبوں کی باتیں کرتے رہے آکسفورڈ یونیورسٹی کے محوروں پر بحث کرتے رہے عورت کی نفسیات کے مختلف پہلوؤں پر بات کرتے رہے۔

پھر محمود نے سوشل ورکروں کی بات چھیڑ دی۔ ”یار ایلی یہ دنیا ہی زلی ہے۔“ وہ بولا۔ ”قوم جسے عورت کہتے ہیں۔ عجیب قوم ہے۔ قہقہوں میں روتی ہے۔ آنسوؤں میں ہنست ہے۔ نہ کہہ کر پچھتاتی ہے ہاں کہتے ہوئے تنہا ہے۔ میں آج کل الف لیل کی دنیا میں جی رہا ہوں۔“ وہیں خواجہ سرا ہیں جنت ہیں۔“

ایلی حیرت سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ حتیٰ کہ دروازے سے پوم پوم کی آواز آئی۔ ”ارے یہ کیا ہے؟“ ایلی چلایا۔

محمود کا رنگ فق ہو گیا۔

”کار کا ہارن معلوم ہوتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں۔“

”کیا وہ خود لینے تو نہیں آگئی؟“

”ایسا ہی معلوم ہوتا ہے۔“

”اس نے کہا تھا کہ میں آؤں گی۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولا۔ ”اس نے کہا تھا زیادہ سے زیادہ ایک روز رہنا پھر چلے آنا اور آج۔“

روز ہو چکے ہیں۔“

”تو یقیناً“ وہی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

محمود اٹھ کر باہر چلا گیا اور چند ساعت میں آکر مسکراتے ہوئے بولا۔ ”یار وہی ہے کتنی؟“

چونکہ تم وعدے کے مطابق کل نہیں پہنچے تو میں لینے آئی ہوں۔“

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”اچھا افسر ملا ہے تمہیں۔“

محمود نے اپنی چیزیں سوٹ کیس میں رکھنی شروع کر دیں اور کہنے لگا۔ ”یار مجھے اس مجھے اچھا لگتا ہے۔“

ایلی جہاں تھا کہ ایسے سازگار حالات کے باوجود محمود وہاں سے تباہ کرنا چاہتا تھا۔ کتنی باتیں تھیں اور پھر محمود جو طبعی طور پر لیڈر مین واقع ہوا تھا۔ جو عورتیں سے دوریوں سے بھاگتا تھا۔ جیسے کسی آبی جانور کو صحرا میں پھینک دیا گیا ہو۔ زندگی کس قدر عجیب تھی۔

ایلی اور جگ

محمود کے جانے کے بعد ایلی سکول گیا تو شیخ کے تیور بالکل بدلے ہوئے تھے۔

”کیسے آگئی صاحب۔“ شیخ اسے دیکھ کر بولا۔ ”بڑے مصروف معلوم ہوتے ہیں آپ آج۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ شیخ کی بات طنز بھری تھی۔ ”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”عجب مصروفیت ہے کہ آدھی رات تک گھبرا جے بجاتے ہیں۔“

”وہ تو ہمیں گے۔“ ایلی نے کہا۔

”تو نہیں منائی جارہی ہیں۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو ہے“ شیخ بولا۔ ”دشمن پر وار ہو رہے ہوں تو خوشی تو ہوتی ہے۔“

نہ جانے کیوں ایلی شیخ کی اس بات پر بگڑ گیا۔ ”اگر آپ اس بات پر مصر ہیں کہ میں آپ کو

نہ بکھاؤں تو چلے یونہی سی۔“

شیخ نے قہقہہ لگایا۔

”شاہ صاحب آپ کے قہقہے نہ گئے۔“

”کوشش تو بہت کی لوگوں نے۔“ شیخ ہنستے ہوئے بولا۔

”جی۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے یہی حیرت ہے۔“

”ہمارا آئیے تو سہی۔“ شیخ نے اپنا رویہ بدلا۔

لیکن نہ جانے کیوں ایلی کو غصہ آگیا تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ کسی زمانے شیخ سے ناراض ہو جائے

لیکن ناراضی سے نجات حاصل ہو جس میں پھنسا ہوا تھا۔ اس دورانی پر اسے اپنے آپ سے

نفرت محسوس ہوتی تھی۔

”نہیں شیخ صاحب۔“ وہ بولا۔ ”اس وقت فرصت نہیں۔“

ایلی کے اس رویے کی وجہ سے شیخ ایلی کے ساتھیوں کو بلواتا اور ان سے کہتا بھی میری اور آصفی کی صلح کرادو اور وہ سب مل کر ایلی کو مجبور کر دیتے پھر یہ قافلہ شیخ کے گھر جا پہنچے۔ وہاں پہنچ کر ایلی صاف صاف بھری محفل میں کہتا۔ ”مجھے شیخ صاحب کے خلاف کوئی شکایت نہیں صرف اس بات کا رنج ہے کہ وہ مجھ پر شک کرتے ہیں اور پھر ان میں اتنی جرات نہیں کہ صاف صاف منہ پر کہہ دیں۔ نہیں صاف صاف نہیں کہتے بلکہ عورتوں کی طرح طعنے دیتے ہیں۔“ اس پر شیخ تسمیں کھانا کہ مجھے آصفی پر شک نہیں۔

شیخ کی یہ بات سنتے ہی چودھری شور مچا دیتا۔ ”چلو بھئی صلح ہو گئی اب کوئی جھگڑا نہیں رہا اب آصفی شیخ صاحب سے بغل گیر ہو جائے۔ اٹھو آصفی۔“ افضل اس کی ہل میں ہل ملا کہ شیر آہستہ سے چلا تا۔ ”اور مٹھائی۔“ ”وہ تو ہو گی ضرور ہو گی۔“ چودھری چیخا۔

پھر وہ سب بیٹھ کر مٹھائی کھاتے اور قہقہے لگاتے ہوئے ایلی کے گھر کی طرف چل پڑے۔ وہاں جا کر باجے بجنے شروع ہو جاتے۔ تاش کی بازی لگ جاتی اور ایلوں کے انبار تلے سے ہپ کی مشین نکل آتی اور چودھری قہقہہ مار کہتا۔ ”لو بھئی آصفی آٹھ دن کے بعد شیخ سے ہجر ہو جانا یار تمہارا کیا بگڑے گا ہمیں مٹھائی مل جائے گی کیا حرج ہے۔“ شیر قہقہہ لگاتا۔ ”ضرور ضرور۔“ احمد تلی بجاتا۔

”بگڑ جائے گا بگڑ جائے گا۔“ افضل سنجیدگی سے کہتا۔ ”میرا ذمہ رہا۔ لیکن تم صلح کرانے میں دیر نہ لگانا۔“

چودھری چلاتا۔ ”اس کا ذمہ میں لیتا ہوں۔“

ان کے لئے یہ ایک نیا شغل تھا۔ جیسے یہ لڑائی اور صلح کا ڈرامہ ڈرامہ در ڈرامہ کی حیثیت رکھتا ہو۔ ان کے نزدیک اس نئی بات نے سازش کو صلح اور جنگ کے ایک دلچسپ کھیل میں تبدیل کر دیا تھا۔

پھر وہ بیگم شیر تھی۔ ان سب نے اس کے پکوانوں کی تعریفیں کر کے اسے بالکل رام کر لیا تھا۔ ہر مینے وہ ان کو دعوت دیتی اور وہ اس کے گھر جا کر کھانا کھاتے اور کھانے کے دوران ہر اہتمام سے اس کے پکانے کی تعریفیں کرتے ان کی تعریفیں سن سن کر شیر زرب کہتا۔ ”ارے

بہن! بس کرو کیوں میرا دیوالہ نکالنے پر ادھار کھائے بیٹھے ہو۔ ابے او خبیثو کیوں اس نیک بن کو دھوکا دے رہے ہو۔ کیوں میرا گھر اجاڑ رہے ہو۔“ لیکن دل ہی دل میں وہ بھی خوش تھا۔ بہن! اب بیگم اس پر پابندیاں عائد نہیں کرتی تھی۔

نتیجہ۔ بیچارا

بیگم شیر کی اس تبدیلی کی وجہ صرف کرپے نہیں تھے۔ ایلی نے بہت جلد محسوس کر لیا تھا کہ ان کرپے دیا ثابت نہیں ہو سکتے۔ جب تک کہ ان بنیادی باتوں کے متعلق کوئی بات نہ اپنی جائے جن کی بنا پر بیگم شیر کو ان کے خلاف شکایت تھی۔

ایلی ابھی زندگی کی دہلیز پر کھڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ زندگی کا تار و پود کیا ہے۔ وہ صرف ہر ایک تیوریوں سے واقف تھا۔ جو اس نے کتابوں میں پڑھی تھیں۔ اور اسے شوق تھا کہ تیوریاں کو کام میں لائے اور دیکھے کہ زندگی میں وہ کیا اثر پیدا کرتی ہیں۔ اس نے ان چند نکات کو آزما دیکھا تھا اور اسے خاصی کامیابی حاصل ہوئی تھی اس لئے ان خیالات کو مزید نکلنے میں اسے راحت ہوتی تھی۔

ایک روز اس نے بڑی سنجیدگی سے شیر کو کہا تھا۔ ”شیر میرا ایک پیغام بیگم تک پہنچا دو۔“ شیر گہرا کیا۔ ”نہیں یار چھوڑو اس بات کو اس نیک بخت کو زیادہ دق نہ کرو کیوں وہ بالکل بگڑ جائے۔“

نہیں یار وہ بولا۔ ”یہ خالی کرپے دیر تک نہ چلیں گے۔“

نہیں کر کے اس نے شیر کو منالیا تھا اور شیر نے ایلی کی ہدایات کے مطابق اپنی بیگم کو پیغام دیا تھا۔

”میں نے کہا۔“ شیر نے بیگم سے کہا۔ ”ایک کام کرو تو بڑی مہربانی ہو گی ثواب کا کام کیا ہے؟“ وہ بولی۔

”یہ جو الیاس ہے۔ اس کی خواہش ہے کہ کسی اچھی لڑکی سے اس کی شادی ہو جائے۔“

”اچھا کرنا کیوں نہیں۔“ بیگم غصے میں چلائی۔

”کی اچھے رشتے کی تلاش ہے اسے۔ اچھی لڑکی ملے تو کرے۔“

”تو کئے نا اپنے ماں باپ سے۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تو سنا ہے کہ ماں باپ کا کما نہیں ملتا۔“

”یہ ٹھیک ہے۔“ شبیر بولا۔

”جو ماں باپ کا کما نہیں ملتا وہ کیا انسان ہے۔“ وہ غصے میں بولی۔

”نہیں تم نہیں سمجھتی بیگم۔“ وہ بولا۔ ”اے ماں باپ کے چٹاؤ پر اعتماد نہیں۔“

”بچے ماں باپ کے چٹاؤ پر اعتماد نہیں۔“ بیگم چڑ گئی۔

دیکھو نا۔“ وہ بولا۔ ”اس کی چار مائیں ہیں۔“

”چار مائیں۔“ وہ چلائی۔

”ہاں۔“ شبیر نے کہا۔ ”والدہ اپنی دھن میں لگے ہیں۔ والدہ کی کوئی مانتا نہیں۔“

”تبت تبت۔“ بیگم پیچ گئیں۔ ”بیچارہ۔“

”کل بھری محفل میں کہہ رہا تھا۔“ شبیر رک گیا۔ ”لیکن چھوڑو اس بات کو۔“

”کہو تو کیا کہہ رہا تھا۔“ وہ مصر ہو گئی۔

”چلو چھوڑو۔“ شبیر نے کہا۔

”چھوڑو کیوں۔“

”تم برا مانو گی۔“

”نہیں میں نہیں مانتی برا۔“

”سچ؟“

”کہہ جو دیا۔“

”کہہ رہا تھا میں نے آج تک کوئی ایسی عورت نہیں دیکھی جو اچھی لڑکی کا چٹاؤ کر سکتی ہو۔“

صرف ایک بیگم شبیر ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”ویسے ہی اناپ شاپ بکتے رہتے ہیں یہ۔“ وہ بولی۔

”نہیں نہیں وہ بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا۔“

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”تو کیا میں نے یہاں شادی ایجنسی کھول رکھی ہے۔ میں کیا

کروں۔“

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ مقصد یہ ہے کہ الیاس چاہتا ہے کہ اگر کوئی رشتہ لے تو تم باکر

لاؤ گیجے لو۔“ آخر جس قسم کی لڑکی چاہیے اسے۔“ بیگم نے پوچھا۔ ”ہے بیچارہ۔“

”میں ایک ہی شرط ہے اس کی۔“

”کیا؟“

”کہ لڑکی مغرب زدہ نہ ہو۔“

”کیا ج۔“ وہ حیران رہ گئی۔

”اچھا۔“ میں تو سمجھتی تھی۔“

شبیر تھکے مار کر ہنسا۔ ”مجھ سے پوچھ رہا تھا کیا تمہاری بیگم کی کوئی چھوٹی بہن ہے۔ جس کی

بہن نہ ہوئی ہو۔“

شبیر اور ایللی کو اچھی طرح سے علم تھا کہ بیگم شبیر کی کوئی چھوٹی بہن نہیں اور اصولی طور پر

بلائی کے جھیلے میں پڑنے کی قائل نہیں اس لئے انہوں نے یہ پیغام اسے بھیجا تھا تاکہ بات

لی بچ جائے اور اس کے نتائج بھی پیدا نہ ہوں۔ اس پیغام کا یہ نتیجہ ہوا۔ کہ بیگم شبیر الیاس کو

باز کرنے لگی۔ اور ایللی مطمئن ہو گیا چونکہ وہ جانتا تھا کہ جسے چند بار بیچارہ کہہ دیا جائے

اُس کے خلاف غصہ نہیں رہتا۔

پہچانی ہڈیاں

محمود کے جانے کے بعد ایللی کو ایک خط موصول ہوا۔ جمیل نے ایللی کو خان پور بلایا تھا کہ

اُن کی ضروری معاملہ ہے۔

خان پور پہنچ کر وہ سیدھا جمیل سے ملا۔

”کیوں خیر ہے؟“ اس نے پوچھا۔

جمیل حسب عادت مسکرا دیا۔ ”گھبراہٹ کی کوئی بات نہیں۔ نقی نے کہا تھا بلاو۔“

”کیوں؟“

”وہ آج کل پریشان ہے۔ یار اس کا کچھ کدو اس نے اپنی زندگی بہت تلخ کر رکھی ہے۔ روز

بٹل کو بیٹتا ہے۔ روز رات کو ان کے گھر میں ہنگامہ مچا ہوتا ہے۔ محلے والے اکٹھے ہو جاتے

تہہ راہ گیر کھڑے ہو جاتے ہیں۔“

پانچ نے بڑا لودھم چا رکھا ہے۔ محلے میں روز لڑائی روز لڑائی مجھے اس کی بات تو بری نہ

لگتی تھی۔ لیکن جو جواب دوسرے نے دیا اسے سن کر کباب ہو گیا میں۔
دوسرے نے کیا کہا؟ ایللی نے پوچھا۔

لگنے لگا۔ ”چھوڑو جی کس کی بات کرتے ہو۔ وہ نئی تو مستی پر آئی ہوئی کتیا ہے۔ کتیا۔“ وہ

مٹا بھی نہیں کتیا۔ اور پھر سوچے تو بیگم سے لڑنے کو کتیا سے کیا تعلق۔ بڑی گہری بات
کی ملنے لگے۔ سمجھ میں نہیں آئی۔

”تو پھر اسے کیوں پینتے ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔
”اگر اس نفلے کا مجھے علم ہوتا تو۔۔۔۔۔“

”تو کیا بے خبری میں پینتے ہو۔“

”لہذا یار اب جو تم نے کہا تو مجھے خیال آیا کہ واقعی بے خبری میں یہ عمل ہوتا ہے۔ مثلاً
بے کوئی دہلیز بات کی اور مجھے غصہ آیا۔ یہاں تک تو شعور ہوتا ہے۔ پھر جو ہوش آتا ہے
لہذا یہ رہا ہوتا ہوں اور وہ چیخ رہی ہوتی ہے۔“

”تو اپنے آپ کو قابو میں رکھو۔“

”یار تم سے پڑھے لکھے ایسی بات کریں حیرت ہے۔ تم سمجھتے ہو جیسے میری انا گھوڑا ہو اور
یار ہوں۔ اس کے برعکس مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے میری انا سوار ہے اور میں گھوڑا
ہوں۔ اسے قابو میں کیسے رکھوں۔ ہاں یار۔“ دھنکا۔ اسے یاد آیا۔ ”جس بات کے لئے
ہم نے نہیں بلایا ہے وہ تو سنو۔ میں تو عجیب مصیبت میں مبتلا ہوں۔ سمجھ لو پاؤلا ہو رہا ہوں۔
پینتے ہیں یار تم یہ بیگم کے قصے کو کیوں لے بیٹھے یہ تو پرانا روگ ہے۔ نہ جانے میرا یا بیگم کا
فلان لکھ شاید اس معاملے میں میں ہی مظلوم ہوں۔ خیر خیر اس قصے کو چھوڑو۔ میں سمجھتا
ہوں پینتے کے لئے اس کی ہڈیاں چاچھلاتی رہتی ہیں۔“

”ہلے تو کسکو۔“ جمیل نے کہا۔

”میں نے پہلے ہی کہہ دیا ہے۔“ نئی بولا۔ ”کہا تو چائے بنانے کو ہے پتہ نہیں شاید
نہاں سے یا ستو گھول دے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”پتہ ہے کل کیا ہوا۔ حقہ جو بھرا اس نے تو میں

”اچھا تو کیا اس لئے بلایا ہے مجھے؟“

”نہیں وہ تو کوئی اور معاملہ ہے۔“ جمیل نے کہا۔

”مجھے نہیں معلوم۔ نئی خود بتائے گا۔ لیکن نئی کے گھر کے جھکڑے کے بارے میں ہم
سوچو یار ہم سب بڑے پریشان ہیں۔“

شام کے وقت جب وہ نئی کے ہاں پہنچے تو وہ ارد گرد اوزار رکھے جوتے کا تلاسی رہا تھا۔
”ارے تم یہ کیا کر رہے ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جو تا سینا سیکھ رہا ہوں۔“ نئی نے جواب دیا۔

”اور وہ چیزیاں کیا ہوئیں جو تم کپڑے پر کاڑھا کرتے تھے۔“

”اڑ گئیں۔“ وہ بولا۔

”لیکن کوئی اور ہالی منتخب کرتے۔“ ایللی نے کہا۔

”یہ ہالی تو نہیں۔“ نئی نے اپنی تھوٹی اٹھائی۔ ”ایک روز سوچ رہا تھا کہ آخر ہر نیا جو نیا

میں خریدتا ہوں۔ میرے پاؤں کو کٹا کیوں ہے۔ یہ بات میں عرصہ دراز سے سوچتا تھا۔ یعنی
مطلب ہے کہ ذہن میں تھی یہ بات تو مجھے خیال آیا کہ یہ موچی لوگ شینڈرڈ ساز کے جوتے
بناتے ہیں۔ یعنی اوسط ساز کے اور جس کے پاؤں اوسط سے ہٹ کر ہوں انہیں جوتے کانٹے ہیں

لہذا میں نے سوچا کہ اپنے پاؤں کے مطابق جو تا سینا چاہئے یہ بات دیر سے میرے ذہن میں تھی۔

اب کی بار نہ جانے کیسے عمل میں آگئی۔ وہ یوں ہوا کہ ایک روز میری جب میں بیس روپے

اور میں اتفاقاً اس بازار میں جا نکلا جہاں موچیوں کے اوزار بکتے ہیں تو میں نے اوزار خرید لئے

پھر جو تا سینے میں کیا دیر لگتی ہے۔ یہ جو ہمارے مکان سے باہر موچی بیٹھتا ہے۔ اس سے ہانکا لگا

سیکھ لیا۔ اللہ اللہ۔ خیر سلا۔ اب سوچتا ہوں کہ آخر چینی موچی کا مکمل کیا ہے۔ کیا تاکہ

خوبصورت شکل کا جو تا نہیں بناتے بلکہ ایسا جو تا بناتے ہیں جو پاؤں پر فٹ بیٹھے۔“

”سنا ہے تم نے بیگم کو پینے کا شغل تیز کر دیا ہے۔“ ایللی نے بات بدلی۔

”ہاں یار۔“ نئی بولا۔ ”میں نے بھی سنا ہے۔ کل رات کو میں جو اپنی بیٹھک سے باہر نکل

کر ایک بند دوکان پر جا بیٹھا۔ ویسے ہی جا بیٹھا۔ میں نے سوچا چلو آتے جاتے لوگوں کا تماشہ دیکھو

تو دو محلے والے آکھڑے ہوئے وہاں۔ انہوں نے یا تو مجھے دیکھا نہیں اور یا پہچانا نہیں۔ اندھا ہوا
چکا تھا۔ وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ اس نئی بابو نے جو ساتھ والے گھر میں

حیران یا اللہ یہ کیا بھرا ہے چلم میں۔ کسے گلی تمباکو ہے۔

”چلم اٹا کر دیکھا تو گدھی نے چائے کی پتی ڈال رکھی تھی چلم میں۔“ وہ ہنسنے لگی۔ مہر لوگ کہتے ہیں۔ میں بیٹھا ہوں اسے۔“

”ہاں تو وہ بات سنا رہے تھے تم۔“ جمیل نے کہا۔

”یہ کیا خرافات ہیں۔“ نقی نے کہا۔ ”بھئی یہ زندگی ہے۔ شکر کرو کہ ہم ہمیں اتنی اہم دیتے ہیں اور جب بھی کوئی خاص واقعہ پیش آتا ہے تو ہمیں سناتے ہیں۔“

”لیکن اتنی دور سے بلانا یہ کیا زیادتی نہیں؟“

”میں نے تو نہیں بلایا۔“ نقی بولا۔ ”میں نے تو جمیل سے کہا تھا کہ میں جاوے ہوں چونکہ میں چاہتا تھا کہ تمہارا مشورہ لوں۔ بات ہی کچھ ایسی تھی میں گھبرا گیا اور جاوے جانے کے لئے تیار ہو گیا۔ پھر جمیل نے کہا کہ تم وہاں نہ جاؤ۔ اسے یہاں بلا لو۔“

”ہاں۔“ جمیل بولا۔ ”میں نے سوچا چلو ہمیں بھی مل جائے گا۔ اپنے بھی دو دن خوشی سے گزرے جائیں گے۔“

تو——یہاں

”ہاں تو بات بڑی الٹی سی ہے“ نقی نے قصہ بیان کرنا شروع کیا۔

”پہلے میں تمہیں یہ بتا دوں۔“ وہ بولا۔ ”کہ میں یہاں چلنے میں کبھی نہیں گیا۔ نہ ہی مجھے وہاں جانے سے کوئی دلچسپی ہے۔ سمجھ لو میرے دماغ میں یہ خانہ سرے سے خالی ہے۔ مجھے بھی علم نہ تھا کہ چکلا کہاں واقع ہے شاید کہیں کسی جگہ اس کے جائے وقوع کے متعلق سنا ہو ضرور سنا ہو گا۔ لیکن مجھے شعوری طور پر علم نہ تھا کہ وہ کہاں واقع ہے۔“

”ایک روز۔“ وہ بولا۔ ”مجھے جلدی تھی۔ ایک دوست سے ملنے کے لئے چند محلے کی طرف جا رہا تھا۔ کابلی دروازے پہنچا تو میں نے چکلے کی گلی کی طرف دیکھ کر سوچا کہ راولپنڈی سے گھوم کر کیوں جاؤں۔ اسی گلی سے کیوں نہ نکل جاؤں ضرور یہ گلی آگے کہیں نہ کہیں لگ جائے گی۔ بند گلی تو معلوم نہیں پڑتی۔ اس طرح پہلی مرتبہ میں چکلے کی گلی میں داخل ہوا۔ اپنی ہی دھن میں چلا جا رہا ہوں کچھ سوچ رہا تھا۔ نہ جانے کس سوچ میں پڑا تھا۔ میں نے سڑک کر دیکھا ہی نہیں۔ شام کا وقت تھا۔ ابھی بتیاں جل رہی تھیں۔ اس وقت وہاں بھیڑ نہیں تھی۔

بہزورات کے وقت ہوتی ہے۔ آدمی گلی تو میں نے ایسے ہی ان جانے میں عبور کر لی۔ اب جو مراٹھ کر دیکھا ہوں تو سامنے ایک کھڑکی میں بیٹھی ہے۔ میں گھبرایا۔ ادھر دیکھا ہوں تو ایک دروازے میں کھڑکی ہے۔ ایک ادھر چوکی پر بیٹھی ہے۔ اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں چکلے سے گزر رہا ہوں۔ طبیعت مکدر تو ہوئی لیکن میں نے سوچا اب آج گیا ہوں تو نکل ہی جاؤں۔

”ابھی چند ہی قدم آگے گیا تھا کہ دفعتاً“ میری نگاہ اس پر پڑی۔ وہ چوبارے کے جنگلے میں بیٹھی تھی۔ اسے دیکھ کر میں خواہ مخواہ رک گیا۔ عجیب انداز سے بیٹھی تھی نہ تو وہ راہگیروں کو دیکھ رہی تھی اور نہ اپنا آپ دکھا رہی تھی۔“ نقی مسکرایا۔ ”اسے خبر ہی نہ تھی کہ وہ بیٹھی ہے یا کھڑی ہے یا کھل بیٹھی ہے۔ باورچی خانے میں بیٹھی ہے یا پلیٹ فارم پر یا چکلے میں۔ دونوں انہوں کا پیالہ بنا کر اس میں ٹھوڑی رکھی ہوئی تھی اور خود کھوٹی ہوئی تھی۔ انداز ایسا تھا جیسے روٹی روٹی ہو۔ ہل کھلے تھے پریشان حال کپڑے بے پرواہی سے پہنے ہوئی۔ بس صرف ہونٹوں پر لپٹک گئی تھی اللہ اللہ خیر سلا۔“

”اسے دیکھ کر مجھے صرف یہ خیال آیا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ چند ایک ساعت تو میں لے دیکھتا رہا۔ پھر میں نے سوچا چلو چھوڑو مجھے کیا لیتا دیتا ہے۔ بیٹھی ہے تو بیٹھی رہے اپنا کیا لیتی ہے۔ میں چل پڑا لیکن یہ سوال میرے دل میں کانٹا سا لگا رہا کہ یہ یہاں کیوں بیٹھی ہے۔ دو قدم باہر رک گیا۔ مجھے غصہ محسوس ہونے لگا۔ آخر یہ کیوں یہاں بیٹھی ہے۔ پھر رک گیا۔ پھر اپنے آپ کو سمجھانے لگا۔ لیکن غصہ بڑھتا ہی گیا۔ حتیٰ کہ میں مجبور ہو گیا۔ جی میں آیا کہ جا کر باہر ہوں تو اس میں حرج کیا ہے۔“

”میں واپس آیا۔ لیکن جب اس کے چوبارے کی یہ ٹرھیاں چڑھنے لگا تو خیال آیا کہ آخر اوپر جا کر کون کا گیا۔ لاحول ولا قوۃ۔ کیا فضول خیال ہے۔ اگر اس نے کہہ دیا کہ بیٹھی ہوں تجھے کیا۔ تو جواب دوں گا۔ اس خیال پر میں آگے چل پڑا۔ لیکن آگے قدم اٹھانا مشکل ہو رہا تھا۔ ہر قدم کے بعد رک جاتا۔ غصہ دم بہ دم بڑھتا جا رہا تھا۔ بہر صورت اتنی بار رہا۔ میں نے کہا آگے جانا ہے کار ہے اور پھر اس قدر غصے میں آچکا تھا کہ کوئی اور بات ذہن میں نہ رہی۔ لہذا میں نے ایک ٹانگا لیا اور تانگے والے سے کہا کہ مجھے گھر لے چل۔ گھر پہنچ تو گیا لیکن بل بھی نہ رہا کہ مجھے یہ خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے اور وہ غصہ جو مجھے آ رہا تھا۔ وہ میں نے سب بیوی پر نکالا۔ پیٹ پیٹ کر اس کا پلستر نکال دیا۔ میرے اپنے ہاتھ دیکھے گئے۔ پھر تھک

بار کر سو گیا۔

”اگلے روز پھر وہی چکر۔ دفتر گیا تو وہاں کام کرتے کرتے رک جاتا اور وہی خیال آتا کہ وہ وہاں کیوں بیٹھی ہے۔ ہزار سمجھایا لیکن بے کار۔ اب میں دفتر میں خواہ خواہ لوگوں سے الگ رہا ہوں بے کار باتوں پر لڑ رہا ہوں حتیٰ کہ صاحب سے جا کر الجھ پڑا۔

”پھر میں نے سوچا یہ تو بری بات ہے گھر چلو ورنہ گز بڑ کر بیٹھوں گا۔ تو میں طبیعت خراب ہونے کا بہانہ بنا کر گھر چلا آیا۔ راستے میں اپنی اس حماقت پر سوچتا آیا۔ چلتا رہا اور سوچتا رہا چلتا رہا اور سوچتا رہا۔

”اب جو آنکھ اٹھا کر دیکھتا ہوں تو اس کے چوبارے کے نیچے کھڑا ہوں۔ یعنی گھر کو پیچھے چھوڑ کر ایک میل آگے نکل گیا اور مجھے علم ہی نہ ہوا کہ آگے نکل آیا ہوں یا کہل جا رہا ہوں۔ یا راستہ غیر مانوس ہے۔“

چوبارے میں کوئی بھی نہ تھا۔ میرا مطلب ہے جنگلے میں کوئی نہ تھا۔ اس وقت کون ہوتا۔ بھلا دوسرے کو وہ بجے کون طائفہ باہر بیٹھتی ہے۔

”وہاں جو ہوش آیا تو اپنے آپ پر غصہ آیا کہ یہ میں کہاں آ گیا ہوں اور اس قدر شدت سے غصہ آیا اپنے آپ پر کہ اب اپنے دل کی بات ماننے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا تھا۔ لہذا اب مجھے اوپر چڑھنے سے کون روک سکتا تھا۔ اوپر چوبارے میں وہ میلے کیلے کپڑوں میں چارپائی پر بیٹھی تھی۔ میں نے اوپر جاتے ہی اس سے لڑنا شروع کر دیا۔ وہی بات ہوئی تھ۔“ نئی بولا۔ ”نہ جان نہ پہچان بڑی خالہ جی سلام۔ میں نے کہا۔ تو یہاں کیوں بیٹھی ہے؟ اور تیرا یہاں بیٹھنے سے کیا مقصد ہے؟ اور تو کیا طائفہ ہے؟ پھر تیرا یہاں کیا کام؟

”پہلے تو حیرت سے میری طرف دیکھتی رہی پھر ہنسنے لگی۔ سمجھتی ہو گی کوئی پاگل ہے۔ ہر اس کے حواری آ گئے۔ انہوں نے آکر مجھ سے الجھنا شروع کر دیا اور غصے سے میرا دل بگڑا اور مجھے چل گیا اور میں نے اتنا اودھم مچایا اور ان سے اتنی مار کھائی کہ کیا بتاؤں۔ پھر لوگوں نے مجھے چھڑایا اور تانکے میں ڈال کر گھر بھجوا دیا۔

”اگلے روز پھر وہی جنون۔ میری زندگی گویا حرام ہو گئی۔ بس یہی دھن جی میں سلاتی تھی کہ وہاں جاؤں اور جا کر اس سے لڑوں۔ چار ایک روز تو میں نے زبردستی اپنے آپ کو روکے رکھا پھر مجھے خیال آیا کہ یہ بھوت ایسے نہیں اترے گا۔ سمجھانا بھجھانا فضول ہے۔ لہذا میں نے سوچ سنا

کہ قبلہ کیا کہ وہاں جاؤں اسے بک کروں۔ منہ مانگے دام دوں اور پھر لڑنے کی بجائے اس ہانسی کروں شاید اس اقدام سے دل کی بھڑاس نکل جائے تو صاحب۔“ نئی نے قصہ بیان کرتے ہوئے کہا۔ ”اس روز میں نے نما و صو کر اچھا لباس پہنا اور بن سنور کر رات کو وہاں جا

پڑا۔ اس کے حواریوں نے جب دیکھا کہ میں رات رہتا چاہتا ہوں اور میرا دنگا فسلو کا ارادہ نہیں تو انہوں نے مزاحمت نہ کی۔ البتہ حرامیوں نے مجھ سے بہت پیسے مانگے۔ ظاہر تھا کہ مجھے لگ رہے ہیں۔ خیر میں نے کہا جو مانگو گے دوں گا۔

”تو جناب۔“ نئی بولا۔ ”میں وہاں ٹھہر گیا۔ لیکن ایمانداری کی بات ہے کہ میں اس کے ہاں لڑنے کا ارادہ نہ رکھتا تھا۔ یعنی میں صرف باتیں کرنا چاہتا تھا اور بس ٹھہرنا تو محض بہانہ تھا۔ خیر۔

ٹی اور بانو

”جب ہم اکیلے رہ گئے تو عجیب بات ہوئی۔ اب میں چپ چاپ کرسی پر بیٹھا سرٹ پی رہا تھا اور وہ کن آنکھیں سے میری جانب دیکھ دیکھ کر مسکرا رہی ہے۔ آخر میں نے بات شروع کرنا شروع کی۔ ”بیانا مجھے تو یہاں کیوں بیٹھی ہے۔“

”وہ بولی۔ تو اس بات کو چھوڑ۔ تجھے اپنے کام سے واسطہ۔ میں نے کہا۔ میں تو آیا ہی اس لئے ہوں کہ تجھ سے پوچھوں کہ آخر بات کیا ہے؟ تو یہاں کی نہیں۔ نہ تو یہاں کی دیکھتی ہے۔ نہ تجھ کی حرکت ایسی ہے۔ جو ظاہر کرے کہ تو یہاں کی ہے بلکہ تجھے دیکھ کر ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے کوئی مچھلی ریت پر پڑی ہے۔ تو تو یہاں دم توڑ رہی ہے۔“

”پھر میں نے اس سے محبت بھرے انداز سے بات کرنی شروع کی کیونکہ ویسے تو وہ میرے ساتھ بہت سی باتیں کرتی تھی۔ میں نے کہا۔ دیکھ بانو، چونکہ مجھے پتہ چل گیا تھا کہ اس کا نام بانو ہے اس بازار میں وہ بیٹھی ہیں جو جسم ہی جسم ہوں اور تو تو جسم ہے ہی نہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے جیسے تو بغیر جسم کے ہو۔ یہ روٹی روٹی آنکھیں یہ کھوٹی کھوٹی نگاہ۔ جیسے کوئی راستہ بھول گیا ہو اور روڈ پر تھک گیا ہو۔

”مجھ سے بار بار کہتی رہی تو چھوڑ اس قصے کو لیکن میں نے اپنی رٹ نہ چھوڑی پھر وہ بولی۔ ”تو کون ہے۔“ میں نے اسے اپنا نام اور کام بتایا۔ اپنا گھر کا پتہ دیا۔ پھر وہ پوچھنے لگی۔

”تو مجھے حق میں لے گا۔“ اس پر میری ہنسی نکل گئی۔

”میں نے کہا۔ تو غلط سمجھ رہی ہے۔ مجھے تیری ہوس نہیں۔ مجھے عورتوں سے کچھ دلچسپی نہیں اور نہ ہی میں تیری محبت کا مارا ہوا ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھتا ہوں کہ تو میل کیسے آگئی۔ یہ تیری جگہ نہیں۔“

”قصہ کو تازہ۔“ نفی بولا۔ ”پھر وہ میرے پاس آ بیٹھی اور کھل مل کر باتیں کرنے لگی۔ روتی رہی۔ کہنے لگی میرے نصیب۔ پھر میں نے بحث چھیڑ لی اور پھر مجھے غصہ آنے لگا اور جب اس نے دونوں بائیں میری گردن میں ڈال کر ہونٹ میری طرف بڑھائے اور بولی۔ اب چھوڑ دو۔ تو غصے میں میں نے اسے یہ تھپڑ مار دیا۔ وہ لڑکھڑا کر گری اور اس نے شور مچا دیا اور پشواں کے کہ حواری آجینتے میں بھاگ آیا اسے ملے مجھے دس دن ہو چکے ہیں۔ اب یہ حالت ہے کہ چاہے میں یورپ کو جاؤں یا پتھم کو مجھے اس وقت ہوش آتا ہے جب میں اس کے چوہارے تلے جا پہنچتا ہوں اور ہوش آتا ہے تو وہاں سے بھاگتا ہوں۔ سارے چکلے میں چرچا ہو رہا ہے۔ لوگ گردن اٹھا اٹھا کر مجھے دیکھتے ہیں۔ انگلیاں اٹھا اٹھا کر میری طرف اشارے کرتے ہیں۔ طاقتوں کے بھڑوے مجھے دیکھ کر ہستے ہیں۔ رنڈیاں میرا مذاق اڑاتی ہیں۔ اور وہ بانو۔ وہ تو مجھے دیکھ کر یوں ساکت ہو جاتی ہے۔ جیسے پتھر ہو گئی ہو۔ اس نے ہنسا مسکراتا چھوڑ دیا ہے۔ اب تو وہ ڈر کے مارے باہر بھی نہیں جھانکتی عجب تماشہ ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

پھر دھنستا۔ اسے خیال آیا ”یار وہ چائے تو مدت سے بنی ہوئی ہوگی میں لایا ہی نہیں۔“ اندر چلا گیا اور چند ساعت کے بعد چائے کا ٹرے اٹھائے ہوئے آیا۔ آتے ہی اس نے چائے بنا شروع کی۔

”ہاں۔“ وہ چائے بناتا ہوا بولا۔ ”تو تمہاری نفسیات کیا کہتی ہے۔ الیاس آصفی۔ یہ سب گڑبڑ گونا گونا کیا ہے۔ ایسا کیوں ہو رہا ہے مجھ سے۔ یار ایسی عجیب و غریب باتیں کیوں ہوتی ہیں۔ کوئی بات بھی تو سیدھی نہیں ہوتی۔ ہر بات الٹی ہر واقعہ پیچیدہ اب بتاؤ میں کیا کروں؟“

”ارے۔“ وہ چائے کی طرف دیکھ کر چلا یا۔ ”یہ کیا چیز ہے؟“

چائے کا رنگ ہلکا پیازی تھا۔ جیسے چائے نہیں بلکہ پشاور قہوہ ہو۔

”لو۔“ وہ بولا۔ ”پھر اس نے گڑبڑ کر دی۔ نہ جانے قہوہ بنا دیا ہے یا کیا حد ہو گئی۔“ نفی نے چائے دانی اٹھالی اور اندر چلا گیا۔

پہلے تو مکان سے اس کے چلانے کی آوازیں آتی رہیں۔ پھر دھنستا۔ ”جیج دیکار شروع ہو گئی وہ دھار رہا تھا اور نہ جانے کس چیز سے بیگم کو زد و کوب کر رہا تھا اور وہ جیج رہی تھی چلا رہی تھی۔“

”تو زورے اور پیٹ اور پیٹ۔“ وہ روتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

”میں تیری ہڈیاں تو زوروں گا۔“

”تو زورے۔ ایک بار میں قصہ ختم کر دے۔“

”نہ قصہ ختم کروں گا کہ دنیا دیکھے گی۔“

پڑوسی چاروں طرف سے اکٹھے ہو گئے۔

”اب چھوڑ بھی کہ مار کر ہی دم لے گا۔“ ایک نے کہا۔

”کیا قیامت اٹھا رکھی ہے تم نے۔“ دوسرا بولا۔

”نفی صاحب اے نفی صاحب۔“

”ایک محلے والے بیٹھک میں آگئے۔“ کیوں صاحب یہ کیا آئے دن کا فسوس ہمارا ناک

لادم آگیا بھائی صاحب۔“

ایلی اور جمیل خاموش بیٹھے تھے۔

اندر جھگڑا بڑھتا ہی جا رہا تھا۔

اس پر محلے والے گھر کے اندر داخل ہو گئے۔ لوگوں نے نفی کو پکڑ لیا لیکن وہ ویسے ہی

بٹے جا رہا تھا۔ ”اند میر خدا کا حقے میں تو چائے ڈالتی ہے اور چائے بناتی ہو تو پان کا زردہ ڈال دیتی

ہ۔“ وہ جیج رہا تھا۔

”چلو چلیں۔“ جمیل نے ایلی سے کہا۔

”لیکن یہ گڑبڑ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ تو یوں ہی رہے گی۔“ جمیل بولا ”کوئی مدد نہیں کر سکتا کوئی دخل نہیں دے سکتا۔“

”لیکن۔“ ایلی بولا۔

”بے کار ہے نفی کا بھید کسی نے نہیں پایا۔“

”کیا واقعی۔“

”دونوں بیٹھک سے باہر نکل آئے۔“

باہر بازار میں چراغ جل رہے تھے۔ سورج غروب ہو چکا تھا آسمان پر گلابی بادل تیر رہے

تھے۔

بیشک کے پاس ہی ایک عورت کو دیکھ کر وہ رک گئے۔

وہ ان کے قریب آگئی۔ ”یہ نیا محلہ ہے نا؟“ اس نے پوچھا۔

”جی۔“ جمیل نے جواب دیا۔

”مجھے نئی صاحب کے گھر جانا ہے۔“ وہ بولی۔ ”مکان نمبر ۳۰۳ آپ کو معلوم ہو کیا؟“

”نئی صاحب کے ہاں۔“ جمیل نے حیرانی سے پوچھا۔

”جی وہ دبلے پتلے صاحب ہیں۔ ڈسٹرکٹ بورڈ میں ملازم ہیں۔“

”آپ کون ہیں؟“ جمیل نے پوچھا۔

”میں ———“ وہ رک گئی۔

”ان کی رشتہ دار ہیں کیا؟“ جمیل نے پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ بولی ”میں ان کی جان پہچان ہوں۔ مجھے ان سے ضروری ملنا ہے۔“

”آپ کا نام بانو ہے نا۔“ ایللی نے کہا۔

حیرت سے اس کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

”بانو ———“ جمیل نے حیرانی سے عورت کی طرف دیکھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولی۔

”ارے تم کہاں جا رہے ہو۔“ نئی نے بیشک سے سر نکال کر انہیں آواز دی۔ ”یہ لہجے

نئی آگیا۔“ ایللی نے کہا۔

بانو کو یوں اپنے گھر کے دروازے پر دیکھ نئی کی آنکھیں ابل آئیں ایک ساعت کے لئے۔

جھپکا پھر وہ دیوانہ وار آگے بڑھا۔ بانو سمٹ کر رک گئی، خوف سے اس کی آنکھیں پھرا گئیں۔

لیکن جسم کے بند بند میں سپردگی موجیں مار رہی تھی۔ باہر بازار میں چراغ جھللا رہے تھے۔ گلابی

بادل دھندلا رہے تھے۔ ہوا رک کر سرگوشیاں کر رہی تھیں۔ نئی بانو کی طرف یوں بدھ رہا تھا۔

جیسے وہ ایک خوفناک موج ہو۔ بانو ڈوب جانے کی شہر تھی۔ ”چلو۔“ جمیل نے ایللی کو ہنسی ماری

اور وہ چپ چاپ چل پڑے۔

انکوائری

جب ایللی واپس جلور پہنچا تو وہاں شور مچا ہوا تھا۔ اس کے تمام ساتھی گھر پر جمع تھے۔

”ارے۔“ افضل چلایا۔ ”ایللی آگیا۔“

ایللی آگیا ایللی آگیا چاروں طرف شور مچ گیا۔

”ہرے موقع پر آئے ہو ورنہ تمہیں تار دینے والے تھے۔“ چودھری بولا۔

”آخر بات کیا ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”پانہ چل گیا۔“ افضل نے شور مچایا۔

”شوخ کی بات بتاؤ نا۔ اس سال جاری ہیں بری حالت ہے۔“ شبیر نے کہا۔

”صاف بات کرو یا ر اسے پریشان کیوں کر رہے ہو۔“ افضل بولا۔

”جو پودا بویا تھا۔ اسے سمجھ لو پھل لگا ہے۔“

”پارا انکوائری ہو رہی ہے۔“

انکوائری کی خبر سن کر ایللی ساکت رہ گیا۔

”ہاں ہاں۔“ شبیر بولا۔ ”خود مسٹر معروف انکوائری کے لئے آرہے ہیں۔“

”خود؟“

”ہاں ہاں۔“

”کب؟“

”کل صبح۔“

لگے روز سکول پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ مسٹر معروف شیخ صاحب کے دفتر میں بیٹھے تھے۔ باہر

اتاق کے دل دھڑک رہے تھے اور وہ انتقاماً لڑکوں کو گھور گھور کر اپنے دل کی بھڑاس نکال

رہے تھے۔ سازشیوں کے رنگ زرد ہو رہے تھے۔ ان کے انداز میں گہرا ہٹ تھی۔ لیکن ہونٹ

چبھتے تھے۔ چڑا سی مودبانہ شولوں پر بیٹھے تھے۔ ڈرل ماسٹر خصوصی طور پر کھج میں

لٹ پٹو کر رہا تھا اور ایللی سوچ میں کھویا ہوا تھا۔ اسے بار بار افضل کی بات یاد آرہی تھی۔

”ایللی سے کہا تھا۔“ تمہارے ساتھیوں میں جرات نہیں۔ نہ یہ بات کر سکیں گے نہ سامنے

آئے۔ اب سوچ لو۔ آیا سامنے آتا ہے یا نہیں۔ دونوں پہلو ہیں۔ اگر تم سامنے نہ آئے تو

تمہارا کیا کر لیا ہے کار جائے اور اگر سامنے آگئے تو شاید زور میں آجاؤ اور فائدہ کچھ بھی

ایللی سوچ رہا تھا۔

طبعی طور پر وہ سامنے آ جانے کا قائل تھا۔ وہ صرف اس پہلو پر غور کر رہا تھا کہ میرے سامنے آ جانے سے باقی ساتھیوں کو نقصان نہ پہنچے۔

سکول کے بچوں کو چھٹی دینے کے بعد مسٹر معروف نے اساتذہ کی میٹنگ بلائی۔ بل کرے میں وہ سب خاموش بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف شیخ صاحب سے باتیں کر رہے تھے۔ اساتذہ بیٹے انتظار کر رہے تھے۔ مسٹر معروف کا شیخ سے برتاؤ ایسا تھا جس سے ظاہر ہوتا تھا کہ وہ شیخ مسعود کی ہر بات کو اہمیت دیتے ہیں۔ ان کے ہر مشورے پر عمل کرنے کے لئے جتنب ہیں۔ باتوں کے دوران میں وہ نجی نگاہ سے اساتذہ کے رد عمل کا جائزہ لے رہے تھے یا شاید یہ دیکھ رہے تھے کہ جو اثر وہ پیدا کرنا چاہتے تھے کیا وہ پیدا ہو رہا ہے۔

شیخ صاحب نہایت مؤدبانہ بیٹھے تھے۔ لیکن ان کے چہرے سے فکر کے آثار ترشح تھے۔ ان کا رنگ زرد ہو رہا تھا۔ آنکھوں سے جبکہ اور گھبراہٹ کا اظہار ہو رہا تھا۔

دفعۃً "معروف صاحب نے اساتذہ کو خطاب کرنا شروع کیا۔

"اساتذہ کرام۔" وہ بولے۔ "میں آپ کے سکول میں انکوائری کے لئے آیا ہوں۔"

"کوائف یہ ہیں کہ تقریباً ایک سال سے جلورا سے گتنام شکایتیں خط موصول ہو رہے ہیں۔ ان خطوط کا انداز انوکھا ہے۔ روز ایک خط بھیجا جاتا ہے۔ جس میں صرف ایک شکایت درج ہوتی ہے، وہ بھی نہایت اختصار سے گتنام خط لکھنے والا یقیناً "کوئی ذہن آوی ہے اور یہ بات بھی قابل ستائش ہے کہ یہ شکایت کسی خاص آدمی کے خلاف نہیں ہوتی۔ ہر مل ظاہر ہے کہ آپ میں سے کوئی ایک یا چند لوگ مل کر یہ خطوط بھیج رہے ہیں۔ میں صرف آج اس لئے آیا ہوں کہ اس کے متعلق انکوائری کروں۔ لیکن انکوائری جیسی ہو سکتی ہے۔ جب مدعی اور مدعا الیہ دونوں موجود ہوں۔ مدعی شکایت پیش کرے۔ مدعا الیہ اس کا جواب دے اور میں اس کی حیثیت سے دونوں پارٹیوں کے دلائل سن کر اس کا فیصلہ کروں۔ لہذا میں آپ کی نہ مت میں ایک درخواست کروں گا کہ جو بھی مدعی ہے وہ اپنا آپ ظاہر کرے۔"

مسٹر معروف خاموش ہو گئے۔ کمرے پر سکوت طاری تھا تمام اساتذہ سر جھکائے بیٹھے تھے۔ مسٹر معروف نے چند ایک منٹ انتظار کیا۔ وہ اساتذہ کو جانچتے رہے لیکن پھر مزید وضاحت کے لئے کہنے لگے۔

"دیکھئے۔" وہ بولے۔ "یہ بات تو میں تسلیم کرنے کے لئے قطعی طور پر تیار نہیں کہ یہ

مدعا الیہ کوئی اور شخص ایک سال سے مسلسل اس سکول کی شکایت بھیج رہا ہے۔ کیا یہ درست ہے۔" انہوں نے پوچھا۔ اساتذہ خاموش بیٹھے رہے۔

بی اور مدعا الیہ

"جو آپ کی خاموشی سے ظاہر ہے کہ آپ کو میرے خیال سے اتفاق ہے۔" مسٹر معروف اڑا کہنے لگے۔ "لہذا اگر آپ میں ہی وہ صاحب موجود ہیں۔ جو ایسے خط لکھ رہے ہیں۔ تو وہ اسے بات کریں اور اگر آپ میں سے کوئی شخص ان خطوط کو اپنانے کے لئے تیار نہیں ہے تو ایچے کہ انکوائری ختم ہو گئی۔ کیونکہ اگر آپ میں سے کسی شخص کو کوئی شکایت ہی نہیں تو اڑی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔"

ایلی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ اسے دیکھ کر شیخ کا چہرہ بھیاک ہو گیا۔ لیکن مسٹر معروف نے اسے اہمیت نہ دی۔

"آپ کیا کرنا چاہتے ہیں الیاس صاحب۔" معروف نے پوچھا۔

"میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں۔" ایلی نے کہا۔ "کیا گتنام خط لکھنے والے نے انکوائری کا مطالبہ کیا۔"

مسٹر معروف کچھ دیر تک خاموش رہے پھر بولے۔ "میرے خیال میں نہیں۔" تو آپ خود انکوائری کے لئے تشریف لائے ہیں۔ لہذا مدعی کے ہونے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں۔" ایلی نے کہا۔

"ہوں۔" مسٹر معروف مسکرائے۔ "کیا آپ چاہتے ہیں کہ انکوائری ہو۔"

"مجھے اس سے کوئی دلچسپی نہیں۔"

مسٹر معروف نے تمام اساتذہ کو مخاطب کر کے کہا کیا آپ میں سے کوئی صاحب چاہتے ہیں انکوائری ہو۔"

سب لوگ خاموش بیٹھے رہے۔

"میری ایک گزارش اور ہے۔" ایلی نے کہا۔

"کہو۔" معروف بولے۔

"ابھی آپ نے فرمایا ہے کہ شکایات کسی فرد کے خلاف نہیں۔ مطلب یہ ہوا کہ مدعا الیہ

”جی۔“ ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔
 ”کیا دلچسپی ہے؟“ معروف بولے۔
 ”مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“
 ”وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔“ ایلی نے گہرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہوائی کو آگ دی گئی ہو۔

مسٹر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔
 اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھالیں۔ ہل کرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائیونگ ماسٹر مسکرا رہے تھے۔
 ”تو آپ مدعی ہیں۔“ مسٹر معروف بولے۔
 ”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔“
 ”دیکھئے الیاس صاحب۔“ مسٹر معروف نے پینتر بدلا۔ ”میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔ میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق لظم و نطق بحال رکھوں۔ سمجھے۔“
 ”جی۔“ الیاس نے کہا۔ ”میں آپ سے انصاف نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ آپ کے لظم و نطق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا الیہ ہیں۔“
 ”تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔“
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ ایلی نے کہا۔
 ”تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔“
 ”شکایت کے ساتھ متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟“

بھی کوئی نہیں ہے تو پھر مدعی کے نہ ہونے سے کیا فرق پڑتا ہے۔“ ”کچھ دیر تک مسٹر معروف خاموش بیٹھے رہے۔ پھر بولے۔ ”الیاس صاحب معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو اس کیس سے غامضی دلچسپی ہے۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا اور اس کا دل بری طرح سے دھڑکنا شروع ہو گیا۔
 ”کیا دلچسپی ہے؟“ معروف بولے۔
 ”مجھے خطوں کی نوعیت کا علم ہے۔“
 ”وہ کیسے؟“

”وہ ایسے کہ وہ خط میں نے لکھے ہیں۔“ ایلی نے گہرا کر کہا اور اس کا سر زمین سے یوں اڑ گیا جیسے ہوائی کو آگ دی گئی ہو۔

مسٹر معروف نے حیرت سے ایلی کی طرف دیکھا۔

اساتذہ کرام نے گردنیں اٹھالیں۔ ہل کرے میں سرگوشیاں گونجنے لگیں۔ چودھری کی آنکھ چمکی۔ شبیر نے آہیں بھرا شروع کر دیا۔ احمد اور ڈرائیونگ ماسٹر مسکرا رہے تھے۔
 ”تو آپ مدعی ہیں۔“ مسٹر معروف بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ذاتی طور پر کوئی تکلیف نہیں کوئی شکایت نہیں۔“
 ”دیکھئے الیاس صاحب۔“ مسٹر معروف نے پینتر بدلا۔ ”میں یہاں انصاف کرنے نہیں آیا۔ میرا فرض یہ ہے کہ آئین اور قوانین کے مطابق لظم و نطق بحال رکھوں۔ سمجھے۔“
 ”جی۔“ الیاس نے کہا۔ ”میں آپ سے انصاف نہیں مانگ رہا۔ شکایات شیخ مسعود کے خلاف نہیں۔ یہ خطوط آپ کو صرف اس لئے لکھے گئے کہ ایسے افعال کا ارتکاب کیا جا رہا ہے کہ آپ کے لظم و نطق کی توہین ہو رہی ہے آپ ہی مدعی ہیں آپ ہی مدعا الیہ ہیں۔“
 ”تو آپ ان شکایات کی حقیقت کو ثابت کرنے کے لئے تیار نہیں۔“
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو مجھے کیسے علم ہو کہ جو آپ نے لکھا ہے وہ درست ہے یا نہیں۔“
 ”شکایت کے ساتھ متعلقہ ریکارڈ کا حوالہ دیا ہے آپ ریکارڈ دیکھیں۔ گواہوں کی کیا ضرورت ہے؟“

”مسٹر معروف بولے۔“ لیکن میرے پاس اتنا وقت نہیں کہ ریکارڈ دیکھوں۔“ مسٹر معروف

”کچھ مزا نہیں آیا ایلی۔“ افضل کہہ رہا تھا۔

”ہل یا رکھ کچھ بھی تو نہیں ہوا۔“ شبیر آہیں بھر رہا تھا۔

احمد سر جھکائے بیٹھا مگری سوچ میں پڑا تھا۔

ڈرائیونگ ماسٹر کہہ رہا تھا۔ ”اب اس انکوائری کا نتیجہ کیا نکلے گا۔“

پوم پوم

میں اس وقت باہر سے پوم پوم کی آواز آئی اور پھر محمود ہنستا ہوا اندر آ گیا۔

”چلو۔“ ”وہ بولا۔“ ”جلدی کرو۔ جلدی۔ ابھی واپس آ جانا۔“

”کہاں جانا ہے۔“ ”ایلی نے پوچھا۔“

”یہاں باہر تک۔ چلو۔ یار۔ باہر کار کھڑی ہے۔“ وہ بولا۔

”کار۔“ ”ایلی نے دہرایا۔“

”ہاں ہاں۔“ محمود بولا۔ ”تم سے چند ایک ضروری باتیں کرنی ہیں۔“

”اچھا۔“ ”ایلی بولا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔“

دروازے کے باہر میدان میں کار کھڑی تھی۔

”بیٹھ جاؤ بیٹھ جاؤ۔“ محمود بولا۔ ”بھئی بیٹھ کر باتیں کریں گے۔ بڑی ضروری باتیں ہیں۔“

محمود نے اسے گاڑی میں دھکیل دیا اور جو خنی وہ کار میں داخل ہوئے گاڑی چل پڑی۔

اگلی سیٹ پر ڈرائیور کے ساتھ میم کو بیٹھے دیکھ کر ایلی چلایا۔ ”ارے یہ تو میم ہے۔“

”تو پھر کیا ہوا۔“ محمود ہنسا۔ ”تمہیں کیا کہتی ہے۔“ اس نے زہر لب کہا۔

”لیکن تم تو کہتے تھے باتیں کریں گے۔“

”باتیں ہی تو کریں گے۔“

”اس کے ہوتے ہوئے۔“ ”ایلی نے پوچھا۔“

”باتیں کرنا جرم تو نہیں۔“

”لیکن یار۔“ ”ایلی بولا۔“

”میڈم یہ میرا دوست کہہ رہا ہے۔“ محمود نے میم کو مخاطب کر کے کہا۔ ”کہ آپ کی

موجودگی میں بات نہیں ہو سکتی۔“

وہ مڑ کر دیکھے بغیر پنجابی میں کہنے لگی۔ ”ہام پنجابی نہیں سمجھتا۔“

”معاف کیجئے۔“ محمود بولا۔ ”ہمیں شک ہے کہ آپ سمجھتی ہیں۔“

”شکی مجاہ اچھا نہیں ہوتا۔“ وہ پنجابی میں بولی۔

”دیکھیں آپ تو پنجابی بول رہی ہیں۔“ ”ایلی نے کہا۔“

”خانی بولنا ہے سمجھتا نہیں۔“ وہ بولی۔

ایلی قہقہہ مار کر ہنسا۔ اس نے محسوس کیا کہ کار میں تین بچے بیٹھے تھے۔ میم دیم کوئی نہ

نہیں۔ اس لئے وہ چلا چلا کر باتیں کرنے لگا۔

”میرا نام ملتا تھا۔“ محمود نے پوچھا۔

”کیا تار؟“ ”ایلی نے کہا۔“

”جو میں نے تمہیں دیا تھا کہ میں آ رہا ہوں تیار رہنا۔“ محمود نے کہا۔

”نہیں تو۔“ ”ایلی نے جواب دیا۔“

”اچھا تو تمہیں پہلے سے علم نہ تھا کہ میں آ رہا ہوں۔“

”نہیں تو۔“ ”ایلی نے جواب دیا۔“

”عجب کی بات ہے۔“ اس نے کہا اور پھر وہ ادھر ادھر کی باتوں میں مصروف ہو گئے حتیٰ کہ

ایلی کو یہ خیال بھی نہ رہا کہ موٹر میں کوئی اور بھی موجود ہے یا موٹر مسلسل چلے جا رہی ہے۔

دو گھنٹوں کو دیکھ کر دفعتاً ”ایلی کو خیال آیا کہ اس کے پاس سگریٹ ختم ہو چکے تھے۔“

زرا روکنے میں سگریٹ خرید لوں۔“

کار سے باہر نکل کر وہ حیران رہ گیا۔ ارے۔“ وہ چلایا۔ ”یہ کونسی جگہ ہے؟“

غالباً وہ سمجھ رہا تھا کہ کار جاورا کے چکر کاٹ رہی ہے۔

”کونسی جگہ ہے۔“ محمود نے ہنس کر پوچھا۔

”یہ تو لاہور معلوم ہوتا ہے۔“

”اور کیا پشاور ہو۔“ محمود نے کہا۔

”کیوں پریشان کر رہے ہو اپنے دوست کو۔“ مسز فلپ نے کہا۔ ”یہ تو جاورا کا بازار ہے۔“

لیکن میں واپس کیسے جاؤں گا۔“ ”ایلی نے پوچھا۔“

”رات کی گاڑی سے چلے جانا۔ صبح پہنچ جاؤ گے۔“ محمود نے کہا۔

”یاباری کی عرضی دے دیتا۔“ مسز فلپ نے کہا۔ ”آخر میڈیکل سائٹیفکٹ کس مرض کی

”ہے۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”یہ ٹھیک ہے۔“ محمود چلایا۔ تم ہمارے ساتھ ہی چلو۔“

”کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”نیا شہر۔“ محمود نے جواب دیا۔

”لیکن تم تو لاکل پور ہو نا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”اونوں۔“ محمود بولا۔ ”دفتر تبدیل ہو کر نیا شہر میں چلا گیا ہے۔“

”اب غصہ میں آنے کا کیا فائدہ۔“ مسز فلپ نے کہا۔

”محترمہ۔“ وہ بولا۔ ”اس شخص نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔“

”کوئی نئی بات ہے۔“ وہ مسکرائی۔

”یہ تو ٹھیک ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”تو چھوڑو۔“ وہ بولی۔

اور موٹر پھر چل پڑی۔ رات لاہور رکنے کے بعد اگلے روز وہ تینوں نیا شہر جا پہنچے۔

مسز فلپ

مسز فلپ اوجڑ عمر کی عورت تھی۔ لیکن وہ یوں چلتی پھرتی اٹھتی تھی۔ جیسے ابھی جوان ہوئی ہو اور اسے اس انوکھی زندگی سے جو اس کے گرد پھیلی ہوئی تھی۔ والمانہ عشق قلمہ و مسرت بھری حیرت سے ہر چیز کی طرف دیکھتی جیسے اس نے پہلی مرتبہ اسے دیکھا ہو۔ بچوں کی طرح تالیاں بجاتی اور پھر چاہتی کہ کسی اور کو دکھائے۔ اس تازہ مسرت میں کسی اور کو اپنا شریک بنائے۔ اس کے لئے زندگی سکون اور اطمینان نہیں بلکہ مسلسل حرکت مسلسل مسرت اور مسلسل تنگ و دو تھی۔ غالباً اسی وجہ سے وہ زندگی کی خوشیوں میں پندرہ افراد کو شریک کر چکی تھی اور اب مسز فلپ اس کا سولہواں خاوند تھا یا شاید اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ اس قدر ذہانت اور چمک کی مالک تھی کہ کوئی اس کا ساتھ نہیں دے سکتا تھا اس کے ہمراہ چلتے تو تھے لیکن بہت جلد تھک کر پیچھے رہ جاتے۔ پھر وہ محسوس کرنے لگتی کہ وہ اکیلی ہے تنہا ہے۔ اس بات پر اسے غصہ آنے لگتا۔ اس وقت اس کی خواہش ہوتی کہ کوئی اس سے محبت کرے یا لڑے، بحث کرے، اپنا پانی سے بھی گریز نہ کرے۔ اسے جمود سے نفرت تھی۔ سکون ایک بھیانک چیز دکھائی دیتی تھی۔ اسے ہر بات گوارا تھی۔ سکون سے نکال کر پھر سے محترمہ کر دے چاہے وہ حرکت کس قدر شدید اور خطرناک کیوں نہ ہو بلکہ ہو تو اور بھی اچھا۔ مسز فلپ کے لئے واحد خطرہ سکون تھا۔

اس کا نیا خاوند مسز فلپ ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ لیکن خوبصورت کے علاوہ اس میں کوئی بات نہ تھی۔ جو مسز فلپ کی شخصیت کو جذب کر سکتی۔ درحقیقت مسز فلپ سے شادی کرنے سے مسز فلپ کا مقصد ہی کچھ اور تھا۔

مسز فلپ ایک فیکٹری میں ملازم تھا اور اس کی ملازمت اس نوعیت کی تھی کہ تنخواہ میں مزارہ ممکن نہ تھا۔ وہ ہمیشہ حاجت مند رہتا۔ یہ حاجت مندی مسز فلپ کی اپنے خاوند سے دلچسپی میں گویا سونے پر سامے کا کلام دیتی تھی۔ تنخواہ ملنے ہی مسز فلپ ایک معقول رقم بذریعہ تار مسر فلپ کو مانی آرڈر کرو دیتی۔ پھر مسز فلپ کے خطوں کا ایک تاننا بندھ جاتا۔ ”فلپ ڈارلنگ تمہیں مزید روپے کی ضرورت تو مجھے لکھو فوراً اطلاع دو۔ نہیں ڈارلنگ گھٹیا سگریٹ نہ پینا۔ اگر پورے دل میں اعلیٰ سگریٹ دستیاب نہ ہوتے ہوں تو مجھے لکھو تاکہ میں نیا شہر سے پٹنی بھیج دوں۔“

مسز فلپ میں ماما کا ایک طوفان دبا پڑا تھا۔ چونکہ سولہ شادیوں کے باوجود اس کا کوئی بچہ نہ تھا۔ اور وہ مسز فلپ کا یوں خیال رکھتی تھی۔ جیسے اس کا اکلوتا بیٹا ہو۔ مسز فلپ اس کی اس کڑوری سے واقف تھا اور دل کھول کر اس کے ماما بھرے جذبات کو حرکت میں لانے اور ان میں شدت پیدا کرنے کی مسلسل کوشش کیا کرتا تھا۔ وقت یہ تھی کہ وہ بہت دور دراز مقام پر لڑکی کرتا تھا اور مسز فلپ کو خالی خطوط پر گزارا کرتا پڑتا تھا۔ شاید اسے خاوند کی جسمانی موجودگی کی ضرورت محسوس نہ ہوتی ہو مگر مسلسل تنہائی اسے کھائے جا رہی تھی۔

جب کبھی مسز فلپ کو اپنی تنہائی کا شدت سے احساس ہوتا تو اسے غصہ آ جاتا۔ اس وقت اس کا بھی چاہتا کہ کوئی ایسا ساتھی ہو جس پر وہ اپنا غصہ اتار سکے۔ یہ کیا زندگی ہوئی کہ لڑنے والا لڑکی کوئی نہ ہو۔ پیار کرنے والا نہیں نہ سہی۔ لڑنے والا بھی ہو تو۔ اس وقت وہ بغیر وجہ اپنے انجمن سے لڑنے کی شدت سے کوشش کرتی مگر اس کے ماتحت نہ جانے کس مٹی سے بنے ہوئے تھے۔ جواب میں سر جھکا کر اس کے روبرو کھڑے ہو جاتے۔ ”لیس میڈم ساری میڈم۔“ اہل بات پر میڈم کو اور غصہ آتا اور آنکھیں دکھاتی منہ بناتی اور فر فر انگریزی بولتی جسے سن کر اس کے رہے سے اوسان بھی خطا ہو جاتے اس پر مسز فلپ مایوس ہو کر کمرے میں جا کر رو دیتی لڑنے سے دل کی بھڑاس نہ نکلتی تو مسز فلپ کو ایک لمبا خط لکھنا شروع کر دیتی۔

مسز فلپ کے دفتر والے سمجھتے تھے کہ میڈم کی بات سمجھ میں نہیں آتی کبھی ہنسی ہے ہنسنے لگتا ہے کبھی بغیر وجہ گرجنا شروع کر دیتی ہے۔ خواہ تنخواہ اچھتی ہے۔ منہ کو آتی ہے اور پھر بیٹھ

کر آنسو بہانے لگتی ہے۔ نہ جانے کیسی افسر ہے گھڑی میں کچھ گھڑی میں کچھ ابھی معطل کر کے دمکی دے رہی تھی اب چڑاسی کے ہاتھ بادام بھیج دیئے کہ پشاور سے آئے ہیں تم بھی کلو۔

”محمود نے جب نئی آسامیوں کا اشتہار دیکھا تو تقریباً ایک عرضی دے دی تھی۔ اس وقت اسے علم نہ تھا کہ ویلیفیر کے محکمہ میں زیادہ تر کارکن عورتیں اور محکمہ کا چیف بھی عورت ہے عورتوں کے متعلق محمود کا رویہ عجیب تھا۔ اگرچہ وہ عاشق قسم کا فرد نہ تھا پھر بھی اسے عورتوں سے بے حد دلچسپی تھی۔ ایسی دلچسپی جو ایک نارمل مرد عورت سے محسوس کرتا ہے۔ لیکن ماہو ہی اسے عورت سے ڈر لگتا تھا۔ وہ ان سے گھبراتا تھا۔ ساتھ ہی انہیں اپنی طرف متوجہ کرنے کی شدید کوشش کرتا۔ یہ ظاہر نہ ہونے دیتا کہ توجہ جذب کرنے کی کوشش کر رہا ہے یا انہیں فیراز معمول اہمیت دے رہا ہے بلکہ اس کے برعکس وہ بے پروائی کا لبادہ اوڑھے رکھتا اور ماتھے پر یوں تیوری جمالیتا جیسے نسوانی سحر سے مستنہ ہو۔ پھر موقع ملنے پر ایک شدت بھری نگاہ ڈالتا۔ آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر مسکراتا۔ گلیڈ آئی چکاتا اور پھر تیوری چڑھا کر یوں منہ موڑ لیتا جیسے جانتا ہی نہ ہو۔

میڈم اور محمود

جب وہ نیا نیا اس محکمے میں گیا تو عورتیں ہی عورتیں دیکھ کر گھبرا گیا۔ لیکن اس گھبراہٹ کے ساتھ ہی دلچسپی بھی محسوس کی۔ بہر حال اس نوکری میں سب سے بڑی وقت یہ تھی کہ اسے محکمہ کی چیف یعنی میڈم سے کام کرنا پڑتا تھا۔ میڈم کو دیکھتے ہی محمود نے تیوری چڑھائی اور یوں کام میں محو ہو گیا۔ جیسے اسے عورت اور مرد کی تمیز ہی نہ ہو۔ لیکن ویلیفیر کی کئی ایک کارکن بڑی بائگی تھیں۔ کئی ایک شوخ تھیں۔ ایسے حالات میں بھلا ہر وقت پیشانی پر تیوری چڑھائے رکھنا کیسے ممکن ہو سکتا تھا۔ لہذا جب میڈم کی توجہ ادا ہوئی تو وہ کارکن پر آنکھ چکاتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

آنکھ چکا کر دفترا ”پھر سے پھر ہو جانے کے فن میں محمود کا جواب نہیں تھا۔ لیکن دقت یہ تھی۔ کارکنیں بالکل ہی نوجوان تھیں۔ وہ اس کی نگاہ کی متحمل نہ ہو سکتی تھیں۔ پھل کر موم جاتیں اور موم سے چھینے اڑتے اور میڈم پر جا پڑتے۔ اس پر میڈم کو غصہ آ جاتا۔

میڈم کو اس بات پر غصہ آتا کہ ابھی یہ لڑکی مناسب طریقے سے باتیں کر رہی تھی اب منہ بند لگی لفظوں کو روکنے لگی۔ آنکھیں چپکانے لگی۔ رکنے لگی۔ کھل متاگئے یہ کیا کڑ بڑ ہے۔ سمجھنے لگی کہ لڑکیوں محمود کے رد برو آ کر دھک جاتی ہیں۔ اسے پتہ نہ تھا کہ محمود اپنے ماتھے کی ٹخن آتا رہتا ہے۔ دو ایک بار میڈم نے اعلان یہ محمود سے اس تبدیلی کی بات کر دی جو اس کی موجودگی میں لڑکیوں میں ظاہر ہوتی تھی۔ اس پر محمود گھبرا گیا اور اسے غصہ آ گیا اور اس کا میڈم سے اور بھی سخت ہو گیا۔

ایک روز جب میڈم نے کہا۔ ”تم نے دیکھا کلرک جب اس لڑکی نے تمہیں دیکھا تو اس نے ہاتھ میں پن شیک کرنے لگا۔ حتیٰ کہ خط بدل گیا۔“

میڈم کی ایسی بات پر محمود کو غصہ آتا تھا۔ ”تو پھر تمہیں کیا۔“ وہ دل میں کہا کرتا۔ اس روز اسے بت ہی غصہ آیا۔

وہ ابھی غصے میں بھرا بیٹھا تھا کہ مالی پھول لے آیا۔ میڈم نے پھول دیکھ کر گویا خوشی سے چیخ ماری۔ ”یہ دیکھا تم نے کلرک۔“ وہ چلائی ”کتنے خوبصورت پھول ہیں یہ دیکھو تو۔“

محمود نے منہ موڑ لیا۔ ”نہیں میں نہیں دیکھتا۔“ اس کے منہ سے نکل گیا۔

میڈم نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

کئی ماتحت نے کبھی ایسا نہیں کیا تھا۔ شاید اسے غلطی لگی ہو۔ شاید کلرک نے غلطی سے ناکردی ہو۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ ایک ادنیٰ ماتحت مجھ سے لڑنے کی کوشش کرے۔

”تمہیں دیکھنا پڑے گا۔“ وہ شدید جوش میں بولی۔

”یہ میرے فرائض میں سے نہیں ہے۔“ محمود نے گھور کر میڈم کی طرف دیکھا۔

میڈم کا منہ سرخ ہو گیا۔ شاید خوشی سے پھر وہ غصے میں چلانے لگی۔ یا شاید لڑائی کے اس نئے نمونے پر خوشی سے چیخ رہی ہو۔

”یہ کوئی بات کرنے کا طریقہ نہیں ہے کلرک۔“ وہ بولی۔

”میڈم یاد رکھئے کہ میرا نام کلرک نہیں محمود ہے۔“ محمود نے کہا اور پھر خراں خراں ہل پڑا۔ جیسے شاہ کا پارٹ ادا کرنے کے بعد ایکٹر بڑے رعب سے سٹیج سے باہر چلا جاتا ہے۔

میڈم حیرت سے اس کی طرف دیکھتی رہی۔

اگلے روز جب محمود دفتر آیا تو وہ جان بوجھ کر اپنے کمرے میں جا بیٹھا۔ ورنہ عام طور پر اس

کہ کلرک کو مردوں کا سا برتاؤ کرنے کا حق ہے یا شاید اس لئے کہ اس کا خاوند اتنی دور کیوں رہتا ہے وہ غصے سے بھوت بن جاتی۔ ہر صورت میڈم اور محمود کے درمیان عجیب چپقلش شروع ہو گئی۔ غالباً محمود کی خواہش تھی کہ کسی وجہ سے میڈم ناراض ہو کر اسے واپس اپنے محل میں بھیج دے۔ اس لئے اس نے جان بوجھ کر میڈم کی باتوں کو رد کرنا شروع کر دیا اسے غلطی طور پر علم نہ تھا کہ ایسی باتیں کر کے وہ میڈم کو احساس دلا رہا ہے کہ وہ کلرک نہیں مرد ہے اور میڈم چیف کے علاوہ عورت بھی ہے۔

اس کے بعد محمود نے مسز فلپ کے نجی معاملات میں دخل دینا شروع کر دیا۔ یہی تو وہ چاہتی تھی کہ کوئی اس کے معاملات میں دلچسپی لے اس سے جھگڑے مشورے دے تاکہ اسے ایک ماضی کی موجودگی کا احساس ہو

اگرچہ مسز فلپ تنخواہ ملتے ہی ایک معقول رقم مسز فلپ کو بھیج دیا کرتی تھی۔ لیکن جلد ہی فب کی زیادتی کا تذکرہ ہوتا اور عام ضروریات مثلاً "سگریٹ و سکی کافی کی کمی کی شکایت ہوتی۔ مسز فلپ پھر کچھ روپیہ بھیج دیتی۔ لیکن جلد ہی پھر ایسا ہی خط موصول ہوتا۔ پھر روپیہ بھیجنے کے علاوہ صبح شام مسز فلپ کی پریشانیوں کی باتیں کرتی رہتی تھی۔ اس نے کبھی ان مطالبات کا برانہ مانگا بلکہ اکثر وہ اس قدر روپیہ ارسال کر دیتی کہ خود اپنی ضروریات میں تخفیف کرنی پڑتی اور اب بھی ہوتا تھا کہ اسے خود کھانے پینے کے لئے قرض لینا پڑتا تھا۔

سزھواں لے پالک

ایک روز جب وہ مسز لے پالک کو دوسری قسط ارسال کر رہی تھی تو محمود نے کہا۔ "میڈم یہ آپ کیا کر رہی ہیں۔ آپ نقد روپیہ بھیج دیتی ہیں اور مسز فلپ اسے اوھر اوھر نقد کر دیتے ہیں اور سگریٹ اس کی تمام ضروریات و سکی کی پوری ہوئے بغیر رہ جاتی ہیں۔"

"تو میں کیا کروں۔" میڈم چلائی۔

سیدھی بات ہے۔ "محمود بلا۔" روپیہ کی جگہ سگریٹ و سکی چائے کافی وغیرہ بھیجے تاکہ ضروریات پوری ہو جائیں۔

"ج"۔ وہ چلائی اور بچوں کی طرح خوشی سے تلبیاں پلٹنے لگی۔ "یہ بات تو مجھے سوچھی ہی ملے۔"

"جی تو سمجھا رہا ہوں۔" وہ ہنسا۔

کا دستور تھا کہ آتے ہی پہلے میڈم سے ملا کام کاج کے متعلق پوچھتا اور پھر کام میں مصروف ہو جاتا۔

کچھ دیر کے بعد ملی آیا۔ "میں صاحب بلاتی ہیں۔"

"اچھا محمود نے کہا۔" کام سے فرمت ہو گئی تو آؤں گا۔"

ملی کو گئے ابھی دیر نہ ہوئی تھی کہ میڈم خود آگئی۔ وہ بولی۔ "مجھے پھول نہیں دکھائے بلکہ خط کا جواب لکھواتا ہے۔"

"ہوں" محمود نے سر ہلایا اور اپنی سیٹ پر بیٹھا رہا۔

اس روز میڈم بے حد خوش تھی وہ بار بار محمود کے کمرے میں آتی اور اسے کوئی نہ کوئی بات سمجھا کر یا بتا کر چلی جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر لوٹ آتی۔ محمود کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس کا رویہ کیوں بدلا ہوا ہے۔ اس نے کلرک کی جگہ مسز محمود کہہ کر اسے پکارنا کیوں شروع کر دیا ہے۔

شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ میڈم اس کی امداد کے بغیر کام نہیں چلا سکتی تھی۔ چونکہ دفتر کے دوسرے کلرک قابلیت اور ذہانت سے خالی تھے اور روز مرہ کے معمولی کام کے علاوہ کچھ کرنے کی اہلیت نہیں رکھتے تھے۔ محمود کو اپنی قابلیت پر اعتماد تھا اور یہ اعتماد مزید مشکلات کا باعث تھا۔ ایک روز میڈم محمود کا لکھا ہوا خط پڑھ کر بولی۔ "ٹھیک ہے لیکن متاثر کے لفظ کے بچے ٹھیک کر لو۔"

"ہوں۔" محمود بولا اور اس نے میڈم کے سامنے وہ خط لفافے میں بند کر کے ڈیسک پر رکھ دیا۔ "اسے ابھی ڈسپچ کر دو۔" وہ بولا۔

"لیکن میں کہہ رہی تھی متاثر کے بچے ٹھیک کر کے بھیجو۔"

محمود بڑے اطمینان سے خط کی نقل اٹھائی پھر آکسفورڈ ڈکشنری لے کر وہ نقل اور ڈکشنری میڈم کی طرف بڑھا دی۔

اس بات پر میڈم بخ پا ہو گئی۔ "میں نے کہا تھا کہ تم بچے دیکھ لو۔"

"میں تو وثوق سے جانتا ہوں کہ بچے ٹھیک ہیں۔" محمود بولا میڈم اپنی تسلی کر لیں۔

محمود کے اس کے اس قسم کے طرز عمل سے میڈم چونکی اور اسے محسوس ہوا کہ وہ ایک مرد سے بات کر رہی ہے کلرک سے نہیں۔ غالباً اسے اپنا خاوند یاد آ جاتا اور پھر شاید اس خیال

”ج۔“ وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”تمہارے بغیر۔۔۔“ وہ دفعتاً رک گئی۔ اس سلاخ غالباً پہلی مرتبہ واضح طور پر اس حقیقت کا اظہار کرتے کرتے اس نے خود کو روک لیا۔ محمود بھی بات کو پانہ سکا اور مسٹر فلپ اس حقیقت کو واضح طور پر پانے کے بعد شدت سے اسے فخر انداز کرنے اور بھول جانے کی کوشش میں کھو گئی۔ جب ایللی ان کے ساتھ نیا شہر پہنچا تو ان دونوں کی کچھ ایسی کیفیت تھی۔ وہ پانہ سکا تھا وہ پاچکی تھی۔ لیکن نظر انداز کرنے کی کوشش میں شدت سے مصروف تھی اور مسٹر فلپ نقد روپیہ کی جگہ اشیاء کی چینی موصول کر کے حیران رہ گیا تھا۔ ایسی بات تو کبھی نہ ہوئی تھی۔ اس کی پیاری بیوی تو ہمیشہ اسے نقد روپیہ بھیجا کرتی تھی اور جی آرڈر سے نہیں بلکہ تار کے ذریعے اور آج غیر معمولی سگرت کے ڈبوں اور دسکی کی بوتلوں کی پٹی اس کے روبرو پڑی تھی۔ خیر اشیاء تو کچھ بری نہ تھیں لیکن وہ اس افراط سے بھیجی گئی تھی کہ مہینہ بھر مطالبہ کرنے کی گنجائش نہ رہی تھی۔ اور نقد روپیہ وصول کرنے کی کوئی امید نہ تھی۔ یہ دیکھ کر وہ چڑ گیا۔ نہ جانے میری بیوی کو کون ایسے گرجتا رہا ہے۔ ورنہ وہ تو صرف محسوس کرنا جانتی ہے۔ سوچنا نہیں۔

مسٹر فلپ نے اس بھید کو جاننے کے لئے اپنے ذرائع استعمال کرنے شروع کر دیے اور غالباً گھر کے کسی نوکر نے مسٹر فلپ کو صورت حالات سے واقف کر دیا۔ ایللی کے نیا شہر پہنچنے پر میڈیم کو یاد آیا کہ ویلفیر کے طالب علموں کے پرچے جو اس کے ہاں دیکھنے کے لئے آئے ہوئے تھے۔ انہیں چیک کر کے واپس کرنے کی تاریخ سربراہ پہنچی تھی۔ اس لئے اس نے محمود کو بلایا اور اس نئی مشکل کا تذکرہ کیا۔

محمود نے کہا۔ ”میڈم اس میں کیا مشکل ہے۔ اگر ہم چار شخص بیٹھ جائیں تو ایک رات میں بارہ سو پرچے ختم کر دیں گے۔ میں ہوں ایللی ہے۔ آپ ہیں اس کے علاوہ آپ کی ڈیڈی نانہ ہے۔“

میڈیم کو یہ تجویز پسند آئی اور ایک رات وہ چاروں میڈیم کی کوٹھی کے بڑے کمرے میں بیٹھ گئے۔ تاکہ پرچے دیکھ کر صبح سویرے انہیں واپس بھیجوا دیں اور اس اہم فرض سے بیکدشا ہو جائیں۔

اور مسٹر فلپ کو جب معلوم ہوا کہ میڈیم کا ایک کلرک اسے ایسے دیے مشورے دے رہا ہے تو اس نے سوچا کہ اس مصیبت کو کسی طرح شروع شروع میں ہی مٹانا چاہیے ورنہ اگر سزا

پہنچنے پر چل نکلی۔ تو پھر اس کا زاویہ نگاہ بدلنا مشکل ہو جائے گا۔ اس لئے صورت حالات کو سمجھنے کے لئے اس نے آٹھ یوم کی رخصت لی۔ اور اطلاع دیئے بغیر نئے شہر آ گیا۔ دن بھر وہ نیا شہر روم میں بیٹھا رہا۔ جب رات پڑی تو چھپ کر گھر آیا۔ آکر اس نوکر سے ملا جس نے اطلاع بہم پہنچائی تھی۔ نوکر ہنس کر بولا۔ ”صاحب وہ تو اس وقت بھی اندر کمرے میں بیٹھے

رہے۔ اور میں ایک عورت ہے اور میڈم ہے۔“

یہ سن کر مسٹر فلپ کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ اس نے سب نوکروں کو اکٹھا کیا۔ ایک طرف کیا۔ جس کے مطابق ایک نوکر نے کچلی کا مین سوچ بند کر دیا اور باقی سب نے اس کے پر پٹا بول دی جس میں ایللی محمود میڈم اور نانہ پرچے دیکھنے میں مصروف تھے۔

کچلی بند ہوتے ہی کمرے میں ایک ہنگامہ مچ گیا۔ محمود نے ایک چنگھاڑی ماری۔ میڈم نے لگی۔ نانہ چیخ رہی تھی۔ ایللی حیران تھا کہ ماجرہ کیا ہے ایک جو تا اس کے سر پر پڑا۔ ارے

کمرے میں سے عجیب و غریب آوازیں آرہی تھیں۔ وہ ڈر گیا۔

کمرے کی ایک کھڑکی کھلی تھی۔ محمود نے باہر چلا گیا لگا دی اور پھر جیتنے لگا۔ ”ایللی“

محمود کی آواز سن کر ایللی کا دل بیٹھ گیا اس نے خطرے کو شدت سے محسوس کیا اور وہ کھڑکی

کھول بھاگ اس وقت رات کے دو بجے تھے۔ محمود اور ایللی چپ چاپ دیران کچلی میں دوڑ

پڑے۔

”ایللی بات کیا تھی۔“ ایللی پوچھ رہا تھا۔

”ناہوش۔“ محمود کا رویہ اسے اور بھی ڈرا رہا تھا۔

”اپنے دھن کے قریب پہنچ کر محمود رک گیا۔ بولا۔ ”گھر جانے میں خطرہ ہے۔“

”ایللی کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”مطلبہ وہ پولیس لے کر ہمارے گھر آئیں۔“

”کیوں کون۔“ ایللی نے پوچھا۔

”نہی۔“ محمود بولا۔ ”جو وہاں میڈم کے گھر آئے تھے۔“

”تو کتنے کون؟“ ایللی نے پوچھا۔

”معلوم نہیں — لیکن مجھے خطرے کی بو آتی ہے۔ دشمن وار کرنے سے نہیں چمکے گا۔“

”تو پھر۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہمیں گھر نہیں جانا چاہیے۔“

”لیکن اس وقت گلیوں میں آوار گردی کرنا بھی تو ٹھیک نہیں۔“

”ٹھیک ہے۔“ وہ چلایا۔ ”چلو ریلوے سٹیشن کے مسافر خانے میں جا بیٹھیں۔“

صبح سویرے ہی محمود نے ایللی کو کہنی ماری۔ ”اب دن چڑھنے کو ہے۔“ وہ بولا۔ ”اب یہاں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”تو پھر جائیں کہاں۔“

”باہر دور۔ کسی دیرانے میں۔“ محمود بولا۔ ”جب تک ہمیں صورت حال کا علم نہ ہو ہمارا پایا جانا ٹھیک نہیں۔“ وہ دونوں نیا شہر کی مشہور ندی کرن کی طرف چل پڑے اور ٹیلوں میں جا چھپے۔

اوسر میڈم کو جب معلوم ہوا کہ یہ حرکت اس کے خاوند نے کی تھی اور اسے شک تھا کہ میڈم اور محمود کے درمیان ناجائز تعلقات ہیں تو وہ ضد میں آگئی اور ایک جیل سے اس نے اپنے شوہر کو خاموش کر دیا ”ناجائز تعلقات کو جائز بھی بنایا جاسکتا ہے۔ مسٹر فلپ مجھے روکنے والے تم کون ہو۔“

پھر مسٹر فلپ اس کے قدموں میں گر کر رہا تھا۔ اظہار محبت کر رہا تھا اور میڈم یوں پھر بنی بیٹھی تھی جیسے وہ ماں جو — اپنا اکلوتا بیٹا سپرد خاک کرنے کے بعد قبرستان سے لوٹی ہو۔ غالباً وہ اپنے سترہواں لے پالک کے متعلق سوچ رہی تھی اور اس کا سترہواں لے پالک اس موہوم خطرے سے بے خبر سما ہوا بیٹھا تھا۔

پہلی ٹھوکر

ایللی واپس جاوڑا پہنچا تو سکول پر سکوت طاری تھا۔ اساتذہ اس تھے اور ایللی کے ساتھی کھٹنوں میں سر دیئے بیٹھے تھے۔ جلد ہی اسے معلوم ہو گیا کہ شیخ مسعود اور وہ خود تبدیل کر دیئے ہیں اور جاوڑا کے تمام اساتذہ کو وارننگ کا ایک خط موصول ہوا ہے۔ جس میں مسٹر معروف نے

لکھا ہے کہ اگر جاوڑا سکول میں مزید کسی قسم کی گزربز ہوگی تو زبردست ایکشن لیا جائے گا۔ جب وہ گھر پہنچا تو افضل خاموش بیٹھا تھا۔ ”تم آگئے۔“ وہ بولا۔

”ایللی نے کہا۔“

”کہاں رہے اتنے دن۔“

”پنشن گیا۔“

”ہوں۔“ وہ خاموش بیٹھا حسب عادت پاؤں ہلاتا رہا۔

”ایللی۔“ وہ بولا۔

”مئی۔“

”جس معلوم ہوا۔“

”کیا؟“

”تمہاری تبدیلی ہو گئی ہے۔“

”ہاں۔“

”تو تم جاؤ گے؟“

”جہاں پڑے گا۔“

”ہوں — تم چلے جاؤ گے تو میں کیا کروں گا۔“ افضل کی آواز کانپ رہی تھی۔

”اگر ہمیں معلوم ہوتا۔“ شبیر بولا۔ ”تو یہ کام ہی نہ کرتے۔“

”پتہ ہے۔“ احمد نے کہا ”شیخ کی ترقی رک گئی ہے۔“

”اس سے ہمیں کیا فائدہ۔“ افضل نے کہا۔ ”پتہ ہے مولوی کا کیا حشر ہوا۔“

”کیا؟“ شبیر نے پوچھا۔

”پانچل خانے میں ہے۔“

”کیا واقعی۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جی۔ ایک آدمی خود مل کر آیا ہے اسے ہوش کھو بیٹھا ہے۔ ہماری محنت بالکل اکارت گئی۔“

”لی کو بچا سکے نہ شیخ کو توڑ سکے پتہ ہے مسٹر معروف نے کیا کہا تھا۔“ شبیر نے پوچھا۔

”گلاب۔“

”تمہارے جانے کے بعد ایک دن پھر آئے تھے۔“ شبیر بولا۔ ”سب اساتذہ کو اکٹھا کر کے

وہ غلط فرمایا تھا۔
 ”کیا کتا تھا۔“
 ”کننے لگے۔ سب ہیڈ ماسٹر ایسے ہی ملیں گے۔ تم خود ہیڈ ماسٹر بنو گے تو ایسے ہی ہو جاؤ گے۔“
 ”سچ کتا ہے۔“ افضل بولا۔
 ”اللہ بچائے۔“ ایللی نے کہا۔
 اور وہ سب گہری سوچ میں پڑ گئے۔
 دروازہ بجا تو وہ چونکے۔
 ”میں اندر آ سکتا ہوں۔“ کسی نے باہر سے پکارا۔
 ”آ جاؤ میاں۔“ افضل بولا۔ ”میاں۔“
 کسی نے نووارد کی طرف نہ دیکھا۔
 ”یہ شیخ مسعود بڑا حرا ہی ہے۔“ افضل بولا۔ ”اس کا ہم کچھ نہ بگاڑ سکے۔“
 ”یہ تو غلط ہے۔“ نووارد نے کہا۔
 ”انہوں نے نووارد کی طرف دیکھا۔ سامنے خود شیخ مسعود کھڑا مسکرا رہا تھا۔
 ”تم نے میری وہ پٹائی کی ہے۔“ وہ تہقیر مار کر ہنسا۔ ”جو آج تک کوئی نہ کر سکا تھا۔ میں تمہاری عظمت کا اعتراف کرنے آیا ہوں۔“
 ”نہیں شیخ صاحب۔“ افضل نے کہا۔ ”جو تم نے مولوی کے ساتھ کیا ہم اس کا انتقام نہیں لے سکے۔“
 ”اچھا تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ آخر آصفی کا میرے خلاف ہو جانا کس وجہ سے ہے میں نے آج تک آصفی کے خلاف کچھ نہیں کیا لہذا مجھے آصفی سے الگ لگاؤ سا ہے۔ کیوں آصفی صاحب کیا یہ سچ ہے کہ تم مولوی کا انتقام لے رہے تھے۔“ ”سچ ہے۔“ ایللی بولا۔
 ”ہاں۔“ شیخ نے سر جھکا لیا۔ ”مولوی سے مذاق میں زیادتی ہو گئی۔“
 ”بہر حال میں چاہتا ہوں کہ ہم دوستوں کی طرح جدا ہوں۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔
 ”آج سے تم میرے دوست ہو۔ ہمیشہ ہی تھے۔ میرے دل میں تمہارے خلاف فضا

ہیں اس کے ساتھ میں تمہاری قابلیت کا بھی معترف ہوں۔“ شیخ کی آواز جذبے سے کلاب لہجے میں آئی تھی۔
 ”میں حرا ہی سہی لیکن ایسے آدمی کی دوستی اچھی ہوتی ہے۔“ ہاتھ ملاتے ہوئے وہ کہنے لگا۔
 ”میری میں میری یہ پہلی ٹھوکر ہے۔“
 ”ٹھوکر تو لگی ہی نہیں۔“ افضل مسکرا کر بولا۔
 ”مگر ہے۔“ شیخ نے جواب دیا۔
 ”صرف ترقی ہی بند ہوئی ہے نا۔“ افضل نے کہا۔
 ”مگر کرل پر لگتی ہے تنخواہ پر نہیں۔ اچھا خدا حافظ۔“

پرائیویٹ

جلد چھوڑنے کے بعد ایللی کا دل پھر سے اچٹ ہو گیا۔ محبت کے متعلق اس کے احساسات لگائی پید ہو چکی تھیں۔ اب زندگی میں پہلی مرتبہ اسے دوسرے پہلو کی تسلی کا احساس ہوا تھا۔ ایللی سوچ میں پڑ گیا تھا۔ کیا یہ زندگی ہے۔ کیا زندگی میں انصاف کو دخل نہیں۔ کیا اللہ میاں کا مسرور کی طرح خلی ایڈ مسٹریشن کر رہے ہیں۔ کیا وہ بھی ایک ہیڈ ماسٹر ہیں۔ سکول کی فضا سے وہ بے زار ہو چکا تھا۔ یہ ادارے جہاں ملک کی آئندہ نسلوں کی تشکیل ہو رہی تھی۔ آئندہ اور ہیڈ ماسٹر کی عجیب و غریب ذہنیوں کی وجہ سے تعفن سے بھرے ہوئے آئندہ کے انداز میں خود پرستی جاہلیت اور جھوٹے وقار کی جھلک تھی اور ان پر بے حسی کا لگا ہوا تھا۔ ان کے خیالات میں وسعت کا فقدان تھا۔ گھریلو معاملات کے الجھاؤ کا عکس ان انجینئروں میں جھلکتا تھا۔ وہ علم کی ظاہری شکل پر مرکوز تھے۔ مفہوم ان کی نگاہ سے اوجھل رہا تھا۔ ایللی کی نگاہ میں وہ سب کیڑے تھے۔ ریٹنگ والے کیڑے، سینٹرل ماڈل سکول کے کلاس روم کی طرح وہ چھڑی کے سہارے چل رہے تھے۔ ان کا ایمان تھا کہ چھڑی ہاتھ میں ہو تو مشکلات دور ہو جاتی ہیں۔

اور ایللی کو سب سے بڑا ڈر تھا کہ ایک روز وہ بھی ویسا ہی ہو جائے گا۔ وہ بھی خلاصوں میں لپکتی تلوٹیوں کو علم سمجھنے لگے گا۔ بچوں کے ذہن پر آئینی پابندیاں ڈالنے کو اخلاق سے تعبیر نہ کرے گا اور پھر وہ بھی ہیڈ ماسٹر بن جائے گا۔ اس خیال پر اس کا دل دھک سے رہ جاتا۔

”نہیں نہیں ایسا نہیں ہو گا۔ ایسا نہیں ہو سکتا۔“

نہ لے پر مچاتی پھرے گی۔

اے ری میں تو پریم دیوانی میرا درد نہ جانے کو

ملدی کے نعوش ایللی کے دل سے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ غالباً اس لئے کہ اس کا چہرہ بہ جسم دکھائی دیتا۔ اس کا جذبہ ہمیشہ جواں نظر آتا۔ اس کا خیال ہمیشہ ایللی کے دل میں زندگی رہتا۔ اس کا تصور پیش کرتا۔ سادی کے خیال کے ساتھ آتش رقابت کی جلن محسوس نہ ہوتی۔ اس سادی کی محبت پر کبھی شک پیدا نہیں ہوا تھا۔ اس نے کبھی کسی رقیب کے وجود کے انکار کے متعلق نہ سوچا تھا۔ کوئی خیالی رقیب پیدا نہ کیا تھا۔ شاید اس کی ضرورت نہ محسوس کی۔ یہ سادی کا خیال ایللی کے لئے زندگی اور رنگینی کے سوا اور کچھ نہ تھا۔ وہ اکثر سوچتا اگر وہ سادی سے منسلک ہو جاتا۔ اگر رکاوٹیں نہ ہوتیں اگر ابایوں قطعی طور پر انکار نہ کرتے اگر ان کے انکار کے باوجود وہ آگے قدم بڑھا سکتا۔ اگر سادی یہ اعلان نہ کرتی کہ وہ اس سلسلے میں مجبور ہے۔ اگر اس کے انداز میں قطعیت نہ ہوتی۔ اگر وہ اتنی دور گروکل ریاست کو مراجعت نہ کر دیتا۔ ایسی ریاست جس کا وجود ایللی کے لئے اس قدر مہموم تھا۔ جیسے وہ الف لیلیٰ کا شہر ہو۔ تو ایللی سادی سے شادی کر کے کتنی اچھی زندگی بسر کر سکتا۔ لیکن شاید یہ خیال اسے صرف اس لئے آتا تھا کہ وہ سادی سے شادی کر کے شہزاد سے انتقام لے سکتا تھا۔

جلور سے تبدیل ہو کر جب وہ چمک بالا پہنچا تو چند ہی دنوں کے بعد اسے جمیل کا ایک تار لکھ جس میں لکھا تھا گرد کل ریاست سے ایک خط موصول ہوا ہے یہاں آؤ تو ملے گا۔

نٹالو اور چنگاری

جب وہ خان پور پہنچا تو علی احمد پنچے جھاڑ کر اس پر جھپٹ پڑے۔

”ہی ایللی نے تو حد کر دی۔“ وہ بولے۔ ”مسٹر معروف کہہ رہے تھے کہ انکوٹری میں وہ بٹا کیس آپ کے فرزند نے کیا بتاؤں اس کو تو وکیل ہونا چاہئے تھا۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ مسٹر معروف نے ایللی کی بڑی تعریف کی اور نصیر کی ماں پر یہ کیا کہنے لگتے۔ آخر کیوں نہ ہو کہ باپ کا بیٹا ہے۔ ہی ہی ہی۔ ساری تان مجھ پر توڑ دی۔ لیکن ایک بات ہے نصیر کی ماں نے دستور کے مطابق ایللی کو پسند کر دینا چاہئے تھا۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔“ راجو نے پوچھا۔

جلور کی سازش سے ایک فائدہ ضرور ہوا تھا۔ اس کے ذہن سے شہزاد کی بے وفائی کی کمی دور ہو چکی تھی۔ اگرچہ کانا ویسے ہی لگا تھا لیکن اب وہ دردِ شیشے درد کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ شہزاد کی بے وفائی نے ایللی کے جذبے کو کم نہیں کیا تھا لہذا اسے قائم کر دیا تھا۔ تعزیت پیش دی تھی۔ طبعی طور پر ایللی بے وفا محبوب سے محبت کرنے والا شخص تھا۔ اس کے نزدیک محبت فرحت بخش جذبہ نہ تھا۔ بلکہ فرحت بخش جذبات تو اس کی نگاہ میں عیش پرستی کے مظہر تھے اور محبوب پر شک و شبہ کرنے کی عادت جو اس نے پال رکھی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اگر محبوب بے وفائی نہ کرے تو اس کی محبوبیت کی حیثیت قائم رکھنے کے لئے ضروری تھا کہ اس پر مہموم بے وفائی تھوپ دی جائے اور خیالی رقیب قائم کر کے محبت کے جذبہ کو حقیقی بنالیا جائے۔

جب سے وہ شہزاد کے گھر سے نکلا تھا۔ ایللی کے ذہن میں شہزاد کی محبوبیت کو چار ہاند لگ گئے تھے۔ اب وہ بے وفا حسینہ ایللی کے تخیل میں رقیب سے ہنسی کھیلتی نظر آتی تھی اور ایللی کی طرف دیکھ کر نفرت بھرا تہقنہ لگاتی ”تم۔“ اس کے ہونٹ تحقیر سے بڑا سا بن جاتے اور اس کا تہقنہ گو بخت۔ اس پر ایللی محسوس کرتا کہ واقعی اسے شہزاد سے محبت ہے اور اس کی محبت کو عیش پرستی سے دور کا واسطہ بھی نہیں

اب وہ ایک سچے عاشق کی طرح اس امید پر جی رہا تھا کہ ایک روز شہزاد کی آنکھیں کھلیں گی اور وہ محسوس کرے گی کہ واقعی ایللی اس کا سچا عاشق تھا اور رقیب تو صرف مطلب پرستی کے لئے اس کا ساتھ بنا ہوا تھا۔ پھر وہ عفو کی طلب گار ہوگی اور آکر اس کے قدموں پر گر پڑے گی۔ مگر وہ سوچتا۔ میں اسے قدموں میں گرنے نہیں دوں گا۔ اس نے مجھے ذلیل کیا تھا لیکن میں اسے ذلیل نہ ہونے دوں گا۔ قدموں پر گرنا تو میرا کام ہے۔ میں قدموں پر گر پڑوں گا اور اس کا ہاتھ بڑھ کر مجھے تھپکے گا اور اس کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑی لگ جائے گی اور وہ رک رک کر کہے گی۔ مجھے معاف کر دو ایللی مجھے معلوم نہ تھا اس وقت میں اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دوں گا۔

پھر —

لیکن پھر کا کیا سوال۔ جس مقصد کے لئے وہ جی رہا ہے۔ وہ تو پورا ہو چکا ہو گا۔ پھر اس کا زندہ رہنے کا بھلا کیا فائدہ۔ پھر اس کے قدموں میں پڑے پڑے اس کی روح قفسِ غمری سے پرواز کر جائے گی اور یہ دیکھ کر شہزاد کی چپخیں ٹکل جائیں گی اور وہ بیرنگن ہو جائے گی اور کئی کئی

”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہیں کیا معلوم کہ کیا ہوتا ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نوکری سے چھٹی۔“

”ہے۔“ وہ چلائی۔

”ہاں۔“ علی احمد بولے ”لیکن ہمارا بیٹا ہے نا۔ سمجھی۔ کیا سمجھی؟“

ایلی کو اس پر غصہ آگیا۔

”یعنی آپ کا مطلب ہے کہ آپ کی وجہ سے میں نوکری پر قائم ہوں۔“ ایلی نے دبا زبان سے کہا۔

”بالکل۔“ وہ بولے۔ ”ورنہ ایک دن بھی نوکری نہیں کر سکتے تم۔“ علی احمد جلال میں آ گئے۔

”یعنی مجھ میں ذاتی طور پر قابلیت نہیں کہ نوکری پر فائز رہ سکوں۔“

”لو۔“ راجو بولی۔ ”ابھی تو آپ کہہ رہے تھے کہ معروف ایلی کی تعریف کر رہے تھے۔“

”ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”تمہیں کیا پتہ۔ قابلیت کئی قسم کی ہوتی ہے۔ یہ قابلیت جو ایلی

میں ہے۔ نوکری شای کی قابلیت نہیں۔ یہ تو اپنے ہی پر چلانے کی قابلیت ہے۔ نہ یہ تیل دیکھ سکا

ہے۔ نہ تیل کی دھاریہ تو پٹرول میں چلتی ماچس پھینک سکتا ہے۔ ہی ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

پھر انہوں نے ایلی کو نصیحت کرنا شروع کر دیں۔

”دیکھو ایلی۔ نوکری میں ہمیشہ اپنے امی جیٹ افسر کا ساتھ دینا چاہئے۔ سمجھے چاہے وہ اچھا ہو

یا جبرا غلطی کر رہا ہو یا ظلم۔ تمہیں اس سے کیا اور یاد رکھو تم پر کوئی ظلم نہیں کرے گا۔ کیے

کرے گا کیا اسے معلوم نہیں کہ تم کس کے بیٹے ہو اور ہمارے معروف سے کتنے تعلقات ہیں۔

یہ لوگ آنکھوں کے اندھے ہوتے ہر بات کی خبر رکھتے ہیں اور دیکھو نا اگر اپنے افسر کے خلاف

کوئی کارروائی کرنی ہو تو۔“ وہ بولے۔ ”تو خود کچھ نہیں کیا کرتے بلکہ دوسروں کو اکسا دیتا۔ دوتا

ہے نا تم نے نصیر کی ماں تم سے کیا چھپا ہے ہی ہی ہی ہی۔ ذرا ایلی کو سمجھا دو یہ مگر برا آرام

رہتا ہے۔“

ایلی کی باتوں سے اکتا کر ایلی جیل کی طرف چل پڑا۔ راستے میں نئی کے مکان پر رک گیا۔

دروازہ کھٹکھٹایا۔

”نئی صاحب کہاں ہیں؟“ اس نے نوکر سے پوچھا۔

”جی وہ تو شکار پر گئے ہیں۔“ نوکر نے کہا۔

”شکار پر؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”کسی خاص تقریب پر گئے ہیں کیا؟“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”وہ تو اکثر شکار پر جاتے ہیں۔“

”ارے۔ وہ تو جوتے سیا کرتے تھے۔“

”جی ہاں۔“ نوکر ہنسا۔ ”پہلے جوتے سیا کرتے تھے آج کل شکار کھیلنے ہیں۔“

”ارے۔“ ایلی ہنس پڑا۔ ”پہلے چڑیاں کاڑھتے تھے۔ پھر جوتے سینے لگے اور اب شکار۔“

ایلی اٹھا

ایلی کو دیکھ کر جیل کی باچیس کھل گئیں۔

”یار تم آگئے۔“ وہ بولا۔ ”بڑا اچھا کیا تم نے دو چار روز رونق رہے گی۔ مزا آ جائے گا۔“

”اور وہ خط؟ کیا صرف مجھے بلانے کا بہانہ تھا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”نہیں نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری قسم۔ تم سے جھوٹ نہیں۔ تم سے جھوٹ نہیں بولا۔“

آج تک کوئی چالاکی نہیں کی۔“

ایلی نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ ”پتے ہوئے ہو کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”بھئی واہ۔“ وہ ہنسا۔ ”یہ کیا چھپانے کی بات ہے۔ بڑی بہادری کی تم نے کہ بوجھ لیا۔ اے

بھائی جب خاموشی سے تمہاری بات سنوں تو سمجھ لو کہ خالی ہوں اور جب بات کروں تو سمجھ لو کہ

قائم ہوں۔“

”نفسہ وشر نہیں ہوتا اونہوں۔ زبان سے رنگ اتر جاتا ہے۔ بس اتنا صرف اتنا۔“ وہ

نہوش ہو گیا۔

”تم سمجھتے ہو۔“ جیل بولا کہ صرف تمہیں ہی سو جھتی ہیں۔ یہ غلط ہے شاید مجھے تم سے

بھی زیادہ سو جھتی ہیں تم سے بھی زیادہ انوکھی۔ لیکن جب تک مالٹا مٹھا کا ادھیا اندر نہ ہو زبان

لگ رہتی ہے۔ سال کو وہ رنگ لگا ہوا ہے کہ اترا نہیں۔ تم پی کر آپے میں نہیں رہتے میں پی

کر اپنے آپ میں آ جاتا ہوں۔ بس اتنا فرق ہے۔“

”بکو نہیں۔“ ایلی بولا۔

”لو۔“ جمیل چلایا۔ ”ہم بات کریں تو بکو نہیں۔ بھی واہ اور تم خود باتیں کرو تو PURE WISDOM تمہاری بات عقل کا نچوڑ ہماری بکو اس اچھا انصاف ہے۔“

”اچھا وہ خط نکلو۔“ ایلی نے کہا۔

”خدا کی قسم۔“ جمیل بولا۔ کیا خط ہے۔ واہ واہ اگر مجھے کوئی ایک محبت بھرا خط لکھ دیتی تو کبھی بوتل کا محتاج نہ ہوتا عمر بھر لیکن کسی حرام زادی نے نہیں لکھا اور نتیجہ یہ ہے۔ جب تک اندر مالٹا مٹھانہ جائے بات نہیں بنتی۔“

”تمہاری بیوی نہیں منع کرتی تمہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پہلے پہل جب نئی نئی آئی تھی تو کیا کرتی تھی۔ اب نہیں خدا کی قسم اب تو آسانی ہے۔“

”وہ کیوں؟“

”کبھی توبہ کر لوں تو مصیبت پڑ جاتی ہے اسے پھر وہ بھانے بھانے مجھے آسانی ہے کہ توبہ توڑ دوں۔“

”لیکن کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ ہنسنے لگا۔“ ”اے معلوم ہو گیا ہے کہ یہ ناؤ پانی بغیر نہیں چلے گی۔“

”تمہاری ناؤ واقعی اس پانی کے بغیر نہیں چلتی۔“ ایلی نے کہا۔

”اونہوں۔“ جمیل ہنسنے لگا۔ ”میری ناؤ کو کون پوچھتا ہے چاہے چلے نہ چلے۔“

”تو پھر۔“ ایلی نے پوچھا۔

”بھئی اس کی ناؤ نہیں چلتی عجب چکر ہے نا۔ مالٹا مٹھا میں پیوں اور ناؤ اس کی چلے۔“

تقریباً مار کر ہنسنے لگا۔

”لیکن وہ خط تو دکھاؤ۔“ ایلی نے کہا۔

”وہ خط۔“ دکھانے والا نہیں۔“ جمیل بولا۔ ”تعویذ بنا کر گلے میں ڈالنے کی قابل ہے۔ میں نے ایسا خط کبھی نہیں دیکھا۔ تم بڑے خوش قسمت ہو خدا کی قسم بڑے خوش قسمت ہو اگر مجھ سے کوئی اس کا دسواں حصہ پیار کرتا تو میں نہ جانے کیا ہو جاتا۔ خدا کی قسم اور پھر وہ تو عالم ہے عالم اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ پائے کا عالم ہونے کے باوجود اس میں لڑکی بے حد نمایاں ہے ورنہ پڑھ لکھ کر یہ آج کل کی چھو کریاں نسایت کھو دیتی ہیں۔ جگ کتنا ٹھیک کتنا ہوں یا نہیں

”ابھی خط اس نے جس میں نہیں لکھا۔“

”چھوڑ کر اس کو لکھا ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

”اپنی بھابی کو۔“

”کون سی بھابی؟“

”اس کا کوئی بھائی ہے۔“ وہ بولا۔ ”انصر نام ہے یا نصیر مجھے معلوم نہیں۔ معلوم ہوتا ہے اپنا پناہ ہوا ہے۔ اس کی بیوی کو خط لکھا ہے۔“ — ”تو پھر یہاں کیسے آ گیا۔ وہ ایلی نے پوچھا۔

”وہ شہرنا ہے تم نے — شراب بخ پہ ڈالی کباب شیشے میں۔“ جمیل گانے لگا۔

”تو یہ کسی کے آنے کا اعجاز ہے۔“ ایلی نے کہا۔

جمیل ہنسنے لگا۔ ”خط اسے لکھا ہے۔ لیکن اس بیچاری کے نام صرف سرنامہ ہے باقی سارے میں تمہارا تذکرہ ہے اور تمہارے خیال سے اس قدر بھری بیٹھی تھی کہ لفافے پر پتہ بھی لکھا لکھ دیا۔ واہ واہ واہ۔ گنن ہو تو ایسی ہو۔“ وہ ہنسنے لگا۔

ایلی نے وہ خط پڑھا تو اس کا دل ڈوب گیا۔ ساوی کے جذبہ کی شدت مجسم ہو کر اس کے ہوا آکڑی ہوئی۔ اس کے انداز بیان میں اس قدر جذبہ اس قدر لطافت اور رنگینی تھی کہ وہ پگھل گیا۔ اس نے بھی ساوی کے دکھ کو محسوس نہیں کیا تھا۔ اس کے لاشعور میں ساوی اور غم غملا جڑیں تھیں۔

لیکن ساوی کا خط پڑھ کر ایلی پر گویا دکھ کا ایک پہاڑ آگرا۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ کپڑے بھاڑ باہر نکل جائے اور پھر جوگی بن کر پہاڑی پر جا بیٹھے۔

”ایک دن تو وہ پڑا آپیں بھرتا رہا پھر شدت جذبہ سے مجبور ہو کر علی احمد کے سامنے جا کھڑا اور اس نے ساوی کا تذکرہ پھر سے چھیڑ دیا۔ علی احمد پہلے تو اس کے تیور دیکھ کر گھبرا گئے۔ ان طبعی انہوں نے پینتیر بدلا اور اپنی عادت کے مطابق ہنسا شروع کر دیا۔“ نصیر کی ماں یہ سنا سنی ہی ہی ہی۔“ اور اس ہی ہی ہی میں بات دب کر رہ گئی۔

تجدید

کیر اور کویا

ایلی کے بن باس کو چار سال گزر چکے تھے۔

یہ چار سال اس نے مسلسل مطالعہ میں صرف کیے تھے۔ جس کی وجہ سے اس کے خیالات میں خاصی چٹنگی پیدا ہو چکی تھی مطالعہ سے حاصل کئے ہوئے کئی ایک نظریات کو وہ عملی زندگی میں آزما چکا تھا۔ اب اس میں خود اعتمادی پیدا ہو رہی تھی۔ اگرچہ بنیادی طور پر اس کے کردار اور شخصیت کی دیواریں اسی احساس کمتری پر کھڑی تھیں، لیکن اب اس کے برتاؤ سے اس حقیقت کا اظہار نہیں ہوتا تھا۔ اب وہ گونگا نہ رہا تھا۔ بلکہ اس کی گفتگو میں ایک جاذبیت پیدا ہو چکی تھی۔ اس کے دوست اور ساتھی اس کی باتیں سننے اور سر دھتے تھے۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ ایلی نے ”الترما“ زندگی کے متعلق ایک انوکھا نکتہ نظر استوار کر رکھا تھا۔ جو رسمی زاویوں سے ہٹ کر قلم دراصل اس کا اسٹیلجول سلف ایک کولے کی حیثیت رکھتا تھا جس کے لئے اس کی جذباتی اتاکیرنے کی طرح چھپی ہوئی تھی۔ مطالعہ نظریات اور چٹنگی خیالات کا اس کے جذباتی اندہ بود پر کچھ اثر نہ ہوا تھا۔ جذباتی طور پر وہ ایک بچہ تھ۔ وہ بچہ مار کھا کر روتے روتے سو گیا تھا۔ ایلی کو یہ خوف دامن گیر رہتا کہ بچہ پھر نہ جاگ پڑے۔ اسے ڈر تھا کہ وہ جاگ پڑے گا۔ اور ہر سے بسورنا شروع کر دے گا۔ اس بات کا مطالبہ کرے گا۔ کہ میں اسے جھکے ہاتھ سے اس کی وابستگی جوں کی توں قائم تھی۔ اس کے گرد و پیش کئی ایک نوجوان لڑکیاں تھیں جو پردوں سے

جانبی نہیں قہقہے لگا کر آواز نشر کرتی تھیں۔ شرابا کر چھپ کر ڈھونڈنے کی دعوت دیتی تھیں۔ ان میں دلفری تھی حسن تھار عنائی تھی۔ لیکن مانتا نہ تھی۔ وہ جنگاتی تھیں تھک کر سلاقی نہ تھیں ان میں پردگی تھی۔ لیکن گردنیں اٹھانے کی صلاحیت نہ تھی۔ اس لیے وہ ایلی کو اپنی طرف متوجہ نہ کر سکیں اور مانتا بھری تھکی کی عدم موجودگی میں ایلی اپنے محنت سے پیدا کئے ہوئے اسٹیلجول کوئے میں سوتا رہا۔ وہ ڈر تھا کہ کہیں بچہ جاگ نہ پڑے اسے آرزو تھی کہ وہ جاگ اٹھے۔ ڈھکی چھپی آرزو اور متا بھرے ہاتھ اسے تھکیں تھکتے تھکتے اٹھا کر متا بھری گود میں ڈال لیں۔

اسی ڈر کے مارے چار سال وہ علی پور نہ گیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ کہیں سویا ہو بچہ پھر سے نہ جاگ پڑے وہ کویا جو اس نے بڑی محنت سے بنایا تھا۔ ٹوٹ نہ جائے اور لوگ اس حقیقت سے واقف نہ ہو جائیں کہ وہ وہی پرانا کیرا ہے۔ پلپلا۔ رینگتا ہوا کیرا۔

اس کے باوجود جب کبھی علی پور سے کوئی آتا۔ وہاں سے خبر آتی تو ایلی کے کان کھڑے ہو جلتے۔ بظاہر بے پروائی دکھاتے ہوئے بڑی توجہ سے علی پور کی باتیں سنتا اور پھر تنہائی میں بیٹھ کر اپنے اٹھاک سے خبروں کے ٹوٹے ہوئے ٹکڑے جوڑتا اور پھر اندازے لگاتا کہ شنراؤ کا کیا حال ہے اور صفدر اور شنراؤ کے تعلق کے متعلق محلے والوں کا کیا خیال ہے کیا شریف حالات سے بے خبر ہے۔ کیا شنراؤ شریف کے ساتھ نہیں جاتی۔

شروع شروع میں محلے۔ جو خبریں آتی تھیں ان میں شنراؤ اور صفدر کا بہت چرچا تھا۔ کہا جاتا تھا کہ دونوں کا ایک دوسرے کے بغیر دم نکلتا ہے وہ کھڑکی میں کھڑی ہو کر آوازیں دیتی رہتی ہے۔ وہ منڈیر سے جھانکتا ہے۔ ”چچی سودا منگواؤ گی۔ آج تو کرلیے پکاؤ اور وہ جو زیور تم نے ہوا تھا“ کھڑکی میں کھڑا رہتا ہے دونوں ہنس ہنس کر باتیں کرتے ہیں۔ وہیں کھڑے دوسرے ٹیم ہو جاتی ہے۔ نہ جانے ان کی باتیں ختم کیوں نہیں ہوتیں رات کو گرامو فون کو سرہانے بیٹھ کر گیت سنتے ہیں۔ آدمی رات بیت جاتی ہے۔ لیکن وہ اللہ کے بندے نہیں تھکتے۔

پھر آہستہ آہستہ باتیں رنگ بدلتی گئیں۔ صفدر کے شراب کے نشے میں دھت رہنے کی تمنا چل نکلی توبہ ہے۔ ہر وقت بوتل منہ سے لگائے رہتا ہے۔ اور کیوں نہ ہو۔ شنراؤ کا مال ہے لیکن لٹائے مفت کی توکتے ہیں قاضی بھی نہیں چھوڑتا اور صفدر تو بیچنے کا شرابی ہے پی کرونگا رہا ہے۔ بیوی کو بیٹتا ہے۔ جیج جیج کر شعر گاتا ہے۔

بہنک خیر منائے گی۔ ہی ہی ہی ہی وہ ہنسنے لگے۔“
جب وہ علی پور پہنچے تو محلے کا احاطہ محلے والیوں کی آوازوں سے گونجنے لگا وہ سب علی احمد کو
پہننے لگیں۔

قلہ

رہنما“ ایللی کو خیال آیا۔ وہ گھبرا گیا۔ اس نے محسوس کیا کہ احاطے کے میدان میں کھڑے
ہناظرے سے خالی نہیں۔ اس نے چند ایک لمبے لمبے ڈگ بھرے اور ڈیوڑھی میں جا کر رک
لیا اس کا دل ابھی تک دھڑک رہا تھا۔ باہر چیلیں جچ رہی تھیں۔ کوئے کائیں کر رہے
تو ان میں علی احمد کے قہقہوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔
”کون؟ علی احمد آیا ہے؟“

رہنما“ ایک مختلف نوعیت کی آواز سنائی دی۔ انوکھی۔ سرلی۔ پنجم آواز۔ ایللی کا دل ڈوب
بد جسم میں لہرسا چلنے لگیں۔

”ہے یہ تو سارا قافلہ ہے کسی کو چھوڑ تو نہیں آئے پیچھے۔“
”تو کھراؤ نہیں۔“ علی احمد بولے۔ ”بسمی ساتھ ہیں۔ بسمی۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا۔ ”تو
بات سناشنواؤں سے تو نے اپنے میاں کو عاق کر دیا ہے۔“
”وہ کیسے۔“

”لوگ کہتے ہیں کہ تو نے اسے رہا کر دیا ہے۔“
”عمر عمر کی بات ہوتی ہے، وہ ہنسی۔“
”عمر تو ڈیوڑھی کی ہے۔ کیوں چاچی۔ جھوٹ کہتا ہوں کیا؟ ہی ہی ہی ہی۔“
”اب کیا رہا ہے پیچھے۔“ پنجم گونجی۔
”نگاہیں کھا گئیں تجھے۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا۔
”نگاہوں کی بھیٹ جو چڑھا دیا اپنے آپ کو۔“ ماں مدھم آواز میں بولی۔

”ہی ہی ہی ہی۔“ علی احمد کا قہقہہ ایللی کے بند بند میں ٹپنے لگا۔ ایللی نے کانوں میں انگلیاں
لٹکائیں۔

محلے میں کئی ایک تبدیلیاں ہو چکی تھیں۔ عورتوں نے احاطے کے میدان میں بیٹھ کر چر خا

اگرچہ ایللی کو یقین تھا کہ اسے ان باتوں سے قطعی دلچسپی نہیں اسے قطعی طور پر پروا نہیں
کہ شہزادہ کھڑکی میں کھڑی رہتی ہے یا بازار میں صندر نمازیں پڑھتا ہے یا شراب کے نشے میں
دمت رہتا ہے۔ ان باتوں سے کیا فرق پڑتا ہے۔ لیکن یہ باتیں بڑی اہمیت رکھتی تھیں۔ صندر
کے شراب پی کر چلانے کی بات سن کر اسے بے حد خوشی ہوتی تھی۔ ایسی خوشی جس کا اعتراف وہ
اپنے آپ سے بھی نہیں کرتا تھا ایک پرائیویٹ خفیہ خوشی۔ اب شہزادہ کو سمجھ آئیگی۔ اب وہ
جانے گی کہ سچے اور جھوٹے عشق میں کیا فرق ہوتا ہے۔

ان چار برس میں علی پور جانے کے کئی ایک موقع ملے تھے لیکن ایللی نے جان بوجھ کر علی
پور جانے سے احتراز کیا تھا وہ علی پور سے ڈرتا تھا۔ وہ شہزادہ کی آواز سننے سے ڈرتا تھا وہ آواز جو
محلے میں گونجتی تھی جس کے سرے محلے والیوں سے قطعی طور پر مختلف تھے۔ جس میں لے تھی
زیروم تھا۔ وہ عجیب سی جھنجھلاہٹ تھی۔ جو سیدھی دل پر اثر کرتی اور پھر نس نس میں دھکی سی
بجتی۔

ہر سال جب سکول گرمی کی چھٹیوں کی وجہ سے ڈیڑھ ماہ کے لئے بند ہو جاتا تو ایللی مشکل
میں پڑ جاتا چھٹیاں گزارنے کے لیے جب وہ خان پور جاتا تو کوئی نہ کوئی علی پور کی بات چھیڑ دیتا۔
مثلاً علی احمد کہتے۔

”نصیر کی ماں کتنی خوشی کی بات ہے کہ ایللی چھٹیاں ہمارے پاس بسر کرتا ہے۔“

”بے چارہ اپنی ماں سے ملنے سے بھی گیا۔“ راجو دبی زبان سے کہتی۔

”اس کا نام زندگی ہے نصیر کی ماں۔“ علی احمد چلاتے ”کبھی دھوپ کبھی چھاؤں۔“

”میں نے کہا۔“ راجو اسے دیکھ کر بولی ”ایللی آیا ہے۔“

”لیکن۔۔۔۔۔“ راجو کہتے کہتے رک گئی۔

”لیکن کیا۔“ علی احمد چلانے لگے۔

راجو کی آواز مدھم پڑ گئی۔ ”ہم تو علی پور جا رہے ہیں۔“

”تو پھر۔۔۔۔۔ تو مطلب کی بات کر۔“

”مطلب یہ۔“ اس کی آواز اور مدھم پڑ گئی۔ ”وہ کہاں رہے گا چھٹیوں میں۔“

”ہی ہی ہی ہی۔“ علی احمد نے نصیر کی ماں تو بھی ہمیشہ باؤنڈری لگاتی ہے۔ اسے بھی ساتھ

لے چلو آخر ایک دن جانا ہی پڑے گا۔ آج نہیں کل سہی۔ کل نہیں پرسوں۔ بکرے کی ماں

”اے ایللی ہے۔“ وہ اسے دیکھ کر چلاتی۔ اے اتنی دیر کے بعد دیکھا ہے تجھے۔ جی نہیں
 پہتا تیرا وطن آنے۔ اے تو نے تو حد کر دی۔ محلہ چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا پہلے تو باہر جانے
 اہم نہ لیتا تھا۔ پھر جو چھوڑا تو بالکل ہی چھوڑ دیا۔“
 پھر وہ ایللی کے قریب تر ہو جاتی۔ ”اچھا ہی کیا تو نے جو اس دلدل سے نکل گیا مردوں کا کیا
 کہ دلدل میں پھنسے بیٹھے رہیں مرد تو چلتے پھرتے گھوڑے ہوتے ہیں۔“

”اے کوئی جگہ ہوتی تو تو جان کی بازی لگاتا۔ وہ تو بارہ دری ہے بارہ دری ایک آیا ایک گیا
 چاہا تیری جان چھوٹی۔“

اے میں نے کہا ایللی کچھ معلوم ہے تمہیں اس اللہ مارے شرابی نے کیا کیا بیچ کر کھلایا اے۔
 بوہو لپوڑ لیا۔ اچھا ہوا اے بھی سمجھ آئی کی کیا کیا ہوتا ہے لیکن اے کیا سمجھ آئے گی۔ وہ تو
 کئی بے لوث لودہ خود لٹنے کے لیے بے قرار ہے۔ خاوند سے بگاڑ ہو چکا ہے۔ لیکن وہ تو بدھو
 بے بدھو۔ ورنہ عورت کی کیا مجال ہے کہ خاوند کا کمانہ مانے۔ اس بے چارے نے ہزار فتنیں
 کیں کہ چل میرے ساتھ چل لیکن اس اللہ کی بندی پر کوئی اثر نہ ہوا۔

”اے ہے۔ اب تو لڑکیاں جوان ہو چکی ہیں۔ پھر بھی یہ اپنی ہٹ سے باز نہیں آتی۔ ادھر
 لالہ مند والا شرابی روز پنی کی بیوی کو پیٹتا ہے پھر ڈھٹ کیس کا اسے آوازیں دیتا ہے چیختا ہے
 ہانا بے فتنیں کرتا ہے اور جب کھڑکی نہیں کھلتی تو پھر سے بیوی کو پیٹنے لگتا ہے۔ توبہ ہے۔ اتنے
 باشرم ہو گئے ہیں۔ کہ توبہ ہے نہ کسی کی شرم نہ لحاظ۔“

ایللی ان کی باتیں سن سن کر ان ٹکڑوں کو جوڑتا رہا، ہر حال وہ خوش تھا۔ ہنگامہ ہوا اچھا ہوا
 کچھ میں آگیا۔ اسے معلوم ہو گیا کہ سچا عشق کسے کہتے ہیں۔

خوشی کے بلوجود ایسی باتیں سن کر اس کے دل پر ٹھیس لگتی۔ اس نے اپنا آپ تباہ کر لیا
 نہ وہ ہوس گنوا دیا۔ اپنی جوانی برباد کر دی۔

ابوہ نے ایللی کو گلے سے لگا لیا۔ اس کے آنسو ٹپ ٹپ کرنے لگے۔ ”اے ایللی تو تو ہم سے
 فٹے بھی گیا پہلے ہمارے پاس رہ کر ہمارا نہ تھا۔ اب ساتھ ہم کو بھی چھوڑ دیا۔ تیرا جی نہیں
 تھا علی پور آنے کو اس سے تو وہی دور اچھا تھا۔ تمہیں دیکھ تو لیتے تھے۔ اب تو دیکھنے سے

کالتا آزار بند بننا ترک کر دیا تھا۔ سر جھکا کر چلنے والے بڈھے تعداد میں کم رہ گئے تھے۔ محلے کے
 نوجوانوں کی وہ حالت نہ رہی تھی۔ اب وہ چھاتی نکال کر چلنے لگے تھے۔ نوجوان لڑکیاں بوڑھیوں
 کی موجودگی میں سینہ ابھا کر کھڑی ہو جاتیں۔ نظر بچا کر مسکراتیں۔ بال جھکتیں۔ بچے بیوں کا کما
 نہ مانتے ضد کرتے بیوں کو منہ پر جواب دیتے محلے کی بوڑھیاں بالکل دسکی ہی تھیں جیسے کہ پہلے
 ہوا کرتی تھیں ان میں قطعی طور پر کوئی تبدیلی واقع نہ ہوئی تھی۔ البتہ ان کی تعداد میں اضافہ ہو
 گیا تھا۔ بہت سی ادھیڑ عمر کی عورتیں ان کی صف میں شامل ہو گئی تھیں۔

ایک نئی چیز جو محلے میں زندگی میں داخل ہوئی تھی۔ گراموفون باجہ تھا پہلے تو محلے میں
 صرف ایک باجا ہوا کرتا تھا۔ جو بالا کے کمرے میں یوں بجا کرتا تھا جیسے کھیاں بھن بھناتی ہوں
 بالا کے پاس چند ایک پرانے ریکارڈ تھے۔ جن کی آواز اس کے کمرے میں گھٹ کر رہ جاتی تھی جو
 چلتے چلتے میرا نام جاگتی بائی الہ آباد والی کہہ کر ختم ہو جاتے تھے۔ جنہیں سن کر بوڑھیاں ہاتھ چلا
 چلا کر چلاتیں۔ ”اے ہے یہ باؤلا کیا توے سے گھساتا رہتا ہے ہر وقت کی ٹیس ٹیس نہ شرم نہ
 حیا۔“ لیکن بالا تو باؤلا تھا۔ اس سے جھگڑنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ آسیب زدہ لوگوں سے
 بھلا کیا جھگڑا اس لیے بالا باجہ محلے میں سسکیاں لیتا رہتا تھا۔ بوڑھیاں چلملائی رقتیں۔ بلائی ہی
 ہی کر کے سنتا رہتا۔

اب محلے میں کئی ایک باجے آگئے تھے ان پر ایسے ریکارڈ چلتے جو ہنساتے نہیں بلکہ گاتے
 تھے اور گانے کے بول دور دور تک صاف سنائی دیتے تھے روز رات کے وقت کوئی نہ کوئی باجا
 بجنے لگتا اور دیر تک گیتوں کی آوازیں محلے میں گونجتیں اکثر ایسا ہوتا کہ دو باجوں کی آہیں میں
 شرط باندھی جاتی اور وہ باری باری ریکارڈ بجاتے مقابلے کے شوق کی وجہ سے باجے والے نے
 نئے ریکارڈ خریدتے تاکہ حریفوں سے بازی لے جائیں۔

محلے والیوں نے ان کے باجے کے خلاف ضرور احتجاج کیا ہو گا۔ ظاہر تھا کہ ان کی آوازیں
 اب وہ اثر نہ رہا تھا۔ بولتیں تو وہ اب تھیں۔ انہیں تو بولنے سے دلچسپی تھی اثر پیدا کرنے سے
 نہیں محلے کے جوان اب ان باتوں کو درخور اعتنا نہیں سمجھتے تھے۔ بولتی ہیں تو بڑی بولیں آپ ہی
 تھک جائیں گی۔ ہر حال ابھی تک ان میں اتنی جرات پیدا نہ ہوئی تھی کہ بوڑھیوں کی بات
 کانٹیں یا ان کی بات کا جواب دیں۔

بکھری کہانی

اتنی دیر کے بعد ایللی سے مل کر محلے والیاں بے حد خوش ہوئیں گویا انہوں نے اس کے

”چونکا کون ہے؟“

حزری سے دبی ہوئی سسکیوں کی آواز آرہی تھی۔ ایللی گھبرا گیا۔

اس نے چوٹی کو اٹھایا۔ ہاتھ پر ٹل دیکھ کر اس کا دل ڈوب گیا اس نے چوٹی کو چھوڑ دیا مگر سسکیوں کی آواز اور بلند ہو گئی۔

اس کا جی چاہتا تھا کہ صوفیوں کو اس ریشمی ٹھنڈی کو پرے ہٹا دے اور پھر خرامیں خرامیں کر کے باہر نکل جائے جیسے ہیرو شیخ سے نکلتا ہے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ ریشمی ٹھنڈی کو اٹھا رہنے سے لگا لے۔

اس کا جی چاہتا تھا گٹھڑی پر ڈھیر ہو جائے۔ اسے بانوں میں سمیٹ لے اور دہی آواز سے بے ہوشی میں لے کر آگے بڑھ جائے۔

”مجھے معاف کر دو۔“ وہ اس کے قدموں میں گری ہوئی تھی۔ اس سے زیادہ اس کی عظمت کا اعتراف کس طرح ہو سکتا تھا۔ اس سے عظیم تر لمحہ اس کی زندگی میں کیا ہو سکتا تھا۔ وہ فانی تھا اس کی تحلیل پر خوش تھا۔ اس کے اعتراف شکست پر خوش تھا۔ وہاں وہ چاہتا تھا کہ یوں ملتا بیٹھا رہے۔ دیوتا بن کر بیٹھا رہے اور اس کے قدموں پر وہ سرنگوں رہے۔

نہم دنیا پر سنا چھایا ہوا تھا۔ کائنات گویا رک گئی تھی۔ روئے زمین پر کوئی اور نہ تھا۔
 ہر دیوتا اور پشیم پجاری، کائنات کی تخلیق کا مقصد پورا ہو رہا تھا۔ صرف وہ دونوں باقی رہ
 گئے۔ یا پھر ایک خلا تھا۔ وسعتوں کو گھیر، ہمیں لئے ہوئے ایک عظیم تر خلاء۔
 صدیوں خاموشی طاری صرف ہچکیاں۔ لمبی۔ دبی۔ دبی ہچکیاں پھر کپڑوں کی صفحہ میں
 ایک نئی حرکت ہوئی۔ پیشانی کا سیاہ تل ابھرا۔

”تم میں — تم۔“ آبدیدہ ہنسی نے اس کی بات کاٹ دی
 ”تم؟“ ایللی نے نفرت بھرے انداز سے کہا بتاؤنی نفرت۔

ہاں۔۔۔ میں۔۔۔“

”تم“ ایلی کی نگاہ کند چھری کی طرح پڑی۔

”اُہل میں۔ چور چور ہو کر تمہارے قدموں میں آگری ہوں۔“

ہاجرہ روئے جا رہی تھی۔ اس کے پیچھے فرحت چپ چاپ کھڑی تھی۔ ایلچی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے۔

”چل ادھر فرحت کی طرف۔“ باہرہ بولی۔ ”تو کیا ادھر علی احمد کے گھر رہے گا۔ اکیلا ہی۔“

فرحت کی طرف جا کر رہنا۔۔۔ گویا پھر سے مسجد حار میں کودنے کے مترادف تھا۔ وہی شہزاد تھی۔ صرف ایک چھت اور ایک زینہ حائل تھا اہلی ادھر جانے کے لیے تیار نہ تھا۔ اس لیے چپ چاپ کھڑا رہا۔

”تو بھی حد کرتی ہے امں۔“ فرحت بولی۔ ”اگر ایللی کا جی ادھر رہنے کو چاہتا ہے۔ تو تو اے کیوں مجبور کرتی ہے۔ ادھر لے جا کر خواہ مخواہ پھر سے مصیبت سر پر کھڑی کرنی ہے کیا۔ مشکل سے جان چھٹی ہے پہلے ہی۔“

”اچھا“ ہاجرہ بولی۔ جس طرح تو خوش رہے۔ جیسے تیری مرضی۔“

ایلی کو یقین تھا کہ شہزاد علی احمد کے گھر آنے کی جرات نہ کرے گی اور اگر آئی بھی تو اتنے لوگوں کی موجودگی میں وہ اس کا سامنا کر سکتا ہے اسے تو صرف ایک بات کا ڈر تھا کہ کسیں وہ اکیلے میں ایلی کے روبرو اکھڑی ہو پھر اسے خیال آتا کہ آخر وہ کیوں آئیں گی۔ اس کی آمد کا فخر و راصل محض خوش فہمی ہے۔ آخر اسے آنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔

چار ایک دن کے بعد ایک روز علی احمد اور گھر کے جملہ لوگ علی احمد کے کسی دوست نے
ہاں جانے کے لیے تیار ہو گئے انہیں صرف چند ایک گھنٹے کے لیے باہر رہنا تھا۔ ایلنے نے اس بات
کو چنداں اہمیت نہ دی۔ اس لیے وہ کتاب اٹھا کر ایک الگ کمرے میں جا بیٹھا اور مطالعے میں
مصروف ہو گیا۔

ہاں — ہوں

اسے وہاں بیٹھے زیادہ دیر نہیں ہوئی تھی۔ کہ کمرے کا دروازہ کھلا۔ اور پیشتر اس کے کمرے
سراٹھا کر دیکھتا رہی کپڑوں کی ایک خوشبودار خوشبوی اس کے قدموں میں ڈھیر ہو گئی تھی۔
اوپر والے سرے پر سیاہ ناگن سی بل کھائے ہوئے تھی۔

”جو شرابی کے ہاتھ کا گلاس بنے۔“

”تم مجھے شرابی کے ہاتھ دے گئے تھے نا۔“

”میں دے گیا تھا؟“ نفرت سے اس نے ہونٹ بھیج لیے۔

”تم نہ جانتے تو۔“

”اب کیا رکھا ہے؟“ وہ بولا۔

”سچ ہے“ وہ اٹھ بیٹھی۔ اس نے معافی بھرے انداز سے چہرے سے ہل ہٹائے اور اپنا منہ
ننگا کر کے بولی۔ ”اب کیا دھرا ہے۔“

وہ اسے دیکھ کر چونکا۔ اس کے روبرو وہ شہزادہ تھی۔ ایک لٹا پٹا چہرہ۔ ویران آنکھیں۔
ہڈیوں بھرے گل، داغ دار جلد، بجا پ، وہ اسے دیکھ کر بھونچکا رہ گیا۔ جیسے کسی نے اس کے
سینے پر گھونسا مار دیا ہو۔ اس کا دل ڈوب گیا۔

”ہاں“ وہ بولی ”اب کیا رکھا ہے۔ ویرانی، تباہی لئے ہوئے کو کون منہ لگاتا ہے۔ چور چور
جائے تو کون ٹکڑے چتا ہے۔“ وہ خاموش کھڑی رہ گئی۔

کمرے کی فضا گویا منوں بوجھل ہو گئی۔

ایک اواس بھاری خاموشی چھا گئی۔

دور کوئی کراہ رہا تھا۔ رو رہا تھا۔ سسکیں لے رہا تھا۔

”مجھے معلوم تھا۔“ وہ بولی ”اب تم بھی منہ نہ لگاؤ گے۔ اب رکھا ہی کیا ہے۔“ اس نے

سکی زدہ قہقہہ لگایا۔

”تو پھر“ وہ بولا۔

”پھر۔۔۔۔۔ ہونہ۔۔۔۔۔“

”آخر پھر مجھ پر نوازش کیوں کی گئی؟“

”تم پر میں کیا نوازش کروں گی؟“

”تو کیا یہ نئی چال ہے؟“

”چال“ وہ قہقہہ مار کر ہنسی۔ اس ہنسی میں دھار تھی۔ ایسی دھار جس کا رخ اس کی اپنی

طرف تھا۔

”گھنہ بخشنا نے آئی تھی۔ کیا؟“

”جی خدا میں کر بیٹھ گئے ہو تم۔“

اپنی بونچکارہ گیا اسے کوئی جواب نہ سوجھا۔

”تم اپنے آپ کو کیا سمجھتے ہو۔“

”میرا حال تم کو سمجھتا ہوں۔“

”ہونہ“ نفرت سے اس کی ناک دھار بن گئی۔ ”تم۔۔۔۔۔ مجھے سمجھتے کیا تم۔ تم مجھے کیا
بوجھ، تم میں اتنی وسعت ہی نہیں کہ دوسرے کو سمجھ سکو۔ دوسرے کو دیکھ سکو۔ سمجھنا تو

اپنا ہے۔“

”جی“ وہ فیسے میں بولا ”میں تمہیں نہیں سمجھ سکا۔ نہیں سمجھ سکتا۔“

”خود پرست شخص کسی کو نہیں سمجھ سکتا۔“

”جی میں خود پرست ہوں۔“

”تمہاری خود پرستی نے ہم سب کو تباہ کر دیا۔“

”اس شرابی کو بھی۔۔۔۔۔“ اس کی آواز میں تسخر تھا۔

”ہاں اس ٹٹی کے کیڑے کو بھی۔“

”ٹٹی کا کیڑا؟“

”ہاں۔ اس کا مقصد مجھے لوٹنا تھا۔ اس نے مجھے دل بھر کر لوٹا۔ اور میں جان بوجھ کر لٹتی

ٹی۔ مجھ میں اب بھی اپنا آپ لٹانے کی جرات ہے۔“

”وہ۔۔۔۔۔“

”تمہاری طرح نہیں کہ مجھے اکیلی چھوڑ کر چلے گئے۔“

(11)

”میں چلا گیا؟“

”تمہیں مجھ پر اعتماد نہ تھا۔ تم کسی پر اعتماد نہیں کر سکتے تم میں اتنی وسعت نہیں۔ تم شک

کنڈار پر بیاہ کرتے ہو۔ محبت کرنا نہیں جانتے۔“ آج تم بھی میرا مذاق اڑا رہے ہو۔ گری ہوئی

پٹلیاں میں روند رہے ہو میں صرف تمہارے سامنے گری ہوں۔ کسی اور کے سامنے نہیں۔ اتنی

ٹٹی ہوئی بھی نہ سمجھو مجھے۔“

شہزادہ کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز تھیں۔ اس نے دلوں بازو سینے پر تہ کیے ہوئے تھے

دلہا کی کھڑی تھی جیسی جلتے ہوئے جہاز میں کوئی کیسا بیانا نکلا ہو۔

دیر تک وہ یوں ہی کھڑی ٹھنکی باندھ کر ایلی کی طرف دیکھتی رہی۔ اس کی نگاہ تلے ایلی ایک انجانی گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا۔ اسے لانا پنا دیکھ کر وہ محسوس کر رہا تھا کہ اسے وہ اکیلا نہیں چھوڑ سکتا جیسے اس کا ساتھ دینا اس پر فرض ہو چکا ہو۔

سکھ میں چاہے وہ اس کا ساتھی نہ بننا لیکن دکھ میں وہ اسے چھوڑ نہیں سکتا۔ اب شزلو کے پاس رہا کیا تھا۔ جوانی ڈھل گئی تھی۔ جو بن ختم ہو چکا تھا۔ ایلی کا جی چاہتا تھا کہ اٹھ کر اس کے قدموں پر گر جائے اور رو کر اس سے معافی مانگ لے لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی۔
 وفتا "وہ آگے بڑھی۔ اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا سر تھام لیا "لیکن تم یوں چوبے کی طرح کیوں دبکے بیٹھے ہو۔ کیوں منہ چھپائے پھرتے ہو۔ کبھی علی پور نہیں آئے اور اب آئے تو سامنے کیوں نہیں آتے۔ مجھ سے دلچسپی نہیں تو نہ سہی مجھے اس کی ضرورت نہیں لیکن مجھ سے نفرت ہی سہی اعلانیہ نفرت کرو تھو کو، میرے منہ پر تھو کو۔ تھو کر مار کر مجھے باہر نکل دو۔" اس نے دونوں ہاتھوں سے ایلی کا منہ اپنی طرف موڑ لیا۔

ایلی نے یوں محسوس یا جیسے پٹاخے کو آگ دکھا دی گئی ہو۔ بھن سے اس کا سر ہولائی کی طرح چل گیا اس نے ان جانے میں اٹھ کر شزلو کو دونوں ہاتھوں میں تھام لیا اور پھر دیوانگی بھرے جوش سے اس ریٹی گھڑی کو سمیٹ کر اپنی گود میں ڈال لیا۔ پھر وہ نہ جانے غصے میں جوش میں یا نفرت کی شدت کی وجہ سے چیخنے لگا۔
 "تم کہنی ہو۔ حرام زادی ہو۔ فاششہ ہو۔ تمہیں دوسروں کو تباہ کرنے میں دلچسپی ہے تم انسانوں سے کھیلاتی ہو۔ تم حرام خور ہو۔"

"ہاں ہوں۔" وہ بولی "کرلو میرا کیا کرتے ہو۔" اور پھر گھڑی سی بن کر پڑ گئی۔
 ایلی نے اس گھڑی کی طرف دیکھا۔ جو اس کی گود میں پڑی تھی۔ پھر وفتا "اس کے ذہن میں گاڑی کی کوک ستائی دی۔ گاڑی اونچے اونچے ٹیلوں کے درمیان چھکا چھک چلی جا رہی تھی۔ ایک ڈبے میں مونگیا رنگ کی گھڑی پڑی جمول رہی تھی۔

"ارے یار غضب ہو گیا۔ تباہی برپا دی، لٹ گئے۔ برباد ہو گئے۔" ار چند چلا رہا تھا۔ پھر گھڑی کے پٹ کھلے اور دو حنائی ناگ باہر نکلے۔

سارے عالم پر سناٹا چھایا ہوا تھا۔ ایلی نے گود میں پڑی ہوئی گھڑی کی طرف دیکھا۔ "یہ میں نے کیا کر دیا پھر سے اپنے آپ کو بدرو میں پھینک دیا۔ یہ میں نے کیا کر دیا" غصے سے اس کا منہ

منہ ہول "کرلو میرا کیا کر سکتے ہو۔ کرلو میرا کیا کر سکتے ہو۔" کوئی اس کا منہ چڑا رہی تھی۔ غصے سے ایلی کے تن بدن میں آگ لگ گئی اور وہ اس ریٹی گھڑی پر پل پڑا۔

اگلے روز جب وہ جنگل میں بیٹھا پڑھ رہا تھا تو نیچے زینے سے شور بلند ہوا۔ "راجو غصیم۔ کوئی ہے یہی اس گھر میں کہ کاتوں میں تیل ڈالے بیٹھے ہو۔"

ایلی شزلو کی آواز سن کر چونکا۔ وہ تو علی احمد کے گھر کبھی نہ آئی تھی۔ کبھی آتی بھی تو سہل میں ایک مرتبہ۔ لیکن اس طرح گھر والوں کو آوازیں دے رہی تھی جیسے روز کی آنے والی ہو۔ اور پھر اس کی آواز اسی طرح ٹھنکی کی طرح بج رہی تھی جیسے سن جوں کاتوں قائم ہو۔ بات کا انداز اسی رہا تھا۔ جیسے بیٹھ ہوا کرتا تھا۔

"ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے ہوئے آگے بڑھے "لو" وہ بولے "ہماری قسمت مفت میں ہال اٹھی"

"کس نے جگادی آپ کی قسمت" راجو نے پوچھا۔

"دیکھ لو شزلو آئی ہے ہمارے گھر۔"

"اب تو آئے گی ہی۔"

"کیوں" علی احمد بولے۔

"اب سودا بک گیا۔" شزلو چلائی "اب خطرہ کیا۔"

"ابھی تو گودام بھرے ہیں۔" علی احمد بولے۔ "کیوں نصیر کی ماں ٹھیک ہے نا۔"

"تم آپس میں ہی فیصلہ کرلو۔" راجو ہنسنے لگی۔

"جی تو میں آئی ہوں" شزلو نے کہا۔ "میں نے کہا آج ردیرو فیصلہ ہو جائے۔"

"تو آؤ بیٹھو۔ ہمارے پاس تو کبھی بیٹھی ہی نہیں تو۔ بس کھڑکیوں پر چیل کی طرح منڈلاتی رہتی ہے۔"

کبھی ہمیں بھی موقعہ دیا ہوتا۔ ہی ہی ہی "علی احمد ہنسنے لگے۔

"جیسے سدھ بدھ ہی نہ ہو اسے کیا موقعہ دینا" وہ ہنسی۔

"اب آئے گی بھی اندر یا ان کی باتوں میں ابھی رہو گی۔" اندر سے راجو بولی۔

بچہ احاطے کے میدان میں چاندنی چٹکی ہوئی تھی۔ ایلے نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ چاندنی
بڑی مٹی بھی پیدا کر سکتی ہے محلے میں چاروں طرف سے آوازیں آرہی تھیں۔ برتن بج
نے لگی چارپائیاں گھسیٹی جا رہی تھیں۔ دروازوں کے پٹ بند ہو رہے تھے۔
آہستہ آہستہ محلے پر خاموشی طاری ہوئے جا رہی تھی۔ خاموشی کے وقفے لمبے ہوتے جا
تے تھے پھر محلے کی مسجد سے نمازی وظائف سے فارغ ہو کر گھروں کو لوٹ رہے تھے قدموں
میں آوازیں آرہی تھیں ٹپ ٹپ قدموں کی چلپ آہستہ آہستہ معدوم ہو جاتی تھی۔
لی دروازہ چراؤں کر کے کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ پھر خاموشی چھا جاتی۔ چند ساعت کے
پھر ٹپ قدموں کی آواز آتی آہستہ آہستہ مدھم ہوتی جاتی اور پھر چراؤں ٹھک کے بعد
پھر ٹپ کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

بچا

احاطے کے میدان کے عین درمیان میں کنوئیں کو منڈیر کے قریب مابھا ڈھیر ہو رہی تھی۔
مابھا کی مسئلہ تھی۔ جو سارا دن نہ جانے کہاں کہاں گھومتی پھرتی اور شام کے وقت محلے کے
ماتے میں آ جاتی اور کنوئیں کی منڈیر کے قریب رات بسر کرتی تھی۔

مابھا کو اپنی سندھ بدھ نہ تھی۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہ تھی۔ لیکن جسم پھولا ہوا تھا۔ غالباً
لگے جسم میں حیات مفقود ہو چکی تھی۔ اگر کوئی مابھا کے جسم پر چٹکی بھرتا تو مابھا کو قطعی
بے حس نہ ہوتا وہ آپ ہی آپ بیٹھی ققمہ مار کر ہنسنے لگتی یا پھوٹ پھوٹ کر روتی یا چیخیں
لاتی۔ اس کے جسم پر ایک لمبا چنڈ پڑا رہتا تھا۔ سر اور جسم میں جو میں چلتی تھیں اور رات
بائٹے میں بیٹھے بیٹھے اس کا پیشاب اور پاخانہ خطا ہو جاتا تھا۔

کوئی نہیں جانتا تھا کہ مابھا کون ہے، کہاں سے آئی ہے، کس کی بیٹی ہے اور اس کی یہ حالت
کیوں ہو گئی ہے؟

کوئی کہتا کہ وہ امیر کبیر گھرانے سے ہے اور کشتہ محبت ہے۔ محبت کی شدت کی وجہ سے
کوئی کہتا ہے کوئی کہتا کہ نوجوانی میں غنڈوں نے اس سے زیادتی کی اور اس عفت مآب لڑکی کو
تور مدمد ہوا کہ وہ ہمیشہ کی لیے ہوش کھو بیٹھی۔

رات کے وقت محلے کے کتے اسے چائے تھے پھر نہ جانے کون کتا اسے چاٹ گیا کہ

”آئی ہوں۔ یہاں تو صرف باتیں ہی باتیں ہیں۔“

علی احمد ہنسنے لگے ”بھئی بڑی تیز ہے یہ شہزادو۔“

”ابھی کیا دیکھا ہے۔“ وہ اندر جانے کی بجائے سیدھی ایلے کی طرف آتے ہوئے بولی اور
بے پردائی سے برسبیل تذکرہ ایلے سے مخاطب ہو کر کہنے لگی ”تو یہ کیا پڑھنے کی جگہ ہے۔ اور یہ
وقت پڑھنے کا ہے۔ میرا یہ خط تو ڈال آؤ ذرا ڈاک میں۔“ شہزاد نے ایک لفافہ اس کی طرف بڑھا
دیا۔ اور پھر جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔ علی احمد سے بولی۔ ”اے ہے مہمان آئے ہیں کچھ تواضع
کرو۔ کچھ منگواؤ نا شہزاد آئی ہے۔“

ان کی گھبراہٹ دیکھ کر شہزاد مسکرائی پھر مڑ کر ایلے سے کہنے لگی ”یہ خط تمہارے لیے ہے
کہیں ڈاک میں ڈالا تو میں پٹ جاؤں گی۔“

ایلے نے دیکھا تو لفافے پر شریف کا پتہ لکھا ہوا تھا۔

لفافہ کھولا تو اندر مختصر طور پر لکھا ہوا تھا۔ ”مجھ سے آج ہی ملو میں نے تم سے بہت باتیں
کرنی ہیں وہ بیشک جو احاطے میں کھلتی ہے۔ اس کی تیسری کھڑکی اندر سے کھلی ہو گی کھڑکی میں
اندر نارنج پڑی ہو گی۔ اٹھا لیتا۔ بارہ بجے سے پہلے نہ آتا۔“

رابعہ کے چوبارے کے نیچے کی بیشک جس کی کھڑکی احاطے کے میدان میں کھلتی تھیں
سال ہا سال سے بند پڑی تھی۔ اس میں گھر کا کٹھ کبار ڈھیر کیا ہوا تھا۔ رابعہ اور شہزاد کے مکان کا
صدر دروازہ چھٹی گلی میں کھلتا تھا جسے گیارہ کہتے تھے۔ لیکن یہ دیوڑھی مشترکہ تھی۔ یہاں سے
چار ایک مکانات کو راستے جاتے تھے۔ اس لیے صدر دروازے کو چوری جیسے شہزاد کے گھر جانے
کے لیے استعمال نہیں کیا جاسکتا تھا۔ میدان میں کھلنے والی بیشک کی کھڑکی ان کے گھر میں
داخل ہونے کا براہ راست ذریعہ تھا وہ بھی صرف اس لیے ممکن العمل تھا کہ رابعہ ان دونوں باہر گئی
ہوئی تھی۔ اور شہزاد نہ جانے کس وجہ سے اپنے چوبارے میں آگئی تھی شاید اس کی وجہ صدر
ہو۔ جس کا مکان شہزاد کے چوبارے سے عین ملتی تھا۔

اس رات وہ جنگل میں لینا ہوا سوچ رہا تھا۔ گھر کے زیادہ تر لوگ اوپر چھت پر سوئے تھے
باہر صحن میں زینے کے پاس ہاجرہ کی چارپائی تھی۔ جس کے پاس ہی وہ جائے نماز پر بیٹھی نہ جانے
کیا پڑھ رہی تھی۔ انہی دونوں ہاجرہ نے دلی کے ایک بزرگ جنہیں حاجی صاحب کہتے تھے کی
بیعت کر لی تھی اور نمازوں اور وظائف میں مصروف رہتی تھی۔

”ہے لڑکی یہ مرد تو اندھے ہو جاتے ہیں۔“

”میں کہتی ہوں اسے پکڑ کر باندھ دو۔ اور صبح گدھے پر بٹھا کر شہر میں پھراؤ۔“

لیکن عورتوں کی یہ آرزو پوری نہ ہوئی۔۔۔۔۔ تلاش کے باوجود کوئی نہ ملا۔

البتہ اتنا ضرور ہوا کہ محلے والے چوکنے ہو گئے اور محلے والیوں کی دلچسپی اس حد تک بڑھ گئی کہ جب بھی رات کے وقت کسی کی آنکھ کھلتی یا نیند نہ آتی تو وہ اٹھ کر کڑکی سے جھانک رک جاتا۔ یہی نگاہ دوڑائی کہ ماجھا کے ڈھیر کے پاس کوئی اور ڈھیر تو نہیں پڑا۔

ابو کے اس انکشاف کا ایک نتیجہ یہ بھی ہوا کہ محلے کے جوان اور عمر رسیدہ کنوارے محلے والوں کے شبہات کا مرکز بن گئے۔ اور رات کے وقت میدان میں جانا خطرہ مول لینے کے درپرف ہو گیا۔

ہاں میں آگیا

گمراہ نے بارہ بجائے۔ ایلی چپ چاپ میدان کی طرف دیکھ رہا تھا۔ محلے پر خاموشی چھائی ہوئی تھی۔

ایلی نے اٹھ کر اپنے گھر کا جائزہ لیا علی احمد کوٹھے پر چوہارے میں تھے۔ غیسم اور اس کی دالیں بچیاں اندر کمرے میں سوئے ہوئے تھیں۔ غیسم کے خراٹوں کی آواز صاف سنائی دے رہی تھی۔ دنگے کے باہر دالان میں باجرہ تھی۔ لیکن حاجرہ کے متعلق ایلی کو کوئی گھبراہٹ نہ تھی۔

وہ چپ چاپ اٹھا۔ دے پاؤں غسل خانے میں گیا۔ باہر صحن کا جائزہ لیا۔ والان میں ہاجرہ عظمیٰ بنی پڑی تھی۔ اس نے میزبھیوں کا دروازہ کھولا۔ اور انتظار کرنے لگا۔ پھر وہ چپکے سے نیچے نکلنے لگا۔ ڈیوڑھی میں گھٹا ٹاپ اندھیرا تھا۔ ڈیوڑھی مشترکہ تھی۔ ڈیوڑھی کے پیچھے چھ سات بکلیاں تھیں وہ رک گما دتر تک کھڑا رہا پھر اس نے دروازہ کھولا اور باہر میدان کا جائزہ لینے لگا۔

باہر نکل کر اس نے ڈیو ڈمی کا دروازہ بند کیا اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ کنوئیں کے منڈیر
سکاپں مچھا کا ڈمیر راتھا۔ جو اس کے لیے بہت بڑا خطرہ تھا۔

وختاً" وہ چونکا۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ ماجھا سے دس فٹ کے فاصلے پر کوئی دیوار
سنگ کر کھڑا تھا۔ ایلی کو نے میں چھپ گیا اور غور سے دیکھنے لگا۔ یقیناً "وہ محلے کا آدمی نہ تھا۔
الہ کا جسم گول منول تھا۔ کپڑے پھٹے پرانے تھے اور منہ پر دھشت سی برس رہی تھی۔ یقیناً "وہ

ماجھا پیٹ سے ہو گئی۔ لوگوں نے حیرت سے ماجھا کی طرف دیکھا۔ مردوں نے نگاہیں جھکا لیں عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھ لیں۔ اور اس سے عجیب و غریب قسم کے استفسارات کرنے لگیں۔ دیر تک وہ اس ٹوہ میں لگی رہیں کہ بکار خویش ہشیار والا معاملہ تو نہیں لیکن وہاں تو سدا بدھ ہی نہ تھی لہذا بات ختم ہو گئی۔ معینہ وقت پر بصد مشکل عورتیں اسے کمرے میں لے گھسیں۔ ماجھا کے ہاں ایک واقعی چاند سے مکھڑے والا بچہ پیدا ہوا۔ اور چند روز زندہ رہ کر مر گیا اور ماجھا فراغت پا کر سیدھی کنوئیں کی منڈیر کے قریب جا کر ڈھیر ہو گئی اور اسی طرح تینے مارنے چیخنے اور رونے میں مصروف ہو گئی جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

پھر ایک روز آدھی رات کے وقت محلے میں شور مچ گیا۔

ابو بہت دیر کے بعد دوکان سے واپس گھر آیا۔ ان دنوں کسی تہوار کی وجہ سے دوکان پر سلامتی کا کام بہت زیادہ تھا۔ جب وہ احاطے کے میدان کے قریب آیا تو اس نے دیکھا کہ باجھا کے ڈھیر کے قریب ایک اور ڈھیر لگا ہوا ہے۔ وہ چونک کر رک۔ دوسرے ڈھیر میں حرکت ہوئی ”کون ہے۔“ وہ چلایا ڈھیر میں پھر حرکت ہوئی۔ ایک سایہ سا بلند ہوا۔ اور تیزی سے گلی کی طرف بڑھا۔

اجو نے شور مچایا۔

اس پر محلے کی بوڑھیاں کھڑکیوں میں آکھڑی ہوئیں۔

”کون ہے؟“ ماں چلائی۔

”میں ہوں میں۔“ اجو بولا ”یہاں کوئی تھا۔“

”کہاں تھا کوئی۔“ دوسری بولی۔

”یہاں ماجھا کے پاس۔“

”ہے کون ہے۔ کالے منہ والا۔“

”معلوم نہیں ماں، میں آیا تو کوئی تھا۔“ میرے سامنے بھاگ کر گیا ہے۔

اس پر محلے کے دو ایک مرد لائین اٹھائے باہر نکل آئے اور اسے تلاش کرنے لگے۔

ادھر عورتیں ہونٹوں پر انگلیاں رکھے بد دعائیں دینے لگیں۔

”نہ جانے کون بے شرم ہے۔ ہے کیا زمانہ آیا ہے۔“

”اور پھر ماجھا کے پاس ماں۔ وہ تو گندگی کا بورا ہے۔“

مغص ماجھا کے لے وہاں کھڑا تھا۔

پھر دھنستا اسے خیال آیا کہ وہ خود بھی وہاں کسی ماجھا کے لیے کھڑا ہے ان دونوں میں کچھ زیادہ فرق نہیں تھا اس کے دل میں اس نامعلوم مغص کے لیے ہمدردی سی پیدا ہو گئی۔ وہ ماجھا کے لیے کتنا بڑا خطرہ مول لے رہا تھا اور ماجھا وہاں گندگی میں لتھڑی پڑی تھی۔ اس سے بڑا آئی تھی۔ سوچے ہوئے پنڈے کے علاوہ اس کے پاس کچھ نہ تھا۔

ایلی نے جب سے ٹارچ نکالی ٹیٹن دیا نامعلوم مغص دیوانہ وار بھاگا۔ ایلی نے ٹارچ کل کر دی چند ساعت کے لیے انتظار کیا۔ پھر وہ چھلکتیں مارتا ہوا میدان پار کرنے لگا۔ کھڑکی کے پت کھل گئے اس نے اندر سے بند کر لیا۔ اور پھر ٹارچ کی روشنی میں کاٹھ کباڑ سے بھری ہوئی بیٹھک میں دبے پاؤں چلنے لگا۔ میڑھیاں چڑھنے کے بعد وہ چوبارے کی طرف بڑھا تو راہبہ کے کمرے سے شہزاد نے جھانکا "تم آگے۔" خوشی سے اس کا چہرہ چمک رہا تھا۔

ایلی نے محسوس کیا کہ شہزاد ایک ماجھا ہے۔ اور اس سے صفر کے تعفن کی بو آ رہی ہے۔ اس کے دل کو دھچکا سالگاہ میں کیوں آیا ہوں۔ کیوں پھر سے اپنے آپ کو تعفن میں جھونک رہا ہوں۔ اس کے دل سے آوازیں آ رہی تھیں۔ اس کے اندر میں جھجک تھی۔ شہزاد اس کے قریب آکھڑی ہوئی۔ "تم جج آگے ہو ایلی"

"ہاں میں آگیا۔" وہ بولا۔

"مجھے یقین نہیں آتا" وہ بولی۔ "میں سمجھتی تھی تم اب نہ آؤ گے کیا واقعی تم نے مجھے معاف کر دیا ہے۔ کیا واقعی۔" وہ اس کے ساتھ چٹ گئی۔

آہستہ آہستہ صفر کا تعفن ختم ہوتا گیا۔ اور بو کی بجائے شہزاد سے وہی خوشبو آنے لگی جس سے وہ بہت مانوس تھا۔

اس کا انداز وہی تھا۔ وہی حرکات۔ وہی آواز۔ وہی باتیں۔ بالکل صرف اس کے چہرے پر معصومیت نہ تھی۔ انداز میں شوخی نہ تھی۔ اب اس تھیلی میں وہ مینڈک نہیں بچھتا تھا۔ خود غل میں ایک عجیب سی موہوم بے حسی آچکی تھی۔ لیکن یہ سب باتیں فنی تھیں۔ سب سے اہم بات تھی کہ سالہا سال کی گم نامی کے بعد آج پھر اسے تخت پر بٹھا دیا گیا تھا۔ اور وہ اسے مور چھل کر رہی تھی۔ اور اس کے گرد خوشبو کی طرح منڈلا رہی تھی۔ اور لمبی لمبی دھنسیں پار سے اس کے گالوں کو چھو رہی تھیں اور ریشمیں لمبوسات اس کے قدموں میں پڑے ہوئے تھے

دو چوٹی آنکھیں اسے رکھے رہی تھیں۔ اس پیش منظر کے عقب میں ایک ریلی آواز دکھ بھرے وہاں کوئی دکھ بھرا گیت الپ رہی تھی۔

سینا گھاسن پر براجمان تھا۔ سامنے گویوں کو بھیڑ لگی ہوئی تھی۔

لاد نہ جانے کہاں ماجھا کراہ رہی تھی۔

اس کے بعد یہ اس کا معمول ہو گیا۔ رات کو وہ دیر تک پڑھتا رہتا پھر لمپ بجا کر محلے کی لڑکیوں ستا برتن الماریوں میں رکھے جاتے۔ پتنگ کھینچے جاتے دروازے بند ہوتے اور آخر لڑکیوں کے قدموں کی ٹپ ٹپ جیسے ٹین کی چھت پر بوندیں گر رہی ہوں۔ ٹپ ٹپ چراؤں کی اور پھر خاموشی کا وقفہ شروع ہو جاتا اور پھر دور سے ٹپ ٹپ کی مدھم آواز پھر سے سنائی دیتی آتی اور پھر مدھم پڑتی جاتی اور آخر چراؤں دروازہ کھلتا اور ٹھک سے بند ہو جاتا۔ اور ہر ٹپ کا ایک اور وقفہ شروع ہو جاتا۔

رات کے بارہ کے قریب گلی سے ایک سلیہ ابھرتا اور پھر میدان کے کسی نہ کسی کونے میں باکرا ہوتا۔

ایلی کو اس سائے سے بے حد دلچسپی ہو چکی تھی۔

الوپ چھاؤں

ایلی کی نیت میں وہی دورخی ابھر رہی تھی۔ وہی دھوپ چھاؤں جو غالباً بچپن ہی سے اس کا دل میں دبی بیٹھی تھی۔ وہ بے حد خوش تھا کہ اس کا کھویا ہوا تخت واپس مل گیا تھا۔ لاد نہ کہ کسی حسینہ کا محبوب تھا۔ حسینہ نہ سہی لیکن اب بھی وہ محلے کی محبوب تھی۔ اس کی بہت کواں کے جسم اور خود غل سے تعلق نہ تھا۔ اس کی باتیں اس کا انداز اس کا کردار اس کی شخصیت کے ضامن تھے۔ اس کے علاوہ ایلی کو رو کر بتاتی کہ صفر نے کس طرح اس سے لڑائی کس طرح اس کا زیور چرایا۔ کس طرح مالی مفاد کے خیال سے اسے بے وقوف بنایا۔ لاد نہ ایلی محسوس کرتا جیسے وہ ایک رہبر ہو ایک ایسا عاشق ہو۔ جس کا نام رانجھا اور مینوال ہے۔ عاشقوں کی فہرست میں لکھے جانے کے قابل ہو۔

لیکن اس خوشی کے ساتھ ہی بیٹھے بٹھائے اسے خیال آتا کہ وہ ایک ماجھا کے قریب میں لڑا ہوا ہے۔ اس کی زندگی غلاطت سے بھری ہے۔ اس کی محبت دراصل جسمانی حرص۔ اور

اس کی ملاقاتیں اپنی پرانی رنجین کھو چکی ہیں۔ ان میں وہ شوق نہیں۔ وہ انتظار نہیں۔ وہ شرفی نہیں۔ اسے محبت نہیں کہا جاسکتا۔ اب وہ ایک تعلق تھا ایک بھونڈا بھدا انعام سا تعلق جو عورت اور مرد کے درمیان ہوتا ہے۔

پہلے اسے یہ شکایت ہوتی تھی کہ شنراو اسے قرب بخشے سے بچکپاتی ہے۔ وہ جان بوجھ کر اس سے دور رہتی ہے۔ اور قریب ہوتے ہوئے بھی نہ جانے کمل ہوتی ہے۔ اب جب اس سے رات کی ملاقاتوں کا سلسلہ شروع ہوا تھا۔ اب وہ محسوس کرنے لگا تھا۔ کہ اپنی محبوبیت اور رنجین کے باوجود شنراو ایک ابھرا ہے۔ اور وہ خود تعفن کا شیدائی۔ اس خیال پر اسے اپنے آپ سے نفرت پیدا ہوتی۔ اور وہ شنراو سے نفرت کرتا اور اپنی زندگی کو ذلت بھری محنت کے حراول سمجھتا۔

رات کے بارہ بجتے تو ایلی میں تعفن کا شیدائی ابھرتا۔ ابھرا کی دھن اس پر جڑے کے بڑھے کی طرح سوار ہو جاتی۔ لیکن جب وہ شنراو کے پاس پہنچتا تو تخت پر بیٹھ کر مورچل کرانے ہوئے اسے محسوس ہوتا جیسے وہ ہزار داستان کا کوئی شنراو ہو اور سوتے جاگتے کا دلچسپ کھیل کھیل رہا ہے۔

صبح کے وقت شنراو کھڑکی میں سوار ہو کر کسی نہ کسی سے باتوں میں مصروف رہتی۔ "میں نے کہاں جی یہاں کھڑکی کس کی راہ دیکھ رہی ہو۔"

"ہے لڑکی کیا کہہ رہی ہے تو" ماں ہونٹ پر انگلی رکھ لیتی۔

"میں نے کہا چاچی" شنراو چیختی۔ "کیا پکا ہے آج۔"

پھر وہ شیم سے مخاطب ہوتی۔ "میں نے کہا وہ اپنے علی احمد کو کہاں چھپا رکھا ہے تم نے۔"

"میں کیا جانوں" شیم جل کر کہتی "پوچھو راجو سے جو اسے بھل میں دباے بیٹھی ہے۔"

"ہے آخر تمہارا بھی تو حق ہے" وہ ہنسی۔

"نہ بہن میں اس سوئٹھ کی گانٹھ کو لے کر کیا کروں گی۔" شیم بولتی۔

اس پر علی احمد چوہارے سے نکل کر منڈیر پر آکھڑے ہوتے۔

"کیوں بھی شنراو۔" وہ چلائے۔ "اب تو ہم کو بھی کبھی کبھی یاد کر لیتی ہو۔"

"جی" وہ بولتی "وقت وقت کی بات ہے۔ برا وقت کسی پر نہ آئے۔"

"ہی ہی ہی ہی" علی احمد ہنستے "لیکن چیز دی جو برے وقت کام آئے۔"

بہم آئے تو ہے نا۔" وہ ہنس کر کھڑکی سے ٹل جاتی۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ یہ سب ڈرامہ اس کے لیے کھیلا جا رہا ہے۔ صبح کے وقت اسے زب اور لگاؤ کا احساس دینے کے لئے صرف یہی ایک طریقہ تھا۔ جب وہ جنگل میں بیٹھا پڑھ رہا ہوتا تھا کسی کو مخاطب کر کے پوچھتی۔

"کہیں جی کیا ہو رہا ہے۔"

ایلی جھٹ اوپر دیکھتا اور کتاب کی طرف اشارہ کرتا۔

"لو ہو چچی۔" وہ چلائی "سارا دن بس آلو ہی چھیلی رہتی ہو۔"

ایلی کتب بند کر کے بیٹھ جاتا۔

"تو میں نے کہا زینب ذرا میری طرف منہ کرو تو بات کروں تم سے۔"

"اے ہے۔" زینب چیختی۔ "میرے منہ پر کیا دھرا ہے۔ جو تم دیکھو گی۔"

"جہیں کیا معلوم۔" شنراو ہنسی۔

"آخر کیا بات ہے۔" زینب پوچھتی۔ "جو مجھ سے کرو گی۔"

"بات کا کیا ہے کوئی زبان سے تھوڑی ہی کی جاتی ہے۔ آئے سائے بیٹھ جاؤ تو بات بن

آئی ہے چاہے منہ سے نہ بولو۔"

"ہے مجھے سائے بیٹھا کر اب کیا بات بتاؤ گی۔" زینب حیرت سے چلاتی اور ہنس ہنس کر ایلی

ار اعلیٰ ہو جاتا۔

بھروسہ کھڑکی سے جانے لگتی تو چیخ کر کسی سے کہتی۔ "ابھی آئی ہیں۔"

پھر تھوڑو

نیک روز رات کے نو بجے کے قریب جب ایلی محلے کی آوازیں سننے میں مصروف تھا دھنٹا

لاٹکے مکان کے عقب سے شور و غل بلند ہوا۔ کوئی چیخیں مار رہی تھی۔ محلے والیاں کھڑکیوں

کا کھڑکی ہوئیں۔

"کون ہے ماں؟"

"اے ہے وہی سیکنہ ہے۔ اس شرابی کی بیوی اور کون۔"

"میں جانوں اسے پیٹ رہا ہے۔"

”کوئی نئی بات ہے، بس حاجل روز پیتا ہے، روز پیتا ہے۔“

”ہے نہ جانے پھر وہ کیوں رہتی ہے شرابی کے گھر میں۔“

”پوچھو اس سے۔“

”میں جانوں میں ایسی بھی ہوتی ہیں کئی ایک۔“

”ایسی کیسی۔“

”جنہیں ہڈیاں تڑوانے کا شوق ہوتا ہے۔“

”ہے نہیں پھوپھی یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“

”لو تمہیں کیا معلوم کیا کیا ڈھنگ آتے ہیں ایسیوں کو۔“

”سیکنہ تو ایسی نہیں۔“

”بس تو رہنے دے میری زبان نہ کھلو۔“

میں نے کہا میں ان کی بھینکن بتا رہی تھی مجھے کہہ رہی تھی۔ جو صندر نہ پئے تو بیوی کا پی

نہیں لگتا گھر میں۔“

”ٹھیک تو ہے شرابی جی نہیں لگائے گا تو کون لگائے گا۔“

”اب لڑکی یہ صندر سمجھ لے چار دن کا مہمان ہے جب سے اس کا گھر چھوٹا ہے۔“

”کس کا ماں؟“

”اے ہے آہستہ بول“ ماں بولی۔ ”اپنی شہزاد کا تب سے کہتے ہیں پرٹ پیتا ہے۔“

”وہ کیا ہوتی ہے ماں؟“

”اے ہوتی ہوگی کچھ۔ دیہی جو مٹی کے تیل سے بنتی ہے جسے بھک سے آگ لگتی ہے۔“

سارا کلیجہ جل چکا ہے۔

ابھی وہ باتیں ہی کر رہی تھیں کہ چھتی گلی سے شور سنائی دیا۔ اور پھر صندر میدان میں

کھڑا ہوا وہ لڑکھڑا رہا تھا اسے دیکھ کر عورتوں نے کھڑکیوں کے پٹ بند کر دیے اور دروازے

دیکھنے لگیں ابلی پھلانگ کر پیچھے ہٹ گیا۔ اسے صندر کے ردیو جانے سی ڈر لگتا تھا۔ شرمندہ

محسوس ہوتی تھی۔

صندر میدان کے درمیان کھڑا ہو کر چیخنے لگا۔ ”سب چلی گئیں۔“ وہ بولا ”سب چلی گئیں

مجھے دیکھ کر سبھی چلے جاتے ہیں۔“ وہ رک گیا۔

پھر اس نے پتھر اٹھا کر شہزاد کی کھڑکی پر دے مارا۔ ٹک سے آواز آئی۔ ”یہ کھڑکی بھی بند

”وہ دیوانہ وار چلانے لگا“ اب یہ کبھی نہیں کھلے گی کبھی نہیں کھلے گی۔ کھولو، کھولو“ وہ

”صرف ایک بار صرف ایک بار سب کھڑکیاں کھول دو۔ اور پھر میرے منہ پر تھوک کو مجھے

”کچھ کرو۔ خدا کے لئے وہ بیٹھ کر رونے لگا۔

”اور توں نے مردوں کو آوازیں دینا شروع کر دیا

”وہ بیٹھا رو رہا تھا کہ محلے کے دو ایک مرد میدان میں اتر آئے۔

صندر ”اجو درزی بولا“ ”یہ کیا تماشہ دکھا رہے ہو۔“

”کھا تو نہیں رہا۔“ صندر نے جواب دیا۔ ”تماشہ بن گیا ہوں۔“

”یہاں بنتے ہو۔“

”میں نہیں بنتا۔“ وہ بولا ”مجھے حالات نے بنا دیا ہے۔ تمہاری قسم بھائی صاحب وہ

”ہے کہ۔۔۔“ وہ تھوڑی دیر کے لئے رکا۔ اس نے ایک نظر اوپر کھڑکی پر ڈالی اور پھر

”میں نہیں میں نشے میں نہیں ہوں میں ہوش میں ہوں۔“

”بزرگ بولے۔

”ان نہ پیا کرو۔“

”ہوش میں آتا ہوں چچا۔ ویسے مردوں طرح پڑا رہتا ہوں۔ جیسے یہ باجھا پڑی ہے۔“

”جو۔“ ”اجو نے کہا۔

”ما جاؤں“ صندر بولا ”سب نے کھڑکیاں بند کر لی ہیں۔

”گھر جاؤ۔“

”گھر“ وہ تہقہ مار کر ہنس ”اپنا گھر۔ ہی ہی ہی۔“

”اے اسے شافوں سے پکڑ لیا اور گھسنے لگے۔

”میں میں ہوش میں ہوں۔۔۔ ہوش میں ہوں۔۔۔ تمہاری قسم“

”کے جانے کے بعد محلے کی بوڑھیوں نے پھر مات شروع کر دی۔

”یہ کیا حالت بن گئی ہے اس کی۔“

”اے بھی تو پیا کرتا تھا یہ۔“

”بیٹے کی بات چھوڑو اب جو دو سال میں دو سرائش ہے۔ اس ۱۲ سے روکھا ہوا

نقشِ کشیدائی

ابھی وہ بیٹھے باتیں ہی کر رہے تھے کہ احاطے کے میدان میں شور بلند ہوا "حرامزادہ جائے گا
کلا۔" پھر پکڑ دھکڑ شروع ہو گئی۔ چاروں طرف کی کھڑکیاں کھل گئیں۔ بوڑھیاں چلانے

لہیں
"کسے پکڑ لیا میں؟"

"پتہ نہیں۔"

"اسی حرامی کو میں۔"

"اے کس کو۔"

"کیونہ — ساجھا کو پکڑے بیٹھا تھا۔"

"اے اللہ" چاروں طرف سے شور بلند ہوا۔

مرد جو تکی پن کر باہر کی طرف بھاگے۔ عورتوں نے لائینس جلائیں۔ ایک ہنگامہ ہوا گیا
گہرا گیا۔

"میں جاتا ہوں۔" وہ بولا۔

"مگر میں سب کو پتہ چل جائے گا کہ میں موجود نہیں۔"

"پتہ چل جائے گا۔" وہ بولی اور اس نے ایللی کی کمر میں ہاتھ ڈال کر اس پر ایک چادر
لٹائی اور پھر کھڑکی کھول کر ایللی کو اسی طرح ساتھ لپٹائے کھڑکی میں کھڑی ہو گئی۔

"یہ کیا کر رہی ہو۔"

ایللی جا بیا۔

"تو نموں۔ مرو نہیں۔ لوگ کیا کہیں گے۔" شہزاد نے گرفت اور مضبوط کرتے ہوئے کہا
لہذا آواز بلند چلانے لگی۔

"کون ہے یہ میں؟"

"مہ جائے کون ہے" میں نے جواب دیا۔

"درا دیکھو تو۔ کیوں چچا دیکھا اے۔"

"مگر باہر کا ہے۔"

"ہے۔"

"دوسرا نشہ کون سا میں۔"

"اے آہستہ بات کر لڑکی۔ اگرچہ اس کی کھڑکی بند ہے پر وہ سب کچھ سن رہی ہے۔" میں
نے شہزاد کی کھڑکی کی طرف اشارہ کر کے کہا۔

اس رات جب ایللی شہزاد کے پاس پہنچا تو وہ غیر از معمول خاموش تھی۔ اس کے چہرے سے
صاف ظاہر تھا کہ روٹی روٹی ہے۔

"تم او اس کیوں ہو۔" ایللی نے پوچھا۔

"نہیں تو" شہزاد نے آنسو پونچھ کر کہا۔

"رو تو رہی ہو۔" وہ بولا۔

"کیوں کیا صفر کا غم ہے۔" ایللی نے اسے طعنہ دیا۔

شہزاد کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔ "ایللی" وہ بولی "مجھے اس کا طعنہ نہ دیا کرو۔"

"کیوں کیا جھوٹ ہے۔" ایللی نے پوچھا۔

"نہیں جج ہے۔" وہ بولی "لیکن —"

"لیکن کیا؟"

"اس کا ساتھ دے کر میں نے اپنے آپ کو لوگوں کی نگاہ سے گرا دیا۔ میں خود اپنی نگاہ سے

مگر گئی ہوں۔"

"کیوں" ایللی نے پوچھا "کیا میرا ساتھ دے کر تم لوگوں کی نگاہ سے نہیں گری تھیں۔"

"نہیں" بولی۔

"بدنام نہیں ہوئی کیا؟"

"ہوئی ہوں۔ لیکن میں ذلیل نہیں ہوئی۔ انا مجھے فخر ہے کہ میں نے تمہارا ساتھ دیا۔"

"یہ کیا دلیل ہوئی؟" ایللی نے پوچھا۔

"مجھے نہیں پتہ کیوں بدنامی کے باوجود میری تذلیل نہ ہوئی بلکہ میری گردن لوہی رہی۔"

لوگ باتیں کرتے رہے۔ جکتے رہے میں نے ذرا بھر پروا نہ کی۔ لیکن چھوٹے آدمی کو نہ لگا کر

ذلیل ہو گئی۔ شہزاد کے منہ سے بے ساختہ ایک دہی ہوئی ہنسی نکل گئی۔ ایللی حیران تھا اس نے
شہزاد کو ایسی بے بسی اور خود ترسی کی حالت میں کبھی نہ دیکھا تھا۔

لبن کچھ دیر کے بعد اس دہری کا ایللی کے دل پر عجیب سا رد عمل ہوتا۔ اس کے دل میں
کے حلق عجیب و غریب شبہات پیدا ہوتے۔ شاید اس وقت جب میں شہزاد کے پاس تھا۔
کسی اور کو دوسرے کمرے میں چھپا رکھا ہو۔ شاید میرے علی پور سے جانے کے بعد
ابھی دروازہ کسی دوسرے کے لیے بھی کھلتا ہو۔ شاید بیک وقت وہ کئی ایک سے کھیل
رہا ہو۔

پہلے کے دل میں شبہات یوں جھنسناتے جیسے طوائف کی دکان پر کھیاں جھنسناتی رہیں۔ اس کی
پانچ عجیب و غریب مناظروں آکھڑے ہوتے جیسے وہ خیالی نہیں بلکہ حقیقی ہوں۔ "پھر
نہ گارو اسے اپنی چنگل میں لے لیتا اور وہ کرب سے ترنہا۔ یہ کرب اس حد تک شدت
پر لیتا کہ ایللی کا سانس بند ہو جاتا۔ دل ڈوبنے لگتا اور سینہ پھٹنے لگتا۔ شاید یہی جذبہ رقابت
میں اس کے لیے تازیانہ بن جاتا۔

اس رات شہزاد کے گھر سے واپس آنے کے بعد اسے احساس رقابت کا شدید دورہ پڑ گیا۔
ابھی سے سب لوگ جا چکے تھے۔ عورتوں نے کھڑکیاں بند کر لی تھیں محلے پر سناٹا چھایا ہوا
نومنگی کی منڈیر کے پاس مابھا کا غلیظ ڈھیر لگا تھا۔ سامنے کی دیوار کے قریب تن کے ساتھ
انہی شیدائی بندھا ہوا تھا۔ ایللی جوش رقابت سے کروٹیں بدل رہا تھا۔ عین اسی طرح
رے کے بند کھولنے کی کوشش میں مصروف تھا۔

دلتا ایللی کو خیال آیا۔ اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔
ابھی کی دیوانہ وار جدوجہد سے ایللی کو یہ شبہ گزرا کہ وہ اس قید سے مخلص پانے کے لیے
رہنمائی کر رہا۔ بلکہ مابھا کے تعفن کی لذت کا ایندھن اسے مجبور کر رہا ہے کہ وہ اپنا آپ
رہنمائی غلط بھرے کنوئیں میں چھلانگ لگا دے۔ اگر وہ انہی کو کسی ایسی جگہ باندھے جہاں
بنا کا قرب حاصل کرنے کا امکان نہ ہوتا تو غالباً وہ صبح تک چپ چاپ دیوار سے لگا کھڑا

ایلی نے محسوس کیا کہ ان دونوں میں کتنی مناسبت تھی۔ دونوں ہی مابھا کے دیوانے تھے۔
رہا اتنا تھا کہ اس مابھا سے خوشبو آتی تھی۔ وہ گونگی تھی اس کے تکلم میں شوخی تھی۔
لی چاہتا تھا کہ وہ بے پاؤں اتر کر اس مابھا کے دیوانے کو کھول کر آزاد کر دے، لیکن پھر خیال
لا رہا جو اس کے گرو لپٹا ہوا تھا۔ اس کا بندھن نہ تھا۔ اس کا بندھن تو مابھا تھی، اس

نیچے سے کسی نے جواب دیا۔
سامنے جنگل سے شیم چلائی "شہزاد یہ ساتھ کے چمنائے کھڑی ہو۔" شہزاد قہقہہ لگا کر ہنسی۔
"جانوں تو نہیں" شیم نے پوچھا۔

"لو تم بھی حد کرتی ہو۔ بھلا جانوں کو بغل میں دبانے کو کس کا جی چاہے گا۔"

میدان میں پھر شور مچ گیا۔ وہ اسے لوہے کی نال سے باندھ رہے تھے۔

"یہ ٹھیک ہے، یہ ٹھیک ہے۔" وہ چلا رہے تھے۔

"رات بھر تو یہاں تن سے بندھا رہے صبح بات کریں گے۔"

ہر کوئی اپنا اپنا مشورہ دے رہا تھا۔

ایللی سوچ رہا تھا ایک دن وہ بھی اسی طرح پکڑا جائے گا۔ اور وہ سب اس کے منہ پر تھوکیں
گے۔

"میں چلتا ہوں۔" وہ گھبرا کر بولا۔

"نہ جاؤ۔" وہ بولی۔ "مجھے ڈر لگتا ہے۔"

"تمہیں ڈر لگتا ہے کیا؟ تمہیں؟"

"ہاں" وہ بولی "اب تو ہر بات پر ڈر لگتا ہے۔"

"اور اس وقت تو یوں بڑھ کر کھڑی ہو۔"

"اس وقت تم جو ہو سو ہو۔ تم ساتھ ہو ایللی تو میں کسی سے نہیں ڈرتی۔ کسی سے نہیں۔"

"آہستہ بولو۔" وہ چلایا "کوئی سن لے گا۔"

"پڑا سن لے۔" وہ بولی "اس دوزخی سے نجات ملے۔"

"یہ کون ہے تمہارے ساتھ۔" میں نے پوچھا۔

"سہیلی ہے میری" وہ ہنس کر بولی۔

"تیری سہیلیوں کا بھی شمار نہیں لڑکی۔" میں بولی۔

ایللی پھر گھبرا گیا۔ اس نے جھٹکا دے کر اپنا ہاتھ چھڑا لیا اور بھاگ کر چلا آیا۔
شہزاد کی دیدہ دہری کو دیکھ کر ایللی بے حد خوش ہوتا تھا شاید اس لیے کہ اس کی دہری میں
عجب سی رہنمائی کی جھلک ہوتی تھی یا شاید اس کی یہ وجہ ہو کر ایللی خود بے حد ڈر پوک واقع ہوا
تھا۔ اس لیے وہ دوسروں کی دہری سے بے حد متاثر ہوتا تھا۔

کافقن تھا۔

چاہے کچھ بھی ہو اس نے سوچا اور چپ چاپ اٹھ کر دروازہ کھول کر نیچے اتر گیا۔ میدان میں پہنچ کر اس نے تل کی طرف دیکھا۔ وہاں کوئی نہ تھا۔ بھاگ گیا۔ اس نے سوچا۔ ڈر کر ہل گیا۔ وہ واپس اوپر آگیا اور بستر پر لیٹ گیا۔

دفعۃً اس کی نگاہ میدان پر پڑی۔ مابھا کے ڈھیر کے قریب ہی ایک اور ڈھیر اس کی طرف آہستہ آہستہ سرک رہا تھا۔

وہ چپکے سے لیٹ گیا۔ جیسی کوئی بات ہی نہ ہو۔

دور مابھا دور، دور، دور کر کے کسی کتے کو دھتکار رہی تھی۔

محلے کی چمکادیں جیج رہی تھیں۔ دور بہت دور کوئی گاڑی ہو نک رہی تھی۔

نہ جاؤ نہ جاؤ

ایک روز رات کے ایک بجے کے قریب شہزاد کی طرف جاتے ہوئے جب وہ ہاجرہ کی چارپائی کے قریب پہنچا تو ہاجرہ دفعۃً چونک کر بیدار ہو گئی اس نے چارپائی سے ایک دست لگایا اور آکر ایلی کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے پوچھا۔

ہاجرہ کے جاگنے پر ایلی قطعی طور پر نہ گھبرا یا۔ چونکہ وہ رات کو اکثر اٹھ کر پیشاب کرنے کا عادی تھا۔ بچپن ہی سے ایلی کو مسلسل ابول کی شکایت تھی۔ سہمی جانتے تھے۔ کہ وہ بار بار پیشاب کرنے کا عادی ہے اگر ہاجرہ نے اسے دیکھ لیا تو اس میں گھبراہٹ کی کوئی بات نہ تھی۔

”کیوں کیا بات ہے؟“ ایلی نے دوبارہ پوچھا۔

ہاجرہ کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس کے چہرے پر خوف و ہراس چھایا ہوا تھا۔

”تم اوھر نہ جاؤ ایلی“ ہاجرہ نے ہاتھ جوڑ کر کہا۔

”کدھر“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”میں تمہاری منت کرتی ہوں“ وہ اپنی ہی دھن میں بولتی گئی۔ دیکھو میں پاؤں پڑتی ہوں۔“

”لیکن کس لیے اہل“ ایلی تنک کر بولا۔

”نہ بیٹا میری بات مان لے۔“

”آخر بت کیا ہے؟“

”مجھے انہوں نے سب کچھ بتا دیا ہے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”بس نے بتا دیا ہے۔ کیا بتا دیا ہے۔“ اس نے پوچھا۔

”مافی صاحب نے۔“ بولی۔

”کون مافی صاحب؟“

”نہ بیٹا“ وہ بولی۔ ”آہستہ بول۔ سب جاگ انھیں کے کیا فائدہ۔“

”لیکن اہل مجھے کچھ پتہ بھی چلے۔“

”اوھر آ۔ اوھر میں تجھے بتاؤں“ وہ اسے ملحقہ کمرے میں لے گئی۔

”مافی صاحب میرے مرشد ہیں“ وہ بولی ”وہ بڑے کامل بزرگ ہیں۔ ابھی ابھی انہوں نے

بہنو ذکر جگایا اور کہنے لگے ایلی اوھر جا رہا ہے۔ اسے روک لے۔ اور میں گھبرا کر جاگ پڑی

یاد رکھتی ہوں کہ تم کھڑے ہو۔“

ایلی قہقہہ مار کر ہنس پڑا۔ ”اہل تم بھی حد کر دیتی ہو۔ وہ بولا ”کون جا رہا ہے کہاں جا رہا

۔ میں نے تو پیشاب کرنے کے لئے اٹھا تھا تمہارے مرشد کو غلطی لگی ہے۔“

”نہ نہ نہ“ ہاجرہ چلائی ”ایسا نہ کہو۔ تم نہیں جانتے۔ تمہیں معلوم نہیں۔“

”تو نہیں ہو گا“ ایلی بولا ”اب آرام سے سو جاؤ۔“

اس کے بعد دیر تک ایلی جاگتا رہا۔ لیکن اسے شک تھا کہ ہاجرہ ابھی جاگ رہی ہے۔ اس

ارشد نے کیا کڑ بڑ ڈال دی تھی۔ خواہ مخواہ پھر جب ہاجرہ خرائے لینے لگی تو ایلی نے دیکھا کہ

ایلی تجھے ہے اور اوھر جانا بالکل بے کار تھا۔ لہذا اس نے اوھر جانے کا خیال ترک کر دیا۔

اگلے روز ہاجرہ ایلی کو فرحت کے ہاں لے گئی اور ابتدائی خاطر تواضع اور منتیں کرنے کے

کے گئی ”ایلی میری ایک بات مان لے صرف ایک بات اس کے بعد جو جی میں آئے کرنا۔

گو نہیں کہوں گی۔ صرف ایک بات مان لے میری خاطر۔“

”کیا بات ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مافی جا کر مافی صاحب کی بیعت کر لے۔ بس اور کچھ نہیں۔“

”بیعت“ ایلی نے حیرت سے پوچھا ”وہ کیا ہوتی ہے۔“

”لگ بھگ ہوتی ہے۔“ وہ بولی ”چاہے کچھ بھی ہو وہ تو کر لے۔“

”اے تو بھی پاگلوں سی باتیں کرتی ہے۔“ فرحت نے کہا۔

”چلو میں پاگل ہی سہی۔“ ہاجرہ نے کہا۔

ایلی رضامند ہو گیا۔ نہ جانے اس کے دل میں کیا خیال آیا۔ ویسے عام طور پر وہ ہاجرہ کی بات سن کر ہنس دیا کرتا تھا۔ لیکن اس روز نہ جانے کیا ہوا۔ بولا ”بس اتنی سی بات ہے چلو میں بھی اس مرشد کی زیارت کر آؤں جو آدمی رات کے وقت آکر اہل کو الٹی سیدھی باتیں بتا کر پریشان کرتا ہے۔“

اس بات پر ہاجرہ اس قدر خوش ہوئی کہ وہ سب کچھ بھول گئی اس نے فوراً ”روپے کا انعام کیا اور دوڑی دوڑی جلیل کے پاس پہنچی۔ جلیل آصفیہ کا بیٹا تھا۔ جو ہاجرہ کی سہیلی بہن کی لڑکی تھی۔

اب جلیل وہ جلیل نہ تھا جس سے کسی زمانے میں ایلی واقف تھا۔ جب وہ مفتی نور یوسف مل کر ان کے ہاں جایا کرتے تھے اور جلیل آنکھیں بنا بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا جو ان کی بیشک کے متصل کی گلی میں جھانڈو دیا کرتی تھی۔ اور پھر وہ یوسف کو بتایا کرتے تھے اور وہ جانا تھا اور بازی گروں کی طرح فلا بازیاں لگاتا جسے دیکھ کر لڑکی بے حد محظوظ ہوتی تھی۔

اب جلیل کا طرز زندگی بدل چکا تھا۔ اس نے داڑھی رکھ لی تھی۔ باقاعدہ نماز پڑھا کرتا تھا۔ جلیل نے بھی انہی حاجی صاحب کی بیعت کر لی تھی۔ اس کی تبدیلی اس قدر حیرت انگیز تھی کہ اس کا چہرہ تک بدل گیا تھا۔ شاید ہاجرہ کا خیال تھا کہ حاجی صاحب سے بیعت کر لینے کے بعد ایلی بھی داڑھی رکھ لے گا۔ نماز پڑھنے لگے گا اور اس کی زندگی بھی یکسر بدل جائے گی۔

اگلے روز جب ایلی شہزاد سے ملا تو اس نے اہل کی ساری بات سنائی۔ وہ ہنسنے لگی۔ ”بیچاری ہاجرہ۔“ وہ بولی۔ ”اے علم نہیں کہ ہمارا بالکا کسی اور کامرید نہیں بن سکتا حاجی صاحب جتنا چاہے زور لگالیں۔ ڈھاک کے وہی تین پات رہیں گے۔“

”لیکن یہ بیعت کیا ہوتی ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”مجھے کیا پتہ۔“ وہ بولی ”ہاجرہ تو مجھے بھی مجبور کر رہی تھی۔“

”کس لئے؟“

”کہ میں بھی بیعت کر لوں حاجی صاحب کی۔ مجھ سے ہاجرہ نے کہا۔ رابعہ نے اصرار کیا۔ رفتی نے منہیں کیں۔ ان دنوں حاجی صاحب یہیں آئے ہوئے تھے۔ علی پور میں۔ اور یہ سب

ایلی کے گرد بیعت کی بھیڑ لگائے بیٹھے تھے جیسے تماشے بٹ رہے ہوں۔“

”تو پھر تم نے کیوں نہ کی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پہلے سے ہی نہ کی ہوتی تو کر لیتی۔“ وہ بولی۔

”پہلے سے کی ہوئی ہے تم نے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔

”بس کی۔“

”تمہاری اور کس کی۔“ وہ اس کے قریب تر ہو گئی۔ ”مجھے اتنا زبردست مرشد ملا ہے کہ ہر کسی اور کی طرف توجہ نہیں ہو سکتی۔“

لی

اگلے روز ایلی جلیل کے ساتھ دلی روانہ ہو گیا۔

دلی میں وہ غلام احمد کے گھر ٹھہرے۔ غلام احمد ان کا عزیز تھا۔ وہ نوجوان تھا۔ خوش شکل تھا اور نگین مزاج واقع ہوا تھا۔ اسے گانے کا بہت شوق تھا۔ اور جب وہ گاتا تو اس کا چہرہ کسی انجانی بچے سے منور ہو جاتا۔ اسے بہت سے گیت یاد تھے۔ خصوصاً ”ایسے گیت جن کی دھنیں چلنت نہیں۔ اور گاتے ہوئے سناں بندھ جاتا تھا۔ دلی پہنچتے ہی جلیل نے کہا کہ وہ اسی شام حاجی صاحب کی طرف جائیں گے۔

غلام احمد نے قہقہہ لگایا۔ بولا ”شام کے وقت بزرگوں سے ملنے کا وقت نہیں ہوتا۔ بہتر ہے کہ آپ انہیں کل صبح ملیں۔“

پھر وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولا ”چلو بھائی صاحب۔ آج شام کو دلی کی سیر رہے۔“

جب جلیل نماز پڑھنے کے لئے چلا گیا تو احمد نے ایلی کو کہنی ماری ”بھل تو بھائی صاحب آپ بقدر طور پر مرید بن جائیں گے۔ پھر تو دنیا ہی بدل جائے گی۔ آج آخری مرتبہ ذرا آزادی سے لہو لہرو۔ آؤ دلی کی یاںکیاں دکھائیں تمہیں۔“

ابو ایلی کو لے کر چاوڑی جا پہنچا۔ پہلے تو اس نے سارے بازار کا جائزہ لیا۔ پھر یاری یاری گلیوں پر چڑھنا شروع کر دیا۔ شروع شروع میں تو ایلی گھبرایا لیکن جب اس نے دیکھا کہ ہر گلی پر لوگ احمد کو بڑے تپاک سے ملتے ہیں اور یوں باتیں کرتے ہیں جیسے مدت کی جان پہچان

ہو۔ تو وہ مطمئن ہو گیا۔

دلی کی طائفہ کو دیکھ کر ایلی بہت حیران ہوا۔ طائفہ تو اس نے لاہور اور امرتسر میں بھی دیکھی تھیں لیکن یہاں بات ہی کچھ اور تھی۔ انہیں دیکھ کر یہ محسوس نہیں ہوتا تھا کہ وہ کسبیاں ہیں اور بازار میں کاروبار کے لئے بیٹھی ہیں۔

ان کی گفتگو نہایت سنجیدہ تھی۔ انداز میں نمائش نام کو نہ تھی بلکہ ایک عجیب سے لاسٹنہ اور گھریلو انداز کی آمیزش تھی۔ احمد صرف ان بیٹھکوں پر جاتا تھا جہاں محفل نہ لگی ہو تاکہ اطمینان سے بیٹھ کر باتیں کرنے کا موقع ملے۔ دو ایک سے اس نے گلے کی بھی فرمائش کی۔ ان کا گفتگو کس قدر پیارا تھا۔ چونکہ اس وقت وہ رسمی ساز کے شور و شغب سے پاک تھا۔ وہ یوں بیٹھی گاری تھی جیسے کوئی گھر والی ہنڈیا پکاتے ہوئی گنگنا رہی ہو۔

ہو کے رہے گا

اگلے روز صبح سویرے جلیل اور ایلی حاجی صاحب کی طرف چل پڑے۔

دیر تک وہ ملی ماراں کی گلیوں میں گھومتے رہے۔ آخر ایک مکان پر پہنچ کر جلیل نے دھک دی۔ ایک نوجوان لڑکا باہر نکلا اور انہیں ایک کمرے میں بٹھا کر اندر چلا گیا۔ پندرہ منٹ کے بعد حاجی صاحب تشریف لائے۔

ان کا قہہ درمیانہ تھا۔ عمر چالیس سے متجاوز۔ رنگ گندمی تھا۔ خدوخال نستعلیق تھے جسم دھلا پتلا۔ چہرے پر جلال اور دب دے کی بجائے بے بسی اور عجز چھایا ہوا تھا۔ البتہ ان کی سرے سے بھری ہوئی آنکھیں بے حد منور اور نرم آلود تھیں اور ان کا سر حرکت کر رہا تھا۔

”کیا یہ ہیں — حاجی صاحب؟“ ایلی نے اپنے آپ سے کہا اور اس کے دل سے خوف اور گھبراہٹ دور ہو گئی۔ اس نے محسوس کیا کہ حاجی صاحب ایک انسان ہیں۔ نہ تو دیوتا یاں اور نہ پیر یا دلی! ان سے بات کی جاسکتی ہے اور ان کی بات کٹلی جاسکتی ہے۔

جلیل حاجی صاحب سے باتیں کر رہا تھا اور ایلی سوچ رہا تھا۔

جلیل سے باتیں کرنے کے بعد حاجی صاحب ایلی کی طرف متوجہ ہوئے۔

”آپ کے مزاج اچھے ہیں۔ اور سب طرح خیریت ہے۔ جملہ متعلقین اچھے ہیں۔ تم بھی

آپ کہاں ملازم ہیں۔“

انہوں نے ایسے بیسیوں سوال کر ڈالے۔ اور ایلی رسمی طور پر ان کے جوابات دیتا چلا گیا۔ پھر حاجی کے ہمراہ جامع مسجد کی طرف چل پڑے۔

پھر قدم کے بعد کوئی نہ کوئی راہ گیر حاجی صاحب کو جھک کر سلام کرتا اور وہ بڑے اخلاق اس سے باتیں کرتے اور پھر جلد ہی رخصت طلب کر کے آگے چل پڑتے۔ ان کا سراپی حرکت کر رہا تھا۔ جیسے گردن اور سر کے درمیان ایک زم تار لگا ہو جو سر کے بوجھ کی وجہ سے جھول رہا تھا۔

جامع مسجد پہنچ کر حاجی صاحب نے وضو کیا۔ پھر ایلی سے کہا۔

”جیلانی وضو کر لو۔“

ایلی کو وضو کرتے دیکھ کر حاجی صاحب خاموش رہے۔ جلیل نے ایلی کو ٹوکا۔

”تو نہیں۔“ جلیل بولا ”ایسے نہیں بلکہ —“

حاجی صاحب نے جلیل کی بات کاٹ کر کہا۔

”میں کرنے دیجئے جیسے بھی یہ کر رہے ہیں ٹھیک ہے۔“

ایلی نے حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔ یہ عجیب پیر ہے جو احکام صلوات نہیں کرتا۔ ای کی آواز اس قدر مدہم ہے۔ پیروں کی آواز تو حلق کے نچلے پردے سے نکلا کرتی ہے اور آواز نہ ہوتا ہے۔ یہ تو بڑے ملائم انداز سے بات کر رہا ہے جیسے معذرت کر رہا ہو۔ بلکہ اس کا نام تر و جوانی معذرت ہے۔

ایلی کو خشک پڑنے لگا کہ وہ پیر نہیں بلکہ کوئی تاجر ہے جس نے پیری مریدی کا دھندا چلا رکھا ہے۔ پیر تو ہونے والے مریدوں کو ڈانٹتے ہیں۔ دھمکاتے ہیں۔ ایلی کو براہ راست کسی پیر سے مل نہیں پڑا تھا۔ اسے معلوم نہ تھا کہ پیر کیسے ہوتے ہیں۔ لیکن نہ جانے کیسے اس نے اندازہ لگایا کہ پیر بڑے بارعب اور جلالی ہوتے ہیں اور مریدوں پر حکمرانی کرتے ہیں۔

باہر

بہر حال اسے یقین ہو گیا کہ حاجی صاحب نے پیر بننے کا ڈھونگ رچا رکھا ہے۔ وضو کرنے کے بعد انہوں نے ایلی کو اپنے رویہ بٹھایا۔ اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لئے اور کچھ

رہا نہیں تو بسم اللہ۔“

”بت خوب۔“ حاجی صاحب نے کہا۔ اور از سر نو اس کے ہاتھ تھام کر بیٹھ گئے۔

”ایک بات اور ہے۔“ ایلی نے پھر انہیں ٹوکا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ اس کی طرف متوجہ ہوئے۔

”اس وقت میرے دل میں سپردگی یا حوالگی کا جذبہ موجود نہیں ہے۔“

حاجی صاحب نے پیار بھری نگاہ سے ایلی کی طرف دیکھا اور پھر آنکھیں بند کر کے بیٹھ گئے۔

پار ایک منٹ وہ یونہی چپ چاپ بیٹھے رہے۔ پھر انہوں نے سر اٹھایا۔ ان کی آنکھوں کی چمک

کمزور بڑھ گئی تھی۔ اور چہرے پر ایک عجیب قسم کی مسرت پھیلی ہوئی تھی۔

وہ جلیل سے مخاطب ہوئے۔

”جلیل صاحب۔“ وہ بولے۔ ”آپ والدہ محترمہ کو میرا سلام دیں۔ ان سے کہیں کہ آپ

میں عزم کی تقیل کر دی گئی۔ لیکن ان سے کہہ دیں کہ۔۔۔“

جلیل نے ان کی بات کاٹ کر کہا ”لیکن حاجی صاحب بیعت۔۔۔“ اور پھر با معنی انداز

میں ایلی کی طرف دیکھنے لگا۔ ”کوئی بات نہیں۔“

وہ بولے ”ایلی صاحب ہمارے دوست ہیں۔ مخلص ہیں اور ہم اپنے دوست سے کوئی بات

چھپا کر نہ کریں گے۔“

ایلی نے پھر حیرانی سے حاجی صاحب کی طرف دیکھا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ ایلی سے مخاطب ہو کر بولے۔ ”چونکہ ہمارے دل میں آپ کی دوستی

کی خواہش ہے لہذا اس خواہش کی وجہ سے ہم اپنے آپ کو آپ کا دوست سمجھتے ہیں۔ چاہے

آپ کے دل میں ایسی خواہش ہو یا نہ ہو۔ آپ کے دل میں بھی پیدا ہو جائے گی۔ انشاء اللہ

بکھینچے گا۔ مگر آپ کے دل میں اللہ کی دوستی کی خواہش پیدا ہو جائے تو یقیناً آپ اللہ کے دوست

بن جائیں گے۔ خواہش بڑی چیز ہے ایلی صاحب۔۔۔ ہاں تو جلیل صاحب آپ والدہ محترمہ

سے کہہ دیں۔“ حاجی صاحب نے جلیل سے مخاطب ہو کر کہا۔ ”ان سے کہہ دیں کہ جو ہوتا ہے

لو کر رہے گا۔ ہمارا مطلب ہے جس بات کا والدہ محترمہ کو ڈر ہے وہ ہو کر رہنے والی ہے۔ جو اللہ

کو منظور ہے وہی ہو گا۔ ڈرنے کی بات نہیں۔ اللہ بستر کرے گا۔ اسی میں بہتری ہے۔“

”اور“ حاجی صاحب نے کچھ وقفے کے بعد کہا۔ ”والدہ محترمہ سے کہیں کہ ابھی وقت

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”جی فرمائیے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”یہ آپ کیا کر رہے ہیں۔“

”آپ کی والدہ کے حکم کو بجالا رہا ہوں۔“ وہ بولے۔

”لو سن لو۔“ ایلی نے سوچا۔ ”اپنے مرید کا حکم بجالا رہا ہے۔ کسی میرے کبھی مرید کے

متعلق ایسی بات کی ہے کیلہ لاجول ولا قوت۔“

”پھر بھی۔“ ایلی نے پوچھا ”اس عمل کو کیا کہتے ہیں۔“

”اسے بیعت کہتے ہیں۔“

”بیعت کیا ہوتی ہے۔“

”بیعت ایک تعلق ہوتا ہے جسے دوستی ہوتی ہے۔“

”دیکھئے حاجی صاحب۔ میں ایک بات واضح کر دینا چاہتا ہوں۔“

”فرمائیے۔“

”اگر آپ اپنی طاقت سے مجھے نیک بنا دیں تو مجھے ایسی نیکی مطلوب نہیں۔“

”کیوں۔“ انہوں نے مسکرا کر پوچھا۔

”میں وہ نیکی چاہتا ہوں جو میرے دل سے نکلے۔ کسی کی بخشش ہوئی نہ ہو۔“

وہ ہنسنے لگے۔

”سبحان اللہ۔ سبحان اللہ آپ بہت سمجھدار ہیں۔“

”ارے۔“ ایلی حیرت سے ان کی طرف دیکھنے لگا ”یہ تو بالکل ہی تاجر ہے۔“

”مگر آپ اپنی نیکی اور عبادت کے زور سے مجھے اللہ سے ملا دیں۔“ ایلی نے کہا ”تو مجھے

مجھے منظور نہیں۔ ملنا ہے تو میں اپنے زور پر ملوں گا۔ اس کے علاوہ“ وہ بولا ”میں نہیں چاہتا کہ

بدلوں۔ میں اسی طرح رہنا چاہتا ہوں۔ جیسا کہ ہوں۔“

”بہت اچھے۔ بہت اچھے۔“ وہ بولے۔ ”نہایت اچھے خیالات ہیں آپ کے۔“

”ارے۔“ ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ ”بالکل ہی بنیاد میں کامرشد ہے۔“

”باقی رہا تعلق کا سوال۔“ ایلی نے کہا ”تو ابھی میرا اور آپ کا تعلق پیدا نہیں ہوا۔ تعلق تو

دل کی بات ہے جو آہستہ آہستہ پیدا ہوتا ہے اور پھر بڑھتا ہے۔ اگر آپ والدہ صاحبہ کا فریاد پورا

نہیں آیا — وقت آئے گا۔ ضرور آئے گا اور بہت اچھا ہو گا۔ بہت اچھا۔ انشاء اللہ اہلی صاحب کے خیالات بہت بلند ہیں۔ انشاء اللہ بہت اچھا ہو گا۔ گھبراہٹیں نہیں۔ ایک وقت آئے گا جب اہلی صاحب بہت اچھے لوگوں سے ملیں گے۔ ان کی خوشنودی حاصل ہو گی۔ انشاء اللہ۔

جادو کی مرہم

اسی روز شام کے وقت وہ دوبارہ حاجی صاحب سے ملے تو وہ تیار بیٹھے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی بولے۔

”جلیل صاحب۔ آپ آگئے۔ اچھا کیا آپ نے۔ اب آپ نماز سے فارغ ہو لیں۔ جب تک میں اہلی صاحب کو دلی کی سیر کرا لوں۔ کیوں اہلی صاحب۔ آپ دلی کی سیر کریں گے۔ آئیے۔“

اہلی نے پھر حیرت سے اس عجیب و غریب پیر کی طرف دیکھا۔ درحقیقت اب وہ قطعی طور پر بھول چکا تھا کہ حاجی صاحب پیر، دلی یا اللہ لوک ہیں۔ اب وہ انہیں تاجر بھی نہیں سمجھتا تھا۔ نہ ہی بنیا۔ اب حاجی صاحب اس کے نزدیک ایک خوش مزاج با اخلاق اور اخلاص سے بھرانا انسان تھا۔

وہ دونوں چل پڑے۔

اہلی حیران تھا کہ یہ منحنی سرحد چشم نحیف و زار آدمی اسے کہاں لے جائے گا۔ وہ بھلا اسے دلی کی کیا سیر کرا سکتا ہے۔ دلی کی سیر تو احمد نے کرائی تھی۔ واہ واہ کیا چیزیں دکھائی تھیں۔ لیکن احمد کے ساتھ جانے میں ایک قباحت ضرور ہوئی تھی۔ احمد کا طائفہ کے ساتھ کچھ ایسا طرز عمل تھا کہ یوں محسوس ہوتا تھا جیسے وہ ان کا بھڑوا ہو۔ وہ اسے اہمیت ضرور دیتی تھیں لیکن ایسی اہمیت جیسے بھڑوے کو دی جاتی ہے۔ وہ اس سے یوں بات کرتی تھیں جیسے وہ ان کا دوست نہ ہو بلکہ ہم کار ہو۔

”آپ نے دلی کی سیر کی ہے کیا۔“ حاجی صاحب نے پوچھا۔

اہلی چونکا۔ ”جی ہاں۔“

”کون کون سی جگہ دیکھی ہے۔“ وہ بولے۔

”جی چلوڑی میں گیا۔“

اہلی کا جواب سن کر حاجی صاحب چونکے۔
”خوب۔“ وہ بولے۔

”ہاں آپ نے کبھی چلوڑی کی سیر کی ہے۔“ اہلی نے پوچھا۔
”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”ہم تو بھائی دیں رہا کرتے تھے۔“
”وہاں رہا کرتے تھے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کیمٹ کی دکان تھی۔ ٹکٹے میں بیڈ آفس تھا۔ بمبئی اور دلی میں برا نہیں تھے۔“

”اگر۔“ اہلی چونکا۔ ”تو کیا کھانا پڑ گیا۔“

”میں تو۔“ وہ بولے۔ ”بس چھوڑ دیا کاروبار۔“

”کیوں۔“ اس نے پوچھا۔

”اللہ میاں نے اپنی طرف بلا لیا۔“

”اللہ میاں سے دوستی ہے کیا۔“

”نہیں۔“ وہ مسکرائے۔ ”ابھی تو معمولی جان پہچان ہوئی ہے۔“

”ایک بات پوچھوں۔“ اہلی نے کہا۔

”ضرور پوچھئے۔ جو جی چاہی پوچھئے۔“

”اللہ میاں کیسے ہیں۔“

”بہت پیارے ہیں۔“ انہوں نے جواب دیا۔ ”بہت ہی پیارے۔“

”وہ تو بہت سخت ہیں۔“ اہلی نے کہا۔

”اللہ صاحب مسکرائے۔“ سخت ہوتے تو کیا ہم سب اس قدر بگڑے ہوئے ہوتے۔“

”ایسا کو یہ خیال کبھی نہ آیا تھا۔ اس نے اس زاویے سے اللہ تعالیٰ کو کبھی نہ دیکھا تھا۔ اس کے نزدیک اللہ تعالیٰ ایک عظیم ہستی تھی۔ بے نیاز۔ بے پردہ!“

”اہلی صاحب!“ وہ بولے۔ ”اللہ تعالیٰ سے دوستی کر کے دیکھو۔ اس قدر مخلص دوست مل سکتا۔“

”میں اس قابل نہیں۔“ اہلی نے جواب دیا۔

”قابلیت اور اہلیت وہ خود عطا کرتے ہیں۔“ حاجی صاحب نے کہا ”صرف ان کی دوستی کی

خواہش پیدا کرو۔ صرف خواہش۔“

”خواہش تو خود پیدا ہوتی ہے زبردستی پیدا نہیں کی جاسکتی۔“ ایلہ نے کہا۔

”تو یہ خواہش ان سے مانگو۔ اللہ میاں سے یا راندہ خوبصورت سے خوبصورت عورت کے یارانے سے کہیں زیادہ رنگین ہے۔“

حاجی صاحب کی باتیں عجیب تھیں۔ ایلہ سوچ میں پڑ گیا۔ اس شخص کا تخیل کس قدر رنگین ہے۔ اس کی غناک نگاہ میں کتنی وسعت ہے۔

”کیا آپ نے کبھی عورت سے بھی یارانہ لگایا تھا۔“ ایلہ نے پوچھا۔

وہ مسکرائے۔ ”ہاں ہاں۔“

”مجھے بتائیے۔“ ایلہ بولا۔

”ہم نے ایک مرہم بنایا تھا۔“

”کیسا مرہم۔“

”ہم نے بہت سی ادویات سے ایک مرہم تیار کیا اور پھر سات روز ایک وظیفہ کیا ایسے مقام پر وظیفہ کیا تھا جو لائق و دوق ویرانہ تھا۔ بمبئی میں سمندر کے ساحل کے پاس ایک پرائیویٹ ہاؤس تھا جو مسماں ہو چکا تھا۔ اس میں بیٹھ کر ہم نے وظیفہ پڑھا اور پھر مرہم مکمل ہو گیا۔ وہ وظیفہ بھی اس مرہم کا ایک جزو تھا۔

”لیکن وہ مرہم کیوں بنایا آپ نے۔“

وہ مسکرائے۔ ”بھائی نوجوان تھے۔ عورتوں کا شوق تھا۔ ان دنوں جی چاہتا تھا کہ ایسا جہاں لگے کہ جس عورت سے آنکھ چار ہوں وہ دل و جان سے ہم پر ٹار ہو جائے۔ ان دنوں جولی کا جوش تھا۔ روپیہ عام تھا۔ صحت ماشاء اللہ جو بن پر تھی۔ عاشق مزاج لڑکپن ہی سے تھے۔“

ایلہ سننے لگا۔ وہ بالکل بھول گیا کہ یہ وہی حاجی صاحب ہیں جن کی بیعت کرنے کے لئے وہ

علی پور سے دلی آیا تھا۔

”مرہم کا نسخہ ہمیں بڑی تلاش سے ملا تھا۔“ حاجی صاحب نے پھر قصہ بیان کرنا شروع کیا۔ ”ایک سادھو سے ہمیں یہ نسخہ ملا بہت گہنی قسم کا سادھو تھا۔ اس نے سالہا سال تپس کی تھی لیکن گہنی ہونے کے باوجود بڑا مہوجی آدمی تھا۔ میں نے صبح شام اس کی خدمت کی تو ایک روز بولا۔

”اے عقل کے اندھے۔ مانگا بھی تو کیا مانگا تو نے۔ بھگوان کے دامن مانگا۔ یہ نہیں تو

مانگنے کی بدھی مانگنا۔ اس سے تو یہی اچھا تھا کہ سندر تا بھری نار بننے کی رکشا کرتا۔ نار میں ہلاکتی ہے اگر کچھ بننا ہو تو محبوب بنو۔ عاشق نہ بنو۔ لگن نار مانگی تو کیا مانگا۔ اپنے آپ کو بھسم کر لو تو کیا ہو گا؟ اچھا اب جو مانگا ہے وہی پاؤ گے۔“

ایلہ حیرت سے حاجی صاحب کی بات سن رہا تھا۔

”ہیں تو ایلہ بھائی ہم نے وہ مرہم بڑی محنت سے تیار کیا۔ اس مرہم کی خاصیت یہ تھی کہ ہر ایک سلائی آنکھ میں لگا کر جس عورت کی آنکھوں سے آنکھیں ملاؤ۔ وہ تمہارے پیچھے چلے گی۔ تمہاری گرویدہ ہو جائے گی۔“

”اچھا تو پھر آپ نے وہ مرہم آزمائی۔“ ایلہ نے پوچھا۔

”صرف ایک بار۔“ وہ بولے۔

”اس کا اثر ہوا۔“

”ہاں۔ اس قدر اثر ہوا۔ اس قدر اثر ہوا کہ۔۔۔“ وہ رک گئے۔

لب خالی طلب

”شام کا وقت تھا۔ بمبئی کا موسم بڑا خوشگوار تھا۔ وہ مرہم لگا کر ہم چوہائی کے ساحل پر جا گئے۔ اس وقت ساحل کے باغیچے میں بیچ پر ایک پارسی خاتون بیٹھی ہوئی تھی۔ بہت خوبصورت تھی۔ اگرچہ نوجوان نہ تھی۔ ہم اس کے پاس جا بیٹھے اور اس تک میں رہے کہ کب وہ ادھر سے لوڑ اس سے آنکھیں چار ہوں۔“

جب آنکھیں ملیں تو وہ گویا ہمیں دیکھ کر بھونچکی سی رہ گئی۔ اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ وہ ٹھنکی بانہہ کر ہماری طرف دیکھنے لگی۔ کچھ دیر تک تو ہمیں اس کا بہت لطف آیا۔

”گہرائی کی کیا بات تھی۔“ ایلہ نے پوچھا۔

”بھئی۔“ وہ بولے۔ ”کیا وہ نگاہیں جھکائے رکھنے والی عورت۔ اور کہاں آنکھوں میں صفا ڈال کر دیدہ دلیری سے ٹھنکی بانہہ کر دیکھنے والی۔ نہ اس کی نگاہ میں شرم تھی نہ ہنس۔ اور پھر اسے یہ بھی خیال نہ تھا کہ لوگ دیکھ رہے ہیں۔ سچ پوچھو تو اس وقت اس میں گہرائیت نہ رہی تھی۔“

ایلی بہت محفوظ ہو رہا تھا۔

”بہت جلد ہم اس سے آگے گئے۔“ انہوں نے پھر بات شروع کی۔ ”پھر ہم نے دیکھا کہ ایک اور مینار سڑک پر چل رہی ہے۔ ہم نے اس سے آنکھیں ملائیں تو وہ چلتے چلتے رک گئی۔ اب وہ کڑی ہماری طرف دیکھ رہی ہے۔ اسی طرح آدھ گھنٹے میں ہمارے گرد تین عورتیں کھڑی ہو گئیں۔ اس پر آنے جانے والوں نے مشکوک نگاہوں سے ہماری طرف دیکھنا شروع کر دیا۔ ایک سپاہی آگیا۔ اس کے روبرو ہم تو گھبرا کر اٹھ بیٹھے۔ لیکن وہ اسی طرح ٹکٹلی ہتھ کر ہماری طرف دیکھتی رہیں۔ اس نے تحقیقات شروع کر دی اور ہم وہاں سے کھسک آئے۔“

”پھر اسی رات ہم تھپھر دیکھنے چلے گئے۔ ہمارے اگلے صوفے پر دو لڑکیاں بیٹھی تھیں۔ جب وقفہ آیا تو ان دونوں نے مڑ کر دیکھا۔ ہم پہلے ہی ناک میں بیٹھے تھے۔ ہم نے خوب آنکھیں چار کیں۔ ان کی بھی وہی حالت ہوئی۔ اب وہ مستقل طور پر منہ موڑ کر بیٹھ گئیں۔ کھیل شروع ہو گیا لیکن وہ اسی طرح شیخ کی طرف پیٹھ کئے بیٹھی رہیں۔ ان کے لواحقین نے ہزار کوششیں کیں کہ وہ سیدھی ہو کر بیٹھیں لیکن لڑکیوں نے ان کی بات کی کوئی پروا نہ کی۔ نتیجہ یہ ہوا کہ وہاں ہنگامہ ہو گیا اور ہم وہاں سے بھی بھاگے۔“

”عجیب مرہم تھا وہ۔“ ایلی بولا۔

”ہم نے تو یہ محسوس کیا کہ جس کی طرف ہم دیکھتے تھے اس کی روح گویا شل ہو جاتی تھی اور خالی جسم رہ جاتا اور پھر اس جسم سے خوف آنے لگتا۔ نہایت تو گویا ختم ہو جاتی۔ یعنی گلاب کے بجائے کدو کا پھول رہ جاتا جس میں نہ بو ہوتی نہ باس۔ یہ دیکھ کر ہمیں احساس ہوا کہ طلب ہی واحد چیز ہے حصول کی کوئی حیثیت نہیں۔ بس ہم نے وہ مرہم سمندر میں پھینک دیا۔ اور دل میں ساگنی کہ کیوں نہ ایسی طلب پیدا کریں جہاں حصول کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ خالی طلب۔ بس دفعتاً طبیعت نے پلٹا دکھایا اور سب کچھ چھوڑ دیا۔ سب کچھ کاروبار، شوق، تفریح، سب کچھ۔“

کچھ دیر کے لئے وہ خاموش ہو رہے پھر بولے۔

”ایلی صاحب یہ تو سب بھانے ہیں۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہیں جب چاہیں اپنی طرف بلا لیتے ہیں۔ ہم پر بھی کرم کر دیا انہوں نے۔ ان کی کرم نوازیاں ہیں۔“ وہ خاموش ہو گئے۔

کچھ دیر کے بعد وہ کہنے لگے۔

”آئیے ایلی صاحب۔ آپ کو اللہ کے بندوں سے ملائیں۔ ہمارے پاس اور کیا ہے۔ بس مافوق الفیض والی بات ہے۔“

”جی اچھا۔“ ایلی نے جواب دیا۔

ایلی ماسٹر

”تو کتنے سے ملیں گے آپ عقل والوں سے یا دل والوں سے یہ دلی تو اللہ کے بندوں سے بھری پڑی ہے۔ ایک سے ایک انوکھا ہے۔ ایک سے ایک زالا ہے۔ دلی پر خدا کا پتہ کرم رہا ہے۔ اس شہر سے انہیں بہت لگاؤ ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے لئے خزانوں کے نہ کھول رکھے ہیں۔ جس کی جتنی ہمت ہو اٹھالے۔ اور بھائی ہم تو ابھی مبتدی ہیں اس مکتب میں ابھی الف کے چکر سے نہیں نکلے۔ ہاں تو چاہیے عالم سے ملیں گے یا.....؟“

”جی۔ عالم سے ملائیے۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ایلی ابھی عقل کے چکر سے نہیں نکل پایا تھا ابھی اسے معلوم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ اس کی دانست میں انسان کی نفسیات میں صرف دو چیزیں اہم تھیں۔ عقل ذہن۔ ایلی کو یہ علم نہ تھا کہ دل کسے کہتے ہیں۔ قلب کیا ہے اور روح کس بلا کا نام ہے۔

چوبارے پر چڑھتے ہوئے حاجی صاحب کہنے لگے ”جن صاحب سے آپ کو ملانے جا رہے ہیں ان کا نام محمد حسین ہے۔ عمر بھر عربی پڑھاتے رہے ہیں۔ ماشاء اللہ۔“

”عربی ماسٹر؟“ ایلی کے ذہن میں حقارت کی ایک رو دوڑ گئی۔ عربی ماسٹر بھلا کیا عالم ہو گا۔ ایلی تو علم کی ہوا بھی نہیں لگی۔ وہ عربی ماسٹروں سے بہت اچھی طرح واقف تھا۔ وہ حلق کے نیچے پردوں سے بات کرتے۔ بار بار لاجول پہنچتے اور تہذیب جدید کی ہر بات پر ناک بھوں پٹختے تھے۔ اس کے علاوہ انہیں انگریزی زبان سے چڑھتی تھی۔ جسے انگریزی زبان سے چڑھو وہ لکھنا ہی ہو سکتا ہے۔ لیکن وہ چپ چاپ حاجی صاحب کے پیچھے پیچھے زینہ چڑھنے لگا۔

ایک مختصر سی بیشک میں چاندنی کافر ش ہو رہا تھا۔ یہاں وہاں کئی ایک ضخیم کتابیں پڑی تھیں۔ ان کے درمیان چار ایک ڈیک نما چوکیاں رکھی تھیں۔ ایک ایسی ہی چوکی کے پاس ایک ڈیکر بن کا آدمی بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے سادہ کپڑے زیب تن کر رکھے تھے۔ کھدر کا لمبا چنڈ لہلہا رہا۔ سامنے چار ایک لوگ بڑے احترام سے بیٹھے تھے۔

ماسٹر صاحب جملہ لوگوں سے مخاطب تھے۔ وہ انہیں سمجھا رہے تھے کہ ہر چیز میں ہونا وہ بھر
واحد ہونا دونوں بیک وقت غیر از امکان نہیں۔

وہ بڑی روانی سے اردو بول رہے تھے۔ ایللی کے لئے حیرت کی بات یہ تھی کہ انگریزی کا
کوئی لفظ استعمال کے بغیر وہ اپنا مفہوم واضح کر رہے تھے۔ ایللی غور سے ان کی بات سنتا رہا لیکن
اسے خاک سمجھ نہ آیا۔ چونکہ وہ ان الفاظ اور اصطلاحات سے قطعی ناواقف تھا۔ البتہ ایللی پر محمد
حسین کی شخصیت نے خاصا اثر کیا۔ ان کی طبیعت میں سادگی تھی۔ ان کی باتیں جذبہ سے سرشار
تھیں اور ان کا انداز دوستانہ تھا۔

جب وہ جزو اور کل کا مسئلہ سمجھا چکے تو سامعین نے جو پہلے ہی اثر اور احترام سے بیٹھے
بیٹھے تھے اجازت حاصل کی اور رخصت ہو گئے۔

اس وقت مولانا نے حاجی صاحب کو دیکھا۔ بڑی تعظیم سے انہیں ملے۔ ایللی سے شفقت
بھرا مصافحہ کیا اور ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگے۔ ابھی چند ایک منٹ ہی ہوئے تھے کہ دو اصحاب
آگئے۔ آتے ہی کہنے لگے۔

”مولانا! ایک مشکل درپیش ہے۔ امداد کے لئے حضور کی طرف رجوع کیا ہے۔“

”کئے کئے۔“ مولانا نے بے تکلفی سے کہا۔

”گستاخی معاف۔“ وہی صاحب بولے۔

”شوق سے پوچھو میاں۔ جو جی میں آئے پوچھو۔ جو جی میں آئے کو۔ اگر ہماری دانست
میں بات آئی۔ تو بیان کر دیں گے۔ صحت کے ضامن نہیں اپنا اپنا خیال ہے۔ میاں اپنی اپنی
رائے ہے۔ علم تو وہ سمندر ہے جس کا کنارہ نہیں۔ ابراہیم تو میاں ابھی کنارے پر بیٹھے ہیں۔ علم
کی تو ہوا بھی نہیں لگی۔ ہاں ہاں شوق سے کو۔“

”سوال یہ ہے حضور مولانا کہ گو کا کیا زائقہ ہے۔“

ایک ساعت کے لیے مولانا نے سر جھکا لیا۔ خاموش بیٹھے رہے۔ پھر سر اٹھا کر مسکراتے
لگے۔ بولے۔

”میاں ہمارا اندازہ ہے کہ گو کے تین ذائقے ہوتے ہیں۔“

”تین ذائقے۔“ ایللی حیرت سے مولانا کی طرف دیکھ رہا تھا۔

”پہلے اس میں مٹھاس ہوتی ہے۔ پھر وہ کٹھاس سے بھر جاتا ہے اور آخر زہر بن جاتا ہے۔“

من لیچے کہ ہمارے اندازے کی بنیادیں کیا ہیں۔ پہلی حالت میں اس پر کبھی بیٹھتی ہے
نہیں بیٹھ مٹھاس پر بیٹھتی ہے۔ پھر اس میں سنڈی پڑتی ہے اور صاحب من! سنڈی ہمیشہ
اپنی چیز میں پڑتی ہے اور بلاخر اس پر نہ کبھی بیٹھتی ہے نہ سنڈی پڑتی ہے نہ چیونٹی منہ لگاتی
ہے نہ کوئی اور جانور تو ظاہر ہوا کہ تیسری حالت میں وہ زہر ہو جاتا ہے۔“

اس پر واہ سبحان اللہ کا شور مچ گیا۔

ابھی وہ دونوں اصحاب جو گو کے ذائقے کے متعلق پوچھنے آئے تھے اجازت حاصل کر رہے
تھے کہ چار سات لوگ اور آگئے۔ انہوں نے آتے ہی ایک نیا مسئلہ پیش کر دیا۔

ان میں سے ایک صاحب کہنے لگے۔

”مولانا! آپ کو یاد ہو گا کہ اجیر شریف کے گزشتہ عرس میں ہم آپ کو اجیر شریف میں
لے گئے۔ اس روز جمعرات کا روز تھا۔ آپ ہمیں اس حجرے میں لے گئے تھے جہاں آپ
برہ ہوئے تھے اور شاید آپ کو یاد ہو کہ آپ نے ہمیں مسئلہ ارتقاء سمجھایا تھا۔“

”شاید۔“ مولانا بولے۔ ”ہمیں یاد نہیں۔ خیر آپ بات کیجئے۔“

اس کے بعد ایک اور صاحب بولے۔ کہنے لگے:

”مولانا! عرس کے روز ہم دلی میں آپ سے ملے تھے۔ اسی دوران خانے میں۔ بلکہ باتوں
میں آپ نے اجیر شریف کا ذکر کیا تھا۔“

”اب سوال یہ ہے کہ۔“ ایک اور صاحب کہنے لگے ”کیا یہ ممکن ہے مولانا کہ ایک شخص
دو وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہو۔ اگر یہ ممکن ہے تو یہ فرمائیے کہ ایسے صاحب کا روحانی
درجہ کیا مرتبہ ہو گا۔“

مولانا ہنسنے لگے۔ کچھ دیر کے توقف کے بعد بولے ”روحانی طور پر اچھے مرتبے اور مقام
لے اصحاب کے لئے عین ممکن ہے کہ وہ بیک وقت دو مختلف مقامات پر موجود ہوں۔ سبحان
”کیا مرتبہ ہے۔“ وہ رک گئے۔

”آخر علی ماسٹری ہے نا۔“ ایللی نے سوچا۔ ”خود ستائی سے کیسے بچ سکتا تھا۔“

”گو توقف کے بعد مولانا نے کہا ”جناب عالی! ایک شرط لازم ہے اس سلسلے میں“ وہ یہ کہ
”وقت دو مقامات پر حاضر ہونے والے صاحب کو یہ احساس ہو کہ وہ بیک وقت دو مقامات
پر موجود ہے۔ اور جہاں تک ہمارا تعلق ہے ہمیں یہ شعور ہے کہ ہم اس روز دلی میں موجود تھے

اجیر شریف کی حاضری کا نہ ہمیں شعور ہے نہ احساس نہ علم لہذا مرتبے کا سوال علی پر انہیں ہوتا۔

پہلے دو آدمیوں نے اس پر شور مچا دیا۔ بولے ”حضرت! ہم نے تو بہ قانگی ہوش و حواس آپ کو وہاں دیکھا ہے۔ آپ سے ملاقات کی ہے۔ آپ نے ہم سے گفتگو فرمائی ہے۔“
 ”بالکل بالکل۔“ مولانا نے کہا۔ ”ہم آپ کی بات جھٹلاتے نہیں۔ یقیناً“ آپ درست فرماتے ہیں۔ آپ نے ضرور ہم سے ملاقات کی ہوگی۔“
 ”تو پھر۔ تو پھر۔“ انہوں نے شور مچا دیا۔

”میاں۔“ وہ بولے۔ ”وہ قادر مطلق بہت بڑا شعبہ باز ہے۔ اگر وہ چاہے کہ کوئی فرد جو موجود دکھائی دے تو یہ اس کی شعبہ بازی ہے۔ البتہ اگر ہم الزام اپنی مرضی سے اور ارادے سے دو جگہوں پر موجود ہوتے اور ہمیں اس امر کا شعور ہوتا تو اور بات تھی۔ کیوں حلی صاحب؟“ انہوں نے حاجی صاحب سے پوچھا۔
 ”آپ بہتر جانتے ہیں۔“ حاجی صاحب بولے۔

پیلی بائی

حاجی صاحب سے رخصت ہونے کے بعد ایللی گھر آکر پڑ رہا۔ اس روز وہ عجیب خیالات میں کھویا ہوا تھا۔ حاجی صاحب کی دنیا عجیب دنیا تھی۔ وہ مرہم و عالم اور نجلے کیا کیا محسوس کرنے لگا تھا جیسے حاجی صاحب کی دنیا ایک وسیع دنیا ہو جس کا صرف ایک کونہ اس نے دیکھا تھا۔ کیا وہ عملی ماثر واقعی دو جگہوں پر بیک وقت موجود تھا یا وہ محض ایک ڈھونگ تھا۔ کیا مگر کا ذاتہ اس نے عقل کے زور پر بتایا تھا۔ بہر حال وہ حیران تھا۔ اس کے رو برو وہی عربی مولوی بیٹھا ہوا تھا اس کا اپنا مرشد برٹریڈ رسل مودیہ مولوی کے سامنے جھکا ہوا تھا۔ اس کے پاس ہی راستہ دیکھنا برنارڈ شا’ ایچ جی ویلز، کانکا، سلمہ لگراف جینز، سب مودیہ بیٹھے تھے۔ اور مولوی انہیں سجدہ کرتا تھا۔

”میاں!“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”تمہیں اللہ کی دین حاصل ہے لیکن تمہیں اللہ کی دین کا احساس نہیں۔ اپنے علم میں اللہ کو بھی شامل کر لیجئے۔ پھر دیکھئے کیا سے کیا ہو جاتا ہے۔“
 کونے میں فرامیڈ مشتبہ نگاہوں سے مولانا کو دیکھ رہا تھا۔ اس کے ہاتھ میں ایک ہاتھ

نئی جیسے وہ بار بار لگتا اور یوں مولانا کی طرف دیکھتا جیسے کسی جرثومہ پر تحقیق کر رہا ہو۔ اگلے روز وہ شام کو علی پور جانے والے تھے۔ دوسرے کو احمد بولا ”ایلی صاحب چلے آپ کو پیلی بائی سے ملاؤں۔ بڑے غضب کی چیز ہے۔“
 جب وہ دونوں پیلی بائی کے چوہارے پر پہنچے تو وہ میلے کچیلے کپڑے پہنے کھڑکی میں فرش پر بیٹھی تھی۔

”آؤ احمد۔“ وہ بے تکلفانہ انداز سے بولی۔ ”بڑی دیر کے بعد آئے ہیں آپ۔“
 احمد نے آداب عرض کی اور اس کے پاس جا بیٹھا۔
 ”تشریف رکھئے نا۔“ وہ ایللی سے کہنے لگی۔

ایللی چپ چاپ ایک طرف بیٹھ گیا۔
 ”یہ کون صاحب ہیں۔“ اس نے احمد سے پوچھا۔
 ”یہ میرے بھائی ہیں۔ الیاس آصفی۔“

”الیاس صاحب۔“ وہ بولی۔ ”میں نے آپ کی تصویر کہیں دیکھی ہے۔“
 ”یہ تو خود تصویر ہیں۔ ان کی تصویر کیا ہوگی۔“ احمد بولا۔
 ”کیا مطلب۔“

”بولتے نہیں۔ تصویر بن کر بیٹھ رہتے ہیں۔“ احمد نے قہقہہ مارا۔
 ”جنہیں دیکھنا ہو وہ بولتے نہیں۔“ ایللی نے بعد مشکل ایک بھڑکی بات کی۔
 ”ارے۔“ وہ ہنسی۔ ”تو آپ دیکھتے ہیں۔“

”جی۔“ ایللی نے بائی پر بھرپور نگاہ ڈالی۔
 ”دیکھنا تو اچھی چیز نہیں۔“ وہ بولی۔ ”خواہ مخواہ خطرہ مول لیا۔“ وہ مسکرائی۔ ”اس سے تو دیکھنا کس اچھا ہے۔“

”تو جی آپ دیکھتی نہیں۔“ احمد ہنسنے لگا۔

”ہمارا کیا ہے۔“ اس نے ایک آہ بھری۔ ”ہماری طرف بھی دیکھتے ہیں اور کوئی بھی نہیں دیکھتا اور اپنی یہ حالت ہے کہ بت کہیں چت کہیں۔“
 ”تو آپ بیک وقت دو جگہ ہوتی ہے۔“ ایللی نے کہا۔
 ”وہ نہیں۔“ ایک جگہ رہیں تو جیون کیسے کئے۔ اور یہ جو روپ ہے یہ تو نفلی ہے۔“

”اور اصل چیز کئی میں باندھ کر رکھی ہوئی ہے۔“ احمد ہنس۔

”اونہوں۔“ وہ بولی۔ ”اصلی چیز خاک میں مل چکی ہے۔“

”خاک میں مل کر ہی تو سوتا بنتا ہے۔“ ایللی نے ایک اور نمائشی فقرہ چست کیا۔

”بنتا ہو گا۔ ہم تو مٹی بن کر رہ گئے۔“

”اے تو بیٹھی کیا کر رہی ہے پیلی۔“ اس کی ماں نے غصے سے ادھر دیکھا۔ ”اٹھ اب تیار ہو۔“

”بیٹھ لینے دے ماں۔“ وہ بولی۔ ”بیٹھ لینے دے کچھ دیر اور۔ ساری عمر تیار ہی ہونا ہے۔“

”ا۔“

پیلی کے انداز کو دیکھ کر ایللی نے محسوس کیا جیسے مولانا پیلی کا بھیس بنا کر بیٹھے ہوں۔ یہ بالی حقیقت سے کس قدر قریب ہے۔ دیے دیکھنے میں کس قدر دور۔ یہ حقیقت کیا چیز تھی۔ اسے یہ سمجھ میں نہیں آتا تھا لیکن اس کے باوجود وہ اسی شدت سے محسوس کرتا تھا۔ حقیقت ایللی کے لئے وہ مقام تھا جہاں سے ہر چیز اپنی تمام تر عمرانی میں پورے طور پر دکھائی دیتی ہے۔

دیر تک وہ دونوں پیلی کے پاس بیٹھے رہے۔ احمد کو نہ جانے کیا سوچھی وہ نیچے جا کر بہت سے چلتوزے لے آیا اور وہ تینوں بچوں کی طرح چلتوزے کھاتے رہے۔ احمد نے بہت سے چلتوزوں کے مغز نکال کر پیلی کو پیش کیے۔

”اونہوں۔“ اس نے مسکرا کر کہا۔ ”خود توڑ کر کھانے میں مزہ ہے احمد۔ مغز نہ دو مجھے“

چلتوزے کھانے کا سارا رومان ختم ہو جاتا ہے۔

”آپ کو رومان سے دلچسپی ہے کیا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن ہمارے لئے رومان کچھ اور چیز ہے۔ یہ رومان نہیں۔ اس کی حقیقت ہم پر اس حد تک آشکار ہو چکی ہے کہ کسی گنتی شمار میں ہی نہیں رہا۔“

”ہمیں بھی پتہ چلے۔“ ایللی بولا۔

”اونہوں۔“ وہ مسکرائی ”چل بھی جائے تو بھی نہ چلے گا۔ آپ کی دنیا اور ہے ہماری اور۔“

آپ دیکھتے ہیں اور ہم پر دکھنا لازم ہے۔ رہا دیکھنا تو میں دیکھ دیکھ کر آتا گئی ہوں۔ پھر بھی دکھنا پڑتا ہے۔ آنکھیں بند کر لوں پھر بھی دکھتا ہے۔“

اس کی بات سن کر ایللی خاموش ہو گیا۔ اسے کوئی بات نہ سوجھ رہی تھی۔

”وہ دھن کیسے ہے۔“ احمد نے کہا۔ ”کچھ موڑ موڑ مسکات جات۔“

اور وہ گانے لگی۔ دفعتاً اس کے چہرے کا عالم ہی بدل گیا۔ پہلے اس پر بے نیازی کی دھیرہ ڈھمی ہوئی تھی۔ جمل اور بے نیازی جس میں قنصع نہ تھا لیکن جونہی اس نے آہستہ آواز میں کہا شروع کیا بے نیازی ختم ہو گئی۔ ایک مبسم تڑپ ایک دلفریبی جیسے دفعتاً ”محبوبیت کی وہ کیفیت ختم ہو گئی ہو۔ جو خود بخود بلا جدوجہد بغیر خواہش اور کوشش کے چھائے ہوئے تھی۔ اب وہ محبوبیت پیدا کرنے کی سعی کر رہی تھی۔ دونوں کیفیات میں کتنا فرق تھا۔ پہلے وہ خدا بنی بیٹھی تھی۔ بے نیاز لا شعوری محبوبیت سے سرشار۔ اب نہ جانے کیا بن گئی تھی۔ کیا واقعی خواہش ذات خود محبوبیت کی کٹ تھی۔“

مہارانی

علی پور آتے ہوئے راستے میں ایللی دلی کے تاثرات میں سرشار رہا لیکن علی پور پہنچ کر جب وہ پہلے روز شہزاد سے ملا تو وہ تاثرات سب کے سب یوں کافور ہو گئے جیسے صبح کی دھند سورج کی شعاعوں سے صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑ جاتی ہے۔

”ہمارے مرشد ہی کسی کے مرید بن آئے تو اب ہمارا کیا ہو گا۔“ شہزاد نے کہا۔ ”ہمیں کئی حیثیت ہی نہ رہی نا۔“ وہ ہنسنے لگی۔

”تم تو مہارانی ہو۔“ وہ بولا ”اور مہارانی مہارانی ہی ہوتی ہے۔“

”جب مہاراج ہی بھکشو ہو جائیں تو مہارانی کہاں رہی۔“

”جسے تم سا خزانہ ملا ہوا ہو وہ بھلا بھکشو کیوں بنے۔ بھکشو تو وہ بنتا ہے جس۔“

”کچھ نہ ہو۔“

”ہاں تو پھر حاجی صاحب نے کیا کہا۔ مجھے سب کچھ بتاؤ نا۔“ شہزاد اس کے قریب تر ہوا۔ تم حاجی صاحب نے کہا۔ ”اس کا مرشد بہت زبردست ہے۔ اس کو سنبھالنا اپنے بس کا رونا۔ نہیں۔“

”ج۔“

”تمہاری قسم۔ وہ دہلا پٹلا حاجی چاہے کچھ بھی ہے لیکن صاحب نظر ضرور ہے۔“

”وہ کیا ہوتا ہے۔ صاحب نظر۔“

”اس نے مجھے دیکھ کر تمہاری طاقتوں کا اندازہ لگا لیا۔ مجھ میں تمہارا پر تو دیکھ لیا۔“

ایلی کا جی چاہتا تھا کہ وہ شنراؤ کو سب کچھ بتا دے۔ وہ پیغام جو حاجی صاحب نے ایل کو دیا تھا — ”ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔“ ایلی کے دل میں کوئی چلا رہا تھا۔ ”ہو کے رہے گا۔“ اس کی زبان پر بار بار آتا تھا لیکن نہ جانے کیوں وہ نہیں چاہتا تھا کہ شنراؤ کو اس راز سے آگاہ کرے۔ شاید اسے یہ خوف دامن گیر تھا کہ شنراؤ اسے رو کر دے گی۔ جیسے وہ ہمیشہ کیا کرتی تھی۔ ہر صورت اس نے بات پھر سے چھیڑی۔ بولا۔

”شنراؤ ایک بات کہوں۔“

”کو۔“ وہ بولی۔

”اس طرح کیسے زندگی بسر ہو گی۔“

”کس طرح۔“ اس نے پوچھا۔

”اس طرح چھپ چھپ کر ملنے سے انجام کیا ہو گا۔“

”انجام تو ہو چکا۔“ وہ بولی۔ ”میں نے تمہیں کھو کر پایا۔“

”لیکن میں نے تو تمہیں نہیں پایا۔“

”تم نے کھویا ہی نہیں تھا۔ پھر پانے کا کیا سوال ہے۔“

”نہیں شنراؤ۔ ہماری زندگی ایک ڈھونگ ہے۔ ایک مسلسل جھوٹ۔ فریب۔ ہم دوسروں

کو دھوکا نہیں دے رہے۔ خود کو دھوکا دے رہے ہیں۔ خود فریب کھا رہے ہیں۔“

”فریب ہی سہی۔“ وہ بولی۔ ”مجھے یہ فریب کھانے ہی دو۔ اتنی زندگی بیت گئی ہے۔ اب

باقی رہا کیا ہے۔“

”نہیں شنراؤ۔“ وہ بولا چلو کہیں چلے جائیں۔ اب بھی وقت ہے۔“

”میری طرف دیکھو۔“ وہ بولی۔

ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے؟“

”دیکھا۔“ وہ بولی ”کیا اب بھی یقین نہیں۔ میں چھ بچوں کی ماں ہوں۔ چھ بچوں کی۔“

”تو پھر؟“

”اپنی زندگی تو میں نے تباہ کر لی۔ اب تمہاری زندگی تباہ کیسے کروں۔“

”اس طرح تو بہت آباد ہے۔“ وہ بولا۔

”تم شادی کر لو ایلی۔“

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”میں یہ بخوشی برداشت کر لوں گی۔“

”تو پھر بات کیا بنی۔“

”میں تم مجھ سے الگ نہ ہونا۔ میرے لئے یہی بہت ہے۔“

”نہیں شنراؤ۔“ وہ بولا ”یہ ہو کے رہے گا۔“

”کیا ہو کے رہے گا۔“

”ہم ایک دوسرے کے ہو کے رہیں گے۔“

”وہ تو ہم ہیں ہی۔“ وہ بولی۔

”اعلانہ ہو کے رہیں گے۔“

وہ قہقہہ مار کے ہنسنے لگی۔ ”اعلانہ ہی تو ہیں۔ سبھی جانتے ہیں۔ خود شریف جانتا ہے۔“

”شریف جانتا ہے۔“ ایلی نے دوبارہ لیا۔

”ہاں۔ وہ صدف کے متعلق مجھے طعنہ دیتا تھا تو میں نے صاف صاف کہہ دیا۔ میں نے کہا

لہذا رہا ہے مجھے تو ایلی کا دو۔ اس شرابی اور کینے کا طعنہ نہ دو۔ میں نے اسے بتا دیا کہ میں

نہاری ہو چکی ہوں۔ صاف بتا دیا۔“

”اور وہ؟“

”وہ سر پکڑ کر بیٹھ گیا۔“ وہ بولی۔ ”کوئی بات نہیں کی۔ مجھے خود معلوم نہیں ایلی کہ میں

کے لئے تمہاری ہو گئی۔ تمہارے پاس دھن نہیں۔ دولت نہیں۔ خوبصورتی نہیں۔“

”خوبصورت تو میں ہوں۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”آئینہ دکھاؤں۔ نہ تم بچے ہو نہ جوان ہو۔ نہ جانے کیا ہو تم۔ مجھے جسمانی ہوس نہیں تم

سے کچھ بھی نہیں پھر بھی میں تمہاری ہو چکی ہوں۔ پتہ نہیں کیوں۔ حالانکہ تمہیں مجھ پر

نکوت نہیں۔ کبھی نہیں ہوا۔ تم ہمیشہ شک کی نظر سے دیکھتے رہے۔ پھر بھی۔“ اس

کا لہجہ نکل گئی۔

ایلی نے شدت سے محسوس کیا جیسے شنراؤ پہلی بائی ہو۔ جس نے کہا تھا ”سب ہمیں دیکھتے

تھا لیکن دیکھتا کوئی بھی نہیں“ شنراؤ کو محلے کے سب جوان بوڑھے دیکھتے تھے۔ لیکن شاید اسے

نہ پتھر سے کچھ زیادہ دور نہیں۔
ایلی بننے لگا "یہ تو اتنا اچھا ہے۔"

جب معلوم ہو جائے گا۔ "جیل چلانے لگا۔" وہ اچھا ہو گا وہ اچھا ہو گا۔ برخوردار کہ سمجھ
اچھے کا تم کو۔ بڑا رانی خان بنا پھرتا ہے۔ عزت والا گنا جاتا ہے۔ اور ہم، ہم کو لوگ رذیل
ہیں۔ حالانکہ تو ہم سب کا پیر و مرشد ہے۔ لیکن ایسا فریب دے رکھا ہے لوگوں کو کہ وہ
بہت سمجھتے ہیں۔ اچھا بننا۔ تو بھی کیا یاد کرے گا۔"

ایلی نے حیرت سے جیل کی طرف دیکھا۔ جیل نے تو اس سے کبھی ایسی باتیں نہ کی
تھیں۔

"ارے۔" دفعتاً اسے خیال آیا۔ "گوگے کو زبان ملی ہوئی ہے۔ یار نے پی رکھی ہے۔"
"ہی پی رکھی ہے۔" جیل بولا۔ "پھر تمہیں کیا تکلیف ہے سالے۔ لوگوں کو کیا تکلیف
ہم جو پی چاہے کریں۔ کوئی ہے سالہ جو پوچھنے کی جرأت رکھتا ہو۔"

شام کو سیر کے بہانے جیل اسے شہر لے گیا۔ ایلی چونکہ نووارد تھا۔ وہ شہر سے واقف نہ تھا
جیل کے ساتھ ساتھ چلے گیا۔

"ارے۔" دفعتاً ایلی چونکا۔ شہر کے لڑکے اسے معنی خیز نظروں سے دیکھ رہے تھے۔ ہنس
ہے تھے۔ کہہ رہے تھے۔ "ارے دیکھ وہ ماشرجی جا رہے ہیں۔" ایک ساعت کے
وہ چونکا۔ پھر اپنی طبعی بے نیازی کی وجہ سے سب بھول گیا۔ دفعتاً اس نے دیکھا کہ وہ چپکے
اکڑا ہے۔

"ارے۔" وہ چلایا۔ "یہ کہاں لے آئے ہو مجھے۔"
"ابھی دیکھ تو۔" جیل بولا "آج ڈیرے کے بچے بچے کو پتہ چل جائے گا کہ تو شرابی اور
نڈا ہڈی ہے اور کل وہ سکول میں تیرا مذاق اڑائیں گے۔ ہی ہی ہی ہی۔" وہ ہنسنے لگا۔

پھر جیل اسے باری باری ہر چوبارے پر لے گیا اور بڑے اہتمام سے اس نے بائوں سے
کاغذ اُتار کر لیا۔

"یہ الیاس آصفی ہے۔ میرا بھائی ہے۔ اور یہاں گورنمنٹ سکول میں ماسٹر ہے۔"
"سب کی سب جیل کے ڈیرے سے تبارے پر افسوس کا اظہار کرتیں تو وہ چلا کر کہتا۔
ایلی جو یہاں ہے۔ بس سمجھ لو میں یہاں ہوں۔ میری جگہ یہ حاضری دیا کرے گا۔ کوئی کام ہو

کوئی نہ دیکھ سکا تھا۔ وہ بھی پہلی بائی کی طرح ہر وقت دو جگہ موجود رہتی تھی۔ قریب ہو کر دور
رہتی۔ دور ہوتے ہوئے اس قدر قریب آ جاتی۔ اس کی دورخی کو ایلی نہیں سمجھ سکا تھا۔ وہ ایلی
کے لئے ایک معرہ تھی۔ اس میں ماجھا پہلی بائی دیوی مدارانی اور نہ جانے کون کون براہمن
تھیں۔

چھٹیاں ختم ہونے پر جب وہ آخری مرتبہ شنراؤ سے ملا تو اس نے پھر سے تذکرہ چھیڑا۔
"چلو شنراؤ۔ کہیں چلے جائیں۔"
لیکن شنراؤ نے اس کی بات نہ سنی۔ "اب کہاں جانا ہے۔" وہ بولی پھر اس نے بات کا
موضوع بدل دیا۔

بنو گورا بنو

ایلی کا تبارہ ڈیرہ میں ہو چکا تھا۔ اس کے اس تبارہ پر سب حیران تھے۔ رام پور
سے جلد مخلصی پالینا حیرانی کی بات تھی۔ رام پور دور دراز مقام پر آباد تھا۔ دریائے سندھ کے اس
پار جہاں جاتے جاتے دو دن لگ جاتے تھے۔ اگرچہ جگہ نہایت اچھی تھی اور وہاں کا ہیڈ ماسٹر تو
دیوتا خصلت کا ایک ہندو تھا۔ اس کے علاوہ رام پور کا سکول بے حد خوبصورت تھا۔ اس کے
ساتھ ملحقہ زمین بہت وسیع و عریض تھی جس پر باقاعدہ کھیتی باڑی کی جاتی اور اس کی آمدنی اس
قدر ہوتی تھی کہ سکول میں غریب کے بچے مفت تعلیم حاصل کرتے تھے۔ بلکہ ان کی کتابیں اور
کپڑے بھی اسی فنڈ سے دیئے جاتے تھے۔ اور بورڈنگ میں جو کھانا پکنا تھا وہ بھی اسی فنڈ سے پکا
جاتا تھا۔ نتیجہ یہ تھا کہ اس سکول میں تعلیم حاصل کرنے والوں کو ایک تو تعلیم، دوسرے کھانا
کپڑے اور کتابوں پر کوئی خرچ نہ اٹھنا تھا۔ بلکہ اس کے علاوہ کئی ایک اور ضروریات کے لئے
امداد ملتی تھی۔ ان سب باتوں کے باوجود اساتذہ وہاں جانے سے گھبراتے تھے۔ اس کی وجہ رام پور
کی دوری تھی۔

جب ایلی رامپور سے بدل کر ڈیرہ آیا تو چار ایک دن کے بعد جیل آدھکا۔ جیل ڈیرہ کے
شیش پر ملازمت کر چکا تھا اور شہر کے بیشتر لوگ اس سے واقف تھے۔ جیل نے آتے ہی شور مچا
دیا۔

"تو ایلی صاحب ڈیرہ میں تبدیلی ہو گئے ہیں۔ کاش کہ میں بھی ڈیرہ میں ہوتا۔ مگر کچھ ہوا

سیدھی سکول چلی جانا اور الیاس آصفی کا پوچھ لیا۔

ایلی سخت گھبراہٹ محسوس کر رہا تھا مگر جمیل کے سامنے بے بس تھا۔

آخر کار جمیل ایلی کو لے کر ایک چوبارے میں جا پہنچا۔

”یہ گھر میرا خاص گھر ہے۔ وہ بولا۔

”ان کے مجھ سے پرانے مراسم ہیں۔ آؤ تمہیں ملاؤں۔ ہاں، بھی حساب سے کھڑی ہو جاؤ۔

یہ ہے سب سے بڑی بنو۔ اور یہ منجھلی گوری اور یہ چھوٹی بنو۔ بیٹھ جاؤ۔ اب سب بیٹھ جاؤ۔“

وہ تینوں بیٹھ گئیں۔

اتنے میں باہر سے کسی نے آواز دی اور دو خوش پوش پٹھان داخل ہوئے۔

”ارے بھی۔“

جمیل انہیں دیکھ کر چلایا۔ ”مکابک خواہ مخواہ منہ اٹھائے چلے آ رہے ہیں۔“

نو واردوں نے تینوں بنوں کی طرف دیکھا۔

بنو انھی اور ان کے قریب جا کر کہنے لگی۔ ”آپ کچھ دیر کے بعد آجائیں۔ ان کے جانے

کے بعد۔“ اس نے دروازہ بند کر دیا اور واپس اپنی جگہ آ بیٹھی۔

”ہاں تو“ جمیل بولا ”ان کی صفات سنو۔ یہ بنو تو مریم ہے۔ ایسی مریم جو ہر قسم کی جلن دور

کرتی ہے پھوڑا ہو پھنسی ہو۔ غم و تنگدہ ہو۔ عشق ہو۔ روپے پیسے کا نقصان ہو جائے۔ پریشانی

ہو۔ کچھ ہو۔ اس کے پاس آ جاؤ۔ ایسا پھار رکھے گی سب غم دور۔ کیوں بنو۔“

ایلی نے بنو کی طرف دیکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے وہ خود دکھ بھری بوتل ہو۔ اس کے

ہونٹ بھینچے ہوئے تھے۔ آنکھیں ننناک تھیں۔

”اور یہ دیکھو گوری یہ گوری نہیں گورا ہے۔ تم نے بھی گورے دیکھے ہیں۔ بس یہ سمجھ لو

کہ یہ اس کتنی فوج کا گورا ہے۔ اس کی آنکھیں دیکھو بلی ایسی ہیں اور یہ ہر وقت مسکاتی ہے ہر

وقت۔ بارش ہو دھوپ ہو گرمی ہو سردی ہو۔ اس بوتل سے ہمیشہ چھینٹے اڑتے ہیں۔ یہ نہیں

بھلا سکتی ہے۔ بچہ بن کر تم سے کھیلے گی۔ ہنسے گی۔ دھکے دے گی۔ نہیں کر سکتی لیکن ہنسنا

سکتی ہے۔ کھلا سکتی ہے۔ ہے تو گورے کی طرح حرامی مکر ساتھی بننے کی صلاحیت رکھتی ہے۔ کچھ

دیر کی ساتھی۔

”اور یہ بنو۔“ اس نے چھوٹی کی طرف دیکھ کر کہا ”بس دیکھ لو اسے۔ یہ تو خالص پٹانہ۔“

یہ پٹانہ۔ نہ کوئی اسے چلا سکتا ہے نہ کوئی اس سے کھیل سکتا ہے۔ اگر اضطراب پیدا

ہو۔ اگر دیوانگی حاصل کرنی ہو۔ اگر اطمینان کھونا ہو۔ اگر طوفان کے ہتھکڑے دیکھنے ہوں تو

اسے آلو۔ یہ ایک ہنگامہ ہے۔ بارود ہے منجھل پوٹاش ہے۔“

پھر ایلی یہ میرا اپنا گھر ہے۔ یہاں میں نے دو سال گزارے ہیں دو سال۔ اور اب یہ تمہارا

ہے مجھے اور اگر تم نے یہاں باقاعدہ حاضری نہ دی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہو گا۔“

اگلے روز جب ایلی سکول گیا تو اس کی طرف انگلیاں اٹھ رہی تھیں۔ لڑکے اسے دیکھ کر

دارے تھے اور وہ سوچ رہا تھا کہ وہ کس طرح ان لڑکوں کو کنٹرول کرے گا۔ کس طرح ان

مانے استلو کی حیثیت سے کھڑا ہو گا۔ لیکن اس معاملے میں اسے اپنے آپ پر اعتماد تھا۔ اس

کبھی رسمی استلو کی طرح بچوں سے سلوک نہ کیا تھا۔ اس نے کبھی رسمی طور پر سبق نہ پڑھایا

اس کی باتیں سن کر لڑکے تعجب سے اس کی طرف دیکھتے جیسے انہیں اپنے کانوں پر یقین نہ

ہو۔ پھر آہستہ آہستہ مسکراتا شروع کرتے اور بالا خراس کے دوست بن جاتے۔ خاص طور پر

بلال لڑکے جنہیں کنٹرول کرنا مشکل سمجھا جاتا تھا۔

نویں جماعت میں داخل ہو کر اس نے پہلے ہی سبق میں چپکے کے موضوع پر اظہار خیال

کا کرنا تاکہ بچوں کے دل کی بات پھوڑا نہ بن جائے۔

ادھر میں وہ واحد شخصیت جس نے ایلی کو متاثر کیا، غلام کی تھی۔ اس کا نام غلام علی تھا

ایلی اسے غلام کہتے تھے بلکہ وہ خود اس بات پر مصر ہوتا کہ اسے غلام کہا جائے۔ وہ کہا

”بھئی گھروالوں نے مجھ پر زیادتی کی ہے کہ علی کی غلامی کا اعزاز بخش دیا۔ اس اعزاز کا میں

مکمل اتنی عظیم شخصیت کی غلامی۔۔۔ نہ بھی میں تو اللہ کے ہر بندے کا غلام ہوں۔

اللہ ان کا۔ سب کا۔“

غلام کا رنگ گورا تھا۔ جسم بھرا بھرا اور خود خدال میں جاذبیت تھی۔ اس کی آنکھیں بے حد پر

نہاں کارنگ شریقی تھیں۔ نکھرا نکھرا اور ان میں شرارت یوں کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی

اس معزز چہرے پر ان آنکھوں کو دیکھ کر حیرت ہوتی تھی۔ ان میں ہر وقت سوڑے کی

مکمل نظر آتی تھیں۔ ایک عجیب سی پھوار پڑتی اور دیکھنے والوں کو اثر سے بھگو دیتی۔

غلام کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس ہوتا کہ ابھی وہ نظر بھر کر راہ چلتی ہوئی خاتون کو دیکھے گا تو

جب وہ غلام کے گھر پہنچے تو ایک بچے نے دروازہ کھولا۔ اور بیٹھک کی طرف اشارہ کر کے بل بیٹھک میں میز پر چند ایک کتابیں پڑی ہوئی تھیں۔ دو کرسیاں رکھی تھیں۔ ایک طرف کھانا تھا۔ دوسری طرف فرش بچھا ہوا تھا اور فرش کے ایک کونے پر جائے نماز پر غلام نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ جائے نماز کے ساتھ ہی ایک ستار رکھی ہوئی تھی۔

وہ سب چپ چاپ بیٹھ گئے۔ الطاف نے ایک رسالہ اٹھا لیا اور اسے دیکھنے لگا۔ اس نے اسے ایک گھنٹہ پڑھ لیا۔ اسے کھولا تو اس میں سے طبلے کی جوڑی نکل آئی۔ پھر اس نے اسے گولے کو جو وہ ساتھ لایا تھا، توڑ کر اس پر لگانا شروع کر دیا۔ ایللی حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ بائیہ آئے آگے طبلے پر لگایا جاتا ہے۔

غلام نے سلام پھیرا اور پھر کسی سے بات کئے بغیر سلام علیکم کئے بغیر ستار اٹھالی اور اسے لے لگا۔ اس کے ساتھ ہی مدھم لے میں اس نے طبلہ بجانا شروع کر دیا۔

وہ خاموش بیٹھے تھے۔ ستار گویا کراہ رہی تھی۔ اور طبلے کی تھپ دل میں اترتی جا رہی تھی۔ باہر بھول گیا کہ وہ کہاں بیٹھا ہے۔ کون ہے اور اسے کیا کرنا ہے۔ کوئی دس منٹ کے بعد دھن دھن کی آواز آئی اور ساز ختم ہو گیا۔ غلام منسوبانہ اٹھ بیٹھا۔

”موت کیجئے۔“ وہ ایللی سے مخاطب ہو کر بولا ”میں نماز میں مصروف تھا۔ آپ کو انتظار کی تھی۔“

”لیکن آپ تو ستار بجا رہے تھے۔“ ایللی بولا۔

”نہیں تو۔“ غلام بولا ”میں تو نماز کے بعد دعا مانگ رہا تھا۔“

”دعا مانگ رہے تھے۔“ ایللی نے دوہرایا۔

”جی۔“ غلام نے کہا ”دعا زبان سے نہیں مانگی جاسکتی۔ دل کے تاروں کی لرزشوں سے پہنچتی ہے۔“

”گورو یہ ستار غلام کا دل ہے۔“ اس نے ہنس کر کہا۔

”جیسا کہ ہے۔“ غلام بولا ”میری ساری کائنات یہ ستار ہے اسی سے نماز پڑھتا ہوں۔ اسی سے دعا مانگتا ہوں۔ یہی بھگتی ہے۔ یہی نروان ہے۔“

”اے کسے کی دو بوتلیں کھلیں۔ رنگ پچکاری کی پھوار پڑی۔ پگھٹ جھول کر پاس آگیا۔“

وہ مسرور ہو کر اس کے پیچھے چل پڑے گی۔ ساری دنیا سے بے نیاز ہو کر اس کے قدموں میں آکرے گی لیکن غلام عورت کو دیکھ کر نگاہیں جھکا لیتا تھا اور الزما ”اس کو شش میں لگا رہتا تھا کہ کہیں وہ نگاہ بھر کر کسی عورت کو دیکھ نہ لے۔ ایللی نے اس کی آنکھوں کو دیکھ کر محسوس کیا جیسے اس نے دلی والے حاجی صاحب کی بنائی ہوئی مرہم کی دو سلائیاں آنکھوں میں لگا رکھی ہوں۔“

غلام

غلام سے ایللی کی ملاقات الطاف اور اسد کی وساطت سے ہوئی تھی۔ الطاف ان لوگوں میں سے تھا جو ہر نووارد سے تعلقات پیدا کرنے کے خواہاں ہوتے ہیں۔ اور بلا محکف اسے کھانے کی دعوت دینے کے مشتاق۔

الطاف کی دعوت اس کے چھوٹے بھائی ارشد نے دی۔ ارشد نویں جماعت میں پڑھتا تھا۔ وہ تین بھائی تھے۔ الطاف، اسد اور ارشد۔ اسد سکول سے تحصیل علم کر چکا تھا اور اب لاہور کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ ارشد کی بات سن کر ایللی نے اسے ٹال دیا۔ کہنے لگا۔

”بھئی۔ ہم تمہارے بڑے بھائی سے واقف نہیں۔ ان سے جا کر کہنا کہ ناواقفوں کو کھانا کھلانا اچھا نہیں ہوتا۔“

شام کو الطاف خود آگیا۔

”السلام علیکم۔“ وہ بولا ”میرا نام الطاف ہے۔ میں ارشد کا بڑا بھائی ہوں۔ لیجئے اب تو ہماری واقفیت ہو گئی۔ اب چلئے گھر۔ کھانا ٹھنڈا ہو جائے گا۔“

الطاف کی معصومیت اور سادگی سے ایللی بے حد متاثر ہوا۔ اسی روز کھانے پر جب الطاف کو معلوم ہوا کہ ایللی کو راگ سے دلچسپی ہے تو وہ بولا طے

آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ اسے موسیقی سے دلچسپی ہے۔“

یہ کہہ کر اس نے اپنے بھیلے بھائی اسد کو اشارہ کیا اور وہ گوندھے ہوئے آگے کاگولا اچھا

ہوا ان کے ساتھ چل پڑا۔ جتنا ہی الطاف سادہ طبیعت تھا اتنا ہی اسد بھڑکیلا تھا۔ وہ یوں بات کرتا تھا جیسے ابھی ابھی ولایت سے تحصیل علم کر کے آیا ہو۔ بہر حال اسد کی نبت ایللی کو اس آئے کے گولے میں زیادہ دلچسپی تھی۔ ایک انگریز ریٹائرڈ خوبصورت جوان جس نے ایک اچھا سوٹ زیب تن کر رکھا تھا وہ آئے کے گولے سے کیوں کھیل رہا تھا۔ اور یوں بر

گوپوں کی قطاریں رقص کرنے لگیں۔ دور کنیا کی مری کی مدھم سرس گونج رہی تھی۔ ایک ساعت کے لئے ایللی بھونچکا رہ گیا۔

ارے۔ یہ کیا چیز ہے۔ یہ نمازیں یہ دعائیں یہ لرزشیں اور یہ نگاہ۔ بس ایک ساعت میں نہ جانے کیا کر دیا۔ ایللی غلام کا غلام بن گیا۔ اس کے بعد ایللی کا دستور ہو گیا۔ سکول سے فارغ ہونے کے بعد رات کا کھانا کھا کر وہ غلام کے پاس جا بیٹھتا۔ غلام جائے نماز پر ستر بچاتا۔ ایللی اپنا سر گھٹنوں میں دیئے بیٹھ رہتا۔ اس کی آنکھوں سے شپ شپ آنسو گرتے۔ بے مقصد آنسو۔ غم کے نہیں وافر جذبات کے آنسو۔ حتیٰ کہ عشا کی نماز کا وقت ہو جاتا۔ اور غلام اٹھ کر نماز پڑھنے لگتا اور ایللی گھر چلا آتا۔

کرم نوازی

چند ہی دنوں میں ایللی غلام کا بے تکلف دوست بن گیا بلکہ ایللی کو غلام سے محبت ہی ہو گئی۔ غلام کی طبیعت میں ہلاکی رہ گئی تھی لیکن نہ جانے اس رہ گئی کے دھارے کا رخ کدھر کو مڑ گیا تھا۔ اس رنگ پکاری نے روپ بدل لیا تھا۔ اس کے علاوہ اس کی طبیعت میں ہلاکی سادگی تھی۔ سادگی اور عجز اور بے نیازی ایللی محسوس کرتا تھا جیسے غلام، وہ سکی کی ایک ایسی بوتل تھا جس میں سے شراب انڈیل کر آب زمزم بھر دیا گیا تھا۔

ایک روز ایللی نے بے تکلفی سے پوچھا۔ ”غلام! تم غلام کیوں ہو؟“
غلام نے جواب دیا۔ ”میں لوگوں کا غلام بننا چاہتا ہوں۔ لیکن نہیں بن سکا۔ اپنا غلام نہیں بننا چاہتا لیکن ہوں اور۔۔۔۔۔۔“

”پھر غلام کیوں کہلواتے ہو۔“

”اس لئے کہ میں غلام ہوں۔ اپنے مرشد کا غلام ہوں۔“

”تو کیا تمہارا کوئی مرشد بھی ہے۔“

”ہاں ہے۔“

”میں تو تمہیں مرشد بنانا چاہتا تھا۔“ ایللی نے کہا۔

”تو بتاؤ۔ چاہے کسی کو بناؤ۔ مجھے بناؤ یا میرے حضرت صاحب کو بناؤ یا کسی پتھر کو بناؤ یا کسی بالی کو بناؤ لیکن بناؤ ضرور۔ بے مرشد جینا تو بالکل ایسے ہی جیسے بے چارہ کی بناؤ۔“

”جسے چاہوں بناؤں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”ہاں۔ کوئی فرق نہیں پڑتا۔ نشہ اندر سے نکلتا ہے اپنے اندر سے جتنا گڑ تمہارے اندر ہے بیٹھا ہو گا۔ ہر صورت میں ہو جائے گا۔“

”ہمیا تم میں گڑ ہے۔“ ایللی نے پوچھا۔

”تھا۔“ وہ بولا ”ہمت تھا۔ بے انداز تھا لیکن میں نے تو سارا بیر ہوٹیوں کو کھلا دیا۔“

”ہوں۔“ ایللی ہنس۔ ”تو تمہاری زندگی میں بیر ہوٹیاں تھیں۔“

”تھیں۔“ وہ بولا ”بھائی صاحب۔ بیر ہوٹیوں کے سوا کچھ نہ تھا۔ میری زندگی کی داستان بے مدد تھی۔ عورت شراب اور راگ۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ جس کی طرف آنکھ بھر کر دیکھ لیتا تھا۔

آپ ہی چلی آتی تھی۔ یوں چلی آتی تھی جیسے پٹانزم کے زیر اثر ہو۔ اور پھر اپنی عادت تھی کہ راکھ کو آنکھ بھر کر دیکھتا تھا حتیٰ کہ ان کا کیولگ جاتا تھا۔ ”وہ ہنسنے لگا۔“ میں نے تو اپنا سارا ران بیر ہوٹیوں کو کھلا دیا۔ اگر دس ایک سال پہلے مرشد مل جاتے تو آج تک بہت بڑا ولی بنا نا تمہاری قسم۔“

”لور اب؟“ ایللی نے پوچھا۔

”لب تو کچھ ذرے رہ گئے تھے۔ سارا ہی لٹا بیٹھا تھا۔ شکر ہے اللہ کا اگر اس کا کرم نہ ہوتا تو سنہ جانے کیا ہوتا۔“

”غلام۔“ ایللی نے پوچھا۔ ”تم نے مرشد کی جستجو کی تھی کیا؟“

”لوں۔“ وہ بولا۔ ”مجھے تو شعور بھی نہ تھا کہ مرشد کسے کہتے ہیں۔ کبھی اس زاویہ نگاہ دکھائی نہ تھا۔ خیال بھی پیدا نہ ہوا تھا۔“

”تو پھر کیسے مل گیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

”جس اللہ نے دے دیا۔ بیٹھے بیٹھے دے دیا۔ کرم نوازی کر دی۔“

”آخر کس طرح۔“ ایللی نے پوچھا۔

”یہ بھی اک راز ہے۔“ وہ بولا اسے راز ہی رہنے دو۔ تم اسے سن کر کیا کرو گے۔“

”مجھے تو اللہ پر اعتماد ہی نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ اس نے ایک بھر پور نگاہ ایللی پر ڈالی۔ ”تمہیں اعتماد نہیں ہے اسے تو میں نے ستر اٹھائی اور بجلانے لگا

ایلی نے کچھ کتا چاہا تو غلام نے ہاتھ کے اشارے سے چپ کرادیا۔
 ”ہاتیں کرنے سے کچھ نہیں ملتا۔“ وہ بولا ”سنو۔ سن سن کر کان بھرو۔ بھریہ بوند بوند دل
 میں ٹپکے گا اور ایک روز دل کی تازہ جو ریت میں پھنسی ہوئی ہے ان بوندوں کے پانی میں بہ نکلے
 گی۔ سنو۔“ اور وہ مدھم آواز میں گانے لگا۔

میں چوہڑی سرکار دی ہاں میں چوہڑی

نورانی

نورانی خاموش طبع آدمی تھا۔ سارا دن یا تو چپ چاپ بیٹھا کام میں مصروف رہتا اور یا باہر
 رہ کر چلا جاتا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی کے لئے اس کی موجودگی نہ ہونے کے برابر رہی۔ وہ آپس
 بھی کھاربات کرتے تھے۔

”کیسے نورانی صاحب“ ایلی اس کے پاس جا کھڑا ہوتا۔
 ”ہنس دیکھ لیجئے۔“ وہ جواب دیتا اور بدستور کام میں مصروف رہتا۔
 ”آپ تو ہر وقت مصروف رہتے ہیں۔“

”مصروف رہتا اچھا ہوتا ہے۔“ وہ جواب دیتا۔

نورانی کے منہ پر کبھی تبسم نہ آیا تھا۔ قلعہ مار کر ہنستا تو گویا اس کی سرشت کے منافی تھا۔
 باور قجب خیز بات تھی کہ نورانی دودھ بہت پیتا تھا۔ ہر وقت اس کی میز پر دودھ سے بھرا ہوا
 پیالہ رہتا کام کرتے کرتے وہ گلاس اٹھاتا۔ دو چار گھونٹ پی کر پھر رکھ دیتا۔ حیرت کی بات
 تھی کہ اتنا دودھ پینے کے باوجود نورانی کے چہرے پر دودھ کا نام و نشان تک نہ تھا۔ چہرے کی
 رنگی اور تازہ بڑھتا ہی جاتا تھا۔ اور ماتھے کی تیوری یوں دکھائی دیتی تھی۔ جیسے لوہے میں سنج کی
 دے گیری کھود دی گئی ہو۔

ایک روز غلام آگیا۔ اس وقت ایلی نورانی کے پاس کھڑا تھا۔ ایلی نے غلام کا نورانی سے
 شک کرادیا۔

طلب کا مشک

ایں شام جب غلام علی اور ایلی اکٹھے بیٹھے تھے تو نورانی کی بات چل پڑی۔
 ”غیب بات ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ شخص اتنا دودھ پیتا ہے لیکن اس کے چہرے پر اتنی
 گہرے حیرت ہوتی ہے۔“

ڈیرہ میں ایلی کی زندگی کا مرکز غلام بن گیا۔ غلام کی ستار نے نہ جانے ایلی پر کیا جادو کر دیا۔
 اس کی تاروں کی لرزشوں نے ایلی کے دل میں ایک خلا پیدا کر دیا۔ اس سے پہلے جب بھی اس
 کے دل میں جذبہ پیدا ہوتا تھا تو وہ ”نورا“ شہزاد پر مرکوز ہو جاتا تھا اور وہ شہزاد کے تصور میں کھو کر
 رہ جاتا۔ لیکن غلام کی ستار نے گویا اسے شہزاد سے بے نیاز کر دیا۔ اب اس کے دل میں جذبہ پیدا
 ہوتا تھا لیکن وہ شہزاد پر مرکوز نہ ہوتا۔ اس کا کوئی بھی مرکز نہ ہوتا تھا۔ ایک لاشعری بے مرکز
 جذبہ جیسے دفعتاً اس کے دل کا سوتا سمندر بن گیا ہو۔ ایک بے نام غم بے کنار بحر۔ اس کے
 لئے یہ کیفیت بالکل انوکھی تھی۔

پھر ایک روز نورانی آگیا۔

ایلی وہاں ایک سالم مکان میں رہتا تھا۔ اس مکان میں دو کمرے ایک باورچی خانہ ایک غسل
 خانہ۔ ایک برآمدہ اور صحن تھا۔ ان کے علاوہ ایک الگ سی بیٹھک تھی۔ ایلی کا سالن اس حد
 تک مختصر تھا کہ گویا تھا ہی نہیں۔ ساری چیزیں سمٹ کر ایک کمرے میں سما گئی تھیں اور باقی ب
 کمرے خالی پڑے تھے۔

ایک روز دروازہ بجا اور ایک سیاہ قام فریہ قسم کا آدمی اندر داخل ہوا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولا ”میرا نام نورانی ہے اور میں محکمہ تعلیم میں اسٹنٹ انسپکٹر
 ہوں۔ میرا تہذیب یہاں ہو گیا ہے لیکن ابھی مکان کا بندوبست نہیں ہوا۔ اگر آپ اجازت دیں تو
 میں چند روز کے لئے آپ کی بیٹھک میں ٹھہر جاؤں۔ میں آپ کو کرایہ ادا کروں گا۔ اور جب
 بھی آپ چاہیں گے بیٹھک خالی کر دوں گا۔“
 ایلی نے غور سے اس بے ترتیب آدمی کی طرف دیکھا۔ اس کا رنگ سیاہ تھا۔ چہرے

”اوموں۔“ غلام نے جواب دیا۔ ”بھئی وہ تو لوہے کا آدمی ہے۔“

”لوہے کا آدمی۔“ ایلی نے دہرایا۔

”ہاں ہاں۔“ غلام بولا۔ ”ضرور وہ کوئی چیز استعمال کرتا ہے۔ سکھایا پکلا۔ اس لئے اس کا

جسم لوہے کی خصوصیات کا حامل ہے۔“

”سکھیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں۔“

”وہ تو زہر ہوتا ہے۔“

”ہوتا ہے۔“

”تو پھر۔“

”پھر کیا۔“ غلام بولا۔ ”تمہارے چہرے پر بھی تو کڑھکی ہے۔“

”میں تو سکھیا نہیں کھاتا۔“

”یہ تمہارے خیالات کی وجہ سے ہے۔“ وہ بولا۔ ”تمہاری شخصیت میں مٹھاس نہیں تلخی

ہے۔ جذبات میں رنگ نہیں شدت ہے۔ تمہارا صفر اسودا کی شکل اختیار کر چکا ہے۔“

”ارے۔“ ایلی چلایا۔ ”تم طب جانتے ہو۔“

”جانتا ہوں۔“

”واقعی۔“

”ہاں۔ طب ہمارے خاندان میں صدیوں سے چلا آتا ہے۔ میں بھی سکھیا استعمال کیا کرتا

تھا۔“

”کیوں۔“

”تمام تماش بنی کرتے ہیں۔“

”لیکن تمہارے چہرے پر تو دودھ ہی دودھ ہے۔“

”یہ میرے سرکار قبلہ کی کرم نوازی ہے۔ ان کی دین ہے۔“

ایلی کے لئے سرکار قبلہ اور کرم نوازی ایک بہت بڑی رکاوٹ تھی۔ وہ ہر موضوع پر بات

کر سکتا تھا۔ لیکن سرکار قبلہ اور کرم نوازی پر پہنچ کر گویا اس کے پر جل جاتے اور پھر وہ ایک بے

بس کپڑے کی طرح ریٹکتا۔ اس پر احساس کمتری کا منوں بوجھ پڑ جاتا۔ اسے سمجھ میں نہیں آتا تھا

کہ کس طرح اس مشکل سے مخلصی حاصل کرے۔ اس کا ذہن سرکار قبلہ کو تسلیم کرنے کے

لئے تیار نہ تھا لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اسے رو بھی نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے سامنے حاجی

مہاب آکھڑے ہوتے۔ ان کا سر روئی کے گالے کی طرح ہلتا۔ ان کی روشن آنکھیں۔ چمکتیں۔

”وقت آئے گا۔“ وہ مسکرا کر کہتے۔

پھر عربی مولوی کی کرخت آواز گونجتی۔

”اس شعبہ باز قادر مطلق کے تماشوں کی حد ہے کوئی۔ دم مارنے کی گنجائش بھی ہو۔“ وہ

نتیجہ مار کر کہتے۔

ایک روز بیٹھے بیٹھائے ایلی نے غلام سے حاجی صاحب کا تذکرہ چھیڑ دیا اور شہزاد کی بات

بھڑ کر پاتی سب کھانی سنا دی۔

غلام مسکراتا رہا۔

جب ایلی بات ختم کر چکا تو وہ مسکرا کر کہنے لگا۔ ”ہاں وقت آئے گا۔ تمہارے ماتھے لکیر ظاہر

رہی ہے کہ تمہیں سرکار قبلہ ملیں گے۔ ضرور ملیں گے۔ میں نے پہلے ہی دن دیکھ لیا تھا۔ آؤ

اب ان آئے والے حضور کا ذکر کریں۔“

اس نے ستار اٹھالی اور مدھم آواز میں گانے لگا۔

”اب ہونہ آئے کن دھوئیں بھرائے۔ اب ہونہ آئے۔“

اس روز پہلی مرتبہ ایلی کے دل میں آرزو پیدا ہوئی کہ کوئی سرکار قبلہ اس کی زندگی کو بھی

نور کر دیتا۔

چونکہ ایلی کو ان ٹھہریوں اور خیالوں کے بولوں سے بے حد دلچسپی تھی جو غلام گایا کرتا تھا۔

ایک دن اس نے غلام سے کہا کہ یہ گیتوں والی کاپی مجھے دے دو میں نقل کر کے لوٹا دوں گا۔

”کاپی۔“ غلام بولا۔ ”لیکن یہ تو میرے سرکار قبلہ کی کاپی ہے۔“

”اس میں تو گیت لکھے ہوئے ہیں۔“

”اس میں گیت ہیں۔ مناجاتیں ہیں۔ تو الیاں ہیں یہ سب تو الیاں گیت اور راگ سرکار قبلہ

کے ہیں۔ میں چاہے کچھ بھی گاؤں روئے سخن ان کی طرف رہتا ہے۔ اس برات کے دولہا وہی

ہی۔ صرف وہ اور بس باقی سب ہوس۔“ غلام نے ایک دلہوز نعرہ لگایا۔

بہر حال ایلی نے وہ کاپی غلام سے لے لی اور گھر چلا آیا۔ اس وقت رات کے دس بجے تھے۔

ایلی کو عرصہ دراز سے مسلسل بول کی شکایت تھی۔ اس رات شرمندگی کی وجہ سے ساری رات وہ پیشاب کرتا رہا۔

سلسلہ البول

ایلی کی یہ سلسلہ البول کی شکایت بھی ایک عجیب قصہ تھا۔

جس زمانے میں وہ کلچ میں پڑھا کرتا تھا تو اس کی نور احمد سے بڑی دوستی تھی۔ نور احمد ان کا دور کا رشتہ دار تھا اور لاہور پولیس میں نوکر تھا۔ جب کبھی میس فیس کی عدم ادائیگی کی وجہ سے ایلی کی حاضری بند ہو جاتی اور اسے بورڈنگ میں کھانے سے جواب مل جاتا تو نور احمد اسے اپنے ساتھ لے جاتا۔ اور اپنے گھر میں اپنے ہاتھوں سے کھانا پکا کر اسے کھلاتا۔ نور احمد کی شادی ہوئی لیکن اس کی بیوی مرچکی تھی اور وہ عرصہ سے اکیلا رہتا تھا۔

نور احمد کو ایلی سے برادرانہ قسم کی محبت تھی اور ایلی کو نور احمد سے بڑی عقیدت تھی کیونکہ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود نور احمد بہت سیانا تھا اور اسے لاہور کا بے پناہ تجربہ تھا۔ ایک مرتبہ نور احمد کو نہ جانے کیا تکلیف ہو گئی اور وہ چھٹی لے کر علی پور آگیا۔ اس زمانے میں ایلی کو گرمی کی چٹھیاں ہو چکی تھیں اور وہ علی پور ہی میں تھا۔ نور احمد آتے ہی ایلی سے ملا۔ کہنے لگا:

”بھئی ذرا باہر چلنا ہے۔“

”لیکن کھل۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ذرا باہر جانا ہے۔“ اس نے جواب دیا۔

طبعی طور پر نور احمد کھل کر بات کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ ہر بات کو راز رکھتا اور صرف اسی بات کا اظہار کرتا جسے وہ ضروری سمجھتا۔

شہر سے باہر جا کر وہ پرانے مقبروں میں گھومتے رہے اور نور احمد ان مقبروں کی ٹوٹی ہوئی دیواروں سے چوٹا اکیڑتا رہا۔

”یہ کس لئے ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔“ نور احمد نے جواب دیا۔

”لیکن کس لئے اکٹھا کر رہے ہو۔“

سردیوں کے دن تھے۔ اس لئے اس وقت گیت نقل کرنا مشکل تھا۔ اس نے سوچا چلو کل نقل کر لوں گا اور شام کو کاپی لوٹا دوں گا۔ کیونکہ غلام نے تاکید کی تھی کہ گیت نقل کر کے جلد کاپی لوٹا دے۔

رات کے دو بجے کے قریب دروازہ بجا۔ ایلی جاگ پڑا۔ اس وقت کون ہو سکتا ہے۔ اس نے سوچا۔ نہ جانے کون ہے۔ شاید پڑوس کے دروازے پر ہو۔

دروازہ پھر بجا۔ شاید نورانی کا دوست ہو کوئی۔ یہ سوچ کر وہ خاموش پڑا رہا۔ پھر دروازہ کھلنے کی آواز آئی کوئی باتیں کر رہا تھا۔ پھر باتوں کی چاپ سٹکی دی اور نورانی اور غلام اس کے سرہانے آکھڑے ہوئے۔

”ارے تم ہو۔“ ایلی چلایا۔

”ہاں۔“ غلام مسکرایا۔

”حیرت ہے۔“

”مجھے وہ کاپی دے دو۔“

”کاپی۔ کیا کاپی لینے کے لئے آئے ہو۔“

”ہاں۔“

”اس وقت۔“

”ہاں۔“

”کیوں۔“

”بھئی۔ وہ مجھے سونے نہیں دیتے۔ فرماتے ہیں کہ ہماری کاپی اس پیشاب کے منکے میں کیوں پھینک آئے ہو۔“

”ارے۔“ ایلی کا دل ڈوب گیا۔ ”تو کیا میں پیشاب کا منکا ہوں۔“

”مجھے کیا معلوم۔“ غلام نے کہا۔ وہ بہتر جانتے ہیں۔“

غلام تو کاپی لے کر چلا گیا لیکن ایلی کو رات بھر نیند نہ آئی۔ جب بھی وہ آنکھ بند کرتا تو اس کے روہرو ایک بڑا سا منکا آ جاتا اور اس میں سے بدبو آتی۔ اور اس کا دماغ پھٹنے لگتا۔ وہ دل ہی دل میں شرمندگی محسوس کر رہا تھا اور طنزاً ”حاجی صاحب سے کہہ رہا تھا۔“ آپ تو کہتے تھے وقت آئے گا لیکن اب یہ پیشاب کا منکا۔“

زنی کتا

ان دنوں اس کا خالہ زاد بھائی جو میڈیکل کالج میں تعلیم پانے کے بعد جس کے ساتھ
ایچہ ہاتھ نہ تھا۔ ولایت میں ایم ڈی کی ڈگری حاصل کرنے چلا گیا۔ واپس وطن لوٹا اس کے
ساتھ اس کی آئرش بیوی بھی تھی۔ ایللی نے ڈاکٹر آصفی کو خط لکھا جس میں اس نے اپنی تکلیف
ع متعلق فکر مندی کا اظہار کیا۔ ڈاکٹر نے اسے لاہور بلا لیا۔

جب ایللی لاہور پہنچا تو ڈاکٹر نے اسے کہا:

”دیکھو بھائی جو علاج کرنا ہے تو آٹھ روز میرے پاس رہو۔ یہاں تمہیں صرف ایک
ٹکٹ ہوگی۔ ہم لوگ رات کا کھانا پونے آٹھ بجے کھاتے ہیں اور پھر آٹھ بجے لیٹ کر سو
جاتے ہیں۔ یہ بندش تم پر بھی رہے گی۔“
ڈاکٹر نے رات کے آٹھ بجے ایللی کو ایک کمرے میں بند کر دیا جس کے ساتھ ایک چنڈ ہاتھ نہ

تھا

”لیکن میں پیشاب کہاں کروں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”تمہارے کمرے میں دو کھڑکیاں ہیں۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”باہر باغیچہ ہے۔ جب چاہو
باہر نکل کر پیشاب کر لو۔ لیکن ڈاکٹر رک گیا۔ ”ذرا احتیاط سے باہر باغیچہ میں جانا۔“

”کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”رات کو کتا کھلا ہوتا۔“ یہ کہہ کر وہ باہر نکل گئے۔

ایللی روز ڈاکٹر سے کہتا کہ وہ اس کا معائنہ کریں لیکن ڈاکٹر صاحب کسی نہ کسی بہانے ٹال
دیتے۔ آٹھویں روز ایللی کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا۔ اس نے اپنا سامان باندھا اور علی پور جانے کی
تہائی کر لی جب ڈاکٹر نے سنا کہ وہ خفا ہو کر جا رہا ہے تو اس نے جلدی سے کاپی اٹھائی اور میز لگا
کر بیٹھ گیا۔

”ہاں بھئی ایللی۔“ وہ بولا۔ جانے سے پہلے ہسٹری تو بتا جاؤ۔“

ایللی کا غصہ اس حد تک پہنچا ہوا تھا کہ وہ ڈاکٹر آصفی سے علاج کرانے پر رضامند ہی نہ تھا لیکن
لہا کی آئرش بیوی نے اگر ایسی ایسی باتیں کیں کہ وہ کیس ہسٹری دینے پر مجبور ہو گیا۔
”ہاں بھئی ایللی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ تمہیں دن میں کتنی مرتبہ پیشاب آتا ہے۔“

”کام آئے گا۔“

”کس کام۔“

”دوائی کے طور پر۔“

”یہ دوائی بتائی ہے کیا۔“

”ہاں۔ ہاں۔“

”کس کے لئے۔“

”اپنے لئے۔“

”تیار ہو۔“

”ہاں۔“

”کیا بیماری ہے۔“

”سوزاک ہو گیا ہے۔“

”ارے۔“ ایللی اچھلا۔

نور احمد نے یوں سر سری بات کی تھی جیسے کوئی بات نہ ہو جیسے سوزاک نہ ہو اسرار ہو
گئی۔ یہ نور احمد کی عادت تھی۔

گھر پہنچ کر نور احمد نے ایک کورا گھڑا لیا۔ وہ پرانا چونا دھو کر اس میں ڈال دیا اور پھر اسے پانی
سے بھر دیا گرمیوں کے دن تھے۔ وہ دونوں سارا دن اکٹھے بیٹھے گیس ہانکتے رہتے اور نور احمد ہر
دس منٹ کے بعد ایک گلاس شکرے میں سے بھرتا اور غٹ غٹ پی جاتا۔ ایللی نے پیاس محسوس
کی۔ نور احمد بولا۔

”یہی پانی پیو نا۔“ تمہارے لئے بھی بہت فائدہ مند ہو گا۔ جگر کی گرمی اٹھائے گا۔“

اس کے بعد ہر دس منٹ بعد وہ دونوں اکٹھے پیشاب کرتے اور پھر ایک ایک گلاس پانی پی کر
پھر سے بیٹھ جاتے۔ دس پندرہ دن کے بعد ایللی نے محسوس کیا کہ اسے سلسل البول کی شکایت ہو
گئی ہے لیکن اس نے اسے چنداں اہمیت نہ دی۔ دو ایک سال گزر گئے۔

اس کے بعد ایللی نے محسوس کیا اسے سلسل البول کی بیماری ہو چکی ہے۔

”میں نے کبھی گنا نہیں۔“

”پھر بھی اندازاً۔“

”یہی آٹھ دس بار۔“

”اور پیاس کی کیا حالت ہے۔“

”بار بار پانی پیتا ہوں۔“

”کے بار۔“

”بس ایک چکر ہے۔ ادھر گلاس پانی کا پیا ادھر پیشاب کیا۔ دونوں عمل ساتھ ساتھ چلے

ہیں۔“

”سردیوں میں زیادہ آتا ہے یا گرمیوں میں۔“

”دونوں موسموں میں ایک سا۔“

”اچھا تو یہ بتاؤ کہ دن میں کون سے وقت زیادہ پیشاب کرتے ہو۔“

”کیا مطلب۔“

”صبح کے وقت زیادہ یا شام کے وقت۔“

”سونے سے پہلے۔“

”شام کو یا رات کو۔“

”لیٹ جانے کے بعد۔ چاہے جس وقت لیٹ جاؤں۔ جب تک نیند نہیں آتی تب تک۔“

”اچھا تو اب ان گزشتہ آٹھ دنوں کے کوائف لکھو دو مجھے۔“

”جی۔“

”کل رات لیٹنے کے بعد سونے تک کے مرتبہ پیشاب کیا۔“

ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

”اندازاً۔“

”کل تو نہیں کیا۔“

”ہوں۔ اچھا پرسوں۔“

پرسوں بھی نہیں۔“

”ایک بار بھی نہیں۔“

سارا دن تو کرتا رہا تھا۔“

”دن کی بات چھوڑو۔ بستر پر لیٹنے اور سونے کے درمیان کے وقفے کی بات کرو۔“

”اوسوں۔“

”نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی نے قہقہہ لگایا۔ بولا۔ ”دیکھو ایلی میں نے تمہیں آٹھ دن انٹر آبزرویشن رکھا

ہے اور گزشتہ آٹھ روز تم نے سوتے وقت پیشاب نہیں کیا حالانکہ یہ وہ وقت ہے جب کہ

تمہیں تمہارے بیان کے مطابق بہت زیادہ پیشاب آتا ہے۔ اگر تمہاری اس بیماری کو ایک خیالی

یخ کا ڈر روک سکتا ہے تو بتاؤ یہ بیماری جسمانی ہوئی یا ذہنی۔ میری جان! تمہیں کوئی بیماری

نہیں۔“

ڈاکٹر آصفی کا قہقہہ دیر تک گونجتا رہا حتیٰ کہ علی پور جاتے ہوئے گاڑی کی چمکا چمک میں بھی

”ڈاکٹر کے قہقہے کی آواز سنتا رہا۔“

آج پھر وہ ڈاکٹر کی آواز سن رہا تھا۔ ”ہی ہی ہی۔ ایلی بھی تمہارا علاج تو سہل ہے۔“

”فصل خانے میں ایک کتاب بندھ لو ہی ہی ہی۔“

پیشاب کا منکا پیشاب کا منکا!

”پیو۔ پیو۔“ نور احمد چہلنے کے گھڑے سے پانی نکل کر اسے دے رہا تھا۔ ”یہ تمہارے جگر

کی گرمی اٹھالے گا۔“

اگلے روز صبح سویرے ایلی کے سر پر ایک دھن سوار تھی۔ صرف ایک دھن۔

پس پات چور

اس روز وہ سکول بھی نہ گیا بلکہ سیدھا ہسپتال پہنچا۔ انچارج ڈاکٹر محمد علی اس کا اچھی طرح

سے واقف تھا۔ وہیں اس نے ایلی کی تمام کیس ہسٹری بڑے غور سے سنی۔ پیشاب ٹٹ کیا اور

بھڑولا۔

”ایلیاس صاحب۔ ہمارے ہاں کیمیکل امتحان کا سامن تو ہے لیکن مائیکرو سکوپک ٹٹ کا

انتظام نہیں لہذا آپ علاج کرانا چاہتے ہیں تو لاہور چلے جائیں۔ وہیں کے سول سرجن میرے

لاست ہیں۔ ان کے نام خط لکھ دیتا ہوں۔ آپ ان سے جا ملیں وہیں مائیکرو سکوپک ٹٹ کا

انتظام ہو جائے۔“

ڈاکٹر محمد علی کا خط دیکھ کر سول سرجن اسے بڑی گرجوٹی سے ملا۔

”کیا آپ پیشاب ساتھ لائے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں تو ڈیرہ سے آیا ہوں۔“

”اوہ ٹھیک ہے۔“ وہ بولا۔ ”یہ تو کیس ہی مختلف ہے۔ فریکوئنسی آف یورن کی شکایت

ہے نا۔“ انہوں نے ایک اسٹنٹ کو بلایا۔ ”بھئی انہیں پس پاٹ دے دو اور غسل خانہ دکھا دو۔“

صاحب آپ پیشاب لے آئے۔“ انہوں نے گھڑی دیکھی۔ ”گیارہ بجے ہیں ابھی بت وقت ہے۔

آپ شام تک ڈیرہ واپس پہنچ سکیں گے۔“

سول سرجن کے اسٹنٹ نے اسے پس پاٹ پکڑا دیا۔ وہ غسل خانے میں جا بیٹھا۔ بارہ بج

گئے لیکن اسے پیشاب نہ آیا۔ جیسے پیشاب کا سلسلہ ہی موقوف ہو چکا ہو۔ ایک بجے اس کی

پریشانی بڑھنے لگی۔ دو بج گئے چار بج گئے۔

باہر ڈاکٹر چلا رہا تھا۔ ارے بھئی وہ فریکوئنسی آف یورن کا مریض کیا ہوا۔“

”کچھ پتہ نہیں صاحب۔“

”کیا اسے ابھی تک پیشاب نہیں آیا۔ مسخرو تو نہیں کوئی۔“

”کھیں پس پاٹ چرا کر نہ لے گیا ہو۔“ کپاونڈر نے کہا۔

”ارے بھئی دیکھنا ڈاکٹر قلعہ مار بولا۔“

ایلی نے چپ چاپ خالی پس پاٹ زمین پر رکھا اور غسل خانے کے پچھلے دروازے سے باہر

نکل کر بھاگا گاڑی ڈیرہ کو جا رہی تھی۔ وہ شور مچا رہی تھی۔ پیشاب کا مٹکا!

ڈاکٹر آصفی قلعہ مار رہا تھا۔ ”کتا پال کتا۔“

”میری کاپی دے دو کاپی۔“ غلام چلا رہا تھا۔

”مسخر۔ مسخر۔“ سول سرجن ہنس رہا تھا۔

”نہیں نہیں۔ پس پاٹ چور۔“ کپاونڈر ہنس رہا تھا۔

ایلی کی اس ذہنی پریشانی کا کوئی علاج نہ تھا۔ صرف ایک چیز تھی جو اس کی پریشانیوں اور

خفتوں کو جذب کر سکتی تھی۔ جذب کر لیتی تھی۔ اور وہ غلام کی ستار تھی۔

وہی غلام جس کے آقا ایلی کو پیشاب کا مٹکا سمجھتے تھے لیکن ایلی کے لئے غلام اور اس کے

اسے دور رہنا ممکن نہ تھا اس لئے سیشن سے وہ سیدھا غلام کے گھر پہنچا۔ دروازہ کھٹکھٹایا۔

”کون ہے۔“ غلام کی آواز آئی۔

”پیشاب کا مٹکا۔“ ایلی نے اپنی خفت مٹانے کے لئے کہا۔

”آپا ابھی آیا۔“ بم اللہ بم اللہ۔“ وہ دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔ ”اتنے دن کس

”میں تمہارا ہمارا ساتھ۔ تم پوتر ہم پلید تم نگ پچکاری۔ ہم پیشاب کے مٹکے۔“

غلام نے قلعہ لگایا۔ ”تم تو بڑے خوش قسمت ہو بھائی جو صرف پیشاب کے مٹکے ہو۔ پتہ

بچے کیا خطاب ملا ہے۔“

”کیا؟“

غلام مسکرایا۔ ”فرمایا۔ تم تو زانی نفس ہو۔“

”کیا واقعی۔“

”تمہاری قسم۔“

اس ایک جملہ نے ایلی کو اس قدر تسکین دی۔ اس قدر تسکین دی جو دنیا بھر کے ڈاکٹر نہ

لے سکتے تھے اور اس کی زندگی میں جو یہ نئی تنگی پیدا ہوئی تھی ختم ہو گئی۔ اس کے بعد کے

ان ستار کی تاروں کی لرزشوں نے صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑا دیئے اور وہ اس کراہتی

ان ستار کے پہلو میں بیٹھ گیا جیسے تار کو کھینچنے والی کیل ہو جو ستار کے بازو پر لگی ہوئی تھیں۔

دکھانم

ایک روز شام کے وقت ایلی بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چلا گیا۔ اس نے دیکھا

انہیں بیٹھا کام کر رہا ہے۔ بیٹھک کے باہر سڑک کے کنارے چہوڑہ تھا جس پر بعد دوپہر

بپ آجاتی تھی۔ نورانی اس چہوڑے پر بیٹھ کر کام کیا کرتا تھا۔ لیکن اس کے بیٹھے کا انداز نہ

سڑک کی طرف پیٹھ کر لیتا میز دیوار کے ساتھ لگا لیتا۔

ڈیرہ میں وہ سڑک خاص طور پر مشہور تھی۔ چونکہ شام کے وقت ہندو خواتین پنڈتائیاں

ٹھیلیاں اور لالائیاں اس سڑک پر سیر کرتی تھیں۔ شوقین مزاج لوگوں نے اس سڑک کو پچھٹ

اسے رکھا تھا۔

ایلی خود کئی بار شام کے وقت بیٹھک سے باہر چوتھے پر کھڑا ہو جایا کرتا تھا۔ ہندو خانہ جو ادھر سے گزرتی تھیں عام طور سے خوبصورت ہوتی تھیں لیکن سب سے بڑی بات یہ تھی ان کے چروں پر شرم و حیا کی سرخی جھلکتی تھی۔ آنکھیں ہمیشہ جھکی جھکی رہتیں اور چہنچہ کرنے کوئے تلاش کرتیں اور جسم اپنا اعلان کرنے کی بجائے سنا سنا رہتا۔ ایلی کو انہیں دیکھ کر محسوس ہوتا تھا جیسے عصمت و عفت اور شرم و حیا کی پہاڑیوں پر ننھے ننھے چشمے ابل رہے ہوں لیکن نورانی کا رویہ عجیب تھا۔ وہ سڑک سے منہ موڑ کر کیوں بیٹھ رہتا تھا اسے بد صورتی کا احساس تھا۔ کیا واقعی؟

ایک روز ایلی نے طنزاً "نورانی سے کہا۔" نورانی صاحب۔ آپ سڑک کی طرف نہ کر کیوں نہیں بیٹھتے۔ کیا آپ کو یہ ڈر ہے کہ کوئی راہ چلتی آپ کو دیکھ کر آپ کی محبت میں ابر ہو جائے۔"

نورانی نے کام سے سر اٹھائے بغیر جواب دیا۔ "کیا فائدہ۔"

"کیا مطلب۔"

"یہاں سے بچیاں گزرتی ہیں۔ خواہ مخواہ کسی کو الجھن میں ڈال دوں تو۔"

ایلی کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔ "کیا واقعی اس خیال سے آپ سڑک کی طرف بیٹھ کرے؟"

ہیں۔"

"ہاں یہ ڈر ہے۔" وہ بولا۔

"ارے۔" ایلی چلا اٹھا۔ "کیا آپ خود کو حسین سمجھتے ہیں۔"

"نہیں ایسی بات نہیں۔"

"تو پھر۔"

"الیاس صاحب کشش اور چیز ہے حسن اور۔"

"تو کیا آپ میں کشش ہے۔"

"بالکل ہے۔"

"ہمیں تو نہیں محسوس ہوتی۔"

"آپ عورت نہیں ہیں اس لئے۔"

"ارے۔"

ایلی اٹھ بیٹھا۔ ایلی کے قریب آ کر کہنے لگا۔ "الیاس صاحب اگر میں کسی عورت کی آنکھ اٹھا کر دیکھ لوں۔ نگاہیں چار ہو جائیں تو وہ میری تلاش میں آپ کا دروازہ نہ کھٹکٹائے۔"

"شرط رہی۔" ایلی چلایا۔

"یہ جی۔ شرط نہ لگاؤ۔" نورانی پھر سے کرسی پر بیٹھ کر بولا۔

"ڈرتے ہیں آپ۔"

"ہاں۔ وہ بولا۔" خواہ مخواہ آپ ہار جائیں گے۔"

"ارے۔" ایلی چلایا۔ "اس قدر زعم ہے۔"

"اس سے بھی زیادہ۔" نورانی نے کہا۔

"تو شرط رہی۔"

"بھلا۔" وہ بولا۔ "اگر آپ مصر ہیں تو۔"

"مفہور ہے۔" ایلی بولا۔

لیکن اس میں دو چار شرائط ہوگی۔ عورت میں خود منتخب کروں گا۔ ایلی نے کہا۔

"غور۔" وہ بولا۔

"اگر آپ کوئی شرط عائد کرنا چاہیں تو۔" ایلی نے پوچھا۔

"ہاں۔" نورانی نے کہا۔ "پہلی شرط یہ ہے میرا نام اور پتہ نہ بتانا ورنہ بدنامی ہوگی۔"

"ٹھیک ہے۔"

"دوسری بات یہ کہ مجھے مناسب موقع دیا جائے کہ میں عورت کو اچھی طرح دیکھ لوں۔"

"ٹھیک۔"

"تیسری بات یہ ہے۔ شرط نہیں منت ہے۔"

"ایسا۔"

"میں معصوم بچی کو نہ منتخب کرتا۔ اس کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔"

لی نورانی کے یقین کامل پر حیران تھا۔

دن ایلی سوچتا رہا۔ اس مسئلے پر نہ وہ غلام سے بات کر سکتا تھا نہ اسد سے اور نہ کسی اور سے چونکہ اس نے نورانی سے وعدہ کیا تھا کہ اس شرط کے بارے میں کسی سے ذکر نہیں

”خود گونگے ہیں شاید۔“ گورا بولی۔

”ہی۔“ ایلی نے کہا۔ ”بولنا نہیں جانتے۔ دیکھنا جانتے ہیں۔ تاجر ہیں نا اس لئے۔“

”تاجر ہیں۔“ بنو نے کہا۔

”ہی۔“ موٹوں کا کاروبار ہے۔“

”اسب دیر تک کہیں ہانکتے رہے لیکن نورانی اسی طرح گھٹا گھٹا کم صم بیٹھا رہا۔ پھر اس نے

”کوئی ہے؟“

”یہ ہے۔“ ایلی نے اعلانیہ بنو کا ہاتھ پکڑ کر نورانی کے ہاتھ میں تھما دیا۔

بنو نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔ نورانی نے بلا تکلف بنو کا بازو کھینچ کر اسے اٹھالیا اور

”گمراہ نہیں۔“ ایلی بولا۔ ابھی آجائیں گے۔ کوئی ایسی ویسی بات نہیں۔“

”ایسی ویسی بات ہو بھی تو کیا ہوا۔“ بنو بولی۔

”ہیں بھی لے چلے کوئی۔“ گورا ہنسی۔

”جیس نہیں البتہ۔“ ایلی نے بنو کا ہاتھ پکڑ لیا اور دوسرے کمرے کی طرف چل پڑا۔

”یہ کیا مذاق ہے۔“

کمرے میں پہنچ کر ایلی نے کہا۔ ”مذاق نہیں۔ جمیل نے کہا تھا کہ تم دکھ جذب کر لیتی ہو۔

”ناہ۔“ میں دکھی ہوں۔ بنو! میرا کچھ کرو۔“

”لاہنے لگی۔“

”گورا نہ بنو۔“ وہ بولا ”ہنسی سے دکھ دور نہیں ہوتا۔“

”تو پھر۔“ وہ بولی۔

”تسے کیا پتہ دکھ کیسے دور ہوتا ہے۔“

”مٹے بھی تو پتہ نہیں۔“ وہ بولی۔

”اچھا تمہاری مرضی۔“ وہ بولا اور اس نے بنو کے ہاتھ میں بیس روپے تھما دیئے۔

”کیسے ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”گولوں کے دن ہیں۔ ریوڑیاں اور مونگ پھلی کھا لیتا۔“

کرے گا۔ ان کے مکان کے گرد لڑکیاں تو بہت رہتی تھیں اور وہ چلا چلا کر اپنی موجودگی کا پیغام
ان تک پہنچاتی رہتی تھیں۔ سڑک پر آنے جانے والی ہندو خواتین بھی تھیں لیکن ایلی نے سڑک
ایسی عورت کا انتخاب کیا جائے جو اس قدر جہاندیدہ ہو کر اسے فریفتہ کرنا آسان کام نہ ہو۔
”بنو! دفترا“ اسے خیال آیا اور وہ اچھل پڑا۔ طائفہ بھلا کب کسی کی بنتی ہے۔
اسے کسی کا ہو جانے کا چاؤ بھی نہیں ہوتا اور پھر بنو تو واقعی پناخہ ہے۔

بہرو پیئے

اگلے روز رات کے نو بجے کے قریب نورانی اور ایلی گھر سے نکلے۔ دونوں نے کالے کمرے
اوڑھ رکھے تھے تاکہ کوئی انہیں پہچان نہ لے۔ سڑک پر پگڑیاں باندھ رکھی تھیں۔ ایلی آگے
آگے جا رہا تھا نورانی اس کے پیچھے پیچھے تھا۔

جب وہ چنگے میں پہنچے تو نورانی رک گیا۔

”اچھا تو طوائف کا انتخاب کیا ہے آپ نے۔“

”یہ شرط تو نہ تھی کہ یہاں کی نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”مشکل کام دیا ہے آپ نے۔“ نورانی بولا۔ ”لیکن کچھ پروا نہیں چلے۔“

بنو کے گھر جا کر ایلی نے کمرے اور پگڑی اتاری اور بے تکلفی سے ان سے باتیں کرنا لگا۔

”آئیے۔“ وہ بولا۔ ”آپ کو اپنے ایک دوست سے ملاؤں۔ یہ آج ہی دلی سے آئے ہیں۔“

صرف ایک روز کے لئے ٹھہریں گے یہاں ڈیرے میں۔“

”آپ کی تعریف۔“ بنو بولی۔

ایلی نے جھٹ جواب دیا۔ ”عظمت خاں۔“

”بڑا ٹھاٹھ دار نام ہے“ گورا ہنسی۔

”خود بھی تو ٹھاٹھ دار ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”فی الحال تو پگڑی اور کمرے ہی دکھائی دیتے ہیں۔“ گورا ہنسی۔

”اور یہ پتہ نہیں چلتا کہ کمرے ختم ہوا اور عظمت خاں شروع ہوئے۔“ بنو۔

کہا۔

”یہی تو کمال ہے۔“ ایلی بولا۔

”جی۔ لالہ جی بلاتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”لالہ جی۔“ ایللی نے لاپرواہی سے دہرایا۔

لالہ جی ان کے ہید ماسٹر تھے۔ وہ عمر میں بچپن کے قریب تھے اور طبیعت کے لحاظ سے ستر لائے ہوں گے۔ انہیں معلوم تھا کہ ایک سال کے اندر اندر وہ پنشن پانے والے ہیں لہذا پانے پہلے ہی پنشن کی مشق شروع کر دی تھی۔ سارا دن باہر دھوپ میں یا اندر کمرے میں رہتے۔ نہ کسی استلو سے بگڑتے نہ کسی کو منہ لگاتے۔ البتہ جب بھی بن آتی لوگوں کی مدد لےتے تھے۔

ایلی دفتر میں داخل ہوا تو بنو کو لالہ جی کے روبرو کرسی پر بیٹھے دیکھ کر گھبرا گیا لیکن جلد ہی پانے خود کو سنبھالا۔

”جی لالہ جی۔“ وہ بولا۔

”یہ آپ کے مہمان ہیں۔“ لالہ جی نے بنو کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ پھر بنو سے کہنے لگا۔
”اپنا ذرا دفتر سے باہر یاغیے میں چلئے یہ ابھی آتے ہیں۔“
بنو اٹھ کر کمرے سے باہر نکل گئی۔

لالہ جی نے نگاہیں جھکا لیں اور بولے۔ ”الیاس صاحب! مجھے آپ سے یہ توقع نہ تھی۔
— دیکھئے نا عورت کا سکول میں آنا۔ بچوں پر کیا اثر پڑے گا۔ آپ نے بلانا ہی تھا تو گھر
پاہونے۔“

”لالہ جی۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”اگر میں بلاتا تو گھر ہی بلاتا۔ اس کا میں سکول میں آنا ہی
لبات کا ثبوت ہے کہ نہ تو میں نے اسے بلایا ہے نہ میں اسے جانتا ہوں۔“
لالہ جی نے آنکھ اٹھا کر غور سے ایللی کی طرف دیکھا اور بولے۔ ”اچھا تو دیکھئے کہ بات کیا
ہے۔“

ایللی یاغیے میں پہنچا تو بنو اس پر یوں جھپٹی جیسے چیل گوشت پر جھپٹی ہے۔

”نہ جانے۔“ وہ بولی۔ ”بنو کو کیا ہو گیا ہے۔ وہ تو اسی روز سے تمہارے دوست کی ملا جپتی
ہے کتنی ہے۔“ اے بلواؤ۔“

”ارے۔“ ایللی چلایا۔ ”کیا واقعی۔“

”نہ جانے کیا کر دیا ہے اس نے میری بنو پر۔“ بنو کی آواز گلو گیر تھی۔

”فضول۔“ وہ غصے میں چلائی۔

”شانت شانت۔“ ایللی نے کہا۔ تم تو نروان دینے والی ہو۔ سچ پاکیوں ہوتی ہو۔“

”دینے والی ہوں۔ لینے والی نہیں۔“

”تو دے دو۔“ وہ اس کی طرف بڑھا۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھکی۔

ایللی نے اس کے سامنے ہاتھ پھیلا دیا۔ اس پر رکھ دو۔“

”کیا؟“

”جو تمہارے پاس ہے دینے کو۔“

وہ غمی۔ ”آپ عجیب باتیں کرتے ہیں۔“

”ان باتوں میں نہ پھنس جانا۔ اونچے بول اندر سے دھول والا معاملہ ہے۔“

”آؤ نا بھی اب۔“ نورانی نے اسے آواز دی۔

”کیوں۔ ہو گئے فارغ۔“

”لا حول ولا قوۃ“ وہ غصے میں پھنکارا۔

”اوہ میرا مطلب تھا۔“ ایللی نے معذرت کی۔

”بس گھورتے ہی رہے۔“ بنو چلائی۔

ایللی نے غور سے بنو کی طرف دیکھا۔ اس پر نورانی کی نگاہ کا کوئی اثر نہ تھا۔ ”مار لیا میدان

..... اس نے سوچا۔

اگلے روز نورانی دورے پر چلا گیا۔ اور دو ہی دن میں ایللی بالکل بھول گیا کہ اس نے شرٹ
بدھی تھی۔ اور بنو کو تختہ مشق بنایا تھا۔ وہ پھر سے غلام کی ستارے کے پاس جا بیٹھا اور جے جے
دیتی اور کیدارے میں کھو گیا۔

پیاں پڑوں گی ہلنگھانہ چڑھوں گی پیاں پڑوں گی۔

غروب و طلوع

چند روز بعد ایک روز جب ایللی نویں جماعت کو تاریخ جغرافیہ پڑھا رہا تھا تو چہرہ اسی آیا۔

”تو پھر بتانے میں کیا حرج ہے۔“

بس دیا اب سمجھنے ہی کو ہے۔
”کیا مطلب؟“

”ڈاکٹروں نے جواب دے دیا ہے۔ اللہ ماری سپرٹ پی پی کر بھیبھڑا جل گیا ہے۔“
فرحت نے کہا۔

”بس آج نہیں تو کل۔۔۔“ ہاجرہ کی ہنسی نکل گئی۔ ”تو کیوں روتی ہے اہل۔“ فرحت نے غصے سے کہا۔ ”اے ہے۔“ وہ روتے ہوئے بولی۔ ”میرے بھائی کا بیٹا ہے آخر۔“ ”اچھا تو میں چلتا ہوں۔“ ایللی نے کہا۔

”اے ہے کھانا تو کھالے۔“ فرحت نے کہا۔ ”میراجی نہیں چاہتا۔“ ایللی نے کہا۔ پاؤں کی چاپ سن کر ایللی نے دروازے کی طرف دیکھا۔ دروازے میں شنراؤ کھڑی تھی۔ اس کے چہرے سے اداسی اور تشکر نکھ رہے تھے۔ ”کون شنراؤ ہے۔“ فرحت بولی۔ ”پہلے تو ناہتی ناہتی دما چوکڑی چاتی آیا کرتی تھی اور اب بلی کی طرح دبے پاؤں آتی ہے۔“ ”وقت وقت کی بات ہے۔“ شنراؤ نے جواب دیا۔ ”یہ ایللی کب آیا؟“

”ابھی آیا ہوں۔“ ایللی نے روکے انداز سے کہا۔ ”مجھے تو آج ڈر لگتا ہے۔“ شنراؤ نے کہا۔

”تجھے اور ڈر۔“ فرحت نے کہا۔ ”وہ ڈر کے زمانے گزر گئے کیا؟“ شنراؤ نے آہ بھری۔ ”بیت گئے۔“ وہ بولی۔ ”کس بات کا ڈر ہے تجھے۔“ ہاجرہ نے پوچھا۔

”پڑوس سے خیر کی آوازیں نہیں اٹھ رہیں۔“ وہ بولی۔ ”ہاں وہ تو ہے ہی نہ جانے کس وقت۔“ فرحت رک گئی۔ ”تو ایللی کو لے جا تو اپنی طرف۔“ ہاجرہ نے کہا۔ ہاجرہ کی اس بات پر وہ سب چونک پڑے۔ فرحت نے حیرت سے ہاجرہ کی طرف دیکھا۔

”اور جو کسی کو پتہ چل گیا تو۔۔۔“ فرحت بولی۔ ”تو بھی مکمل کرتی ہے اہل۔“

”ہم کسی کو بتائیں گے تو پتہ چلے گا۔“ ہاجرہ نے کہا۔

فرحت غصے سے لال ہو گئی۔ ”واہ اہل واہ۔“

”ویسے بھی تو اس نے جانا ہی ہے نا۔“ ہاجرہ چلائی۔ ”ان دونوں کو آج تک تو کوئی روک نہ

سکا۔ اب فضول غصہ چڑھانے سے فائدہ۔“

ایللی اٹھ بیٹھا۔ ”چلو شنراؤ۔“ وہ بولا۔ ”میں چلوں گا۔ تمہارے ساتھ۔“

شنراؤ نے حیرت سے ایللی کی طرف دیکھا اور چپ چاپ اس کے آگے آگے چل پڑی۔

ب کیا ہے

جب وہ چوبارے میں پہنچے تو شنراؤ کے تینوں بچے سو رہے تھے۔ اس کی تین بڑی لڑکیاں پہ نیند اور ریحانہ تو پہلے سے ہی گرد چٹن کے سکول میں داخل تھیں چونکہ علی پور میں لڑکیں کالہی سکول نہ تھا۔ اس لئے شنراؤ نے گرد چٹن بھیج دیا تھا جو علی پور سے بیس میل کے فاصلے پر تھا اور جہاں وہ بورڈنگ میں رہتی تھیں۔ دو لڑکے اور ایک لڑکی اور میں بیدی اور ناز کے ساتھ رہتے تھے۔ وہ تینوں عمر میں بہت چھوٹے تھے۔ لہذا شام ہی سے سو گئے تھے۔ اس کی ملازمہ جانو ان دونوں اپنی بیٹی سے ملنے کے لئے لاہور گئی ہوئی تھی۔ ”کھانا کھاؤ۔“ شنراؤ نے کہا۔ ”میراجی نہیں چاہتا۔ ایک پیالہ چائے کا پلا دو البتہ۔“ ایللی نے جواب دیا۔ وہ چولے پر بیٹھ لہائے بنانے لگی۔

ایللی اس کے پاس بیٹھ گیا۔ دیر تک دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ ”ہاجرہ نے بڑی جرات کی ہے آج شنراؤ نے کہا۔“ اور تم نے بھی۔“ اب کیا ہے۔“ اور پھر مدھم آواز میں گنگنائے لگا۔ ”اب جو کچھ گزرتا ہے جان پر گزر جائے۔“

وہ پھر خاموش ہو گئے۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ شنراؤ بات کیوں نہیں کرتی۔ ویسے بلا سمجھا ہے۔ لیکن خاموش ہے۔ ”خط لایا تھا۔“ شنراؤ نے پوچھا۔ ”ہاں“ وہ بولا۔ ”مجھ سے ملنے آئے ہو۔“

”ہاں“ اس نے جواب دیا۔ ”مجھے پتہ تھا تم آؤ گے۔“ وہ بولی۔

”اچھا؟“ اس نے طنز کیا۔

”نہ بھی آتے۔“ وہ بولی۔ ”تو مجھے گلہ نہ ہوتا۔“

”اوہ۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”کمال جا رہی ہو۔“ ایللی نے پوچھا۔

”معلوم نہیں۔“

”پھر بھی۔“

”شاید عیسائی ہو جاؤں۔“

”اس سے کیا ہو گا۔“

”مزدوری کر سکوں گی۔“

”مجھے ساتھ لے چلو“ ایلی نے کہا۔

”اونہوں۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“

”بس نہیں کہہ جو دیا۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ایک بات پوچھوں۔“ ایلی نے کہا۔

”پوچھ۔“

”کیوں جا رہی ہو۔“

”اب اس گھر میں رہنا ناممکن ہو چکا ہے۔“

”کیوں۔“

”بے عزتی کی زندگی سے بھیک مانگ لینا اچھا ہے۔“

”شریف آیا تھا کیا؟“

”ہاں۔“

”کب آیا تھا۔“

”جس روز تمہیں خط لکھا تھا اسی روز گیا تھا وہ۔“

”کچھ کتنا تھا۔“

”بہت کچھ۔“

”کیا؟“

”چھوڑو اس بات کو۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ادھر کا دروازہ بند ہے کیا؟“ ایلی نے پوچھا۔

”مکہ ہر کا۔“

”فرحت کی طرف کا۔“

”نہیں تو۔“

”ہر آؤ۔“

”ایسا فرق پڑتا ہے؟“ وہ مسکرائی۔

”مزدوری آجائے تو۔“

”مگر ہم کچھ کرنے لگ جائیں تو۔“

”کیا ہے۔“ وہ پھر خاموش ہو گئے۔

”ایک وہ خاموش بیٹھے رہے۔ شہزاد نے چائے تیار کر دی۔

”میں رکھ دوں۔“ وہ بولی۔

”نہیں رہنے دو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہاں۔“

”ہاں۔ تم بیوگی۔“

”بیوگی۔“

”شہزاد۔“ وہ بولا۔ ”کیا تم زندگی سے اکتا گئی ہو۔“

”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”ابھی کہیں۔“

”اب تو وہ تڑپ نہیں رہی۔“

”لوں تو۔“ وہ بولی۔ ”تڑپ تو ہے۔“

”تو پھر لو اس کیوں ہو۔“

”لو اس نہیں۔“ وہ بولی۔

”ہاں۔“

”دوری ہوئی ہوں۔“

”کیسی۔“

”میں شربلی پڑوسی سے۔“

”مختار سے۔“

”اے۔ روز میرا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے مجھے معاف کر دو تو مروں گا۔ ورنہ نہیں۔“

”اگر دو نا معاف۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں نہیں مانگ۔“

”اتنی سخت گیر تو نہیں تو۔“

”عورت ہوں۔“ وہ بولی۔

”اوہ۔۔۔“ اور وہ پھر خاموش ہو گئے۔

دھنسا ”شنراو بولی۔“ تو وہاں کیوں کھڑی ہے یہاں آجا۔“

ایلی حیران تھا کہ کس سے بات کر رہی ہے۔

فرحت مسکراتی ہوئی دروازے سے نکل کر اندر آگئی۔ ”میں نے کہا دیکھوں تو کیا کر رہے

ہیں۔“ وہ بولی۔

”یہاں بیٹھ کر دیکھو۔“ شنراو بولی۔ ”چپ کر دیکھنے سے کیا فائدہ۔“

”میں تو حیران ہوں۔“ فرحت بولی۔ ”تم دونوں ہی عجیب ہو۔“

”کیوں۔“ شنراو نے پوچھا۔

”یوں بیٹھے ہو۔ جیسے صدیوں سے ایک ہی گھر میں اکٹھے رہتے ہو۔“

”وہ تو ہے۔“ شنراو بولی۔ ”صدیوں سے اکٹھے رہتے ہیں ہم۔ کیوں ایلی۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا ”صدیوں سے۔“

”اور میں سمجھتی تھی۔“ فرحت ہنسی۔

”تو جوجی چاہے سمجھ تیرا کیا ہے۔“ شنراو بولی۔

ایلی یا دونوں

فرحت چند ایک منٹ ٹھہری اور پھر ہمانہ بنا کر چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد وہ اسی طرح چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”دیکھو شنراو۔“ ایلی اٹھ بیٹھا۔ ”اگر تم نے جانا ہی ہے تو چلو اکٹھے چلیں۔“

”بڑی بدنامی ہوگی۔“

”پھر کیا ہوا۔“

”تم برداشت نہ کر سکو گے۔“

”میری بات چھوڑو۔“ وہ بولا ”میں مرد ہوں۔ بس یہی کچھ برداشت کر لوں گا۔ تم عورت ہو۔“

میری تنخواہ بہت قلیل ہے۔ تم غربت برداشت نہ کر سکو گی۔ تم غربت سے واقف نہیں شنراو

اگر تم بچے چھوڑ جاؤ گی تو تم ان کی جدائی برداشت نہ کر سکو گی۔“

وہ خاموش رہی۔

”ہلو ہٹ۔“ ایلی نے اسے جھنجھوڑا۔

”میں تمہیں ساتھ لے جانے کے لئے تیار نہیں۔“ وہ بولی۔

”کیا یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔

”ایک بات کہوں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کو۔“

”چلو اس کا فیصلہ نہ تم کرو نہ میں کرتا ہوں۔“

”تو پھر۔“

”دیکھیں قدرت کو کیا منظور ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”وہ کیسے؟“

”آؤ پرچیل ڈال لیں۔ ایک پر لکھیں دونوں دوسری پر ایلی تم ایک پرچی اٹھاؤ۔ اگر ایلی

ایں چپکے سے چلا جاؤں گا اور اگر دونوں نکلا تو تم چپکے سے میری ساتھ چل پڑنا۔

وہ خاموش ہو گئی۔

”ہلو منظور ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ اسی طرح خاموش بیٹھی رہی۔“

دیر کے بعد اس نے آہ بھری۔ چلو ساری عمر جو اٹھیا ہے تو اب کی بار بھی سہی۔“ شنراو

”تو منظور ہوا۔“ ایلی نے کہا۔

”لیکن میری ایک شرط ہوگی۔“ وہ بولی۔

”کیا؟“

”وعدہ کر کہ اگر ایلی کی پرچی نکل آئی تو تم شادی کر لو گے۔ میرے جانے کے فوراً بعد

اننگی بھر مجھ سے نہیں ملو گے۔“

”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

وہ اٹھی۔ ٹرک سے کاپی کا ورق پھاڑا۔ پنسل لی اور لکھنے بیٹھ گئی۔
 دفعتاً نہ جانے اسے کیا ہوا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے ہاتھ کانپنے لگے۔ اس نے
 لی میز پر رکھ دی اور دونوں ہاتھوں میں سر تھام کر رونے لگی۔
 "شیراز۔" شیراز۔" ایلی نے اسے جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کی توں پتھری طرح بیٹھی رہی۔

نہیں مروں گا

— عین اس وقت ملحقہ کمرے سے شور مچا دیا۔
 "نہیں نہیں۔ میں نہیں مروں گا۔ نہیں مروں گا۔" صغدر چلا رہا تھا وہ کمرے میں ادھر سے
 اور ادھر سے ادھر پھر رہا تھا۔
 "نہیں نہیں نہیں نہیں۔" وہ چلائے جا رہا تھا۔
 شیراز نے سر اٹھایا اور غور سے سُنے لگی۔
 "نہی کے ابا نہی کے ابا۔" صغدر کی بیوی اس کی منتیں کر رہی تھی۔ "خدا کے لئے ان
 نے ہموئے بچوں کے لئے۔"
 "ہلی جاؤ چلی جاؤ۔" وہ چلانے لگا۔

"ان بچوں پر رحم کرو۔ میں تمہارے پاؤں پڑتی ہوں۔" وہ رو رہی تھی۔
 "ہلی جاؤ، چلی جاؤ۔ مجھ پر کسی نے رحم نہیں کیا۔ میں کسی پر رحم نہیں کروں گا۔"
 "گپے آپ پر رحم کرو۔ یہ زہر نہ پیو۔" اس کی بیوی بولی۔
 "ہٹ جاؤ، ہٹ جاؤ۔ دفع ہو جاؤ۔" وہ چیخ رہا تھا۔
 "خدا کے لئے خدا کے لئے۔" وہ کراہ رہی تھی۔
 ملحقہ کمرے پر خاموشی چھا گئی۔ وہ دونوں دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔
 "شیراز۔" ایلی بولا۔ "کیا سوچ رہی ہو؟"
 "کوئی بھی نہیں۔"
 "نہی طرف دیکھو۔"

انہوں نے سر اٹھایا۔ اس کی گالوں پر آنسو ڈھلک رہے تھے۔
 صغدر رہا تھا۔ نہ جانے صغدر کے متعلق کوئی بات تھی۔ جو شیراز چھپا رہی تھی۔

"میری خاطر ہمیشہ سب کچھ ہوتا آیا ہے۔" وہ بولی۔ "یہ بھی ہو گا۔ جو بھی میں چاہوں گی ہو
 کے رہے گا۔" وہ مسکرا دی۔

"کیا مطلب؟"
 "میں ابھی جیتی ہوں۔" وہ بولی "مجھے مزہ نہ سمجھو۔ مجھ میں ابھی کس بل ہے۔" اس کی
 آنکھوں میں چمک لہرائی۔

"میری خاطر تم بہ بھی کرو گے۔ دیکھ لیتا۔"
 "اور نہ کروں تو۔"

"تو میرا آخری فیصلہ تم ہی چکے ہو۔"
 "یعنی جوا نہیں کھیلو گی۔"

"اوہ نموں۔" شیراز نے نفی میں سر ہلایا۔
 "اچھا۔" ایلی بولا۔ "مجھے منظور ہے۔"

"وعدہ۔"

"تمہاری قسم۔"

"مجھے تم پر یقین ہے۔"

"لیکن دونوں نکلا تو میری بھی ایک شرط ہو گی۔ تمہیں وعدہ کرنا ہو گا۔" ایلی نے کہا۔
 "کیا؟"

"اگر بچوں کو ساتھ لے جاؤ گی تو غربت برداشت کرنی پڑے گی اور اگر بچوں کو ساتھ نہ لے
 جاؤ گی تو ان کا غم نہ کھانا۔ ورنہ تمہاری زندگی تلخ ہو جائے گی۔"

"ہوں۔" وہ سوچنے لگی۔

"میں بتاؤں۔" ایلی بولا۔

"کیا۔"

"تم لڑکیوں سے سچی بات کہہ دنا اور پوچھ لیتا۔ انہیں یہ بھی بتا دنا کہ بھوکوں مرنے پڑے
 گا۔"

"ٹھیک ہے۔" وہ بولی۔

"تو پرچیاں لکھ دو۔"

ایلی نے حیرت سے شزاو کی طرف دیکھا۔ کیا یہ شزاو بول رہی تھی۔ نہیں نہیں۔ وہ تو اتنی دل نہ تھی۔ پھر کون بول رہی تھی۔ ایلی کے لئے شزاو کی شخصیت کا یہ پہلو نیا تھا۔ جس کا وہ آج تک واقف نہ ہوا تھا۔

کچھ دیر لمحوئے کمرے پر خاموشی چھائی رہی۔ پھر دیوار پر پھر سے ٹک ٹک ہونے لگی۔

”کہہ کیوں نہیں دیتی۔“ ایلی بولا۔

شزاو خاموش بیٹھی رہی۔

”میری خاطر کہہ دو۔“ ایلی نے منت کی۔

”جی نہیں مانتا۔“ وہ بولی۔

”کہہ دیتی ہوں۔ صرف ہونٹوں سے۔“

”تو کہہ دو۔“

شزاو نے ٹنک سے تالا اٹھایا اور اسے دیوار پر مارنے لگی۔ ٹھک ٹھک ٹھک

پھر وہ رک گئی۔

صفر نے پھر دیوار بجائی۔

شزاو نے پھر تالا دیوار پر مارا۔ ٹھک ٹھک ٹھک

دھننا۔ صفر چلا گیا یہ تم ہو۔ تم ہو۔ بولو۔“

”ہاں“ وہ با آواز بلند بولی۔ ”میں نے معاف کیا۔“

لمحوئے کمرے سے نعروں کی آوازیں آنے لگیں۔ کوئی چیخ رہا تھا، ناچ رہا تھا۔ قہقہے مار رہا

کمانی پھر چڑھ گئی۔ پھر وہی تے کرنے کی آواز اور پھر خاموشی چھائی۔

دیر تک وہ دونوں خاموش بیٹھے رہے۔

تب پرچی لکھوٹ۔“ ایلی نے کہا۔

”ہاں پرچی۔“ شزاو گویا خواب سے بیدار ہوئی۔

پہلیں لگتے وقت اس کا ہاتھ کانپ رہا تھا۔ آنکھیں آنسوؤں سے بھری تھیں۔ اس نے

ہاتھ ہاتھوں سے کانٹھ کے ان دونوں پر زوں کو تھپکایا اور بولی۔ ”اب اٹھاؤ۔“

”میں نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”تم اٹھاؤ۔“ ایلی نے پرچیوں کو مٹھی میں لے کر بلایا۔

وہ تو بے نیاز تھی۔ کسی بات کو درخور اعتنا نہیں سمجھتی تھی۔ پھر کیا بات تھی۔ جس کی وجہ سے اس کے آنسو نہیں رکتے تھے۔ ایلی کو کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

”شزاو۔“ وہ بولا ”آخر بات تو ہے کوئی۔“

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

اچھا تو یہ پرچیوں کو لکھو۔

”لکھتی ہوں۔“ وہ بولی اور ویسے ہی بت بنی بیٹھی رہی۔

لمحوئے کمرے میں بالکل خاموشی تھی۔ صرف لمبے لمبے سانس لینے کی آواز آرہی تھی۔

— دیر تک وہ پھر خاموش بیٹھے رہے۔

لمحوئے کمرے سے ٹک ٹک کی آواز آرہی تھی۔ کوئی دیوار بج رہا تھا۔ شزاو کے کان کھڑے

ہو گئے۔

”دیوار بج رہا ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”شزاو نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کون ہے۔“ اس نے پوچھا۔

شزاو نے پھر اثبات میں سر ہلایا۔

ایلی مجھ گیا۔ لیکن صفر دیوار کیوں بج رہا ہے۔ یہ اسے سمجھ میں نہ آیا۔

”مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر دو۔“ صفر کی مدھم آواز سنائی دی۔

شزاو خاموش بیٹھی رہی۔

”وہی ہے کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

شزاو نے اثبات میں سر ہلایا۔

”تو کہہ دو معاف کر دیا۔“ ایلی نے کہا۔

شزاو نے برا سامنے ہٹایا ”دل نہیں مانتا۔“ وہ بولی۔

”تو جھوٹ موٹ کہہ دو۔“ ایلی نے کہا۔

”جب تک میں نہیں مروں گا۔“ صفر با آواز بلند چیخنے لگا۔ حتیٰ کہ اسے کمانی کا دھڑکا

”کیا اور کہہ کیوں نہیں دیتی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ساری عمر جان کنی کے عذاب میں مبتلا رہے۔“ شزاو بولی۔

شنزاد نے ایک پرچی اٹھائی۔ ”کھولو۔“ وہ بولی۔
”نہیں تم خود کھولو۔“ اس نے کہا۔

شنزاد نے اسے کھولا۔ ”دونوں“ دیکھ کر وہ مسکرائی۔ لیکن اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔
عین اس وقت لمحہ کرے میں صفدر کی بیوی کے بین شروع ہو گئے۔
ایلی چونکا۔ ”کیا مر گیا؟“ وہ بولا۔

”ہں۔“ شنزاد نے جواب دیا۔ ”جان چھٹی۔“ لیکن اس کی آنکھوں سے ابھی تک آنسو رواں تھے۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ آنسو غم کے تھے یا خوشی کے۔

”تم اب جاؤ۔“ شنزاد بولی۔ ”مرگ پر سارے محلے والے اکٹھے ہوں گے۔“

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”کل میں چلا جاؤں گا۔ انتظام کرنے کے لئے۔ انتظام کر کے واپس آؤں گا۔ تم تیار رہنا۔“

شنزاد نے اثبات میں سر ہلایا۔ ”دیر نہ لگانا۔“ وہ بولی۔

”نہیں۔“ ایلی بولا، ”جلد آؤں گا۔“ وہ دبے پاؤں فرحت کے گھر کی طرف چل پڑا۔

وکیل میم

لاہور پہنچ کر ایلی سوچنے لگا کہ اسے کیا تیاری کرنی ہے۔ اسے قانون سے چنداں واقفیت نہ تھی اور نہ ہی اسے کسی لڑکی کو بھگا کر لے جانے کا تجربہ تھا۔ شنزاد نے کئی بار اسے بتایا تھا کہ شریف کے ساتھ اگر ایسی واردات ہو جائے تو وہ قانونی طور پر کوئی اقدام نہیں کرے گا۔ میدان میں آکر لڑنے کی بجائے شاید وہ خود معدوم ہو جائے گا۔

بہرحال اگر اس نے کوئی اقدام کیا تو اسے معلوم ہونا چاہئے کہ قانونی طور پر وہ کس طرح دا میں آتا ہے۔ ایلی نے کورٹ روڈ پر دو چکر لگائے اور وکلاء کے بورڈ پڑھنے لگا۔ لیکن اس میں اس قدر ہمت نہ پڑتی تھی کہ کسی وکیل کی پاس جائے۔

اپنی کوشش کے باغیچے میں ایک معمر وکیل کو بیٹھے دیکھ کر اس نے اندر داخل ہونے کی شدید کوشش کی لیکن اس کے قدم رک گئے عین اس وقت وکیل کا منشی آ گیا۔

”کیوں مہاراج۔“ وہ بولا۔ ”آپ لالہ جی سے ملیں گے۔“

”ہں۔“ ایلی نے مشکل سے کہا۔

”تو آؤ نا وہ سامنے بیٹھے ہیں۔“

ایلی کو مجبوراً ”لالہ جی کے پاس جانا پڑا۔“ آداب عرض۔ ”وہ بولا۔

”نہتے۔“ وکیل نے جواب دیا اور کتب ایک طرف رکھ دی۔ ”ہوں کیا بات ہے۔“

”مجھے آپ سے مشورہ کرنا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ حقے کا کش لے کر بولے۔

”خوا کا کیس ہے۔“ ایلی نے بعد مشکل کہا۔ پھر وہ گھبرا گیا۔ ”میرا مطلب ہے۔

ایلیٹ کا۔ یعنی۔“ وہ رک گیا۔ اس کا کھاسو کھ گیا تھا۔

”کیا کیس ہے۔“ وہ بولے۔

”اگر ایلیٹ کی جائے تو اس میں قانونی زد کیا کیا ہو سکتی ہے۔“

”یہ تو کوائف پر منحصر ہے۔“ لالہ جی بولے۔

”میرا مطلب ہے۔“ ایلی نے بعد مشکل کہا ”کیا کوائف ہونے چاہیں؟“

”یعنی کیا مطلب ہے؟“

”مطلب ہے یعنی۔“

”دیکھو نوجوان۔“ لالہ جی بولے۔ ”کیا ارتکاب جرم ہو چکا ہے؟“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

لالہ جی تھقہ مار کر ہنسنے لگے۔

”کیا تم اس کے بہرو ہو گے۔“ لالہ جی نے پوچھا۔

”جی۔“ ایلی نے اثبات میں سر ہلایا۔

”کی کی عمر کیا ہے؟“ وہ بولے۔

”میر۔“ ایلی کے گلے میں کچھ پھنس گیا۔ ”معلوم نہیں۔“ وہ بولا۔

”میر بھی اندازاً۔“

”اگل کے چھ بیٹے ہیں۔“

”نوجوان وہ بولے تمہیں کسی ڈاکٹر سے ملنا چاہئے وکیل

”میں نے“
 ”پھر کیا ہے۔“ ایلی بولا۔ ”مجھے ڈراؤ نہیں۔ مشورہ نہ دو۔ امداد کرو۔“
 ”جتنی مدد کرو گے کروں گا۔ بشرطیکہ میں قانون کی زد میں نہ آؤں۔“ محمود ہنسنے لگا۔
 ”چھ بچوں کی ماں ہے وہ کیا۔“ میم نے مسکرا کر پوچھا۔
 ”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔
 ”تمہارا رو مینس ہے۔“ اس نے پوچھا۔
 ”سولہ سل سے۔“ ایلی نے جواب دیا۔
 ”سولہ سل۔“ اس کی آنکھوں میں چمک لہرائی۔
 ”حرام زادی۔“ محمود غصے میں چلایا۔ ”اس کی آنکھ کی چمک دیکھو۔“
 ”تم تو خواہ مخواہ بگڑتے ہو۔“ میم نے یوں لاڈ سے کہا جیسے بچی ہو۔
 ”ابھی رو مینس کی لت نہیں مگنی کیا۔“ محمود نے اسے پکڑ کر گرا لیا اور اونڈھا کر کے اس کے چوڑوں پر یوں کے مارنے لگا۔ جیسے سکول کی بچی کو سرزنش کر رہا ہو۔
 ”ہائے مری ہائے مری۔“ میم چلا رہی تھی۔
 ”میرے دوست پر لپٹائی نظرس ڈالتی ہے تو۔“ محمود غرا رہا تھا۔
 ایلی حیران تھا۔ اس کے ذہن میں میم کا تخیل کچھ اور تھا۔ یہ عجیب میم تھی اور محمود عجیب
 لڑکا تھا۔ جو میم کا محتاج ہونے کے باوجود اسے یوں پیٹ رہا تھا۔ جیسے وہ اس کی ہاؤس میڈ ہو۔
 بہر حال محمود سے کوائف طے کرنے کے بعد وہ ڈیرہ آگیا۔

نثر لفظ

ڈیرہ پہنچ کر بھی اس کے کانوں میں محمود کا مشورہ گونج رہا تھا۔ محمود نے کہا تھا۔ ”ایک بات
 رکھو۔ اپنی ڈیوٹی پر حاضر رہنا۔ روپوش نہ ہو جانا ورنہ مارے جاؤ گے۔“
 ایلی نے ڈیرہ پہنچ کر اس کے توسط سے ایک مکان کرایہ پر لے لیا۔ تاکہ شہزاد کو وہاں رکھ
 کس انتظام کے باوجود وہ سخت گھبرایا ہوا تھا۔
 پہلے روز جب وہ غلام کے گھر گیا۔ تو غلام اسے دیکھ کر بولا۔
 ”کیوں خیریت تو ہے۔“

لالہ جی کی کوٹھی سے نکل کر ایلی نے اطمینان کا سانس لیا ”کچھ پرواہ نہیں۔“ اس نے اپنے
 آپ کو تسلی دی۔ ”جو ہو گا دیکھا جائے گا۔“ اور لالہ جی سے ملنے کی کوفت ملانے کے لئے وہ
 سینا ہل میں جا گھسا۔
 سینا سے نکل کر جب وہ انارکلی میں جا رہا تھا تو محمود کو دیکھ کر ٹھٹھکا۔ ”ارے تم؟“
 ”میں یہیں ہوں۔“ محمود بولا۔
 ”یہاں تبدیلی ہو گئی ہے کیا۔“
 ”نہیں جھٹی پر ہوں۔“ محمود نے کہا ”لبی جھٹی پر۔“
 ”کیوں؟“
 ”یہاں کالج میں داخل ہو گیا ہوں۔ بی اے کر رہا ہوں۔“
 ”ارے۔ اور زر۔“
 محمود ہنسا۔ ”پرایا دھن۔“ وہ بولا۔
 ”کس کا؟“
 ”اسی کا۔“
 ”اسی کس کا۔“
 ”میری میم کا۔“
 ”ارے۔ کیا وہ تمہاری بن گئی ہے۔“
 ”شاید نہ بنتی نیکن مشرق پنے اس روز حملہ کر کے اسے اٹھا کر میری گود میں ڈال دیا۔“
 ”وہ کس طرح۔“ ایلی نے پوچھا۔
 ”بھئی عورت ہے۔ ضد میں آگئی۔ بولی یوں ہے تو چلو یونی سہی۔“
 ”تو وہ میم کہاں ہے آج کل۔“ ایلی نے پوچھا۔
 ”میرے پاس ہے۔“
 ”کہاں؟“

”مکان کرائے پر لے رکھا ہے۔ چلو گھر چلیں۔ تمہیں اپنا گھر دکھاؤں۔“
 گھر جا کر ایلی نے محمود کو اپنی مشکل سے آگاہ کیا۔ محمود شٹنا گیا۔ ”ارے چھ بچوں کی ماں کو
 اغوا کر رہے ہو۔ بلکہ وہ تمہیں اغوا کر رہی ہے۔ یار اگر خاندان نے قانونی چارہ جوئی کی تو اندر“

”بالکل“ ایلی نے جواب دیا۔

”معلوم تو نہیں ہوتی۔“ غلام نے کہا۔

نہ جانے کیا بات تھی۔ ہر کوئی اس سے یہی سوال پوچھتا تھا۔ کیا واقعی اس کے چہرے پر پریشانی اور تفکر کے آثار اس حد تک نمایاں تھے۔

”الیاس بھائی۔“ غلام بولا ”اپنے آپ سے لڑو گے تو بند بند چنلی کھائے گا۔“

”میں کیا اپنے آپ سے لڑ رہا ہوں۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولا پھر غلام نے پیار سے ایلی کا ہاتھ تھام لیا اور بولا ”بھائی ایک بات کہتا ہوں۔ جو بھی کرتا ہے کر ڈالو۔ سوچو نہیں ورنہ سوچ کا آرا چلتا ہے۔ بری طرح چلتا ہے۔“

ایلی کئی بار چاہتا تھا کہ غلام سے ساری بات کہہ دے، لیکن اس کی زبان گنگ ہو جاتی تھی۔ ہمت نہ پڑتی تھی۔ اس روز بھی اس نے بات کرنا چاہی لیکن ہمت نہ پڑی اور وہ وہاں سے چلا آیا۔ پھر جب وہ چپ چاپ اپنے کمرے میں بیٹھا تھا تو نورانی خلاف معمول ایلی کے کمرے میں آ گیا۔

”الیاس صاحب۔“ وہ بولا ”معاف کیجئے میں نے دیکھا ہے کہ آپ سخت پریشان ہیں۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ اسے جھٹلاتا ہے کار ہے۔ ”ہاں ہوں۔“ وہ بولا۔

”میں کوئی مدد کر سکتا ہوں کیا؟“

”نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر؟“

”بات یہ ہے نورانی صاحب کہ میں مستقبل کے متعلق پریشان ہوں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”تو میں آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔“ نورانی بولا ”ضرور کر سکتا ہوں۔“

”وہ کیسے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میں علم جعفر سے واقف ہوں۔“ نورانی نے کہا ”کیا آپ اپنا سوال مجھے بتا سکتے ہیں۔“

”نہیں“ ایلی نے کہا ”وہ ایک راز ہے۔“

”اچھا۔“ نورانی بولا ”تو آپ نہ بتائیے۔ میری ہدایات پر عمل کیجئے۔“

”وہ کیسے؟“

”اپنا سوال تیرہ الفاظ میں لکھ دیجئے۔“ نورانی کہنے لگا ”شرط یہ ہے کہ الفاظ تیرہ ہوں نہ کم

بیشمار کیا میں بی۔ اے کے امتحان میں پاس ہو جاؤں گا۔ جو اس سال ہو گا۔ دیکھئے اس سوال الفاظ ہیں اور اس کا متن معانی کے لحاظ سے مکمل ہے۔“

اس کے بعد نورانی نے ایلی کو ایک لمبا چوڑا عمل بتایا۔ ان الفاظ کو ابجد کے ہندسوں میں اور اسی طرح تیرہ مرتبہ بدلنا تھا اور پھر ان کا مجموعہ نکالنا تھا۔ نورانی بیٹھ گیا اور اس عجیب و غریب عمل میں ایلی کی مدد کرنے لگا۔ جب مجموعہ نکال چکا تو نورانی بولا۔ ”اب ذرا ٹھہریئے۔ میں رستاروں کی پوزیشن دیکھ لوں۔“

بہائی ایک جملہ آپ لکھیں جس میں پورا مفہوم موجود ہو۔ مجھے بے شک نہ بتائیں۔

ایلی نے تیرہ لفظوں کا جملہ لکھا۔

بابہ اغوا میرے اور شنراو کے لئے باعث خوشی یا پریشانی ہو گا۔

نورانی باہر نکل گیا اور وہاں کھڑا گویا عجیب عجیب منتر پڑھتا رہا۔ ”مشرقی، اسد، زہرہ، سرطان“

بلنے کیا کیا نام لیتا رہا۔

پھر وہ اندر آگیا۔ ”رستاروں کے لحاظ سے۔“ وہ بولا ”آپ اس مجموعے میں ۲۱۵ جمع کر

گئی۔“ ایلی نے جمع کر کے کہا۔

”اب آپ از سر نو انہیں حروف میں بدل لیجئے۔“

ایلی نے ایسی ہی کیا اور وہ حیران رہ گیا۔ اس کے سامنے تیرہ الفاظ کا ایک مکمل جملہ بنا ہوا

”فعل آپ کے اور لواحقین کے لئے باعث ذلت و رسوائی ہو۔“

الیاس جواب دیکھ سکتا ہوں۔“ نورانی نے کہا۔

ایلی نے وہ چٹ جس پر جواب لکھا تھا۔ نورانی کی طرف بڑھا دی۔ اس کا رنگ زرد ہو رہا

تھوڑے پر ہوائیاں اڑ رہی تھیں۔

”نفس السوس ہے۔“ نورانی بولا۔

”نہیں بھی ہے۔“ ایلی نے کہا ”لیکن میرا فیصلہ بدل نہیں سکتا۔“

الیاس صاحب۔“ نورانی بولا ”میں دوست ہوں ناصح نہیں البتہ اگر کبھی میری مدد کی

نہا جائے تو آپ مجھ پر بھروسہ کر سکتے ہیں۔“ یہ کہہ کر نورانی باہر نکل گیا۔

”یہ ہو کے رہے گا۔ ہو کے رہے گا۔ اللہ اچھا کریں گے۔“ حاجی صاحب کی گردن روکی کے گالے کی طرح لرز رہی تھی۔

”اپنے آپ سے نہ لڑو۔“ غلام مسکرا رہا تھا۔ ”جو کرنا ہے کر ڈالو۔ کر ڈالو۔“

”تم قید ہو جاؤ گے۔“ محمود چلا رہا تھا۔

”تمہیں ڈاکٹر سے مشورہ کرنا چاہئے۔“ لالہ جی اسے گھور رہے تھے۔

دھمکی

آٹھ روز کے بعد ایلی لاہور شیشین پر بے تلی سے ان کا انتظار کر رہا تھا۔

شہزاد کی لڑکیوں نے اعلان کر دیا تھا کہ وہ ہر حالت میں مل کا ساتھ دیں گی۔ انہیں غربت اور بھوک کی تکلیف کا تصور ہی نہ تھا۔

شہزاد کی تیوں بڑی لڑکیاں ہنسوڑ تھیں۔ وہ ہر بات پر ہنستی تھیں۔ ہنسنے چلی جاتی تھیں۔ بات بات پر ان کی مسرت میں یوں اہل آتا تھا۔ جیسے سوڈے میں نمک کی چٹکی ڈال دی ہو۔

سب سے بڑی صبیحہ تھی۔ اس کا چہرہ بے حد معصوم تھا۔ طبیعت میں بلا کی سلوکی تھی۔

لیکن ذہنی چمک نہ تھی۔ نفیسہ اس سے چھوٹی تھی اسکا رنگ سانولا تھا۔ وہ بے حد تیز اور ذہین تھی۔ لیکن بات بات پر ہنسنے میں وہ نفیسہ کی ساتھی تھی۔ تیسری جسمانی طور پر بھی صبیحہ اور

نفیسہ کی طرح رنگین نہ تھی۔ اسے مزاج پیدا کرنا نہیں آتا تھا۔ البتہ بہنوں کی دیکھا دیکھی اس

نے بھی بات بات پر ہنسا سیکھ لیا تھا۔ طے شدہ انتظامات کے مطابق شہزاد نے علی پور سے گردن

لڑکیوں سے ملنے جانا تھا اور پھر گورنمنٹ سے محمود نے انہیں لاہور لے آتا تھا۔ جہاں سے ایلی

انہیں ڈیرہ لے جا رہا تھا۔ ڈیرہ میں ایلی نے خفیہ طور پر ایک الگ مکان ان کی رہائش کے لئے

کرایہ پر لے رکھا تھا۔

ایلی سخت گھبرایا ہوا تھا۔ مگر جب وہ لاہور پہنچے اور ایلی انہیں لے کر ڈیرہ کی گاڑی میں بیٹھ

گیا تو شہزاد کی لڑکیوں کی مسلسل ہنسی نے اس کا فکر دور کر دیا۔

ایلی حیران تھا۔ انہیں خطرے کا احساس ہی نہ تھا۔ شہزاد خاموش تھی۔ لیکن جب ایلی نے

خطرے کا ذکر کیا تو وہ ہنس پڑی۔ وہ بولی۔ ہمارا کوئی کیا بگاڑے گا۔ جہاں جی چاہے گا رہیں گے

جہاں نہیں جی چاہے گا نہیں رہیں گے۔ اب مزید بے عزتی برداشت نہ ہوئی تو چلی آئی۔ لڑکیاں

دھمکی

”یہی سے آئی ہیں۔ واپس لینا چاہیے تو لے لے۔“

لیکن اگر اس نے چارہ جوئی کی تو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں کرے میں بھری پکھری میں جواب دوں گی اسے تم کیوں غم کھاتے ہو۔“ وہ بولی۔

انہیں ڈیرہ میں رہتے ہوئے دس روز ہو گئے۔ لیکن کوئی ایسا واقعہ نہ ہو جو باعث فکر ہو۔

مگر وہیں دن محلے کے ایک بزرگ سکول میں آگئے اور ہیڈ ماسٹر کے توسط سے ایلی سے

ایلی کو یہ خیال بھی پیدا نہ ہوا کہ وہ شہزاد کے سلسلے میں آئے ہیں۔ ایلی انہیں اپنے گھر لے

لیکھ انہوں نے گھر کو غور سے دیکھنا شروع کیا تو ایلی کا ماتھا ٹھنکا۔

کچھ دیر کے بعد انہوں نے ایلی سے بات کی۔

”بولے۔“ ”بھئی بات یہ ہے کہ مجھے شریف نے یہاں بھیجا ہے۔“

”شریف نے؟“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ شاید تمہیں علم ہو گا کہ شہزاد اپنے تمام بچے لے کر چلی گئی ہے۔“

”چلی گئی ہے؟“ ایلی نے مصنوعی تعجب سے کہا۔

”یہاں ہم صرف اس لئے آئے ہیں کہ تم سے کہیں کہ تم شہزاد کی مدد کرنا ورنہ خواہ مخواہ

نہیں بڑھ جائیں گی۔ چونکہ شریف کہتا ہے کہ وہ اس بارے میں سخت کارروائی کرے گا۔“

وہ بزرگ ایلی کو دھمکی دے کر چلے گئے۔

جب وہ شہزاد کے پاس گیا اور اس نے یہ قصہ بیان کیا تو وہ ہنس پڑی۔ ”اونہ۔“ وہ بولی ”سخت

دھمکی کرنے والے دھمکیاں نہیں دیتے کر گزرتے ہیں۔“

بہر حال اس بزرگ کے آنے کا یہ نتیجہ ہوا کہ ایلی نے فیصلہ کر لیا کہ وہ ڈیرہ نہیں رہیں گے

بلکہ روز ہی وہ ایک ماہ کی چھٹی لے کر جملہ لوگوں کو ساتھ لے کر امرتسر چلا گیا۔

دھمکی

اور شریف چھٹی لے کر علی پور آگیا۔ جب اس نے دیکھا کہ اس کے بنے بنائے گھر میں

نہیں آگئی ہے۔ اس کی بیوی اور بچے تمام اسے چھوڑ کر جا چکے ہیں۔ تو اس میں ایک عجیب

بلکہ واقعہ ہوئی۔ وہ شریف جس نے کبھی محلے میں سر نہ اٹھایا تھا۔ جسے کسی نے اونچی آواز سے

نہ نہ سنا تھا۔ جس کی آواز تک کبھی محلے میں نہ گونجی تھی وہ شریف احاطے کے

نتیجہ یہ ہوا کہ شریف نے شہزاد کی بجائے نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر کر دیا۔ پھر نہ انہیں کہیں سے خبر مل گئی کہ اہلی امرتسر میں چھپا ہوا ہے۔ وہ سب لالٹیاں اٹھا کر امرتسر آ

اہلی جو نبی امرتسر پہنچا تو نہ جانے کیا ہوا۔ اس کے چہرے پر پھنسیں نکل آئیں اور پھر سب کہیں۔ ان میں سے پانی رسنے لگا۔ اہلی کو کسی اچھے ڈاکٹر کا پتہ نہ تھا۔ چونکہ امرتسر کا وہ علاقہ میں انہیں مکان ملا تھا۔ بالکل نیا تھا۔ جس سے اہلی واقف نہ تھا۔ لہذا اس نے گھر سے دور باب نہ سمجھا ان کے گھر کے قریب ہی ایک جراح کے دوکان تھی وہ جراح کی پاس چلا گیا۔ ”یہ کیا نکلا ہے مجھے۔“ اس نے جراح سے کہا۔

”یہ اگر بچہ ہے۔“ جراح نے کہا ”میرے پاس اس کا خاص علاج ہے۔“ جراح نے پرانے کا پیرا سا کھڑا جلایا اور جلتے ہوئے کپڑے کو ان سوراخوں میں بھر دیا۔ جو اہلی کے منہ پر یوں کے پھونکنے کی وجہ سے پیدا ہو گئے تھے۔ اہلی نے آئینہ دیکھا۔ اس کی ہنسی نکل گئی۔ معلوم ہوتا تھا جیسے سرکس کا کارٹون ہو۔

وہ دوکان سے باہر نکلتے لگا تو اس نے دیکھا کہ محلے کے سات آٹھ افراد ہاتھوں میں لالٹیاں آ رہے ہیں۔

ایک ساعت کے لئے وہ ٹھٹھکا پھر پتھر بن کر کھڑا ہو گیا۔ قریب آ کر وہ رک گئے پھر ساتھ والے دوکان دار سے کہنے لگے ”شیخ عثمان صاحب آپ ارے محلے کا کوئی شخص تو نہیں دیکھا؟“

”نہیں تو۔“ عثمان نے جواب دیا۔ پھر وہ آگے کی طرف چل پڑے۔

لے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ محلے والے اسے تلاش کر رہے تھے۔ اگر اس کا منہ نہ پھٹایا اس پہلی درمیان نہ لگی ہوتی تو نہ جانے کیا ہوتا۔

اہلی گھر پہنچا تو گھر کا نقشہ ہی اور تھا۔ وہ سب تاش کی گڈی سامنے رکھے بیٹھے ہوئے تھے۔ شفا رہی تھی۔ صبیحہ اور بھانہ ہنس ہنس کر دوہری ہوتی جا رہی تھیں۔ اولیس چلا چلا کر نہ لایا اعلان کر رہا تھا۔ ناز تلیاں پیٹ رہی تھی۔ اور بیدی چپ چاپ کھڑا دیکھ رہا تھا۔ ”گو اللہ کے بندو مجاہدو۔ کچھ خبر ہے۔ محلے والوں کے جتنے امرتسر کا چپہ چپہ چھان رہے ہیں تلاش کر رہے ہیں۔ وہ ہاتھوں میں لالٹیاں اٹھائے ہوئے ہیں۔“

میدان میں اکھڑا ہوا۔ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ منہ سے کف جاری تھا۔ وہ چلا رہا تھا۔ محلے والوں کے احساس خودداری کو لٹکار رہا تھا۔ لوگوں کو غصہ دلا رہا تھا۔ اپنی لٹی ہوئی دنیا کا واسطہ دے کر انہیں علی احمد کے گھرانے کی خلاف ابھار رہا تھا۔

شریف کی آواز سن کر محلے کی عورتیں کھڑکیوں میں آگئیں انہوں نے ہاتھ چلا کر شریف کی شرافت کو سراہا۔ جو ظلم اس پر ہوا تھا۔ اس میں رنگ بھر کر شہزاد کے قصے بیان کئے اور شریف کو مزید ابھارا۔ اس محلے کے مرد اکٹھے ہو گئے۔ ”ان کا حقہ پانی بند کر دو۔“ کسی نے نعرہ بلند کیا۔ ”بند کر دو بند کر دو۔“ وہ نعرہ چاروں طرف گونجا۔

عورتوں نے علی احمد کے خاندان کے جملہ لوگوں پر لعنتیں بھیجتا شروع کر دیں۔ مردوں نے لٹھ اٹھا کر لہرائے نوجوانوں نے قسمیں کھائیں۔ ”محلے سے نکل جاؤ۔“ وہ چلائے ”نکل جاؤ۔“

گھر میں ہاجرہ فرحت سیدہ سب سسی بیٹھی تھیں۔ ان کے دروازے پر پتھروں کی بارش ہو رہی تھی۔ ان کے خلاف آوازے بلند ہو رہے تھے۔ لیکن علی احمد اطمینان سے گھر میں بیٹھے روز کا حساب کتاب لکھنے میں مصروف تھے۔ جیسے کوئی بات ہی نہ ہو۔ ”میں کبھی ہوں یہ اہلی ہی کا کام ہے۔“ ایک بولی۔

”جو جو یہاں ہوتا رہا ہے اسے دیکھ کر ہماری تو آنکھیں پک گئی تھیں۔ گند بچا رکھا تھا اس اللہ کی بندی نے۔“

اعلانہ ملتے تھے وہ کیوں ملے۔ ”بالکل لیکن خاوند نے آنکھیں موند رکھیں تھیں۔ ہم کس منہ سے بات کرتے۔“ ”اے سچ پوچھو تو شریف کی شرافت نے جلتی پر تیل ڈالا۔ ورنہ انہیں اتنی جرات نہ ہوتی کبھی۔“

”وہ کہتے ہیں ناکہ گر باکشتن روج اول۔“ محلے کے اس طوفان نے خوفناک صورت اختیار کر لی۔ علی احمد اور ہاجرہ سے مختلف پہلوؤں دشمنیاں جاگ اٹھیں۔ لوگ پرانے انتقام لینے پر آمادہ ہو گئے اور شریف کو خوفناک شور مچا دینے لگے۔

”کیا مطلب؟“
 ”بہن تمہارے متعلق خبر اخباروں میں چھپ چکی ہے۔“
 ”خبرداروں میں؟“
 ”ہاں۔“ وہ بولا ”اور تم پر نابالغ لڑکیوں کے اغوا کا مقدمہ دائر ہو چکا ہے۔“
 ایللی سخت گھبرا گیا۔

”اچھا ہوا تم یہاں آ گئے ہو۔“ شیخ نے کہا ”یہ میرا اپنا محلہ ہے انشاء اللہ تمہیں کوئی زک نہ پہنچے گی۔ میرے سگے بھائی وکیل ہیں۔ چلو ان سے مشورہ کر لو۔“
 شیخ رحمان ڈیرہ کے مدرسے میں ایللی کے ہم کار تھے۔ وہ ایک خاموش مزاج شخص تھے اور مدرسے میں اکثر ایللی سے ملا کرتے تھے۔ چپ چاپ ایللی کی باتیں سنا کرتے تھے۔ اس سے زیادہ انہیں بھی ایک دوسرے سے سابقہ نہیں پڑا تھا۔
 پہلے دو ایک دن تو ایللی شیخ پر شک کرتا رہا۔ شاید یہ شخص ہمہ رو بن کر ہمارا بھید لے رہا ہے۔

شاید شریف کا جاسوس ہو شاید۔ لیکن دو دن کے بعد اس کے شکوک رفع ہو گئے اور شک ان کے لئے صحرائیں نخلستان بن گیا۔
 شیخ کے بھائی نے ایللی کو مشورہ دیا کہ شہزاد پکھری میں جا کر حلفیہ بیان درج کروا دے کہ وہ اپنی مرضی سے گھر سے آئی ہے اور اس کی بچیاں جن کی وہ جائز ولی ہے اس کے ساتھ رہتی ہیں۔

پکھری کا نام سن کر ایللی کی روح فنا ہو گئی۔ شہزاد ہنس پڑی۔ ”تو اس میں کیا مشکل ہے۔“ وہ ایللی۔ ”لو کھلی میں سر دینے والے کیا دھمکیوں سے ڈرتے ہیں۔“ اگلے روز ہی شہزاد نے شیخ کے گھر سے ایک برقعہ منگوایا اور وہ دونوں تانگے میں بیٹھ کر چل پڑے۔ وہ اپنا برقعہ نہیں پہننا چاہتی تھی تاکہ محلے والے اسے پہچان نہ لیں پکھری سے کچھ فاصلہ پر ایک پرانا مقبرہ تھا۔ شہزاد نے وہاں تانگہ روکا اور ایللی کو اتار دیا۔ بولی ”جب تک میں نہ لونوں یہاں سے نہ ہلتا۔“ اور خود پکھری کی طرف چل پڑی۔

مقبرے کے اندر ایک سپاہی نے اسے لٹاکارا ”اے“ وہ بولا ”اوھر آؤ۔“
 ”جی۔“ ایللی پاس جا کر بولا۔

”کرنے دو تلاش۔“ شہزاد بولی۔ ”ڈھونڈ بھی لیا تو کریں گے کیا۔“
 ”مجھے ملے تھے۔ ابھی۔“ ایللی نے کہا۔

دفعۃً ان کی نگاہ ایللی کے چہرے پر منطف ہو گئی وہ سب قہقہہ مار کر ہنس گئے۔ ”یہ کیا حلیہ بنایا ہے بچا جان۔“

”یہ حلیہ نہ بنا ہوتا تو وہ کھیت کر لے گئے ہوتے۔“ ایللی بولا۔
 لیکن وہ سب موقعہ کی نزاکت کو سمجھنے سے منکر تھے انہوں نے ایک اور موقعہ بلند کیا ایللی محسوس کرنے لگا جیسے وہ کسی زندہ تاج اور گنا گنا کپنی کا جو کر ہو۔

صحرائیں نخلستان

اگلے روز بارہ بجے کے قریب دروازہ بجلا۔
 ”یا اللہ یہ کون ہے۔“ ایللی کا دل ڈوب گیا۔
 ”الیاس صاحب۔“ کسی نے آواز دی۔
 ایللی گھبرا گیا۔

شہزاد اٹھ بیٹھی۔ ”میں دیکھتی ہوں کون ہے۔“

”نہ نہ نہ“ اس نے شہزاد کو روکا مگر وہ جا چکی تھی۔ کچھ دیر وہ دروازے میں کھڑی بائیں کرتی رہی پھر آکر کہنے لگی ”کوئی ڈیرہ کا ٹیچر ہے کہا ہے میرا نام شیخ ہے تم سے ملنے آیا ہے۔“
 ”لیکن اسے ہمارے گھر کا علم کیسے ہوا۔“

”یہ نہیں مجھے معلوم۔“ وہ بولی۔

ایللی ڈرتا ڈرتا باہر نکلا۔

”اسلام علیکم۔“ شیخ اسے دیکھ کر چلایا۔ ”بھئی بات یہ ہے کہ میں نے کل حمیس دیکھا تھا پہلے تو مجھے یقین نہ آیا کہ یہ تم ہو۔ پھر آج میں نے حمیس پہچان لیا۔ اس لئے ملنے چلا آیا۔“
 ”لیکن تم یہاں کہاں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بھئی یہ ساتھ والا مکان میرا ہے۔ میں امرتسر کا رہنے والا ہوں نا آٹھ روز سے چھٹی پر ہوں۔“
 ”شیخ صاحب کیا کسی اور کو بھی علم ہے کہ میں یہاں رہتا ہوں۔“
 ”بالکل نہیں۔“ وہ بولا۔ ”گھبراؤ نہیں۔ میں معاملے کی اہمیت کو سمجھتا ہوں۔“

”جھگوڑے ہو تم۔“

”جی۔“ ایلی نے گھبرا کر جھگڑا کر دیا۔

”تم اس عورت کو بھگا کر لائے ہو نا جو ابھی ٹانگے سے تمہیں اتار کر مٹی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا

سپاہی نے قہقہہ مارا۔ ”تم جھوٹ بولتے ہو معلوم ہوتا ہے تم نے اسے اغوا نہیں کیا۔

بلکہ وہ تمہیں اغوا کر کے لائی ہے۔“

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”ہمیشہ عورت ہی اغوا کر کے لاتی ہے۔ لیکن مجرم مرد گردانا

جاتا ہے اور سزا مرد کو ملتی ہے۔“

سپاہی نے پھر قہقہہ لگایا ”سچ کہتے ہو میاں۔“

وہ سپاہی ایلی کا دوست بن گیا۔

”وہ آگلی پکھری گئی ہے نا۔ بڑی جرات ہے اس میں۔“ سپاہی نے کہا۔

”ان سب میں بڑی جرات ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

وہ دونوں بیٹھ کر باتیں کرنے لگے۔

شہزاد نے پکھری میں حلیفہ بیان درج کرایا۔ لیکن جب وہ باہر نکلی تو آصفی محلے کے ایک

جتنے نے اسے گھیرنے کی کوشش کی۔ شہزاد یہ دیکھ کر پھر سے مجسٹریٹ کے کمرے میں داخل

ہو گئی۔ کہنے لگی۔

”مجھے دشمنوں سے خطرہ ہے۔ میری حفاظت کا انتظام کر دیجئے۔“ مجسٹریٹ نے دو سپاہی

ساتھ کر دیئے۔ مقبرے پر جا کر وہ ٹانگے سے اتر گئی۔

محلے والے اس کا پیچھا کر رہے تھے وہ مقبرے میں آگئے۔ سپاہی نے باہر جا کر ان کا راستہ

روک لیا۔ ”کسے ڈھونڈ رہے ہو۔“ وہ بولا۔

”میں ایک عورت اتری تھی۔“ انہوں نے جواب دیا۔

”وہ تو اوھر گئی ہے۔“ سپاہی نے سڑک کی دوسری طرف اشارہ کیا اور وہ اوھر چلے گئے۔

”آؤ تمہیں گھر چھوڑ آؤں۔“ سپاہی بولا ”میں بیٹھنا ٹھیک نہیں۔“

”ہم خود چلے جائیں گے۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”تو تو چلی جائے گی۔ لیکن یہ“ سپاہی نے ایلی کی طرف اشارہ کیا۔ ”جسے تو ساتھ لائی ہے۔“

”ایسوں کو ہی ساتھ لایا کرتے ہیں۔“ وہ بولی۔

ارم پورہ

سپاہی نے قہقہہ لگایا ”بھئی واہ کیا جوڑی ہے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنسنے لگا۔

مہینہ بھر وہ امرتسر میں رہے۔ ایلی باہر نکلتا تو اس کے منہ پر دھجیوں کی سیاہ راکھ تھپی ہوتی

اور اس نے اپنے گرد ایک کھیل لیٹا ہوتا۔ بازاروں میں گھومتے ہوئے کئی بار اس نے محلے والوں

کے گروہ دیکھے تھے اور ڈر کی وجہ سے اس کا دل اچھل کر گلے میں آنا تھا۔ چار ایک بار وہ

پہری بھی گئے تھے لیکن حسب دستور ایلی کو شہزاد نے مقبرے میں چھپا دیا تھا۔

جب ایلی گھر آتا تو گویا نقشہ ہی بدل جاتا۔ وہاں پہنچ کر وہ محسوس کرتا جیسے وہ پلنگ پر آئے

اور ان کی زندگی میں خطرے یا مشکل کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا ہو۔

سارا دن وہ بیٹھ کر تاش کھیلتے اور جو ہارتا اسے چور بتاتے۔ اس کے لئے انوکھی سزائیں تجویز

دے اور پھر قہقہے لگاتے۔ لڑکیاں ناچ ناچ کر چلتیں بات بات پر ہنستیں۔ مل کر گیت گنگنا تیں۔

بائیاں بجاتے وہ سب قطعی طور پر اس خطرے سے بے نیاز تھے۔ جو ان کے سر پر منڈلا رہا

اوھر شریف کے ساتھیوں نے سارا امرتسر چھان مارا۔ لیکن انہیں ایلی اور شہزاد کے چھپنے کی

کا علم نہ ہو سکا۔ شیخ نے ہر ممکن طریق سے ان کی مدد کی۔ ان کے بھائی نے انہیں قانونی

مدد دیئے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ شریف کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا اور پھر سے اس پر قنوطیت چھا گئی جو

ان کی طبیعت کا بنیادی جزو تھی اور ایک روز وہ چپکے سے روپوش ہو گیا۔ اس پر محلے والے بگڑ

۔ انہیں یہ شکایت تھی کہ جب خود شریف میدان چھوڑ کر بھاگ گیا ہے تو ہم کیوں اس کی

دینا بھرنی دشمنی مول لیں۔ اس لئے وہ بھی میدان چھوڑ کر چلے گئے۔

محلے والوں نے ڈیرہ اخباروں میں جو جو خبریں ایلی کے متعلق پھیلوائی تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ

خود ڈر گیا تھا۔ سکول کو بدنامی سے بچانے کے لئے اس نے کوشش کر کے ایلی کا تبادلہ کرا

تجہ یہ ہوا کہ اس لمبی رخصت کے دوران ایلی ڈیرہ سے ارم پورہ تبدیل ہو گیا۔ یہ تبادلہ ایلی

کے نعمت غیر متوقع تھا۔

ارم پورہ بنیادی طور پر لاہور کے قریب ایک قصبہ تھا۔ لیکن لاہور شہر کے پھیلاؤ کے وجہ

بہ لاہور کی بستی کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ اگر وہ ڈیرہ ہی میں مقیم رہتے تو ایلی اپنے

”جی مجھے نہیں علم۔“

”کیا آپ نے گزشتہ دنوں میں اخبار نہیں دیکھے۔“

”جی نہیں۔“

”کیوں۔“

”جی میں چھٹی پر تھا۔“

”آپ نے کس لئے چھٹی لی تھی؟“

”جی تفریح کے لئے۔“

”تو آپ نے کیسے تفریح کی؟“

”گھر بیٹا رہا۔ منہ ہاتھ نہیں دھویا۔ کوئی کام نہیں کیا۔ تاش کھیلا رہا۔“

”ہوں۔“ وہ بولے ”تاش کا کون سا کھیل کھیلتے رہے؟“

”جی چور سپاہی۔“

ان کے ہونٹوں پر مسکراہٹ جھلکی۔ لیکن انہوں نے ضبط سے کام لیا۔

”آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ آپ پر اغوا کا الزام ہے۔“

”جی مجھے نہیں معلوم۔“ وہ بولا۔

”ہم جو آپ کو بتا رہے ہیں۔“ وہ غصے میں بولے۔

”کسی عدالت نے مجھے نہیں بتایا۔ بہر حال۔“

”تو آپ کو کوئی سمن نہیں ملا۔“

”جی نہیں۔“

”آپ کبھی میں حاضر نہیں ہوئے۔“

”جی نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”تو وہ خبریں کیوں چھپیں۔“

”جی مجھے معلوم نہیں۔“

”آپ کو علم ہونا چاہئے الیاس صاحب کہ اس خاتون کے شوہر نے مجھے سب باتیں کہیں۔“

”مکمل ہے۔“ وہ بولا ”مجھے اس کا علم نہیں۔“

مکان کو خفیہ نہ رکھ سکتا۔ لیکن لاہور میں اپنے مکان کی جائے وقوع کو سینہ راز میں رکھنا کچھ مشکل نہ تھا۔

اسی وجہ سے ایک ماہ کی رخصت کے بعد ایللی نوکری پر حاضر ہو گیا۔ اس نے ایسی جگہ مکان کرایہ پر لیا جو لاہور کی ایک اور بہتی تھی اور ارم پورہ کی متضاد سمت میں واقع تھی۔

اگرچہ طوفان گزر چکا تھا پھر بھی لکیر ابھی تازہ تھی۔ ایللی ڈرتا تھا کہ نہ جانے کب طوفان پھر سے چلنے لگے۔ اس لئے وہ بے حد محتاط تھا۔ اس کی یہ احتیاط اور اک کی وجہ سے نہیں بلکہ ڈر کی وجہ سے تھی۔ وہ بنیادی طور پر بے حد بزدل واقع ہوا تھا۔

وہ سب مقدمات جو شریف نے ان کے خلاف دائر کر رکھے تھے۔ عدم بیرونی کی وجہ سے داخل دفتر ہو چکے تھے۔ لیکن جھگے میں ایللی کی بے حد بدنامی ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ افسر اعلیٰ معروف

صاحب نے ایللی کے والد کو خط لکھ کر متنبہ کر دیا تھا کہ ان حالات کے تحت وہ ایللی کی امداد کرنے سے قاصر ہیں۔

جب وہ پہلے روز ارم پورہ کے مدرسے میں حاضر ہوا تو ہیڈ ماسٹر صاحب نے اسے چارج دینے سے انکار کر دیا۔ بولے ”ہم نے آپ کا کیس ڈائریکٹر بہادر کو بھیج دیا ہے۔ جب تک وہ کوئی فیصلہ نہ کریں ہم آپ کو چارج نہیں دے سکتے۔“

چار ایک روز کے بعد ہیڈ ماسٹر نے ایللی کو بتایا کہ مسٹر معروف نے اسے انٹرویو کے لئے بلایا ہے لہذا اسے بڑے دفتر میں جانا چاہیے۔

معروف اور راغب

مسٹر معروف سے ایللی کا وہ دوسرا انٹرویو تھا۔ چند ایک سال قبل جاوڑا میں وہ انکوائری کرنے آئے تھے اور ایللی اور مسٹر معروف کی بات چیت ہوئی تھی۔ آج پھر وہ مسٹر معروف کے روبرو حاضر تھا۔

مسٹر معروف نے ایک ساعت کے لئے بڑی سنجیدگی سے اسے گھورا۔ نہ جانے کیوں لیکن ایللی مسٹر معروف کو دیکھ کر محسوس کرتا تھا جیسے اس کے روبرو ایک خوش مذاق ریشیلی عورت بیٹھی ہو۔ اس کے دل میں ذرہ بھر خوف پیدا نہیں ہوتا تھا۔

”کیا یہ سچ ہے کہ آپ کے خلاف اخباروں میں خبریں نکلی ہیں۔“ معروف بولے۔

”کیا آپ نے اس کی بیوی کو اغوا کیا ہے۔ وہ غصے میں بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ میرے روبرو جھوٹ بول رہے ہیں۔“

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر کوائف کیا ہیں؟ سچ بتائیے ورنہ میں سخت کارروائی کروں گا۔“

”جی حقیقت یہ ہے کہ اس کی بیوی نے مجھے اغوا کیا ہے۔“

معروف صاحب کی ہنسی نکل گئی۔

”آپ عجیب آدمی ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ ”میں ایک عام آدمی ہوں۔“

”لیکن آپ ابھی کہہ رہے تھے۔“ معروف صاحب پھر سنجیدہ ہو گئے۔ ”کہ آپ چھٹیوں

میں تاش کھیلتے رہے۔“

”سچ عرض کیا ہے میں نے۔“

”کس سے تاش کھیلتے رہے۔“

”جی ان سے جنہوں نے مجھے اغوا کیا ہے۔“

”وہ کون کون ہیں۔“

”جی چھ بچے اور ان کی ماں۔“

”تو کیا یہ سچ ہے کہ وہ چھ بچوں کی ماں ہے۔“

”جی ہاں۔“

”آپ عجیب بے وقوف ہیں۔ اگر اغوا ہی کرنا تھا تو کسی لڑکی کو کرتے خواہ مخواہ آپ نے

اتنے بڑی کتبہ کا بوجھ اٹھالیا۔“

”جی کوئی لڑکی مجھے اغواء کرنے کو تیار نہ تھی۔ سوائے اس چھ بچوں کی ماں کے۔“

”شٹ اپ۔“ معروف نیم غصے نیم مذاق سے بولے۔ ”جا کر چارج لیجئے اور یاد رکھئے۔ اگر

پھر آپ کی رپورٹ آئی تو آپ کو سہڑ کر دوں گا۔“

معروف کے بعد ارم پورے کے ہیڈ ماسٹر راغب صاحب نے اسے اپنے دفتر میں بلا لیا۔

راغب صاحب ایک دبلے پتلے جلعے آدی تھے۔ ان کا چہرہ لمبا تھا مگر کتابی نہیں تھا۔ آنکھیں

رکھنی ہوئی تھیں ناک یوں ابھری ہوئی تھی جیسے سمندر سے مونگے کی چٹان جھانک رہی
ایلی نے ایک نظر انہیں دیکھا۔ وہ معروف سے برعکس قسم کی شخصیت تھے۔

”آمنی صاحب۔“ وہ بولے ”اگرچہ معروف صاحب نے آپ کو اجازت دے دی ہے۔

میں نہیں چاہتا کہ آپ میرے سکول میں کام کریں۔“

”معروف صاحب نے مجھے اجازت نہیں دی۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیا مطلب؟“ وہ بولے۔

”معروف صاحب نے فرمایا ہے کہ راغب صاحب کی مرضی کے بغیر ہم کچھ نہیں کریں

۔“

”لیکن۔۔۔ لیکن۔“ وہ رک گئے۔ ”اچھا مجھے اس کا علم نہ تھا۔“

”معروف صاحب نے صاف کہہ دیا تھا۔“ ایلی نے کہا ”میں اجازت دینے والا کون ہوں کام

ب صاحب نے لیتا ہے۔“

”خوب خوب۔“ وہ خوشی سے چلائے ”تو ہمارا فیصلہ یہ ہے کہ آپ اس مدرسہ میں کام

ا کریں گے۔“

”جیسے بھی آپ مناسب سمجھیں۔“ ایلی نے کہا۔

”دیکھئے نا ہم بدنام آدمی کو اپنے سکول میں نہیں رکھ سکتے۔ ہم اپنا ڈسپلن خراب نہیں کریں

۔“

”جیسے آپ کی مرضی لیکن راغب صاحب بدنام آدمی ڈسپلن خراب نہیں کر سکتا۔“

”آپ کا مطلب؟“

”مطلب یہ ہے کہ شرارت وہ لوگ کرتے ہیں جن پر شبہ نہ کیا جاسکے۔ یا جن کا اعمال نامہ

مذکور ان پر حرف نہ آسکے۔ بدنام آدمی تو اپنا جائز تحفظ بھی نہیں کر سکتا۔ وہ تو کالج کے

نالی طرح ہوتا ہے۔ ذرا ضرب لگی اور ٹوٹ گیا۔“

”ایلی آپ مجھے عقل سکھانے آئے ہیں۔“

”کی نہیں۔“ وہ بولا ”مجھ میں تو خود عقل نہیں میں کیا عقل سکھاؤں گا کسی کو۔“

”کیا مطلب۔“ وہ چلائے۔

”کی عقل ہوتی تو کیا چھ بچوں کی والدہ کو اغوا کر لاتا۔“

”جی ہے۔“

”ارے۔“ وہ چلائے ”کیا واقعی؟“

”تو کیا جو خبریں آپ کے متعلق چھپی تھیں وہ درست ہیں۔“ ایک صاحب نے پوچھا۔

”بالکل۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”حیرت سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے انہیں سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اب کیا کہیں دو
بہتر رہے تھے۔ دو ایک تحسین بھری نگاہوں سے ایلی کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”تو آپ نے چھ بچوں کی ماں کو اغوا کر لیا۔“ ایک نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

”ہائیں۔ ابھی تو آپ کہہ رہے تھے۔“

”خبر تو سچی ہے مگر انداز بیان میں کچھ غلطی رہ گئی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا؟“

”یہ کہ چھ بچوں کی ماں نے مجھے اغوا کر لیا ہے۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہی ہی ہی ہی۔“ ایک قہقہہ بلند ہوا۔

ایلی اچھی طرح جانتا تھا کہ اگر کسی بات پر لوگ قہقہہ مار کر ہنس لیں تو بات اپنی سنگینی کھو

اے۔ اس لئے اس نے اس موضوع پر ایک لیکچر دینا شروع کر دیا کتنے لگا ”بھائی مردوں کی

مردوں کی قوم ہمیشہ ظلم کرتی آئی ہے۔ وہ ہمیشہ مردوں کو اغوا کرتی رہیں اور نام بدنام ہوتا

ہے۔ مرد کو مجرم گردانا جاتا رہا۔ مرد جیل جاتا رہا مرد قید کانتا رہا مرد۔ معلوم ہوتا ہے۔

رات ہند کی اغواء کی دفعہ لکھتے وقت مصنف کی بیوی بھی پاس بیٹھی تھی۔ اس ظالم نے ساری

غلط لکھوا دی۔“

”اور عورت کی بات کرتے وقت ایلی یوں محسوس کیا کرتا تھا۔ جیسے بطخ خشکی سے اتر کر پانی

پا پھینکتی ہو۔“

پچھلے روز ہی جملہ اساتذہ کو ایلی سے ہمدردی پیدا ہو گئی۔ اور وہ اس کے دوست بن گئے۔

”کی تفریح کی کھنی بجتی اور ایلی کو لے کر کسی مقام پر جا بیٹھتے اور اسے چھیڑ کر اس کی باتیں

کر کے دور دور سے اسے دیکھتے اور مسکراتے اور ہیڈ ماسٹر اسے معروف کا آدمی سمجھ کر اس

اتفاق سے پیش آتے۔

”تو کیا یہ سچ ہے؟“ وہ بولے۔

”ہاں جی اور یہی میری بے وقوفی کی دلیل ہے۔“

راغب صاحب بوکھلا گئے۔

اگلے روز راغب صاحب نے معروف صاحب سے احکامات کی وضاحت کی درخواست

کرتے ہوئے ٹیلی فون پر انہیں بتایا کہ الیاس آصفی کے بیان کے مطابق انہیں اس بات کا حق دیا

گیا تھا کہ اس امر کا فیصلہ کریں کہ آیا ارم پورہ کے سکول میں الیاس کام کرتے ہیں یا نہیں۔

معروف فوراً بھانپ گئے کہ وہ بات جو انہیں کہنی چاہیے تھی۔ ایلی نے از خود راغب سے

کہہ دی ہے۔ اس بات پر وہ بے حد مسرور ہوئے اور بولے۔ ”یہ ٹھیک ہے راغب لیکن ہمارا

مشورہ ہے کہ آپ الیاس کو اپنے پاس رکھنے پر رضا مندی دے دیں وہ ایک قابل شخص ہے۔

آپ کو کام سے تعلق ہے ناعورتوں کے اغوا سے تو نہیں۔“

نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی نے ارم پورہ میں کام شروع کر دیا۔

جھوٹ سچ

ایلی نے زندگی میں نئی بات سیکھی تھی۔ وہ سچ کے ذریعے جھوٹ بولتا تھا۔ اس نے تجربہ کے

زور پر اس حقیقت کو پالیا تھا کہ سچی بات کہہ دی جائے تو سننے والا حیران رہ جاتا ہے۔ اس کے دل

میں نفرت کی بجائی دلچسپی اور ہمدردی پیدا ہوتی ہے اور کبھی کبھار احترام بھی۔ اس کے علاوہ کتنے

والے کے دل پر بوجھ نہیں رہتا۔ اور بات کہہ دی جائے تو وہ پھوڑا نہیں بنتی۔ اس میں پیپ

نہیں پڑتی۔ اکثر اوقات تو ایسا ہوتا ہے کہ سچی بات کو اعلانیہ تسلیم کر لیا جائے تو لوگ سمجھتے ہیں

کہ مذاق کر رہا ہے انہیں یقین ہی نہیں آتا۔ شاید ایلی نے یہ انوکھا طریقہ شنوار سے سیکھا ہو۔

بہر صورت جب اساتذہ اس سے ملے تو اخباری خبروں کی بات چھڑائی۔ ایک صاحب ”اتفاق“

بولے۔ ”جی ان اخبار والوں کا کیا ہے۔ جو جی چاہتا ہے انہیں شاپ لکھ دیتے ہیں۔ سچ تو ہوتا

ہی لکھتے ہیں۔“ کیوں الیاس صاحب۔“

”پنا تجربہ تو مختلف ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب؟“ ایک اور صاحب بولے۔

”مطلب یہ ہے کہ میرے متعلق آج تک صرف ایک خبر چھاپی ہے انہوں نے اور وہ سولہ

آٹھ بچے

سکول میں ہیرو بن کر گھومنے کے بعد وہ سائیکل اٹھا کر چوروں کی طرح گھر کی طرف چل پڑا۔ جان بوجھ کر لمبے راستے سے گھر جانا تاکہ کوئی یہ نہ سمجھ لے کہ وہ ریتا کمال ہے کوئی اس کے گھر کا پتہ پوچھتا تو صاف کہہ دیتا ”بھائی گھر کا پتہ نہ پوچھو اور کوئی خدمت بتاؤ جو انوار کرتے ہیں وہ گھر کا پتہ مینہ راز میں رکھتے ہیں۔“

گھر پہنچتا تو وہ گھر کے ہنگامے میں کھو جاتا۔

گھر میں وہ آٹھ بچے تھے۔ کبھی کسی نے محسوس نہیں کیا تھا کہ گھر میں کوئی بڑا بھی ہے۔ بڑا گھر میں کوئی تھا ہی نہیں۔ وہ ماں کیا بڑی بن سکتی ہے۔ جو چھ بچے ساتھ لے کر گھر سے بھاگ آئی ہو۔ وہ مرد کیا بڑا بن سکتا ہے۔ جو چھ بچوں کی ماں کو انوار کر لایا ہو۔ ان حالات میں جو تھوڑی بہت بزرگی اور بڑائی شہزاد اور ایللی میں تھی۔ وہ بھی خارج ہو چکی تھی۔ کس منہ سے وہ عقل و اور اک اخلاق یا سنجیدگی کا ڈھونگ رچاتے اور پھر ان بچیوں کے رویہ جو جوان تھیں۔ صبیحہ تیرہ سال کی تھی۔ نفیسہ بارہ کی اور ریحانہ نو سال کی البتہ ایک بات ضرور تھی۔ شہزاد اور ایللی نے کبھی بڑائی ہاتھ سے جلنے پر افسوس محسوس نہ کیا تھا۔

اگر شہزاد کبھی کبھار لڑکیوں کے شور سے تنگ آجاتی اور چلا کر کہتی ”اے لڑکیو سنٹی ہو۔“

”امی۔“ نفیسہ ہنستی ”ذرا زور سے بولو تو کچھ سنائی بھی دے۔“

”کانوں میں تیل ڈالا ہوا ہے کیا؟“

”تیل تو نہیں۔“ صبیحہ کہتی۔ ”کانوں پر صرف بل ڈالے ہوئے ہیں۔“

”تمہارا تو دماغ خراب ہو گیا ہے۔“

”دل تو اچھا ہے نا امی۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنستیں۔

پھر وہ سب جھرمٹ ڈال امی کے گرد اکھڑی ہوتیں اور ناچتیں گاتیں ہنستیں۔ ایللی کہتا۔

”شور نہ مچاؤ۔ اگر کسی کو ہمارے گھر کا پتہ چل گیا تو۔“

”تو کیا۔“ وہ جواب دیتیں۔ ”یہی ناکہ وہ چٹھی لکھ دے گا ہمیں اور چٹھی رساں چٹھی لے آئے گا اور ہم پڑھ لیں گے۔“

”اور اگر کسی نے آکر تمہیں چوٹی سے پکڑ لیا تو۔“ ایللی چلاتا۔

چوٹی کٹ ڈالیں گے۔“ وہ قہقہہ مار کر ہنس پڑتیں۔

ان کی زندگی میں ایک مشکل تھی۔ جو روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔

ایللی کی تنخواہ صرف ستائیس روپے تھی۔ ایللی اس زمانے میں جوان ہوا تھا۔ جب پہلی عالمی جنگ کے اثرات رونما ہوئے تھے اور دنیا بھر میں مالی بحران کا دور دورہ تھا۔ بنیادی طور پر ایک رپہٹ کا گریڈ اسی روپے سے شروع ہوتا تھا۔ لیکن مالی بحران کی وجہ سے گورنمنٹ کے بین کی تنخواہوں میں تخفیف کر دی گئی تھی اور اسی (۸۰) کی جگہ اب پینسٹ روپے کا گریڈ کر دیا گیا تھا۔ لیکن پینسٹ روپے کے گریڈ پر ملازم رکھا جائے اور پینسٹ روپے ایم اے بی بی اپنے جائیں۔ اس لئے ایللی کی تنخواہ پینتالیس روپے سے شروع ہوئی تھی۔ اور اب وہ اس روپے پر رہا تھا۔ ستائیس روپے اتنے بڑے کنبے کے لئے بے حد ناکافی تھے۔ خصوصاً

ایلیا کی جو مالی مشکلات کے تصور سے ہی بیگانہ تھا۔

ان کے پاس جو آٹھ تھادہ ختم ہو چکا تھا اور اب وہ شدت سے مالی مشکلات کو محسوس لے گئے تھے۔ اس امر کو صرف ایللی ہی محسوس کرتا تھا۔ لڑکیاں اس بات سے بے نیاز واقع نہیں۔ روایتی ملکہ کی طرح وہ سوچتی تھیں کہ غریبوں کو اگر کھانے کو روٹی نہیں ملتی تو وہ بہ پڑی کیوں نہیں کھاتے۔

بہرحال یہ امر مسلمہ تھا کہ اگر مالی مشکلات کا احساس ان کے گھر میں صدر دروازہ سے داخل ہوا تھا۔ تو عقبی دروازے سے ضرور داخل ہو رہا تھا۔ لاشعوری طور پر جانے بغیر ان کی زندگی ان جلدی تنگی بڑھنے لگی تھی۔

ایللی ہاں

لاہور میں صرف ایک آدمی تھا۔ جو ان کے مکان سے واقف تھا۔ وہ تھا محمود کبھی کبھار محمود شہزاد اور ایللی کو میم کی باتیں سناتا اور کالج کے قصبے بیان کرتا۔ محمود سترھواں لے پالک ہونے لگا۔ محمود گھر میں یوں رہتا تھا۔ جیسے الف لیلیٰ میں شہزادیوں کے جھرمٹ میں سلطان رہتے۔ ان کو بلانے پر حبشی جلا دہاتھ میں تلووار اٹھائے حاضر ہو جاتا۔ لیکن کبھی کبھار ایللی کو شک پڑتا کہ وہ میں بھی ایک ایللی چھپا ہوا ہے۔ جو ماسٹا بھری گود میں لینے کے لئے بلکتا ہے۔ جسے یہ لہجہ کوئی اس کی دیکھ بھال کرے۔ اس کی ناک پونچھے منہ دھوئے اور پھر پیار سے جھڑک کر

سکول بھیج دے ایلی جذباتی طور پر ڈرا ہوا بچہ تھا اور ذہنی طور پر ایک نڈر مفکر۔

ایک روز وہ سب بیٹھے تھے تو محمود آگیا۔ اس کے ساتھ ساری میں لپٹی ہوئی ایک گوری عورت تھی۔ جسے اس نے اندر بھجوا دیا۔

”ارے یہ کون ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”یہ بھی ہے۔“ محمود بولا۔

”کوئی نئی پھنسی ہے؟“

پھنسی ہی رہتی ہیں۔ اب ایک کام کرو۔“ محمود بولا۔

”کیا؟“

”ایک مولوی بلوا دو۔“

”بھئی نکاح پڑھواتا ہے۔“

”اور وہ میم کیا ہوئی؟“

ایلی اوہراوہر بھاگ دوڑ کر ایک مولوی لے آیا۔

مولوی صاحب پہلے تو محمود کو کٹے پڑھاتے رہے۔ پھر جب ایجاب و قبول کا وقت آیا۔ تو

مولوی صاحب نے کہا۔ ”کیا آپ کو محمود ولد احمد سکھ رام پور کی زوجیت میں آنا قبول ہے؟“

وہ خاتون بولی ”ہام کو منبڑ ہے۔“

اس پر لڑکیاں ہنسنے لگیں۔

ایلی نے حیرت سے خاتون کی طرف دیکھا۔ ”ارے آپ تو میم ہیں۔“ وہ بولا۔

میم نے کہا ”ڈول ہاں“ ہے میم ناہیں۔“

مولوی کی جانے کے بعد ایلی کے گھر میں ہنگامہ مچ گیا۔ لڑکیاں میم کے ساگ لگنے لگیں۔

اسے چھیڑنے لگیں۔ میم نے جارہی تھی۔ محمود مسکرا رہا تھا۔ شہزاد کی آنکھوں میں سرت کی

پھوپھا پڑ رہی تھی۔

محمود اور میم کے نکاح کے چند روز بعد محمود بھاگا بھاگا ایلی کے پاس آیا۔ ”ایلی۔“ وہ بولا

”وہ نہیں آئی!“

”کون نہیں آئی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”آج دیک اندھے۔“ وہ بولا ”ہر دیک اندھ پر وہ آیا کرتی ہے۔ بلا ناٹھ لیکن اب کی بار نہیں

ایلی نے قہقہہ لگایا ”تم تو پاگل ہو۔“ وہ بولا ”خواہ مخواہ پریشان ہو رہے ہو جیسے وہ بچی ہو۔“

”تم نہیں جانتے۔“ وہ ہنسنے لگا۔ ”واقعی وہ بچی ہے۔“

”بچی ہے۔“ ایلی ہنسا۔

”ہاں۔“ محمود نے کہا یہ سب بچیاں ہوتی ہیں۔ ان کی عمر نہ دیکھو شکل نہ دیکھو صورت نہ

یہ سب بچیاں ہوتی ہیں اور جہی تک ٹھیک رہتی ہیں جب تک ان پر بچی حاوی رہے۔“

ن گھبرائے مسکایا بات ہے۔“ ایلی بولا ”گھبرانے کی بات تو ہے۔“ محمود نے کہا ”وہ آئی جو

مجھے سمجھ میں نہیں آئی بات۔“

کھین

مجھے بھی نہیں آئی تا! محمود نے کہا ”میرا دل کہہ رہا ہے کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔“

دو روز محمود میم کا انتظار کرتا رہا لیکن وہ نہ آئی۔ وہ پھر وہ نئے شرچلا گیا۔ وہاں جا کر اپنا

ٹاہر کئے بغیر اس نے حالات کا جائزہ لیا معلوم ہوا کہ وہاں موجود نہیں۔ اس پر وہ گھبرا گیا۔

مزید پوچھ گچھ پر اسے معلوم ہوا کہ ایک صاحب اسے ساتھ لے گئے ہیں۔ اس کے علاوہ

کچھ علم نہ ہو سکا۔

لاہور واپس آکر وہ سیدھا ایلی کے پاس آیا۔ ”غضب ہو گیا۔“ وہ بولا۔ ”وہ نئی شہر میں بھی

ہے۔ کہتے ہیں کوئی گورا صاحب اسے آکر لے گیا ہے۔“

”کیا زبردستی لے گیا ہے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”جی۔“ وہ بولا ”اسے کوئی زبردستی لے جائے تو اس کے لئے اس سے بڑھ کر رو مینس

ناہیں ہو سکتا۔ یہ سبھی ایسی ہوتی ہیں۔ پہلے روتی ہیں۔ چیختی ہیں چلاتی ہیں پھر غم سے

لو ہو کر لے جانے والے سے چٹ جاتی ہیں۔ اللہ اللہ خیر سلا۔“

”کس کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پوچھا۔

”گورڈ خاموش رہا۔“ ”کیا میموں کی بات کر رہے ہو۔“ ایلی نے پھر پوچھا۔

”گوگوگو“ وہ بولا ”عورت عورت ہمیشہ عورت رہتی ہے۔ چاہے وہ میم ہو دکی ہو یا جہنم ہو۔“

کوئی فرق نہیں پڑتا۔

”کیا عمر ہوگی؟“

”بڑھا ہے۔ لیکن سخت زانی ہے اور شرابی بھی۔“

”ایک بات بتاؤں بابا۔“ ایلی نے کہا اور پھر قدرے توقف کے بعد اس نے چوکیدار سے

”تمہارا صاحب ایک مسلمان عورت کو بھاگ لایا ہے۔ نئے شرے۔“

”نہ باو۔“ وہ بولا ”میں اپنی دیکھی عورت کبھی نہیں آئی یہاں تو میںیں آتی ہیں۔ جوان

می اوجیز سبھی آتی ہیں۔“

”لیکن بابا۔“ ایلی نے کہا ”وہ ہے تو میم مکر مسلمان میم ہے۔“

”یہاں قلعہ مار کر ہٹا۔“

”سچ کہتا ہوں بابا۔“ ایلی نے کہا۔

”نہ بھی۔“ وہ بولا ”میم مسلمان نہیں ہوتی۔ ان میموں کا اسلام سے کیا واسطہ۔“

ایلی نے بابا کو سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کے ذہن میں میم کا مسلمان ہونا ممکن ہی نہ

اس لئے ایلی کی تجویز ناکام ہو گئی۔

”اچھا۔“ وہ بولا ”بابا ایک کام تو کرو مجھے اس میم کے سامنے لے چلو۔ جو اس وقت صاحب

لے گھر میں ہے۔“

”اونہوں۔“ بابا نے جواب دیا۔ ”گھر میں جانے کی کسی کو اجازت نہیں۔“

”تو چلو باہر سے ہی جھانکوں گا۔“

بابا کو یہ بات بھی منظور نہ تھی۔ بولا ”نہ باو وہ دیکھ لے یا اسے پتہ چل جائے تو کھا جائے

”ایسا سخت ہے ہو۔“

بہر حال ایلی نے کوشی کے باہر دو ایک چار لگائے کوشی چاروں طرف سے بند تھی۔ اس

نے کھڑکیوں کے شیشوں سے جھانکنے کی کوشش کی لیکن اندر دیر پر دے لگ رہے تھے۔

ابھی وہ وہیں کھڑا تھا کہ خاندان کا لڑکا آگیا۔

وہ ایلی کو گھورنے لگا۔

ایلی نے اس سے پوچھا ”کوشی میں کوئی ہے کیا؟“

محمود کی بات صحیح نکلی چند ہی دنوں کے بعد اسے ایک خط موصول ہوا جس میں درج تھا۔

”مجھے اچھی سے معلوم ہے کہ تم غنڈوں کے ایک گروہ سے تعلق رکھتے ہو اور تم نے ایک

برٹش نیٹشل خاتون کو عرصہ دراز سے اغوا کر رکھا ہے اور تم نے اسے زبردستی مسلمان کرنے کی

کوشش کی ہے اور دھوکے سے اس کے ساتھ عقد کیا ہے۔ حالانکہ تعزیرات ہند کے تحت

کوئی ہندوستانی کسی برٹش نیٹشل خاتون سے شادی نہیں کر سکتا۔ جب تک خاص اجازت ہند

حاصل نہ کرے لہذا تم اور تمہارے دوست دھوکہ دہی اور اغواء کے مرتکب ہوئے ہو اور میں

تمہارے خلاف قانونی چارہ جوئی سے گریز نہیں کروں گا اور اگر تم نے اس خاتون سے دوبار ملنے

کی سعی کی تو اپنے اختیارات کو کام میں لا کر میں تمہیں کیفر کروا کر تک پہنچاؤں گا۔

خط کے نیچے لپے چوڑے دستخط کئے ہوئے تھے۔ نیچے لکھا تھا کیشنر بیجاپور

”ارے۔“ ایلی چلایا ”یہ تو کوئی کیشنر ہے۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔“ محمود بولا ”وہ اسے اغوا کر کے لے گیا ہے۔ اس کی مدت سے آرزو

تھی کہ کوئی اسے زبردستی اغوا کر کے لے جائے پھر جب تم ان سب کو لے آئے اور اس نے یہ

قصہ سنا تو گویا جلتی پر تیل پڑ گیا وہ بھی بھڑک اٹھی۔ اس کی یہ خواہش اور بھی چلی اور اب ’ب

یہ ڈار ٹنگینیں نہ جانے اسے کہاں سے مل گیا ہے۔“

محمود سخت گھبرایا ہوا تھا۔

محمود کے کہنے پر ایلی بیجاپور گیا۔ تاکہ وہاں سے کوائف حاصل کرے۔ پہلے تو وہ شر

کا جائزہ لینے میں مصروف رہا۔ پھر اس نے کیشنر کی کوشی کا پتہ لگایا اور وہاں پہنچ کر باہر انتظار کرنا

رہا کہ کب کیشنر دفتر جائے تو کوشی کے کسی نوکر سے ملے آخر کیشنر کی کار کوشی سے باہر نکل۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد وہ کوشی کے آؤٹ ہاؤس کی طرف گیا اور چوکیدار سے ملا۔ چوکیدار

ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ اسے دیکھ کر ایلی کی امید بندھ گئی۔ اس نے چوکیدار کو پانچ روپے تمنا

دیئے۔ ”بابا یہ صاحب کس قسم کا آدمی ہے؟“

”توبہ ہے“ بابا نے جواب دیا۔ ”یہ صاحب تو سمجھ کر لو آفت ہے آفت۔“

”کیا سخت مزاج ہے۔“

”اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔ سارا دن بیٹھ کر شراب پیتا ہے۔ سارا دن۔“

”نہیں باو۔“ وہ بولا ”صاحب اکیلے ہی رہتے ہیں۔“

”کوئی مہمان عورت تو نہیں آئی ہوئی؟“

”نہیں۔“ وہ بولا۔

”جھوٹ نہ بولو۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے۔“

”ہاں۔“ لڑکے نے اقبل کرتے ہوئے اشارہ کیا۔ ”پر وہ بند ہے۔“

”بند ہے۔“ ایلی بولا۔

”ہاں۔“ لڑکے نے ڈرتے ہوئے ادھر ادھر دیکھ کر کہا ”صاحب تلہ لگا کر جاتا ہے۔“

ابھی وہ بات ہی کر رہے تھے کہ موٹر کے آنے کی آواز سنائی دی۔ وہ سب بھاگ کر آؤٹ

ہاؤس کی طرف چلے گئے۔ تاکہ صاحب انہیں دیکھ نہ لے۔ ایلی نے دور سے چھپ کر دیکھا۔ ڈار

ٹنگینیں ادھر عمر ختم کر چکا تھا۔ اس کا جسم بھدا تھا۔ چہرے پر شراب نوشی کے واضح آثار تھے

اور اس کے ساتھ ہی جابرانہ رجحانات مترشح ہو رہے تھے۔ اس کی شکل و صورت ان فلمی

غنائوں کی سی تھی۔ جو ہیروئین کو اٹھا کر لے آتے ہیں اور اسے قلعہ کے زیرین کمرے میں

مقتل کر دیتے ہیں۔

محمود نے جب یہ سنا تو اس نے سر پیٹ لیا۔ ”بس سمجھ لو قصہ ختم ہو گیا اسے تو دیر سے یہ

خواہش تھی کہ کوئی ظالم قسم کا جابر آدمی اسے پکڑ کر لے جائے اور کسی قلعہ میں قید کر دے۔“

محمود کی بات سچ ثابت ہوئی۔ میم نے اسے ملنے کی کوئی کوشش نہ کی۔ ممکن ہے اسے

”کرنے کا موقع ہی نہ ملا ہو۔ وہ لمبی رخصت پر رہی اس لئے نئے شہر واپس نہ آئی۔ بلکہ

کا جائزہ لینے میں نے اپنی قلم سے درخواست بھیج دی جس میں تحریر تھا کہ سز قلم

رہا کہ کب کسٹر دفتر جائے جو جو رقوم اسے واجب الادا ہیں ان کی تفصیل بھیج دی جائے۔

کچھ دیر انتظار کرنے کے بعد سن پڑا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایک ماہ کے اندر اندر وہ دونوں

ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ اسے گئے اور ستر ہواں لے پالک لاہور میں بے بس بیٹھا حالات کا

دیکھے۔ ”بابا یہ صاحب کس قسم کا

”توبہ ہے“ بابا نے جواب دیا

”کیا سخت مزاج ہے“

”اونہوں بابا یہ تو بد ہے بد۔“ ایسا دیکھے ہی شریف ایک مظلوم شخص تھا۔ اس نے فطرتاً

ہوتا۔ اپنی تمام تر اہمیت کا انحصار اپنی مظلومیت پر استوار کر رکھا تھا۔ پہلے وہ انور کے عشق میں

مرشاد تھا۔ اس حد تک سرشار تھا کہ شہزاد سی رنگیلی بیوی کے ہوتے ہوئے بھی مظلومیت کی

بات میں کھویا رہا۔ یہ کہنا کہ اسے شہزاد سے محبت نہ تھی غلط ہو گا۔ اسے واقعی شہزاد سے محبت

تھی۔ اسے شہزاد پر ناز تھا۔ وہ اس کی رنگینی سے کما حقہ واقف تھا۔ وہ شہزاد کے لئے بھی کچھ

کرتے کو تیار تھا۔ لیکن مظلومیت کے احساس کو رد نہ کر سکتا تھا یہ احساس اس کی گھٹی میں پڑا

افقہ سل باسل کے عشق نے اسے اور بھی اجاگر کر دیا تھا۔ اب وہ تفریحاً اپنی مظلومیت اور

اپن عشق کا پرچار کرتا تھا۔ اسے خیال نہ آیا تھا کہ ایک رنگین بیوی کی موجودگی میں کسی اور

رات کے عشق میں آہیں بھرنا اچھے نتائج پیدا نہیں کرتا۔

شریف کو یقین تھا کہ خود شہزاد اس کے عشق میں گرفتار ہے۔ چونکہ اسے خفیلی کے

بڑک کی بات نہ بھولی تھی۔

بہر صورت انور کے عشق کی ناکامی تو اس کے لئے ایک رنگین غم تھا۔ چونکہ اذنی طور پر

رہا ایک سچا اور خالص عاشق نہ تھا۔ بلکہ ایک سچے عاشق کی طرح جبر پسند واقع ہوا تھا۔ انور

سے محروم ہو جانے پر اسے صدمہ تو ضرور ہوا۔ مگر وہ صدمہ ایسے ہی تھا جیسے بلخ کے لئے

اُن کا طوفان ہوتا ہے۔

شہزاد اور بچوں کا اپنی مرضی سے شریف کے گھر سے نکل آنا شریف کے لئے ایک شدید

درد تھا۔ ایک ایسا صدمہ جس میں رنگینی کا عنصر نہ تھا۔ لہذا اس میں محنت اور رسوائی تھی۔

لہذا رسوائی جو عشق کی رسوائی سے قطعی طور پر مختلف ہوتی ہے۔ لہذا اس پر ہسٹیریا کا دورہ

آیا تھا۔ اور اس دورے کے تحت وہ اپنے آپ سے باہر نکل آیا تھا۔ اور محلے میں آکر اس نے

بڑا معمول آگ لگا دی تھی۔

کچھ دیر کے بعد جب ہسٹیریا کی شدت مدھم پڑ گئی تو اس نے محسوس کیا کہ اس روپے

سے تو روحانی اور بھی بڑھ رہی تھی۔ اس کی بنیادی اٹانے اسے لکارا اور وہ چپ چاپ علی پور

سے روانہ ہو گیا اور اپنی نوکری پر حاضر ہو گیا۔

اس صدمہ کی شدت کے ختم ہونے پر شریف نے محسوس کیا کہ وہ بیٹھا بیٹھا درد جو باقی

دیا تھا اس کے لئے باعث تسکین ہے۔ ایک غم خور کو گویا ہمیشہ کے لئے غم کی ایک دولت

مل گئی تھی۔

گرد جمرٹ لگا لیا۔ نفیدہ ناپنے لگی۔ صبیحہ کا رہی تھی۔ وہ سب مل کر انہیں چھیڑ رہے تھے۔
جی کر رہے تھے۔ ان سے مذاق کر رہے تھے۔

اس واقعہ کو ایک سال گزر گیا۔ اب وہ قطعی طور پر آزاد تھے۔ اب انہیں چھپ کر رہنے کی ضرورت نہ رہی تھی۔ سکول میں لوگ بھول چکے تھے کہ ایلہی کے متعلق اخبارات میں خبریں مچھی تھیں۔ مشر معروف کو یہ امر یاد نہ رہا تھا کہ اس کے خلاف خطوط موصول ہوتے رہے تھے۔ محلے والوں کے دلوں میں ان کے لئے نفرت نہ رہی تھی ایک دو شریف کے رشتہ دار تھے جو ایلہی کا نام سن کر تیوری چڑھاتے یا نفرت سے منہ پھیر لیتے باقی لوگوں کو ان کے ساتھ کوئی تعلق نہ رہا تھا۔

روابن الوقت

پھر ایک روز ان کے ہاں علی احمد آگئے۔ شہزاد کے آنے کے بعد یہ پہلا موقع تھا کہ علی احمد ان کے ہاں آئے تھے۔ آتے ہی انہوں نے شور مچا دیا۔ کیوں بھی شہزاد کوئی حقہ وقت بھرو کوئی چائے دوائے پلاؤ۔ مہمان آئے ہیں۔ ایلہی اور شہزاد علی احمد کو دیکھ کر بے حد خوش ہوئے۔ ”میں نے کہا۔“ وہ بولے۔ ”جب تو ہم سے آنکھ بھی نہیں ملاتی تھی۔ اب بولو۔“ شہزاد ہنسنے لگی۔ ”اب انتہی ہے۔ جب دیکھ کر تیوری چڑھاتی تھی۔“

”جب کی بات جب کے ساتھ۔“ وہ بولی۔ ”اب کی اب کے ساتھ۔“

”تو تم ابن الوقت ہو۔“ علی احمد نے قہقہہ لگایا ”کہ جب اور اب کا خیال رکھتی ہو۔“

”آپ بھی تو ہیں ابن الوقت۔“ وہ چلانے لگی۔

”وہ کس طرح۔“ علی احمد نے پوچھا۔

”جب آپ کی نگاہ اور ہوتی تھی اب اور ہے۔“

”ہی ہی ہی۔“ وہ ہنسے۔ ”تو تم نگاہ کو پہچانتی ہو۔ ہی ہی ہی۔ لیکن ہمارے کمال کی جگہ دو دو نا بھی موقع اور محل سمجھتے ہیں کیا کہتی ہے۔“

پھر وہ لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو گئے۔ ”پائی بالی۔“ وہ چلانے لگے۔ ”یہ تو سب جوان ہو گئی ہیں۔ عورت نے دنیا میں دھاندلی مچا رکھی ہے۔“

”وہ کیسے؟“ شہزاد بولی۔

اس دولت کو پا کر وہ اپنے پرانے کوئے میں کھس گیا اور اس نے اپنی طبعی قنوطیت کا لبلاہ لادڑھ لیا۔

غم خور کے لئے سب سے بڑی ضرورت ایک ایسے ساتھی کی ہوتی ہے جس سے انکار غم کیا جاسکے اور اپنی محرومیت اور زمانے کے مظالم کا رونا روایا جاسکے اس لئے شریف نے فیصلہ کر لیا کہ وہ اپنی پرانی زندگی کو یکسر بھول جائے گا اور ایک نیا ورق الٹے گا۔ یہ نیا ورق ایک نئی شادی اور نئی بیوی تھی۔ لیکن ایسی بات اپنے منہ سے کہہ دینا یا شعوری طور پر اس پر سوچنا ایک غم خور کے لئے ممکن نہ تھا۔ لہذا اس نے جلد ہی ایسے حالات پیدا کر لئے کہ اس کی ہمیشہ نے یہی تجویز بھائی کے سامنے پیش کر دی اس پر وہ حیرت سے بہن کا منہ ٹکٹنے لگا ”یہ تم کہہ رہی ہو حمیدی۔“ اس نے ملامت سے بہن کی طرف دیکھا اور مجبور ہو کر بہن کی بات مان لی شادی کے روز وہ بہت رویا جیسے اسے اپنی طبیعت کے خلاف کسی بات پر مجبور کر دیا گیا ہو۔ نتیجہ یہ ہوا کہ حمیدی نے نیاز مرحومہ کی بڑی بیٹی رشیدہ بانو سے شریف کا بیاہ کر دیا۔ رشیدہ کے لواحقین کو یہ ڈر تھا کہ کہیں شریف کی بیوی شہزاد اپنے چھ بالکوں کو لے کر پھر سے شریف کے گھر نہ آؤ گئے اس لئے انہوں نے صاف کہہ دیا کہ شہزاد کو طلاق دے دو تو مناسب ہے۔ شریف اعلان یہ شہزاد کو طلاق دینے کے حق میں نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ شہزاد قانونی طور پر آزاد نہ ہو سکے۔ اس لئے اس نے چوری چوری طلاق نامے پر دستخط کر دیئے اور اس بات کو مخفی رکھا۔

شریف کے گھر ایک نئی بیوی آگئی۔ جس کے سامنے وہ صبح و شام اپنی مظلومیت کا قصہ بیان کر سکتا تھا۔ آپس بھر سکتا تھا۔ چھت کو ٹٹنگی باندھ کر دیکھ سکتا تھا گویا مینڈک کو پھر بچہ بھرا کنارہ مل گیا اور وہ پھر سے اپنے آسٹیاں میں آ بیٹھا۔

محض اتفاق سے اس خفیہ طلاق کی خبر ایلہی اور شہزاد تک پہنچ گئی۔ اس روز وہ یوں محسوس کر رہے تھے۔ جیسے انہوں نے ایک دوسرے کو پہلی مرتبہ دیکھا ہو۔ جیسے وہ از سر نو عشق میں گرفتار ہو گئے ہوں۔ اگرچہ جہاں تک ظاہر کا تعلق تھا۔ وہ دونوں سمجھتے تھے کہ یہ قانونی نقطہ ایک بے معنی بات ہے۔ وہ دونوں تو عرصہ دراز سے ایک دوسرے کے ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود وہ بے حد خوش تھے اور ساتھ ہی اس خوشی کو تسلیم کرنے کے لئے تیار نہ تھے۔

جب وہ دونوں ایک بوڑھے مولوی کے سامنے بیٹھے تو ایلہی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ شہزاد پھر سے مونگیا گٹھڑی بنی بیٹھی تھی۔ پھر جب وہ گھر واپس پہنچے تو لڑکیوں نے ان کے

ایلیٹنگ کے پاس بیٹھا تھا۔ اس کے ذہن میں بیرونی طوفان سے زیادہ شدید طوفان چل رہا

”شرط یہ ہے کہ شریف سب کے رویہ و قسم کھا کر کہے کہ میں پورے عزم اور استحکام سے اس معاملے کی پیروی کروں گا۔“ میں نے کہا۔ ”دیکھو نا شریف ایک سلاہو قسم کا آدمی ہے اسے دنیا سے لگاؤ نہیں کسی سے دشمنی اس کے دل میں نہیں۔ اس کا کیا ہے کل اس جھڑے کو چھوڑ

پھر ہسپتال کا بنگلہ اس کے رو برو کھڑا تھا۔ مردہ بچے کی لاش لے جاؤ۔ ”وہ کہہ رہا تھا۔
 لاش ایلی سوچنے لگا۔ لاش کو کہاں لے جاؤں۔ کیا کروں۔ لاش!!
 بنگلے اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ ”ابھی لے جاؤ۔“ وہ کہہ رہا تھا۔ ”اسی وقت اٹھانے والا ہے
 ایلی حیرت سے اس کا منہ دیکھ رہا تھا۔

ملو بند

شہزاد ہسپتال سے واپس آئی تو ایلی اسے دیکھ کر گھبرا گیا۔ یہ وہ شہزاد نہیں تھی۔ جس سے وہ
 نکل گیا۔ یہ تو کوئی اور ہی شہزاد تھی۔ اس کا جسم ہڈیوں کا ایک ڈھانچہ تھا۔ گل بری طرح چمک
 رہے۔ ہڈیاں ابھر آئی تھیں۔ ماتھے کا قتل گویا گل ہو گیا تھا۔ اس میں وہ روشنی نہ رہی تھی۔
 کسی نے دھپ بجا کر اس کی گزشتہ روشنی کی یاد تازہ رکھنے کے لئے اسے ان طاقوں پر رکھ
 ہو۔ آنکھوں میں چمک باقی تھی۔ لیکن اس چمک میں باہر کا دھندلا شال ہو گیا تھا۔ ناک
 رانی تھی۔ ہونٹ گویا بھینچ گئے تھے۔ دانت نکل آئے تھے۔

اسے ڈسچارج کرتے ہوئے ڈاکٹر نے کہا تھا اسے اچھی غذا کی ضرورت ہے اچھی غذا اور
 ٹیم لیکن جب وہ گھر پہنچی تھی تو ان کے ہاں کچھ آٹا اور تھوڑی سی دال کے علاوہ کچھ نہ تھا۔
 ان کی غربت روز بروز بڑھتی جا رہی تھی۔ سر پر قرض کا طوار کھڑا ہو گیا تھا۔ بے ادراک کرنے
 کوئی صورت نہ تھی۔ لیکن اس سے بڑی مشکل یہ تھی کہ قرض حاصل کرنے کے مزید
 اثبات بالکل ختم ہو چکے تھے۔

لاہور میں ایلی کے ماموں زاد بھائیوں رفیق جمیل اور خلیق نے اس کی بے حد امداد کی تھی۔
 اب ابھی تک خان پور میں تھا۔ رفیق لاہور رہتا تھا چونکہ اس کی تبدیلی ہیڈ آفس میں ہو چکی
 تھی۔ ٹینٹ اب ڈاکٹر بن چکا تھا اور اکثر لاہور آیا کرتا تھا۔ ان کے علاوہ اس کے خالہ زاد بھائی
 نے ان کے ساتھ بہت ہمدردی کی تھی۔ لیکن انہیں تو آئے دن امداد کی ضرورت رہتی
 تھی۔ کبھی کبھار کی بات ہوتی تو بھی وقت گزر جاتا۔ روز کی حاجت مندی کا کیا علاج ہو سکتا تھا۔
 دوسری مشکل یہ تھی کہ دو لڑکیاں اب جوان ہو چکی تھیں۔ ان میں شہزاد کی سی رنگینی تو
 تھی۔ لیکن پھر بھی وہ شہزاد کی بیٹیاں تھیں اور اسی گھر میں پل کر جوان ہوئی تھیں۔ لہذا ان کی

تھا۔ کیا یہی اس قصے کا انجام تھا۔ سالہا سال کی تنگ و دو کے بعد جب کہ وہ جیون ساتھی بن چکے
 تھے کیا قدرت کو یہی منظور تھا کہ وہ پھر جدا ہو جائیں۔ اگر شہزاد کو کچھ ہو گیا تو بچوں کا کیا ہو گا؟ وہ
 سوچ رہا تھا۔

بیٹے ہوئے لمحات اس کے سامنے پردہ ظلم کی طرح آ رہے تھے۔ جب وہ شہزاد کو پہلی دفعہ
 بیاہ کر لائے تھے اور ملحقہ ڈبے میں وہ مونگیا گھٹھری بنی ہوئی تھی۔ حنا ملیدہ ہاتھ گھٹھری سے نکل
 تھے۔ یہ ہے ایلی۔ کسی نے کہا تھا اور دو ناگ اس کے سر پر منڈلانے لگے تھے۔

پھر جب وہ کمائی سنا رہی تھی اور ایلی نے محسوس کیا تھا کہ اس کے انگوٹھے پر ایک رنگین
 بوجھ سا پڑ گیا تھا اور اس کا سر بھن سے اڑ گیا تھا جیسے کسی نے ہوائی کو آگ دی ہو اور ان جانے
 میں اس نے وہ حنا ملیدہ ہاتھ تھام لئے تھے اور نہ جانے جذبے کی شدت میں کیا کہہ دیا تھا۔ ”تم
 ایلی تم۔“ شہزاد نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا تھا۔

پھر بند بیٹھک میں اپنے مردانہ پن کی وحاک جملنے کے لئے وہ سکندر کی طرح حملہ آور تھا
 اور پھر پورس کی طرح منہ میں گھاس لئے اس کے قدموں میں پڑا ہوا تھا۔

پھر وہ بے نیاز درزن اس کے رو برو بیٹھی تھی۔ جو قریب ہو کر اس سے دور ہو جاتی تھی اور
 دور ہوتی تو گویا اس کی گود میں آ بیٹھتی۔ وہ اجنبی عورت کی طرح اس کے رو برو کھڑی تھی۔ وہ
 صفر سے ہنس ہنس کر باتیں کر رہی تھیں اور ایلی کی طرف حقارت سے دیکھ کر کہہ رہی تھی
 ”تم!“ اس تم میں کتنی وحاک تھی۔ اس کا دل ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا تھا۔

پھر وہ چلا رہا تھا۔ ”تم رذیل کمین عورت ہو۔ آج پھر میرے رو برو آتے ہوئے نہیں
 شرم نہیں آتی کیا؟“ اور وہ اس کے قدموں میں گر کر کہہ رہی تھی ”ہاں۔“ ہوں۔“ پھر
 صفر چلا رہا تھا۔ ”میں نہیں مردوں گا میں نہیں مردوں گا۔ مجھے معاف کر دو۔ مجھے معاف کر
 دو۔“ اور اب شہزاد آپریشن ٹیبل پر پڑی ایلی سے کہہ رہی تھی۔ ”مجھے معلوم تھا۔ میں تم
 سے پہلے مردوں گی۔ ہمیشہ سے مجھے اس کا علم تھا۔ میرا دل گواہی دیتا تھا۔ مجھے کوئی غم نہیں صرف
 میری بچیاں۔“ اس نے آخری ہنسی لی۔ ایلی گھبرا کر چونک پڑا۔ چونکہ دار چاکا تھا۔ آسمان پر
 ہلکی ہلکی سفیدی چھائی ہوئی تھی۔ طوفان تھم چکا تھا۔ نرس اسے جھنجھوڑ رہی تھی۔ ”آپریشن
 کامیاب رہا۔ تمہیں مبارک ہو۔“ ایلی کو یقین نہیں آتا تھا۔ اس کے دل میں کوئی خوشی پیدا
 ہوئی اور وہ اسی طرح دیوانہ وار بیٹھا رہا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کہاں جائے۔ کیا

طالع میں وہ گھٹا گھٹا پن نہ تھا۔ محلے کی تمام عورتیں ان کے سحر سے مخدوش تھیں۔ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ ان کے شوہر یا بھائی یا بیٹے شہزاد کے گھر جائیں یا ان سے ملیں۔ اس لئے یہ سب لوگ چوری چھپے وہاں آتے تھے۔

ان کے آتے ہی فرش بچھا دیا جاتا اور پھر سب مل کر تاش یا چوٹ کھیلنے بیٹھ جاتے اور کھیل میں وہ سب ہنستے چیختے چلاتے قہقہے لگاتے۔ گیت گنگنائے اور شور مچاتے۔ ایک دھما چوڑی لگی رہتی۔ لیکن ان کے جلتے ہی مالی دقتوں کا احساس بیدار ہوتا اور شہزاد ایک طرف لیٹ کر سو جتی اور آہیں بھرتی۔

لڑکیاں بے "ہنسنے پر مجبور تھیں یا ان کا غنواں شباب انہیں مسکرانے پر مجبور کرتا تھا۔ اس لئے وہ ہنستی رہتی تھیں۔ لیکن ان کے دل کی گہرائیوں میں بھی بچپن کے یادوں کی بوند باندی شروع ہو چکی تھی۔ غالباً وہ اس احساس کا اظہار صرف ماں کے ساتھ کیا کرتی تھیں۔ جس کی وجہ سے وہ مغصوم اور افسردہ رہنے لگی تھی۔ شہزاد کو ذاتی طور پر کوئی غم نہ تھا نہ وہ بچپن کے قائل تھی۔ غالباً اسے بیٹیوں کے غم نے اندر سے کھوکھلا کر دیا تھا۔

ایلی نے آنے سے پہلے بار بار شہزاد سے کہا تھا کہ مالی مشکلات ہوں گی۔ اس لئے سوچ لو کیا تم انہیں برداشت کر سکو گی۔ لیکن ان دنوں شہزاد اس کے اس سوال کو اہمیت نہ دیتی تھی۔ ایلی کو اس بات پر غصہ آتا تھا کہ اب وہ کیوں اکیلی پڑی رہتی ہے کیوں آہیں بھرتی ہے۔ کیوں غم کھاتی ہے۔

شہزاد کو اپنی بڑی لڑکیوں کی تعلیم کا بھی غم تھا۔ جب وہ گروپین سے آئی تھیں۔ تو دونوں نویں جماعت میں تعلیم پا رہی تھیں۔ ان کے دو سال پہلے ہی ضائع ہو چکے تھے۔ پہلے سال تو انہیں کسی سکول میں داخل کرنے کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ دوسرے سال میں انہیں نے کئی بار کوشش کی تھی کہ گروپین سے ان کے سرٹیفکیٹ دستیاب ہو جائیں۔ لیکن شریف نے بیڈ مسٹرس کو لکھ کر دے دیا تھا کہ جب تک وہ خود ان کے سرٹیفکیٹ طلب نہ کرے۔ سرٹیفکیٹ جاری نہ کئے جائیں۔ لہذا ان کا دوسرا سال بھی ضائع ہو گیا تھا اور شہزاد کو ڈر تھا کہ کہیں تیسرا سال بھی ضائع نہ ہو جائے۔ بوند بوند غم اس کی روح میں سرایت کر رہا تھا۔

دوپاگل

پھر ایلی کا تہلولہ شاہ وال ہو گیا اور وہ سب شاہ وال چلے گئے!

شاہ وال ایک بڑا قصبہ تھا جو لاہور سے تیس چالیس میل کے فاصلہ پر واقع تھا۔ ابھی وہ شاہ پنچ ہی تھے کہ شہزاد پھر بیمار پڑ گئی۔ اسے خون جاری ہو گیا۔ لیڈی ڈاکٹر نے جواب دے دیا۔ "اے لاہور ہسپتال میں لے جائیے۔ لاہور ہسپتال کے ڈاکٹروں نے معائنہ کرنے کے بعد کہا کہ مریضہ کا اندرونی جسم مردہ بچے کے زہر کی وجہ سے بھل گیا ہے۔ آپریشن ہو گا۔

ایلی نے پوچھا۔ "کیا آپریشن کے بعد مریضہ یقینی طور ٹھیک ہو جائے گی۔" ایلی نے پوچھا۔ "یقین سے نہیں کہا جاسکتا۔" ڈاکٹر بولا۔ "زیادہ امید نہیں۔"

"اے۔" ایلی سوچ میں پڑ گیا۔

جب وہ شہزاد سے ملا تو وہ بولی "میں آپریشن نہیں کرواؤں گی۔"

"کیوں۔" اس نے پوچھا۔

"بے کار ہے۔" وہ بولی۔

"بے کار کیوں۔"

"وہ کہتے ہیں سزا نہ بچلی جھلی تک پہنچ چکی ہے اور خون بند نہیں ہو گا۔"

"تو پھر۔"

"مجھے لڑکیوں کے پاس لے چلو۔"

"اچھا۔" ایلی نے سر جھکا لیا۔

جب شہزاد لیڈی ڈاکٹر سے ہسپتال چھوڑنے کی اجازت طلب کرنے گئی تو ڈاکٹر نے صاف لڑکھایا۔ "بے وقوف مت بنو۔" وہ بولی۔ "اگر تم ہسپتال چھوڑ کر چلی گئی تو زیادہ سے زیادہ لاہور جیو گی۔"

"اور اگر میں ہسپتال میں رہوں تو۔"

"تو تو۔۔۔ تو شاید۔"

شہزاد نے اپنے کپڑوں کی گٹھڑی اٹھالی۔ ڈاکٹر گھبرا گئی۔ "نہیں نہیں۔" وہ بولی۔

"مجھے کون روک سکتا ہے۔" شہزاد نے کہا اور باہر نکل آئی۔ ڈاکٹر اس کے پیچھے پیچھے تھی۔

ڈاکٹر نے ایلی کو دیکھ کر شور مچا دیا۔ "اے مسٹر۔ یہ تمہاری مسز دیوانی ہو گئی ہے۔ جان بوجھ کر لڑکی کر رہی ہے۔ اے مسٹر۔"

”کیا کرتا ہے۔“ وہ بولی۔

”چلتے ہوئے تمہیں تکلیف ہوگی۔“ وہ بولا۔

”تکلیف“ — وہ ہنسی۔ ”اب کیا ہے۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”اب کیا ہے۔“

”ایلی۔“ وہ بولی۔

”جی۔“

”ایک بات کہوں۔“

”کہو۔“

”ہانو گے؟“

”ہاں گا۔“

”شروع سے ہی مجھے معلوم تھا۔“

”کیا؟“

”کہ میں پہلے مروں گی۔“

”واقعی؟“

”ہاں۔ جب بھی تم میرے پاس آیا کرتے تھے تو کوئی میرے کان میں کہتا۔ تم پہلے مری جاؤں گی۔“

”ہاں۔“

”اچھا۔“

”ہاں۔“

”کون کہتا تھا؟“

”معلوم نہیں۔ لیکن مجھے معلوم تھا وہ سچ کہتا ہے۔“

”بس اتنا ہی کہتا تھا؟“

”نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو؟“

”ایک بات اور کہتا تھا۔“

”وہ کیا؟“

ایلی رک گیا۔ ”یہ عورت پاگل ہے۔“ ڈاکٹر چلائی۔

”ہم دونوں پاگل ہیں۔“ وہ بولا۔

”ارے۔“ ڈاکٹر بولی۔ ”تم تو پڑھے لکھے نظر آتے ہو۔“

”ہاں۔“ ایلی نے کہا ”میں پڑھا لکھا پاگل ہوں۔“

”ارے۔“ وہ گھبرا کر پیچھے ہٹ گئی۔ دونوں پاگل باہر نکل آئے۔ شہزاد نے ایلی کا ہاتھ تھام

لیا۔ بولی۔ ”ایلی۔“

”جان من۔“ وہ بولا۔

”پندرہ دن ہیں۔“ اس کی آنکھ میں مسرت کی چمک تھی۔

”ہاں۔“

”پندرہ دن ہم اکٹھے رہیں گے۔“

”ہاں۔“

”پندرہ دن بہت ہوتے ہیں۔“

”ہاں ہاں۔“ وہ بولا۔

”تم نے کہیں باہر تو نہیں جانا۔“

”نہیں جاؤں گا۔“

”ہم اکٹھے بیٹھ رہیں گے۔“

”بالکل۔“

”اور پھر ہم بیٹھ کر سب باتیں دہرائیں گے۔“

”ہاں۔“

”جب میں نے تمہیں پہلی مرتبہ دیکھا تھا۔“

پن۔ درہ۔ دن

اپنی ہی دھن میں پاگل پیدل چلے جا رہے تھے۔

”بابو جی تاکہ چاہیئے۔“ تاکے والے نے قریب آکر پوچھا۔

”تاکے پر چلو گی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”کہتا تھا — نہیں بتاؤں گی۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

”نہ بتاؤ۔“ وہ بولا۔ ”لیکن تم روتی کیوں ہو۔“

”ہاں روتی ہوں۔“ وہ بولی۔

”اچھا جیسے تمہارا جی چاہے۔“

”اس لئے نہیں روتی کہ پندرہ دن اور ہیں۔“

”تو کس لئے؟“

”وہ جو دوسری بات کہتا تھا۔ اس پر نہ جانے کیوں اس کی دوسری بات سن کر میں ہمیشہ روتی

رہی چھپ چھپ کر روتی رہی۔“

”کیا کہتا وہ ایسی بھی کیا بات ہے؟“

”کہتا تھا — بتا دوں؟“

”تمہاری مرضی۔“

”کہتا تھا۔ تمہارے مرنے کے بعد اس کی زندگی شروع ہوگی۔“

”کس کی زندگی؟“

”تمہاری۔“

”زندگی ختم ہو جائے گی یا شروع ہو جائے گی۔“

”شروع ہوگی۔“ وہ بولی۔

”اس میں رونے کی کیا بات ہے؟“

”مجھے محسوس ہوتا تھا۔ جیسے میں تمہارے راستے کی رکاوٹ ہوں۔“

”وہ کیسے؟“

”اور تمہاری زندگی شروع نہیں ہو سکتی جب تک رکاوٹ دور نہ ہو۔“

”بے وقوف تم رکاوٹ نہیں زندگی ہو۔ تم چلی گئیں تو سب کچھ ختم ہو جائے گا۔“

”ج۔“ وہ بولی۔

”تمہاری قسم۔“

وہ مسکرائی۔ ”بس مجھے ایک غم ہے۔ میری بچیاں۔“ اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے پھر وہ

گاڑی میں بیٹھے ہوئے شاہ وال جا رہے تھے۔ انجن ہو تک رہا تھا۔

”ہن۔ درہ۔ دن — پن۔ درہ۔ دن۔“

دھننا۔ ایللی کی توجہ سامنے بیٹھے ہوئے مسافروں کی طرف منعطف ہو گئی۔

”پندرہ۔“ ”دن۔“ ایک چلا رہا تھا۔ ”صرف پندرہ دن۔“

ایللی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ کیا وہ ان کے راز سے واقف تھا۔

”کیوں بھائی۔“ وہ ایللی کو مخاطب کر کے کہنے لگا۔ ”لو تم ہی بتاؤ پندرہ دن بھی کوئی حیثیت

رکھتے ہیں۔“ اس نے چنگلی بجا لی۔ ”یوں گئے ہے نا۔“ وہ قلم مار کر ہنسنے لگا اور پھر اپنے

ہاتھوں کو مخاطب کر کے بولا۔ ”ہم نے تو بس وہی ایک ڈاکٹر دیکھا ہے۔ دو سال میری بیوی میو

ہسپتال میں پڑی رہی۔ دو سال آخر انہوں نے جواب دے دیا اور میں اسے دورا ہے لے گیا اور

اس اللہ کے بندے نے پندرہ روز میں ایسا کر دیا کہ وہ اپنے پاؤں چل کر گھر آئی اور اللہ اس کا

بلا کرے۔ آج ہم ہنسی خوشی زندگی بسر کر رہے ہیں۔“

”کون ہے وہ ڈاکٹر؟ ایللی نے پوچھا۔

”دورا ہے کا ہو میو پیٹھ ہے جی۔“

”کیا نام ہے؟“ ایللی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہاشم

”بھئی واہ۔“ وہ بولا۔ ”تم ڈاکٹر ہاشم کو نہیں جانتے۔“

”جی ڈاکٹر ہاشم کو کون نہیں جانتا۔“ اس کا ساتھی بولا۔

اگلے روز ہی ایللی دورا ہے میں ڈاکٹر ہاشم کے معمل میں بیٹھا تھا۔

ڈاکٹر ہاشم کا معمل ایک وسیع و عریض صحن پر مشتمل تھا۔ جس کے ایک طرف دو تنگ

گڑوں میں ادویات رکھی تھیں اور دو کمپاؤنڈر بیٹھے تھے۔ دوسری طرف ایک برآمدہ تھا۔ جس

کے پیچھے دو وسیع کمرے میں کتابیں پڑی تھیں۔ تیسری طرف ایک دروازے کے پیچھے ڈاکٹر کا

مکان تھا۔ صحن میں ایک درخت کے نیچے ایک تخت پڑا تھا۔ جس پر ایک پرانا سا کتہ لگا تھا۔ نیچے

ایک سلہ سا گدا بچھا ہوا تھا ایک چھوٹے سے ڈبک کے گرد بہت سی چیزیں بکھری پڑی تھیں۔

ڈاکٹر صاحب شیش۔ ربڑ کی نلکیاں۔ ڈسک پر ایک پرانا قلمدان پڑا تھا۔ یہ ڈبک تخت پر لگا ہوا

قلم لور اس کے پاس ہی کانڈ کی پرچیاں سی پڑی تھیں۔ تخت کے ایک طرف بوسیدہ کالا کمبل

”بے وقوف۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ تم میں سمجھنے کی صلاحیت ہے۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

”تو پھر مت سمجھو۔“

”جی بہت اچھا۔“

”جاؤ مزے کرو۔ اب کسی دوائی کی ضرورت نہیں۔“ وہ شخص سر جھکائے چل پڑا۔

”ہوں تم۔“ ڈاکٹر کی نگاہ ایک اور شخص پر پڑی۔ ”تم۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ اس شخص نے جواب دیا۔ ”میرا نام ماجد ہے۔“

ڈاکٹر نے قہقہہ لگایا ”نام کو میں کیا کروں۔ تمہیں تپ دق ہے نا۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”تو جاؤ تمہارے لئے میرے پاس کوئی دوا نہیں جاؤ۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولا۔ ”میں کہاں جاؤں؟“

”تم اللہ کے پاس جاؤ۔“ ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ”وہاں سکھی رہو گے۔ جاؤ جاؤ جاؤ۔“

وہ شخص مایوس ہو کر چل پڑا۔

”ہوں۔“ ڈاکٹر نے ایلی کی طرف دیکھا۔

”جی میں۔“ ایلی بولا۔ ”میں شاہ وال سے آیا ہوں۔“

”تو کیا مجھ پر احسان کیا ہے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں لوگ حیدر آباد سے آتے ہیں۔“ وہ رک

یا۔

”میسور سے آتے ہیں۔ تم شاہ وال سے آگئے تو کیا ہوا۔“ اس نے دوبارہ کہا۔

ایلی گھبرا گیا۔ ”جی آپ بجا فرماتے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیا فائدہ ہوا شاہ وال سے آنے کا کیا فائدہ ہوا۔ بے وقوف۔“ ڈاکٹر اسے گھورتا رہا۔

ایلی کو غصہ آ رہا تھا۔

”لو بھائی اس شخص کی طرف دیکھا۔“ ڈاکٹر نے جملہ لوگوں کو مخاطب کر کے کہا۔ ”یہ شاہ

لاسے آیا ہے لیکن بے وقوف مریض کو ساتھ نہیں لایا۔“

”ارے۔“ ایلی حیرت سے ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگا۔

”میں۔“ ڈاکٹر کہنے لگا۔ ”اگر تم مریض کو ساتھ نہیں لائے تو کیا میرا منہ دیکھنے آئے ہو۔“

ڈھیر ہو رہا تھا۔

”محن میں کوئی کرسی نہ تھی۔ کتابوں والے کمرے میں بھی بیٹھنے کے لئے فرش کے علاوہ کوئی کرسی یا کاؤچ نہ تھا۔ محن میں لوگ ادھر ادھر زمین پر چوکیں رکھے بیٹھے ہوتے تھے۔ وہ سب ایک دوسرے سے باتیں کرنے میں مصروف تھے۔ اور یوں شور مچا رہے تھے۔ جیسے وہ ڈاکٹر کا معمل نہیں بلکہ سٹہ منڈی ہو۔ ڈاکٹر ابھی زنان خانے سے باہر نہیں نکلا تھا۔

دفعۃً زنان خانے کا دروازہ کھلا۔ ایک لڑکا ایک حقہ اٹھائے باہر نکلا۔ اسے دیکھ کر سب خاموش ہو گئے۔ اس کے پیچھے پیچھے ایک دیوانہ سا آدمی یوں لڑھکتا ہوا آ رہا تھا۔ جیسے کسی نے اسے دھکا دے کر متحرک کر دیا ہو۔ اس نے ایک لمبا سا چنہ پن رکھا تھا۔ نیچے سیاہ جرابیں تھیں ایک پھٹی ہوئی گرگبلی۔

اس کے بال پریشان تھے۔ چہرہ گویا سو جا ہوا تھا۔ آنکھیں چندھیائی ہوئی تھیں۔ تخت کے قریب پہنچ کر وہ رکا۔ اس نے بڑھ کر کھل اٹھا لیا اور اسے اپنے گرو پلیٹ کر تخت پر ڈھیر ہو گیا۔ مجمع پر خاموشی طاری تھی۔

ایک ساعت کے بعد اس نے سر اٹھایا اور مجمع پر اپنی نگاہ ڈالی۔ اس کی نگاہ ایک آدمی پر رکی۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تم۔“

”جی۔“ وہ شخص بولا۔

”تمہاری بیوی مر گئی ہے کیا؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ شخص بولا۔

”تو اس کا برا حال ہے کیا۔“

”جی نہیں۔“ الٹا وہ رو سخت ہے۔“

”تو پھر تم کیوں آئے ہو۔“ ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا۔

”جی دوا لینے۔“

”کیسی دوا۔“

”جی دوائی۔ یعنی۔“ وہ گھبرا گیا۔

”جب وہ رو صحت ہے تو دوائی کا مطلب۔ دوائیاں لینے کا شوق ہے کیا۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”میں نے سمجھا کہ مزید دوائی۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

ڈاکٹر قہقہہ مار کر ہنس بولا۔ ”اچھا تو دیکھو۔“

یعنی اس وقت ایک معزز ہندو داخل ہوا اور دروازے میں ہی ہاتھ جوڑ کر بولا۔ ”نمستے ڈاکٹر صاحب۔“ ڈاکٹر صاحب کی توجہ نووارد کی طرف منعطف ہو گئی۔

”یہ لالہ جی دورا ہے کے تحصیلدار ہیں۔“ قریب سے ہی آوازیں آئیں۔

لالہ جی قریب آگئے۔ وہ ایک معزز اور شریف آدمی نظر آتے تھے اور انداز میں بلا کا قتل تھا۔ جب وہ قریب آئے تو ڈاکٹر نے بغور ان کی طرف دیکھا۔

”لالہ جی۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”مہربانی کر کے تشریف لے جائیں۔“

تحصیلدار نے ڈاکٹر کی طرف دیکھا۔

”تشریف لے جائیں۔“ ڈاکٹر نے دہرایا۔ ”پھر سے داخل ہوں اور السلام علیکم کہیں۔“

تحصیلدار کھڑے ہو کر ڈاکٹر کی طرف دیکھنے لگے۔

”جب تک آپ ایسا نہیں کریں گے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”میں آپ کو دو انہیں دوں گا۔“

”لیکن ڈاکٹر صاحب۔“ تحصیلدار نے کہا۔ ”میں نے داخل ہوتے وقت ہاتھ باندھ کر آپ

کو نمستے کی ہے۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”نمستے کرنے میں کیا برائی ہے؟“ تحصیلدار نے پوچھا۔

”کوئی نہیں۔“

”الٹا اس میں تو بے حد عجز ہے۔“

”جی۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”آپ بالکل بجا فرما رہے ہیں۔ اس میں بہت عجز ہے۔ لیکن اذرا

کرم واپس جائے پھر داخل ہو کر السلام علیکم کہیے۔ تاکہ میں آپ کو دو انہیں دوں۔“

اس پر تحصیلدار صاحب مسکرائے اور احاطے سے باہر نکل گئے۔ پھر داخل ہوتے ہوئے

بولے۔

”السلام علیکم۔“

”وعلیکم اسلام۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”فرمائیے کس کے لئے دو انہیں لینا ہے آپ نے۔“

”گھروالی کے لئے۔“ وہ بولے۔

”اپنی گھروالی کو اپنی طرح قتل پسند بنائیے نا۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”وہ اپنی طبیعت کی تسخیر کی وجہ سے پیار رہتی ہے۔“

”یہ میرے بس کا روگ نہیں۔“ تحصیلدار نے شرمندگی محسوس کرتے ہوئے کہا۔ ”آپ نا کی بیماری کی تفصیلات سن لیجئے۔“

”نہیں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”پہلے ہمیں ایسی دو انہیں دینا ہوگی۔ جس سے ان کی طبیعت بدل جائے۔“

”دو انہیں سے طبیعت بدل جائے۔“ تحصیلدار نے کہا۔

ڈاکٹر نے قلم نیچے رکھ دیا آپ دو انہیں کو کیا سمجھتے ہیں لالہ جی۔“ اس نے پوچھا۔

شاید آپ سمجھتے ہیں کہ دو انہیں صرف پیٹ کا درد دور کرتی ہے۔ کھانسی کو روکتی ہے۔ اسل

اوند کرتی ہے۔“

”جی ڈاکٹر صاحب۔“ وہ بولے۔

”آپ غلط سمجھتے ہیں اور یہ ایک خوارک دینے کے بعد۔“ ڈاکٹر نے پرچی پر لکھتے ہوئے

کہا۔ ”آپ کو سمجھ میں آئے گا کہ دو انہیں کیا چیز ہے۔“

”مجھے اجازت ہے کہ ایک بات پوچھوں۔“ ایللی بولا۔

ڈاکٹر نے مڑ کر ایللی کی طرف دیکھا۔

”لالہ جی بھی تو مریض کو ساتھ نہیں لائے۔“ وہ بولا۔

”تو پھر۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”تو پھر۔ انہیں کیوں دو انہیں دے رہے ہیں آپ؟“

ڈاکٹر ہنسنے لگا۔ ”اس کا جواب تمہیں اس وقت دیں گے جب تم مریض کو ساتھ لاؤ گے اب

ملائی کر کے چلے جاؤ۔“ ڈاکٹر نے اسے ڈانٹا اور چپ چاپ صحن سے باہر نکل آیا۔

کبل کی گٹھڑی

شاہ وال کو واپس جاتے ہوئے ایللی سوچ رہا تھا۔ ایسا ڈاکٹر تو اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ نہ ہی

”کیو مینٹی“ سے اسے کبھی سنا تھا۔ علاج بالشل کے تصور سے ہی وہ بیگانہ تھا۔ عجیب ڈاکٹر

نہ لیکن سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ اسے کیسے معلوم تھا کہ وہ مریضہ کو اپنے ہمراہ نہیں لایا۔ شکل و

صورت کی بھی بات نہ تھی۔ چونکہ دیکھنے میں تو وہ ہمیشہ ہی مریض دکھائی دیتا تھا۔ ہر مل عجب ڈاکٹر تھا۔ ایللی کے دل میں بے وجہ یقین پیدا ہوا جا رہا تھا کہ شہزاد صحت مند ہو جائے گی۔ جب اس نے شہزاد سے بات کی تو وہ ہنس پڑی۔

”اب یہ چودہ دن بھی ضائع کر گئے۔“ وہ بولی۔ ”ایک دن ضائع کر آئے ہو۔“
اکٹھے جائیں گے۔ ایک ہی ڈبے میں بیٹھیں گے۔ ایللی نے کہا۔ ”پھر کیسے دن ضائع ہو گا۔۔۔ تم سمجھ لیتا کہ سیر کرنے جا رہے ہیں۔“

”اور ڈاکٹر کو دینے کے لئے روپیہ کہاں سے آئے گا۔“
”اللہ مالک ہے۔“ وہ بولا۔ ”کچھ ہو ہی جائے گا۔“

شہزاد تیار ہو گئی۔ ایللی نے سوچا کہ رات کو سفر ٹھیک نہیں۔ سارا دن سفر کریں تاکہ شہزاد کو تکلیف نہ ہو۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ڈاکٹر ہاشم شام کے وقت بھی معمل میں آتے ہیں یا نہیں۔ لیکن سوال یہ تھا کہ وہ رات کہاں گزاریں گے۔ چلو شیش پر مسافر خانے میں بیٹھ رہیں گے اس نے سوچا اور وہ اسی روز دورا ہے کو روانہ ہو گئے۔

شام کو تین بجے کے قریب وہ دورا ہے پہنچے۔ ایللی شہزاد کو لے کر سیدھا معمل میں پہنچا۔ معمل کا دروازہ کھلا تھا۔ لیکن اندر کوئی نہ تھا۔ نہ کوئی مریض نہ کیاؤنڈر اس نے شہزاد کو باہر صحن میں بٹھا دیا اور خود اوہر اوہر جھانکنے لگا۔

کتابوں والے کمرے میں کبیل کی ایک گٹھڑی سی پڑی ہوئی تھی۔ ایللی مایوس ہو کر صحن میں آ گیا۔ اور چپ چاپ تخت پر بیٹھ گیا۔ دیر تک وہ چپ چاپ بیٹھے رہے۔
کبیل کی گٹھڑی کو حرکت ہوئی۔

”ارے۔“ ایللی چونکا اور پھر اندر چلا گیا۔

ڈاکٹر کبیل اوڑھے گٹھڑی بنا پڑا تھا۔

ایللی ڈر رہا تھا کہ کیس بگڑ نہ جائے۔

”کون ہے؟“ ڈاکٹر بولا۔

”جی میں ہوں۔“ ایللی بولا۔

”میں کون؟“

”میں شاہ وال سے مریضہ کو لایا ہوں۔“

”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تم شاہ وال والے ہو کیا؟“
”جی۔“

ڈاکٹر نے کبیل سے ہاتھ نکالا۔ اس کا سر اور منہ کبیل ہی میں لپٹے رہے۔ ”نبض دکھاؤ۔“
”جھمانہ لپچے میں بولا۔“ ”اوہر آؤ مریضہ۔“

ایللی نے شہزاد کو گھسیٹ کر پاس بٹھا دیا ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولی۔
”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا اور نبض تھامے بیٹھا رہا۔

”دوسرا ہاتھ۔“ وہ بولا۔

شہزاد نے دوسرا ہاتھ تھما دیا۔

دیر تک ڈاکٹر نبض تھامے جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”جسم سے خون جاری ہے نا۔“ وہ بولا۔

”جی۔“ ایللی نے کہا۔

”اندر گل گیا ہے۔“

”جی ہسپتال والوں نے یہی کہا تھا۔“

”ٹھیک کہا تھا۔“ وہ بولا۔

”انہوں نے کہا تھا پندرہ روز اور جنے گی۔“ ڈاکٹر فرام کو گھن لگ گیا ہے۔ ”ایللی نے کہا۔

”ڈاکٹر فرام کو گھن لگ چکا ہے۔“ ڈاکٹر نے کہا۔ ”لیکن یہ کتنے والے وہ کون ہیں کہ پندرہ

رہنے گی۔ وہ کیا خدا ہیں؟“ ڈاکٹر نے غصے میں کہا۔

ایللی خاموش بیٹھا رہا۔

”بولو۔“ وہ ڈانٹنے لگا۔ ”بولو نا۔ وہ کون ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے پھر وہ

تائیں؟“

”جی۔۔۔“ ایللی نے کہا۔

”تم مسلمان ہو؟“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”جی۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اچھے مسلمان ہو تم۔“ ڈاکٹر نے ایللی کو ڈانٹا اور دفعتاً اپنا منہ کبیل سے باہر نکال کر اس

طرف دیکھا۔ ایللی ڈر گیا۔ ڈاکٹر کی آنکھیں انگارہ سی چمک رہی تھیں۔

”کوئی پرہیز۔“ ایلی نے پوچھا۔

ڈاکٹر ہنسا ”بے وقوف کھانے کو میسر نہیں آتا اور پوچھتے ہیں پرہیز۔ جاؤ۔“ وہ چلایا۔
 ”ڈاکٹر نے انہیں جاتے ہوئے دیکھ کر کہا۔“ پندرہ روز کے لئے تم اس کے خاوند نہیں
 اور یہ تمہاری بیوی نہیں سمجھے۔“
 ”جی۔“ ایلی بولا۔

”سہولتیں دن کوئی بندش نہیں۔“

ایلی اور شنراو باہر نکلے تو وہ حیرانی سے ایک دوسرے کی طرف دیکھ رہے تھے۔

”یہ ڈاکٹر ہے کیا۔“ شنراو نے پوچھا۔

”ہاں ڈاکٹر ہاشم۔“

”مجھے تو پاگل دکھتا ہے۔“ وہ بولی۔

”مجھے بھی۔“ ایلی نے کہا۔ ”لیکن سمجھ لو اللہ نے فرشتہ بھیج دیا ہے۔“

”مجھے تو دھوئگی معلوم ہوتا ہے۔“ شنراو نے کہا۔

”نہیں خالی پاگل۔ پگلا پن اور قابلیت ایک ساتھ ملتے ہیں۔“

”قابل آدمیوں کی شکل ایسی ہوتی ہے کیا۔“ شنراو نے برا سامنہ بتایا۔ شاہ وال پہنچ کر پندرہ
 شنراو اور ایلی نے گمن گمن کر کاٹے۔

ایلی

سہولتیں دن ایلی نے پوچھا۔ ”شنراو کیا خون اب بھی جاری ہے؟“

وہ مسکرائی۔ ”نہیں تو۔“ وہ بولی۔ ”کب سے ختم ہو گیا۔“

”تم نے مجھے بتایا نہیں۔“

”میں نے کہا۔ شاید پھر جاری ہو جائے۔“

”تو نہیں ہوا۔“

”کوئی نہیں۔“ وہ بولی۔

”تو وہ دوائی کام کر گئی نا۔“

”ہتہ نہیں۔“ وہ غبی۔

”مسلمان ہوتے ہوئے تم نے ان کے منہ پر تھپڑ نہ مارا۔ کیسے مسلمان ہو تم۔“

ایلی سر جھکائے بیٹھا رہا۔

ڈاکٹر نے کمبل پرے پھینک دیا اور کچھ کسے بغیر باہر نکل گیا۔

ایلی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کرے آیا وہیں بیٹھا رہے یا باہر چلا جائے۔

نہ جانے ڈاکٹر کیوں باہر گیا تھا۔

وہ دونوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔

”لو۔“ ڈاکٹر اندر داخل ہوا۔

”ارے۔“ ایلی چونکا۔

”منہ کھولو۔“ وہ بولا۔

ایلی نے منہ کھول دیا۔

”بے وقوف۔“ ڈاکٹر چلایا۔ ”مریض وہ ہے یا تم۔“

ڈاکٹر ہاتھ میں ایک پڑیا اٹھائے کھڑا تھا۔

شنراو نے منہ کھول دیا۔ ڈاکٹر نے پڑیا اس کے منہ میں اندر ڈال دی۔ ”جاؤ۔“ وہ بولا اور پھر

ہاتھ جھٹکتے ہوئے کہا۔

”جاؤ۔ چلتے جاؤ اور اچھے ہوتے جاؤ۔“

ایلی حیرانی سے اس کا منہ تک رہا تھا۔

”آپ کی فیس۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے دس کانوٹ نکالا۔

”فیس۔“ وہ بولا۔ ”تم میری فیس دے سکتے ہو کیا؟“

”جی نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”دوائی کی قیمت۔“

”دو آنے۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”دو آنے۔“

ایلی نے گھبرا کر دو آنے نکالے۔

”رکھ دو۔“ وہ بولا۔ ”رکھ دو۔“

ایلی نے دونی رکھ دی۔

”گھر کے لئے دوا۔“ ایلی نے کہا۔

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”جاؤ۔ یہی کافی ہے۔“

”ایک بات کہوں۔“ ایلی نے اسے تھپکتے ہوئے کہا۔
”کہو۔“

”مانو گی؟“

”کہو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پہلے کہو مانو گی۔“

”مانو گی۔“ وہ پیار سے بولی۔

”آج ہمارا اپنی مون ہے۔“ وہ بولا۔

شہزاد نے مسکرا کر آنکھیں نیچی کر لیں۔

”آج ہم پرانے زمانے کی یاد منائیں گے۔“

”کیسی یاد۔“

”جب تم مونیکہ ٹھہری تھیں۔ تب کی یاد۔“

وہ مسکرائی۔

”اب کہاں۔“ وہ بولی۔ ”اب وہ بات کہاں؟“

”اب بھی ہے۔“ اس نے کہا۔

”کیسے؟“

”میرے لئے ہے۔“ اس نے ہاتھ بڑھایا۔

شہزاد نے پیار سے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔

”یاد ہے وہ زمانہ۔“ وہ بولا۔

”ہوں۔“ شہزاد ہنسی۔ ”بھول سکتا ہے کیا۔“

ایلی نے زیر لب کہا۔ ”آج میں آؤں گا۔“

شہزاد نے اس کی طرف تعجب سے دیکھا۔

ایلی نے پھر سرگوشی کی۔ ”کھڑکی کھلی رکھنا۔“

شہزاد بامعنی انداز سے مسکرائی اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

ایلی باہر نکل گیا شام کو وہ ادھر ادھر ٹھٹھا رہا۔ حتیٰ کہ نوبچ گئے۔ پھر وہ سینما میں جا بیٹھا۔ جب وہ فلم دیکھ کر ٹٹکا تو ساڑھے گیارہ بجے تھے۔ وہ چپ چاپ گھر کی طرف چل پڑا۔ شاہ وال کی

ایلی دیر ان پڑی تھیں۔ کتے بھونک رہے تھے۔ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔ وہ بڑی احتیاط سے دبے پاؤں چل رہا تھا۔ گھر کے پاس جا کر وہ رک گیا اس نے چاروں طرف دیکھا۔ پھر جست بر کردہ کھڑکی کے پاس پہنچا۔ پٹ کو آہستہ سے دلیا۔ پٹ کھل گیا۔ دبے پاؤں وہ اندر داخل ہو گیا۔ چارپائی پر شہزاد بنز چادر اوڑھے مشین سامنے رکھے کام کر رہی تھی۔

ایلی نے اسے دیکھ کر ہونٹوں پر انگلی رکھ لی۔ ”چپ۔“ وہ بولا۔

شہزاد مسکرائی۔

”چائے پلاؤ گی۔“

اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

ساری رات وہ ہاتھ میں ہاتھ دیئے بیٹھے چائے پیتے رہے۔ جب بھی کوئی کھٹکا ہوتا تو وہ دونوں خاموش ہو جاتے۔

”کون ہے۔“ وہ زیر لب کہتا۔

”میں دیکھتی ہوں۔“ وہ گنگنائی اور پھر باہر نکل جاتی اور کچھ دیر کے بعد پھر اس کے پاس آ جاتی۔

یوننی صبح ہو گئی اور ایلی اسے الوداع کہہ کر کھڑکی سے باہر نکل گیا اور پھر صدر دروازے سے گھر میں داخل ہو کر اپنے بستر پر پڑ کر سو گیا۔

سراپ

شاہ وال ایک بہت بڑا قصبہ تھا۔ وہاں کا مدرسہ بھی کافی بڑا تھا اگرچہ عمارت پرانی تھی۔ لیکن لڑکے کے ساتھ وسیع و عریض میدان تھے۔ سکول کے قریب ہی بوڑنگ کی عمارت تھی۔ جس میں شاہ وال کے گرد و نواح کے دیہات کے لڑکے رہتے تھے۔ بوڑنگ کے سپرنٹنڈنٹ کا کواٹر بوڑنگ کی عمارت کے اوپر دوسری منزل پر تھا۔

سکول کے ہیڈ ماسٹر کا نام سراپ تھا۔ اس کا قد چھوٹا تھا۔ جسم گول مثل رنگ گورا اور چہرہ لال کی طرح تھا۔ جس میں اس قدر ہوا بھری ہوئی معلوم ہوتی تھی کہ سراپ کی آنکھیں لال ہی نہ دیتی تھیں۔ کبھی غلوخ ہوتیں بھی تو جیسے دو لکیریں ہوں اور پھر وہ جلد ہی غروب ہو جاتیں چونکہ سراپ کو بات بات پر ہنسنے کی عادت تھی۔ جب وہ ہنستا تو گوشت کا ایک طوفان چہرے

مہر کے اندر زنانے میں وہ ہر وقت صفائی میں مصروف رہتی تھی۔
 باہر مردانے میں سراب نوجوان طلباء کے جھرمٹ میں راجہ اندر بنے بیٹھے رہتے۔ لیکن
 اندر میں راجہ کی نسبت رانی کی زیادہ جھلک تھی۔
 سراب کو دیکھتے ہی لاشعوری طور پر ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ ان سے کسی قسم کا تعلق روانہ
 نہ لے گا۔

”شا“ سراب اس سے پوچھتے۔ ”آصفی صاحب آج آپ لیٹ کیوں آئے ہیں۔“
 ”جی آج کی بات تو نہیں۔“ ایلی جواب دیتا۔ ”میں تو روز لیٹ آتا ہوں۔“
 ”کیوں لیٹ آتے ہیں آپ۔“ وہ پوچھتے۔
 ”جی میں نے بہت کوشش کی ہے کہ اس نکتے کو حل کروں۔ لیکن —“
 ”کیا آپ کا اخلاقی فرض نہیں کہ آپ وقت پر سکول آئیں۔“ وہ بعد مشکل اپنے آپ پر
 ایلی طاری کر کے کہتے۔

”اخلاقی فرض تو نہیں سراب صاحب۔“
 ”کیوں۔“

”تو کہوں لہذا۔ وقت پر آنا چاہئے۔“
 ”تو یہ فرض ہوا۔“

”جی اخلاقی فرض تو نہیں نا۔ دیکھئے سراب صاحب آپ میرے افسر ہیں اور میں آپ کا
 فٹ ہوں۔“ ایلی کہتا۔ ”میرا فرض یہ ہے کہ آپ کو خوش رکھوں۔ اور بس۔“
 سراب صاحب کے گل سرخ ہو جاتے۔ چہرے پر گوشت کی لہریں چلنے لگتیں اور آنکھیں
 لہب ہو جاتیں۔

”بہر صورت آپ وقت پر آیا کریں۔“ وہ کہتے۔
 ”بہت اچھا صاحب۔“

اگلے روز ایلی پھر لیٹ آتا۔

سراب نے سوچا کہ ایلی کو شرمندہ کرنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ انہوں نے خود وقت پر آنا
 ٹھہر کر دیا۔ آتے ہی وہ ایلی کو تلاش کرتے اور پھر اس کی جماعت میں جا کر خود پڑھانا شروع کر
 لیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ایلی دو ایک روز صورت حالات کا جائزہ لے گا تو شرمندگی محسوس کرے

پر چلتا۔ بڑھتا سنتا۔ آنکھیں کشتیوں کی طرح لہروں میں ڈوب جاتیں۔ لیکن جب کبھی وہ سنجیدہ
 ہوتا یا جان بوجھ کر غصے میں آجاتا تو دو بھوری دھاریاں ابھسرتیں حتیٰ کہ وہ کنکریں
 بن جاتیں۔ ان میں دھار پیدا ہو جاتی اور وہ بری طرح سے کانٹے لگتیں۔ ایلی سراب کو مل کر بے
 حد خوش تھا۔ اس نے اپنی زندگی کا ایک بڑا حصہ اساتذہ کے درمیان گزارا تھا اور اس نے
 محسوس کیا تھا کہ اساتذہ زیادہ تر رسمی یا کتابی زندگی بسر کرتے تھے۔ وسعت نظر سے قطعی طور پر
 بیگانہ تھے۔ چونکہ ان کا مطالعہ محدود تھا۔ شاید اس لئے کہ وہ زیادہ تر زندگی بچوں میں بسر کرتے
 تھے۔ ان کی شخصیت رسمی خیالات جذبات اور حرکات کا مجموعہ تھی۔ وہ سب ایک ہی دائرے میں
 گھومتے تھے اور اپنے خیالات علم اور نظریات کو ناجائز طور پر بے حد اہمیت دیتے تھے۔ ہاتھی
 دانت کی طرح انہوں نے اخلاقی معیار پال رکھتے تھے۔

ایلی اساتذہ سے آگاہ چکا تھا۔ ان میں نہ تو ذہنی چمک تھی نہ وسعت قلب اور نہ ہی وہ
 رنگین جذبات سے واقف تھے۔ لیکن ہیڈ ماسٹر تو بالکل ہی ایلی کے لئے ناقابل قبول تھے۔ وہ
 اساتذہ سے بھی یوں پیش آتے۔ جیسے وہ بچے ہوں۔ مدرسے میں وہ ایک جزیرے کی طرح الگ
 تھلگ رہتے اور یا اساتذہ کے قریب آتے تو یہ توقع رکھتے کہ وہ ان کی ہر بات کو سراہیں۔ ان
 کے ہر خیال پر واہ واہ کریں۔

سراب میں خود ستائی کی واضح جھلک تو تھی۔ لیکن ان کی طبیعت میں رنگین کا عنصر مفقود نہ
 ہوا تھا۔ جسے وہ بڑی محنت سے چھپائے پھرتے تھے۔ اس وجہ سے بڑوں کی نسبت وہ بچوں سے
 قریب تر تھے۔ ان کے گھر میں نوجوان طلباء کی بھیڑ لگی رہتی تھی۔ وہ انہیں پڑھاتے تھے۔
 چھیڑتے تھے گھورتے تھے اور پیار کرتے تھے۔

نہ جانے کیوں ایلی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ ہیڈ ماسٹر نہیں۔ جیسے کسی میم نے
 زبردستی سوٹ پہن رکھا ہو یا کوئی دلہن شرم و حیا کو بلائے طاق رکھ کر مردانہ لباس میں باہر نکل
 آئی ہو۔

ان کی بیگم ایک معزز خاندان کی خاتون تھیں۔ نہ جانے کیوں یہ وہم اس کے گلے کا ہار ہو
 رہا تھا کہ ان کا مکان پاک صاف نہیں۔ لہذا وہ بہت سے طالب علموں کو اکٹھا کر کے گھر کی صفائی
 میں لگی رہتی تھی۔ فرش دھواتی۔ دیواریں جھاڑتی۔ دروازوں کے تختوں کو پانی سے دھوتی حتیٰ
 کہ دروازے کی زنجیروں کو پاک کرنے کے لئے ان پر صابون ملتی۔

گا۔ لیکن ایلے نے یہ دیکھ کر کہ سراب صاحب اس کی جماعت کو پڑھا رہے ہیں۔ پہلے پریڈ میں آنا ہی بند کر دیا۔ اس پر سراب صاحب بہت سٹ پٹائے اور اساتذہ کی میٹنگ میں انہوں نے اس بات کا تذکرہ کیا بولے۔ ”شرمندہ ہونے کی بجائے آصفی صاحب نے پہلے پریڈ میں آنا ہی چھوڑ دیا ہے۔“

ایلے نے کہا۔ ”جناب عالی دراصل بات یہ ہے کہ چونکہ آپ مجھ سے بہتر پڑھاتے ہیں۔ لہذا میرا جی نہیں چاہتا کہ اپنی جماعت کو آپ کے درس سے محروم کروں۔“

سراب صاحب کو جلد ہی پتہ چل گیا تھا کہ الیاس کا برتاؤ باقی اساتذہ سے ہٹ کر ہے۔ اور وہ دل ہی دل میں اس پر خوش تھے۔

ایک روز ایلے سے سراب نے پوچھا۔ ”آصفی صاحب آپ کا رویہ باقی اساتذہ کا سامنے کیا وجہ ہے؟“

”وجہ یہ ہے۔“ وہ بولا کہ آپ کا رویہ باقی ہیڈ ماسٹروں کا سامنے۔“

وہ مسکرائے ”کیا فرق ہے؟“ وہ بولے۔

”وہ فرق جو سوکھے اور ہرے بھرے درخت میں ہوتا ہے۔“

چند ایک روز تو ایلے باتوں کی مدد سے اپنے قدم جمانا رہا۔ پھر جب اس کی خود اعتمادی بڑھ گئی تو ایک روز جب وہ اکیلے تھے۔ ایلے نے نہ جانے کس بات کے جواب میں اپنے دل کی بات اذراہ مذاق کہہ دی۔ کہنے لگا۔ ”سراب صاحب کسی وقت تو میں ایسے محسوس کرتا ہوں جیسے آپ دلہن ہوں۔“ وفتا ”سراب صاحب میں چھپی ہوئی عورت تمام احتیاط اور ضبط کو توڑ پھوڑ کر باہر نکل آئی۔ اس نے نوج کر اپنے کپڑے پھاڑ دیئے اور برہنہ ایلے کے رو برو آکھڑی ہوئی۔

سراب کے چہرے پر سرخی جھلکی۔ وہ سرخی نہیں جو دوران خون تیز ہونے پر جھلکتی ہے بلکہ وہ سرخی جو دلہن کا گھونگھٹ اٹھنے پر ظاہر ہوتی ہے۔ ایلے حیران رہ گیا۔ اسے اس برہنگی کا خیال نہ تھا۔ توقع نہ تھی۔ وہ گھبرا کر چلا آیا۔ اس کے بعد سراب اور ایلے کے درمیان ایک جلاب سادیواری بن کر حائل ہو گیا۔ جیسے وہ دونوں کسی راز سے واقف ہوں۔

کپور اور ریاض

مدرسے میں سراب کے علاوہ دو شخص پیش پیش تھے۔ ایک تو سکول کے دفتر کا کلرک تھا۔

ن کاہم ریاض تھا۔ اس کا جسم فرہبی کی طرف مائل تھا۔ رنگ کالا تھا اور طبیعت میں حکمرانی کے علاوہ اخلاق، نیکی اور سچائی کی طلب کا جنون تھا۔

دوسرا شخص کپور تھا۔ کپور سینئر انکسٹریچر تھا۔ اس کا قد درمیانہ تھا۔ طبیعت میں بلا کا عجز اور مٹھاس تھی۔ کپور اپنے لئے نہیں بلکہ دوسروں کے لئے جیتا تھا۔ وہ دوسروں کے لئے جیتا تھا وہ ہر وقت کسی نہ کسی شخص کی جائز یا ناجائز امداد پر کمر بستہ رہتا تھا۔ صبح سویرے گھر سے نکلنا اور پھر رات گئے گھر لوٹنا اور سارا دن کسی نہ کسی حاجت مند کے کام میں مصروف رہتا۔ کوئی اسے پکڑی لے جاتا تاکہ مقدمے میں اس کی امداد کرے۔ کوئی اسے اپنی بیٹی کی شادی کے جملہ اخراجات سونپ دیتا۔ کوئی کہتا بھائی کپور۔ تھوڑا سا قرض چاہئے۔ کہیں سے انتظام کر دو۔ کوئی اسے یونٹن کے لئے فرمائش کرتا اور اگر کوئی کام نہ ہوتا تو کپور گھر گھر لوگوں سے ملتا ”کوئی سیوا دینے صاحب۔“ وہ کہتا ”میں آپ کا سیوک ہوں۔“ ایلے کے لئے ریاض اور کپور دونوں نعت فرماتے تھے۔ وہ دونوں ایلے کے کاموں میں مصروف رہتے تھے۔ کپور اسے اوصار سودا دیتا تھا۔ ریاض لڑکیوں کو سرٹیفکیٹ کے بغیر گریڈ سکول میں داخل کرنے کے لئے تنگ و دو کر رہا تھا۔ پھر کپور نے ان کی فیس معاف کرانے کا ذمہ لے لیا اور ریاض ان کے لئے کتابیں حاصل کرنے کی کوشش کرنے لگا۔

اسی طرح وہ دونوں ہر ممکن طریقے سے اس کی مدد کرتے رہے۔ سراب کو بھی ایلے کے حالات سے بے حد ہمدردی تھی۔ لیکن سراب کی ہمدردی کو عمل سے کوئی تعلق نہ تھا۔ ایلے کی جملہ مشکلات مالی نوعیت کی تھیں تنخواہ میں اس کا گزارا نہیں ہوتا تھا۔ اس لئے اس پر قرض کا طہار لگا جا رہا تھا۔ اس کے قرض خواہ اوائلی کے لئے تقاضہ کرتے اور ایلے دوڑ کر کپور کو بیٹی کی طرف بھیجتا تاکہ اسے کچھ دیر اور انتظار کرنے پر راضی کرے۔ اگلے روز کپورے والا آ جاتا اور ایلے ریاض کی طرف دوڑتا۔

کپور اللہ واسطے کام کرنے کا قائل تھا۔ مگر ریاض طبیعت کا سخت تھا وہ کام تو کرتا تھا مگر ساتھ گھر بھی پلاتا اور اس بات کا مطالبہ کرتا کہ ایلے اس کی عظمت اور نیکی کا اقرار کرے۔ اس کے علاوہ وہ ایلے پر خوش نہ تھا۔ اس کا کہنا تھا کہ آخر یوں کب تک گزارا ہو گا۔ اس کا کوئی عملی مذاکرہ کرنا چاہئے۔ ریاض اور کپور چاہتے تھے کہ ایلے کوئی یونٹن کرے اور اس طرح اپنی آمدنی میں اضافہ کرے۔ لیکن ایلے یونٹن کا قائل نہ تھا۔ اس کی زندگی نظم سے خالی تھی۔ وہ بلاتنہ

موس کرنے لگا تھا۔

ایلی کے لئے سب سے بڑی دقت یہ تھی کہ لڑکیوں جو ان ہو رہی تھیں۔ ان کے قہقہے گھر سے باہر نشر ہونے لگے تھے۔ ان کی آوازیں سن کر راہ گیر رک جاتے تھے۔ اور کہتے اچھا یہ ہے اپنی صاحب کا گھر جب وہ سکول جاتی تھیں تو راستے میں لوگ خصوصاً نوجوان لڑکے ایک دوسرے کو کہنی مارتے۔ مسکراتے اور کوئی عاشقانہ گیت گنگناتے ہوئے بامعنی نگاہوں سے ان کی طرف دیکھتے۔

ان باتوں کو دیکھ کر اس کے دل میں شبہات کا ایک طوفان پیدا ہو رہا تھا۔ ایلی ان لڑکیوں کی مصویت سے واقف نہ تھا۔ اسے یہ علم نہ تھا کہ ہر لڑکی اپنا آپ نشر کرنے پر فطری طور پر مجبور ہے۔ اسے اس کا شعور نہ تھا کہ لڑکیوں کی مسکراہٹیں کسی ٹھوس مقصد کے شعور سے خالی ہوتی ہیں۔ ان کے قہقہے لوگوں کی توجہ جذب کرنے کے لئے ہوتے ہیں۔ لیکن کسی خاص شخص کو بلانے کے لئے نہیں ہوتے۔ وہ اس امر سے ناواقف تھا کہ عنوان شباب میں لڑکی کسی تحسین بری نگاہ کو رو نہیں کر سکتی۔ حالانکہ اس سے اس کا کوئی خاص مقصد نہیں ہوتا۔

ان وجوہات کی بنا پر ایلی کو معصوم لڑکیوں سے شکایات پیدا ہوتی جا رہی تھیں اور یہ شکایات نصیب کی صورت اختیار کر رہی تھیں۔

اقتصادی مشکلات کی وجہ سے شہزاد میں ایک اداسی اور احساس محرومیت پیدا ہو رہا تھا۔ اس کی وہ رہنمائی ختم ہو چکی تھی۔ اس کی طبعی شوخی اب محض روایت سی معلوم ہوتی تھی۔ اگرچہ اس کی صحت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی تھی۔ لیکن اس میں وہی تلخی پیدا ہوئی جا رہی تھی۔ جو ایک ایسی عورت میں پیدا ہو جاتی ہے جو کبھی بہت خوبصورت رہی ہو اور جسے احساس ہو کہ وہ اپنا حسن کھو چکی ہے۔ شہزاد کو ایلی کے خلاف کوئی شکایت نہ تھی۔ اسے اب بھی ایلی سے وہی لگاؤ تھا۔ لیکن اس کے اظہار کے موقعے معدوم ہوتے جا رہے تھے۔ وہ جب بھی کوئی بات شروع کرتے تو نہ جانے کیسے وہ بات کسی نہ کسی اقتصادی مشکل پر آ ختم ہوتی اور بات کی رہنمائی تلخی میں بدل جاتی۔

کبھی کبھار لاہور سے محمود آ جاتا۔ میم کے چلے جانے کے بعد وہ تنہا رہ گیا تھا۔ لیکن اس کی نصیحت میں بلا کی جاؤ بیت تھی۔ میم کے جانے کا اس پر اثر ضرور ہوا تھا۔ لیکن وہ اس قدر گمراہ نہ تھا کہ اس کی شخصیت کی بنیادوں کو ہلا دیتا۔ ایلی کی دانست میں محمود اذلی طور پر ایک ایسا لڑھکتا

مقررہ وقت پر حاضر ہو کر کام کرنے کی اہلیت نہ رکھتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ تھی کہ ایلی محنت سے گریز کرتا تھا اور ریاض کو یہ بات پسند نہ تھی۔

پکور اور ریاض کے علاوہ شاہوال سکول میں ایک اور شخص بھی تھا جو جو نیر نیر تھا۔ اس کا نام ثناء اللہ تھا۔ ثناء اللہ میں کوئی ایسی خصوصیت نہ تھی۔ جو ایلی کے لئے جاذب توجہ ہوتی۔ اس کا جسم موٹا تھا۔ منہ سوجا سوجا سا طبیعت میں شوخی یا رہنمائی کا عنصر نام کو نہ تھا۔ وہ سر سے پاؤں تک ایک معزز آدمی تھا۔ البتہ اسے افسروں کے خلاف شکایت کرنے کی عادت تھی۔ کسی کو اکیلا دیکھ پاتا تو اسے پکڑ کر زیر لب افسروں کی شکایات کا دفتر کھول لیتا زندگی میں یہ اس کی واحد دلچسپی تھی۔ ثناء اللہ کی ایلی سے راہ و رسم صرف اس لئے ہو گئی کہ ان دونوں کے مکانات ایک ہی محلے میں واقع تھے۔ ایلی سکول سے واپس آتا تو ثناء اللہ آ نکلتا۔

”یہ سراب بڑا حرامی ہے“ وہ ادھر ادھر دیکھ کر زیر لب کہتا۔ ”اس کے کارنامے سنو گے۔ بھائی صاحب تو دنگ رہ جاؤ گے۔ بس اندر کا اکھاڑہ بنا رکھا ہے۔ اس سے مدرسے کے بچوں کے اخلاق تباہ ہو رہے ہیں۔“

”ایلی صاحب پکور کو زیادہ منہ نہ لگاؤ۔ اوپر سے دھرماتا بنا ہوا ہے۔ ویسے اندر سے کڑبند ہے اور بے انتہا متعصب۔ آپ کو علم نہیں۔ آپ تو صرف ظاہر پر جاتے ہیں۔ یہ لالے بڑے چالاک ہوتے ہیں اور یہ جو سیوا سستی شروع کر رکھی۔ اس نے یہ محض دکھاوا ہے۔“

”یہ جو موٹا ریاض ہے نا۔ مدرسے کا سارا پیسہ کھا گیا ہے۔ لیکن ہے اس قدر چالاک کہ کسی کو پتہ نہیں چلے دیا۔ ایک روز بھانڈا بھونے کا تو پتہ چلے گا۔ اس کے ساتھ اٹھنا بیٹھنا ٹھیک نہیں ورنہ جب بات نکلے گی تو ساتھ دھر لئے جاؤ گے۔“

ایلی کو ثناء اللہ سے قطعہ کوئی دلچسپی نہ تھی۔ نہ ہی وہ اس کی باتوں کو غور سے سنا کرتا تھا۔ لیکن اس میں اتنی جرأت نہ تھی کہ ثناء اللہ سے اپنا پیچھا چھڑاتا۔ اس کے برعکس وہ اس کی باتیں سن کر مجبوری سے تعجب بھری آوازیں کہتا۔ ”اچھا تو یہ بات ہے۔“

یا۔ ”کیا واقعی۔“ یا ”ارے ایسا معلوم تو نہیں ہوتا۔“

شاہ وال پنچ کر زندگی میں پہلی مرتبہ ایلی محسوس کرنے لگا تھا کہ سبھی اساتذہ اس کے راز سے واقف تھے۔ وہ جانتے تھے کہ وہ چھ بچوں کی ماں کو بھگا کر لے آیا ہے اور وہ اس بات پر شرم

ہوا پتھر تھا۔ جسے ہر لڑکھن نئی چمک عطا کرتی ہے۔

دور رہے سے واپس آئے ابھی انہیں دو مہینے ہی ہوئے تھے کہ ایللی کو معلوم ہوا کہ شہزاد امید سے ہے۔ لیکن شہزاد کو شہمت تھے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے وہ کہہ رہی تھی۔ لاہور ہسپتال والوں نے صاف کہہ دیا تھا کہ بچے کا اب سوال ہی پیدا نہیں ہوتا اور اگر ہوا ابھی تو میں کے لئے خطرے کا باعث ہو گا۔ لیکن امید کی تمام علامات واضح تھیں۔

”نہ جانے کیا ہے۔“ شہزاد نے کہا۔ ”یہ علامات شاید کسی آنے والی بیماری کا پیش خیر ہوں۔“

ادھر یا پاگل خانہ

”تم تو خواہ مخواہ شک کرتی ہو۔“ ایللی نے کہا۔

”میری طبیعت تو شکی نہیں۔“ وہ بولی۔ ”شکی تو تم ہو۔“

”پھر مجھے شک کیوں نہیں پڑتا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”مجھے کیا معلوم۔“ شہزاد بولی۔

”میں بتاؤں شہزاد۔“ ایللی نے کہا ”چلو ایک بار پھر دور رہے جا کر ہاشم سے ملیں۔

ہاشم کا نام سنتے ہی وہ گھبرا گئی۔ ”نہ میں نہیں جاتی۔“

”کیوں۔“

”وہ تو دیوانہ ہے۔“

”پڑا ہو میں اس سے مطلب۔“

شہزاد دور رہے جانے کے لئے تیار نہ ہوئی تو وہ اسے ایک لیڈی ڈاکٹر کے پاس لے گیا۔

لیڈی ڈاکٹر نے شہزاد کا معائنہ کیا اور پھر مسکرانے لگی۔ ”تمہیں بچہ ہونے والا ہے ظاہر ہے

کہ تم امید سے ہو۔۔۔ لیکن تمہاری صحت اچھی نہیں تمہیں خوراک کی ضرورت ہے۔“

اب بھی شہزاد کو یقین نہیں آتا تھا۔

چھ مہینے کے بعد وہ پھر بیمار پڑ گئی اور صاحب فراش ہو گئی۔ ایللی گھبرا گیا اور اس کی نشیں

کرنے لگا کہ ایک مرتبہ درواہے چلے۔ پہلے تو وہ انکار کرتی رہی لیکن جب تکلیف بہت بڑھ گئی تو

وہ راضی ہو گئی اور وہ دونوں دور رہے جانے کے لئے تیار ہو گئے۔

اس مرتبہ بھی وہ صبح کی گاڑی سے روانہ ہو کر شام کو تین بجے کے قریب دور رہے پہنچے۔

ان کا محل خالی پڑا تھا۔ ڈاکٹر ہاشم اسی طرح کبیل میں لپٹا ہوا بیٹھا تھا۔

ایللی نے اپنی آمد کا اعلان نہ کیا۔ بلکہ شہزاد کو سمجھا دیا کہ تم چپکے سے اپنا ہاتھ بدھا دینا تاکہ

اپر نبض دیکھ لے۔ ایللی ڈرتا تھا کہ کہیں ڈاکٹر اپنے طبعی جنون کی وجہ سے اسے دیکھنے سے انکار

کر دے۔

”کون ہے۔“ ڈاکٹر نے آواز سن کر پوچھا۔

”مریضہ۔“ وہ بولی۔

”اس وقت نہیں۔“ وہ بولا۔ ”صبح آئے۔“

”بہت دور سے آئی ہوں۔“ شہزاد نے کہا۔ ایللی خاموش بیٹھا رہا۔

”کتنی دور سے۔“

”شاہ وال سے۔“ وہ بولی۔ ”آج ہی واپس جاتا ہے۔“

”ہوں۔“ وہ بولا۔ ”تو کھاؤ نبض۔“ ڈاکٹر نے اپنا ہاتھ کبیل سے باہر نکالا اور وہ شہزاد کی

نبض دیکھنے لگا۔ دھتتا ”وہ چونکا۔“ ”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”معاملہ تو خراب ہے۔ بہت خراب ہے۔“

شہزاد خاموش بیٹھی رہی۔

”بچہ تو گل گیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”اور اگر تم بروقت نہ آتے تو۔۔۔“

”آپ نے پہلے بھی دوائی دی تھی۔“ ایللی بولا۔

”کب؟“

”چھ مہینے ہوئے۔“ وہ بولا۔ ”آپ نے کہا تھا جسم اندر سے گل گیا ہے۔“

”دی ہو گی دی ہو گی۔“ ڈاکٹر چلایا۔ ”لیکن معاملہ پھر بگڑا ہوا ہے۔“ اس نے کبیل سے سر

نکالا۔ ”یہاں روز مریض آتے ہیں۔“ وہ چلایا۔ ”سینکڑوں آتے ہیں۔ ہمیں کیا یاد رہتا ہے۔ کہ

لی کو کیا دوائی دی تھی۔ یہ دیکھو۔“ ڈاکٹر نے اس قالین کا کونہ اٹھایا جس پر وہ بیٹھا تھا۔ اس

کے نیچے خطوط کا ایک ڈھیر لگا ہوا تھا۔ ”دیکھو۔“ وہ بولا۔ ”یہ سب مریضوں کو خط ہیں۔ ان سب

کو ان جواب لکھے۔ خواہ مخواہ خط لکھتے چلے جاتے ہیں۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

”میاں۔“ وہ پھر بولا۔ ”ہم کیا خدا ہیں۔ صحت اور موت اللہ کے ہاتھ میں ہے جسے صحت

اللہ مطلوب ہوتی ہے۔ ہمارے ہاتھ سے صحیح دوا لکھوا دیتے ہیں۔ ورنہ یونہی اتاپ شاپ دوائی

مل جاتی ہے۔ سب اللہ کی شعبہ بازی ہے کون حکیم ہے اور کون ڈاکٹر سب ڈھونگ ہے ڈھونگ ”وہ پھر خاموش ہو گیا۔“

”تم کیا کام کرتے ہو۔“ اس نے ایللی سے پوچھا۔

”جی میں بچے پڑھاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

”تم بچے پڑھاتے ہو۔“ اس نے ایللی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔

”جی۔“ ایللی نے کہا۔

”تم اس کام کی اہلیت نہیں رکھتے۔“

”جی۔“ ایللی نے کہا۔

”اور تم یہ کام کرو گے بھی نہیں۔“

”جی۔۔۔؟“

”چھوڑ جاؤ گے۔“ ڈاکٹر نے پھر سے اپنا منہ کبل سے ڈھانپ لیا اور اپنی بات جاری رکھی۔

”تمہاری زندگی میں گزربو ہے۔“ وہ بولا۔ ”ذرا نبض دکھاؤ۔“ اس نے ایللی سے کہا اور اپنا ہاتھ کبل سے نکال کر ایللی کی نبض دیکھنے لگا۔ دیر تک نبض ہاتھ میں پکڑ کر بیٹھا رہا۔

”سب کچھ غلط ہے“ وہ بولا۔ ”سرے سے سب کچھ غلط۔ دل و دماغ اعضاء سب غلط ہیں۔“

سب الٹ پلٹ ہو رہا ہے۔ سودا کی طرف مائل ہو۔ صفرا حد تک پہنچ چکا ہے۔ پاگل ہو جاؤ گے۔“ وہ بولا۔ ”یقیناً“ ہو جاؤ گے۔ بچاؤ کی صرف ایک صورت ہے۔“ اس نے کہا صرف ایک

اگر ادھر نہ پہنچے تو میٹل ہسپتال میں پہنچ جاؤ گے۔ اور وہیں مرو گے۔“

”ادھر کدھر۔“ ایللی نے پوچھا۔

”وہ بھی ایک سمت ہے۔ ایک ایسی سمت جس سے تم واقف نہیں ہو۔“ ڈاکٹر نے جواب

دیا۔

”تو پھر ادھر پہنچے گا کیا امکان ہو سکتا ہے اگر میں ادھر سے واقف ہی نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

ڈاکٹر ہنسا۔ ”وہی پہنچتے ہیں جو واقف نہیں ہوتے۔ بلائے جاتے ہیں۔ اللہ نے بڑے پاکھنڈ

بچار کھے ہیں۔“ اس نے سر سے کبل پھرتا رہا۔

”تم لڑکی۔“ وہ شہزاد کی طرف دیکھ کر بولا۔ ”تمہارا اس کا ساتھ نہیں چلے گا۔ دیر تک

نہیں چلے گا۔ تمہاری یہ بیماری۔۔۔ تمہیں لے جائے گی۔“ ہاں لے جائے گی۔ لیکن

مارے پیٹ میں جو کچھ ہے جو گل چکا ہے۔ انشاء اللہ وہ ٹھیک ہو جائے گا۔ یہ بچہ معمولی بچہ

میں۔ بہت کچھ لے کر آئے گا بہت کچھ عالی ظرف ہو گا۔ فنکار ہو گا سبحان اللہ۔“

وہ دھنسا۔ ”اٹھ بیٹھا۔“ ”آؤ تمہیں پڑیا دیں۔“ وہ بولا۔ ”آؤ۔“

”ہاشم سے فارغ ہو کر وہ چپ چاپ سٹیشن پر بیٹھے رہے۔ شہزاد اپنے ہی خیالات میں کھوئی

ہی تھی۔

”کیا سوچ رہی ہو۔“ وہ شہزاد سے پوچھنے لگا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ وہ بولی۔

ڈاکٹر کی باتوں پر دھیان نہ دو ایللی نے کہا۔ ”وہ صرف ڈاکٹر ہی نہیں۔ دیوانہ بھی ہے۔ بہت

اقلفی بھی ہے۔ روحانیت سے بھی شغف رکھتا ہے۔ عجیب آدمی ہے۔ شاید تم سوچ رہی ہو

لڑاتی ہم دونوں ایک دوسرے سے الگ ہو جائیں گے۔“

”وہ تو میں دیر سے جانتی ہوں۔“ شہزاد بولی۔

”کیا؟“

یہی کہ تم اکیلے رہ جاؤ گے اور میں چلی جاؤں گی۔ لیکن ایللی ایک بات ہے۔“

”کیا؟“

شہزاد نے اس کا ہاتھ تھام لیا ”میرے جانے سے پہلے کہیں مجھے چھوڑ نہ جانا۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ وہ بولا

”بس مجھے یہی ایک فکر ہے۔“ شہزاد کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

”تمہیں مجھ پر بھروسہ نہیں کیا؟“

”ہے۔“ وہ بولی۔ ”لیکن پتہ نہیں کیوں یہ خیال بار بار میرے دل میں اٹھتا ہے۔“

وہ تہقہ مار کر ہنس پڑا۔

جب وہ شاہ وال پہنچے تو شہزاد کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر تھی۔ پھر روز بروز اس کی طبیعت

نرم ہوئی گئی۔ حتیٰ کہ وہ صحت یاب ہو گئی۔

صحت یاب ہونے کے بعد بھی وہ اداس رہتی تھی۔ کئی بار بیٹھے بیٹھے جب اس کی نگاہ بڑی

لیڈل پر پڑتی تو اس کی آنکھوں میں آنسو آ جاتے۔ دراصل اسے لڑکیوں کا غم کھائے جا رہا تھا۔

لڑکا خیال تھا کہ ان لڑکیوں کے لئے کوئی رشتہ نہیں ملے گا۔ چونکہ وہ اس کی بیٹیاں تھیں۔ کوئی

عزیز یا رشتہ دار ان سے شادی کرنے کے لئے تیار نہ ہو گا۔ شہزاد نے اپنے اس خیال کے متعلق ایللی سے بھی کئی بار بات کی تھی لیکن ایللی اس کی بات پر ہنس دیتا تھا۔ ”ابھی سے کیوں فکر کرتی ہو۔“ وہ کہتا۔

”میرے پاس زیادہ وقت بھی ہو۔“ شہزاد جواب دیتی۔

اس پر ایللی چڑ جاتا۔ ”کیا واقعی تم یہ خیال دل میں لے بیٹھی ہو کہ تمہارے پاس زیادہ وقت نہیں ہے۔“

”کیا تمہیں ابھی تک یقین نہیں آیا۔“ شہزاد پوچھتی۔

”پاکل ہو“ وہ چلاتا۔ ”خواہ مخواہ کے فکر لگائے بیٹھی ہو۔“ اسے واقعی اس بات پر غصہ آ جاتا تھا۔ لیکن اس کے غصے نے کبھی لڑائی کی صورت اختیار نہ کی تھی۔

بھارت سیمٹ

ایک روز ثناء اللہ اپنی بیوی کو ان کے ہاں لے آیا۔ اس کی بیوی بڑی لڑکی صبیحہ کو دیکھتے ہی چلانے لگی۔

”ہائے کتنی پیاری بیٹی ہے۔ تمہاری۔ آئیں واری جاؤں۔ آئیں تجھے پیار کروں۔“ اس نے صبیحہ کو اپنے پاس بیٹھایا اور اسے پیار کرنے لگی۔

صبیحہ حیران تھی وہ زیر لب ہنسے جا رہی تھی۔ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ ایک بیگانہ عورت اس پر اس قدر مفتون کیوں ہوئی جا رہی ہے۔ شہزاد کو بھی حیرت ہو رہی تھی۔

اگلے روز ہی بھانڈا پھوٹ گیا۔ ثناء اللہ اپنے چھوٹے بھائی کا پیغام لے کر آیا۔

”صبیحہ کو تو ہم نے اپنی بیٹی بنا لیا ہے۔“ وہ بولا۔ ”میری بیوی تو اسے دیکھ کر اپنا دل دے چکی ہے۔ کل سے اسی کر باتیں کرتی ہے۔ بات بات پر اسی کا تذکرہ اگر آپ ہم غریبوں کا پیغام منظور کر لیں تو بہت کرم نوازی ہوگی۔“

چند ہی روز کے بعد ثناء اللہ نے اپنے دونوں بھائیوں کو شاہ وال بلایا تاکہ وہ ایللی سے مل سکیں۔

اس کا بڑا بھائی ذکاء اللہ شکل و صورت اور بات چیت سے خالص فنکار دکھائی دیتا تھا۔ اس کے بال گیسوؤں کی طرح لمبے تھے۔ چہرے سے خوش مذاقی اور ذہنی چمک واضح تھی۔ غنٹنگو

دلت پر اخلاق اور آواز بہت رسیلی تھی۔ ثناء اللہ کے بیان کے مطابق وہ سکرٹریٹ میں ایک اعلیٰ درجے پر فائز تھا۔

چھوٹا بھائی ضیاء ابھی نوجوان ہی تھا۔ اس نے ایف اے تک تعلیم پائی تھی اور آنکھوں میں دہلی چمک تھی۔

شہزاد اور ایللی ان سے مل کر بے حد خوش ہوئے۔

”لو۔“ ایللی نے کہا۔ ”تمہارا یہ غم بھی دور ہو گیا۔ صبیحہ کو اچھا رشتہ مل گیا۔“

”اونہوں۔“ شہزاد بولی۔ ”میں خوش نہیں ہوں۔ ایف اے سے کیا ہوتا ہے آج کل لڑکا ہر طرح تعلیم یافتہ نہیں اور جب تک اسے مناسب ملازمت نہ مل جائے میں یہ کام نہیں لائے گی۔“

ہر صورت اس بات چیت کا یہ نتیجہ ہوا کہ صبیحہ اور ضیاء نام زد ہو گئے۔

بہنرنگی سے پہلے ایللی ایک روز ثناء اللہ کو مدرسے میں ایک طرف لے گیا اور کہنے لگا۔ ایللی پشتر اس کے کہ اس امر کا فیصلہ ہو میں یہ ضروری سمجھتا ہوں کہ تمہیں اپنے حالات سے لگ کر دل نہ لگنا کہ ایسا نہ ہو کہ کل تمہیں ان تفصیلات کا علم ہو اور تم ہم سے گلہ کرو کہ ہم نے بیادعو کے میں رکھا۔“ یہ کہہ کر ایللی نے اپنی زندگی کے متعلق اہم باتیں اسے بتا دیں۔

ثناء اللہ غور سے اس کی باتیں سنتا رہا اور پھر مسکرا کر بولا۔ ”میں سب علم ہے۔ آپ نے لائے بات نہیں سنائی۔“

”تو کیا۔“ ایللی نے پوچھا۔ ”آپ نے یہ سب جانتے ہوئے پیغام دیا تھا۔“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”ذکاء زندگی بھر بیرونی ممالک میں گھوما ہے۔ وہ ان باتوں کو درخور اعتنا نہ سمجھتا اور چونکہ چھوٹا ضیاء اس کے زیر اثر ہے اس لئے اس کا نقطہ نظر بھی رسمی نہیں ہے۔“

لہذا ایک ماہ کے بعد ایک روز شہزاد اور ایللی کو اکٹھے لاہور جانے کا اتفاق ہوا۔ وہاں پہنچ کر

دئے کہا۔ ”اب جو یہاں آئے ہیں تو ذکاء اور ضیاء سے مل کر جانا چاہئے۔ انہیں علم ہو گا کہ لاہور آئے تھے اور ملے بغیر چلے گئے تو وہ برا مانیں گے۔“

یہ سوچ کر وہ دونوں انارکلی گئے وہاں سے انہوں نے پھل وغیرہ خریدا اور پھر مل روڈ کی پہل پڑے۔ انہیں صرف یہ معلوم تھا کہ ضیاء اور ذکاء اکٹھے نمبر ۱۱۳ کی کوٹھی میں رہتے

ہیں۔ دیر تک وہ بل روڈ پر گھومتے پھرے۔ لیکن انہیں ۳۳ نمبر کی کوٹھی کا پتہ نہ چلا۔ آخر ایلی ایک دوکان پر گیا۔ پان فروش سے پوچھا۔ ”بھائی نمبر ۳۳ کا بنگلہ کدھر ہے۔“

نمبر ۳۳ پٹواڑی سوچ میں پڑ گیا۔ اس نے قریب کھڑے ایک آدمی کو آواز دی۔ ”کیوں بھابی۔“ وہ بولا۔ ”بھلا نمبر ۳۳ کی کوٹھی کون سی ہوئی۔“

”۳۳۔“ وہ بھی سوچ میں پڑ گیا۔ اس پر دو چار آدمی اور آگئے۔

”بھائی صاحب کچھ اتا پتہ دیجئے خالی نمبر سے تو کام نہیں چلے گا۔“ ایک آدمی نے کہا۔

”بھئی ان کا نام ذکاء اللہ ہے یہاں سیکرٹریٹ میں اعلیٰ عہدے پر فائز ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ہوں۔“ وہ سوچ میں پڑ گئے۔

”کتنے بھائی ہیں۔“ ایک نے پوچھا۔

”دو بھائی ہیں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”ارے۔“ ایک چلایا۔ ”وہ ناچے تو نہیں کیا۔“

اس پر ان سب نے غور سے ایلی اور شہزاد کا جائزہ لیا۔

”ارے نہیں۔“ ایک بولا۔ ”وہ کیسے ہو سکتے ہیں۔ بھئی انہیں ملنے تو میسین آتی ہیں۔“

”ناچے۔“ ایلی سن کر مسکرایا۔ ”ناچے کا کیا مطلب۔“ اس نے دل ہی دل میں سوچا۔

”معلوم نہیں جی۔“ ایک شخص بولا۔ ”آپ ان پچھلے بنگلوں میں دیکھیں۔ شاید وہیں

ہوں۔“

ایلی ان بنگلوں کی طرف چل پڑا۔ شہزاد تانگے میں بیٹھی رہی۔

ساننے بنگلے سے موسیقی کی آوازیں آرہی تھیں۔ بنگلے کے گول کمرے پر بورڈ آؤریاں تھیں۔

”بھارت سیتھ۔“ گول کمرے میں ساز سنگیت کا ریکارڈ چل رہا تھا۔ کس قدر صاف آواز تھی۔

کیسا اچھا باجہ تھا۔ ایلی نے قریب جا کر اندر جھانکا۔ کمرے میں ایک جوان حسین و جمیل لڑکی بیٹھ

رہی تھی۔

”ارے۔“ وہ گھبرا گیا۔ ”کس قدر خوبصورت لڑکی ہے۔ انگریز تو نہیں۔ ہندوستانی معلوم

ہوتی ہے۔“ ایک ساعت کے لئے وہ کھڑا دیکھتا رہا۔

وہ تھا۔ اس گول کمرے سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ ”ارے۔“ وہ ضیاء تھا۔

ریتی گن گلی

”آٹا خفاء ہے۔“ ایلی چلایا۔ ”یار ہمیں نمبر ۳۳ ملتا ہی نہیں تھا۔ دیر سے تلاش کر رہے

ایلی نے یوں محسوس کیا جیسے ضیاء چپ چاپ کھڑا اس کے منہ کی طرف دیکھ رہا ہو۔ ایک

ت کے بعد ضیاء بولا۔

”اس بلاک کے پچھواڑے میں ہے۔ ہمارا گھر۔“

ایلی اور ضیاء شہزاد کو ساتھ لے آئے اور ضیاء انہیں اس بلاک کے پچھواڑے کی طرف

ایک گول کمرے کے قریب پہنچ کر ایلی نے دیکھا کہ موسیقی بالکل بند ہو چکی ہے اور کمرے

لوکی بھی نہیں۔

ذکا انہیں بہت تپاک سے ملا۔ ”آپ نے آنے کی اطلاع کیوں نہ دی۔“ وہ بولا۔

”ویسے ہی آئے تھے۔“ شہزاد بولی۔ ”تو ہم نے کہا آپ کو مل لیں۔“

”پھر بھی اطلاع دینا مناسب ہوتا ہے۔“ خواہ مخواہ آپ کو کوفت ہوئی۔ ”ذکاء نے

بات بدلی۔

چند منٹ بیٹھنے کے بعد ایلی اور شہزاد نے اجازت طلب کی۔ ”گھاڑی چلنے میں صرف ایک

رہ گیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

ضیاء اور ذکاء انہیں تانگے تک چھوڑنے آئے۔

جب وہ اکیلے رہ گئے تو شہزاد بولی۔ ”ان کے گھر تو کوئی بھی عورت نہیں۔“

”ذکاء کی بیوی تو مر چکی ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”مجھے یہ بات یاد ہی نہ تھی۔ میرا خیال تھا کہ کوئی عورت ہو گی گھر میں۔“ شہزاد بولی۔

ابھی ان کا تانگہ سڑک پر پہنچا ہی تھا کہ ایلی تانگے والے سے بولا۔ ”بھئی ذرا ٹھہرنا میں ذرا

ٹالے آؤں۔“

اور وہ اسی دوکان پر سگریٹ خریدنے چلا گیا۔ جہاں سے انہوں نے پتہ پوچھا تھا۔

پٹواڑی نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھا اور بڑے بامعنی انداز سے کہنے لگا۔ ”کیوں بھابی

تہیں وہ لوگ۔“

ایلی خود حیران تھا۔ شرمیلی گن گلی پڑھ کر وہ خود سوچ بچار میں کھو گیا تھا۔

کھیل شروع ہوا۔ وہی حسین و جمیل لڑکی جسے ایلی نے گول کمرے میں دیکھا تھا۔ سٹیج پر آئی۔ اس نے ناظرین کو دونوں ہاتھ جوڑ کر سلام کیا پھر یورپین فیشن کے مطابق جھکی اور پھر تتلی کی طرح محو رقص ہو گئی۔ اس کی حرکات میں لے تھی۔ اعضاء میں ہلا کی چمک تھی اور چہرہ ٹکڑیوں سے بھرپور تھا۔ ایلی بھول گیا کہ وہ کیوں شو دیکھنے آئے تھے اور انہیں کس بات کا پتہ لانا تھا۔

شرمیلی نے تین سولو ناچ پیش کئے۔ چوتھے ناچ میں اس کے ہمراہ ایک نوجوان تھا۔ نوجوان روکھ کر شہزاد ٹھٹھکی۔ ”یہ تو مجھے ضیاء معلوم ہوتا ہے۔“ وہ بولی۔

”ضیاء؟“ ایلی چونکا اسے یاد ہی نہ رہا تھا کہ ضیاء کون تھا۔ ”وہ ضیاء“ کچھ دیر کے بعد لایا۔ ”نہیں نہیں۔ کہاں ضیاء کہاں یہ لڑکا۔ یہ تو کوئی مدراسی معلوم ہوتا ہے۔“

چوتھے ناچ کے بعد انڈول ہو گیا اور ذکاء بنس نفیس سٹیج پر آکر ناظرین کا شکریہ ادا کرنے لگا۔ لڑنے ایلی کی طرف دیکھا۔ غصے سے اس کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔

اگلے روز شاہ وال آتے ہوئے شہزاد گاڑی میں بیٹھی ہوئی رو رہی تھی۔

”آخر رونے کا مطلب۔“ ایلی بولا۔

”کچھ نہیں۔“ وہ کہنے لگی۔

”ناچنا تو ایک فن سمجھا جاتا ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ ناچ کوئی طائفہ ناچ تو نہیں ہے نا۔ پھر لیل دل برا کرتی ہو۔“

”نہیں ایلی۔“ وہ بولی۔ ”وہ میری صبیحہ کو نچائیں گے۔ اس کے شو کریں گے۔“

”تو کیا ہوا۔“ ایلی نے کہا۔ ”یہ تو بھارت نیٹم ہے۔ بھارت نیٹم تو فن ہے۔ عیب تو“

”لیکن لوگ کیا کہیں گے۔“ وہ بولی۔

”تم تو لوگوں کی پرواہ نہیں کیا کرتی تھی۔“ ایلی نے کہا۔

”اپنے لئے نہیں کرتی تھی نا۔“ وہ بولی۔ ”لڑکیوں کے متعلق پرواہ کرنی ہی پڑتی ہے۔“

”تو کیا انہیں جواب دے دو گی۔“ منگنی توڑ دو گی۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہائے تو کیا ناچوں کو دے دوں اپنی بچی۔“ شہزاد نے جواب دیا۔

”جی۔“ ایلی نے جواب دیا۔ ”مل گئے۔“

”میں نے تو پہلے ہی کہا تھا بھابی۔“ وہ بولا۔ ”کہ وہی ہوں گے۔“

”نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”وہ تو پچھلے ہلاک میں رہتے ہیں۔“

”اجی وہی ہیں نا جو ابھی آپ کو تانگے تک چھوڑنے آئے تھے۔“ پنواڑی بولا۔ ”دو بھائی ہیں اور ایک بہن بہت اچھا ناچتی ہے وہ بھائی خود سکھاتا ہے اسے ساری عمر مدراس میں رہا ہے تاہیں سے سیکھ کر آیا ہے۔“

بھارت سسٹیم! ایلی کے روبرو گول کمرے کا بورڈ آگیا۔

”آج ہی شو ہے بھابی۔“ پنواڑی بولا۔ ”اپنے کیپٹل میں ہو گا۔ ہم بھی جا رہے ہیں۔“

دیکھنے کے لئے۔“

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے منہ پر تھپڑ مار دیا ہو۔

جب شہزاد کو ایلی نے پنواڑی کی بات بتائی تو وہ پنچے جھاڑ کر اس کے پیچھے پڑ گئی۔

”لوگوں کا کیا ہے۔“ وہ بولی ”خواہ مخواہ ہستان لگاتے ہیں۔ اگر ان کی بہن ہوتی تو کیا وہ ہمارے سامنے نہ آتی۔ اتنی دیر ہم بیٹھے رہے ان کے گھر اور گھر کی صورت ہی سے ظاہر تھا کہ

کوئی عورت نہیں رہتی وہاں۔“

اس پر ایلی کو وہ لڑکی یاد آگئی جو گول کمرے میں ناچ رہی تھی۔

”کیا وہی ان کی ہمشیرہ تھی۔ کتنی خوبصورت تھی وہ۔“ ایلی سوچنے لگا۔

”تو پھر آج کی رات ہم یہی رہ جاتے ہیں۔“ ایلی نے شہزاد سے کہا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”وہ کہتا تھا آج شام کو ان کا شو ہے اور ان کی بہن ناچے گی۔ چلو آج دونوں شو دیکھیں گے۔“

شہزاد اس کے لئے تیار نہ تھی۔ لیکن اس کے بغیر انہیں حقیقت کا پتہ نہیں چل سکتا تھا۔

لہذا وہ مجبوری میں ایلی کی بات مان گئی۔

شام کو جب وہ کیپٹل میں پہنچے تو اشتہار میں لکھا تھا۔ بھارت سسٹیم کا شاہکار شرمیلی گن آ

پیش کریں گی۔

شہزاد چلائے گئی۔ ”ناچ دیکھنے کو اپنا جی چاہتا تھا اس لئے بہانہ بنا کر لاہور رک گئے۔“

ناظم کے چہرے سے ذہانت کے آثار مترشح نہیں ہوتے تھے۔ اس کے خدوخال عام سے لڑکے کے بلوغت پر احساس دیتے کہ ان کو سمجھنا آسان نہیں۔ اس کی آنکھوں میں ہلکا سا فرق تھا۔ اندر ہلکا کہ کسی وقت دکھائی نہ دیتا اور نہ محسوس ہوتا لیکن کسی وقت وہ اس قدر شدت سے غم ہوتا جیسے دھول بجا بجا کر اپنے وجود کا احساس دلا رہا ہو۔

ناظم سے چار ایک مرتبہ ملنے کے بعد ایلی نے محسوس کیا کہ وہ ایک مجموعہ افساد تھا۔ مثلاً "کے چہرے پر ذہانت کا فقدان تھا۔ اس کے بلوغت وہ اکثر ذہانت بھری بات کرتا اور ایلی حیرانی سے اس کی طرف دیکھتا۔ ناظم کے انداز سے ظاہر تھا کہ وہ مجلسی آدمی نہیں اور سوسائٹی سے دور پسند کرتا ہے۔ لیکن چند ہی دنوں میں ایلی نے دیکھا کہ بورڈنگ کے تمام لڑکے اس کے گرد رٹ کئے بیٹھے ہیں تمام لڑکے تھوڑے ہی عرصے میں ناظم کے مداح ہو گئے تھے۔ اور اس کے اداکاری کے متعلق سارے سکول میں دھوم مچ گئی تھی۔ اس کے علاوہ ناظم کے چہرے پر ہٹو رہو قسم کی علامات ہر وقت موجود رہتی تھیں جو لوگوں سے میل جول پیدا کرنے میں رکاوٹ بنتیں۔ اس میں ایک واضح جھجک تھی۔ لیکن درحقیقت اس کا دل جذبات کی شدت سے بھرا تھا۔ اسے دیکھ کر شک پڑتا کہ وہ جذبات سے خالی ہے اور حیات سے کورا ہے لیکن حقیقت جذبات اور خصوصاً "شدت اس کے کردار کے بنیادی پہلو تھے۔

بی اے ہونے اور سوٹ پہننے کے بلوغت ناظم کی طبیعت امرتسر کے "بھائی۔" قسم کی تھی۔ بہترین دوست اور بدترین دشمن ہوتے ہیں جو دکھلاوے سے دور بھاگتے ہیں اور کسی کا رعب اٹھانے کے لئے تیار نہیں ہوتے۔

ناظم اور ایلی کی دوستی روز بروز بڑھتی گئی اس کی تمام تر ذمہ داری ناظم پر عائد ہوتی تھی۔ روز شام کے وقت وہ ایلی کو آواز دیتا۔ "آصفی صاحب۔" اور پھر اسے ساتھ لے کر باہر نکلے۔ ایلی سیرو تفریح کا مشتاق نہ تھا۔ اس لئے وہ شامیں گھر پر ہی بسر کرنے کا عادی تھا۔ عام طور پر اہل وقت مطالعہ میں بسر کرتا۔ ناظم زبردستی اسے باہر لے جاتا اور وہ دیر تک گھومتے رہتے۔ ناظم میں دلچسپی محض کتابی قسم کی تھی۔ وہ اس کی شخصیت کے متعلق معلومات حاصل کرنا ہوتا تھا۔ اسے ایسی عجیب و غریب شخصیت سے کبھی سابقہ نہ پڑا تھا۔

ناظم کو بازار میں کھانے پینے کی بہت عادت تھی۔ مثلاً "وہ سوڈا پینے کھڑا ہوتا تو سوڈے کی بوتلیں پی جاتا کباب کھانا شروع کرتا تو دو درجن کباب کھا جاتا پہلے روز ہی جب اس نے دو

لاہور سے آنے کے بعد شہزاد پر بلاسی چھا گئی۔ ایک تو صبیحہ کی بنی بنائی بات ٹوٹ گئی تھی دوسرے وہ بچے سے تھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس کے دل کی تموں میں بیٹھا ہوا غم چڑھا ہٹ اور غصے میں بدل گیا۔ بات بات پر اس کا غصہ جوش میں آ جاتا اور پھر بھوکے شیرنی کی طرح کچار میں بیٹھ کر غراتی رہتی۔ ایلی اس کی اس تبدیلی پر ہیچ پا ہو جاتا ہے۔

وہ دن ان کے لئے نہایت تلخ تھے۔ وہ گھر جہاں ہر وقت دھما چوکڑی مچی رہتی تھی۔ تاش اور چوہٹ کی بازی لگی رہتی تھی جہاں لڑکیاں ناچتی تھیں۔ بچے قفقہ لگاتے تھے وہ گھر ویرانے میں بدل چکا تھا۔ حالانکہ ان کی مالی مشکلات کسی حد تک کم ہو گئی تھیں۔ چونکہ ریاض اور کپور کی کوششوں کی وجہ سے ایلی کو بورڈنگ کا سپرنٹنڈنٹ بنا دیا گیا تھا اور اب وہ کرایہ کے مکان کو چھوڑ کر سرکاری کوارٹر میں مقیم ہو گئے تھے اس طرح اسے کچھ مالی امداد حاصل ہو گئی تھی۔ ایک تو اسے مکان کا کرایہ نہیں دینا پڑتا تھا اور دوسرے ایک قلیل رقم الاؤنس کے طور پر ملنے لگی تھی۔

ناظم

انہی دنوں ڈائریکٹر تعلیم نے ان کے سکول میں ایک جوئیر کلرک کی آسامی منظور کر دی تھی اور ایک نیا کلرک اس آسامی پر مامور ہو کر وہاں پہنچ گیا تھا۔

وہ ایک نوجوان بی اے تھا۔ اس کا نام ناظم تھا۔ اگرچہ دیکھنے میں وہ نہ تو بی اے نظر آتا تھا اور نہ اسے نظم سے کوئی تعلق معلوم ہوتا تھا۔ چونکہ ناظم شادی شدہ نہ تھا اور شاہ وال میں نوازد تھا اس لئے اسے بورڈنگ میں قیام کرنے کی وجہ سے ایلی اور وہ روزانہ ملا کرتے تھے۔ پہلے روز جب ایلی نے ناظم کی طرف دیکھا تو اسے کچھ بھی سمجھ میں نہ آیا۔ اگرچہ ناظم نے سوٹ پہن رکھا تھا لیکن اس کا سوٹ گویا سوٹ معلوم ہی نہیں ہوتا تھا۔ اس کی شخصیت سوٹ اور بی اے دونوں سے بے نیاز تھی۔ ناظم اے بی کورس کا گریجویٹ تھا۔ جب ایلی کو اس تفصیل کا علم ہوا تو وہ اور بھی حیران ہوا اس کے علاوہ جب اسے یہ علم ہوا کہ ناظم ریاض پڑھانے میں بڑی دسترس رکھتا ہے تو ایلی بالکل ہی کھو گیا۔ شخصیت کو سمجھنے کے متعلق ایلی کو اپنے اندازوں پر بڑا ناز تھا اس کا خیال تھا کہ وہ شخصیت اور کردار کو سمجھنے کی صلاحیت رکھتا ہے لیکن ناظم کو دیکھ کر اسے کچھ سمجھ میں نہیں آیا تھا کہ وہ کیا شے ہے۔

درجن کباب کھائے اور اس کے اوپر تین مینھی بوتلیں ہیں تو ایلی گھبرا کر بولا۔ ”کیا ہوا ہے تمہیں ناظم صاحب۔“

”یار۔“ اس نے کہا۔ ”بہت دکھ لگا ہوا ہے آج۔“

”دکھ۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”دکھ لگا ہو تو بھوک نہیں لگتی۔“

”مجھے تو بہت لگتی ہے اتنی لگتی ہے کہ جی چاہتا ہے کہ دنیا بھر کی چیزیں پیٹ میں جمویں دوں۔ اندر ایک خلاء پیدا ہو جاتا ہے جو بھرتا ہی نہیں“ ناظم نے جواب دیا۔

”کیا واقعی؟“

”ایمان سے۔“

”عجب بات ہے۔“

”عجیب کہل۔“ وہ بولا یہ تو میرا دستور ہے بچپن سے ہی ایسا ہے۔“

”آج کیا غم ہے تمہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”میرا دوست بیمار ہے۔“ ناظم بولا۔

”دوست بیمار ہے؟ کون سا دوست؟“

”آج ہی خط آیا ہے ساری دنیا اندھیر ہو رہی ہے۔“ ناظم بولا۔

”ارے بس اتنی سی بات پر غم ہے تمہیں۔“

”اتنی سی بات۔“ اتنا ناظم نے غصے سے ایلی کی طرف دیکھا۔ ”دوست کی بیماری سے بڑھ کر

اور کیا بات ہو سکتی ہے۔ کیا دکھ ہو سکتا ہے۔“

ایلی حیران تھا۔ لیکن وہ خاموش رہا۔ ناظم کی آنکھوں کا فرق نمایاں ہوتا جا رہا تھا اور تجربے

کی بنا پر ایلی کو علم ہو چکا تھا کہ اس کی آنکھوں کا زاویہ جذبات کی شدت کی وجہ سے بدلتا ہے۔

ایسی صورت میں ناظم سے عقل کی بات کہنا اچھے اثرات پیدا نہیں کر سکتا۔ بہر حال ناظم کے

آنے سے ایلی کے دوستوں کی تعداد میں اضافہ ہو گیا تھا۔

نصیر اور شیر

پھر ان کے گھر نصیر اور شیر علی آ گئے۔

شیر اور نصیر ایلی کے بھائی تھے وہ دونوں راجو کے بطن سے تھے۔ فرق صرف یہ تھا کہ شیر

علی راجو کے پہلے خاوند سے تھا اور جب وہ علی احمد کے گھر آئی تھی تو اس کی گود میں تھا۔ اور نصیر علی احمد سے تھا۔

نصیر اس زمانے کی پیداوار تھا۔ جب علی احمد بڑھاپے کے اولین دور میں قدم رکھ چکے تھے۔ اس لئے علی احمد نے غیر از معمولی محبت سے پالا تھا۔ اگرچہ یہ محبت خصوصی محبت تھی۔ جس میں علی احمد کی جھلک تھی۔ لیکن اس کے باوجود نصیر کی جسمانی یا شخصیت پھل پھول نہ سکی تھی۔ جسمانی طور پر وہ کمزور تھا اور اکثر بیمار رہتا تھا۔ طبیعت کے لحاظ سے وہ جذباتی کمزور اور نیکی کی طرف مائل تھا۔ وہ بڑوں کا ادب کیا کرتا تھا۔ ماں باپ کا احترام کرتا تھا اور ایلی سے بہت متاثر تھا۔

نصیر کے برعکس شیر علی جسمانی طور پر مضبوط تھا۔ اس کے جسم کے ساخت ہی اس بات کو واضح کرتی تھی کہ وہ آمفیوں میں سے نہیں اور علی احمد کے خاندان سے ہٹ کر ہے وہ ”بھعا“ خاموش تھا۔ لیکن اسے دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ دل کی بات چھپا کر رکھتا تھا اور اس کی آرزو تھی کہ بڑا آدمی بنے۔ شیر علی میں جنسی پہلو کی شدت تھی اور اس شدت میں پراسراریت کا عنصر تھا۔

دسویں پاس کرنے کے بعد شیر علی دورا ہے میں ایک ٹیکنیکل کورس کرنے کے لئے چلا گیا تھا اور ایک سال کی ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد واپس آیا تھا۔

جب وہ واپس آیا تو اس کا قد بہت بڑھ گیا تھا۔ یوں دکھائی دیتا تھا۔ جیسے جوان ہونے سے پہلے ہی جوان ہو گیا ہو۔ وہ گھر کی کسی بات میں با آواز بلند دخل نہیں دیتا تھا۔ شاید اس کی یہ وجہ ہو کہ گھر میں اس کی پوزیشن ایسی نہ تھی۔ جیسے ایلی یا نصیر کی تھی یا شاید ”بھعا“ وہ بات کہہ دینے کی صلاحیت سے بے گناہ تھا۔ لیکن ایلی محسوس کرتا تھا کہ اس کے دل کی تہوں میں ان کی باتوں کا غور لگا ہے۔ ایلی کو اس کی شخصیت کا یہ پہلو پسند نہ تھا۔

دورا ہے سے ٹریننگ حاصل کرنے کے بعد علی پور آتے ہی شیر علی کو ایلی کی پرانی منگیتر ٹھوکی چھوٹی بہن عامرہ سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ ایک دوسرے کو خفیہ خط لکھا کرتے تھے اور لب بام کھڑے ہو کر ایک دوسرے کو دیکھتے اور اشارے کیا کرتے تھے۔ لیکن شیر علی نے اس کے متعلق کبھی کسی سے بات نہ کی تھی۔

شیر علی کو محلے والے ہمیشہ بیگانہ سمجھتے تھے۔ چونکہ وہ آمفیوں میں سے نہ تھا۔ حالانکہ محلے

اس کے سامنے ڈاکٹر ہاشم آکھڑا ہوا۔ ”یہ بچہ۔“ وہ بولا۔ ”بہت کچھ لائے گا۔ بہت کچھ“
ایلی طرف عالی۔ عالی۔“ ایلی کے کانوں میں ہاشم کی آواز گونج رہی تھی۔
”عالی۔“ ایلی نے بچے کی طرف دیکھا۔
”اور تم لڑکی۔“ ہاشم نے شہزاد کی طرف دیکھا۔ ”تم چلی جاؤ گی۔“
”ہاں مجھے معلوم ہے۔“ شہزاد نے نگاہیں جھکا لیں۔

ایلی باہر جنگلے میں نکل گیا اور کمری کی طرف دیکھنے لگا۔ شیش پر ایک گاڑی
کمری تھی۔ پلیٹ فارم پر لوگ ادھر ادھر چل رہے تھے اس کے باوجود ایسے دکھائی دے رہا تھا۔
جیسے تمام دنیا پر جمود طاری ہو۔ جیسے لوگ نیند میں چل رہے ہوں۔
عالی کی آمد کے بعد ایلی کے گھر میں ایک نئی دل چسپی پیدا ہو گئی۔ شہزاد کی بد مزاجی دور ہو
گئی۔ لڑکیاں عالی میں کھو گئیں۔ سارا دن وہ اسے کھلاتیں۔ اٹھائے پھرتیں۔ عالی کے آنے سے
گھر میں ایک بار پھر زندگی پیدا ہو گئی۔
ایک مرتبہ شہزاد اور ایلی کو لاہور جانا پڑا۔

محمود اور نقیلہ

جب وہ لاہور سے لوٹے تو شاہ وال میں محمود ان کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ان دنوں محمود بی اے کر چکا تھا۔ اب وہ لاہور میں محکمہ تعلیم کے ہیڈ آفس میں پرنسپل
تھا۔ ایلی محمود سے مل کر ہمیشہ خوش ہوتا تھا۔ وہ پرانے ساتھی تھے اور جب بھی آپس میں ملے
تھے علم و ادب کے علاوہ نفسیات پر بحث کرتے یا پرانی باتوں کو دہرا دہرا کر ہنسا کرتے۔
شام کے وقت محمود اور ایلی دونوں سیر کے لئے باہر نکل گئے۔ تو محمود نے بات چھیڑ دی۔
کنے لگا۔ ”ایلی یار تم ان لڑکیوں کی شادی کیوں نہیں کر دیتے۔ وہ اس گھر میں خوش نہیں
ہیں۔“

شادی کی بات تو خیر ٹھیک تھی۔ لیکن یہ سن کر وہ گھر میں خوش نہیں ایلی چونکا۔
”خوش نہیں ہیں۔“ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔ ”تم کیسے کہہ سکتے ہو کہ وہ خوش
نہیں۔“

محمود اپنے پر اسرار انداز سے مسکرایا۔ عورتوں کے معاملے میں اس کی شخصیت میں ایک

میں پیشتر لوگ ایسے تھے۔ جنہیں آصفی خاندان سے دور کا تعلق بھی نہ تھا۔ کیونکہ بہت سے لوگ
باہر سے آکر وہاں مقیم ہو گئے تھے۔ لیکن انہوں نے اپنے متعلق کبھی صحیح جائزہ نہ لیا تھا۔
شیر علی کے رومان کی بات باہر نکلی تو عامہ کی والدہ غصے سے بھوت بن گئی۔ اسے پہلے ہی
علی احمد کے خاندان کے خلاف شکایت تھی۔ چونکہ ایلی نے اعلانیہ اس کی بڑی بیٹی ثمرہ سے شادی
کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ حالانکہ وہ دونوں منسوب تھے اور ان کی منگنی بڑی دھوم دھام سے
ہوئی تھی۔

اب جب اسے علم ہوا کہ شیر علی جان بوجھ کر عامہ کو دہلا رہا ہے۔ تو وہ سمجھی کہ شیر علی
کا مقصد صرف اس کے گھرانے کو بدنام کرنا ہے۔

ایلی کو اس بات کا پتہ چلا تو وہ راجو سے بات کرنے کے بعد خود عامہ کی والدہ زبیدہ سے ملا
اور اس نے کوشش کی کہ زبیدہ شیر علی اور عامہ کی شادی پر رضامند ہو جائے اس پر زبیدہ کو
اور بھی غصہ آیا۔ ایلی کی اتنی ہمت کہ وہ شیر علی کا پیغام لے کر آئے جب کہ اس نے ثمرہ کے
سللے میں اس سے اس حد تک بدسلوکی کی تھی کہ آخر وہ ثمرہ کو نور علی سے بیاہنے پر مجبور ہو گئی
تھی۔ حالانکہ ثمرہ اور نور علی میں بیس پچیس سال کا فرق تھا اور نور علی کی پہلی شادی سے ایک
بیٹی تھی جس کی عمر ثمرہ سے کم نہ تھی۔

نصیر اور شیر علی بہت دیر کے بعد ایلی سے ملے تھے۔ کیونکہ شہزاد اور ایلی تو بن باسیوں کی
سی زندگی بسر کر رہے تھے اور محلے میں نہیں جاسکتے تھے۔ نصیر بڑی محبت سے ایلی کو ملا شیر علی اپنی
طبیعت کے مطابق خاموش تھا اگرچہ اس کے انداز میں رسی ادب اور اخلاق بدرجہ اتم موجود
تھے۔ وہ دونوں دو ایک روز شاہ وال رہے اور پھر واپس علی پور چلے گئے۔

ان کے جانے کے چند روز بعد ایک دن صبح سویرے ہی لڑکیوں نے ایلی کو بچایا۔ ”ایلی کی
طبیعت اچھی نہیں۔ انہوں نے کہا۔ ایلی شہزاد کی طرف گیا۔ شہزاد نے اٹھنے کی کوشش کی اور
دھڑام سے گر کر بے ہوش ہو گئی۔ ایلی گھبرا گیا۔ اور اٹھ کر ڈاکٹر کی طرف بھاگا۔ لڑکیاں
سسم گئیں۔

جب وہ ڈاکٹر کو لے کر آیا تو دیکھا کہ شہزاد چارپائی پر پڑی کراہ رہی ہے اور اس کے پاس
چارپائی پر ایک بچہ چپ چاپ پڑا ہے۔ لڑکیوں کے پاس ان کی پڑوسن بیٹی مسکرا رہی تھی۔
ایلی نے غور سے بچے کی طرف دیکھا۔

عجیب سی پراسرار تھی۔ وہ بات کھل کر نہیں کرتا تھا۔

”انہوں نے مجھے خود بتایا ہے۔“ وہ بولا۔

”خود بتایا ہے۔“ ایلی نے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ شرارتے ہوئے بولا۔ ”جب میں کل یہاں پہنچا اور مجھے معلوم ہوا کہ تم گھر نہیں ہو تو تمہاری غیر حاضری میں میں نے تمہارے ہاں ٹھہرنا مناسب نہ سمجھا۔ لیکن۔۔۔“ وہ رک گیا۔

پھر وہ خود ہی بولا۔ ”انہوں نے خود مجھے ٹھہرنے پر مجبور کیا۔ میرا مطلب ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”نو فاول پلے آفسٹ اور پھر رات کو نفیسہ میرے پاس آگئی اور دیر تک بیٹھی رہی۔ روتی رہی۔“ روتی رہی۔ ”ایلی نے پھر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”لڑکیاں سمجھتی ہیں کہ انکی زندگی تباہ ہو چکی ہے۔ اور ان کا مستقبل تاریک ہے اور وہ چاہتی ہیں کہ جلد ان کی شادیاں ہو جائیں تاکہ وہ اپنے اپنے گھر چلی جائیں۔“ محمود نے کہا۔ ”لیکن شہزاد اور میں۔۔۔۔۔ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

”اونہوں۔“ محمود بولا۔ ”تم دونوں لڑکیوں کے صرف ایک پہلو سے واقف ہو۔ تم سمجھو کہ ان کی زندگی کا ظاہری پہلو ہی حقیقت ہے۔“

”تو کیا ان کی زندگی کا کوئی اور پہلو بھی ہے۔“ ایلی نے حیرانی سے پوچھا۔

”ہاں۔“ محمود بولا۔ ”اور اسی پہلو کے تحت وہ میرے پاس آئی تھیں۔ صبیحہ اندر دروازے

میں کھڑی رہی اور نفیسہ میرے پاس آ بیٹھی اور وہ دونوں باتیں کرتی رہیں۔“

”تمہیں معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔ ”صبیحہ کے لئے رشتہ آیا تھا۔“

”ہاں وہ تاجے۔“ وہ بولا۔ ”مجھے انہوں نے سب بتایا تھا۔“

”تو پھر میں کیا کروں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”نفیسہ کا نکاح کر دو۔“ محمود بولا۔

”لیکن کس سے۔“ ایلی نے پوچھا۔

محمود مسکرایا۔ ”تمہارا بوجھ ہلکا ہو جائے گا۔ میں اس کا تمام خرچہ برداشت کروں گا اور جب تک وہ چاہے گی اسے تعلیم دلاؤں گا۔ اسے تعلیم حاصل کرنے کا بہت شوق ہے۔“

”تم۔۔۔ ایلی نے محمود کی طرف دیکھا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”میں! مجھ پر تم بھروسہ کر سکتے ہو۔“

”لیکن لیکن۔“ ایلی بولا۔ ”کیا وہ رضامند ہو جائے گی۔“

”کون۔“ محمود نے پوچھا۔

”نفیسہ اور کون۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”نفیسہ رضامند ہے۔“ محمود نے کہا۔ ”بلکہ وہ خود چاہتی ہے اور میں اسی کے کہنے پر تم بات کر رہا ہوں۔“

ایلی کو دھچکا سا لگا۔ اسے محمود کے خلاف شکایت نہ تھی اسے لڑکیوں پر حیرت تھی ”دیکھو۔۔۔“ وہ بولا۔ ”مجھے کوئی اعتراض نہیں بشرطیکہ نفیسہ اس بات کی خواہاں ہو اور اگر وہ یہاں ہے تو شہزاد کو میں منالوں گا۔“

محمود کے جانے کے بعد ایلی نفیسہ کو ایک طرف لے گیا۔

”نفیسہ۔“ اس نے بات شروع کی۔ ”نفیسہ ایک بات بتاؤ مجھے۔“

نفیسہ نے پراسرار نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

”شرمانے کی کوئی بات نہیں۔“ وہ بولا۔ ”جو بھی تمہاری صحیح رائے ہو وہ مجھے بتا دو چونکہ میں تمہاری رائے کے بغیر تمہاری رضامندی کے بغیر کچھ نہ کروں گا۔“

نفیسہ نے آنکھیں جھکا لیں۔

”کیا تم چاہتی ہو کہ تمہاری شادی کر دی جائے۔“

وہ چپ چاپ بت بنی کھڑی رہی۔

”اگر تمہاری شادی محمود سے کر دی جائے تو تمہیں اعتراض تو نہ ہو گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

نفیسہ جوں کی توں چپ چاپ کھڑی رہی۔

”جواب دو نا۔“ وہ بولا۔

وہ خاموش رہی۔

”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”اگر تم نے کوئی جواب نہ دیا تو میں سمجھوں گا کہ تم رضامند ہو۔“

وہ جوں کی توں خاموش کھڑی رہی۔

”اچھا۔“ ایلی نے کہا۔ ”تو فکر نہ کرو میں کروں گا کہ تمہاری شادی محمود سے ہو

بلکہ فکر نہ کرو میں تمہارا ساتھ دوں گا۔“

اس شام وہ بغور نفیسہ کی حرکات و سکنات کو دیکھتا رہا اور اس نے محسوس کیا کہ غیر خوش تھی۔

اسی رات جب ایلی نے شہزاد سے بات کی تو وہ مجرمی بولی۔ ”کیا ہر تنہو خیرا کے لئے میری ہی لڑکیاں رہ گئی ہیں۔“ ایلی نے التڑتا اسے حالات سے آگاہ نہ کیا تاکہ نفیسہ کی شکایت کا پلو نہ نکلے۔

ایلی کو محمود اور نفیسہ کی شادی سے قطعی کوئی دلچسپی نہ تھی۔ وہ اس سلسلے میں صرف اس لئے کوشش کر رہا تھا کہ نفیسہ چاہتی تھی کہ وہ محمود کی ہو جائے۔ ایلی نے شہزاد کو سمجھایا بجھایا اور رضامند کر لیا۔

نتیجہ یہ ہوا کہ ایک روز محمود کا نفیسہ سے نکاح ہو گیا۔

محمود ایلی کے گھر میں دس روز نفیسہ کے ساتھ رہا پھر اس نے نفیسہ کو زناٹے بورڈنگ ہاؤس میں داخل کرا دیا چونکہ نفیسہ کا مطالبہ تھا کہ اسے بورڈنگ میں داخل کرا دیا جائے تاکہ وہ بورڈنگ میں محنت کر سکے اور دسویں پاس کر لے۔

جب دسویں کا امتحان ہو چکا تو محمود نفیسہ کو لینے کے لئے آگیا اس نے اسے لاہور کالج میں داخل کرانے کے جملہ انتظام کر رکھے تھے۔

جب ایلی نفیسہ کو بورڈنگ سے لینے گیا تو نفیسہ نے آنے سے انکار کر دیا۔ پھر سکول کی استائیاں اکٹھی ہو گئیں اور وہ ایلی کو برا بھلا کہنے لگیں۔ ان کی باتوں سے مترشح ہوتا تھا کہ وہ سمجھتی تھیں کہ نفیسہ کی شادی زبردستی کی گئی تھی۔

ایلی حیران تھا۔ اسے کچھ سمجھ میں نہ آ رہا تھا۔ غصے کی وجہ سے اس کا ذہن شل ہو چکا تھا۔ اس نے شور مچا دیا حتیٰ کہ سکول کی عزت کے خیال سے انہیں نفیسہ کو باہر بھیجنا ہی پڑا۔ ایلی نے اس کا بازو تھام لیا اور اسے سمجھانے لگا۔ ”یہ کیا حماقت ہے نفیسہ! تمہاری شادی ہو چکی ہے تم دس روز اکٹھے رہ چکے ہو اور اب ——— لیکن یہ شادی تو تمہاری رضامندی سے کی گئی تھی۔“ نفیسہ نے چلتے چلتے زور سے جھکا مارا اور ہاتھ چمڑا کر بورڈنگ کی طرف بھاگی۔

طلاق

جب وہ گھر پہنچا تو شہزاد یوں کھڑی تھی۔ جیسے شیرینی کچھار میں کھڑی ہو وہ غصے سے کانپ

رہی تھی۔ ”اگر اپنا بھلا چاہتے ہو“ وہ بولی ”تو ابھی میری بیٹی کو طلاق دلاؤ۔ ورنہ۔“

”تو کیا تم بھی ———“ وہ شہزاد کی طرف حیرانی سے دیکھنا لگا۔

”تم نے میری بیٹی کو ایک بد معاش کے ہاتھ بیچا ہے۔“ شہزاد بولی۔

”یہ تم کہہ رہی ہو۔“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں میں کہہ رہی ہوں۔“ شہزاد بولی۔

”تم نے اپنی بیٹی سے پوچھا ہے کیا۔“

”میں سب جانتی ہوں۔“ وہ بولی۔

شہزاد کے عقب میں صبیحہ اور رحمانہ کھڑی مسکرا رہی تھیں۔

فرش پر عالی بیٹھا کنگنا رہا تھا۔ ”ابو، ابو۔“

شہزاد گھر سے باہر نکل گئی۔ وہ بورڈنگ کی طرف جا رہی تھی۔

”غصہ میں نہ آؤ۔“ محمود ایلی کے پاس آکھڑا ہوا۔

”تم جاؤ محمود۔“ وہ بولا۔ تمہارا میاں رہتا ٹھیک نہیں۔ نہ جانے یہاں کیا ہونے والا ہے تم

پلے جاؤ۔“

”کیوں۔“ وہ بولا۔

”بات بڑھ جائے گی۔“ ایلی نے کہا۔ ”بہت بڑھ جائے گی اگر تم یہیں رہے تو۔“

”ہوں یہ تو ٹھیک ہے۔“ محمود نے لپک کر اپنا سوٹ کیس اٹھالیا۔

”میں تمہیں اطلاع دوں گا۔“ ایلی نے کہا۔ محمود چپ چاپ گھر سے نکل گیا۔

ایلی صحن میں دیوانہ وار گھوم رہا تھا۔ وہ شہزاد کے انتظار میں بیٹھا تھا۔ اسے سمجھ میں نہیں آ

رہا تھا کہ آخر وہ سب یک لخت کیوں بدل گئے تھے۔ آخر کیا وجہ تھی۔ وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے

وہ سب کچھ جو ہو رہا تھا۔ ایک سوچے سمجھے پلان کے مطابق ہو رہا تھا۔ لیکن کیوں؟ وہ سوچ رہا

تھا اس کا مقصد کیا تھا؟ اسے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔

رات کے بارہ بج چکے تھے۔

باہر محلہ سنسان پڑا تھا۔

دور کتے بھونک رہے تھے۔

کمرے میں لڑکیاں کانپھوسی کر رہی تھیں۔

پلنگزی پر عالی بیٹھا بیٹھا سو گیا تھا۔ اس کا منہ ایللی کی طرف تھا۔
دفعۃً "شہزاد داخل ہوئی۔ اس کے ساتھ نفیسہ تھی اور سکول کی ایک ادیبز عمر کی
استانی۔

ایللی انہیں چپ چاپ دیکھتا رہا۔

شہزاد خاموش تھی۔ نفیسہ آتے ہی لڑکیوں کے کمرے میں داخل ہو گئی۔ انہوں نے
اندر سے کنڈی لگالی۔

استانی بولی۔ "بہتر یہی ہے کہ آپ لڑکی کا فیصلہ کرا دیں۔" اس کا روئے غن ایللی کی طرف
تھا۔

"آپ سمجھتی ہیں کہ لڑکی کی شادی زبردستی کی گئی ہے۔" ایللی نے پوچھا۔

"لڑکی یہی کہتی ہے۔" وہ بولی۔

"اور وہ ٹھیک کہتی ہے۔" شہزاد بولی۔ "لڑکی کو دھوکے سے پھانس لیا گیا ہے۔"

"لڑکی کو میرے سامنے بلا کر پوچھ لیجئے۔" ایللی نے استانی سے کہا۔

"وہ سامنے نہیں آئے گی۔" شہزاد دونوں ہاتھ کر پر رکھ کر ایللی کے سامنے کھڑی ہو گئی۔

"کیوں۔" ایللی نے پوچھا۔

"بس نہیں آئے گی۔" وہ غرائی۔

"کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔" ایللی نے استانی سے کہا۔ "میں نے یہ رشتہ لڑکی کی نشا کے

مطابق کیا ہے۔ بلکہ اس کے اشارے پر کیا ہے۔ کیا آپ کو مجھ پر اعتماد نہیں۔"

"بالکل غلط ہے۔" شہزاد بولی۔ "بالکل غلط۔ یہ شادی ایک سازش تھی۔ بہتر یہی ہو گا کہ

فوراً اسے طلاق دلا دی جائے۔"

"ورنہ —" ایللی بولا۔

"ورنہ میں طوفان کھڑا کر دوں گی۔" شہزاد چلائی۔

"ہوں۔" ایللی بولا۔ "طلاق مل جائے گی لیکن ہمارا آپس میں کوئی سببندہ نہیں رہے گا۔

تمہیں منظور ہے۔"

اس نے پوچھا۔

"منظور ہے۔" شہزاد نے جواب دیا۔

ایللی اندر چلا گیا۔ اس نے سوٹ کیس میں اپنے کپڑے بند کئے اور پھر سوٹ کیس اٹھا کر باہر
آیا۔ "آئیے۔" وہ استانی سے کہنے لگا۔ "میں آپ کو بورڈنگ تک چھوڑ آؤں۔"

شہزاد نے ایک مرتبہ حیرت سے ایللی کی طرف دیکھا۔ شاید وہ سمجھتی تھی کہ ایللی خالی دھمکی

دے رہا ہے۔

"طلاق تمہیں مل جائے گی۔" ایللی نے دہرایا۔ "خرج بھی ملتا رہے گا۔ حسب توفیق۔"

"لیکن آپ جائیں گے کہاں۔ اس وقت۔" استانی نے پوچھا۔

"میں ایسے گھر میں نہیں رہ سکتا جہاں اپنی مرضی سے شادی کرنے کے باوجود دس دن کے

الوداع طلاق مانگی جائے۔" ایللی نے جواب دیا۔

شہزاد دونوں بازو کولہوں پر رکھ کر صحن میں کھڑی ہو کر ایللی کو گھورنے لگی۔

"ایسا نہ کیجئے۔" استانی نے کہا۔

"تو کیا یہاں رہ کر بے عزتی کی زندگی بسر کروں۔" وہ بولا۔

"اب تو عزت والے بن بیٹھے ہو۔" شہزاد چلائی

"لڑنا بیکار ہے۔" وہ بولا۔ "صرف ایک بات پوچھتا ہوں کیا تم طلاق مانگتی ہو۔ تم چاہتی ہو

نفیسہ طلاق لے لے۔"

"چاہتی۔" وہ غرائی۔ "میں دیکھوں گی کہ کیسے نہیں ہوتی طلاق۔" اس کی کیا وجہ ہے۔" ایللی

پوچھا۔

"تمہیں اس سے کوئی تعلق نہیں۔" وہ غرائی۔

"اچھا۔" وہ بولا۔ "مجھے کوئی تعلق نہیں تو خدا حافظ۔" ایللی باہر نکل گیا۔

ابو۔ ابو۔ "عالی سوتے سوتے جاگ پڑا۔" ابو۔ "وہ رو رہا تھا۔ ایللی بھاگ رہا تھا

اسے ڈر تھا کہ کہیں عالی کی چٹیں سن کر وہ واپس جانے پر مجبور نہ ہو جائے۔ ابو ابو

ایک چکی ہو تک رہی تھی۔

ابو۔ ابو ریل نہ جانے کدھر جا رہی تھی۔ وہ ہاتھوں میں سر دبائے چپ چاپ ڈبے میں بیٹھا

”نکٹ تو نہیں۔“ وہ بولا۔

”کہاں جاتا ہے۔“ بابو نے پوچھا۔

”شاہوال سے آیا ہوں۔“ وہ بولا۔

”جاتا کہاں ہے۔“ بابو چلایا۔

”یہ گاڑی کہاں جائے گی۔“ ایللی نے پوچھا۔

بابو نے تعجب سے ایللی کی طرف دیکھا۔ کیا تمہیں معلوم نہیں کہ کہاں جاتا ہے۔“

”مجھے۔“ وہ بولا۔ مجھے تو کہیں بھی نہیں جانا۔“

اس کے ہمراہی مسافر تفتہ دار کرہنس رہے تھے۔

”تو گاڑی پر سوار کیوں ہوئے۔“ بابو بولا۔

”پتہ نہیں۔“ ایللی گویا اپنے آپ سے کہنے لگا۔

”کراریہ نکالو۔“ بابو نے کاپی کھولتے ہوئے کہا۔

ایللی نے جب ٹٹولی۔ اس کی جیب میں صرف سات روپے آٹھ آنے تھے۔

”میرے پاس صرف یہ ہیں۔“ ایللی نے کہا۔

بابو نے بغور اس کے چہرے کی طرف دیکھا۔ ”کیا ہے تمہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”کچھ بھی نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

بابو اس کے پاس بیٹھ گیا۔ ”تم عادی بے کٹے نظر نہیں آتے۔“

”جی نہیں۔“ ایللی بولا۔ ”میری طبیعت ٹھیک نہیں۔“

”اچھا تو پھر اگلے شیش پر اتر جانا۔“

”جی اچھا۔“

بابو نے اپنی کاپی بند کر لی اور چپ چاپ بیٹھا رہا۔ ایللی پھر اپنے خلا میں کھو گیا۔

اگلے جنکشن پر بابو نے اسے پھر جھنجھوڑا۔ ”چلو اترو۔“ وہ بولا۔

ایللی نے سوٹ کیس اٹھایا اور پلیٹ فارم پر اتر گیا۔

”اب کہاں جاؤ گے۔“ بابو نے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”والہاں شاہوال کیوں نہیں جاتے۔“

انجام

کہاں جاؤں

ایللی چپ چاپ گاڑی کے ڈبے میں بیٹھا تھا۔ کھڑکی سے باہر اندھیرے کو گھور رہا تھا۔ اتر

ذہن ایک وسیع خلا میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اسے کچھ بھی یاد نہ رہا تھا۔

شہزاد کو خدا حافظ کہنے کے بعد وہ بلا سوچے سمجھے شیش کی طرف چل پڑا تھا۔ آدمی رات

عالم تھا۔ اس وقت وہ ریلوے شیش کے سوا کہاں جا سکتا تھا۔ اس لئے ان جانے میں وہ ادھر چلا

دیا۔ اور وہاں پہنچ کر پلیٹ فارم کے بیچ پر بیٹھ گیا۔

پھر نہ جانے کب گاڑی آگئی اور نکٹ لئے بغیر سوچے سمجھے بغیر وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ گاڑی

چل پڑی اور وہ بت بنا بیٹھا رہا۔

اس نے شانے پر دباؤ محسوس کیا۔ وہ چونکا۔ پاس ایک وردی پوش ابو کھڑا تھا۔ ایللی نے با

کی طرف دیکھا۔

نکٹ بابو نے کہا: ”نکٹ۔“

”نکٹ۔“ ایللی نے تعجب سے دہرایا۔

اس وقت اسے احساس ہوا کہ وہ ریل گاڑی میں بیٹھا ہے۔

”ہاں نکٹ۔“ ایللی نے پھر دہرایا اور جیب ٹٹولنے لگا۔ کچھ دیر کے بعد اسے یاد آیا کہ اس

کے پاس تو کوئی نکٹ نہیں ہے۔

ایلی نے نفی میں سر ہلادیا۔

پھر وہ پلیٹ فارم پر ایک بیچ پر جا بیٹھا۔ بابو اسے دور کھڑا دیکھتا رہا۔ گاڑی چل پڑی۔ ایلی جوں کا توں بت بنا بیٹھا رہا۔ یہ دیکھ کر بابو پھر سے گاڑی پر چڑھ گیا۔

دیر تک ایلی وہیں بیٹھا رہا۔

بچے کے رونے کی آواز سن کی ایلی چونکا۔ ذہن میں حرکت سی ہوئی۔

”ابو ابو ——— عالی اس کی طرف ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پھر دھندلکے سے ایک شکل ابھری: ”تم نے میری بیٹی کو بیچا ہے۔“ کوئی چلائی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے کسی نے اس کے سینے میں کناری سی بھونک دی ہو گھبرا کر اٹھ بیٹھ اور چائے کے شال پر کھڑا ہو کر چائے پینے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہاں جاؤں میں؟ کہاں جاؤں؟

اس کے روبرو محمود آکھڑا ہوا۔ ”اونسوں۔“ وہ بولا۔ ”غصے میں نہ آؤ۔“

”محمود۔“ کسی نے اس کے کان میں کہا۔ ”محمود جو ہے۔“

”اونسوں۔“ ایلی نے نفی میں سر ہلایا۔

علی پور۔ رفتی۔ خانپور ——— اس کی کانوں میں آوازیں آنے لگیں لیکن وہ نہ تو علی پور جانے کے لئے تیار تھا نہ لاہور نہ خانپور۔

”کہاں جاؤں۔ کہاں جاؤں؟“ گاڑی ہوکتی ہوئی پلیٹ فارم میں داخل ہو رہی تھی۔

ایلی کی توجہ گاڑی کی طرف منعطف ہو گئی۔ صبح کا وقت تھا۔ سردی زوروں پر تھی۔ گاڑی کی تمام کھڑکیاں بند تھیں۔ اندر دھندلی دھندلی بتیاں جھلما رہی تھیں۔ مسافر کمبلوں اور چادرول میں لپٹے انگوٹھ رہے تھے۔

دغتاً اس کی نگاہ گاڑی کی پلیٹ پر پڑی: ”راجواڑہ پنجر۔“

”راجواڑہ۔“ اس نے محسوس کیا جیسے وہ نام مانوس ہو۔ وہ سوچنے لگا۔ ڈاکٹر خلیق اس کے

روبرو آکھڑا ہو:

”الیاس صاحب۔ کبھی میرے پاس راجواڑہ آؤ۔“ وہ مسکرایا۔

”ہاں۔“ ایلی کو یاد آیا۔ اس کا ناموں زاد بھائی خلیق راجواڑے کے ہسپتال میں نوکر تھا۔ ایلی

چپکے سے باہر نکلا۔ اس نے راجواڑے کا ٹکٹ خریدا۔ اور پھر سے اندر آکر گاڑی میں بیٹھ گیا۔

بوندا باندی

ایلی کو دیکھ کر خلیق حیران رہ گیا۔

”ارے الیاس بھائی ہیں۔“ اسے یقین نہ آتا تھا کہ الیاس اسے ملنے راجواڑے آیا ہے۔

بہن دلو۔“ وہ چلانے لگا۔ ”یہ تو بڑی خوش قسمتی کی بات ہے۔ مجھے بے حد خوشی ہوئی ہے حد۔

یہ خیال بھی نہ تھا کہ کسی روز الیاس آئیں گے۔ بڑی مہربانی کی بڑی عنایت ہے۔“

دیر تک خلیق چلاتا رہا۔ اظہار خوشی کرتا رہا۔ پھر دغتاً اس نے محسوس کیا کہ ایلی وہ ایلی

لی۔ نہ جانے کیا بات ہے۔

”لیکن۔“ وہ چلایا۔ ”خیریت تو ہے۔“

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کوئی بات تو نہیں۔“ خلیق نے پوچھا۔

”کوئی بات نہیں۔“ ایلی نے ناامیدی اور مایوسی سے کہا۔

”آپ کی طبیعت تو اچھی ہے۔“ وہ بولا۔

”ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

ایلی نے فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی آمد کی وجہ نہیں بتائے گا۔ ایلی کو خلیق پر پورا اعتماد تھا۔ وہ

بات سے پورے طور پر واقف تھا کہ خلیق کے دل میں ایلی کے لئے محبت ہے اور اس محبت

کا احترام کا عنصر شامل ہے اور خلیق کسی واقعہ پر بھی ایلی سے بدظن نہیں ہو سکتا۔ پھر نہ جانے

ایلی بات چھپانا چاہتا تھا کہ وہ شہزاد سے قطع تعلق کر کے چلا آیا ہے۔ اسے یہ بات کہنے کی

ات نہ پڑتی تھی۔ شاید وہ محسوس کرتا تھا کہ اس نے ارتکاب جرم کیا ہے۔

خلیق سمجھ گیا کہ کوئی بات ہے جس کا اظہار نہیں کرنا چاہتا اور دیکھی ہے۔ چپ لگی ہے۔

کچھ بعد وہ یوں خاموش ہو گیا جیسے کوئی بات نہ ہو۔ جیسے وہ کچھ سمجھا ہی نہ ہو اور ایلی کا دل

لٹنے کے لئے اس نے ادھر ادھر کی باتیں چھیڑ دیں۔

”الیاس صاحب۔“ وہ بولا۔ ”ایسی اچھی جگہ ہے یہ راجواڑہ کہ کیا بتاؤں۔ تاریخی اہمیت کا

ہے۔ اگرچہ چھوٹا سا ہے لیکن مطالعہ کے لئے لاجواب شہر ہے۔“

پھر وہ ایلی کو شہر لے گیا۔

”یہ دیکھئے یہ راجواڑے کے محلات ہیں۔ منہدم ہو چکے ہیں پھر بھی واضح آثار ہیں اور یہ

نقشہ ہے اس کے نیچے منوں سونا اور چاندی ہے اور نہ جانے کیا کیا۔ حکومت یہ آثار کھودنے پر

۔ زہنی حالت شدید بحران کی غماز ہے۔

دبیل سنگھ

راجواڑے میں پہلا وہ واقعہ جس نے ایللی کی توجہ کو خارجی دنیا کی طرف منعطف کیا راجپل متعلق تھا۔ راجپل سنگھ ایک قوی پیکل سنگھ تھا۔ وہ راجواڑے کی ایک بہتی میں رہتا تھا۔ ایک روز جب ایللی اور خلیق شام کے وقت کواڑ سے باہر میدان میں بیٹھے تھے تو راجپل آگیا۔ آتے ہی وہ لڑکھایا، مگر اور پھر سنبھل کر بیٹھ گیا۔ اس کے اوسان خطا ہو رہے تھے۔ پل اڑی ہوئی تھیں اور وہ مشکل سے سانس لے رہا تھا۔

خلیق گھبرا کر اٹھ بیٹھا: ”کیوں کیا بات ہے۔“ وہ چلایا۔

راجپل بیٹھا لے لے سانس لے رہا تھا اس نے ڈاکٹر کی بات کا کوئی جواب نہ دیا۔

”تم بیمار ہو کیا؟“ ڈاکٹر نے اس کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔

”اومسوں۔“ راجپل نے نفی میں سر ہلا دیا۔ ”اچھا بھلا ہوں ڈاکٹر۔“ وہ بولا۔

”تو پھر بات کیا ہے۔“

راجپل نے اشارہ کیا۔ ”ابھی بتاتا ہوں۔“

دیر تک وہ باتوں میں سر تھاے بیٹھا رہا۔

”ڈاکٹر۔“ وہ کچھ دیر کے بعد بولا۔ ”میری زندگی کا کوئی بھروسہ نہیں۔“

”وہ تو کسی کی زندگی کا بھی نہیں۔“ خلیق ہنسا۔

”نہیں ڈاکٹر۔ یہ اور بات ہے۔“ راجپل بولا۔ ”بات یہ ہے کہ ایک نایک راج نامی

نے کلٹ کر چھوڑے گی۔“

”نامی“ ڈاکٹر نے پوچھا۔

”ہاں۔ میں نے مکتی سے ایک راج اس کے زکو مار دیا۔ وہ دونوں نمر کے کنارے کھڑے

نے پراگئی اوٹ میں تھی سو مجھے دکھائی نہ دی۔ دکھائی دے جاتی ڈاکٹر تو میں انہیں کچھ نہ کہتا۔

اگر اور نامی اکٹھے ہوں تو انہیں کچھ نہ کہنا چاہئے۔ جو ایک مرجائے تو دوسرا بدل لے بغیر نہیں

موت لے اکیلا ناگ ہو چاہے نہ ہو یا مادہ جو چاہے کرو۔ چاہے وہ مرجائے چاہے جھنجھی ہو جائے۔

ایک بات نہیں۔

غور کر رہی ہے اور یہ دیکھتے یہ پرانے بانٹ ہیں۔ مغلیہ وقت کے کسی زمانے میں یہاں گورنر رہتا تھا۔ بڑے ٹھانڈے تھے اس زمانے میں راجواڑے کے۔ بے حد زرخیز جگہ ہے ناس لے اتے بانٹ تھے یہاں کہ اسے بالغ بہتی کہتے تھے۔ یہ نام تو اب رکھا گیا ہے۔ پہلے اسے بالغ بہتی کہا جاتا تھا۔ یہاں ہر قسم کا میوہ آتا تھا۔ بس ایک ہی وقت ہے یہاں سانپ بہت ہیں۔“

ایللی خلیق کی باتیں سنے بغیر ہوں ہوں کہتا رہا اور بانٹ دیکھے بغیر بہت خوب کہہ دیا۔ دراصل ایللی راجواڑہ میں ہوتے ہوئے راجواڑہ میں نہ تھا۔ وہ ان دنوں کہیں بھی نہ تھا۔ نہ شاہوال میں نہ کہیں اور۔ اس کے ذہن میں وہی خلا پھیلا ہوا تھا۔ یوں محسوس کرتا تھا جیسے کوئی خواب میں چل پھر رہا ہو۔ نگاہ میں چاروں طرف ایک دھند کا چھایا ہوا تھا۔ گرد و پیش اس دھند کے میں اوٹھتے ہوئے معلوم ہوتے تھے۔ چیزوں میں وضاحت نہ تھی۔ حرکات بے جان اور غم آلود دکھائی دیتی تھیں جیسے سلوموڈنٹ فلم چل رہا ہو۔ بازاروں میں دوکان دار اوٹھتے دکھائی دیتے تھے۔ راہ گیر چلتے نہ تھے بلکہ لڑھکتے تھے۔ آہستہ آہستہ بے جان بے عزم طبعی طور پر ایللی کے غم کے کوائف ہی مختلف تھے۔ شدت غم میں اس کا ذہن خلا میں بدل جاتا۔ دھندلا چاروں طرف دھند کا چھا جاتا۔ پھر غم بوند بوند اس کے دل کی گہرائیوں میں گرتا۔ بوند بوند۔ بوند بوند۔ اور وہ بوند باندی لگی رہتی۔ دنوں، ہفتوں، مہینوں۔

ایللی کو صرف ایک ڈر تھا کہ کہیں خلیق راجواڑہ میں اس کی آمد کے متعلق کسی کو خبر نہ کر دے۔ اگر اس نے خبر کر دی تو مشکلات پیدا ہو جائیں گی۔ وہ اچھی طرح سے جانتا تھا کہ شزاو اسے مٹانے نہیں آئے گی لیکن ممکن ہے لوگ اسے سمجھانے کے لئے آجائیں۔ وہ راجواڑے میں صرف اس لئے آیا تھا کہ کسی کو خیال بھی نہ آئے گا کہ وہ راجواڑے میں ہے۔ اس نے کپور کو بھی کوئی خط نہ لکھا تھا تاکہ شاہوال میں کسی کو علم نہ ہو کہ وہ راجواڑے میں مقیم ہے۔ اس نے اپنی چھٹی کی عرضی سراب کے نام بھیج دی تھی۔ جس میں ایک خط ملفوف کر دیا تھا کہ اس کی تنخواہ اس کے گھر شزاو کو بھجوا دی جائے۔ یہ عرضی اس نے آر ایم ایس میں پوسٹ کی تھی۔

خلیق ہر وقت ایللی کے ساتھ رہتا تھا۔ جب وہ ہسپتال جاتا تو ایللی کو ساتھ لے جاتا۔ اسے اپنے کمرے میں بیٹھاتا۔ اس کی جملہ ضروریات کا خیال رکھتا اور اگر اسے کسی مریض کو دیکھنے کے لئے جانا ہوتا تو بھی ایللی کو ساتھ لے جاتا۔ وہ سمجھتا تھا کہ ایللی کو اکیلے چھوڑنا خطرے سے خالی نہیں چونکہ چند ہی روز میں خلیق کو یقین ہو چکا تھا کہ ایللی کی کیفیت معمولی سے بہت کمزور

”ہوں۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”تو پھر۔“

”پھر کیا۔ میں نے موقع پا کر ایک لٹھ مار دی۔ زروں چٹ ہو گیا۔ اب جو دکھتا ہوں ڈاکٹر تو بوٹے کی اوٹ میں مدین ناگنی ہے۔ بس اسے دیکھتے ہی پسینہ آ گیا۔ بس ڈاکٹر۔ وہ روج اور آج کا روج ہے۔ جب باہر جاؤں تو مجھے پتہ ہوتا ہے کہ ناگنی دور نہیں۔ کہیں پاس ہی ہے۔ خبردار رہتا ہوں۔ لاشی بنا باہر نہیں جاتا۔ ایک لمٹ کے لئے بے خبر ہو جاؤں تو سمجھ لو معاملہ کھتم ہو گیا۔“ وہ خاموش ہو گیا۔

کچھ دیر کے بعد بولا:

”دن کے سے تو کوئی بات نہیں۔ ناگنی چلاک ہے تو اپنے باجوؤں پر جی جو رہے۔ جو پاس آئے گی تو چھوڑتا میں بھی نہیں۔ پر رات جو باہر جاتے تو سمجھ لو پھر وہ مجھے شرمینے نہیں دے گی۔ آج کچھ دیر ہو گئی تھی۔ قدم قدم پر میرے ساتھ رہی وہ۔ میں بھاگ۔ وہ بھی بھاگی۔ بس سمجھ لو گرد کی مہربانی ہے جو سلامت پہنچ گیا ورنہ آج کوئی صورت نہیں تھی پہنچنے کی۔“ وہ لمبے سانس لینے لگا۔

”تو میں اس بات میں تمہاری کیا مدد کر سکتا ہوں۔“ ڈاکٹر نے کہا۔

”بس ایک بات ہے۔“ وہ بولا۔ ”دو سلاخیاں اس سرے کی دید مجھے صرف دو سلاخیاں۔“

”سرے کی۔“ ڈاکٹر نے حیرانی سے کہا۔

”ہاں۔ وہ جو کمپنی والوں کے پاس سرمہ ہے سانپ کے کاٹے کا۔“

”سرمہ ہے۔“ ایلی نے حیرت سے پوچھا۔ ”سانپ کے کاٹے کا سرمہ۔“

”ہاں بابو۔“ راجپل بولا۔ ”جس کو ناگ کاٹ جائے یا کیرا سوگت جائے اس کی آنکھ میں

سرے کی سلاخی لگا دیتے ہیں۔ بس سارا جہر بھسم ہو جاتا ہے۔“

”ارے۔ کیا یہ سچ ہے“ ایلی نے خلیق سے پوچھا۔

”پتہ نہیں۔“ خلیق نے جواب دیا۔

”بالکل سچ ہے ڈاکٹر ارجی۔“ راجپل بولا۔

”تو پھر تم کمپنی والوں سے کیوں نہیں مانگتے۔“

”وہ نہیں دیتے بابو جی۔ وہ نہیں دیتے۔ ڈاکٹر انہیں کہیں تو شاید دے دیں۔ میرے کہنے

پر نہیں دیتے۔“ راجپل نے کہا۔

”اچھا۔“ ڈاکٹر بولا۔ ”میں ان سے کہوں گا۔ تم کل پتہ کرنا۔“

راجپل کی بات پر پہلی مرتبہ ایلی کا وہ غلاوٹ گیا۔ راجپل کی بات نے اس کی تمام توجہ کو ہٹا لیا۔ اس کے دل میں بیسیوں سوالات پیدا ہوئے۔ کیا واقعی بارہ زکا انتقام لیتی ہے؟ کیا وہ ان کا چچا کرتی ہے۔ کیا سانپ بھی سوچنے کی اہلیت رکھتے ہیں۔ اور چالاکی سے وار کرتے ہیں کیا سانپ کے کاٹے کا علاج سرمہ بھی ہو سکتا ہے۔

مدد کیرا

”سانپوں کی زندگی بے حد پراسرار ہے“ خلیق نے کہا۔

”ہاں“ وہ بولا۔ ایلی کو باہر کا واقعہ یاد آ گیا۔

یہ ان دنوں کی بات تھی۔ جب ایلی علی پور میں شارٹ ہینڈ کی تعلیم حاصل کر رہا تھا۔ اس دن میں وہ بیشتر وقت شنزاد کے چوہارے میں بسر کیا کرتا تھا۔

ایک روز باہرہ نیچے تہ خانے میں اتر گئی اور دیر تک وہاں رکھی ہوئی چیزوں کو ٹھیک ٹھاک لٹا رہی تہ خانے میں وہ دوسرے چوتھے روز جایا کرتی تھی۔ انہوں نے گھر کا کٹھ کبار دیں دیکھا ہوا تھا۔

باہرہ تہ خانے سے واپس آ کر سیدھی شنزاد کی طرف گئی۔ نہ جانے اسے کیا کام تھا۔ وہ کوئی باقی کر رہی تھی کہ دفعتاً اس نے اپنی شلوار میں کوئی حرکت محسوس کی اور اپنا ہاتھ ادھر بٹایا۔ پھر باہرہ نے ایک لمبی چیخ ماری اور دھڑام سے زمین پر گر پڑی۔ ایلی اور شنزاد حیرانی سے مائی طرف دیکھ رہے تھے۔ چیخ سن کر راجہ اور جانو بھاگی بھاگی اوپر آئیں۔

وہ سب باہرہ کی طرف لپکے۔

”ہائیں۔“ وہ حیران رہ گئے۔ باہرہ کا منہ نیلا ہو چکا تھا۔ جیسے کسی نے نیلی سیاہی انڈیل دی

دھندھی منٹوں میں سارا محلہ اکٹھا ہو گیا۔

”کیا ہوا۔ کیا ہوا۔“ محلے والیاں چلانے لگیں۔

”ہے۔ یہ تو نیلی ہو گئی۔“ ایک بولی۔

”لیکن ہوا کیا ہے بن؟“

”کیا پتہ کیا ہوا ہے۔ بس ایک چیخ مار کر بے ہوش ہو گئی ہے۔“

مجھے کیا ہوا۔ پھر جب میں ہوش میں آئی تھی تو بھی میں نے محسوس کیا تھا جیسے کسی نے لٹھے سے سر پر دے ماری ہو۔“

ہاجرہ بالکل صحت مند ہو گئی۔ اس کے بعد کئی ایک سال تک اگر اسے کوئی بھڑیا کوئی زہریلا در کانا تو معاں مر جاتا اور ہاجرہ کے جسم پر اس کا کوئی اثر نہ ہوتا۔

پھر ایک روز ان کالی مرجوں کے دان کے اثر کا راز بھی کھل گیا جو سپیرے نے شہزاد کو بطور زدی تھیں اور جن میں سے شہزاد نے صرف دو تین چبائی تھیں۔

ایک روز شہزاد کی انگلی پر بھڑکٹ گئی۔ شدت درد سے بلبل اٹھی۔ اتفاقاً اس نے وہ انگلی میں ڈال لی۔ دھشتا درد عتاب ہو گیا۔ وہ بے حد حیران ہوئی۔ اس کے بعد نہ تو انگلی سوجی اور ہی درد ہوا۔

پھر ایک روز ریحانہ کو بھڑنے کاٹا تو شہزاد نے آزمانے کے لئے اس جگہ اپنا لب لگا دیا۔ بلانہ کو فوراً آرام آ گیا۔ پھر دھشتا اسے خیال آیا کہ شاید ان کالی مرجوں کا اثر ہوا اور وہ بوس کرنے لگی کہ اس نے ساری مرجیں کیوں نہ کھائیں۔

ایلی کو وہ سب واقعات یاد آ گئے۔ اس کی نگاہ تلے شہزاد آکھڑی ہوئی۔ اس کی پیشانی پر وہ لڑا شربی قلیوں روشن تھا جیسے دیا جل رہا ہو۔ سپیرا رک گیا میری طرف دیکھ لڑکی۔“ وہ بولا۔

زے ماتھے پر تو نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔“

پھر شہزاد شاہوال کے گھر میں کھڑی تھی۔ اس نے دونوں ہاتھ کولوں پر رکھے ہوئے تھے۔

نے کی بندی گل ہو چکی تھی۔ اس کی دونوں آنکھیں انگاروں کی طرح دھک رہی تھیں۔

”میں دیکھوں گی کس طرح تم اسے طلاق نہیں دلواتے۔“

یہ شہزاد اس شہزاد سے کس قدر مختلف تھی۔

شاید وہ محض ایک رنگیلی محبوبہ تھی۔ اس میں بیوی بننے کی صلاحیت نہ تھی۔ ایلی سوچ رہا تھا اس روز پہلے دن اس نے شہزاد کے متعلق سوچا تھا۔ ورنہ جب سے وہ راجاؤں سے آیا تھا اگر سے شہزاد کا خیال بھی آتا تو اس قدر دکھ محسوس ہوتا کہ وہ اس خیال کو دل کی اقامت گرائیوں میں ڈالتا۔ اس روز رات کو سونے سے پہلے اس کا جی چاہتا تھا کہ چچ چچ کر رو دے لیکن خلیق کی قدر کی مانع تھی۔ اس لئے اس نے چپکے چپکے چند آنسو بہائے۔ ہر صورت وہ جو اس پر اثر تھا ٹوٹ گیا اور وہ ذہنی خلا سمٹ کر تپید ہو گیا۔

ڈال دیا۔ سپیرا اپنی گھڑی سنبھال رہا تھا۔ وہ بے حد خوش تھا۔ پھر اس نے بچی سے ایک بڑی سی ڈبیہ نکالی اور دو لکڑیوں کی مدد سے ہاجرہ کی ٹانگ کا وہ پھوڑا اٹھالیا۔ جسے ڈاکٹر نے قبضی سے کاٹا تھا۔ سپیرے نے گوشت کا وہ ٹکڑا جو ابھی تک سیاہ تھا اٹھا کر ڈبیہ میں ڈال لیا۔

”تمہاری کیا خدمت کریں؟“ ایلی نے باہر نکل کر سپیرے سے کہا۔

”تم کیا سیدو کرو گے بابو۔“ وہ بولا۔

”پھر بھی۔۔۔“ ایلی نے کہا۔

”اونسوں۔“ سپیرا مسکرایا۔

”کچھ تو لے لو۔“ شہزاد نے پانچ ایک دس دس کے نوٹ اس کی طرف بڑھائے۔

”لڑکی تمہیں تو صرف بڑھیا کا جیون ملا ہے پر مجھے گرد کئی دیا سے ساری جیون ہستی مل گئی ہے۔ تمہیں کیا پتہ یہ کتنی بڑی دولت ہے۔“ اس نے اپنی ڈبیہ کی طرف اشارہ کیا۔ ”میں اب چلتا ہوں۔“

دھشتا وہ رک گیا۔ ”اے لڑکی۔“ وہ بولا۔

”کیا ہے۔“ فرحت نے کہا۔

”تو نہیں۔“ وہ بولا۔ ”یہ جو دوسری والی ہے۔ ذرا منہ میری طرف کرو۔“

شہزاد نے سپیرے کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ شہزاد کے ماتھے کے تل پر پڑی۔ ”آہ۔“ وہ بولا۔

”تیرے تو ماتھے پر نند بندی ہے۔ تو تو آپ ناگ دیوی ہے۔ یہ لے لے کیا یاد کرے گی کہ سپیرے نے کیا دان کیا تھا۔“ اس نے ایک اور ڈبیہ سے چند سیاہ مرجیں نکالیں اور شہزاد کے ہاتھ پر رکھ کر بولا: انہیں کھالے۔ ابھی کھا۔“

شہزاد نے نفرت سے ان گندی مرجوں اور سپیرے کے غلیظ ہاتھوں کی طرف دیکھا اور پھر جھپکتے ہوئے دو مرجیں منہ میں ڈال لیں۔

سپیرے کے جانے کے بعد اس نے باقی مرجیں پھینک دیں۔

ہاجرہ رو بہ صحت ہونے لگی۔ سپیرے کے کہنے کے مطابق ایک ہفتہ تک وہ اسے دودھ اور کھی پلاتے رہے۔

جب وہ تندرست ہوئی تو خود ہی کہنے لگی: پتہ نہیں کیا ہوا تھا۔ اس روز بے ہوش ہونے سے پہلے میں نے یوں محسوس کیا تھا جیسے کسی نے ایک لٹھے میرے سر میں دے ماری ہو۔ پھر پتہ

نہ کیا کیا جاسکتا تھا۔ ہم نے ناگ تیل بھی لگا دیکھا۔ کچھ افادہ نہ ہوا۔ پھر مجھے سرمہ یاد آیا میں ایک چلو اسے بھی آزما دیکھو۔ سو جنب میں نے ان کی آنکھوں میں ایک سلائی لگا دی۔ سلائی نے کی دیر تھی کہ وہ اٹھ کر بیٹھ گئیں۔ درد گویا کافور ہو گیا۔ اس روز ہمیں سمجھ میں آیا کہ یہ تو بے کام کی چیز ہے۔ سو جنب ہم نے کمیٹی کی طرف سے ڈونٹی پڑادی کہ کسی شخص کو بچھو یا ہپ کٹ لے تو وہ ہمارے پاس پہنچ جائے صاحب بیسیوں مریض آئے اور ایک ایک سلائی ہانے کے بعد یوں اپنے پاؤں پر چل کر گھر لوٹے جیسے کچھ ہوا ہی نہ ہو۔

”تو کیا اب بھی آپ کے پاس وہ سرمہ ہے۔“ خلیق نے پوچھا۔

”ہو نہیں۔“ حافظ صاحب بولے۔ ”ختم ہو گیا۔ شاید ایک آدھ سلائی نکل آئے۔ ابی ڈاکٹر صاحب ہم نے حکیم محمود علی کو کئی ایک خط لکھے“ تاکہ اور شیشیاں بھیجے لیکن تمام خط ڈی ایل او کے ذریعے واپس آ گئے۔ ڈاکٹ نے ان پر تحریر کیا ہوا تھا کہ ایسے نام کا کوئی شخص بھائی دروازے پر رہائش نہیں رکھتا۔ لہذا خط واپس کئے جاتے ہیں۔ پتہ نہیں وہ حکیم محمود علی صاحب کیا دے اور ان کا مطلب کیا ہوا۔ ہم نے بڑی تحقیق کی لیکن بے فائدہ۔“

خلیق نے پھر راجپال کا تذکرہ چھیڑ دیا۔ حافظ صاحب بولے:

”ہاں وہ ہمارے پاس بھی آیا تھا لیکن دوئی پہلے ہی دے دینا یہ چیز ہمارے اصول کے خلاف ہے۔ البتہ اگر سانپ اسے ڈس لے اور وہ یہاں پہنچ جائے تو میرا خیال ہے ایک سلائی سرمہ تو لڑی آئے گا۔“

چار ایک روز بعد شام کے آٹھ نو کے قریب راجواڑے کے بازار میں شور مچ گیا۔

راجپال آ رہا ہے۔ راجپال آ رہا ہے۔“

جب وہ قصبے میں داخل ہوا تو اس کا منہ سوچ چکا تھا۔ آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ نہ بٹہ وہ کتنی دور سے بھاگتا ہوا آیا تھا۔ اس کی ہمت ختم ہو چکی تھی۔ دیر تک وہ فصیل دیوار سے لہ کر کھڑا رہا۔ پھر اک عزم سے دوڑنے لگا۔ لالہ رام داس کی دکان پر وہ تھکی کی طرف جھپٹا اور ہانگی پینے لگا۔ اتنے میں اس کے گرد بھیڑ لگ چکی تھی۔ لوگوں چاروں طرف سے دوڑ پڑے۔ ایک آدمی حافظ صاحب کے پاس پہنچ گیا تھا۔ دوسرا ڈاکٹر کے پاس۔ سبھی پینے کے بعد راجپال نے ہر ہمت کر کے بھاگنا شروع کیا لیکن چند ہی قدم اٹھانے کے بعد اس نے دونوں ہاتھوں میں ہاتھ رکھا اور پھر چکر کھا کر دھڑام سے بازار کے عین وسط میں ڈھیر ہو گیا۔ اتنے میں حافظ

ماوہ کا انتقام

اگلے روز چائے سے فارغ ہو کر وہ دونوں کمیٹی کے سیکرٹری کے گھر چلے گئے۔ راجواڑے کی میونسپل کمیٹی کے سیکرٹری کا نام حافظ عبد المجید تھا۔ وہ چالیس برس کے ہوں گے۔ قدرتی طور پر وضع داری کے جملہ نشانات واضح تھے۔ انداز میں روایات پرستی کی واضح جھلک تھی۔ وہ احتیاط سے چلتے۔ احتیاط سے بات کرتے اور احتیاط سے سوچتے تھے۔ خلیق نے کچھ دیر بعد مطلب کی بات چھیڑی۔ بولا:

”حافظ صاحب۔ کیا آپ کے پاس سانپ کے کاٹے کا سرمہ ہے یعنی —۔“ خلیق نے اپنی بات کی وضاحت کرنے کے لئے کچھ اور کہنا چاہا۔

”ہاں ہاں“ حافظ صاحب بولے۔

”حیرت ہے۔“ خلیق بولا۔ ”کہ سرمہ لگانے سے سانپ کے زہر کا اثر دور ہو جائے۔“

”ابجی صاحب۔“ وہ بولے۔ ”ساری بات ہی عجیب ہے۔ دراصل ہوا یہ کہ آج سے چار سال پہلے ہمیں حکومت کی طرف سے ایک خط موصول ہوا جس کے ساتھ ہی حکیم محمود علی کا ایک اشتہار ملفوف تھا۔ اشتہار میں اس سرمے کے متعلق مرقوم تھا کہ اس کی سلائی لگانے سے سانپ یا بچھو کا زہر یا تو اثر نہیں کرتا اور اگر اثر ہو چکا ہو تو دور ہو جاتا ہے۔ گورنمنٹ نے خط میں لکھا تھا کہ ہم اس سرمہ کو خریدنے کی پرزور سفارش کرتے ہیں۔ چونکہ بیان کیا جاتا ہے کہ اس سرمہ کا اثر فوری ہوتا ہے اور اسے استعمال کرنے سے فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ لہذا اسپتالوں، سکولوں اور کمیٹی گھروں کو یہ سرمہ خریدنا چاہئے۔“

”آپ جانتے ہی میں ڈاکٹر صاحب۔“ حافظ صاحب بولے۔ ”کہ ایسے سرکاری خط آیا ہی کرتے ہیں۔ میں نے سمجھا کہ ویسے ہی حکیم محمود کا کاروبار چلانے میں مدد دینا مقصود ہے۔ چونکہ ساری بات ہی مہمل تھی بھلا آنکھوں میں سرمہ لگانے کو سانپ کے کاٹے سے کیا تعلق۔“

”بالکل بالکل۔“ خلیق ہنسنے لگا۔

”ہے نا“ حافظ صاحب بولے۔ ”تو صاحب ہم نے گورنمنٹ کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے دو شیشیاں خرید لیں اور وہ عرصہ دراز تک گھر جوں کی توں پڑی رہیں۔“

”ایک رات دو بجے کے قریب بیگم صاحب جو انھیں تو انہیں سانپ نے کاٹ لیا۔ اب اس

”ایلیاس بھائی۔ تم کہیں۔ آؤ آؤ۔“ دھنستا وہ رک گیا۔ ”لیکن نہیں۔ یہیں نہیں۔ کوئی دن دیکھ نہ لے۔ ٹھہرو میں ابھی آیا۔“

کپور چند منٹ کے بعد باہر نکلا۔ ”آؤ آؤ۔“ وہ بولا۔ ”باہر جا کر بات کریں گے۔“ اور وہ

ایلی چپ چاپ شیش کی طرف چل پڑے۔ دھننگ روم میں بیٹھ کر کپور ایلی پر برس پڑا:

”تم نے یہیں سے جانے میں بڑی شدید غلطی کی ایلی۔ تم نے میدان خالی چھوڑ دیا۔ نتیجہ

ہوا کہ تمہاری بیوی نے وہ دوا پلا چھایا۔ تمہارے خلاف اس قدر زہر اگلا کہ شاہوال کا ہر ہلکار

اسے خلاف ہو چکا ہے۔ ہر شخص کی ہمدردی ان کے ساتھ ہے۔ پولیس کے افسروں نے حکم

دیا ہے کہ تمہیں حراست میں لے لیا جائے۔ مجسٹریٹ تمہاری بیوی کا قہقہہ سن کر اتنا متاثر

کہ اس کے آنسو نکل آئے۔ سراب تمہارے خلاف ہو چکا ہے۔ ڈپٹی کمشنر تمہارے حق میں

نہ سارے شہر میں تمہارے خلاف آگ لگی ہوئی ہے۔ اگر لوگوں نے تمہیں دیکھ لیا۔ تو وہ

بس ماریں گے۔ ان سب کو یقین ہو چکا ہے کہ تم نے اپنی بیٹی کا سودا کیا تھا۔ اور اس کی اور

ہاکی ماں کی مرضی کے خلاف زبردستی اس کی شادی کر دی تھی۔ اور پھر تم بھاگ کر

پوش ہو گئے۔ اس سے ان کا یقین اور بھی پکا ہو گیا۔

”کیا تمہارا بھی یہ خیال ہے۔“ ایلی نے کپور سے پوچھا۔

”میری بات چھوڑو۔ میرا کیا ہے۔“

”میں تمہیں حقیقت بتانا چاہتا ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

”اس کی کیا ضرورت ہے۔ تمہیں چاہئے تھا کہ جانے سے پہلے بتاتے۔ اب کیا فائدہ اب تو

ملن سے نکل چکا ہے۔ تمہاری گھر گھر رسوائی ہو چکی ہے۔ لوگ اور اہل کار تمہیں بد معاش

کہتے ہیں۔ تمہارے پڑوس میں جو اے۔ ایس۔ آئی رہتا تھا وہ ان کی امداد کر رہا ہے۔“

”حد ہو گئی۔“ ایلی نے کہا۔

”حد سی حد ہوئی ہے۔“ کپور کہنے لگا۔ ”حتیٰ کہ ریاض بھی مخالف پارٹی میں شامل ہو چکا

نہ صرف ناظم کو تم سے ہمدردی ہے لیکن وہ بھی کھلے بندوں اس کا اظہار نہیں کر سکتا۔“

”اوہ۔ تو پھر ہو گا کیا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”پھر بھی تم تاریخ پر تو یہیں آؤ گے ہی۔“ کپور نے کہا۔

”کیسی تاریخ۔“ ایلی نے پوچھا۔

صاحب بھی عین موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے سرے کی ایک سلائی اس کی آنکھوں میں ڈالی۔ راجپال کا جسم یوں ترپنے لگا جیسے بجلی کا شٹ لگ گیا ہو۔ پھر اس نے آنکھیں کھولیں اور وحشیانہ انداز سے نعرہ لگایا: ”واہ گرو۔“

ایلی نے اس وقت محسوس کیا جیسے اس پر بھی سانپ کے کانے کا اثر ختم ہو گیا ہو۔ اس کا

بھی جی چاہتا تھا کہ زور سے نعرہ لگائے۔ ”واہ گرو۔“

اگلے روز خلیق نے دیکھا کہ ایلی کی پرانی شخصیت پھر سے استوار ہو گئی ہے اور اس کا وہ

ذہنی جود ختم ہو چکا ہے تو اس نے بات چھیڑی۔

”شکر ہے اب آپ کی طبیعت پہلے کی نسبت بہتر ہو گئی ہے۔ میں تو ڈر ہی گیا تھا۔“ وہ ہنسنے

لگا۔

”صورت حال بڑی خطرناک تھی۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا۔“ ڈاکٹر نے پوچھا۔ ”آخر بات کیا تھی؟“

”مجھے بتانے میں تو کوئی خرچ نہیں۔“

رسوائی

ایلی کا قہقہہ سننے کے بعد خلیق خاموش ہو گیا۔ غالباً وہ محسوس کر رہا تھا کہ اس لمبی چوڑی

داستان کا یہ انجام نہیں ہونا چاہیے تھا۔ سال ہا سال دکھ اور تکلیفیں سننے کے بعد اتنی سی بات پر

انہیں جدا نہیں ہونا چاہئے تھا۔ خلیق کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے لیکن اس نے زبان سے کچھ

نہ کہا۔

خلیق طبعاً کہنے والا شخص نہ تھا۔ وہ خاموشی سے محسوس کرنے کا عادی تھا۔ اس نے بعد

مشکل آنسو پی لئے اور بولا: ”میں کیا کہہ سکتا ہوں۔ آپ اپنے معاملات کو بہتر سمجھتے ہیں۔“

پندرہ روز راجواڑے ٹھہرنے کے بعد ایلی خلیق سے رخصت ہو گیا۔ وہ ایک ایسی گاڑی میں

سوار ہوا جو رات کے ایک بجے شاہوال پہنچتی تھی۔ شاہوال پہنچ کر وہ سیدھا کپور کے گھر گیا۔

حالات کو جاننے کے لئے وہ کسی اور کے پاس نہ جا سکتا تھا۔ ریاض سے وہ گھبراتا تھا۔ ناظم سے ملنا

مشکل تھا۔ اور بورڈنگ میں جانا مناسب نہ تھا۔ اسے ڈر تھا کہ لڑکے اسے پہچان لیں گے اور پھر

آپس میں باتیں کریں گے۔ کپور اسے دیکھ کر گھبرا گیا:

”تمہارے خلاف دو مقدمے درج ہو چکے ہیں۔“ کپور بولا۔

”اوہ۔“ ایلی بولا۔

”خبردار رہتا جب بھی تم آؤ گے کسی نہ کسی بہانے تمہیں حوالات میں بند کر دیں گے اور ہم میں سے کوئی شخص اس بارے میں کھلم کھلا تمہاری مدد نہیں کر سکے گا۔“
ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ راجپال ہو اور اسے مادہ نے ڈس لیا ہو۔

”ہم تو بس یہی ایک کام کر سکتے تھے سو ہم نے کر دیا۔“ کپور نے کہا۔ ”سراب صاحب تمہارے خلاف محکمے میں رپورٹ کرنے والے تھے۔ میں نے ہاتھ جوڑے، میں نے کہا کہ ایسا نہ کیجئے۔ وہ کہنے لگا کہ ہم اسے یہاں نہیں رہنے دیں گے۔ یہ تو بلکہ اچھا تھا۔ چونکہ یہاں تمہارا رہنا ممکن نہیں رہا۔ سو بھائی۔ میں نے ان سے کہا کہ رپورٹ نہ کیجئے میں ویسے ہی اس کا چالوہ کرا دوں گا۔ سو میں ایک روز کے لئے لاہور چلا گیا اور لوگوں سے مل ملا کر میں نے تمہارا چالوہ کرا دیا ہے۔“

”کس جگہ۔“ ایلی نے پوچھا۔

”قاضی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں کا ہیڈ ماسٹر شریف آدمی ہے اور وہ جگہ لاہور کے قریب ہے۔“

”تو میں یہاں چارج کیسے دوں گا۔“ ایلی نے پوچھا۔

”اس کی ضرورت نہیں۔“ کپور نے کہا۔ ”ہم سب ٹھیک کر لیں گے۔“ اس نے جب سے ایک کانٹہ نکالا۔ ”یہ لو۔“ ”یہ تمہارا آرڈر ہے اور اس پر ہم نے لکھ دیا ہے کہ تمہیں یہاں سے فارغ کر دیا گیا ہے۔ میری رائے ہے کہ سیدھے قاضی پور جا کر ڈیوٹی سنبھال لو۔ اگرچہ رہے تو معاملہ اور زیادہ بگڑ جائے گا۔“

کپور سے جدا ہونے کے بعد ایلی گویا بالکل تنہا رہ گیا۔ اس نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ وہ اکیلا ہے۔ بالکل اکیلا۔ اور کوئی بھی ایسا نہیں جو اس کا ساتھ دے۔ ایک بار پھر وہ فکر میں ڈوب گیا۔ لیکن اب کی بار اس کا ذہن خالی نہیں تھا۔ اس میں بیسیوں سوال ابھر رہے تھے۔ وہ سوچ رہا تھا اور گاڑی قاضی پور کو جا رہی تھی۔

کوڑھی

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا ہیڈ ماسٹر صاحب کے گھر پہنچا۔ اس نے وہ آرڈر ان کے سامنے

پکڑا اور کہنے لگا:

”مدرسے میں حاضر ہونے سے پہلے میں آپ کو اپنے حالات سے واقف کرنا چاہتا ہوں۔“

اتنی سی تمہید کے بعد اس نے اپنی روداد مختصر طور پر انہیں سنادی۔

”ہوں۔“ اس کا قصہ سن کر انصاری صاحب سوچ میں پڑ گئے۔ ظاہر تھا کہ وہ ایلی کے لئے

ایک ہمدردی محسوس نہیں کر رہے تھے۔ لیکن آصفی صاحب ”وہ بولے۔“ میں اس بارے میں

پکی کیا مدد کر سکتا ہوں۔“

”آپ میری یہ مدد کر سکتے ہیں کہ کچھ دیر کے لئے مجھے برداشت کر لیں۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب۔“

”مجھے یہاں اپنے سکول میں رہنے دیں۔“

وہ نہنے۔ ”اچھا۔“ وہ بولے۔ ”تو آپ شوق سے ہمارے مدرسے میں کام کریں۔ لیکن

ایں صاحب! ایسی گڑبڑ سے مجھے بہت وحشت ہوتی ہے۔“

قاضی پور پہنچ کر ایلی کی کوئی حیثیت نہ رہی۔ وہ باتیں جن سے وہ لوگوں کی توجہ جذب کیا

لانا ختم ہو گئیں۔ اپنے ارد گرد اساتذہ کی بھیڑ لگانے کی بجائے وہ جان بوجھ کر ان سے دور

بلد جماعت میں چمکیلی۔ باتیں کرنا بھی چھوٹ گیا۔ وہاں بھی خاموش رہتا اور پڑھانے میں کوئی

تنبہ نہ لیتا۔

اسے شاہوال سے دلخراش خبریں آ رہی تھیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ آخر اتنا بڑا معاملہ

ان کی خلاف کیوں قائم کیا جا رہا ہے۔ آخر شنوار کا مقصد کیا تھا۔ اس نے جو احتجاج کیا تھا اس کی

پکڑ کی غلط بات پر استوار نہ تھی۔ شنوار اچھی طرح جانتی تھی کہ اس نے نفیسہ کی شادی

تبت کی بنیاد پر نہیں کی تھی۔ وہ جانتی تھی کہ ایلی نے اسے سچا نہیں تھا۔ پھر وہ کیا جانتی تھی۔

بالاں کا مقصد ایلی کو رسوا کرنا تھا۔ یا ڈرا دھمکا کر اپنے تابع کرنا تھا۔ لیکن اس کی جرات ڈر کے

بے پروا پر استوار تھی۔ جوں جوں خطرہ بڑھتا جاتا اور بچاؤ کی کوئی صورت دکھائی نہ دیتی توں توں وہ

لڑھکاتا جاتا تھا۔

پولیس اور کورٹ اس کے لئے خطرناک مقامات تھے۔ اس وقت اس کے سر پر قید کا خطرہ

لڑھکاحت سے منڈلا رہا تھا۔ کہ ذہنی طور پر وہ اس کے لئے تیار ہو چکا تھا۔ قید ہو جاؤں گا تو کیا

ہوا۔ وہ سوچا۔ لیکن ڈر کی وجہ سے کسی کے تابع نہیں ہوں گا۔

جب اسے اپنی رسوائی کا خیال آتا تو وہ دل موس کر رہ جاتا۔ اس کے دل پر نہیں لگتی۔ شہزاد نے اچھا نہیں کیا۔ وہ سوچا۔ پھر اس کی نگاہ میں وہ پولیس آفیسر آ جاتا جو شہزاد کے پردوس میں رہتا تھا۔ شہزاد اس کے قریب آ بیٹھتی اور آنسو بہاتی۔ لڑکیاں اس کے گرد منڈلاتیں۔ ہنستیں، قہقہے لگاتیں اور معنی خیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھتیں۔ اہلی کو دھچکا لگتا۔ شہزاد سے اسے ایسی توقع نہ تھی۔ قاضی پور کا وہ زندہ اہلی کی زندگی کا بدترین دور تھا۔ وہ اپنے آپ سے نفرت کرنے لگا تھا۔ اس کے دل میں کامل یقین تھا کہ سبھی اس سے نفرت کرتے ہیں۔ وہ ہیڈ ماہر جس کے روبرو اس نے خلوص سے تمام واقعات ہمدردی حاصل کرنے کے خیال سے دہرائے تھے وہ بھی اسے مشکوک نگاہوں سے دیکھتا تھا۔ شاہوال میں اس کے خلاف ایک طوفان مچا ہوا تھا۔ آصفی محلے میں لوگ اس کے خلاف آوازیں بلند کر رہے تھے۔ حتیٰ کہ اس کے دوست اور رشتہ دار بھی اعلانیہ اس کے خلاف ہو چکے تھے۔

اس کے مکان پر وجہت برستی تھی۔ وہ مکان جو قاضی پور میں اسے رہنے کے لئے ملا تھا بہت وسیع تھا۔ اس میں کئی ایک کمرے تھے اور اس کا جملہ سالن ایک سوٹ کیس پر مشتمل تھا۔ اس کے پاس نہ کوئی بستر تھا نہ چارپائی۔ خوش قسمتی سے وہ گرمیوں کے دن تھے ورنہ نہ جانے کیا ہوتا۔ مکان میں مالک مکان کا ایک ٹوٹا ہوا تخت پوش پڑا تھا جس پر رات کو پڑ کر سو رہتا۔ سارا دن بھی وہ اسی تخت پوش پر بیٹھا سوچتا رہتا۔

دو مرتبہ اس کے نام شاہوال سے سمن آچکے تھے۔ مدرسہ کے دفتر شاف کی مہربانی سے ان کی تعمیل نہ ہوئی تھی۔ لیکن اسے اچھی طرح معلوم تھا کہ ایک روز اسے شاہوال جانا ہی پڑے گا۔

تیسری مرتبہ جب سمن آئے تو ساتھ ہی ایک اور مصیبت رونما ہوئی۔ اس روز جب وہ صبح جاگا تو اس کے دونوں ہاتھوں پر اور بازوؤں پر ایگزیمہا کے چھالے نکل آئے تھے۔ ایسی ہی پھنسیاں جو امرتسر میں اس کے چہرے پر نکلی تھیں۔ جب وہ پھنسیاں پھٹ گئیں اور اس کے ہاتھوں کی جلد اتر گئی۔ ہاتھوں کے زخموں سے پانی بہنے لگا۔ اس نے حیرت سے اپنے ہاتھوں کی طرف دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

پھر وہ گاڑی میں بیٹھا سمن کی تعمیل کرنے شاہوال جا رہا تھا۔ اس کے دونوں ہاتھ بیکار ہو

تھے۔ ان پر پٹیاں بندھی ہوئی تھیں۔ اور اس نے دونوں بازو اوپر اٹھا رکھے تھے۔ وہ سوچ رہا اس کی نگاہوں تلے سارا شاہوال پلیٹ فارم پر کھڑا اس کا انتظار کر رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں بنے تھے۔ ان کے پیچھے پولیس والے ہتھکڑیاں اٹھائے کھڑے تھے۔

دکٹ باؤ نکٹ۔" ریلوے کا ایک وردی پوش ٹی ٹی اسے جھنجھوڑ رہا تھا۔ اہلی چونکا۔ اس نے بڑی بے بسی سے ٹی ٹی کی طرف دیکھا۔ نکٹ اس کی جیب میں تھا لیکن کے ہاتھ بیکار تھے۔ وہ نکٹ نکال نہ سکتا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھر آئے۔

"بے نکٹا ہے۔" باؤ مسکرایا۔

"جی نہیں" وہ بولا۔

"تو پھر دکھاؤ۔"

اس نے اپنی جیب ٹی ٹی کی طرف کر دی۔ "اس جیب میں ہے۔"

ٹی ٹی نے مخدوش نگاہوں سے اس کی طرف دیکھا۔

ایک ہمرای مسافر نے بات سمجھ کر اہلی کی جیب میں سے نکٹ نکالا۔

"کیا ہوا ہے تمہارے ہاتھوں کو۔" ٹی ٹی نے پوچھا۔

"جی ایگزیمہا ہے۔"

جاننا بھائی

اس کے قریب بیٹھے ہوئے مسافر یہ سن کر پرے ہٹ گئے جیسے وہ کوڑھی ہو۔ شاہوال کا دوران تھا۔ صرف چند ایک مسافر تھے۔ وہ جلدی سے اترا اور چپکے سے شیشن سے باہر نکلے۔ اس نے ایک ویران راستہ اختیار کیا تاکہ کوئی دیکھ نہ لے۔ پکھری پہنچ کر وہ مجسٹریٹ کے باہر چند دیہاتیوں کے ساتھ زمین پر بیٹھ گیا۔ اس نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی۔

اس کا کوئی جانا پہچانا نہ تھا۔ پھر وہ آواز کا انتظار کرنے لگا۔ دوپہر ہو گئی لیکن اسے آواز نہ آیا۔ ایک پولیس والا دور کھڑا اسے گھور رہا تھا۔ اہلی سمٹ کر بیٹھ گیا۔ وہ دیہاتی جو اس کے پاس بیٹھے سب جا چکے تھے۔ دروازے کے سامنے وہ اکیلا تھا۔ پولیس والا گیا تو اس نے گھبراہٹ میں کہا۔ "ضرور کوئی بات ہے۔ اس نے سوچا۔ پھر پکھری کے پیادے سے ملا۔

”شہزادہ نام الیاس کی باری کب آئے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”تم کون ہو۔“ وہ بولا۔

”میں الیاس ہوں۔“

پیادے نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔ پھر وہ قلعہ مار کر ہٹا۔ ”اپنی باری پر حاضر نہیں ہوتے اور پھر پوچھتے ہیں۔“

”لیکن مجھے تو آواز نہیں پڑی۔“

”تمہارے تو وارنٹ بھی نکل چکے ہیں۔“ وہ بولا۔

”کیوں بھی۔ کیا بات ہے۔“ وہی پولیس والا آگیا۔ ”کون ہو تم؟“ اس نے ایلے سے

پوچھا۔

الیاس آصفی۔ ”ایلے نے جواب دیا۔

”صاحب۔ ذرا ادھر آئیے۔“ پولیس والا چلایا۔“

ایک انسپکٹر نہ جانے کہاں سے آگیا۔

”ادھر آؤ۔“ انسپکٹر نے ایلے کو گھور کر دیکھا۔ ”ادھر آؤ ہمارے ساتھ۔“

وہ اسے ساتھ والے کمرے میں لے گئے۔ وہاں ایک پولیس افسر کرسی پر بیٹھا تھا۔ انہوں

نے زیر لب کچھ باتیں دہرائیں۔ پھر وہ افسر کہنے لگا: اسے حوالات میں بند کر دو۔“

”کس لئے؟“ ایلے نے بھد مشکل کہا۔

”وجہ بعد میں بتائیں گے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”میں نے کیا جرم کیا ہے؟“ ایلے نے پوچھا۔

”تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔“ انسپکٹر نے بولا۔

کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے ایلے کی طرف دیکھا اور بولا: ”تمہارے ورائٹ ہیں۔ یا تو ابھی

پانچ ہزار کی ضمانت کراؤ ورنہ حوالات جاؤ۔“

”کہاں ہے تمہارا ضامن۔“ انسپکٹر نے پوچھا۔

ایلے نے بے بسی سے چاروں طرف دیکھا۔

وہ اسے لے جانے لگے تو پولیس کا ایک اور اے ایس آئی داخل ہوا۔ ”السلام علیکم۔“ وہ

ایلے سے مخاطب ہو کر بولا۔ ”آصفی صاحب۔ آپ یہاں کہاں؟“

ایلے نے اس کی طرف غور سے دیکھا۔ وہ اسے قطعاً نہ جانتا تھا۔

”اسے لے جاؤ۔“ کرسی پر بیٹھے ہوئے افسر نے کہا۔

پای نے ایلے کا بازو پکڑ لیا۔

”لیکن۔“ نووارد اسے ایس آئی نے کہا۔ ”میں جوان کا ضامن ہوں۔“

انہوں نے حیرت سے اے ایس آئی کی طرف دیکھا۔

ایلے خود حیران کھڑا تھا۔

”آپ اس معاملے میں نہ آئیں مجید صاحب۔“ افسر نے اے ایس آئی سے کہا۔

”یہ میرے بھائی ہیں۔“ مجید بولا۔

ایلے نے پھر حیرت سے مجید کی طرف دیکھا ”بھائی۔ اس نے تو کبھی مجید کو دیکھا بھی نہ تھا۔“

”میں ان کی ضمانت دوں گا۔“ مجید بولا۔

”آپ سرکاری افسر ہیں آپ ضمانت نہیں دے سکتے۔“ افسر نے مجید سے کہا۔

اے ایس آئی نے اپنی بیٹی کھولی اور افسر کے سامنے میز پر رکھ دی۔ ”یہ لیجئے اپنی نوکری۔“

انہایت اطمینان سے کہنے لگا۔ ”اب تو میری ضمانت منظور کیجئے گا نا۔“

ایلے بت بنا کھڑا تھا۔ وہ مجید کی طرف دیکھ رہا تھا۔

اتنے میں ایک خوش شکل آدمی داخل ہوا۔ وہ سب منسوبانہ انداز سے کھڑے ہو گئے۔

”آخاہ۔“ نووارد چلایا۔ الیاس صاحب ہیں۔ آئیے الیاس صاحب۔ مجھے آپ سے کچھ کہنا

ہے۔“ اس نے ایلے کا ہاتھ پکڑ لیا اور کمرے سے نکل گیا۔ باہر جا کر اس نے ایک تانگے کو اشارہ

کیا۔ ایلے کو تانگے میں بٹھا کر وہ خود بھی سوار ہو گیا اور تانگہ چل پڑا۔ کچھ دور جا کر تانگہ رکا۔

برقعہ پوش عورت پنج پر بیٹھی تھی۔ خوش پوش شخص نے اشارہ کیا۔ وہ عورت آکر ایلے کے

ہاتھ میں گئی اور تانگہ پھر سے روانہ ہو گیا۔

اس روز عجیب واقعات ہو رہے تھے۔ وہ مجید کون تھا؟ وہ اس کی ضمانت کیوں دے رہا تھا؟

”فوش پوش شخص اسے کیوں لے آیا تھا؟ کہاں لے جا رہا تھا؟ اور وہ برقعہ پوش کون تھی؟“

انہا اور گھن

جب تانگہ شہزاد کے مکان کے پاس رکا تو ایلے چونکا۔ ارے وہ تو شہزاد برقعہ پہنے اس کے

پاس بیٹھی تھی۔ اور وہ خوش پوش خوبصورت جوان ضرور اس کا پردوسی پولیس والا انسپکٹر تھا۔ وہ ایلی کو اپنے گھر میں لے گیا۔ شہزاد نے برقعہ اتار دیا۔ اس کے چہرے سے نفرت اور غصہ ہٹ کر رہے تھے۔ اس نے دونوں ہاتھ اپنے کولہوں پر رکھ لئے اور وہ اسی طرح ایلی کے درہوتن کر کھڑی ہو گئی جس طرح اس روز کھڑی تھی جب وہ اپنے گھر سے نکلا تھا۔

انسپکٹر نصیب نے مسکرا کر شہزاد کی طرف دیکھا۔ اور اسے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ ”دیکھئے الیاس صاحب۔“ وہ بولا۔ ”بہتر یہ ہے کہ آپ ان لوگوں سے کوئی سمجھوتہ کر لیں ورنہ اس کے نتائج آپ کے حق میں بے حد نقصان دہ ثابت ہوں گے۔“

ایلی خاموش بیٹھا رہا۔

”آپ کو غم ہونا چاہئے۔“ نصیب بولا۔ ”کہ شاہوال کے لوگ اور حاکم سب آپ کے اس فعل پر لعنت بھیج رہے ہیں اور مجسٹریٹ علی قلی خاں نے تو اعلان کر دیا ہے کہ آپ کو اندر کر دے گا۔“ نصیب خاموش ہو گیا۔

ایلی جوں کا توں بیٹھا رہا۔

”آپ کے ڈائریکٹر کو تمام تفصیلات معلوم ہیں اور آپ نوکری سے برطرف ہونے والے ہیں۔“ وہ پھر خاموش ہو گیا۔

”آپ کا ان لوگوں کو ان کے گھر سے نکال کر یوں بے یار و مددگار چھوڑ جانا ایک قبیح فعل ہے۔“ انسپکٹر نے کہا۔

”بے یار و مددگار تو میں ہوں۔“ ایلی نے کہا۔

نصیب مسکرایا: ”جو لوگ ایسے فعل سرزد کرتے ہیں ان کے عزیز اور دوست بھی ان کے خلاف ہو جاتے ہیں۔ اس لئے میں بلا در رعایت آپکو مشورہ دیتا ہوں کہ آپ ان کے ساتھ سمجھوتہ کر لیں۔“

”میرا ان سے کوئی جھگڑا نہیں۔“ ایلی نے کہا۔

”تو پھر آپ انہیں کیوں چھوڑ گئے ہیں۔“ اس نے پوچھا۔

”یہ طلاق کا مطالبہ چھوڑ دیں۔ لڑکی اپنے گھر جا بے تو میں واپس گھر آ جاؤں گا۔“ ایلی نے

جواب دیا۔

”تمہیں لڑکی کو طلاق دینی پڑے گی۔“ شہزاد غرائی۔ ”تم نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم

نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ تم نے میری بیٹی کو ایک بد معاش کے ہاتھ بیچ دیا ہے۔“ انسپکٹر نے پھر اشارہ کیا: آپ فی الحال نہ بولیں۔“ اس نے شہزاد سے کہا۔

”یہ سب الزام ہیں۔“ ایلی بولا۔

”چلو الزام ہی سہی۔“ نصیب نے کہا۔ ”لیکن واقعات کا رخ ایسا ہے کہ آپ پر جرم ثابت ہو جائے گا۔ قانون آپ کے حق میں نہیں۔“

”نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کو سزا ہو جائے گی۔“ وہ بولا۔

”ہو جائے۔“ ایلی نے کہا۔

”آپ کی زندگی تباہ ہو جائے گی۔“

”مجھے اس کی پرواہ نہیں۔“ ایلی بولا۔

”وہ تو ڈھیٹ ہے۔“ شہزاد چلائی۔

”آپ خاموش رہئے۔“ نصیب نے کہا۔

آپ سوچ لیں الیاس صاحب۔

”میں نے سوچ لیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”دیکھئے۔ آپ تعلیم یافتہ ہیں۔ آپ شریف آدمی معلوم ہوتے ہیں۔“

شہزاد نے نفرت سے اونہ کہا۔

”آپ کو چاہئے کہ سوچ سمجھ کر فیصلہ کریں۔“ نصیب بولا۔

دفترا۔ ایلی کو نہ جانے کیا ہوا کہ ملحقہ گھر سے لڑکیوں آوازیں سن کر یا شاید شہزاد کی نفرت

بحری ”اونہ۔“ سن کر وہ بالکل نڈر ہو گیا۔

”دیکھئے انسپکٹر صاحب مجھے معلوم ہے کہ مجسٹریٹ اور پولیس کے افسران لوگوں کا ساتھ

دے رہے ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ ہر قدم آپ کے مشورے سے اٹھایا جا رہا ہے۔ مجھے علم ہے

کہ ڈائریکٹر شکایات پہنچ رہی ہیں۔ مجھے معلوم ہے کہ میں قید کر لیا جاؤں گا۔ میں یہ سب کچھ

ہلانا ہوں۔ لیکن آپ کو علم نہیں کہ میں نے جو کچھ کیا وہ کیا جو ایک باعزت خاوند کے شایان

نہیں ہے۔“

”باعزت خاوند۔“ شہزاد چلائی۔

”میں حق بجانب ہوں۔“ ایلی نے کہا۔ ”مجھے ان لوگوں کے خلاف غصہ نہیں۔ میں پیشہ انہیں خرچ دوں گا۔ ہر طرح سے مدد کروں گا۔ لیکن میں ان کے ساتھ نہ رہوں گا۔ جب تک یہ لوگ باعزت لوگوں کی طرح اس نکاح کا احترام نہیں کریں گے۔ آج اگر لڑکی اپنے خلوئہ کے پاس چلی جائے تو کل میں از خود اپنے گھر آ جاؤں گا۔“

”ہوں۔“ نصیب سوچ میں پڑ گیا۔

”اور رسوائی، قید اور ملازمت سے برطرفی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں۔“ ایلی نے کہا اور اٹھ کر چل پڑا۔

”الیاس صاحب۔ الیاس صاحب۔“ نصیب نے آوازیں دیں لیکن وہ نصیب کے گھر سے باہر نکل چکا تھا۔

اندر شہزاد چیخ رہی تھی: ”اس کے مزاج ٹھیک نہ کئے تو میرا نام بھی شہزاد نہیں۔ میں دیکھوں گی کیسے نہیں دیتا طلاق!“

باہر محلے میں لوگ کھڑیوں میں کھڑے اسے دیکھ رہے تھے۔ عورتوں نے ہونٹوں پر انگلیاں رکھی ہوئی تھیں۔ بچے اس کا منہ چڑا رہے تھے۔ راہ گیر اسے رک کر دیکھتے تھے۔ لیکن اسے اس وقت کسی کا ڈر نہ تھا۔ کسی کی پرواہ نہ تھی۔ وہ سینہ تانے چل رہا تھا۔ وہ یہ بھی بھول چکا تھا کہ اسے ہاتھوں پر کوڑ چل گیا ہے۔

محله سے باہر نکل کر اس نے دیکھا کہ سامنے سکول کے باہر ناظم کھڑا ہے۔

”ارے تم۔“ ایلی چلایا۔ ”تم کہاں۔“

ناظم کا منہ سرخ ہو رہا تھا۔ آنکھوں کا فرق بے حد نمایاں تھا۔ اس نے ہاتھ میں ہانک نکالی ہوئی تھی۔

ایلی کو دیکھ کر اس نے چار ایک گلیاں دیں:

”تم اکیلے نہیں ہو۔“ وہ چلایا۔ ”میں تمہارے ساتھ ہوں۔ میں دیکھوں گا یہ کیا کرتے ہیں۔ ان کی ایسی کی تہی۔“ اس نے ہانک نکالی۔ اور پھر مگلی دے کر بولا: ”انہوں نے تمہیں اکیلا سمجھا ہے کیا۔ میں جان دے دوں گا جو میرے یار کو کسی نے انگلی سے چھوا بھی تو۔ پولیس افسر ہیں تو پڑے ہوں۔ ہم بھی غنڈے ہیں۔“ اس کے منہ سے تھوک کے فوارے چل

ہے تھے۔

”میں صبح سے تمہارے ساتھ ہوں۔“ ناظم بولا۔ ”جب تم گاڑی سے اترے تھے۔ پھر جب تم غم کر پڑے قلعے کے راستے پھری گئے تھے اور پھر علی قلی کی عدالت کے باہر زمین پر بیٹھے دئے تھے۔ میں سب دیکھ رہا تھا۔“

”لیکن یار۔“ ایلی نے کہا۔ ”وہ مجید کون تھا۔ اس نے تو حد کر دی۔“

ناظم تہقہ مار کر ہنسا۔ ”وہ میرا یار ہے۔ میں نے ہی اسے بھیجا تھا ورنہ انہوں نے تمہیں مار کرنے کی سیکم عمل کر رکھی تھی۔“

ایلی نے حیرت سے ناظم کی طرف دیکھا۔

”دیکھتے کیا ہو۔“ وہ بولا۔ ”ہم امرتسر کے یار ہوتے ہیں۔ ریاض پکڑ اور سراب کی طرح ہتھیہ نہیں ہوتے بولے ڈر گئے۔ پیچھے ہٹ گئے۔“ اس نے غصے میں سنک گھرائی۔

”مجھے بھی مشورہ دیتے تھے کہ آگے نہ بڑھنا ورنہ آٹے کے ساتھ گھن بھی پس جائے گا۔ میں گھن ہوں گھن۔“ وہ کھڑا ہو کر چلانے لگا۔ ”مجھے پسینے والا آئے تو میرے سامنے۔“ وہ سڑک پر کھڑا دیوانہ وار چلا رہا تھا۔ اور لوگ رک کر اس کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سامنے سکول کے طلباء بھیڑ لگائے کھڑے تھے۔ اساتذہ کمروں سے جھانک رہے تھے۔

سراب کا چہرہ سمٹ رہا تھا۔ وہ بھوری آنکھیں ابھر رہی تھیں۔ پکڑ سر جھکائے کھجا رہا تھا۔ ریاض خاموش کھڑا نہ جانے کیا سوچ رہا تھا۔

ابو۔ ابو۔

قاضی پور پہنچ کر ایلی ایک بار پھر بے چارگی اور بے بسی میں کھو گیا۔ وہ دیران مکان، ٹوٹا ہوا تخت وہی دیران سکول جہاں لوگ اسے درخور اعتنا نہ سمجھتے تھے اور اساتذہ نفرت سے اس کی طرف دیکھتے تھے۔ وہی غربت جو اس روز سے اس کی سرپریوں سوار تھی جیسے جزیرے کا پڑھلا۔ ایک بار اس کے بعد اسے تاریخ پر شاہووال جانا پڑا۔ لیکن اب ہر یار ناظم اس کے ساتھ ہوتا۔ اور ناظم کے دوست اسے ایس آئی کی امداد سے حاصل تھی۔

علی قلی خاں مجسٹریٹ نے اسے عدالت میں اعلانیہ ڈانٹا لیکن اس کے خلاف کچھ نہ کر سکا۔ تمام مقدمات عدم پیروی کی وجہ سے داخل دفتر ہو گئے چونکہ شہزاد اپنی بچیوں کو لے کر لاہور

آگنی تھی۔ اس کی والدہ نے اسے مجبور کیا تھا کہ وہ شاہوال چھوڑ کر لاہور آجائے۔ اس کے جانے کے بعد اس کے حمایتی افسروں نے ایلی کی مخالفت چھوڑ دی تھی۔

پھر ایلی کو معلوم ہوا کہ شنراؤ نے محمود سے مل کر نفیسہ کی طلاق حاصل کر لی ہے۔ اس پر ایلی کو بالکل تعجب نہ ہوا۔ چونکہ محمود نے بارہا اسے خط لکھے تھے جن میں اسے مشورہ دیا تھا کہ وہ اس کی خاطر جھگڑانہ برہمائے۔ چونکہ ان حالات میں اسے نفیسہ کو طلاق دینے میں کوئی اعتراض نہ تھا چونکہ وہ نفیسہ کی مرضی کے خلاف اسے اپنے گھر میں رکھنے کے حق میں نہ تھا۔ لیکن جب اس نے یہ سنا کہ نفیسہ کا نکاح شیر علی سے ہو گیا ہے تو اس کے پاؤں تلے سے زمین نکل گئی۔ تو کیا یہ سب فسو شیر علی کا چلایا ہوا تھا اور اس کے اپنے بھائی نے شنراؤ کو اس بات پر ابھارا تھا۔ ایلی کو یہ خبر سن کر اس قدر تکلیف ہوئی کہ اس کا دل زندگی سے بالکل اچھٹ ہو گیا اور اسے یوں محسوس ہونے لگا جیسے وہ تنہا شخص ہے۔ ایک سوکھا ہوا درخت جو صحرا میں اگا ہوا ہے۔ اور ارد گرد چاروں طرف ریت ہی ریت ہے۔ ریت اور دیرانی۔

لیکن کبھی کبھار اس دیرانے سے آواز آتی۔ ”ابو ابو۔“ اور ایلی دونوں ہاتھ اٹھا کر اس کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھتا۔

ایلی کا جی چاہتا کہ چوری چوری شنراؤ کے گھر جائے اور کسی سے ملے بغیر کسی کے جانے بغیر عالی سے ملے اور اسے کہے:

”عالی! تم تو جانتے ہو۔ تم تو گواہ ہو کہ اس میں میرا قصور نہیں۔ انہوں نے مجھ سے دھوکا کیا ہے۔ تمہیں تو علم ہے جیسی تم مجھے بلاتے ہو۔ ابو ابو پکارتے ہو۔ کوئی اور میرا نام نہیں لیتا۔ صرف تم ہو عالی۔“

آخری بار

دو ایک مرتبہ وہ چوری چوری لاہور گیا بھی تھا۔

شام کے جھینپے میں وہ اس مکان کے باہر انتظار کرتا رہا تھا۔ اور جب ایک بچہ گول منول سا بچہ باہر نکلا تھا تو ایلی نے دوڑ کر ایک بڑا سا لفافہ اس کے ہاتھ میں تھما دیا تھا۔ لفافے کو دیکھ کر عالی سہم گیا تھا لیکن مٹھائی اور پھل دیکھ کر اس کی آنکھ میں چمک لہرائی تھی۔ اور پھر ایلی اس سے بات کئے بغیر وہاں سے بھاگ لیا تھا۔

ایک مرتبہ جب ایلی ایک بڑا سا لفافہ اٹھائے وہاں کھڑا تھا تو شنراؤ عالی کو اٹھائے ہوئی اور لہنتی ہوئی سامنے آکھڑی ہوئی۔ وہ شنراؤ کو دیکھ کر گھبرا گیا۔

”لے لو عالی۔“ وہ بچے سے کہہ رہی تھی۔ ”اپنے ابو سے لفافہ لے لو۔“ عالی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔

ایلی نے لفافہ بڑھا دیا اور چلنے لگا۔

”آؤ۔“ وہ بولی۔ ”جائے کا پیالہ پی لو۔“

”ایلی جوں کا توں کھڑا رہا۔“

”آ جاؤ اب کیا ہے۔“ وہ کھانتے ہوئے بصد مشکل بولی۔ ”اب تو کھیل ہی ختم ہو گیا۔“

ایلی چپ چاپ اس کے پیچھے چل پڑا۔

شنراؤ کو دیکھ کر ایلی کو نہ جانے کیا ہوا۔ اس نے بڑھ کر شنراؤ کے کندھے پر سر رکھ دیا اور اس کی چٹخیں نکل گئیں۔ شنراؤ اسے تھپکنے لگی۔

ایلی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس کے ہاتھ میں گویا کسی مردے کا ہنجر تھا۔ ہڈیاں نکل آئی تھیں۔ چہرے پر زردی پھیلی ہوئی تھی۔ اور گوشت گویا تھا ہی نہیں۔ وہ بار بار کھانسی تھی۔

”اب کیا روٹا ہے۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔“ وہ چلایا۔

”اب کمانی ختم ہو گئی۔“ وہ بولی۔

”کیا ہوا ہے تمہیں۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ٹی بی ہے۔“ شنراؤ نے مسکرانے کی کوشش کی۔

”دوائی پیتی ہو۔“

”دوائی۔“ وہ ہنسی۔ ”اب تو صرف چند روز اور ہیں۔“

ایلی کے دل پر ایک چھری سے چل گئی۔

”تو کیوں کہاں ہیں؟“ اس نے بات بدلی۔

”اوہر گئی ہیں نفیسہ کی طرف۔“ وہ کھانتے ہوئے بولی۔

”اور تم آگئی ہو۔“

اس نے ہنسنے کی کوشش کی۔ ”وہ ہوں بھی یہاں تو آگئی ہوں۔“ وہ بولی۔

”ہوں۔“ وہ خاموش رہا۔

”اب اکیلے پن کے سوا کیا ہے۔“ وہ بولی۔ ”ب تو —۔“

”شہزاد۔“ وہ بولا۔

”ہیں۔۔۔۔۔“ وہ کھانسنے لگی۔

”تم نے ایسا کیوں کیا۔ کیوں؟“

”چھوڑو اب۔“ وہ بولی۔ ”جو ہوتا تھا ہو گیا۔“

”بڑا ظلم ہوا۔“ وہ بولا۔

”ہیں۔ ہو گیا بس۔“

”چلو میں تمہیں دورا ہے لے چلوں۔“ ایللی نے کہا۔

”بے کار ہے۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

”کیوں۔“

”کیا فائدہ۔“

”شاید تم صحت مند ہو جاؤ۔“

”اب کیا فائدہ۔“ وہ بولی۔

”کیوں۔ صحت اچھی ہو جائے تو —۔“

”تو کیا ہو گا۔“ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔

ایللی اس کی بات سن کر کانپ گیا۔

”کیا حرج ہے۔“ وہ بولا۔ ”چلو تو۔“

”نہیں۔“ وہ بولی۔ ”اب میں نہیں جاتی۔“

”خند کرتی ہوتا۔“ وہ بولا۔

”چھوڑو اب ان باتوں کو۔ اتنی دیر کے بعد ملے ہو۔ کوئی اور بات کرو۔“

”صرف ایک ہی بات ہے میرے پاس۔“

”کیا؟“

”کہ آج بھی تم میرے لئے وہی شہزاد ہو جو پہلے تھی۔ وہی سبز گھڑی۔“

”ج۔“ اس نے ایللی کا ہاتھ تھام لیا۔

”ہیں۔“ وہ بولا۔

”میرا خیال تھا۔“ وہ کہنے لگی لیکن اسے کھانسی چھڑ گئی۔

”کیا خیال تھا۔“ ایللی نے پوچھا۔

”کہ تم بدل گئے ہو۔“

”نہیں۔“ وہ بولا۔ ”تمہارے ساتھ میں کبھی نہیں بدل سکتا۔“

”ج۔“ اس نے ایللی کا ہاتھ دبایا۔ ”پھر مجھ سے اس قدر خند کیوں کی۔“

”وہ اور بات تھی۔“ وہ بولا۔ ”میرے دل نے اس بات کو گوارا نہ کیا لیکن میرے دل میں

مارے لئے کبھی غصہ یا نفرت پیدا نہیں ہوئی۔“

”ج۔“ اس نے پوچھا۔

”تم بدلی ہوئی نظر آتی تھی۔“ وہ بولا۔

”چلو چھوڑو اس بات کو۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔

”کیا کرتی ہو آجکل۔“ اس نے پوچھا۔

”کیا کرنا ہے۔ پڑی رہتی ہوں۔“

”سارا دن۔“

”ہیں۔ ڈاکٹر نے اٹھنے بیٹھنے سے منع کر رکھا ہے۔“

”پھر تم باہر کیوں آتی تھی۔“

”جی چاہتا تھا آخری بار لموں۔“

”کیا واقعی۔“ اس نے پوچھا۔

”ہیں۔“ وہ ہنسی۔ ”دعائیں مانگتی تھی کہ ایک بار تم آؤ۔“

”میں تو آتا ہی رہتا تھا۔“

”مجھے پتہ نہ چلتا تھا۔“ وہ کھانسنے لگی۔

”ہوں۔“

”پھر جب عالی لفافہ لاتا تو پتہ چلتا۔ پر تم جا چکے ہوتے۔“

”اور اب کی بار۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جاگ پڑے۔“ شہزاد بے بسی سے مسکرائی۔
 ”تم نہیں سوئیں کیا؟“ اس نے پوچھا۔
 ”اب تو دیر ہو گئی۔“
 ”یعنی۔“ اس نے پوچھا۔
 ”دیر سے سونا چھوٹ گیا۔“ وہ کھانسنے لگی۔
 ”کیوں؟“
 ”نیند نہیں آتی۔“
 ”ساری رات بیٹھی رہتی ہو۔“
 ”ہاں۔“
 ”وقت نہیں گزرتا۔“
 ”باتیں یاد آتی ہیں۔“
 ”کوئی؟“
 ”ایک ایک۔“ اسے پھر کھانسی کا دورہ پڑ گیا۔
 ”اچھا۔“ وہ بولا۔ ”میں آ جاؤں گا۔“
 ”کمل۔“ اس نے پوچھا۔
 ”تمہارے پاس۔“
 ”ج۔“
 ”ہاں۔“ ایلی نے کہا۔ ”آج جا کر چھٹی لے آؤں ایک مہینے کی۔“
 ”ایک مہینے کی؟“ اس نے پوچھا۔
 ”ہاں۔ اکٹھے رہیں گے۔“
 ”اچھا۔“ اس نے ایلی کا ہاتھ دلیا۔ کب تک مل جائے گی؟
 ”ہفتے کے اندر۔“
 ”ہفتہ۔“ اس نے برا سامنہ بنایا۔ اسے پھر کھانسی چھڑ گئی۔
 ”کیوں؟“ ایلی نے پوچھا۔
 ”ہفتہ نہیں۔“ وہ بولی۔ ”جلدی۔“

”پتہ نہیں“ وہ بولی۔ ”سوئی ہوئی تھی۔“
 ”پھر؟“
 ”پھر ایسے ہوا جیسے کسی نے مجھے جھنجھوڑا۔“
 ”کس نے؟“
 ”پتہ نہیں کسی نے میرے کان میں کہا۔ مل لو۔“
 ”ہوں۔“ ایلی سوچ میں پڑ گیا۔
 ”میں نے عالی کو اٹھا لیا اور باہر نکل آئی۔“
 ”تم سے تو چلا بھی نہیں جاتا۔“
 ”نہیں جاتا۔“ وہ بولی۔ ”پر تم سے ملنا تھا اس لئے۔“
 ایلی نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے گل پر رکھ لئے۔ وہ دیر تک خاموش بیٹھے رہے۔
 ”تو تم مجھے جھوکی نہیں آج تک۔“ ایلی نے کہا۔
 ”نہیں۔“ وہ بولی۔
 ”ان دنوں تو بہت غصہ تھا۔“
 ”تھا۔ لیکن یہ بھلا مجھے بھولنے دیتا ہے۔“
 ”کون؟“
 ”یہ عالی۔“ وہ کھانسنے ہوئے بولی۔
 ”عالی؟“
 ”ہاں۔ سارا دن بیٹھا ابو کرتا رہتا ہے۔“
 ”مجھے دیکھ کر سہم جاتا ہے۔“
 ”پتہ نہیں۔ گھر میں ابو کرتا ہے۔“
 ”ہوں۔“ وہ بولا۔
 پھر کھانسنے لگی اور پھر خون تھوکا۔
 ساری رات دونوں بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ صبح کے قریب ایلی کی آنکھ لگ گئی۔ جب
 بیدار ہوا تو سات بجے تھے۔
 ”شہزاد۔“ وہ بولا۔

”اچھا۔ میں کوشش کروں گا۔ اب جاتا ہوں۔“

”اچھا۔“ شنراو نے بیٹھنے کی کوشش کی۔ ”اگر جانے سے پہلے کوٹھے پر چھوڑ آؤ۔“

”کیا مطلب۔“ ایلی نے کہا۔

”میں میزہیاں نہیں چڑھ سکتی۔ دھوپ میں بڑی رہوں تو آرام رہتا ہے۔“

”اٹھا کر لے چلوں۔“

”ہاں۔“ وہ بولی اور کھانسنے لگی۔

ایلی نے اسے دونوں بازوؤں سے اٹھا کر اپنے سینے سے لپٹا لیا۔ وہ یوں اس کی چھاتی سے

چٹنی ہوئی تھی جیسے کوئی بچہ ماں کی چھاتی سے چٹا ہو۔

”آؤں گا۔“ وہ بولا۔ ”تو روز تمہیں کوٹھے پر لے جایا کروں گا۔“

”ہاں۔ دھوپ میں مجھے آرام رہتا ہے۔“ وہ بولی۔

”اگٹھے دھوپ میں بیٹھا کریں گے۔“

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”پر جلدی آنا۔“

ایلی اسے چارپائی پر لٹانے لگا تو شنراو کا سر پٹنگ کے پائے سے ٹکرا گیا۔

”اوہ۔“ وہ بولا۔ ”تمہیں چوٹ آئی ہے۔“

”اچھا ہوا۔“ وہ بولی۔

ظاہر تھا کہ شنراو کو بے حد چوٹ لگی ہے۔

”مجھ سے غلطی ہوئی۔“ ایلی نے کہا۔

”اچھا ہوا۔“ وہ بولی۔ ”تمہارے ہاتھوں چوٹ آئی ہی تھی مجھے۔“

”کیوں۔“

”بس۔ اچھا ہی ہوا۔“ وہ کھانسنے لگی۔

وہ دیر تک اس کا سر ہاتھوں سے مٹا رہا اور پیار سے اسے دباتا رہا۔ وہ بڑی محبت سے اسے

دیکھ رہی تھی۔

”اچھا میں اب جاتا ہوں۔“ وہ بولا۔

شنراو نے چپ چاپ اسے دیکھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو تھے۔

قاضی پور پہنچ کر وہ سیدھا سکول پہنچا۔

دکا

اس روز اس نے محسوس کیا کہ قاضی پور کے سکول کی عمارت بہت بڑی اور خوبصورت اور لمبھے پارک بڑے سلیقے سے بنایا گیا تھا اور گراؤنڈ میں سفید کے درخت بہت

درخت لگتے تھے۔ سکول میں آدمی چھٹی ہو چکی تھی۔ اساتذہ حسب معمولی باغیچہ میں بیٹھے تھے۔ پہلی مرتبہ

انڈے کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”آئیے آئیے الیاس صاحب۔“ ایک صاحب نے گرمجوشی سے اس کا استقبال کیا۔

”آپ تو الگ تھلگ رہتے ہیں۔“ دوسرے صاحب بولے۔

”کبھی صورت ہی نہیں دکھائی۔“ تیسرے صاحب بولے۔

آپ جیسی صورت ہو تو مجھے بھی دکھانے میں کوئی ہچکچاہٹ نہ ہو۔“ ایلی نے کہا۔

انہوں نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا اور مسکرانے لگے۔

”وہ صاحب۔“ ایک صاحب کہنے لگے۔ آپ تو بولنے لگے۔“

”میرا قصور نہیں۔“ ایلی نے کہا۔ موسم ہی ایسا ہے۔“

”تو آپ فیدر کاک ہیں۔“ دوسرے صاحب نے کہا۔

اس پر ایک قہقہہ پڑا۔

اس روز دیر تک وہ اساتذہ سے باتیں کرتا رہا۔

شام کو وہ ہیڈ ماسٹر صاحب سے ملا اور چھٹی کی درخواست پیش کر دی۔

”دیکھئے الیاس صاحب۔“ انصاری بولے۔ ”میں ایک ماہ کی چھٹی تو منظور نہیں کر سکتا۔ ہاں

اٹھا کر کے لاہور بھجوا دیتا ہوں۔ منظور ہو جائے تو آپ شوق سے چھٹی پر چلے جائیے۔“

”اب تک منظور ہو جائے گی۔“ اس نے پوچھا۔

”ایک ہفتہ لگے گا۔“ وہ بولے۔ ”کم از کم۔“

”ممت خوب۔“

جب وہ گھر پہنچا تو اس نے محسوس کیا کہ اسے چند ایک چیزیں خرید کر گھر میں رکھنی

بہرہ خواہش ایلی نے اس شدت سے محسوس کی کہ وہ اسی وقت بازار چلا گیا تاکہ پتہ لگائے

نے وہ خط ہاتھ میں تھام لیا اور بدستور ہیڈ ماسٹر صاحب سے باتیں کرتا رہا۔ "انصاری
ے حالات میرے بس میں نہیں۔ کچھ ایسی الجھنیں ہیں۔ میں کوشش ضرور کروں گا۔

"

"ارے بھائی۔" انصاری بولے۔ "اس تار کو پڑھ لو پہلے۔"

"تار۔" ایللی نے ہاتھ کے لفافے کی طرف دیکھا۔

اس نے جلدی سے تار کھولا۔

"کیوں۔ خیریت تو ہے؟" ہیڈ ماسٹر نے پوچھا۔

"جی۔" ایللی چونکا۔ وہ پھر کھو چکا تھا۔ اس نے تار ہیڈ ماسٹر کے ہاتھ میں تھما دی۔

ماقتہ

"شہزاد کل رات فوت ہو گئی۔ جنازہ صبح نوبے ہو گا۔"

سانے گھڑی گیارہ بج رہی تھی۔

گرد و پیش پر دھند لکا چھا چکا تھا۔

انصاری کے ہونٹ مل رہے تھے۔

باغیچے میں ایک بڑے سے پتک پر ایک لاش پڑی تھی۔

پاس ہی ایک بچہ دونوں ہاتھ اٹھائے چلا رہا تھا۔ "ابو۔ ابو۔" پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے چلا

بارہا تھا

"اب کیا ہے۔ اب کیا ہے۔" لاش منہ سے چادر اٹھا کر کہہ رہی تھی راستے کی رکاوٹ۔

ایل ہونک رہی تھی۔ انجن چینیں مار مار کر رو رہا تھا۔

تنگے والے چلا رہے تھے۔

پھر بہت سے لوگ دروازے اور کھڑکیوں میں کھڑے اسے گھور رہے تھے۔

"وہ آگیا۔ وہ آگیا۔"

"ہٹ جاؤ۔ ہٹ جاؤ۔"

"اب آیا تو کیا آیا۔"

یہ ہو کے رہے گا۔ "حاجی صاحب مسکرا رہے تھے۔

"تم آگئے۔" شہزاد اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

کہ آیا اسے چند ایک چیزیں کرایہ پر مل سکتی ہیں۔ دیر تک وہ بڑے بازار میں گھومتا رہا۔

"کیا فر۔ پھر کرایہ پر دیتے ہیں۔" اس نے پوچھا۔

"ہاں ہاں۔ کیوں نہیں۔" لڑکے کے والد نے کہا۔ "آپ فرمائیے آپ کو کیا چاہیے۔"

رات کو دیر تک وہ مکان میں فرنیچر کی چند چیزیں سجا رہا اور پھر سو گیا۔ اس روز گویا اس کی

دنیا ہی بدل ہوئی تھی۔

ایللی کے بدلے ہوئے رویے کو دیکھ کر تبسمی حیران تھے۔

جماعت میں وقت کاٹنے کی بجائے اس نے پڑھانا شروع کر دیا تھا۔ نویں جماعت کے لڑکے

تو اس کے دو ایک سبق سن کر بے حد خوش ہوئے تھے۔

اساتذہ بھی اب اس میں دلچسپی لینے لگے حتیٰ کہ انصاری صاحب نے بھی اس تبدیلی کو

محسوس کیا تھا۔ انہوں نے ایللی کو بلا کر اس سے بات بھی کی تھی۔ بولے:

"الیاس صاحب۔ کیا یہ ممکن ہے کہ آپ اپنی لمبی چھٹی کو ملتوی کر دیں۔"

ایللی نے گھبرا کر ان کی طرف دیکھا۔

"دیکھئے نا۔" انصاری بولے۔ "امتحانات بالکل قریب ہیں۔ اگر آپ چھٹی پر چلے گئے تو نتیجہ

پر برا اثر پڑے گا۔"

"جی۔" ایللی نے کہا۔ "لیکن مجبوری ہے۔"

"آخر آپ کس لئے چھٹی لے رہے ہیں۔"

"جی میری بیوی بیمار ہے۔"

"آپ انہیں یہاں کیوں نہیں لے آتے۔" انصاری نے کہا۔

"جی وہ بہت بیمار ہے۔"

"اگر میں موٹر کا انتظام کر دوں تو۔"

"شاید۔" ایللی نے کہا۔ "شاید یہ ممکن ہو۔"

"آپ کوشش کریں گے۔"

"جی۔" وہ بولا۔ "کروں گا۔ اگر ممکن ہو اتو۔"

ابھی وہ ہیڈ ماسٹر سے بات کر رہا تھا کہ ڈاکہ آگیا۔ اس نے ایک لفافہ سا اٹھایا ہوا تھا۔

"جی۔" وہ بولا۔ "الیاس آصفی۔"

”ابو۔ ابو۔“ دو ننھے ننھے ہاتھ اس کی طرف بڑھے۔

ایلی نے ایک بچے کو سینے سے چمٹا لیا۔

پھر وہ جا رہا تھا۔ نہ جانے کہاں جا رہا تھا۔

چاروں طرف قبریں پھیلی ہوئی تھیں۔

ایک بڑی سی قبر سامنے آگئی۔ اس پر تازہ پھول پڑے ہوئے تھے۔

وہ قبر پھیلنے لگی۔ پھیلتی گئی۔ حتیٰ کہ سارا قبرستان اس کی لوث میں آ گیا۔

پھر وہ ابھرنے لگی۔ ابھرتی گئی زمین سے آسمان تک پھیل گئی۔

”تم آگئے۔“ ایک جانی پہچانی آواز آئی۔

پھر ایک سیلاب امنڈ آیا۔ پانی ہی پانی۔ وہ قبر اس پانی میں بہہ گئی پھر وہ بچوں۔

پھر وہ بچوں کی طرح بلبلاتا کر جنھیں مار رہا تھا۔ اس سیلاب میں ڈوب رہا تھا۔

دھنسا۔ اس کی نگاہ اس بچے پر پڑی جو اس کے سینے سے چمٹا ہوا تھا۔ ”ابو۔ ابو۔“

وہ اٹھ بیٹھا جیسے دھنسا۔ اسے سارا مل گیا ہو۔ جیسے زندگی میں پھر سے مفہوم پیدا ہو گیا ہو۔

”عالی عالی“ اے کوئی جنموڑ رہا تھا۔

اسے عالی کو اس سیلاب سے پہچانا تھا۔

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ دیوانہ وار بھاگ رہا تھا۔

”ابو۔ ابو۔“ ریل گاڑی چیخ رہی تھی۔ ”ابو۔ ابو۔“

سامنے شہزاد کھڑی مسکرا رہی تھی۔

پاکستان

ایک چھوٹا

مینے کی چھٹی گزارنے کے بعد گویا اس کے دل کی گہرائیوں سے ایک نیا آدمی ابھر آیا تھا۔
ایسا آدمی جسے اپنے ماضی سے نہ لاگ تھا نہ لگاؤ جو اپنی گزشتہ زندگی پر نہ تو شرم محسوس کرتا
نہ بیٹے ہوئے واقعات کو ذہن میں دہرانے کا شوق رکھتا تھا۔ اسے اپنے گزشتہ افعال پر پشیمانی
نہی نہ تھی وہ اس پر فخر کرتا تھا۔ جو بیت چکا تھا۔ وہ اپنے گزشتہ عشق کو حماقت نہیں سمجھتا تھا۔
اب بھی عشق کی عظمت کا اعتراف تھا۔ وہ حماقتوں کی اہمیت کا معترف تھا۔ وہ جانتا تھا کہ ان
نہی نے اس کی زندگی میں رنگ پیدا کیا ہے۔ وہ حماقتیں فطری تھیں انسانیت بخش تھیں۔ وہ
ملا دہرانے کا بھی شوقین نہ تھا۔ اس کی گزشتہ زندگی اس کے مستقبل پر تاریک سایہ نہیں
ارہی تھیں۔

یہ محض حسن اتفاق تھا کہ اس کی گزشتہ زندگی کے پھوڑے اور پھینسیوں نے اس کی
ت شخصیت کردار، خیالات، محسوسات پر کوئی داغ نہ چھوڑا تھا۔ اسے اس حسن اتفاق کا
ت سے احساس تھا۔ یہ بھی ممکن تھا کہ وہ اپنی گزشتہ زندگی سے عشق لگا کر بیٹھ جاتا اور شریف
طرح باقی زندگی آپس بھرنے اور چھت کی طرف حسرت بھری نگاہوں سے دیکھنے میں بسر کر
دیتا اپنی گزشتہ زندگی کو قاتل نفیرین قرار دے کر من نہ کر دم شامہذر بکنسیہ کا پرچارک بن

اسے یہ بھی احساس تھا کہ یہ زاویہ نگاہ اس کی اپنی کوششوں کا نتیجہ نہیں اس لیے اس نے
”کچھ بھی تو نہ کیا تھا۔ اسے احساس تھا کہ گزشتہ زندگی سے اغذ کیے گئے لاگ یا لگاؤ سے

صاحب کے رد برو اظہار کیا تھا۔

دوتین

قاضی پور سے ایلی کا تبادلہ ہو چکا تھا۔ اور اب وہ گروتین میں مقیم تھا۔ گروتین ایک چھوٹا ڈھسورت سا قصبہ تھا۔ اس میں دو ایک کشادہ سڑکیں تھیں جن پر ہنگے خور کالنج بنے ہوئے دو ایک تنگ و تاریک بازار تھے شہر کے باہر چند ایک صاف ستھری آبادیاں تھیں کچھ حصہ گھٹا ہوا تھا جیسے پرانے شہروں میں ہوتا ہے۔ گروتین میں طرز کس اور طرز جدید دونوں پہلو موجود تھا۔

بازاروں میں بھیڑ تھی سول لائسنز نمائندے میں خوبصورت ویرانی تھی۔ ایلی کو ویرانی پسند نہ آئی اور اس کا مکان بھیڑ اور ویرانی بھرے علاقوں کے سقم پر تھا۔ گھر میں عالی تھا اور ایلی کی ماں نے۔ اب ایلی اکیلا نہیں رہ سکتا تھا اس لیے کہ عالی سے الگ رہنا تکلیف دہ تھا۔ چونکہ اس کو اپنی تمام تر محبت عالی پر مرکوز کر دی تھی۔ اس محبت میں ہٹیریا کا عنصر نہ تھا۔ پھر بھی اس کی اتر توجہ عالی پر مرکوز تھی غالباً گزری ہوئی تنخی کو بھلانے کے لیے اس نے عالی کا سارا لے لیا تھا۔

عالی ایک بھرا سا لڑکا تھا۔ اس کے نقوش موٹے تھے۔ چہرے پر بے حسی چھائی ہوئی تھی۔ اس کی خاصی حد تک بے ربط تھیں۔ اس کے خدوخال میں قطعی طور پر شہزاد کی جھلک نہ تھی۔ ہاجرہ کا ایلی کے پاس رہنا ناگزیر تھا۔ چونکہ چار سال کے بچے کو پاس رکھنا ایلی کے لیے ممکن نہ تھا وہ اکیلا نہ تو اس کی دیکھ بھال کر سکتا تھا۔ اور نہ اسے گھر میں اکیلا چھوڑ کر خود نوکری کے فرض ادا کر سکتا تھا۔

ایلی نے پھر سے مطالعہ شروع کر دیا تھا۔ زندگی میں اس نے پہلی مرتبہ بلا واسطہ کتاب اٹھائی تھی اس سے پہلے اس نے کئی مرتبہ شدت سے مطالعہ کیا تھا۔ لیکن اس کی حیثیت محض فرار کی تھی۔ تلخ واقعات کو بھولنے کے لیے اس نے کئی بار کتاب کا سارا لیا تھا۔ لیکن اب پہلی مرتبہ اس نے کتاب کے لیے مثبت شدت سے محسوس کی تھی۔

سارا دن یا تو وہ پڑھتا اور یا غلطی سے کھینچا رہتا اور پھر اس کا جی چاہتا کہ شام کو کسی طرف لے جائے اور پھر کسی غلام کے پاس جا بیٹھے۔ اور ستر کی لرزشیں اسے چاروں طرف سے گھیر

”ابو۔ ابو۔“ دو ننھے ننھے ہاتھ تھے لیکن اسے یہ علم نہ تھا کہ یہ نعمت کس کی دین ہے۔ ایلی نے ایک بچے کو۔ سے وہ ابھی تک بچہ تھا۔ ذہنی طور پر اس کی پختگی اور بڑھ گئی تھی۔ پھر وہ جارہا تھا۔ حظ سے زندگی نے اسے کچھ نہ سکھایا تھا۔ ذہنی لحاظ سے ہر تجربہ ہر مشاہدہ اس کے لیے ایک نئی کھلی بن کر رہ جاتا تھا۔ اور اس کی شخصیت پر اثر انداز ہوتا تھا۔

زندگی کے دریا کے بہاؤ کی منجھدار گزر چکی تھی۔ اب وہ پایاب پانی میں چل رہا تھا۔ لیکن پایاب پانی میں پہنچ کر الیاس آصفی نے دفعتاً محسوس کیا کہ وہ آزاد ہے۔ قطعی طور پر آزاد۔ اپنی ان کی بندشوں سے آزاد اس کی آنکھوں سے ذاتیات کے چشمے اتر گئے تھے۔ اب وہ دنیا کو دیکھ سکتا تھا۔

دنیا بے حد وسیع تھی۔ مگر وہ بلا کی وسعت اور اسی پیدا نہیں کر رہی تھی۔ اس میں ایک عجیب سی عظمت تھی۔ اس نے پہلی مرتبہ دوسروں کو دیکھا۔ اس کے رد برو سینکڑوں ایلی تھے جو جذبات کے بھنور میں ڈبکیں کھا رہے تھے۔ وہ انہیں قابل نفیر نہیں سمجھتا تھا۔ ان کا مذاق نہیں اڑاتا تھا۔ اسے ان سے ہمدردی تھی اس کے دل میں ان کی عزت تھی۔

ایلی میلے سے واپس آ رہا تھا۔ لیکن جو میلے کو جا رہے تھے ان پر خندہ زن نہ تھا۔ وہ سمجھنے لگا تھا کہ بھرپور شوق سے میلے کو جانا بھی ضروری ہے۔ اور بے لاگ لگاؤ وہاں سے لوٹنا بھی ضروری ہے۔

اس کے خیال میں محبت ایک عظیم تجربہ تھا۔ اور اس عظیم تجربے کے چار ضروری دور تھے۔ پہلا یہ کہ شدت سے محبت کرے دوسرے اسے محبت میں عظیم کامیابی حاصل ہو یعنی سخت پر بیٹھے اور مور چھل کرائے۔ تیسرے یہ کہ محبوب اس کی تذلیل کرے اور دھکا دے کر سخت سے نیچے پھینک دے ذلت اور رسوائی چاروں طرف سے اسے گھیر لیں اور چوتھا یہ کہ وہ عشق کامیابی تذلیل اور رسوائی سب سے بے نیاز ہو جائے۔ بے لاگ بے لگاؤ۔

اس کا یہ نظریہ جسمانی عشق کے متعلق تھا۔ افلاطونی یا روحانی عشق کے متعلق سے وہ واقف ہی نہ تھا۔ افلاطونی عشق تو محض ایک قصہ تھا۔ البتہ روحانی عشق کے وجود سے وہ منکر نہ تھا۔ لیکن اسے کبھی سمجھ میں نہ آیا کہ روحانی عشق کا مطلب کیا ہے۔ ایک انسان کس طرح اللہ سے محبت کر سکتا ہے۔ اس نے کئی ایک مرتبہ مرشد کا نام سنا تھا۔ لیکن بیعت اور مرشد کے متعلق ابھی تک اس کے وہی خیالات تھے جن کا کسی زمانے میں دلی کی جامع مسجد میں اس نے

لیں اور وہ ان میں ڈوب جائے۔

ایلی کے کردار کی شدت اگرچہ بہت کم ہو چکی تھی پھر بھی وہ مٹھاس بھرے تاثرات کا مٹھن تھا ایسے تاثرات جو اس کی شخصیت کے کونوں کو تراش کر ہموار کر دیں۔ بچی کچی ستیروں کو سمیٹ لیں۔ اس کے نزدیک موسیقی سے بڑھ کر کوئی چیز نہ تھی۔ جو اسے سکون سے ہم آہنگ کر سکتی تھی۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ اپنی شخصیت میں لے پیدا کرے۔ پھر دفعتاً اسے خیال آیا کیوں نہ میں طبلہ بجانا سیکوں۔

اس نے اس سلسلے میں تحقیق کی۔ لیکن ہر جگہ سے اسے ایک ہی جواب ملا۔ سارے گروپن میں صرف ایک ہی فرد تھا جو طبلہ بجانے اور ریتمی محفل کے لیے مشہور تھا۔ اور غالباً اسی وجہ سے سب لوگ اسے رنگی کہتے تھے۔

رنگی کسی سرکاری دفتر میں انسپٹر تھا۔ ایلی کو یقین نہ آتا تھا کہ کوئی انسپٹر طبلے میں دلچسپی لے سکتا ہے۔ اس لیے اس نے انسپٹر سے ملنے کا خیال ہی ترک کر دیا۔ اسے ایک بڑے عمدے دار سے راہ ورہ پیدا کرنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔

گروپن میں جو مکان انہیں ملا اس کے پڑوس میں ایک اویڑ عمر کی عورت اور دو لڑکیاں رہتی تھیں وہ وقت بے وقت ان کے گھر آ جاتی تھیں۔ اور بے حجابانہ ایلی کی طرف دیکھ کر پراسرار طور پر مسکراتی رہتیں۔

ایلی نے پہلے تو ان سے دور رہنے کی کوشش کی۔ وہ گھر میں داخل ہو تھیں تو ایلی کمرے میں کھس جاتا۔ وہ کسی نہ کسی بہانے کمرے میں پہنچ جاتیں تو وہ باہر صحن کی طرف بھاگتا۔ ایک روز جب وہ صحن کی طرف جانے لگا تو بڑی لڑکی اس کا راستہ روک کر کھڑی ہو گئی۔ اور باہمی انداز سے مسکرانے لگی۔ ایلی کو اس کی مسکراہٹ بہت بری معلوم ہوئی۔ اب وہ ان جمیلیوں میں نہیں پڑنا چاہتا تھا۔ اسے عورت میں وہ خصوصی دلچسپی نہ رہی تھی جو کسی زمانے میں محسوس کیا کرتا تھا۔ جوانی میں وہ عورت سے ڈرتا تھا۔ اس لیے اس کی طرف بری طرح کھنچا جاتا تھا۔ ڈر اور دلچسپی۔ عورت اس کے دل میں یہ دو جذبات پیدا کرتی تھی۔ نتیجہ یہ تھا کہ عورت کو اس نے بے حد اہمیت بخش رکھی تھی۔

پھر عورت کے متعلق اس کے خیالات تخیلی سے بھر گئے۔ وہ بے وفا تھی، اس پر بھروسہ نہیں کیا جاسکتا تھا۔ وہ مردوں کو کھلونا بنا کر ان سے کھیلتی تھی وہ ایک سنہرا جیل تھی۔ لیکن اس

باوجود اس کا سحر عظیم تھا۔

اب وہ محسوس کرنے لگا تھا کہ عورت ایک کمزور اور بے بس مخلوق ہے۔ اور اس کی بات میں گہرائی نہیں۔ اس کی شخصیت عظمت سے خالی ہے۔ قدرت کی طرف سے وہ تخیل پر رہے۔

شاید اسی وجہ سے اسے ان دو لڑکیوں سے قطعاً دلچسپی پیدا نہ ہوئی بلکہ اس نے سوچا کہ وہ اس کی آزادی میں مغل ہو رہی تھیں۔ اس لیے اس نے کوشش کر کے اپنا مکان بدل لیا۔ اور وہ لڑکے کو نے پر ایک چھوٹے سے مکان میں منتقل ہو گئے۔

رنگی

پہلے روز ہی رات کے وقت اس کے کان کھڑے ہوئے کوئی شخص طبلہ بجا رہا تھا۔ پھر کسی نے کھانا شروع کر دیا۔ اسے غلام یاد آ گیا۔

اگلے روز شام کے وقت ایلی نے پھر طبلہ کی آواز سنی۔ وہ چپکے سے گھر سے باہر نکل گیا۔ زہب ہی پڑوس میں ایک بیشک سے طبلہ بجانے کی آواز آرہی تھی۔ اس نے دور کھڑے ہو کر بیشک کی طرف دیکھا۔

ایک خوش پوش نوجوان سوٹ پہنے ہو لگائے فرش پر بیٹھا طبلہ بجا رہا تھا۔ اس کا لباس زراعت تھا۔ انداز سے معلوم ہوتا تھا جیسے کوئی ارسٹو کریٹ ہو۔ لیکن اس کے باوجود اس کے ہارے میں ہلاکی جاوہیت تھی اس کی شخصیت سے مٹھاس کے چھینٹے اڑ رہے تھے۔

ایلی قریب چلا گیا۔

”آئیے آئیے۔“ وہ مسکرایا ”بیٹھے۔“

”نہیں نہیں۔“ ایلی بولا۔ ”آپ شغل جاری رکھیے میں یہیں سے سنوں گا۔“

”آئیے بیٹھے۔“ وہ بولا ”آ بھی جائیے۔“ وہ پھر مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ بے حد دلنواز

”اب آ بھی جائیے۔“

ایلی اندر داخل ہو گیا۔

دیر تک وہ طبلہ بجاتا رہا۔ ایلی چپ چاپ سنتا رہا۔

پھر اس نے طبلہ ایک طرف رکھ دیا۔ اور بولا ”لجئے میں ذرا استالوں۔ اجازت ہے؟“
 وہ یوں ہنس ہنس کر باتیں کر رہا تھا جیسے عرصہ دراز سے اسے جانتا ہو۔
 ”آپ کو اس میں دلچسپی ہے کیا؟“ اس نے طبلہ کی طرف اشارہ کیا۔
 ”سننے کا شوق ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔
 ”یہ تو کلن کا رس ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”جس کے کلن میں رس ہے اس کی روح میں مٹھاس ہے۔“

”جی ہاں۔“ ایللی نے جواب دیا۔ ”کلن میں رس نہیں لیکن روح میں مٹھاس پیدا کرنے کی آرزو ہے۔“

”سب رنگ رس کا کھیل ہے۔“ وہ بولا۔

”آپ کی تعریف؟“ ایللی نے پوچھا۔

”مجھے رنگی کہتے ہیں۔“

”رنگی؟“

”ہاں طنز کہتے ہیں۔“ وہ بولا۔ ”بے رنگ ہوں نا اس لیے۔“

”بے رنگ ہیں آپ۔“ ایللی نے کہا۔ ”ایسا اچھا طبلہ بجاتے ہیں۔“

”اومٹوں۔“ وہ بولا۔ ”زندگی صرف کردی لیکن سمجھ لیجئے کھودی۔ بات پیدا نہیں ہوئی۔“

”نہیں ہوئی۔“

”بالکل نہیں ہوئی۔“ وہ بولا۔ ”رس پیدا نہیں ہوا۔ صرف ڈب ڈب کرنا سیکھ لیا ہے۔“

”صرف فارم روح نہیں شور ہے دھڑکنیں نہیں۔“

ایللی حیرانی سے اس کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس قدر رنگین شخصیت۔ اس کی ہر بات میں

رنگ تھا رس تھا۔ انداز بیان میں، چھوٹی چھوٹی حرکت میں۔ نگاہ میں، تکلم میں، گروہن کے صرا

میں وہ پہلا نکلستان تھا۔

رنگی پھر سے طبلہ بجانے میں مصروف ہو چکا تھا۔ طبلہ بجاتے ہوئے اس کی بیشک بھی

عجیب تھی چھاتی نکلی ہوئی۔ سر اٹھا ہوا۔ کتنا وقار تھا اس بیشک میں ایللی اس کی طرف غور سے

دیکھ رہا تھا۔

دفعتاً وہ مسکرایا۔ ”تکلیف نہ ہو تو ذرا آگے سے ہٹ جائیے۔ ذرا اوھر کو۔“ انہیں

ہٹ ہوتی ہے اس لیے کہتا ہوں۔“ رنگی پھر مسکرایا۔

”کسے تکلیف ہوتی ہے؟“ ایللی پوچھا

”شرمیتی کو۔“ وہ مسکرایا۔

شرمیتی وہ حیران تھا۔ لیکن مزید بات پوچھنے کی اسے ہمت نہ ہوئی۔

کچھ دیر رنگی اسی طرح بیٹھا رہا۔ پھر آپ ہی آپ مسکرا کر بولا۔ ”شب بخیر شب بخیر جائیے۔“

لام فرمائیے۔“ اس کا روئے خطاب ایللی کی طرف نہ تھا۔

شرمیتی

”ارے۔“ ایللی حیران تھا کہ وہ کس سے بات کر رہا ہے اس نے دروازے سے باہر دو ایک

دور کھا تھا۔ لیکن باہر گھٹا ٹپ اندھیرا تھا۔

”معاف کیجئے گا صاحب۔“ رنگی ایللی سے مخاطب ہوا۔ ”شرمیتی آ جاتی ہیں تو مجھے انہیں

لا کر پڑتا ہے۔ اکثر آتی ہیں۔ مطالبہ یہ ہے کہ دروازے کے سامنے بیٹھو۔ روشنی منہ پر

ہے۔ دروازے میں کسی کو کھڑا ہونے نہ دو ہم تو احکامات کے پابند ہیں۔“

”کون ہے وہ؟“ ایللی نے پوچھا۔

”ہے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنے مہمانوں میں سے ایک ہے۔ اپنی زندگی ان مہمانوں کی نگاہ کرم

کے ہمارے بیت رہی ہے۔“

رنگی سے مل کر ایللی ساری رات بیٹھا سوچتا رہا۔ رنگی میں کس قدر جلاہیت تھی۔ کتنا رنگین

لدا تھا۔ ایللی نے پہلے روز ہی محسوس کیا گویا وہ رنگی کے بے حد قریب ہو بہت قریب۔

اس کے بعد اس کا معمول ہو گیا کہ مدرسہ سے آ کر ایک پیالہ چائے پیٹ میں انڈیل کر وہ

اگلی کے پاس جا بیٹھتا۔ رنگی کی شخصیت سے رنگ کے چھیننے اڑتے اور بھیگ بھیگ جاتا۔

”ایللی صاحب۔“ تیسرے ہی روز رنگی نے مسکرا کر کہا۔ ”آپ شرمیتی کے چائنسز تباہ

کرنے پر کیوں تلے ہوئے ہیں۔ دروازے سے ہٹ جائیے نا۔ انہیں دیکھ کر اپنا شوق پورا کرنے

بجائے۔“

ایللی نے مرکز دروازے سے دیکھا۔

دور سے ایک بڑی سی کوٹھی کی چار دیواری پر ایک رنگ دار گھٹا سا رکھا ہوا تھا۔ ”لومٹوں

یہ فاول ہے۔“ رنگی بولا۔ ”اوسر اعلانیہ دیکھنا فاول ہے۔ ہاں اندر بیٹھ کر چھپ کر شوق سے دیکھئے۔ میرے سارے دوست دیکھتے ہیں مطلب یہ ہے کہ شرمیلی یہ سمجھیں کہ ان کے بارے میں کوئی کچھ نہیں جانتا۔ حالانکہ میرے بھی دوست جانتے ہیں اور شرمیلی جانتی ہے کہ وہ جانتے ہیں۔ اور چھپ چھپ کر اسے دیکھتے ہیں لیکن وہ اپنے آپ کو دھوکا دینا چاہتی ہیں کہ اس راز کو صرف ہم دونوں جانتے ہیں وہ خود اور میں۔ کیا پیارا دھوکا ہی۔ ساری شر۔ بتل ہی پیارے دھوکے ہیں۔ جی چاہتا ہے کہ ان پیارے دھوکوں کا ایک جھگڑا لگا رہے۔ اور میں اس میں ڈوبا رہوں۔“ ایللی نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”ہاں یہ ٹھیک ہے۔“ وہ ایللی کی طرف دیکھے بغیر بولا۔ ”میں انہیں دیکھوں آپ مجھے دیکھیں۔“

کچھ دیر تک وہ دیکھتا رہا پھر مسکرا کر بولا۔ ”لجئے“ شرمیلی چلی گئیں غالباً پتا جی آگئے۔“

”وہ کون ہیں ان کے پتا جی؟“

رنگی نے جھرجھری لی۔ ”پتا جی وہ ہیں جو چاہیں تو مجھے تین سال کے لیے اندر کر دیں۔“

”یعنی۔“ ایللی نے حیرت سے پوچھا۔

”مجسٹریٹ ہیں غالباً اور روز دعائیں مانگتے ہیں کہ میں کبھی ان کے بچے میں پھنس جاؤں۔“

”ارے۔“ وہ چلایا۔ ”میں آپ سے باتیں کرنے میں وقت گنوا رہا ہوں اور اوسر وہ انتظار کر رہے ہیں۔“ وہ دوڑ کر باہر نکلا اور بیٹھک سے باہر کھڑا ہو کر دوسری سمت دیکھنے لگا۔

ایللی جو کاتوں بیٹھا رہا۔

کچھ دیر کے بعد رنگی داخل ہوا وہ مسکرا رہا تھا۔

”یہ کون تھے؟“

”اپنے ایک مہربان دوست ہیں۔ اپنی زندگی میں اور ہے ہی کیا۔ اسپکڑی کی بک بک۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”اسپکڑی؟“ ایللی نے رنگی کی طرف دیکھا۔

”نو کری لور کیا۔“ وہ بولا

”تو کیا آپ اسپکڑ ہیں؟“

”ہاں۔“ بڑی ذلیل چیز ہے یہ اسپکڑی۔ دم گھٹتا ہے۔“

تو یہ وہی اسپکڑ تھے جنہیں ملنے سے ایللی ہچکچاتا تھا۔

”جی چاہتا ہے۔“ رنگی بولا ”کہ آج ہی استعفیٰ دے دوں پر گزراہ گزر کیسے ہو گا۔ دال روٹی سے بھی جواب مل جائے گا۔ مجبور ہوں۔“

رنگی کی شخصیت میں رنگ اور رس کے علاوہ عجیب تضاد تھے۔ بمعاً وہ ایک محبوب تھا۔ لیکن اس کے باوجود اس میں عشق کرنے کے لیے بے پناہ تڑپ تھی۔ عشق میں وہ ایک بمخوار تھا جو پھول پھول بیٹھ کر رس چوستا ہے۔ اس کے علاوہ اس میں واضح ناسیت کی جھلک تھی۔ لیکن جسم مردانہ خصوصیات کا حامل تھا۔ اس کی حرکات و سکنات میں ایک عظیم مرد کی جھلک تھی۔ کردار میں بھی مردانہ رنگ تھا۔ تیسری بات یہ تھی کہ وہ پیدائشی ارسنوکریٹ تھا مگر اس کے خیالات اور جذبات میں عوام سے بے پناہ ہمدردی تھی اور وہ خود کو ہمیشہ عوام میں سمجھتا تھا۔ اور آخری بات یہ تھی کہ اسے اپنی بیوی سے محبت تھی۔ بہر حال زندگی کی بے پناہ شخصیت نے ایللی کو جذب کر لیا اور وہ گھرے دوست بن گئے۔

رضی

پھر ایک روز رضی آگیا۔

رضی رنگی کا دوست تھا لیکن اس میں کوئی خصوصیت نہ تھی۔

رضی اوجڑ عمر کا آدمی تھا۔ بدن فربہی پر مائل تھا۔ چہرے پر اکتاہٹ برس رہی تھی۔ بال سفید ہو رہے تھے۔ اس کی طرف دیکھ کر محسوس ہوتا تھا۔ جیسے وہ اپنی زندگی بیت چکا ہو اور اب کنارے پر بیٹھ کر نظارہ کر رہا ہو۔ گزشتہ زندگی کی جھلک اس کی آنکھوں سے صاف ظاہر تھی۔

رضی کی آنکھیں بھری بھری تھیں جیسے نہ جانے کیا کیا جذب کر چکی ہوں۔ ان میں ایک دیا آبلو تھی۔ ایک شوخ و شنگ دنیا جیسے ان آنکھوں سے کبھی رنگ کی پچکاریوں کے فوارے نکلے ہوں جیسے وہ کبھی سرخ چیونٹیوں کے مسکن رہی ہوں۔ وہ بلائنگ پیپر اب بھی بھرے ہوئے تھے لیکن اب نہ تو ان میں تلخی تھی نہ شدت۔ مٹھاس کی پھلجڑی چل رہی تھی۔ مسکراہٹ اس مٹھاس کو ہوا دیتی تھی۔

”ان سے ملیے یہ میرے نئے دوست ایللی ہیں، نام تو الیاس آصفی ہے۔ لیکن مجھے ایللی پسند

”نہیں۔“ رضی نے جواب دیا۔ ”النا اب تو ملھاس ہی ملھاس ہے۔“ اس نے ایک ملھاس بھری مسکراہٹ چمکائی۔

”رنگی تو مصروف کار ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”اچھا ہے۔“ رضی بولا۔ ”جو مصروف ہے وہ مصروف ہے۔“

”نصیحت کرنے کو جی نہیں چاہتا کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

رضی پھر ہنسا۔ ”لوگوں نے ہمیں بہت کی تھیں۔“

”کیا۔“

”۔“

”پھر۔“

”وہ اپنا وقت ضائع کرتے تھے۔ ہم نہیں کرتے کیوں کریں۔ یہ سب بھگوان کی لیلیا ہے۔“

رضی مسکرایا اور پھر چھوٹی آواز میں گانے لگا۔

”گردھر کی مرلیا باجے رے — مدھون میں راوھکل ناچے رے۔“

گردھر کی مرلیا باجے رے۔“

ایللی کے لیے یہ ایک نیا نظریہ تھا۔ کتنا رنگین تھا۔ کتنا پیارا تھا۔

ساری رات وہ سوچتا رہا۔ اور گردھر کی مرلیا۔ باجی رہی۔ مرلیا کے بول فضا میں گونج رہے

تھے۔ اس کی تنخیں ان سروں میں دھوئی جا رہی تھیں۔ شنراو کے ماتھے کی بندی چمک رہی

تھی۔ وہ اسے دیکھ رہا تھا جیسے وہ بھی گردھر کی ایک راوھکل ہو۔ اس کے دل میں نہ محبت تھی نہ

نکرت۔

انشاء اللہ

ایک روز جب ایللی چپ چاپ اس بیٹھا تھا تو باہر بولی ”ایللی۔“

”کیوں اہل!۔“ اس نے اہل کی طرف دیکھا۔

”تجھے چھٹی مل سکتی ہے۔ کیا؟“

”کیوں نہیں۔“

تو چار دن کی چھٹی لے لے۔“ وہ بولی۔

ہے۔ ایللی رضی اور رنگی کیا بگڑی ہے۔“

”یہ وہ رضی ہیں۔“ رنگی نے ایللی سی کہنے لگا ”جو اس مردے میں جان ڈالتے ہیں۔“ اس

نے طلبے کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ ”ہاں تو رضی صاحب آج کچھ ہو جائے۔“ رنگی نے اپنی ستار

رضی کی طرف بڑھا دی ”آج تو رضی ایمان سے آگ لگا دو۔ آگ آگ۔ چاروں طرف شعلے

اٹھیں۔ اپنے مہربان بھی کیا یاد کریں گے۔ انہیں بھی پتہ چلے کہ تڑپ کسے کہتے ہیں۔“

رضی مسکرایا۔ اور کچھ کہے بغیر اس نے ستار بجانی شروع کر دی۔ رنگی نے طلبہ اٹھایا۔

رضی گانے لگا۔ اے ری عالی پیابن۔“

اس کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔ آکٹاہٹ بھری اداسی پھیل رہی تھی۔ وسعتیں اور ہلچل رہی

تھیں۔ خلا قریب تر آ رہا تھا۔ خاموش ویران خلا۔

”اے ری عالی پیابن۔“

ایک روز جب رضی اور ایللی اکیلے تھے تو شرمیتی آگئیں۔

”آپ بھی درشن کر لیں۔“ ایللی نے رضی سے کہا۔

رضی مسکرایا۔ اس کی مسکراہٹ میں عجیب سی بے نیازی تھی۔

”آپ کو دلچسپی نہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بہت بے حد۔“ رضی مسکرایا۔

”تو پھر؟“

”تھی — اب نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پہلے راہ چلتی سے تھی۔ چاہے راہ چلتی ہو۔ یا منڈیر

پر کھڑی ہو۔ کہیں ہو۔ کیسی ہو۔“

”کیسی ہو۔“ ایللی نے دوہرایا

”ہاں۔“ رضی نے کہا۔ ”ہر عورت حسین ہوتی ہے۔ ہر عورت۔“

”کیا واقعی۔“

”ہاں۔“ رضی بولا ”لیکن اب تو سب بیٹیاں بن گئیں ہیں۔ کوئی عورت رہی ہی نہیں۔“

”کیوں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”بھرا میلا دیکھ لیا۔ بس ہم بھرا میلا چھوڑنے کے قائل ہیں۔“ رضی مسکرایا۔

”کوئی تلخی رکھو بن گئی کیا؟“ ایللی نے پوچھا۔

نہ اٹھا کر لایا جاتا ہے

”سبحان اللہ۔“ وہ مسکرائے۔

”شادی کا نام نہیں لیتا۔“ وہ زیر لب بولی۔

”وقت کی بات ہے۔“

”کوئی لڑکی بھی ملے۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”پہلے ہی خیال میں رکھا ہوتا تو آج بات کی شکل ہی اور ہوتی۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

ایلی ان کی باتیں غور سے سن رہا تھا۔ لیکن اسے سمجھ میں کچھ نہیں آ رہا تھا۔

حاجی صاحب کی باتیں بے حد سادہ تھیں اس کے باوجود وہ انہیں سمجھ نہیں سکتا تھا۔ ہاجرہ مکرار ہی تھی ظاہر تھا کہ سمجھ رہی تھی۔ لیکن عجیب بات تھی کہ ہاجرہ تو سمجھ لے اور وہ نہ سمجھ سکے۔

اس روز ایلی نے پہلی مرتبہ محسوس کیا کہ ایسی باتیں بھی ہیں جنہیں سمجھنے کے لیے ذہن کے علاوہ کسی اور قابلیت کی ضرورت ہے۔ مگر وہ قابلیت کیا تھی اس کے پاس ایسا کوئی جواب نہ تھا۔

بہر حال ایک بات تو مسلم تھی کہ حاجی صاحب کی ہر بات میں خلوص تھا۔ وہ دیر نہیں تھے۔ محج مرشد تھے یا نہیں اس کے بارے میں وہ کچھ نہ کہہ سکتا تھا لیکن ان میں انسانیت کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی تھی۔

حاجی صاحب دراصل اپنے کسی مرید کی سفارش کرنے کے لیے علی پور آئے تھے۔ وہ مرید خود ایلی کا جاکر انہیں ساتھ لایا تھا۔ وہ آصفی محلے کا فرد نہ تھا۔ اور حاجی صاحب اس کے گھر ٹھہرنے گئے۔

دو ایک مرتبہ وہ آصفی محلے میں آئے تھے تاکہ لوگوں سے مل سکیں۔ آصفیوں کی مسلح منتوں کے باوجود انہوں نے ان کے پاس ٹھہرنے سے انکار کر دیا تھا۔ ان کا کہنا تھا کہ اندریں ملاقات ان کا وہاں رہنا مناسب نہیں۔

حاجی صاحب کے اس مرید نے اپنے مکان میں ایک کمرہ ان کے لیے خالی کرا دیا تھا۔ کہ وہ ہاں اطمینان سے رہ سکیں۔

ان دنوں رمضان شریف کے دن تھے حاجی صاحب سے ملنے کے لیے رفیق اور یوسف بھی

”کیوں ملے۔“

”سنا ہے دلی سے حاجی صاحب آئے ہوئے ہیں۔ چل کے انہیں ملیں۔“

ایلی علی پور جانے کا خواہشمند نہ تھا کیونکہ جب بھی وہ وہاں جاتا تو محلے والیاں اس پر انگلیاں اٹھاتیں کہتیں اے ایلی دیکھ لیا تو نے ان باتوں کا انجام بس آخر دھول ہی اڑتی ہے۔ بوڑھے اسے دیکھ کر تیوری چڑھ جاتے تھے۔ نوجوان سرگوشیاں کرتے۔

لیکن حاجی صاحب کا نام سن کر وہ تیار ہو گیا اور وہ چار روز کے لیے علی پور چلے گئے۔ حاجی صاحب ایلی کو دیکھ کر مسکرائے۔ ”آئیے الیاس صاحب۔“ وہ بولے۔ ”بسم اللہ۔ خیریت تو ہے۔ ویسے تو اچھے ہیں آپ؟“

”جی شکریہ۔“ وہ بولا۔

”کیسے وہ طوفان گزر گیا نا۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”جن طوفانوں کو چلنا ہوتا ہے چل کے رہتے ہیں۔“ وہ بولے۔

”جی ہاں۔“

”اللہ تعالیٰ نے آپ پر کرم کیا۔“ وہ بولے۔ ”آپ بھگتے نہیں۔“

ایلی کی سمجھ میں نہ آیا۔ اس لیے وہ خاموش رہا۔

”ہر چیز کا وقت مقرر ہوتا ہے۔“ حاجی صاحب مسکرائے۔

”کیوں ہیشیرہ صاحبہ۔“ وہ ہاجرہ سے مخاطب ہوئے۔ ”وقت سے پہلے کچھ نہیں ہو سکتا۔“

”جی۔“ ہاجرہ بولی۔ ”اب تو وقت آ گیا نا۔“

انشاء اللہ آئے گا۔“ وہ بولے۔

آئے گا؟“ ہاجرہ نے دوہرایا۔

”زیادہ دیر نہیں۔“ وہ بولے۔ ”دھوپ نکلنے سے پہلے بادلوں کو صاف کرنا ہوتا ہے۔ محفل نکلنے سے پہلے صفائی ہوتی ہے۔ فرش بچھایا جاتا ہے۔ گھبرائیے نہیں ہیشیرہ صاحبہ اللہ کے فضل سے اچھا ہو گا۔“

”ابھی تو وہی حال ہے۔“ وہ زیر لب بولی۔ ”ایک قدم نہیں اٹھایا۔“

”ہوں۔“ وہ مسکرائے۔ ”کوئی چل کر آتے ہیں۔ کوئی تلاش کرنے کے بعد پہنچتے ہیں کسی

اب کی بار آپ نے ہم سے کچھ پوچھا نہیں۔

”جی۔“ ایلی نے ان کی طرف دیکھا۔

”دلی میں تو آپ نے ہم سے بڑی باتیں پوچھی تھیں۔“

”جی۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”وہ مرہم کی بات یاد ہے آپ کو؟“ انہوں نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔ ”وہ زمانے گئے مرہم کی بات پوچھنے والے۔“

”ہاں۔“ وہ بولے۔ ”یہ زمانہ بھی گزر جائے گا۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”انشاء اللہ بہتر زمانہ آئے گا۔“

”جی۔“ اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا کہے

”وہ پریشانی تو نہیں رہی نا۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔ ”پیشانی بھی نہیں۔“

وہ مسکرائے۔ ”پیشانی بھی لگاؤ کی دلیل ہوتی ہے۔“

ایلی نے حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ نفسیات کا وہ باریک نقطہ ایک سادہ آدمی سے سن کر

اسے حیرت ہوئی۔

”تو آپ آزاد ہو گئے۔“ حاجی صاحب بولے۔

”جی آوارہ ہوں۔“

”آوارگی۔“ وہ بولے ”کبھی منزل کی طرف بھی لے جاتی ہے۔“

”جی ہاں۔“ وہ بولے۔ ”لیکن کوئی منزل ہو بھی۔“

”کبھی منزل خود راہی کے سامنے آ جاتی ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”یہاں سبھی راہی ہیں۔“

”کی کو منزل کا شعور ہے کسی کو نہیں ویسے راہی سبھی ہیں۔“

”منزل کو کرنا کیا ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”سبحان اللہ۔ اچھا خیال ہے۔“ وہ بولے

ایلی نے پھر حیرت سے ان کی طرف دیکھا۔ عجیب مرد ہے اس کی بات رد بھی کرو تو بھی

آئے ہوئے تھے۔ یوسف نے اتنی لمبی داڑھی رکھی ہوئی تھی۔ رفیق پکا نمازی تھا۔ دونوں

روزے رکھتے تھے۔ لیکن ایلی نے کبھی روزہ نہ رکھا تھا۔ صبح آٹھ دس بجے کے قریب وہ تینوں

حاجی صاحب کی طرف چلے جاتے اور سارا دن ان کے ساتھ باتیں کرتے رہتے۔ پھر تین چار بجے

کے قریب وہاں سے گھر آ جاتے۔

ایلی رفیق اور یوسف کی باتیں سن کر حیران ہوتا تھا۔ یوں باتیں کرتے اور مسئلے مسائل

پوچھتے جیسے کوئی بڑے مولانا ہوں۔

ان کی باتیں سن کر ایلی کو وہ دن یاد آ جاتے جب وہ تینوں مل کر جلیل کی طرف جایا کرتے

تھے۔ اور جلیل مست آنکھیں بنا کر اس لڑکی کی طرف دیکھا کرتا تھا۔ جو اپنے گھر کی ڈیوڑھی میں

جھاڑو دیتے ہوئے باہر گلی میں نکل آتی اور ساری گلی میں جھاڑو دینے لگتی تھی۔ اس وقت بار بار

رفیق کھڑکی سے باہر جھانکتا اور اس کے منہ سے ”سی سی۔“ کی آواز آتی۔ جیسے اسے بہت کچھ

برداشت کرنا پڑ رہا ہو۔ باہر صحن میں یوسف قلابازیاں لگاتا اور بندروں کی طرح ناچتا۔

اب وہ دونوں معزز سے بنے بیٹھے تھے اور شرع کے مسائل پر بڑی سنجیدگی سے بحث کر

رہے تھے۔ ان کے علاوہ جلیل تو بالکل ہی نمازیوں اور وظائف میں کھو گیا تھا۔ نہ جانے لوگ

کیسے بدل جاتے ہیں۔ ایلی سوچتا۔

ایلی محسوس کرتا تھا کہ ذہنی طور پر وہ وہی ایلی ہے جو اس زمانے میں تھا۔ اس کے خیالات

بالکل وہی تھے۔ ان کی بنیاد اور تانے بنے میں کوئی فرق نہ آیا تھا۔ اس کے خیالات کی لکیریں کچھ

اور پھیل گئی تھیں لیکن ان کے پھیلاؤ کی سمت وہی تھی۔ رخ وہی تھا۔

ایلی کا بھی جی چاہتا تھا کہ وہ حاجی صاحب کی دنیا کی ایک بھٹک دیکھے۔ اسے سمجھنے کی کوشش

کرے لیکن جانے بغیر وہ آنکھیں بند کر کے آئین کسے کے لیے تیار نہ تھا۔ وہ حاجی صاحب کی

عزت کرنے لگا تھا کیونکہ ان میں خلوص تھا اور وہ ناصح نہ تھے، بلند تر ہستی نہ تھے۔ مرشد نہ

تھے۔ مسند پر نہیں بیٹھے تھے بلکہ ان سب کے قریب بہت قریب۔ حتیٰ کہ ایلی محسوس کرتا تھا کہ

وہ اس کے قریب تھے حالانکہ وہ خود ان سے بہت دور تھا۔ کوسوں دور۔ ان میں انسانیت تھی۔

براہری کا احساس تھا۔ اور ان کے دل میں ہر شخص کے لیے ہمدردی تھی۔

اور بھتی رہی پھر رفیق سے کہنے لگی۔ ”بے ہوش نہ ہو تو چارہ کیا کرے۔“

”کیوں اماں۔“ یوسف نے پوچھا۔ ”بات کیا ہے۔“

”اے تین دن سے یہاں پڑا ہے یہ اور نہ سحری نہ افطاری۔“

”کیا مطلب۔“ ایلہی نے پوچھا۔

”گھر والا تو کام پر رہتا ہے اسے کیا خبر کہ مہمان کی کیا حالت ہے۔“ بڑھیا نے کہا۔ ”اور گھر لایا کتنی ہے۔ میں تو نہ بھیجوں گی کھانا۔ میں کیا نوکر ہوں کہ اس کے دوستوں کی خدمت کرتی ہوں۔“

”کیوں۔“ رفیق نے پوچھا۔

”بس ضد اور کیا۔ بڑی بد مزاج ہے۔“

ایلہی یہ سن کر حیران رہ گیا چار روز سے وہ روز وہاں سارا سارا دن گزارتے تھے لیکن حاجی صاحب نے ان سے نہیں کہا تھا کہ وہ سحری اور افطاری کے بغیر روزے رکھ رہے ہیں۔ اور پھر یہ بھی تھا کہ وہ اپنے کام سے وہاں نہیں آئے تھے بلکہ مرید کی سفارش کرنے آئے تھے جس کی بولی انہیں بھوکوں مار رہی تھی۔

اس روز وہ تینوں افطار کے وقت وہیں رہے۔ رفیق اور یوسف افطار کے لیے کچھ پھل لے آئے اور انہوں نے حاجی صاحب کی منتیں کیں کہ وہ آصفی محلے میں جا کر ٹھہریں مگر انہوں نے ٹکار کر دیا بولے ”یہ ٹھیک نہیں جن کے ہاں میں مہمان ہوں وہ برا نہیں گے ان کا دل دکھے گا۔“ ایلہی اس بڑھے کو حیرت سے دیکھ رہا تھا۔ یقیناً وہ بڑا انسان تھا۔

پوٹ

جب ایلہی گرد پتہن واپس پہنچا اور رنگی سے ملا تو اس نے دیکھا کہ ایک نوجوان لڑکا اس کے پاؤں بیٹھا ہے

”یہ مانی ہے۔“ رنگی بولا۔ ”ویسے میرا بھتیجا ہے لیکن ہر بات میں مجھ سے چار قدم آگے بچے۔“ وہ مسکرایا۔

مانی ایک خوبصورت نوجوان تھا۔ اس کا رنگ رنگی کی نسبت بہت گورا تھا خدوخال ستواں تھے جسم موزوں تھا۔ بال گھٹکھریالے تھے اور طبیعت میں لالہ ایلہی پن اور ساتھ ہی محبوبانہ بے نیازی

سبحان اللہ کہتا ہے۔

”انشاء اللہ وہ دن بھی آئے گا۔“ حاجی صاحب بولے۔

”کون سا دن؟“ ایلہی نے پوچھا۔

”آئے گا ضرور آئے گا۔“ وہ بولے ”ہم تو شاید نہ ہوں گے۔“ وہ مسکرائے۔

اسی شام چار بجے کے قریب جب حاجی صاحب لیٹے ہوئے تھے اور رفیق یوسف اور ایلہی آپس میں باتیں کر رہے تھے تو نہ جانے کس بات پر انہوں نے حاجی صاحب کی رائے پوچھنے کے لیے انہیں پکارا

حاجی صاحب چپ چاپ پڑے رہے۔ انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔

”سو گئے ہیں۔“ رفیق نے کہا۔

”ارے یہ ان کے دانت تو دیکھو۔“ ایلہی نے کہا۔

وہ سب حاجی صاحب پر جھک گئے۔ حاجی صاحب کے دانت یوں نکلے ہوئے تھے جیسے مقل ہو گئے ہوں۔

”ارے۔“ ایلہی چلایا ”یہ تو بے ہوش پڑے ہیں۔“

رفیق نے انہیں جھنجھوڑا لیکن وہ جوں کے توں پڑے رہے۔

وہ سب گھبرا گئے۔

رفیق نے ان کے منہ پر پانی کے چھنٹھے دیئے۔

حاجی صاحب کے جسم میں ہلکی سی جنبش ہوئی لیکن وہ پھر بے ہوش ہو گئے۔ رفیق ڈاکٹر کی

طرف بھاگا۔

ڈاکٹر نے آکر ٹوٹیل لگائیں اور پھر ایک بوتل سٹکائی۔

حاجی صاحب نے آنکھیں کھول دیں۔

جب وہ ان کے منہ میں دوا اڑنے لگے تو حاجی صاحب نے آنکھوں سے اشارہ کیا۔ کہ انہیں کچھ نہ دیا جائے۔ غالباً وہ روزہ توڑنے کے حق میں نہ تھے۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ”مریض کو بے

حد نفاہت ہے۔۔۔ ویسے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔“ ڈاکٹر کے آنے پر کسی ایک محلے دار بیٹھک میں آگئے اور مریض کی صحت کے متعلق پوچھنے لگے۔ وہ مرید جس کے حاجی صاحب

مہمان تھے کارخانے میں کام پر گیا ہوا تھا۔ اس کے گھر سے ایک بوڑھی عورت آکر حاجی صاحب

تھی وہ نہایت اطمینان سے بیٹھا ہوا پکاراگ گنگنا رہا تھا۔

”آپ سے مل کر مسرت ہوئی۔“ مانی نے کہا اور پھر اس کی موجودگی سے بے نیاز ہو کر گیت گنگنا نے اور شرمیلی کو دیکھنے میں مصروف ہو گیا۔

”آپ کالج میں ہیں۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جی نہیں۔“ وہ بولا ”اب تو نوکری کرتے کرتے بوڑھا ہو گیا۔“

”کیا ملازمت کرتے ہیں؟“

”جی ہاں۔“ وہ بولا۔

”نوکری کیا ہے۔“

”پوسٹ ہوں۔“ اس نے بے پرواہی سے کہا۔

”پوسٹ۔“ ایللی نے حیرت سے دوہرایا۔ ”نظمیں لکھتے ہیں کیا؟“

”نظمیں لکھتا ہوں ڈرامے سنیج کرتا ہوں۔ شوکا اہتمام کرتا ہوں سبھی کچھ۔“ اس نے بے پرواہی سے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔

”لا جواب نوکری ہوئی نا۔“ ایللی نے کہا۔

”بے کار۔“ وہ بولا۔ ”بیگم آنکھوں میں آنکھیں ڈالتی ہے۔ لڑکیاں مسکاتی ہیں صاحب

گھورتا ہے۔ کسی روز جان سے مار دے گا۔“

”تم تو روتے ہی رہتے ہو۔“ رنگی مسکرایا۔

”رونق سے کون منکر ہے۔“ مانی بولا۔ ”رونق کا تو میں بھی قائل ہوں۔“

”تو پھر۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جان کا روگ نہ بنیں تو۔“ مانی نے کہا۔

”نہ بناؤ۔“ رنگی بولا۔

”کون بتاتا ہے، زبردستی بنتی ہیں۔“ مانی نے بے نیازی سے کہا۔

اتنے میں شرمیلی آگئی۔ رنگی دروازے کے سامنے بیٹھ گیا۔ ”لو بھئی۔“ وہ بولا۔ ”اب تو

خاموش ہو جاؤ۔ شرمیلی پہلے ایکٹ کا پہلا سین شروع ہو گیا۔“

”یار۔“ مانی بولا۔ ”یہ تو کچھ بھی نہیں۔“

”تمہیں کیا پتہ یہ ظالم تو جے جے ہے۔“ رنگی نے جواب دیا۔

”جے جے تو نہیں خالی دنتی ہی ہے۔“ مانی نے کہا۔ ”البتہ وہ دوسری والی پتلی جو ادھر رہتی ہے۔ وہ ہے کچھ کچھ۔“

”وہ وہ تو شنراوی ہے شنراوی۔“ رنگی نے کہا۔

”شنراوی تو نہیں خیر۔“ مانی بولا۔ ”خاصی ہے۔“

”شنراوے کو جو بھی میسر ہو وہ شنراوی ہوتی ہے۔“ رنگی مسکرایا۔

”شنراوہ تو جھک مارتا رہتا ہے۔“ مانی ہنسا اور پھر دھوپ میں بیٹھ کر گیت گنگنا نے لگا۔

ایللی اس کی باتیں حیرانی سے سن رہا تھا۔ عجیب لوگ تھے۔ ذہنی چمک تھی۔ رنگینی تھی اور جوانی بھی۔

ایللی ہمیشہ ان شخصیتوں کو پسند کرتا تھا جن میں ذہنی چمک ہو جو رسمی خول سے آزاد ہوں۔

لیکن حال میں وہ سوچنے لگا تھا کہ صرف ذہنی چمک ہی کافی نہیں۔ وہ حاجی صاحب تھے ان کی

فحشیت میں اس قدر ہی جاذبیت کیوں تھی۔ پھر وہ غلام تھا۔ ذریہ والا غلام۔ آخر وہ کون سی بات

تھی جو ان میں بلا کی جاذبیت پیدا کر رہی تھی۔ ان میں ذہنی چمک قطعی طور پر مفقود تھی۔ رنگین

باتیں یا رنگ کی پیکاریاں نہیں تھیں۔ پھر وہ شخصیتیں دوسرے کو گود میں کیوں لے لیتیں تھیں۔

وہ جاذبیت اس ذہنی چمک کی جاذبیت سے کہیں زیادہ پر اثر تھی بے شک ذہنی چمک میں اٹھان

تھی۔ پھیلاؤ نہیں تھا۔ وسعت نہیں تھی۔

کبھی کبھی وہ محسوس کرتا کہ رضی میں بھی پھیلاؤ ہے، وسعت ہے۔ اگر مانی اور رنگی کی باتوں

میں رنگینی تھی تو رضی اور غلام کی خاموشی رنگین تھی۔ رنگی میں گرفت تھی رضی میں پیار

بہری گود تھی۔ مانی چاند کی طرح ہر رنگ میں چمکتا تھا۔ کبھی ہلال بن جاتا کبھی چاند لیکن رضی

مسلل سورج تھا جس میں سے ہر وقت شعاعیں نکلتی تھیں اور گرماتی تھیں۔

مانی اور رنگی کی گفتگو صرف لڑکیوں تک ہی محدود نہ رہتی تھی کبھی وہ راگ و دیا پر بحث

پھیلے لیتے اور مختلف راگوں کے تاثرات پر گرجویشی سے باتیں کرتے۔ سیاست میں ان کی

لچکی محض اخباری قسم کی تھی۔ ایللی خود سیاست میں کورا تھا۔ اسے سیاسی مسائل سے قطعی طور

پر لگاؤ نہ تھا۔

گفت

گردپتن میں ایللی کا مرکز رنگی کی بیٹھک تھی۔ مدرسے سے فارغ ہو کر وہ سیدھا گھر جاتا اور

چند ایک منٹ رسمی طور پر وہاں ٹھہر کر عالی کو اٹھا کر رنگی کی بیٹھک میں پہنچ جاتا۔
عالی کے ذہن پر ایک خوف طاری رہتا تھا۔

پہلے ایک روز ناگاہ ابو گھر چھوڑ گیا تھا اور وہ اپنی امی کے ساتھ اکیلا رہ گیا تھا۔ وہ حیران تھا کہ ابو کہاں گیا اس کے بعد اس کی امی نہ جانے کہاں چلی گئی تھی۔ اور ابو نہ جانے کہاں سے آ گیا تھا۔ اور اسے اٹھا کر نہ جانے کہاں لے آیا تھا۔ اسے امی اور ابو کا یہ بکھیرا سمجھ میں نہ آیا تھا۔
جب بھی امیلی گھر سے باہر نکلتا تھا تو عالی گھبرا جاتا۔ اسے یہ ڈر لاحق ہو جاتا کہ شاید وہ لوٹ کر نہ آئے اب تو گھر میں امی بھی نہ تھی۔ ابو چلا جائے گا تو کیا ہو گا۔ گھر میں ہاجرہ تو تھی لیکن عالی کو ہاجرہ سے کوئی دلچسپی نہ تھی ہاجرہ کا ہونا یا نہ ہونا برابر تھا۔

عالی کا یہ خوف امیلی کے لئے بہت بڑی مشکل تھی وہ باہر نہ جاسکتا تھا۔ سکول جانے میں اسے بے حد دقت ہوتی تھی۔ عالی رونے لگتا۔ اور امیلی کے دل پر نہیں سی لگتی۔ لیکن وہ مجبور تھا۔ دو ایک مرتبہ امیلی نے اسے سکول لے جانے کی کوشش کی تھی۔ ایک بار وہ ساتھ چلا بھی گیا لیکن وہ وہاں اس پریشان حال رہا۔ اس بھیڑ میں ابو کا بھی ہونا نہ ہونے کے برابر تھا۔
سکول سے آنے کے بعد بہر حال امیلی اسے ہر وقت ساتھ رکھتا تھا۔ اور رنگی کی بیٹھک میں تو وہ ہمیشہ ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے۔ اس پر رنگی ہنستا۔ ”یہ باپ اور بیٹا بھی عجیب ہیں۔
جہاں ایک ہو گا دوسرا بھی قریب ہی ہو گا کہیں۔ امیلی اور عالی کیا جوڑی ہے۔“

وہ دونوں بیٹھ ستار سنتے۔ رضی گانا سنتے اور مانی اور رنگی کی محبتوں اور یارانوں کے قصے سنتے حتیٰ کہ رات کے دس گیارہ بج جاتے۔ پھر وہ گھر لوٹتے تو ہاجرہ چپ چاپ بیٹھی ہوتی۔ امیلی کو ہاجرہ پر ترس آتا تھا۔ وہ بیچاری بڑھاپے میں پھر سے قید میں پڑ گئی تھی۔

ایک روز ہاجرہ نے ڈرتے ڈرتے بات چھیڑی بولی۔ ”امیلی زندگی کس طرح بسر ہو گی۔“
”کیا بات ہے امی؟“

”دیکھو نا۔“ وہ بولی۔ ”آخر میں ساری عمر تو تمہارے ساتھ نہیں رہ سکتی۔“
”تو پھر؟“

”تم شادی کر لو بیٹا، ورنہ یہ لڑکا کس طرح پلے گا۔“

”تو کر دو۔“ امیلی نے بے پروائی سے کہا۔

ہاجرہ کا خیال تھا کہ امیلی شادی کے نام پر بدک جائے گا۔ شاید وہ ساری عمر دوسری شادی کے لیے تیار نہ ہو گا۔ امیلی کے منہ سے یہ بات سن کر وہ حیران رہ گئی۔

”تمہیں کوئی اعتراض نہیں نا۔“ اس نے پوچھا۔

”ہو جائے تو بھی اعتراض نہیں۔ نہ ہو تو بھی نہیں۔“

”تو کہاں کرو گے؟“

”کیس بھی۔“ وہ بولا۔

”مکے والے تو نہیں دیں گے اپنی لڑکی۔“

”ظاہر ہے۔“ وہ بولا

”تو کیس سے خود ہی تلاش کر لو نا۔“

”نہ امی۔“ وہ بولا۔ ”یہ جھنجٹ مجھ سے نہ ہو گا۔“

”تو تمہاری پسند کیسی ہو گی؟“

”کوئی بھی ہو منظور کر لو گے؟“

”ہاں۔“ وہ بولا۔ ”صرف ایک بات ہے۔“

”وہ کیا؟“

”جس روز اس نے عالی سے بدسلوکی کی میں اسے گھر سے نکال دوں گا۔“

”ہاجرہ ہنس پڑی۔“ اے تم اپنے دوست سے کیوں نہیں کہتے۔“

”کس سے۔“ وہ بولا۔

”اس رنگی سے۔“

”میں تو نہ کہوں گا۔“

”تو پھر میں کہوں۔“ ہاجرہ نے کہا۔

”کہہ دیکھو۔“

”یہ تو اچھے لوگ دیکھتے ہیں۔“

”ہاں اچھے ہیں۔“

”شاید کوئی اچھا رشتہ ڈھونڈ دیں۔“

”شاید۔“ وہ بولا۔ اور پھر عالی کو اٹھا کر رنگی کی طرف چلا گیا۔

”ہیائت برائیں مانتی۔“ ایللی نے مانی سے پوچھا۔
 ”بہت۔“ مانی بولا۔ ”کڑھتی ہے۔ لیکن بھی گلاب کے ساتھ کانٹے تو ہوں گے۔“
 ”وہ بھی تو ٹھکت ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”ہاں۔“ وہ بے پروائی سے بولا۔ ”ٹھکت کی کیا بات ہے۔ وہ ہم سب کی محبوبہ ہے۔ جگت
 بوبہ ہے۔ ہم سب اسے پیار کرتے ہیں۔ تم بھی کرو گے۔ اسے بغیر پیار کرنے کے کوئی نہیں رہ
 ملک وہ میری محبوبہ ہے سسلی ہے۔ راز دان ہے۔ اور وہ میری ماں ہے ماں۔ آؤ ہم چل کر اس
 ے عشق لڑائیں۔“ مانی اندر جا کر ٹھکت کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔ ”ماں۔“ وہ بولا۔ ”ہم تو
 پا ہو گئے۔“

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”بس برباد ہو گئے۔“

”وہ مسکرائی۔“

”کوئی خاطر میں نہیں لاتی۔“

”نت ت۔“ اس نے مذاق سے منہ بتایا۔

”اچھی ماں کسی ایسی لڑکی کا پتہ دو کہ مزا آ جائے۔ بے حد خوبصورت ہو۔ رنگیلی ہو۔

لہذا ہو۔۔۔ تمہاری طرح۔“ پھر وہ دفعتاً چلایا۔

”یہ ہمارا ایللی ہے اس کی بات بنا دو کہیں۔“

”کیسی بات؟“

”اسے اچھی سی بیوی دلا دو۔“

”اچھا۔“

”بس یہ کام کرو۔“ ساتھی تلاش کر دیتا۔ بیوی نہیں۔“ مانی نے کہا۔

”بیوی کیوں نہیں؟“

”بیوی بڑی بھدی شے ہوتی ہے۔“ وہ بولا۔

”پھر لوگ کیوں کرتے ہیں؟“

”الو کے پٹھے ہیں۔“ وہ بولا۔

”اور تم۔“

ایللی کا رنگی کی بیوی سے ملنے کا اتفاق یہ ہوا کہ اسی روز جب چائے کا وقت ہوا تو فیراز
 محمول بیٹھک میں چائے پینے کی۔۔۔ بجائے رنگی اسے گھر کے اندر زنانے میں لے گیا۔ اور
 وہی ٹھکت سے اس کا تعارف کرا دیا۔ ٹھکت کو دیکھ کر ایللی گھبرا گیا۔

ٹھکت خوبصورت تھی اس میں ایک عجیب سا وقار تھا۔ نگاہ بے نیازی سے لبرز تھی۔
 منوں میں رنگی کی جھلک تھی۔ ٹھوڑی میں دلی ہوئی انبساط تھی۔ جوانی تھی۔ بے تکلفی تھی۔
 ایللی اس کی خوبصورتی کو دیکھ کر حیران نہیں ہوا تھا۔ بلکہ ٹھکت میں رنگی اور رضی کی
 میزب دیکھ کر اسے حیرت ہوئی۔ اس میں وہی برداشت تھی جو رضی اور غلام میں تھی وہی
 ہلاں تھی اور اس کے باوجود نہایت کی تمام تر رنگینی اور شوخی بھی تھی۔ یہ متضاد خصوصیات
 بیک جگہ کیسے اکٹھی ہو سکتی ہیں وہ حیران تھا۔

ٹھکت کو دیکھ کر ایللی کو رنگی کی شہریتوں پر غصہ آنے لگا۔ رنگی کیوں جھک مار رہا تھا۔
 یوں پھول پھول اڑ رہا تھا۔ جب کہ اس کے اپنے گھر میں ہمار آئی ہوئی تھی۔ بلکہ ایک روز اس
 نے رنگی سے اشارہ ”یہ بات کہہ بھی دی۔ رنگی کا چہر خوشی سے متا اٹھا۔ وہ بولا۔ ”دیکھنا ٹھکت
 قہقہہ میری زندگی کی ہمار ہے۔ اس کے بغیر دنیا سونی ہے جہی تو مجھے اس سے اس قدر عشق ہے
 کہ نہ عشق۔“

ایللی کے ہونٹوں پر طنز پر مسکراہٹ دیکھ کر رنگی چلایا۔ ”تمہیں یقین نہیں آیا کیا۔ ٹھکت میری
 روح کی روشنی ہے جسم کی بات چھوڑو۔“

”اور یہ جو فن فیراں ہیں تمہاری۔“ ایللی نے پوچھا۔

”جی ان کی کیا حیثیت ہے۔“ رنگی نے کہا۔ ”اگر ٹھکت کو زکام ہو جائے اور اگر ان تمام

فیروزیوں کا بھرتا بکا کر کھلانے سے اس کا زکام دور ہو سکتا ہو تو میں ذرا تامل نہ کروں۔“

رنگی بڑی سنجیدگی سے کہہ رہا تھا، لیکن ایللی کو سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ کس طرح متضاد
 میں کیے جا رہا تھا عین اس وقت مانی نے شور مچا دیا۔ ”بھئی اوھر کی بھی خبر لو۔ کب سے بیچاری
 سوپ میں کھڑی ہے۔ تمہارے لیے۔“

”تخلی ہے کیا؟“ رنگی اچھل کر بولا۔

”ہاں ہاں۔“ مانی چلایا۔

رنگی نے دو چھلانگیں ماریں اور بیٹھک سے باہر نکل گیا۔

”میں بھی ہوں۔ الو کا پٹھا۔“

”کیوں ہو؟“ وہ ہنسی

”میں باپ نے بنا دیا بس۔“

”نہ بننے۔“

”زبردستی بنا دیا۔ اب کہیں ایللی کو الو کا پٹھا نہ بنا دیتا۔ خیال رکھنا۔“

”ہے۔“ رنگی چلاتا ہوا اندر داخل ہوا۔ ”میری پیاری کو دق نہ کرو۔“

گھٹ رگھی کی طرف دیکھ کر مسکرائی۔

”بس تمہارے بغیر میرا دم نکلتا ہے۔“ رنگی نے پیار سے گھٹ کی طرف دیکھا۔ ”ہم تو بس

تمہارے بغیر یتیم ہو جاتے ہیں۔“

”اچھا۔“ وہ مسکرائی اور وہ ایک دوسرے میں کھو گئے۔

پاک بابا

ایک صبح ہاجرہ بولی آج میں نے خواب میں پاک بابا کی زیارت کی۔

”پاک بابا؟“ ایللی نے تعجب سے پوچھا۔

”ہاں۔“ وہ بولی۔ ”انہوں نے مجھے بہت ڈانٹا۔“

”کیوں؟“

”دیر سے ان سے ملنے کا ارادہ کر رہی ہوں۔“

”تو پھر۔“

”جانا ہی نہیں ہوا۔“

”کیوں۔“

”بس جھنجھٹوں میں پڑ رہی۔“

”ہوں۔“ ایللی بولا۔

”حاجی صاحب کیا پاک بابا کی زیارت کر آؤں۔“ میں نے حاجی صاحب سے پوچھا تھا۔

”تو وہ کیا کہنے لگے۔“

کہنے لگے ”اللہ کے بندوں کی خدمت میں حاضری دینا اچھا ہوتا ہے۔“ میں نے پوچھا تو

”میں بھی کہنے لگے ہاں ہاں کیا حرج ہے۔“

”تو پھر ہو آؤ کہیں ہیں وہ۔“ ایللی نے کہا۔

”لو ایللی کیسے جاؤں۔“

”تو کسی کو ساتھ لے جاؤ۔“

”تم کیوں نہیں چلتے۔“ اس نے پوچھا۔

”میں جا کر کیا کروں گا۔“

”حرج بھی کیا ہے۔ تم بھی کیلینا۔“ ہاجرہ بولی۔

”کیا فائدہ۔“

”وہ ہنسی۔“ ”لو اللہ کے بندوں سے ملنے کا بہت فائدہ ہوتا ہے۔“

”کیا ہوتا ہے؟“

”تقدیریں بدل جاتیں ہیں۔“

”اب تقدیریں بدل کر کیا کرتا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”وہ ہنسنے لگی۔ بولی۔“ ”ابھی تو ساری زندگی پڑی ہے تیری۔“

”ہاں تو میری زندگی کی بات چھوڑ۔“ ایللی نے کہا۔

”کیسی باتیں کرتا ہے۔“ وہ بولی۔ ”چل اپنے لیے نہ سہی۔ میری خاطر چل۔“

”کیا کروں گا وہاں جا کر۔“

”تو چل تو سہی۔“

پاک بابا امرتسر علی پور سڑک پر ایک درخت کے نیچے بیٹھا تھا۔ اس کے سر پر ایک بہت بڑی پگڑی تھی۔ ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے وہ پگڑی باندھی ہوئی نہ ہو بلکہ گٹھا سا بنا کر سر پر رکھ لی ہو۔ اس کے جسم پر ایک لمبا سا چنڈ لٹکتا تھا۔

ایک درخت کے نیچے ایک چھوٹا سا بستر، ایک مٹی کا پیالہ۔ ایک لوٹا۔ اور ایک تھالی پڑی تھی۔ یہ بابا کا جملہ سامان تھا۔ اسے کبھی کسی نے بیٹھے نہ دیکھا تھا۔ ہمیشہ سڑک پر ادھر سے ادھر، لہر سے ادھر گھومتا رہتا۔ چھاتی ابھری رہتی، گردن انھی رہتی۔ اسے دیکھ کر ایسے معلوم ہوتا تھا جیسے نولین جہاز کے تختے پر گرد و پیش کا جائز لے رہا ہو۔

پھر وہ نماز پڑھنے میں مصروف ہو جاتا۔ لیکن نماز پڑھنے کے لیے وہ سڑک سے ہٹ کر

قرب ہی کھیتوں میں چلا جاتا تھا۔ نماز سے فارغ ہوتے ہی وہ واپس سڑک پر آ جاتا۔ بابا کو بھی کسی نے سوتے، اٹھتے یا کھاتے پیتے نہ دیکھا تھا۔

اللہ سے بیاہ

ریتی پور کے گاؤں میں ایک روز جب لوگ مسجد میں گئے تو بابا وہاں بیٹھا نماز پڑھ رہا تھا اور اس کا مختصر سا سالن جس میں ایک چھوٹا سا بستر بھی شامل تھا۔ حجرے میں رکھا ہوا تھا۔ گاؤں والوں نے سمجھا کہ مسافر ہے۔ شاید سستانے کے لیے وہاں رک گیا ہے۔ دو ایک روز تو لوگ سے ساگ روٹی بھیجتے رہے۔ تیسرے روز ریتی کا نمبردار غصے میں آگیا۔ کہنے لگا۔ ”دیکھ بابا یہ مسجد ہے۔ اللہ کا گھر ہے۔ ہوٹل یا سرائے نہیں ہے۔ تو اب اپنا راستہ لے۔ یہاں ڈیرہ جمانا غلط ہے۔“ چوتھے روز وہ پھر مسجد میں گیا۔ تو بابا جوں کا توں بیٹھا تھا۔

نمبردار کو طیش آگیا۔ اس نے بابے کا سالن اٹھا کر باہر پھینک دیا۔ اور دھکے دے کر مسجد سے باہر نکال دیا۔ بابے نے اپنی پگڑی سر پر رکھی سالن اٹھایا۔ اور ریتی پور کی مسجد سے دس پندرہ قدم کے فاصلے پر جا کر سڑک پر بیٹھ گیا۔

اسی شام نمبردار کی بھینس بیمار پڑے بغیر مر گئی۔ سارا گاؤں حیران تھا کہ بھینس کو کیا ہوا۔ کچھ لوگ کہنے لگے ”تم نے بابا کے ساتھ بدسلوکی کی تھی۔ یہ اس کا نتیجہ ہے۔“

نمبردار غصے میں چلانے لگا۔ ”میں نے کیا برا کیا تھا۔ کیا شریعت کے خلاف بات کی تھی۔ سیدھی بات ہے میاں کہ مسجد اللہ کا گھر ہے۔ وہاں جا کر نماز پڑھو۔ میلاد کرو۔ عبادت کرو اور اگر کوئی مسافر ہو تو بے شک دو دن کے لیے وہاں ٹھکانہ بھی کر لے۔ پر یہ کیا ہوا کہ اسے گھر بنا کر بیٹھ جائے۔“ نمبردار نے بھینس کی موت کو بابا کی بدعا کا نتیجہ سمجھنے سے صاف انکار کر دیا۔

اگلے روز جب وہ حویلی میں گیا تو ایک اور بھینس مری پڑی تھی۔ ”ارے۔“ وہ سر ہٹام کر بیٹھ گیا۔ آٹھ روز میں جب اس کی تینوں بھینسیں بے وجہ مر گئیں تو وہ گھبرا گیا اور اس نے گاؤں میں کھڑے ہو کر لوگوں کی منتیں کیں ”میں تباہ ہو گیا۔“ یہ کیا مصیبت آپڑی ہے مجھ پر؟ خدا کے لیے میری مدد کرو۔ ضرور یہ اس بابا کی بدعا ہے۔ مجھ سے بھول ہو گئی۔ میری توبہ ہے؟ میں اس کے پاؤں پڑنے کے لیے تیار ہوں مجھے اس سے معافی لے دو، ورنہ تباہ ہو جاؤں گا۔“

وہ سب مل کر بابا کے پاس گئے۔ لیکن بابا چپ چاپ بے نیازی سے سڑک پر ٹھٹھا رہا جیسے ان لوگوں سے کوئی واسطہ ہی نہیں ہو۔ دیر تک وہ چیخے چلاتے رہے لیکن بابا اپنی ہی دھن ادا کر رہا تھا۔

اسی شام وہ پھر بابا کے پاس گئے۔ انہوں نے منتیں کیں۔ کہ وہ پھر مسجد میں آ بیٹھے۔ وہ گاؤں میں ایک مکان دینے کے لیے تیار تھے۔ اس کی خدمت کرنے کے لیے بے تاب تھے بلکہ وہ گاؤں والوں کو معاف کر دے۔ لیکن بابا نے ان کی طرف دھیان نہ دیا۔

پھر اگلے روز انہوں نے گاؤں کے وارے میں بیٹھ کر مشورہ کیا۔ ہر کسی نے اپنی اپنی تجویز دی۔ لیکن دو لے چمار کی بات سب کو پسند آئی۔ اور انہوں نے اس پر عمل کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ ایک آدمی سڑک پر جا بیٹھا کہ بابا پر نگاہ رکھے۔ گاؤں کے دس ایک آدمی وضو کر کے انتظار میں رہے۔ جب بابا نماز پڑھنے کے لیے کھیت میں گیا اور نیت باندھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ سب گئے اور بابا کے پیچھے قطار بنا کر نماز پڑھنے لگے۔

جب بابا نماز پڑھ کر فارغ ہوا اور اس نے پیچھے دیکھا کہ گاؤں والے اس کے پیچھے نماز پڑھ رہے ہیں تو وہ چلانے لگا۔ ”جاؤ جاؤ۔ اٹھو میرے پیچھے مت بیٹھو۔ تم نے اللہ سے بیاہ نہیں کیا۔“ گاؤں والوں میں سے ایک بولا۔ ”ہم تمہارے پیچھے نماز پڑھنا نہ چھوڑیں گے۔ جب تک ہمیں معاف نہ کرو۔“

”مت پڑھو، مت پڑھو۔“ بابا چلایا۔ ”تم نے اللہ کے ساتھ بیاہ نہیں کیا۔“

”تو کہہ دو گاؤں والوں کو معاف کیا۔“ وہ بولے۔

”اللہ معاف کرے گا۔“ وہ بولا۔ ”جاؤ جاؤ۔“

”اللہ نہیں کرے گا۔ جب تک تم نہ کرو۔“ گاؤں والوں نے کہا۔

”جاؤ جاؤ۔“ بابا بولا۔ ”میں کون ہوں۔ میں کچھ نہیں میں کچھ نہیں۔ جاؤ۔“

”چاہے تم کچھ نہیں۔“ گاؤں والوں نے کہا۔ ”جب تک تم یہ نہ کہو گے کہ جاؤ معاف کیا تمہیں جائیں گے۔“

”بابا اٹھ بیٹھا۔ وہ کھیتوں میں گھومنے لگا۔“ پگے پگے ٹنگ کرتے ہیں۔ ٹنگ کرتے ہیں۔“

لٹاوا لے دیں بیٹھا رہے۔

”جاؤ۔ جاؤ۔“ بابا بار بار ان کے قریب آ کر چلاتا۔

”کو معاف کیا۔“ وہ جواب دیتے۔ بابا پھر گھونسنے لگتا۔ ”میں کون ہوں میں کون ہوں۔ اللہ معاف کرنے والا ہے۔“

دیر تک وہ یوں ہی چلاتا رہا۔ پھر بولا۔ ”جاؤ معاف کیا جاؤ جاؤ۔ اللہ سے بیاہ کر لو۔ سب اللہ سے بیاہ کر لو جاؤ۔“

اس کے بعد انہوں نے کئی بار کوشش کی کہ بابا گاؤں میں آ رہے لیکن بابا نے ان کی بات نہ سنی اور وہیں سڑک پر گھومتا رہا۔

بابا کی یہ بات جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی۔ ارد گرد کے علاقے کے لوگ بابا کے پاس آنے لگے۔ لیکن جلد ہی ان سب کو معلوم ہو گیا کہ بابا نہ بیٹھے گا نہ بات کرے گا۔ لہذا لوگوں نے آ کر بابا کو سلام کرنا شروع کر دیا۔ بات کرنی ممکن نہ تھی مگر وہ سلام تو کر سکتے تھے اور رسم اس قدر عام ہو گئی کہ سڑک پر چلتی ہوئی بسیں، لاریاں اور موٹریں بابا کے ڈیرے کے پاس آ کر رک جاتیں ڈرائیور انجن بند کر دیتے اور پھر از سر نو گاڑی شارٹ کر کے چل پڑتے یہ ان کی سلامی تھی۔

برائیں رک جاتیں۔ بینڈ انگریزی نیشٹل انتھم بجاتے اور سلام کے بعد خاموشی سے پھر چل پڑتے راگبیر رک جاتے۔ سلام کرتے اور پھر چل پڑتے۔

اور بابا اتنی بڑی پاگ سر پر رکھے سڑک پر ادھر سے ادھر، ادھر سے ادھر چکر لگاتا رہتا۔ اس کی چھاتی ابھری ہوتی۔ گردن تخی ہوتی۔ سر اوپر کی طرف اٹھا ہوتا۔ اور وہ ادھر ادھریوں دیکھتا جیسے جہاز کا کپتان ہو۔ حالات کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کو کھینچ کر پار لے جانے کے متعلق ملاحوں کو احکامات صادر کر رہا ہو۔“

میں کیا کروں

جب ہاجرہ اور ایللی وہیں پہنچے تو بابا کھیت میں بیٹھا نماز پڑھنے میں مصروف تھا۔ ہاجرہ چپکے سے بابا کے پیچھے کھڑے ہو کر نماز پڑھنے لگی۔ ایللی عالی کو اٹھائے قریب ہی بیٹھ کر تنکے سے زمین کریدنے لگا۔

نماز سے فارغ ہو کر بابا نے مڑ کر دیکھا۔ ”تم نے اللہ سے بیاہ کیا ہے؟ وہ چلایا۔

”کیا ہے بابا جی۔“ ہاجرہ نے جواب دیا۔

”اچھا کیا۔“ وہ بولا۔ ”اچھا کیا۔“

”بابا جی یہ میرا بیٹا ہے۔“ وہ ایللی کی طرف اشارہ کر کے بولی۔ ”ادھر آ ایللی۔ ادھر آ۔ بابا کے ماننے۔“

ایللی اپنی جگہ چپ چاپ بیٹھا رہا۔

بابا نے ایللی کی طرف دیکھا۔ غور سے اس کی طرف دیکھتا رہا۔

”تمہارا بیٹا ہے۔“ وفتا“ وہ بولا۔

”جی بابا۔“ ہاجرہ بولی۔

”تمہارا بیٹا ہے۔ تو پھر میں کیا کروں۔“

”دعا کریں آپ۔“ وہ بولی۔

”میں کون ہوں۔“ وہ چلایا۔ ”میں کون ہوں کہ دعا کروں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ ہاجرہ بولی۔

”اللہ اپنے کام آپ جانے۔ وہ سب جانتا ہے۔ اللہ اپنے کام آپ کرے وہ سب کرتا ہے کون ہوں۔“

”آپ اللہ والے ہیں۔“ ہاجرہ نے پھر دوہرایا۔

”بھئی اللہ کے ہیں۔ میں بھی ہوں پھر میں کیا کروں۔“ پھر وہ اٹھ بیٹھا اور وہیں کھیت میں لڑکھٹے لگا۔

”وہ سب کرتا ہے۔ وہی کرتا ہے کون کرتا ہے پھر کون کرتا ہے۔ وہی جانے۔ اسی کے کام مادی جانے۔ میں کیا کروں۔“ دیر تک وہ میں کیا کروں کی رٹ لگاتے ان کے سر پر منڈلاتا

پھر وہ ایللی کے سامنے آکھڑا ہوا۔

”کیا نہیں کیا؟“ بابا چلایا۔ ”کیا نہیں کیا؟ جب تم نے ڈیرہ میں ڈیرا لگایا تو حضرت لغور نے تم پر ترس کھایا اور تم کو حفاظت میں لیا تھا، نہیں لیا تھا؟“

ایللی نے ڈیرہ کا نام بابا کے منہ سے سن کر حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”کیا نہیں کیا اس نے۔“ بابا چلا۔ ”وہ پھر چکر کھٹے لگا۔ واپسی پر وہ پھر ایللی سے رو برد کھڑا ہو

اور تم کو وقت پہ وہاں سے نکال دیا۔ اور تمہیں بچنے کھڑے میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“
چنا کنڈرا۔ ایللی کو امر ترسیاد آگیا۔

”اور پھر تمہارا منہ کالا کر دیا۔ اور تم چلتے پھرتے رہے اور لوگ چلتے پھرتے رہے۔ اور تم ان کو دیکھتے رہے اور وہ تمہیں دیکھتے رہے۔ پر انہوں نے تمہیں نہ دیکھا۔“

کیا نہیں کیا؟ کیا نہیں کیا؟ پھر وہ دیوانہ وار چکر کاٹتا رہا۔ کہتے ہیں نہیں کیا۔ نہیں یا تو نہیں کیا کروں۔ چلو نہیں کیا۔ پھر تم کون ہو کہنے والے نہیں کیا۔ سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ پھر وہ ایللی کے روبرو آکر کھڑا ہوا۔ ”کیا نہیں کیا۔“ وہ چلایا۔ ”پھر تمہیں داتا کے قدموں میں جگہ دی۔ نہیں دی کیا؟“ وہ بولا۔ ”بولو۔ دی۔ دی۔ وہ دینے والا ہے۔ ہم کون ہیں۔ ہم کون ہیں وہی سب کچھ ہے۔ سب کچھ دینے والا۔ اس کے سوا کوئی نہیں ہے۔“

بیا پھر ایللی کے روبرو آکھڑا ہوا پھر بولا۔ ”جھنڈے شاہ نے تمہاری حفاظت کی۔ تم پر ترس کھلایا۔ تمہیں بچایا۔ رحمت ہوگی اللہ کی بس اسی کی رحمت یہی چیز ہے۔ ہم کیا ہیں۔ ہم کیا ہیں کہتے ہیں کیا نہیں کیا پگے پگے۔“ وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔

بڈھا اور لمبا

”اور اور۔“ وہ رکا۔ ”اس نے تمہارا نانا لکھ لیا۔ نہیں لکھا؟ تم نے نہیں لکھوایا۔ تم نے کہا کہ تم اس سے بیاہ نہ کرو گے۔ نہ کرو نہ کرو۔ پھر کیا ہے؟ اس کا کیا؟ وہ تو اپنی رحمت سے بلاتا ہے۔ نہ جاؤ۔ نہ جاؤ پھر کیا ہے؟ اس پر بھی تمہارا نانا لکھ لیا۔ لکھ لیا۔“

وہ پھر چکر کاٹنے لگا۔ ”خود اندھے ہیں خود اندھے۔ اور کہتے ہیں۔ کچھ نہیں کیا۔ پھر میں کیا کروں۔ کیا کروں ہیں۔“

وہ پھر آکھڑا ہوا۔ ”اس بڈھے نے سب کچھ بتایا نہیں بتایا کچھ بولا۔ اس نے تمہارا نانا لکھا ہے وقت وقت کی بات ہے۔ وقت پر ہوتا ہے وقت پر نہیں ہوتا۔ اس بڈھے نے کہا وقت آئے گا۔ تم نے پرواہ نہ کی۔ اندھے ہیں اندھے اندھے ہی اندھے۔“ وہ پھر چکر لگانے لگا۔

ایللی حیرت سے اس بڈھے کی طرف دیکھ رہا تھا۔ اس کے سامنے حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ہاجرہ سہمی ہوئی بیٹھی تھی۔ سامنے سڑک پر لوگ کھڑے حیرت سے دیکھ رہے تھے۔ بیانے بھی کسی کو پاس نہ بٹھایا تھا۔ وہ ہاجرہ عالی اور ایللی کی طرف دیکھ رہے تھے۔ عالی اگلیوں سے لکیریں

بھیج رہا تھا۔

بیا پھر آگیا۔ ”پھر میں کیا کروں۔ میں کیا کر سکتا ہوں۔ تم وہاں جاؤ نہ جاؤ۔ جہاں تمہارا بواں ہے۔ دور بہت دور۔ رومی ٹوپی والا بڈھا بیٹھا ہے۔ وہ تم ایسوں سے نیٹ لے گا۔ کنویں کے پاس۔ مسجد کے پاس ندی کے پاس۔ وہ بڈھا بڑا جبر دست ہے اور اس کا بالکا وہ لمبا ہی لمبا اور اونچے قد والا دونوں بیٹھے ہیں جہاں تم نے پہنچنا ہے۔ جاؤ۔ جاؤ۔ وہ چلایا۔ ”میں کیا کروں۔ جاؤ جہاں تم نے جانا ہے ان سے ہو کر پھر تم نے وہاں پہنچنا ہے۔ جہاں تمہارا نانا لکھا ہے بیس سے ہو کر جانا ہے۔“ اس نے سڑک کی طرف اشارہ کیا۔ ”جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔“

دھنٹا۔ ”بیا کو غصہ آگیا۔ ”جاؤ جاؤ جاتے کیوں نہیں جاؤ۔“ اس نے ہاجرہ اور ایللی کو دھمکایا۔

”اس کو بھی بے جاؤ۔“ اس نے عالی کی طرف دیکھا۔ ”اس کو جو گل گیا تھا۔ پیٹ میں گل گیا تھا۔ اسے بھی لے جاؤ۔ جاؤ۔ جاؤ وہ غصے میں چلایا۔

”نہیں جاتے نہ جاؤ نہ جاؤ۔ تم جانو بڈھا جانے میں کیا کروں، میں کیا کروں۔“ یہ کہتا ہوا بیا سڑک کی طرف چل پڑا۔

وہ تینوں چپ چاپ بیٹھے رہے۔ ہاجرہ کے چہرے پر عجز اور انکار کے تو دے لگے ہوئے تھے عالی ایللی کا منہ تک رہا تھا۔ اور ایللی خاموش بیٹھا تھا چاروں طرف سے دھند لکا اس پر یورش کر رہا تھا۔

دھندلکے میں کھڑی شہزاد مسکرا رہی تھی۔ ”جاؤ۔“ وہ کہہ رہی تھی۔ ”رکاوٹ تو دور ہو نہ۔“ حاجی صاحب کا سر ہل رہا تھا۔ ”آئے گا وقت ضرور آئے گا۔“ وہ مدھم آواز میں گنگتا رہے تھے۔ ان کی آنکھیں یوں چمک رہی تھیں جیسے انہوں نے اسی سرے کی سلامتی لگا رکھی تھی۔

غلام مسکرا رہا تھا۔ اللہ ہی اللہ۔ اللہ ہی اللہ اس کی ستار سردھن رہی تھی۔

”اے ری عالی بیا بن۔“ رضی کی آنکھوں سے مٹھاس بھرے جھنجھٹے اڑ رہے تھے۔ بیا بیا لک چینی ہوئی اڑے جا رہی تھی۔

اس دھندلکے میں ایک بڈھا میلی سی رومی ٹوپی پہنے فضا کو گھور رہا تھا۔ اس کے قریب ایک

ہر ایمان کو استوار نہ کرتی تھی۔ نہ ہی اس کے دل میں خدا یا مذہب کے لیے جذبہ پیدا کرتی۔
رنہ ہی وہ ایسے لوگوں کو اللہ والے تسلیم کرنے پر تیار تھا جن سے ایسی طاقتوں کا ظہور ہوتا۔
تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈر پوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد
قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا وہ جیم جیمز کی فلکیات ہلڈین کپلے کے
بائس کا بجز۔“ سے متعلق مضامین برٹنڈرسل کے فزکس سنٹیانا کے جذبات کاؤنٹ
بیمین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ولز کی سائنس فکشن کتابوں سے اخذ کیا گیا تھا۔
ڈر کی بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا اسے اللہ کے بندوں
ہماتوں کے متعلق کچھ علم نہ تھا۔ اور ہوتا بھی تو اسے ان سے کوئی سروکار نہ تھا۔ چونکہ اسے
لہ کی طلب نہ تھی احترام تھا فقط احترام۔ ویسے وہ اللہ کی محبت سے کورا تھا۔ اللہ سے محبت کا
ال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ اللہ سے محبت صرف اسی صورت میں پیدا ہو سکتی ہے۔ جب وہ اپنی
لی اٹھا کر نیچے اتر آئیں۔ اسے بجائیں اور کائنات ماحول میں راہنما کی طرح نچے اور ان
املی کے سحر تلے بوئے آگ آئیں بھول کھل جائیں اور کوئل چلائے پیو پیو۔

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لیے قابل قبول تھا۔ اسلام
لے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا۔ عظمت عظمت عظمت۔ محبت کا سوال پیدا ہی نہیں
رہا تھا۔ اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں
لے اخذ کیا تھا۔ اسلام سے نہیں۔

لہذا معجزات کو خاطر میں لانا یا اللہ کے ان بندوں کے سامنے جھکتا بے کار تھا۔ ایللی کی ذہنی
اے بے حد مستحکم اور محفوظ تھی۔

لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بہتی تھی۔
شاید اسی لیے اسے شعریوں سے محبت تھی چونکہ شعریوں کے زیر اثر مرلی اٹھائے کلٹ
سے نیچے اتر آئے۔ اور پگھٹ پر اسے گھیر لیتے۔ اس کی ذہنی چوڑیاں ٹوٹ جاتیں۔ اس کے
ٹکی مگر پھوٹ جاتی اور وہ اس ٹوٹ پھوٹ سے بے نیاز ہو کر رادھکل بن کر نکلتا۔

لیکن یہ روی ٹوٹی والا بڑھا اور دراز قد کون تھے۔ جو اس کی پرائیویٹ زندگی میں خواہ مخواہ
لے پلے آ رہے تھے۔ لاحول و لا قوت عجیب بات تھی کہ وہ لاحول پڑھنا بھول جاتا۔ اس کا دل

اونچا لمبا دبلا پتلا انسان چپ چاپ بیٹھا تھا۔ کنواں اڑیاں اٹھائے ان کی طرف جھانک رہا تھا۔ ٹوٹی
ہوئی مسجد کے مینار گم صم کھڑے دیکھ رہے تھے چھوٹے چھوٹے درخت بالوب کھڑے تھے۔
جب ایللی گرد و پتن پہنچا تو وہ دھند لکا بدستور قائم تھا۔

اس کے بعد ایللی کے احساسات میں نہ جانے کیا ہوا۔ جب بھی وہ رضی مانی اور رگی کے
پاس بیٹھا ہوتا اور رضی کوئی نہ کوئی راگ چھیڑتا۔ گھمری رے اے ندیا۔“

تو اس کے روبرو ایک وسیع میدان پھیل جاتا۔ گمری ندی کے قریب ایک کنواں ابھر آتا اور
پھر پاس ہی ایک مسجد سفید چادر اوڑھے آبیشتی اور ایک مختصر سی چادر دیواری کے اندر سفید
ٹائیلوں پر روی ٹوٹی اوڑھے ایک بڑھا اپنے ہی دھیان میں مگن بیٹھا ہوتا۔ پاس ہی دراز قد با
اوب کھڑا ہوتا۔

”پون چلت پڑتا۔“ رضی گویا آپس بھرتا۔ ”وہی دنیا۔“ وہ چادر میں لپیٹی ہوئی مسجد اپنا آپ
سمیٹتی۔ دور ہوا سیٹیاں۔ بجاتی۔ دستیں اور پھیل جاتیں۔ کائنات انگڑائی لیتی پتے سرگوشیاں
کرتے درخت جھکتے ندی اور گمری ہو جاتی۔

ایللی رضی رگی اور مانی کے درمیان بیٹھ کر بھی اسی منظر میں کھویا رہتا۔
”لو شریستی آگئیں۔“ رگی مسکرایا۔

ایللی کی نگاہ تلے ایک نیلی روی ٹوٹی ابھری۔

”کیا بونا سا قد تھا۔“ مانی تتلی کو دیکھ کر مسکرایا۔

ایک بونا ایللی کی نگاہوں میں ابھرتا۔ اور پھر دراز قد ایللی کی طرف دیکھتا۔ اور پھر باگ بیا
چینٹ۔ ”جاؤ۔ چلے جاؤ تم جانو اور وہ جانیں۔ میں کون کون ہوں۔“

اور حاجی صاحب کا سر جھولتا۔ ”اللہ کا کرم ہے جس پر ہو جائے۔“

باگ بابا نے نہ جانے ایللی کو کیا کر دیا تھا۔

لیکن ایللی کا ذہن جوں کا توں تھا۔ وہ ایک مضبوط قلعے کی طرح اس کے گرد حصار کیے ہوئے
تھا۔ یہ ٹھیک ہے۔ بابا نے اس کے ماضی کے متعلق اتنی ساری باتیں بتادی تھیں۔ ضرور بابا میں
کوئی طاقت کام کر رہی تھی۔ لیکن ایللی سوچتا اس شعبہ بازی سے مجھ سا سمجھدار آدمی کیسے متاثر
ہو سکتا ہے۔ شعبہ بازی ایللی کو حیران کن ضرور کرتی تھی اسے شعبہ بازی سے چنداں دلچسپی نہ
تھی۔ معجزات یا اس قسم کی غیر مرئی طاقت اس کے لئے حیران کن ضرور تھی۔ لیکن وہ اس

احترام سے بھر جاتا۔ اور پھر نہ جانے کون مرلی چھیڑ رتا اور کائنات ناپنے لگتی۔

خاموش عزم

پھر ایللی باجرہ اور عالی چند ایک روز کی رخصت پر علی پور چلے گئے۔

علی پور ایللی کے لیے ایک ویرانہ تھا۔ نہ وہاں اس کا دوست تھا۔ نہ کوئی دلچسپی شہزاد کے چوبارے کو دیکھ کر اسے ہلکی سی اواسی محسوس ہوتی تھی۔ اور بس۔ محلے والوں کے دلوں میں ابھی تک اس وقت کی یاد باقی تھی۔ اگرچہ محلے والیاں اسے ہنس کر بلاتی تھیں لیکن جلد ہی کسی کے منہ سے زمانہ ماضی کی کوئی بات نصیحت کے رنگ میں نکل جاتی۔

گھر میں علی احمد اسی لمٹھرائق سے رہتے تھے۔ وہ بات بات پر گھروالوں کی توجہ اپنی طرف منعطف کرتے اور راجو یا شمیم کو طعنے دیتے رہتے۔

شمیم کی دونوں بیٹیاں جوان ہو چکی تھیں۔ بڑی دسویں جماعت پاس کر چکی تھی۔ اور اب کسی مدرسے میں معلمہ تھی۔ چھوٹی لڑکی کی شادی ہو چکی تھی۔

راجو کا بیٹا شیر علی لاہور میں اپنی بیوی کے پاس رہتا تھا۔ نصیر کالج میں تعلیم پاتا تھا۔ اس کے علاوہ علی احمد کے دو بیٹے اور تھے۔ وزیر اور کبیر وہ دونوں مدرسے میں پڑھتے تھے۔ جب سے علی احمد نے پنشن پائی تھی ان کی زندگی میں خاصی تبدیلی واقع ہو گئی تھی۔ وہ سارا دن گھر بیٹھے رہتے اور اپنے رجسٹروں میں کچھ لکھتے رہتے۔ نصیر وزیر اور کبیر سے ان کا رویہ قطعی طور پر مختلف تھا۔ چونکہ اب وہ بوڑھے ہو چکے تھے اور باپ کی بجائے دادا بن گئے تھے لہذا وہ ہر وقت اپنے بیٹوں کو اپنے پاس بٹھائے رکھتے اور انہیں اپنے خیالات کے انجیکشن لگاتے رہتے۔

ایللی علی پور پہنچا تو علی احمد نے حسب معمول بڑے تپاک سے اس کا استقبال کیا۔ ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے۔ پھر وہ گردن پتین کے متعلق پوچھنے لگے۔

”کیوں بھئی۔“ تمہارا جی لگ گیا وہاں۔ بڑا اچھا مدرسہ ہے۔ خوبصورت شہر ہے۔“ پھر معروف صاحب کی بات چل نکلی بولے ”دراصل تم کیریئر کے لحاظ سے خاصے بد قسمت واقع ہوئے ہو۔ ورنہ محکمہ تعلیم کے سبھی افسر اپنے دوست ہیں اگر تمہارے خلاف شکایات نہ ہوتیں تو نہ جانے ان کی مدد سے تم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے۔“

اپنے اثر و رسوخ پر ناز کرنے کی علی احمد کی پرانی عادت تھی۔ وہ خود بڑے عمدے پر نہ پہنچ

تھے۔ اور اپنی تمام تر زندگی میں کوئی مقام حاصل نہ کر سکے تھے۔ اس لیے عادی طور پر وہ اپنی اہمیت ان دوستوں سے اخذ کرتے تھے۔ جنہیں کوئی نہ کوئی مرتبہ حاصل تھا۔ ایللی ان کی اس عادت سے پورے طور پر واقف تھا لیکن اس میں اس قدر فراخ دلی نہ تھی کہ ان کی اس چھوٹی سی کمزوری کو برداشت کرتا۔

ان کے منہ سے اپنے دوستوں کی عظمت کا تذکرہ سن کر وہ جل کٹ جاتا تھا۔ اس کا خیال تھا کہ علی احمد کا کوئی دوست نہیں۔ لوگ صرف ان کی بذلہ سبکی کی وجہ سے ان سے ملتے اور ہمیں ہانکتے تھے۔ دراصل وہ علی احمد کے لیے کچھ کرنے کے لیے تیار نہ تھے۔ اس کی وجہ علی احمد کی اپنی طبیعت تھی۔ چونکہ وہ بڑے آدمیوں کو ہوا دینے کے قائل تھے۔ ان کا ادب لحاظ ملحوظ خاطر رکھتے۔ وہ کسی بڑے آدمی سے برابری کے احساس سے نہیں مل سکتے تھے۔

بہر صورت ایللی میں اس قدر وسعت قلب نہ تھی کہ علی احمد کی اس چھوٹی سی خوشی میں ان کا ساتھ دیتا۔

”دیکھئے ابا جان۔“ وہ بولا۔ ”آپکے دوست آج تک میرے لیے کچھ نہ کر سکے چھوڑیئے اس بات کو۔“

اس پر علی احمد کو غصہ آگیا۔ غصہ تو آتا ہی تھا۔ چونکہ ان کا اپنا بیٹا ان کی تمام تر اہمیت کو یوں یک قلم رد کر رہا تھا۔

”اگر معروف صاحب ڈائریکٹر نہ ہوں۔“ وہ جلال میں کہنے لگے۔ ”یا تم میرے بیٹے نہ ہو تو تم ایک روز بھی اپنی نوکری پر قائم نہیں رہ سکتے۔“

”آپ کا مطلب یہ ہے تاکہ انہوں نے آپ کی وجہ سے میرے خلاف شکایات پر کوئی ایکشن نہیں لیا۔“ ایللی نے کہا۔

”بالکل۔“ وہ بولے۔

”یہ میں تسلیم کرتا ہوں اور شکر گزار ہوں۔“ ایللی نے کہا۔ ”لیکن ان کی امداد مثبت قسم کی نہیں۔“

”کیا مطلب۔“ علی احمد بولے۔

”انہوں نے مجھے کچھ نہیں دیا۔ صرف نوکری پر بحال رکھا ہے۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”اجی میاں۔“ علی احمد چلائے۔ ”اگر وہ نہ ہوں تو تم ایک دن کے لیے بھی نوکری نہیں کر

”نوکری تلاش کرنے آئے ہو۔“ محمود بولا۔ ”تو میری تلاش کرو۔ میں بھی اس محکمے سے آتا گیا ہوں۔“

محمود نے بات مذاق میں ٹال دی۔ اب ایللی کو سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ کہاں جائے کس طرح کو شش کرے۔ اتفاق سے اس کی توجہ میز پر پڑے ایک اخبار کی طرف منعطف ہو گئی۔ اس نے ورق گردانی شروع کر دی۔ وہ چونک پڑا۔ اخبار میں لکھا تھا ایک نئے محکمے کے لیے چند آسامیاں پر کرنے کے لیے گریجویٹوں کی ضرورت ہے۔

”یہ دیکھو۔“ اس نے محمود سے کہا۔ ”تم تو کہتے تھے نوکری ڈھونڈنے سے ملتی نہیں۔“

محمود ہنسا۔ ”خالی تو بیسیوں ہوتی ہیں روزانہ لیکن ملتی نہیں۔“

”میں عرضی دوں گا۔“ وہ بولا

”دینے کا کیا مطلب ہے۔“ محمود چلایا۔ ”انہوں نے تو لکھا ہے کہ عرضی لے کر خود آ جاؤ۔

وہاں سینکڑوں سفارشی ہوں گے۔ تمہیں کون پوچھتا ہے۔“

ایللی نے عرضی لکھی اور اسے لے کر خود اس محکمے میں جا پہنچا۔

محکمہ کا ڈائریکٹر ایک نوجوان ہندو تھا۔ اس نے ایللی کا بغیر جائزہ لیا۔ ”ہوں۔“ وہ بولا۔

”تو آپ الیاس آصفی ہیں؟“

”جی۔“ ایللی نے کہا۔

”اور آپ محکمہ تعلیم میں ہیں۔“

”جی ہاں۔“

”کتنی نوکری کر چکے ہیں آپ محکمہ تعلیم میں۔“

”پندرہ سال۔“

”پندرہ سال کافی لمبا عرصہ ہے۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”لیکن آپ اس نوکری کو چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

ایک ساعت کے لیے ایللی نے سوچا اور پھر فیصلہ کر دیا کہ وہ اسے سچی بات بتائے گا۔ بولا۔

”جناب محکمہ تعلیم میں میرے والد کا اثر و رسوخ ہے۔“

”یہ تو اور بھی اچھا ہے۔“ وہ بولا۔

سکتے۔“ ایللی کو غصہ آ گیا بولا۔ ”یعنی آپ یہ سمجھتے ہیں کہ مجھ میں اتنی قابلیت ہی نہیں کہ اوئی سی نوکری بھی کر سکوں۔“ وہ ہنپے۔ ”میاں تم اپنی قابلیت کے زور پر اوئی سے اوئی نوکری بھی نہیں کر سکتے صرف میری وجہ سے تم اتنے بڑے عہدے پر فائز ہو یہ سنا تم نے نصیر کی ماں کیا کہا ہے ہم نے۔ کیا کہتی ہے۔ کیا غلط کہا ہے۔ ہی ہی ہی۔“ وہ ہنپے۔ ”یہ ایللی کیا نوکری کرے گا۔ اپنے بل بوتے پر۔ وہ ہم ہی تھے جو بغیر کسی کی مدد کے کسی واسطے کے اتنے سال نوکری کی اور عزت سے کی۔ کیا کہتی ہے۔“

ایللی کے دل میں ایک عزم بیدار ہو رہا تھا۔

جوں جوں وقت گزر رہا تھا وہ خاموش عزم تقویت پکڑا گیا۔ ایللی کی تمام تر انا گویا احتجاج میں اٹھ کھڑی ہوئی تھی وہ ایک مظلوم حبشی کی طرح تن گئی تھی۔ حبشی کی آنکھیں اپنے خاؤں سے باہر نکل آئی تھیں۔ گویا سو جا ہوا تھا۔ بازو تڑپتے ہوئے تھے۔ توڑ دو توڑ دو۔ یہ زنجیر توڑ دو۔ اس کے جسم کے بند بند سے نعرے بلند ہو رہے تھے۔

ایللی نے اب تک اپنی اہمیت شنوار سے اخذ کی تھی۔ اسے وہ محبوبہ حاصل تھی جس کے لیے آصفی محلے کے تمام افراد چشم براہ تھے۔ لیکن اب اس کی موت کے بعد ایللی کے لیے کوئی ایسی بات نہ تھی جس پر وہ اپنی اہمیت کو استوار کر سکتا تھا۔ علی احمد کی اس سرسری بات نے ایللی کی توجہ کو اس بات کی طرف منعطف کر دیا تھا۔ اسے اپنی قابلیت پر بڑا ناز تھا۔ وہ جملہ اساتذہ کو کمتر سمجھتا تھا۔ اس کی دیرینہ خواہش تھی۔ کہ اساتذہ کے جھرمٹ سے نکل جائے۔ ان کی زندگی کھوکھلی تھی۔ ان کی شخصیتیں بناوٹی اور رسمی تھیں۔ انہوں نے اخلاقیات کا خول پہن رکھا تھا۔ ان کا علم کتابی تھا۔ ہڈر، فکر کی ان میں صلاحیت نہ تھی۔

ایللی کا ارادہ پختہ ہوتا گیا۔ کہ وہ محکمہ تعلیم کو چھوڑ دے گا۔ جہاں اعلیٰ افسر علی احمد کے دوست تھے۔ وہ اپنا راستہ خود پیدا کرے گا۔

رام گوپال

چند ایک روز کے بعد ایللی لاہور چلا گیا۔

لاہور میں اس نے محمود سے بات کی۔ ”یار کوئی نوکری تلاش کرنے آیا ہوں۔ میری مدد کرو۔“ وہ بولا۔ ”میں سکول کی نوکری نہیں کروں گا۔“

”جی۔“ ایلی نے کہا۔

”تو آپ وہ محکمہ چھوڑنا کیوں چاہتے ہیں؟“

”میں ایسے محکمے میں نوکری نہیں کرنا چاہتا۔ جہاں بلا واسطہ اپنے بل بوتے پر ترقی حاصل نہ سکوں۔“

”کیوں۔“ ڈائریکٹر سوچ میں پڑ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کھیل رہی تھی۔

”کیا آپ کو معلوم ہے۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ کہ یہ آسامی جس کے لیے آپ نے درخواست ہے مستقل نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”اس میں پشش نہیں۔“

”جی۔“ وہ بولا۔

”آپ کی پندرہ سال کی نوکری بے کار جائے گی۔“

”مجھے معلوم ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”معاف کیجئے گا۔“ وہ بولا۔

”میں آپ کو یہ آسامی دے کر آپ کا نقصان نہیں کرنا چاہتا۔“

”معاف کیجئے گا۔“ ایلی نے کہا۔

”میرا فائدہ اور نقصان میں بہتر سمجھتا ہوں۔“

”اچھا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔ ”تو آپ امتحان میں شامل ہو جائیے۔“

”امتحان۔“ ایلی نے دوہرایا۔

”ہاں۔“ وہ بولا۔

”ہم انڈیو پولیس گے۔ اگر آپ پاس ہو گئے تو میں آپ کا کیس رکنڈ کر دوں گا۔“

انڈیو کے بعد ڈائریکٹر نے ایلی کو بلایا۔ اور ایک ٹائپ شدہ کانڈ اس کے ہاتھ میں تھمادیا۔

آفر ہے۔“ وہ بولے۔ ”اگر آپ کو ڈیڑھ سو روپے ماہوار تنخواہ منظور ہے۔ تو آپ مجھ سے

کر سکتے ہیں۔ لیکن تب جب آپ یہاں جائن کرنے کے لیے آئیں۔“

”آپ نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔ میں بے حد شکر گزار ہوں۔“ ایلی نے جذبہ کی

ت سے انک انک کر کہا۔

”میں نے آپ پر کوئی احسان نہیں کیا۔“ ڈائریکٹر نے کہا۔

”میں تو سمجھتا ہوں۔“ ایلی نے کچھ کہنا چاہا۔

”آپ غلط سمجھتے ہیں۔“

”اتنے میں ایک چہرہ اسی کچھ کانڈات لے کر آ گیا۔

”ذرا ٹھہریے۔“ ڈائریکٹر نے ایلی سے کہا۔

”تشریف رکھیے۔ ایک منٹ۔“

کانڈات پر دستخط کر کے وہ ایلی کی طرف متوجہ ہوا۔

”میں نے آپ پر احسان نہیں کیا۔“ وہ بولا۔ ”ان بچوں پر احسان کیا ہے جنہیں آپ

بھاتے ہیں۔“ ایلی نے حیرانی سے اس کی طرف دیکھا۔

”آپ بچوں کو پڑھانے کے لیے بے حد ناموزوں ہیں۔“ وہ بولا۔ ایلی کی سمجھ میں نہیں آ

ہا تھا۔ کہ کیا کہے۔

”یہ درست ہے۔“ وہ بولا۔ ”کہ آپ ان میں فکر کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ یہ بھی ج

ہے کہ آپ ان میں تحقیق کی سپرٹ بیدار کرتے ہیں۔“

”جی میں ———“ وہ گھبرا کر بولا۔

”سن لیجئے۔ ڈائریکٹر نے کہا۔

ایلی خاموش ہو گیا۔

”لیکن آپ کی تعلیم ان کے لئے سم قاتل ثابت ہوتی ہے۔ اور تمام دنیا حریف بن کر ان

کے سامنے آکھڑی ہوتی ہے۔“ وہ رک گیا۔

پھر مسکرا کر بولا۔ ”آپ کی تعلیم کی وجہ سے میری زندگی میں بہت مشکلات پیدا ہوئیں۔

بلکہ میری بیشتر مشکلات کی وجہ آپ ہیں آپ۔“

ایلی نے تعجب سے اس کی طرف دیکھا اور گھبرا کر کھڑا ہو گیا۔

ڈائریکٹر بھی کھڑا ہو گیا۔ اس نے ایلی کی طرف ہاتھ بڑھایا۔ میرا نام رام گوپال ہے۔ میں

آپ کا شاگرد ہوں۔

ڈائریکٹر نے تپاک سے ایلی سے ہاتھ ہلایا۔

ایلی کی زبان گنگ ہو چکی تھی۔

”یہ بھی صحیح ہے۔“ رام گوپال بولا۔ ”میں نے آپ سے پایا بھی بہت کچھ ہے۔ بہت کچھ۔“

ایلی کے استعفیٰ پر اک شور مچ گیا۔ لالہ جی نے جوان کے ہیڈ ماسٹر تھے اپنا سر پیٹ لیا۔ وہ کو بار بار سمجھاتے کہ پندرہ برس کی نوکری کو یوں ٹھوکر مار کر چلے جانا عقل مندی نہیں۔ لالہ جی حیران تھے۔ علی احمد نے سنا تو فوراً ایک خط لکھا۔ ”برخودار ایسی حماقت نہ کرنا ورنہ کی بھر بچھتاؤ گے۔ تمہیں مسٹر معروف سا افسر اعلیٰ کیس نہیں ملے گا۔ اس محکمے کو نہ چھوڑو۔ محکمہ تعلیم کا وزیر بھی میرا پرانا لنگوٹیا ہے۔ ایسی آسانیاں کیس دستیاب نہ ہوں گی۔“ لیکن ایلی نے اپنا فیصلہ نہ بدلا۔

صرف رضی رگنی اور مانی تھے۔ جنہوں نے اس کی ہمت بندھائی۔ رضی نے کہا۔ ”بھئی دانہ پانی کی بات ہے۔“

رگنی بولا۔ ”یار میں بھی اس محکمے کو چھوڑنا چاہتا ہوں۔ لیکن آج تک بات نہیں بنی۔ وہیں گے تو میرے لئے بھی کوشش کرنا۔“

”بڑا چھایا تم نے۔“ مانی بولا۔ ”شبلاش اپنا راستہ خود بناؤ۔ چاہے ناکامی ہی کیوں نہ ہو۔“ لاہور میں ایلی کی زندگی یکسر بدل گئی محکمہ بدلنے کی وجہ سے ماضی کی تمام تلخیاں گویا اس نامہ اعمال سے دھل گئیں۔ محکمہ تعلیم میں اس کے افسران اور رفقاء کار کسی نہ کسی حد تک اس کے گزشتہ کارناموں سے واقف تھے۔ اس کی ہر بات کا مضمون اس کی گزشتہ زندگی کے پود کے حوالے سے اخذ کیا جاتا تھا۔ اس کے خیالات اور جذبات بلا واسطہ کوئی حیثیت نہ دیتے تھے۔

اس محکمے میں وہ ماضی کے حوالے سے قطعی آزاد ہو گیا۔ اس کے علاوہ یہاں اس کے بہادر خیالات اور دکھلاوے کے تقدس سے بے نیاز تھے اگرچہ وہ مڈر ہو کر سوچ نہ سکتے تھے لیکن خیالات کے خلاف ان میں بغض نہ تھا۔ محکمہ تعلیم کو چھوڑ کر ایلی نے محسوس کیا جیسے وہ کچھ بڑے جوہر سے نکل کر دریا میں آپہنچا تھا۔ وہاں روانی تھی وسعت تھی اور جود نام کو نہ تھا۔ نئے محکمے میں آکر چند ہی روز اس نے محسوس کیا جیسے وہ پرانا ایلی نہ تھا۔ جیسے بچی ہوئی رگنی محض ایک خواب ہو۔

”میں نے کہا تھا۔“ شہزاد آکر مسکراتی۔ ”تمہاری زندگی پھر سے شروع ہوگی۔“ لاہور پہنچ

کر اس نے پہلی مرتبہ شہزاد کو یاد کیا۔ شہزاد کی یاد اب اس کے ذہن میں گزشتہ تلخیوں سے بے تعلق تھی۔ جب بھی شہزاد کی یاد آتی تو وہ اسے مسکراتے ہوئے دیکھتا اور اس کے دل میں عجیب سی خوشی پیدا ہوتی۔

لاہور میں اس کا ماموں زاد بھائی رفتی تھا۔ پھر فرحت بھی وہیں تھی۔ چونکہ اس کا خاوند اجمل لاہور کے ایک دفتر میں تبدیل ہو چکا تھا۔ اور حکومت کی وساطت سے انہیں مادھو محلہ میں ایک مکان مل گیا تھا۔ جہاں وہ رہتے تھے۔ ایلی فرحت کے پاس ٹھہرا تھا۔ اور ایک بار پھر اسے بھرے گھر میں رہنے کا موقع ملا تھا۔ فرحت نے ایک بڑا سا کمرہ ایلی عالی اور ہاجرہ کے لئے مخصوص کر دیا تھا۔

ہاجرہ سے جب فرحت نے سنا کہ رگنی اور مانی ایلی کی شادی کے لئے کوئی رشتہ ڈھونڈ رہے ہیں تو اسے بہت خوشی ہوئی۔ فرحت کو ایلی کی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔ لیکن اس نے ایلی اور شہزاد کے تعلقات کے کبھی اچھی نگاہ سے نہ دیکھا تھا۔

ابھی ایلی کو لاہور آئے چند ایک روز ہی ہوئے تھے کہ مانی اور رگنی لاہور آگئے۔ رگنی کے لئے لاہور ایک عظیم نعمت تھی۔ وہ وہاں آکر بے حد خوش ہوتا تھا۔ اس لئے کہ خوبصورت اجمل اس کے نزدیک سب سے بڑی نعمت تھی۔ لاہور میں لباس تھا جوانی تھی۔ رنگ تھا۔ شوخی تھی۔ اور رگنی کے لئے یہی بہشت تھا۔

دو روز وہ اکٹھے سڑکوں پر گھومتے رہے۔ راگ دیا کی باتیں کرتے رہے۔ پتی اور شرمیستی کے قصے دہراتے رہے۔ جب رگنی اور مانی جانے لگے تو دفعتاً ”رگنی بولا“ ایلی تمہارے لئے ایک ایسی بیوی تلاش کی ہے۔ جس کا جواب نہیں۔ وہ تمام خصوصیات اس میں ہیں جن کی تمہیں اشد ضرورت ہے شکل و صورت سے تو تم بے نیاز ہو۔ باقی رہی طبیعت تو جتناب ایسی نیک لڑکی ہمارے قصبے میں تو ہے نہیں کوئی۔ اور اس کا باپ ایک لاجواب مرد ہے۔ اس قدر شدت کی انفرادیت شاید ہی کسی میں ہو۔ جو منہ سے کہہ دیا پھر کی لکیر سمجھ لو۔ اور دیانتداری کی تو حد نہیں کوئی۔ بات کا پکا قول کا پورا اور رسمیات سے بیگانہ بالکل بیگانہ۔ وہ لوگ آکر تمہیں دیکھ لیں گے جیسے عام طریقہ ہے اور یہ بھی محض رسم ہے چونکہ لڑکی نکمت کی بچہن کی سہیلی ہے وہ اسے ذاتی طور جانتی ہے۔ بہر حال بات یہی سمجھو۔

”دیکھو بھائی۔“ ایلی نے کہا ”چاہے جو جی چاہے کہ میرے مرضی کے متعلق کوئی بات چھپا

نہی کہ ہونے والی بیوی کو ایک نگاہ دیکھ لے یا ہاجرہ کو بھیج کر اس کے ذریعے معلومات حاصل کرے۔

نامن پور

نامن پور ایک پرانا قصبہ تھا۔ جولاہور سے تقریباً تیس میل کے فاصلے پر واقع تھا نامن پور مغلوں کے زمانے میں آباد ہوا تھا۔ قصبے پر مغلوں کی سرکشت تھی قصبے کے گرد چھوٹی اینٹ کی بنی ہوئی چار دیواری تھی۔ جس میں آٹھ دروازے کھلتے تھے۔ چار دیواری کے اندر تنگ و تاریک گلیوں اور چھوٹے چھوٹے تنگ گلی نما بازاروں کا جال بچھا ہوا تھا۔ ان تنگ گلیوں کے ارد گرد اونچی اونچی چوٹے کی عمارتیں تھیں حویلیاں تھیں۔ اوپر گلیوں کا احاطہ تھا اوپر سیدوں کا ہلی طرف دیوانوں کا۔

قصبے کے شمال مغرب میں ہندوؤں کا سینہ کنبہ آباد تھا۔ جن کی وجہ سے نامن پور مشہور تھا جنھوں کا یہ کنبہ نامن پور کا قدیم ترین کنبہ تھا۔ نامن پور کے گرد و نواح کے کھیت انہیں کی لیت تھے۔ سینہ حسین تھے، متحمل مزاج تھے اور دولت کی حفاظت کرنا جانتے تھے۔ سینھوں کے بعد نامن پور کے نو مسلم مشہور تھے وہ سب دییش تھے جو بعد میں مسلمان ہو گئے۔ ان کا پیشہ بارت تھا۔ اور وہ قدیم زمانہ سے دوکانداری کرتے آئے تھے۔ ان دییشوں کی کئی ایک گوتیں ان پور میں آباد تھیں مثلاً ”کپڑے تاراج تھے ہنگاتے چالیہ تھے۔ نامن پور اور اس کے جوار کے قصبوں اور شہروں میں ان کی دوکانیں تھیں۔ جنہاں وہ چھوٹے چھوٹے کاروبار کرتے۔ ان کا چند ایک لوگ ہندوستان کے دور و دراز کے شہروں میں جا کر پنجاب کی منسوعات بیچتے تھے۔ ایک ماہ شہروں کے چکر لگاتے اور پھر نامن پور میں لوٹ آتے تاکہ اگلے چکر کے لئے اشیاء اکٹم کریں۔

ان میں سے گنتی کے لوگ تعلیم یافتہ تھے۔ جنہوں نے کاروبار چھوڑ کر ملازمت اختیار کر لی لان کی تعداد بہت کم تھی۔

چالیہ گوش کے دییشوں کا سب سے بڑا گھرانہ آصف کا تھا۔ غیر تعلیم یافتہ ہونے کے باوجود مف صاحب فکر تھے۔ اس کے فکر میں انفرادیت تھی۔ اور یہ انفرادیت صرف فکر کی حد تک مدد تھی۔ وہ سوچتے تھے اور اسے فوراً عمل میں لانے کے قائل تھے۔ فکر کی اس علوت کی

کر نہ رکھنا ایسا نہ ہو کہ بعد میں کہیں ہم سے دھوکا کیا گیا۔“

”یہ بات تم ہم پر چھوڑ دو۔“ مانی بولا۔

”نہیں یا یہ غلط ہے۔“ ایللی نے کہا۔

”تم ہمارے رشتہ داروں اور برادری والوں کو نہیں جانتے۔“ مانی نے کہا۔ ”بے حد غلط

لوگ ہیں۔ پشت در پشت دوکانداری کرتے رہے ہیں۔ ان کا نقطہ نظر روپیہ تک محدود ہے جس کے پاس روپیہ ہے وہ بڑا آدمی ہے۔ سب لکیر کے فقیر ہیں۔ ہر بات قابل قبول ہے جس میں سے رسم کی بو آتی ہو۔ نئی بات الحاد ہے۔ نیا چین قابل تف ہے۔“ مانی شدت میں نہ جانے کیا کہتا گیا۔ رنگی مسکرا رہا تھا۔

ایللی سوچ رہا تھا۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ جس قصبے نے رنگی نکت اور مانی جیسے کردار پیدا کئے ہوں۔ وہ قصبہ ازلی طور پر رنگ سے خالی ہو یا زندگی سے محروم ہو ضرور مانی بڑھا کر بات کر رہا تھا۔ چونکہ مانی میں تو توازن مفقود تھا۔ اس میں جذبہ تھا۔ خلوص تھا خود پسندی کی دلی دلی جھلک تھی اور بے پناہ جرات تھی۔

شادی کے متعلق ایللی اب سوچنے سمجھنے اور پرکھنے کا قائل نہ رہا تھا۔ زندگی میں بہت سی باتیں جو اس نے سوچ سمجھ کر کی تھیں ان کا انجام اچھا نہ ہوا تھا۔ عورت کے متعلق تو اسے یقین ہو چکا تھا کہ وہ چاند کی طرح ایک مخصوص پہلو آپ کے سامنے پیش کرتی ہے۔ اور عورت میں کئی ایک پہلو ہیں۔ متبسم پہلو۔ متذبذب پہلو ”مجھے کیا“ اور وہ پہلو جس کے تحت شہزادے اس شرابی کے متعلق کہا تھا۔ ”نہیں میں اسے معاف نہیں کروں گی۔ میرے سامنے بلک بلک کر گھٹ گھٹ کر مرے۔“

عورت کو پرکھنا ایللی کے خیال کے مطابق ناممکن تھا۔ عورت میں یہ صلاحیت تھی کہ سال با سال اپنا ایک مخصوص پہلو پیش کرے وہ سالہا سال تبسم پہلو پیش کر سکتی تھی کیسے ہی حالات کیوں نہ ہوں کتنی ہی مشکلات کیوں نہ ہوں۔ لیکن اگر وہ ضرورت محسوس کرے تو تبسم ہی دکھائی دے گی۔ اور جب وہ سمجھے کہ اب ضرورت نہیں رہی تو حالات کے تقاضے سے بے نیاز ہو کر گھورتا شروع کر دے گی۔ یا بے پروائی اور بے نیازی کا جامہ اوڑھ لے گی۔ اس لئے عورت کو جانچنے کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا ایللی سمجھنے لگا تھا شادی ایک جوا ہے۔ چاہے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر کھیلو یا آنکھیں بند کر کے اس نے آنکھیں بند کر لی تھیں۔ اس نے یہ خواہش محسوس نہ کی

وجہ سے انہوں نے زندگی میں چند ایک اصول مرتب کئے تھے جن پر شدت سے پابند ہونے کے باوجود وہ اس بات کا احساس رکھتے تھے کہ زندگی اصول سے زیادہ اہم ہے۔

نامن پور میں لوگ آصف کی عزت کرتے تھے اور ان پر اعتماد رکھتے تھے۔ ہندو اپنی امانتیں آصف کے سپرد کر دیتے دیش اپنے جھگڑوں کے تصفیہ کے لئے آصف کو بیچ بنانے پر خوشی محسوس کرتے لیکن آصف کے اپنے گھر میں ان کے خیالات کا مذاق اڑایا جاتا تھا۔ ان کی بیوی کو ان کی رائے مشورے یا فیصلے پر قطعی اعتماد نہ تھا۔ گھر میں ہر بات پر انھیں جھاڑ جھٹ ہوتی تھی۔ جسے وہ سر جھکا کر سننے کے عادی ہو چکے تھے لیکن اس کے باوجود وہ اپنے خیال اور رائے پر قائم رہتے اور وہی کرتے تھے جو ان کے خیال میں درست ہوتا۔

آصف نے زیادہ تر زندگی جنوبی ہندوستان کے ایک شہر میں گزاری تھی۔ جہاں ان کا ایک اعلیٰ قسم کا ہوٹل تھا۔ جس میں بڑے بڑے اہل کار اور یورپین آکر ٹھہرتے تھے۔ شاید اسی وجہ سے وہ دوسروں کی بات غور سے سننے کے عادی ہو چکے تھے ان کی طبیعت میں اخلاق تھا قتل تھا۔ اگرچہ اس کے ساتھ ہی وہ دہم کی بیماری میں مبتلا تھے۔ جو کافی شدت اختیار کر چکی تھی۔

تین بیٹوں کے علاوہ آصف کی ایک بیٹی بھی تھی۔ جس کا نام بلند بخت تھا۔ بلند بخت نے چند ایک جماعتوں تک مدرسہ میں تعلیم پائی تھی اور پھر آصف نے اسے مدرسہ سے اٹھالیا تھا چونکہ دستور کے مطابق نامن پور کے لوگ بچیوں کو زیادہ پڑھانے کے قائل نہ تھے۔ آصف خود تو تعلیم کے حق میں تھے ممکن ہے ان کی بیگم نے زبردستی بلند بخت کو کتب سے اٹھالیا ہو۔

بلند بخت ابھی عنفوان شباب میں ہی تھی کہ اسے ایک قریب رشتہ دار کے بیٹے سے منسوب کر دیا گیا۔ اور جلد ہی بڑی دھوم دھام سے شادی ہو گئی۔

لڑکے نے دولہا بننے سے پہلے بار بار اپنے والدین کو کسلا دیا تھا کہ اس کی شادی نہ کی جائے چونکہ وہ شادی کے قائل نہیں۔ لیکن والدین نے اس کی بات کو درخور اعتنا نہ سمجھا۔ شاید وہ یہ سمجھتے رہے کہ لڑکا ویسے ہی اچکا پاتا ہے اس کے ذہن پر عورت کا ڈر حاوی ہے۔ آہستہ آہستہ مانوس ہو جائے گا۔ یا شاید اس کی وجہ یہ ہو کہ اس سالن کو دیکھ کر جو آصف جیز کے مشتاق تھے لڑکا چاہے قاتل ہو یا نہ ہو۔ سالن پر قبضہ جمانے کے تو وہ قاتل تھے۔ لہذا انہوں نے لڑکے کی بات نہ سنی۔

بلند بخت شب عروسی میں دولہا کا انتظار کرتی رہی۔ دولہا کے والدین اسے ڈھونڈتے رہے۔

آخر بات نکل گئی کہ دولہا غائب ہے۔ بلند بخت نے سنا تو اسے ایک دھچکا لگا۔ اس کی حیات منجمد ہو گئی۔ نسائی تقاضوں کے راستے مسدود ہو گئے۔ نہیں ایک زبردست بیچاں سے ٹکرائیں اور حیات کا وہ فیروزہ ہمیشہ کے لئے اڑ گیا۔ جو اس کی نسائی زندگی میں تحریک پیدا کر سکتا تھا۔ اگلے روز اس کے والدین بلند بخت کو اپنے گھر لے گئے۔

پہلے تو مہو مہو سی امید باقی تھی۔ کہ شاید دولہا کسی روز گھر واپس آجائے پھر جوں جوں وقت گزرنا گیا مایوسی گہری ہوتی گئی۔ حتیٰ کہ سات سال گزر گئے۔

دیش لوگوں میں طلاق کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔ ان کے نزدیک طلاق کا لفظ گالی کے مترادف تھا۔ وہ اسے منہ پر لانے والا برداری میں ہمیشہ کے لئے اپنی عزت کھو دیتا تھا۔ لہذا بلند بخت کی دوسری شادی کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا تھا۔

بلند بخت نعمت کی سہیلی تھی اور نعمت رنگی اور مانی کے ساتھ رہنے کی وجہ سے یا شاید نفرتی طور پر نامن پور کی عورتوں سے ہٹ کر تھی۔ ہاجرہ کی بات سن کی اسے فوراً بلند بخت کا خیال آیا تھا۔ رنگی نے اس بات میں اس کی ہاں میں ہاں ملائی تھی۔ اور مانی عملی طور پر اس سلسلے میں کوشش کرنے کے لئے بے تاب ہو گیا تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ انہوں نے مل کر برداری میں بات چلا دی۔ اور کچھ حیرت کچھ تعجب اور عورتوں کے ناک بھوں چڑھانے کے بعد بلند بخت کو طلاق ہو گئی۔ ایک مختصر سی رسم کے بعد بلند بخت کا ایللی سے عقد ہو گیا۔ اور وہ ایللی کے گھر آگئی۔ اور ایللی نے دیکھا کہ اس کے گھر ایک لاش پڑی ہے اور زندگی بھر اسے ایک لاش اٹھائے پھرنا ہے۔ بلند بخت کو دیکھ کر ایللی کو ایک دھچکا لگا۔

اگرچہ وہ اس بات پر مصر تھا کہ کسی نو جوان لڑکی سے اس کی شادی نہ کی جائے۔ بظاہر وہ یہ بھی چاہتا تھا کہ اس کی بیوی حسین نہ ہو۔ رنگین نہ ہو۔ اس وقت اس کی عمر چالیس سال کے لگ بھگ تھی۔ شدت بھری زندگی بسر کرنے کے بعد وہ تھک چکا تھا۔ آکتایا ہوا تھا۔ اس کی سب سے بڑی خواہش سکون و اطمینان تھا۔ اس کے علاوہ اسے یقین تھا کہ وہ عالی کے لئے شادی کر رہا ہے۔ اگر اس کے گھر میں حسین و جمیل بیوی آگئی تو ممکن ہے وہ اپنی بیوی میں اس حد تک کھو جائے کہ قریب ہی عالی بے توجہی کی گود میں پڑا بلکتا رہے اور اسے خبر بھی نہ ہو کہ وہ بلک رہا ہے۔ رو رہا ہے۔ پریشان حال ہے۔

ان سب باتوں کے باوجود بلند بخت کو دیکھ کر ایللی کو ایک دھچکا لگا۔

لیکن جلد ہی اس نے جواز پیدا کر لیے شاید یہی مناسب تھا کہ بلند بخت اس کی بیوی بنے۔
 جیون ساتھی نہ بنے۔ ورنہ عالی تنہا رہا جاتا۔ اس نے اپنے آپ کو تسلی دینے کی کوشش کی کہ
 ضرور اس میں قدرت کا ہاتھ ہے۔

دقت یہ تھی کہ بلند بخت اس گزشتہ سانحہ کی وجہ سے بالکل ہی مایوس ہو چکی تھی۔

بلند بخت کے خیالات بے حد پاکیزہ تھے لیکن یہ پاکیزگی رسم و رواج کی زنجیروں میں جکڑی
 ہوئی تھی۔ اس کے شانوں پر سر نہیں بلکہ ایک پھوڑا تھا جس میں مسلسل درد رہتا تھا۔ اس کی
 سب سے بڑی خوشی یہ تھی کہ خاوند اس سے دور رہے بلند بخت کی آمد پر اہلی نے ایک مکان
 کرائے پر لے لیا اور اہلی اور عالی فرحت کا گھر چھوڑ کر اپنے گھر میں منتقل ہو گئے۔

مشکلات

اہلی کو سیاست سے قطعی طور پر دلچسپی نہ تھی۔ اخبار تو وہ پڑھتا تھا لیکن سیاسی خبروں کے
 متعلق اسے دلچسپی نہ تھی۔ صرف سرخیاں پڑھ کر مطمئن ہو جاتا۔

جب ہندوستان کی آزادی کی آواز بلند ہوئی تو اہلی کو بے حد خوشی ہوئی تھی وہ چاہتا تھا کہ
 اس کا ملک آزاد ہو جائے۔ اور کوئی بیرونی طاقت اس ملک پر مسلط نہ رہے۔ اہلی کے دل میں ان
 مجاہدوں کے لئے احترام تھا جو آزادی کی جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ ہندوستان کے لیڈروں پر ناز کرتا
 تھا۔ مثلاً "مہاتما گاندھی پنڈت جواہر لال نہرو اور محمد علی جناح۔ اس کے باوجود اس نے کبھی کسی
 سیاسی مجلس میں حصہ نہ لیا تھا۔ اور نہ ہی ان محبوب لیڈروں کو کبھی دیکھا تھا۔ حالانکہ اس زمانے
 میں سیاسی بیداری بڑھ چکی تھی۔ اور لوگوں کے دلوں میں سیاسی جذبہ یوں لہریں لے رہا تھا کہ
 ذاتی مسائل بھی پس پشت پڑ چکے تھے۔

پاکستان کے قیام کا سوال ان دنوں پیش پیش تھا۔ پنجاب میں مسلم لیگ کی دھوم مچی ہوئی
 تھی یوپی کے مسلمان پاکستان کے لئے سردھڑکی بازی لگائے بیٹھے تھے علی گڑھ یونیورسٹی میں علم و
 ادب کی جگہ سیاست کا ایال آیا ہوا تھا۔

لیکن اہلی اس جھگڑے سے بالکل بے گانہ تھا۔ وہ پاکستان کے حق میں نہ تھا۔ وہ پاکستان کے
 خلاف بھی نہ تھا۔ اس نے کبھی اس مسئلے کو اہمیت ہی نہ دی تھی۔ وہ چاہتا تھا کہ ہندوستان کو
 آزادی مل جائے۔ اور لوگوں کی اور ملک کی اس میں بہتری ہے تو پاکستان کا قیام عمل میں آ

جائے۔ بہر حال وہ ہر اس بات کا طرف دار تھا۔ جو عوام اور ملک کی بہتری کے لئے تھی۔ لیکن وہ
 یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ ملک کی بہتری کس بات میں ہے۔

پنجاب کے مسلمان پاکستان کے حق میں تھے۔ اس وجہ سے کبھی کبھار اس کے دل میں بھی
 پاکستان کے لئے جذبہ پیدا ہوتا۔ لیکن وہ جذبہ محض وقتی ہوتا۔ یا کبھی کبھار بیٹھے بیٹھے اس کے
 روبرو دھرم سالہ کا سکول ابھرتا۔ چھٹی جماعت کا لڑکا رام لال اس کے سامنے آکھڑا ہوتا۔ "رام
 لال مجھے ایک گلاس پانی لا دو۔" اہلی کہتا۔ "رام لال کی گردن جھک جاتی اور وہ چپ چاپ جوں کا
 توں کھڑا رہتا۔ "رام لال۔" اہلی چلاتا۔ "تم سے کیا کہہ رہا ہوں۔" جی میرا دھرم بھرشت ہو
 جائے گا۔" رام لال جواب دیتا۔ "بے وقوف لڑکے۔" اہلی ہنستا۔ "اگر تم میرے ہاتھ کا پانی پو تو
 دھرم بھرشت ہو گا۔ اگر تم مجھے پانی لا دو تو تمہارا دھرم کیسے بھرشت ہو سکتا ہے۔" رام لال اسی
 طرح گردن جھکائے کہتا۔ "جی میرا دھرم بھرشت ہو جائے گا۔"

پھر اس کے روبرو دھرم سالہ کا پڑوسی آکھڑا ہوتا۔ "جی میرا نام رام دین ہے۔"

"رام دین؟"

"جی میں بھگوان کی دیا سے مشلمان ہوں۔"

"مشلمان۔"

"جی جی۔"

پھر اہلی کی نگاہ میں رام دین کی کنیا ابھرتی۔ وہ چونکا۔ وہ پوتر گوبر کا ڈھیر کارنس پر دھری ہوئی
 مورتیاں۔

"جی میں مشلمان ہوں۔" رام دین چلاتا۔ اور پھر تمام ہندوستان کے مسلمان اس کے
 سامنے قطار باندھ کر کھڑے ہو کر چلائے۔ "جی میں بھگوان علی ہوں۔ جی میں کرشن اللہ ہوں۔ جی
 میں غلام گرد ہوں۔ ہم مشلمان ہیں۔" وہ چلائے۔ "پاکستان زندہ باو پاکستان زندہ باو۔" اس کے
 دل میں کوئی نعرے لگتا۔ لیکن جلد ہی اہلی چونکتا۔ "نہیں نہیں" وہ چلاتا۔ اگر رام لال اس قدر تنگ
 خیال واقع ہوئے ہیں کہ کسی کو پانی پلانے سے ان کا دھرم بھرشت ہو جاتا ہے۔ یا وہ اپنے
 درمیان رہنے والے اکے دے مسلمان کو رام دین بنا دیتے ہیں۔ تو اس کا یہ مطلب نہیں کہ
 ہندوؤں کے خلاف ایسے نفض پال کر میں بھی رام لال بن جاؤں۔ نہیں نہیں وہ چلاتا۔ ان باتوں
 پر ہندوؤں کے خلاف تعصب پال لینا اچھا نہیں۔

انہوں نے کھڑکی سے جھانک کر دیکھا۔ بازار میں ایک آنکھ کھڑا تھا زمین پر تانگے والے کی لاش بچ رہی تھی۔۔۔ پاس ہی ایک ہندو بڑھیا چلا رہی تھی۔ اے تمہیں بھگوان کا ڈر نہیں کیا بیچارا مجھے بچا بچا کر لایا تھا۔ کتا تھاں جی میں لے جاتا ہوں چاہے میری جان جائے پر تم پر کوئی انگلی نہ اٹھائے گا۔ ہائے جالمو یہ کیا کیا تم نے۔“ وہ رو رہی تھی بین کر رہی تھی۔

فرحت گھبرا گئی اجمل باہر دورہ پر گیا ہوا تھا۔ گھر میں صرف عورتیں اور بچیاں تھیں۔ اکیلا اہلی انہیں سنبھال نہیں سکتا تھا۔ اہلی کا اپنا دل بیٹھا جا رہا تھا۔ نہ جانے انہیں جانا چاہیے یا نہیں مگر ہے وہ وہیں گھر میں محفوظ ہوں۔ لیکن شام پڑ چکی تھی۔ اور پھر رات کے وقت نہ جانے کیا ہو۔ اسے اسی وقت ایک فیصلہ کرنا تھا۔

عین اس وقت دروازہ بجایا۔

اہلی گھبرا گیا۔ شاید وہ آگئے۔ شاید انہوں نے بلہ بول دیا ہے۔

”کون ہے؟“ اس نے دروازہ کھولے بغیر پوچھا۔

”میں ہوں۔ مانی۔ کھولو جلدی۔“

”مانی —“ اہلی مانی کو دیکھ کر حیران رہ گیا۔

جلوس کو دیکھ کر مجھے فوراً بہن فرحت کا خیال آیا مانی اندر داخل ہو کر چلانے لگا۔

”چلو چلو۔“ وہ چلایا۔ ”آ جاؤ آ جاؤ۔ سب آ جاؤ ڈرو نہیں۔“

”لیکن اہلی بولا۔“ باہر وہ سب کھڑے ہیں۔ اگر —“

مانی سن کر چلایا۔ ”ان کی ایسی جیسی۔ لالے وہ کیا گاڑیں گے ہمارا۔ چلو میسرہ۔“

”لیکن ٹھہرو وہ سونا دے دو مجھے۔ بس ٹھیک ہے چار پانچ کو مارے بغیر تو نہیں مروں گا تم۔ جب تک تم انہیں نکال کر لے جانا۔ آ جاؤ آ جاؤ۔“ وہ خوشی میں چلایا۔ وہ سب چل پڑے۔

چوک میں ہندوؤں کے جمختوں نے ان برقعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھا۔

مانی نے لٹھ لہرائی اور نعرہ لگایا۔

وہ آپس میں کھسک پھرنے لگی۔

مانی لٹھ لہرائے جا رہا تھا۔ ”جاؤ چلتے جاؤ۔“ وہ اہلی کی ہمت بڑھا رہا تھا۔

ایک نوجوان ان کی طرف بڑھا۔

اگرچہ اسلام کے اصولوں کا وہ مداح تھا اور فلسفہ مذہب کے مطابق اسلام کی عظمت کا قائل تھا۔ لیکن یہ احساس محض ذہنی تھا۔ جس کا عکس اس کے جذبات پر نہیں پڑتا تھا۔

ایک روز جب وہ لاہور کی مال روڈ پر گھوم رہا تھا تو دفعتاً ”ایک شور بلند ہوا۔ وہ رک گیا۔ ل روڈ پر ٹہلنے والے سبھی لوگ چونک پڑے۔ ہندو اور سکھوں کا ایک جم غیر مال روڈ کی طرف بڑھ رہا تھا۔ ان کے ہاتھوں میں تنگی تلواریں تھیں جنہیں وہ لہرا رہے تھے۔ عورتیں سر پیٹ رہی تھیں۔ بین کر رہی تھیں۔ وہ سب اسمبلی چیمبر کی طرف بھاگ رہے تھے اور پاکستان مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔

اس جلوس میں ایک شدت تھی اشتعل تھا۔ ایک وحشت تھی جس میں تشدد کی واضح ہشمت تھی لوگ حیرت سے اس دوڑتے ہوئے تشدد بھرے مجمع کو دیکھ رہے تھے۔ پھر دیکھنے والوں کے دلوں میں ایک خوف ابھرا اور وہ اپنے اپنے گھر کی طرف بھاگے۔ اہلی چپ چاپ کھڑا دیکھتا رہا۔

”اجی صاحب میری بیٹی تو ہندوؤں کے محلے میں رہتی ہے۔“ کوئی اس کے قریب کہہ رہا تھا۔

”یہ تو ہمیں میں چنگاری ڈالنے والی بات ہے۔“

”ظاہر ہے کہ سمجھ بوجھ پلان کے مطابق ہو رہا ہے۔“

”نہ جانے کس وقت خون کی ندیاں چل لگیں۔“

”بھئی میں جا کر بیٹی کی خبر لیتا ہوں۔ حالات نازک ہیں۔“

حالات نازک ہیں۔ حالات نازک ہیں۔ اہلی کے سر پر ہتھوڑے سے چل رہے تھے دفعتاً

اسے فرحت کا خیال آیا۔ ارے فرحت بھی تو مادھو پورہ میں رہتی ہے جہاں ہندوؤں کا گڑھ ہے

وہ بے سوچے سمجھے مادھو پورہ کی طرف بھاگا۔

مادھو پورہ کے بڑے بازار میں لوگ یہاں وہاں گروہوں میں کھڑے تھے ان کے تیور اچھے

نہ تھے۔

پیشانیوں سے تشدد بھرے ارادے ظاہر ہو رہے تھے ہر آتے جاتے کو مخدوش اور مشکوک

نگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔ اہلی آنکھ بچا کر چوبارے پر چڑھ گیا۔

”چلو فرحت۔“ ”اوہ بولا“ ”یہاں ٹھہرنا ٹھیک نہیں چلو میرے گھر چلو۔“

ابھی وہ تیار ہی نہ ہوئے تھے کہ نیچے بازار میں شور مچ گیا۔ پکڑ لو۔ پکڑ لو۔ جانے نہ پائے۔

مانی نے ایک چنگاڑ ماری۔ ”مولا علی“ اور لاشی تھمانے لگا۔
وہ گھبرا کر پرے سرک گئے۔

”جلدی چلو جلدی چلو۔“ ایللی عورتوں کو ہانک رہا تھا۔

”آ جاؤ آ جاؤ۔“ ایک بوڑھا تانگے والا چلایا ”آ جاؤ۔“ اس نے برقعہ پوش عورتوں کی طرف دیکھ کر کہا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ وہ بھول چکا تھا کہ وہ مسلمان ہے اور ہندو محلے میں کھڑا چلا رہا ہے۔

پھر وہ سب تانگے میں سوار تھے۔ اور تانگہ بھاگ رہا تھا۔

”اجی صاحب۔“ بڑھا کہہ رہا تھا۔ ”سارے شہر میں چھری چل رہی ہے۔ سڑکوں پر لاشیں پڑی ہیں۔ خون کے فوارے چھوٹ رہے ہیں۔ آگ لگ گئی ہے شہر میں۔ اللہ اپنا فضل کرے انہوں نے سوئے شیروں کو جگایا ہے۔ ہمیں لکارا ہے انہوں نے اچھا نہیں کیا۔ اللہ فضل کرے۔ اللہ فضل کرے۔“

پاکستان زندہ باد

اس جلوس کے بعد شہر میں ایک طوفان آگیا۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں شروع ہو گئیں۔ محلوں میں جانا خطرناک ہو گیا۔ حتیٰ کہ سڑکوں پر چلنا بھی خطرہ سے خالی نہیں تھا۔ ایک روز جب ایللی شام کے وقت گھر آ رہا تھا تو مزنگ کے نوجوان چھو کر دھکے مارنے لگا۔

”اے او۔“ ایک نے لکار کر کہا۔

ایللی نے ان کی لکار کی پردہ نہ کی۔

”پکڑ لو۔ پکڑ لو۔“ وہ چلائے۔ انہوں نے اس کی سائیکل روک لی۔

ایللی کو غصہ آگیا۔ غالباً اس لئے کہ وہ مسلمان تھا اور مسلمان محلے میں پکڑا گیا تھا۔

”اے کون ہے تو؟“ ایک لڑکے نے چلا کر کہا۔

”تجھے اس سے کیا۔“ ایللی نے جواب دیا۔

”میں کہتا ہوں یہ ہندو ہے۔“ ایک بولا۔

”پھر تجھے کیا تکلیف ہے۔“ ایللی چلایا۔

”پکڑ لو پکڑ لو۔“ وہ سب اس کی طرف بڑھے۔

”بڑے مجاہد بنے پھرتے ہو۔“ ایللی چلانے لگا۔ ”اللہ اور محمد کی خدمت کر رہے ہو نا۔“

”اے مسلمان ہے یہ۔“ ایک بولا۔

”نہیں نہیں بچنے کے لیے اللہ کا نام لیتا ہے۔“ دوسرا بولا۔

”کلمہ پڑھ“ ایک چلانے لگا۔

”اللہ کا نام نہ لیتا تو اب تک ڈھیر ہوتا۔ میرا ہاتھ رک گیا۔“ ایک غنڈہ بولا۔

ایللی نے دیکھا کہ اس کے ہاتھ میں کمانی دار چاقو ہے۔

اس روز ایللی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان تھا۔ سیاسی خیالات کا سوال نہ تھا۔ مسلم لیگی اور کانگریس کا سوال نہ تھا۔ یہ سوال نہ تھا کہ آیا وہ اسلام سے واقف ہے۔ آیا وہ شریعت کا پابند ہے یہ سوال نہ تھا کہ آیا رام دین سا مسلمان ہے یا محمد علی سا۔ سوال صرف یہ تھا کہ وہ مسلمان ہے یا ہندو۔ اس روز جب وہ دھو پورہ سے باہر نکلے تھے تو ہندوؤں کے گروؤں کے گروہوں نے بھی یہ نہ سوچا تھا کہ آیا وہ نیشنل نقطہ نظر کے حامل تھے۔ یا مسلم لیگی۔ آیا وہ پاکستان کے حق میں تھے یا پاکستان کے قیام کے خلاف تھے۔ ان کی نگاہ میں وہ صرف مسلمان تھے۔ تانگے والے کے پیٹ میں چھرا گھونپنے وقت بھی ہندو بڑھیا کے چلانے کے باوجود انہیں یہ احساس نہ ہوا تھا کہ تانگے والا ہندو ماتا جی کو مسلمان غنڈوں سے بچا بچا کر دھو پورہ میں لایا تھا۔ اور اس نے ماتا جی کو یقین دلایا تھا کہ وہ ماتا جی کو بچانے کے لئے اپنی جان تک دے دے گا۔ چاہے وہ ماتا جی کو بچا کر لایا تھا۔ چاہے ہندوؤں کی خدمت کی تھی۔ لیکن وہ مسلمان تھا اس لئے انہوں نے اس کے پیٹ میں چھرا جھونک دیا تھا۔

ایللی نے محسوس کیا کہ وہ مسلمان ہی نہیں وہ بذات خود پاکستان ہے۔ چاہے وہ پاکستان کے حق میں تھا۔ یا خلاف چاہے وہ اسلام سے بیگانہ تھا چاہے وہ مذہبی تعصب سے بے نیاز تھا۔ وہ بذات خود پاکستان تھا۔ اس کے دل میں کوئی چلا رہا تھا پاکستان زندہ باد۔

بالادب

ایللی کے تمام تر خیالات درہم برہم ہو رہے تھے۔ اس کا ذہن گویا از سرنو ترتیب پا رہا تھا۔ پرانے خیالات کی اینٹیں اکھڑی جا رہی تھیں۔ نئی اینٹیں نہ جانے کہاں سے آگئی تھیں اور اس

ٹوپی والا کھڑا تھا جس کے ساتھ دراز قد تھا دونوں داتا سے اس کی سفارش کر رہے تھے۔
 اسے سمجھ میں نہیں آ رہا تھا۔ کہ داتا صاحب سے کیا کہے۔ دفعتاً حاجی صاحب آگئے ان کا
 سر روئی کے گالے کی طرح مل رہا تھا۔ ”وقت آئے گا وقت آئے گا۔“
 وہ دبی دبی زبان سے کہہ رہے تھے۔
 ”تمہاری نئی زندگی شروع ہوگی“ شہزاد مسکرا رہی تھی۔ ”نیا بیون۔“
 ”وہی کرنے والا ہے وہی کرنے والا ہے۔“ پاک بابا چلا رہا تھا پھر ایل کی نگاہوں تلے ایک
 کنواں ابھر آیا۔ اس کے قریب ہی سفید چار اوڑھے ایک مسجد چپ چاپ آ بیٹھی۔ پھر ایک چار
 دیواری ابھری تھی اور اس چار دیواری کے اندر ایک قسمہ روشن ہو گیا۔
 داتا مسکرا رہے تھے۔

پریتیمیاں

جب وہ واپس آ رہا تھا تو راستے میں ناظم کو دیکھ کر وہ حیران رہ گیا۔ ناظم اسے دیکھ کر یوں
 کھل گیا ہے۔ جیسے مٹھاس کی وجہ سے خربوزہ پھوٹ جاتا ہے۔ ”میں تمہارے دفتر سے آیا
 ہوں۔“ وہ بولا۔ ”مج سے تمہیں ڈھونڈ رہا ہوں۔“ صبح سے۔
 ”تم یہاں کیسے؟ ایل نے پوچھا۔
 ”میرا تالوہ ہو گیا ہے یہاں۔“ وہ بولا۔ ”بڑے دفتر ہیں۔“
 ”اچھا۔“
 ”اب میرے ساتھ چلو۔“ وہ بولا۔
 ”ارے کہاں؟“
 ”بس آ جاؤ۔ آ جاؤ شاید وہ مل جائے۔“ ناظم بولا۔
 ”کون مل جائے؟“
 ”بھئی وہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔“
 ”کون انتظار کر رہی ہے۔“
 ”تم آؤ تو۔“ وہ بولا۔
 ”پھر بھی۔“ ایل نے اس کی منت کی۔ ”میں تمہارے ساتھ چلوں گا۔ لیکن کچھ بتاؤ تو

من میں آپ ہی آپ لگی جا رہی تھیں۔
 اسی روز شام کو دفتر سے آتے ہوئے وہ ان جانے میں اندر کھلی کی طرف گھوم گیا۔ حالانکہ
 ادھر کوئی کام نہ تھا۔ اور ان دنوں بے کار گھومنے کا سوال پیدا ہی نہ ہوتا تھا چونکہ شہر میں
 زلی کی وارداتیں بڑھتی جا رہی تھیں۔ اور ادھر ادھر گھومنا خطرے سے خالی نہ تھا۔
 کچھ دیر وہ اندر کھلی میں گھومتا رہا پھر سرکلر روڈ کی طرف چل پڑا اور آخر کار اس نے دیکھا کہ
 صاحب کے مزار کے باہر کھڑا ہے۔
 داتا کے مزار پر وہ کئی مرتبہ گیا تھا چند ایک بار وہ مزار کے اندر بھی داخل ہوا تھا لیکن جب
 ر جاتا تو اس کی توجہ ان عورتوں کی طرف منعطف ہو جاتی جو بن سنور کر داتا کے دربار میں
 ہوتی تھیں۔ اور وہاں پہنچ کر اپنی نمائش کرنے کے خیال سے ادھر ادھر گھوما کرتی تھیں ہیرا
 کی طوائفیں ان دنوں داتا کی بڑی متوال تھیں۔ کیوں نہ ہوتیں۔ وہاں جانے سے ان کا
 حباب وسیع تر ہوتا تھا۔

یہ درست ہے کہ ایل عورتوں کو دیکھنے کی غرض سے وہاں کبھی نہ گیا تھا۔ لیکن وہاں پہنچ کر
 نے عورتوں کے سوا پھر وہاں ملے تھے جو طوائف کی طرح اپنی نمائش کرنے میں مصروف
 تھے مزار کی جالی کے گرد کھڑے لوگوں کو ہاتھ اٹھائے دیکھ کر ایل کے ہونٹ نفرت سے بڑھ
 تے ضعیف الاعتقاد لوگ۔!

اس روز داتا صاحب کے مزار کے باہر اس کے خیالات کا رنگ کچھ اور ہی تھا۔
 پاک بابا سامنے محراب کے نیچے کھڑا تھا۔ ”کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلا رہا تھا۔ ”سب
 کیا سب کچھ کیا۔ کیا نہیں کیا۔ اور تمہیں داتا کے قدموں میں لا کھڑا کیا۔ کیا نہیں کیا کس
 تمہاری حفاظت نہیں کی۔ مادھو پورہ سے کس نے نکالا۔ مزنگ میں کس نے بچایا۔ وہی
 نے والا ہے وہی سب کچھ کرتا ہے۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں۔“ وہی کرنے والا

ایل محسوس کر رہا تھا جیسے وہ خود نہیں آیا ہو بلکہ اسے بلایا گیا ہو اور اندر داتا اس کا انتظار کر
 ہوں۔ وہ سر جھکائے جا رہا تھا۔ دل دھک دھک کر رہا تھا۔ اس وقت وہ یہ نہیں محسوس کر
 تا کہ وہ مجرم ہے یا گنہگار ہے۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ خوش نصیب ہے اور اسے شاہ کے
 میں کھڑے ہونے کا موقع ملا اس کا سر جھک گیا۔ آنکھیں بند کر لیں۔ نگاہوں تلے روئی

”ی۔“

”بھئی وہ آندھرے فلم کمپنی کی مالک ہے۔“

”ارے اسے مجھ سے کیا کام؟“

”میں نے کہا تھا اس معاملے میں میں کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ البتہ میرا ایک دوست ہے۔“

”جی۔“

”تو اس نے کہا مجھے اس سے ملا دو۔“

ایلی جیران تھا ناظم کیسی باتیں کر رہا ہے۔

”اب اس سے بات کر لو چل کر۔“ ناظم مسکرایا۔

”لیکن کس سلسلے میں۔“ ایلی نے چڑ کر کہا۔

”بھئی اسے اپنی فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔“ وہ بولا۔

آئیڈیا۔“ ایلی کا ذہن اس وقت بالکل خالی تھا۔

ناظم زبردستی اسے بریگیٹسٹا ہوٹل میں لے گیا۔ جہاں پریتیاں ٹھہری ہوئی تھی۔

وہ نے اندر اپنا کارڈ بھیجا اور انتظار کرنے لگے۔

کچھ دیر کے بعد پریتیاں نے انہیں اندر بلا لیا۔

وہ ایک بنی سنوری ہوئی میٹا عورت تھی۔ جیسے چینی کی گڑیا ہو۔ ان کے روپرو بیٹھے ہوئے

لمبی ادارے کی مالکہ کم دکھائی دیتی تھی۔ عورت زیادہ ایلی کی طرف دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر

ساتھ بسم لہرایا۔ جس میں طنز کی جھلک تھی۔

”آپ الیاس آصفی ہیں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیا آپ کو فلم سے دلچسپی ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”دیکھتا ہوں۔“ وہ بولا۔ ”صرف۔“

”فلم سازی سے واقفیت ہے کیا؟“ وہ بولی۔

”جی نہیں۔“

”فلمی کہانی کبھی ہے کبھی؟“

”جی نہیں۔“

”ناظم صاحب آپ کی بڑی تعریف کرتے ہیں۔“ پریتیاں طنز انداز سے مسکرائی۔

”ان کا حسن ظن ہے۔“

ناظم نے غصے بھری نگاہ ڈالی۔

آئیڈیا

”مجھے ایک آئیڈیا کی تلاش ہے۔“ پریتیاں بولی۔

”جی۔“ وہ بولا۔

”ممکن ہے آپ میری مدد کر سکیں۔“

”اس وقت شاید یہ ممکن نہ ہو۔“ ایلی نے جواب دیا۔

”کیوں۔“ وہ بولی۔

”اس کی ایک وجہ ہے۔“

”اچھا۔“ وہ بولی۔ ”گزشتہ دو روز سے میں چار ایک اصحاب سے ملی ہوں لیکن بات نہیں

”ہی۔“

”کیا وہ لوگ آپ سے ملے تھے۔“ ایلی نے پوچھا۔

”ہاں ہاں وہ مجھ سے ملے تھے۔“

”اور وہ آپ کو آئیڈیا نہیں دے سکے؟“

”بالکل نہیں دے سکے۔“

”وجہ ظاہر ہے۔“ ایلی نے کہا۔

”کیا مطلب۔“ وہ بولی۔ ”میں سمجھتی نہیں۔“

”دیکھئے شرمیتی۔“ ایلی نے کہا۔ ”آپ موجود ہوں تو کوئی دوسرا آئیڈیا نہیں آتا۔“

پریتیاں کے چہرے پر رنگ پھیل گیا۔ ایک چمک لہرائی۔ ”کیا مطلب؟“ وہ بولی۔

”مطلب یہ۔“ ایلی نے کہا کہ ”آپ مرکز بن جاتی ہیں۔“

”عجیب بات کی ہے آپ نے۔“ وہ مسکرائی اور پہلی مرتبہ طنز و تحقیر کے بغیر اس کی طرف

دیکھا۔

”دراصل ”وہ بولی۔“ مجھے اپنے نئے فلم کے لئے ایک آئیڈیا چاہئے۔“

”کس قسم کا آئیڈیا۔“

”میں عورت اور مرد کی زندگی کا کمپیوٹرز بن کرنا چاہتی ہوں۔“

”آپ کا مطلب ہے موازنہ۔“ ناظم نے کہا۔

”ہاں ہاں۔“ وہ بولی۔ ”موازنہ۔“

”تو کیجئے۔“ ایللی نے کہا۔ ”آئیڈیا تو آپ کے پاس موجود ہے۔ آئیڈیا تو آپ ہی کا ہوا۔“

اس نے پھر ایللی کی طرف دیکھا بولی۔ ”لیکن کسی طریق سے اسے پیش کیا جائے؟“

”اس میں تو کوئی مشکل نہیں۔“ ایللی نے کہا۔

”مثلاً۔“ وہ بولی۔

”مثلاً۔“ ایک ساعت کے لئے اس نے توقف کیا۔ ”دنیا میں تبدیلی جنس کے واقعات تو

ہوتے ہی رہتے ہیں۔ ایک لڑکی کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔ پھر لڑکی کی جنس تبدیل کر

دیجئے اور بحیثیت مرد اس کے خیالات اور جذبات پیش کیجئے۔“

”واہ واہ اکیسلنٹ۔“ وہ اچھل پڑی۔ ”واہ آصفی صاحب۔“

ناظم نے فخر سے آہٹ کو ایللی کی طرف دیکھا۔

”ایک صورت اور بھی ہے۔“ ایللی بولا۔

”کسے۔“ وہ پھر سے بیٹھ گئی۔

”ایک ڈاکٹر تبدیلی جنس کا راز پالیتا ہے۔ پھر وہ باری باری عورت اور مرد بن کر جیتا ہے۔“

تفریحاً۔۔۔ اس طرح موازنہ بہتر ہو گا۔“

”بہت خوب۔“ وہ بولی۔

”پھر اسے ایک مشکل میں ڈال دیجئے۔ اور اسے فیصلہ کرنا پڑے کہ آیا اسے بیٹھ کے لئے

عورت بن کر جینا ہے یا مرد۔“

”اکیسلنٹ۔“ وہ مسکرائی۔

اس کے بعد دیر تک وہ بیٹھے چائے پیتے رہے۔

چائے کے دوران میں یبریتیاں نے اپنے بیگ میں سے ایک فارم نکالا۔ اس کے نیچے

دستخط کئے اور ایللی کے ہاتھ میں تھمادیا۔

”یہ آفر ہے۔“ وہ بولی۔ ”جب بھی آپ چاہیں میرے سٹوڈیو میں آجائیں۔ فی الحال میں

آپ کو پانچ سو روپیہ ماہوار دے سکتی ہوں۔“

ناظم خوشی سے جھوم اٹھا۔

”میری رائے مانیں تو یہ آفر منظور کر لیجئے۔“ یبریتیاں نے کہا۔ ”آپ کی آمد کا کرایہ

میرے ذمے رہا۔“ اس نے سو سو کے پانچ نوٹ بٹوں سے نکال کر اس کے سامنے رکھ دیئے۔

”جب بھی آپ کا جی چاہے آجائیے۔“ وہ نہایت دلنوا انداز سے مسکرائی۔

”ہم آپ کا انتظار کریں گے۔“

یبریتیاں کی آفر نے ایللی کی زندگی میں پہل پیدا کر دی۔ اسے یہ خیال بھی نہ تھا کہ فلم

میں کام کرنے کا موقع ملے گا۔ پانچ سو۔ اسے یقین نہیں آتا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ ملاقات

محض ایک خواب تھی۔ ابھی اس کی آنکھ کھلے گی اور وہ دیکھے گا کہ وہ کانڈجو یبریتیاں نے اسے

دیا تھا ایک سادہ ورق ہے۔

ناظم اسے اکسا رہا تھا:

”خمس جانا چاہئے۔ فوراً چلے جانا چاہئے۔ بمبئی کے سٹوڈیو میں کام کرنے کا چانس ہاتھ

سے گمنا عطلندی نہیں۔“

مانی اس کے ساتھ جانے پر تیار تھا۔ وہ یونٹ کی نوکری سے استعفیٰ دے چکا تھا چونکہ اسے

افبراعلیٰ کی بیگم اور بیٹیوں سے وحشت ہونے لگی تھی۔

مانی نے ایک سکیم مرتب کر لی تھی۔ ایک ناشر سے معاملہ طے کر لیا تھا کہ بمبئی جا کر وہ

اعلیٰ بیگم پر ایک فلمی رسالہ جاری کرے گا۔

بلند بخت اس آفر اور اس کے نتائج سے متعلق بے پروا تھی۔ اسے احساس نہ تھا کہ ایسی

آفر کا مطلب کیا ہے؟

ہاجرہ خوش تھی: ”ہاں ہاں چلے جاؤ۔ سنا ہے بمبئی بہت بڑا شہر ہے۔ اگر کام چل نکلا تو بڑی

تنخواہ پاؤ گے۔“

ایللی تیار ہو گیا۔

اس نے بلند بخت کو نامن پور بھیج دیا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑا۔ ان دنوں تقسیم کی

بات زبان زد غلق تھی۔ پنجاب کے مسلمانوں کو خطرہ تھا کہ کس لاہور ہندوستان کا حصہ نہ بن

جائے کیونکہ علی پور ضلع گورداسپور میں واقع تھا اور گورداسپور میں مسلمانوں کی اکثریت تھی اس

لئے علی پور ایک محفوظ مقام تھا۔ ہاجرہ اور عالی کو علی پور چھوڑنے کے بعد وہ واپس لاہور پہنچا اور اپنی اسالی سے استغنے دے کر مالی کو ساتھ لے کر بمبئی روانہ ہو گیا۔

بمبئی

بمبئی کو دیکھ کر ایللی کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ اتنا بڑا اتنا خوبصورت شہر اس نے کبھی نہ دیکھا تھا۔ چند روز وہ بے وقوفوں کی طرح سر اٹھا اٹھا کر ان سربنک عمارتوں کو دیکھتا رہا۔ عمارتوں کی عظمت سمندر کی وسعت اور بھیڑ کے تسلسل کو دیکھ کر اس کی اپنی حیثیت ختم ہو چکی تھی۔ وہ اپنے آپ کو بے حد حقیر سمجھ رہا تھا۔ پریتیاں کو آئیڈیا دینے سے جو اس میں خود اعتمادی اور فخر پیدا ہوئے تھے، بمبئی پہنچ کر صابون کے بلبلیوں کی طرح اڑ گئے۔

دوسرے روز شام کے وقت جب وہ میرن ڈرائیو کے قریب ایک باغیچے میں بیچ پر بیٹھا ہوا تھا تو دفعتاً اس نے محسوس کیا جیسے اس کے روہو حاجی صاحب کھڑے تھے۔ ان کا سر مل رہا تھا۔ آنکھیں روشن تھیں اور ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

”یہی بیچ تھا وہ۔“ وہ بولے۔

”بیچ۔“ ایللی نے دہرایا۔

”اسی بیچ پر بیٹھے تھے ہم۔“ وہ مسکرائے۔

ایللی کو یاد آ گیا — ”ہاں جب سرمہ لگا کر وہ گھر سے نکلے تھے تو —“ ان نون وہ بمبئی ہی میں مقیم تھے۔

یہ کہہ کر حاجی صاحب اس کے قریب آ بیٹھے۔ انہوں نے مسکرا کر ایک راہ گیر حسینہ کی طرف دیکھا۔ وہ حسینہ ان کے قریب آ بیٹھی۔ وہ دیوانہ وار حاجی صاحب کی طرف دیکھ رہی تھی۔ پھر ایک اور طرحدار عورت وہاں آ بیٹھی۔ پھر ایک میم آگئی۔ وہ تینوں حاجی صاحب کی طرف یوں دیکھ رہی تھیں۔ جیسے اپنا آپ ان کی بھیجت چڑھا رہی ہوں۔

پھر وہ اٹھ بیٹھے اور ایللی کے روہو آکھڑے ہوئے:

”بیکار ہے۔“ وہ بولے۔ ”بے کار۔ سب بے کار ہے۔“

انہوں نے نفرت سے عورتوں کی طرف دیکھا اور چل پڑے۔ ایللی چونکا۔ اس نے گردو پیش پر نگاہ دوڑائی۔

”بے کار ہے۔ کھلونے۔“ حاجی صاحب نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔

ایللی نے پھر ان خوبصورت عمارتوں کی طرف دیکھا۔ اس کی نگاہ تلے گتے کے رنگدار ڈبے اور سجا کر رکھے ہوئے تھے۔ سڑک پر چلتی ہوئی خوبصورت عورتیں گویا کپڑے کا دکھانوں کی دھڑوں سے بھاگی ہوئی پتلیاں تھیں۔

اس نے سمندر کی طرف نگاہ دوڑائی۔

سمندر نے بڑھ کر اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

سامنے مغرب میں افق پر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔

اس روز جب وہ رات کو اپنی جائے قیام پر پہنچا تو وہ سوچ رہا تھا۔ حاجی صاحب کے خیال آ کر اس کے نقطہ نظر میں تبدیلی پیدا کر دی تھی۔ عجیب بات تھی۔ اس عظیم الشان شہر کو اور خوبصورت عورتوں کو بدل دیا تھا۔ یہ کیا جادو ہے۔ وہ سوچ رہا تھا کہ کیا نقطہ نظر انسان کے ذہن کی بات نہیں۔ یا ایک عام سا آدمی اتنی طاقت رکھتا ہے کہ وہ کسی کے زاویہ نظر کو بدل رکھ دے۔ زندگی بھر تکہ تنکے چن کر جو آشیاں بنایا تھا اسے ایک نگاہ سے تاراج کر دے۔ یہ طاقت تھی۔ ایللی سوچ رہا تھا۔

حاجی صاحب نے اپنا کاروبار جس کی شانیں کلکتہ، بمبئی اور دہلی میں تھیں یک قلم چھوڑ دیا۔ آخر کیوں۔ کیا یہ ان کا اپنا فیصلہ تھا یا ایسے ہی کسی مرد خدا نے ان کا زاویہ نظر بدل دیا تھا۔ ایللی کو اس سوال کا کوئی جواب نہ سوجھتا تھا۔ شاید ان عالموں کے پاس اس کا جواب تھا ہی۔ ماحجن کے علم و فکر پر اس نے اپنے ذہنی نظریوں کی بنیاد استوار کی تھی۔ برٹریڈ رسل کھڑا رہا تھا۔

دفعتاً وہ مسکرایا:

”چچہ روتا ہو۔“ وہ بولا۔ ”تو اس کی توجہ کسی اور طرف کر دو۔ وہ خاموش ہو جائے گا۔“

دوستو وہی مسکرا رہا تھا۔ ہم سبھی بچے ہیں۔“

دوستو وہی کہہ رہا تھا اگر انسان میں بچے کا عنصر نہ ہو تو وہ عفریت بن کر رہ جائے۔“

ایللی سوچ رہا تھا کہ کیا وہ سبھی بچے تھے۔ کیا نقطہ نظر اور زاویہ نگاہ قدرت کی دین تھی۔ کیا یہ نگاہ میں معمولی تبدیلی اتنا عظیم فرق پیدا کر سکتی تھی۔ اس کے روہو پاگ بابا کھڑا چلا رہا تھا: ماکن ہوں۔ کوئی بھی نہیں۔ کوئی بھی نہیں۔“

ادائیں ہوتی تھیں لیکن کبھی کبھی سول لائسنز کے علاقے میں بھی کوئی واردات ہو جاتی اور کچھ رے کے لئے وہ علاقہ ویران دکھائی دیتا۔ پھر جلد ہی لوگ اسے بھول جاتے اور پھر سے آمد و رفت رونق ہو جاتی۔

ایلی خوف کے مارے کبھی ہندو علاقوں میں نہیں گیا تھا۔ سول لائسنز میں گھومتے ہوئے بھی باہر خوف مسلط رہتا۔ لیکن مانی بے نیاز تھا۔ اس نے چلتے ہوئے کبھی اپنے ارد گرد نہ دیکھا۔ وہ اپنی ہی دھن میں چلے جاتا۔ چلتے ہوئے کوئی گیت گنگاتا رہتا۔ ایلی کو اس کی بے پروائی پر آجاتا اور وہ ہر وقت مانی سے بحث کرتا۔ اسے گھورتا۔

ابھی انہیں بمبئی پہنچے دو ماہ ہی گزرے تھے کہ پیریتماں کے نگار خانے کے دروازے پر ایک وارداتیں ہو گئیں۔ غنڈروں نے دھمکیاں دینا شروع کر دیں۔ کہ وہ نگار خانے کو آگ دیں گے چونکہ پیریتماں کا خاندان مسلمان تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ نگار خانہ بند کر دیا گیا۔

اس کے بعد مانی اور ایلی کی تمام تر توجہ فلمی پرچے کی طرف مبذول ہو گئی۔ جو وہ شائع کرنے کا منصوبہ لے کر آئے تھے۔ مانی انٹرویوز میں مصروف تھا چونکہ وہ بے دھڑک ہر علاقے جاسکتا تھا اور لوگوں سے مل سکتا تھا۔ اس سلسلے میں ایلی کا خوف سدراہ تھا۔

ماچھ مینے گزر گئے۔

یو پاکستان

اگست سنٹالیس میں مانی کے پبلشر نے انہیں بلا بھیجا تاکہ وہ چند امور کا تقصیبہ کرے۔ اس بلاؤے پر ایلی مسرور تھا چونکہ اس کا جی چاہتا تھا کہ عالی سے ملے۔ اسے خیال تھا کہ اس کی غیر حاضری پر متعجب ہو گا۔ سوچتا تھا کہ پہلے ابو چلا گیا۔ پھر ای چلی گئی اور ابو آئے اور اب دونوں نہ جانے کیوں اسے چھوڑ کر چلے گئے ہیں۔ مانی انٹرویوز کے چکر میں ایسا تھا کہ اس کا جی نہیں چاہتا تھا کہ وہ لاہور جائے۔ اسے فلمی زندگی سے بے حد دلچسپی تھی۔

تاروں، تانہوں اور فلساؤں سے مل جل کر اس نے اپنی ایک حیثیت پیدا کر لی تھی۔ اس نے ایلی کے ساتھ لاہور جانے پر رضامند نہ تھا۔ وہ چاہتا تھا کہ ایلی لاہور جا کر بات چیت طے

ایلی کے دل میں عجیب و غریب خیالات تھے۔ کسی وقت تو اس کی وحشت اس حد تک بڑھ جاتی کہ وہ خود کو کانٹا کا بیٹا مارفیس سمجھنے لگتا۔ پھر وہ سوچ میں پڑ جاتا۔ کیا میں پاگل ہو رہا ہوں۔ اس خیال پر وہ بالکل گھبرا جاتا۔

بمبئی میں ایلی کے دھندلکے میں صرف مانی دھوپ کی ایک شعلہ تھی۔ مانی میں زندگی تھی۔ چمک تھی۔ جوش تھا۔ شوق تھا۔ اس کے نقطہ نظر میں صحت تھی۔ بے پروائی تھی۔

وہ بمبئی کو شوق سے دیکھ رہا تھا۔ اس کی نگاہ میں خوبصورت عمارتیں گتے کے ڈبے نہ تھے۔ حسین عورتیں درزیوں کے ماڈل نہ تھے۔ اس کی نگاہ میں عورتیں عورتیں تھیں اور اس قدر حسین بھی نہ تھیں کہ انہیں دیکھ کر وہ اپنی حیثیت کھو دیتا۔ حسین عورتیں — خوب تھیں۔ اچھی خاصی تھیں — اس قابل تھیں کہ ان سے دل ہلایا جائے۔

مانی جوان تھا۔ اس کی طبیعت میں بلا کی رنگینی تھی۔ وہ اپنی حیثیت کو کمتر نہیں سمجھتا تھا اور عملی طور پر کچھ کرنے کے لئے بے تاب تھا۔ اس میں جھجک نہ تھا۔ ایلی کبھی جوانی سے واقف نہ ہوا تھا۔ احساس کمتری کا مارا ہوا۔ زندگی کی راہ پر تھکا ہارا ہوا۔ مرکزیت تئیں کی وجہ سے اس کی طبیعت ڈر اور گھبراہٹوں سے لٹی پڑی تھی۔ اس کے جذبات اور ذہن میں قطعی طور پر ہم آہنگی نہ تھی۔

مانی اور ایلی کو بمبئی میں رہنے کے لئے ایک ایسی جگہ ملی جہاں شاعر اور مصنف رہتے تھے۔ ایلی کی زندگی میں یہ پہلا موقع تھا کہ اسے ادیبوں کے ساتھ رہنا پڑا تھا۔ وہ عجیب لوگ تھے۔ بات کرنے سے پہلے سوچتے نہ تھے۔ بات کرنے کے بعد بھی انہوں نے کبھی نہ سوچا تھا۔ کہ اس بات کا کیا اثر ہوا ہے۔ وہ اثر یا رد عمل سے بے نیاز تھے۔ انہیں یہ خیال نہ تھا کہ دوسرا کیا کہے گا۔ کہ سوچے گا۔ آیا اسے بات بری لگے گی۔ وہ دوسروں کے احساسات سے بے گانہ تھے۔ دل کی بات کو چھپانے کے قائل نہ تھے۔ وہ خود شعوری سے بے گانہ تھے۔ ایلی نے محسوس کیا کہ وہ زندگی سے ہم آہنگ ہیں۔ ان میں ہماؤ ہے۔ رکاوٹ نہیں۔ لیکن اس کے باوجود وہ محسوس کرتا تھا کہ وہ خود پسند ہیں۔ اپنی اہمیت کے چراغ جلانے کے شوقین ہیں اور دنیا کو اپنے مقابلے میں سمجھتے ہیں۔

ان دنوں بمبئی میں بھی ہندو مسلم فسادات جو بن رہے تھے۔ چھرا گھونپنے کی وارداتیں عام تھیں۔ اس کے علاوہ آتشزدگی کی وارداتیں بھی ہوتی تھیں۔ مسلمان اور ہندو علاقوں میں اندھ

کر لے۔ جب تک وہ خود بمبئی میں کام جاری رکھے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ایلی لاہور آگیا۔

ابھی ایلی نے لاہور میں قدم رکھا ہی تھا کہ لاہور اور امرتسر کے درمیان آمد و رفت کا سلسلہ منقطع ہو گیا۔ گاڑیوں کی آمد و رفت ختم ہو گئی۔ بسوں کا چلنا موقوف ہو گیا۔

ایلی نے اس خبر کو سن کر خصوصی پریشانی محسوس نہ کی۔ ہاجرہ عالی فرحت اور علی احمد کے کتبے کے تمام افراد علی پور میں محفوظ تھے اور علی پور محفوظ ترین مقام تھا البتہ لاہور کے متعلق مسلمان پریشان تھے اور ریڈ کلف ایوارڈ کا بے تابی سے انتظار کر رہے تھے۔

لاہور شہر میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ سڑکیں خالی پڑی ہوئی تھیں۔ لوگ اپنے اپنے گھروں میں چپے بیٹھے تھے۔ رات کے وقت گولیاں چلنے کی آوازیں سنائی دیتیں اور پھر موت کی سی خاموشی چھا جاتی۔ پھر کسی مجمع کا شور و غل بلند ہوتا۔ لوگ چنگھاڑ چلاتے چیختے اور پھر خاموشی چھا جاتی۔ صبح سڑکوں پر یہاں وہاں دکھائی دیتیں۔ انہیں دیکھ کر اپنے قدم راہ گیر اور تیز کر دیتے تھے۔ سپاہی واردات کو اپنی آنکھوں سے دیکھ کر منہ موڑ لیتے جیسے انہیں علم ہی نہ ہو کہ کیا ہو رہا ہے۔

مسلمانوں کی بے تابی بڑھ رہی تھی۔ بڑھتی جا رہی تھی کہ ۱۳۔ اگست کا دن قریب آ رہا تھا۔ اس روز پاکستان کا قیام عمل میں آنے والا تھا اور ایوارڈ کا اعلان ہونے والا تھا۔ اس شام شہر پر مکمل خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ بازار سنسان پڑے تھے۔ سڑکیں ویران تھیں۔ لوگ گھروں میں سسے ہوئے بیٹھے تھے۔ بازاروں میں مسلح فوج ہاتھوں میں مشین گنیں لئے گھوم رہی تھی۔ سڑکوں پر فوجی ٹرک کھڑے تھے۔

ایلی ریڈیو کھول کر بیٹھا تھا۔

گھڑی نے بارہ بجادیکھی۔ ایلی کا دل دھک سے رہ گیا۔ بارہ بجے اعلان ہونے والا تھا۔ آج وہ محسوس کر رہا تھا۔ جیسے وہ اعلان اس کی زندگی کا اہم ترین واقعہ ہو۔ جیسے آج اس کو قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہو۔ وہ یہ بھول چکا تھا کہ وہ مذہبی تعصب سے بلند و بالا ہے۔ وہ بھول چکا تھا کہ قیام پاکستان سے بے گانہ ہے۔ وہ ہندوستان اور عوام کی بہتری کے فلسفے کو فراموش کر چکا تھا۔ وہ محسوس کر رہا تھا کہ وہ بذات خود پاکستان ہے اور اس روز حدود ملے ہوئے والی تھیں۔ وہ محسوس کر رہا تھا جیسے وہ ایک بادشاہ ہو اور پاکستان کے قیام کا اعلان دراصل اس کو

رسم تاجپوشی کا اعلان تھا۔ اس روز اسے معلوم ہوا تھا کہ اس کی قلمرو کہاں سے کہاں تک ہو گی۔ لیکن وہ خوش نہ تھا۔ ایک ان جانی اداسی اور پریشانی اس پر مسلط تھی جیسے اسے یقین نہ ہو کہ اس کی قلمرو اسے مل جائے گی۔ وہ مضطرب تھا۔ بے حد مضطرب۔

دفعۃً حاجی صاحب اس کے رو برو آکھڑے ہوئے۔ ان کی گردن مل رہی تھی۔

”وقت آئے گا۔“ وہ مسکرائے۔ ”انشاء اللہ۔“ وہ بولے۔

پاک بابا چلانے لگا: ”وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ اسی کا کام ہے۔ وہی جائے۔ میں کون ہوں۔ میں تو کچھ بھی نہیں۔“

پھر ایک رومی ٹوپی ابھر رہی تھی۔ ابھر رہی تھی۔ ان کے پیچھے کنواں گڑگڑا رہا تھا۔ سفید چادر میں لپٹی ہوئی مسجد سجدے میں پڑی تھی۔

رومی ٹوپی والے نے مڑ کر دیکھا۔ اس کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل رہی تھی۔ اس پر پھیلتی ہوئی مسکراہٹ کو دیکھ کر دروازہ نے آنکھیں بند کر لیں۔

”الحمد للہ۔ الحمد للہ۔“ مدھم سی سرگوشی ابھری۔

ریڈیو نے سرسکوت توڑ دی۔

طلبل بجنے لگا۔

جیسے دور بہت دور ایک دل دھڑک رہا ہو۔

وہ مدھم دھڑکن قریب آ رہی تھی۔ اور قریب۔ اور قریب۔

”ہم ریڈیو پاکستان سے بول رہے ہیں۔“

اعلان ایلی کے بند بند میں گونجا۔

پھر دھڑکن بن کر اس کے دل کی گھڑائیوں میں اتر گیا۔ اس کا سر بھن سے اڑ گیا۔ جیسے کسی نے بارود کو آگ دکھادی ہو۔

پھر اس کے بدن پر چوٹنے رینگ رہے تھے۔ چوٹنے ہی چوٹنے۔

پھر کسی نے اس کے سر پر تاج رکھ دیا۔

”پاکستان زندہ باد۔“ کوئی چلایا۔

انکے رو برو دنیا بھر کے مسلمان قطاروں میں کھڑے تھے اور ہر مسلمان کے سر پر تاج تھا۔

ریلوے سٹیشن ویران پڑا تھا۔ چند ایک لوگ پلیٹ فارم پر بیٹھے ادکھ رہے تھے۔ دیر تک وہاں گھومتا رہا۔ گھومتا رہا۔

پھر دفعتاً اسے خیال آیا۔ ”باو جی باو جی۔“ وہ وردی والے باو کو دیکھ کر بولا۔ ”باو جی باو جی۔“ امر تر کو گاڑی جائے گی کیا؟

باو رک گیا اور چونکے ہوئے انداز سے بولا: گاڑی؟

”جی۔“ ایلی نے کہا۔ ”امر تر گاڑی جائے گی کیا؟“

”اوہ۔“ باو چونک کر بولا۔ ”مطلب ہے گاڑی۔“

”جی ہاں۔“ ایلی بولا۔ ”امر تر کو۔“

اس نے نفی میں سر ہلایا۔ ”گاڑی نہیں جائے گی۔“

”نہیں جائے گی؟“

باو نے سر ہلادیا۔ اس کی آنکھیں پر غم تھیں۔

دو روز وہ ریلوے سٹیشن اور بسوں کے اڈوں پر گھومتا رہا۔ بسوں والے اس کے سوال کا جواب نہیں دیتے تھے۔ کوئی بھی اس کے سوال کا جواب نہیں دیتا تھا۔

”میں تمہیں کر گیا دوں گا۔ جو مانگو گے دوں گا۔“ وہ چلاتا۔

وہ اس کی طرف ٹکٹنی باندھ کر دیکھتے اور سر ہلادیتے۔

بسوں کے اڈے سے وہ پھر سٹیشن پر جا پہنچا۔

حتیٰ کہ ایک روز گاڑی آگئی۔

”یہ گاڑی امر تر جائے گی۔“ وہ چلایا۔

”باو نے غور سے اس کی طرف دیکھا۔“ یہ امر تر سے آئی ہے۔“

”کیا یہ واپس جائے گی؟“ وہ چلایا۔

باو نے خاموشی سے اس کی طرف دیکھا۔ ”جا کر دیکھ لو۔“

ایلی گاڑی کی طرف بھاگا۔ شاید گاڑا اسے بتا سکے۔

وہ ڈبے کی طرف لپکا۔

ڈبے میں چاروں طرف خون کے چھینٹے لگے ہوئے تھے۔ سرخ گٹھریاں ادھر ادھر پڑی

تھیں۔

مالی عالی

اگلے روز جب اسے معلوم ہوا کہ ضلع گورداسپور ہندوستان میں شامل ہو گیا ہے۔ تو اس کا دل دھک سے رہ گیا۔

اسے یقین نہ آتا تھا: ”یہ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟“ وہ آپ ہی آپ چلا رہا تھا۔ ”نہیں۔“ یہ نہیں ہو سکتا۔ کیسے ہو سکتا ہے یہ؟

پھر وہ باہر نکل گیا۔ نیچے بازار میں دکانوں پر کھڑے لوگ گورداسپور، گورداسپور چلا رہے تھے۔

کنز پر حلوائی دودھ کے کڑا ہے میں چچہ ہلاتے ہوئے آپ ہی آپ گنگنا رہا تھا: ”پر بھائی جی گورداسپور کا کیا ہو گا؟“

پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگے جا رہا تھا۔

”بھوں بھوں۔“ کار بیچ رہی تھی۔ وہ رک گیا۔

”کیوں جی۔“ ڈرائیور نے سر نکالا۔ ”گورداسپور کا کیا بنا۔“

”کیا بنا۔“ ایلی نے دہرایا۔

”وہاں میرے بچے ہیں۔“ ڈرائیور نے ایک عجیب سی نگاہ سے اس کی طرف دیکھا۔

کار چل پڑی۔ اس کے پیچھے عالی بیٹھا تھا۔ ”ابو۔“ ”ابو۔“ وہ ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ”ابو۔“

”ابو۔“ پھر بہت سے لوگ اس کے گرد آکھڑے ہوئے۔

”کون ہے تو باو۔“ وہ چلائے۔ وہ غنڈے تھے۔

ایلی نے چونک کر ان کی طرف دیکھا۔

”کہاں جا رہا ہے تو؟“ وہ اسے گھورنے لگے۔

”علی پور۔“ وہ بولا۔ ”وہاں میرا بچہ ہے۔ میری ماں ہے۔ میرے بھائی ہیں۔“

وہ پیچھے ہٹ گئے۔

”پیدل جائے گا۔“ ایک لڑکا چلایا۔

”اے ہٹ جا۔“ کس نے ترائخ سے لڑکے کے منہ پر تھپڑ مارا۔ ”جانے دے۔“ غنڈہ

ایلی کی چیخ نکل گئی۔

”یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔ یہ گاڑی امرتسر سے آئی ہے۔“ چاروں طرف شور مچ گیا۔ پھر وہ بھاگ رہا تھا۔ بھاگا جا رہا تھا۔

پھر اسے معلوم ہوا کہ علی پور ٹرک لے جانے کے لئے اسے دفتر سے پر مٹ حاصل کرنا ہے۔

جب وہ پر مٹ دفتر پہنچا تو وہیں بہت بھیڑ تھی۔ لوگ دیوانہ وار دفتر کے گرد گھوم رہے تھے۔

سارا دن وہ وہیں گھومتا رہا لیکن کسی نے اس کی بات نہ سنی۔ جب دفتر بند ہو گیا تو وہ ایک دکان کے سامنے چلانے لگا:

”پر مٹ لینا ہے؟“ بابو نے پوچھا۔

”جی۔“

”کہاں کا؟“

”جی علی پور کا۔“

”ہوں۔ ٹرک ہے تمہارے پاس۔“

”جی نہیں۔“ وہ بولا۔

بابو قہقہہ مار کر ہنسا۔ ”تو پر مٹ کس کالو گے؟“

”لیکن۔۔۔۔۔۔“ ایلی بولا۔

”بھائی صاحب۔“ بابو کہنے لگا۔ ”پہلے ایک ٹرک حاصل کرو جو ادھر جانے کے لئے تیار ہو۔

میں یہاں آکر پر مٹ لو۔ اور علی پور لے جاؤ۔ ایسے غم نہ کھاؤ۔ علی پور ابھی تک محفوظ ہے۔“

پھر کئی ایک دن وہ ٹرکوں کے پیچھے گھومتا رہا۔ ادھر جانے کے لئے کوئی ٹرک رضامند نہ ہوتا

”بھائی صاحب۔ امرتسر کی طرف جانے میں جان کا خطرہ ہے۔ سارے ٹرک کو آگ لگا دیتے

ہیں وہاں امرتسر میں تو خون کی ندیاں بہہ رہی ہیں۔“

آخر اسے ایک ٹرک مل گیا۔

”دیکھو بابو۔“ ٹرک والا بولا۔ ”جتنے دن کھڑا ہے سو روپیہ فی روز ہو گا اور جس روز پر مٹ

مل گیا دو سو جانے کا اور دو سو آنے کا یعنی چار سو لگے گا۔“

ایلی نے محسوس کیا کہ پر مٹ حاصل کرنے سے پہلے اسے روپیہ کا انتظام کرنا ہے۔ لاہور

میں اس کے گرد وحشت ناک مناظر تھے۔ مکانات جل رہے تھے۔ سڑکوں پر خون کے چھینٹے

پڑے ہوئے تھے۔ لوگ گٹھڑیاں اٹھائے ہوئے آرہے تھے۔ عورتیں چیخ رہی تھیں۔ امرتسر سے

آئے ہوئے لوگ اشتعال بھرے نعرے لگا رہے تھے لیکن وہ ان مناظر سے بیگانہ تھا۔ اس کی

آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔ ہاجرہ کے چہرے کی جھریوں پر آنسوؤں کے

قطرے بہہ رہے تھے۔

صبح سویرے وہ پر مٹ کے دفتر میں جا پہنچا۔ سارا دن وہیں دھکے کھاتا اور پھر جب دفتر بند ہو

جاتا تو ٹرک والے کے لئے سو روپیہ اکٹھا کرنے کی دوڑ دھوپ میں لگ جاتا۔

چھ دن گزر گئے۔ وہ ٹرک والے کو چھ سو روپیہ ادا کر چکا تھا۔ اب اس پر مایوسی اور ناامیدی

چھا چکی تھی۔ پر مٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔

اس کے دل میں کوئی رو کر تھکا ہوا پیرہ بلک رہا تھا۔

ہولڈ آپ

پھر کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا۔

اس نے سر اٹھا کر دیکھا۔ سامنے شیر علی کھڑا تھا۔

”آپ یہاں۔“ وہ بولا۔

اس نے شیر علی کو پہچان لیا۔ ”تم یہاں؟“ اس نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔

”میں یہاں ملازم ہوں۔“ وہ بولا۔

”اور وہ سب۔ وہ۔۔۔۔۔۔“ ایلی نے پوچھا۔

”وہ سب علی پور ہیں۔“ شیر علی بولا۔

”پر مٹ نہیں ملا۔“ ایلی نے مایوسی بھرے انداز سے کہا۔

”مجھے ایک ٹرک مل گیا ہے۔“ شیر علی بولا۔ ”آج ہی محکمہ والوں نے دیا ہے۔“

”مل گیا ہے۔“ ایلی چلایا۔ اسے اپنے کانوں پر یقین نہیں آ رہا تھا۔

”ہاں مل گیا ہے۔ صرف ایک بندوق والا سپاہی اور ایک ڈرائیور۔“

”اوہ.....“ ایلی اٹھ بیٹھا۔

اسی روز وہ فوجی ٹرک میں بیٹھے علی پور جا رہے تھے۔

ٹرک کے پردے بند تھے۔ ڈرائیور گاڑی چلاتے ہوئے زیر لب قرآن کی آیات پڑھ رہا تھا۔ سپاہی نے بندوق کی ٹالی پردے سے باہر نکال رکھی تھی۔ اور وہ سڑک کا جائزہ لے رہا تھا۔ شیر علی چپ چاپ ڈرائیور کے پاس بیٹھا تھا۔ ایلی ٹرک کے اندر پچھلی سیٹ پر گھس رہا تھا۔ اس کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”اللہ اپنا فضل کرے۔“ ڈرائیور چلایا۔ ”بسم اللہ۔“ اس نے ایک سیلینڈر کھولتے ہوئے کہا۔ ”ہم امرتسر میں داخل ہو رہے ہیں۔ ذرا دھیان سے کوئی باہر نہ جھانکے پردے کے پیچھے نہ گولی سے بچاؤ نہ ہو گا۔“

”روکنا نہیں۔“ سپاہی بولا۔ ”چاہے کچھ بھی ہو۔“

”روکنا۔“ ڈرائیور بولا۔ ”ہم چالیس کی سپیڈ پر چلیں گے۔ چاہے کوئی بھی سامنے ہو۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ٹرک جھول رہا تھا۔ ربڑ کے گیند کی طرح اچھل رہا تھا۔

دور بہت سے لوگ چلا رہے تھے۔ نعرے مار رہے تھے۔ لمبی سنسنی خیز چیخیں سنائی دے تھیں۔

وہ چپ چاپ بیٹھے تھے۔ دقت ریک رہا تھا۔

دھننا ”سپاہی چلایا۔“ وہ دیکھو۔ ریل کی پنڑی کے دونوں طرف سکھوں کے جتے ہیں۔“

”وہ دیکھو۔“ وہ پھر چلایا۔ ”وہ درختوں اور جھاڑیوں کے پیچھے چھپے ہوئے ہیں۔“

”اندھے ہو گئے ہیں اندھے۔“ ڈرائیور بولا۔ ”یہ سکھ۔“

”سر پر خون سوار ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

”لیکن ریل کی پنڑی پر کیوں۔ سڑک پر کیوں نہیں۔“ شیر علی نے پوچھا۔

”ضرور کوئی بات ہے۔“ سپاہی نے کہا۔

پھر سپاہی اور ڈرائیور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔ شیر علی اور ایلی خاموش بیٹھے تھے۔

”لو چار میل رہ گیا علی پور۔“ ڈرائیور بولا۔

”چار میل۔“ سپاہی بولا۔ ”ڈرا روکو۔“ وہ چلایا ”روکو۔“

”پاگل ہو گئے ہو۔“ ڈرائیور بولا۔

سپاہی نے بندوق کی ٹالی ڈرائیور کی طرف پھیر دی۔ ”میں کتنا ہوں۔ روکو۔ سنا تم نے۔“ اس کی آنکھیں سرخ ہو رہی تھیں۔ آواز تھرا رہی تھی۔ ”روکو۔“ گاڑی رک گئی۔ سپاہی نے بندوق اٹھائی اور باہر چھلانگ لگاتے ہوئے بولا۔ ”میرا انتظار کرو۔ میں ابھی آیا۔ جانا نہیں۔“ اور وہ بھاگتا ہوا درختوں میں غائب ہو گیا۔

ڈرائیور نے بے بسی سے ایلی اور شیر علی کی طرف دیکھا۔ دونوں خاموش بیٹھے تھے۔ ایلی کے ذہن میں وہی خلا کھول رہا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی نگاہوں سے دیکھ رہا تھا۔ عالی کی چیخیں مدھم پڑ چکی تھیں۔ اس کی شکل دھندلا گئی تھی۔ ہر چیز پر دھندلا کچھائے جا رہا تھا۔

”یہ تو سمجھو ہولڈ آپ ہو گیا۔“ ڈرائیور بولا۔

انہیں سمجھ نہیں آ رہا تھا کہ سپاہی انہیں چھوڑ کر کیوں چلا گیا تھا۔ کہاں چلا گیا تھا۔ کہیں وہ سکھوں کے ساتھ تو نہیں مل گیا تھا۔ ان کو یوں بے یار و مددگار چھوڑ کر چلے جانا۔ ایسی جگہ جہاں چاروں طرف دشمن تھے۔

”چلو لے چلو۔“ شیر علی نے ڈرائیور سے کہا۔ ”اب تو علی پور قریب ہے۔“

”اونہوں۔“ ڈرائیور بولا۔ ”اس کو یہیں چھوڑ جائیں۔ وہ مسلمان ہے بھی۔ کیسے

چھوڑ جائیں۔“

سامنے ایک ویران گاؤں تھا۔ گاؤں کے دو ایک مکان جلے ہوئے تھے۔ ان میں سے دھواں

اٹھ رہا تھا۔

اس کے ارد گرد کچھ سائے سے حرکت کر رہے تھے۔ دھننا ”ڈرائیور اٹھا۔ اس نے لوہے کی

دو بڑی بڑی سلاخیں اٹھائیں۔

”یہ لو۔“ وہ بولا۔ ایک سلاخ ایلی کے ہاتھ میں تھادی۔ ”یہ لویہ۔“ اس نے ایک کوٹنے

کی طرف اشارہ کیا۔ ”اسے پردے سے باہر نکال رکھو۔“

پھر اس نے دوسری سلاخ شیر علی کے ہاتھ میں تھادی۔ ”وہ سمجھیں گے کہ بندوقوں کی

ٹالیاں باہر نکلی ہوئی ہیں۔ مطلب یہ ہے کہ انہیں پینے چلے کہ ہم نیتے ہیں۔“

”جو اللہ کو منظور ہو گا وہی ہو گا۔“ اس نے ٹرک کی جالی مضبوطی سے ہاتھ میں پکڑ لی۔

”انشاء اللہ دو چار کو مار کر مرس گے۔“

دیر تک وہ بیٹھے رہے۔ صدیاں بیت گئیں۔

”وہ آ رہے ہیں۔ خردار۔“ ڈرائیور کی آواز سنائی دی۔ ”خاموش۔“

سامنے چار سیکھ ہاتھوں میں لٹھ اٹھائے ان کی طرف بڑھ رہے تھے۔ ٹرک کے قریب آکر وہ گئے۔

”قریب آئیں تو گولی مار دو۔“ ڈرائیور چلایا۔ گولی مار دو سارجنٹ۔ ”وہ چلایا۔“ ایلی نے کہا کہ سلاح کو اور باہر نکال دیا۔

”سارجنٹ۔“ ڈرائیور چیخنے لگا۔ سنتے ہو سارجنٹ۔“

یہ سن کر سیکھ بھاگ گئے۔

ڈرائیور ہنسنے لگا۔ ”بزدل بھڑوے۔“ وہ بولا۔ ”ڈر گئے۔“

ایلی کی پیشانی پسینہ میں شرابور تھی۔

دو گنا دور سے سپاہی کی آواز سنائی دی۔ ”آگیا گریاں آگیا۔ اللہ اکبر۔“ اس نے نعرہ دیا۔ ”بندوق اٹھائے بھاگا آ رہا تھا۔“ اللہ ہو اکبر۔“ اس کا نعرہ دور تک گونج رہا تھا۔ ”چلو چلو۔“

ٹ کر۔ ”وہ قریب آکر بولا۔“ وہ میرا پیچھا کر رہے ہیں۔“

ٹرک چل پڑا۔

”کیا بات تھی؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”کیا تھار پورٹ کرنے۔“

”کہاں گیا تھا۔“

”باندھری فورس کا ہیڈ کوارٹر ہے یہاں۔ وہاں گیا تھا۔“

”کہاں ہے ہیڈ کوارٹر۔“

”یہاں سے تین میل دور۔“ سپاہی نے کہا۔ ”وہ سامنے اس جھنڈ سے پرے۔“

”کیوں گئے تھے۔“

”میں نے سوچا۔ یہ سیکھ جو ریل کی لائن پر کھڑے ہیں۔ ضرور رفوجیوں کی گاڑی آنے والی

تو میں نے سوچا مسلمانوں کی ساری گاڑی کٹ جائے گی۔“

”تو پھر۔“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”پھر مجھے پتہ تھا کہ یہاں باندھری فورس فرنیئر فورس کی ہے۔ سب مسلمان ہیں اس لئے میں

نے کہا۔ مہاجر گاڑی کو اللہ کے حکم سے پچھلے گلی فورس کا صاحب انگریز ہے۔ میں نے سیلوٹ مارا۔ میں نے کہا حضور ریل کی پٹری پر رفوجی گاڑی کو سیکھوں کے جتنے روک کر مسلمانوں کو قتل کر رہے ہیں۔“

”گاڑی تو ابھی آئی ہی نہیں۔“ ایلی بولا۔

”تمہیں کیا معلوم ہو۔“ سپاہی بولا۔ ”ایسا نہ کہتا تو وہ سپاہی کیسے بھیجتا جو یہ کہتا گاڑی آنے

والی ہے تو کون سنتا میری بات۔“

”تو پھر؟“ ڈرائیور نے پوچھا۔

”صاحب ابھی سوچ رہا تھا کہ جوانوں نے سن لیا اور وہ حکم ملنے سے پہلے ہی رفلنس لے کر

بھاگے۔ وہ سب آ رہے ہیں سیکھوں کے جتنے بھاگ رہے ہیں۔ اللہ نے چاہا تو گاڑی بچ جائے

گی۔“

”انشاء اللہ۔“ ڈرائیور بولا۔

”اگر ہم پر یہاں حملہ ہو جائے۔“ شیر علی نے پوچھا۔

”یہاں تو صرف تین مرتے۔“ سپاہی بولا۔ ”وہاں تو سینکڑوں کی بات تھی۔“

”اللہ مالک ہے۔“ ڈرائیور بولا۔

ایلی نے حیرانی سے سپاہی کی طرف دیکھا۔ ”اور اگر تمہیں گولی مار دیتے تو؟“ اس نے

پوچھا۔

”ایک نہ ایک دن مرنا ہی ہے ہاں۔ مار دیتے۔“ وہ مسکرایا۔ ”اپنا کیا ہے۔ ایک نہ ایک دن

گولی سے ہی مرنا ہے۔ پر وہ مسلمان رفوجی کی گاڑی۔“ وہ رک گیا۔

ایلی کی نگاہ سے گویا ایک پردہ سا ہٹ گیا۔

علی پیچھے ہٹ گیا۔

اس کی جگہ بیسیوں چھوٹے چھوٹے بچے اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ انہوں نے ہاتھ

اٹھائے ہوئے تھا ابو ابو۔ بیسیوں آوازیں بلند ہوئیں۔ سینکڑوں بوڑھی عورتیں اس کی طرف

امید بھری نگاہ سے دیکھ رہی تھیں۔

جاؤ جاؤ

انہوں نے محلے پر آخری نگاہ ڈالی۔

وہ آصفی محلے کو بیٹھ کے لئے چھوڑ رہے تھے۔

حملہ ویران پڑا تھا۔ کھڑکیاں بند تھیں۔ دیواریں چپ چاپ استوار تھیں۔

محلے کا میدان خالی پڑا تھا۔ کچھ لوگ جا چکے تھے۔ کچھ اداں کھڑے جانے والوں کو دیکھ رہے تھے۔ محلے والوں کی زبانیں گویا تلو سے چٹ گئی تھیں۔ ان کی قوت گویائی آنکھوں میں ڈوب رہی تھی۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے علی احمد کی گھرانے کو جاتے ہوئے دیکھ رہے تھے۔

ایلی نے آخری نگاہ ڈالی۔ اوپر چوبارے میں شہزاد کھڑی تھی۔ پھر وہ سب ٹرک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ علی احمد چپ چاپ سر کو ہاتھوں میں تھامے ہوئے نہ جانے کدھر دیکھ رہے تھے۔

ہاجرہ کا چہرہ بھیانک ہو رہا تھا۔ عالی حیرانی سے ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ شمیم اور اس کی بیٹیاں چپ چاپ بیٹھی تھیں۔ صرف راجو کے چہرے پر ہمت اور امید کی جھلک تھی۔ نصیر دانتوں میں تنکا چلا رہا تھا۔ اب ہاتھ مل رہی تھی۔ فرحت کی ہوائیاں اڑی ہوئی تھیں۔ اس کے بچے سے ہوئے بیٹھے تھے۔

ٹرک چلے جا رہا تھا۔

ریل کی سڑک کے دو رویہ فوجی بندوقیں لئے کھڑے تھے۔

دفعتاً "سپاہی چلایا: "اللہ اکبر"

سب سپاہی کی طرف دیکھنے لگے۔

"رفوچی گاڑی۔ رفوچی گاڑی۔" وہ بچوں کی طرح تالیاں بجا رہا تھا۔

انہوں نے پردہ اٹھا کر دیکھا۔

سامنے ریل کی پٹری پر مسلمانوں کی پہلی رفوچی گاڑی آرہی تھی۔ اس کے ساتھ لوگ یوں چپے ہوئے تھے جیسے گڑ پر چوہ ٹپیں۔ وہ آہستہ آہستہ چل رہی تھی۔ جیسے اس عظیم بوجھ تلے ہو تک رہی ہو۔

"اور گریاں۔" سپاہی چلانے لگے۔ "آج اگست کا آخری دن ہے۔"

ڈرائیور نے سپاہی کی طرف تعجب سے دیکھا۔ پھر وہ بولا:

"کل مسلمان ہائیڈری فورس یہاں سے چلی جائے گی۔"

"چلی جائے گی۔" علی احمد بولے۔

"اور اور۔" ڈرائیور بولا۔ "چلی جائے گی تو۔۔۔۔۔"

"سنگھ دھاندلی مچا دیں گے۔" سپاہی نے جواب دیا۔

"اور علی پور کا کیا بنے گا؟"

"وہ تو ہائیڈری والوں کی وجہ سے بچا ہوا تھا۔" سپاہی بولا۔

"مگر دہشت تو صاف ہو گیا۔" ڈرائیور نے کہا۔

ایلی نے جھرجھری لی۔

ایک بھیانک خاموشی چھا گئی۔

"ارے بھائی۔" ڈرائیور نے ایک چیخ سی ماری۔

بسمی ڈرائیور کی طرف دیکھنے لگے۔

ٹرک رک گیا۔

وہ سب سسم گئے۔ شاید حملہ ہو گیا۔ شاید ٹرک خراب ہو گیا۔

سپاہی نے علی کا نعرہ مارا اور بندوق اٹھائے باہر چھلانگ لگا دی۔

وہ پردے ہٹا کر دیکھنے لگے۔

سڑک پر یہاں وہاں لاشیں پڑی تھیں۔ چاروں طرف خون کے چھینٹے اڑے ہوئے تھے اور

ان کے درمیان پاگ بیا چھاتی نکالے گردن اٹھائے بے پروائی اور بے نیازی سے ادھر سے ادھر

اور ادھر سے ادھریوں ٹپ رہا تھا جیسے جہاز کا کپتان ارد گرد کا جائزہ لے رہا ہو اور جہاز کے ملاحوں

کو احکامات جاری کر رہا ہو۔

"بابا۔۔۔۔۔" ڈرائیور چلایا۔

سپاہی بابا کو دیکھ کر بھونچکا رہا گیا۔

"بابا۔" ڈرائیور پھر چلایا۔

بابا دور نہ جانے کہاں دیکھ رہا تھا۔

"آؤ باؤ چلیں۔" سپاہی چلایا۔ "پاکستان چلیں۔"

بابا نے سپاہی کی طرف دیکھا۔ "چلیں۔" وہ بولا۔ "سب نے چلے جانا ہے۔ سب نے۔" وہاں

تو جاؤ۔ جانا ہے تو جاؤ۔ جس نے جانا ہے جائے۔"

"تم آ جاؤ بابا۔" ڈرائیور چلایا۔

بابا اپنی ہی دھن میں چلا رہا تھا: ”جانا ہے تو جاؤ۔ چلے جاؤ۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہی کرنے والا ہے۔ وہی کرتا ہے۔ وہی مارتا ہے وہی زندہ کرتا ہے۔“

”لیکن بابا۔“ سپاہی چلایا۔ ”وہ تمہیں مار دیں گے۔“

”مار دیں گے۔۔۔۔۔ وہ۔۔۔۔۔“ بابا کے ہونٹوں پر ہنسی آگئی۔ ”وہ کہاں ہیں۔ کہاں ہیں وہ کہاں ہیں وہ۔ کوئی بھی تو نہیں صرف وہی ہے۔ صرف وہی۔ یہاں وہاں ہر جگہ ہر جگہ اور کون ہے؟“

”اسے زبردستی اٹھلو۔“ ڈرائیور چیخنے لگا۔ ”اٹھلو۔ ٹرک میں ڈال دو۔“

بابا نے ایک غضب ناک نگاہ سپاہی پر ڈالی۔

”مت کرو۔ مت کرو۔“ ہاجرہ بولی۔ ”بابا کو کچھ نہ کہو۔“

بابا نے ایلچی کی طرف دیکھا۔ ایلچی نے جبک کر سلام کیا۔

حضور حضور

بابا نے غور سے اس کی طرف دیکھا اور ٹرک کے قریب آکھڑا ہوا:

”بولو کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔“ وہ چلایا۔ ”سب کچھ کیا سب کچھ کیا۔ کہاں کہاں حفاظت نہیں کی۔ کہاں کہاں خیال نہیں رکھا۔ کیا نہیں کیا۔ کیا نہیں کیا۔ بولو بتاؤ۔“

”وقت آگیا ہے۔ وقت آگیا ہے۔“ وہ پھر بولنے لگا۔ ”جاؤ جاؤ۔ تم جاتے کیوں نہیں۔ وقت آگیا۔ دور دور۔ جاؤ جاؤ۔ مسجد کے پاس کنوئیں کے پاس دونوں بیٹھے ہیں۔ اللہ نے معاملہ اس کے ہاتھ میں دے دیا وہ جس کے ہاتھ میں چاہے دیدے۔ میں کیا کروں۔ میں کیا کروں۔ وہ جانے اور وہ جانے۔ وہ دینے والا وہ لینے والا۔ جاؤ جاؤ۔“

ڈرائیور نے ٹرک شارٹ کر دیا۔ سپاہی بے حد کر اوپر چڑھ گیا۔

”آ جاؤ بابا۔“ سپاہی آخری مرتبہ چلایا۔

بابا نے قریب ہی سے ایک لاشی اٹھائی اور دوسری طرف منہ پھیر کر اسے لہرانے لگا۔ ”ہٹ جاؤ۔۔۔۔۔ ہٹ جاؤ۔“ اور پھر لاشی پھینک کر ہنسنے لگا۔ ”مجھے کیا ہے مجھے کیا ہے۔ کرنے والے تم ہو۔ تم جانو۔ میں کیا ہوں۔ میں کیا ہوں“ وہ چلا رہا تھا۔

ٹرک روانہ ہو چکا تھا۔

دلفت!“ ایلچی کے روبرو حاجی صاحب آکھڑے ہوئے۔ ”وقت آئے گا۔ وقت آئے گا۔“ وہ سترائے۔ ”الحمد للہ۔ اللہ اچھا کرے گا۔ وقت آئے گا۔“

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی: ”میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔ میں دور ہو گئی۔“

دلی کا عالم مولوی ہنس رہا تھا۔ ”سب اس کا پر تو ہے۔ سب اس کی شعبہ بازی ہے۔ وہ بڑا شعبہ باز ہے۔ سب اسی کا کھیل ہے۔ وہ بڑا کھلاڑی ہے۔“ وہ ہنسنے لگا۔

”خبردار۔“ ڈرائیور چلایا۔ ”امر تر آگیا۔ کوئی باہر نہ جھانکے۔ کوئی آواز نہ نکالے۔“

”اللہ مالک ہے۔“ سپاہی بولا۔

ایلچی چونک پڑا۔

اس نے سامنے شیشے سے جھانک کر دیکھا۔

سامنے چوک میں ایک فوجی کھڑا تھا۔

”اگر اس نے روکا۔“ سپاہی بولا۔ ”تو رکنا نہیں۔“

”جو اللہ کرے۔“ ڈرائیور نے ٹرک تیز کر دیا۔

چوک میں کھڑے فوجی نے رکنے کا اشارہ کر دیا۔

”جاؤ جاؤ۔“ دور سے پاک بابا کی آواز سنائی دی۔

”تواخ۔۔۔۔۔“ ایک آواز سی سنائی دی۔

چوک میں کھڑا فوجی ڈھیر ہو کر گر پڑا۔

ایلچی نے دھڑکتے ہوئے دل سے سامنے دیکھا۔

”جاؤ جاؤ۔ چوک میں۔“ پاک بابا چلا رہا تھا۔ ”سڑک سے نہیں۔ کھیتوں سے۔ کھیتوں سے۔“

ڈرائیور نے ٹرک سڑک سے اتار کر کھیتوں میں ڈال دیا۔

”نیا جیون۔ نیا جیون۔“ کھڑکی میں شہزاد گنگنا رہی تھی۔

”آئے دو۔“ رومی ٹوپی والا کھیتوں میں ہاتھ دیئے کھڑا تھا۔

”راستے کی رکاوٹ تو میں تھی۔“ شہزاد

”آئے دو۔ آئے دو۔“ دراز قد اشارے کر رہا تھا۔

ٹرک دوڑ رہا تھا۔ دوڑ رہا تھا۔

علی پور کا ایلی

(ڈاکٹر محمد احسن فاروقی)

”آ جاؤ۔ جاؤ۔“ پیوں کی آواز چاروں طرف گونج رہی تھی۔
 ”حضور حضور۔“ ہارن خوشی سے چیخ رہا تھا۔
 ”پاکستان۔ پاکستان۔“ ایلی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

”علی پور کا ایلی۔“ کے پہلے ایڈیشن کی ہر جلد کے ساتھ ایک چھپی گئی ہوئی ملتی تھی۔ جس پر لکھا ہوتا تھا۔ ”اسے آدم جی انعام بھی ملا۔“ اور کچھ ہی عرصہ بعد اس کے بابت ابن انشاء صاحب نے کہا۔ ”اسی لئے مشہور ہے کہ اس پر آدم جی انعام نہیں ملا“ اور جملہ کا یہ حصہ اس کے ہر ایڈیشن کے ساتھ چھپا۔ مجھے یاد آتا ہے کہ جب ۱۹۶۱ء کا آدم جی انعام ملنے والا تھا تو یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ اس ناول کو انعام ملنا چاہیے یا ملے گا یا ضرور ملے گا۔ مگر انعام ”تلاش بہاراں۔“ کو دیا گیا۔ مولوی عبدالحق بقید حیات تھے اور میں ان کی خدمت میں بیباک تھا۔ ان کے ناول کے سلسلے میں ذوق پر مجھے کبھی اعتماد نہیں ہوا۔ جب پہلا آدم جی انعام ”خدا کی بستی۔“ کو دیا گیا تو میں نے مولوی صاحب سے کہا تھا۔ ”آپ نے ترازو بٹ سے تول کر انعام دیا ہے۔“ اور ان سب کتابوں کو جو مولوی صاحب کے کمرے میں ایک پلنگ پر پھیلی ہوئی تھیں۔ دیکھ کر اٹھادہ کرتے ہوئے یہ بھی کہا تھا۔ ”آخر ان سب کتابوں سے تو وزن میں یہ سب سے بھاری ہے۔“ مولوی صاحب ہنس دیئے تھے۔ پھر آئندہ سال ”تلاش بہاراں۔“ کو انعام ملنے کے بعد میں ان کے پاس گیا۔ وہ قریب المرگ تھے۔ مگر باتیں کرتے تھے میں نے کہا۔ ”اب کی انعام دینے کے سلسلہ میں ”علی پور کا ایلی۔“ اس قدر زیادہ بڑی کتاب تھی کہ ترازو ہی ٹوٹ گئی لہذا اس کا وزن نہ ہو سکا اور اس کم وزن کی کتاب ”تلاش بہاراں۔“ کو آپ نے انعام دے دیا۔“ مولوی صاحب تھوڑی دیر کے بعد غش میں آ جاتے تھے۔ کہہ نہیں سکتا کہ انہوں نے یہ بات پوری کی یا نہیں۔ مگر میں یہ سب ہی سے کہتا رہا۔ یہ عجیب واقعہ تھا کہ ایک ناول کی سب سے بڑی

تعریف یہ ہو کہ ”اسے آدم جی انعام ملا“ اور دوسری کی تعریف یہ کی جائے کہ اسے ”آدم جی انعام نہیں ملا۔“ انعام ملنا یا نہ ملنا بے معنی ہو گیا اور ایک حد تک جن ناولوں کے بابت یہ کہا جائے کہ انہیں انعام ملا یا نہیں ملا وہ بھی بے معنی ہو گئیں۔ اس بنا پر ”مجھے علی پور کا ایلہ۔“ سے ایک مہم ساقصوب ہو گیا اور میں اسے بھی ایسی چیز ماننے لگا جو میرے پڑھنے کے قابل نہیں ہے۔ اس قصب کو ختم ہوئے بھی عرصہ گزر گیا۔ پھر ایک دن جمیل صاحب کے یہاں اس کا وہ ایڈیشن رکھا ہوا دیکھا جو ”ہماری لائبریری۔“ کے سلسلہ کا ہے۔ ممتاز مفتی کی افسانہ نگاری سے بھی بہت ہی واقف تھا۔ اور اسے قدر کی نگاہ سے دیکھا کرتا تھا۔ میں نے یہ طے کیا کہ ”علی پور کا ایلہ۔“ کو ضرور پڑھ کر دیکھوں گا اور جمیل صاحب سے کتاب عاریتاً لے لی۔ پڑھنا شروع کیا تو اس میں ایسا محو ہوا کہ دن دن بھر اور رات میں کافی دیر تک پڑھتا رہا۔ ساتھ لئے لئے پھر اور کراچی کی بسوں میں دفنوں میں جہاں بھی ذرا سا وقت مل گیا۔ اس کی طرف رجوع ہو گیا کتب مضمیم تھی اور جلد بہر یک جب میں نے اسے جمیل صاحب کو واپس دیا تو اس کے بلا مبالغہ آٹھ الگ الگ ٹکڑے ہو چکے تھے۔ کچھ لوگوں نے اسے میرے ہاتھ میں دیکھ کر تعجب سے یہ بھی کہا۔ ”اتنی موٹی کتاب پڑھ رہے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔ ”چھوٹی یا موٹی کی مجھے کوئی پرواہ نہیں یہ کتاب حد سے زیادہ دلچسپ ہے اور میرے لئے میں غیر ادبی یا ادب سے گری ہوئی کتاب نہیں پڑھتا اور یہ مجھے آج کی سب ادبی کتابوں سے زیادہ دلچسپ معلوم ہو رہی ہے جلد سے جلد ختم ہو جائے گی۔“ غرض اس کتاب کو ایک ہلکی قسم کی نفرت سے میں نے شروع کیا مگر یہ میرے لئے دلچسپ اور قابلِ وقعت ہوتی گئی اور آخر میں اس مثل پر پوری اتاری کہ جادو وہ ہے جو سر چڑھ کر بولے۔ مشفق محمد طفیل ایڈیٹر ”نقوش۔“ نے اس کا ”فسانہ آزاد۔“ سے مقابلہ کیا اور ان سے میری ملاقات ہوئی تو میں نے کہا ”علی پور کا ایلہ۔“ اور ”فسانہ آزاد۔“ میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ آخر الذکر ناول کے میدان میں پہلا ڈنگا ہوا قدم ہے اول الذکر اس میدان کے ادب میں پورے طور پر تسخیر کا نشان ہے۔“ انہوں نے کہا۔ ”اس پر ایک مفصل مضمون لکھ ڈالئے۔“ میں نے اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھنا شروع کیا۔ مگر یہ دیکھ کر کہ رسالہ نقوش سو گیا ہے۔ مجھے بھی نیند آگئی اور وہ رہ گیا۔ مگر اب جب اس تصنیف کو مقبول ہوئے بارہ برس ہو گئے ہیں اسے پھر پڑھا اور اس پر مضمون لکھ ڈالنے ہی کا فیصلہ کیا۔ نقوش نہ معلوم کب نکلے گا مگر مضمون کو تیار رہنا چاہیے۔ لکھنے کی وجہ یہ بھی ہے کہ میں نے اب ان تمام ناولوں پر

مفصل لکھنے کی ٹھان لی ہے جو ۱۹۴۷ء سے اب تک وجود میں آئی ہیں اور جو ہماری ناول نگاری میں ایک نیا بلکہ ناول کے اصل معنوں میں پہلے دور کے نقوش جمارہی ہیں۔ میری رائے ہے کہ ”علی پور کا ایلہ۔“ ان آدھے درجن ناولوں میں ہے جو ہمیشہ اہم مانی جاتی رہیں گی۔

ممتاز مفتی صاحب ناول کا واضح شعور رکھتے ہیں اور اس لئے ان کے سلسلے میں انعام کی کوئی اہمیت نہ ہونا چاہیے۔ کیونکہ انعام تو پیشتر ایسے لوگوں کو ملتا ہے۔ جن کو ناول کا کوئی شعور نہیں ہوتا اور وہ اپنی ناول کے بابت یہ نہیں بتا سکتے کہ اس میں ہے کیا۔ برخلاف اس کے مفتی صاحب انکار کے ساتھ فرماتے ہیں۔

”اپنی دانست میں میں نے ناول بلکہ ایلہ کی سرگزشت لکھی تھی۔ مقصد تھا کہ ایلہ کی شخصیت کا ارتقاء پیش کروں۔ اس لئے چند ایک بظاہر غلیظ تفصیلات پیش کرنے سے گریز نہیں کیا۔ یہ اور بات ہے کہ ایلہ ایسا کروار ہے جو مشاہدات کے سمندر میں ڈبکیں کھاتا ہے۔ لیکن جب کنارے لگتا ہے تو پنچھی کی طرح پر جھاز کر پھر سے جوں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔۔۔۔۔“

بہر حال اردو ادب میں کوئی طویل کہانی ایسی نہ ملے گی۔ جس کی تفصیلات براہ راست زندگی سے اخذ کی گئی ہوں اور چٹاؤ کے بغیر ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہوں۔ اس لحاظ سے یہ کتاب آپ جیتی ہے۔

(پیش لفظ، طبع ثانی)

پس لفظ طبع ۱۹۶۱ء میں وہ پہلے ہی فرما چکے تھے۔

----- یہ روداد ہے۔

ایک ایسے شخص کی جس کا تعلیم کچھ نہ بگاڑ سکی۔

جس نے تجربے سے کچھ نہ سیکھا۔

جس کا ذہن اور دل ایک دوسرے سے اجنبی رہے۔

جو پلا پروان چڑھا اور باپ بننے کے باوجود بچہ ہی رہا۔

جس نے کئی ایک محبتیں کیں لیکن محبت نہ کر سکا۔ جس نے محبت کی بھلجھڑیاں اپنی انا

کی تسکین کے لئے چلائیں لیکن سپردگی کے عظیم جذبے سے بیگانہ رہا اور شعلہ جوالا نہ پیدا کر

سکا۔

جو زندگی بھر اپنی انا کی دھندلی بھول۔ صلیوں میں کھویا رہا حتیٰ کہ بالآخر نہ جانے کہاں سے

یک کرن چکی اور اسے نہ جانے کدھر کو لے جانے والا ایک راستہ مل گیا۔

اس داستان کے بیشتر واقعات اور مرکزی کردار حقیقت پر مبنی ہیں۔ باقی کردار حقیقت اور سانسہ کی آمیزش ہیں۔ حقیقت سے گریز کی وجہ میرا عجز ہے اور ان کرداروں کی عظمت کو اجاگر کرنا میرے بس کی بات نہ تھی۔ لہذا انسانی رنگ شامل کر کے میں نے اپنے عجز کو چھپانے کی کوشش کی ہے۔

ظاہر ہے کہ دو پیش لفظوں میں جو کچھ نہیں ملتا ہے اسے باقاعدہ تنقید ہی کہا جاسکتا مگر وہ ممتاز مفتی صاحب کے ناول کے سلسلے میں شعور کا ضرور اندازہ دیتا ہے اور اس میں سے حسب میل خاصی باتیں سامنے آتی ہیں۔

اول یہ کہ وہ مستقل واقعیت پسند ہیں۔ وہ اپنا مخصوص تجربہ پیش کرنا چاہتے ہیں اور اس طرح کہ وہ بالکل صحیح رہے۔ یہ بات ہمیں ناول کی بنیاد تک لے جاتی ہے۔ اٹھارویں صدی میں ناول کی ابتدا کرنے والوں کے سامنے بھی یہی مخصوص مقصد تھا اور یہی مقصد آج بھی تمام ادبی ناول نگاروں کا ہوتا ہے۔ مگر وقت کے ساتھ اس مقصد میں اور بھی مقاصد شامل ہو گئے۔ خاص طور سے بیسویں صدی میں تجربہ یا زندگی کے حالات کو نظریہ یا تخیل کے اثر سے بدل کر پیش کرنا بھی ضروری سمجھا جاتا ہے۔ اسی سے ناول نگار مفکر کے روپ میں سامنے آتا ہے۔ اور ناول متاثر کرنے کے علاوہ ذہنی بحث کا مواد بہم پہنچاتی ہے۔ مفتی صاحب اس جھنجھٹ میں نہیں پڑ رہے ہیں۔ وہ نہایت غیر جانبداری سے ایک سرگزشت ایک روئند کو بے کم و کاست بیان کر دیتا چاہتے ہیں۔ ہمارے یہاں ناول کا ارتقا عجیب رہا ہے۔ ابتدا کے ناول نگار اسے سانسہ سمجھ کر بہت سے فرضی، خیالی اور مبالغاتی چیزیں اس میں داخل کرتے رہے اور آج کل کے ناول نگار جدید تجربوں کی راہ پر چل کھڑے ہوئے۔ اس لئے ہمارے یہاں ایسی ناول جسے ناول کا NORMA کہا جائے ڈھونڈھے نہیں ملتی۔ مفتی صاحب اس فارم اس ”خالص ناول“ کی راہ پر چل رہے ہیں اور ”علی پور کا ایل“ اپنے نام سے ہی اور پھر مواد سے بھی زندگی کی اس طرح ترجمانی ہے جیسی واقعیت پسندوں اور قدریت پسندوں نے کی تھی۔ جدید دور میں اس راہ پر چلنا اور قدم میں لغزش نہ آنا بھی ایک کمال ہی کے دائرے میں آتا ہے اور ہمیں یہ دیکھنا ہو گا کہ وہ اسے کہاں تک حاصل کر سکے ہیں۔

دوسرے یہ کہ واقعیت پورے طور پر ہلکنار رہنے کی کوشش سے اس ناول میں ”

خصوصیات پیدا ہونا لازمی تھیں اور انہیں مفتی صاحب نے نہایت فراخ دلی سے پیدا ہونے دیا۔ اول یہ کہ تجربوں کا ڈھیر لگتا چلا گیا اور اس میں سے انہوں نے چننے کی کوشش نہیں کی۔ ناول کو آج کا انتخاب اور ارتقاء کے اصولوں کے ماتحت لانے کی کوشش کی جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے کہ بہت سی تفصیلات غائب ہو جاتی ہیں اور بہت سی سکڑا کر رکھی جاتی ہیں۔ قاری کو ناول نگار کے اشاروں سے خود بہت کچھ اپنی طرف سے شامل کر لینا پڑتا ہے۔ اسی طرح ناول فنکار اور صاحب ذوق دونوں کی تخیل کے ساتھ ساتھ چلتے رہنے سے بنتی ہے۔ وہ اکثر لوگوں کے لئے مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے اور بیشتر لوگ مبہم اور مشکل بھی ہو جاتی ہے۔ اور بیشتر لوگ اسے اپنی اپنی طرح پر سمجھتے ہوئے اسے پڑھ جاتے ہیں۔ مفتی صاحب اس کے قائل نہیں ہیں اور ہر اس معاملے میں بھی وہ اٹھارویں اور انیسویں صدی کے ناول نگاروں کے ساتھ ہیں جو تفصیلات کو زیادہ سے زیادہ واضح طریقہ پر پیش کرنے کے قائل تھے۔ اور زندگی کا واضح سے واضح نقشہ پیش کرتے تھے۔ اس لئے ”علی پور کا ایل“ میں ہمیں جدید فنکاری سے انکار بلکہ اختلاف ملتا ہے یہ ثابت ہوتا ہے کہ پرانا طریقہ اب بھی کتنا زور دار ہو سکتا ہے۔ دوسرے یہ کہ اس وجہ سے اس کی ضخامت بڑھ گئی ہے۔ جس پر کچھ لوگوں کو اعتراض ہے ناول کے سلسلے میں ہمارے یہاں کوئی واضح نظریہ نہ ہونے کی وجہ سے کچھ لوگ اسی تصنیف کو ناول کہتے ہیں جو کم از کم ایک ہزار صفحوں کا ہو مگر زیادہ تر لوگ ضخامت سے ٹھنصر جاتے ہیں اور یہ چاہتے ہیں کہ ناول حد سے حد چار سو صفحوں کی ہو۔ ”علی پور کا ایل“ کی ضخامت زیادہ تر لوگوں پر بار ہے۔ میں اسے ایک قسم کی بدذاتی سمجھتا ہوں اصل میں ضخامت مواد اور فن پر مبنی ہوتی ہے اور مفتی صاحب کا جو مواد ہے اور جس طرح وہ اسے پیش کرنا چاہتے ہیں وہ اتنی ضخامت گھیرے بغیر وہ ہی نہیں سکتا تھا جتنی کہ ناول کی ہے۔ ان باتوں سے یہ نتیجہ بھی نکلتا ہے کہ مفتی صاحب بغیر سوچے سمجھے روائی کے ساتھ ناول سرسراتے گئے ہیں اور انہیں فنکاری سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ ہمیں دیکھنا ہے کہ یہ سب تفصیلات اور طوالت کیا محض لاپرواہی کی وجہ سے ہے یا اس کے پیچھے کوئی مستقل فنی صورت چھپی ہوئی ہے اور ہے تو وہ کس حد تک دلکش ہے۔

تیسرے یہ کہ تخیلی کار کی حیثیت سے وہ تمام قوت کردار نگاری پر صرف کرنا چاہتے ہیں اور خاص طور پر ناول کے ہیرو اور اسی کی حد سے زیادہ نارمل نوعیت کو دائمی حقیقت بنا دینا چاہتے ہیں۔ جدید ناول نگاری کے سلسلے میں بھی باقی ہے۔ اور بالکل واقعاتی کردار پیش کرنے کے

بجائے اشارت وغیرہ پر عمل کرتی ہے۔ مفتی صاحب اس کے بھی خلاف ہیں اور ان کی وہ راہ ہے جو ”دون کا ہونے“ سے شروع ہو کر ”چوک پیچہ ز“ تک چلی آتی ہے اور آج بھی سوسرٹ نام وغیرہ کی راہ ہے۔ غرض اس معاملے میں سبھی وہ ناول نگاری کے تمام الجھاؤں کو الگ کر دیتے ہیں۔ ضخامت اور وسعت کے لحاظ سے اس کتاب میں کردار کا ابھرتا اور نئے نئے کردار کا ہر موڑ پر سامنے آتے رہنا لازمی ہے۔ ہمیں یہ دیکھنا ہے کہ یہ کس قدر زندہ ہیں اور کیسے مل جل کر ایک دنیا تخلیق کرتے ہیں اور یہ دنیا کس حد تک دلکش ہے۔ پھر ناول کا مرکزی کردار ایلی سب سے زیادہ مصنف کی توجہ کا مرکز ہے۔ اس کے بابت چند بنیادی باتیں وہ پیش لفظ ہی میں کہہ دیتے ہیں۔ یہ باتیں نہایت معمولی ہیں مگر معمولی ہونے ہی کی وجہ سے تعجب انگیز بھی اور اسی مثل کی مصداق ہیں کہ حقیقت مجاز سے زیادہ تعجب انگیز ہوتی ہے۔ غرض یہ ناول صاف صاف طور پر اس قسم کی ناول ہے جسے کرداری ناول کہا جاتا ہے اور اس کی کامیابی بالکل آخر کار اس کے ہیرو کی تخلیق کی کامیابی بالکل سے وابستہ ہونا چاہئے اور اگر ایلی دیانے ناول نگاری کے ان کردار میں سے ایک ٹھہرتا ہے جس کو حقیقت سے زیادہ حقیقی اور ایک معاشرے کا مکمل نمائندہ کہا گیا ہے تو ناول کو عظیم درجہ میں جگہ دینا ضرور ہو جاتا ہے۔

غرض ہم اس ناول کو یہ جان کر اور مان کر شروع کرتے ہیں یہ ناول کی بنیاد۔ روح یا سیدھی ضرور راہ سے ہٹنے کی کوشش نہیں کی بلکہ ان جدید ضروری یا غیر ضروری آلائشوں سے پاک ہے جو تجربہ کی طرح تھوپی جا رہی ہیں۔ ہمیں پیش لفظوں میں یہ بھی بتایا جاتا ہے کہ کچھ لوگ اسے ناول کہنے کے لئے تیار نہیں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں۔ جن کی رائے کو کوئی خاص وقعت نہیں دینا چاہئے۔ یہ لوگ ناول میں رومان دیکھنا چاہتے ہیں اور ”علی پور کا ایلی“۔ میں بس اسی حد تک ہے جتنا کہ ایلی کے کردار سے ممکن تھا۔ اس کو رنگ دینا واقعیت سے ندراری کے مترادف ہوتا اس لئے مفتی صاحب نے رومانی رنگ چڑھانے سے گریز کیا۔ اس لئے عام ناولوں کو پڑھنے والے اسے غیر دلچسپ کہیں گے۔ مگر میں نے پڑھ کر دیکھا ہے اور بہت سے لوگ میرے ہم رائے ہیں کہ اس میں بے پناہ دلچسپی ہے۔ ویسی دلچسپی بھی جیسی ناول کا اعلیٰ ذوق رکھنے والے ڈھونڈتے ہیں اور ویسی دلچسپی بھی جو جیسی ایک فرد کے دنیا سے کشمکش سے خاص طور پر عشق بازی کی کش مکش سے پیدا ہوتی ہے اور اس میں ایک مسلسل عشقیہ قصہ بھی ہے۔ جو بڑے جزئیات کے ساتھ سامنے آتا ہے۔ اور بڑے دلکش کردار کے مختلف پہلو دکھاتا ہے۔ ایلی اور

شہزاد کا عشق بڑی عجیب حقیقت ہونے کی وجہ سے اچھا خاصا رومانی ہے اور اس میں رخنوں کو اور اس کے نتیجوں کو ہم بڑی دلچسپی سے نکلنے سے دیکھنے کے منتظر رہتے ہیں۔ لاہور میں ایلی کا ایک اور عشق چلتا ہے اور وہ بھی بڑا دلچسپ ہو جاتا ہے ایک اس وجہ سے کہ وہ اپنی جگہ پر عجیب ہے اور دوسرے اس وجہ سے کہ وہ ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ کو ختم نہیں کرتا پھر جب ہمیں ایلی سے شروع ہی سے دلچسپی ہو جاتی ہے کہ ہم اسے ناول کے سلسلے کے تعصبات سے ذہن کو خالی کر کے پڑھیں تو زندگی کا جو منظر یہ پیش کرتی ہے۔ وہ حد سے زیادہ دلچسپ ہو جائے گا۔ اور ضخامت ہماری دلچسپی کی راہ میں کسی طرح حائل نہ ہوگی بلکہ ہمارا دل چاہتا ہے کہ یہ اور بھی ضخیم ہوتی تو اچھا تھا۔

(۲)

مفتی صاحب یہ فرماتے ہیں کہ اس کتاب میں زندگی کی تفصیلات ایک جگہ ڈھیر کر دی گئی ہیں۔ ڈھیر کا لفظ (بے ترتیبی کی طرف اشارہ کرتا ہے مگر کسی ڈھیر پر غور کیجئے تو اس میں ایک ترتیب ضرور نظر آئے گی۔ یہ ترتیب انسان کی دی ہوئی تو کسی طرح نہ ہوگی مگر قدرت نے انسان کے ڈھیر کئے ہوئے مواد سے ایک ترتیب ضرور پیدا کر دی ہوگی۔ اناج کے ڈھیر کو دیکھئے اس کی ایک چوٹی ہوگی اور سارا مواد اس سے شروع ہو کر ایک مثلث کی شکل ضرور اختیار کر گیا ہو گا۔ ”علی پور کا ایلی“۔ بھی اسی قسم کی ترتیب قدرتی ترتیب رکھتا ہے۔ اس کی ابتدا ایلی یا الیاس کے گھر کا سین سب میں پہلے سامنے لاتا ہے۔ باپ علی احمد دو ماہیں ایک سگی ماں ہاجرہ اور ایک سوتیلی صفیہ صاف صاف ایک دوسرے سے مختلف اور اپنی جگہ پر منفرد ہیں۔ ایلی کو بچہ ہی کہا جاسکتا ہے۔ مگر وہ ان میں سے ہر ایک سے ایک خاص رد عمل رکھتا ہے۔ علی احمد مستقل کردار ہے۔ وہ ایلی کو ملازم کی طرح سمجھتے ہیں اور ایلی ان کی آواز سن کر دھک سے رہ جاتا ہے۔ اور ان کا حقہ بھرنے لگ جاتا ہے۔ ہاجرہ بھی ایک ملازمہ کی طرح ہے جو قناعت اور رواداری سے زندگی گزار رہی ہے اور وضع دار اور حسین صفیہ کے حکم پر چل رہی ہے ایلی صفیہ سے نفرت کرتا ہے اور گھن کھاتا ہے مگر اس کے حکم پر چلنے سے انکار نہیں کر سکتا۔ اس طرح وہ ماحول پورے طور پر ہمارے سامنے آ جاتا ہے۔ جو ایلی کے کردار کے سلسلے میں بنیادی ہے۔ ناول کی یوں ابتدا بڑی معنی خیز اور فنی لحاظ سے بڑی مناسب ہے۔ علی احمد اور ایلی جو تمام داستان پر حاوی رہیں گے پوری انفرادیت کے ساتھ سامنے آ جاتے ہیں اور ایلی کا عورتوں کی طرف رد عمل

جو داستان کی بنیادی چیز ہو گا پورے طور سے ظاہر ہو جاتا ہے۔ ہاجرہ کو وہ میروین اور صفیہ کو وہ ولن سمجھتا ہے اور علی احمد کے ہر حکم پر چلنے کو تیار ہے۔ علی احمد اس سے محبت کرتے ہیں جو اس بات سے ظاہر ہوتی ہے کہ کھانا کھاتے وقت گوشت کی بوٹی اسے دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دیتے ہیں۔ یہ محبت بڑے خاص قسم کی گوشت کی بوٹی دو انگلیوں سے اٹھا کر دینا ایسا پیار ہے جو ثابت کرتا ہے کہ علی احمد کا خاص رجحان تو اپنے کلام کی طرف ہے یا پھر عورتوں سے تعلق پیدا کرنے میں ہے مگر وہ ایلی کی طرف باپ کے فرائض اور باپ کی محبت کے تقاضے پورے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔ بہر حال ابتدا ایک فوکس ہے جس میں ساری ناول دکھائی دے گئی ہے اور اس سے علی پور کی طرف گریز اور اس کا مناسب بیان نہایت قدرتی ہے۔ اس کا آصفی محلہ ایک چھوٹی سی دلکش دنیا ہے اور اس کے بادشاہ اور ملکہ علی احمد اور صفیہ کے نقوش اور بھی گہرے کر کے سامنے لائے جاتے ہیں۔ فرحت بھی دبے پاؤں اس گھر میں آ جاتی ہے۔ صفیہ اور ہاجرہ کے آپس میں تعلقات انوکھا انتقام اور نرالا امتحان کے واقعات کے ذریعہ روشن ہو جاتے ہیں۔ پہلا باب ”مرد و پیش“ اسی طرح مکمل ہو جاتا ہے۔ ہر باب کی ایک سرخی ہے اور اس کے ہر حصہ کی ماتحت سرخی ہے جو مار جن میں چھپی نظر آتی ہے۔ ظاہر یہ تاثر ہوتا ہے ناول کی قاشیں اور اس پر چھوٹی قاشیں کر دی گئی ہیں، مگر یہ سب قدرتی اور منطقی تسلسل سے جڑی ہوئی ہیں۔ سرخیوں پر سرخیوں کا استعمال وضاحت میں اور دھیان لگا رہنے میں خاص مدد کرتا ہے۔ کتاب ایک ڈھیر ہے اور معمولی ڈھیر بھی نہیں بلکہ بڑے ساز کے قریب بارہ سو صفحوں کا چوڑا اور اونچا ڈھیر ہے۔ اک پہاڑی کئے مگر اس پر جانے کا راستہ چکر کا سسی مگر صاف ہے۔ ہر چوٹی اور موڑ پر نشان کے تختے لگے ہوئے ہیں اور سفر کرنے والے کی راہنمائی کرتے ہیں اور ہر ہر گوشے کی نوعیت کا علم بہم پہنچاتے ہیں۔ ”علی پور کا ایلی“ قدرتی طور پر ایک بے شکل پہاڑی ہے مگر مفتی صاحب نے پورے شعور کے ساتھ اور فنکارانہ اُچھ اور جدت کے ساتھ اس پر چلنے والے کے لئے ہر ہر قدم پر دلچسپ راہبر کے فرائض ادا کئے ہیں۔ بے خیالی میں یہ مان لیتا ممکن ہے ناول کا کوئی اسٹریکچر نہیں ہے مگر غور سے دیکھنے پر معلوم ہوتا ہے کہ ایک بے ہتھم ڈھیر کو ناول نگار نے نہایت درجنوں چھوٹے حروف میں لکھی ہوئی سرخیاں ایک عظیم ڈھیر کو جو قدرت کا بنایا ہوا ہے انسان کے ذہن نشین کرانے اور مواد کو ایک فارم دینے میں خاص طور پر مدد ثابت ہوتی ہیں۔ اس لئے یہ کتنا

بالکل غلط ہو گا کہ ناول کا کوئی خاص فارم نہیں ہے۔ ناول زندگی کی طرح بے ہیئت ہے مگر اس پر مصنف نے ایک فارم عائد ضرور کیا ہے۔ یہ عام طور سے جو فارم ناولوں میں نظر آتے ہیں ان سے مختلف ہی نہیں بلکہ ان کا متضاد ہے مگر غور کرنے والوں پر روشن ہو جاتا ہے کہ یہ بالکل نئی چیز ضرور ہے اور مفتی صاحب کا شعور واو کے قابل ہے کہ انہوں نے فارم کو بھی خوبی سے چھپایا ہے یا مواد بھی وہ اسی خوبی سے چھپ گیا ہے کہ ناول نگاری میں ایک بالکل نئی اور اچھوتی ہیئت کا اضافہ ہوتا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس ہیئت کو قدم بقدم طے کرنا ایسا طویل عمل ہو گا کہ تنقید بھی کتاب کے برابر ضخیم ہو جائے گی۔ ہر چھوٹی سرخی ایک دلچسپ واقعہ سامنے لاتی ہے اور بڑی سرخی ان کا ایک مستقل ترتیب میں آ جانا دکھائی ہے۔ واقعات نئے اور دلچسپ ہیں اور ہر ایک سے یا تو کوئی نیا کردار ابھرتا ہے یا جانا پہچانا ہوا کردار کوئی نئی چھب دکھاتا ہے۔ تفصیل سے ہٹ کر ہم دیکھتے ہیں تو علی احمد۔ ایلی اور کچھ آگے چل کر شہزاد کے قسے پلائوں کی صورت اختیار کر لیتے ہیں۔ علی احمد کے معاشقوں کے قصوں کا تار جس سے ایلی ضمنی طور پر وابستہ ہے ایک دلچسپ لیکر بناتا ہے۔ پھر ایلی اور شہزاد کے عجیب و غریب معاشقوں کا پلاٹ اس طرح آتا ہے کہ وہ ناول کا مرکزی پلاٹ ہو جاتا ہے۔ مگر اصل پلاٹ ایلی کی سرگزشت کا ہے۔ یہ ناول کو علی پور سے باہر لے جاتا ہے۔ لاہور اور امرتسر کے واقعات اس میں شامل کرتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ پنجاب کا وہ علاقہ جو علی پور کو مرکز مان کر اور امرتسر کو حد مان کر دائرے میں بلایا جاسکتا ہے۔ ناول کا ماحول ہے۔ ایلی دلی اور بمبئی کی بھی خبر لیتا ہے مگر جہاں بھی جائے یہ ماحول اس کے ساتھ ہے اور ساتھ نہیں تو اس کے دل اور اس کے کردار میں رچا بسا ہے۔ پنجاب اور اس کا وہ مخصوص حصہ جسے علی پور کہتے ہیں۔ ایک واقعاتی مگر نئی اور عجیب کائنات کی طرح پوری ناول پر حاوی رہتا ہے۔ اور مختلف بلکہ گونا گوں قصوں اور کردار کو ایک اتھا میں لاتا ہے۔ اس طرح اس وسیع پیمانے پر پھیلے ہوئے مواد میں ایک تنصیل اتحاد صاف طور پر موجود نظر آتا ہے۔ ناول کی سرخی ”علی پور کا ایلی“ نہایت سادہ۔ نہایت سیدھی۔ سہل اور اردو میں سرخی دینے کی رسم کو دیکھتے ہوئے نہایت درجہ بلکہ ممکن حد تک بے مزا ہے مگر یہ انگریزی اور یورپی ناولوں کی سرخیوں سے بالکل ہم آہنگ ہے۔

اور ان کی طرح بغیر کسی دکھاوے کے اول مواد کے ہر ہر جزو میں پروٹی ہوئی نظر آتی ہے۔

اتحاد کا تاثر اسی سے شروع ہوتا ہے اور سارا مواد اس سے اہل کر نکلتا ہوا اور تمام میں پھیلتا ہوا نظر آتا ہے۔ ایلی جو بنیادی طور پر علی پور ہی کا ہے ایک طرف علی احمد سے متعلق ہے اور ان کی تمام دلچسپیوں میں ایک مبصر کی طرح شریک ہے پھر اس کی اپنی بھی دلچسپیاں اور مصروفیات ہیں۔ اسے تعلیم حاصل کرنا ہے اور ملازمت پر آنا ہے۔ اور اس سلسلے میں وہ واقعات کا مغز و مرکز نظر آتا ہے۔ اس کا خاندانی گھر ہے اور اس میں اس کے عزیز ہیں۔ جن سے بھی اس کے تعلقات ہیں مگر اس کی سب سے خاص دلچسپی اپنے ایک عزیز کی بیوی اور اپنے سے کافی بڑی چھ بچوں والی شہزاد سے ہو جاتی ہے۔ شہزاد بھی اپنی جگہ پر بڑی دلکش اور زندہ دل عورت ہے اور ایلی کے اس عشق کا قصہ ناول کا سب سے زیادہ دلچسپ پلاٹ ہو جاتا ہے۔ کسی پر اسرار اصول کے ماتحت ناول کو عشقیہ قصہ ہی مانا جاتا ہے اور عام ناول میں روایتی عشق کے واردات اور ایک معشوق کے لئے دو عاشقوں میں کش مکش سے ہی سارے قصے کی تعمیر ہوتی ہے۔ ممتاز مفتی کو جیسے کسی روایتی امر سے کوئی تعلق نہیں ہے ویسے روایتی عشق بازی بھی ان کے دائرے سے خارج ہے۔ ایلی اور شہزاد کے عشق میں ایک ہر بات حد سے زیادہ حقیقی ہے مگر ہم اسے بجا اور پر غلوں عشق ضرور کہیں گے۔ یہ عشق ناممکن بھی کہا جاسکتا ہے۔ اور لوگوں کی نظروں میں بہت زیادہ مضحک بھی ہو سکتا ہے مگر اس کی واقعیت میں ایسا زور اور ایسی عظمت ہے کہ ہم اس کے مظاہرے پر ایک عجیب و غریب دنیا میں کھو جاتے ہیں اور آخر میں اسی کو ناول کا حاصل اور ممتاز مفتی کا اہم ترین تجربہ مان لیتے ہیں۔ اس قصہ کے مدارج بہت ہیں اور بہت دلچسپ ہیں۔ مگر ان میں سے بہت ہی خاص کا ذکر کر کے ہم اس کی اہمیت نوعیت اور جدت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ ایلی کی زندگی میں شہزاد اس کے ایک قریب عزیز کی دولہن کی طرح داخل ہوتی ہے اور علی پور کے آصفی محلہ کے سب سے خاص مکان یا محل میں آکر رہنے لگتی ہے۔ وہ ایلی سے کافی بڑی ہے اور پھر جلد ہی چھ بچوں کی ماں ہو جانے کی وجہ سے اس سے اور بھی دور ہو جاتی ہے۔ مگر دونوں کا دل قریب ہے۔ شہزاد اس کی طرف ایسی توجہ دکھاتی ہے۔ جیسے کوئی چاہنے والی بھانجی چھوٹے دیور کی طرف دکھائے اس معاملے میں اگر عشق بھی آ جاتا ہے تو وہ پاک قسم کا ہے۔ دونوں کا تعلق جنس سے بالاتر ہے۔ ایلی کے جنسی رجحان کو وہ یہ کہہ کر روکتی ہے کہ وہ اسے دوسری عورتوں کی طرح نہ سمجھے۔ ایلی اس کی طرف آکر پلنگ پر پڑا رہتا ہے۔ اسے مشین چلاتے ہوئے یا اور کام کرتے ہوئے دیکھتا رہتا ہے۔ اس کے بازوؤں پر ایلی کی خاص نظر رہتی

ہے۔ شہزاد بھی جب دیکھو ”چھن سے۔“ اس کی طرف آ جاتی ہے۔ اس مبسم مگر دلچسپ محبت میں جنس داخل ہوئے بغیر نہیں رہتا اور ایک دفعہ جب شہزاد سلمان کی انگ کو ٹھری میں ہے تو ایلی اس پر حملہ کر دیتا ہے مگر ناکامیاب رہتا ہے۔ اس سے ان دونوں کے تعلقات میں فرق نہیں آتا اور آگے چل کر ایک دن طے ہو جاتا ہے کہ ایلی شہزاد کو بھگالے جائے گا۔ وہ اس کام کے قانونی پہلو پر ایک مشہور وکیل سے رائے لیتا ہے۔ اور وکیل یہ سن کر کہ محبوبہ چھ بچوں کی ماں ہے۔ ایلی کو کسی دماغ کے ڈاکٹر سے رائے لینے کا مشورہ دیتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ اس عشق میں دماغی خلل کو بہت کچھ دخل ہے۔ شہزاد ایلی کے ذہن میں بس جاتی ہے اور ہر وقت اس کے تصور میں ”چھن سے۔“ آ جاتی ہے۔ وہ لاہور میں تعلیم کی غرض سے آکر رہتا ہے اور قریب کے گھر میں رہنے والی ایک اونچے خاندان کی لڑکی سے اس کی پینگ کافی بڑھتے ہیں۔ اس لڑکی کو سائیکل پر لئے ہوئے وہ لاہور کے مختلف مقامات پر جاتا ہے۔ دونوں بہت قریب آ جاتے ہیں اور یہ بھی امکان نظر آتا ہے کہ دونوں کی شادی ہو جائے مگر اس عشقیہ معاملے کے دوران بھی شہزاد اس کے تصور میں آتی رہتی ہے۔ ایلی کی ماں اس کی ایک جگہ متکفی کی رسم بھی پوری کر دیتی ہے۔ مگر اس سے بھی ایلی کی شہزاد کی طرف توجہ میں کوئی فرق نہیں آتا علی احمد جس کا خاص مشغلہ عورتوں سے لگاؤ کرتے رہتا ہے ایلی کو رنڈیوں سے بھی متعارف ہونے کا موقعہ دیتا ہے۔ اور ایلی کو ایک رنڈی پھانس لینے کی بھی ناکام کوشش کرتی ہے۔ ایلی خود بھی ایک دن ایک گندے رنڈی خانہ کی گندگی میں کود ہی پڑتا ہے۔ مگر آخر میں ایسا کچھ ہوتا ہے کہ ایلی اپنی تعلیم ختم کر کے اسکول کی ملازمت پر آتا ہے اور شہزاد سے اس کی شادی ہو ہی جاتی ہے۔ دونوں کی زندگی بڑی خوشگوار نظر آتی ہے مگر آگے چل کر شہزاد کو اپنی پہلے شوہر کی لڑکی کی غلط شادی کی بنا پر ایلی کی توجہ اپنے شہزاد سے لڑکے عالی کی طرف رہتی ہے۔ وہ بہیئ میں صحافی کی حیثیت ملازم ہوتا ہے اور جب تقسیم ہند کے سلسلے میں لاہور میں فسادات ہوتے ہیں تو ”عالی عالی۔“ کرتا ہوا لاہور بھاگ آتا ہے۔

یہ خاص پلاٹ کا بہت ہی زیادہ مختصر خلاصہ ہے اس میں بہت سے چھوٹے چھوٹے پلاٹ معاون کی طرح شامل ہوتے رہتے ہیں۔ علی احمد کے نین کا سپاہی بن کر متعدد معاشقے کرنے کا ایک طویل قصہ ہے۔ ایلی کے تعلیم اور اس کے بعد ملازمت حاصل کرنے کا بھی ایک الگ پلاٹ ہے۔ اس کے مختلف عزیزوں کے بھی قصے ”نمنا“ ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ہر پلاٹ مناسب تفصیل

کے پہنچ جاتی ہوئی دکھاتی ہے۔ فسانہ آزاد کو اگر اس سے مقابلہ میں لایا جاسکتا ہے۔ تو تضاد کے لئے یعنی یہ واضح کرنے کے لئے کہ محض ناول نما فسانہ اور صحیح معنوں میں ناول کے درمیان کیا فرق ہے ”علی پور کا ایل۔“ کے بعد شبہ کی گنجائش نہیں رہتی کہ ناول اپنے پورے رنگ و روپ کے ساتھ اردو ادب میں کھب گئی۔ مفتی صاحب اس کے لئے داستان سرگزشت، ڈھیر وغیرہ کے الفاظ استعمال کریں۔ یعنی نقاد کی حیثیت سے اس کی بابت ناول کا لفظ استعمال کرنے سے پہچانیں مگر ان کے اندر جو فن کار ہے وہ تنقیدی شکوک سے بالاتر ہے۔ اور اس کی موج خرام بنے گل کترے ہیں اور ایک بالکل نیا انفرادی اور دلکش چمن ایجاد کر دیا ہے۔

(۳)

مفتی صاحب کی تخلیقی قوت کا سکھ ان کے افسانوں ہی سے جم چکا تھا مگر ”علی پور کا ایل۔“ اس کے بڑے پیمانہ پر عمل اور کاسیاب عمل کی مثال سامنے لاتا ہے۔ تخلیق قصہ گوئی کے ذریعہ بھی ظاہر ہو سکتی ہے۔ مگر اس کا خاص میدان باوجود کچھ جدید ناول نگاروں کے سخت اختلاف کے کردار نگاری ہی رہا۔ ”علی پور کا ایل۔“ میں ہر جگہ کردار امنڈتے نظر آتے ہیں اور ان میں سے ہر ایک اپنی منفرد زندگی کا واضح اور دلکش نقش ضرور چھوڑ جاتا ہے مگر ناول نگار کی عظیم تخلیقی قوت کا بیان بظاہر تین لافانی کردار کے ذریعہ خاص طور پر ہوتا ہے اور یہ کردار پہلو بدلتے۔ ارتقا کرتے حقیقت سے ہمکنار رہتے ہوئے حقیقت سے زیادہ حقیقی ہو جاتے ہیں یہاں تک کہ اردو ادب میں ان کا کوئی ثانی نہیں نظر آتا۔

علی احمد کا کردار سب میں پہلا سامنے آتا ہے اور پوری ناول پر ایک مستقل نہ بدلنے والے شخص کی طرح چھایا رہتا ہے۔ اس کی زندگی کی ہر دلچسپی مقرر ہو کر ایک خاص ٹھپہ کی ہو گئی ہے۔ وہ اپنے کام میں چوکس ہے۔ اس کے ابا عام طور پر ایک چٹائی پر بیٹھے ڈیسک پر رکھے ہوئے رجسٹر میں لکھنے میں مصروف رہتے تھے۔ وہ نمیش اتار کر بیٹھا کرتے تھے اور ان کی دھوقی میلی ہونے کے علاوہ پھٹی ہوتی تھی اور اس کے پلوؤں کو اوہر اوہر سر کے رہنے کی عادت تھی جو ایللی پر بے حد گراں گزرتی تھی۔

اس عالم میں وہ ہمیشہ بیٹھے نظر آتے ہیں اور بیٹھے بیٹھے آواز لگاتے ہیں۔ ”ایلی حقہ بھر دو۔“ حقہ بھی اس کے کردار کا ایک حصہ ہے اور پھر ان سب سے زیادہ دلچسپی عورتوں میں ہے ان کی ایک بیابہ بیوی ہاجرہ ایللی کی ماں ہیں۔ جو اب محض نوکرانی ہو کر رہ گئی ہیں مگر ساتھ ہی ساتھ

کے ساتھ سامنے آتا رہتا ہے۔ ہر سلسلے میں ڈرامائی سین بڑی مناسب اور موزوں مکالموں کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ کتاب کی ضخامت میں اضافہ رہتا ہے مگر کہیں یہ محسوس نہیں ہوتا کہ کوئی جملہ کیا لفظ بھی بلا ضروری ہے اور اسے ناول سے خارج کر کے ناول کو بہتر فارم دیا جاسکتا ہے۔ بنیادی طور پر ناول کرداری قسم کی ہے یعنی اس کا مقصد اہل فرد کو مختلف واقعات سے گزرتے ہوئے دکھانا ہے مگر اس میں ڈرامائی ناول یعنی ایسی ناول کے جو مختلف لوگوں کے درمیان کشمکش دکھائے اور وقت کے ساتھ اس کشمکش کے درجہ طے ہوں۔ عناصر بھی شامل ہو جاتے ہیں اور یہ کہتے ہی بنتا ہے کہ یہ ناول زور کے ساتھ ڈرامائی بھی ہے۔ مقامات بھی بدلتے ہیں مگر یہ محسوس ہوتا ہے کہ علی پور اور اس کا آصفی محلہ اور اس میں بھی ایللی کا خاندانی محل ایک سنج ہے اور اسی پر سارا قصہ دکھایا جا رہا ہے۔ امرت سر، لاہور اور دوسرے مقامات پر کچھ ضمنی سین ضرور دکھائے گئے ہیں مگر یہ مرکزی اسٹیج سے اس قدر متعلق ہیں کہ اتحاد تاثر میں کسی طرح فرق نہیں آتا۔ آخر میں قاری کے تصور میں جو دنیا رہ جاتی ہے اس میں علی پور اس کے خاص قسم کے مکانات۔ آصفی محلہ اور اس کے خاص محل کے رہنے والے بڑے دلکش طریقہ پر زندہ نظر آتے رہتے ہیں۔ اتحاد کے ساتھ تو تنوع کو ہم آہنگ کرنے کی بڑی اچھی مثال قائم ہوتی ہے۔ مفتی صاحب فنکاری سے زیادہ زندگی کی طرف متوجہ ضرور ہیں اور اس کو اہمیت دیتے ہیں اور ناول کو ایک ڈھیر کہہ دینے میں کوئی سکی محسوس نہیں کرتے مگر ان کی ناول شاید لاشعوی اور قدرتی طور پر مواد کو اس طرح سینٹی اور ایک مستقل شکل یا ہیئت میں تبدیل کرتی جاتی ہے کہ ان کی غیر معمولی فنکارانہ صلاحیت کا اعتراف کرنا پڑتا ہے۔ ضخامت ڈراوینے والی چیز ضرور ہے۔ اور بیشتر ضخیم ناولوں کا مواد ناول نگاروں کی گرفت سے نکل ہی جایا کرتا ہے اس لئے سطحی نظر رکھنے والے لوگ ضخامت اور بے ترتیبی کو ہم سننے سمجھتے ہیں۔ ”علی پور کا ایللی۔“ ایسے کلیوں کی صاف رو ہے۔ اتنے وسیع مواد کو ترتیب میں لے آتا۔ ایک مستقل فارم کا تاثر دینا اور دلچسپی کو قائم رکھنا ہی وہ کمال ہے جو مفتی صاحب کو ناول نگاروں کی صف اول میں کھڑا کر دیتا ہے۔ طفیل صاحب نے ضخامت میں لطف پیدا کرنے کا خیال کرتے ہوئے ”علی پور کا ایللی۔“ کا سرشار کے فسانہ آزاد سے مقابلہ کیا ہے۔ ”علی پور کا ایللی“ فسانہ آزاد کا سا جنگل کا جنگل ضرور سامنے لاتا ہے مگر اس جنگل کی ایک بڑی اہم اور فنکارانہ ترتیب بھی ہے جو فسانہ آزاد ایسی بے نکان بیڑوں کو بہت پیچھے چھوڑ آتی اور اردو ناول کو ایک کڑبڑ جھالے سے ایک دلکش تعمیر میں ارتقا کر

ایک بنی ٹھنی بیوی صفیہ ہیں جو زیادہ تر ان کے کمرے کی زینت رہتی ہیں۔ مگر صفیہ ان کے بے پناہ جنسی رجحان کی ایک مثال ہے ورنہ

”دادا کی وفات کے بعد علی احمد نے سب سے پہلا کام یہ کیا کہ باہر کو ہمیشہ کے لئے آلو چھیلنے اور آنا گوندھنے پر مامور کر دیا اور خود کمرہ مت باندھ کر اپنے جذبہ تسخیر کو مطمئن کرنے چل نکلے۔ وہ اپنی ا۔ ستادہ چال۔ ابھری ہوئی چھاتی۔ فراخ پیشانی اور رنگین متبسم نگاہوں سے مردانہ وار تسخیر کرتے پھر ٹھیلے میں ڈان کو بٹے کی سی پر جوش لڑائی لڑنے کے بعد اس میدان کارزار کی دہلیز پر بچے کی طرح اس امید پر گر پڑتے کہ انہیں کوئی شفقت بھرا ہاتھ تھپک تھپک کر سلا دے گا۔ اس لحاظ سے ان کی شخصیت جنگجو سورما ٹین کے سپاہی اور دودھ پیتے بچے کی دلچسپ آمیزش سے بنی تھی اور چونکہ ان کا جنسی پہلو شخصیت کے جملہ پہلوؤں پر حاوی تھا اس لئے یہ آمیزش درحقیقت ان کی تمام تر زندگی کا تار و پود تھا۔ ٹین کا سپاہی جنگجو سورما۔“

علی احمد اس صفت کے تمام تر بندے ہونے کی وجہ سے یک طرفہ کردار یا کمری کچر بھی کہا جاسکتا ہے۔ حالانکہ ان کی زندگی کے اور بھی پہلو ہیں۔ وہ ایللی کے محبت دار باپ ہیں اور اس کی ترقی کے لئے اپنی بساط بھر سب کچھ کرتے ہیں۔ وہ گھر کے اپنی حد تک اچھے خاصے منظم بھی ہیں اور عام انسانی فرائض کی ادائیگی میں کوئی خاص کوتاہی نہیں کرتے ہیں۔ مگر زیادہ تر ان کا ٹین کے سپاہی والا پہلو ہی سامنے آتا رہتا ہے اور بڑی دالمانہ دلچسپی کے ساتھ وہ عورتوں کی فتح پر فتح حاصل کرتے ہیں۔ ایسے ہیرو کی طرح مصروف نظر آتے ہیں۔ جس کا ایک اور ایک ہی مقصد حیات ہو۔ ان میں مجلسی زندگی کی جملہ صلاحیتیں بھی موجود تھیں۔ انہیں لکھنے سے عشق تھا عشق۔ یہ عشق گھر کا حساب اور پیدائش اور موت کی تاریخوں کے نوٹ کرنے پر محدود تھا۔ ایک جزل رجسٹر کے علاوہ وہ گھر سے متعلق ہر فرد کا ایک رجسٹر کھولے ہوئے تھے۔ پھر ان کے کردار میں روپے پیسے کی احتیاط کا پہلو بے حد اہم تھا۔

حتیٰ کہ وہ عورت پر روپیہ خرچ کرنے کے قائل نہ تھے اور ان کا خیال تھا کہ عورت کو تسخیر کرنے کے لئے سب سے ضروری چیز وعدے ہیں روپے کا تصرف نہیں۔ ان کا ایمان تھا کہ عورت کی خوشی حقیقت سے تعلق نہیں رکھتی۔ بلکہ محض تخیل سے وابستہ ہے اور اسے روپے پیسے جیسی ٹھوس چیز سے کیا تعلق۔

ان کے کردار پورے طور پر پہلو دار (ROUND) کرنے کی مفتی صاحب کو شش کرتے

ہیں اور ہمیں یہ محسوس کرا دیتے ہیں کہ ان کی زندگی کے سب ہی انسانی پہلو میں اور ہرگز کر یکچہر نہیں کے جاسکتے مگر ان کی جنسی زندگی کے مناظر ہمارے سامنے آتے رہتے ہیں۔ ہر ایک منفرد، نیا اور نہایت درجہ دلچسپ اور ان کے کردار کی تمام زندگی اس بات میں سمٹ آتی ہے۔ عورت دیکھتے ہی یہ ٹین کا سپاہی کس طرح زندہ ہو جاتا ہے۔ کس ہوشیاری سے عورت کو تسخیر کر کے اپنے مخصوص کمرے میں لے جاتا ہے۔ یہ کمرہ ایک قلعہ ہے جس میں پکارے جانے پر بھی ایللی کو داخل ہوتے ہوئے براڈر لگتا ہے کیونکہ وہاں ہر دقت رجسٹر پر علی احمد کے قلم چلتے رہنے کے علاوہ کسی جنسی حرکت کے ہوتے رہنے کا بھی امکان ہے جس کو راز میں رکھنا رسم دنیا ہے۔

غرض علی احمد کا سارا قصہ اور اگر سارا نہیں تو اس کا اہم ترین اور دلچسپ ترین حصہ ان کی مختلف عورتوں کو دون کو بٹے کی طرح تسخیر کرنے کے واقعات کا احاطہ کرتا رہتا ہے۔ یہ واقعات بہت ہیں اور ہر ایک کو بڑی تفصیل کے ساتھ بیان کیا گیا ہے۔ اس لئے ان میں سے کسی کا اقتباس کرنا طول عمل ہے اور ان کا خلاصہ کرنے سے ان کی زندگی ہی ختم ہو جاتی ہے۔ ان میں ایللی بھی اسی طرح شریک نظر آتا ہے۔ جیسے ڈون کو بٹے کے سات ساکو پازا مردانہ کے یہ دونوں کردار یورپ کی تمام ناول نگاری میں ڈکنس کے سربیکو اور سام ویلر تک ماحول کے حساب سے روپ بدل بدل کر آتے رہے ہیں۔ مفتی صاحب کے دھیان میں بھی وہ آفاقی اور دائمی ٹائپ ہیں اور ”علی پور کا ایللی۔“ میں وہ علی احمد اور ایللی کے ذریعہ پنجاب کے اس علاقے سے متعلق ہو کر جو ناول کا مخصوص ماحول ہے پیش ہوتے ہیں۔ علی احمد ہر قسم اور ہر طبقہ کی عورت کے آتے ہی ڈون کو بٹے کی طرح اپنا بھلا تان کر کھڑا ہو جاتا ہے اور ایللی ساکو پازا کی طرح اس کی بیدلی سے مدد میں مصروف نظر آتا ہے۔ گھریلو لڑکیاں جیسے سارا صبورہ و نندار عورتیں جو بیویاں بن کر رہنا چاہتی ہیں اور رہ جاتی ہیں۔ کیسیاں جو وقتی تعلق ہی کو کافی سمجھتی ہیں۔ ایک ہندو عورت جو علی احمد سے تعلق تو کر لیتی ہے مگر اس کے یہاں کا پانی نہیں پیتی اور ایللی کو اس کے لئے کنوئیں سے پانی نکال کر ایک بوتل میں بھر کر لانا پڑتا ہے۔ سب ہی ان کے دائرے میں آتی ہیں اور ان سے دم کے دم میں تسخیر ہو جاتی۔ اپنے سے رشتہ کی عزیز کی جوان بیوی شہزاد بھی ان کی توجہ کا مرکز ہو جاتی ہے اور وہ اس سے جس طرح لطف لیتے ہیں اس کا منظر بھی عجیب ہے وہ کھل کھلا کھل کھلا گلوٹ کی ہنسی ہنستے ہیں اور شہزاد کا نام لیتے جاتے ہیں۔ خیر ان کا وار خلل جاتا

آتے ہی وہ ہر شخص کے لئے حسن و ناز کا عجیب کرشمہ ہو جاتی ہے۔ مگر ایلی اس سے سب سے زیادہ متاثر نظر آتا ہے۔ جسے اس کے حسن کی ہر ہر ادا رومانیت کا مظاہرہ نظر آتی ہے۔ اس کی چال چہم سے آجائے۔ اس کا دوپٹہ اوڑھنے کا انداز اس کے ماتھے پر قل۔ اس کے گورے گورے کھلے بازو۔ اس کے چھوٹے چھوٹے سبک مرمر کے پیر۔ اس کا لگاؤ اس کی بے نیازی۔ وہ چیز جسے محلے والے بے شری کہتے ہیں۔ اور اس کی بے پناہ ذہانت جس کی بنا پر وہ سب کے باوجود ایلی سے شوخی کرنے کا ہمانا نکال لیتی ہے بار بار بیان ہوتا ہے اور یہ سب ایک سچے عاشق کے نقطہ نظر سے جس کی بنا پر اس میں حد درجہ کا حسن بچنے لگتا ہے۔ مفتی صاحب شہزاد کو دنیا کی حسین ترین چیز کی طرح پیش کر دیتے ہیں۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایلی کے تاثرات ہی کی ترجمانی نہیں کر رہے ہیں۔ بلکہ شہزادے انہیں خود ویسا ہی دل تعلق ہے۔ جیسے ایلی کو تھا۔ وہ ساری ناول ان کے تجربہ کی چیز ہے ہی مگر اس تمام تجربہ میں جس چیز نے ان کے دل کو سب سے زیادہ چھوا ہے اور جس چیز نے ان کے تخیل کو سب سے زیادہ آتیا اور روشن کیا ہے وہ شہزاد یا شہزاد کی طرح کی کوئی محبوبہ ہے۔ ایلی کے شہزاد سے بڑھتے ہوئے تعلقات کی نفسیاتی تحلیل اس طرح ہوتی ہے کہ قاری کو وہ اپنا خود کا حال معلوم ہونے لگتا ہے۔ یہی کردار نگاری کا کمال ہے اور ان تمام معاملات میں حد سے زیادہ واقفیت کے ساتھ جو رومانی پیچیدگی تعجب پیدا کرتی رہتی ہے اس کے انکشاف میں مفتی صاحب کردار نگاری کے اعلیٰ ترین وجہ پر پہنچ جاتے ہیں۔ کتاب کے وہ مقامات جن میں شہزاد چہم سے آجاتی ہے عجیب طرح روشن اور دلکش ہو جاتے ہیں۔ ان کو بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ اور تکرار کے باوجود ان کا لطف کم نہیں ہوتا۔ شریف کی اجازت سے پہلے پہلے ایلی کو چائے پر بلائے آتا۔ پھر اکیلے میں ایلی سے بے باک لانا۔ مختلف ملاقاتوں میں ایک وقت اتنا قریب اور اس وقت اتنا دور ہو جانا عجیب کرشمہ قدرت کی طرح آنکھوں کے سامنے پھرتا رہتا ہے۔ ایلی کے عشق میں جسمانی محبت کو دخل نہیں ہے۔ ایسی محبت سے اسے اپنے باپ کے معاشقوں کی وجہ سے نفرت ہو چکی ہے۔ اور قاری بھی شہزاد کے جسمانی تاثرات کے باوجود اسے آسانی چیز ہی کی طرح چاہنے لگتا ہے۔ وہ اسے قبول بھی کرتی ہے مگر نالتی بھی ہے۔ وہ اسے ستاتی بھی رہتی ہے۔ اس کے گلاں کو سلاتی ہے۔ اس کے چنگی بھی لے لیتی ہے۔ مگر وہ شادی شدہ عورت ہے اور اپنے کو پسپا نہیں ہونے دیتی۔ ناول کا وہ سین جس میں ایلی بند بیٹھک میں چھپا بیٹھا ہے اور یہ انتظار کر رہا ہے۔ شہزاد وہاں آئے تو اس پر حملہ آور ہو شہزاد

مگر ان کی جنسی فطرت ایسی خوبی سے سامنے آ جاتی ہے کہ جس کی مثال ملنا نامکن ہے۔ مفتی صاحب نے جس تفصیل سے اور جتنے جزئیات کے ساتھ ان کے حالات بیان کئے ہیں وہ کردار نگاری کے لئے بڑے ضروری ہیں۔ خاص طور سے مزاحیہ کردار نگاری کے لئے ٹیکسپیر نے فلاساف کو پورے طور پر جمانے کے لئے ایک نہیں تین تین ڈرامے لکھے۔ ڈکنس نے پکوک کو پر اثر بنانے کے لئے ہزار صفحے کے قریب کالے کئے۔ ہمارے یہاں سرشار کا خوبی بھی اب تک اردو کا سب سے زیادہ مزاحیہ کردار اسی وجہ سے ہے کہ وہ ہزار و صفحوں پر بار بار آتا ہے۔ علی احمد خوبی سے تو کم ہی جگہ گھیرتے ہیں اور اس سے کہیں زیادہ پہلودار اور واقعاتی ہیں۔ وہ اپنے ماحول کے عظیم مضحک نمائندہ ہیں اور آفاقی مزاح کے بھی نمائندہ ہو جاتے ہیں۔ اگر ہم یہ کہیں کہ اردو ناول نگاری میں ان سے بہتر مزاحیہ کردار اب تک نہیں پیش ہوا تو غلط نہ ہو گا۔

”علی پور کا ایلی۔“ کا کردار نگاری میں دو سرا اہم شاہکار شہزاد ہے۔ یہ حسن جوانی اور زندہ دلی کی صورت ہے اور حسین عورت کی بیباکی اس میں عجیب و غریب کرشمہ دکھائی ہے۔ اس کا سب میں پہلے ذکر شریف سے اس کی شادی کے سلسلے میں آتا ہے۔ اس نے شریف پر تھیلی میں بند مینڈک پھینکا شریف بیان کرتا ہے۔

واقعی وہ شہزادی ہے۔ اسم با سمنی ہے۔ مجھے چھپ چھپ کر دیکھنے کے بعد ایک روز وہ مکان کی دلیز سے باہر آگئی اور میرے روبرو اس نے ایک مینڈک کے ذریعہ اظہار محبت کر دیا۔
— اس نے مینڈک کو ایک تھیلی میں ہی رکھا تھا اور جب میں سو رہا تھا تو وہ تھیلی میرے منہ پر پھینک دی اور ڈر کر اٹھ بیٹھا اور وہ ہنسنے لگی۔

اور پھر ایلی کی نگاہوں تلے ایک شوخ حسینہ آکھڑی ہوئی اور پھر شادی میں رخصتی کے بعد ریل کے ڈبے میں ایک مونگیا گھڑی اسے دکھائی دیتی ہے۔

”مونگیا گھڑی میں جنبش ہوئی دو سفید خون میں بھیکے ہوئے ہاتھ ایلی کی طرف لپکے تازہ خون کی لوکا ایک رپلا آیا۔ ایلی بھاگنے کی سوچ رہا تھا۔ کہ گھٹسری کے پٹ کھل گئے دو گلابی جھیلیں جھلکیں جن میں سیاہ گلاب ابھر رہے تھے۔ مٹلی ہیر ہونیاں رینگ رہی تھیں۔ اور بالاخر ایک چمکدار تبسم اور ایلی یوں کھڑا تھا جیسے پتھر کا بن چکا ہو ڈبے کے دوسرے لوگ جھملا کر معدوم ہو چکے تھے۔

شہزاد کی کردار نگاری اس کے دوسرے لوگوں پر تاثر کے ذریعہ ہوتی ہے۔ آصفی محلہ میں

کو پورے طور پر سامنے لے آنے کا کمال ہے۔
دروازہ کھلا شہزاد اندر داخل ہوئی۔

ایلی بجلی کی تیزی سے اپنی جگہ سے نکلا اور لپک کر اندر سے کنڈی لگا دی۔ شہزاد نے ڈر کر ایک ہلکی سی چیخ ماری۔

کنڈی لگانے کے بعد وہ شہزاد کے روبرو کھڑا ہو گیا۔

ایک ساعت کے لئے وہ گھبرا گئی مگر اسے پہچان کر مطمئن ہو کر بولی۔ ”تم یہاں۔“ ایلی کی خاموشی اور اس کے وحشت بھرے انداز کو دیکھ کر وہ از سر نو گھبرا گئی۔ ”یہ سب کیا ہے؟“ وہ بولی ”تمہیں کیا ہو گیا ہے؟“

ایلی جواب دیئے بغیر اس کی طرف بڑھا۔

”پاگل ہو گئے ہو کیا۔“ وہ زیر لب چلائی۔

وہ سمجھتی تھی کہ ایلی اس پر حملہ کرنے والا ہے۔ اسے معلوم نہ تھا کہ دراصل وہ اپنی شدید کمزری کی خفت مٹانے کی ناکام کوشش کر رہا ہے اور اپنا اصلی روپ چھپانے کے لئے اس نے شیر کی کھال پہننے کی مضحکہ خیز کوشش کی ہے۔

”خدا کے لئے۔“ وہ چلائی۔ ”ہٹ جاؤ۔ یہ کیا دیوانگی ہے۔“

”وہ چپ چاپ آگے بڑھتا گیا۔“

”ضرور تم پاگل ہو گئے ہو۔“ وہ بولی۔ ”تم اپنے حواس میں نہیں ہو۔“

”ہاں۔“ ایلی نے بھیاںک آواز میں جواب دیا۔ ”نہیں ہوں۔“

”ایلی کوئی سن لے گا۔ دیکھ لے گا۔ پاگل نہ بنو۔ وہ چلائی ”پاگل نہ بنو۔ پاگل نہ بنو۔“

ایک رتکین دھندلا کا ایلی کے قریب تر آ گیا اور قریب اور وہ دیوانہ وار اس کی طرف بڑھتا گیا۔ اس کے ہونٹ شہزاد کا خون چوسنے کے لئے جو تک کی طرح آگے بڑھے۔ ہاتھ بازو منہ سر جسم وہ دیوانہ وار اس کے جسم کا ایک ایک حصہ چوسنے لگا۔ پہلے تو شہزاد نے اپنے آپ کو اس کی گرفت سے چھڑانے کی کوشش کی پھر وہ تھک کر۔ ہار کر ایک لاش کی طرح میز پر گر پڑی۔ بھیاںک خاموشی طاری ہو گئی۔

ایلی نے محسوس کیا جیسے اس کی وحشت ختم ہوئی جا رہی ہو۔ اس نے دیوانہ وار بھیٹی میں نیا ایندھن دھکیلنے کی کوشش کی۔ چرا چرا۔ ریشی کپڑے کے پھٹنے کی آواز آئی۔

”ایلی پاگل نہ بنو۔“ ایک بار پھر مرمریں جسم کے اس تودے میں حرکت ہوئی ”پاگل نہ بنو۔“ مدھم آواز میں مبہم سا احتجاج دیکھ کر وہ اور بھی بھڑکیا۔

دھپ — ایک ہوائی سی چھوٹ گئی اور معا ”گرد و پیش تاریک ہو گئے۔ اس نے محسوس کیا جیسے وہ ڈوب گیا ہو چاروں طرف اندھیرا تھا۔ گھور اندھیرا۔ خفت ناکامی کا گھٹا ٹوپ اندھیرا۔ خود ساختہ وحشت کا سارا ہاتھ سے چھوٹ چکا تھا۔ وہ دیوانگی ختم ہو چکی تھی اور اس کے عقب میں مصیبت اور شکست کے منفی احساسات کا ریلا اڑا آ رہا تھا۔ ایلی نے محسوس کیا۔ جیسے اس کے منہ میں گھاس کا ٹکڑا ہو۔ وہی ٹکڑا جو پورس اپنے منہ میں لے کر سکندر کے حضور میں حاضر ہوا تھا۔

اس نئی خفت کو مٹانے کے لئے ایلی مایک بار پھر آگے بڑھا اور دیوانہ وار شہزاد کے بند بند چومنے لگا۔ اور بالاخر تھک کر بچنے کی طرح اس کے قدموں میں سر رکھ کر گر پڑا۔ ”مجھے تم سے محبت ہے شہزاد مجھے تم سے۔“

اپنے پاؤں پر آنسوؤں کے قطرے محسوس کر کے شہزاد اٹھ بیٹھی اور اس کا بازو ایلی کی طرف بڑھا اور اسے تھکنے لگا۔

اس کیفیت میں کتنا اطمینان تھا۔ ایلی نے محسوس کیا جیسے ماں کا ہاتھ سرزنش کرنے کی بجائے معاف کر دینے کے بعد تھپک رہا ہو۔

ماں کا ہاتھ عجیب نفسیاتی اشارہ ہے۔ شہزاد عورت کے تمام منصب بڑی پیچیدگی کے ساتھ ادا کر رہی ہے۔ وہ ماں بھی ہے۔ بیوی بھی اور محبوبہ بھی۔ معشوقانہ انداز پوری بیباکی کے ساتھ اس میں شروع ہی سے دکھائی دیتے رہے۔ وہ ایک شخص کی قانونی بیوی بھی ہے اور بچہ پیدا کرنے میں زور خیز بھی کسی جا سکتی ہے۔ مگر ایلی کی طرف اس کا رجحان مادرانہ بھی ہے۔ ہمارے معاشرے کے لوگ عورت کے بابت دھڑے اچھی یا بری رائے دے دینے کے عادی ہیں۔ مفتی صاحب ان لوگوں سے کس قدر بالاتر ہیں اور عورت کی پیچیدہ اور غیر فطرت کا کتنا زبردست مشاہدہ رکھتے ہیں۔

شہزاد کا رویہ متضاد سوالات ایلی کے دل میں لاتا ہے اور ہم بھی ان سوالات میں پڑ کر تعجب کے عالم میں آ جاتے ہیں۔ سوال یہ اٹھتا ہے کہ کیا شہزاد ایلی سے محبت کرتی ہے۔ اس سلسلے میں وہی معاملہ سامنے آتا ہے کہ نہ اعتبار مجھے ہے نہ اعتبار انہیں۔ مگر یہ صاف ہے کہ شہزاد کی اس

زمانے میں جب ایللی چھٹی لے کر علی پور آتا ہے اور شریف بھی آ موجود ہوتا ہے حرکات سے محبت نکلتی ہے اور وہ اسے بڑی ذہانت سے بیباکی کے روپ میں چھپاتی رہتی ہے۔ وہ ایللی کو ڈھونڈھنے جاتی ہے۔ اور اسے گھیسٹ کر لے آتی ہے۔ اپنے شوہر کے سامنے ایک فرضی مجذوبہ کی باتیں کرتی ہے جن کا اشارہ اپنی طرف ہوتا ہے۔ وہ اس پردے میں صاف صاف عشق کا اظہار کرتی ہے۔ اور ایللی میں اس کی تصدیق بھی کر دیتی ہے۔ گھر میں اور محلہ میں ہر ایک کو شبہ ہے کہ وہ ایللی سے عشق لڑا رہی ہے۔ اور وہ اس عشق کو کبھی بیباکی میں اور کبھی زکوت کی باتوں میں چھپا لیتی ہے۔ اس کا چھم سے آجاتا۔ اس کا چھن سے آجاتا قیامت ہے۔ وہ وارفتہ بھی ہو جاتی ہے مگر اپنے کو سنبھالے رہتی ہے۔ وہ اپنے میاں کی افرنگی سے نفرت کا اظہار بھی کرتی ہے اور ایللی سے محبت کا بھی۔ اس کی محبت میں جنس کا مقام بھی سمجھ میں نہیں آتا۔ وہ اپنے کو اس سے بالاتر سمجھتی ہے اور پاک عشق کرنا چاہتی ہے۔ اس کے میاں سے ایللی رقاقت محسوس کرتا ہے۔ تو اسے سمجھاتی ہے کہ جسمانی تعلق کچھ نہیں ہے۔ کئی بار وہ کہہ دیتی۔ ”تم مجھے سمجھے کیا ہو۔“ تم مجھے نہیں سمجھتے۔ حقیقت میں وہ ایسا راز حیات ہے جس کو سمجھنا مشکل ہے مفتی صاحب بھی نہیں بتا سکتے کہ وہ شوخ تند خو کیا ہے۔ مگر وہ ایسا کرشمہ ہے۔ جسے انہوں نے محسوس کیا ہے اور وہ ہمیں محسوس کرانے میں پورے کامیاب ہیں۔ ایللی اس کے پاس سے چلا جاتا ہے۔ دوسری غورتوں کی طرف متوجہ ہوتا رہتا ہے مگر وہ اس کے دل و دماغ میں ایسی بس گئی ہے کہ چھن سے تصور میں آ جاتی ہے۔ وہ اپنے شوہر کے ساتھ بھی کامیاب زندگی گزار رہی ہے۔ گھر کے ہر کام میں فرد ہے اور دھڑا دھڑپے بھی ہو رہے ہیں۔ ایللی سے ملاقات ہوتی رہتیں ہیں۔ کبھی نیاز اور آخر میں اس چھ پنوں کی مٹاؤ سے کنوارا ایللی شادی کر لیتا ہے۔ ایللی نوکر ہے اور وہ اس گھر کی ہی نہیں دل کی بھی شہزادی بنی رہتی ہے۔ شادی کے بعد وہ دھیمی پڑتی جاتی ہے۔ سخت بیمار بھی ہوتی ہے مگر ہومیوپیتھ کی دوا سے مرنے سے بچ جاتی ہے۔ مگر اپنی شریف سے لڑکی کے بارے میں اس کا ایللی سے جھگڑا ہوتا ہے۔ وہ بالکل دوسری چیز ہے ایللی اس سے الگ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمارا دل بھی اس کی طرف سے پھر جاتا ہے۔ آخر میں وہ دق ہو کر مر جاتی ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ اسی قیامت کے حسن پر پانی پھر گیا۔ شہزاد کے ارتقاء کے سلسلے میں مجھے ناول نگار کی حیثیت سے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر اس کے آخری دور کا کردار نہ دکھایا جاتا تو حسن اور خوبی کی مکمل تصویر ہمارے تخیل پر ثبت رہتی۔ ٹولسٹوئے نے انا کارینہ کو اس درجہ پر پہنچنے سے

پہلے ہی مار ڈالا۔ فلا بیر نے میدم بواری کے ساتھ بھی یہی کیا۔ مگر مفتی صاحب بالکل رومانی فنکار نہیں ہیں۔ وہ کامل ر۔ لمٹ ہیں۔ وہ اس حسین مجسمہ کو رفتہ رفتہ مٹا بھی دکھاتے ہیں اور اس بات کی پرواہ نہیں کرتے کہ فنکار کو کچھ چیزیں چھوڑ بھی جانا چاہئے۔ بہر حال جس حسن و خوبی سے انہوں نے شہزاد کو پر اثر بنایا ہے وہ ان کے تجربہ کا اور اس کو نہایت کامیابی سے پیش کرنے کا حق ہے۔ اردو ناول نگاری کی وہ سب سے زیادہ حسین اور واقعیاتی ہیروئن ہو جاتی ہے۔ وہ پنجاب کے حسن و کرشمہ کا اشارہ ہے۔ وہ ہر کرشمہ ساز عورت کا اشارہ ہے۔ وہ میکشپرس کی کلیوہا ترا کو مگر کی میلانات۔ ٹولسٹوئے کی انا۔ فلا بیر کی ایماء اور ہر عظیم ہیروئن کے ساتھ برابر کا مقابلہ کرتی ہے۔ اردو کی بساط ہی کیا ہے — وہ ہماری ناول نگاری میں سب سے بڑا فنی شاہکار ہے۔

(۴)

مگر ناول کی ریڈھ کی ہڈی۔ روح رواں اور جان ایللی ہے اور مفتی صاحب اسی کی طرف خاص طور سے متوجہ ہیں۔ دوسرے کردار اس کے ضمن میں آتے ہیں اور اس کی طویل اور وسیع سرگزشت کی سطح پر چھوٹے چھوٹے نقوش بنا کر چلے جاتے ہیں۔ ان نقوش میں علی احمد شہزاد کے نقوش زیادہ حصہ گھیرتے ہیں۔ ایللی کے کردار واضح کرنے کے لئے ہی ساری ناول لکھی گئی اور اس کو مفصل طور سامنے لانے کے لئے پوری ناول کے خلاصے کی ضرورت ہے۔ اسی کے بابت پیش لفظوں میں مفتی صاحب نے اظہار خیال کیا ہے۔ ان کی رائے میں ایللی ایسا کردار ہے تمام تجربے اور تعلیم کے باوجود نہیں بدلتا۔ جس کے خیالات اور جذبات میں ہمیشہ کشمکش رہی جس کی بنا پر وہ اپنا کوئی کردار نہ بنا سکا۔ دوسرے الفاظ میں وہ ہر اخلاقی اور نفسیاتی معیار سے بالکل بے کردار شخص ہے مگر پھر بھی وہ مستقل حقیقت ہے۔ اسے پنجاب کے اس خطہ کا نمائندہ کہا جاسکتا ہے جس کا مرکز علی پور ہے اور جس کا دائرہ امرتسر اور لاہور تک بھی جاتا ہے۔ وہ دلی اور بمبئی میں بھی مقیم رہتا ہے مگر اپنی مخصوص پراسرار صنعت نہیں کھوٹے۔ لیلہ پنچھی جو پانی میں ڈبکیں لگاتا ہے مگر پھر چھاؤں کا توں خشک ہو جاتا ہے۔ شاید بلکہ یقیناً ”ایسے لوگ کسی خاص جغرافیائی علاقہ سے مخصوص نہیں کئے جاسکتے۔ شاید بلکہ یقیناً“ ہر شخص کے اندر باوجود شدید اختلاف کے ایک ایللی چھپا ہوا رہتا ہے۔ وہ معمولی نہایت ہی معمولی ہستی ہے اور اسی لئے نہایت درجہ معمولی ہے۔ ہمارے تصور میں ایک معمولی انسان ہے مگر یہ معمولی انسان کہیں

ڈھونڈے نہیں ملتا اس لئے اسے ٹایاب کہہ دیتے ہیں۔ ایلی وہ ٹایاب معمولی انسان ہے۔ مفتی صاحب کو وہ مل گیا ہے اور اسے انہوں نے صفحہ ناول پر اتار دیا ہے۔ ناول کا شروع ہی سے یہ مقصد رہا کہ ناول انسان کی شکل دکھائے۔ میلڈنگ نے ٹوم جونس میں ایسا ہی کردار پیش کیا جو تمام ناول نگاروں کے لئے آج بھی ماڈل ہے۔ مفتی صاحب نے بھی ایلی میں ایسا کردار پالیا ہے شاید وہ خود ایلی میں اور ساری سرگزشت ان کی آپ بیتی ہے۔ ان میں ادیب کی اعلیٰ صلاحیتیں بھی ہیں جو ایلی میں نہیں ہیں مگر ان کی نظر اپنی ان صلاحیتوں پر ہے جو نہایت معمولی نہایت عام ہیں اور جن میں پنجاب کا ہر آدمی ہندوستان کا ہر آدمی اور دنیا کا ہر آدمی ان کا حصہ دار ہے۔ دوسرے ناول نگار جب اپنے کو اپنی ناول میں پیش کرتے ہیں تو اپنی مخصوص صلاحیتوں کو سامنے لاتے ہیں یا انکساری میں اپنے کو اصلیت سے گرا کر پیش کر دیتے ہیں۔ مفتی صاحب کو نہ بردھانے سے سروکار ہے نہ گھٹانے سے۔ ان کے ذاتی تجربہ سے جو آدمی محض آدمی نکلتا ہے وہ ہمارے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔ عموماً بڑا آدمی اور اس کا کوئی بڑا کام سنسنی پیدا کر کے عام آدمی کے لئے دلچسپ ہو جاتا ہے۔ ایلی میں کوئی بھی بڑائی چھو کر بھی نہیں گزری اور نہ اس نے کوئی بڑا کام ہی کیا۔ وہ نہایت معمولی گھر میں پیدا ہوا۔ نہایت معمولی ماحول سے زندگی بھر گزرتا رہا۔ احساس کمتری کے سوا اسے کوئی احساس نہیں ہوا۔ قوت ارادہ کا تو اس کے اندر سوال ہی نہیں اٹھتا۔ زمانے کے اثرات اسے جیسے بہاتے گئے وہ بہتا رہا۔ ٹوم جونس راسکل ہے مگر تجربہ اسے ہیرو بنا ہی دیتا ہے۔ جرمن ناولوں میں جنہیں ROMAN BUILDING کہا جاتا ہے ایک معمولی لڑکا ارتقاء کی منزلیں طے کرتا ہوا نظر آتا ہے اور آخر میں غیر معمولی مقام حاصل کر لیتا ہے۔ ایلی یوں بھی ارتقاء نہیں کرتا۔ وہ ڈبکی لگانے کے بعد پر جھاز کر ویسے کا ویسا ہی رہ جاتا ہے۔ اسے کسی قسم کی قدردنوں سے سروکار نہیں جو وہ اپنے کو بہتر بنائے۔ وہ مٹی میں گڑا ہوا پودا ہے جس کا قد اور سن مٹی اور پانی کے اثر سے بڑھ جاتا ہے مگر جس میں ذہنی یا اخلاقی شعور یا رجحان آنے کا سوال نہیں۔ باپ کا زور اگر نہ ہوتا تو وہ تعلیم بھی نہ حاصل کرتا۔ بسر اوقاف کی ضرورت نہ ہوتی تو وہ ملازمت بھی نہ کرتا۔ اگر وہ جائدار نہ بنایا گیا ہوتا تو وہ جیتا بھی نہیں۔ وہ ایسا آدمی ہے جس کو ہم چھوٹے ہی بڑا گھٹیا کہہ دیں گے مگر وہ اس حد سے زیادہ گھٹیا پن کی وجہ سے نہایت درجہ دلچسپ ہو جاتا ہے۔

مفتی صاحب کے ہم وطنوں سے یعنی لاہور اور امرتسر کے جوار کے لوگوں سے ملنے تو ان

میں ہر شخص ہر شریف خاندان اوسط طبقہ کا فرد ایلی معلوم ہو گا۔ ایک قصباتی ماحول کے ایک خاص گھر میں پلا ہوا۔ والد معمولی ملازمت پر رہے ہوں گے مگر مستعد اور کام میں چوکس ہوں گے جس کی وجہ سے اس کی زندگی ایک معمولی دھڑے پر لگ گئی ہو گی۔ بچپن کھیل میں یا گھر کے معمولی کام بدلتی سے کر آنے میں گزرا ہو گا۔ زبردستی اسکول اور کالج بھی گیا ہو گا۔ اور کسی نہ کسی طرح تعلیم پٹا کر معمولی ملازمت پر بھی آگیا ہو گا۔ رسمی طور پر اس کی سنگتی اور شادی بھی ہو گئی ہو گی۔ اگر اس میں غیر معمولی بات ہو گی تو وہ اس کی عورتوں کی طرف توجہ سے نمایاں ہو گی مگر یہ بات بھی غیر معمولی نہ کہی جاسکے گی کیونکہ اس کے خاندان میں ہر شخص اور اس کے ساتھیوں میں ہر شخص کو اسی کی طرح کی جتنی دلچسپی رہی ہو گی۔ عشق و حسن کا معیار اگر پست نہیں تو اعلیٰ بھی نہیں ہو گا۔ زندگی سے لگاؤ بھی جبلی سطح کا ہو گا اور اس میں ان خاص جذبات کے زور کی کوئی گنجائش نہ ہو گی جو اعلیٰ انسانیت سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسے ہم اچھا آدمی نہیں کہہ سکتے تو برا بھی نہیں کہیں گے۔ اس میں خود غرضی بھی واجب و اجبی ہو گی۔ وہ ایک گھٹیا سا معلوم ہو گا جو زمین پر اپنا جسم بڑھاتا گھٹاتا ہوا نظر آئے گا۔ وہ اچھائیوں اور برائیوں میں پڑنے کا برابر اہل اور نااہل ہو گا۔ ہم خالص جذباتی EVERYMAN کی تصویر ہے۔

اس کے حالات بھی ایسے ہی معمولی ہیں صرف اس فرق کے ساتھ کہ وہ ان شہریوں اور ان قصبوں اور ان گاؤں سے مخصوص ہیں جہاں ایلی جاتا ہے۔ اس کی لاتعداد مردوں اور عورتوں سے ملاقاتیں ہوتی ہیں۔ ان میں وہ سب سے مختلف اور اس طرح مختلف نظر آتا ہے۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ ہر شخص کے ساتھ تو لے جا رہا ہے اور اس کا وزن سب سے کم نکل رہا ہے اور ناولوں کے ہیرو اس لئے دلچسپ ہوتے ہیں کہ وہ وزن میں سب سے کچھ نہ کچھ زیادہ ضرور نکلتے ہیں۔ ایلی کی دلچسپی ہی ہے کہ وہ ہر کام میں نااہل ثابت ہوتا ہے اور ہر شخص سے ہر بات میں کم نظر آتا ہے۔ یہ ایک عجیب راز ہے جس کو مفتی صاحب نے دریافت کر لیا ہے۔ اور اس کی بنا پر ہم ایلی کو حد سے زیادہ دلچسپ پاتے ہیں۔ اس کی باتیں حماقت میں مگر ہم کو کن پر ہنسی نہیں آتی۔ نہیں وہ ہر گز احمق نہیں ہے۔ اس میں کچھ بھی نہیں ہے۔ اس کا کوئی خاص تاثر بھی نہیں ہے۔ مگر پھر بھی ہم اسے سپاٹ نہیں کہہ سکتے۔ اس میں بے پناہ سادگی ہے اور خلوص ہے۔ وہ عکرم بازی کر ہی نہیں سکتا۔ وہ کسی کو برا نہیں سمجھتا۔ وہ مردم شناس بھی نہیں ہے مگر کسی کے دھوکے میں بھی نہیں آتا۔ شہزاد کے سلسلے میں اس کے اندر ڈھلاہٹ کے باوجود ایک عزم اور

استقلال آجاتا ہے اور وہ اس سے ہر مخالفت کے باوجود شادی کر لیتا ہے یوں تو اسے دل پھینک کہہ سکتے ہیں مگر شہزاد سے اس کی محبت میں استقلال ہے۔ وہ کسی سے جھگڑتا نہیں مگر شہزاد ہی سے اس کا جھگڑا ہو کر رہتا ہے شہزاد سے عشق اور آخر میں شہزاد سے جھگڑا ہی اسے جذباتی سطح پر نہایت درجہ معمولی رویہ کے انسان سے اوپر لے آتے ہیں۔ آخر میں اس کے ملاقاتیوں کا دائرہ وسیع ہوتا ہے اور اس کی ”ذہین“ قسم کے لوگوں سے ملاقاتیں بھی ہوتی ہیں جن میں وہ کچھ زیادہ مستقل کردار دکھائی دیتا ہے۔ اس کے مذہب کے بابت مفتی صاحب بتاتے ہیں۔

غالباً اس کی وجہ یہ تھی کہ اگرچہ وہ بے حد ڈرپوک تھا لیکن اللہ پر اس کا ایمان ڈر کی بنیاد پر قائم نہ تھا۔

اللہ کا تخیل جو اس کے دل میں قائم ہوا تھا۔ وہ جنہیں نحینز کی فلکیات ہائوس کیکلے کے سائنس کا مجر، سے متعلق مضامین برٹینڈرسل کے فزیکس سیتا کے جذبات کاؤنٹ کر۔ مکین کے مشاہدات اور ایچ۔ جی ویلز کی سائنٹیفک فکشن کتابوں سے اخذ تھا۔

ڈر کے بجائے اس کا دل اللہ تعالیٰ کی عظمت کے جذبات سے معمور تھا۔

ہندویت اور عیسائیت کے مطابق اللہ کی محبت کا تخیل اس کے لئے قابل قبول تھا۔ اسلام کے مطابق تو صرف اللہ ہو اللہ ہو تھا، عظمت عظمت عظمت محبت کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا اور اس بے پناہ عظمت کا اسے کچھ کچھ احساس تھا۔ جو اس نے مغربی علماء کی تحریروں سے اخذ کیا تھا اسلام سے نہیں لیکن اس کی جذباتی دنیا ذہنی خیالات سے دور اپنے ہی رنگ میں بستی تھی۔

معلوم ہوتا ہے کہ ایللی ویسا معمولی نہیں ہے جیسا کہ وہ اپنی سرگزشت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اس کی ذہنی دنیا بھی ہے اور وہ جدید ترین خیالات سے ہم آہنگ بھی ہے مگر وہ ایسی واقعاتی دنیا میں ہے جہاں وہ محض انسان ہی ہو کر رہ گیا ہے۔ ایللی کی اور اس دنیا کی ذہنی اور کرداری سطح ایک ہے۔ اس لئے وہ نمائندہ اور نارمل انسان ہے۔ آخری دور میں وہ معمہ بھی ہو جاتا ہے۔ اور ہمیں خیال آتا ہے کہ کب وہ معمہ نہیں تھا۔ سب سے بڑا معمہ یہی ہے کہ ہر چیز صاف اور معمولی ہو مگر پھر بھی وہ ہمیں ہر قدم پر تعجب میں ڈالے اور معمہ سے زیادہ معمہ ہوتی جائے۔ ایللی اپنی تمام سادگی کے باوجود اور سادگی کی وجہ ہی سے ایسی ہی چیز ہے۔

سطحی نظر سے دیکھنے پر یہ محسوس ہو گا کہ یہ ایللی کی ظاہری سرگزشت ہے اور اس طرح

کردار نگاری کے سلسلے میں بیسویں صدی سے پہلے ہی کی راہ پر چل رہی ہے مگر غور سے دیکھنے کی ایسی ضرورت نہیں اور یہ معلوم ہوتا ہے کہ جدید ناول کی طرح یہ مرکزی کردار کی اندرونی زندگی کو بھی ہر قدم پر سامنے لاتی ہے۔ ظاہرہ واقعات کے ساتھ ساتھ ایللی کی اندرونی دنیا بھی سامنے آتی رہتی ہے۔ شروع ہی سے اس کا اپنی سوتیلی ماں صفیہ کی طرف رد عمل اور اس کے مہندی لگے ہوئے ہاتھوں سے اسے نفرت کا بھی تجزیہ ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد کا عشق ایللی کی اندرونی یا ذہنی کشمکش کا اظہار ہے وہ گوگو کا عالم وہ یقین اور بے یقینی کا چکر جو اس کے دماغ میں چل گیا ہے پوری نفسیاتی تخیل کے ساتھ بیان ہوتا رہتا ہے۔ شہزاد اس کے سر پر بری طرح سوار ہوتی ہے۔ اور جب وہ دوسری عورتوں کی طرف بھی متوجہ ہے اور ان سے عشق بھی لگا ہوا ہے۔ تو بھی شہزاد چھن سے اس کے سامنے آتی رہتی ہے۔ اس کی اندرونی اور بیرونی دنیا میں ساتھ ساتھ چلتی نظر آتی ہیں اور اس کی کردار نگاری اس طرح وہ سطحوں پر کردار نگاری کی مثال ہے جیسی جدید ترین ناولوں میں خاص طور پر تیس جوائس کی ”جوئیس“ میں کہتی ہے۔ مفتی صاحب INTERNAL MONOLOGUE کے فن سے بھی واقف ہیں اور اسے بھی بڑی چابک دستی سے برتتے ہیں۔ اپنے افسانوں میں انہوں نے جدید نفسیات کو افسانہ سے ہمکنار کرنے کی کوشش کی ہے مگر اس سلسلے میں کمال پر ایللی کے کردار کو واضح کرنے میں پہنچے ہیں۔ مر جانے کے بعد بھی شہزاد ایللی کے لئے ایک زندہ حقیقت ہے جو اسے جگہ جگہ پر دکھائی دیتی ہے۔ جب وہ تقسیم کے نتیجے میں ترک وطن کر کے بھاگ رہا ہے۔ تو اس کے تصور میں شہزاد اسی طرح آتی ہے۔

شہزاد کھڑکی سے چلا کر بولی۔ ”میں رکاوٹ تھی۔ میں دور ہو گئی۔“ وہ بولی۔ ”ایللی نیا جیون جیو۔ نیا جیون جیو۔“

شہزاد کے بعد اس کی محبت کا ظاہری مرکز اس کا شہزاد سے لڑکا عالی ہو جاتا ہے۔ وہ بمبئی میں یہ سن کر کہ گورداس پور ہندوستان میں آگیا۔ پاگل سا ہو جاتا ہے۔ ہزار جتن کرتا ہے کہ امرتسر اور علی پور پہنچ جائے۔ تمام کوششیں ناکامیاب ہوتی ہیں۔ وہ تھک جاتا ہے۔

اس کی آنکھوں تلے عالی دونوں ہاتھ اٹھائے رو رہا تھا۔

پر مٹ دفتر میں وہ ایک کونے میں بیٹھا تھا۔ اس کی آنکھوں میں آنسو بھرے ہوئے تھے۔

”عالی عالی۔“ اس کے دل میں کوئی رو رو کر تھکا ہوا بچہ بلک رہا تھا۔

بہر حال ناول کے آخری صفحات میں یہ دوہری کردار نگاری بڑی فراوانی سے نمایاں ہے اور ناول کا خاتمہ یوں ہوتا ہے:- حضور حضور — ایللی کا دل دھک دھک کر رہا تھا۔

مفتی صاحب نے پیش لفظ میں اپنے فن کی طرف کوئی خاص اشارہ نہیں کیا۔ ناول میں ایک جگہ وہ دوستو فسکی کے ”برادر کارمازوف“ کا ذکر کرتے ہیں اور ہم کو محسوس ہونے لگتا ہے کہ ان کی کردار نگاری دوستو فسکی سے گہرے طریق پر متاثر ہے۔ ایللی کے کردار میں دوستو فسکی کے فن کا والہانہ پن اور فن سے بے نیازی ہے مگر وہ اپنے کردار کی تحلیل نفسی میں جدید ناول نگاروں کے لئے ماڈل ہے۔ مفتی صاحب بھی اس ماڈل پر چلنے میں پورے کامیاب ہیں۔ اور یہ کامیابی کسی ملک کی ناول میں بھی عظیم ہو سکتی ہے۔ اردو ناول نگاری میں تو یہ ایک مستحکم جھنڈا گاڑ دیتی ہے۔

(۵)

مجھے محسوس ہوا کہ اس ناول پر تنقید کرنے میں تنقید کے پر جل ہی نہیں گئے بلکہ جل کر راکھ ہو گئے اور وہ راکھ بھی اڑ گئی۔ اس کا رخ و اقصیت کی طرف ہے جو ناول کی جان اور و اقصیت بھی یہاں انگریزی اور فرانسیسی والے سے زیادہ روسی ناول کی تفصیل اور جزئیات میں گہری دلچسپی کے ساتھ برتی گئی ہے اور پھر جدید و اقصیت کی پیچیدگی یا پیچیدہ عالموں سے دلچسپی کا بھی خیال رکھا گیا ہے جس کی وجہ سے ناول کا ضخیم ہو جانا لازمی تھا اور اس دور میں ضخیم ترین ناول ہو بھی گئی ہے۔ مگر مفتی صاحب نے جو کمال دکھایا ہے اسے جانچتے وقت تمام اصول ٹوٹ جاتے ہیں اور پھر بھی یہ محسوس ہوتا ہے کہ یہاں ایک فن اپنی پور زندگی کے ساتھ موجود ہے اور اپنا تحلیل اثر جمانا چلا جاتا ہے۔ یعنی اس ناول میں وہ جادو ہے جو سرچڑھ کر بولتا ہے۔ میٹھو

آرنلڈ کا سب سے اہم اصول یہ تھا کہ ادب کو زندگی پر تنقید ہونا چاہیے۔ مگر ٹولسٹو کی ”اناکارینہ“ پر مضمون میں اسے اپنا اصول توڑتے ہوئے اس کی تعریف میں یہ کہا کہ یہ تنقید حیات نہیں ہے بلکہ ہو ہو حیات ہے۔ مفتی صاحب کی و اقصیت نگاری اور نفسیات نگاری کے بابت بھی ایسا ہی کچھ کہہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں زندگی کا نقشہ نہیں ہے جس کے حدود تاپے جا سکیں۔ جس کے تاثرات کے صحیح یا غلط ہونے کا اندازہ لگایا جاسکے۔ یہاں زندگی ہے زندگی ہی ہے اور مکمل زندگی ہے۔ مفتی صاحب اسے ”ڈھیر“ کہتے ہیں مگر یہ محض ڈھیر نہیں ہے اس میں ترتیب ہے مگر وہ ترتیب ہے جس کا اندازہ نہیں لگایا جاسکتا کیونکہ وہ ہو ہو زندگی کی طرح ہے

اور اسی طرح اپنے زور سے پڑھنے والے کو پسپا کر دیتی ہے۔ ہم یہ بھی کہہ سکتے تھے کہ وہ فنکاری میں ناکامیاب ہیں ان کا کوئی مقصد نہیں ہے اور وہ فضول کی بکواس کا ایک ڈھیر لگائے ہیں۔ مگر ان کی ناول کا منظر ہمیں یہ کہنے سے روک دیتا ہے بلکہ منہ بند کر دیتا ہے اور ہم اس کے خلاف کچھ کہنا نادانی مان لیتے ہیں۔ یہ ناول ہے۔ اس معنوں میں ناول نہیں جو ایک دلچسپ قصہ سنا کر ہمیں محفوظ کرتی ہے بلکہ اس معنے میں ناول کہ یہ ایک زندگی کی اور ایک گروہ کی زندگی کی مکمل تصویر ہے اور یہ تصویر خاص طور پر ایک مرکزی کردار کے ضمن میں لائی گئی ہے۔ اس میں وہ پھیلاؤ ہے اور جزئیات کی طرف وہ توجہ ہے جس کے برتنے میں روسی ناول نگار سب سے آگے ہیں۔ اس میں زندگی کا سا چڑھاؤ اور اتار ہے اور قصہ ہیرو کے بچپن سے شروع ہو کر ایک نئی زندگی کے آغاز تک جاتا ہے، اس کی کوئی نئی بندھی ہیئت نہیں ہے مگر وہ وسیع ہیئت کا تاثر ضرور دیتا ہے۔ یہ ایک عظیم دریا کی طرح ہے جس کا مخرج ایللی کا گھر ہے اور پھر وہ پھیلتا ہوا آصفی محلے، علی پور، امرتسر، لاہور تک جاتا ہے۔ وہ سارا خطہ جو گرداسپور سے لے کر لاہور تک ہے اس کی وسعت میں آ جاتا ہے۔ پھر یہ بھی تک پھیل کر سمندر کو بھی اپنے میں ملا لیتا ہے۔ اس کی سطح پر کثرت سے انسان پھیلے نظر آتے ہیں۔ جتنی وسعت بڑھتی جاتی ہے اتنی ہی انسانوں کی تعداد بھی بڑھتی جاتی ہے۔ کچھ انسان مرکزی ہو جاتے ہیں اور بار بار آتے رہتے ہیں۔ یہ ایللی کے قریبی عزیز ہیں۔ سب سے زیادہ ایللی خود ہے جس کو ہم اس سیلاب میں ہر جگہ ڈبکی کھاتے ہوئے دیکھتے ہیں۔ اس کو اس کا شناور کہنے کو جی چاہتا ہے مگر وہ شناور کی سی طبیعت اور مقصد نہیں رکھتا۔ وہ بہا چلا جاتا ہے سب لوگوں کی طرح کا ہے مگر سب سے مختلف ہے۔ وہ فرد بھی ہے مگر اس کی انفرادیت کی حد متعین نہیں ہو سکتی اور ہم اسے ہر جگہ اور ہر وقت محسوس ضرور کر لیتے ہیں۔ ناول میں بس وہی وہ ہے اور شناور تک اس کے ذہن کی پیدوار ہے۔

”یہ محسوس ہوتا ہے کہ مفتی صاحب اور ایللی ایک ہی شخص اور مفتی صاحب کے جاننے والے یہ تصدیق کرتے ہیں کہ ”علی پور کا ایللی“ ایک خود نوشتہ سوانح ہے۔ مگر میں سوال کرتا ہوں کہ کیا ممکن ہے؟ یہ کتاب تاریخ نہیں ناول ہے اور ناول میں اس کا مصنف اپنے کو ضرور پیش کرتا ہے مگر وہ پورا کا پورا اپنے کو اتار نہیں سکتا۔ نام بدلنے سے اور تحلیل کے دائرے میں آنے سے مصنف خود دو سرا آدمی ہو جاتا ہے۔ اس لئے ایللی اور مفتی صاحب ایک نہیں ہو سکتے اور ایللی تاریخ کا فرد نہیں بلکہ تحلیل کی تخلیق ہے اس لئے اس کی سرگزشت کتنا ہی واقعات کا

نقشہ ہو مگر وہ زندگی کی ایک نظریہ حیات کے مطابق اور ایک فنی نظر کے مطابق تعمیر ضرور ہے۔ علی پور کے آصفی محلہ کی سماجی اخلاقی قدریں ہیں۔ ان کا مذہب عالم اسلام ہے جو ہندوئیت اور تصوف سے متاثر ہے۔ ایلی اس مذہب پر اٹھایا جاتا ہے۔ مگر تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے وہاں سے بالاتر ہو گیا ہے۔ وہ توہمات میں عقیدہ کرنے سے انکار کرتا ہے۔ اسلام کا دینی درجہ پر اسے کوئی علم نہیں ہے مگر جدید یورپین فلسفیوں سے اس نے عظیم تصور خدا حاصل کر لیا ہے۔ وہ خدا کے ساتھ اخلاقی قدریں وابستہ نہیں کرتا مگر اس کی عظمت کا احساس رکھتا ہے۔ اس کے والد عورتوں کے شائق ہیں۔ وہ ان کی عیاشی کو دیکھ رہا ہے اور اسے عورت سے جسمانی تعلق سے نفرت ہو جاتی ہے۔ شہزاد کے حسن کا وہ گرویدہ ہو جاتا ہے اور اس کے دل میں اعلیٰ عشق اور پست عشق کے درمیان کشمکش ہوتی ہے۔ اور وہ شوہر والی چھ بچوں کی ماں سے شادی کر رہی لیتا ہے۔ اس کا ادب کی طرف دھیان ہے اور وہ اعلیٰ ترین شاہکار سے دلچسپی لیتا ہے اور آخر میں وہ صحابی ہو جاتا ہے۔ وہ کوئی بڑا کارنامہ نہیں پیش کرتا مگر فلم زدوں سے وابستہ نظر آتا ہے۔ اس میں احساس کسری کے باوجود ہمت اور استقلال بھی آ جاتا ہے۔ اسے سیاست سے کوئی غرض نہیں ہے مگر پاکستان بننے پر وہ خوش ضرور ہوتا ہے۔ اسے اپنے وطن سے لگاؤ ضرور ہے مگر وہ پاکستان میں آ جانے کو نیا جیون سمجھتا ہے۔ اس کے ذریعہ کوئی مستقل نظریہ حیات اس طرح سامنے نہیں آتا کہ خواہ مخواہ کو ٹھونس ٹھانس معلوم ہو مگر اس کا ایک جدید نظریہ حیات ضرور ہے۔ اس میں وقت ارادہ کی کمی صاف صاف نمایاں سہی مگر وہ اپنے ارادے کا پکا بھی ہے اسے اپنی طرح پر جو کچھ کرتا ہے وہ کر گزرتا ہے اور اپنے ماحول کی خلاف ورزی کی کوئی پرداہ نہیں کرتا۔ بات یہ ہے کہ اس کے نقطہ نظر کو مفتی صاحب نے بالکل خارجی کر دیا ہے اور کہیں تجریدی نہیں ہونے دیا۔ اس کے واقعات اور عمل نقطہ نظر سے اس قدر ہم آہنگ ہیں کہ واقعات ہی واقعات دکھائی دیتے ہیں اور نظریات بالکل چھپ جلتے ہیں یہ ڈرامہ نگاری اور ناول نگاری کی حد ہے۔ ٹیکسپر کے لئے کہا جاتا ہے کہ وہ اپنے کردار کو اس طرح پیش کرتا ہے کہ اس سے کوئی واضح نقطہ نظر نکال لینا ناممکن ہے۔ مفتی صاحب نے ایلی کو بھی اس طرح پیش کیا ہے کہ وہ اپنا اور اس کا نقطہ نظر بالکل چھپانے میں کامیاب ہو گئے ہیں۔

اسی طرح وہ تحقیق کے سلسلے میں بھی ہر فن کاری سے اپنی بے نیازی کا اظہار کرتے ہوئے اپنی ناول کو ایک ڈھیر کر دیتے ہیں یعنی فنکارانہ ترتیب۔ انتخاب ارتفع سے منہ موڑ لیتے ہیں مگر

اس ناول کے مختلف حصوں میں بیانات میں جو بہت کم ہیں اور مکالموں میں جو بڑی فراوانی سے لائے گئے ہیں زبردست ڈرامہ نگاری کا شعور نظر آتا ہے۔ ان کی افسانہ نگاری کی قوت اور اس میں مشق مسلم ہے اور بیان طویل چیز کو ربط دینے میں بھی کامیاب ہیں۔ وہ کسی فن کے تعلق نہیں ہیں مگر فن ان کے سامنے ہاتھ باندھے نظر آتا ہے اور وہ اس کا احترام کرتے ہوئے جدھر چاہتے ہیں ادھر اس کی باگ موڑ دیتے ہیں۔ وہ صرف ایک اصول کے قائل ہیں جو حافظ کے اس شعر سے ادا ہوتا ہے۔

ورہیں آئینہ طوطی منہم داشتہ اند آئچہ استاد ازل گفت ہلای گویم

مگر وہ ایسی طوطی ہیں جس کو استاد ازل نے ناول نگار ہونے کی صلاحیت دی ہے اور پھر شعور اور مشق سے اس صلاحیت کو آگے بڑھا کر وہ اس مقام پر آ گئے ہیں۔ وہ بے ساختگی سے اور ظاہرہ بے پردہی سے لکھتے چلے جا رہے ہیں۔ ان کے تجربہ کا دریا امنڈتا چلا آ رہا ہے اور وہ اسے بغیر زور لگائے ہوئے فن میں تبدیل کرتے چلے جا رہے ہیں۔ فن اپنی قدرتی جگہ لئے ہوئے ہے اور انگلی کے سیلاب میں ایسا چھپ گیا ہے کہ اس کی طرف توجہ جانا ممکن نہیں رہ گیا ہے۔ فنکاری مشکل کام ہے اور اس میں کامیابی کی داو دی جاسکتی ہے مگر فن کو چھپانا مکمل ہے اور مفتی صاحب اس مکمل پر پہنچ گئے ہیں۔ سطحی نظریہ یہ بھی کہہ سکتی ہے کہ ”علی پور کا ایلی۔“ میں کوئی فن نہیں اور اس کے مصنف نے فن سے بے نیازی کا اعلان بھی کر دیا مگر غور کی نظروں کو یہاں وہ فن نظر آئے گا جو بہت اوپر چلا جاتا ہے اور حقیقت کو اس طرح سامنے لاتا ہے جہاں فن کا ربول اٹھے۔

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی کچھ ہماری خبر نہیں آتی

آخر میں میں اس بات پر واپس آتا ہوں کہ ”اے آدم جی انعام نہیں دیا گیا۔“ ممکن ہے کہ اس بات پر پبلک سے شکایت ہو مگر اس سے انعام دینے والوں کی تالی کی طرف بھی اشارہ ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ وہ مصلحتوں کے ماتحت انعام دیتے ہیں اور اس کتاب کو کسی مصلحت سے انہوں نے انعام نہیں دیا ہو گا۔ اس بات کو طے کرنے والے ”نقاد۔“ ہوں گے اور میں ان کو یہی نہیں بلکہ ان کے اچھے اچھوں کو ناول پر تنقید کرنے کا نااہل قرار دے چکا ہوں۔ وہ ناول کا کوئی ذوق نہیں رکھتے اور اسے کچھ لگے بندھے اصولوں سے جانچنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ وہ ”علی پور کا ایلی۔“ کے ایسے اور بیچل شاہکار کو کیسے محسوس کر سکتے ہیں اور عام طور پر بھی

نقاد کسی نئے راہ کو سمجھنے کے اہل نہیں ہوتے بروست نے اپنی عظیم اور ضخیم ناول کے بابت کہا ہے۔ ”مجھے اس کی قدر کرنے کی نقاد سے کوئی امید نہیں ہاں ان صاحبان ذوق سے امید ہے جو بجائے اصولوں کے اپنے ادبی پرنیک لیتے ہیں۔“ ”آلار شر سے دو تان بارود۔“ کی ضخامت سے لوگ ڈر گئے ہمارے نقاد بھی اس کی ضخامت کی شکایت کرتے ہیں۔ جن لوگوں نے شکایت کی ان سے مل کے کہا۔ ”آپ کو پڑھنے کا شوق تو ہے ہی نہیں ورنہ ضخامت اس کے اور آپ کے درمیان حائل نہ ہوتی۔“ اصل بات یہی ہے کہ ہمارے پروفیسر نقاد کے لئے ادب لگائے بندھانے کا سودا ہے اور وہ جو طالب علم نکال رہے ہیں وہ بھی ان کے سے ہوتے ہیں۔ ”علی پور کا اہلی۔“ کو وہ مقبولیت بھی حاصل ہے جو آج دوسری ناولوں کو ملی۔ مگر مجھے یقین ہے کہ یہ آہستہ آہستہ لوگوں کے دلوں میں گھر کرتی جائے گی اور اس سے لوگ ناول کے آشنائے راز ہوتے جائیں گے۔ ممکن ہے کہ یہ ناول نگاری کے سلسلے میں مائل ہو جائے کیونکہ یہ اس سب آلائش سے پاک ہے جو فن و فکر کے بہانے ناول سے وابستہ کی جا رہی ہے۔ میں نے ایک کتاب ”ناول کیا ہے؟“ پچیس برس پہلے لکھی تھی۔ اس وقت تک ”علی پور کا اہلی۔“ وجود میں نہیں آئی تھی۔ اب اگر کوئی شخص مجھ سے یہ سوال کرے تو اس کا جواب میں یہ دوں گا ”علی پور کا اہلی کو پڑھ ڈالو معلوم ہو جائے گا کہ ناول کیا ہے۔ کیا ہونا چاہیے کہ وہ عظیم ناول کے دائرے میں آجائے۔“ حقیقت یہ ہے کہ کسی ناول میں ناول کی روح نہایت آزادی سے وسیع اور عظیم سفر طے کرتی نظر آتی ہے۔ اس دور کی ناولوں میں یہی اس کی انفرادی صفت ہے۔

مصنف کا نوٹ

اگرچہ علی پور کا اہلی ناول کی شکل میں لکھی گئی ہے لیکن دراصل یہ ممتاز مفتی کی خود نوشت آبِ بیتی کا پہلا حصہ ہے۔ اس کتاب کی واحد خوبی ہے کہ اس میں ہر واقعہ سچ سچ بیان کر دیا گیا ہے۔ اخلاق، ادب، روایت اور کلچر سے بے نیاز ہو کر۔ عبادت آرائی سے پاک بناوٹ سجاوٹ سے بے نیاز مجھے یقین تھا کہ اس کتاب کی کوئی ادبی حیثیت نہیں ہو سکتی، لیکن زبان دانوں اور ناقدوں نے اسے شرف قبولیت بخش دیا۔ یہ ان کی کرم نوازی ہے۔ اب اس خود نوشت کی تصدیق کے لئے مجھ پر لازم ہے کہ میں کتاب کے اہم کرداروں کے اصلی نام پیش کر دوں تاکہ حقائق کے متعلق تحقیق میں آسانی ہو۔

مصنف کے آبا شیخ فیروز ولی اور احمد راست قلم کے قلمی کتابوں سے اخذ شدہ کوائف

شہر بنالہ پاک و ہند برصغیر میں تقریباً ۷۶ طول بلد اور ۳۲ عرض بلد پر ۱۸۶۵ء مطابق ۸۶۹ھ بمطابق لودھی کے دور حکومت میں آباد ہوا سولہویں صدی عیسوی میں نواب شمشیر خان ۳ کروڑی ناظم علاقہ ماجھ دو آبہ جالندھرنے بنالہ میں مستقل رہائش اختیار کی اور اس شہر میں عالیشان عمارات، خوبصورت باغات وسیع تلاب تعمیر کئے اور یوں شہر کو فروغ ملا۔ خاندان مغلیہ کے دور حکومت میں بنالہ کو پرگنہ کی حیثیت حاصل تھی اور اس کا انتظام ایک کروڑی منصب دار کے سپرد شد سکھوں کے زمانے میں مہاراجہ رنجیت سنگھ کی بیوی مستب کور کی ولیدہ سدا کور اور مہاراجہ شیر

سنگھ عرصہ تک بٹالہ میں سکونت پذیر رہے اور مہاراجہ رنجیت سنگھ اکثر موقعوں پر بٹالہ آکر نواب شمشیر خاں کے بنوائے ہوئے تلاب کے قریب کئی روز متواتر قیام کرتے۔ برطانوی راج میں بٹالہ کافی عرصہ تک ضلع کا صدر مقام رہا اور بعد میں حکومت نے ضلع کا صدر مقام بٹالہ سے گورداسپور منتقل کیا اور بٹالہ کو تحصیل بنادیا۔

آزادی برصغیر اور تقسیم صوبہ پنجاب کے وقت ۱۹۴۷ء میں بٹالہ شہر کی آبادی پچاس ہزار سے تجاوز کر چکی تھی، شہر بٹالہ کی جنوبی فصیل میں دروازہ کلاں ہے جسے تقسیم پنجاب تک بڑا دروازہ یا ہاتھی دروازہ بھی کہا جاتا تھا۔ اس دروازہ کے اندر کچھ فاصلہ پر شہر میں شہل کی جانب ایک قلعہ نما محلہ منٹیاں تھا، جسے عام شیخاں حویلی بھی کہتے تھے۔ یہ محلہ ستمبر ۱۹۴۷ء تک خاندان منٹیاں بٹالہ کی اقامت گاہ رہا اور تقسیم ملک کے بعد اس کا نام چٹوڑ گڑھ رکھا گیا ہے۔

ہم نے بزرگوں سے سنا ہے کہ شہنشاہ جلال الدین محمد اکبر کے دور حکومت میں بٹالہ میں چار درویش وارد ہوئے۔ چاروں عرب نژاد بزرگ ایران سے اپنے عقائد کی حفاظت کی خاطر ہندوستان آئے۔ ان کے قافلہ میں ایک مرزا غیاث بیگ بھی تھے۔ جن کے اس سفر کے دوران ایک لڑکی تولد ہوئی جس کا نام مرثیاء رکھا گیا اور جو بعد میں نور جہاں کے لقب سے ملکہ جمائیکر بنی۔ یہ چار بزرگ بٹالہ میں مقیم ہوئے اور باقی قافلہ آگے دہلی کی طرف چل دیا۔ ان بزرگوں میں سے ایک فقیر منٹاں اور درویش صفت بزرگ نے شہر سے باہر شہل مشرق کی جانب ایک میل کے فاصلہ پر گوشہ نشینی اختیار کی اور مصروف عبادت ہوئے۔ ان کی وفات پر وہیں ان کا مقبرہ بنا جیسے جیسے کہا جاتا ہے۔ دوسرے بزرگ وزیر صاحب شہر کے دروازہ کلاں کے باہر جنوب کی سمت تقریباً ”اڑھسے میل کے فاصلہ پر گوشہ نشین ہوئے اور ان کی وفات کے بعد وہیں ان خانقاہ زیارت گاہ خاص و عام بنی تیسرے بزرگ شہر کے جنوب مشرقی حصہ (اندرون نصیرالحق دروازہ) میں سجادہ نشین ہوئے اور ان کی اولاد میں تھوریہ سلسلے کے کئی خدا رسیدہ بزرگ اور اولیاء اللہ ہوئے۔ چوتھے بزرگ شیخ فیروز دلی بن شیخ ہملول بن شیخ جلال تھے۔ شیخ فیروز دلی کے بٹالہ پہنچنے ہی قاضی عبداللہ خطیب ان کی عظمت اور قابلیت سے متاثر ہوئے اور انہیں اپنے ہمسایہ میں ایک مسجد کے قریب رہنے کی دعوت دی اور ملازمت حاکم کی ترغیب دلائی بلکہ شیخ فیروز دلی کی خواجہ معین تک رسائی کرائی۔ جس سے شیخ فیروز دلی کا تقرر فوراً روزنامہ نرسخ پر ہو گیا۔ شیخ فیروز دلی

مسجد کے نزدیک اولین رہائش گاہ اور قریبی علاقہ کے گرد ۱۵۸۹ء میں ان کے تیسرے صاحبزادے شیخ فتح اللہ صدی نے فصیل کھینچ کر محلہ منٹیاں کی بنیاد رکھی۔

۱۹۱۹ء میں ایک اور نظریہ فروغ پایا کہ شیخ دلی بن شیخ ہملول (ہملو) بن شیخ جلال (جلو) بن دود بن نادر بن لکڑ بن جیل بن ہانسل بن پل بن شاہ کلوچر قوم راجپوت موضع بوہ پرگنہ ہیست پور پٹی سے خضر خان گورنر لاہور کے ہاتھوں موضع بوہ کی جہاں کی وجہ سے اپنے موروثی علاقہ سے کئی سو گاؤں ہمیش چھوڑ چلے اور موضع گوندوال اور موضع رائے پور سے ہوتے ہوئے بٹالہ پہنچے تھے۔ باقی تفصیلات میں البتہ کوئی فرق نہیں۔ شاید کوئی تحقیق طلب ان نظریات کی کھتی کو سلجھائے۔ جب کہ ہر دو نظریات بے کم و کاست خاندان منٹیاں کے اجداد کے بارے میں یہاں راقم ہیں۔

شیخ فیروز دلی کے دوسرے فرزند شیخ احمد فیروز ۱۵۵۳ء میں شیخ فیروز دلی کے ہاں پیدا ہوئے۔ آپ کی والدہ کا اسم مبارک سلیم خاتون تھا۔ اس وقت ان کے بڑے بھائی شیخ محمد دلی کی عمر دوا تین سال تھی۔ آپ نے بٹالہ میں ہوش سنبھالا، مسجد کی قیوت اور والد کے علمی ذوق اور مشاغل کے درمیان اپنے بڑے بھائی شیخ دلی محمد (تاریخ پیدائش ۱۵۵۲ء) اور چھوٹے بھائیوں مسی شیخ فتح اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۵۸ء) اور شیخ نعمت اللہ (تاریخ پیدائش ۱۵۶۸ء) کے ساتھ احسن تربیت پائی۔ خود منشی طبیعت تھے۔ بچپن میں تبدیلی وطن کی صعوبت برداشت کی جس نے عمر بھر کے لیے محنت اور کاوش کی عادت ڈال دی۔ رقوم ثلث، نسخ، تعلیق، نستعلیق و سیاق اور خط شکستہ میں کمال حاصل کیا اور جدت پسند طبیعت نے ان میں غنی اختراعات پیدا کیں۔ ادھر خاندانی روایت کے تحت فنون حرب میں ایسی استعداد حاصل کی کہ مغل اور افغان آپ کی تیر اندازی کی تعریف کرتے۔ آپ بیس سال کی عمر میں نواب وزارت پناہ قاضی علی سلطان کے سرخط نویس مقرر ہوئے پھر روزنامہ پر ترقی پائی۔ اور دو نیستی منصب پایا۔ نواب جانیوس الزبانی حکیم ابوالفتح اور حکیم ہام گیلانی جیسے نامور بزرگوں کے مقرب رہے۔ اور تقریباً ”تینتیس سال کی عمر ۹۹۹ھ میں دیوان پرگنہ شہر کوٹ اور پرگنہ فارہہ مقرر ہوئے۔ ۱۰۰۴ھ میں خواجہ طاہر محمود والد خواجہ عماد الدین اور نواب آصف صفات آصف خاں کی وساطت سے دربار اکبری پہنچے اور بادشاہ کے دہن مبارک سے ”راست قلم۔“ کا لقب پایا۔ اکثر امراء نے آپ کو مبارک دی۔ اس وقت آپ کے چھوٹے بھائی شیخ فتح اللہ شاہی تخت کے پاس نواب آصف خان کی مسند کے عقب میں کھڑے

تقسیم کے وقت بٹالے کے مسلمان شہر بدر کر دیے گئے۔ مفتیاں محلے کے لوگ یا تو راستے میں دم توڑ گئے یا پاکستان پہنچنے میں کامیاب ہو گئے، لیکن سب بکھر گئے۔

شبیبہ کا یہ عالم تھا کہ بسیار خوش صورت، پوشاک اور طریق یوں اپنائے کہ دربار اکبری میں اکثر امرا آپ کو مغل زادہ سمجھتے۔ اخلاق حسنہ کی بلندی کا یہ حال کہ غریا کی مدد فرماتے۔ فہرا کو گھر بلاتے، مہمانداری کرتے اور عزت و احترام سے پیش آتے۔ پاکبازی، خشوع، ہر دلعزیزی، دلربائی اور راست گفتاری میں مشہور وقت جس کی مندرجہ ذیل جھلکیاں اس زمانے کے خطوط میں ملتی ہیں۔

”برگزیدہ نیکل و پاکل ہندوستان یعنی شیخ الشیخ شیخ احمد محفوظ بود ہمیشہ ورکشاش و طلب و

راستی شد چوں شعار قلمش احمد راست قلم شد علمش

حق گوئی میں اتنے یکنائے زمانہ کہ بڑے بڑے آپ کی وکالت اور فیصلے کے خواہاں رہتے۔ گھر میں ہر بزرگ و خورد کا صلاح مشورہ لیتے اور اگر کوئی مشکل پڑتی تو خاندان کا اجلاس طلب کرتے پھر نقش عمل مرتب کرتے۔ نماز، روزہ اور ذکر خدا میں کسی حال کو تاملی نہ کرتے اور ہر دعا میں روح بزرگان کو ثواب بخشتے۔ اور سلامتی افراد خاندان کی دعا فرماتے۔ رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے عشق تھا۔ چار یار باصفا کے مداح۔ حضرت غوث الثقلین شیخ عبدالقادر جیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے شاخاں اور حضرت فرید گنج شکر علیہ رحمۃ کے مرید تھے۔

حضرت والدہ اور بڑے بھائی کی عزت کرتے۔ چھوٹے بھائیوں اور عزیز مہمان سے شفقت سے پیش آتے۔ اور جب بھی کار و نیا سے فرصت ملتی روزہ حضرت فرید سنج پاکپتن اور والدہ